تاریخ شام

تصنیف

فل[illegible] کے حتی

ترجمہ

غلام رسول مہر



تاریخِ شام

تالیف

ڈاکٹر فِلپ کے حتی

ترجمہ

مولانا غلام رسول مہر

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

FIRST URDU EDITION

PRINTED IN PAKISTAN

طبع دوم	۱۹۶۸ء
طابع	شیخ نیاز احمد
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس لاہور
تعداد	ایک ہزار ایک سو
قیمت	[redacted] ہے

SH. GHULAM ALI & SONS
PRICE
40/-
LAHORE

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز۔ ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

بہ اشتراک

مؤسسہ مطبوعاتِ فرینکلن۔ لاہور ــــ نیویارک

ڈاکٹر فلپ کے۔ حتّی کے سوانح

ڈاکٹر فلپ، حتّی ۱۸۸۶ء میں بمقام شملان (لبنان) پیدا ہوئے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۸ء میں فارغ ہو کر امریکا چلے گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں ریسرچ کرتے رہے۔ وہاں سے مشرقی ادبیات والسنہ میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی اور وہیں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ پہلی جنگِ یورپ ختم ہوئی تو انھیں بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں طلب کر لیا گیا اور وہ تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۲۶ء تک وہیں رہے۔ پھر امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں تاریخ عرب کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں انھیں مشرقی درسیات کے ایک شعبے کا رئیس بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ تمام مناصب سے سبکدوش ہوئے۔ اب بھی مختلف اداروں اور انجمنوں میں انھیں معزز حیثیت حاصل ہے۔

ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت "تاریخ عرب" کو حاصل ہوئی جس کا ایک مختصر ایڈیشن بھی انھوں نے شائع کر دیا ہے۔ دوسرا درجہ "تاریخ شام" کو حاصل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لبنان کی بھی ایک مستقل تاریخ مرتب کر دی ہے۔

دیباچہ

شام کی تاریخ کو، اس نام کے جغرافیائی مفہوم کے ساتھ ایک لحاظ سے چھوٹے پیمانے پر پوری مہذب دنیا کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ یہ ہماری تہذیب کے گہوارے اور ہماری روحانی و ذہنی میراث کے ایک نہایت اہم حصّے کی تاریخ ہے، جس میں اس کے تمام عناصر سمو دیے گئے ہیں۔ ایسی تاریخ کی ترتیب کا حق اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ محرّر کو نہ صرف قدیم سامی زبانوں اور قرونِ وسطیٰ کی ادبیات ہی پر عبور ہو، بلکہ اسے یونانی و رومی سرگزشتوں اور تاریخ کے ترکی و ایرانی دائروں سے بھی پوری پوری آگاہی ہو اور اس سلسلے میں عہدِ حاضر کے مغربی یورپ کی زبانوں اور تاریخی مواد سے واقفیت جتنی ضروری ہے، اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

راقم الحروف کو ان تمام وسائل سے واقفیّت کے دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کا مطالعہ صرف سامی دائرے تک محدود رہا اور اس کی تحقیق و کاوش عربی اور اسلامی دائرے سے آگے نہ بڑھ سکی، لیکن اس کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ اگرچہ شام کے بعض حصّوں کے متعلق بے شمار تحریریں مرتب ہوئیں یا اس کی طویل گونا گوں تاریخ کے خاص ادوار مرتب کر دیے گئے، تاہم ایسی کوئی کتاب موجود نہیں، جس میں پورے علاقے کو ایک وحدت کی حیثیت میں پیشِ نظر رکھ کر اس کی زندگی کا متوازن اور جامع مرقع پیش کر دیا گیا ہو اور یہ مرقّع قدیم ترین زمانے سے دورِ حاضر تک کی تصویروں پر مشتمل ہو۔ بنا بریں راقم الحروف کو اس کتاب کی تدوین کا حوصلہ ہوا۔ یہ امر محتاجِ تصریح نہیں کہ لبنان کے فینیقیوں، فلسطین کے عبرانیوں اور دمشق کے عربوں کے متعلق مقابلۃً بڑی گہری تاریخی تحقیق کی جا چکی ہے، لیکن ان کی حقیقی کیفیت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انھیں باشندگانِ شامِ کبیر کے لاینفک اجزا کی حیثیت میں نہ دیکھا جائے۔ اور مشرقِ قریب کی معاصر ثقافت کے مشترک پس منظر میں رکھ کر ان پر نظر نہ ڈالی جائے۔

یہ کام ہرگز آسان نہ تھا۔ شام جو عموماً دوسری سلطنتوں کے تابع رہا، اس کے حالات بھول بھلیاں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس رشتے کو کیونکر تھامے رکھا جائے، جو اس ملک کی سرگزشت کے اہم واقعات کا شیرازہ بند ہو سکے۔ معاملہ یہیں ختم نہ ہوتا تھا، لازم تھا کہ جو معلومات مہیا ہو چکی ہیں، ان کی بخوبی دیکھ بھال کی جائے۔ ضروری عناصر کو کام میں لایا جائے، ان کی مطابقت کے پہلو ابھارے جائیں۔ پھر ان سب کے ارتباط سے ایک ایسی مسلسل کہانی تیار کر دی جائے، جس سے طلبہ اور اہلِ علم یکساں فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سلسلے کی مشکلات کچھ کم نہ تھیں۔ راقم الحروف کی اس کوشش کے لیے نہ جدّت کا دعویٰ موزوں ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر معاملے کو تحقیق کی آخری منزل پر پہنچا دیا گیا ہے۔ تاہم اگر اس طرح ایک ایسی کتاب تیار ہو گئی ہے، جو شام، لبنان، فلسطین اور شرقِ اردن کے باشندوں کے متعلق ایک قابلِ مطالعہ، غیر فنی اور درخورِ اعتماد کہانی کی موجودہ ضرورتیں پوری کر سکے۔ ساتھ ہی ان بہت سے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک عام پس منظر کا کام دے سکے، جو ان علاقوں کی ابھرتی ہوئی قوموں کو محیط ہیں تو یہ کوشش عبث نہ سمجھی جائے گی۔ راقم الحروف نے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے موسمِ گرما میں ان سرزمینوں اور ہمسایہ سرزمینوں کے طویل دورے کیے تاکہ قدیم مقامات اور تاریخی مناظر کے متعلق یاد تازہ ہو جائے، نیز مروّج افکار اور جدید رجحانات سے براہِ راست

ربط و تعلق پیدا ہو جائے۔ اگر یہ درست ہے کہ کسی "حال" کو "ماضی" کے مطالعے کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا تو یہ بھی ویسا ہی درست ہے کہ کسی "ماضی" کو اس وقت تک پوری طرح ذہن نشین نہیں کیا جا سکتا، جب تک "حال" سے خاصی آگاہی حاصل نہ ہو۔

راقم الحروف نے کتاب کا مسودہ ان ارباب علم کی خدمت میں پیش کیا تھا جنھیں مختلف دوائر میں ماہرین فن کی حیثیت حاصل تھی۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر گلین[1] ایل جیپسن نے تمہیدی ابواب پڑھے، جن کا تعلق بشریات سے ہے۔ اسی یونیورسٹی کے دو[2] اور پروفیسروں، ولیم ٹی تھوم اور ڈاکٹر جان سی[3] میکسویل نے ارضیاتی حصے کی چھان بین کی۔ ڈراپسی[4] کالج کے پروفیسر سائرس ایچ گارڈن[5] نے ان ابواب کی چھان بین کی، جن کا تعلق کنعانیوں اور آرامیوں سے ہے اور میرے رفیق ہنری[6] ایس جیمن نے عبرانیوں کے متعلق معلومات کا جائزہ لیا۔ ایک اور رفیق ٹی کیولر[7] ینگ نے ایرانی دور کے متعلق معلومات پر نظر ثانی کی۔ سکندر اور سلوکیوں کے متعلق جو ابواب ہیں وہ پروفیسر الفریڈ[8] آر بیلنجر کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے اور رومی دور نیز مسیحیت کے متعلق تمام تحریرات پروفیسر کارل[9] ایچ کرائیلنگ کو دکھائی گئی تھیں ان دونوں پروفیسروں کا تعلق ییل یونیورسٹی سے ہے۔ بیزنطینی عہد کے ابواب ڈاکٹر گلینول[10] ڈاؤنی نے پڑھے، جو ہارورڈ یونیورسٹی کی ڈمبرٹن اوکس[11] ریسرچ لائبریری سے متعلق ہیں۔ پروفیسر ہیرلڈ[12] انگھولڈ (ییل یونیورسٹی) نے بنطیوں، تدمریوں اور غسانیوں والے حصے ملاحظہ فرمائے۔ وہ دو باب، جن میں عثمانی دور کے حالات بیان ہوئے ہیں، میرے رفیق ڈاکٹر لیوس[13] وی ٹامس نے پڑھے۔ ان تمام فضلاء نیز دوسرے امریکی و بیرونی اہل علم کا بہ صمیم قلب شکر گزار ہوں، جن سے میں نے استمداد کی اور انھوں نے ازراہِ نوازش میری درخواست قبول فرمائی۔ یہ عرض کرنا غیر ضروری ہے کہ جو غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئیں ان کے لیے کامل ذمہ داری راقم الحروف پر ہے۔

امریکہ کی نیومس میٹک سوسائٹی (انجمن مسکوکات) کے ڈاکٹر جارج سی مائلز[14] کے شکریے کا بار قرض بھی راقم الحروف کے ذمے ہے۔ انھوں نے زیادہ تر سکوں کی تصویریں میرے لیے اور متعدد طلبہ کے لیے فراہم کیں، جن میں سے زیادہ نمایاں ہیری[15] ڈبلیو ہیزرڈ، ولفریڈ[16] سی سمتھ، آر بیلی[17] وائنڈر اور سی[18] ارنسٹ ڈاؤن ہیں۔ ان اصحاب نے پورا مسودہ پڑھا اور اپنے افکار سے مجھے

---

۱ Glenn L. Jepsen
۲ William T. Thom
۳ Dr. John C. Maxwell
۴ Dropsie College
۵ Cyrus H. Gordon
۶ Henry S. Gehman
۷ T. Cuyley Young
۸ Alfred R. Belinger
۹ Carl H. Kraeling
۱۰ Glanville Downey
۱۱ Dambarton Oaks Research Library
۱۲ Harold Inghold
۱۳ Lewis V. Thomas
۱۴ George C. Miles
۱۵ Harry W. Hazard
۱۶ Wilfred C. Smith
۱۷ R. Bayly Winder
۱۸ C. Ernest Dawn

مستفید فرمایا۔ بہت سے نقشے ڈاکٹر وائنڈر نے تیار کیے۔ اس مسودے کو اشاعت کے لیے تیار کرنے میں جس قدر تحریری امداد ضروری تھی، وہ رسق جی حداد فونڈیشن (نیویارک) کی مہربانی سے میسّر آئی۔ اشاریہ بھی اسی ذریعے سے تیار ہوا۔

راقم الحروف کو مسودہ بار بار پڑھنے اور پروف درست کرنے کے دوران میں بارھویں صدی کے ایک شامی جج کے یہ الفاظ رہ رہ کر یاد آتے رہے۔

"میں کسی ایسے مصنف سے نہیں ملا، جو اپنی کتاب کی عین تکمیل کے وقت یہ کہنے کے لیے تیار نہ تھا: "کاش میں اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کر سکتا تو یہ بدرجہا بہتر ہوتا! اگر فلاں بیان اس میں شامل کیا جا سکتا تو یہ تصریح کس قدر واضح ہو جاتی! اگر ان الفاظ کو آگے لایا جاتا تو بہت موزوں ہوتا! اگر فلاں فلاں فقرے اڑا دیے جاتے تو یقیناً عبارت قابلِ ترجیح بن جاتی!" اس قسم کے تجربات میں ایک بہت بڑی موعظت ہے، جو اس حقیقت کی شہادت مہیا کرتی ہے کہ خامی انسان کے تمام کاموں کی خصوصیت ہے"۔

۱۵۔ مارچ ۱۹۵۰ء

فلپ۔ کے۔ حتی

مقدمہ

(مترجم)

ڈاکٹر فلپ کے۔ حتی کو علمی دنیا میں آج ایسی شہرت حاصل ہے کہ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ ان کی "تاریخ عرب" بعض جگہ گنجائش اختلاف کے باوجود اصل موضوع کے متعلق گراں قدر معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ ہے، جو غالباً کسی دوسری جگہ نہیں مل سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کو چند بڑے واقعات کا گوشوارہ نہیں سمجھتے۔ وہ محض فرمانرواؤں کی لڑائیاں اور کش مکش ہی بیان نہیں کرتے، بلکہ آبادی کے تمام طبقات کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تمام تصانیف کو ہر علمی حلقے میں خاص قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

"تاریخ شام" بھی جس کا ترجمہ آئندہ اوراق میں پیش ہو رہا ہے، یقیناً علم و تحقیق کے لحاظ سے ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اگر کہا جائے کہ شام کے بارے میں ایسی کتاب کسی بھی زبان میں موجود نہیں تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی چند خصوصیات اختصاراً ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ اس میں دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک شام کی سرگزشت ایک مسلسل داستان کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ آثار قدیمہ سے جو کچھ روشنی میں آیا، اس سے عہد قدیم کے حالات کا نقشہ تیار کیا گیا، پھر تاریخی ادوار کے حالات حسنِ ترتیب سے بیان کر دیے گئے۔

۲۔ تاریخ قدیم سے بعض ان حالات کی حقیقی کیفیت واضح ہوتی ہے، جن کا تعلق ہمارے مذہب کے پس منظر سے ہے۔

۳۔ یہودیت اور نصرانیت کے نشو و ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو مذہبوں کے ابتدائی دور کے بارے میں جتنی تفصیلات ہمارے سامنے آئیں گی، قرآن مجید کے مختلف حصوں کی تفہیم میں معاون ثابت ہوں گی۔

۴۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے حالات اگرچہ اختصار سے بیان ہوئے ہیں، تاہم وہ بڑے مستند ہیں اور انھیں پیش نظر رکھ کر ہم ان جلیل القدر پیغمبروں، نیز بنی اسرائیل کے دوسرے داعیوں کے متعلق مزید غور و تحقیق کی نئی راہیں اختیار کر سکتے ہیں۔

۵۔ شام کی تاریخ میں عربوں کا حصہ سب سے بڑھا ہوا ہے، ڈاکٹر حتی کی کتاب عربوں کی نسبت جامع معلومات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔

۶۔ عام مغربی مستشرقین کے مقابلے میں ڈاکٹر فلپ حتی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ عربی ان کی مادری زبان ہے اور وہ تمام عربی مآخذ سے اسی طرح براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں، جس طرح انگریزی یا دوسرے مآخذ سے استفادہ کرتے ہیں۔ انھیں عربی کے بعض ایسے مصادر تک بھی رسائی حاصل ہوئی، جن کا علم بھی اکثر حضرات کو نہ تھا۔ ان وجوہ سے ڈاکٹر صاحب کی فراہم کردہ معلومات بدرجہا مستحق ترجیح ہیں۔

تاہم اس دنیا کی کوئی علمی کوشش ایسی نہیں، جو گنجائشِ اختلاف سے بالکل پاک ہو اور جسے تحقیق و کاوش کے اعتبار سے حرفِ آخر کہا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں بھی کہیں کہیں اختلاف کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے حواشی میں اپنا اختلاف واضح کر دیا،

تاکہ خوانندگان کرام ڈاکٹر فلپ حتی اور مترجم کی آرا میں موازنہ کر کے صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کے خلاف تعصب کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے مغربی اہل علم کی عام سازش کے خلاف بعض ثابت شدہ حقیقتوں کے واضح اعتراف میں تامل نہیں کیا، جس سے خود عیسائیوں کا پہلو کمزور ہوتا تھا۔ بلکہ مسیحیوں کی بعض سرگرمیوں پر نکتہ چینی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اہل علم کی شان یہی ہے کہ جس شے کو حق سمجھیں اس کے قبول میں توقف نہ کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے تذکرے میں زیادہ تفصیل سے غالباً اس لیے کام نہ لیا کہ ان کے نزدیک ان تاجداروں کے حالات عام طور پر معلوم و معروف ہیں۔ ان کے مقابلے میں غیر معروف صلیبیوں کے تذکرے کے لیے خاصے صفحات وقف کر دیے۔ شاید موصوف کی رائے یہ ہو کہ یہ حالات عام اہل علم کے سامنے نہ تھے۔ بہ ظاہر یہ طرز عمل غیر متوازن محسوس ہوتا ہے تاہم اس سے کتاب کی بلند علمی اور تحقیقی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب نیز "تاریخ عرب"، جس انداز میں لکھی گئی ہیں، کاش مورخ اسی انداز میں زیادہ مبسوط تاریخیں مرتب کر سکیں۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے بیش بہا علمی ذخائر یورپ کے کتب خانوں میں دیکھے تھے تو انھیں غنیؔ کاشمیری کا یہ مشہور شعر یاد آ گیا تھا۔

غنیؔ! روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

لیکن کیا یہ چیز کم قابلِ رشک ہے کہ جس علمی اور تحقیقی کام کے اصل ذمہ دار ہم تھے، وہ ہماری جگہ دوسرے انجام دے رہے ہیں اور کیا یہ تاسف کا مقام نہیں کہ ہم ان کی مثالیں سامنے رکھ کر بھی وہ فرض اب تک ادا نہیں کر سکے، جو ابتدا سے ہمارے ذمے عائد تھا؟ ہمارے پاس معلومات کے بڑے بڑے قیمتی گنجینے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ انھیں دورِ حاضر کے مقبول علمی انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ "تاریخ شام" کو اس لحاظ سے بھی ہمارے لیے ایک اچھے محرک کی حیثیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر حتیؔ نے سنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء تک کے مختصر حالات اپنی "مختصر تاریخ شام" میں شامل کر دیے تھے۔ میں نے اس عہد کے چار ابواب کا ترجمہ بھی حصہ ششم کے زیر عنوان اسی کتاب میں شامل کر دیا ہے، تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ جامع ہو جائے۔

غرض میں نے اسے ایک مفید کتاب سمجھ کر ترجمہ کیا اور اپنی ناچیز معلومات کی بنا پر جابجا حواشی لکھے، تاکہ اصل معاملہ بخوبی واضح ہو جائے۔ امید ہے کہ میری یہ عاجزانہ کوشش شرفِ قبول پائے گی۔

فہرست

حصّہ اوّل

تاریخ سے پیشتر کا دَور

پہلا باب

تاریخِ عالم میں شام کا مقام

شام کو تاریخ عالم میں یگانہ حیثیت حاصل ہے۔ اگر اس ملک کی قدیم حدیں پیشِ نظر رکھی جائیں، یعنی فلسطین اور لبنان کو بھی شامل کر لیا جائے، جو اس کے اجزا تھے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسری سرزمین نے انسان کی ذہنی اور ثقافتی ترقی میں شام سے زیادہ نمایاں اور شاندار حصہ نہیں لیا۔ نقشے پر دیکھا جائے تو چھوٹے ملکوں میں شام غالباً سب سے بڑا ملک ہے، جو رقبے کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے۔ تاہم تاثیر و نفوذ کے لحاظ سے اسے ہمہ گیر عالمی حیثیت حاصل ہے۔

شام یہودیت کا گہوارہ ہے اور مسیحیت نے بھی اسی میں جنم لیا۔ اس طرح اس ملک نے مہذب دنیا کو دو توحیدی مذہب دیے۔ تیسرے توحیدی مذہب، یعنی اسلام کے ظہور اور نشوونما و ارتقا سے بھی اسے گہرا تعلق ہے۔ مسیحی، مسلمان اور یہودی دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتے ہوں، مذہبی فیضان کے لیے ان کی نگاہیں شام ہی کے کسی مقدس مقام کی طرف پلٹیں گی اور ان کے قدم رہنمائی کے لیے شام ہی کی طرف اٹھیں گے۔ ہر مہذب آدمی دو ملکوں کے ساتھ گہرے انتساب کا دعویٰ کر سکتا ہے، ایک اپنا وطن اور دوسرا شام۔

مذہبی فیضان کے ساتھ اس اخلاقی پیغام کو بھی گہرا تعلق ہے، جو جنوبی شام نے دنیا کو پہنچایا۔ وہاں کے باشندوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیدا کیا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ گویا خدا کی سرپرستی میں تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس طرح جمہوری طرزِ زندگی کی بنیاد استوار ہوئی۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے روحانی قدروں پر زور دیا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ فتح و کامرانی انجام کار سچائی ہی کی قوتوں کے لیے مقدر ہے۔ اس طرح وہ عالم انسانیت کے اخلاقی معلّم بن گئے۔

زمانۂ قدیم کے شامیوں نے دنیا کے لیے صرف نہایت حسین و جمیل، اعلیٰ فکر ہی کا تحفہ مہیا نہیں کیا، بلکہ وہ نشانات بھی بہم پہنچا دیے، جو دیکھنے میں بہت سادہ، مگر استعمال کے لحاظ سے سحر انگیز تھے، یعنی ابجد اور ابجد ہی کے ذریعے سے دنیا کے بیشتر بڑے بڑے ادبی سرمائے محفوظ ہوئے۔ کوئی ایجاد اہمیت کے لحاظ سے ابجد کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جسے دورِ قدیم کے لبنانیوں نے نشوونما دی اور دنیا میں پھیلایا۔ فونیقیوں ہی سے جو اپنے آپ کو کنعانی کہتے تھے، یونانیوں نے اپنے حروف لیے، پھر انھیں رومیوں کے حوالے کر دیا، رومیوں سے یہ حروف دورِ حاضر کی یورپی اقوام نے لے لیے۔ مشرقی سمت میں آرامی آباد تھے، انھوں نے بھی اپنے حروف فونیقیوں ہی سے لیے، پھر انھیں عربوں، ایرانیوں، ہندوستانیوں اور ایشیا و افریقہ کی دوسری قوموں تک پہنچایا۔ اگر شام کے یہ باشندے اور کوئی خدمت انجام نہ بھی دیتے تو محض ابجد تیار کر دینے ہی کی خدمت اتنی اہم تھی کہ انھیں انسانیت کے سب سے بڑے محسنوں میں شمار کیا جاتا۔

لیکن ان کی خدمات کا سلسلہ یہیں پہنچ کا ختم نہیں ہوتا، شام کی محدود سرزمین میں ایسے تاریخی اور ثقافتی واقعات پیش آئے،

جو اتنے رقبے کی کسی دوسری سرزمین کو نصیب نہ ہو سکے۔ ان واقعات میں بوقلمونی بھی تھی اور حرکت و جوش بھی، یہی واقعات تھے، جن کی وجہ سے شام و فلسطین کی تاریخ مختصر شکل میں پوری مہذب دنیا کی تاریخ بن گئی۔ یونانیوں اور رومیوں کے دور اقتدار میں شام کے فرزندوں نے کلاسیکی دنیا کے لیے بعض ممتاز مفکر، معلم اور مؤرخ بہم پہنچائے۔ رواقی اور نو فلاطونی فلسفوں کی مختلف شاخوں کے بعض بانی شامی تھے۔ رومی قانون کے عظیم ترین دبستانوں میں سے ایک نے بیروت میں فروغ حاصل کیا، جو لبنان کا دارالحکومت ہے۔ اس دبستان کے بعض معلموں کی قانونی رائیں جسٹینین کے مجموعۂ ضوابط میں شامل ہوگئیں، اور یہ مجموعۂ ضوابط بجا طور سے رومی ذکاوت کا سب سے بڑا تحفہ سمجھا جاتا ہے، جو آنے والی نسلوں کے حوالے ہوا۔

اسلام پھیلا تو اس کے تھوڑی دیر بعد شام کا دارالحکومت دمشق، شہرۂ آفاق اُمیّہ سلطنت کا مرکزِ حکومت بن گیا۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے فتوحات کا سلسلہ ایک طرف ہسپانیہ اور فرانس تک دوسری طرف اندرون ہند اور حدود چین تک پہنچا دیا۔ یہ سلطنت حدود کے اعتبار سے اتنی وسیع تھی کہ رومی سلطنت کمال عروج میں بھی اس سے کمتر تھی اور اس وسیع سلطنت میں خلیفۂ دمشق کے ہر ارشاد کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی اور عربی دنیا کے لیے ذہنی اور دماغی سرگرمیوں کا دور شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں یونانی علوم کو عربی کا لباس پہنایا گیا۔ یقیناً تاریخ ایسی سرگرمیوں کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکے گی۔ اس زمانے میں یونانیوں کا فلسفہ اور ان کے افکار نہایت اہم میراث کی حیثیت میں کلاسیکی دنیا نے قرون وسطیٰ کو سونپے۔ یونانی علوم اور فلسفے کو عربی کا لباس پہنانے کے سلسلے میں مسیحی شامیوں نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی زبان یعنی سریانی وہ دہلیز تھی، جس سے گزرتے ہوئے یونانی علوم عربی زبان میں داخل ہوئے۔

قرونِ وسطیٰ میں سٹیج پر ایک نیا ڈراما دکھایا گیا۔ جسے مشرق کے مسلمانوں اور مغرب کے مسیحیوں کے تعلقات کی تاریخ کا حد درجہ سنسنی پیدا کرنے والا ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ فرانس، انگلستان، اٹلی اور جرمنی سے صلیبی جنگجوؤں کے بڑے بڑے جتھے شام کے ساحلی میدان اور فلسطین کی سطح مرتفع میں پہنچے، وہ "مسیح میت" کی تلاش میں آئے تھے، جو زندہ حقیقت کے طور پر ان کے دلوں میں موجود نہ تھا۔ اس طرح یورپ اور ایشیا میں وہ تحریک جاری ہوئی۔ جو تاریخ کے اعتبار سے بہت دُور رس تھی۔ لیکن صلیبی جنگیں شام کی طویل اور بوقلموں جنگی تاریخ کا محض ایک باب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شام ایشیا کا دروازہ تھا اور قوموں کے چوراہے پر واقع تھا۔ لہٰذا جنگ کی حالت میں یہ بین الاقوامی رزمگاہ بن جاتا اور امن کی حالت میں تجارتی شاہراہ کا کام دیتا۔ شام کے سوا کس زمین کے لیے یہ دعویٰ زیبا ہے کہ اس نے عظیم الشان سپہ سالاروں اور فاتحوں کی سب سے بڑی قطاریں دیکھیں؟ ان کی ابتدا، تموتمس سے ہوئی، پھر بنوکدنزر، ابخت نصر، سکندر، جولیئس سیزر، خالد بن ولید، صلاح الدین، بیبرس اور نپولین جیسے شہرۂ آفاق سالار یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے رہے۔

ترکوں اور مملوکوں کے زیر اقتدار شام کی تقدیر کا ستارہ صدیوں تک گہنایا رہا۔ زمانۂ حال میں اس ملک کے باشندوں نے مشرقی عربی دنیا کے لیے ذہنی قیادت کا سروسامان بہم پہنچایا۔ شامیوں اور خصوصاً لبنانیوں نے گزشتہ صدی میں سب سے پہلے مغرب کے ساتھ تعلقات پیدا کیے۔ اس کے کئی ذریعے تھے۔ مثلاً انھوں نے مغرب میں تعلیم حاصل کی یا وہ نقل وطن کر کے کسی مغربی ملک میں آباد ہو گئے یا انھوں نے سیر و سیاحت کے ذریعے سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس طرح وہ ایک واسطہ بن گئے جس سے یورپی اور امریکی اثرات مشرق قریب میں آہستہ آہستہ پہنچے۔ قاہرہ، پیرس، نیو یارک، ساؤ پاؤلو[1] برازیل

[1] Sao Paulo

اور سڈنی میں ان لوگوں نے جو نو آبادیاں قائم کیں، وہ ان کی جفاکشی اور منچلے پن کی زندہ شہادتیں ہیں۔

شام کی تاریخی اہمیت محض اتنی ہی نہیں کہ اس نے انسان کی اعلیٰ زندگی کے لیے مستقل خدمات انجام دیں، اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پرانی دنیا کے تین براعظموں ——— یورپ، ایشیا اور افریقہ ——— کے درمیان اسے خاص جنگی وضعیت حاصل رہی ہے۔ نیز یہ آس پاس کی تہذیبوں کے ثقافتی اثرات اور تجارتی ساز و سامان جابجا منتقل کرنے کے لیے ایک پُل کا کام دیتا رہا ہے۔ یہ وظیفہ فونیقیوں نے بڑے اچھے طریقے پر ادا کیا تھا، جو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کا ذریعہ بنے تھے۔ شام کو مشرقِ قریب میں بنیاد کی حیثیت حاصل تھی اور مشرقِ قریب دنیائے قدیم کے مرکز میں واقع تھا۔ اس وجہ سے شام عہدِ قدیم کی ثقافت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔ اس کے ایک جانب دو دریاؤں کی وادی (عراق) اور دوسری جانب ایک دریا کی وادی (مصر) واقع تھی۔ قدامت، سرگرمی اور تسلسل میں کوئی دوسرا خطّہ ان تین خطّوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مسلسل تاریخ کی صبح انھیں خطّوں میں طلوع ہوئی تھی۔ یہاں ہم کم و بیش ایک ہی قسم کے لوگوں کی پانچ چھ ہزار سال کی تاریخ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، جس میں کبھی انقطاع نہ ہوا۔ ان کی تہذیب چار ہزار سال ق،م سے رواں دواں چلی آ رہی ہے۔ اب ہم پر واضح ہو چکا ہے کہ یورپ کی ابتدائی ثقافت دیر تک مشرقی بحیرہ روم کی اسی تہذیب کا دھندلا سا عکس رہی[1]۔ اب ہم پر منکشف ہو رہا ہے کہ قدیم چینی تہذیب کے بعض بنیادی عناصر بھی غالباً "ہلالِ زرخیز" ہی کے مشرقی حِصّے سے گئے تھے۔

زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو چھان بین ہوئی، اس سے واضح ہو گیا ہے کہ شام کو تاریخی دور سے پیشتر بھی بلند حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً گندم کی کاشت غالباً سب سے پہلے یہیں ہوئی، تانبا بھی یہیں دریافت کیا گیا۔ مٹی کے برتنوں کی ایجاد بھی شام ہی میں ہوئی۔ اس طرح انسانی زندگی کے طور طریقے بدلے، یعنی لوگ شکار کھیلنے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کے بجائے ایک جگہ مقیم ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ ممکن ہے سب سے پہلے شام ہی کے دیہات و قصبات میں حضری زندگی کی ابتدا ہوئی ہو۔ اس سے بھی پہلے، جیسا کہ آئندہ باب میں واضح ہوگا، شام اس نوعِ انسانی کی پرورش گاہ رہا، جس سے براہِ راست ہمارا سلسلہ چلا۔

---

[1] ملاحظہ ہو V. Gardon Childe. New Light on the Most Ancient East (London 1934) Ch. 1

دوسرا باب

مقدّماتِ تہذیب

پتھر کے اوزار

سمندروں میں برف کے جو بڑے بڑے تودے نظر آتے ہیں، ان کا صرف ایک معمولی سا جزو پانی کی سطح پر ہوتا ہے اور بہت بڑا حصّہ پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت شام اور اہلِ شام کی سرگزشت میں ادبی دَور کی ہے۔ یہ دَور بھی کُل کا محض ایک معمولی سا جُزو ہے۔ شام میں ادبی تاریخ کا آغاز تیسرے ہزار سال ق۔م کے اوائل میں ہوا۔ جبکہ اس کے دو ہمسایہ ملکوں، یعنی دوآبہ عراق کے جنوبی حصّے اور مصر میں تہذیب کی نشو و نما شروع ہو چکی تھی اور فنِ تحریر وجود میں آگیا تھا۔ ظہورِ ادب سے پیشتر کے دَور کی کوئی تحریری دستاویز نہیں ملتی اور ہمارے لیے آثارِ قدیمہ کے باقیات پر بھروسے کے سوا چارہ نہیں۔ یہ دَور نئے سنگی عہد سے گزرتا ہُوا پُرانے سنگی عہد میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ہزاروں سال پر پھیلا ہُوا ہے۔ شمالی اور مشرقی شام کے جن حصّوں میں کبھی کوئی چھان بین نہیں کی گئی تھی، وہاں، نیز لبنان کے غاروں، فلسطین کے ٹیلوں، مشرق اُردن کے ریت میں دبے ہوئے شہروں کے اندر گزشتہ تیس سال میں جو کھدائی ہوئی اس سے ایسی تہذیب کے آثار ظاہر ہوئے، جو مدّت سے گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکی تھی۔ ان آثار کو دیکھ لینے کے بعد قطعاً شبہہ باقی نہیں رہتا کہ جس خطّے کے آثارِ قدیمہ کو مدّت تک نذرِ فراموشی کیا گیا اور اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہ تھا، وہ خطّہ بالکل ابتدائی ادوار میں بھی بہت آگے بڑھا ہوا تھا، حالانکہ عام طور پر اس صورتِ حال کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ابتدائی دور کے باقیات: پتھر کے اوزار

ہم اس خطّے کے ابتدائی انسان کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ تو ہماری نگاہوں سے بچ کر نکل جاتا ہے، تاہم اس کے آثار ہمیں جا بجا مل جاتے ہیں، مثلاً پتھر کے اوزار جو غاروں میں یا سطحِ ارض پر چھوٹی چھوٹی تصویروں کی طرح وسیع علاقے میں بکھرے ہوئے پائے گئے ہیں۔ یہ اوزار اور ہتھیار سرسری طور پر پتھروں کے پرت اتار اتار کر یا انھیں بے قاعدگی سے چھیل چھیل کر بنائے گئے تھے اور ان سے کلہاڑیوں، چھُریوں، یا گھرچنے والے آلات کا کام لیا جاتا تھا۔ صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کا تعلّق قدیم سنگی دَور کے اوائل سے تھا، جس کا زمانہ ڈیڑھ لاکھ سال پیشتر سمجھنا چاہیئے[1]۔ اس خطّے میں دستے والی کلہاڑی سب سے پہلی چیز تھی، جو ابتدائی دور کے انسان نے بنائی اور اس کی صورت یہ تھی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے مختلف حصّوں کو چھیل لیا گیا تھا تاکہ آسانی سے اسے ہاتھ میں لے کر چیزیں کاٹنے یا باریک کرنے کا کام لیا جا سکے۔ اس سے پیشتر کی کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی، جو اور زیادہ ناہموار و ناتراشیدہ ہوتی،

---

[1] یہ وہی زمانہ ہے جو یورپ میں "اشول" ثقافت کا زمانہ تھا۔ اس ثقافت کو "اشولی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ فرانس کے ایک خاص مقام سے منسوب ہوئی

یعنی جس کا تعلق تجربات سے قبل کے دَور سے ہوتا۔ اس سلسلے میں جو مشکل پیش آئی، یہ تھی کہ ابتدائی دَور کے انسان کے بنائے ہوئے کسی آلے اور پتھر کے خود بخود ذرا تراشیدہ ہو کر آلے کی صورت اختیار کر لینے میں کوئی حد قائم نہ کی جا سکی، یہ بھی اغلب ہے کہ ابتدائی دور کے انسان پتھر کی کلہاڑیوں کے ساتھ ساتھ یا ان سے پیشتر لکڑی کی شاخوں یا لکڑی کی دوسری چیزوں سے کام لیتے رہے ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کا کوئی ایسا اثر یا نشان باقی ہی نہ رہ سکتا تھا، جسے آسانی سے دریافت کیا جا سکتا۔

لبنان اور فلسطین کے جن غاروں سے قدیم سنگی دَور کی چیزیں ملی ہیں اور ان کی چھان بین کی جا چکی ہے۔ ان میں عدلون[1]، کوہ کرمل[2]، اُم قطفہ[3] اور الزطیہ[4] بھی شامل ہیں۔ اسی دَور کی بنی ہوئی دستے والی کلہاڑیاں دریائے اُردن کے طاس میں (جسر بنات یعقوب سے نیچے)[5] دوسرے مقامات پر، نیز راس الشمرہ[6] میں بھی ملی ہیں، جسے زمانۂ قدیم میں اغاریت کہتے تھے۔ یہ کلہاڑیاں مثلث یا بیضوی تھیں اور ان کے دستے کاٹنے والے حصوں سے زیادہ بڑے تھے۔

جن انسانوں نے اپنے وجود کے متعلق پتھروں کے یہ آثار چھوڑے، وہ بظاہر سفید فام باشندوں کا بالکل ابتدائی نمونہ تھے جنھیں ابھی تک کسی خاص صنف کے ماتحت لایا نہیں جا سکا۔ اور ان کی ثقافت کی جدا امتیاز بھی قائم نہیں ہو سکی۔ وہ کم از کم کچھ وقت ضرور غاروں میں گزارتے تھے، تاکہ بارش، درندوں اور دشمنوں سے محفوظ رہیں اور اس سے پیشتر کے دور میں موسم کی شدتِ برودت نے انھیں اس طرز بودوماند

---

[1] عدلون، صور اور صیدا کے درمیان قریباً وسط میں واقع ہے۔ اس کے غاروں، نیز نہر ابراہیم، نہر الکلب اور انطلیاس کے دوسرے غاروں میں چھان بین کا کام جی زوموفن (G. Zumoffen) نے انجام دیا۔ ملاحظہ فرمائیے اس کی کتاب La Phenicie avant les Pheniciens (مطبوعہ بیروت ۱۹۰۰ء) ص ۴-۱۲، نیز مجلہ Anthropos مجلد سوم (۱۹۰۸ء) کا مقالہ L'Age de la pierre en Phenicie ص ۴۳۱-۴۵۵۔

[2] یہاں کھدائی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک ڈوروتھی اے ای جارود (Dorothy A. E. Garood) اور ڈی ایم اے بیٹ (D. M A Bate) نے کی۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب The Stone Age of Mount Carme (جلد اول (مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۷ء) باب ہشتم

[3] یہ مقام بحیرہ مردار کے شمال مغرب میں ہے یہاں چھان بین رینی نوویل (Rene Neuviib) نے کی تھی۔ ملاحظہ ہو اس کا مقالہ مجلہ "L' Anthropologie" میں جس کا عنوان ہے: L' Achuleen superieur de la grotte L' Oumm Qatat (جلد ۴۱ (۱۹۳۱ء) ص ۱۳-۵۱ و ص ۲۴۹-۲۶۳، نیز Le Prehistorique de Palestine) Revue beblique. Vol. XLII (1934) ص ۲۳۷-۲۵۹

[4] یہ مقام بحیرہ طبریہ کے شمال مغرب میں ہے یہاں کھدائی ایف ٹرنیل پیٹرے (F. Turville-Petre) نے کرائی تھی۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Researches in Prehistoric Galilec (مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء) پیرا ۵-۶ نیز جارود اور بیٹ ۱۱۳-۱۱۵

[5] جسر بنات یعقوب مجلہ The Quarterly of the Department of Antiquities in Palestine مجلد ششم (۱۹۳۶ء) ص ۲۱۴-۲۱۵

[6] Claude F. A. Schaeffer, the Cuneiform Text of Ras Shamro Ugarit (۱۹۳۹ء) مطبوعہ لندن۔

پر مجبور کردیا ہوگا۔ اگرچہ برف کے تہ بہ تہ جمنے کا سلسلہ جنوبی شام تک کبھی نہ پہنچا، لیکن اس ملک کی آب و ہوا ضرور برف سے متاثر ہوئی ہوگی۔ قدیم سنگی دَور کا پہلا حصّہ ختم ہونے پر یہاں کی آب و ہوا بارانی اور خاصی مرطوب ہو گی۔ اس وجہ سے سبزہ بہ کثرت اُگتا ہو گا۔ جو جانور اس سبزے سے پرورش پاتے تھے، وہ اب بالکل ناپید ہو چکے ہیں، جن جانوروں کے ڈھانچے دستیاب ہوئے ہیں، اُن میں گینڈے اور دریائی گھوڑے کے علاوہ ایک فیل نما جانور بھی شامل ہے۔ اس زمانے میں یورپ برفانی عہد کی تختیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، اس وجہ سے مشرقِ قریب میں انسان کے لیے ابتدائی جدّ وجہد شروع کرنے کا موقع پیدا ہو گیا۔

ابتدائی عہد کے انسانی ڈھانچے

مشرقِ قریب میں انسانوں کے جو زیادہ سے زیادہ پرانے ڈھانچے ملے ہیں، ان کا تعلّق قدیم سنگی دَور کے درمیانی عہد سے ہے۔ یہ ڈھانچے مس جارڈو[1] کو زیادہ تر کوہ کرمل کے دو غاروں سے ملے، جن میں سے ایک ناصرہ[2] کے جنوب میں اور دوسرا بحیرہ طبریہ[3] کے شمال مغرب میں ہے۔ ان ڈھانچوں کی دریافت مشرقِ قریب کے ماقبل تاریخ عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ بن گئی۔ یہ ڈھانچے موستیری[4] نمونہ ثقافت سے متعلق تھے، اور ان کا زمانہ کم از کم ایک لاکھ سال پیشتر کا سمجھنا چاہیے۔ ان سے انسانی ڈھانچوں کا ایک پورا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے، جو نیانڈرتھل[5] نمونے سے ترقی کرتے کرتے اس درجے پر پہنچ گیا، جسے انسان سے زیادہ سے زیادہ قریب سمجھا جا سکتا ہے۔ نیانڈرتھل کا قد چھوٹا اور جسم گٹھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ بڑی حد تک سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔ لیکن بالکل سیدھا نہیں۔ کوہِ کرمل سے جو ڈھانچے ملے۔ اُن میں خاص طور پر حیرت انگیز بات یہ پائی گئی کہ بعض عضویاتی خصوصیتوں کے اعتبار سے وہ ابتدائی دَور کی انسانی نوع کے مشابہ تھے۔[6] مثلاً کھوپڑی کا حلقہ یورپی نسل کے مقابلے میں زیادہ بڑا تھا۔ ٹھوڑی بھی یقیناً بڑی تھی، تاہم اس کی وضع و ساخت میں وہ صورت ناپید تھی، جو مربوط بات چیت کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن انسانوں کے یہ ڈھانچے تھے، انھیں ارتقائے انسانی کی ایک نمایاں کڑی سمجھنا چاہیے۔ بہ الفاظِ دیگر مشرقِ قریب اُن لوگوں کی پیدائش گاہ اور پرورش گاہ رہا جن کا درجہ نوعِ انسانی کی ابتدائی شکل اور دَورِ حاضر کے انسان کے درمیان تھا۔

---

[1] مغارۃ الطابون اور مغارۃ الغول ملاحظہ ہو جارڈو اور بیٹ کی کتاب ابواب ۴ — ۷

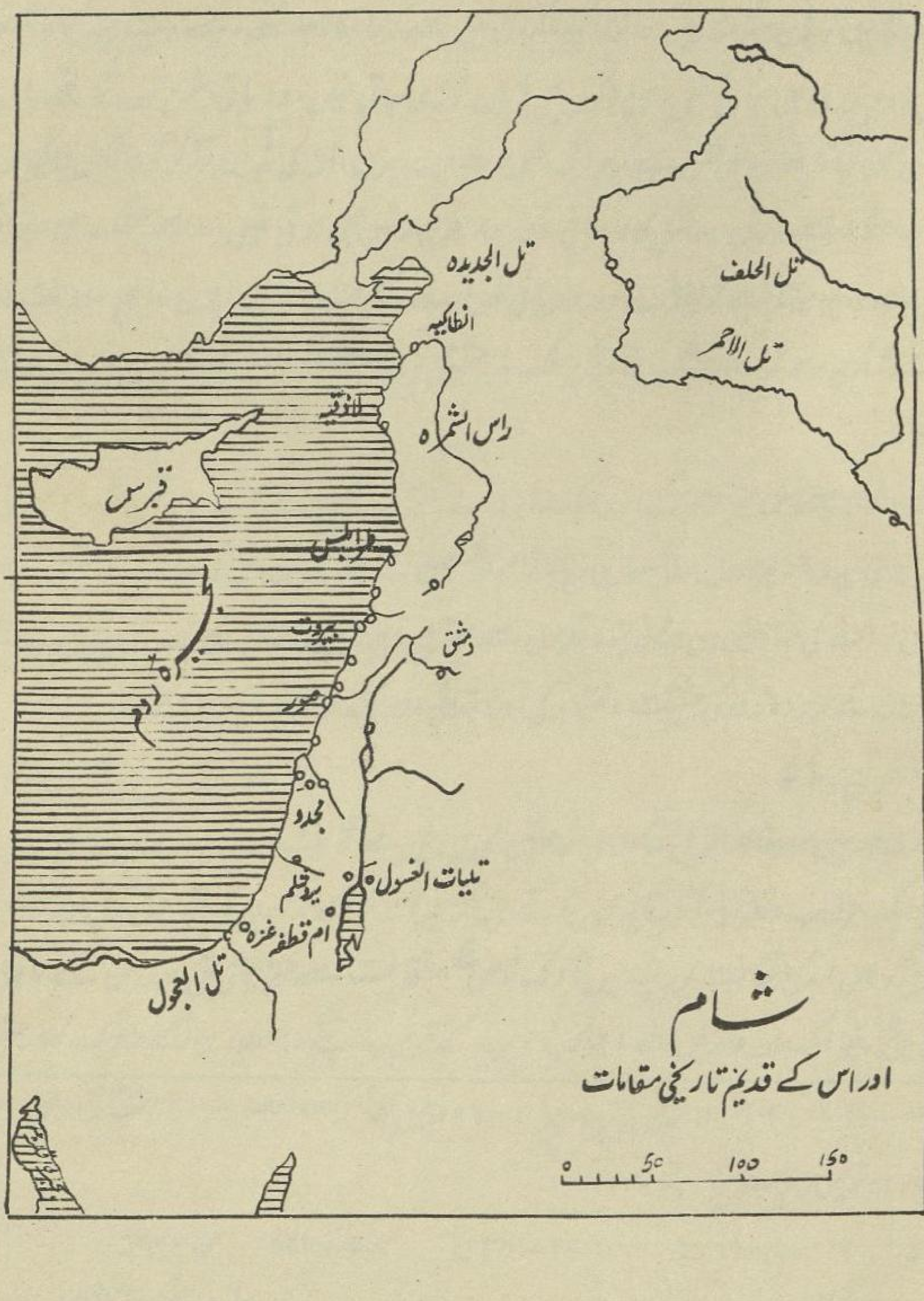
[2] جبل القفزہ جس کی چھان بین رینی نوئیل نے ۱۹۳۴ء میں کی، لیکن جو کچھ دیکھا، اسے شائع نہیں کیا، دیکھیے مقالہ بہ عنوان "جبل قفزہ" جو مشہور مجلّے The Quarterly of the Department of Antiquities of Palestine جلد چہارم (سنہ ۱۹۳۴ء) میں شائع ہوا، ص ۲۰۲۔

[3] الزطیہ متریل پیترے۔ ایڈورڈ کیتھ (Edward Keith Report on the Galilee Skull)

[4] Mousterian Type یہ نام فرانس کے ایک غار سے لیا گیا۔

[5] جرمنی کے صوبہ رہائن کی ایک وادی کا نام ہے۔ یہ نام اس انسانی ڈھانچے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو اس وادی سے ملا تھا۔

[6] Theodore D. McCown and Arthur Keith کی کتاب The Stone Age of Mount Carmel جلد دوم (آکسفورڈ ۱۹۳۹ء) باب دوم۔ ارنسٹ، اے ہوتن Hooten کی کتاب Up from the Ape (نیویارک ۱۹۴۶ء) ص ۳۳۶ — ۳۳۹، الفریڈ ایس رومر Romer کی کتاب Man and the Vertebrates (شکاگو ۱۹۴۱ء) ص ۲۱۹ — ۲۲۲۔



تل الجدیدہ
انطاکیہ
تل الحلف
تل الاحمر
لاذقیہ
راس الشمرہ
قبرص
طرابلس
بحر روم
بیروت
دمشق
صور
مجدو
تلیلات الغسول
یروشلم
ام قطفہ
غزہ
تل العجول
شام
اور اس کے قدیم تاریخی مقامات
0 50 100 150

قدیم سنگی دَور کے درمیانی عہد کا انسان بہ دستور غاروں میں رہتا تھا۔ وہ حسبِ سابق پتھر کے کراس سے بے وضع ٹکڑے کاٹ لیتا اور اُنھیں ٹکڑوں سے کلہاڑیوں اور ہتھوڑوں کا کام لیتا[1]۔ اُنھیں سے چیزیں کاٹتا یا چھیلتا۔ اس عہد کا اجتماعی نظام بے شبہ بہت ہی سادہ اور ابتدائی دَور کا تھا۔ مثلاً مختلف لوگ مِل جُل کر ایک جتھا یا گروہ بن جاتے اور حیوانات و نباتات میں سے جو کچھ ہاتھ آتا، اس پر زندگی گزارتے۔ ایسی مثالیں بھی ملیں کہ انسانی ہڈیوں کو بڑی ہنرمندی سے توڑا گیا تاکہ ان میں سے گودا نکالا جا سکے، جسے بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں آدم خوری بھی رائج تھی۔ جن لوگوں کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں۔ وہ یا تو دشمن ہوتے تھے یا ایسے رشتہ دار جن سے چھٹکارا پانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ طبعی موت مرے ہوں، اُن کی ہڈیاں توڑ کر گودا نکال لیا گیا ہو۔

اس عہد کا موسم ایسا تھا، جیسے بارش اور خشکی کا درمیانی دَور ہو، یعنی بارشیں بھی ہوتی تھیں اور موسم خشک بھی رہتا تھا۔ جانوروں کے جو ڈھانچے ملے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گینڈے اور دریائی گھوڑے کے علاوہ غزال، چرخ، ریچھ، اونٹ، دریائی خنزیر اور ہرن بھی نمودار ہو گئے تھے[2]۔ اگرچہ موسم گرم اور خشک تھا، لیکن ملک میں مستقل دریا بہتے تھے، جن سے زمینیں سیراب ہوتی تھیں اور جگہ جگہ جنگل بھی پائے جاتے تھے۔

وسطی سنگی دور کے آخری حصے میں پھر موسم کے اندر ایک زبردست تغیر ہوا۔ یعنی بہت سخت بارشیں شروع ہو گئیں۔ اس طرح پھر آب و ہوا میں رطوبت پیدا ہو گئی۔ یہ زمانہ ہزاروں سال جاری رہا۔ شام و فلسطین کے بارے میں اس کی مدت کے متعلق زیادہ معلومات میسّر نہیں آ سکیں۔ لبنان میں اس زمانے کی شہادتیں ان چٹانی پناہ گاہوں سے ملتی ہیں، جو نہر الجوز (نزد بترون) اور نہر ابراہیم کے حلقے میں واقع ہیں[3]۔ یہی زمانہ ہے جس میں جانوروں نے موجودہ دَور کی حیثیت اختیار کی اور ابتدائی دَور کے نمونے ناپید ہو گئے۔

قدیم سنگی دَور کا آخری زمانہ

قدیم سنگی دور کے آخری عہد میں، جو خاصا طویل تھا، ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ موسم میں خشکی اور یبوست تدریجاً[4] بڑھ رہی تھی، البتہ بیچ میں ایک مرطوب وقفہ آیا۔ آثارِ قدیمہ بھی بتاتے ہیں کہ بحیرۂ روم کے موسموں کی معتدل گرمی اور ٹھنڈک قدیم سنگی دَور کے آخری عہد تک باقی رہی۔ اس عہد کی ثقافت یورپ میں "آرگ ناسی[5]" ثقافت سے ملتی جلتی تھی اور اس کے باقیات ہمیں انطلیاس اور نہر الکلب کے غاروں میں[6]، نیز ایک اور غار میں ملے، جو بحیرۂ عرب کے قریب ہے[7]۔ انطلیاس کے نزدیک کسار عقیل کے مقام پر

---

[1] جارود اور بیٹ ص ۸۸-۹۰، ص ۱۰۹-۱۱۲، ترفیل پیترے پیرا ۳-۶، نیز مجلّہ Revue biblique (۱۹۳۷ء) ص ۲۳۷

[2] جارود اور بیٹ ص ۲۲۶، ترفیل پیترے پیرا ۴-۸۔

[3] زموفن (Zumoffen) La Phericie ص ۲۹-۴۸، نیز Anthropos ص ۴۴۳

[4] لیو پکارڈ Leo Pecard کی کتاب Structure and Evolution of Palestine (مطبوعہ یروشلم ۱۹۴۳ء) ص ۱۱۹-۱۲۰

[5] Aurignaician یہ نام فرانس کے ایک مقام کے نام پر رکھا گیا، جہاں سے اس ثقافت کا ابتدائی نمونہ ملا۔

[6] ایلفریڈ ای، ڈے Alfred E. Day کا مقالہ "آثار الانسان الاوّل المکتشفہ حدیثاً فی انطلیاس" جو مجلّہ "کلیہ" (بیروت) جلد دوازدہم ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا ص ۴۹۶-۴۹۹، نیز زموفن La Phenicie ص ۲۰-۲۸، ص ۴۹-۸۷، اور Anthropos ص ۴۴۳

[7] مغارۃ الدمیرہ۔ ملاحظہ ہو ترفیل پیترے ص ۲-۔

جو کھدائی ماضی قریب میں (سنہ ۱۹۳۹ء) ہوئی، اس میں ہرنوں، اچرخوں، گینڈوں، لومڑیوں، بکریوں اور انسانوں کے ڈھانچے ملے[1]۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے عجائب خانے میں سنگی عہد کے اوزار بہ کثرت موجود ہیں۔

جانوروں کے ڈھانچوں میں سے غزال کے ڈھانچوں کو نمایاں درجہ حاصل رہا۔ باقی رہی فن کاری اور ہنر مندی تو اس لحاظ سے یہ زمانہ سابقہ زمانے سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، البتہ اوزار کے حجم میں کمی آ گئی، یعنی وہ زیادہ چھوٹے اور مختصر ہوتے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے مختلف اوزار و آلات میں لکڑی یا ہڈی کے دستے لگانے شروع کر دیے تھے۔ گویا دو مختلف چیزوں کو ملا کر ایک آلہ تیار کیا جاتا تھا۔ لکڑی مدت دراز تک باقی نہ رہ سکتی تھی لہٰذا چوبی دستوں کا کوئی نشان نہیں مل سکا۔ ہاں ایسی ہڈیاں ضرور ملی ہیں جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ آلات و اوزار میں دستوں کے طور پر استعمال ہوئی تھیں۔

آگ: کوئلہ

ہمارے حلقے میں کوئلے کے جو اجزا اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ کوہ کرمل کے ایک غار کی سب سے نچلی تہ سے ملے ہیں[2] اور ان کا تعلق ابتدائی سنگی دور کے آخری زمانے سے ہے، گویا ڈیڑھ لاکھ سال پیشتر سے دوسرے اجزا، جو سنگی دور کے آخری زمانے کے ہیں (یورپ میں آرگ ناسی دور[3]) وہ پاس کے ایک غار سے کھود کر نکالے گئے[4] اور اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ شاہ بلوط، توس (اُٹل فرنگی) زیتون اور انگور کی بیل کے ہوں گے[5]۔ غرض ابتدائی دور کے انسان نے پست ذہنی سطح سے آہستہ آہستہ اور بخت محنت مشقت کے ساتھ اوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ عزم و ارادہ سے نہیں بلکہ محض اتفاقیہ وہ ایسی دریافتوں پر پہنچ گیا، جن کی وجہ سے اسے اعلیٰ سہولتیں میسر آ گئیں۔ ان سہولتوں نے اس کی سوئی ہوئی صلاحیتِ ایجاد کو بیدار کر دیا، پھر اس صلاحیت کو نشوونما مل گئی۔ بالکل ابتدائی دور کی دریافتوں میں سے ایک آگ بھی ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائی دور کے انسان نے وہ آگ ضرور دیکھی ہوگی، جو بجلی یا شہاب ثاقب کے گرنے سے یا دوسرے طبعی حوادث کے باعث پیدا ہوتی ہے اور اس سے — فائدہ بھی اٹھایا ہوگا۔ بعد ازاں غالباً تازہ گوشت کے ٹکڑے سبز اور ناپختہ میوے یا قابل خورش سبزیاں اتفاقیہ بھڑکتی ہوئی آگ میں گر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیزیں ملائم ہو گئیں اور ان کا ذائقہ بھی بہتر ہو گیا۔ جو انسان ذہنی اعتبار سے ذرا مستعد تھے اور انھیں ہر نئی چیز کی ٹوہ لگانے کا شوق تھا، انھوں نے تجربے شروع کر دیے، نیز جب وہ سخت پتھروں کے ٹکڑے کاٹتے تھے اور انھیں چھیل چھیل کر یا رگڑ رگڑ کر اوزار بناتے تھے تو انھیں تجربہ ہوا ہوگا کہ رگڑ سے چنگاریاں اور شعلے پیدا ہوتے ہیں، تاہم وہ پشتوں تک اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پھر اُن کے ہمسروں میں سے ایڈیسن جیسا کوئی دُور اندیش موجد پیدا ہوا جس نے اس منظر پر

---

[1] Franklin Ewing کا مقالہ American Journal of Physical Anthropology — [3] Aurignacian جو
Man in Syria میں شائع ہوا، جلد چہارم سنہ ۱۹۴۶ء ص ۲۵۲-۲۵۳ نیز المشرق جلد XLI (سنہ ۱۹۴۷ء) ۲
ص ۱۴۷-۱۴۱ (سنہ ۱۹۴۷ء) میں جو آثار قدیمہ ملے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادی الفلطیاس میں انسانوں کی آبادی چھ ہزار سال ق م سے برابر جاری ہے۔

[2] الطابون ملاحظہ ہو جارود اور بیٹ کی کتاب ص ۱۲۹۔

[4] مغارۃ الوادی جو کوہ کرمل کے مغربی کونے کے قریب ہے۔

[5] جارود اور بیٹ کی کتاب ص ۱۲۹۔

غور وفکر شروع کر دیا اور اس نے خود شعلے پیدا کر کے انھیں انسانی مقاصد کے لیے محفوظ کر دینے کا طریقہ سوچ لیا۔ یا کہنا چاہیے کہ یہ کام ایڈیسن جیسے متعدد موجدوں کی لگاتار کوششوں سے پایہ تکمیل پر پہنچا۔ اس طرح انسانی ترقی اور پیش قدمی کی سرگزشت میں ایک عظیم ترین انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ اندازہ ہوتا گیا کہ آگ محض نئی قسم کے کھانے پکانے ہی کا کام نہیں دیتی بلکہ یہ سردی سے بچنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ آگ جلا کر درندوں سے بچاؤ کا بندوبست ہو سکتا ہے اور شکار کو جنگل سے باہر نکالنے کے لیے بھی آگ معاون بن سکتی ہے۔

زبان

قدیم سنگی دَور کے اوائل ہی میں ایک اور زبردست کارنامہ انجام پایا۔ یعنی زبان نشوونما پا کر انسانوں کے درمیان مبادلۂ افکار کا ذریعہ بن گئی۔ زبان کی اصل وابتدا تو ہمیں ان قلوب کے وظائف میں تلاش کرنی چاہیے، جن کے انسانی قلوب بننے کا آغاز ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ وظائف ہماری تحقیق وتفتیش کی دسترس سے باہر ہیں، چونکہ زبان ایک انسان کا ذہنی ربط وتعلق، دوسرے انسان کے ساتھ قائم کرنے کے لیے ایک مفید ذریعہ تھی، اس لیے زبان ہی کی بناء پر متفرق ومنتشر افراد چھوٹے چھوٹے گروہوں میں مرتبط ہوتے گئے۔ جیسے جیسے انسان اجتماعی ترقی کی راہ میں گامزن رہا، زبان بھی ساتھ ساتھ ارتقا واکتساب کے مراحل طے کرتی گئی۔ لیکن تحریر وکتابت کی ایجاد سے پیشتر زبان کے متعلق واضح آثار باقی ہی نہ رہ سکتے تھے۔ اور تحریر وکتابت ہزاروں سال بعد میں آئی۔ لہٰذا زبان کے بارے میں چھان بین اور تحقیق وتفتیش کے لیے ہمارے سامنے آثارِ قدیمہ کا کوئی سرمایہ موجود نہیں۔

درمیانی سنگی دَور

قدیم سنگی دور غیر محسوس طریق پر ماضی کی تاریکی میں چلا گیا اور اس کی جگہ جدید سنگی دَور نے لے لی جس میں انسان نے پالش کیے ہوئے سنگی اوزار وآلات کا استعمال شروع کر دیا۔ اس عبوری دَور کو عام طور پر درمیانی یا وسطی سنگی دَور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے دس ہزار سال پیشتر شروع ہوا اور کوئی چار ہزار سال پیشتر تک قائم رہا۔ اس دَور میں انسان چقماق اور بسالٹ کے پالش کیے ہوئے اوزار بنانے لگا۔ نیز اس نے اپنے ماحول کے وسائل سے خاصی حد تک فائدہ اٹھایا۔ فلسطین میں اس ثقافت کی نمائندگی نطوفی آثار کر رہے ہیں اور جس غار (الشقبہ) سے یہ آثار ۱۹۲۹ء میں ملے، وہ وادی نطوف میں واقع ہے، جو یروشلم کے شمال مغرب میں ہے، مس جارود نے کھدائی کرائی تھی[1]۔ بعد ازاں اس ثقافت کے آثار مغارۃ الوادی اور دوسرے مقامات سے بھی دستیاب ہے۔

نطوفی ثقافت

نطوفی ثقافت کی ابتدا وسطی سنگی دَور کے اوائل میں ہوئی اور یہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے چھ ہزار سال پیشتر تک جاری رہی باقی رہے افراد تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے قد سابقہ عہد کے افراد سے چھوٹے تھے، جسم دُبلے پتلے، ٹُھنگ اور سر گول تھے۔ گویا انھیں بربخی و سنگی

---

[1] ڈوروتھی اے، ای جارود کی رپورٹ ملاحظہ فرمایئے، جس کا عنوان ہے Excavation of a Palaeolithic Cave in Western Judaea یہ رپورٹ Palestine Exploration Fund Quarterly Statement اپریل ۱۹۲۸ء میں چھپی تھی، ص ۱۸۲-۱۸۵

نیز جارود بریٹ کی کتاب، ص ۱۱۴

دَور کے اس ڈھانچے سے زیادہ مشابہت تھی، جو بیبلوس (جُبَیل) میں دریافت ہُوا یا ان لوگوں سے زیادہ مشابہت تھی، جو بادشاہی خاندانوں کا سلسلہ باقاعدہ قائم ہونے سے پیشتر مصر میں آباد تھے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی نسل کے افراد تھے، جس نسل سے بعد کے ادوار میں حامیوں اور سامیوں کا تعلّق تھا[۱]۔ نطوفی کے دَور کے جانور تو بلاشبہہ دَور جدید کے عام نمونے کے مطابق تھے، مگر ان میں ایک نہایت اہم فرق تھا۔ غزال عام تھے، مگر چکارے کی وضع کے تھے، جو اب بہت کمیاب ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ زمین بنجر ہو گئی تھی۔ لگڑ بگڑ یا چرخ کے جسم پر گل ہوتے تھے اور ڈھانچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم آج کل صحرائے اعظم کے جنوبی حصّے ہی میں پائی جاتی ہے۔ خارپشت بھی تھا، مگر چھوٹے کانوں والے ان خارپشتوں سے بالکل جدا گانہ تھا جو آج کل پائے جاتے ہیں[۲]۔ آگے چل کر گھوڑا یا سرخ رنگ کے ہرن جیسے جانور ناپید ہو گئے۔ یہ غالباً آب و ہوا اور موسموں کے ناسازگار ہونے کا نتیجہ ہو گا، البتہ فن کاری اس زمانے میں خوب زوروں پر تھی۔ ایسی ہڈّیاں ملتی ہیں، جن پر بڑا عمدہ کام ہوا تھا اور بیل بُوٹے کندہ تھے۔ دندانہ دار پیکاں بھی خوب بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں اوزار و آلات چھوٹے اور مختصر تھے۔ اور وسطی سنگی دَور کی ثقافت کا خاصہ یہی ہے۔

جانوروں کی پرورش

کرمل کے ایک غار کی تہ سے ایک جسیم کُتّے کی قریباً مکمّل کھوپری ملی تھی[۳]۔ یہ جانوروں کی تربیت و پرورش کے متعلق سب سے پہلی شہادت بہم پہنچی ہے اور آگ کی دریافت کے بعد جانوروں کی پرورش، تہذیبی زندگی کی جانب انسان کی پیش قدمی کا دوسرا عظیم الشان اقدام تھا۔ کتّے کی پرورش اسی زمانے میں شروع ہو گئی تھی، جب انسان کا گزارہ شکار پر تھا۔ کتّا شکار میں مدد دیتا تھا۔ پالنے والے کی حفاظت بھی کرتا تھا اور چھچھڑے اور چھیچھڑیاں بھی کھاتا رہتا تھا۔ دوسری شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ مویشی کی پرورش شروع ہو گئی تھی۔ ان کے ریوڑ رکھے جاتے تھے اور گلّہ بانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ شکار کے پیچھے دوڑتے پھرنے کے بجائے زیادہ یقینی ذریعۂ خوراک مہیّا ہو جائے۔ بعدازاں اونٹ پالے جانے لگے۔ لیکن جانوروں کی تربیت سے پیشتر انسان کے لیے ـــــ لازم تھا کہ خود اپنے لیے مناسب تربیت کا سرو سامان کر لیتا۔ اریحا کے ایک پرانے معبد میں مٹّی سے بنی ہوئی جانوروں کی مورتیاں نکلی ہیں، جو بطور نذر چڑھائی گئی تھیں مثلاً گائیں، بکریاں، بھیڑیں، سؤر۔ یہ معبد حضرت مسیح علیہ السّلام سے چھ ہزار سال پیشتر کا بتایا جاتا ہے[۴]۔ جانوروں کی تربیت عموماً اس وقت شروع ہوتی رہی، جب انسان خانہ بدوشی ہی کی زندگی بسر کر رہا تھا، لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ یہ مرحلہ زراعت کے آغاز سے پہلے طے ہو چکا تھا۔ مشرقِ قریب کے اندر وسطی سنگی دَور میں جو لوگ رہتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو اتّفاقیہ جانوروں کی پرورش کا خیال آ گیا۔ ممکن ہے کسی موقع پر شکار کھیلتے ہوئے کوئی مادہ ماری گئی ہو اور بچّہ زندہ رہ گیا ہو۔ شکاری نے رحم یا محبت کی بنا پر اسے اٹھا لیا اور بچّہ نر تھا یا مادہ اس کی پرورش اپنے بچّوں کے ساتھ شروع کر دی۔ یہ تجربہ کامیاب ہُوا تو اسے دہرایا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ

---

[۱] W. F. Albright The Present State of Syro-Palestine Archaeology The Haverford Symposium on Archaeology and the Bible (New Haven, 1938) P ~.

[۲] جارود و میٹ کی کتاب، ص ۱۵۳۔

[۳] الوادی جارود و میٹ کی کتاب ص ۱۷۵ــ ۱۷۷

[۴] John Garstang and J.B.E. Garstang The Story of Jericho (London 1940) ص ۴۹، ۵۱۔

کا دائرہ پھیلتا گیا۔ جانوروں کے لیے انسان نے حفاظت کا بندوبست کر دیا اور انسان کو جانوروں سے غذا کے لیے دودھ نیز شکار اور بار برداری میں امداد ملتی رہی۔ گویا قدیم سنگی دور کا ابتدائی معاشرہ تدریجاً ترقی کر کے بلند تر حالت پر پہنچنے لگا تھا۔

زراعت

جب تک انسان کا گزارا شکار پر تھا، وہ ان وحشی جانوروں کے تعاقب میں لگا رہتا تھا، جو اس کی شکم پُری کر سکتے تھے۔ پھر وہ جانور پالنے لگا اور گلہ بانی کی منزل میں پہنچ گیا تو اگرچہ سیر و گردش کا سلسلہ بدستور باقی رہا، مگر ایک فرق آگیا، یعنی اب سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں پھرتا تھا تاکہ اپنے ریوڑوں کو چرا سکے۔ وسطی سنگی دَور میں یا جدید سنگی دَور کے اوائل میں نطوفی ثقافت نے قیام و استقرار کی زندگی کی طرف ایک اور قدم اٹھایا جس سے حیاتِ انسانی پر زیادہ پائدار اثر پڑا، یہ فنِ زراعت کا آغاز تھا۔

شام اس لحاظ سے یقیناً خوش نصیب تھا کہ یہ شریف جانوروں کا وطن تھا، جنھیں بہ آسانی پالا جا سکتا تھا۔ نیز اس مُلک میں بڑی عمدہ گھاسیں تھیں، جو جانوروں کی پرورش کے لیے بہت مفید تھیں۔ جنگلی گندم اور جو شمالی شام اور فلسطین میں خود رو ہوتے ہیں[۱] اور خیال ہے کہ ان کی غذائی حیثیت کا اندازہ ابتدا ہی میں کر لیا گیا ہوگا۔ نطوفیوں نے سنگی دَرانتیاں اور دوسرے اوزار خاصی بڑی تعداد میں چھوڑے ہیں[۲]، یہ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ خود انھوں نے، نیز شمالی شام میں ان کے معاصروں نے (مشرقِ قریب میں) سب سے پہلے کھیتی باڑی شروع کی۔ لوگ عام طور پر غاروں میں رہتے تھے، یعنی ان کی بود و باش کی وہی کیفیت تھی، جس کا ذکر اہلِ مصر کے تعلق میں ہوا ہے[۳]۔ ان کا گزارہ شکار اور ماہی گیری پر تھا۔ بعض لوگ گلّے چراتے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ کھیتی باڑی کی ابتدا بہت سادہ وضع کے کُھرپوں اور بیلچوں سے ہوئی۔ جب ایک جگہ زمین کی قوتِ نمو ختم ہو جاتی تو لوگ ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر دوسری جگہ چلے جاتے۔ قیاس یہ ہے کہ پہلا قدم شاید چھ ہزار سال سے پیشتر اٹھایا جا چکا تھا، یعنی یہ واقعہ مٹی کے برتنوں یا معدنیات کی نمود سے صدیوں پہلے کا ہونا چاہیے۔ جو انسان پہلے غذائی فراہمی کے سلسلے میں جا بجا گھومتا پھرتا تھا، وہ اب خود غذائی اجناس پیدا کرنے لگا۔ غذائی اجناس یا مشروبات کو جمع رکھنے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اس زمانے میں بھی اندر سے خالی تونبے یا چمڑے کے تھیلے استعمال کیے جاتے تھے۔ تاریخ کسی دوسری قوم یا گروہ کی مثال پیش نہیں کرتی کہ اس نے اس ابتدائی دَور میں کھیتی باڑی شروع کی۔ حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ شام سے جو سامی باشندے مصر گئے، انھوں نے وہاں گندم اور انگور کی کاشت سے مصریوں کو روشناس کرایا۔ مصرِ قدیم میں گندم کے لیے "قمح" (   ) اور انگور کے لیے "کرم" (   ) کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ بلاشبہ سامی الاصل یا کہنا چاہیے کنعانی الاصل الفاظ ہیں[۴]۔ بابل، مصر اور عہدِ حاضر کے شام کے

---

[۱] چائلڈ Childe ص ۵۴، مینی نرفیل، Les Debuts de l'agriculture et la faucille prehistorique en Palestine یہ مقالہ Journal of the Jewish Palestine Exploration Society میں شائع ہوا تھا (۱۹۳۴ء)، ۱۹۳۵ء، ص XVII

[۲] ڈی، اے، ای، جارڈ کا مقالہ بہ عنوان A New Mesolithic Industry : The Natufian of Palestine Journal Royal Anthropological Institute of Great Britain میں شائع ہوا تھا جلد ۶۲ (۱۹۳۲) ص ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۵

[۳] سٹرابو کا جغرافیہ کتاب سترھویں باب اول

[۴] ایم، آر، ہال کی کتاب The Ancient History of the Near East آٹھواں ایڈیشن نیو یارک ۱۹۳۵ ص ۸۹–۹۰

ہلوں کی تصویریں سامنے رکھی جائیں تو ان میں حیرت انگیز مشابہت نظر آئے گی (ملاحظہ ہوں تصویریں صفحہ ۴۵ پر)
ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جاسکتا کہ وسطی سنگی دور کے انسان نے نباتات کی کاشت کے ممکنات کیوں کر دریافت کیے۔ اس وقت تک غذا میں جنگلی غلّوں کا گودا شامل کیا جاتا تھا۔ ممکن ہے، جنگلی غلّے کے کچھ بیج ایک خاص وقت میں اتفاقیہ زمین پر گر گئے ہوں، پھر کسی انسان یا کہنا چاہیے، فوق الانسان نے گزشتہ سال کی قیام گاہ کے آس پاس غلّے کے پودے خوب گھنے اُگے ہوئے دیکھے ہوں اور اس طرح اس کے اُفقِ شعور پر خیال کا ایک نیا ستارہ طلوع ہُوا ہو۔ وہ انسان یقیناً بہت بلند پایہ اور عام سطح سے بہت بالا ہوگا، جس نے اپنے قبیلے کو اس امر پر آمادہ کیا کہ جنگل سے جو غلّہ جمع کیا گیا تھا، وہ سارے کا سارا خرچ نہ کیا جائے بلکہ اس کا کچھ حصّہ بچا لینا چاہیے، تاکہ اپنی مرضی سے نئی فصل اگائی جاسکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بونے کے لیے اچھے اور عمدہ بیج چُن لیے ہوں تاکہ بہتر غلہ پیدا ہو۔ گندم اور جَو کی کاشت نے دوسری جنسوں مثلاً باجرے وغیرہ کی کاشت کا دروازہ کھولا، بعد ازاں پھل ——— مثلاً زیتون، انگور، انجیر ——— اور مختلف قسم کی سبزیاں بوئی گئیں، یہ سب اجناس تاریخی دستاویزوں کے دَور سے پیشتر کاشت ہونے لگی تھیں بلکہ ان کے بیج اور پود میں خاصی اصلاح بھی ہو چکی تھی۔

قیام و استقرار کی زندگی

غلّوں، سبزیوں اور پھلوں کی کاشت انسانی ترقّی کی راہ میں جانوروں کی پرورش سے بھی بدرجہا زیادہ انقلابی پیش قدمی تھی۔ زراعت نے ترقی کی تو انسان مٹّی سے بنائی ہوئی جھونپڑیوں یا کچّی اینٹوں سے بنائے ہوئے مکانوں میں رہنے لگا۔ اریحا میں انسانوں کی یہ ابتدائی آبادی کی سطح پر زمانۂ قدیم کے مکانوں کے نشان ملے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ پانچ ہزار سال پیشتر کے ہوں گے[1]۔ بعد ازاں تل الجدیدہ[2]، راس الشمرہ[3]، اور بیبلوس[4] (جبیل) میں بھی ایسے مکانوں کے آثار دریافت ہوئے۔ اس سے پیشتر کی کسی آبادی کا کوئی نشان اب تک منکشف نہیں ہوا۔ اریحا غالباً دنیا کا وہ مقام ہے، جہاں سب سے زیادہ طویل مدّت سے مسلسل انسانی آبادی چلی آرہی ہے۔ جانوروں کے پالنے اور کھیتی باڑی کرنے کا مشغلہ مستقل طور پر اختیار کرتے ہی وسطی سنگی دَور کا انسان خانہ بدوشی کو چھوڑ کر مختلف جگہوں پر مستقلاً رہنے لگا۔ اب ضرورت کے مطابق غذا پیدا کرنے کے وسائل اسے میسر آ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس نے پہاڑوں کی بلندی پر غاروں یا چٹانوں کے سایے میں قیام کے بجائے میدانی علاقے میں بستیاں قائم کرلیں، ساتھ ہی زمین کی ملکیت کا مسئلہ سامنے آگیا جب تک انسان گھومنے پھرنے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا، کسی خاص جگہ کے ماحول میں اس کے لیے کوئی جاذبیت پیدا نہیں ہوسکتی تھی اور نہ ماحول اس میں وسیع تغیر پیدا کر سکتا تھا یا اپنا مقامی رنگ اس پر چڑھا سکتا تھا۔ اس کے تجربات میں نظم نہ تھا۔ بلکہ ہر تجربہ متفرق اور بکھرا ہُوا تھا اب ایک مقام پر مستقل قیام و استقرار کے باعث اس کے مُماثل تجربے اکٹھے ہونے لگے۔ اور زندہ ثقافتی روایات کا لباس پہن کر آس پاس کے لوگوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچنے لگے۔ اس طرح ایک جگہ جم کر بیٹھ جانے والے انسان نے محض غذائی جنسوں

---

[1] گارسٹانگ اور گارسٹانگ ص ۷، ۴۸، ۴۹ [2] یہ مقام شمالی شام میں خلیج اسکندرونہ سے قریب اور انطاکیہ سے تھوڑے فاصلے پر شمال مشرق میں تھا، اس کا قدیم نام اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔ دمشق کے ص ۲۰ پر ایک نوٹ کے سلسلے میں اس کا مزید ذکر ملے گا [3] ملاحظہ فرمائیے Claude F. Schaeffer, Ugaritica (Paris 1939)"

[4] مارس دوناں Maurice Dunand کی کتاب Fouilles de Byblos جلد اوّل مطبوعہ پیرس ۱۹۳۹ء ص ۲۹۵-۲۹۶ دوناں کے نزدیک بیبلس کی عمارتیں تین ہزار دو سو سال ق م میں بنی تھیں۔ یہ مشرق میں اور غالباً وہ لوگ تھے جو سامیوں سے پہلے وہاں آباد تھے اس کے بقربے کی بنیاد شاید چھ ہزار ق م کے نصف اوّل میں رکھی گئی۔

ہی سکے نہیں بلکہ خیالات وافکار کے ذخیرے بھی جمع کرنے شروع کر دیے۔ یوں وہ اپنے تجربات کو آئندہ نسلوں تک بہتر انداز میں پہنچانے کا اہل بن گیا۔

عقلی زندگی

اجتماعی زندگی کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کے نشوو ارتقا کے لیے ایک زبردست محرّک مہیا ہو گیا۔ ہمیں جو چیز حیرت میں ڈال دیتی ہے، یہ ہے کہ وسطی سنگی دَور کے انسانی قلوب نے کس اہتمام سے زبان کو نشوونما دی۔ مثلاً اگر دَورِ حاضر کی عربی بول چال کا مقابلہ سامی زبانوں کی ام الالسنہ سے کریں تو واضح ہو جائے گا کہ کس طرح یہ زبان تاریخی عہد سے بہت پہلے بنی، سنوری اور سلجھنی شروع ہو گئی تھی۔

وسطی سنگی دَور کی عقلی زندگی کا ایک اور اثر مذہبی زندگی ہے، یعنی انسان ایک معبود یا بہت سے معبودوں پر اعتقاد رکھتا تھا اور موت کے بعد زندگی کا بھی عقیدہ موجود تھا، اگرچہ وہ کتنا ہی خام اور عامیانہ ہو۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ مُردوں کے ساتھ مقبروں میں کھانے کے برتن اور زندگی بھی رکھی ہوئی ملیں۔ موسٹیری ثقافت میں بھی حیات بعدالموت کے متعلق مبہم عقیدے کے آثار دستیاب ہوتے ہیں۔ اب کھیتی باڑی اور جانوروں کی تربیت شروع ہوئی تو مذہب زیادہ پُرپیچ بن گیا۔ گلہ بانی کی زندگی میں لوگ غالباً چاند کی پوجا کرتے تھے اور شام و فلسطین جیسے گرم ملک میں سورج کے بجائے چاند کو زیادہ فیض رساں اور مہربان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ذریعے سے تاریکی کے خطرے زائل ہو جاتے تھے اور چاندنی کی ٹھنڈک میں گلے اور ریوڑ زیادہ آرام و راحت سے چر سکتے تھے۔ چنانچہ سورج کے مقابلے میں چاند ہی کو گلہ بانوں اور گڈریوں کا دوست اور رفیق سمجھا جاتا تھا۔ اریحا میں جو معبد چھٹے ہزار سال قبل مسیح کے اواخر میں بنا تھا۔ وہ غالباً چاند ہی کی پوجا کے لیے وقف تھا۔

زراعت اور کھیتی باڑی کی زندگی شروع ہوئی تو انسان کو یہ حقیقت ذہن نشین کرنے کا موقع ملا کہ فصلوں کی نشوونما سے سورج کو گہرا تعلق ہے۔ اس وقت سے سورج نے چاند پر برتری حاصل کر لی۔ چنانچہ سورج کی پرستش کے ساتھ دھرتی ماتا کی پوجا بھی "بارودی" کی دیوی کی شکل میں شروع ہو گئی، جس کے قبضے میں معاملاتِ زراعت تھے۔ اب مذہب میں واضح طور پر انثیت کا عنصر غالب ہو گیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عورتیں شکار کے بجائے زراعت زیادہ سہولت سے کر سکتی تھیں۔ بارودی کی دیوی کے ساتھ جو افسانے یا اعتقادی اشارتیں وابستہ ہیں اور جنھوں نے فنیقیہ میں ادونیس وعشتارہ، مصر میں اوزیرس اور ایزس کی شکل اختیار کی، ان کی ابتدا اسی دَور میں ہوئی تھی، جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ اریحا کے ابتدائی دَور کی تہذیب میں تین مورتیاں بھی ملی ہیں، جن میں سے ایک باپ کی ہے، دوسری ماں کی اور تیسری بیٹے کی۔[۵] ممکن ہے، ان کی حیثیت اشاری ہو۔ غرض ان سے ہمارے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ مسیح علیہ السّلام سے پانچ ہزار برس قبل عائلی نظام وہ صورت اختیار کر چکا تھا، جسے آگے چل کر مستقل حیثیت مل گئی۔

فنون

وسطی سنگی دَور کا انسان مذہبی نشوونما ارتقا کے ساتھ ساتھ فنی ارتقا میں بھی مشغول رہا۔ زبان کی طرح فن بھی بشریت کا ایک امتیازی وصف ہے۔ فن اس وقت پیدا ہوا تھا جب سنگی دَور کے کسی آدمی کے شعور میں تقلید و نقالی کا امکان پیدا ہوا تھا۔ اس وقت سے انسان کی رُوح نئی دنیا میں داخل ہو گئی۔ یہ خیال و جمال کی دنیا تھی۔

اپنے ابتدائی مظہر میں فن کو جادو کے ساتھ خاص ربط و تعلق تھا۔ عام قیاس کے مطابق مصوّر یا رسّام کا عقیدہ تھا کہ جس جانور کی تصویر

۵۔ گورڈن چائلڈ اور گارسٹانگ ص۵۷

بنائی جائے، اس پر اختیار و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ کوہ کرمل کے غار سے ایک ہڈی ملی ہے جس پر بیل کا سر کندہ کر دیا گیا تھا یہ وسطی سنگی دور کے کسی آدمی کا کام تھا۔ انسان جب اپنے گرد و پیش کی قوتوں سے آگاہ ہوا اور اپنی بے چارگی پر اس نے نظر ڈالی تو جادو کا ایک سلسلہ تیار کر لیا، ہڈیوں اور پتھروں پر تعویذ کندہ کر کے سحرکاری کو تقویت پہنچائی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طریقے سے کام لے کر ان چیزوں سے محفوظ ہو سکتا ہے جن سے وہ خوف زدہ تھا۔ گویا انسان کے ابتدائی عقائد میں خوف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ بعد ازاں اس نے جادو کے ذریعے سے فائدے حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے جانوروں کی تعداد بڑھ جائے، فصل کی پیداوار زیادہ ہو جائے۔ خیال یہی ہے کہ ابتدائی دور کے انسان کا مذہب عبادتِ ارواح اور جادوگری پر مبنی تھا۔ عبادتِ ارواح سے واضح ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے ماحول کی تمام چیزوں کے متعلق سمجھ لیا تھا کہ ان میں رُوح ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ جو روح خبیث ہو، اُس کی رضا جوئی مدِ نظر رکھی جائے اور جو فائدہ رساں ہو اُس کے ساتھ اپنا ربط و تعلق بڑھایا جائے۔

نطوفیوں کے کندہ کیے ہوئے پتھر اور ہڈیاں خاصی مقدار میں ملی ہیں۔ ان میں سے بہترین مورتی ہرن کے بچے کی ہے جو ہڈی سے بنائی گئی تھی بہرحال فلسطین میں فن کاری کے زیادہ سے زیادہ پرانے نمونے وہی ہیں جو اریحا سے ملے اور یہ پالتو جانوروں کی مورتیاں ہیں جو نذر کے طور پر پیش کی گئی تھیں[1]

جدید سنگی دور کی حضارت

جدید یا آخری سنگی دور چھٹے ہزار سال قبل مسیح میں شروع ہوا اور کم و بیش دو ہزار سال قائم رہا۔ اس دور میں زراعت، جانوروں کی پرورش، حضری زندگی اور پالش کیے ہوئے آلات کے استعمال میں خاصی ترقی ہوئی۔ اسی میں مٹی کے برتن بنانے کا آغاز ہوا اور دھاتیں بھی دریافت ہوئیں۔

جب انسان نے مٹی کے برتن بنانے اور انھیں پکا لینے کا فن سیکھ لیا تو اس نے حضارتی ترقی کے سلسلے میں ایک اور زبردست دریافت پایۂ تکمیل پر پہنچا دی۔ اب تونبوں اور چمڑے کے تھیلوں یا لکڑی، پتھر وغیرہ کو اندر سے چھیل چھیل یا تراش تراش کر بنائے ہوئے برتنوں کے بجائے مٹی کے برتن استعمال ہونے لگے۔ سابقہ چیزیں انسان کی اقتصادی ضرورتیں پوری کر دیتی تھیں۔ اُن پوری طرح نہیں۔ نئی ایجاد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آدمی ندی نالوں یا پانی کے دوسرے وسیلوں سے کسی قدر فاصلے پر بھی بہ سہولت زندگی بسر کرنے لگا، اس لیے کہ مٹی کے برتنوں میں پانی محفوظ ہو سکتا تھا۔ اب وہ باقاعدہ کھانا پکانے لگا۔ محض کچی یا آگ پر بھونی ہوئی چیزیں کھانے کی ضرورت نہ رہی غذائی اجناس پر قابو پا لینے کے علاوہ، اس نے غذا کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی دریافت کر لیا۔ خانہ بدوشی کی زندگی میں وہ جگہ جگہ سے خوراک اکٹھی کرتا تھا کھیتی باڑی نے اُسے غذائی اجناس پیدا کرنے کا اہل بنا دیا، اب وہ غذائی اجناس کو محفوظ کرنے لگا۔ پہلے ہر وقت اسے یہ پریشانی رہتی تھی کہ غذائی چیزوں کے حاصل کرنے میں خلل پیدا نہ ہو۔ اب اس پریشانی سے نجات مل گئی اور اسے خاصی فرصت میسر آ گئی۔ یہ فرصت زندگی کی اعلیٰ چیزوں کو ترقی دینے کے لیے حد درجہ ضروری تھی۔

گلی ظروف کی ساخت

فلسطین میں مٹی کے برتن بنانے کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اریحا میں کھدائی کرتے ہوئے خاصی نچلی سطح پر پہنچ کر

---

[1] گارسٹانگ اور گارسٹانگ ملاحظہ ہو، متن کا صفحہ ۱۵

کہ مٹی کے برتن ملے۔ گارسٹانگ کا خیال یہ ہے کہ یہ فن فلسطین ہی میں شروع ہوا[۱]۔ سب سے پہلے بڑے بڑے مٹکے بنے جو زمین کے اندر رکھے جاتے اور ان کے اندر کی طرف صاف چونے کا پتلا سا پلستر کر لیا جاتا، پھر معمولی مرتبان بننے لگے، جن کے کنارے سادہ اور تلے مسطح ہوتے۔ ان میں ایک طرف دستے لگا دیتے۔ شام میں ظروف گلی کے جو زیادہ سے زیادہ پرانے نمونے ہاتھ لگے، وہ اس حصے میں ملے، جو دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے، یعنی شمالی و مشرقی گوشہ۔ شمالی شام میں جو یک رنگے برتن ملے ہیں، وہ پانچ ہزار سال قبل مسیح میں بنے ہوں گے۔ پھر تل الجدیدہ کے منقش ظروف کا دور شروع ہو گیا[۲]، جو انطاکیہ کے شمال مشرق میں واقع ہے اور اس کی ابتدا پانچویں ہزار سال کے وسط سے ہوتی ہے۔ ان ظروف کو ابتدائی نمونے کی نقش کاریوں سے سجایا گیا تھا۔ حضارت کی اسی سطح کے ساتھ ان منقش ظروف کا تعلق ہے، جو ساکجی جینزی سے نکالے گئے[۳]۔ یہ مقام شام کے انتہائے شمال میں واقع ہے جو برتن زیادہ پرانے تھے، ان میں ایک سیاہ رنگ کا خط اندر کھدا ہوا تھا۔ بعد کے برتنوں پر گوناگوں رنگوں کے نقش بنائے جاتے تھے۔ شمالی شام کے برتنوں کے ٹکڑے مشرقی جانب سامرا تک ملے، جو دریائے دجلہ پر واقع ہے۔ قیاس ہے کہ جس چرخی یا چکّر سے ظروف ساز کام لیتے تھے۔ وہ چوتھے ہزار سال سے پیشتر ایجاد ہو چکا تھا، لیکن جنوبی فلسطین میں دو ہزار سال قبل مسیح تک اس سے ہنر مندانہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس ایجاد سے پہلے مٹی کے برتن صرف ہاتھ سے گھڑے جاتے تھے۔

پانچویں ہزار سال کے اواخر اور چوتھے ہزار سال کے اوائل میں تزیینی فنون کی ابتدائی تاریخ میں سب سے اونچا درجہ آ گیا۔ ان فنون کا مرکز یا تو شمالی شام تھا یا دوآبہ دجلہ و فرات۔ اس حضارت کو "حضارت حلف" کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ "تل حلف"[۴] سے منسوب ہے، جس کا پرانا نام "غوزان" تھا اور یہ دریائے "خابور" پر واقع ہے۔ اس حضارت کے نمونے مغربی جانب مرسین میں ملتے ہیں جو سلیشیا میں واقع ہے۔ فن کار وہ تھے جو گِل دانوں پر نقش و نگار بناتے تھے۔ انھوں نے یہ فن ٹوکریاں بنانے والوں اور قالین بُننے والوں کی نقالی میں شروع کیا۔ ساخت اور فن کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کے بنائے ہوئے برتن عہد قدیم کی ساختہ اشیاء میں بہترین تھے۔ ان برتنوں میں قاب، رکابیاں، پیالے، پیالیاں، مرتبان شامل ہیں۔ وہ مختلف رنگوں کی ہندسی شکلیں بناتے یا بیل بوٹوں سے برتنوں کو آراستہ کرتے اور کم از کم دور حاضر کے نقطۂ نگاہ سے کہا جاتا ہے کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں ان کی ہنرمندیوں کے حسن و جمال سے قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہمارے لیے یہ یقین کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی ذہنی صلاحیت اس وقت

---

۱ گارسٹانگ اور گارسٹانگ ص ۵۳-۵۴

۲ اس کی کھدائی رابرٹ جے، بریڈ وڈ Robert J. Braidwood نے کرائی تھی ملاحظہ ہو اس کی کتاب Mounds in the Plain of Antioch شکاگو ۱۹۳۷ء، ص ۷۔

۳ جان گارسٹانگ کا مقالہ Excavations at Sakje-Genzi in North Syria Annals of Archaeology لورپول یونیورسٹی جلد اول (۱۹۰۸) میں شائع ہوا۔ ص ۱۱۴-۱۱۷

۴ اس کی کھدائی Max F. von Oppenheim نے کرائی۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Der Tell Halaf جو لائپزگ سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔

۵ "تل" اس ٹیلے کو کہتے ہیں جو برباد شدہ شہروں کے ملبے سے بنا ہو۔ یہ چیز صرف مغربی ایشیا کے لیے مخصوص ہے اور دو ہزار سال ق م کے تل یہاں ملتے ہیں۔ "تل" عربی لفظ ہے جو اصلاً سومیری تھا۔ ولیم الف البرائٹ کی کتاب From the Stone Age to Christianity (مطبوعہ بالٹی مور ۱۹۴۰ء) ص ۹۸۔

سے کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان منقش برتنوں کے دور کی زیادہ تر آبادیاں، زیادہ تر باقیات اور اعلیٰ ذہنی آثار شمالی شام اور دوآبہ میں پائے گئے اور اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ مغربی ایشیا کے اندر تہذیب کا دھارا اسی خطے میں سے بہتا تھا۔ ارد گرد کے باقی خطے اس سے نسبتاً غیر متاثر تھے۔

خانہ داری کے سروسامان میں مٹی کے برتن شامل ہو جانے سے ضمناً ایک بہت مفید علمی مقصد پورا ہو گیا۔ مٹی کے برتن برباد نہیں ہوتے، اگرچہ ان کے بے شمار ٹکڑے کر دیے جائیں۔ ان کی ساخت اور آرائش میں اسی طرح وقت کا ذوق اور رواج منعکس ہوتا ہے، جس طرح ہمارے زمانے کی خواتین کے لباس سے موجودہ عہد کے ذوق اور رواج کا نقشہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ برتن جتنے بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے پائے جائیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تجارتی تعلقات کس حد تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے مٹی کے برتنوں کی چھان بین کے لیے دورِ حاضر کے علمائے تحقیق و تفتیش کے روبرو سب سے بڑی کھڑکی کھل جاتی ہے، جس میں سے جھانک کر وہ زمانۂ ماضی کے دھندلکے سے خاصی معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ معدنی اشیاء کے ذریعے سے دوسری کھڑکی کھلتی ہے۔ مٹی کے برتنوں اور معدنی چیزوں کے سہارے ہم دورِ ماقبل تاریخ سے آگے بڑھتے ہوئے تاریخ کے ابتدائی دور میں قدم رکھتے ہیں۔

تیسرا باب

دھاتوں کے اوزار

دھات کی دریافت سے صعودِ انسانی کے سفر میں ایک نئے اور خاص طور پر قابلِ توجہ مرحلے کی ابتدا ہوئی۔ اسے دھاتوں کا دَور کہتے ہیں، یعنی پتھروں کی جگہ دھاتوں نے لے لی اور تمام اوزار و آلات دھاتوں سے بننے لگے۔

برنجی و سنگی دَور

مٹی کے برتنوں کی ایجاد پر غالباً کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مغربی ایشیا میں دھاتیں دریافت کر لی گئی ہوں گی، مگر ان سے کام لینے کا سلسلہ ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک ملتوی رہا اور دھاتوں میں سب سے پہلے تانبے کا وسیع استعمال شروع ہُوا ہوگا۔ شام و فلسطین میں لوگ حضرت مسیح علیہ السلام سے قریباً چار ہزار سال پیشتر تانبے (نحاس) سے کم یا زیادہ کام لینے لگے ہوں گے لیکن اوزار و آلات کے لیے پتھر کا استعمال تین ہزار سال ق۔م تک ختم نہ ہُوا۔ اس بنا پر چوتھے ہزار سال کو برنجی و سنگی دَور کہنا مناسب ہوگا۔ اس دَور میں زیادہ ترقی یافتہ گروہ تانبا بھی استعمال کرتے تھے، لیکن عموماً پتھر سے اوزار و آلات بنتے تھے۔ اس عہد کی حضارت کے آثار ابغاریت، شمالی شام کے دوسرے مقامات، تلیلات الغسول[1] اور فلسطین کے دیگر حصّوں سے بہ کثرت ملے۔ تلیلات الغسول فلسطین کا وہ مقام ہے جہاں سے اب تک دھاتوں کے قدیم ترین اوزار ملے۔ تین ہزار سال ق۔م سے تانبے (نحاس) کا دَور شروع ہُوا، جسے غلطی سے برنجی دَور کہا جاتا ہے۔ دو ہزار سال ق۔م ادوم میں یعنی بحیرۂ لُوط کے جنوب اور مشرق میں دھاتیں خام صورت میں دریافت ہوئیں اس سے تانبے (نحاس) کی کامیابی کا دَور کمال پر پہنچ گیا۔

جدید سنگی دَور کی طرح برنجی و سنگی دَور میں بھی شمالی شام پورے مشرقِ قریب کا حضارتی مرکز بنا رہا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تانبا دریافت کیوں کر ہُوا؟ اغلب ہے کوئی شخص باہر خیمے میں ہو گا، اس نے آگ جلائی اور اسے گھیرنے کے لیے مٹی لگا دی۔ مٹی میں تانبے کے اجزاء ہوں گے۔ دوسرے روز صبح کے وقت اُس نے کوئلوں کو کریدا تو دھات کے چھوٹے چھوٹے ذرّے چمکتے نظر آئے ہوں گے۔ جدید سنگی دَور کے اس شامی کو یہ احساس کب ہو گا کہ اس طرح اس نے ایک انقلابی حرکت کے راستے پر قدم رکھ دیا ہے جو انسانی حضارت کو سنگی سطح سے اٹھا کر معدنی سطح پر لے جائے گی۔ دھاتوں کی دریافت اور ان کے خواص کے ادراک سے انسان ایک نئے دروازے پر پہنچ گیا، جو ہمارے زمانے تک قائم رہا۔ تانبے کی جگہ پیتل نے اور پیتل کی جگہ لوہے نے لی۔ برنجی دَور کے شروع ہوتے ہی ابجد ایجاد ہوئی، ساتھ ہی شام کی وہ حضارت ختم ہو گئی، جسے اس اعتبار سے ناخواندہ کہنا چاہیے کہ اس میں کتابت کا کوئی انتظام نہ تھا، اور وہ حضارت شروع

---

[1] اس کی کھدائی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء میں بائیبل کے اسقفی انسٹی ٹیوٹ Pontifical Biblical Institute نے کرائی۔ ملاحظہ ہو الیکسس میلن Alexis Mallon کی کتاب et al., Teleilat Ghassul I (روما ۱۹۳۴ء) رابرٹ کوئپل (Robert Koeppel) et. al., Teleilat Ghassul II (روما ۱۹۴۰ء)

ہوگئی جس میں لکھنے پڑھنے کا بھی انتظام تھا۔

شام سے تانبے کے بارے میں ضروری معلومات ہر سمت پہنچا دی گئیں۔ شاہی خاندانوں کا سلسلۂ حکمرانی قائم ہونے سے پیشتر یہ معلومات غالباً سامیوں کے حملے کے ساتھ مصر پہنچیں[5]۔ نینویٰ کے حلقے نے غالباً یہ معلومات اپنے مغربی ہمسائے سے حاصل کی ہوں گی[6]۔ یوں شام کا وہ حصّہ جو خلیج اسکندرونہ سے دریائے فرات کے موڑ تک پھیلا ہوا ہے، تین خصوصیّتوں کی وجہ سے بہت نمایاں حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ یعنی وہیں گندم کی کاشت شروع ہوئی، وہیں سب سے پہلے مٹّی کے برتن بنے اور وہیں دھاتیں دریافت کی گئیں۔

اس خطّے کے انسانوں نے جو باقیات چھوڑے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے تانبے سے، پھر برنج سے کام لیا۔ یہ چیزیں شروع میں آلاتِ جنگ بنانے کے لیے استعمال کی گئیں۔ بعد ازاں ان سے مقاصدِ امن کے لیے فائدہ اٹھایا گیا۔ یہ دھات کوٹنے پیٹنے میں نرم و ملائم اور آلۂ حرب کی شکل اختیار کر لینے کے بعد جسم کے اندر گھس جانے والی تھی۔ اس لیے اس کے آلہ ہائے جنگ، پتھّر کے آلوں سے بدرجہا بہتر تھے۔ مقاصدِ امن کو بھی اس دھات سے بہت فائدہ پہنچا۔ مکانوں کی تعمیر بہت بہتر ہوگئی۔ اب بڑی بڑی عمارتیں بننے لگیں۔ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکان عموماً مستطیل بنائے جاتے تھے لیکن عبادت گاہیں مدوّر ہوتی تھیں۔

غسولی حضارت

تلیلات الغسول سنگی و برنجی دَور کا شہر ہے جو بحیرہ لُوط کے شمال میں تھا۔ اس میں جتنے مکانوں کے آثار ملے، ان سے معلوم ہُوا کہ مستطیل مکان کے طویل ترین حصّے کے آگے صحن ہوتا تھا۔ دیواریں کچّی اینٹوں کی بنائی جاتی تھیں۔ ان کی بنیادیں اَن گھڑ پتھّروں کی ہوتی تھیں چھت کا طریقہ یہ کہ سرکنڈے ڈال کر اوپر مٹّی سے لیپ دیا جاتا۔ بچوں کو بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھ کر گھر کے اندر ہی دبا دیا جاتا۔ بعض مُردوں کو جلایا بھی جاتا، حالانکہ یہ طریقہ قطعاً غیر سامی تھا۔ تل الجزر کے لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک غار کو اس غرض کے لیے مخصوص کر دیا تھا کہ لوگ اپنے رفیقوں کے مُردہ جسم اس میں جلا سکیں۔ جلانا جسم کو ختم کرنے کا بڑا سہل طریقہ تھا۔ نیز اس طرح مُردے کی رُوح سے زندوں کو آزار پہنچنے کا کوئی امکان نہیں رہتا تھا۔ جن مُردوں کو جلایا نہ جاتا تھا، انھیں بڑے بڑے مرتبانوں میں اس طرح رکھ دیا جاتا، جس طرح جنین رحمِ مادر میں رہتا ہے اور فرش کھود کر ان مرتبانوں کو دفن کر دیا جاتا۔ شمالی جانب، ۲ خماریت[1] تک نیز بعد کے دور میں کرکمیش (جرابلس[2])، جزر (تل الجزر[3]) میں جدید سنگی دَور کے جتنے آثار ملے، ان کی کیفیت یہی تھی۔ جزر (تل الجزر[3]) کی کھدائی میں ایسے تابوت ملے، جو مٹّی کے تھے۔ یہ مقام

---

[5] ہال HALL ص ۹ نیز ملاحظہ ہو متن کا ص ۱۷۔

[6] غالباً جنوبی حصّے کے سومیریوں نے یہ دھات پہلے دریافت کی تھی اور انھیں عمان سے اس کے ذخیرے بہم پہنچتے تھے۔ ملاحظہ ہو حتّی کی تاریخ عرب چوتھا ایڈیشن لندن سنہ ۱۹۴۹ء ص ۳۶ نیز برٹش ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانس منٹ آف سائنس میں "سومیری تانبا" لندن سنہ ۱۹۲۹ء ص ۴۳۷ – ۴۴۱۔

[1] کلاڈ، ایف، اے شافر: Les Fouilles de Ras-Shamra facing page 110 شام جلد پانزدہم (سنہ ۱۹۳۴ء) ص ۱۱۱ – ۱۱۲ pl XI No. 2

[2] سی یونارڈ وولے C. Leonard Woolly کا مقالہ Hittite Burial Customs Annals of Archaeology and Anthropology میں شائع ہوا اور پول یونیورسٹی جلد ششم (سنہ ۱۹۱۳ء) ص ۸۸ نیز Carchemish جلد دوم لندن سنہ ۱۹۲۱ء ص ۳۹

[3] آر اے میکالسٹر R. A. Macalister. نے سنہ ۱۹۰۲ء تک کھدائی کرائی۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب The Excavation of Gezer تین جلدوں میں لندن (سنہ ۱۹۱۲ء)

موجودہ عہد کے اریحا سے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ آثار بھی ابتدائی دور ہی کے تھے۔ جزر کے آثار کو بغور دیکھنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ غاروں میں رہنے والے مکان بنا کر رہنے لگے تھے۔ بعد میں جو گاؤں آباد ہوئے، اُن کے ارد گرد کچی فصیلوں کے نشان دیکھے گئے۔ ان کے بنانے کی غرض یہ تھی کہ لوگ دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ برنجی دور کے دوسرے دیہات میں بھی ایسی فصیلیں ملیں۔ یہی زمانہ ہے جس میں شہروں کی حفاظت کے لیے استحکامات کا آغاز ہوا۔ جزر کے ایک غار میں ایک جلی ہوئی میت کے ساتھ مٹی کے برتن بھی رکھ دیے گئے تھے، جن میں کھانے اور پینے کا سامان تھا[1]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مُردوں سے موت کے بعد دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔

جزر کی عبادت گاہ کے نیچے سے ہڈیوں کا ایک بہت بڑا انبار نکلا۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خنزیر کو قربانی کے لیے ترجیح دی جاتی تھی اور فلسطین میں خنزیر کو پہلے پالنے لگے تھے۔ چونکہ خنزیر کو قربانی کے لیے ترجیح دی جاتی تھی، اس وجہ سے ابتدائی فلسطینیوں کے دشمن اور جانشین یعنی سامی خنزیر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے[2]۔ جزر میں انگور اور زیتون کی کاشت ہوتی تھی۔ پھر ان پھلوں کو ایک گڑھے میں ڈال کر اسے پاؤں سے دباتے۔ جو رس نکلتا، وہ ایک طرف سے بہ کر ایک گول گڑھے میں جا گرتا، جس کی سطح پہلے گڑھے کی سطح سے نیچی ہوتی[3]۔ پھلوں کا رس نکالنے کے لیے اس قسم کے سادہ سنگی شکنجے دوسرے مقامات پر بھی ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگور اور زیتون بحیرۂ روم کے طاس میں خود رو تھے۔ اس طاس کے مشرقی حصے میں سب سے پہلے ان کی کاشت شروع ہوئی اور اسے بکثرت پھیلا دیا گیا۔ وہاں سے یہ پھل تجارت اور آبادکاری کے ذریعے سے مغرب میں منتقل ہوئے۔ انجیر کے متعلق یہی صورت پیش آئی۔ زیتون، زیتون کا تیل، انگور، انجیر، گندم اور جو آج تک اہل شام کی خاص غذائی جنسیں ہیں۔ فلسطین جیسے ملک میں، جس کا ساحل زیادہ زرخیز نہیں، گندم کے بجائے جو کی پیداوار کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ چین کے گیہوں بھی مشرق قریب کے گیہوں جیسے ہوتے ہیں، نیز معلوم ہوتا ہے کہ چین کے بیلوں یا بھیڑوں کی ابتدائی نسل بھی مشرق قریب ہی سے گئی ہوگی[4]۔

عسولی نمونے کے دوسرے بلاد میں بھی کھدائی ہوئی، جن کا تعلق برنجی و سنگی دور سے تھا۔ مثلاً اریحا، مجدو (تل المتسلم) عفولہ، بیت شان (بیسان) لاکیش (تل الدوائر) ام غاریت اور بیبلوس۔ فلسطین کی عسولی حضارت شمالی شام اور دوآبہ دجلہ و فرات کی حلفی حضارت سے مشابہ ہے، اگرچہ یہ تھوڑی دیر بعد شروع ہوئی۔

آبیاری کے ذریعے سے زراعت

اس اثنا میں زراعت اور مویشی کی پرورش کے لیے ایک نیا محرک پیدا ہوا۔ بیل، بھیڑ اور بکری کی پرورش جدید سنگی دور میں شروع ہو چکی تھی، اب یہ پرورش بہت وسیع پیمانے پر پھیل گئی، جیسا کہ مٹی سے ان کی شکلیں بنائی ہوئی جا بجا ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ جن جانوروں کی پرورش عام تھی، وہ سؤر اور فاختہ تھے۔ متاخر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاختہ کو اس دیوی سے گہرا تعلق تھا جسے ماں کہا جاتا تھا۔ دا لتہ الأم، یعنی زندگی اور بارآوری کی نمائندہ دیوی۔ برنجی و سنگی دور کی قریباً تمام بستیاں یا تو دریاؤں کے کنارے آباد ہوئی تھیں یا ان میدانوں میں واقع تھیں، جن میں سیلاب آتے رہتے تھے۔ گویا ان کی کھیتی باڑی کا انحصار آبیاری پر تھا۔ برنجی و سنگی دور کی حضارت میں شعبہ زراعت

---

[1] میکالسٹر جلد اول ص ۱۰۷، نیز ص ۲۸۵ [2] ایضاً جلد دوم ۳۷۹ - ۳۸۰ [3] ایضاً - ایضاً ص ۹۴

[4] کارل ڈبلیو بشپ Carl W. Bishop کا مقالہ The Beginning of Civilization in Eastern Asia جو امریکن اورینٹل سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا، جلد دسمبر ۱۹۳۹

کے اندر جو کارنامہ انجام پایا، وہ آبیاری کا تھا۔ اس طرح بہت سی سبزیاں اور ترکاریوں کی کاشت شروع ہو گئی مثلاً سلاد، پیاز، لسن، چنا، باقلا وغیرہ۔ غذاؤں کی کیفیت و کمیت میں اس اضافے کا نتیجہ یہ ہوا کہ برنجی و سنگی دور کے آخری حصے میں متوسط انسانی قد میں اضافہ ہو گیا۔

نسلی روابط

اس زمانے میں ان متفرق بستیوں کی نسلی ترکیب واضح نہیں، اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ آبادیوں میں غلبہ سامیوں کو حاصل نہ تھا، جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا، سامی نسل کے لوگ ابھی شمالی و جنوبی شام میں پہنچے نہیں تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ ان کی آمد برنجی و سنگی دور کے خاتمے کے قریب ہوئی۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں یہاں آباد تھے، اسی نسل سے تھے، جس سے بعد میں سامی اور حامی الگ ہوئے۔ جنوب میں جزر سے جو ڈھانچے ملے، ان کی چھان بین سے واضح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا تعلق اس گروہ سے تھا، جسے عام طور پر ارمنی عائلہ کہا جاتا ہے[1]۔ شمال میں کرکمیش اور ساکجی غوزی سے جو آثار قدیمہ برآمد ہوئے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورے سنگی و برنجی دور میں یہاں انھیں لوگوں کا زور رہا، جو ارمنی نمونے سے متصل تھے۔ اس کی توثیق یوں بھی ہوتی ہے کہ شمالی اور وسطی شام کی ابتدائی آبادیوں کے ناموں پر غور کیا جائے تو سامی زبان کی کسی شاخ سے ان کا تعلق ثابت نہیں ہوتا اور ان آبادیوں میں دمشق و تدمر[2] بھی شامل ہیں، ممکن ہے یہ نام سامی دور سے پیشتر کے ہوں اور بدستور باقی رہ گئے۔ ارمنی شاخ کو الپیوں کی مشرقی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ناک اونچی اور بھاری ہوتی ہے، کھوپری چھوٹی۔ عہد قدیم کے حوری اور ہندی یورپیوں سے پیشتر کے افراد اور عہدِ حاضر کے ارمن اور یہودی اسی گروہ کے نمائندے ہیں۔ بعد میں دوسری نسلوں سے بھی اس گروہ کا اختلاط ہوا، مثلاً حتیوں سے، مگر اب بھی یہ لوگ اپنے مخصوص خط و خال کی وجہ سے پورے ملک میں ممتاز ہیں۔

اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہاں مختلف آبادیوں کے درمیان امتزاج ہوا، لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ اس زمانے میں زمین پر جامیوں کی کوئی نسل آباد تھی[3]۔ بلا شبہہ جابجا غاروں میں ایسے مقبرے ملے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی سوفٹ لمبے ہیں اور قبروں پر ایسی عمارتیں بھی ملی ہیں جنھیں "دولمن" کہتے تھے، یہ بڑے بڑے اَن گھڑ پتھروں سے بنائی گئی تھیں اور ان کی بنیاد گول رکھی گئی تھی۔ غالباً ایسے ہی آثار دیکھ کر آنے والوں کے دل میں افسانہ طرازیوں کا خیال پیدا ہوا۔ جن انسانوں کا تعلق "بنی عناق[4]" اور عمالقہ سے ہے وہ تو عربی اور اسلامی ادب میں مستقل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ فلسطین کے جس ضلع سے جالوت[5] کا تعلق تھا، اس کے ایک شہر کا نام بیت جبرین (عبرانی میں بیت جبرین اعاجس کے معنی ہیں "جابروں کا وطن")!

---

[1] میکالسٹر جلد اول ص ۵۸، ۵۹۔

[2] اس کا ذکر آگے آئے گا

[3] کتاب پیدائش باب ۶ آیت ۴

[4] گنتی باب ۱۳۔ آیت ۳۳۔ بائبل میں یہ نام یونہی آیا ہے۔ ہمارے ادب میں عناق کو عام طور پر عنق کہا جاتا ہے۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ صحیح عوق ہے، ایک بیٹے کا نام عُوج تھا جسے بہت طویل القامت بتایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی عمر بھی ۳½ ہزار سال کی تھی۔ بائبل میں ان لوگوں کو "جبابر" کہا گیا ہے۔

[5] جالوت کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے، یہ بڑا شہ زور تھا۔ اور بنی اسرائیل کو اس نے بُری طرح شکستیں دی تھیں، بلکہ تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گیا تھا، جس میں انبیائے کرام کے آثار تھے۔ طالوت نے اس سے جنگ کی، حضرت داؤد نے اسے مارا۔

"دولمن" اب تک شرقِ اُردن، نیز فلسطین کے پہاڑی حصّوں، شام کی سطحِ مرتفع اور ایشیائے کوچک میں موجود ہیں، بعض بڑے بڑے غاروں پر معدنی اوزار و آلات کے نشان نیز شرقِ اُردن کے ایک "دولمن" کی کھدائی سے[1] تانبے کے جو چھلّے برآمد ہوئے، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا تعلق برنجی و سنگی دور سے ہے۔ ان میں سے قدیم ترین دولمن سرزمین کنعان سے ملتے ہیں اور ان کی تاریخِ تعمیر جدید سنگی دَور تک جاتی ہے، یعنی پانچ ہزار سال پیشتر۔ مغربی یورپ میں بڑے بڑے ان گھڑ پتھروں کی عمارتوں کے جو آثار ملے ہیں وہ ایک ہزار سال یا اس سے زیادہ دیر بعد کے ہیں، وہاں بھی ان عمارتوں نے ایسے ہی بے سروپا افسانوں کے لیے گنجائش پیدا کر دی کہ تاریخ سے پیشتر کے دَور میں بڑے جسیم و طویل القامت افراد آباد تھے۔

جمالیاتی نشو و ارتقا

معدنیات کی دریافت کے بعد فنون نے عموماً اور فنونِ لطیفہ نے خصوصاً بہت ترقی کی، مُہریں، جواہرات کی چیزیں اور تانبے کے برتن اس زمانے سے بہ کثرت استعمال ہونے لگے۔ ان کی فنّی حیثیت بہت بہتر ہو گئی۔ سنگ تراشی کا آغاز تو وسطی سنگی دَور میں ہو گیا تھا اب اُسے بڑے اُونچے پیمانے پر پہنچا دیا گیا۔ مجدو میں برنجی و سنگی دَور کی سطح پر فرش کے جو پتھر ملے، ان پر آدمیوں اور جانوروں کی تصویریں بنائی گئی تھیں[2]۔ گھروں کے اندر آرائش کے یہ سب سے ابتدائی نمونے تھے، جو دستیاب ہوئے، تاہم مٹی کے برتنوں کی آرائش میں اربابِ فن کے لیے اپنی صلاحیتوں کی نمائش کا بڑا اچھا موقع تھا، چوتھے ہزار سال کے اختتام تک شیشوں پر نقاشی کا فن شمالی شام سے کریٹ کے ابتدائی دِنوں اور مصری فن کاروں تک پہنچ گیا تھا، مصر کے اندر اس زمانے میں حکمران خاندانوں کے سلسلے کا ابتدائی دَور تھا۔ ابیدوس میں ابتدائی فراعنہ مصر کی قبروں سے ایسے گلدان ملے ہیں جن پر شمالی شام کے انداز میں مجلّٰی نقاشی کی گئی تھی اور یہ غالباً باہر سے منگوائے گئے تھے تل الجدیدہ (شمالی شام) سے تانبے کی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ملی ہیں۔ ان میں ایک مورتی دیوتا کی اور ایک بارودی کی دیوی کی بھی تھی[3] سمجھا جاتا ہے کہ دھات میں انسانی شکل کی یہ سب سے پہلی مورتیاں تھیں جو اب تک دریافت ہوئی ہیں۔

معدنیات کی چیزیں بنانے اور ظروفِ گِلی پر نقش و نگار کرنے کے فن نے برنجی و سنگی دَور کے اواخر اور نحاسی دَور کے اوائل میں ترقی کر لی تو اس سے مختلف پیشے پیدا ہوئے۔ دیہات و قصبات میں کاروباری روابط بڑھ گئے اور مختلف فنون میں مزدوروں کی حیثیتِ اختصاص بہت بلند ہو گئی۔ میدانوں اور وادیوں میں، نیز ان مقامات پر جنھیں آبادی کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے۔ تجارت نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی۔ ایک طرف شام، فلسطین اور لبنان کے درمیان، دوسری طرف بابل و مصر کے درمیان تجارتی اور حضارتی روابط بہت وسیع ہو گئے اور یہ امر ان سرزمینوں کی آئندہ زندگی میں اوّلین اہمیت اختیار کر گیا، مشرقِ قریب میں زندگی کی حرکت بہت تیز ہو گئی، جس طرح بھاپ اور بجلی کی دریافت سے دَورِ حاضر میں زندگی کی حرکت تیز ہوئی۔ اب صرف ایک بڑی ایجاد کا ذکر باقی رہ گیا ہے،

---

[1] Gottlieb Schumacher کی کتاب Northern Ajlun (لندن ۱۸۹۰ء) ص ۱۰۶

[2] Millar Burrows کی کتاب What Mean These Stones (نیوہیون ۱۹۴۱ء) ص ۸۸، نیز Chester C. McCown کی کتاب The Ladder of Progress in Palestine نیویارک ۱۹۴۳ء، ص ۶۱ – ۶۳

[3] یہ مورتیاں اب شکاگو یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں ہیں۔ اس یونیورسٹی کی Handbook and Museum Guide ملاحظہ کیجیے مطبوعہ شکاگو ۱۹۴۱ء ص ۴۵۔

یعنی کتابت، اس کے بعد ہم اس دَور میں داخل ہو جائیں گے، جو تاریخ کی پوری روشنی میں آچکا ہے۔ سب سے پہلی تحریری دستاویزیں سومیر سے برآمد ہوئیں اور قریباً ساڑھے تین ہزار سال ق، م کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی دوآبہ سے کتابت کا فن شمالی شام میں پھیلا۔ تیسرے ہزار سال کے ابتدائی زمانے میں یہ خاصی ترقی کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ کا آغاز ہو گیا، لیکن شام کی زندگی میں تاریخی دَور کے ظہور کا بیان شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین کی سرگزشت کی ایک جھلک دیکھ لیں، جس نے تاریخی وقائع کے لیے سٹیج کا کام دیا۔

چوتھا باب

سطح کی آراستگی

شام کے جغرافیائی احوال کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں نشیبی خطّے اور سطوحِ مرتفع برابر برابر شمال سے جنوب کی سمت چلی جارہی ہیں۔ سمندر اور صحرا کے درمیان طولاً پانچ ایسے خطّوں کو الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔

ساحلی میدان

مغربی سمت میں پہلا خطّہ وہ ہے، جسے ساحلی میدان کہنا چاہیے۔ یہ خطّہ بحیرۂ روم کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ جزیرہ نمائے سینا سے خلیج اسکندرونہ (قدیم اسّوس) تک چلا جارہا ہے۔ اسے ایک طرف سمندر نے اور دوسری طرف پہاڑوں نے دبا رکھا ہے۔ اس کے شمالی اور جنوبی حصّے ذرا چوڑے ہیں، لیکن لبنان پہنچ کر یہ محض ایک پتلی سی پٹی رہ جاتا ہے۔ یہاں اس کی چوڑائی کہیں بھی چار میل سے زیادہ نہ ہوگی، حالانکہ عسقلان[1] میں یہ کم و بیش بیس میل عریض ہے۔ ساحلی علاقے سے سطح بعض اوقات ایک دم بہت بلند ہو جاتی ہے، مثلاً بیروت کے شمال میں جونیہ ایک مقام ہے، جہاں میدان صرف ایک میل چوڑا ہے۔ پھر پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن کیسا سلسلہ؟ جو چار میل کے اندر اندر اڑھائی ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ تین میل جنوب میں نہر الکلب کے دہانے پر پہاڑی چٹانیں سمندر کے اندر چلی گئی ہیں۔ اس طرح اہلِ ملک کے لیے ایک اہم جنگی موقع پیدا ہو گیا ہے، جہاں بیٹھ کر وہ دشمن کے لشکروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ کوہ کرمل پر میدان بالکل غائب ہو گیا ہے، صرف ایک گزرگاہ سی باقی رہ گئی ہے، جو بہ مشکل دو سو گز چوڑی ہوگی۔ اس کی سطح میں سمندر کے بجائے خشکی کی جانب جھکاؤ ہے۔ قدیم زمانے کی یہ وہ بین الاقوامی شاہراہ تھی، جو مصر سے شروع ہو کر ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب جاتی تھی۔

ساحلی میدان کا زیادہ تر حصّہ اس وقت پیدا ہوا، جب سمندر کی تہ ارضیات کے دورِ ثالث میں اوپر اٹھ آئی۔ اس میں کھریا مٹی کے جو اجزا تھے، وہ اطرافِ سلسلۂ کوہ سے بہنے والے پانیوں نے کھینچ کھینچ کر جا بجا پھیلا دیے۔ بیروت کے اردگرد جو ریت کی تہ نظر آتی ہے، یہ بحیرۂ روم کی موجوں نے چھوڑی تھی، اور بحیرۂ روم نے یہ ریت دریائے نیل سے لی تھی۔ اس طرح کہیں سمندر کے کنارے ریت بچھ گئی اور کہیں پانی کے ذخیرے جمع ہو گئے۔ اسی وجہ سے ساحلی زمین حد درجہ زرخیز ہے۔ میدان سے ملے ہوئے پہاڑی علاقوں سے جو ندیاں نالے بہتے ہوئے آتے ہیں، ان کی وجہ سے اس علاقے کی آبیاری کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کے جنوب میں صارونہ اور فلسطینہ کے میدان ہیں۔

---

[1] پرانا شہر ہے، جو غزہ (فلسطین) سے کسی قدر شمال میں ہے۔ غزہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر دو ڈھائی گھنٹے میں بہ آسانی عسقلان پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ریل میں جائیں تو غزہ اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن مجدل آتا ہے، مجدل سے عسقلان تھوڑے فاصلے پر ہے۔

یہیں سے فلسطین نام پایا گیا، شمال میں نصیریہ کا ساحل ہے اور وسط میں ساحل لبنان۔

ساحل پورے کا پورا دنیا کے سب سے زیادہ سیدھے ساحلوں میں سے ہے، شمال میں خلیج اسکندرونہ[1] کے سوا اس میں نہ کوئی گہرا دھانہ اور نہ کوئی خلیج ہے، اسکندرونہ سے مصر تک ساحل کی لمبائی چار سو چالیس میل ہو گی۔ اس میں مشکل سے کوئی قابل ذکر بندرگاہ ملے گی۔

مغربی سلسلۂ کوہ

شام کے ساحلی میدان کے اوپر پہاڑیوں اور سطح مرتفع کا ایک سلسلہ اٹھا ہوا ہے، جو شمال میں امانوس سے شروع ہوا ہے اور جنوب میں جزیرہ نمائے سینا کے بلند اور گنجان کوہستان تک چلا گیا ہے۔ اس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت مغربی لبنان کو حاصل ہے جو حقیقی معنی میں لبنان ہے۔ اگر لبنان کو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ فرض کر لیا جائے تو اس پر گوشت پوست کی حقیقت اس پاس کے میدانوں اور نشیبی خطوں کو حاصل ہے۔ یہ دوسرا طویل خطہ ہے، جو شمالاً جنوباً چلا گیا ہے۔ سمندر اور اندرونی زمین کے درمیان آمد و رفت میں یہ پہلی روک ہے اور ایسی روک ہے جس سے بچ کر نکلنے کے دو راستے ہیں اور یہ شمالی و جنوبی سروں پر واقع ہیں۔ ایک خلیج اسکندرونہ کے پاس سے شمالی شام کے پہاڑی علاقے کو قطع کرتا ہوا دو آبہ دجلہ و فرات کے میدان کی طرف نکل جاتا ہے، دوسرا خلیج عقبہ کے پاس ہے۔ اس میں سے ہوتے ہوئے بحیرۂ قلزم یا صحرائے عرب میں چلے جاتے ہیں۔ ان دو سروں کے درمیان صرف تین راستوں سے پہاڑی خطا کو عبور کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نہر الکبیر کی وادی میں سے جو طرابلس الشام کے شمال میں واقع ہے۔ اس دریا کا پرانا نام ایلیوتھروس[2] تھا

۲۔ میدان جزریل[3] سے جو عکہ کے مشرق میں ہے۔ اس کا موجودہ نام مرج ابن عامر ہے۔

۳۔ حیفا سے

طارس[4] کا سلسلۂ کوہ شام کو ایشیائے کوچک سے جدا کرتا ہے۔ اسی کی ایک شاخ امانوس[5] ہے، جو بظاہر اس لیے آگے بڑھ آئی ہے کہ جنوبی سمت میں شامی سلسلۂ کوہ سے مل جائے۔ یہ شاخ خلیج اسکندرونہ کے گرد چکر لگاتی ہوئی شام اور سیلیشیا[6] کے درمیان روک بن گئی ہے اور اس کی بلندی پانچ ہزار فٹ تک جا پہنچی ہے۔ نہر العاص نے جس کا پرانا نام اورنٹس[7] تھا، امانوس کے جنوبی حصے کو قطع کر دیا ہے تاکہ سمندر تک راستہ پیدا کر لے۔ اسی پہاڑ میں سے انطاکیہ اور حلب کی سڑکیں گزری ہیں، اس کا سب سے بڑا درہ بیلان[8] ہے، جو "باب الشام" کے نام سے مشہور ہے، امانوس چونے کی چٹانوں سے بنا ہے اور لبنان کے پہاڑ آتش فشاں معلوم ہوتے ہیں۔ اسکندرونہ

---

[1] موجودہ سنجاق (ضلع) اسکندرونہ کو جس میں انطاکیہ بھی شامل ہے، شام کی حکمران طاقت، یعنی فرانس نے ۱۹۳۹ء میں ترکی کے حوالے کر دیا تھا، برطانیہ بھی اس پر راضی تھا۔ یہ واقعہ دوسری عالمی جنگ کے آغاز پر پیش آیا تھا۔

[2] Eleutherus [3] انگریزی نام Esdraelon اور بائیبل کا نام جزریل ہے۔

[4] عربی میں اسے جبل اللکام کہتے ہیں۔ یہ نام "اکار" یعنی "سیاہ" سے آیا ہے، ترکی میں اس کا نام "گبر داغ" ہے (غیر مومنوں، یعنی مسیحیوں کا پہاڑ) یہ سلسلہ کو مدت تک مسلمانوں اور بزنطینیوں کے درمیان حد فاصل رہا۔

[5] Amanus [6] Cilicia [7] orontes [8] Baylan

کے قریب یہ پہاڑ خم بر خم اور پیچ بر پیچ ہو گئے ہیں، ان میں کروم بکثرت موجود ہے اور اس دھات سے ترکی کے پہاڑ خوب مالا مال ہیں[۱]۔

یہ سلسلہ نہر العاصی کے دھانے سے جنوب کی سمت بھی چلا جارہا ہے، اسے جبل الاقرع کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں اس کا نام جبل کاسیس[۲] تھا، یہ پہاڑ کوئی ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہوگا اور لاذقیہ[۳] کے قریب تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں اس کا نام جبال النصیریہ[۴] ہے۔ غرض نہر الکبیر پر پہنچ کر اس کا سلسلہ ٹوٹتا ہے[۵]۔ یہ دریا جو جبال النصیریہ سے نکلتا ہے، اس پہاڑی سلسلے اور لبنان کے درمیان حدِّ فاصل ہے، نیز یہ موجودہ شام اور لبنان کے درمیان بھی حدِ فاصل ہے۔ نصیریہ سلسلے کے پتھر بھی اصلاً چونے کے ہیں۔ بیچ بیچ میں بسالت (گہرا سبز یا بادامی رنگ کا آتش انگیز پتھر) بھی کہیں پایا جاتا ہے[۶]۔ اس کی عام وضع و ہئیت بہت سادہ ہے، لیکن اس میں بہت سی گہری وادیاں، اونچے نیچے اور ناہموار نالے نیز بہت سی ڈھلوان چٹانیں ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں یہاں حشیشین رہتے تھے اور انھوں نے مستحکم قلعے بنا لیے تھے، مسلمانوں کے ایک فرقے نصیریہ کی بھی یہ پہاڑ پناہ گاہ تھے۔ بعض پہاڑیوں پر اب تک پرانے صلیبی قلعوں کے مرعوب کُن کھنڈر نظر آتے ہیں۔

لبنان

مغربی سلسلۂ کوہ لبنان پہنچ کر بہت بلند ہو جاتا ہے اور یہ نہر الکبیر سے قاسمیہ[۷] تک پھیلا ہوا ہے جو صور کے شمال میں ہے۔ نہر الکبیر سے قاسمیہ تک فاصلہ ایک سو پانچ میل ہے۔ لبنان نام کی اصل سامی ہے، یعنی "لابن" جس کے معنی "سفید" کے ہیں۔ چونکہ لبنان کے پہاڑوں پر برف پڑی رہتی تھی، جو آج کل بھی چھ مہینے تک اس کی چوٹیوں کو چھپائے رکھتی ہے، اس لیے لبنان نام پڑ گیا۔ لبنان کی سب سے اونچی چوٹی "القرنتہ السوداء" (کالا کونا) گیارہ ہزار چوبیس فٹ بلند ہے۔ اس کے پاس ہی "ضہر القضیب" ہے، جو کوئی ایک سو فٹ کم ہوگی۔ دیودار کے قدیم درختوں میں سے سب سے بڑا جھنڈ اسی پہاڑ کی آغوش میں ہے۔ ایک اور عالیشان چوٹی "صنین" ہے، جو بیروت اور خلیج مار جرجیس کے اوپر بلند ہے۔ اس کی اونچائی "ضہر القضیب" سے بھی ایک سو فٹ کم سمجھنی چاہیے۔

دیوداروں کا جھنڈ ایک بیضوی حلقے میں ہے۔ ماہرینِ ارضیات کا خیال ہے کہ یہ حلقہ قدیم زمانے کی کسی برفانی چٹان کا آخری حصہ ہے[۸]۔ برفانی دور میں شمالی یورپ، نیز امریکہ تا بہ نیویارک برف کی تہوں میں دبے ہوئے تھے، لیکن وہ انجمادی آب و ہوا شام تک

---

[۱] Max Blanchenborn کی کتاب Handbuch der regionalen Geologic جلد پنجم حصہ چہارم یعنی شام و دوآبہ دجلہ وفرات (مطبوعہ ہائیڈل برگ ۱۹۱۴ء) ص ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۲۹۔ نیز ایلفرڈ، ای، ڈسے کی کتاب Geology of Lebanon مطبوعہ بیروت ۱۹۳۰ء ص ۳۰۔

[۲] Casius [۳] Loadicea [۴] Bargylus پلنی Natural History کتاب پنجم باب ۱۷ پیراگراف ۲۰

[۵] دسویں صدی کا عرب جغرافیہ دان الاصطخری صاحب مسالک الممالک (ایڈیشن مُرتبہ گوئیے مطبوعہ لائیڈن ۱۸۷۰ء) ص ۵۵ میں لکھتا ہے کہ جبل لکّام جنوب میں لاذقیہ تک چلا گیا ہے اور جبال النصیریہ کو وہ "بہرا" بتاتا ہے۔ ملاحظہ ہو: رینی دساڈ Dussaud کی کتاب Topographic historique de la Syrie antique et medievale مطبوعہ پیرس ۱۹۲۷ء ص ۱۴۶۔

[۶] لوئی دوبرترت Dubertret کی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۹۳۳ء جلد اول ص ۲۳، ۲۴

[۷] آگے دیکھیے متن کا ص ۳۹

[۸] جی زومفن Jurassic Geologie du Liban مطبوعہ پیرس ۱۹۲۶ء ص ۱۵۲، ۱۵۳، نیز ڈسے ص ۲۱

نہیں پہنچی تھی۔ تاہم اس عہد میں برودت کا اثر یہاں آ پہنچا تھا اور مقامی طور پر کہیں کہیں برف کے بڑے بڑے تول فراہم ہوتے گئے تھے۔ برفانی دور میں برف کے یہاں تک آ پہنچنے سے بھی زیادہ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس دور میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ انسان اس وقت موجود تھے۔ خیال یہ ہے کہ برفانی دور آتے، پھر موسم ذرا گرم ہو جاتا اور برف پگھل جاتی۔ ایسے ہی کسی دور میں آدمی یورپ کے اندر نمودار ہوئے۔ اگر پہلے نہیں تو کم از کم اسی زمانے میں شام، نیز شرق قریب کے دوسرے ملکوں میں انسان کا ظہور ہوا۔

ماہرینِ ارضیات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس سے ہزاروں سال پیشتر بحیرۂ روم کے پانیوں نے پورے شام کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کو بھی چھپا رکھا تھا اور ان کی آخری حد شمالی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جسے ارضیات کی اصطلاح میں چونے اور کھریا مٹی کا زمانہ (JURASSIC)[1] کہا جاتا ہے۔ بحیرۂ روم کے پھیلاؤ کے باعث مدت تک یہ علاقے زیرِ آب رہے۔ اس زمانے میں شمالی اور جنوبی براعظموں کی مٹی کے اجزا گھل گھل کر سطح پر جمتے گئے۔ اس طرح چونے کی چٹانیں وجود میں آئیں، جن کی ایک مثال شام کا مغربی سلسلۂ کوہ پیش کرتا ہے۔ کھریا مٹی کے زمانے کے بعد وہ زمانہ آیا، جسے ارضیات میں دورِ ثالث کہا جاتا ہے۔ اس میں زمین کے اندر وسیع تغیرات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے بحیرۂ روم کے پھیلاؤ میں بہت کمی واقع ہوئی۔ زمین کی سطح اوپر اٹھ آئی۔ یوں جبال النصیریہ، لبنانِ غربی، لبنانِ شرقی، یہودیہ کی سطح مرتفع اور صحرائے عرب کی سطح مرتفع نمایاں ہو گئی۔ جانوروں کے جو پنجر گاد، یعنی تہ نشیں ریت میں دب گئے اور متحجر ہو گئے، ان سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ تہ نشین ریت کے فراہم ہونے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ متحجر مچھلیوں کے پنجر جن مقامات سے ملے، ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں۔

۱۔ ساحل علما جو جونیہ کے قریب ہے

۲۔ حاقل، جو جبیل یعنی دورِ قدیم کے بیبلوس سے اوپر ہے۔[2]

متحجر مچھلیوں کا واضح ذکر ادبیات میں دو جگہ ملتا ہے۔ اول ایک صلیبی جنگجو کی کتاب سوانح میں (۱۲۴۸ء) جس میں[3] صیدا کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ دوم، دو صدی پیشتر البیرونی میں۔ آخری کتاب میں[4] بحیرۂ قزوین کے جنوبی و مشرقی حصے کا ذکر تھا۔

لبنانی چٹانوں کی تین تہیں ہیں: نیچے چونے کی، اوپر چونے کے پتھر کی اور بیچ میں ریت کے پتھر کی۔ بالائی تہ سے پہاڑوں کی چوٹیاں بنی ہیں۔ اور اس تہ کی موٹائی چند سو فٹ سے پانچ ہزار فٹ تک ہے۔ زیریں تہ کہیں نظر نہیں آتی کہ اس کی موٹائی کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ یہ تہ گہری وادیوں کی سطح ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسراوان میں چار ہزار فٹ، رقومات میں (صیدا کے مشرق میں جزین کے قریب دو توام چوٹیاں) سات ہزار فٹ اور جبل حرمون کے پاس نو ہزار فٹ موٹی ہے۔ لبنان غربی و لبنانِ شرقی دونوں میں چونے کے پتھر کی زیریں تہ کے اندر خام لوہے کے ڈھیلے بہت پائے جاتے ہیں اور جہاں جہاں یہ تہ اوپر آ گئی ہے، ڈھیلے صاف نظر آتے ہیں۔ انھیں زمانۂ حال تک

---

[1] یہ انگریزی نام جبال جورو Jura سے ماخوذ ہے، یعنی وہ پہاڑ جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان ہیں، ان کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔

[2] زموفن ص ۱۳۷-۱۴۱۔

[3] جائن ول Joinville کی کتاب Histoire de Saint Louis (مطبوعہ پیرس ۱۸۷۴ء)

[4] ملاحظہ ہو صنعۃ المعمور مرتبہ اے ذکی ولیدی توکان (نئی دہلی ۱۹۴۱ء) ص ۵۶۔

معمولی بھٹیوں میں تپا تپا کر نکلتے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی وجہ سے لبنان میں درخت زیادہ نہیں پائے جاتے جیسا کہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

چونے کے پتھر کی بالائی تہ ہر دور میں لبنانی منظر پر فائق رہی۔ اس کے بادامی رنگ نے پورے منظر میں شان پیدا کی اس کے کٹ پھٹ جانے سے زراعت کے لئے گنجائش پیدا ہوئی اور اسی کی وجہ سے گرمیوں کے موسم میں لبنان کی سڑکوں پر گرد اڑتی ہے۔ اس کے پتھر تعمیر میں صرف ہوتے ہیں۔ بالائی سطح کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بارش کا پانی اندر ہی اندر جذب ہو کر اس سطح تک پہنچ جاتا ہے جو ریت اور مٹی سے مرکب ہے اور جو زیریں سطح کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ پانی درمیانی سطح میں محفوظ رہتا ہے۔ اسی سے صاف اور مجلّیٰ پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں، جو پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور وادیوں کو حیات بخش اجزا سے مالا مال کرتے ہیں۔

ریتلے پتھروں کا طبقہ چونے کے پتھر کی بالائی سطح اور زیریں سطح کے درمیان کا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ بالائی سطح میں کھریا مٹی کے اجزا زیادہ ہیں اور زیریں سطح میں چونے کے اجزا کی بہتات ہے۔ زیریں سطح کو ابتدائی دور کی کھریا مٹی سے مرکب سمجھنا چاہئے۔ مصر، جزیرہ نمائے سینا، عرب اور شرقِ اردن میں جو ریتلے پتھر پائے جاتے ہیں اور انہیں عام طور پر نوبی پتھر کہتے ہیں، لبنان کا سلسلہ انہیں کی ایک شمالی توسیع ہے۔ ان پتھروں کا طبقہ چند سو فٹ سے ایک ہزار فٹ تک موٹا ہو گا۔ ان پتھروں میں کوئی متحجر شئے نہیں ملی، البتہ بھورے رنگ کا کوئلہ ضرور ملتا ہے، جس سے دورِ حاضر میں ریشم کے کارخانوں کے اندر ایندھن کا کام لیا گیا ہے نیز پہلی عالمی جنگ کے دوران میں وہ ریلوں کے انجنوں کے اندر بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ بعض اضلاع (مثلاً کسراوان اور متن میں (شرقی بیروت) زمین کے کٹنے پھٹنے سے اوپر کا طبقہ غائب ہو گیا ہے اور ریتلے پتھر کے طبقے اور زیریں پتھروں کے طبقے کا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ زیریں طبقے کا پتھر سرخی مائل بھورا ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر اس میں بہت رنگ نظر آتے ہیں اور اسے بہترین شکل میں دیکھنا ہو تو لبنان میں نہیں، بلکہ بترا[1] میں دیکھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ سے زمین میں ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں کہ اس میں وہ صنوبر لگنے لگے ہیں، جو پتھروں میں نشو و نما پاتے ہیں۔ اگر اس میں مٹی ملی ہوئی ہو اور آبیاری کا بندوبست ہو جائے تو یہ زمین پھلوں کے باغوں اور شہتوتوں کے لیے بہت موزوں ہے۔ بیروت کے آس پاس ساحلی میدان کی سبز حاصلی کا اصل راز یہی ہے۔

لبنان کا عمومی منظر کیا ہے؟ ایک طرف خوب تراشی ہوئی اور بوقلموں سطوح مرتفع ہیں۔ ان کے سامنے سمندر ہے، جس کا عام رنگ گہرا نیلا ہوتا ہے، لیکن اس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو کئی رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ منظر کی خوشنمائی کا اصل سبب یہ ہے کہ مطلع صاف ہوتا ہے، افق دور تک نظر آتا ہے، فضا اتنی صاف رہتی ہے کہ طبعی خط و خال کے رنگ بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں، یعنی زمین، سمندر، پہاڑیوں اور وادیوں کا الگ الگ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حسن و جمال عبرانیوں کے دور سے عربوں کے عہد تک تمام شاعروں اور مغنّیوں کو برابر مسحور کرتا رہا ہے۔

ناکاموں کی پناہ گاہ

لبنان کے پہاڑی طبقے عموماً مائل و خمیدہ ہیں اور ان میں بہت موڑ ہیں۔ یہ اکثر عمودی ہیں، افقی شاذ ہی ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کے ٹیلے، چٹانیں اور وادیاں باہم خلط ملط ہو گئی ہیں اور اس وجہ سے ملک کے مختلف حصّوں کے درمیان مواصلات

سہل نہیں رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پورے علاقے میں جا بجا رخنے پیدا ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیمہ میں پوری سطح پر زبردست دباؤ پڑ رہا تھا، اس وجہ سے مختلف حصے ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ایک دوسرے پر گرتے رہے۔ ایسی زمین میں ان افراد و جماعات کے لیے بڑی اچھی پناہ گاہیں مہیا ہو سکتی تھیں، جو غیر ہر دلعزیز وابستگیوں اور عجیب و غریب عقیدوں کی مالک تھیں، نیز اس میں بلند وادیاں اور زرخیز خطے زیادہ تھے، جو آس پاس کی من چلی اور حریت دوست آبادیوں کو اپنی جانب کھینچتے رہے، چنانچہ مارونی، دروزی اور شیعہ (جنہیں شام میں "متاولہ" کہا جاتا ہے) لبنان کی ان گڑھیوں اور قلعوں میں پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے عقائد کی آزادی بحال رکھی۔ جو ارمن اور اشوری سلطنت عثمانیہ کی بد نظمیوں سے پریشان ہو کر جاتے تھے، وہ سب سے آخر میں لبنان پہنچے۔ مسیحی راہبوں اور درویشوں نے لبنان کے غاروں کو لذاتِ دنیوی پر ترجیح دی اور زمانۂ قدیم کے قزاق دوسری اغراض پیشِ نظر رکھ کر یہاں آئے[1]۔ بیشمار غار حضرت مریم عذرا اور دوسرے مسیحی اولیا سے منسوب ہیں اور وادئ قادیشا[2] کی پوری وادی جو دیو داروں کے بڑے جھنڈ کے پاس سے طرابلس الشام تک پھیلی ہوئی ہے، اب تک اپنے پرانے سریانی نام سے پکاری جاتی ہے یعنی "مقدس"۔

لبنان حقیقی معنی میں پہاڑی خطہ ہے۔ یہ زمانۂ قدیم سے ان جماعتوں کی پناہ گاہ چلا آتا ہے، جو اپنے مقاصد میں ناکام رہیں اور سب سے آخری خطہ ہے، جو غیر ملکی حملہ آوروں کے قبضے میں آیا۔

جلیل

ارضیات کے نقطۂ نگاہ سے فلسطین لبنان ہی کے سلسلے کا امتداد[3] ہے۔ لبنان کا ساحلی میدان فلسطین میں بھی دور تک چلا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میدان صارونہ[4] پر نظر ڈال لینی چاہیے جو کوہ کرمل سے یافا کے جنوب تک جاتا ہے اور فلسطینہ کے حلقے سے مل جاتا ہے۔ شام کا مغربی سلسلۂ کوہ بالائی جلیل کی بلندیوں میں سے ہوتا ہوا قاسمیہ والے شگاف کے جنوب تک آتا ہے۔ دراصل یہ لبنان اور اس پہاڑی سلسلے سے منفصل ہے جنہیں جلیل زیریں کہتے ہیں۔ بالائی جلیل کی بلندی جرمق پر، جو صفد کے شمال میں ہے، ۳۹۳۵ فٹ ہے۔ گویا فلسطین کی یہ سب سے اونچی چوٹی ہے۔ جلیل زیریں کی بلندی کوہ طابور پر، جو ناصرہ کے نزدیک ہے، ۱۸۴۳ فٹ ہے۔ پھر اس سلسلے میں مرج ابن عامر[5] پر سب سے بڑا انقطاع واقع ہوتا ہے۔ اس سے پورا فلسطین دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ جلیل کا کوہستانی علاقہ شمال کی جانب، یہودیہ اور سامرہ کا کوہستانی علاقہ جنوب کی طرف۔ سامرہ کے دو پہاڑ قابلِ ذکر ہیں، عیبال (جبل الشمالی، ۳۰۷۷ فٹ) اور جریزیم ۲۸۴۹ فٹ۔ آخری پہاڑ سامریوں کا مقدس کوہستان ہے۔ ان پہاڑوں میں جا بجا وادیاں ہیں۔ یہ پہاڑ بتدریجاً اور بالکل غیر محسوس طریق پر یہودیہ کی سطح مرتفع میں منتہی ہوتے ہیں، جو ناہموار اور مجتمع چونے کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ یہ کوہ حبرون کے جنوب میں انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے، جہاں کوہ یتّہ[6] کی رفعت ۳۳۴۷ فٹ ہے۔ یروشلم ۲۵۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پھر یہودیہ کی سطح مرتفع شروع ہو جاتی ہے جو عریض لہروں کی شکل میں بئر السبع (شیر کا کنواں) تک چلی جاتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو سٹرابو کا جغرافیہ سولہویں کتاب

[2] سمندر کے نزدیک اس کا نام ابو علی ہے

[3] ڈے ص ۱۴۲ اور دوبرتہے ص ۷۰-۷۲

[4] عبرانی میں ہاشارون یا شارون میدان کو کہتے ہیں موجودہ زمانے کی عربی زبان میں اس کا کوئی نام نہیں

[5] Esdraelon

[6] بائیبل کتاب یشوع میں اس کا نام دو جگہ آیا ہے (باب ۱۵، آیت ۵۵ اور باب ۲۱، آیت ۱۶) دونوں جگہ نام یوطہ لکھا ہے آج کل اسے یتہ کہتے ہیں۔

جنوبی حصے کی بنجر زمین کا نام "نفب" ہے یعنی جھلسی ہوئی زمین۔ یہ نام ہر لحاظ سے موزوں ہے۔

غار

چونے کے پتھر کی وسیع قدرتی بناوٹیں، لبنان میں سفید راہیں بن کر سمندر کے اندر چلی گئی ہیں۔ سمندر کی موجوں نے انہیں جگہ جگہ سے کھوکھلا کر دیا ہے اور ان میں غار بن گئے ہیں۔ بالکل اسی قسم کے غار کوہ کرمل میں بن گئے ہیں، جو سطح بحر سے ۴۷۰ فٹ بلند ہے اور اسی کے غاروں میں مشرق قریب کے ابتدائی انسان کے ڈھانچے ملے تھے۔ بعض غار اندرون ملک میں بہت دور واقع ہیں، جہاں کسی زمانے میں سمندر پہنچا ہوا تھا یا زیر زمین بہنے والے دریا جہاں سے گزرتے تھے۔ ممکن ہے، غاروں میں رہنے والے ابتدائی دور کے انسانوں نے ان غاروں یا گپھاؤں کو وسیع کر لیا ہو، جنہیں وہ بود و ماند کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لبنان کے غار ان لوگوں کی پناہ گاہیں بنتے رہے جو سیاسی یا مذہبی اعتبار سے جبر کا تختہ مشق بنے۔ بائیبل کے ایلیاہ نے اخاب بادشاہ کی بیوی کے غصے سے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے طالوت کے انتقام سے بچنے کے لیے غاروں ہی میں پناہ لی تھی۱؎۔ بعض غار مدفنوں کا کام دیتے رہتے ہیں۔ غالباً ایسے ہی کسی مقام پر حضرت مسیح علیہ السلام کا جسم مبارک رکھا گیا تھا۲؎۔ اس طرح یہ غار عیسائیت کی مقدس ترین زیارت گاہ بن گیا ہے۔

درمیانی نشیب

تیسرا جنوبی و شمالی خطہ وہ ہے، جسے ایک طویل نشیب یا تنگ آبریز کی حیثیت حاصل ہے اور وہ سرزمین شام کے وسط میں واقع ہے۔ دریائے عاصی جنوب سے شمال کی طرف لمبا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد انطاکیہ کے سامنے پہنچ کر دفعتہً مغربی جانب مڑ گیا ہے۔ یہاں سے قریب ہی ایک عریض میدان ہے، جسے عمق۴؎ کہتے ہیں، مذکورہ بالا طویل نشیب یہیں سے شروع ہو کر حماۃ کی جانب اوپر اٹھتا آیا ہے، یہاں پر اس کی بلندی ۱۵۰۰ فٹ ہے۔ یہاں اس نے دو لبنانوں کے درمیان البقاع کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ پھر یہ نشیب جنوبی سمت میں بڑھتا چلا آیا ہے۔ اسی میں سے دریائے اردن بہتا ہوا، بحیرۂ جلیل (طبریہ) سے گزر کر بحیرۂ لوط میں گرتا ہے۔ بحیرۂ لوط کے جنوب میں یہ نشیب وادی العربہ میں سے ہوتا ہوا العقبہ پر منتہی ہوتا ہے جو بحیرۂ احمر کی مشرقی شاخ ہے۔ یہ نشیب اس طرح واقع ہوا کہ دو پہاڑی سلسلوں کی زمین اندر دھنس گئی اور غالباً یہ تغیر ارضیات کے کسی قریبی زمانے میں ہوا۔ بہر حال بقاع، اردن اور عربہ کا مسلسل نشیب، خصوصاً اس کا جنوبی حصہ سطح ارض کے عجیب ترین مظاہروں میں سے ایک ہے۔ حولہ کے نزدیک اس کی سطح سمندر سے صرف سات فٹ بلند ہے، بحیرۂ طبریہ (جلیل) کے پاس پہنچ کر یہ سمندر سے چھ سو پچاسی فٹ نیچے ہو گیا ہے اور بحیرہ لوط کے نزدیک یہ نشیب سطح بحر سے ایک ہزار دو سو بانوے

۱؎ ملاحظہ اول کے لیے بائیبل کی کتاب سلاطین حصہ اوّل باب ۱۹ آیت ۱۹ اور دوم کے لیے بائیبل کی کتاب سموئیل، حصہ اول باب ۲۲ آیت ۱۔

۲؎ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۳ آیت ۹ و باب ۴۹ آیات ۳۰-۳۱

۳؎ یہ مصنف کا بیان ہے، جو خود مسیحی ہیں، مترجم اس کا ذمہ دار نہیں

۴؎ اسوری دستاویزوں میں اس کا نام "ادینقی" مرقوم ہے۔ ملاحظہ ہو ڈینیل ڈی لکن بل (Luckenbill) کی کتاب Ancient Records of Assyria and Babylonia جلد اوّل (مطبوعہ شکاگو ۱۹۲۶ء) پیراگراف ۷۶۹، ۷۷۲، ۸۲۱۔

۵؎ پکارڈ ص ۹۔

فٹ نیچا ہے۔ اس سے نزول کی تیزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[1] یہ دنیا کا تہ خانہ ہے۔ ایسا نشیب اور کہیں بھی نمایاں نہیں۔

البقاع

البقاع[2] یعنی لبنان کا نشیب چھ میل سے دس میل تک چوڑا ہے اور بعلبک کے پاس یہ سمندر سے ۳۷۰۰ فٹ بلند ہے۔ اس کے پاس ہی ایک دلدلی سا پن دھارا ہے، جہاں سے دریائے عاصی شمالی جانب کا سفر شروع کرتا ہے اور دریائے لیطانی نے جنوب کا رخ کر لیا ہے۔ عاصی شام کا سب سے بڑا دریا ہے، فرات نہ منبع کے لحاظ سے شامی ہے اور نہ مجریٰ کے لحاظ سے۔ صرف عاصی اور اردن شام کے بڑے دریا ہیں، لیطانی عاصی کے برعکس جنوب کی جانب چلا آتا ہے۔ جب یہ قلعۃ الشقیف[3] کے دامن میں پہنچتا ہے تو دفعتاً مغرب کا رخ کر لیتا ہے اور لبنان کی چوٹی کے پتھروالی پہاڑیوں کو کاٹتا ہوا صور و صیدا کے درمیان سمندر میں گرتا ہے، یہاں اس کا نام دریائے قاسمیہ ہے۔ قلعۃ الشقیف صلیبی جنگوں کے زمانے کا ہے۔

بقاع کو یہ دو دریا سیراب کرتے ہیں، اس وجہ سے شام کا یہ علاقہ بہترین مرغزار بن گیا ہے اور عریض ترین مرغزار ہے اس میں تہ آب کی مٹی اور چکنی مٹی کے اجزا بہت شامل ہو گئے ہیں، اس لیے زمین زراعت کے لیے حد درجہ سازگار ہے لیکن شام کے دوسرے دریاؤں کی طرح عاصی کا طاس اتنا گہرا ہے کہ اس کے پانی سے بآسانی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، لہٰذا رہٹ[4] لگا کر پانی زمین کی سطح پر لایا جاتا ہے اور رہٹوں کی یک آہنگ ریں ریں میں رومیوں کے زمانے سے اہل حماکی نسلیں برابر آرام کی نیند سوتی رہی ہیں۔

وادی ردن[5] قریباً پینسٹھ میل لمبی اور تین میل سے چودہ میل تک چوڑی ہے۔ اس یگانہ نشیب کو مغربی جانب کی ندیوں سے بہت پانی ملتا ہے جس کی وجہ سے فلسطین کی زمین میں پانی کی بہم رسانی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ پھر یہ پانی دنیا کے تلخ ترین بحیرہ میں پہنچ جاتا ہے۔ بحیرۂ لوط کے پانی کی غیر معمولی تلخی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا کوئی نکاس نہیں، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی زمانے میں اس کا تعلق سمندر سے رہا۔ اس میں برومائن، پوٹاش اور میگنیشیم کلورائڈ کے اجزا بہ کثرت شامل ہیں۔ اوّل اور اعلیٰ درجے کا اسفلٹ بحیرہ لوط میں، اس کے آس پاس اور حاصبیا میں ملتا ہے، جو کوہ حرمون کے جنوبی دامن میں واقع ہے۔

لبنان کے پہاڑوں کی رخنوں والی ڈھلوانوں اور وادی کے لمبے نشیب (جو اردن اور بحیرہ لوط تک ممتد ہے) کے علاقے زلزلوں کی شدید سرگرمیوں کا حلقہ ہیں، لیکن زیر زمین بے چینی صرف ان علاقوں تک محدود نہیں۔ جو سطح مرتفع کوہ حرمون کے مشرق اور دمشق کے جنوب میں ہے، اس میں سے ایسے آتش فشاں دہانوں کا ایک خط گزرتا ہے، جو اب مدت سے ساکن و خاموش ہو چکے ہیں۔ اس

---

[1] اردن عبرانی لفظ یردین سے ماخوذ ہے، جس کے معنی نیچے اترنا ہے۔ بحیرہ طبریہ کو عہد جدید گنیسرت (Gennesaret) لکھا ہے (لوقا کی انجیل باب پنجم آیت پہلی نیز یوحنا کی انجیل باب ششم آیت پہلی) عہد قدیم میں اسے کنرت بتایا گیا ہے (گنتی باب ۳۴، آیت ۱۱ نیز سلاطین اول باب ۱۵، آیت ۲۰) کنرت کے معنی ہیں بربط کی مانند، الحولہ وہی ہے، جسے زمانہ قدیم میں (Semechonitis) کہا جاتا تھا یعنی بحیرۂ سمخ۔

[2] البقاع کے معنی ہیں، وہ مقام جہاں پانی ٹھہرا رہے۔ زمانہ قدیم میں اسے شام مجوف کہتے تھے (Coele-Syria) یونانی رومی دور میں اس کا اطلاق وسیع تر خطے پر ہوتا رہا ہے۔ حوران نیز شرق اردن کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ سٹرابو سولھویں کتاب، جوزیفس Antiquities of the Jews پہلی کتاب دوسرا باب نیز تیرھواں باب۔ [3] Behort. [4] نواعیر (Water-wheels) اس کا مفرد ناعورہ ہے، اسی سے انگریزی لفظ Semple نکلا ہے۔ [5] النہر الاردن یا المخور۔ اردن کو نہر الشریعہ بھی کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ابو الفدا کی تقویم البلدان پیرس ۱۸۴۰ء ص ۴۸

خطے پر جگہ جگہ لاوے کے نشان دکھائی دیتے ہیں، بعض علاقوں میں گرم پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں، مثلاً طبریہ میں بحیرۂ لوط کے حلقے میں اور تدمر میں۔

شام کے جغرافیے میں آتش فشاں پہاڑوں کا اتنا ذکر نہیں ملتا، جتنا اس ملک کی تاریخ میں زلزلوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً انتہائے شمال میں انطاکیہ برابر زلزلوں کا مرکز رہا۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر چھ سو سال کی مدت میں کم از کم دس مرتبہ زلزلے آئے[1] بعلبک کے شہرۂ آفاق معبد شمس کی دیواریں زلزلوں کے ہیجان کی نشانیاں پیش کر رہی ہیں، بالکل اسی قسم کی نشانیاں صلیبی جنگوں کے زمانے کے ان قلعوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ بنی اسرائیل نے اریحا شہر پر حملہ کیا تھا تو اچانک اس کی دیواریں گر پڑی تھیں[2]۔ اسی طرح بحیرۂ لوط کے جنوبی و مغربی گوشے میں سدوم اور عمورہ نام دو شہر برباد ہوئے، یہ سب کچھ زلزلوں ہی کا نتیجہ تھا۔ سدوم اور عمورہ میں پہلے زلزلہ آیا۔ پھر اس وجہ سے آگ لگ گئی کہ وہاں زمین کے اندر تیل تھا، نیز اسفلٹ کے چشمے تھے[3]۔ عبرانی پیغمبروں، شاعروں اور مورخوں نے جب یہوداہ (قادر مطلق) کی طاقت و قوت کو بیان کرنا شروع کیا تو وہ زلزلوں کے اضطراب اور ان کی وجہ سے سمندر کے تلاطم و تموج کے باب میں اپنے تجربات سے کام لیتے رہے یا ان طبعی مظاہر سے متعلقہ امور کو اپنے بیان کا مبنیٰ بناتے رہے[4]۔ عہد نامۂ جدید میں بتایا گیا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا تھا زلزلہ آیا تھا اسی طرح جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مرنے کے بعد جی اٹھے، اس روز بھی زلزلہ آیا تھا[5]۔

سمندر میں اس قسم کا تلاطم و تموج فونیقی ساحل کے ساتھ ساتھ خصوصاً بہت تباہی پھیلاتا تھا صور اور صیدا کو تلاطم و تموج نیز زلزلوں کے باعث اکثر نقصان پہنچا[6]۔ صور کو زیادہ نقصان پہنچنے کے امکانات اس لیے زیادہ بڑھ گئے تھے کہ اس شہر میں منزل بہ منزل بہت اونچے مکان بنانے کا رواج تھا۔ بعض عمارتیں ستر ستر فٹ بلکہ اس سے بھی زیادہ اونچی تھیں[7]۔ شمالی شام میں آخری بڑا زلزلہ ۱۸۲۲ء میں آیا، جس کی وجہ سے حلب اور دوسرے بلاد و قصبات بری طرح برباد ہوئے اور ہزاروں جانیں اس حادثے کی نذر ہو گئیں۔ فلسطین میں آخری بڑا زلزلہ ۱۸۳۷ء میں آیا اور اس میں صفد بالکل تباہ ہو گیا[8]۔

مشرقی سلسلۂ کوہ

مشرقی سلسلۂ کوہ شام کے ابھار کا چوتھا منطقہ ہے۔ اس کی ابتدا حمص کے جنوب میں ایک مقام سے ہوتی ہے اور اس

---

[1] ایلن سی سمپل (Semple) کی کتاب بحیرۂ روم کے خطے کا جغرافیہ (The Geography of the Mediterranean) مطبوعہ لندن ۱۹۳۲ء ص ۲۲۔ [2] اریحا کا ذکر بائیبل میں کئی جگہ ہے، دیواریں گرنے کے واقعے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب یشوع باب ششم۔ [3] یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر بائیبل میں بھی ہے اور قرآن مجید میں بھی عذاب کی جو تفصیلات بیان ہوئیں، ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زلزلہ آیا اور آگ لگی

[4] ملاحظہ ہو بائیبل کتاب عاموس باب ۵ آیت ۸، باب ۹ آیت ۶، یسعیاہ باب ۲۹ آیت ۶، کتاب ایوب باب ۹ آیت ۵-۶، باب ۲۸ آیت ۹، زبور ۹۰ آیت ۲، ۱۰۴ آیات ۳، ۴۔ سلاطین اول باب ۱۹ آیت ۱۱، گنتی باب ۱۶ آیات ۳۱-۳۲

[5] ملاحظہ ہو متی کی انجیل ستائیسواں اور اٹھائیسواں باب [6] سیفیلا اور سٹرابو [7] سٹرابو

[8] فرانسس آر چزنی (Region Chesney) کی کتاب مطبوعہ لندن ۱۸۵۰ء جلد اول صفحات ۳۶۴، ۴۴۱ نیز ایچ بی ٹرام کی کتاب مطبوعہ لندن ۱۸۷۶ء ص ۵۶۷

کی وجہ سے مشرقی لبنان اور مغربی لبنان کے سلسلے طول اور بلندی میں قریباً یکساں ہو جاتے ہیں، پھر یہ سلسلہ حرمون سے تیزی کے ساتھ حوران کی سطحِ مرتفع پر گرنا شروع ہوتا ہے۔ حوران کے پاس مغربی سمت میں جولان[2] کے پہاڑی ٹیلے ہیں۔ وہاں سے یہ شرقِ اردن پہنچ جاتا ہے اور جلعاد کی پہاڑیوں سے گزرتا ہے۔ پھر مواب کی سطح مرتفع پر پہنچ جاتا ہے۔ انجام کار بحیرۂ لوط کے جنوب میں جبل سعیر[3] پر ختم ہوتا ہے۔

مشرقی لبنان

مشرقی لبنان کو ایک سطح مرتفع اور نہر بردی (توراۃ کا دریائے ابانا) نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، ایک شمالی حصہ[4] جس کے مغربی بازو پر شاید ہی کوئی بستی ہو۔ دوسرا جنوبی حصہ جس میں جبل حرمون ہے۔ حرمون بہ اعتبار جلال و عظمت شام کی بہترین چوٹی ہے اور بلند ترین چوٹیوں میں سے ہے (۹۲۳۲ فٹ) اس کی مغربی ڈھلوانوں پر بہت سے گاؤں آباد ہیں۔ مشرقی لبنان کی آبادی غربی لبنان کے مقابلے میں زیادہ بکھری ہوئی ہے اور کم ترقی یافتہ ہے۔ دوسرے اسباب کے علاوہ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مشرقی لبنان میں بارشیں بھی کم ہوتی ہیں اور سبزہ بھی کم ہوتا ہے۔ اس میں لوگ عموماً مشرقی شام سے آتے ہیں[5]۔ موجودہ جمہوریۂ لبنان کی سرحد کوہ حرمون پر سے گزرتی ہوئی زبدانی کے پاس پہنچ کر خم کھاتی ہے، پھر یہ لبنان شرقی کے شمالی حصے کی چوٹی کے ساتھ جاتی ہے۔ بیروت و دمشق کے درمیان جو ریلوے لائن ہے، وہ زبدانی اور بردہ کی وادی کے ساتھ جاتی ہے۔

دریائے بردی زبدانی گاؤں کی زرخیز مرتفع وادی میں سے نکل کر مشرقی جانب بہنا شروع کرتا ہے اور اس کی وجہ سے شام کی زمین کا خاص بڑا حصہ سیراب ہوتا ہے۔ اگر بردی جاری نہ ہوتا تو یہ زمین بے آب صحرا ہی رہتی اس کی وجہ سے دمشق وجود پذیر ہوا، جو صحرا میں حضارت کی چوکی ہے۔ بردی ہی دمشق کے ان مشہور باغات کو سیراب کرتا ہے، جو الغوطہ کے نام سے مشہور ہیں۔ انہیں باغات کی خوشبوؤں کے باعث عربی میں دمشق کا نام فیحا پڑا۔ پھر اس دریا کی پانچ شاخیں ہو جاتی ہے یا کہہ لیجئے کہ پانچ دھارے بن جاتے ہیں، جن سے قدیم مرکزِ حکومت کے شوارع مستفید ہوتے ہیں۔ پانی کا جو نظام اب دمشق میں رائج ہے یہ خلافت بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں مرتب ہوا تھا[6]۔

حوران

حوران[7] کی سطح مرتفع کی سطح کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ آتش افشانی لاوے سے بنی ہے۔ اس میں بسالٹ کی چٹانیں ہیں اور زمین بڑی زرخیز ہے۔ لاوے کی سطح کا سلسلہ تلول سے چلتا ہے جو دمشق کے جنوب میں واقع ہے۔ وہاں سے لاوے نے کم و بیش ساٹھ میل لمبے

---

[1] زبور میں اس کا نام سریون ہے (۲۹-آیت ۶) آج کل اسے جبل الشیخ کہتے ہیں مقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم میں اس کا نام جبل الثلج بنایا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۶۰ نیز ابو الفداص ۲۴۸، ۲۲۸۔ [2] اس کی اصل عبرانی ہے، گولان Golan بہ معنی دائرہ۔ کلاسیکی زمانے میں اسے Gaulanitis کہتے تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں جولان کا ذکر کیا ہے [3] عبرانی میں سعیر ادوم کا مترادف ہے۔ [4] عرب جغرافیہ دانوں نے اسے "سنیر" کے نام سے پکارا ہے، ملاحظہ ہو یاقوت جلد سوم ص ۱۷۰۔ [5] اہل الجبل یا جبلیوں سے مراد مغربی سلسلہ کوہ کے باشندے ہیں [6] اس کا ذکر آگے آئے گا۔

[7] اسے کلاسیکی دور میں اورانی ٹس Auranitis کہتے تھے، توراۃ میں "باشان" کہا گیا ہے اشوریوں کے ہاں اس کا نام "حورانو" تھا یعنی "ارض مجوفہ"۔ محدود معنی میں حوران اس خطے کا نام ہے جو جولان کے مشرق میں اور جبل دروز کے مغرب میں ہے، لیکن ترکوں کے زمانے میں "متصرفیہ" (انتظامی قسمت یا کمشنری) حوران میں جولان، اللجا، جبل دروز کے علاوہ عجلون بھی شامل تھا۔

اور اتنے ہی چوڑے رقبے کو گھیر رکھا ہے، شام میں اس نوعیت کا یہ سب سے بڑا خطہ ہے[1]۔ اس خطّے کے شمال مشرق میں اللجا ہے، جسے سیاہ پتھروں کا حصار سمجھنا چاہیئے[2]۔ اس کی حیثیت ایک پناہ گاہ کی ہے، جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے۔ سرکش قبیلے ہمیشہ یہاں پناہ لیتے رہے۔ اس کے جنوب مغرب میں وہ پہاڑی احاطہ ہے "جبل حوران" یا "جبل دروز"[3] کہتے ہیں یہاں دروزیوں کا قبضہ بہت بعد میں ہوا۔ یہ اٹھارھویں صدی کی بات ہے، جب لبنان میں مختلف فریقوں کے درمیان فسادات ہوتے رہتے تھے۔ حوران کی یہ مشرقی فصیل چار ہزار فٹ سے پانچ ہزار فٹ تک بلند ہے اور حوران و بادیۂ شام کے درمیان یہ حائل ہے آتش افشانی خطّہ مغربی جانب چلا گیا ہے، یہاں تک کہ جولان بھی اس میں شامل ہو گیا ہے۔ حوران میں کوئی درخت نہیں، صرف چند چشمے ہیں، تاہم یہاں گیہوں بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور چراگاہیں بھی بہت اچھی ہیں۔ زمین کو دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ لاوے کے جو اجزا تحلیل ہوئے، ان میں سرخ رنگ کی مٹّی مل گئی ہے، یہ نمی کو اپنے اندر دیر تک محفوظ رکھتی ہے اور فصلوں کے لیے اس میں بڑی عمدہ غذا ہے۔ نیچے کی سطح چونے کے پتھر کی ہے۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ میں دولمن بھی ہیں، جنہیں ابتدائی دور کے انسان کا کام سمجھنا چاہیئے۔ علاوہ بریں یہاں رومی اور بیزنطینی دور کی سڑکوں، آبی گزرگاہوں، تالابوں، عمارتوں، اور استحکامات کے بھی بچے کھچے نشان ملتے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بہت رونق اور چہل پہل تھی اور حوران، رومی یا بیزنطینی سلطنت کا ایک "اناج گھر" تھا۔ یہ آج بھی فلسطین و لبنان کے لیے اسی طرح گیہوں بہم پہنچاتا ہے جس طرح عبرانیوں اور فونیقیوں کے زمانے میں بہم پہنچاتا تھا۔

حوران کے آتش افشانی حصے، جنوب مشرق کی طرف پھیلتے پھیلتے صحرائے حماد میں گزرتے ہوئے حجاز کی ان پتھریلی زمینوں تک پہنچ گئے ہیں، جو حرّات[4] کے نام سے معروف ہیں۔ خاص مشرقی اردن میں مشرقی سلسلۂ کوہ کی کھریا مٹّی کی یا لاوی تہیں چلی گئی ہیں ان کی بلندی شمال میں عجلون پر ۴۱۳۷ فٹ پر اور اس کے ہمسایہ جبل جلعاد[5] پر، ۳۳۹۶ فٹ پر پہنچ گئی ہے جنوب میں الکرک[6] کے قریب بلندی ۳۷۷۵ فٹ ہو گی۔ بترا کی طرف آئیں تو ریتلے پتھروں اور ٹیلوں کی بلندی ۴۳۰۰ فٹ ہے۔

بادیۂ شام

شمالی و مشرقی حوران اور مشرق اردن کی سطح مرتفع درجہ بدرجہ لق و دق بیدان، حرات اور ریت کی شکل اختیار کرتی کرتی اس وسیع بنجر زار پر پہنچ جاتی ہے، جو بادیۂ شام کہلاتا ہے یہ شام کی ارضی ساخت کا پانچواں اور سب سے بڑا حصّہ ہے۔ اسے صحرائے اعظم عرب ہی کے سلسلے کا امتداد سمجھنا چاہیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عربی مستطیل کا شامی حصّہ ہے اور شام کو عراق سے جدا کرتا ہے جو صحرائی علاقہ مشرقی کونے

---

[1] ڈی، جی ہوگارتھ کی کتاب مشرقِ قریب مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۵ء ص ۶۶۔ [2] عرب اس خطّے کو نیز اس کے ساتھ کے مشرقی خطّے کو جس کا نام صفا ہے، "الوعر" کہتے ہیں، کلاسیکی زمانے میں اس کا نام Tracheon تھا۔ ملاحظہ ہو جارج اے سمتھ کی کتاب "ارضِ مقدس کا تاریخی جغرافیہ" مطبوعہ نیویارک ۱۹۰۲ء ص ۶۱۵، نیز اسی مصنف کی کتاب شام اور ارضِ مقدس مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء ص ۲۵۔ [3] ملاحظہ ہو سلیمان ابو عزّ الدین کا مقالہ "وطن الدروز فی حوران" مجلہ "الکلیہ" میں جلد دوازدہم ۱۹۲۶ء ص ۳۱۳ - ۳۲۳۔ [4] ان خطّوں کے لیے عربی لفظ جن پر لاوے کی تہیں بچھی ہوئی ہوں۔ [5] عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں سخت، یہ پتھریلے خطّے کے لیے استعمال ہوا ہے، جلعاد عربی شکل ہے۔ [6] صلیبی جنگجوؤں میں یہ مقام Le Crac مشہور تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

یا العراق سے متصل ہے، اس کے شمالی حصّے کو بادیۂ الجزیرہ (دوآبۂ دجلہ و فرات کا صحرا) اور جنوبی حصّے کو بادیۂ العراق یا السماوہ کہتے ہیں۔ بادیۂ شام کا جنوبی و مغربی حصّہ، جسے الحماد کہتے ہیں، جزواً پتھریلا اور جزواً ریتلا ہے۔ موسم بہار میں اسے گھاس کا فرش ڈھانپ لیتا ہے۔ شام و عراق کا صحرا ایک بہت بڑی مثلث کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا قاعدہ مغرب میں خلیجِ عقبہ اور مشرق میں کویت ہے اور راس (اوپر کا حصّہ) شمالی جانب حلب کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس صحرا کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی آٹھ سو میل ہے۔ اس میں جو خانہ بدوش لوگ آباد ہیں، انہوں نے دونوں جانب تجارت کے سلسلے قائم کر رکھے ہیں۔ گویا وہ دونوں طرفوں کے درمیان واسطہ بنے ہوئے ہیں۔ زمانہ قدیم میں انہوں نے تدمر جیسے شہر آباد کیے تھے جو مشرق و مغرب کے درمیان صحرائی شاہراہ پر واقع تھا۔ ان خانہ بدوشوں کا خون ہر دور میں شہری آبادی کے لیے روحِ حیات کا سرچشمہ بنا رہا ہے۔ یعنی یا تو وہ فتح و تسخیر کے ذریعے سے پرانی آبادی میں نئے خون کی لہریں دوڑا دیتے یا پر امن طریق پر شہروں میں چلے آتے۔ خاص حرکات کا معاملہ الگ ہے ورنہ خانہ بدوش یعنی بدو کسی جگہ جم کر رہنا پسند نہیں کرتے اور وہ اپنے ریوڑوں کے لیے نئی چراگاہوں کی تلاش میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بارش ہو جائے تو جگہ جگہ سبزے کا فرش بچھ جاتا ہے۔ بدو مہمان نوازی میں بڑے فراخ حوصلہ ہیں۔ لیکن نئی چیزوں کے خیر مقدم میں یہ حوصلہ منعکس نہیں ہوتا۔ اگر حضری آبادی میں ترقی کا سرچشمہ یہ ہے کہ زندگی اور ماحول میں تبدیلی و تطابق کی کوشش جاری رہے تو خانہ بدوشی کی زندگی میں بقا کا راز یہ ہے کہ جو حالات موجود ہوں، انہیں قبول کر لیا جائے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق بنا لیا جائے

شام کے مشرقی سلسلۂ کوہ کی مشرقی ڈھلانوں سے جو ندیاں نکلی ہیں، وہ صحرا سے ساتھ دست و گریباں ہو کر شکست کھا چکی ہیں اور اب اس بنجر خطے کے اندر دفن ہیں۔ ملک کے اس حصّے کے طبعی جغرافیے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ صحرا اور مزروعہ رقبے کے درمیان جدوجہد جاری ہے، جس طرح ہمیشہ سے جاری رہی ہے۔ صحرا مختلف حیثیتوں میں سمندر سے مشابہ ہے یہ اپنی حرکت و جنبش میں ہمیشہ بے پناہ رہا ہے اور اس میں بھی برابر مدّ و جزر کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ صحرا اور مزروعہ رقبے کے درمیان کش مکش کا نمونہ دیکھنا ہو تو بدوؤں، یعنی صحرائی خانہ بدوشوں اور زرخیز میدانوں میں کھیتی باڑی کرنے والوں کے درمیان کش مکش ملاحظہ فرما لیجئے۔ بدو ہتی دست ہوتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرنے والے ضرورت کی چیزوں کے مالک بنے رہتے ہیں۔ بنو اسرائیل سے صدیوں پیشتر اور صدیوں بعد صحرا کی مریض نگاہیں، آس پاس کی ان زمینوں کی طرف اٹھتی رہیں جو شاداب و زرخیز تھیں۔

پانچواں باب

طبعی ماحول

جس سٹیج پر تاریخ شام کے ڈرامے کی نمائش ہوئی، اس کی طبقاتی اور جغرافیائی حیثیت گزشتہ باب میں واضح کی جاچکی ہے۔ پیش نظر باب میں اس کے طبعی خصائص بیان کیے جائیں گے اور اس بیان میں آب و ہوا، نباتات اور حیوانات بھی شامل ہوں گے۔

آب و ہوا

شام کی آب و ہوا اور موسمیات کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وسطِ نومبر سے اختتامِ مارچ تک بارشیں ہوتی ہیں اور باقی مہینوں میں موسم خشک رہتا ہے۔ دراصل بحیرۂ روم کے پورے حلقے کی عام کیفیت یہی ہے، اس لیے کہ یہ دو ایسے خطوں کے درمیان واقع ہے، جو بلحاظ آب و ہوا ایک دوسرے سے کاملاً متضاد ہیں۔ جنوبی منطقے سے خشک تجارتی ہوائیں آتی ہیں، نیز اس جانب افریقہ کے صحرائی علاقے واقع ہیں۔ شمالی منطقے سے مغربی ہوائیں چلتی ہیں یہی مغربی جانب کی مرطوب ہوائیں ہیں، جو اوقیانوس سے سال بھر وسطی اور شمالی یورپ میں بارش پہنچاتی رہتی ہیں، موسم سرما میں سرزمین شام کے اندر ان کا خوب زور ہوتا ہے اگرما میں حرارت کا حلقہ خط استوا سے شمال کی جانب پھیلتا ہے۔ اس وجہ سے شام پر مہینوں تک صحرا کی خشکی اور یبوست کا ماحول مسلط رہتا ہے موسم کی جو تغیر پذیری ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شمالی حصے کی خصوصیت ہے اور جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہمت و استعداد کو تقویت پہنچاتی ہے اس کا شام میں کہیں وجود نہیں۔

مغربی ہوائیں بعض اوقات شدید طوفانی ہواؤں سے مل کر بحیرۂ روم پر چھا جاتی ہیں۔ اس طرح ان میں مزید نمی آجاتی ہے پھر وہ لبنان کے پہاڑوں اور فلسطین کے درمیانی کوہستانی سلسلے سے ٹکراتی ہیں اور اوپر اٹھتی ہیں۔ اس اٹھنے میں وہ پھیلتی ہیں اور نمی کی جو دولت وہ اپنے دامن میں سمیٹے رہتی ہیں، اس کا کچھ حصہ بارش کی شکل میں گرا دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ شام کے موسمی عوامل مندرجہ ذیل ہیں۔ سمندر کا قرب، زمین کا ابھار اور ارتفاع، صحرا سے دوری نیز بحیرۂ روم اور صحرا کے اثرات کا تعامل۔ ان عوامل کا نتیجہ یہ ہے کہ شامی سطح مرتفع کے مغربی بازو پر جو ساحلی میدان ہے وہ بارش کی سالانہ مقدار کا بڑا حصہ لے لیتا ہے اور جیسے جیسے مغرب سے مشرق، نیز جنوب سے شمال کی طرف جائیں، بارش کا اوسط کم ہوتا جاتا ہے۔

موسموں کے متعلق جو ریکارڈ رکھے جاتے ہیں، ان سے مندرجہ بالا نتائج کی تصدیق ہوتی ہے۔ اکتالیس برس کی جو مدت جولائی ۱۹۲۱ء میں ختم ہوئی، اس میں بیروت کے اندر بارش کا سالانہ اوسط ۳۵.۰۹ انچ رہا، فلسطین کے ساحل پر یہ اوسط صرف ۲۲.۲ انچ تھا بیروت سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر الشویر ہے۔ وہاں پچیس سال کی اس مدت میں جس کا اختتام جولائی ۱۹۲۶ء میں ہوا، سالانہ اوسط ۵۹.۱۶ انچ تھا۔ یروشلم ساحلی علاقے سے دو ہزار دو سو پچاس فٹ بلند ہے۔ وہاں اوسط صرف ۲۵.۴۶ انچ تھا۔ کسارہ اس وسطی نشیب میں واقع ہے، جس کے دونوں جانب پہاڑی دیواریں کھڑی ہیں یہاں کا اوسط ۲۴.۸ انچ تھا اور وادی اردن کا صرف ۵.۰۵ انچ وسطی فلسطین کی

سطح مرتفع کے بعد موسم میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ البتہ مزید مشرق میں شرقِ اردن کا سلسلۂ کوہ پھر ہوا کو اوپر اٹھا دیتا ہے اور جو نمی اس میں باقی ہوتی ہے وہ چھن جاتی ہے اس طرح برساتی ہوائیں اردن سے اوپر اوپر نکل جاتی ہیں۔ لبنان کے دوسرے برساتی پردے کے پیچھے دمشق واقع ہے، وہاں بارش کا اوسط دس انچ ہے۔ شرقِ اردن کے سلسلۂ کوہ کی چوٹی پر یہ اوسط ۵۵،۲۷۔ انچ پر پہنچ جاتا ہے، لیکن شرقِ اردن کے مشرق میں ۹،۳۔ انچ بارش ہوتی ہے[1]۔ بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ فلسطین و لبنان کے ساحلی میدان میں جنوبی کیلی فورنیا اور زیریں کیلی فورنیا کے مقابلے میں دگنی بارش ہوتی ہے۔

حرارت کا اوسط بیروت میں ۶۸ درجے فارن ہائٹ ہے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی کی رصد گاہ میں حرارت کے جس انتہائی درجے کا ریکارڈ موجود ہے، وہ ۱۰۷،۸۶ درجے ہے اور یہ ۸ ارمئی ۱۹۱۶ء کو تھا اور کم سے کم درجہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۷ء نیز ۲۵ر جنوری ۱۹۰۷ء کو تھا یعنی ۲۹،۸۲ درجے[2]۔ عجیب بات یہ ہے کہ لبنان کے ساحلی علاقے میں مرطوبیت بہ ماہ جولائی انتہا پر پہنچتی ہے، یعنی پچھتر فیصد اور دسمبر میں یہ کم سے کم ہوتی ہے، یعنی اوسط ساٹھ فی صد رہتا ہے[3]۔ موسم سرما میں وسط ایشیا کے کثیف بادِ اور خشک طوفان شکن اثرات شام کی مشرقی سطح مرتفع پر پھیل جاتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کُہرا اور برف پڑتی ہے۔ ساحلی علاقے میں ایسے منظر کا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ درجۂ حرارت سمندر کے اثرات کی وجہ سے اعتدال پر آجاتا ہے گویا یہاں موسم سرما میں کسی حد تک گرم اور گرما میں کسی حد تک سرد رہتا ہے۔ سطحِ مرتفع کی دو بڑی دیواریں اور ان کے بیچ کے نشیب کے باعث (جس کی وضع خندق کی سی ہے) سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں رُک جاتی ہیں اور اندرونِ ملک تک نہیں جاسکتیں۔ صحرا سے گرد بھری ہوائیں چلتی ہیں، اس لیے موسم گرما میں دمشق اور حلب جیسے شہروں میں درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ فلسطین میں وقتاً فوقتاً حرارت زیر سایہ ایک سو فارن ہائٹ اور شرقِ اردن میں ایک سو تیس فارن ہائٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ مشرق اور جنوب مشرق کی جانب سے جو گرم ہوائیں چلتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ خوفناک وہ ہے جسے سموم یا شرقی[4] کہتے ہیں یہ حد درجہ موذی اور خشک ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس میں مرطوبیت صرف دس درجے رہ جاتی ہے، یہاں تک کہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر موسم بہار اور موسم خزاں میں چلتی ہے اور اکثر ساحل تک پہنچ جاتی ہے۔ گویا یہ بارشوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ صحرا کے حاشیے میں اس کے اندر ریت کے باریک اور مہین ذرّے بکثرت مل جاتے ہیں غالباً ایسا ہی کوئی دن تھا جب یہ ہوا چل رہی تھی اور مسلمانوں کی عسکری قیادت نے طے کر لیا کہ بیزنطینی فوج سے فیصلہ کن جنگ کی جائے، جو شام کی حفاظت کے لیے لڑ رہی ہے۔ اس طرح یرموک کی فیصلہ کن جنگ پیش آئی (۶۳۶ء)[5]

---

[1] منصور جبر ورق کا مقالہ بہ عنوان ہوا، جبل، لبنان جو مجلہ "الکلیۃ" کی بارھویں جلد میں (۱۹۲۶ء) شائع ہوا ص ۱۳۔ ۱۴۔ ۴۴ نیز ڈی ایشبل ، D. Ashbel کی کتاب فلسطین شرقی اردن، جنوبی شام اور جنوبی لبنان میں بارش کا نقشہ، تیسرا ایڈیشن مطبوعہ یروشلم (۱۹۴۲ء)

[2] جبر ورق کا مقالہ الکلیۃ میں بارھویں جلد ۱۹۲۶ء ص ۴۱۲۔ [3] ڈبلیو، بی، فش (W. B. Fish) کا مقالہ "لبنان" جیوگرافیکل ریویو میں، جلد ۳۴ (۱۹۴۴ء) ص ۲۴۳۔ [4] سموم کے معنی ہیں زہریلی، وبائی، شرقی کا نام مغربیوں نے سرد کو (Sirocco) بنا لیا ہے، عام عقیدہ یہ ہے کہ شرقی ہوائیں دن تک جاری رہتی ہے، جیسے کہ مصر میں ایک ہوا پچاس دن رہتی ہے اور اسے "خمسین" کہتے ہیں۔ [5] اس کا ذکر آگے آئے گا درجۂ حرارت بارش اور ہواؤں کے متعلق چارس گومبر کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ بیروت ۱۹۴۵ء ملاحظہ فرمائیے۔

سطح ارض کی فرسودگی

بارش کے پانی کا بیشتر حصّہ چونے کے پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اس میں سے کچھ مقدار زمین کے نیچے جمع ہو کر چشموں کی شکل میں باہر نکلتی ہے۔ شام و لبنان میں غبار آلود مطلع کا ذکر تو اوپر ہو چکا ہے۔ وہاں چونے کے پتھروں کی بہتات نے ایک اور ناسازگار عامل پیدا کر دیا ہے۔ اس وجہ سے پانی کی بہم رسانی محدود ہو گئی ہے اور انسانوں کی آبادکاری کا دائرہ تنگ ہو گیا ہے، خصوصاً شرقی لبنان میں۔

جو پانی سطح میں جذب نہیں ہوتا، وہ ندیوں اور دریاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب زیادہ بارش ہو تو ان میں طغیانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور موسم گرما کی خشکی میں اگر وہ بالکل بے آب نہیں ہوتے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رستے میں پہاڑوں کی بلندیوں سے پانی زور و جوش کے ساتھ نیچے اترتا ہے تو اس سے زمین میں فرسودگی اور عریانی پیدا ہوتی ہے، یعنی اس کے زرخیز اجزا تحلیل ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مرورِ زماں کے ساتھ وہ خطّے بنجر ہو گئے ہیں جو کسی زمانے میں بڑے آباد، زرخیز اور بارونق تھے۔ اس وجہ سے بعض اہل علم کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ شام میں تاریخی دَور کے اندر موسمی تبدیلیاں ہوئیں اور خشک سالی بڑھتی گئی۔[1] آگے چل کر معلوم ہو گا کہ یہ نظریہ سراسر مغالطہ آمیز شہادت پر مبنی ہے۔[2] مشرقی شام میں بظاہر جس عجیب و غریب صورت حال سے عموماً سابقہ پڑتا ہے، یعنی جو خطّے کبھی بارونق اور آباد تھے، وہ اب بنجر اور بے آباد ہو گئے ہیں، اس کی توضیح کے لئے موسمی تغیرات یا بارش کی کمی بیشی قطعاً سود مند نہیں ہو سکتی۔ وہی چیزیں اب بوئی جاتی ہیں، جو زمانۂ قدیم میں بوئی جاتی تھیں (صرف ان پودوں کو مستثنیٰ کر دینا چاہیے، جو عرب قرونِ وسطیٰ میں مشرق سے لائے یا زمانۂ حاضرہ میں ملکی باشندوں نے امریکہ سے لا کر شام میں کاشت کیے) زمین میں ہل چلانے کے طریقے بھی پرانے ہی ہیں، فصلیں بونے اور کاٹنے کے موسموں میں بھی کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ یہ تمام حقائق اس امر کا ثبوت ہیں کہ موسمی تغیرات کے باعث شام میں خشک سالی قطعاً نہیں ہوئی۔ زمین کی قوت نمو میں کمی نہ آ جانے کے اصل اسباب یہ ہیں کہ بہنے والے پانیوں اور ہواؤں نے پہاڑوں کے اطراف برہنہ کر دیئے ہیں۔ بعض چشمے جو پہلے جاری تھے، بند ہو گئے ہیں۔ جنگل گھٹ گئے یا بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ جانوروں کے چرنے کے باعث وہ جڑیں اکھڑ گئی ہیں، جو زمین کے مختلف اجزا کو یکجا رکھتی تھیں۔ بربریوں کے حملوں اور خانہ بدوشوں کے چھاپوں کی وجہ سے آبیاری کے نظام تباہ ہو گئے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حصوں کی زمین تدریجاً اپنی قوت نمو زائل کر بیٹھی ہو۔[3]

نباتات

علاقۂ شام میں نباتات کے تین مختلف حلقے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ساحلی میدان اور مغربی پہاڑیوں کی زیریں سطح پر ساحلِ بحیرۂ روم کی عام نباتات ہوتی ہے۔ اس حلقے میں بہار کا موسم آتا ہے تو ہمیشہ سبز رہنے والی جھاڑیاں لہلہانے لگتی ہیں، ان میں جلدی سے پھول آ جاتے ہیں، جن کی خوشبو بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن فصلوں سے غذائی جنسیں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً گیہوں، جو، باجرا، یہ ابتدا سے کاشت ہوتی رہی ہیں اور اب بھی کاشت ہو رہی ہیں۔ مکئی کا رواج اس کے بعد ہوا۔ پیاز، لہسن، کھیرے، ککڑی اور دوسری ترکاریاں شروع ہی سے بوئی جاتی

---

[1] ایلسورتھ ہنٹنگٹن (Huntington) کی کتاب Palestine and its Transformation مطبوعہ بوسٹن سنہ ۱۹۱۱ء ابواب ۱۲-۱۴۔

[2] انگریزی متن کا ص ۲۹۳۔

[3] سیمپل (Semple) ص ۱۰۰۔

ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹماٹر اور آلو بھی بوئے جانے لگے ہیں اور نئی دنیا سے تمباکو بھی آگیا ہے۔ امریکہ میں جتنے بھی اناج پیدا ہوتے ہیں (مکئی اور جئی کے سوا) وہ سب یورپ کے راستے ایشیا سے اور خصوصاً مشرق قریب سے آئے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت عام سبزیوں اور حلقہ معتدلہ کے پھلوں کی ہے (ایک امریکی کھجور اور دوسرے پیکن[1] کے سوا[2]) لاذقیہ کا تمباکو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ پرانے زمانے میں انجیر، زیتون، کھجور اور انگور پیدا ہوتے تھے۔ یہ پھل اب بھی کثرت سے ہوتے ہیں اور ان میں پھلوں کی نئی قسموں مثلاً کیلے، مالٹے، سنگترے وغیرہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ گنا عرب فاتحین مشرق سے لائے تھے۔ چونکہ گرمی کے موسم میں بارشیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے بعض فصلوں کو آبیاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ بحیرۂ روم کے سورج کی تیز کرنیں جھلسی ہوئی زمین پر خشک موسم میں روزانہ پڑتی ہیں اور یہ پھلوں کو خوب پکا دیتی ہیں۔ اس حلقے کے عام درخت یہ ہیں۔ معمولی بلوط، بحیرۂ روم کے صنوبر، توت، سفیدے کی قسم کے درخت (زان) جن سے کمانیں بنتی ہیں۔ وہ درخت یقیناً پہلے کثرت سے ہوتے تھے، جن کے پتے خزاں کے موسم میں جھڑ جاتے ہیں۔ پہلے جنگلات کے باعث بلند زمینوں میں فرسودگی کا عمل رُکا ہوا تھا۔ جنگلوں میں جتنی کمی ہوئی، اسی تناسب سے نقصان پہنچا۔

لبنانِ غربی اور لبنانِ شرقی کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سردیوں میں درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔ اس وجہ سے ساحلی حلقے کی جھاڑیاں پودے اور درخت سوکھ جاتے ہیں۔ صرف زیادہ سردی برداشت کر لینے والے درخت باقی رہتے ہیں، مثلاً دیودار، سرو یا صنوبر کی قسم کے دوسرے درخت۔ یہ نباتات کا دوسرا حلقہ ہے۔ لبنان شرقی کے شمالی حصے کی پہاڑیاں بنجر ہیں، لہٰذا ان کی عام کیفیت لبنان غربی سے بالکل مختلف ہے۔

نباتات کا تیسرا حلقہ وہ ہے، جس میں ایک تو گہرے درّے جیسا نشیب آتا ہے اور دوسرے مشرقی شام کی بلند سطح۔ یہاں گرمی بہت پڑتی ہے اور بارش کم ہوتی ہے، اس لیے درخت بالکل نہیں ملتے۔ گھاس اور سبزہ اپنے وقت پر اُگ آتے ہیں۔ معمولی جھاڑیاں یا چھوٹے چھوٹے درخت پائے جاتے ہیں۔ بادیۂ شام کے کنارے جو بلند سطح ہے، اس میں بھی درخت بہت کم ہوتے ہیں، البتہ خشک خاردار جھاڑیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ دریائے عاصی اور دریائے اردن بہت گہرائی میں بہتے ہیں، اس لیے ان سے فصلوں یا باغوں کو پانی دینے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

شرقِ اردن اور حوران کی بلند سطحیں ایسی جگہ واقع ہیں کہ ان کے سامنے ہوا کے رخ سامرہ اور جلعاد کی نسبتاً پست پہاڑیاں ہیں۔ یہ سطحیں اتنی اونچی ہیں کہ خاصی نمی اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ اس طرح سبزہ خوب پیدا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی حوران شام کا اناج گھر تھا اور آج بھی اس کی یہی کیفیت ہے۔ فلسطین سے جو غلہ صور[3] اور یونان بھیجا جاتا تھا وہ غالباً حوران ہی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ نباتات کے یہ تین حلقے اصل میں اس امر کا نتیجہ ہیں کہ شام میں دو مستقل نباتاتی حلقوں کا اتصال ہوتا ہے۔ اوّل بحیرۂ روم کا، دوسرا مغربی ایشیا کی بلند سطح کا حلقہ، لبنان کے پہاڑ بیچ میں آگئے اور ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوگیا۔ ان کی بلندی کے زیرِ اثر نباتات میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اس وجہ

---

[1] Pecan یہ درخت عام طور پر دریائے مسس سپی کے حلقے میں ہوتا ہے۔

[2] والٹر، ٹی سونگل (Swingle) کا مقالہ Trees and Plants We Owe to Asia جو رسالہ "ایشیا" کی تینتالیس جلد (۱۹۴۳ء) میں شائع ہوا۔ ص ۶۲۳۔

[3] سلاطین اوّل باب ۵ آیت ۱۱۔

سے بحیرہ روم کی نباتات میں غیر معمولی تیزی سے بڑی اثرات نمایاں ہو گئے [1] یہی وجہ ہے کہ سمندر سے ساٹھ میل کے اندر اندر ایک جگہ کیلے کاشت کیے جاتے ہیں، دوسری جگہ اتنی شدید برف پڑتی ہے کہ اس پر موسم سرما کے کھیل ہوتے ہیں اور تیسری جگہ صحرائی نخلستان موجود ہیں۔ بہار کے موسم میں درختوں کے پتے کمال پر پہنچ جاتے ہیں اور زمین سبزے سے پٹ جاتی ہے۔ گرمی میں حدت کی تیزی نباتات کو جھلس دیتی ہے تاہم ہر جگہ منظر کا تفاوت بالکل نمایاں ہے۔

زیتون کے درخت

قدیم زمانے میں صرف تین پھل وسیع پیمانے پر کاشت کیے جاتے تھے، جو موسم کی خشکی کا مقابلہ کر سکتے تھے، یعنی انجیر، انگور اور زیتون، انگور کو فونیقی پہلے یونانیوں کی سرزمین میں لے گئے، وہاں سے یہ اٹلی پہنچا، پھر زیتون انگور کے پیچھے پیچھے مشرق سے مغرب گیا۔[2] زیتون کے درخت کی نگرانی اور دیکھ بھال زیادہ نہیں کرنی پڑتی اور پیداوار بہت ہوتی ہے۔ اس کا پھل قدیم زمانے میں بھی طبقۂ زیریں کی خاص خوراک تھا اور آج بھی اس کی کیفیت یہی ہے۔ بیروت کے جنوب میں زیتون کے درخت میلوں تک چلے جا رہے ہیں۔ یہ زیتون کے سب سے بڑے ذخیروں میں شمار ہوتے ہیں۔ زیتون کا تیل کھایا بھی جاتا ہے[3] چراغوں میں بھی جلایا جاتا تھا[4] اس سے مرہم اور خوشبوئیں بھی بنائی جاتی تھیں[5] اور اسے علاج معالجے میں بھی استعمال کیا جاتا تھا[6]۔ سموئیل نبی نے جب بنی اسرائیل کے لیے پہلا بادشاہ چنا تھا اور اسے مسح کیا تھا تو اس کی کپی میں زیتون ہی کا تیل تھا[7]۔ غرض زیتون کے تیل نے ایسی مقدس حیثیت اختیار کر لی کہ آج تک اسے مرنے والوں کی بھووں پر لگایا جاتا ہے۔ اس کا مغز جانوروں کو کھلایا جاتا ہے اور گٹھلیوں کو کوٹ کر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب سے حضرت نوح علیہ السلام کی کبوتری زیتون کی پتی چونچ میں لے کر کشتی میں لوٹی، اس وقت سے زیتون کی شاخ امن و راحت کا نشان بن گئی۔ بائبل کی کتاب قضاۃ میں درختوں کی ایک مجلس کا ذکر ہے، (باب ۹ آیت ۸) اس میں بتایا گیا ہے کہ فلسطین کے درختوں نے زیتون کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنا پہلا بادشاہ نامزد کر دیا۔

دیودار

لبنان کے درختوں میں جو درخت سب سے زیادہ شاندار ہوتا ہے اور جسے سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے، وہ دیودار ہے، جس کی مضبوطی (زبور ۲۹ آیت ۵)، پائداری (یرمیاہ باب ۲۲ آیت ۱۴) عظمت و شوکت (سلاطین حصہ دوم باب ۱۴ آیت ۹، زکریاہ باب ۱۱ آیت ۱-۲) اور دستکاری کے لیے موزونیت (یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۱۴-۱۵) کے قصیدے قدیم زمانے کے شاعروں، نبیوں اور مؤرخوں نے گائے ہیں۔ لبنان قدیم کے باشندوں نے سمندروں میں چلنے والے جو جہاز تیار کیے، ان میں دیودار

---

[1] ایچ، بی ٹرسٹرام (Tristram) کی کتاب The Survey of Western Palestine جس میں فلسطین کی نباتات، حیوانات پر بحث ہے

[2] شام کے جو دوسرے درخت اٹلی پہنچے، ان کے متعلق آگے ذکر آتا ہے۔ [3] تواریخ حصہ اوّل باب ۱۲، آیت ۴۰، حزقی ایل باب ۱۶، آیت ۱۳-۱۹۔ [4] خروج باب ۲۵، آیت ۶، متی کی انجیل باب ۲۵ آیت ۳۔ [5] خروج باب ۳۰ آیت ۲۵۔ سموئیل حصہ دوم باب ۱۴ آیت ۲، زبور ۲۳، آیت ۵۔ [6] یسعیاہ باب اوّل آیت ۶، میکاہ باب ۶، آیت ۱۵، لوقا کی انجیل باب ۱۰، آیت ۳۴۔

[7] سموئیل حصہ اوّل باب ۱۰، آیت پہلی۔

ہی کی لکڑی استعمال ہوئی تھی اور بہترین لکڑی تھی۔ ان دیو داروں کے لئے دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں کے بادشاہوں کے دل میں بھی کشش پیدا ہوئی، جہاں اتنے بڑے درخت پرورش ہی نہیں پا سکتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آج یہ دیودار لبنان کی شان وعظمت میں وہ اضافہ نہیں کرتے، جس کی داستانیں زمانۂ قدیم میں سنائی جاتی تھیں (یسعیاہ باب ۳۵ آیت ۲ نیز باب ۶۰ آیت ۱۳) اب ان کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ باقی رہ گئے ہیں۔ جنہیں لبنان کی برہنہ چھاتی پر پھولوں کا ایک گلدستہ سمجھنا چاہیے اور سب سے بڑا جھنڈ بشتری کے اوپر ہے، جہاں اس کے کوئی چار سو درخت ہوں گے۔ ان میں سے بعض ایک ایک ہزار سال پرانے ہیں اور ابھی تک بڑھتے چلے جا رہے ہیں[۱]۔ ان میں سب سے اونچا دیودار کوئی اسی فٹ بلند ہوگا۔ انہیں عام لوگ "ارز الرب" کہتے ہیں، یعنی "پروردگار کے دیودار" ان میں سے ایک کو موجودہ جمہوریۂ لبنان کا نشان بنا لیا گیا ہے۔ اس سے چھوٹا اور کم عمر جھنڈ "البا روک" کے اوپر جنوبی سمت میں ہے، جہاں اسے "الل" کہا جاتا ہے[۲]۔ دیودار کے ان جھنڈوں سے صدیوں تک فائدہ اٹھایا گیا۔ سب سے آخر میں ترکوں نے ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں ریل کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح پہاڑ بہترین درختوں سے خالی ہو گئے اور زمین میں فرسودگی کا عمل جاری ہو گیا، جس کی وجہ سے درختوں کے دوبارہ اگنے اور فروغ پانے کا سلسلہ رک جاتا ہے۔

حیوانات

بکریوں اور بھیڑوں، خصوصاً بکریوں نے زمین میں فرسودگی کے عمل کا راستہ صاف کر دیا۔ اس لیے کہ پہاڑیوں کے اطراف میں جو گھاس یا چھوٹی چھوٹی پود اگتی تھی، وہ چر لی، زمینی بستگی کا کوئی ذریعہ نہ رہا اور بہنے والے پانی کا عمل زیادہ مصیبت خیز بن گیا۔ چونکہ لبنان کے پہاڑ بہت بلند ہیں اور فلسطین کی سطح مرتفع میں پانی زیادہ چلا جاتا ہے، اس لیے شام میں مویشی اور گھوڑوں کے چرنے کے لیے قدرتی چراگاہیں ہمیشہ کم رہی ہیں، البتہ بھیڑوں اور بکریوں کو خاصا چارا مل جاتا ہے۔

گھوڑا

گھوڑا اصل میں امریکہ کا وحشی جانور ہے۔ یہ اس زمانے میں مشرقی ایشیا پہنچا جب امریکہ اور ایشیا ایک بر اعظم تھے یہ تاریخی دور سے بہت پہلے کی بات ہے۔ نطوفیوں کے زمانے میں فلسطین کے اندر یہ وحشیانہ حالت میں نمودار ہوا[۳]۔ ہندی یورپی خانہ بدوشوں نے بحیرۂ قزوین کے مشرق میں کسی مقام پر اسے رام کر لیا اور پالنے لگے۔ یہ بہت قدیم زمانے کی بات ہے۔ کسّی اسے بڑی تعداد میں دوآبۂ دجلہ و فرات کے اندر لائے۔ وہاں سے گھوڑا مغربی ایشیا میں پہنچا۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے کوئی دو ہزار سال پیشتر کی بات ہے۔ حتیوں نے اسے لیڈیا پہنچایا اور وہاں سے یہ یونان گیا۔ ہکسوس گھوڑے کو شام میں لائے۔ پھر اسے مصر لے گئے۔ یہ مسیح

۱؎ ملاحظہ ہو جارج ای پوسٹ (Post) کی کتاب the Botanical Geography of Syria and Palestine مطبوعہ لندن ص ۳۶، ۳۷، ایلبرٹ ای روتھی Ruthy کی کتاب مطبوعہ برن ۱۹۴۲ء ص ۴۱-۴۲

۲؎ دراصل یہ عرعر کی ایک قسم ہے۔ عبرانی میں ایرز erez اور عربی میں "آرز" Arez دیودار کو کہتے ہیں، لیکن وہ قومی لفظوں میں اکثر التباس ہو جاتا ہے۔ ارز کی لکڑی کو مذہبی حیثیت میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً جو ص سے جسم چھو جائے تو اس کا اثر دور کرنے کے لیے (احبار باب ۱۴ آیت ۴) یا مردے کو چھو کر پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے (گنتی باب ۱۹ آیت ۶) یہ بظاہر صنوبر کی قسم کا ایک درخت ہوتا ہے، جو جنگلوں میں اگتا تھا اور پانیوں کے کنارے بھی ہوتا تھا۔

۳؎ ڈورو تھیا ایم، اے بیٹ Bate کا مضمون جرنل آف دی رائل انتھروپولوجیکل انسٹی ٹیوٹ میں (جلد ۶۲، ۱۹۳۲ء) ۲۷۷، ۲۷۸۔

علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ شام ہی سے گھوڑا مسیحی سنہ کے آغاز سے پہلے عرب پہنچا اور عرب میں گھوڑا اپنی نسل کو اختلاط سے محفوظ رکھنے میں زیادہ کامیاب رہا[۱]۔

اونٹ

گھوڑے کی طرح اونٹ بھی اصلاً امریکہ کا جانور ہے یہ لاکھوں سال پیشتر شمالی اور مشرقی ایشیا میں منتقل ہوا۔ پھر کشمیر اور ہندوستان ہوتا ہوا شمالی و مغربی عرب میں داخل ہوا۔ وہاں سے جنوبی شام گیا۔ کشمیر اور ہندوستان سے اس کی ہڈیاں متحجر شکل میں ملی ہیں۔ اونٹ کے متعلق سب سے پہلے ادبی اشارہ قضاۃ کی کتاب میں ملتا ہے (باب ۶ آیت ۵) جہاں بیان کیا گیا ہے کہ گیارہ صدی قبل مسیح مدیانیوں نے فلسطین پر حملہ کیا تھا۔ اونٹ کے متعلق پہلی تصویر سنگی دور کی ہے، جو حال ہی میں شرقِ اردن کے ایک مقام کلوۃ میں ملی[۲] ہے، جہاں اونٹ درمیانی سنگی دور کے پہاڑی بکرے کے پیچھے رکھا گیا ہے[۳]۔ تصویر ایک چھوٹے کوہان والے اونٹ کی ہے۔ جیسے عام طور پر آج بھی عرب میں ملتے ہیں۔ ایک نہایت عمدہ سانڈنی کی تصویر جس پر سوار بھی موجود ہے، تل الحلف سے ملی اور یہ ۳۰۰۰ء تا ۲۹۰۰ء ق، م کی معلوم ہوتی ہے[۴]۔ سوار کی موجودگی اس امر کی قطعی شہادت ہے کہ اونٹ پالتو جانور بن چکا تھا۔ جبیل میں ایک مصری خاکہ ملا ہے، جو مسیح سے دوسرے ہزار سال پیشتر کے نصف اوّل کا ہے۔ اس میں اونٹ کو لیٹی ہوئی شکل میں پیش کیا گیا ہے[۵]۔ مصر میں اور بھی مجسمے ملے ہیں، جو قدیم بادشاہی (۲۵۰۰ء ق، م) کے ہیں۔ یہ بھی جبیل ہی سے ملے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ اونٹ اس وقت باربرداری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ایک اور جانور، جو ایشیا کے خشک علاقے سے عرب پہنچا، لمبی اون والا دنبہ تھا، جو آج بھی عام ہے۔ اس کا ذکر بائبل میں بھی آتا ہے اور کلاسیکی ادب میں بھی[۶]۔ لبنان میں دنبوں کو موٹا کرنے کی ایک عجیب ترکیب اب تک رائج ہے یعنی چارا زبردستی اس کے منہ میں ڈالتے ہیں، پھر ہاتھ سے جبڑے کو ہلاتے ہیں۔ یہ ترکیب مصر قدیم میں بھی استعمال کی جاتی تھی۔ جیسا کہ غزال نما جانوروں یا بکریوں کی تصویروں سے ظاہر ہے، جو مقبروں پر بنائی گئیں اور چھٹے بادشاہی خاندان تک ان کا سراغ ملتا ہے۔

اونٹ اور گھوڑے کے علاوہ شام میں گدھا، خچر اور بعض دوسرے جانور بھی موجود ہیں، جو باربرداری کا کام دیتے ہیں۔ بکریوں اور بھیڑوں کے علاوہ گائے، بیل، کتوں اور بلیوں کے پالنے کا سلسلہ بھی قدیم زمانے سے جاری ہے۔ مویشی، بھیڑ بکریاں، سؤر اور مرغیاں تمام ایشیائی جانور ہیں جنہیں پرورش کرنے کے بعد یورپ پہنچایا گیا، پھر یہ امریکہ گئے۔ وحشی جانوروں میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں ۔ لگڑ بگڑ یا چرخ، بھیڑیا (اب شاذ ہے) لومڑی، گیدڑ، چکارا اور ہرن، غزال، جو پانی کے بغیر مدت تک رہ سکتے ہیں، اب ناپید ہو رہے ہیں۔ افریقہ کا بارہ سنگا بڑا حیرت انگیز جانور ہے۔ یہ صحراؤں کے اندر پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور غالباً اب معدوم ہو چکا ہے۔ شتر مرغ

---

[۱] ڈاکٹر حتی کی تاریخ عرب ص ۲۰-۲۱ [۲] شرقِ اردن کی جنوبی و مشرقی سرحد پر جبل طبیق میں۔

[۳] ہینس رہوٹرٹ (Rhotert) کی کتاب، نیز ایگنس ہارس فیلڈ (Horsefield) کا مقالہ سفر کلوہ جو جغرافیائی جرنل میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۳ء ص ۷۱-۷۷۔ [۴] خان اوپن ہائم کی کتاب تل الحلف ص ۱۴۰۔ [۵] پیر مونتت (Montet) کی کتاب بابل و مصر (فرانسیسی میں) مطبوعہ پیرس۔

[۶] "خروج" باب ۲۹، آیت ۲۲، "احبار" باب ۳، آیت ۹ ہیروڈوٹس کی تاریخ حصہ سوم باب ۱۳ [۷] سونگل Swingle رسالہ ایشیا میں، نیز حجاز ص ۱۱۹

جو باقی رہ گئے تھے، کوئی تیس پینتیس سال پیشتر جبل طبیق میں مارے گئے۔ شیروں اور چیتوں کا ذکر صلیبی جنگوں کے زمانے میں تھا ۱ے اب یہ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ سانپ، گرگٹ اور بچھو عام ہیں، خصوصاً ملک کے جنوبی حصے ہیں، پرندوں میں سے عقاب، گدھ، اُلو، تیتر اور دوسرے پرندے موجود ہیں، جن سے بائیبل کا مطالعہ کرنے والے بخوبی آگاہ ہیں۔

۱ے اسامہ بن منقذ، کتاب الاعتبار، جسے ڈاکٹر فلپ کے حتی نے ایڈٹ کر کے پرنسٹن سے شائع کیا (۱۹۳۰) ص ۱۰۴-۱۰۳۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا جس کا نام ہے An Arab-Syrian Gentleman and Warrior in the Period of the Crusades ۔ یہ نیویارک میں چھپا، ص ۱۳۴، ۱۷۳۔

حصّۂ دوم

قدیم سامی زمانہ

چھٹا باب

سامیوں کا ظہور

شام کی تاریخ کو سرسری طور پر پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ تاریخ سے پیشتر کا دَور، جس کا ذکر گزشتہ ابواب میں آچکا ہے۔

۲۔ سامی دَور، جس کی ابتدا اموریوں سے ہوئی۔ (سنہ ۲۵۰۰ ق،م کے آس پاس) یہ دَور جدید بابلی (یا کلدانی) سلطنت کے سقوط (سنہ ۵۳۸ ق،م) پر انجام کو پہنچا، ساتھ ہی ایرانیوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔

۳۔ یونانی و رومی دَور، جس کا آغاز سکندر اعظم کی فتوحات سے ہوا (سنہ ۳۳۳ ق،م)۔ جب عرب فتح و نصرت کے پرچم اڑاتے ہوئے شام پر مسلط ہوگئے (۶۳۳ء ۔ ۶۴۰ء) تو یونانی و رومی دَور کا خاتمہ ہوگیا۔

۴۔ عربی و اسلامی دَور، جو عثمانی ترکوں کے تسلط (۱۵۱۶ء) تک رہا۔

۵۔ عثمانی دَور، جو پہلی عالمی جنگ کے ساتھ ختم ہُوا۔

اس طویل اور متنوع تاریخ میں کوئی وقت نہ آیا، جب شام پورے کا پورا وطنی حکمرانوں کے ماتحت آزاد دولت کی حیثیت میں اپنی تقدیر کا مالک بنتا۔ اس کی وحدت ہمیشہ ایک نہ ایک خارجی قوت کے عزم و ارادہ کی بنا پر حقیقت بنتی رہی۔ صرف دو زمانے پیش کیے جاسکتے ہیں، جن میں سیاسی مرکز شام کے اندر رہا:

۱۔ سلوکیوں کی سلطنت کے دوسرے دَور میں، جب انطاکیہ اس سلطنت کا پائے تخت تھا (۳۰۱ ق،م ۔ ۱۴۱ ق،م)

۲۔ اموی خلافت کے زمانے میں جب دمشق (تین براعظموں میں پھیلی ہوئی) سلطنت کا مرکز تھا (۶۶۱ء ۔ ۷۵۰ء)

مسلمان مملوکوں کے ماتحت (سنہ ۱۲۵۰ء ۔ سنہ ۱۵۱۶ء) شام مصر سے وابستہ رہا۔ مصر میں دریائے نیل اور عراق میں دریائے فرات اتحاد و یک جہتی کے عامل بنے رہے، شام میں کوئی ایسا طبعی عامل موجود نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شام کی طبعی وضع و ہیئت وحدت کے بجائے تفرقہ و تنوع پیدا کرنے کا موجب تھی۔

ملک کا نام

اسم "سوریہ"[۱] اپنی وضع میں یونانی ہے۔ ماغاریتی ادبیات میں اس کا ذکر "شرین"[۲] اور عبرانی زبان "سریون"[۳] کی شکل میں آیا ہے[۴]، لیکن

۱۔ Syria

۲۔ Shryn

۳۔ Siryon یہ چودھویں صدی ق،م کے اوائل کی بات ہے۔ سائرس ایم گارڈن (Gordon) کی کتاب مطبوعہ روما سنہ ۱۹۴۵ء ص ۲۴۲

۴۔ استثنا باب ۳ آیت ۹ زبور ۲۹ آیت ۶۔

عبرانی میں یہ نام لبنان شرقی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ آگے چل کر ایک حصّے کا نام کل کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لفظ "لبنان" بھی سامی ہے۔ اگرچہ اس کا ذکر سمیری تحریرات میں آگیا تھا جو دغاریتی اور عبرانی دستاویزوں سے پیشتر کی ہیں۔ سرزمین فرات کے ایک شمالی ضلع کو اہل بابل "سوری"[1] کہتے تھے۔ "سوریہ" اور "اشوریہ" کے درمیان غالباً کوئی اشتقاقی تعلق نہیں ہے[2]۔ یونانیوں کے دور میں اور ان سے بعد کے زمانے میں اس نام کے اطلاق کا دائرہ پھیل گیا اور اسے پورے ملک کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور پہلی عالمی جنگ کے اختتام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ عمومی حیثیت میں یہ نام اس خطے کے لیے بولا جاتا تھا، جو شمالاً جنوباً کوہستان طارس اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان اور شرقاً غرباً بحیرۂ روم اور عراق کے درمیان واقع ہے۔ ہیروڈوٹس کے نزدیک فلسطین شام کا ایک حصّہ تھا اور اس کے باشندے[3] وہ شامی تھے، جو فلسطین میں آباد تھے۔ بالکل یہی حالت ترکوں کے زمانے میں رہی۔ ولیم صوری[4] اور صلیبی جنگوں کے دوسرے مؤرخ بھی فلسطین کو شام کا حصّہ سمجھتے تھے۔ لفظ پلسٹائن[5] بھی اصلاً یونانی ہی ہے۔ اصل میں یہ "فلستیا" تھا، جو ان ہندی یورپی فلسطینیوں کے نام پر مشہور ہوا، جنہوں نے تیرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں ساحلی علاقے پر تصرف جما رکھا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر آچکے تھے اور ملک کے اندرونی حصّے پر قبضے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ پھر یہ نام (فلسطین) پھیلا اور صحرا تک پورے علاقے کے لیے اس کا اطلاق ہونے لگا۔

"سوریہ" اور "سوریین" کی اصطلاحات اصل عبرانی تحریرات میں نہیں آئیں، بلکہ یہ ترجمہ "سبعینیہ" میں آرام اور آرامیوں کے لیے استعمال کی گئیں۔ کلاسیکی دور کے بعض مصنفین غلطی سے سوریوں اور اشوریوں کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ عربوں نے اس ملک کا نام "الشام" رکھا۔ انہوں نے حجاز کو زاویۂ نگاہ کا مرکز قرار دیا۔ اس سے بائیں جانب (شمال) والے ملک کو شام اور دائیں جانب (جنوب) والے ملک کو "یمن" کہا[6]۔ انگریزی لفظ "سیرین"، پورے شام کی آبادی کے لیے قومی نام کی حیثیت میں ماضی قریب تک استعمال ہوتا رہا، لیکن اب اس نام کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے، جو شامی جمہوریت کے باشندے ہیں۔ لسانی اعتبار سے اس اصطلاح میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں، جو سریانی (آرامی) بولتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو عراق اور ایران میں ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ اصطلاح قدیم سریانی مسیحی کلیسا کے تمام پیروؤں کے لیے مستعمل ہے، جن میں سے بعض جنوبی ہند جیسے دور افتادہ علاقے میں متوطن ہیں[7]۔

رومیوں کے نزدیک سیروس[8] وہ تھا، جو سریانی زبان بولتا تھا اور ان کے ہاں ولایت شام کی حدیں دریائے فرات سے مصر تک پھیلی ہوئی تھیں، عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک بھی شام کے حدود یہی تھے[9] اور عثمانی دور کے اختتام تک یہی صورت رہی ہے[10]۔

؎۱ SU-RI تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ ؎۲ ارنسٹ فیلڈ کا مقالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی، جلد ۲۲ (۱۹۴۷ء) ص ۱۷۸-۱۸۱، اس میں اشتقاق تسلیم کیا گیا ہے۔ ؎۳ ہیروڈوٹس کی کتاب اول، دوم، سوم نیز جوزیفس کی کتاب Antiquities ؎۴ William of Tyre ملاحظہ ہو امیلی اے بیبکوک Babcock اور اے سی کرے Krey کی کتاب A History of Deeds Done Beyond the Sea جلد دوم ص ۵ ؎۵ Palestine ؎۶ عربی زبان میں تعبیر ... سنڈ ہی ص ۵۲، ابو الفداص ۲۲۵ - حدود شام کے لیے ملاحظہ ہو ابن حوقل کی کتاب المسالک والممالک ص ۸، یاقوت جلد سوم ص ۲۴۰ ؎۷ تو ہے لفظ سوری قومی اور جغرافیائی اعتبار سے مستعمل ہوتا ہے، سریانی لغوی اور دینی اعتبار سے۔ ؎۸ Syrus ؎۹ الاصطخری ص ۵۵، ابوالفدا ص ۲۲۵۔ ؎۱۰ ملاحظہ ہو مستو کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۱۷، ٹائن بی کی کتاب Survey of International Affairs جلد اول اسلامی دنیا ص ۳۲۷-۳۲۸ کارنیلس دین ڈائک کی کتاب مرآۃ الاولیہ فی الکرۃ الارضیہ مطبوعہ بیروت ص ۱۱۹، ۱۲۰، دوساؤ Dussaud ص ۱۰ Jericho

اس خطّے کی طبیعی اور حضارتی وحدت مسلّم ہے، اگرچہ قومی اور سیاسی وحدت کا وجود نہیں۔ یہ ایک ایسا خطّہ ہے، جس کے مختلف حصّے حضارت کے نقطۂ نگاہ سے فی الجملہ متشابہ ہیں اور آس پاس کے دوسرے خطّوں سے یہ واضح طور پر مختلف ہے۔ صرف اس میں اور "ہلالِ زرخیز" کے مشرقی گوشے (عراق) میں حضارت کے اعتبار سے مستقل حد کبھی قائم نہیں ہوئی۔

فیصلہ کُن تاریخی عوامل

شام اور اس کے باشندوں کی تاریخ کے فیصلہ کُن عوامل تین ہیں:

۱۔ اس کی جغرافیائی وضعیت، یہ مختلف خطّوں کا ایک مجموعہ ہے، جس میں مختلف آبادیاں، قومی شاخیں اور مذہبی اسماد النقاب منعکس ہو رہے ہیں۔ زمین کی سطح اس قدر کٹی پھٹی ہے کہ کسی ایک جگہ بھی اتنا وسیع علاقہ نہیں ملتا، جس میں کوئی زبردست اور جامع حکومت نشو و نما پا سکے۔

۲۔ دوسرا عامل اس کی جنگی حیثیت کا ہے۔ یہ تین برّاعظموں کے درمیان اتصالی کڑی ہے اور اس پر ہر طرف سے خطروں اور حملوں کے دروازے کھُلے پڑے ہیں۔ چنانچہ مختلف اوقات میں بابلیوں، آشوریوں، مصریوں، حتّیوں، ایرانیوں، مقدونیوں، آرامیوں، عربوں، تاتاریوں، ترکوں، صلیبی جنگجوؤں اور دوسرے متفرق گروہوں نے اس پر یورشیں کیں اور وہ پورے خطّے یا اس کے کسی حصّے پر قابض ہو گئے۔

۳۔ تیسرا عامل یہ ہے کہ شام ابتدائی دور کی فعّال حضارت کے دو مرکزوں کی ہمسائگی میں واقع ہے، سُمیری و بابلی حضارت مشرق میں اور مصری حضارت جنوب میں۔ بعد کے دور میں سمندر کے راستے کریٹ، یونان اور روم سے ہندی یورپی اثرات یہاں پہنچنے لگے۔ خشکی کے راستے ایران و ہندوستان سے ہندی ایرانی اثرات یہاں داخل ہو گئے۔

عظیم بین الاقوامی شاہراہ

شام عظیم بین الاقوامی شاہراہ پر واقع تھا، اس وجہ سے بیرونی دنیا کے ساتھ اس کا ربط و ضبط سہل بھی اور مستقل بھی۔ یوں اس پر آفاقیت کی پرچھائیاں پڑی رہیں اور شکست یافتہ جماعتوں اور گروہوں کے باقیات بھی یہیں پناہ لیتے رہے۔ شام ہی کے جنوبی حصّے میں دورِ حاضر کی بہائیت تباہی سے محفوظ ہوئی اور سامریت جیسے قدیم مذہب کے متحجّرات کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کے وسطی حصّے میں دروزی اور مارونی موجود ہیں، جو قرونِ وسطیٰ میں پیدا ہوئے تھے۔ شمالی حصّے میں نصیریوں اور حشیشیوں (اسماعیلی باطنی) کے گروہ اب تک باقی ہیں۔

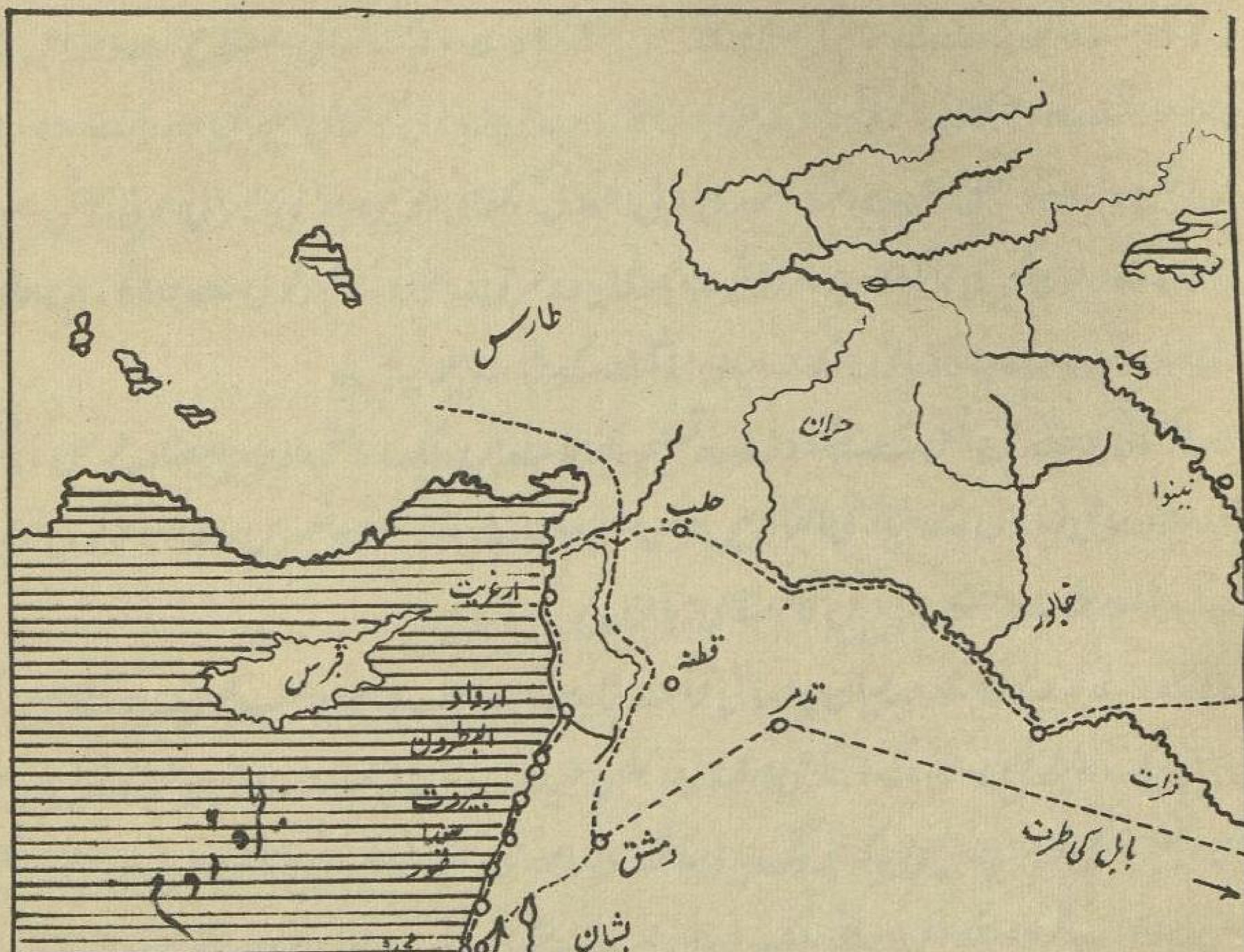
اس عظیم شاہراہ کا سراغ اب بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ دریائے نیل کے ڈیلٹا سے شروع ہوتی تھی اور جزیرہ نمائے سینا کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہیں اس میں سے ایک شاخ نکل کر جزیرہ نما کے تانبے اور فیروزے کی کانوں تک جاتی تھی۔ مزید آگے بڑھ کر ایک اور شاخ جنوبی عرب کی طرف ان سرزمینوں کو جاتی تھی، جو بخور کی مرکز تھیں۔ جزیرہ نمائے سینا کا ساحل ختم ہوتے ہی یہ شاہراہ فلسطین کے ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف مڑ جاتی تھی۔ اس حصّے میں یہ ساحل سے زیادہ قریب نہ تھی۔ کوہِ کرمل کے پاس پہنچ کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی تھیں۔ ایک شاخ صور، صیدا، ببلوس اور شام کی دوسری بندرگاہوں کی جانب جاتی تھی، دوسری شاخ اندر کی طرف مڑ جاتی تھی اور یہ مجدّو کے میدان سے گزرتی ہوئی بالائی دریائے اردن کو عبور کر کے دمشق پہنچتی تھی۔ یہاں سے ایک شاخ بادیۂ شام میں سے ہوتی ہوئی تدمر کے راستے عراق کی طرف نکل جاتی تھی اور اسطرح شام کے مرکز

کو عراق کے مرکز سے ملا دیتی تھی۔ آخرالذکر مرکز مختلف اوقات میں بدلتا رہا۔ پہلے بابل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، پھر بابل کی جگہ مدین نے لے لی اور آخر میں بغداد کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دمشق سے اصل شاہراہ مغرب کی طرف مڑ جاتی تھی اور زبدانی کے راستے لبنان شرقی سے گزرتی ہوئی دریائے عاصی کے ساتھ ساتھ قادش میں سے شمالی شام چلی جاتی تھی۔ قادش سے ایک اور شاخ نکلتی تھی، جو نہر کبیر کی وادی کے ساتھ ساتھ بحیرہ روم کے کنارے پہنچ جاتی تھی۔ اسی شاخ کے ساتھ ساتھ اب ریل کی لائن بن گئی ہے۔ شمالی شام میں اس شاہراہ کی ایک شاخ کوہستان امانوس کے شامی ابواب میں سے گزرتی ہوئی سمندر کی طرف نکل جاتی تھی۔ دوسری شاخ کا رخ شمالی و مغربی جانب تھا۔ یہ کوہستان طاس کے ابواب سلیشیا میں سے ایشیائے کوچک کو جاتی تھی۔ اصل شاہراہ شام کے شمالی گوشے میں سے گزرتی ہوئی مشرقی جانب مڑ جاتی تھی۔ پہلے دریائے فرات، پھر دریائے دجلہ کو عبور کر کے جنوب کا رُخ کر لیتی تھی اور خلیج فارس پر ختم ہوتی تھی۔

سرجون، سنحیرب، بخت نصر، سکندر اعظم، پومپی، عمرو بن العاص، نپولین، ایلن بی، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰؑ اور مقدس خاندان (یعنی مسیح علیہ السلام کا خاندان) سب نے اس بڑی تجارتی شاہراہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور طے کیا۔ اسی شاہراہ سے زمانۂ قدیم اور قرونِ وسطیٰ میں تجارتی قافلے گزرتے رہے۔ مثلاً یہ قافلے افریقہ سے ہاتھی دانت اور سونا لاتے، ہندوستان اور جنوبی عرب سے مُر، بخور اور مسالے چین اور وسطی ایشیا سے ریشم اور کہربا، شام کے پہاڑوں اور میدانوں سے گیہوں اور لکڑی لاتے تھے۔ ان تجارتی قافلوں کے ساتھ جنسوں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں جاتیں، یعنی افکار و خیالات کا غیر مرئی سامان، گیہوں کھالئے گئے، کہربا نے کسی دوشیزہ کی وقتی مسرت کا سامان بہم پہنچا دیا، لیکن افکار سب کے سب مفقود نہیں ہو سکتے تھے۔ بعض افکار شامیوں کے قلوب میں جڑ پکڑ گئے اور وہ جامع حضارت پیدا کرنے میں معاون بنے، جسے شامی حضارت کہتے ہیں اور جو مقامی عناصر اور آس پاس کی حضارتوں سے لیے ہوئے اجزا کا مجموعہ تھی۔ مقامی اجزا بھی انہیں عناصر کے باقیات تھے، جو نقلِ مکان کر کے باہر سے آنے والے، نیز حملے کرنے والے محفوظ کر گئے تھے۔

بدوی اور حضری

چوتھا فیصلہ کن تاریخی عامل یہ ہے کہ پوری سرزمین شام کی سرگزشت خصوصاً اس کے مشرقی اور جنوبی حاشیوں کی سرگزشت اس کے سوا کچھ نہیں رہی کہ بدویوں اور حضریوں کے درمیان مسلسل کشمکش جاری رہی۔ مشرقِ قریب کی پوری تاریخ میں ایک اہم واقعہ یہ رہا کہ بدوی یعنی خانہ بدوش اس لالچ میں آس پاس کی مستقل شہری آبادیوں پر حملوں کا ہنگامہ بپا کرتے رہے کہ وہ بھی شہریوں کی طرح راحت و اطمینان کی زندگی سے مستفید ہو سکیں، شام کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی مدّوجزر کے لیے وقف ہے جو بے چین اور نیم گرسنہ صحرانشینوں کی طرف سے بپا رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ پرامن یا جبری مداخلت کے ذریعے سے ان زمینوں پر قابض ہو جائیں، جن میں کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ خیمہ نشین بدوؤں کے پاس املاک بہت کم تھے، وہ تیزی سے جا بجا حرکت کر سکتے تھے اور مشقتوں کے برداشت کرنے کی ان میں صلاحیت زیادہ تھی، اس لیے مستقل شہری آبادکاروں کے مقابلے میں ان کی کامیابی کے امکانات زیادہ تھے۔ ابتدائی دور کے اسرائیلیوں کی جو داستان عہد نامۂ قدیم کے صفحات پر مرقوم ہے، وہ بدویت سے حضریت اور خانہ بدوشی سے مستقل آبادکاری کی طرف مسلسل منتقل ہوتے رہنے کی ایک نہایت مکمل مثال ہے۔ لیکن اسرائیلی پہلے سامی نہ تھے، جنہیں یہ تجربہ ہوا۔ بہت سے سامی گروہ اسرائیلیوں سے پہلے اور بہت سے ان کے بعد شام کے متعلق ان ہی مراحل سے گزرے۔


شام
قدیم سامی اقوام کے مسکن
اور بین الاقوامی شاہراہیں
0 50 100 150 200
طارس
حران
حلب
نینوا
خابور
قبرس
قطنہ
تدمر
بیروت
صیدا
صور
دمشق
بابل کی طرف
بشان
غزہ
پیٹرا
انباط
تل العمارنہ

سامی کون تھے؟

لفظ سامی سِم سے نکلا ہے۔ یہ نام عہد نامۂ قدیم کے اس لاطینی ترجمے میں آیا ہے، جو جیروم نے چوتھی صدی مسیحی میں کیا تھا۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ سامی حضرت نوحؑ کے سب سے بڑے بیٹے سام کی اولاد تھے۔ علمی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک لسانی اصطلاح ہے اور اس کے مطابق ہر اس شخص کو سامی کہا جاسکتا ہے، جو کوئی نہ کوئی سامی زبان بولتا تھا۔ اب جن زبانوں کو سامی تسلیم کیا جارہا ہے، وہ دوسری زبانوں سے الگ ہیں، لیکن باہم ان کا تعلق مسلّم ہے، مثلاً آشوری، بابلی (اکادی)[1]، کنعانی، فونیقی، آرامی، عبرانی، عربی، حبشی، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان تمام زبانوں کے درمیان گہری مماثلت ہے اور بحیثیت مجموعی یہ دوسری زبانوں کے مجموعوں سے جداگانہ ہیں۔ حامی زبان سامی زبانوں سے تھوڑی بہت قریب ہے۔ ان زبانوں کے درمیان مماثلت کے بڑے بڑے پہلو یہ ہیں:

الفاظ کے مادے ثلاثی ہوتے ہیں۔ فعل کے لیے دو زمانے تسلیم کیے جاتے ہیں: ایک ماضی، دوسرا مضارع۔ فعل کی تصریف بھی اسی اسلوب پر چلتی ہے۔ سامی زبانوں کے بنیادی الفاظ میں خاص مشابہت ہے۔ مثلاً شخصی ضمیریں، وہ اسما جو خونی قرابت ظاہر کرتے ہوں، اعداد جسم کے بڑے بڑے اعضا۔ یہ چیزیں تمام سامی زبانوں میں یکساں ہیں۔

سامی زبانیں بولنے والے گروہوں کے درمیان یہ لسانی قرابت نہایت اہم رابطہ ہے جو ان سب کو ایک رشتے میں رکھنے کی تصدیق کرتا ہے، لیکن یہی ایک رابطہ نہیں، ان کے اجتماعی اداروں، مجلسی عقیدوں، نفسیاتی صفات اور طبعی خط و خال میں بھی مشابہت کے خاصے پہلو موجود ہیں۔ نتیجہ بالکل ظاہر ہے، یعنی یہ کہ جو لوگ بابلی، آشوری، اموری، کنعانی، عبرانی، آرامی، عربی اور حبشی زبانیں بولتے ہیں، ان کے کم از کم بعض اجداد ایک گروہ کے افراد تھے، ایک زبان بولتے تھے اور ایک ماحول میں رہتے تھے، بعد ازاں وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہوئے۔

سامیوں کا گہوارہ عرب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سامیوں کا اصل وطن کون سا تھا؟ جو نظریہ دل کو لگتا ہے، یہ ہے کہ ان کا وطن جزیرۃ العرب[2] تھا۔ عرب کے حق میں جغرافیائی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس کی زمین طبعاً صحرائی ہے اور تین طرف سے اسے سمندر نے گھیر رکھا ہے، اس سرزمین میں ایسے خطے بہت تنگ ہیں، جن میں انسان رہ سکتے ہیں۔ جب آبادی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطے باشندوں کے لیے ضرورت کی چیزیں بقدر کفایت بہم نہیں پہنچا سکتے، تو لوگ اِدھر اُدھر نئی زمینوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور ایسی زمین صرف شمالی جانب ہے اور زمینیں زیادہ سرسبز اور زرخیز بھی ہیں۔ یہ اقتصادی دلیل ہے، جو اس اصل پر مبنی ہے کہ عرب خانہ بدوش ہمیشہ گرسنگی کی سرحد پر رہے اور ہلال زرخیز ہی نزدیک

---

[1] اکاد (و) سامی کلمہ ہے، جو سومیری کلمہ اگادے (Agade) کے مقابل ہے۔ یہ ابتداً میں سرجون کے دار الحکومت کا نام تھا، جس نے پہلی سامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، لیکن اب اس لفظ کا اطلاق ملک پر ہوتا ہے۔ یہ شہر اس مقام پر واقع تھا، جہاں دجلہ و فرات بالکل قریب آگئے ہیں اور اس کا ذکر کتاب پیدائش میں بھی آتا ہے (باب ۱۰، آیت ۱۰)۔

[2] جزیرۃ العرب کے باشندوں کو عرب کہتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی عرب ہی کہا جاتا ہے، جو عربی زبان بولتے ہیں، خواہ قومیت کے لحاظ سے وہ ایرانی ہوں یا عراقی، شامی ہوں یا مصری وغیرہ۔ مسلمانوں کی فتوحات کے باعث انھوں نے عربی زبان اختیار کر لی اور وہ اوضاع و اطوار میں بڑی حد تک مسلمانوں کے سے ہو گئے۔ اس امتیاز کی ضرورت پر سب سے پہلے ڈاکٹر حتی نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں توجہ دلائی، ص ۴۳ حاشیہ نمبر ۳۔

ترین جگہ تھی، جو ان کے لیے ضرورت کی چیزیں مہیا کرتی تھی۔

سنہ ۳۵۰۰ ق، م کے آس پاس سامیوں نے جزیرۃ العرب سے شمال مشرق کی طرف حرکت شروع کی اور ان کے خانہ بدوش گروہ عراق کی طرف سمیری آبادی پر چھا گئے، جو وہاں مستقل طور پر رہتی تھی اور تہذیب کے اعلیٰ پیمانے پہ پہنچ چکی تھی۔ اس طرح عراق میں وہ قوم پیدا ہوئی، جسے تاریخ میں اکادی کہا گیا ہے۔ بعد میں انہیں بابلی کہنے لگے۔ سامی خانہ بدوشوں نے عراق پہنچتے ہی اپنے غیر سامی پیشروؤں سے میل جول پیدا کر لیا، نیز ان کے ساتھ شادیاں شروع کر دیں۔ انھیں سے خانہ بدوشوں نے تعمیر کا فن سیکھا، چنانچہ وہ مکان بنا کر رہنے لگے۔ زمینوں میں کھیتی باڑی اور آبیاری شروع کر دی۔ ان سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ انہوں نے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا جو سامی زبان وہ اپنے ساتھ لائے تھے اسی کو فروغ حاصل ہوا، وہی زبان بڑی لمبی مدت تک سرزمین فرات کی حضارت کے لیے ترجمانی کی خدمات انجام دیتی رہی۔

پہلے نقل وطن سے کوئی ایک ہزار سال بعد ہجرت کی دوسری حرکت شروع ہوئی، جس میں اموری شام کے شمالی میدانوں میں پہنچے، یہ ہجرت ان لوگوں نے کی تھی جو بعد ازاں ساحلی میدان پر قابض ہوئے وہ اپنے آپ کو کنعانی کہتے تھے۔ یونانیوں نے ان سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھے اور انہیں فونیقی کہہ کر پکارتے تھے۔

سنہ ۱۵۰۰ ق، م اور سنہ ۱۲۰۰ ق، م کے درمیان عرب سے تیسری ہجرت ہوئی، جس میں آرامی لوگ شام کے نشیبی حصے اور خطۂ دمشق میں پہنچے۔ اسی زمانے میں عبرانیوں نے ملک کے جنوبی حصے میں توطن اختیار کیا۔ سنہ ۵۰۰ ق، م میں پھر ہجرت کا طوفان اٹھا۔ اس طوفان کے ذریعے سے نبطیوں نے جزیرہ نمائے سینا کے شمال مشرق میں اپنا حلقہ قائم کر لیا۔ ان کے دار الحکومت کا نام بترا تھا، جس نے رومیوں کی سرپرستی میں حیرت انگیز تہذیبی برتری حاصل کر لی۔

عرب سے انسانوں کا جو آخری بڑا سیلاب باہر نکلا، وہ ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں اسلامی پرچم کے نیچے نکلا اس سیل نے نہ محض شام کو، بلکہ پورے "ہلال زرخیز"، مصر، شمالی افریقہ، ایران، ہسپانیہ اور وسط ایشیا کے مختلف حصوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا جو لوگ عرب کو سامیوں کا وطن تسلیم کیے بیٹھے ہیں، ان کی طرف سے یہ آخری ہجرت تاریخی حجت کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ لسانی دلیل کا بھی اضافہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربی زبان نے اصل عامی ام الالسنہ کے ساتھ اپنا گہرا تعلق رکھا اور تمام سامی زبانیں اسی ام الالسنہ کی مختلف بولیاں تھیں۔ ایک نفسیاتی ثبوت بھی دیا جاتا ہے، یعنی یہ کہ عربوں، خصوصاً صحرا کے باسیوں نے اپنے خالص ترین سامی اوصاف برقرار رکھے۔

ان ہجرتوں کے درمیان قریباً ایک ایک ہزار سال کا فصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے ذخیرۂ افراد کو پوری طرح بھر کر چھلک جانے کے لیے اتنی ہی مدت درکار رہتی تھی۔ ان طغیانیوں کو بعض اوقات لہریں قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ہجرتیں تاریخ کی عام انسانی ہجرتوں سے مختلف نہ تھیں۔ طریقہ یہ رہا کہ پہلے تھوڑے سے آدمی باہر نکلتے، پھر دوسرے ان کی پیروی کرتے۔ یہاں تک کہ ایک تانتا بندھ جاتا اور ہجرت کمال پر پہنچ جاتی۔ پھر اس کا زور کم ہوتے ہوتے یہ بالکل ختم ہو جاتی۔ ہجرت کا ذکر اس وقت تاریخ کے اوراق پر ثبت ہوتا، جب یہ پورے زور پہ پہنچ جاتی تھی اور وسیع پیمانے پر اس کی شہرت ہو جاتی، اگرچہ حقیقت میں یہ سلسلہ قرنوں پہلے اور قرنوں بعد تک جاری رہتا۔

ساتواں باب

شام میں پہلا بڑا سامی گروہ — اموری

اموریوں کی آمد

سامیوں کا جو پہلا بڑا گروہ بہ تلاشِ وطن شام کے حلقے میں پہنچا اور وہاں آباد ہو گیا کچھ معلوم نہیں کہ اُس نے اپنا نام کیا بتایا، لیکن اس کے مشرقی ہمسایوں، یعنی سمیریوں نے ان کا نام "اموری" بتایا۔ یہ لفظ غیر سامی ہے اس کے معنی ہیں "اہلِ مغرب" اموری حکومت کا مرکزی مقام "ماری" تھا، جو دریائے خابور (یہ بھی سمیری لفظ ہے) کے دہانے سے تھوڑی دُور جنوب میں واقع ہے۔ اشتقاقی نقطۂ نگاہ سے یہ نام مُلک کے نام کا مترادف ہے۔ ملک کا نام "امورو" اور مارتو[۱] تھا یعنی مغربی جانب کی زمین۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اموریوں کے ابتدائی دیوتا کا نام تھا، جو جنگ اور شکار کا دیوتا تھا۔ بعد ازاں بابلیوں نے اس نام کا دائرہ بڑھا لیا اور وہ پورے شام کو اسی نام سے یاد کرنے لگے۔ وہ بحیرہ روم کو بھی "امور کا بڑا سمندر" کہتے تھے۔

اموریوں کی سرزمین کے متعلق پہلا اشارہ سرجون کے عہد میں ملتا ہے (۲۳۵۰ ق۔م) سامیوں کی تاریخ میں یہ پہلا عظیم الشان نام ہے[۲]۔ تدریجاً اموری وسطِ شام، لبنان اور فلسطین میں نمودار ہونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ لبنان، صیدا[۳] اور عسقلان نام شہروں کے اسماء کا آخری حصہ اموری ہے۔ شہر عمریت[۴] فونیقی ساحل کے شمالی حصے میں واقع ہے۔ یہ اب تک اموریوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اموریوں کی آمد سے پیشتر شام حوریوں اور دوسرے غیر سامی گروہوں سے بھرا ہوا تھا۔ اموریوں نے ملک پر سامیت کا رنگ چڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ البتہ کہیں کہیں محدود حلقے باقی رہ گئے اور یہ سلسلہ اب تک بدستور جاری ہے۔ بلادِ امورو پر سرجون کے قبضے سے پیشتر "ماری" ایک ابتدائی سمیری خاندانِ حکومت کا مرکز تھا۔ سرجون نے سمیری فاتح کو معزول کر دیا، جس کا نام لوگال زاگیزی[۵] تھا اور وہ ارک[۶] کا رہنے والا تھا۔ اس کا ایک سکہ آثارِ قدیمہ سے برآمد ہوا ہے، اس میں زاگیزی بتاتا ہے کہ میں نے سورج کے طلوع ہونے سے، سورج کے غروب ہونے تک پوری زمین مسخر کر لی اور میں نے دجلہ و فرات کے بحرِ زیریں سے بحرِ اعلیٰ تک راستہ سیدھا کر لیا[۷]۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر دوسرے ہزار سال کی پہلی صدی میں یہ مرکزی شہر اور اردگرد کے علاقے آبادی، حضارت اور حکومت کے اعتبار سے کاملاً اموری بن گئے۔ یقین ہے کہ ان سامی حملہ آوروں نے دوآبۂ دجلہ و فرات کے کسی آباد مہذب معاشرے پر مسلط ہو کر ترقی کی دوڑ شروع

---

۱ A-MUR-RU   MAR-TU

۲ ملاحظہ ہو Arno Poebel کی کتاب Historical Texts (فلاڈلفیا ۱۹۱۴ء) ص ۱۷۷ ۳ اس کا عربی نام صیدا ہے، انگریزی Sidon ہیں نے صیدا اس لئے لکھا ہے کہ یہاں نام کے آخری حصے یعنی "ان" کا اظہار ضروری تھا ۴ Amrit قدیم مصر میں MRT اور کلاسیکی دور میں اسے مراتھوس کہتے تھے ۵ Lugal-zaggisi ۶ Erech

۷ F. Thureau-Dangin کی کتاب مطبوعہ لائپزگ ۱۹۰۱ء ص ۱۵۵۔

کی ہوگی اور ہم قیاس کر سکتے ہیں، اس سے پہلے یہ لوگ شمالی علاقے اور البقاع میں بسنے لگے اور ریوڑ چراتے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔

ایک سمیری شاعر سنہ ۲۰۰۰ ق م سے کچھ پیشتر کا معلوم ہوتا ہے، اس نے خانہ بدوشی اور جانور پالنے کی زندگی کے بجائے استقرار و زراعت کی زندگی اختیار کر لینے کا ذکر ایک ڈرامے میں کیا ہے۔ اس زمانے میں اموری بابل پر قابض ہو چکے تھے۔ شاعر کہتا ہے

ہتھیار اموری کے دائمی رفیق ہیں۔
وہ کسی کی کبھی اطاعت نہیں کرتا
کچا گوشت اُس کی غذا ہے۔
وہ زندگی بھر مکان کا مالک نہیں بنتا۔
اگر اس کا رفیق مرجائے تو اُسے دفن نہیں کرتا
(اب) مارتو مکان کا مالک ہے۔
(اب) اس کے پاس غلہ ہے[۱]

خانہ بدوشی کی زندگی میں اموریوں کا انحصار زیادہ تر گدھے پر تھا، اس لئے کہ اونٹ کی پرورش اس وقت تک وسیع پیمانے پر شروع ہی نہیں ہوئی تھی[۲]۔ اٹھارھویں صدی قبل مسیح تک بھی وہ قربانی کے لئے گدھے ہی استعمال کرتے تھے۔

اموریوں نے دریائے فرات کے وسطی حصے کے پاس ایک حکومت کی بنیاد رکھی۔ پھر انہوں نے نہ صرف شام کو، بلکہ خاص دوآبۂ دجلہ فرات کو بھی پامال کر ڈالا اور وہاں فرمانروائی کرتے رہے۔ سنہ ۲۱۰۰ ق م سے سنہ ۱۸۰۰ ق م تک انہوں نے متعدد خاندانوں کی حکومتیں استوار کیں، جو شمال میں آشور سے جنوب میں لارسا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر اہم خاندان وہ تھا، جس کا مرکز بابل تھا۔ بابل میں یہ غالباً پہلی حکومت تھی۔ یہ شہر ہے، جس سے زمانۂ قدیم کا مشہور واضع قانون منسوب ہے یعنی حمورابی[۳] (وفات سنہ ۱۶۸۶ ق م کے آس پاس)، یہی حمورابی تھا، جس نے "امور" کو فتح کر کے سلطنت بابل میں شامل کر لیا تھا۔

اس فتح نے ماری کو قعرِ گمنامی میں دفن کر دیا۔ چند سال پیشتر ایک مقام پر کھدائی شروع ہوئی، جسے "تل الحریری" کہتے ہیں، جب آثار نمودار ہوئے تو پتا چلا کہ یہ قدیم شہر "ماری" کے کھنڈر ہیں[۴]۔ زمانۂ حاضر میں قدیم زمانے کے جو آثار دریافت ہوئے ان میں سے "ماری" کے آثار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان آثار میں بیس ہزار سے زیادہ تختیاں نکلیں، جن پر میخی خط کے کتبے تھے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ایڈورڈ چیرا Chiera کی کتاب Sumerian Religious Texts مطبوعہ سنہ ۱۹۳۲ء ص ۲۰ - ۲۱

[۲] ایلبرائٹ کی کتاب The Stone Age ص ۱۲۰ - ۱۲۱ [۳] ایلبرٹ کی کلے (City) کی کتاب Amurru : The Land of the Northern Semites مطبوعہ سنہ ۱۹۰۹ء اور The Empire of the Amoraes بتایا گیا ہے کہ بابلی سامیوں کی حضارت اگر اموری بلاد میں شروع نہ ہوئی تو کم از کم اس نے نشو و نما وہیں پائی۔ نیز اموری جو تھے اور پانچویں ہزار سال ہی میں وسیع سلطنت کے مالک تھے اور یہ بے اصل ہے کہ سامیوں کا اصل وطن عرب ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

[۴] کھدائی Andre Parrot نے کرائی، فرانسیسی زبان میں اس کی رپورٹیں دیکھیے۔ یہ شہر زمانہ قدیم میں دریا کے کنارے پر تھا۔ اب ایک میل سے زیادہ فاصلے پر ہے۔

نینوا سے باہر کوئی ایسا مقام پیش نہیں کیا جا سکتا، جہاں سے تختیوں کی اتنی بڑی تعداد نکلی ہو۔ زبان زیادہ تر اکاذی ہے۔ لیکن الفاظ اور صرفی و نحوی خصوصیات پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جس نے یہ عبارتیں لکھیں، وہ اموری یا مغربی سامی زبان بولتا تھا اور یہ زبان اکادی یا مشرقی سامی زبان سے مختلف ہے۔ یہ تختیاں "زمری لیم[1]" کے محافظ خانے یا دفتر خانے کی ہیں، (عہد حکومت قریباً ۱۷۳۰ء ق م۔ ۱۷۰۰ء ق م) یہ ماری کا آخری بادشاہ تھا اور اس کی سلطنت اس عہد کے عظیم ترین تاجدار حمورابی نے برباد کی تھی۔ ان تختیوں میں بادشاہوں اور سرکاری عہدیداروں کے خطوط ہیں، کاروباری انتظامی اور اقتصادی دستاویزیں ہیں اور نہایت قیمتی رپورٹیں ہیں[2]۔ ایک تختی سے واضح ہوتا ہے کہ گھوڑوں کے ذریعے سے چلنے والے رتھ رواج پا رہے تھے۔ قومی دفاع کے موقع پر آگ جلا کر ایک دوسرے کو آگاہ کر دیا جاتا تھا اور اسی ذریعے سے خطرے کی خبریں دُور دُور پہنچائی جاتی تھیں۔ اموری تہذیب کا جو نقشہ اس زبان میں منعکس ہُوا ہے، جو ان کی تحریر کا ذریعہ تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اموری حوری اور بابلی عناصر کا مرکب تھی۔

ان تختیوں میں حلبو (حلب) کو یمخاض[3] کا مرکز بتایا گیا ہے۔ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ (جبیل، بیبلوس) میں کپڑے بُننے جانتے تھے اور ان سے عمدہ لباس بنائے جاتے تھے، قطنہ (موجودہ نام المشرفہ جو حمص کے شمال مشرق میں ہے) بھی بڑا اہم مرکز تھا۔ حرانو موجودہ عربی نام حرّان، بائیبل کا نام حاران) میں ایک اموری امارت قائم تھی۔ حرّان ہی وہ مقام ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السّلام فلسطین میں عبرانی قوم کی بنیاد رکھنے سے پہلے عراق سے آتے ہوئے ٹھہرے تھے۔ دراصل ان دستاویزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام اموری حکمران خاندانوں یا اموری شہزادوں کے مرکز تھے، نیز ۱۸۰۰ء ق م کے آس پاس بحیرۂ روم سے عیلام کی سطح مرتفع تک پورے علاقے میں اموریوں نے تسلط جما رکھا تھا۔ جبیل کے امیروں میں سے ایک کا نام ینتن عمو بتایا گیا ہے۔ یہ نام اموری ہے اس لیے کہ اموری زبان میں عمو کے معنی قبیلے کے ہیں۔

زمری لیم کے جس محل سے میخی خط کی تختیاں نکلی ہیں، اس کے کوئی تین سو کمرے تھے اور ان کی دیواروں پر نہایت عمدہ تصویریں اور حاشیے بنے ہوئے تھے۔ تصویریں آدمیوں اور دیوتاؤں کی تھیں۔ ایک تختی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل دنیا بھر کے لئے زیارت کے قابل تھا۔ یہ چھ ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہُوا تھا۔ اس میں غسلخانے بھی تھے اور بیت الخلاء بھی بڑے عمدہ بنے ہوئے تھے[4]۔ دو کمروں میں بینچ اور ڈیسک پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ درس گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ایک نہایت عمدہ رنگین تصویر بادشاہ کی بنائی گئی تھی، جس میں اسے عشتار دیوی سے زینت وطاقت کا نشان لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ محل کی طرز تعمیر اور دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حضارت نے بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا تھا اور پہلے اتنی ترقی کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ حضارت مصر اور عراق سے لگا کھاتی تھی۔

---

[1] Zimri-Lim اموری زبان میں اس کا صحیح نام یمرلیم تھا۔ ملاحظہ ہو البرائٹ کا مقالہ جو Bulletin, American Schools of Oriental Research میں چھپا۔ [2] جارج دوسن (Dossin) ص ۹۷، ۱۱۳ [3] Yamkhad

[4] جارج دوسن کے مجلہ Syria (شام) جلد ہفدہم (۱۹۳۶ء) میں ایک تصویر میں مٹی کے دو پکائے ہوئے ٹب دکھائے گئے ہیں ان میں سے ایک شاید گرم پانی کے لئے تھا اور دوسرا سرد پانی کے لئے۔ یہ ٹب دائیں جانب تھے اور بیت الخلاء بائیں جانب۔

شامی گزرگاہ

اموریوں کی سرزمین میں خوشحالی کا جو دَور دَورہ تھا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اُنہوں نے کھیتی باڑی کے لئے آبیاری کا انتظام کر رکھا تھا دوسرے یہ کہ ہمسایوں کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ خلیج اسکندرونہ کے پاس سمندر زمین کے بڑے حصّے کو کاٹتا ہُوا اندر آگیا ہے جہاں سے دریائے فرات کے مغربی موڑ تک کوئی ایک سو میل کا فاصلہ ہوگا۔ یہاں ساحل اور خطّۂ دوآبہ کے درمیان زمین نے ایک قدرتی گزرگاہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ گزرگاہیں تجارت کے علاوہ افکار و خیالات کے لئے بھی بہت اہم ہیں۔ ان کے ذریعے سے مختلف حضارتوں کے درمیان میل جول کا عمل جاری ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر شمالی و مغربی جانب سے پہاڑوں اور جنوبی جانب سے صحرا کی رکاوٹیں ختم ہوگئی ہیں اور یہ ایک راستہ بن گیا، جو ایک طرف ایک وادی میں پہنچاتا ہے اور دوسری طرف سمندر کے کنارے لے جاتا ہے۔ اسے شامی گزرگاہ قرار دینا بہت ہی مناسب تھا۔ یہ گزرگاہ کوہستانِ طارس کے پائین میں واقع ہے لہٰذا بعض اوقات اسے "دامن کوہ" بھی قرار دیتے ہیں۔ یہ اس خطِّ مواصلات کا آخری سرا ہے جو خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جاتا ہے اور نینوا کے حوالی میں پہنچ کر مغربی جانب مُڑ جاتا ہے، پھر شام کی بندرگاہوں میں پہنچتا ہے۔ زمانۂ ماضی میں اس خط نے تل الحلف، حرّان، ماری، حلب اور دوسرے قدیم شہروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔ اسی میدان سے شام کی مسلسل تاریخ کا آغاز ہُوا۔ اموری، سامیوں کے پہلے نمائندے تھے۔ ان کے بعد بابلی، مصری، حاشوری، کلدانی، ایرانی اور مقدونوی یکے بعد دیگرے یہاں آئے۔ اسے گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا اور اپنے زیرِ اثر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس میدان میں سالانہ دس انچ سے بیس تک بارش ہوتی ہے اور اتنا سبزہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آنے جانے والے قافلوں کے جانور پیٹ بھر سکیں۔ بارش کے بعد اس کی عام صورت گولف کے میدان کی سی ہوتی ہے۔ کوہستانِ طارس سے جو ندی نالے آتے تھے، وہ نیز دریائے فرات سے نکلنے والی نہریں اس حصے کے شہروں کو پانی بہم پہنچاتی تھیں۔

اموریوں کے مرکز میں تبدیلی

حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل دوسرے ہزار سال کے موڑ پر معاملاتِ شام کا مرکز شمال میں تھا اور اموری اس کی تاریخ میں ممتاز ترین کردار ادا کر رہے تھے۔ چودھویں صدی قبل مسیحؑ میں یہ مرکز شمال سے وسطی شام کی طرف منتقل ہوگیا۔ اموری اس وقت تک مرکزی حیثیت کے مالک تھے۔ اس اثنا میں مصر نے سامراج کے راستے پر گامزنی شروع کر دی تھی اور شاہ تموتس (وفات ۱۴۴۷ق م) بزورِ شمشیر شام کے بڑے حصّے پر قابض ہو چکا تھا۔ تموتس کو مصر کے اٹھارھویں حکمران خاندان کا نپولین سمجھنا چاہیئے ایک اور عظیم الشان قوت جو مصر کی حریف بن رہی تھی، شمالی اُفق پر نمایاں ہو رہی تھی یہ ہٹّی (بائیبل کے حتّی) تھے۔ ان دو بڑی طاقتوں کے درمیان اموریوں کی سلطنت پھنس گئی تھی، یعنی وسطی شام کی سلطنت۔ تل العمارنہ کی تختیوں سے ——— اور یہ ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں ——— اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عروج کے اوج پر اموری شمالی لبنان کے بڑے حصّے، ساحلی میدان، نشیبی شام، مشرقی لبنان اور خطّۂ دمشق پر قابض تھے۔ ان کے ایک حکمران کا نام عبد عشرتا[1] تھا۔ یہ حکومت مصر کا باجگزار تھا، اس کا

---

[1] یعنی عشرتا یا عاشترہ نام دیوی کا غلام۔ مفصل ذکر آگے آئے گا۔

نام اس وجہ سے تاریخ کے صفحات پر آگیا کہ اس نے بہت ہی معمولی اور حقیر اکادی زبان میں ——— جو اس دور کی عام زبان تھی ——— مصر کے فرعون امنحوتپ ثالث (وفات ۱۳۷۵ ق م) کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کی ابتدائی عبارت ہمیں بہت ہی ذلیل و حقیر معلوم ہوگی، لیکن اس عہد میں رسمی خطوط لکھنے کا طریقہ یہی تھا۔ خط مظہر ہے :-

"اے بادشاہ، اے سورج دیوتا، اے میرے آقا، حضور کا غلام، حضور کی خاکِ پا، عبد عشترتا عرض کرتا ہے، میں اپنے بادشاہ، اپنے آقا کے قدموں میں سات مرتبہ کورنش بجا لاتا ہوں، پھر سات مرتبہ کورنش بجا لاتا ہوں۔ واضح رہے کہ میں بادشاہ کا خادم اور اس کے گھر کا کتا ہوں اور تمام امور میرے بادشاہ، میرے آقا کے محافظ و نگہبان ہیں"۱؎

اس خط کی تحریر کے وقت عبد عشترتا فونیقی شہر ارقہ۲؎ میں تھا، جسے اس نے فتح کر لیا تھا، لیکن اس کی سلطنت کا مرکز اس حلقے میں تھا، جو دریائے عاصی کے بالائی حصے میں تھا۔ اس نے امکی۳؎ کی تسخیر میں حتیوں کو امداد دی تھی، لیکن اب وہ دونوں فریقوں کو دھوکا دے کر اپنی سلطنت کی حدیں بڑھانے کے لیے کوشاں تھا، یعنی ایک طرف مصر کو وفاداری کا یقین دلا رہا تھا، دوسری طرف بظاہر حتیوں سے تعاون کر رہا تھا، جو آگے بڑھے چلے آ رہے تھے، تاہم اس کی اصل غرض یہ تھی کہ اپنے لیے نئے علاقے فتح کر لے۔ عبد عشترتا اور اس کے بیٹے ازیرو نے ساحلی اور اندرونِ ملک کے شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا یا انہوں نے اور ان کے حامیوں نے ان شہروں کو لوٹا۔ مصر کے بعض باجگزاروں کو اس نے رشوت دے کر ساتھ ملا لیا، بعض کو ختم کر دیا۔ پہلے قطنہ پر قبضہ کیا، پھر حماۃ لے لیا، خطۂ دمشق۴؎ کا شہر اوبی خطرے میں پڑ گیا اور آگے چل کر خود دمشق پر قبضہ جما لیا گیا۔ ساحلی شہروں میں سے ارواد، شیغاتا، امبی، اتبرون وغیرہ۵؎ فتح کر لیے۔ اہلِ ارواد غالباً اس لیے تموتمس کے زمانے سے مصریوں کے مخالف بن گئے تھے کہ انہیں اہلِ جبیل کے ساتھ تجارتی رقابت تھی۔ صرف سیمیرا۶؎، جو مصری نائب السلطنت کا مرکز تھا اور جبلہ۷؎ باقی رہ گئے۔ آخری مقام کنعانی اتیر کا مرکزِ حکومت تھا، جو مصریوں کا حامی تھا۔ اسے اندرونِ ملک اور ساحل پر بھی سیمیرا تک اقتدار حاصل تھا۔ آخر سیمیرا بھی حوالگی پر مجبور ہوا اور جبلہ کا سلسلہ اندرونِ ملک سے کٹ گیا اس کا گزارا اندرونِ ملک سے لائی ہوئی لکڑی

۱؎ جے۔ اے۔ نڈزن Knudtzon سنہ ۱۹۰۶ء اے۔ ایچ Sayce کی کتاب Records of the Past, نیا سلسلہ جلد پنجم ص ۹۷-۹۸۔ سیموئیل اے، بی، مرسر، دستاویزوں Mercer تل العمارنہ کی تختیاں سنہ ۱۹۳۹ء۔

۲؎ مصری دستاویزوں میں اسے RQT لکھا ہے، کلاسیکی دور میں یہ Arka کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام "عرقہ" ہے اور یہ طرابلس الشام کے شمال مشرق میں بارہ میل پر، نیز کتاب پیدائش۔ باب ۱۰۔ آیت ۱۷، اور تواریخ حصہ اول باب، آیت ۱۵۔

۳؎ Amki انطاکیہ اور حماۃ کے درمیان ایک میدان

۴؎ تختیوں میں اسے DI-MASH-QA لکھا ہے۔

۵؎ AR-WA-DA SHI-GA-TA, BAT-RU-NA شیغاتا وہ مقام نہیں جسے آج کل زغرتا کہتے ہیں اور عماری کے رسم الخط میں اسے Sagaratim لکھا ہے، بلکہ یہ شکا ہے جو البترون کے شمال میں ہے، امبی وہی مقام ہے جسے اشوری Ampa کہتے تھے عرب انفہ کہنے لگے، صلیبیوں نے اسے Nephin بتایا، آج کل بھی اسے انفہ کہتے ہیں، یہ شکا اور طرابلس کے درمیان ہے بترونہ کو یونانیوں نے Botrys لکھا، آج کل البترون کہتے ہیں، دیکھیے Abel کا Geographic جلد دوم ص ۴ نیز Dussaud ص ۱۱۷۔

۶؎ Simyra مصری دستاویزوں میں اسے SU-MUR اور DMR لکھا ہے، کلاسیکی تلفظ Simyro اور موجودہ نام غالباً سمرا ہے یہ نہر الکبیر کے دہانے کے شمال میں ہے۔

۷؎ بائبل میں جبل، یونانی ببلوس، لاطینی ببلوس، موجودہ جبیل

۸؎ Rib Addi

مصریوں کے ہاتھ فروخت کرنے پر تھا۔ اب اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ ربّ عدی نے رو رو کر کوئی پچاس[۱] خط فرمانروائے مصر کے نام لکھے، جن میں عبد عشرتا "کلب شاہ مصر" اور اس کے بیٹے زیرد کی غداری کی کیفیت بتائی اور امداد کے لئے پُر زور درخواستیں کیں، لیکن یہ کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

ایک موقع پر امنحوتب نے ذرا ہمت کی اور ایک جیش شام بھیج دیا، حالانکہ اس کا پیشرو تحوتمس خود فوج لے کر وہاں گیا تھا — اس کے بھیجے ہوئے جیش نے سیمیرا پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور بغاوت کی آگ عارضی طور پر فرو کر دی، لیکن شمال کی طرف حتّیوں کی پیش قدمی نے جو زبردست خطرہ پیدا کر دیا تھا، اس کا مقابلہ تھوڑا سا لشکر نہیں کر سکتا تھا۔

عبد عشرتا مارا گیا اور اس طرح ڈرامے میں سے ایک کردار نکل گیا، لیکن ڈراما بدستور جاری رہا۔ اس کا بیٹا اور جانشین ازیرو کیا دلی جیسی ہنرمندیوں کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ اس اثنا میں امنحوتب چہارم تخت نشین ہوا (اخناتون[۲] ۱۳۷۵ ق م) اس طرح مصر میں حالات کا نقشہ بدل گیا۔ اس سے اگر کوئی نتیجہ نکلا تو الٹا ہی نکلا۔ نئے فرعون کو سلطنت کے بچاؤ سے اتنی دلچسپی نہ تھی، جتنی مذہبی اصلاحات کے نفاذ سے تھی۔

ادھر ازیرو، اس کے بھائیوں اور حلیفوں نے مزید شہروں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ ربّ عدی نے اپنے رنج و غم کی کہانیوں کا نیا سلسلہ میخی خط میں مٹی کی تختیوں پر لکھ لکھ کر فرعون اور اس کے کارندوں کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ ایک خط میں وہ لکھتا ہے۔

پہلے ایک مصری کی شکل دیکھتے ہی کنعان کے بادشاہ اس کے سامنے سے بھاگ نکلتے تھے، مگر اب عبد عشرتا کے بیٹے مصریوں کی ہنسی اڑاتے ہیں اور خون ریز ہتھیاروں سے مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔

ایک اور خط میں وہ شکایت کرتا ہے کہ عبد عشرتا کے بیٹوں نے "سوریہ" کی سرزمین کے افسروں اور آدمیوں کو رہن کر دیا ہے۔ اولازا[۳] اردتا[۴] اور دوسرے شہر ازیرو کے قبضے میں آ گئے۔ سیمیرا پر بھی دوبارہ قبضہ کر لیا گیا اور اسے تباہ کر ڈالا گیا۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ اسے حتّیوں کے ہاتھ پڑ جانے سے بچانا منظور ہے۔ جب فرعون نے اس شہر کو از سرِ نو بسانے کا مطالبہ کیا تو ازیرو نے ایک سال کے اندر اندر اس حکم کو پورا کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ فوراً اس لئے پورا نہ کیا کہ حتّیوں کے حملے سے بادشاہ مصر کے شہروں کو بچانے کی مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ وعدہ پورا نہ کر سکا اور جیسا کہ اس نے بار بار کہا وہ بار مصر میں حاضری کے لئے بھی مہلت نہ نکال سکا، تاکہ اپنے آقا کے نظارۂ جمال سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا اور اپنے حالات ٹھیک ٹھیک سنا دیتا۔

آخر مدت گزرنے پر ازیرو مصر گیا لیکن اس سے پیشتر اس نے مصری کارندے کے ذریعے سے حلف اٹھوا لیا تھا کہ اسے کوئی گزند

---

۱ تل العمارنہ کی تختیاں برٹش میوزیم میں سی آر کونڈر Conder تل العمارنہ کی تختیاں ... ان میں سے بعض لندن میں اور بعض برلن میں محفوظ ہیں۔ سی بیزولڈ C. Bezold

۲ اخناتون نے دین میں نئی باتیں پیدا کی تھیں۔ مصری پہلے امون کی پرستش کرتے تھے، اخناتون نے امون کی جگہ اتون (قرص خورشید) کی پرستش کا حکم دیا۔ اسی وجہ سے اپنا نام اخناتون رکھا یعنی قرص خورشید کا جمال" ساتھ ہی اپنا مرکز حکومت تھیبز (طیبہ) سے منتقل کر کے اخیت اتون Akhetaton لے گیا۔ اس مقام کو آج کل تل العمارنہ کہتے ہیں۔ عمارنہ عمران کی جمع ہے۔ یہ ایک قبیلے کا نام تھا، جو اٹھارھویں صدی مسیحی کے آغاز میں یہاں مقیم ہوا تھا۔

۳ UL-LA-ZA کلاسیکی دور میں اسے Orthosia کہتے تھے۔ موجودہ دور میں یہ ارتوزی کہلاتا ہے۔ طرابلس شام کے شمال میں نہر البارد کے دہانے پر واقع ہے۔ ۴ AR-DA-TA یہ اردہ ہے جو زغرتا کے نزدیک ہے۔ دیکھیے ایبل کا جغرافیہ جلد دوم ص ۴، نیز دوسا دص ۸۵۔

نہ پہنچے گا، مصر سے واپس آیا تو اس نے شام کے حتی فاتح سے حلفِ اطاعت کی تجدید کرلی - اس فاتح کا نام شوبیلولیئوما[1] تھا اب ربّ عدّی نے محسوس کیا کہ وہ پرندے کی طرح جال میں پھنس گیا ہے. اس کے حالات بہت ابتر ہوگئے. چنانچہ اس نے اپنی بہن اور اس کے بچوں کو پناہ کے لئے صور[2] بھیج دیا، جہاں کا بادشاہ ابی ملکی ان گروہوں میں شامل نہیں ہوا تھا، جو مصریوں کے مخالف تھے، بلکہ ربّ عدّی کی طرح دردناک خطوط مصر بھیج رہا تھا۔ بعد ازاں ربّ عدّی جبلہ سے بیروت[3] بھاگ گیا، لیکن اس کی بیویوں اور حتیوں نے اپنے آپ کو ازیرو کے حوالے کردیا. جب بیروت کے لیے خطرہ پیدا ہوا تو ربّ عدّی صیدا[4] بھاگ گیا، جس نے اپنے حریف شہر صور کے خلاف اموریوں سے اتحاد کرلیا تھا. انجام کار ازیرو کا ہرکارہ وہاں بھی جا پہنچا اور ربّ عدّی گرفتار ہوگیا

اس طرح مصر نہ صرف شمالی شام، بلکہ فونیقیہ بھی چھوڑنے پر مجبور ہوگیا، جس کی بندرگاہوں سے وہ نہایت اہم خام جنسیں لیتا تھا. اب شام اور فلسطین کے درمیان جدائی بڑھنے لگی.

اموری فلسطین میں

یہاں پہنچ کر وسطی شام کے اموریوں کے حالات پر پردہ پڑگیا اور دلچسپی کا مرکز جنوب کی طرف منتقل ہوگیا۔ حتّی شمالی اور وسطی شام میں خوب قدم جما چکے تھے - اخناتون کے جانشینوں نے کسی زبردست مہم کا انتظام نہ کیا. تل العمارنہ کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ جب حتّی شمالی علاقے پر قبضہ جما رہے تھے تو جنوبی علاقے پر نئے گروہوں نے ہلّہ بول دیا تھا. انہیں خابیرو[5] کہتے ہیں. یہ نئے سامی گروہ صحراؤں میں پھرتے پھراتے بظاہر آرامیوں کے ساتھ آئے تھے. بعض اہل علم کہتے ہیں کہ خابیرو وہی ہیں جنہیں ساغاز کہا گیا ہے، یعنی یہ اس حتّی فوج کے تنخواہ دار سپاہی تھے جو عبد عشرتا کے ساتھ تعاون کر رہی تھی. ربّ عدّی اخناتون کے نام اپنے ایک آخری خط میں ان کا ذکر کرتے ہوتے لکھتا ہے :

"جب تیرا باپ صیدا سے واپس ہوا تو اسی وقت سے آس پاس کی سرزمین غاز کے ہاتھوں فتح ہوگئی."

خابیرو فلسطین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کم از کم ایک حصّے کو ابتدائی دور کے سامیوں یعنی اموریوں نے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے. شام میں اموریوں کی بہت سی ریاستیں اور جماعتیں مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی تھیں ان کے درمیان تاریخی کڑیاں ناپید ہیں. ہم یقینی طور پر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جنوب کی جانب اموریوں کی حرکت، اجتماعی حرکت تھی. حتّیوں کی طرح اموریوں کی اصطلاح کے معنی بھی زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے اور اس اصطلاح کا اطلاق ایک حد تک غیر متعیّن طریق پر ہوتا رہا. ممکن ہے اموری جنوبی حصّے میں حکمران ہوں. عہد نامۂ قدیم (بائیبل) کے مؤرخوں اور نبیوں نے جس بڑے ماخذ سے فائدہ اٹھایا، اس میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلیوں سے پیشتر فلسطین میں اموریوں ہی کا غلبہ تھا، بلکہ اسرائیلیوں کی آمد سے پیشتر پہاڑی علاقوں اور شرقِ اردن کے تمام باشندوں کو اموری ہی بتایا گیا ہے[6]

---

[1] Shubbiluliuma اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا [2] پرانا نام SUR-RI یہ ابھی تک صور کی شکل میں باقی ہے۔

[3] BE-RU-TA مصری BI-RU-TA آج ان تمام شہروں سے زیادہ بارونق ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے. بیروت کے معنی ہیں کنوئیں. دیکھیے Zellig S. Harris کی کتاب A Grammar of the Phoenician Language ص ۸۵ نیز یوشع باب ۹، آیت ۱۷، باب ۱۸ آیت ۲۵ [4] SI-DU-NA یہ نام ماہی گیری اور شکار کے دیوتا کے نام پر رکھا گیا تھا. ۵

[6] ملاحظہ ہو بائیبل کتاب گنتی باب ۱۳، آیت ۲۹، کتاب یوشع باب ۲۴، آیات ۸، ۱۸، کتاب عاموس نبی باب ۲، آیت ۱۰، کتاب حزقیل باب ۱۶، آیت ۳ و ۴۵.

ایک دوسرے بڑے ماخذ میں ان باشندوں خصوصاً مغربی حصّے کے باشندوں کو کنعانی ظاہر کیا گیا ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ تیرھویں صدی قبل مسیح میں اموری جنوبی شام کی تمام اہم چوٹیوں اور جنگی نقطۂ نگاہ سے تمام اہم مقاموں پر قبضہ کیے بیٹھے تھے اور انھیں نے ان بستیوں کی داغ بیل ڈالی تھی جو آگے چل کر عظیم الشان کنعانی شہروں کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی دیواروں اور برجوں کے سامنے نووارد اسرائیلیوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ جاتے تھے۔

آہستہ آہستہ اسرائیل، اموری اور کنعانی سرزمینوں کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے، سیحون اور اس کے شمالی اموری ہمسائے بسن کو پامال کر چکنے کے بعد شام کا وہ حصّہ ان کے قبضے میں آگیا، جو دریائے اردن کے مشرق میں واقع تھا[1]۔ بسن کا سردار عوج تھا، جسے جبّاروں کا بقیّہ بتایا جاتا ہے۔ اس کا قد بہت لمبا تھا۔ اس کا پلنگ لوہے کا بنا ہوا تھا، جو نو ہاتھ لمبا اور چار ہاتھ چوڑا تھا[2]۔ عاموس نبی کے نزدیک اموری دیوداروں کی طرح بلند اور بلوطوں کے مانند مضبوط تھے (باب ۲ آیت ۹) پرانی یادگاروں میں اموریوں کے جو مجسمے ملے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے قد لمبے تھے اور وہ خاصے جواں مرد تھے۔ ان کے قد و قامت اور حضارت سے جنوبی شام کے کوتاہ قد غار نشین قدیم باشندے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے افسانے تراش لیے مثلاً یہ کہ جبّاروں کی ایک نسل آئی اور اس نے انسانوں کی بیٹیوں سے شادی کر لی۔ یہی افسانے اسرائیلیوں کے پاس پہنچ گئے۔ دوسری قوموں میں بھی اس قسم کے افسانے سنے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دھاتوں کے اوزار اور آلات استعمال کرتے ہوئے نمودار ہوئے، ان کا ان افسانوں سے کچھ نہ کچھ تعلّق ضرور ہے۔ یہاں غالباً برنج کے اوزار و آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ ابتدائی دور کے اموری اپنی برچھیوں کی انیوں، تلواروں اور چاقوؤں میں تانبا استعمال کرتے تھے، لیکن انھیں کوٹ کوٹ کر سخت کر لیتے تھے۔ تانبے میں ٹین ملا کر سخت نہیں کرتے تھے۔ فلسطین سے جو ابتدائی برنجی خنجر برآمد ہوئے ہیں، انہیں شمالی شام کے خنجروں سے گہری مشابہت ہے۔ فلسطین میں برنج کو ڈھالنے کا سلسلہ ۲۵۰۰ ق م سے پیشتر شروع ہو چکا تھا۔ اموریوں کے ڈیل ڈول اور شکلوں کا تعلّق اس نمونے سے ہے، جسے ارمنوی کہا جاتا ہے، یعنی گول سر اور اونچی ناک جنوبی عربوں میں بھی یہ نمونہ پایا جاتا ہے[3]۔ ایشیا کے اسیران جنگ میں سے سب سے پہلا گروہ فرعون، ساحو رایع (۲۵۵۳ ق م۔ ۲۵۴۱ ق م) کے ہاتھ لگا تھا۔ ان اسیروں کا تعلق اسی نمونے سے تھا۔ مصر کے مقام بنی حسن کی دیواروں پر جو تصویریں ہیں ان میں اسی نمونے کے لوگوں کو مشرقی صحرا کے ناظم کے لیے سرمہ (الکحل) لاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان تصویروں میں اموریوں کے ایک سردار کو قبیلے کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ انہوں نے رنگ برنگ کپڑے کے لباس پہن رکھے ہیں۔ مردوں کے پاؤں میں چمڑے کے چپل اور عورتوں کے پاؤں میں جوتے یا موزے ہیں۔ مردوں کی داڑھیاں کالی ہیں، ناک نوکدار، آنکھوں کے پردے ہلکے سلیٹی رنگ کے اور پتلیاں سیاہ۔ تصویر میں ابشہ یعنی سردار قبیلہ جلوس کے آگے آگے ہے۔ عورتوں کے پیچھے ایک آدمی گدھا لیے چلا جا رہا ہے۔ گدھے کی پیٹھ پر ایک مشکیزہ رکھا ہوا ہے۔ آدمی کے ہاتھ میں ایک گز ہے جس سے

۱؎ کتاب استثنا ر باب ۲ آیت ۳۰، باب ۳ آیت ۱، ۲؎ کتاب استثنا ر باب ۳، آیت ۱۱۔ یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ عوج کے علاقے کو بائبل کے اردو تراجم میں باشان کے بجائے بسن لکھا گیا ہے۔

۳؎ کرک کا مقالہ بہ عنوان Outline of the Cultural History of Palestine جو مجلّہ Palestine Exploration Quarterly میں شائع ہوا۔

۴؎ ڈاکٹر حتّی کی تاریخ عرب (انگریزی)، ص ۳۰

وہ اپنا آٹھ تار والا رُباب بجاتا ہے صابر وشاکر گدھے کی پیٹھ پر ایک کپڑا پڑا ہُوا ہے جس کے ایک طرف برچھی بندھی ہوئی ہے اور دوسری طرف گھماکر پھینکنے والی لکڑی۔ مردوں نے جو اور ہتھیار اُٹھا رکھے ہیں، ان میں پھینکنے والے چھوٹے نیزے اور کمانیں ہیں۔ ہاتھی دانت کی ایک تختی ملی ہے، جس کا تعلق مصر کے پہلے شاہی خاندان کے آخری دَور سے تھا (قریباً ۳۰۰۰ ق م) اس پر ایک سامی کی تصویر بنی ہوئی ہے جس نے بہ ظاہر جنگی لباس پہن رکھا ہے، یعنی حاشیے والا لنگوٹ باندھ رکھا ہے جو قریباً گھٹنوں تک پہنچا ہُوا ہے۔

اموری زبان کا کوئی اہم کتبہ نہیں مل سکا، صرف مقاموں اور حکمرانوں کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ تاہم یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ زبان صرف محاورے میں کنعانی سے مختلف تھی۔ اسے مغربی کنعانی یا فونیقی زبان کے مقابلے میں مشرقی کنعانی زبان سمجھنا چاہیئے۔

اموریوں کا مذہب

اموریوں کا مذہب اپنی ابتدائی شکل میں ان سامیوں سے مختلف نہ تھا، جو طبعی قوتوں کی پرستش کرتے تھے۔ یہی پرستش بادیہ شام اور عرب کے قدیم خانہ بدوشوں میں رائج تھی۔ ایک تو قبیلے کا خاص دیوتا تھا جس کا نام امور تھا اور اسی کو جنگ کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے دیوتا تھے، جن کی صفات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ ان میں سے اکثر بعد ازاں کنعانیوں کے دیوتاؤں میں شامل ہو گئے۔ ان میں سب سے بڑا حدد تھا اکادی زبان میں آدد یا آدر اس کا ایک مشہور نام "رمانو بھی" تھا، یعنی رعد کا دیوتا۔ اس کے قبضے میں بارشیں اور آندھیاں تھیں مغربی ایشیا کا یہ عام دیوتا تھا۔ اسے بیل اور رعد کی شکل میں نمایاں کیا جاتا تھا۔ آگے چل کر یہی عظیم الشان بعل بن گیا۔ مغربی حصّے کے سب سے بڑے دیوتا کی حیثیت میں اس کا نام "مارتو" تھا، ایک اور مشہور دیوتا کا نام رشف تھا، جسے آگ سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ مصریوں نے اپنی نئی سلطنت کے زمانے میں اسے کنعانیوں سے لے لیا۔ "دجن"، جس کی پوجا بابل کے فاتح اموری کرتے تھے، دراصل خوراک کا دیوتا تھا اغاریت میں کھدائی کرتے ہوتے ایک مندر ملا ہے، جو اس دیوتا کے لیے بنا تھا۔ فلسطینیوں نے اسے ماہی گیری کا دیوتا بنالیا۔ چنانچہ غزہ میں اسے حد درجہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ماری سے جو تختیاں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں ان تمام دیوتاؤں کا ذکر آیا ہے۔

امورتہ دیوتا کی ایک اہلیہ بھی تھی، جس کا نام عاشرتا تھا۔ اسے عیش ونشاط کی دیوی مانا جاتا تھا۔ گویا اس کا نمونہ بھی وہی تھا جو معروف عشتار میں نظر آتا ہے۔ دیویوں میں اس کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ اسرائیلیوں کی آمد سے پیشتر سانپ کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔ یہ پوجا ایک دیوی سے متعلق تھی۔ ممکن ہے، اسے اموریوں نے رواج دیا ہو۔ جنوبی عرب کے دیو مالا میں اس دیوی کو چاند کی دیوی کہا جاتا ہے۔ عاشرتا نام کے وہی معنی ہیں جو عبرانی میں عشیراۃ کے ہیں، یعنی مقدس کھمبا یا درخت کا تنہ۔ یہ چیز مذہبی رسوم میں استعمال کی جاتی ہے۔

جنوبی شام میں اموریوں نے جو مذہبی رسوم جاری کیے، ان میں سب سے نمایاں حیثیت مقدس ستون کو حاصل تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستون قبیلے کے دیوتا کا نمونہ تھا اور اسے کسی ایسی جگہ نصب کیا جاتا تھا جو بہت پاک ہوتی تھی، مثلاً کوئی غار۔ جس کے پاس چونے کے پتھر کی قربان گاہ بنائی جاتی اور اسے اوزار سے آلودہ کرنا پڑتا تھا یعنی تراشنا جاتا تھا[۵۳]۔ جن سامیوں نے جذر میں سابقہ آبادی کی جگہ خود سنبھالی

---

[۱] تل العمارنہ کے خطوط میں سے ایک خط نکلا ہے (۵۲)، یہ قطنہ کے حاکم کی طرف سے امنحوتپ سوم بادشاہ مصر کو لکھا گیا تھا اور اس سے غالباً حتّیوں کے خلاف امداد مانگی گئی تھی۔ اس میں شاہِ قطنہ فرعون کو "اے میرے ادد" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ قطنہ کے خطوط میں (۵۷-۵۵) حوری تعبیرات بھی بہت ہیں۔

[۵۳] خروج باب ۲۰ آیت ۲۵۔

تھی وہ مولود اول کی قربانی کے عادی تھے، نیز کسی مکان کی بنیاد رکھتے تو اس وقت بھی قربانی کرتے اور اونچے مقامات پر بڑے بڑے پتھروں سے عبادت گاہیں بناتے۔ تعمیر کے وقت قربانی کی رسم کا پہلا اشارہ ایک میری نظم میں ملتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ اموریوں نے ایک مردہ آدمی کے اوپر مندر کی عمارت اٹھائی۔ اموریوں نے جو مذہبی ادارے اور اعمال جاری کیے تھے، وہ ان کے ہم جنسوں اور جانشینوں یعنی کنعانیوں نے قائم رکھے۔

آٹھواں باب

شام میں دوسرا بڑا سامی گروہ —— کنعانی

کنعانی جنھیں یونانیوں نے بعد میں فونیقی کہنا شروع کیا، سامی نسل کا دوسرا بڑا گروہ تھے، جو اموریوں کے بعد شام کے معاملات میں نمایاں حیثیت کے مالک ہوئے۔ کنعانی اور اموری ایک ہی ہجرت میں آئے تھے، لہٰذا ان میں بنیادی قومی اختلاف کوئی نہ تھا، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اموریوں نے آہستہ آہستہ سمیری اور حوری عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیا اور فونیقیوں نے دوسرے مقامی عناصر اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔ حضارتی اختلاف اس بنا پر پیدا ہوا کہ اموریوں کا ابتدائی مرکز شمالی شام میں تھا، اس وجہ سے سمیری اور بابلی تمدن کے زیر اثر آگئے۔ کنعانیوں کا جغرافیائی مرکز ساحلی علاقہ تھا، لہٰذا ان کا رُخ مصر کی جانب تھا۔ مذہبی اختلاف زیادہ تر تو حضارتی ترقیات کی بنا پر تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنے اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی گئی۔ لسانی اختلاف صرف محاورے تک محدود تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اموریوں اور کنعانیوں، دونوں کا تعلّق مغربی شامی شاخ سے تھا اور عبرانی بھی اسی شاخ سے متعلّق تھے۔ یہی شاخ ہے جسے اس لحاظ سے شمالی و مغربی کہہ سکتے ہیں کہ عربی شاخ جنوبی و مغربی تھی۔

کنعان

کنعانی جس خطّے میں رہتے تھے، اسے کنعان کہنے لگے۔ اب تک سمجھا جاتا تھا کہ کنعان سامی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں نشیبی زمین[1] جس طرح لبنان کے معنی ہیں بلند اور مرتفع زمین، لیکن حال میں یہ شبہہ پیدا ہو گیا ہے کہ لفظ کنعان اپنی اصل میں غیر سامی ہے۔ نئی تحقیق کے مطابق اس لفظ کو حوری الاصل بتایا گیا ہے۔ حوری زبان کا ایک لفظ [2] ہے، جس کے معنی ہیں ارغوانی رنگ۔ اسی سے نوزی اکادی لفظ "کنخنی"[3] نکلا (جسے تل العمارنہ کی میخی تختیوں میں "کیناخی"[4] لکھا گیا ہے)، فونیقی زبان کا "کنعا"[5] اور عبرانی زبان کا "کنعان"[6] اسی سے بنے۔ یعنی وہ زمین جس کا رنگ ارغوانی ہے[7]۔ جس زمانے میں حوریوں کا تعلّق بحیرۂ روم سے پیدا ہوا یعنی اٹھارھویں یا سترھویں صدی قبل مسیح میں، اس وقت ارغوانی رنگ کی تجارت اس زمین میں فروغ پر ہو گئی۔ اسی طرح فونیقیہ یونانی لفظ فونکس سے بنا، جس کے معنی ہیں ارغوانِ سُرخ۔ یہ بھی اسی رنگ کی صنعت کی طرف اشارہ ہے۔ یونانیوں نے ابتدا میں جن کنعانیوں سے تجارت کا سلسلہ جاری کیا، انھیں وہ فونیقی کہتے تھے۔ بارھویں صدی کے بعد اس لفظ نے کنعانی کے مترادف کی حیثیت اختیار کر لی۔ شام کے یہ سامی چھوٹے چھوٹے گروہوں سے مرکب ہوں گے اور انھیں قبائلی اور مقامی اختلافات کا احساس زیادہ ہو گا، قومی اتّحاد کا احساس اتنا نہ ہو گا۔ ابتدائی دور کے گروہوں کی عام کیفیت اس سے مختلف نہ تھی۔ باہر سے

---

1. "کنعا" سے جس کے معنی ہیں نشیبی زمین / دیکھو سمتھ کا جغرافیہ ص ۴-۵
2. Knaggi
3. Kirakhui
4. Kinakhkhi
5. Kena
6. Kenaan
7. ڈبلیو، ایف ایلبرائٹ، The Roie of the Conaanites in the History of Civilization

اجنبیوں نے آکر انھیں ایک نام دیا۔

کنعان نام ابتدا میں صرف ساحلی علاقے اور مغربی فلسطین کے لیے استعمال ہوتا تھا، لیکن آگے چل کر یہ فلسطین، نیز شام کے خاصے بڑے حصّے کے لیے معیاری جغرافیائی نام بن گیا۔ یہ فلسطین کا پہلا نام تھا، دوسرے ناموں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ عہد نامۂ قدیم کی ابتدائی دستاویزوں میں لفظ کنعانی فلسطین کے تمام باشندوں کے لیے بلا امتیازِ نسل استعمال کیا جاتا تھا اور فلسطین کے سامی جو زبان بولتے تھے اسے عام طور پر کنعان ہی کی زبان کہا جاتا تھا[1]۔

کنعانی مذہب اور زبان نے حضرت مسیح علیہ السّلام سے پیشتر دوسرے ہزار سال کے آغاز میں سامی قدامت کے دھندلکے سے باہر نکلنا شروع کیا، لیکن جن لوگوں کو کنعانی کہا گیا، ان کے آبا و اجداد اس سے ایک ہزار سال یا زیادہ مدت پہلے اس سرزمین پر قابض ہو گئے ہوں گے۔ موجودہ زمانے میں جو آثارِ قدیمہ برآمد ہوئے، ان میں مختلف مقامات کے ناموں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ مثلاً اریحا[2]، بیت شان[3] اور مجدّو[4] واضح طور پر کنعانی نام ہیں اور یہ تین ہزار سال قبل مسیح آباد ہو چکے تھے۔ دوسرے شہروں کے نام مثلاً عکو[5]، صور[6]، صیدا، جبلہ، عرقہ، سیمیرا بڑے اچھے سامی نام ہیں۔ انھیں بھی کنعانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا ذکر کتبات میں دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصفِ اوّل میں شروع ہو چکا تھا۔

شہری ریاستیں

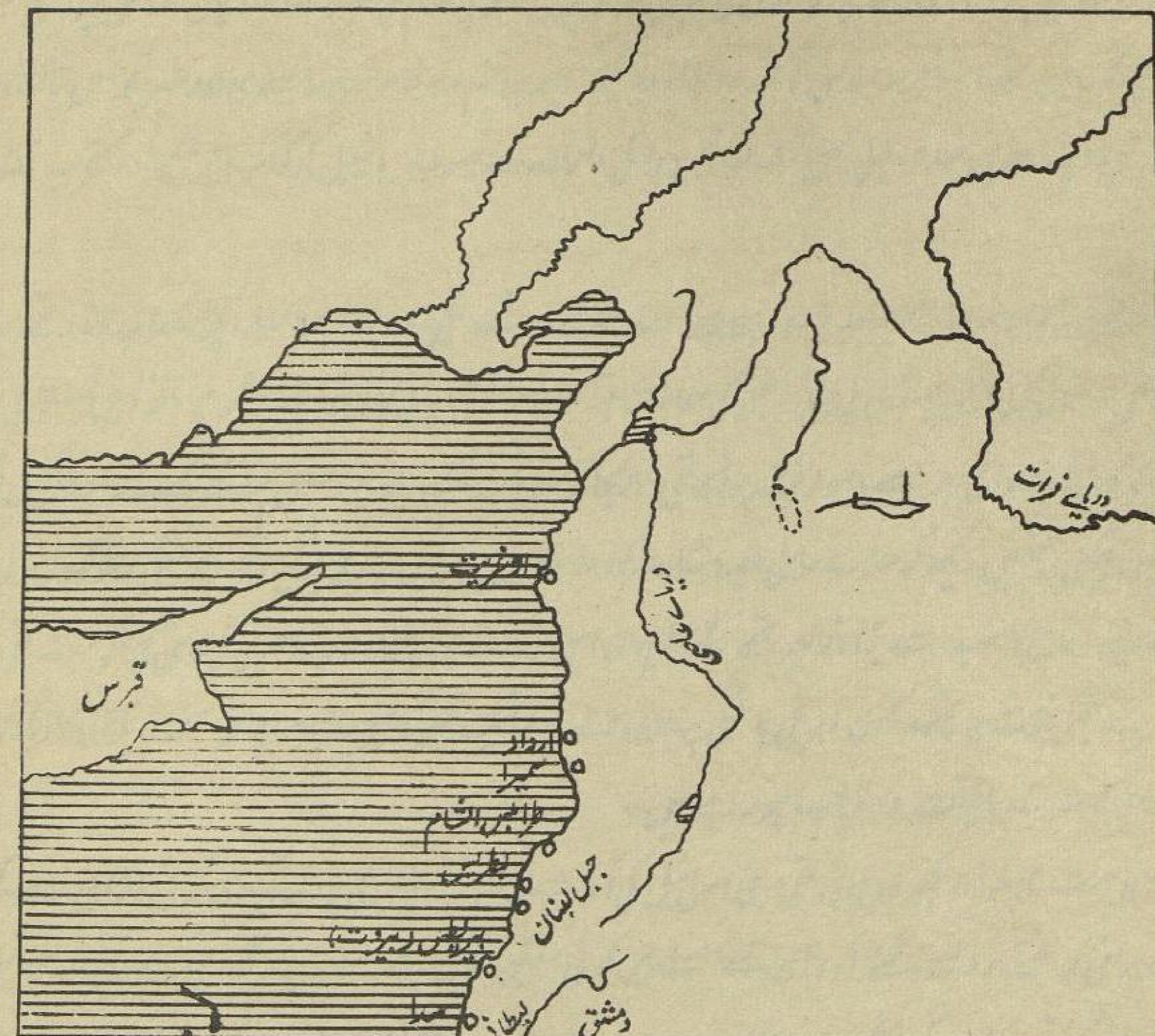
کنعان کی طبعی حیثیت اور اس کی جنگی وضعیت ایسی تھی کہ یہ تین بڑی طاقتوں کے بیچ میں آ گیا تھا۔ ایک طرف وادیٔ نیل کی طاقت دوسری طرف وادیٔ دجلہ کی طاقت، تیسری طرف ایشیائے کوچک کی طاقت۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کنعانی کوئی مضبوط اور متحدہ حکومت قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منظم ہو گئے تھے۔ ہر گروہ کا الگ حکمران تھا۔ قیاس یہ ہے کہ ابتدا میں وہ بڑی جاگیر کا مالک ہوگا، موقع پا کر حکمرانی کی مسند پر پہنچ گیا۔ ہر گروہ کسی مستحکم اور قلعہ بند شہر کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا، جس میں فصیلیں اور دفاعی برج بنے ہوئے تھے جب خطرہ پیدا ہوتا، آس پاس کی دیہاتی اور مزدور آبادی پناہ کی غرض سے شہر میں جمع ہو جاتی۔ امن کے زمانے میں شہر ان کے لیے خرید و فروخت کی منڈی اور اجتماعی مرکز تھا۔ اس قسم کے قلعہ بند شہر طاقتور ہمسایوں، نیز خانہ بدوشوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کا اچھا ذریعہ تھے۔ تاہم ظاہر ہے کہ زمین چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی جو اکثر ایک دوسری کے خلاف برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ پھر ہر ریاست میں اونچے درجے کے لوگ اقتدار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں لگے رہتے تھے، اس وجہ سے کوئی بھی ریاست داخلی اعتبار سے پائیدار نہ تھی۔ ان اسباب کی بنا پر پورا ملک طاقتور اور جابر قوتوں کے رحم پر رہ گیا تھا۔

کنعانیوں کی ابتدائی آبادیاں شمال میں کوہ کاشیوس سے جنوب میں کوہ کرمل تک ساحل کے ساتھ ساتھ پھیل گئی تھیں، لیکن ساحل زیادہ کٹا پھٹا نہ تھا، اس لیے طبعی بندرگاہیں بہت محدود تھیں۔ شمال میں کوہ امانوس اور کوہ کاشیوس، نیز جنوب میں فلسطین کی سطح مرتفع بھی حملوں سے حفاظت کا کوئی ویسا موثر ذریعہ نہیں بن سکتی تھیں جیسا کہ لبنان کے بلند پہاڑ تھے۔ لہٰذا لبنان کے دامن میں بڑی بڑی پائدار بستیاں جمع ہو گئیں اور انھوں نے

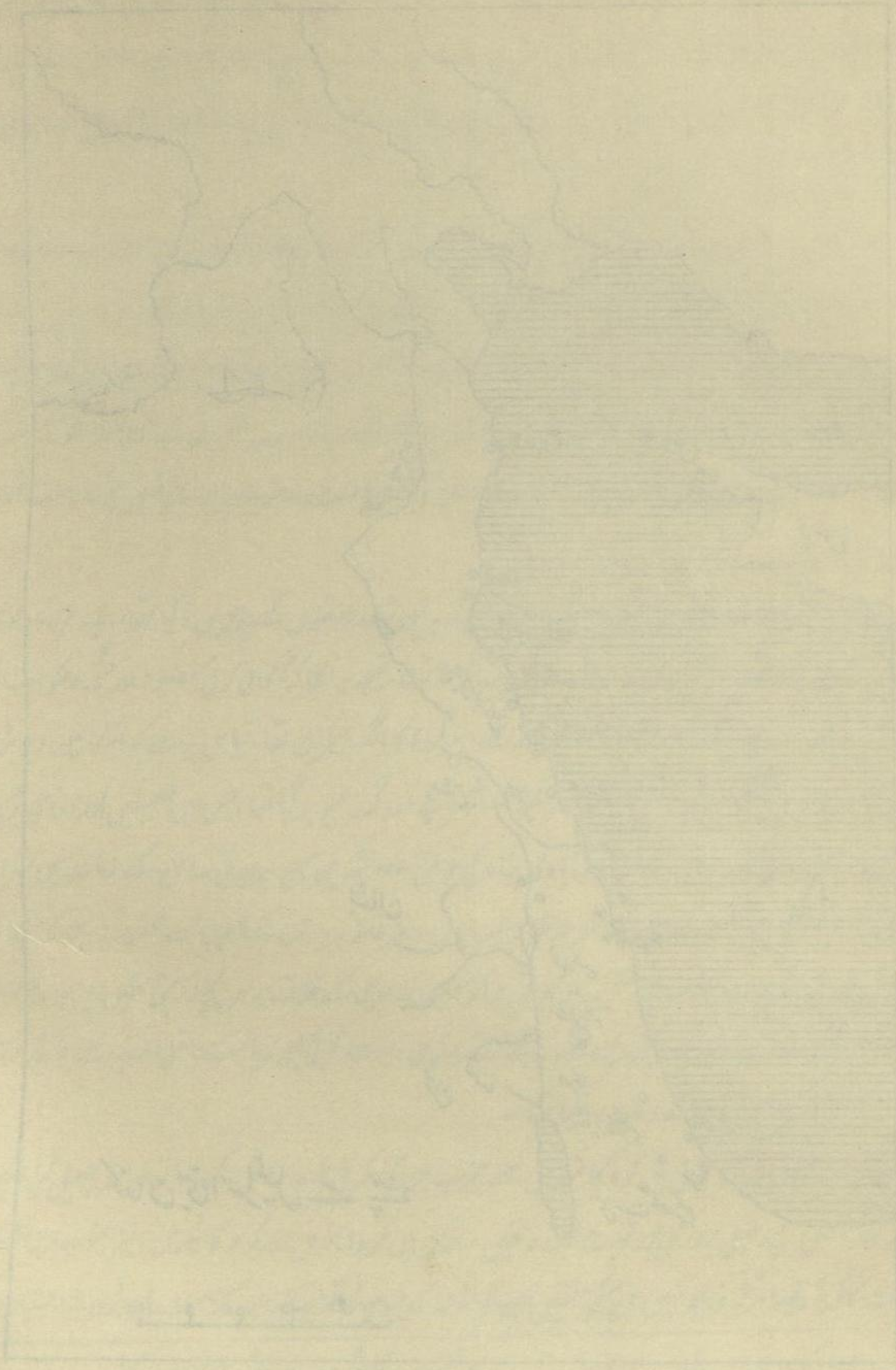
---

[1] یسعیاہ باب ۱۹ آیت ۱۸۔ [2] Jericho یریحو یعنی چاند کا شہر (مدینۃ القمر)، موجودہ اریحا۔

[3] Beth-shan یعنی شان دیوتا کا گھر اسے بیسان بھی کہتے ہیں۔ [4] Megiddo یا Megiddon جدّد سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں کاٹنا۔ آج کل اسے تل المتسلم کہتے ہیں۔ [5] Acco جس کے معنی ہیں گرم ریت، یونانی دور میں اسے Ptolemais کہتے تھے۔ موجودہ عکہ۔ [6] Sor بہ معنی چٹان، موجودہ صور۔ [7] Sidon بہ معنی مچھلی کی شکارگاہ یا پرورش گاہ، موجودہ صیدا۔



کنعان بنی اسرائیل سے پہلے



خوب فروغ پایا، مثلاً طرابلس[1]، باتروس[2]، ببلوس، بیری ترس[3] صیدا اور صور۔ ان بستیوں کے ساتھ شمالی جانب عرقہ، سمیرا اور ارادس[4] شامل ہوگئیں اس طرح چھوٹی چھوٹی خود کفیل اور خود مختار شہری ریاستوں کی شطرنجی بساط بچھ گئی۔ جنوبی شام میں غزہ[5] اور عسقلان[6] ساحل پر واقع تھے اور متعدد کنعانی شہر اندرونِ ملک میں تھے، مثلاً جزر، لاکش[7]، مجدو، ہازور، شکیم[8] اور یروشلم۔ یہ تمام شہر اور ایسے ہی اور شہر تحوتمس ثالث فرعونِ مصر کی مہموں کے سلسلے میں مذکور ہیں (پندرھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں) تل العمارنہ کے خطوط نیز بائیبل کی کتاب یوشع اور کتابِ قضاۃ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

ان شہروں کا رقبہ زیادہ نہ تھا۔ جزر اور ہازور ان میں سب سے بڑے تھے، لیکن وہ پندرہ یا سولہ ایکڑ کے اندر اندر تھے۔ اریحا نے صرف چھ ایکڑ زمین گھیری تھی۔ جہاں کوئی ایسی پہاڑی مل جاتی، جس کی حفاظت بہ آسانی ہوسکتی یا پانی کا کوئی اچھا چشمہ ہوتا تو وہیں بستی کی بنیاد رکھ دی جاتی جزر کی فصیل، جیسا کہ کھدائی سے واضح ہوا ہے، سولہ فٹ چوڑی تھی۔ اریحا کی حفاظت کے لیے جو حصن بنائے گئے تھے، وہ اکیس فٹ بلند تھے[9]۔ یہی کنعانی قلعہ بندیاں تھیں، جنھیں دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جاسوسوں پر ہراس طاری ہوگیا تھا[10]۔ جو جنگی رتھ کنعانیوں نے ملک میں رائج کیے تھے، وہ ان کے لیے دفاع کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ گھوڑا یہاں اس زمانے میں پہنچا، جب مصر پر ہکسوس کی حکومت تھی (۱۷۵۰ ق م کے آس پاس) دوسرے جنگی آلات یہ تھے؛ کمان، برنجی یا سنگی پیکاں والے تیر، ایک چھوٹا خنجر، مڑا ہوا چاقو، سخت لکڑی کا ایک بھاری ڈنڈا۔ آخر الذکر کے سوا تمام آلات کے باقیات دستیاب ہو رہے ہیں۔

دیہاتی آبادی بہت ہی کم اور بکھری ہوئی تھی۔ بنی اسرائیل کی آمد سے پیشتر فلسطین کی پوری آبادی کوئی اڑھائی لاکھ کے قریب ہوگی[11]۔ شہروں کی کیفیت یہ تھی کہ بنتے اور بستے گئے اور ان کے سلسلے میں کوئی معین نقشہ پہلے سے بنایا نہ گیا۔ پندرھویں صدی قبل مسیح[12] کے جو کنعانی مکان آثارِ قدیمہ کی کھدائی کرنے والوں کے بیلچوں نے نکالے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان کی تعمیر کا اسلوب اچھا تھا اور نہ ان میں کوئی خاص ترتیب پیشِ نظر رکھی گئی تھی۔ غریبوں کے مکان بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور اسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، جن کا نقشہ پرانی وضع کے دیہات میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کھاتے پیتے اور خوشحال آدمیوں کے مکان میں اِرد گرد کمرے ہوتے تھے اور بیچ میں صحن رکھا جاتا تھا۔ بعض مکانوں میں مودی خانے اور پانی کے ذخیرے یا حوض بھی دیکھے گئے[13]۔

جزائری شہر

بعض شہروں ——— ارادس (ارواد)، صیدا اور صور ——— کے دفاعی استحکام دہرے تھے۔ ان مقامات کے شہریوں نے

---

۱ Tripoli یونانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں تین شہر۔ موجود مقام طرابلس ہے۔ یہ اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ اصل فونیقی قصبے کا نام کیا تھا۔

۲ Botrys ۳ Berytus ۴ Aradus موجودہ نام "ارواد"۔ ۵ اصل میں "عزہ" تھا بمعنی قوت اور استحکام۔ موجودہ نام "غزہ" ہے۔ ۶ عبرانی نام عشقلان تھا۔ موجودہ "عسقلان"۔

۷ Lachish ۸ Shechem ۹ گارسٹانگ Heritage of Solomon ص ۱۰۹، ۱۱۰ نیز فرانسیسی کتاب Manuel d' archeologic bibiique جلد اول ص ۱۴۵۔ ۱۰ بائیبل، گنتی باب ۱۳۔ آیت ۲۸

۱۱ گارسٹانگ کی کتاب ص ۱۰۷۔ ۱۲ میکالسٹر Macalister, Excavation of Gezer جلد اول ص ۱۶۹۔ دوسرے مکانوں کی کیفیت کے لیے Barrois ص ۲۵۱ ملاحظہ فرمائیے۔

ایک آبادی برلبِ ساحل قائم کر رکھی تھی۔ جہاں وہ تجارتی کاروبار کرتے تھے، نیز پھلوں کے باغوں اور بُستانوں کی دیکھ بھال کا کام انجام دیتے تھے۔ دوسری آبادی آس پاس کے جزیرے میں قائم کر رکھی تھی۔ مثال کے طور پر جب آشوری حملہ آور بھیڑیوں کے غول کی طرح پہاڑی دروں سے گزرتے ہوئے آپڑتے تھے تو یہ لوگ جزیرے والی آبادی میں چلے جاتے تھے۔ ارواد کے باشندوں کی ساحلی آبادی کا نام یونانیت کے دور میں ہٹن انترودس[1] تھا۔ ان لوگوں نے پاس کے جزیرے میں جو آبادی قائم کی تھی، وہاں کئی کئی منزل کے مکان بنا لیے تھے، جس طرح نیویارک کے ساتھ کے جزیرے کی کیفیت ہے۔ یہ مکان ایک دوسرے میں ٹھسے ہوئے تھے۔ اس آبادی کے لیے پانی کی بہم رسانی میں انھوں نے بڑی ہنرمندی اور کاریگری سے کام لیا تھا۔ بارش کا پانی چھتوں سے گرتا تو اسے حوضوں میں جمع کر لیتے۔ علاوہ بریں انھوں نے سمندر کے نیچے ایک چشمہ دریافت کر لیا تھا۔ اس پر ایک بہت بڑا دھودکش نما ظلکا اوندھا کر اس کے ساتھ چمڑے کی ایک نلی لگالی تھی[2] سمندر کی تہ سے میٹھا پانی حاصل کرنے کی غالباً یہ سب سے پہلی مثال ہے۔

صور کی جزائری آبادی بھی ارواد جیسی ہی تھی[3] سکندر نے جب صور کا محاصرہ کیا تو نصف میل کا بند بنا کر جزائری شہر کو خشکی سے ملا دیا۔ حال میں سمندر کے نیچے جو کھدائی ہوئی، نیز فضا سے جو تصویریں لی گئیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ اصل بندرگاہ جزیرے کے جنوبی حصے میں تھی۔ بندرگاہ کی حفاظت کے لیے ایک بند بنایا گیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سمندر کی لہروں کا زور روکا جا سکے۔ یہ بند ساڑھے سات سو میٹر لمبا اور آٹھ میٹر چوڑا تھا۔ اس کے قریب شہر کی فصیل تھی، جس پر جا بجا برج بنے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں شاہ حیرام نے بنوائی تھیں، جو حضرت سلیمان علیہ السّلام کا ہم عصر ہے۔ اس کے زمانے میں شہر ترقی کے درجۂ کمال پر پہنچا۔ ان انتظامات کے باعث صور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل کی مستحکم ترین بندرگاہ بن گیا، لیکن اس کی سلطنت اور کشورکشائی تجارت اور ثروت پر مبنی تھی نہ کہ زمین اور تسخیر پر۔

صور کا شمالی ہمسر صیدا خشکی کے ایک ایسے قطعے پر واقع تھا جو سمندر میں آگے بڑھ کر راس کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ جگہ شہر کی آبادی کے لیے یقیناً اس لیے چنی گئی تھی کہ آس پاس چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے، جنھیں بند بنا بنا کر آپس میں ملا دیا گیا تھا۔ اس طرح ایک بڑی عمدہ بندرگاہ وجود میں آگئی تھی۔ یہ بندرگاہ آبادی کے شمالی جانب تھی۔ جنوبی جانب ایک اور بندرگاہ تھی جسے عام طور پر مصری بندرگاہ کہتے تھے۔ یہ شمالی بندرگاہ سے زیادہ بڑی تھی، لیکن اس کی حفاظت کا انتظام ناقص تھا۔ خشکی کی جانب شہر کی حفاظت کے لیے ایک فصیل بنا دی گئی تھی۔ صیدا کا موجودہ قلعہ، جسے قلعۃ البحر کہتے ہیں، صلیبیوں کے زمانے میں سب سے بڑے جزیرے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں لبنان کے امیر فخرالدین المعنی نے قدیم بندرگاہ کا مدخل بھروا دیا تھا، تاکہ عثمانی بیڑا اندر نہ آسکے۔

شہری ریاستوں کے تعلقات

یہ شہری ریاستیں سیاسی اعتبار سے الگ الگ تھیں اور اس امر کا ثبوت پیش کر رہی تھیں کہ ملک طبعی لحاظ سے پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ یہ علیحدگی صرف عارضی اور مقامی طور پر وقتاً فوقتاً دور ہوتی رہی، یعنی جب کسی ایک شہری ریاست کی قیادت میں باقی ریاستیں اکٹھی ہو جاتیں۔ بعض اوقات مشترکہ مفاد کی بنا پر وہ خود بخود آپس میں وفاق قائم کر لیتیں مثال کے طور پر سولھویں صدی قبل مسیح[4] کے آواخر میں اغاریت نے

---

[1] صلیبی اسے Tortosa کہتے تھے، آج کل طرطوس کہلاتا ہے۔ یہ عمریت کے شمال میں ہے اور فونیقی زمانے کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً معبد اور مقبرے۔

[2] سٹرابو سولھویں کتاب دوسرا باب [3] ایضاً۔ ایضاً

چودھویں صدی میں جبیلہ نے، گیارھویں صدی سے پہلے صیدا نے گیارھویں صدی کے بعد صور نے اور پانچویں صدی قبل مسیح میں طرابلس نے اپنے تمام ہمسروں پر برتری حاصل کر لی۔ جب کوئی زبردست خطرہ پیدا ہو جاتا تو یہ شہری ریاستیں خود اتحاد کر لیتیں اور جمعیّتیں بنا لیتیں، ایک بڑا اتحاد وہ تھا جسے مصر کے فرعون تحوتمس ثالث نے ۱۴۷۹ ق،م میں بمقام مجدّد توڑا تھا۔ اس زمانے میں اتحاد کے لیے نمایاں ترین سرگرمی قادش نے دکھائی، جو بہت فاصلے پر دریائے عاصی کے کنارے آباد تھا۔ ایک صدی بعد کے متعلق جو خط وکتابت تل العمارنہ سے برآمد ہوئی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان ریاستوں میں محض اتّحاد ہی ناپید نہ تھا، بلکہ مختلف ریاستوں کے فرنیقی حکمران بھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچا کر فرعونِ مصر کی نظروں میں اعتبار جمانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر حکمرانوں نے الگ الگ فرعون کو خط لکھے، بہرحال کنعانیوں کی طویل سرگزشت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ امن دوست تھے، جنگ جوئی کے عادی نہ تھے۔ ان کی دلچسپیوں کا اصل مرکز تجارت، فنونِ لطیفہ اور مذہب تھے نہ کہ رزم وپیکار۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مصر، بابل، حتّیوں کی سرزمین، ایران یا مقدونیہ سے فتح وتسخیر کا طوفان آیا، تو ان شہروں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ ہمیشہ خراج کی رقم دے کر اپنے آپ کو غیر مناسب مداخلت سے محفوظ کر لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اندرونِ ملک کی منڈیوں کے ساتھ تجارتی سلسلہ بڑھا کر اپنے نقصان کی تلافی کم سے کم ایک حد تک ضرور کر لی جائے گی۔

اقتصاد: زراعت

کنعان کے باشندوں نے اقتصادیات کے انھیں پہلوؤں کو ترقی دی، جو ان کے وطن اور طبعی وسائل کے لیے موزوں تھے۔ زراعت، ماہی گیری اور تجارت ان کے ابتدائی بڑے پیشے تھے۔ زراعت پر سب سے بڑھ کر توجہ کی جاتی تھی۔ ان کے مذہب پر بھی زراعت ہی سے گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ ہاتھ سے غلّہ بوتے تھے، بابل سے ہل آگیا تو کھیتی باڑی کو ایک زبردست محرّک مل گیا۔ ملک کے جنوبی حصّے میں ہل شاید مصر سے پہنچا۔ تل بیت مرسیم (قریۂ سفرا) میں کنعانی زراعت کے جو باقیات ملے ہیں، ان کا تعلق پندرھویں صدی اور تیرھویں صدی قبل مسیح کے درمیانی دَور سے ہے۔ راس الشمرہ سے ایک برنجی بیلچہ نکلا ہے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ فصل پتھر کی دندانہ دار درانتی سے کاٹی جاتی تھی جس کے ساتھ ہڈی یا لکڑی کا دستہ لگا لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی درانتی ۱۰۰۰ ق،م تک استعمال ہوتی رہی، پھر اس کی جگہ لوہے کی درانتی نے لے لی تقریباً اسی زمانے کے آہنی اوزار وسطِ فلسطین سے نکالے گئے ہیں۔ جبعہ سے ہل کی ایک پھالی نکلی اور جبعہ طالوت کا وطن تھا۔ اس کا موجودہ نام تل الغول ہے۔ تل بیت مرسیم سے لوہے کی پھالیاں اور درانتیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ فلسطین کے ظروف لگے تھے جن سے اصل چیزوں کی تاریخ کا اندازہ کرنے میں مدد ملی غلّے کو کوٹنے کے لیے ایک ہتھوڑا استعمال کیا جاتا تھا، جس کے نچلے حِصّے میں چھوٹے چھوٹے پتھر نصب ہوتے تھے۔ بھوسا غلّے سے الگ کرنے کے لیے لکڑی کا ایک بڑا دوشاخہ استعمال کیا جاتا تھا۔ آٹا پتھر کی چکّیوں میں ہاتھ سے پیسا جاتا تھا اور روٹی مٹّی کے ایک گول تنور میں پکائی جاتی تھی۔ غرض صورتِ حال کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، وہ اس سے زیادہ مختلف نہیں، جو آج شام کے دیہاتی حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ان درانتیوں، چکّیوں، کونڈیوں اور دوسری اشیاء پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہو سکتا ہے، جو زمانۂ حال میں کھدائی سے برآمد ہوئیں۔

فصلیں بھی آج کل سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔ گندم، جئی، جو، چنا، دریح، انگور، زیتون، انجیر، انار اور اخروٹ عام طور پر ہوتے تھے۔ غلّے، انگور اور زیتون کو بجا طور پر بحیرۂ روم کی تین زرعی پیداواریں قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ شاید بارش کافی نہ ہو، لہٰذا کھیتی باڑی کرنے والوں نے ایسا بندوبست کر لیا تھا جسے خشک بیج بونے کا طریقہ کہتے ہیں، یعنی مختلف کھیتوں میں ایک سال فصل بوتے

اور ایک سال انھیں خالی رکھتے۔ کنعانی معاشرے میں مزارعین یا مستاجرین بھی شامل تھے، جنھیں "خاپشی"[1] کہا جاتا تھا۔ بابلی معاشرے میں ایسا ہی ایک طبقہ مشکینوں کہلاتا تھا۔[2] لبنان کے دیہاتی حلقے میں آبادی مقامی وسائل پیداوار سے بڑھ گئی تو پہاڑوں کے اطراف میں پایے سے بنا لیے گئے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیواریں کھڑی کر دی گئیں، تاکہ قابلِ کاشت زمین میں اضافہ ہو جائے اور یہ زمین بارش کے پانی کے باعث جگہ جگہ سے کٹ نہ جائے اس قسم کے پایہ بہ پایہ ڈھلوان انگورستانوں، نیز میووں اور پھلوں کے باغات کے لیے زراعت کے مقابلے میں زیادہ موزوں تھے۔ ان پایہ بہ پایہ ڈھلوانوں کا ذکر سب سے پہلے تحوتمس ثالث فرعونِ مصر کے ایک کتبے میں ملتا ہے۔ یہ چیز آج بھی لبنان میں موجود ہے۔

پالتو جانوروں میں سے زیادہ اہم حیثیت گائے، بیل، بھیڑ، بکری، گدھے، سؤر اور کتّے کو حاصل تھی، کتّے، سؤر اور بھیڑ کو غلاظت صاف کرنے والے جانور سمجھا جاتا تھا۔ گوشت صرف شادمانی کی تقریبوں پر کھایا جاتا تھا۔ پکانے کا طریقہ یہ تھا کہ اسے چوڑے منہ والے برتنوں میں ابال لیتے تھے۔ کھانا یا تو ہاتھ سے کھایا جاتا تھا یا ایسے چمچوں سے، جن کے دستے ہڈی کے ہوتے تھے۔ پینے کا پانی یا تو حوضوں سے لیا جاتا تھا یا چشموں سے۔ باہر سے پانی مشکیزوں میں بھی لایا جاتا تھا اور مرتبان نما برتنوں اور مشکوں میں بھی۔ چراغ مٹی کی چھوٹی چھوٹی تشتریوں میں جلاتے جاتے تھے۔ ان کے کنارے ایک جگہ سے ذرا نوکدار بنا لیے جاتے تھے، تاکہ ان میں بتی ٹھہر سکے اور زیادہ سے زیادہ پرانے چراغ وہ ملے ہیں، جن کا تعلّق دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصف اول سے ہے۔ کھانا پکانے کے بہت سے برتن ملے ہیں، مثلاً مٹکے، ہنڈیا، پتھر کے پیالے، یہ چیزیں قدیم آبادیوں کی جگہوں میں کھدائی سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ گھریلو زندگی کے جو طور طریقے پہلے رائج تھے، وہی اب تک چلے جا رہے ہیں۔

صنعت و حرفت

کاریگر اور تاجر کنعان کے معاشرے میں درمیانی حیثیت کے مالک تھے۔ ایک جانب جاگیردار امرا تھے، جو بڑے بڑے مالکانِ اراضی اور جنگی رتھوں میں بیٹھ کر لڑنے والوں پر مشتمل تھے۔ دوسری طرف زیریں طبقہ تھا، جو کسانوں اور غلاموں سے مرکب تھا۔

بیٹے عموماً اپنے آبا کا پیشہ اختیار کرتے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہتا۔ یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ دستکاروں اور ہنرمندوں نے اپنی جماعتیں منظّم کر لی تھیں۔ یہ جماعتیں بڑی مرتّب تھیں۔ پیشے اور خون کے رشتوں نے انھیں ایک دوسرے سے جکڑ رکھا تھا اور یہ جماعتیں آبادی کے جداگانہ حلقوں میں رہتی تھیں۔ اس قسم کی جماعتی تنظیمات فلسطین کے اندر اٹھارھویں صدی قبل مسیح میں شروع ہو گئی تھیں۔

شام کی صنعت کاری میں مٹّی کے برتن بنانے کا فن بالکل ابتدائی دور میں شروع ہو گیا تھا اور یہ بہت کامیاب ہوا۔ پندرھویں صدی قبل مسیح سے پیشتر یہ اوجِ کمال پر پہنچ گیا تھا۔ اس سلسلے میں بابل کا اثر ۲۰۰۰ ق م میں نمایاں ہو چکا تھا۔ کمہار کا چکہ دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے اوائل میں رائج ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے کنعانی ظروفِ گلی نے نئی شان حاصل کر لی اور ان کی شکل صورت زیادہ موزوں ہو گئی۔ ان ظروف کے لیے جو مٹّی استعمال کی جاتی تھی اسے بہتر بنانے کے طریقے اختیار کر لیے گئے۔ اموریوں کے ابتدائی دور میں جن پہلوؤں کو ظروفِ گلی میں نمایاں کیا

---

[1] Khapshi — خاپشی کی اصل غالباً خبوشہ ہے، یعنی کمینہ ہونا

[2] Mushkenu — یہی لفظ عربی میں "سکین" ہے

جاتا تھا، انھیں بالکل چھوڑ دیا گیا اور اس سلسلے میں بیرونی نمونوں خصوصاً مصر، کریٹ سیناﺋی کی پیروی[۱] عام ہو گئی۔ مصر کے مجلّی اور سنگی ظروف خاص تعداد میں درآمد ہونے لگے۔ قبرص سے آئی ہوئی چیزیں بھی نمونے کے طور پر استعمال ہونے لگیں جیسا کہ ادغاریت اور بعض دوسرے مقامات کی قدیم چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ادغاریت قبرص کے راستے میں شام کے ساحل پر واقع تھا۔ ۱۵۵۰ ق م کے بعد قبرص اور سیناﺋی کے اثرات بطور خاص گہرے ہو گئے۔ مذہبی تقریبوں اور دعاؤں کے مواقع کیلئے خاص طور پر نکالے گئے ظروف گِلی میں جلا اور چمک پیدا کرنے کے لئے ٹین کا استعمال شروع ہو گیا۔ مقبروں سے جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ مذاق اور فن کاری نے خاصا بلند رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ سنگتراشی کو سولھویں صدی قبل مسیح میں عروج نصیب ہوا۔

معدنیات

درمیانی اور آخری برنجی دور (۲۰۰۰ ق م - ۱۲۰۰ ق م) کے کنعانیوں سے معدنیات کے علم میں کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ تانبے اور برنج سے بے تکلف کام لیتے تھے۔ راس الشمرۃ سے ایک کلہاڑی کا پھل ملا ہے جو چودھویں صدی قبل مسیح کے اوائل کا ہے۔ اس کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ پھل بنانے والوں کو نہ محض لوہا پگھلانے کا علم تھا بلکہ وہ جانتے تھے کہ کون کون سی دوسری دھاتیں لوہے میں شامل کر کے فولاد بنایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے متعلق پہلے کوئی علم نہ تھا۔ کنعانیوں نے تانبے میں ٹین شامل کر کے پیتل بنایا۔ لوہے میں ٹین شامل کر کے فولاد بنا لیا۔ پھر وہ سونے اور چاندی کی تلاش میں اپنے وطن سے باہر لمبے سفر کرتے رہے۔ فرعون نے شام سے جو مال غنیمت لیا تھا، اس میں رو پہلی مچھلیاں بھی شامل تھیں۔ زرگری کا فن سولھویں صدی قبل مسیح میں کمال پر پہنچا۔ قیمتی چیزیں تولنے کے لئے صرّاف جو ترازو استعمال کرتے ہیں، اس کا ایک نمونہ راس الشمرۃ میں دستیاب ہوا۔ اگرچہ عام طور پر تجارت میں جنسوں کا مبادلہ جنسوں سے ہوتا تھا، لیکن چاندی کے ٹکڑے تول کر قیمت ادا کرنے کا رواج مغربی ایشیا میں موجود تھا لیکن سکّے اس وقت تک رائج نہیں ہوئے تھے۔ سنخرب (۷۰۵ ق م - ۶۸۱ ق م) ایک آشوری فاتح تھا، جس نے شام فتح کیا۔ وہ ایک جگہ اپنے بنائے ہوئے اوزان کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے۔

"میں نے مٹی کا ایک سانچا تیار کرایا اور اس میں پگھلا ہوا برنج ڈال دیا۔ اس طرح ایک وزن بن گیا، جو نصف شقل کے برابر تھا۔"

چاقو، برچھوں کی انیاں، جنگی کلہاڑے، سنالیاں اور موچنے اریحا سے ملے ہیں، جن کا تعلق اسرائیلیوں سے پیشتر کے دور سے ہے۔ ۱۲۰۰ ق م کے بعد آلات و اسلحہ کے سلسلے میں حتّیوں، قبرص والوں کے اور مائی سیناﺋی والوں کے نمونے فلسطین میں نمودار ہوئے۔ مختلف مقامات سے پیتل، سونے اور چاندی کے ہار، پائل، پازیب، گوشوارے، انگوٹھی، بروچ وغیرہ زیور ملے ہیں۔ حیفا کے نزدیک ایک مقام ابو ہورم ہے، وہاں سے پیتل کے چھوٹے چھوٹے جھانجھ نکالے گئے ہیں، جن کا تعلق چودھویں صدی قبل مسیح سے ہے۔ آثار سے پتا چلتا ہے کہ مختلف قسم کے آلات موسیقی مثلاً بربط، بانسری، دہری بانسری، ستار، طنبوری وغیرہ موجود تھے، مگر ان کا کوئی بچا کھچا حصّہ نہیں مل سکا۔ کنعانی

---

[۱] Mycenaean یہ یونان کے ایک حصے کی تہذیب تھی جو یونان کے عروج سے پیشتر فروغ پا چکی تھی۔ اس کا ذکر بحر ایجہ کی تہذیب کے سلسلے میں آ چکا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو شافر (Schaeffer) کی (Ugaritics) ص ۱۱۰

[۳] شقل، جسے انگریزی میں Shekel کہتے ہیں، ایک وزن تھا جو یہودیوں میں رائج تھا۔

تاجروں نے مصر سے تعویذ، بھونرے کی وضع کے تراشے ہوئے قیمتی پتھر، ظروف، مہریں، تسبیح کے دانے، اسلحہ اور دوسری چیزیں منگوانی شروع کر دی تھیں۔ کنعان کے کاریگر انھیں نمونوں پر اپنے ہاں سب کچھ بنانے لگے۔ ہومر کی نظموں میں دھاتوں کے فونیقی صناعوں اور ارباب فن کی ستائش پائی جاتی ہے مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ چاندی کے ایک پیالے پر صیدا کے کاریگروں نے اس چابک دستی سے ایسا کام کیا تھا کہ وہ پیالہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی جمیل ترین شے بن گیا۔ بلاشبہ صیدا کے کاریگروں کو فنون میں بڑی مہارت تھی[1]

ہاتھی دانت

عام لوگوں کے لئے آرائش کا سامان چونے کے پتھروں، بلّور اور عقیق سے بنتا تھا اور اس کے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ البتہ ہاتھی دانت کے دانہ ہائے تسبیح اور تعویذ کم ملے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی دانت کی جگہ کنعانی کاریگر ہڈیوں سے کام لیتے تھے۔ اگرچہ اس وقت وسطِ شام میں ہاتھی موجود ہوگا جیسا کہ اس حصہ ملک میں فراعنہ کے شکار کی رودادوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ فونیقیہ سے ہاتھی دانت کی جو زیادہ سے زیادہ پرانی چیزیں ملی ہیں، وہ چودھویں صدی کی ہیں اور مجدّو سے وہ ایک محل میں پڑی ہوئی ملیں جو بارھویں صدی کا ہو سکتا ہے ممکن ہے اصل چیزیں کچھ مدت پیشتر کی بنی ہوئی ہوں۔ ہسپانیہ کے مقبروں سے جو کنگھیاں برآمد ہوئیں، ان کی وضع قطع مجدّو کی کنگھیوں سے ملتی جلتی ہے لیکن ہسپانوی مقبرے آٹھویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ مجدّو سے ہاتھی دانت کی ایک چیز ملی ہے جس میں ایک مطرب کو رباب بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، یہ بارھویں یا تیرھویں صدی قبل مسیح کی ہونی چاہئے۔ اہل فونیقیہ نے ہاتھی دانت کی جو چیزیں چھوڑی ہیں، ان میں سے بعض اتنے اعلیٰ اور خوبصورت کام کا مرقع پیش کرتی ہیں کہ انہیں پہلے مشرقی فنون کی بہترین چیزوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

کانچ

کنعانیوں کو کانچ کے فن میں بھی کمال حاصل تھا۔ کلاسیکی روایات میں کانچ کی دریافت کا سہرا کنعانیوں کے سر باندھا گیا ہے، لیکن اب بھی قطعی طور پر معلوم ہے کہ کنعانیوں سے بہت پہلے اہل مصر کانچ دریافت کر چکے تھے۔ پلینی[2] کے بیانات میں جو کنعانی روایات پیش ہوئی ہیں، ان میں بتایا گیا کہ عکّہ کی بندرگاہ میں جہازوں پر نائٹریٹ پوٹاشیم کے ڈھیلے لادے جاتے تھے اور جہاز والے کھانا پکاتے وقت انھیں ڈھیلوں کو کنارے پر رکھ کر چولھے بنا لیتے تھے اور ان پر دیگچیاں چڑھا دیتے تھے۔ جب چولھے میں آگ سلگتی اور نائٹریٹ پوٹاشیم کی آمیزش ریت کے ساتھ ہوتی تو شفاف لہریں نمودار ہوتیں۔ اس طرح کانچ کی صنعت ظہور میں آئی بہرحال یہ واقعہ ہے کہ مصری کانچ کی تجارت کنعانی تاجروں کے ہاتھ میں تھی اور فونیقیوں ہی نے کانچ کی ساخت تکمیل پر پہنچائی۔

پارچہ بافی

سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا گھروں میں عام رواج تھا۔ پتھر اور ہڈی کی بنی ہوئی ایسی چرخیوں کے باقیات ملے ہیں جنھیں سوت کے لچھے بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ پتھر اور مٹی کی ایسی چیزیں بھی دستیاب ہوئی ہیں، جنھیں جلاہے کپڑا بننے کے وقت کام میں لایا کرتے تھے، ان کا تعلق تیسرے ہزار سال قبل مسیح کے اوائل سے ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے پہل اونی کپڑا بنا گیا جو توریت کی دستاویزیں پندرھویں

---

[1] ہومر کی ایلیڈ کتاب ۲۳ ص ۷۴۰ ۔ یہاں اہل صیدا کو فونیقیوں کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے

[2] پلینی کی کتاب ۳۶ باب ۶۵۔

صدی قبل مسیح کے آس پاس کی ہیں)، ان میں کنعانی اون کا ذکر ہے[۱] کپاس ایک ہندوستانی پودا تھا، جسے سنحریب نے آشوریہ میں رائج کیا۔ اس کے ایک کتبے میں ایسے پودوں کا ذکر ہے "جنھیں اون لگتی تھی اور اس کے آدمی اسے چن کر کپڑے بناتے تھے"[۲] لیکن کپاس اس زمانے میں عام نہ ہوئی۔ فونیقیوں نے یونانیت کے ابتدائی دور میں کپاس کو اس کے سامی نام[۳] کے ساتھ یونانی دنیا میں پہنچایا۔ جنوبی شام میں غالباً دسویں صدی قبل مسیح میں سن کی کاشت ہو رہی تھی، کیونکہ اس دور کی ایک تقویم میں "سن کاٹنے کے مہینے" کا ذکر ہے۔ اگر حزقی ایل (باب ۲۷ آیات ۱۰، ۱۶) کے ایک لفظ کا ترجمہ درست ہوا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اہل صور کو ریشم سے آگاہی تھی۔ اسرائیلیوں سے پیشتر فلسطین میں سوئیاں اور پنیں رائج تھیں۔ یہ چیزیں برنجی ڈبوں میں رکھی ہوئی بھی ملی ہیں اور کھلی بھی۔ سوئیوں کے ناکے ہوتے تھے اور پنیں لمبی تھیں جن کے سرے چپٹے تھے یا ان کی حیثیت میخوں کی تھی۔ گول بٹن بھی ملے ہیں جن میں دو سوراخ ہوتے تھے۔ غریب لوگ مٹی کے بٹن استعمال کرتے تھے۔ امیروں کے لیے ہڈی یا ہاتھی دانت کے بٹن بنائے جاتے تھے۔

مصر کے چٹانی مقبروں کی دیواروں پر تصویریں موجود ہیں جو مقبرے ہکسوس بادشاہوں کے ابتدائی زمانے کے ہیں (۱۸۹۰ ق۔م) ان کی تصویروں میں کنعانی بھی دکھائے گئے ہیں۔ انھوں نے لمبی پوشاکیں پہن رکھی ہیں جو کندھوں سے گھٹنوں تک آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنگین کپڑے پہنتے تھے جن کے حاشیے پر پٹیاں بنا دی جاتی تھیں اور انھیں بڑی اچھی طرح آراستہ کیا جاتا تھا۔ یہ لباس ابتدا میں بادشاہ اور مذہبی پروہت استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ عوام میں رائج ہو گیا۔ اٹھارھویں شاہی خاندان کے جو مقبرے تھیبز (طیبہ) میں ہیں، ان کی تصویروں میں یہ منظر بھی دکھایا گیا ہے کہ شام سے آدمی خراج کی رقم لے کر دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔ ان خراج گزاروں نے کمر سے نیچے تک سفید شلوکے لپیٹ رکھے ہیں جن کے حاشیے سرخ یا نیلے ہیں۔ مصر کی بعض عمارتوں پر کنعانی قیدیوں کی بھی تصویریں ہیں۔ انھوں نے قمیصیں یا چھوٹے کوٹ پہن رکھے ہیں اور کمر میں ایسا لباس ہے جس کی وضع قطع گھاگھرے کی سی ہے۔ اوپر سے ایک چھوٹے عرض کا کپڑا استوانے کی شکل میں لپیٹ رکھا ہے۔ ان کا پورا لباس جس میں سربند بھی شامل ہے، بدوؤں کے لباس سے ملتا جلتا ہے۔ مصریوں کی بنائی (ہوئی) تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض کنعانی ہی نہیں، بلکہ اموری اور دوسرے سامی طبقوں کے لوگ بھی مصریوں کے مقابلے میں بھاری جسم کے تھے۔ وہ بال لمبے رکھتے تھے اور گھنی سیاہ نوک دار داڑھیاں ہوتی تھیں۔ ان کے بال پیچھے کی جانب گردن پر گرتے تھے اور انھیں ایک فیتے یا ڈوری سے باندھ کر پیشانی سے اوپر رکھا جاتا تھا۔ پروہت یا کاہن مصریوں کی طرح سر منڈا لیتے تھے۔ بعد کے زمانے میں عورتیں اپنے سر کے بالوں کو کپڑے میں چھپائے رکھتی تھیں اور شادی کے بعد وہ ایسی ٹوپیاں پہن لیتی تھیں جو پورے سر کو ڈھانپے رہتی تھیں اور ان پر چاند سے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

ارغوان

ساحل کے ساتھ ساتھ ماہی گیری کا بھی دور تھا۔ صیدا[۴] نام بھی اس کا ایک ثبوت ہے۔ چونکہ زمین چنداں زرخیز نہ تھی اور بارش بھی ہمیشہ ضرورت کے مطابق نہیں ہوتی تھی، اس لیے سبزے کی پیداوار عموماً بس اتفاقیہ یا غیر یقینی رہتی تھی، لیکن مچھلیاں بکثرت ملتی تھیں، خصوصاً بڑی مچھلی کی قسم

---

۱ Annual, American Schools of Oriental Research, vol. xvi (1936), No. 77

۲ جیمز ہنری بریسٹڈ (Breasted) کی کتاب Ancient Times دوسرا ایڈیشن نیویارک (۱۹۳۵ء) ص ۲۰۳۔

۳ عربی قطن، یونانی Kiton اور Chiton، انگریزی کاٹن Cotton یہی نام کتان کی شکل میں باقی رہ گیا۔

۴ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صیدا کے لفظی معنی ہیں "مچھلیوں کی پرورش گاہ"۔

کی ہو ذائقے میں نمکین اور رنگ میں سرخی مائل ہوتی تھیں۔

لفظ ارغوان سب سے پہلے راس الشمرۃ کی ایک دستاویز میں استعمال ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اون کی ایک خاص مقدار جلاہوں کے درمیان تقسیم کی گئی اور انھیں تاکید کی گئی کہ اسے "ارجان[1] میں رنگ ڈالیں۔ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں نہ صرف مشرقی ساحل پر بلکہ ہر جگہ صدف ماہی سے ارغوانی رنگ نکالا جاتا تھا اور فونیقوں کے علاوہ مینوسی اور یونانی اس غرض سے گھونگے استعمال کرتے تھے یونانیوں میں ایک روایت چلی آرہی ہے کہ ملکہ ہیلن جو یونان سے ٹرائے چلی گئی تھی ایک روز سمندر کے کنارے وقت گزاری کے لئے ٹہل رہی تھی اس کے کتے نے ایک صدفی مچھلی نگل لی اور اس کے منہ کا رنگ ارغوانی ہوگیا۔ یہ رنگ اسے اتنا پیارا معلوم ہوا کہ جو بھی اس کے لطف و کرم کا امیدوار بن کر آتا، اس کے سامنے یہ مطالبہ پیش کرتی کہ میرے لئے ارغوانی رنگ کا لباس لے کر آؤ۔ زمانہ قدیم کے رنگوں میں سے ٹرائے کا ارغوانی رنگ سب سے زیادہ قیمتی مانا جاتا تھا اور اس نے سب سے بڑھ کر شہرت پائی۔ صور اور صیدا کے آس پاس بہتر قسم کی صدف ماہی پائی جاتی تھی۔ فونیقی اپنے ہاں کے ذخیرے کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ سپارٹا، قرطاجنہ اور ٹیکاٹک کی بندرگاہوں سے رنگ درآمد کرتے تھے۔ وہ رنگ نہیں بلکہ رنگا ہوا کپڑا بیچتے تھے کچھ معلوم نہیں کہ جس سیال مادے سے یہ رنگ حاصل کیا جاتا تھا وہ صدف ماہی کے جسم میں کیا وظیفہ ادا کرتا تھا۔ یقیناً اس کا وظیفہ یہ نہ ہوگا کہ دشمن حملہ کردیں تو صدف ماہی یہ سیال مادہ پانی میں چھوڑ کر اسے رنگین بنا دے اور اس طرح دشمن کے حملے سے محفوظ رہے عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی رائے یہی ہے۔

صدف ماہی میں سے اس مادے کے چند قطرے نکالنے کے لئے بڑی خاصی اور تکلیف دہ مشقت برداشت کرنی پڑتی تھی اس طرح خرچ بہت پڑجاتا تھا پھر کسی خاص طبقے کے پاس اس کا اجارہ بھی نہیں تھا صرف دولت مند لوگ ہی ارغوانی رنگ کے کپڑے خرید سکتے تھے رفتہ رفتہ اس رنگ کا لباس امتیاز کا نشان بن گیا اسی طرح شان امیری کی تعبیر کے لئے "ارغوانی" رنگ ایک مثل بن گیا[2] ہومر کے دور میں نیز یونانیت کے عہد عروج میں ارغوانی لباس کو صرف بادشاہوں کے لئے خاص سمجھا جاتا تھا۔ ٹرائے کی ملکہ ہیلن کی طرح مصر کی ملکہ کلیوپیٹرا کو بھی ارغوانی لباس بہت پسند تھا۔ یہودیوں کا اعلیٰ کاہن بھی اپنے منصب کی برتری ظاہر کرنے کے لئے ارغوانی لباس پہنتا تھا۔ بالکل یہی طرز عمل ہیراپولس (شمالی شام) کے اعلیٰ کاہن[3] نیز میگنیشیا (ایشیائے کوچک) میں چوپیڑ کے مندر کے پروہت نے اختیار کر لیا تھا[4]۔

فونیقی ذرائع سے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ارغوانی رنگ کیوں کر تیار کیا جاتا تھا۔ پلینی[5] ہمیں بتاتا ہے کہ صدف ماہی کو زندہ پکڑ لیتے تھے ——— اس لئے کہ مرنے کے ساتھ وہ اس عرق کو باہر نکال دیتی تھی ——— پھر ایک خاص رگ میں نشتر لگا کر رنگ نکال لیتے اور اس میں نمک ملا کر تین روز پڑا رہنے دیتے۔ بعد ازاں درمیانے درجے کی حرارت سے اسے جوش دیتے اور ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ہلاتے جاتے، دس روز کے بعد رنگ بالکل گھل جاتا۔ پھر اس میں اون ڈبو دیتے جو پانچ روز تک سوکھتی رہتی پانچ روز کے بعد اون نکال کر کھول لیتے۔ دوبارہ یہی عمل کیا جاتا تاکہ رنگ اون میں پوری طرح جذب ہوجائے۔ رنگ کو اس وقت بہترین سمجھا جاتا، جب یہ جمے ہوئے خون کی طرح

---

[1] آشوری زبان میں اس کا تلفظ "ارجمانو"، عبرانی و ارجامان" (دتواریخ حصہ سوئم باب ۳۔ آیت ۷) اور عربی میں ارجوان۔ مگر یہ لفظ غیر سامی ہے

[2] کتاب آستر باب ۸، آیت ۱۵، کتاب الامثال باب ۳۱ آیت ۲۲، لوقا کی انجیل باب ۱۶، آیت ۱۹۔ [3] ایلیڈ کتاب چہارم ۱۴۱–۱۴۵، نیز کتاب المکابین حصہ اول باب ۸ آیت ۱۴۔ [4] لوسیاں De Dea Syria [5] سٹرابو چودھویں کتاب پہلا باب

[5] نویں کتاب باب ۶۲

ہو جاتا۔

مسیحیت کے ظہور سے پیشتر دمشق میں دولت کی ریل پیل تھی، بہت وسیع پیمانے پر ارغوانی لباس پہنا جاتا تھا۔ پھر اٹلی اور دوسری سرزمینوں میں اس کی نقالی ہونے لگی۔ مشرق میں یہ صنعت اسلامی فتوحات کے بعد بھی جاری رہی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آخری دور میں وینس کے تاجر جو چیزیں مشرق سے منگواتے تھے ان میں صور کے ارغوانی پارچات کا بھی ذکر ہے۔ بیزنطینی سلطنت کے سقوط کے بعد ارغوانی رنگ بنانے والوں کا حلقہ محدود رہ گیا اور مشرق کے باشندے اس صنعت سے بالکل بے خبر ہو گئے۔ انگلستان میں یہ رنگ مشرق سے پہنچا تھا اور سترھویں صدی عیسوی تک رائج رہا۔

ارغوانی رنگ کے علاوہ لبنان کے قدیم باشندوں نے قرمزی رنگ کی تجارت بھی شروع کی تھی[۱] اس کا ذکر بائبل کی کتابوں میں بھی ملتا ہے[۲] یہ ان کیڑوں سے بنایا جاتا تھا جو بلوط کی ایک خاص قسم پر رہتے تھے۔ اس قسم کے بلوط بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر ہوتے تھے۔ ان کیڑوں کو سکھا کر ان پر کوئی تیز آب ڈال دیا جاتا تو رنگ نکل آتا۔ شروع میں یہ کیڑے بلوط کے درختوں سے حاصل کئے جاتے۔ پھر ایرانیوں اور غالباً ارمنوں نے ان کی باقاعدہ پرورش شروع کر دی۔

---

[۱] عربی قرمز، انگریزی Crimson اصل لفظ ایرانی یا ارمنی ہے

[۲] گنتی باب ۱۹۔ آیت ۶۔ احبار باب ۱۴ آیت ۴۔

نواں باب

بحری سرگرمیاں اور استعماری توسیع

فونیقی تاریخ کی سب سے پہلی بحری قوم تھے لبنان کے سلسلۂ کوہستان کے باعث ملک کے اندرونی حصے کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے میں مشکلات حائل ہوگئی تھیں، لیکن ان پہاڑوں میں جو لکڑی پیدا ہوتی تھی اس سے بڑے عمدہ جہاز بنائے جاسکتے تھے اور بحیرۂ روم مشرقی ساحل کے ان سامی باشندوں کو اپنی سطح پر جہاز رانی کی دعوت دے رہا تھا انھوں نے یہ دعوت قبول کرلی اور خانہ بدوشی کی زندگی میں صحرانوردی کے بجائے دریانوردی اختیار کرلی سمندر کے ظاہری خطرات انھیں ہراساں نہ کرسکے اور غیر معلوم دنیا نے انھیں سراسیمہ کرنے کے بجائے مسحور کرلیا ابتدا میں انھوں نے ساحل کے ساتھ ساتھ جہاز چلانے شروع کئے اور مچھلی کا بیج، مٹی کے برتنوں اور دوسری مقامی پیداوار اور صنائع کی تجارت شروع کردی پھر ان کے سفینے کھلے سمندر کی وسعت میں دوڑنے لگے اسی طرح انھوں نے شرق و غرب کے درمیان اہم بحری شاہراہیں قائم کرلیں جن پر طویل مدت تک انھیں کا قبضہ رہا اس طرح چھوٹے چھوٹے دکاندار ملک التجار بن گئے وہ اعلیٰ درجے کے آبادکار تھے اور انھوں نے اپنی نیز اپنے ہمسایوں کی حضارت کے عناصر جگہ جگہ پھیلا دیے۔ اجنبیوں نے ان کی حضارت قبول کرلی تیرھویں اور بارھویں صدی قبل مسیح کے درمیان آرامیوں نے انھیں وسطِ شام سے اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے جنوبی شام سے نکال دیا تو فونیقیوں یا کنعانیوں نے اپنی سرگرمیوں کا رخ سمندر کی طرف پھیر لیا۔ اضافی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخ کے سب سے بڑے تاجر اور سب سے بڑے بحر پیما تھے بحری شاہراہیں۔

فونیقی محض دریانورد ہی نہ تھے جیسا کہ روایات نے ان کا نقشہ پیش کیا ہے انھوں نے خاص راستوں کے نقشے چھان بین کے بعد تیار کئے اور ان سے کام لیتے رہے، بلکہ ان راستوں پر قریباً انھیں کا اجارہ قائم ہوگیا۔ ان کے ابتدائی بین الاقوامی راستے وہ تھے جو ببلوس کو مصر کی دوسری بندرگاہوں سے ملاتے تھے۔ بعد میں انھوں نے جو بڑے بڑے راستے بنائے وہ صیدا اور صور سے مصر جاتے تھے یا سیدھے قبرص کے شمال کی جانب نکل جاتے تھے۔ وہاں سے ان کا رخ کوہستان طارس کی طرف ہوجاتا تھا اور لیقیہ کے پاس سے گزرتے ہوئے جزیرہ روڈس کے جنوب میں پہنچ جاتے تھے، پھر کریٹ اور کورسیرا[1] ہوتے ہوئے سسلی پہنچ جاتے تھے، وہاں سے کوسیرا[2] جزیرے میں چلے جاتے تھے۔ وہاں سے شمالی افریقہ کی ساحلی نوآبادیوں میں چلے جاتے تھے۔ ان سے آگے مغربی جانب ہسپانوی ساحل پر ان کی نوآبادیاں تھیں، ان نوآبادیوں کی طرف نکل جاتے تھے ان بڑے راستوں کے علاوہ ایسے راستے بھی تھے جنھیں شمالی و جنوبی بحری گلیاں سمجھنا چاہیئے یہ راستے بڑی شاہراہوں کو جا بجا قطع کرتے تھے۔ فونیقیوں نے پہلے پہل چار خاص چیزوں کی بہم رسانی شروع کی یعنی لکڑی، گیہوں، تیل اور شراب۔ جو ملک

---

[1] Corcyra اس جزیرے کو آج کل عام طور پر کارفو کہتے ہیں اور یہ ایڈریاٹک کے دہانے پر البانیہ اور یونان کی سرحد کے قریب واقع ہے۔

[2] یہ وہی جزیرہ ہے جسے اب پینٹی لیریا Pantelleria کہتے ہیں یہ سسلی اور تونیہ کے درمیان ہے عرب اسے "قومرہ" کہتے تھے۔

بحیرۂ روم کے سواحل پر واقع تھے، ان میں سے اکثر کو ان چیزوں کی احتیاج تھی۔ یونانیوں کے لئے لبنان کے دیودار فونیقی دیودار تھے[1] آگے چل کر فونیقی تاجروں نے اپنے ہاں کی مصنوعات میں سے دو ممتاز جنسوں کی تجارت شروع کر دی، اول کپڑا، دوم دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں۔ مصر اور دو آبۂ دجلہ و فرات کی زمینیں سیلابی تھیں، ان ملکوں کے باشندوں کو پائدار لکڑی کی اشد ضرورت تھی، اس لئے بھی کہ اپنے مندر اور محل تعمیر کریں اور اس لئے بھی کہ ماہی گیر کشتیاں، نیز تجارتی اور جنگی جہاز بنائیں۔ لبنان کے جنگلوں میں عمدہ لکڑی کے درخت بھی تھے اور ایسے درخت بھی جن سے گوند، رال وغیرہ نکل سکتے تھے، مثلاً صنوبر، دیودار، تارپین کا درخت۔ یوں ان جنگلات سے لکڑی کے علاوہ رال، گوند وغیرہ بھی حاصل ہو سکتے تھے اور لکڑی کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی تجارت بھی شروع ہو گئی۔ گوند، رال وغیرہ کو جہازوں کے اوپر مل دیا جاتا تھا[2] تاکہ یہ پانی میں خراب نہ ہوں۔ تیل خوشبو کے لئے بھی کام دیتا تھا اور کھانے میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ فونیقیوں کے مال کی کھپت کے لئے دور دور تک منڈیاں بن گئیں تو مصنوعات کی رفتار بھی تیز ہو گئی اور ہر قسم کی جنسیں فراہم کی جانے لگیں چنانچہ فونیقی تاجر مشرق و مغرب کے درمیان تجارت کے کارندے بن گئے۔ وہ مشرق کی تمام ضروری چیزیں مغربی ملکوں میں پہنچاتے، مغرب سے جو کچھ ملتا اہلِ مشرق کے حوالے کرتے تھے۔ مغرب سے زیادہ تر معدنیات یا ظروفِ گلی آتے۔ غرض بحیرۂ روم یونانیوں اور رومیوں کی جھیل بننے سے بہت پہلے فونیقیوں کی جھیل بن گیا تھا۔

فنِ جہاز رانی

بحری آمد و رفت کو بین الاقوامی پیمانے پر ترقی دینے کی کوشش میں فونیقیوں نے فنِ جہاز رانی کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ انہیں قطب تارے کے فوائد کا علم ہو چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت جہاز چلانے کے فن میں انھوں نے سب سے پہلے مہارت حاصل کی یعنی وہ ستاروں کو دیکھ کر اپنا راستہ متعین کر لیتے تھے[3] یونانیوں نے قطب تارے کا نام فونیقیوں ہی کے مطابق رکھا۔ دیودار کے بڑے بڑے شہتیر طغیانیوں کے موسم میں ندیوں کے اندر ڈال دیے جاتے تھے، تاکہ قریب ترین بندرگاہ پر پہنچ جائیں۔ وہاں ان سے جہاز سازی کا کام بھی لیا جاتا تھا اور باہر بھی بھیجے جاتے تھے۔ پائداری میں کوئی لکڑی ان سے برتر نہ تھی۔ صیدا اور صور کی بندرگاہوں میں یہ لکڑی کوہ حرمون (جبل الشیخ) سے آئی تھیں۔ ۱۲۰۰ق م کے آس پاس فونیقیوں کے جہاز مصریوں کے نمونے پر بنتے تھے۔ یعنی ہلال کی وضع کے۔ اگلا حصہ اونچا، سامنے دو بڑے پتوار، جو جہاز کو سیدھا رکھتے تھے اور مستول کے بالائی سرے سے ایک مربع بادبان وابستہ ہوتا تھا۔ ہمیں جہازوں کا جو ابتدائی نمونہ ملا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بادبان اور پتوار دونوں انھیں چلانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ جہاز خاصے چوڑے ہوتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ سامان ان میں سما سکے۔ آخری دور میں فونیقیوں کے جو تجارتی اور جنگی جہاز تھے ان کی تصویریں آشوری یادگاروں پر بنی ہوئی ہیں۔ ان کے بھی اگلے حصے اونچے ہوتے تھے اور آخری سرا بڑا نوکدار بنا دیا جاتا تھا تاکہ اسے لڑائی میں بھی بخوبی استعمال کیا جا سکے۔ ان کے عرشے دہرے ہوتے تھے یعنی ایک نیچے دوسرا اوپر۔ فونیقی جہاز سازوں ہی نے سب سے پہلے ملاحوں کی دو یا زیادہ قطاروں والے جہاز بنائے۔ ایک گروہ نیچے ہوتا تھا دوسرا اس کے اوپر عرشۂ زیریں میں عام طور پر

---

[1] تھیوفراسٹس Theophrastus کتاب سوم نیز کتاب نہم

[2] ایضاً کتاب چہارم نیز خروج باب ۲، آیہ ۳

[3] سٹرابو سولھویں کتاب باب ۲۔

چار یا پانچ ملاحوں کی دو قطاریں ہوتی تھیں، گویا کل سولہ یا بیس آدمی جہاز کو کھینے کا کام انجام دیتے تھے بعد میں جہاز کھینے والوں کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی مسافر جہاز کے بالائی طبقے میں رہتے تھے بادبان کو سنبھالنے کے لیے مستول کے ساتھ صرف ایک بلّی لگائی جاتی تھی۔ جہاز لنگرانداز ہوتا یا موسم ناخوشگوار ہوتا تو بادبان لپیٹ دیا جاتا۔ ظروفِ گلی پر جو تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی نمونہ ابتدائی دور کے یونانیوں نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ان ملاحوں نے ایسے ہی جہاز بنائے تھے، جو سمندر سے واقف تھے[1] اور یہ ملاح حضرت سلیمانؑ کے حلیف حیرام شاہ صور نے بھیجے تھے۔ حضرت سلیمان کے جہاز عصیون جابر میں لنگرانداز ہوتے تھے، یہی مقام حکومت اسرائیل کی بندرگاہ ہے اور یہ خلیج عقبہ میں واقع ہے[2] اسی راستے لکڑی اور تانبا باہر بھیجا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں اوفیر کا سونا، خوشبوئیں اور مسالے عرب کے دوسرے حصوں سے حاصل کئے جاتے تھے۔ یوں سویز کے راستے سے احتراز کیا جاتا تھا کیونکہ اس راستے کے دوسری جانب مصر واقع تھا علاوہ بریں غلام اور گھوڑے مصر بھیجے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں مصر سے مقامی چیزیں حاصل کی جاتی تھیں۔ مصر کے بیسویں حکمران خاندان (۱۲۰۰ ق م - ۱۰۹۰ ق م) کے زمانے میں جو شہر ڈیلٹا میں آباد تھے[3] ان کے فونیقی تاجروں کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل تھی۔ ممفیس کے اندر انھیں تیرھویں صدی قبل مسیح میں ایسے خاص حقوق حاصل تھے جنھیں دورِ حاضر کے اجنبی امتیازات کا پیش خیمہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فونیقی سب سے پہلے بحرپیما ہی نہ تھے، بلکہ تاریخ کی یہ پہلی قوم ہے جس نے بحر و بر دونوں سے یکساں فائدے اٹھائے۔ اندرونِ ملک میں ان کے تجارتی مرکز تھے، مثلاً الرہا (ادلیسا) اور غالباً نصیبین[4] ان مرکزوں کے ذریعے سے بحیرۂ روم کی بندرگاہوں اور خلیج فارس کی چوکیوں کے درمیان اتصال پیدا ہو گیا تھا۔ فونیقیوں کی اپنی روایات بھی کہتی ہیں کہ وہ خلیج فارس سے اٹھ کر ساحل شام پر پہنچے تھے۔ خلیج فارس میں بھی ان کے شہروں کے نام وہی تھے، جو شام پہنچ کر رکھے یعنی ارواد، صور اور صیدا[5]۔ نبی حزقی ایل کی کتاب کے تجارتی باب (۲۷) میں فونیقیوں کی بحری اور بری تجارت کے مختلف پہلوؤں کی کیفیت بڑے ہی اچھے طریق پر بیان کی گئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ چاندی، لوہا، ٹین اور سیسہ ہسپانیہ سے لاتے تھے، غلام اور پیتل کے برتن "آئی اونیا" سے، کپڑا مصر سے، بھیڑ بکریاں عرب سے

افریقہ کا بحری دورہ

فونیقیوں کا عظیم ترین بحری کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے افریقہ کے اردگرد سمندر کے راستے چکر لگایا اور یہ واقعہ پرتگیزوں کے ایسے ہی دعوے سے دو ہزار سال پیشتر کا ہے۔ یہ کارنامہ چھبیسویں مصری خاندان حکومت کے بادشاہ فرعون "نخو" (۶۰۹ ق م - ۵۹۳ ق م) کے زیر نگرانی انجام پایا، جس نے وہ پرانی نہر از سر نو کھدوائی تھی جو دریائے نیل کی مشرقی شاخ کو بحیرۂ قلزم سے ملاتی تھی۔ انھوں نے سمندر کا راستہ اختیار کیا اور جنوبی سمندر میں پہنچ گئے۔ خزاں کی آمد پر انھوں نے جہاز ٹھہرائے، کنارے پر گندم کی کاشت کی، فصل پک گئی تو غلہ لے کر

---

[1] بائیبل، سلاطین حصہ اول باب ۹ آیت ۲۷

[2] Ezion-Geber یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ فونیقیوں نے نقب میں بھی کوئی نوآبادی قائم کی تھی۔ ملاحظہ ہو گارسٹانگ کی کتاب Heritage of Solomon ص ۳۷۱، نیز ایلبرائٹ کی کتاب Archaeology and the Religion of Israel ص ۵۹-۶۰

[3] بعض اصحاب کا خیال ہے لفظ "نبل" اصلاً فونیقی ہے اس کا اصل مادہ سامی لفظ نہیں ہے جس کے معنی میں ہیں۔

[4] Nisibis موجودہ نام نصیبین ہے۔

[5] سٹرابو سولھویں کتاب، باب سوم۔

پھر روانہ ہو گئے۔ اس طرح دو سال صرف ہو گئے تیسرے سال کے دوران میں ہرکولیس کے ستونوں[۵۱] پر پہنچ گئے۔ وہاں سے مصر ان کا عام راستہ تھا انھوں نے کہا (ممکن ہے کچھ لوگ تسلیم کر لیں، میں تسلیم نہیں کرتا) کہ لیبیا (افریقہ) کا چکر لگاتے وقت سورج ان کی دائیں جانب تھا لیکن یہی آخری تفصیل جسے بابائے تاریخ (یونان) نے تسلیم نہ کیا، دراصل ان کی کہانی کو سچا ثابت کرنے کی دستاویز تھی جب ان کے جہاز راس امید کا چکر لگا کر مغربی جانب بڑھے تو کرہ جنوبی کا سورج یقیناً ان کے دائیں ہاتھ ہو گا۔

نوآبادیاں

فونیقی جہاں بھی گئے، انھوں نے نوآبادیاں قائم کر لیں۔ ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ وہ جہاں موزوں جگہ پاتے پاؤں جما کر بیٹھ جاتے اور کسی کے دل میں ان کے متعلق شبہ پیدا نہ ہوتا چونکہ ان کی کوئی مشترک سیاسی زندگی نہیں تھی اس لئے اپنے آپ کو کسی خاص مشقت کا ہدف بنائے بغیر وہ ہر قسم کے حالات سے مطابقت پیدا کر لیتے تھے یہ بالکل وہی طریقہ تھا جو دور حاضر میں ان کے اخلاف یعنی لبنانی تارکین وطن نے اختیار کیا۔ آبادکاروں اور منتقلوں کی حیثیت میں انھوں نے رفتہ رفتہ اونچا درجہ حاصل کر لیا جو دنیا بظاہر ساکن و جامد معلوم ہوتی تھی اس میں انھوں نے حرکت و جنبش پیدا کی اور اس کے پورے افق کو بہت وسیع کر دیا۔ انھوں نے جا بجا تجارتی کارگاہیں قائم کیں یہ کارگاہیں بستیاں بنیں، بستیوں نے بڑی بڑی نوآبادیوں کی حیثیت اختیار کر لی بحری راستوں نے ان نوآبادیوں کو ان شہروں سے ملا دیا، جہاں سے منچلے لوگوں نے نکل کر یہ آبادیاں قائم کی تھیں اس طرح ڈیلٹا سے ایشیائے کوچک کے ساحل تک پھر یونان اور بحیرہ روم کے دوسرے مقامات تک ایک سلسلہ روابط قائم ہو گیا اس طرح بحیرۂ روم واقعی 'بحیرۂ متوسط' بن گیا، جیسا کہ اسے آجکل کہا جاتا ہے یہ امر بے تامل قبول کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی بحیرۂ روم کی آبادیوں میں قبرص شامل ہو گا۔ قبرص میں نوآبادیاں سسلی اور سارڈینیا سے پہلے بن چکی ہوں گی اور سسلی و سارڈینیا کی نوآبادیوں کا سنگ بنیاد شمالی و مغربی افریقہ اور ہسپانیہ سے پہلے رکھا جا چکا ہو گا وسط بحیرۂ روم کے جزیروں میں فونیقیوں کی آبادکاری اگر پہلے نہیں تو گیارھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں شروع ہو گئی ہو گی۔ ہسپانیہ میں قادس[۵۳] اور شمالی افریقہ کے اس حصے میں، جسے آجکل تونیسیہ کہتے ہیں اوتیکا[۵۴] کی بنیاد ۱۱۰۰ ق م کے آس پاس پڑ چکی ہو گی۔ ان حصوں میں یہ سب سے پرانی آبادیاں ہیں قادس ایک فونیقی لفظ گدر سے مشتق ہے جس کے معنی فصیل یا محصور مقام کے ہیں نویں صدی ق م سے پیشتر کا کوئی فونیقی کتبہ سارڈینیا اور قبرص سے نہیں ملا بعل لبنان کا جو مشہور کتبہ قبرص میں ملا ہے اور جسے ایک وقت میں فونیقی تحریر کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جاتا تھا دراصل آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے قرطاجنہ[۵۵] جسے شہر صور کی عالی شان دختر کہنا چاہیے فونیقیوں کی ممتاز ترین نوآبادی تھی اس کی ابتدا ۸۱۴ ق م سے ہوئی یہ اپنی مغربی ہمسر ہپو[۵۶] کے بعد وجود میں آئی ہپو ایک زمانے میں تاجداروں کی قیام گاہ تھا اسی وجہ سے اس کا عرف ریجیس[۵۷] پڑ گیا بعد ازاں اس میں سینٹ آگسٹائن کی اسقفی کلیسا کا مرکز بنا لفظ لیبیا یونانی ہے لیبیا شمالی افریقہ کا یونانی نام تھا بعد ازاں یہ نام پورے براعظم افریقہ کے لئے استعمال ہونے لگا یونانی روایات کے مطابق یہ پوسیڈن[۵۸] کی بیوی کا نام تھا جو آجینور شاہ فونیقیہ کی

---

۵۱ Pillars of Hercules یہ آبنائے جبل طارق کا قدیم نام ہے گویا وہ افریقہ کا چکر لگا کر بحیرۂ روم کے مغربی دہانے پر پہنچ گئے تھے۔

۵۲ ہیروڈوٹس کتاب چہارم باب ۴۲

۵۳ Cadiz

۵۴ Gades — Agadir یہ عربی لفظ جدار (دیوار) سے مشابہ ہے بربری زبان میں اگادیر کے معنی دیوار کے ہیں۔

۵۵ Carthage

۵۶ Hippo

۵۷ Regius

۵۸ Poseidon یہ سمندر کے دیوتا کا نام ہے جس کی بیوی کا نام لیبیا تھا۔

والدہ تھی۔

مغربی بحیرۂ روم میں آبادکاری کی سرگرمیاں بظاہر دسویں صدی قبل مسیحؑ کے وسط اور آٹھویں صدی قبل مسیحؑ کے وسط میں کمال پر پہنچیں۔ ان کی غیر معمولی کامیابی سے خیال ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں، نیز جزیرہ نمائے ہسپانیہ و پرتگال کے جنوبی حصے میں پہلے سے سامی تارکین وطن موجود تھے۔ سامیوں کی جو آبادی مسیح علیہ السلام سے پیشتر تیسرے ہزار سال میں یا اس سے بھی پہلے مصر پہنچی تھی، ممکن ہے وہ آگے بھی نکل گئی ہو۔ کلاسیکی یا عربی تحریرات میں اس روایت کی دھندلی سی یاد محفوظ رہ گئی ہے کہ سامی اس سے پہلے مغربی بحیرۂ روم پہنچ گئے تھے۔[۱]

آبنائے جبل طارق سے آگے بڑھ کر قادس کے نوآبادی بن جانے سے فونیقی ایٹلانٹک سے متعارف ہو گئے۔ اس طرح قدیم دنیا بڑے سمندر کے انکشاف تک پہنچی۔ دنیا کی ترقی میں اس انکشاف کو شامی تہذیب کے سب سے بڑے کارنامے کی حیثیت حاصل ہے۔[۳] ہومر اور ہیسیوڈ کو ایٹلانٹک کا پتا فونیقیوں ہی سے ملا۔ یہ معلوم کرنا آسان نہیں کہ فونیقی اس بڑے سمندر میں، جسے آگے چل کر عرب بحرِ ظلمات کہنے لگے، کہاں تک اندر چلے گئے تھے۔ بعض مآخذ میں بتایا گیا ہے کہ وہ ٹین کی تلاش میں انگلستان کے علاقے کارنوال تک پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ اس کا کوئی اشارہ ابتدائی دستاویزوں میں نہیں ملتا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ مجھے کاسٹریدیس[۴] کا کوئی علم نہیں جہاں سے ہمارے لئے ٹین لایا جاتا ہے۔ دراصل ٹین کے ذخیرے جزائر سلی[۵] میں تھے جو کارنوال کے انتہائی مغربی کونے سے قریب ہیں۔ سٹرابو، جس نے مسیحؑ کے زمانے میں کتاب لکھی، بتاتا ہے کہ کاسٹریدس میں ٹین اور سیسہ موجود ہے اور وہاں کے باشندے مٹی کے برتنوں، تانبے کے ظروف اور نمک کے بدلے میں یہ چیزیں دے دیتے تھے۔ نیز زمانہ گزشتہ میں فونیقی قادس میں بیٹھ کر ان جزیروں سے چیزیں لیتے تھے اور بحری راستے کا پتا کسی کو نہ دیتے تھے۔ سٹرابو یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک مرتبہ چند رومی جہاز فونیقی جہازوں کے پیچھے پیچھے چلے، لیکن فونیقی جہاز کے کپتان نے یہ دیکھتے ہی اپنا جہاز ایک پایاب مقام پر پہنچا کر ضائع کر دیا۔ اس کا جو سامان ضائع ہوا تھا، اس کی قیمت حکومت نے دے دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فونیقی ٹین کی تجارت کے اجارہ دار تھے اور حکومت جہازوں اور سامان کے بیمے کر لیتی تھی۔ ڈیوڈورس سیکولس[۶] نے اپنی کتاب سٹرابو سے کوئی پچھتر سال بعد لکھی ہے، وہ بتاتا ہے کہ برطانیہ سے ٹین گال کے ساحل پر پہنچایا جاتا تھا جو سامنے واقع تھا، پھر خشکی کے راستے مسیلیہ[۷] لایا جاتا تھا جو ایک یونانی نوآبادی تھی۔ فونیقی کتبہ برطانیہ میں ملا ہے۔ وہ غالباً قرطاجنہ کے ایک شخص کا لکھا ہوا ہے جو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور اسے برطانیہ پر رومیوں کے قبضے کی پہلی صدی کا سمجھنا چاہیے۔ پیٹری[۸] نے غزہ

۱؎ قیساریہ کے پروکوپیس Procopius کی کتاب History of the Wars کتاب چہارم باب ۱۰، الادریسی کی کتاب "صفۃ المغرب" نیز ابن خلدون کی تاریخ کتاب العبر ودیوان المبتدا والخبر جلد ششم ص ۹۳-۹۴ ۲؎ سمندر کے لئے انگریزی لفظ Ocean "اوشن" ہے جو یونانی لفظ Okeanos سے ہے اس کا مصدر سامی لفظ "یوج" ہے بمعنی حلقہ، دائرہ۔ ملاحظہ ہو ہوٹل میر ویلٹ Mittelemeer-Welt کی کتاب، لیکن ایم لیوی Lewy کو اس باب میں شبہ ہے ۳؎ آرنلڈ ٹائن بی کی کتاب A Study of History جلد دوم ص ۵۰، ۵۲، ۱۴۱

۴؎ ہیروڈوٹس کتاب سوم باب ۱۱۵ Cassiterides بمعنی "ٹین کے جزیرے" یونانی لفظ Kassiteros سے نکلا ہے، یعنی ٹین، عربی لفظ قصدیر ہے جس کی اصل مشرقی معلوم ہوتی ہے مگر فونیقی نہیں۔ ۵؎ Scilly Isles ۶؎ Diodorus Siculus

۷؎ Massilia یہ وہی بندرگاہ ہے جو مارسائی (عام تلفظ مارسیلز) کے نام سے دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکی ہے اور فرانس کی جنوبی بندرگاہ ہے۔ ۸؎ Petrie



اہلِ فنیقیہ کی نو آبادیاں

میں ایک مڑی ہوئی سنہری بالی دریافت کی تھی، اس کا خیال ہے کہ یہ آئرلینڈ کی بنی ہوئی ہے اور اسے سنہ ۱۲۰۰ ق-م کی سمجھنا چاہیے۔ ۱؎

ہسپانوی نوآبادیاں

ہسپانیہ میں فونیقیوں کی زیادہ تر نوآبادیاں ترشیش ۲؎ میں تھیں۔ خصوصاً اس حصے میں جو قرطجینہ ۳؎ سے قادس تک پھیلا ہوا ہے۔ مقامات کے یہ سامی نام عام ہیں اور جو سکے موجود ہیں، ان کا ذکر آتا ہے۔ ترشیش بائبل کے ادب اور اشوری ادب میں بھی مذکور ہے یہ غالباً فونیقی اصطلاح ہے جس کے معنی یا تو "کان" کے ہیں یا ایسے مقام کے جہاں کوئی دھات پگھلائی جائے۔ شہر طرسوس کلیکیہ میں ہے۔ یہاں پولوس رسول پیدا ہوئے تھے یہ نام ترشیش سے ملتا جلتا ہے اور اسے بھی فونیقی نوآبادی ہی سمجھنا چاہئے۔ یہاں جس طریق پر بعل کی عبادت ہوتی تھی وہ وہی تھا جو صور اور قرطجینہ میں رائج تھا، قرطجینہ شمالی افریقہ کی مشہور نوآبادی قرطاجنہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مالقہ ۴؎ کے معنی دکان یا چھوٹے کارخانے کے ہیں۔ سٹرابو نے بتایا ہے کہ یہاں مچھلیوں کو نمک لگانے کا ایک کارخانہ تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں کس قسم کا کام ہوتا تھا۔ قادس میں نمک بھی بنایا جاتا تھا۔ قرطبہ ۵؎ اصل میں اہل ہسپانیہ کا شہر تھا، فونیقیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے قدیم ترین سکوں پر فونیقی حروف تھے اور بعد کے سکوں پر قرطاجنہ کے حروف استعمال ہوئے۔ ہسپانیہ کے دوسرے شہروں کے علاوہ قرطبہ سے بھی ہینی بال کے والد ہمکار برقہ ۶؎ نے فوج بھرتی کی تھی، تاکہ روما کے خلاف مہموں میں اس سے کام لے۔ برشلونہ ۷؎ مزید شمال میں ہے ممکن ہے اس نام کا تعلق فونیقی لفظ "باراق" بمعنی "برق" یا بجلی سے ہو جو ہینی بال کے باپ کے نام کا ایک جزو ہے۔ ان نوآبادیوں کے ذریعے سے بحیرۂ روم کے مغربی حصے میں شامی تہذیب کے لئے دوسرا وطن پیدا ہو گیا۔

جزیرہ مینورقہ کا موجودہ دارالحکومت ماہون ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ نام "ماگو ۸؎" تھا اور یہ قرطاجنہ کے ایک سپہ سالار کا نام تھا۔ جزائر بلیارک میں فونیقیوں نے جابجا چوکیاں بنالی تھیں، لیکن جزیروں پر، جن کے باشندے آئیریا کے تھے ان کا قبضہ پکا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح کارسیکا اور سارڈینیا میں بھی ان کی چوکیاں موجود تھیں۔ سسلی کا مرکز حکومت پلرمو ایک قدیم فونیقی آبادی کی جگہ بسایا گیا ہے۔

یونان میں بھی مختلف مقامات کے نام، نیز مختلف دیوتاؤں کے نام سامی ہیں جن کے ساتھ افسانے اور اساطیر بھی رائج ہو گئے یہ اس امر کی شہادت ہے کہ یہاں بھی فونیقیوں کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کارنتھ کی بنیاد غالباً فونیقیوں ہی نے رکھی تھی۔ ایک افسانے میں اسے ایک فونیقی الاصل دیوتا سے منسوب کیا گیا ہے، جس کا نام ملیکرتس ۹؎ (ملقارت) تھا۔ یونان کے دوسرے جزیروں کے علاوہ ساموس اور کریٹ ۱۰؎

۱؎ فلنڈرس پیٹری کی کتاب Ancient Gaza جلد دوم ص ۷۔ ۲؎ جہاں سے یہ لفظ نکلا ہے وہ عربی میں بصورت "رشق"، موجود ہے جس کے معنی ہیں پانی چھڑکنا۔ دیکھئے ایلبرائٹ کی کتاب Studies in History of Civilization ص ۲۴، نیز ایلبرٹ وائٹ ریش کی جرمن کتاب ص ۳۲ ۳؎ Carthagena یہ مقام ہسپانیہ کے جنوبی و مغربی حصے میں ہے جسے پرانے زمانے میں غالباً Tartessus کہتے تھے۔ ۴؎ اصل فونیقی لفظ "ملاکہ" انگریزی میں اس شہر کو Malaga لکھتے ہیں، عرب "مالقہ"، کہتے تھے ۵؎ (Cordoba) Cordova جسے عرب قرطبہ کہتے ہیں اور صدیوں تک یہ اسلامی اندلس کا دارالحکومت رہا۔ ۶؎ Hamilcar Barca ۷؎ Barcelona ۸؎ فونیقی لفظ مجن بمعنی ڈھال۔ انگریزی لفظ Mayonnaise غالباً اسی سے لیا گیا ہے، لیکن چونکہ فرانسیسی واسطے سے آیا اس لئے وضع فرانسیسی بن گئی۔ ۹؎ فونیقی Milk-qart یعنی شہر کا بادشاہ ۱۰؎ ساموس اصل میں شمس تھا بمعنی سورج، کریٹ کارت تھا بمعنی کاٹنا۔

نے فونیقی تہذیب میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔

کریٹ سرزمین یورپ سے پیشتر تہذیب کا مرکز بن گیا تھا۔ یہیں دیوتا زیئس نے سانڈ کی شکل اختیار کر کے یوروپا کو ساحلِ شام کی ایک چراگاہ سے اٹھا لیا تھا۔ یوروپا فونیقیوں کے بادشاہ آجینور کی حسین و جمیل بیٹی تھی اور زیئس اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ کریٹ پہنچتے ہی زیئس نے اپنی اصلی صورت اختیار کر کے یوروپا سے شادی کر لی۔ اسی شادی سے کریٹ کا مشہور حکمران اور قانون ساز مینوس پیدا ہوا اور ماں کے نام پر برِاعظم یورپ کا نام رکھا گیا۔

مالٹا[51] فونیقی نام ہے۔ ڈیوڈورس کے نزدیک یہاں کی آبادی بھی فونیقی تھی۔ اس جزیرے کی بندرگاہیں پورے بحیرۂ روم میں بہترین تھیں، لہٰذا اگر اس کا نام "جائے پناہ" رکھا گیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ تھریس یونان کے شمالی خطّے کا نام ہے، یہاں سونے کی کانیں تھیں۔ افسانوی روایت یہ ہے کہ ان کانوں سے سونا نکالنے کا کام سب سے پہلے صور کے حکمران قدموس[52] نے شروع کیا، جو یوروپا کا بھائی تھا اور باپ نے اسے بہن کی تلاش میں بھیجا تھا۔ فونیقی کارکنوں نے ساتویں صدی قبل مسیح تک یہاں سونے کی تلاش شروع کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدموس ہی نے شہر تھیبس کی بنیاد رکھی تھی، جس کے بالاحصار کا نام قدمیا[53] اسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام الیریس تھا۔ اسی کے نام پر ایک علاقہ الیریا مشہور ہوا۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے آج کل البانیا کہا جاتا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ قدیم ایونیا کی اصل شامی تھی اور یہاں کا یونانی فنِ عمارت، جس سے مختلف کلاسیکی طرزیں پیدا ہوئیں، شامی ہی تھا۔ اس کے بڑے بڑے ستون اور کارنس بھی شامی ہی تھے۔

ہومر کے زمانے میں فونیقی جہاز جو سامان لے جاتے تھے، ان میں گلاب کے پودے، کھجور کے درخت، نیز انجیر، انار، مر[54]، کشمش اور بادام شامل ہوتے تھے جو بحیرۂ روم کے تمام علاقوں میں پھیلائے گئے۔[55] انھیں جہازوں نے یونان سے شام تک لارل اور پا مٹر، سوسن، عشق پیچاں، پودینہ اور نرگس پھیلائے ہوں گے، جن میں سے بعض کے یونانی نام سامی زبانوں میں محفوظ ہو گئے۔ مسالوں کی تجارت کا ملکہ فونیقیوں کے ہاتھ میں تھی اور تجارتی راستوں کا راز چھپائے رکھنے کی غرض سے انھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مسالوں کے جزیروں اور راستوں میں سخت خطرات موجود ہیں۔ ابتدائی کلاسیکی زمانے میں مدت تک سمجھا جاتا رہا کہ بلساں اور مرشام میں پیدا ہوتے ہیں، مر عرب میں پیدا ہوتا تھا۔ فونیقیوں سے پیشتر اس کی تجارت سبائیوں کے ہاتھ میں تھی، لیکن سکندر کی فتوحات سے قبل کسی کو معلوم نہ تھا کہ مر عرب میں پیدا ہوتا ہے۔ لارل کے تاج شاعروں [illegible] کو پہنائے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ دفنہ نام ایک پری کا تعاقب اس کے عاشق اپولو نے کیا۔ چنانچہ پری کو انطاکیہ کے قریب ایک مقام پر لارل کے درخ[illegible]ت کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ مقام اب تک اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اریحا کے بلسان نے ملکہ کلیوپیٹرا کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے وہاں [illegible] چند باغات ٹھیکے پر لے لیے تھے۔

قرطاجنہ

اگرچہ قرطاجنہ کی [illegible] بنیاد افریقی نوآبادیوں میں بہت بعد میں رکھی گئی، لیکن اس نے بہت زیادہ فروغ پایا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہ اپنے

---

۵۱ مالٹا سے بہ معنی نجات [illegible]لتا

۵۲ Cadmus

۵۳ Cadmea

۵۴ ہلبرٹ جی کیلر Keller کی کتاب Homeric Society

ص ۲۰، ۳۴، ۴۴، مر یعنی Myr[illegible]rh ایک قدیم سامی اصطلاح ہے جو یونانیوں نے مستعار لے لی تھی۔

اصل وطنی مرکز کا مقابلہ کر رہی تھی، جس پر زوال کا دور طاری ہو چکا تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کے اواخر اور ساتویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں یونانی آبادکاری کی لہریں اٹھنے لگیں تو زوال کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ آشوریوں نے یونانی قصبوں کی تسخیر شروع کر دی۔ اہل قرطاجنہ نے اپنی تجارت کو خوب پھیلایا اور جنس کا مبادلہ جنس سے کرنے کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کئے۔ اس سلسلے میں ہیروڈوٹس کی بیان کی ہوئی ایک داستان سننے کے لائق ہے وہ کہتا ہے کہ قرطاجنہ کے ملاح افریقہ کے مغربی ساحل پر پہنچ جاتے تھے اور جہازوں سے پہلا مال اتار کر کنارے پر جمع کر دیتے۔ پھر اطلاع کے لئے آگ جلا دیتے۔ افریقہ کے وحشی باشندے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے تو کناروں پر پہنچ جاتے اور سامان کی قیمت کے برابر سونا رکھ کر چلے جاتے۔ قرطاجنہ کے ملاح پھر جہازوں سے اترتے اور جب اندازہ کر لیتے کہ سامان کی قیمت مل گئی ہے تو سونا اٹھا کر رخصت ہو جاتے اگر دیکھتے کہ قیمت پوری نہیں ملی تو پھر سونا اور مال چھوڑ کر جہازوں میں جا بیٹھتے۔ اس طرح افریقہ کے وحشیوں کو معلوم ہو جاتا کہ قیمت اور دینی چاہیے، لیکن اس خاموش سودے میں کوئی فریق دوسرے سے دھوکا نہیں کرتا تھا۔

قرطاجنہ نے تجارت اور سیاست میں ایسی برتری حاصل کر لی تھی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اس کی سلطنت سائرانیکا (موجودہ لیبیا) کے حدود سے ہرکولس کے ستونوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ مختلف جزیرے، یعنی جزائر بلیارک، مالٹا اور سارڈینیا بھی اس میں شامل تھے۔ کچھ نوآبادیاں ہسپانیہ اور فرانس کے ساحل پر تھیں۔ صیدا اور صور پر ایک طرف سے مصر کا اور دوسری طرف سے آشوریہ کا سایہ پڑ رہا تھا اور ان کے لئے سلطنت پیدا کرنے کا کوئی موقع نہ تھا، قرطاجنہ کو ایسا موقع حاصل تھا۔ اس وجہ سے اسے رومہ کے ساتھ کشمکش پیش آ گئی، جس کا اختر اقبال ابھر رہا تھا۔ دونوں میں سمندر پر برتری حاصل کرنے کے لئے مقابلہ شروع ہو گیا۔ قرطاجنہ کے بیڑے کو سمندر پر ایسا اقتدار حاصل تھا کہ کہا جاتا تھا، رومی قرطاجنہ کی اجازت کے بغیر سمندر میں ہاتھ بھی نہیں دھو سکتے۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ قرطاجنہ کا ایک پنج طبقہ جہاز کسی جگہ خراب ہو گیا۔ رومی جہاز سازوں نے اس کا نمونہ سامنے رکھ کر چھ دن میں ایک سو تیس جہاز تیار کر لئے۔

ہینی بال[1] نے لڑکپن میں رومہ کے خلاف دائمی دشمنی کا حلف اٹھایا تھا۔ ۲۱۸ء ق م میں وہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہوا۔ جس کے لئے اپنی زندگی وقف کی تھی یعنی اس نے اٹلی کے خلاف ہسپانیہ سے براہ ایلپس فوج کشی کی۔ پندرہ سال تک وہ اٹلی کی سرزمین میں کامیابیوں سے ہم آغوش رہا۔ اس اثنا میں رومہ پر بھی حملہ کیا گیا۔ پھر ہینی بال کو افریقہ واپس بلا لیا گیا۔ جہاں ۲۰۲ء ق م میں اس نے زرما کے مقام پر فیصلہ کن شکست کھائی۔ زرما قرطاجنہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ۱۹۶ء ق م میں وہ بھاگ کر صور پہنچ گیا اور وہاں سے انیٹاکس شاہِ شام سے جا ملا تاکہ قرطاجنہ کے ابدی دشمن (رومہ) کے ساتھ جنگ جاری رکھے، لیکن اسے پھر شکست ہوئی چونکہ بچاؤ کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا اس نے الیشیئے کو چک ہی میں (۱۸۳ء ق م) یہ کہتے ہوئے خودکشی کر لی کہ اس طرح اہل رومہ ایک قدیم اور نفرت زدہ فرد کی موت کے انتظار کی تشویش سے محفوظ ہو جائیں گے۔

قرطاجنہ نے اپنے نقصانات کی تلافی انتہائی تیزی سے کر لی اور اس کی اقبال مندی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیٹو اور دوسرے ذی اثر رومیوں کی تنگ دلی اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکی۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ قرطاجنہ کو تباہ کر دینا چاہیے۔ سترہ روز تک شہر آگ کے شعلوں کی نذر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی جگہ صرف راکھ کا ڈھیر رہ گیا۔

---

[1] اصل فونیقی نام "حانی بعل" ہے یعنی بعل کی رحمت نعمت۔

پھر وہاں ہل چلا دیے گئے اور اس جگہ کو ہمیشہ کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا۔ اس طرح رومیوں کے نیک نام پر ایک ایسا بدنما دھبا لگ گیا جو کبھی مٹ نہیں سکے گا۔

دسواں باب

ادبیات، مذہب اور دوسرے ثقافتی پہلو

بری قافلوں کی طرح جہاز بھی تجارتی سامان کے ساتھ ساتھ غیر محسوس چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں جو انسانی ترقی کے لئے زیادہ نہیں تو کم از کم سامان جتنی اہم ضرور ہوتی تھی۔ ان غیر محسوس چیزوں میں وہ گوناں گوں تہذیبی اثرات بھی شامل تھے جو فونیقی تاجر آباد کار اپنے ساتھ لے گئے اور ان لوگوں کو متاثر کرتے رہے، جن سے ربط ضبط کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں یونانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو جہاز رانی اور آباد کاری میں فونیقیوں کے شاگرد بن گئے نیز انھوں نے ادبیات، مذہب اور فنونِ آرائش فونیقیوں سے مستعار لیے۔ فونیقیوں کی سرگرمی کے زیرِ اثر بحیرۂ روم بوقلموں حضارتی تحریکات کا مرکز بن گیا یہ تحریکات صرف فونیقیہ سے نہیں، بلکہ بابل اور مصر سے بھی اٹھی تھیں۔ فونیقی جس طرح تجارت میں سب کے درمیان واسطہ بن گئے تھے اسی طرح ذہنی اور روحانی اعتبار سے بھی واسطہ بن گئے۔

ابجد

فونیقیوں نے جو نعمتیں عالمِ انسانیت کو عطا کیں ان میں اہمیت کے لحاظ سے پہلا درجہ ابجد کو حاصل ہے خیال یہ ہے کہ یونانیوں نے ابجد [illegible] ق۔م اور [illegible] ق۔م کے درمیان مستعار لی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ بعض اصحاب ابجدی نظام کی ایجاد و اشاعت کو انسانیت کے لئے شامی تہذیب کا سب سے بڑا تحفہ سمجھتے ہیں اس کے بعد دوسرا بڑا تحفہ عقیدۂ توحید تھا اور تیسرا بڑا تحفہ ہیلانگ کا انکشاف۔

یونانیوں نے حروف کے سامی نام برقرار رکھے، بلکہ ان کی شکلوں اور ترتیب میں بھی کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ابتدائی یونانی کتبات میں فونیقی تحریرات کی طرح حروف دائیں سے بائیں لکھے جاتے تھے۔ قدموس کی داستان میں یونانیوں نے حروف مستعار لینے کا اعتراف کیا ہے کہا جاتا ہے کہ قدموس نے سولہ حروف جاری کئے تھے اس داستان کو شاعرانہ آرائشوں سے الگ کر لیا جائے تو حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام سے آنے والے لوگوں نے یونان میں اول ابجد رائج کی۔ دوم کان کنی کا فن جاری کیا۔ سوم دیونی سوس کی عبادت کو رواج دیا جو شراب کا دیوتا تھا۔ یونانیوں نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ابجد کو اصلاح یافتہ شکل میں رومیوں کے حوالے کیا۔ رومیوں ہی کی ابجد سے زیادہ تر یورپی ابجدیں پیدا ہوئیں۔ آرامیوں نے بھی ابجد فونیقیوں ہی سے لی تھی پھر اسے عربوں، ہندوستانیوں، ارمنوں اور مشرق کے باقی ابجد نگاروں کو سونپا۔ فونیقی ابجد بائیس حروف پر تھی۔ یہ بہت ہی سادہ تھی اور اس وجہ سے ہر عامی کے لئے نوشت و خواند کا موقع پیدا ہو گیا تھا۔ جنوبی عرب میں جو طریق کتابت رائج تھا وہ غالباً براہ راست سینائیوں سے لیا گیا تھا، جس کی وجہ سے خود فونیقیوں کو ابتدائی قدم اٹھانے کا حوصلہ ہوا۔

فونیقی پہلی قوم تھے، جنھوں نے خالص ابجدی اور پر منظم سلسلۂ تحریر و کتابت استعمال کیا اور اسے دنیا بھر میں پھیلایا۔ انھیں

اس نظام کی بنیاد بظاہر مصریوں کے تصویری (ہیروغلافی) خط سے ملی یہ چیز ان کے پاس جزیرہ نمائے سینا سے پہنچی تھی۔ ہیروغلافی یا تصویری خط ابتدا میں یوں ایجاد ہوا کہ جس چیز کو پیش کرنا مقصود ہوتا اس کی تصویر بنا دیتے پھر صوتیات کی بنا پر چالیس نشان تجویز کر دیئے گئے جنھیں آج کل کی اصطلاح میں حروف صحیح سمجھنا چاہیے۔ علامت پسند مصری کبھی اس بات پر آمادہ نہ ہوئے کہ ان حروف صحیح کی علامات کو بطور خود استعمال کرتے، لہٰذا یہ علامتیں یا نشان کوئی خاص نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ سولھویں صدی قبل مسیح میں کسی کنعانی اسیر جنگ یا مزدور نے جزیرہ نمائے سینا میں فیروزے کی کانوں کے اندر کام لیا گیا وہ شخص اپنے مصری آقاؤں کے تصویری حروف کی پیچیدگیاں نہ سمجھتا تھا، چنانچہ وہ تصویری حروف کو نظر انداز کر کے حروف صحیح کی علامتیں استعمال کرنے لگا۔ یہ واقعہ اس مقام پر پیش آیا جسے آج کل "سرابیط الخادم" (خادم کے ستون) کہتے ہیں اس کنعانی نے حروف صحیح کی علامتوں کو سامی نام دے دیے اور سامی قیمتیں عطا کر دیں، مثلاً اس نے بیل کے سر کا نشان لے لیا اور اس امر سے بے پروا ہو گیا کہ مصریوں کے نزدیک بیل کے سر کی علامت کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس علامت کو سامی زبان میں الف کا نام دے دیا پھر صوتیات کے اصول پیش نظر رکھتے ہوئے اس نشان یا علامت کو "ا" کی جگہ استعمال کرنے لگا اس اصول کے مطابق ہر حرف تصویری نشان یا علامت کی آواز کے ابتدائی حصے کے لیے کام میں لایا جانے لگا۔ چھوٹے بچوں کو بہلانے کی غرض سے پرانے زمانے میں جو گیت گائے جاتے تھے ان میں یہی اصول پیش نظر رکھا گیا تھا۔ بالکل یہی کیفیت گھر (عربی بیت) کے سلسلے میں پیش آئی۔ اسے "بیت" کہا، مگر "ب" کے لیے استعمال کیا۔ ہاتھ کی علامت یا نشان کو "ید" کہا اور اسے "ی" کے لیے استعمال کرنے لگے۔ "سر" کے لیے "راس" آیا تو اسے "ر" کا نمائندہ سمجھ لیا گیا۔ اس طرح جزیرہ نمائے سینا کے اس مزدور نے ابجد کے اس تصور کو عملاً پیش کر دیا جو مصر کے تصویری خط میں مضمر تھا اور اپنے لیے علامتوں اور نشانوں کا سادہ نظام تیار کر لیا، جس کے الفاظ کہے جا سکتے تھے۔

جزیرہ نمائے سینا سے فونیقیوں کے تجارتی تعلقات تھے قیاس یہ ہے کہ انھوں نے وہاں سے حروف لیے، پھر انھیں ترقی دے کر بائیس حروف کی ابجد کا سلسلہ مکمل کر دیا۔ البتہ اس ابجد میں حروف علت موجود نہیں تھے اور یہ مصریوں کے تصویری خط کا اثر تھا۔ یوں وہ ایجاد عمل میں آئی جسے بجا طور پر سب سے بڑی انسانی ایجاد کہا جاتا ہے۔

فونیقی کتبات

لاکیش اور بیت شمش[1] سے چھوٹے چھوٹے کنعانی کتبات نکلے ہیں، جن میں حروف ابجد استعمال کیے گئے ہیں اور یہ کتبات متوازی سطروں میں ہیں ان کا تعلق چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح[2] سے ہے لاکیش کا کتبہ ایک پیالے پر تھا۔ کنعانی ابجد کا پرانے سے پرانا جو کتبہ پورا پڑھا گیا وہ ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ نے، جس کا نام دونان[3] تھا، ببلوس سے نکالا تھا۔ یہ اوپر نیچے پانچ سطروں میں تھا اور اس میں ایک دیوار بنانے کا ذکر تھا، جو شفط بعل بن ایلی بعل بن یحیم ملک نے بنائی تھی۔ یہ تینوں ببلوس کے بادشاہ تھے[4] اس کے حروف احیرام کے اس طویل کتبے سے زیادہ پرانے تھے، جو ۱۹۲۳ء میں فرانس کے ماہر آثار قدیمہ مونتیت[5] نے ببلوس سے نکالا تھا یہ غالباً ۱۰۰۰ ق م کا ہے۔ سب سے زیادہ طویل کتبہ وہ ہے جو قرہ تپہ سے نکالا گیا۔ یہ مقام ادنہ کے شمال مشرق میں ہے۔ یہ

---

[1] لاکیش وہی مقام ہے جسے آج کل تل الدوائر کہتے ہیں بیت شمش تل الرمیلہ ہے جو عین شمس کے پاس ہے [2] Dunand

[3] ابلیرائٹ [4] Near Eastern Archaeology [5] Montet

کتبہ اکانوے سطروں کا ہے اور نویں صدی کے ایک فونیقی بادشاہ نے لکھوایا تھا۔[1]

بائیس حروف کا سطری ابجدی نظام، جسے دائیں سے بائیں لکھا جاتا تھا،[2] بظاہر ببلوس کے فونیقیوں نے ایجاد کیا تھا۔ دوسرے فونیقیوں نے جن کا تعلق اغاریت سے تھا، ایک اور نظام مکمل کیا جس کے اصول مختلف تھے۔ انھوں نے ابجدیے کی اکائی کے ذریعے اسے مٹی کے تختوں پر لکھ لیا۔ اس طرح اسے مسماری علامتوں کی شکل دے دی، جنھیں وہ استعمال کرتے تھے۔[3] راس الشمرۃ سے جو تختیاں ١٩٢٩ء میں برآمد ہوئی تھیں، وہ اسی خط میں تھیں، جواب تک غیر معلوم ہے۔ یہ زیادہ تر چودھویں صدی قبل مسیحؑ کے اوائل کی ہیں، کچھ اس سے بھی پیشتر کی ہیں۔ اس رسم الخط میں ایک کتبہ بیت الشمش سے بھی برآمد ہوا ہے۔ یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ یہ رسم الخط پندرھویں اور سولھویں صدی قبل مسیحؑ میں خاصا رائج تھا۔

تحریر و کتابت کے ان دو نظاموں کے علاوہ بھی، جو کنعانیوں نے ایجاد کیے تھے، وہ متعدد رسم الخط جانتے تھے، جن میں سے بعض بڑے پیچیدہ تھے۔ ان میں سے ایک انھوں نے خود ایجاد کیا تھا۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر تیسرے ہزار سال کے اواخر میں بروئے کار آیا اور یہ خاص اشارتوں اور علامتوں کا مجموعہ تھا، جس کے ضمن میں مصریوں کا نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا اور اس میں کوئی ایک سو علامتیں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ نیم تصویری رسم الخط ان کتبات میں استعمال ہوا ہے، جو پتھروں پر یا تانبے کے پتروں پر کندہ کرائے گئے تھے۔ یہ کتبات ١٩٣٠ء میں دونان نے ببلوس سے برآمد کیے تھے اور یہ فونیقی لغت کی قدیم ترین یادگار ہیں۔ اکادیوں نے جو مسماری خط ایجاد کیا، اس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر دوسرے ہزار سال کے ابتدائی دور میں مذکورہ بالا نیم تصویری خط کا استیصال کر دیا۔ تل العمارنہ کی تختیوں میں بھی مسماری خط استعمال ہوا ہے۔ کنعانی کاتبوں نے مسماری خط میں جو غلطیاں کیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اکادی زبان سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ ممکن ہے سکولوں میں انھوں نے یہ زبان پڑھی ہو۔ جو اسلوبِ تحریر استعمال کیا گیا، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ کنعانی افکار و خیالات کا ترجمہ اکادی زبان میں کر رہے تھے۔ تحریر و کتابت کی ایسی درسگاہوں کا ثبوت بھی مل گیا ہے، جن میں لوگ وقت کی رواج یافتہ زبان، یعنی اکادی فرہنگوں اور تمرینات کے ذریعے سے سیکھ لیتے تھے۔ ایک ایسی درسگاہ کے نشانات اغاریت کے مندر کے ساتھ ملے ہیں۔

تل العمارنہ کی تختیوں کے علاوہ برطانیہ کے ماہرِ آثارِ قدیمہ وولے نے ١٩٣٧ء سے ١٩٣٩ء میں تل العطشانہ (قدیم الالخ) سے، جو دریائے عاصی کے زیریں حصے میں واقع ہے، مسماری خط (اکادی) کی تین سو تختیاں برآمد کیں، جو ١٩٠٠ ق م سے ١٢٠٠ ق م تک کی ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق علم نجوم سے ہے اور بعض پیشگوئیوں پر مشتمل ہیں۔

تیسرے ہزار سال قبل مسیحؑ کے اواخر سے دوسرے ہزار سال قبل مسیحؑ کے اواخر تک کتبات و تحریرات کی اس کثرت کو پیشِ نظر رکھ لینے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس دور میں متنوع حضارتیں پہلو بہ پہلو موجود تھیں اور ان میں امتزاج پیدا ہو رہا تھا۔ بہ الفاظ دیگر دوآبہ دجلہ و فرات، مصر اور شام کے علمی اور مذہبی افکار میں آزادانہ میل جول پیدا ہو رہا تھا اور ایک ملک کے افکار و خیالات دوسرے

---

[1] جولین اوبرمان (Obermann) کی کتاب (Discoveries at Karatepe)

[2] جو خط دائیں سے بائیں کو لکھے جاتے ہیں اور پتھروں پر کندہ کرنے کے سلسلے میں شروع ہوئے اور اس سلسلے میں کندہ کرنے والے کی سہولت مدنظر رکھی گئی۔ بائیں سے دائیں جانب جو خط لکھے جاتے ہیں ان کی ابتدا سیاہی اور قلم سے ہوئی۔

[3] جوہنیس فریڈرک (Friedrich) کا مقالہ "راس شمرہ" (Der alte Orient)

ملک میں پہنچ رہے تھے۔ تاہم اس دور کی ادبیات کا حصہ محفوظ رہا ہے۔ فونیقی ادب پیپرس پر مرقوم تھا اور یہ جلد تلف ہو جانے والی چیز تھی۔ اس پر کاروباری تحریرات ثبت ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں پیپرس مصر سے آتا تھا۔ اس کی بڑی مقدار ۱۵۰۰ ق۔م کے آس پاس درآمد کی گئی تھی۔ زیادہ تر تحریریں متاخر دور کی تھیں یعنی پانچویں صدی قبل مسیح سے دوسری صدی قبل مسیح تک کی، عیسوی سنین شروع ہونے کے بعد کی کوئی فونیقی تحریر ان کے وطن میں نہیں ملتی، لیکن فونیقی زبان اپنی مغربی شکل (پیونک شکل) میں ظہورِ اسلام تک بولی جاتی تھی، جو یونانی و فونیقی کی ملی جلی زبان تھی، جو مالٹا اور قبرص میں دریافت ہوئی اور فرانسیسی نیز دوسرے ملکوں کے علماء نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ جرمنی کے مشہور مستشرق جیسینیس نے ۱۸۳۷ء میں تمام دریافت شدہ متنوں کی کلید شائع کی۔

فونیقی ادبیات میں نشأۃِ ثانیہ کا ایک دور چھٹی صدی قبل مسیح میں کمال پر پہنچا اور اس سلسلے میں سانچونیاتن[51] کی پراسرار شخصیت بیروت میں بروئے کار آئی۔ اس نے اپنی قوم کی افسانوی نظموں کو اکٹھا کیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ ببلوس (الجبیل) کے فلو[52] نے ان کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا تھا۔ یہ دوسری صدی مسیح کے اوائل کا واقعہ ہے[53]۔ یونانی روایت کے مطابق یہ کام ملیطوس کے طالیس[54] نے انجام دیا تھا (وفات ۵۴۶ق م کے آس پاس) جو یونان کے سات بڑے دانشمندوں اور حکیموں میں سے ایک تھا اس نے بابل اور مصر کی تمام قابلِ مطالعہ چیزوں کا مطالعہ فونیقی زبان میں کر لیا تھا۔

خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ کنعانی ادبیات کی بہترین چیزیں عبرانیوں نے محفوظ کر لیں اور یہ چیزیں ان کے مقدس نوشتوں میں شامل ہو گئیں، خصوصاً غنائی نظمیں اور ضرب الامثال، مثلاً بائبل کی کتاب الامثال، زبور اور غزل الغزلات میں، نیز وہ افسانوی تحریرات جو کتاب پیدائش اور قصص الانبیاء میں آگئیں۔ یہ حقیقت اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھی، جب تک زمانہ قدیم کا فراموش شدہ شہر اغاریت دریافت نہیں ہوا تھا۔

اغاریت

۱۹۲۸ء میں ایک شامی کسان نے راس الشمرہ[55] میں ایک چیز اتفاقیہ دریافت کر لی۔ اس بنا پر ایک فرانسیسی مہم نے اس مقام پر کھدائی شروع کر دی۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک دوسرے کے کھنڈروں پر پے درپے شہر آباد ہوتے رہے۔ سب سے پہلا شہر حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ ہزار سال پیشتر کا ہوگا۔ ۱۴۰۰ ق۔م کے آس پاس اس شہر کی رونق انتہائی عروج پہ پہنچی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا نام "اوغاریت[56]" تھا۔ شہر کی آبادی بندرگاہ سے، جس کا نام آج کل "المیناء البیضا" (سفید بندرگاہ) ہے، کوئی نصف میل اندر کی طرف ہوگی اور یہ قبرص کے راستے پر واقع ہے۔ شہر کی رونق اور عروج و اقبال تجارت پر موقوف تھے اور اندرون ملک کا سامان اسی کی بندرگاہ سے باہر جاتا تھا اور باہر کا سامان اسی کی بندرگاہ سے اندر آتا تھا۔ اس زمانے میں یہاں جو شخص بادشاہ تھا اس کا نام نقماد تھا۔

---

[51] Sanchuniathon [52] Philo [53] یوسی بئس (Eusebius) نے تراجم کے بہت سے ٹکڑے محفوظ کر دیے ہیں لیکن موجودہ زمانے کے علماء انھیں جعلی قرار دیتے ہیں۔ Sanchniathon فونیقی زبان میں نوتیانن جس کے معنے ہیں سافن دیوتا کا عطا کردہ۔

[54] Thales of Mitetus [55] راس الشمرہ کے لفظی معنی ہیں "وہ راس جہاں سویا پیدا ہوتا ہو" یہ لاذقیہ کے شمال میں واقع ہے۔

[56] اغاریت کے لفظی معنی ہیں "زراعت کے قابل کھیت" ظاہر ہے یہ لفظ سرمری زبان سے مستعار لیا ہوا ہے۔

(القیادا کے معنی ہیں، حدود یوتا کا انتقام) جس کے محل کے ستونوں کے زیریں حصے پر چاندی کے خول چڑھے ہوئے تھے محل کی حفاظت کے لئے ایک چوڑی دیوار بنی ہوئی تھی، نیز ایک مربع برج تھا جس کا طول اور عرض چودہ چودہ میٹر تھا۔

یہاں سے جو چیزیں ملیں، ان میں زیادہ بیش قیمت مٹی کی وہ تختیاں تھیں جن پر مسماری نمونے کی تحریریں ثبت تھیں یہ تختیاں اس حصے سے ملی تھیں، جہاں مندر واقع تھا۔ یہ تحریریں چودھویں صدی قبل مسیح میں تختیوں پر نقل کی گئی تھیں، ظاہر ہے کہ اصل تحریریں اس سے پیشتر مرتب ہو چکی تھیں۔ ان تحریروں میں تیس حروف استعمال کئے گئے ہیں اور ان کی زبان ایک کنعانی بولی ہے مضمون کا تعلق زیادہ تر مذہب و عبادات سے ہے۔ غرض جس کنعانی ادب کو مدت سے گم شدہ سمجھا جا رہا تھا، ان تختیوں کے ذریعے سے اس کا ایک اہم حصہ ہاتھ آ گیا ہے ایک نہایت اہم نظم ملی ہے جس میں بنات کے دیوتا "علیان بعل" اور اس کی مخالف دیوی "موت" کی سالانہ کش مکش کا ذکر ہے۔ پہلے "موت" "بعل" کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور جس سرزمین میں موسم گرما کی حدت و تپش نباتات کو بالکل خشک کر دیتی تھی، وہاں اس قسم کا تصور یقیناً قرین قیاس تھا، لیکن جب بارشیں شروع ہو جاتیں، زمین کی پیاس بجھ جاتی اور سبزہ از سر نو اگ آتا تو اس طرح "بعل" "موت" پر فتح و کامرانی حاصل کر لیتا۔ ممکن ہے یہ نظم ساحل شام پر ایک ڈرامے کی شکل میں پیش کی گئی ہو۔ یونانیوں کو عام طور پر ڈرامے کا بانی سمجھا جاتا ہے لیکن مندرجہ بالا نظم صدیوں پیشتر کی ہے اس وقت تک ڈراما شاید یونانیوں کے خیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔

ان تختیوں سے ایک اور حقیقت بھی منکشف ہوئی ہے یعنی اوغاریت کے ادب اور بائیبل کی کتاب ایوب[۵۱] میں زبان و افکار کی گہری یکسانی اور مقاربت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان تختیوں کے ادب اور عبرانی زبور کے درمیان، الفاظ و افکار اور زبان اور اسالیب وضع و ترکیب کا توافق یقیناً حیرت انگیز ہے[۵۲] مثلاً اوغاریت کی تختیوں میں "بعل" کو راکب الغمام (بادلوں کا سوار) کہا گیا ہے زبور میں خدا کے لئے یہی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے[۵۳] اس طرح اوغاریت کی ایک تحریر میں رعد کو "بعل کی آواز" کہا گیا ہے۔ کتاب ایوب (باب ۳۷، آیات ۲-۵) —— اور زبور (۲۹، آیات ۳-۵) میں رعد کو خدا کی آواز بتایا گیا ہے[۵۴] صاف معلوم ہوتا ہے کہ پورے انتیسویں زبور کی اصل کنعانی ہے دریائی عفریت کو کنعانی ادب اور بائیبل دونوں میں پیچیدہ سانپ، یا پیچیدہ اژدہا کہا گیا ہے۔ (یسعیاہ باب ۲۷، آیت ۱[۵۵]) بعل نے دریائی عفریت کو مارا، خدا سے بھی یہی بات منسوب کی گئی ہے کنعانی ادب میں اس دریائی عفریت کے سات سر بتائے گئے ہیں۔ صدیوں بعد یہ ہرکولیس کے ہائیڈرا[۵۶] کی شکل میں نمودار ہوا۔ دانیال (لفظی معنی اللہ نے فیصلہ کردیا) اوغاریت کا ایک ممتاز فرد تھا، وہ سوسن کی کہانی کے دانیال سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ "وہ بیواؤں کا دادرس اور یتیموں کا حامی ہے" یہی صفات (زبور ۶۸- آیت ۵) میں خدا کی بیان کی گئی ہیں۔[۵۷]

---

[۵۱] ملاحظہ ہو جان پیٹرسن کی کتاب Canaanite Parallels in the Book of Psalms [۵۲] ملاحظہ ہو زبور ۶۸ کی آیت ۴ جس میں "صحرا کا سوار" کا جملہ آیا ہے۔ صحرا کے سوار کے لئے شاہراہ تیار کرو۔ [۵۳] کتاب ایوب کی متعلقہ آیات یہ ہیں: "ذرا اس کے بولنے کی آواز سنو اور اس ہمہمہ کو جو اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ اسے سارے آسمان کے نیچے اور اپنی بجلی کو زمین کی انتہا تک بھیجتا ہے اس کے بعد رعد کی آواز آتی ہے وہ اپنے جلال کی آواز سے گرجتا ہے... خدا عجیب طور پر اپنی آواز سے گرجتا ہے" [۵۴] پھر زبور کی آیات ملاحظہ ہوں "خداوند کی آواز بادلوں پر ہے خدائے ذوالجلال گرجتا ہے خداوند دریاؤں پر ہے خداوند کی آواز میں قدرت ہے خداوند کی آواز میں جلال ہے خداوند کی آواز دیوداروں کو توڑ ڈالتی ہے" [۵۵] Leviathan [۵۶] یسعیاہ ۲۷:۱ اس وقت خدا اپنی سخت اور بڑی مضبوط تلوار سے اژدہا یعنی تیز رو سانپ کو اور اژدہا یعنی پیچیدہ سانپ کو اور دریائی اژدہا کو قتل کرے گا۔ [۵۷] Hydra یونانی دیومالا کا بہت سے سروں والا سانپ۔ [۵۸] خدا اپنے مقدس مکان میں یتیموں کا باپ اور بیواؤں کا دادرس ہے۔

اور یسعیاہ (باب ۱، آیات ۱۷) میں یہی طرزِ عمل نیکو کاروں کا ہے[1]

زمانہ قدیم کا یہ بین الاقوامی مرکز جس کے فنون میں مصریوں اور حتّیوں کی زیبائشی چیزیں نمایاں تھیں جس کے گھروں میں پہلے اموریوں، بعدازاں قبرصیوں اور مائی سینائیوں کے ظروف گلی استعمال ہوتے تھے جس کے بازاروں میں حوریوں اور ہکسوسوں کی تلواریں بکتی تھیں ۱۳۶۵ ق م میں پہلے زلزلے سے پھر آگ سے تباہ ہوا۔ ۱۲۰۰ق م کے آس پاس اسے دوبارہ بحری لوگوں[2] نے برباد کر ڈالا اور یہ تاریخ کے صفحات سے ناپید ہوگیا۔

زرخیزی و باروری کا مذہب

اوغاریت کے انکشاف سے پیشتر کنعانی مذہب کے متعلق ہمارے وسائلِ معلومات بہت محدود اور فرومایہ تھے ان میں یونانیوں کی تصانیف شامل تھیں۔ بعض لوگ شامی تھے مثلاً بیبلوس کا فلو اور ساموسطہ (موجودہ سمیساط) کا لوسیان، لیکن یہ سب بہت متاخر دور کے تھے اور جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ مبہم سا تھا، واضح نہ تھا۔ عہد نامۂ قدیم یعنی بائیبل نے خاصا ذخیرۂ معلومات مہیا کردیا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب میں عبرانی مصنفوں کی مخالفانہ روش اثر انداز ہوتی رہی۔ ابتدائی دور کے مسیحی پادریوں نے جو کچھ لکھا، وہ بلاواسطہ نہیں، بلکہ بالواسطہ معلومات پر مبنی تھا۔ ان وسائل سے نیز زمانہ قریب کے آثارِ قدیمہ سے واضح ہوتا ہے کہ کنعانی مذہب کی بنیاد نمود توالد کی قوتوں کی پرستش تھی، جس گروہ کی بقا زراعت اور پرورش مویشی پر موقوف تھی اور جو ایسی سرزمین میں رہتا تھا، جہاں بارش ہمیشہ محدود اور غیر یقینی ہوتی ہے وہاں ایسے ہی مذہبی تصورات کے فروغ پانے کا امکان تھا۔ تمام قدیم سامی مذاہب کے سلسلے میں فی الجملہ اسی کو حقیقت مانا جاسکتا ہے۔ کنعانیوں نے لاریب کچھ عبادتیں اور رسمیں اپنے بابلی اور مصری ہمسایوں ہی سے مستعار لیں، جس طرح ان لوگوں نے دوسرے حضارتی ماخذ سے مختلف چیزیں حاصل کیں اور دوسروں کو بھی عطا کیں۔ گویا اس عمل کی حیثیت ہر فریق کے سلسلے میں دو دوستوں کی تھی، یعنی وہ لیتے بھی تھے اور دیتے بھی تھے۔

باروری کے اس سامی مذہب کے نمایاں خط و خال یہ تھے کہ جب سبزہ خشک ہو کر ناپید ہوجاتا تو اسے نباتات کے دیوتا کی موت سے تعبیر کرتے اور اس کا ماتم کیا جاتا۔ ایسی رسمیں ادا کی جاتیں، جن کے سلسلے میں یقین تھا کہ ان کے ذریعے سے نمو کے دیوتا کو دشمن (موت اور عالم اسفل کا دیوتا) پر غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ اس طرح کہ بارش اتنی ہوگی جس سے نئی سال کی فصل پروان چڑھے گی۔ فصل کے دور کا وقت قریب آتا تو مرے ہوئے دیوتا کے دوبارہ زندہ ہونے پر جشن منایا جاتا۔ عقیدہ یہ تھا کہ بعل زندہ ہوکر زرخیزی و باروری کی دیوی عشتار سے شادی کر لیتا ہے چنانچہ موسم بہار میں سبزہ پھر نمودار ہو جاتا ہے یہ مقدس شادی ایک بلند روحانی حیثیت اختیار کر کے آگے چل کر خدا اور اس کی برگزیدہ قوم کے درمیان اتحاد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مسیحی روایت کا اہم اور محبوب حصہ یہی تصور ہے کہ خدا پہلے مرتا ہے، اس کے بعد زندہ ہو جاتا ہے۔

موسم گرما کی حدت سے نباتات کے مرنے اور موسم بہار میں اس کے زندہ ہونے کا دور جاری رہتا ہے۔ ساتھ ہی ایک اور تخم شامل ہو جاتا ہے، یعنی سورج شانِ و تمکنت کے ساتھ نئی قوت حاصل کرتا ہے اور موسم شکست کھا جاتا ہے۔

---

[1] یسعیاہ:- بدفعلی سے باز آؤ، نیکوکاری سیکھو، انصاف کے طالب ہو، مظلوموں کی مدد کرو، یتیموں کی فریاد رسی کرو، بیواؤں کے حامی ہو۔
[2] ان کا ذکر آگے آئے گا۔

"تموز[1]" کا ابتدائی افسانہ اسی پر مشتمل تھا۔ کنعانی اس دیوتا کو "آدون" کہتے تھے جس کے معنی آقا کے ہیں۔ اسی لفظ کو یونانیوں نے لے کر اڈونیس[2] بنا لیا۔ آگے چل کر اس نے مصریوں کے دیوتا اوزیرس[3] کی حیثیت اختیار کر لی۔ اڈونیس کی حیثیت میں وہ شامیوں کے تمام دیوتاؤں پر فائق ہو گیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں اسی کا مذہب یونان کے اندر رائج ہوا تھا۔ فونیقیوں نے عشتار کے ساتھ اس کے تعلق کو مقامی بنا لیا۔ چنانچہ عشتار کو "سیدہ ببلوس[4]" قرار دیا گیا۔ اس لبنانی دریا کے منبع پر اس کا سلسلہ کھڑا کیا گیا، جسے آج کل نہر ابراہیم کہتے ہیں[5]۔ تموز یہاں جنگلی سور کا شکار کھیل رہا تھا کہ سخت زخمی ہو گیا چنانچہ اسے حالت نزع میں اٹھا کر اس کی الم زدہ محبوبہ کے پاس لے گئے۔ عام عقیدہ یہ ہو گیا کہ اسی وجہ سے دریا کا پانی ایک خاص وقت میں سرخ ہو جاتا ہے یعنی تموز کا خون اس میں مل جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے افسانے کی اصل شان یہ توجیہ پیش کر کے برباد کر ڈالی کہ آس پاس کی زمین سرخ ہے اور موسم بہار کے سیل جب اس سرخ مٹی کو بہاتے ہوئے آتے ہیں تو دریا کا پانی سرخ ہو جاتا ہے[6]۔ تموز جب تک عالم اسفل میں رہتا، نباتات بھی زمین پر مرجھائی رہتی۔ یعنی اس میں زندگی کی کوئی رمق نہ پائی جاتی۔ پھر عشتار خود عالم اسفل میں جاتی اور تموز کو اپنے ساتھ لے آتی۔ ببلوس میں ایسی رسمیں ظہور پذیر ہوتیں، جن کا تعلق تموز کی موت کے ذکر سے تھا۔ ببلوس دریا کے دہانے سے پانچ میل شمال میں ہے۔ عورتیں تموز کی تلاش میں نکلتیں۔ یہ سالانہ جشن سات روز تک جاری رہتا۔ جب تموز دوبارہ زندگی پاتا تو لوگ جوشِ نشاط میں ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ عبادت گزار عورتیں اپنی عزت و حرمت قربان کر دیتیں، مرد رجولیت سے الگ ہو کر خواجہ سراؤں کی حیثیت میں مقدس مندر کی خدمت انجام دیتے۔ شادی سے پیشتر عورت کی بدکاری کو آگے چل کر محض ایک نمائشی سزا پر ختم کر دیا گیا۔ یعنی عورت کے تھوڑے سے بال کاٹ دیئے جاتے۔ ختنے کی رسم قدیم زمانے میں عام تھی۔ بظاہر یہ رسم باروری کی دیوی کے لئے قربانی کے سلسلے میں جاری ہوئی اور یہ رسم قبیلے کا نشان بھی بن گئی جب شام میں مسیحیت پہنچی تو یہ رسم ترک کر کے نیا مذہب اختیار کر لیا گیا۔

حیات و موت کا دور صرف نباتات تک محدود نہ تھا، بلکہ انسان بھی اس دور سے باہر نہ تھا۔ اس وجہ سے زندگی کے جنسی پہلو پر خاص کر زور دیا گیا۔ مثلاً عشتار کی عبادت کے سلسلے میں "مقدس بدکاری" جاری ہوئی اور یہ محض ببلوس میں نہیں بابل، قبرص، یونان، سسلی، قرطاجنہ اور دوسرے مقامات پر بھی جاری ہو گئی[7]۔ اس رسم کے بعض پہلو بظاہر عبرانیوں نے بھی مستعار لے لیے۔ ان کے ہاں ہیکلوں کے لئے کسبیاں ہوتی تھیں[8]۔ قدیم اور جدید دونوں دنیاؤں کی ابتدائی قوموں میں زراعتی جشن کے موقع پر جنسی اباحت عام تھی جو لوگ شادی کی محفل میں شریک ہوتے وہ دلھن کو بوسہ دیتے۔ غالباً یہ رسم بھی ابتدائی دور ہی کے باقیات میں سے ہے۔ مسیحی راہبائیں جب اپنی زندگیاں آسمانی دولھا کے لئے وقف کرتی ہیں تو اب تک ان میں بال ترشوا دینے کا دستور چلا آتا ہے۔

---

[1] بابلی زبان میں اسے "دوموزی" کہتے تھے یعنی میٹھے پانی کا بیٹا۔ یہ نام سومیری ہے۔ تموز سامی سن کا چوتھا مہینا ہے اور تقویم عربی میں اسے ساتواں مہینا قرار دیا جاتا ہے۔ [2] Osiris [3] Adonis [4] لومیان نے یہ منظر ۱۸۴۶ء میں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اس کا رسم و رواج تفصیل سے بیان کیا ہے۔ [5] نہر ابراہیم نام ایک اموی امیر کے نام پر رکھا گیا۔ دریا منبع "افقا" ہے جہاں سیدہ کے احترام کے مراسم ادا ہوتے ہیں۔ اب اسے مریم عذرا کا نام لیا جاتا ہے۔ ایک مقام ہے جہاں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ پاس انجیر کا درخت ہے۔ اس کی شاخوں پر شیعوں اور مسیحیوں نے کپڑے کے ٹکڑے باندھ رکھے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔ [6] اس افسانے کی ایک روایت یہ بھی ہے کہا جاتا ہے کہ اڈونیس کا حقیقی لقب نعمان تھا اور ایک پھول کو اب تک شقائق النعمان کہتے ہیں۔ [7] ہیروڈوٹس اور سٹرابو [8] حزقی ایل باب ۸ آیت ۱۴۔ میکاہ، باب ۱ آیت ۷، استثنا باب ۲۳ آیت ۱۸۔

دیوتا

کنعانیوں کا، نیز پوری سامی دنیا کا ابتدائی مذہب قوائے طبعی کی پرستش کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے دو معبودوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور ان کے نام مختلف اوقات میں تبدیل ہوتے رہے، مگر معبودیت کی بنیادی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ان میں سے ایک دیوتا تو آسمان تھا، جسے باپ سمجھا جاتا تھا۔ دوسری دیوی زمین تھی، جسے ماں کی حیثیت دی جاتی تھی۔ اوغاریت میں آسمان کو "ایل" کہتے تھے اور جو دیوی ماں سمجھی جاتی تھی اسے "عاشرہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ "ایل" کنعانی و عبرانی دنیا کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کا لقب یا عرف "علیان" تھا۔ "بعل" کی حیثیت میں وہ شہر کا محافظ قرار پایا۔ بارش اور فصلیں اس کے قبضے میں تھیں۔ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جشن منانے پر خوش ہوتا ہے اور قربانیاں اسے منا لینے کا ذریعہ ہیں اور اس کی خفگی کو دور کرتی ہیں۔ قربانیوں سے جو دعوت تیار ہوتی تھی اس میں اصولاً عابد و معبود دونوں شریک ہوتے تھے۔ اس دیوتا کی کوئی خاص صورت نہ تھی، بلکہ ایک ستون یا پتھر کو اس کا نشان بنا لیا جاتا تھا۔ ملخ یا مولخ[50] جس کے لئے بچے قربان کئے جاتے تھے، بظاہر "ملقارت" یا محافظ شہر تھا۔ یہ صور کا دیوتا تھا۔ معبد مل میں ایسے مرتبان ملے ہیں جن میں بچے دفن کئے گئے۔ ان سے بائبل کی اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ بچوں کو قربان کیا جاتا تھا[51]

ایل کی رفیقہ حیات کا نام عاشرہ[52] تھا۔ اوغاریت اور تل العمارنہ میں عشتارت[53] نام ایک اور دیوی تھی۔ یہ وہی دیوی تھی جسے آشوری اور بابلی عشتار کہتے تھے۔ اوغاریت کے لوگ عشتارات کو تمام دیوتاؤں کی ماں سمجھتے تھے۔ عبرانیوں نے اسے عشتورت[54] لکھا (جمع عشتارات[55])۔ یونانی اسے آستارت[56] کہتے تھے۔ یونانیوں نے اس دیوی کو لے کر افرودیت[57] کے ساتھ ملا دیا اور اسے باروری کی مشہور دیوی بنا دیا۔ بعل کی حیثیت میں اس نے مقامی حیثیت اختیار کی اور شہر کی حفاظت کا کام انجام دینے لگی۔ عشتار ان مقامی دیویوں کا بھی نام تھا جو کنعانیوں کے دیوتاؤں سے متعلق تھیں اور انہیں بلند مقامات پر رکھا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی لوگ ان دیویوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبرانی نبیوں کو بار بار ان دیویوں کی مذمت کرنی پڑی[58]۔ ایلول جو تقویم کا چھٹا مہینہ ہے اور اس وقت گرمی کمال پر پہنچ جاتی ہے اسی دیوی کے لئے مخصوص تھا کیونکہ اسی مہینے میں فصلیں اور میوے پکتے تھے۔ بعل سے منسوب ہونے کے علاوہ عشتار کا ایک لقب ملکہ بھی تھا۔ اس سے "ملکہ آسمان"[59] کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ بیت لشان میں ایک مصری کتبہ ملا تھا جو تیرھویں صدی قبل مسیح کا تھا اس میں عنات کو "سیدۂ آسمان[60]" قرار دیا گیا ہے۔ اغاریت کی ایک تختی میں عنات کو علیان بعل کی بہن بتایا گیا ہے اور اسے عذرا کا لقب دیا گیا ہے

---

۵۰ Moloch یا Molech ملاحظہ ہو بائبل کی کتاب احبار باب ۱۸، آیت ۲۱، نیز سلاطین حصہ دوم باب ۲۳، آیت ۱۰۔ بائبل کے تراجم میں اس کا نام "مولک" لکھا ہے۔

۵۱ ملاحظہ ہو سلاطین حصہ اول باب ۱۱، آیت ۵ سلاطین حصہ دوم باب ۲۳، آیت ۱۳۔ جنوبی عرب میں یہ نام عشتار کے طور پر آیا ہے اس کی اصل کے معنی ہیں "دولت مند ہونا" "آبیاری کرنا"۔ یہ دیوتا کے لئے، نہ کہ دیوی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ اصلی نام تمام سامی قوموں میں مشترک ہے۔

۵۲ Asherah ۵۳ Ashtart ۵۴ Ashtoreth ۵۵ Ashtaroth

۵۶ Astarte

۵۷ Aphrodite یونانی دیوی جو زہرہ کے لئے مخصوص ہے۔

۵۸ ملاحظہ ہو قضاۃ باب ۲، آیت ۱۳، یرمیاہ باب ۴۴، آیت ۲۵، سلاطین حصہ دوم باب ۲۳، آیت ۱۳، سموئیل حصہ اول باب ۷، آیت ۳-۴ ہر مقام پر عشتارت کو بائبل کے تراجم میں "عشتارات" لکھا گیا ہے۔

۵۹ یرمیاہ باب ۷، آیت ۱۸، باب ۴۴ آیات ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۵ ۶۰ بروز (Burrow) ص ۲۳۰۔

عنات کا نام بیت عنات[۱۱]، بیت عنوت[۱۲] اور عناتوت[۱۳] کی شکل میں باقی ہے۔ عنات عشتار زندگی دیتی بھی تھی اور وہی تباہ بھی کرتی تھی وہ محبت کی دیوی بھی تھی اور جنگ کی دیوی بھی تھی۔ اسی طرح اشف[۱۴] (شعلہ) موت کا دیوتا بھی تھا اور باروری کا دیوتا بھی۔

عبادت گاہیں

عبادت گاہیں یا مندر بنانے کا مدعا یہ تھا کہ دیویوں اور دیوتاؤں کے لئے رکھنے کی جگہ مہیا ہو جائے۔ مندروں میں دیوتا اسی طرح رہتے تھے جس طرح عام انسان اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ مندر انسان اور دیوتا کے درمیان رابطہ ضبط پیدا کرنے کا بھی ایک خاص ذریعہ تھے یعنی انسان مندر میں پہنچ کر خدا کے ساتھ ذاتی ربط ضبط پیدا کر لیتا تھا۔ جن قدیم ترین کنعانی مندروں یا معبدوں کا پتا چل سکا ہے وہ حضرت مسیح علیہ السّلام سے پیشتر تیسرے ہزار سال کے شروع میں بنے تھے اور یہ معبد اریحا اور مجدّو میں تھے۔ ان پرانے معبدوں کا نمونہ یہ تھا کہ ایک کمرہ ہوتا اور دروازہ اس سمت میں رکھا جاتا جو زیادہ لمبی ہوتی۔ دوسرے ہزار سال قبل مسیحؑ کے وسط میں زیادہ اچھی عمارتیں بننے لگیں۔ ایسے معبدوں[۱] کے خاص خط و خال یہ تھے کہ مذبح[۲] چٹان کی شکل میں ہوتا۔ ایک مقدّس ستون رکھا جاتا، ایک مقدّس کھمبا اور زمین دوز کمرے یا حجرے ہوتے۔ چنانچہ جزر، بیت شان، اوغاریت اور دوسرے مقامات سے جو معبد برآمد ہوئے ان کی کیفیّت یہی تھی۔ ان میں سے مذبح کو سب سے بڑھ کر اہمیت حاصل تھی۔ مقدّس ستون دیوتا کی نمائندگی کرتا۔ اغلب یہ ہے کہ اس کا آغاز عضوِ تناسل سے ہوا۔ اس کے پاس مقدّس کھمبا یا درخت[۳] ہوتا۔ یہ کھمبے یا درخت، سدا بہار پودے کی نمائندگی کرتے یعنی باروری کی دیوی ان میں رہتی۔

بیت شان میں کھمبا مندر کی اندرونی عمارت کے داخلے پر نصب تھا جو کمرے یا حجرے زمین کے نیچے بنائے گئے تھے ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ہاتف کا کام دیں۔ چڑھاوے کی شراب کے ذخیروں اور پیالوں پر سانپوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی بخور دانیاں تھیں اور ان کے رکھنے کے لئے سہارے بنے ہوئے تھے۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں کس غرض سے استعمال ہوتی تھیں[۴] ایسے مندروں کے باقیات بھی ملے ہیں جن کے ساتھ حوض سے تھے اور ان پر عبادت گزار اپنے پاؤں دھوتے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے ہاں نماز سے پیشتر وضو کا جو دستور ہے، قدیم کنعانی اس سے ناواقف نہ تھے بخور دانیاں رکھنے کے لئے جگہیں یونانیوں اور اٹرسکنوں نے کنعانیوں سے لیں۔ بیت شان میں پیچھے کی طرف ایک سہارا سا بنا ہوا ملا۔ یہ غالباً معبود کی تمثال رکھنے کی جگہ تھی

---

[۱۱] Beth-anat یشوع باب ۱۹، آیت ۳۸ آج کل اس کا نام "البعنہ" ہے اور یہ عکّہ کے مشرق میں ہے۔ [۱۲] Beth-anoth یشوع باب ۱۵، آیت ۵۹۔ اسے آج کل بیت عینون کہتے ہیں اور یہ الخلیل (حبرون) کے شمال میں ہے۔

[۱۳] Anathoth تواریخ حصّہ اوّل باب ۶، آیت ۶۰، موجودہ نام عناتا ہے اور یہ یروشلم شمال مشرق میں ہے [۱۴] Rashap بائبل میں اسے اشف لکھا ہے اور یہ ایک فرد کا نام ہے۔ دیکھئے تواریخ اوّل باب ۷، آیت ۲۵۔

[۱] معبد کے لئے ہیکلو Kekallu کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں گھر یا قصر۔ یہ سمیری لفظ ہے اور عربی میں اس نے ہیکل کی شکل اختیار کر لی ہے

[۲] عصیبہ جس کی جمع عصیبوت ہے۔ یہ نصب سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کھڑا ہونا یعنی تمثال یا ستون۔ ہوسیع باب ۳ آیت ۴ سلاطین حصّہ دوم باب ۲، آیت ۲۷ پیدائش باب ۳۵ آیت ۱۴ سموئیل حصّہ دوم باب ۱۸ آیت ۱۸ [۳] اصل لفظ سیرت ہے ملاحظہ ہو سلاطین اوّل باب ۱۴ آیت ۲۳ سلاطین دوم باب ۲۳ آیات ۶-۷۔ یسعیاہ باب ۲۷، آیت ۹۔ استثنا میں اسے حرام قرار دیا گیا ہے باب ۱۲، آیت ۳، باب ۱۶ آیت ۲۱

[۴] تصویروں کے لئے ملاحظہ ہو کی کتاب چار کنعانی مندر الواح مختلفہ۔

اور اس امر کی دلیل کہ یہاں سے "قدس الاقدس" (مقدس ترین مقام) شروع ہوتا ہے۔

شام اور فلسطین کے مسلمانوں، مسیحیوں اور دروزیوں کا طریقہ اب تک یہ ہے کہ ان درختوں کو (خصوصاً بلوط یا صنوبر کے درختوں کو) جو چشموں یا کسی بزرگ کی قبر کے قریب ہوں احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ افقہ کے درخت میں چندیاں بندھی ہوئی اب تک دیکھی جا سکتی ہیں یعنی نہر ابراہیم کے منبع کے پاس۔

بت

کنعانیوں کے نزدیک مقدس کھمبا اور مقدس ستون بالکل کافی تھے اور وہ بت تراشی کی ضرورت سے بالکل بے پروا تھے عام دستور یہ تھا کہ اٹھا ہوا ہاتھ رعد کو تلوار کی طرح گھماتا تھا اور اس کے پاس بعل کے چھوٹے چھوٹے برنجی بت دھرے رہتے تھے دیوی کو عموماً برہنہ شکل میں دکھایا جاتا اور اس کے بازو یا تو اطراف میں لٹکے رہتے یا چھاتیوں پر اس طرح دھرے ہوتے گویا وہ غذا مہیا کر رہی ہے۔

دھات یا مٹی کی بنی ہوئی ایسی کئی شکلیں برآمد ہوئی ہیں۔ لیکن یہ معبدوں میں نہیں، بلکہ گھروں میں رکھی رہتی تھیں۔ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں بڑی تاثیر ہے۔ تعلیم یافتہ عبادت گزاروں کا عقیدہ یہ تھا کہ ان بتوں میں خدا رہتا ہے لیکن عام لوگ انھیں کو خدا سمجھتے تھے۔ شام کی مشہور دیوی اتارغاتس[۱] کی عام شکل دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے آخری حصے میں ایک برہنہ عورت کی تھی۔ ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا، جس میں سوسن کی شاخ یا سانپ پکڑے ہوتے۔ قادش[۲] ایک اور شامی دیوی تھی، اسے بھی برہنہ شکل میں شیر پر سوار دکھایا جاتا تھا شیر یا سانڈ قوت اور سرگرمی کا نشان تھے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سانپوں کو کس بنا پر بار وری کا نشان قرار دیا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سانپ زمین کے اندر رہتے ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگ سانپ کی اس حرکت سے بہت متاثر ہوئے ہوں گے کہ وہ ہر سال اپنی کینچلی بڑی پھرتی سے بدل لیتا ہے اور اپنے جسم کو از سر نو قوی بنا لیتا ہے۔ نیز اس کے ڈسنے سے فوراً موت واقع ہوتی ہے۔ اب تک یہ دستور رائج ہے کہ شامی کسان کے گھر میں سے کالا سانپ نکل آئے تو اس وجہ سے اسے مارنے میں تامل کرتا ہے کہ شاید یہ اس کے گھر کی حفاظت کر رہا ہو۔

مصر، کریٹ اور مشرق کی دوسری سرزمینوں میں ابتدائی دور کے اندر سانپ کی پوجا عام تھی۔ بیت شان میں چار کنعانی معبدوں کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں سانپوں کی پوجا ہوتی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مصر کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ان میں سب سے پہلا معبد میکال کے لئے مخصوص تھا، جسے بیت شان کا مالک قرار دیا گیا تھا۔ یہ تحوتمس ثالث کے زمانے کا ہے (۱۵۰۱ق م تا ۱۴۴۷ق م) میکال جس کا نام ملخ سے ملتا جلتا ہے کنعانیوں اور اموریوں کے رشف کی ایک شکل تھی۔ اس معبد میں ایک ایسا پیالہ ملا جس کے بیرونی حصے پر سانپ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

اونچے مقامات

شہری معبدوں کے علاوہ کنعانیوں کی مقامی زیارت گاہیں بھی تھیں۔ یہ زیارت گاہیں عموماً کھلی جگہوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوتی تھیں۔ یہی وہ اونچے مقامات ہیں جن کی مذمت عہد نامۂ قدیم میں ملتی ہے[۳]۔ اکثر حالتوں میں یہ زیارت گاہیں محض ایک مذبح اس کے متعلقات اور اس کے

[۱] Atargatis

[۲] Qadesh [۳] سلاطین حصہ اول باب ۱۳، آیت ۲، یرمیاہ باب ۳۲، آیت ۳۵، ہوسیع باب ۱۰، آیت ۸۔

مقدس پتھر تک محدود ہوتی تھیں۔ جزر کے ایسے ہی "بلند مقام" کے پاس سے ان بچوں کے پنجر ملے ہیں، جو قربانی کئے گئے تھے اور انھیں مرتبانوں میں بند کر کے پاس ہی دفن کر دیا گیا تھا۔

تدفین کی رسمیں

عام دستور یہ تھا کہ جن بچوں کو قربان کیا جاتا تھا، انھیں گاؤدم مرتبانوں میں بند کر کے دفن کیا جاتا تھا۔ سر مرتبان میں پہلے ڈالا جاتا تھا۔ اریحا اور دوسرے مقامات پر ایسے مرتبان گھروں کے اندر دفن کیے ہوئے ملے۔ عبرانیوں کے دور میں بچوں کو گھروں کی بنیادوں میں دفن کیا جاتا تھا۔ عبرانیوں کے آباو اجداد بھی دوسرے سامی گروہوں کی طرح اس رسم کے پیرو تھے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے ظاہر ہے[۱]۔ مواب کے بادشاہ میشا نے واقعی اپنے بڑے بیٹے کو قربان کر دیا تھا۔

دوسرے ہزار سال قبل مسیحؑ کے وسط میں میت کی تدفین کا بہترین طریقہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ میت کو قبر میں چت لٹا دیا جائے اور اس کا سر شمال کی جانب رکھا جائے۔ میت کے ساتھ ایک چراغ، ایک کوزہ، کھانے کی ایک رکابی، کھانے اور پینے کے دوسرے برتن بھی دفن کیے جاتے تھے۔ یہ اس عقیدے کا ثبوت تھا کہ موت کے بعد میت کو ایسی زندگی ملے گی، جو دنیوی زندگی کے نمونے سے ملتی جلتی ہو گی۔ عورتوں کے ساتھ ان کے ہار، عطر، زیورات رکھے جاتے تھے۔ مردوں کے ساتھ ان کے ہتھیار جمع کیے جاتے تھے۔ اسیرام کا ایک بڑا سنگین تابوت ملا ہے، جس کے اوپر میت کا جلوس کندہ کیا گیا تھا۔ عورتیں گریہ و ماتم کرتی ہوئی دکھائی گئی تھیں، ملازموں نے تحائف اٹھا رکھے تھے۔ نعشوں کے حنوط کرنے، یعنی خوشبو لگانے کا دستور نہ تھا، البتہ کنعانی بادشاہوں نے مصریوں کے زیر اثر یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ فونیقی بادشاہوں کی تدفین میں ایک اور مصری اثر نمایاں ہوا، یعنی ان کے تابوت انسانوں کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ کئی ایسے تابوت ملے ہیں، جن کا ایک حصہ انسان کے سر کے مطابق تھا، بلکہ تابوت کے بالائی حصے پر پوری انسانی شکل بنی ہوئی تھی۔ یہ تابوت چھٹی صدی قبل مسیحؑ سے تیسری صدی قبل مسیح علیہ السلام تک کے تھے۔ ان میں سے ایک نہایت خوبصورت اور حسین و جمیل تابوت نکلا، جو اشمون عزر ابن تبنیت[۲] کا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو شہر صیدا کا بادشاہ بتایا اور وہ سکندر سے نصف صدی بعد بادشاہ بنا تھا۔ تابوت کے بالائی حصے پر جو کتبہ کندہ کیا گیا تھا، وہ تابوتوں کے کتبوں میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ اس کا بنیادی مضمون یہ تھا کہ جو شخص میت کو گزند پہنچائے گا، وہ بددعا کا مستوجب ہو گا، نیز یہ کہ میت کے ساتھ کوئی خزانہ دفن نہیں کیا گیا۔ مصری پہلے اجنبی تھے، جو فونیقیہ پر حکمران ہوئے اور سکندر سے بیشتر اس سرزمین کے آخری حکمران ایرانی تھے۔

---

[۱] حضرت ابراہیمؑ کے واقعۂ ذبح اور قدیم سامیوں کی بیان کردہ رسم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ رسم کا مقصد یہ تھا کہ بچے کو ذبح کر کے بت کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں دنیا کی عزیز ترین شے کو بھی بے تامل قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دونوں کی حیثیت اساساً مختلف ہے۔

[۲] اشمون عزر کے معنی ہیں، اشمون مدد کرتا ہے۔ اشمون صیدا کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ ابتدا میں اسے نمو کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس کا نام اب تک "قبر شمون" ہے، یہ کھنڈر بیروت کے جنوب مشرق میں ہیں۔ تبنیت کا نام بھی "کفر تبنیت" کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ صیدا کے جنوب مشرق میں ہے۔ عبرانی میں یہ "تبنی" سے مشابہ ہے۔ ملاحظہ ہو سلاطین حصہ اوّل باب ۱۶، آیات ۱۵-۲۳۔

گیارھواں باب

بین الاقوامی تعلقات ــــ مصر

مسیح سے قبل تیسرے اور دوسرے ہزار سال میں مغربی ایشیا کی تین بڑی طاقتیں تھیں: مصر، بابل اور حتی۔ اس کے بعد تین اور طاقتیں بروئے کار آئیں، جو چوتھی صدی قبل مسیح کے اختتام تک برسر اقتدار رہیں۔ آشوری، نو بابلی، یعنی کلدانی اور ایرانی۔ ان زبردست اور عظیم الشان ہمسایوں کے ساتھ شامی ریاستوں کے فوجی، تجارتی اور سفارتی تعلقات قریباً تین ہزار سال تک تاریخی واقعات کا اہم جزو بنے رہے۔

مصر کی قدیم سلطنت

فونیقی مسیح سے قبل تیسرے ہزار سال کے شروع میں مشرقی بحیرۂ روم کے ساحل پر نمودار ہوئے۔ اس ساحل کے ساتھ مصر کا تعلق پہلے سے چلا آتا تھا۔ ابتدا میں یہ تعلق تجارتی تھا، پھر اس میں بوقلمونی پیدا ہوگئی، یہ بہت گہرا ہوگیا اور تیرھویں صدی قبل مسیح (بحری باشندوں کے حملے) تک جاری رہا۔ بیچ میں کچھ خلل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً اٹھارھویں اور سترھویں صدی قبل مسیح میں مصر پر ہکسوس قابض ہوگئے اور چودھویں صدی قبل مسیح میں خابیرو آگئے۔ بایں ہمہ کہا جاسکتا ہے کہ فونیقی ساحل پر فراعنہ کا تصرف سنہ ۲۴۰۰ ق م سے ۱۳۰۰ ق م تک قائم رہا۔ حضارتی و اقتصادی اثرات سیاسی اثرات زائل ہو جانے کے بعد بھی قائم رہے۔ شمالی شام اور اندرونی حصے میں مصر کے تسلّط و اقتدار کو چودھویں صدی ق م میں حتیوں سے مقابلہ پیش آیا اور اس میں خلل پیدا ہوگیا۔[۵۱]

جس شہر کو ابتداءً شام و مصر کے تعلّقات میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی وہ "جُبلہ"[۵۲] (جُبیل) تھا۔ مصری اسے "کپنا"[۵۳] کہتے تھے۔ فونیقیوں نے اس غیر سامی نام کو تبدیل کرکے جُبیلہ بنالیا۔ یہ سامی نام اب تک جُبیل (پہاڑی) کی شکل میں موجود ہے۔ اس کا یونانی نام "بیبلوس" تھا۔ جس کے معنی ہیں "پاپیروس" یعنی کتاب۔ یہ نام بائیبل میں باقی رہا۔ پاپیروس کی برآمد کا مرکز بننے سے بہت پہلے اس شہر کی بندرگاہ سے لبنان کے دیودار وادیٔ نیل بھیجے جاتے تھے۔ وہاں ان سے معبد، محل اور جہاز اور تابوت بنائے جاتے تھے اور اعلیٰ درجے کا فرنیچر بھی اسی لکڑی کا بنتا تھا۔ مثلاً فرعون سنفرو (قریباً سنہ ۲۶۵۰ ق م) نے تعمیرات کی غرض سے دیودار سے بھرے ہوئے چالیس جہاز درآمد کیے تھے۔ مصر و شام کے درمیان تعلّقات کی جو پہلی تحریری شہادت ہمیں دستیاب ہوئی ہے، وہ اسی فرعون کے عہدِ حکومت کی ہے۔ جبیلہ سے شراب اور تیل بھی مصر بھیجا جاتا تھا، تاکہ نعشوں کو حنوط کرنے میں استعمال ہو۔ اس کے بدلے میں فونیقی شہر سونا، دھات کی بنی ہوئی دوسری چیزیں اور سامان تحریر (پاپیروس) خریدتے تھے۔ فرعون خوفو (قریباً سنہ ۲۶۰۰ ق م) اس لحاظ سے بہت شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اہرام میں سب سے بڑا اسی نے تعمیر کرایا تھا، اس نے ایک سنگی ظرف پر اپنا نام

---

۵۱ ان تمام واقعات کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ ۵۲ یہ مقام جبیلہ سے الگ ہے جسے اوغاریت کے لتبات میں GB'L لکھا گیا ہے۔ یہ موجودہ جبیل ہے، جو شامی جانب ہے۔ یہ بھی کنعانی بستی تھی۔ ۵۳ Kupna

کندہ کرا کے نذر کے طور پر "سیدہ جبلہ" کے لئے بھیجا تھا۔ اہل مصر اس دیوی کو اپنے ہاں کی دیوی "حاتھور" سے ملاتے تھے۔ اس طرح یہ بلاد شام کی سیدہ بن گئی۔ پانچویں شاہی خاندان کے فرعون ساحورا ع نے ابوصیر (بیرون ممفس) میں مدفن کی غرض سے ایک ہیکل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں ایک مہم کی تصویر بنائی گئی تھی، جو بیرونی ملکوں کی تسخیر کے لئے بھیجی گئی تھی۔ اس مہم کے ساتھ مال غنیمت کا نقشہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس تصویر میں کنعانی کوزوں کے اندر زیتون کا تیل بھی دکھایا گیا ہے۔ فرعون اونیس[1] (وفات قریباً ۲۳۵۰ ق، م) اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا، اس نے اپنے بیڑے کے ذریعے سے شہر جبلہ پر قبضہ قائم رکھا، غالباً یہ شہر تاج کی نو آبادی تھا۔

چھٹے شاہی خاندان کے کتبات میں جہاں بحیرۂ رُوم کے اندر آمد و رفت کا ذکر ہے، وہاں جبلہ کے جہازوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اسی خاندان سے ہمیں فلسطین و شام میں بری مہموں کے مفصل حالات پہلے پہل معلوم ہوتے ہیں۔ ان مہموں کی ابتدا تیئسویں صدی قبل مسیحؑ میں ہوئی تھی اور پہلی مہم کا سپہ سالار ادنی[2] تھا، جو فرعون پیپی اوّل کا سپہ سالار تھا۔ کتبے میں بتایا گیا ہے کہ اس سالار نے ایشیا کے صحرائی باشندوں سے جنگ کی۔ شمالی جانب دُور تک چلا گیا۔ ان کے قلعے تباہ کر دیئے، انجیر اور انگور کے باغات کاٹ ڈالے اور اپنی فوج کو محفوظ واپس لے آیا۔

درمیانی دَور کی سلطنت

بارھویں شاہی خاندان (۲۰۰۰ ق م - ۱۷۸۸ ق، م) کے فرعونوں کا عہد تاریخ مصر کا ایک نہایت شاندار عہد ہے۔ یہ فرعون نہ صرف ساحل فونیقیہ پر، بلکہ فلسطین کے علاوہ شام کے ایک بڑے حصے پر بھی برتری کے مدعی تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی نہ کسی حیثیت میں برتری حاصل تھی اور قطنہ بھی ان کی سلطنت میں شامل تھا۔ ادغاریت کے ایک امیر نے سنوسرت اوّل[3] (۱۹۸۰ ق، م - ۱۹۳۵ ق، م) کی طرف سے تحفے قبول کیے اور فرعون امن محت ثالث[4] (۱۸۴۹ ق، م - ۱۸۰۱ ق، م) کا ایک مجسمہ ابوالہول[5] کی شکل میں ادغاریت کے اندر معبد بعل کے دروازے پر نصب تھا۔ مصریوں نے مختلف مقامات کے جو نام بتائے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون امن محت کے عہد حکومت کے آخری دَور میں فلسطین مشرقی سمت میں جلعاد تک، فونیقیہ شمال میں وادی نہر الکبیر تک، نیز حوران و دمشق کے علاوہ البقاع کا بڑا حصہ بھی مصری سلطنت میں شامل تھا۔ سنوسرت کے عہد حکومت سے ہمیں شام و فلسطین کی اجتماعی اور تنظیمی زندگی کے متعلق پہلی تفصیل ملتی ہے[6]۔

سنوحی کا قصہ

یہ تفصیل مصر کے ایک درباری سنوحی نے قلم بند کی تھی۔ جو سنوسرت کی تخت نشینی پر بھاگ کر شام چلا گیا اور وہاں اس نے بہت سے سال بدوؤں کے درمیان گزارے۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو فرعون نے اسے واپس بلا لیا اور وہاں اس نے اپنے حالات یادداشتوں

---

[1] Unis
[2] Uni
[3] Senwosret
[4] Amenerhet
[5] Sphinx

[6] مصری شمالی شام کو رتینو (Retenu) یا خورو (Khuru) کہتے تھے۔ ممکن ہے رتینو کسی سامی لفظ کی تحریف ہو۔ خورو غالباً حوری کی تحریف ہے۔ مغربی اور شرقی لبنان کے درمیانی علاقے کا نام مصریوں نے "اَمورو" (Amurru) رکھا تھا فونیقیہ اور فلسطین کے میدان کو وہ زاہی (Zahi) کہتے تھے۔ فونیقیوں کے لئے انھوں نے فنخو کا نام تجویز کر لیا تھا، اس مصری لفظ کے معنی ہیں "جہاز ساز"۔

کی شکل میں نظم کیے۔

سنوحی مصر سے نکلا تو سرحد پر ایک بدو شیخ کے پاس پہنچا، جس نے اس کے لئے پانی اور جوش دیے ہوئے دودھ کا انتظام کیا نیز اپنے قبیلے میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح غریب سنوحی کی جان بچی۔ جنوب میں کچھ مدت گذارنے کے بعد سنوحی جبلہ پہنچا۔ پھر لبنان سے گذرتا ہوا بقاع کے خطے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے مقامی باشندوں کی وضع قطع اختیار کر لی اور ایک قبیلے سے منسوب ہو گیا۔ جس کے شیخ کا نام "اموریا" تھا۔ تازہ وارد مہمان نے شیخ پر بہت زور دیا کہ فرعون کی اطاعت قبول کر لے، لیکن شیخ نے اپنی آزادی سے دست بردار ہونے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ سنوحی نے شیخ کی بڑی بیٹی سے شادی کر لی اور اسے زمین کا ایک اچھا ٹکڑا دے دیا گیا۔ جس میں انجیر اور انگور کے باغات تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ شراب مقدار میں پانی سے زیادہ تھی۔ شہد اور روغن زیتون کی افراط تھی اور درخت پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ وہاں جَو تھے، گیہوں تھے اور ہر قسم کے بے شمار مویشی تھے[۱]۔ شیخ کی وفات پر سنوحی ہی کو قبیلے کا سردار بنا لیا گیا۔ وہ کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا تھا، بدوؤں کے عام شیوے کے مطابق مہمانوں کی مہمانداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا۔ کوئی پیاسا آ جاتا تو اسے پانی پلاتا، کوئی راستہ بھول جاتا تو اس کے لئے رہنمائی کا انتظام کر دیتا اور چھاپوں میں بھی شریک ہوتا۔ قبیلے میں اسے ایسی ہر دلعزیزی حاصل تھی کہ ایک موقع پر قبیلے کے ایک طاقتور فرد سے اسے دست بدست جنگ کی نوبت آ گئی، جس میں تیز برچھیاں اور کلہاڑے بے تکلف استعمال کیے گئے۔ قبیلے کی عورتیں اسے خطرے میں پا کر چیخ اٹھتی تھیں اور مرد اس کی برابر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پھر اس کے دل میں وطن کی محبت جاگ اٹھی اور اس خیال سے اس کا دل لرزنے لگا کہ مرنے کے بعد وہ ایک اجنبی سرزمین میں دفن ہو جائے گا۔ اس اثنا میں فرعون سنوسرت کی طرف سے اس کے پاس فرمان پہنچ گیا۔ اس نے تمام املاک بڑے بیٹے کے حوالے کیے۔ ریگ زار وہاں کے باشندوں کے لئے چھوڑا، زیتون کے درخت ان لوگوں کو سونپے، جن کے نزدیک اس سے بہتر مرہم کوئی نہ تھا اور خود ایک پوستین میں ملبوس وطن پہنچ گیا، جہاں مدت دراز کے بعد اسے حمام میں غسل کرنے اور اعلیٰ درجے کے بستر پر سونے کی راحت نصیب ہوئی[۲]۔

شام کا الحاق

اٹھارھویں شاہی خاندان کے فرعون احموس[۳] (وفات ۱۵۴۶ ق،م) نے نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے عہد حکومت میں شام کا الحاق سلطنت مصر سے ہو گیا۔ یہی بادشاہ تھا جس نے ہکسوس کو مصر سے باہر نکالا اور ان کے تعاقب میں شام پہنچ گیا۔ جہاں سے اٹھ کر وہ مصر گئے تھے۔ اسی وقت سے از سرِ نو مصر کی جنگی مہموں اور استعماری سرگرمیوں کا دور شروع ہو گیا۔ احموس کے جانشینوں نے شام و مصر میں پیش قدمی کی پالیسی جاری رکھی۔ فرعون تحوتمس اوّل نے ۱۵۲۰ ق،م کے آس پاس شام و فلسطین کا دورہ کیا۔ اسے کہیں بھی زیادہ مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا اور وہ بالائی دریائے فرات تک پہنچ گیا، جہاں سے دو دریاؤں کی سرزمین شروع ہوتی ہے (نہرین)۔ یہاں اس نے عظیم الشان کارناموں کو شہرت دینے کے لئے ایک کتبہ کندہ کرایا۔ دریائے فرات، دریائے نیل سے الٹے

۱۔ ایڈالف ارمن کی کتاب The Literature of the Ancient Egyptians ص ۱۹۔

۲۔ ڈیوڈ پیٹن Paton کی کتاب Early Egyptian Records of Travel Vol. I لیکن یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ سنوحی کا پورا افسانہ بدیہی طور پر سراسر ناقابل اعتماد ہے۔ اغلب ہے اس نے ایک خیالی داستان تیار کر لی ہو۔

۳۔ Ahmose

رُخ بہتا تھا، مصریوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ ہر قسم کی افواہیں پھیل گئیں، نیل تو جنوب سے شمال کی طرف بہتا تھا اور فرات کا رُخ شمال سے جنوب کی طرف تھا، اس الٹے رُخ کی وجہ سے دریا کا نام الٹا بہنے والا دریا رکھ دیا گیا۔[۵۱]

جنگ مجدو

مصر قدیم کا نہایت مشہور جنگجو تحوتمس ثالث (۱۵۰۱ ق م۔ ۱۴۴۷ ق م) تھا، جس نے شام میں چودہ یا اس سے زیادہ مہمیں بھیجیں۔ اس طرح مصر کی برتری مستحکم ہوئی اور شام عروج پذیر مصری سلطنت میں قطعی طور پر جذب ہو گیا۔ ۱۴۷۹ ق م میں مجدو کا سقوط پہلی اور نہایت اہم مہم کا واقعہ ہے۔ یہاں تین سو نیٹس امیر جتھا بنا کر فوجی مقابلے کے لئے تیار تھے۔ ہکسوس تھوڑا ہی عرصہ پہلے مصر سے نکالے گئے تھے، اب وہ شامی وفاق میں ریڑھ کی ہڈی بنے کھڑے تھے۔ قادش دریائے عاصی کے کنارے واقع تھا۔ وہاں کا امیر وفاق کا سپہ سالار تھا۔ شہر مجدو کے استحکامات کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس کی فصیل کے سامنے لڑائی ہوئی۔ مصریوں نے بڑی تیزی اور تندی سے حملہ کیا۔ شامی فوجیں پیچھے ہٹیں تو دیکھا کہ باشندوں نے شہر کے دروازے بند کر کے اندر دھس بنا لئے ہیں۔ قادش کے امیر کو بھی کپڑوں کے رسّے بنا کر فصیل پر سے اندر پہنچایا گیا۔ سات مہینے شہر کا محاصرہ جاری رہا، پھر خوراک کی قلت نے شہریوں کو حوالگی پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس شہر کی تسخیر ہزاروں شہروں کی تسخیر کے برابر تھی۔ شام کے تمام امیر فرعون کے قدموں میں گر گئے اور اپنے "نتھنوں کے لئے سانس کی بھیک مانگی"۔ مصری فوج نے اتنا مال غنیمت حاصل کیا کہ اسے ناقابل یقین سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً دو ہزار اکتالیس گھوڑے، نو سو چوبیس جنگی رتھ، جن میں سے بتیس پر چاندی اور سونے کا نہایت اعلیٰ کام کیا گیا تھا، ایک ہزار نو سو انتیس عالیشان بیل، دو ہزار معمولی مویشی، بیس ہزار پانسو دوسرے جانور، دو سو زرہیں اور بے شمار قیمتی ہتھیار، شاہی محل سے ستاسی بچے اور ایک ہزار سات سو چھیانوے لونڈیاں، غلام نکلے۔ ان کے علاوہ سنہری برتنوں، فرنیچر کی چیزوں اور مجسموں کا شمار نہ تھا۔ مفتوح امیروں نے اپنی طرف سے یرغمال دیئے۔[۵۲]

مجدو کے سقوط نے فلسطین کی قسمت پر مُہر لگا دی۔ سرگرم تحوتمس فوراً شمالی جانب روانہ ہو گیا اور بہتّر میل کا فاصلہ طے کر کے لبنان کے خطّے میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے تین شہروں پر قبضہ جما لیا اور ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اپنی پانچویں مہم میں تحوتمس نے ارد وین (ار واد) کو مسخر کیا۔ اس طرح فونیقی میدان پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ ارواد ایک ایسا شہر تھا جو جزیرے میں واقع تھا اور بڑا مستحکم مانا جاتا تھا، نیز یہ تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی تسخیر کا اعلان سرکاری روئیداد میں یوں درج ہوا:

> دیکھو اعلیٰ حضرت نے شہر ارداو پر قبضہ کر لیا اور پورا غلّہ اعلیٰ حضرت کے ہاتھ آ گیا۔
> اس شہر کے خوشنما درخت کاٹ ڈالے گئے۔ دیکھو اسی شہر میں پورے زاہی (فونیقی میدان اور فلسطین) کی پیداوار فراہم تھی۔ باغات میووں سے بھرے ہوئے تھے۔ انگوروں کا رس پانی کی طرح بہ رہا تھا۔ غلّہ کھلے چبوتروں پر رکھا ہوا تھا۔ یہ ساحل کی ریت سے بھی زیادہ تھا۔ فوج مال غنیمت کے بوجھ کے نیچے دب گئی۔[۵۳]

---

[۵۱] Breasted

[۵۲] Ancient Records

[۵۳] Breasted

اس کے بعد تحوتمس خراج کی تفصیل بتاتا ہے، جس میں غلام، گھوڑے، مویشی، چاندی کی رکابیاں، خوشبوئیں، تیل، شراب، شہد تانبا، سیسا، لاجورد، ایک سبز قلمی دھات، غلہ، روٹیاں میوے وغیرہ شامل تھے۔ روئداد کے آخری الفاظ یہ تھے:

"دیکھو اعلیٰ حضرت کی فوج ہر روز خوب شراب پیتی ہے اور زیتون کا تیل لگاتی ہے، جیسا کہ مصر میں خاص جشنوں کے موقع پر عمل میں آتا ہے"۔

قادش

ارواد کے شمال میں اس کا ہمسایہ سیمیرا تھا۔ بعد کی ایک مہم میں وہ بھی مسخر ہو گیا۔ قادش[۱] بے چینی کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس پر بھی قبضہ جما لیا گیا لیکن بارہ سال بعد تحوتمس کو پھر اس کے خلاف پیش قدمی کرنی پڑی۔ قادش کے امیر نے جب دیکھا کہ مصریوں کے جنگی رتھوں میں گھوڑے جتے ہوئے ہیں تو اس نے ایک عجیب چال چلی۔ اس نے ایک گھوڑی چھوڑ دی جو اچھلتی کودتی رتھوں کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ صف بندی ٹوٹنے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ آمن محب، فرعونِ مصر کا ایک سپہ سالار اور مستقل رفیق تھا۔ وہ فوراً تلوار ہاتھ میں لے کر رتھ سے کودا اور آگے بڑھ کر اس نے گھوڑی کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ اس کی دُم کاٹی اور اسے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا[۲]۔

نہارین

آٹھویں مہم جس میں علاقہ فرات فتح کیا گیا۔ تحوتمس کے ایشیائی محاربات کی بہت بڑی مہموں میں سے ایک تھی۔ اس مہم کا سب سے بڑا واقعہ یہ تھا کہ دریائے فرات کے مشرق میں سرحد پر ایک کتبہ کندہ کرا کے لگا دیا گیا۔ دریائے فرات غالباً کرکمیش پر عبور کیا گیا تھا۔ ایک اور کتبہ اس کے قرب و جوار میں وہاں کندہ کرایا گیا تھا جہاں اس کے باپ تحوتمس اول کا کتبہ تھا۔ تحوتمس ثالث نے راستے میں تبیانیوں کے شہر لوٹے۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلا، جہاں کوئی قصبہ مل جاتا اسے لوٹتا اور برباد کر ڈالتا۔ پھلوں کے باغات کٹوا دیتا، فصلیں اکھڑوا دیتا اور پوری زمین کو بنجر بنوا دیتا۔ نہارین کے خلاف غالباً ایک سے زیادہ مہمیں بھیجی گئیں۔ ایک مہم کے سلسلے میں تحوتمس نے ببیلہ کے مشرقی پہاڑوں سے دیودار کٹوائے، کشتیاں بنوائیں اور انہیں بیل گاڑی میں لاد کر دریائے فرات پر پہنچا دیا تاکہ فوج ان کے ذریعے سے دریا کو عبور کر کے نہارین پہنچ جائے۔ مراجعت پر تحوتمس دریا کے مغربی حصے کے دلدلوں میں شکار کھیل رہا تھا۔ وہاں اسے ہاتھیوں کا ایک گلہ ملا۔ ایک ہاتھی تحوتمس کو موت کی گھاٹ اتارنے والا تھا۔ "امن محب" نے خطرہ بھانپ لیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی۔

امن محب کو جن واقعات سے سابقہ پڑا، ویسے تجربے شام میں دوسرے مصری سپاہیوں کو بھی ہوئے۔ ان میں سے ایک واقعہ یافا کی تسخیر کا بھی ہے جو فرعون کے دوسرے جرنیل جحوتی نے انجام دیا اور یہ واقعہ لوک کہانیوں میں شامل ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جحوتی نے یافا کے امیر کو دعوت میں بلایا، شراب پلا کر بدمست کیا اور قتل کر ڈالا۔ ساتھ ہی امیر کی بیوی کو پیغام بھیجا کہ تیرے شوہر نے جحوتی کو قتل کر دیا ہے اور مالِ غنیمت کے پانسو بورے لے کر واپس آ رہا ہے۔ چنانچہ بیوی نے شہر کے دروازے کھول

---

[۱] تل النبی مند جو جھیل حمص کے جنوب میں ہے۔

[۲] بریسٹڈ Breasted کی کتاب Ancient Records جلد دوم

دیے۔ پانسو بورے اندر پہنچے تو ان میں سے مصری سپاہی نکلے۔ انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں محافظ سپاہیوں پر قابو پالیا۔ جھوتی نے فرعون کے پاس مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے کارنامے کی روئداد بھیجی:

"اے بادشاہ خوش ہو آپ کے اچھے باپ آمون نے یافا کے دشمن اور اس کی قوم اور شہر کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ اپنے خادموں کو بھیجیے، وہ قیدیوں کو بھی لے جائیں تاکہ آپ کے باپ آمون راع کا گھر لونڈیوں اور غلاموں سے بھر جائے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرے قدموں میں لوٹتے رہیں گے۔ آمون راع تمام دیوتاؤں کا بادشاہ ہے۔[۱]"

تحوتمس نے اپنی فتوحات تھیبس (طیبہ) کے ایک مندر کی دیوی پر کندہ کرائی تھیں۔ ان میں ان تمام شہروں کے نام درج تھے جو اس کے ہاتھوں فتح ہوئے۔ ساتھ ہی مال غنیمت کی تفصیل دی گئی تھی۔ یعنی ہاتھی دانت، آبنوس، جواہرات، چاندی، ہیرے، یاقوت، خردبا کی لکڑی جس پر سنہری کام تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شام میں اس وقت دولت کی ریل پیل تھی اور باشندے تہذیب کے اعلیٰ پیمانے پر پہنچے ہوئے تھے۔ خیال یہ ہے کہ ساحلی علاقے میں گھنی آبادی ہوگی۔ مصری پروہتوں نے ایک قصیدہ تحوتمس کی فتوحات کے متعلق لکھا تھا۔ اس میں فرعون کے آسمانی محافظ کی زبان سے مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے:

"تو نہارین کے بڑے بند کے پانیوں سے گزر گیا۔
اس فتح و قوت کے زور میں، جو میں نے تجھے عطا کی۔
وہ تیرا نعرۂ جنگ سنتے ہیں اور اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔
میں ان کے نتھنوں سے زندگی کا سانس چھین لیتا ہوں۔
میں نے تیری عظمت و شوکت کے ہراس سے ان کے دل لبریز کر دیے ہیں۔
. . . .
میں اس لیے آیا کہ تیرے پاؤں کے نیچے شاہی کے سردار کچلے جائیں۔
میں نے پوری سرزمین میں انھیں تیرے پاؤں کے نیچے ڈال دیا۔"

فتح و تسخیر کے بعد شام کے سلسلے میں تحوتمس نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ چھوٹے چھوٹے مقامی سرداروں کے بیٹوں کو وہ مصر لے گیا تاکہ انھیں مصر کے ساتھ دوستی کی تعلیم دے، پھر انھیں تدریجاً واپس بھیج کر پرانے سرداروں کی جگہ حکمران بنا دے، اس لئے کہ پرانے سرداروں کے دل عداوت سے پاک نہیں ہوئے تھے، لیکن اس طرح بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اہل شام مصری لشکروں کی مخالفت کا سلسلہ مستقل جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب دشمن فوج لے کر آپہنچتا تو وہ چپ چاپ گردنیں جھکا دیتے اور خراج پیش کر دیتے۔ لیکن جب مصری لشکر واپس چلے جاتے تو تحائف کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ مجدّو سے نصف صدی بعد تک مصری فوجوں کو بارہا شام آنا پڑا۔ ان کی آمد کی ایک غرض یہ ہوتی

---

[۱] بریسٹڈ کی کتاب Ancient Records جلد دوم

تھی کہ باغی عناصر کی سرکوبی کریں۔ ایک غرض یہ بھی ہوتی تھی کہ ٹیکس باقاعدہ شاہی خزانے میں پہنچتے رہیں۔ اگر کوئی ایسا فرعون مسند نشین ہو جاتا جو پیش رَو کے مقابلے میں کمزور ہوتا تو یہ امر نئی سرکشی کا موجب بن جاتا۔ بار بار کی حقوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک اقتصادی لحاظ سے بہت محتاج ہو گیا اور فوجی لحاظ سے اس قابل نہ رہا کہ شمالی جانب سے جو قوتیں بروئے کار آ رہی تھیں، ان کا مقابلہ کر سکتا۔

مصری اقتدار کا زوال

یہ صورت حال تھی جب آمن حوتپ چہارم، یعنی اخناتون (۱۳۷۵ ق م۔ ۱۳۵۸ ق، م) تخت نشین ہُوا۔ یہ زمانۂ قدیم کی حد درجہ جاذب شخصیت ہے۔ نئے فرعون کی دل چسپی کا مرکز سلطنت کے معاملات نہیں تھے، بلکہ مذہب تھا۔ اس سلسلے میں اس پر خاص اثر ملکہ نفریتتی[۱] نے ڈالا، جو حسین و جمیل بھی تھی اور ذہنی اعتبار سے بھی خاص صلاحیتوں کی مالک تھی۔ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اصلاً شامی تھی۔ تل العمارنہ سے جو خط و کتابت برآمد ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اخناتون کی موت سے پیشتر فلسطین مصر کے ہاتھ سے کاملاً نکل چکا تھا۔ اور انیسویں حکمران خاندان کے فرعون سیتی اوّل[۲] (۱۳۱۳ ق، م۔ ۱۲۹۲ ق م) کی حکومت کے پہلے سال تک آزاد رہا۔ اس خاندان کے فرعون رعمسیس[۳] ثانی (۱۲۹۲ ق، م۔ ۱۲۲۵ ق، م) نے اسی جنگی رُوح کا اظہار کیا جو اس کے پیش رَو کی خصوصیت تھی۔ اس کی ابتدائی فتوحات بیروت تک رہیں۔ بیروت سے چند میل شمال میں نہر الکلب[۴] کے دہانے پر پہاڑ سمندر میں ذرا آگے نکل گیا ہے۔ یہاں رعمسیس نے پتھر پر تین کتبے کندہ کرائے، جو اب اتنے فرسودہ ہو چکے ہیں کہ بالکل پڑھے نہیں جا سکتے۔ اس وقت سے اس چٹان پر کتبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ہمارے زمانے تک باقی رہا۔ ۱۹۴۲ء میں اتحادیوں (برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس وغیرہ) نے ایک تحریر کندہ کرائی اور ۱۹۴۶ء میں لبنانیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس طرح یہ چٹان کتبات کا زبردست عجائب گھر بن گئی ہے۔ ان میں سے چھ آشوری کتبے پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ بادشاہ السرحدون[۶] (۶۷۱ ق، م) کے ہیں۔ ان کے بعد بخت نصر شاہ بابل کا کتبہ ہے۔ ایک یونانی کتبہ ہے، متعدد لاطینی کتبے ہیں جو کیرا کلا کے ہیں۔ ایک کتبہ عربی ہے۔ فرانسیسیوں نے ایک مصری کتبے کو مٹا کر اس کی جگہ لبنان پر اپنے قبضے (۱۸۶۰-۶۱ء) کا کتبہ کندہ کرا دیا۔ ایک فرانسیسی کتبہ جنرل غورو[۷] نے جنرل ایلن بی[۸] کے انگریزی کتبے کے برابر کندہ کرا دیا تھا۔

بیسویں شاہی خاندان کے پورے دَور میں مصر کا تسلط زوال پذیر رہا۔ اس دَور کے آخر میں ہمیں واضح صورت حال نظر آتی ہے۔ یہ ایک روئداد ہے جو فرعون کے سفیر ون آمون[۹] نے ۱۱۰۰ ق، م کے قریب دربار میں بھیجی تھی۔ فرعون نے ون آمون

---

[۱] Nefertiti اس کے بالائی حصے کا مجسمہ ماضیٔ قریب تک برلین کے عجائب خانے میں تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ملکہ کی نہایت عمدہ تمثال ہے۔ [۲] Seti [۳] Ramses [۴] کہتے ہیں یہاں کتے کی تمثال تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب دشمن آتا تو یہ اس زور سے بھونکتا کہ سب سن لیتے۔ بت شکن مسلمانوں نے اس تمثال کو دریا میں پھینک دیا۔ ۱۹۴۲ء میں آسٹریلیا والوں نے اسے نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ کتا نہیں بھیڑیا تھا۔ اب بیروت میں ہے۔ [۵] لبنانیوں نے غیر ملکی فوجوں، خصوصاً فرانسیسی فوجوں کے نکل جانے پر کتبہ کندہ کرایا۔

[۶] Esarhaddon [۷] Gourand [۸] Allenby [۹] Wenamon

کو اس بیے شام بھیجا تھا کہ آمون کی مقدس کشتی کے لئے لکڑی لے آئے۔ جُبلہ کے امیر نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا۔ اگر یہ واقعہ درست ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر کے نمائندے شامی حکمرانوں کے نزدیک عزت کے مستحق نہیں رہے تھے۔ ون آمون اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں انیس دن جبلہ کی بندرگاہ میں ٹھہرا رہا۔ ہر روز میرے پاس بادشاہ کی طرف سے پیغام آتا، خبردار! میری بندرگاہ میں نہ آنا۔

غرض ون آمون کو جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس سے وہ مایوس ہوگیا، بلکہ اسے اپنی جان کے لئے خطرہ محسوس ہوا اور وہ مقامی حکمران ذکر بعل[1] کے سامنے عاجز اور بے دست و پا رہا۔ وہ ساحل پر بیٹھ کر اپنی قسمت کو روتا رہتا۔ اس کے پاس چاندی اور سونا یقیناً تھا، لیکن اعتماد کے کاغذ نہ تھے۔ ایک موقع پر حکمران نے ایک مصری مغنیہ کو دل بہلاوے کے لئے اس کے پاس بھیج دیا۔ آخر ذکر بعل کے دل میں رحم کی لہر اٹھی۔ ایک روز وہ صبح کے وقت عبادت کی رسمیں ادا کر کے معبد سے واپس آیا اور اپنے بالائی ایوان میں کھڑکی کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ نیچے سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، اس وقت زرد رُو اور مضطرب مصری سفیر کو باریابی کا شرف عطا کیا۔ ملاقات کے دوران میں حکمران نے صاف صاف کہہ دیا کہ نہ تو میں تمہارا نوکر ہوں، اور نہ اس کا نوکر ہوں جس نے تمہیں بھیجا ہے۔ میں اگر لبنان کے پہاڑوں کو پکاروں تو آسمان کے دروازے کُھل جائیں گے اور لکڑیاں یہاں سمندر کے کنارے آگریں گی۔

بہر حال ذکر بعل نے مصر کی تہذیبی برتری کا اعتراف کیا لیکن اپنے ملک پر مصر کی سیاسی برتری کے خیال کا مذاق اڑایا۔ پھر زیادہ روپیہ لے کر لکڑی دے دی۔ اس وقت شام کو مصر کا سرحدی صوبہ سمجھا جاتا تھا لیکن بارھویں صدی میں یہ مصر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت تک حتیوں نے شمال میں، آرامیوں نے شام کے اندرونی حصوں میں، عبرانیوں نے جنوبی شام میں اور فلسطینیوں نے جنوبی ساحل پر قدم جما لیے تھے۔

جب شام مصری سلطنت میں شامل تھا تو اس وقت بھی مصریوں کا مدعا محض یہ تھا کہ امن و نظم قائم رہے، ملک کی شاہراہیں قبضے سے نہ نکلیں اور خراج وصول ہوتا رہے۔ پہلے دو مقصدوں کے لئے جا بجا فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں، تیسرے مقصد کے لئے انتظامی افسروں کی ایک محدود تعداد مقرر ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے شہروں کے مصری افسروں کے انسپکٹر (ناظر) مقرر کر دیے تھے تاکہ وہ دورے کرتے رہیں۔ جنوبی شام میں فرعون کے اعلیٰ نمائندے کا مرکز غزہ تھا۔ اس کے ماتحت ٹیکس جمع کرنے کے لئے انسپکٹر مقرر تھے اور جن شہروں میں فوجی چوکیاں تھیں ان کا انتظام خاص افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ داخلی نظم و نسق مقامی سرداروں کے حوالے تھا۔ وہی اپنی اپنی فوج سنبھالے رکھنے کے ذمہ دار تھے۔

شام پر مصر کا اثر

بلاشبہ مصری تہذیب کا اثر شام پر پڑا لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ معکوس تحریک کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ شام کا اثر مصر کی نہایت مقدس کہانی میں بھی نمایاں ہے۔ یعنی اوزیرس کی مصیبتوں کی کہانی میں، جس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور جبیل میں اثل کے درخت کے نیچے اسے دفن کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کٹے ہوئے اعضا مصر میں دفن کیے گئے تھے۔ خیال یہ ہے کہ اوزیرس کی عبادت کا پورا سلسلہ ابتدائی دور میں شام کے ساحل سے اخذ کیا گیا تھا۔ کنعان کا ایک دیوتا حوردان تھا جو بنہ[2] کا سب سے

---

[1] Zakar-Baal [2] یہ موجودہ وہ بنہ ہے اشدد سے نو میل شمال میں ہے۔ حوردان غالباً وہ مقام ہے جسے ابل کہتے ہیں۔

بڑا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس دیوتا کو آمن حوتب دوم (۱۴۵۰ ق،م - ۱۴۲۵ ق،م) کے عہدِ حکومت میں مصری معبد کے اندر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا نام حورمحب میں منعکس ہے۔ جو انیسویں حکمران خاندان کا بانی تھا (۱۳۵۰ ق،م) رعمسیس ثانی کے ایک بیٹے کا نام میری استردت (محبوب عشتاروت) تھا۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ تیرھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں مصر کے اندر عشتارت کی پوجا شروع ہو چکی تھی۔ نوکراتس بھی ابتدا میں ایک فونیقی نوآبادی تھا۔ وہاں ۶۸۸ ق،م میں افرودیت عشتاروت کے لئے ایک مندر بنا تھا۔ ہیراکلس بھی جس کے لئے کانوپس[51] میں ایک معبد مخصوص ہوا تھا، ایک فونیقی نوآبادی ہی تھا۔ اور یہ یقیناً فونیقی ملقارت تھا۔

شامی لڑکیوں کو مصر میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی لیکن مصری لڑکیوں کو شام میں یہ درجہ نصیب نہ تھا جب مصری سلطنت کمال عروج پر پہنچی ہوئی تھی تو شامی لڑکیاں یرغمال کے طور پر یا لونڈیوں کی حیثیت میں یا بیویوں کی حیثیت میں بکثرت حاصل کی جاتی تھیں۔ اس وجہ سے بالائی طبقے کے چہروں کی حیثیت میں نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ امیروں اور بادشاہوں کے حرم میں عموماً میتانی، حتی اور فونیقی شہزادیاں شامل ہوتیں۔ ذرا تحوتمس چہارم کی تصویر پر ایک نظر ڈالیے، اس کے خط و خال بڑے تیکھے ہیں۔ اس کے برعکس تحوتمس اوّل کو دیکھیے، اس کا جبڑا بھاری اور ناک چھوٹی ہے۔

غیر ملکی بیویوں کے ساتھ غیر ملکی مذہبی اور دنیوی خیالات بھی پہنچ گئے۔ بادشاہی مقبروں میں صنوبر کی لکڑیوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ مصر کے پہلے شاہی خاندان کے مقبروں کی تعمیر میں جو شہتیر استعمال ہوئے، وہ بھی بظاہر شام ہی سے آئے تھے۔ مصر کے بعض باقیات سے ثابت ہوتا ہے کہ نئی سلطنت کے زمانے میں شامی جنسیں بکثرت پیدا ہوتی تھیں۔ شامی کاریگر بڑی قیمتی اور عمدہ چیزیں بناتے تھے مثلاً مزین ہتھیار، منقش اور زردوزی کپڑے، نازک گلدستے، عمدہ فرنیچر، ایسی گاڑیاں جن پر سونے اور چاندی کا کام ہوتا۔ شام میں جو لوگ تزئینات کے ماہر تھے، انھوں نے کنول، پاپیروس (نرسل کی قسم کا ایک پھول والا پودا) اور شوکتہ الیہود (ایک پودا جو آرائش میں کام آتا تھا) مصریوں سے لیے، لیکن خود بھی گل داؤدی، گل سوسن اور خطمی کو آرائش کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نیز وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے معدنیات کے برتنوں میں مصنوعی پھول بنانے کا سلسلہ جاری کیا[52]۔ صنوبر کا گوند، عام گوند، شہد اور تیل باہر بھیجنے کے لیے شامی تاجر مٹی کے ایسے برتن استعمال کرتے تھے جو نیچے سے نوکدار ہوتے تھے، مصر اور جبیلہ میں جو کھدائی ہوئی اس میں ایسے برتنوں کے بہت سے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں۔ ابیدوس[53] میں فراعنہ کی جو قبریں ہیں، ان میں سے مٹی کے ایسے کوزے ملے ہیں جن پر چمک پیدا کرنے والا روغن پھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ شمالی شام سے منگوائے گئے ہوں گے۔ چمک اور جلا پیدا کرنے والے روغن کا فن شمالی شام سے مینوسی عہد کے بعد کریٹ میں پہنچا۔ مصریوں میں بہت جلد ایسی

---

۵۱ Kanopus ۵۲ پیٹر مونتت Montet کی فرانسیسی کتاب ص ۱۷۹۔

۵۳ Abydos ۵۴ مثلاً آبنوس یونانی زبان سے آیا۔ انگریزی میں اس نے Ebony کی شکل اختیار کی۔ "داحہ" بہ معنی نخلستان اور "نحس" قبطی سے آگئے۔ آخری لفظ ایک ایسے لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی نوبی یعنی سیاہ رنگ کا لے کے ہیں اسی سے عبرانی لفظ منحاس نکلا ہے "طوب" بھی قبطی سے آیا ہے۔ طوب پہلے ہسپانیہ وہاں سے انگریزی میں منتقل ہو کر اس نے Adobe کا لباس پہنا اینٹیں پکانے کا فن مصریوں نے خود ایجاد کیا تھا اور اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

فنی اور خوبصورت چیزوں کے لئے خاص ذوق پیدا ہو گیا جو جنگوں کے سلسلے میں یا سیاحت و تجارت کے سلسلے میں باہر سے اُنھیں ملیں، چنانچہ مصری کاریگروں نے ان کی نقالی شروع کر دی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کو مصر میں فنون لطیفہ کی نشأۃ ثانیہ کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں فونیقی فنون سے مزید استفادہ کیا گیا۔ ایک صدی بھی نہیں گزری کہ فونیقی فنون اپنی اصلیت کھو بیٹھے اور یونانی فنون بازی لے گئے۔

مشہور ساز عود سب سے پہلے تحوتمس ثالث کی فتوحات کے بعد نمودار ہوا، اس میں جو بھاری پھندنے ہوتے تھے ان کی وضع قطع شامی تھی۔ ستار کو بارھویں شاہی خاندان کے سامی بدو مصر لے گئے۔ اٹھارھویں شاہی خاندان کے زمانے میں سیسہ مصر کے اندر عام ہو گیا تھا۔ یہ غالباً شام ہی سے آتا تھا۔

مصری حکمرانی کی چار صدیاں زمانہ قدیم میں شام پر مصری رنگ نہ چڑھا سکیں۔ جس طرح دورِ حاضر میں چار صدیوں کی ترکی حکومت مصر پر ترکیب کا رنگ نہ چڑھا سکی۔ مصری زبان وافکار نے شام کے باشندوں پر کوئی اثر نہ ڈالا بلاشبہ چند مصری الفاظ عربی زبان میں نظر آتے ہیں، لیکن ان میں سے زیادہ تر الفاظ بعد میں یونانی قبطی زبانوں میں سے آئے[۵۱]۔ فونیقی زمانے میں بھی اور موجودہ زمانے میں بھی بہت سے شامی ترکِ وطن کر کے وادیٔ نیل میں جا بسے، لیکن مصریوں کی تھوڑی ہی سی تعداد بھی مصر چھوڑ کر شام نہ آئی۔ مصر کی آب و ہوا ایسی ہے کہ وہاں کے باشندے کسی دوسری سرزمین میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے خصوصاً موسم سرما کی بارش اور سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے خاص صلاحیت درکار ہے۔ شاید اسی بنا پر مثل بن گئی ہے کہ ایک دفعہ نیل کا پانی پی لو تو پھر ہمیشہ اسی پانی کی آرزو رہے گی۔

دوآبۂ دجلہ وفرات سے تعلقات: سمیر

شام پر مصر کا سیاسی تسلط دوآبۂ دجلہ وفرات[۵۲] کے تسلط سے بہت زیادہ دیر تک قائم رہا۔ لیکن مؤخر الذکر کے حضارتی و تہذیبی اثرات مصر سے کہیں زیادہ تھے۔ قومی، لسانی اور جغرافیائی اعتبار سے شامیوں کو مصریوں کے مقابلے میں آشوریوں اور بابلیوں سے زیادہ قرب تھا۔

مسیح سے پیشتر تیسرے ہزار سال کی پوری مدت میں سمیری مغربی ایشیا کے اندر تہذیب وحضارت کے سب سے بڑے نمائندے رہے۔ یہ ایک غیر سامی گروہ تھا جس سے دریائے فرات کی تہذیب کا آغاز ہوا۔ انھوں نے سماری رسم الخط ایجاد کیا۔ خاص مذہبی اور روحانی تصورات پیدا کیے اور ادبیات کو نشو و فروغ دیا۔ یہ تمام چیزیں ان کے آشوری اور بابلی جانشینوں کے ذریعے

---

[۵۱] مثلاً آبنوس یونانی زبان سے آیا۔ انگریزی میں اس نے Ebony کی شکل اختیار کی "واحہ" بہ معنی نخلستان اور "نحس" قبطی سے آئے۔ آخری لفظ ایک ایسے لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی نوبی، یعنی سیاہ رنگ یا کالے کے ہیں۔ اس سے عبرانی لفظ لحناس نکلا ہے۔ "طوب" بھی قبطی سے آیا ہے۔ طوب پہلے ہسپانیہ پہنچا وہاں سے انگریزی میں منتقل ہو کر اس نے Adobe کا لباس پہنا۔ اینٹیں پکانے کا فن مصریوں نے خود ایجاد کیا تھا اور اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

[۵۲] دوآبہ Mesopotamia کا ترجمہ ہے، لیکن یہ نام دجلہ وفرات کی درمیانی سرزمین کے صرف شمالی حصے کے لئے محدود رہنا چاہیئے۔ اسی حصے کا نام رومیوں نے میسوپوٹیمیا رکھا تھا اور عرب اسے "الجزیرہ" کہتے تھے۔ جنوبی حصے یعنی بابل کو عرب "العراق" کہتے تھے۔ مگر آج کل سرسری طور پر پورے دوآبے (جس میں شمالی اور جنوبی حصے شامل ہیں) کو دوآبہ کہتے ہیں۔

سے شام کی میراث کا ایک جزو بن گئیں اور اس میراث میں اسرائیل بھی شریک ہیں۔ مسماری رسم الخط میں بابلی زبان پورے مغربی ایشیا میں سیاسی و تجارتی مفاد خدمات کا بین الاقوامی ذریعہ بن گئی اور سمیریوں میں اپنے دیوتاؤں کے متعلق جو کہانیاں مشہور تھیں، وہ شام کی یہودی اور مسیحی ادبیات میں شامل ہو گئیں۔ ان میں تخلیق اور طوفان کی داستانیں بھی شامل ہیں۔ جن لوگوں نے عہد نامۂ قدیم مرتب کیا، ان کے ذریعے سے بعض کہانیوں نے انسان کی نہایت خوبصورت اور حسین و جمیل ادبی تخلیقات کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہی زمانہ ہے جس میں نہ صرف سمیری بلکہ بہت سے اکادی[1] لفظ بھی مستعار لیے گئے[2]۔

دوآبہ دجلہ و فرات کی زمین کو شام کے تعلق میں عقبی یا اندرونی زمین کی حیثیت حاصل تھی۔ خصوصاً حلب کا علاقہ تجارتی راستے کا کام دیتا تھا۔ جہاں سے سلیشیا کی دھاتیں دریائی سلطنت (دوآبہ) میں پہنچتی تھیں۔ "اور" کے شاہی مقبروں (۲۵۰۰ ق۔م) سے سونا اور چاندی ملا ہے۔ وہ اسی راستے وہاں پہنچا ہوگا۔ لاغاش کا سمیری امیر، جودیہ سلیشیا سے سونے کے علاوہ امانوس سے دیودار بھی منگواتا تھا۔ دوآبے کے تاجروں کی جماعتیں عمدہ لکڑی کی تلاش میں اس سے بھی پیشتر شمالی شام کے کوہستانی جنگلوں میں پہنچ گئی تھیں۔

بابل

بہت سے اہلِ علم اب اس واقعے کو شبہے کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسیح سے پیشتر تیسرے ہزار سال کے نصف ثانی میں شمالی شام حکومتِ بابل کے ماتحت تھا۔ سرجون اول (۲۳۶۰ ق۔م کے حوالی میں) سامی تاریخ کی پہلی عظیم الشان شخصیت ہے جس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس نے اپنے اسلحہ سمندر کے پانی میں دھوئے۔ وہ دیودار کے پہاڑوں پر بھی تسلط کا مدعی تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ لبنان کے نہیں بلکہ امانوس کے پہاڑ تھے۔ اس نے ایک چھاپا شمالی شام پر بھی مارا۔ اس کا چوتھا جانشین نارام سین (۲۲۳۰ ق۔م کے حوالی میں) دیودار کے جنگلوں پر تسلط کا دعویدار تھا۔ لیکن اس کے دعوے کی بنا بھی یا تو امانوس کے دیودار ہوں گے یا ان پہاڑوں کے دیودار جو آشوریہ کے مشرق میں واقع ہیں۔ مشرقی علاقوں سے سیاسی اور فوجی دباؤ اس وقت تک کوئی خاص حیثیت حاصل نہ کر سکا، جب تک حتیوں کی طاقت مٹ نہ گئی۔ اور آشوریوں کا ستارہ عروج پر نہ آگیا۔ اس وقت سے دوآبہ دجلہ و فرات کے حکمرانوں کا یہ عام شیوہ ہو گیا کہ مغربی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سمندر تک پہنچ جاتے تاکہ بحیرۂ روم کے تجارتی راستوں کے منتہا پر قابض ہو جائیں۔

---

[1] یہ بابل و آشوریہ کی مشرقی سامی بولی ہے جو Agade (بابل کے شمال میں) سے منسوب ہوئی۔ بائیبل میں اسے اکادی کہا گیا (پیدائش باب ۱۰۔ آیت ۱۰)۔

[2] مثلاً "ہیکلو" کی اصل سمیری لفظ E-gal ہے جس کے معنی ہیں "بڑا گھر"، اور یہ کنعان پہنچ کر ہیکل بنا۔ Kissa'u سمیری لفظ تھا اکادی کے ذریعے سے آیا اور "کرسی" بن گیا۔ نباتات و معدنیات کے بہت سے الفاظ کی اصل آشوری بابلی ہے۔ یہ فونیقیہ اور یونان کے راستے اجنبی زبانوں میں منتقل ہوا ہے۔ مثلاً Carob (خروبہ) Cassia (قثاء ہندی) Chicory (ہندبا) Crocus (الکرکم) Hyssop (الجص) جبسم (حشیشۃ الزوفا) Jasper (یشب) Mandrake (اللفاح) Naphtha (نفط) Nard (ناردین) Saffron (زعفران) Sesame (السمسم) عربی میں تجار برصغی کو کہتے ہیں۔ یہ سمیری اکادی لفظ Naggaru سے نکلا ہے۔ لوح بمعنی تختی اکادی Li'u ہے۔

آشوریہ

آشوریہ نے پہلے پہل تغلاتِ پلسر اوّل کے ماتحت عظیم الشان سلطنت کے راستے پر قدم رکھا، جو کسی حد تک قبل از وقت تھا۔ تغلاتِ پلسر نے ۱۰۹۴ ق،م میں شام پر حملہ کیا اور اپنے آپ کو پورے امورو کا فاتح قرار دیا۔ وہ جبل البنان سے گزر کر حتیوں کی زمین میں پہنچ گیا اور اعلان کیا کہ حتیوں کے جانشین کی حیثیت میں شام کا مالک میں ہوں، نیز جُبلہ، اروَدس (ارداد) صیدا اور دوسرے فونیقی شہروں کو میری اطاعت قبول کر لینی چاہیے۔ جُبلہ غالباً اس وقت تک نوکریبل کے ماتحت تھا۔ حملہ آور بادشاہ نے بڑے بڑے دیودار کٹوائے اور اپنے دیوتاؤں کا مندر بنانے کی غرض سے انھیں آشوریہ بھیج دیا۔ وہ "امورد کے بڑے سمندر" میں سے گزرتا ہوا سیمیرا پہنچا۔ راستے میں اس نے بحری گھوڑے اور ڈالفن کا شکار کیا۔ دوآبۂ دجلہ و فرات کے متعدد حکمرانوں نے لبنان میں جنگلی بیل مارے۔

تغلاتِ پلسر نے دریائے فرات کے پار جتنا علاقہ فتح کیا تھا، اس پر بہت جلد آرامی حملہ آور قابض ہو گئے۔ چنانچہ اس کے جانشینوں میں سے آشور ناصر پال (۸۸۴ ق،م - ۸۵۹ ق،م) کو یہ علاقہ دوبارہ فتح کرنا پڑا۔ جو راستہ تغلاتِ پلسر اور دوسرے بادشاہوں نے اختیار کیا تھا وہی راستہ آشور ناصر پال نے شمالی شام پر حملے کے لئے اختیار کیا۔ پھر وہ جنوب کی طرف مڑ گیا اور دریائے عاصی کو عبور کر کے لبنان میں داخل ہو گیا۔ اسی طرح کسی بڑی مزاحمت کے بغیر سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ یہیں فونیقی شہروں نے عارضی طور پر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ دوآبۂ دجلہ و فرات سے شام پر یہ پہلا بڑا حملہ تھا اور اس کی حیثیت تحوتمس ثالث فرعونِ مصر کے اس حملے کی سی تھی جو سو سال بیشتر شام پر ہوا تھا۔ آشور ناصر پال اور اس کے بیٹے اور جانشین شلم ناصر ثالث (۸۵۹ ق،م - ۸۲۴ ق،م) نے وہ فوجی تنظیم مکمل کی، جس کی وجہ سے ان کا وطن مغربی ایشیا کا مالک بن گیا۔

شلم ناصر کو ۸۵۳ ق،م میں قرقر کے میدان میں جو وادیٔ عاصی کے [illegible] واقع ہے، شام کی متحدہ ریاستوں سے جنگ پیش آئی۔ اس متحدہ قوت کا رئیس دمشق کا آرامی بادشاہ تھا۔ اسرائیل کا بادشاہ آخاب، نیز صور اور دوسری فونیقی شہری ریاستوں کے نمائندے بھی شام کی متحدہ قوت میں شامل تھے۔ شلم ناصر نے اس متحدہ قوت کو شکست فاش دی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتح فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ شلم ناصر اپنے کتبات میں بار بار ذکر کرتا ہے کہ اسے شام و فلسطین کی تسخیر کے لیے مہمیں تیار کرنی پڑیں۔ ۸۴۲ ق،م میں تمام فونیقی شہروں نے کاملاً اطاعت قبول کر لی۔ اپنے اخبار نامے میں شلم ناصر اس فتح کا ذکر یوں کرتا ہے:

> "اپنے عہد حکومت کے اٹھارھویں سال میں نے دریائے فرات سولھویں مرتبہ عبور کیا۔ آرامیوں کے بادشاہ خزائیل کو اپنی بڑی فوج پر بھروسہ تھا۔ میں نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ پھر میں نے بعلی راسی کی جانب پیش قدمی کی، جو ایک پہاڑی ہے اور سمندر کے اندر چلی گئی ہے۔ میں نے اپنا مجسمہ وہاں نصب کیا۔ پھر صور اور صیدا کے لوگوں اور یاحوا ابن عمری سے خراج وصول کیا۔[1]"

---

[1] لکن بل Luckenbill کی کتاب Ancient Records جلد اوّل جس پہاڑی کی طرف اشارہ ہے، وہ غالباً کوہ کرمل ہے۔ لیکن شلم ناصر نے دریائے کلب پر بھی اپنا نشان چھوڑا تھا۔

شلم ناصر اور اس کے باپ نے شام کی تسخیر سے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی وہ معرض زوال میں آگئی۔ ایک صدی بعد تغلات پلسر ثالث[1] اور اس کے جانشین نے اس میں از سرِ نو تازہ روح پھونکی۔ ۷۴۳ ق،م سے ۷۲۷ ق،م تک تغلات پلسر نے ارفاد[2] میں اپنا جنگی مرکز قائم رکھا اور وہاں سے شام کی از سرِ نو تسخیر کے لیے مہمیں بھیجتا رہا یا خود لے جاتا رہا۔ اس کے بیٹے شلم ناصر پنجم نے فونیقیہ اور اس کے شہروں کو پامال کر ڈالا۔ جیسا کہ جوزیفس نے سامی روایات کی بنا پر بیان کیا ہے۔ صیدا، عکّہ اور صور کے اس شہر نے جو ساحل پر واقع تھا، ایکا کر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس صور کے مالی کنٹرول اور سیادت سے آزادی حاصل کر لیں، جو جزیرے میں واقع تھا۔ چنانچہ انھوں نے حملہ آوروں کی برتری قبول کر لی اور ایک بیڑا اس کے لیے تیار کر دیا۔ جس میں ساٹھ جہاز تھے اور ان میں آٹھ سو فونیقی ملّاح سوار تھے۔ جزائری صور سے شلم ناصر کے بیڑے کی لڑائی ہوئی، لیکن یہ بیڑا شکست کھا کر بکھر گیا۔ شلم ناصر نے خشکی پر اتنی فوج جمع کر رکھی تھی کہ جزیرہ صور کی ناکہ بندی کنارے کی طرف سے جاری رہی۔ جزائری شہر کے اندر میٹھے پانی کے کنوئیں موجود تھے۔ لہٰذا اہلِ شہر کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ پانچ سال کے محاصرے میں بھی شہر حوالے نہ ہوا۔ اور ۷۲۲ ق،م میں باعزت عہد نامہ ہو گیا۔ سامرہ کا محاصرہ ۷۲۴ ق،م میں شروع ہوا تھا، شلم ناصر کے جانشین سرجون ثانی کے عہد میں یہ شہر تسلیم ہوا (۷۲۲ ق،م) لیکن اس کی تفصیل کا تعلّق اسرائیلی حکومت کی کہانی سے ہے۔

صور کے بادشاہ ایلوائلی (میرا اللہ حقیقی خدا ہے) نے آشوریوں کا مقابلہ کیا تھا۔ دراصل وہ مصر کی طرف مائل تھا۔ سرجون ثانی کے عہد میں وہ ساحلی علاقے کی ایک اہم شخصیت بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے، اس نے فونیقیہ کے بڑے حصّے پر اقتدار قائم کر لیا تھا اور قبرص کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ انجام کار سرجون کے بیٹے اور جانشین سنخیرب (۷۰۵ ق،م - ۶۸۱ ق،م) نے ایلوائلی کو بھاگ کر قبرص چلے جانے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ صیدا کے بادشاہ ایت لبعل کو حکمران بنا دیا، جو آشوریوں کا حامی تھا۔ آشوری حملہ آوروں نے پہلے ایلوائلی کے گرمائی محل کو آگ لگائی، جو لبنان میں واقع تھا اور اس کے تاکستان پامال کر ڈالے، پھر اس کی فوجیں برچھیوں اور نیزوں کا سہارا لیتی ہوئی دیواروں کے نیچے سستاتی ہوئی بلند چوٹیوں پر چڑھ گئیں۔ جہاں درختوں کے جھنڈ میں ایلوائلی کا قلعہ تھا، اس کی محافظ فوج کے آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انھیں سنخیرب کی پیش گاہ میں پہنچا یا گیا۔ سنخیرب نے دریائے کلب کے کنارے ایک چٹان پر ایک نقش چھوڑا تھا، جو اب تک دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اسی طرح حملہ آور ہوا تھا جس طرح بھیڑیا ریوڑ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ سنخیرب کو خلیج فارس میں اسی لیے ہنگامہ آرائی کا موقع مل گیا کہ اسے فونیقیہ سے جہاز اور ملّاح مل گئے تھے۔

صیدا نے ۷۰۱ ق،م میں سنخیرب کی اطاعت قبول کی تھی، لیکن ۶۷۷ ق،م میں اس کے بیٹے السرحدّون کے خلاف سرکشی کی۔ اس نے صیدا کو برباد کر ڈالا۔ اس کی دیواریں سمندر میں گرا دی گئیں۔ اس کا بادشاہ عبد ملقارت سمندر میں کود پڑا، لیکن اسے نکال لیا گیا اور سر قلم کر ڈالا گیا۔ پاس ہی کار اسر حدّون نام ایک قلعہ تعمیر کر لیا گیا تاکہ شہر پر دہشت طاری رہے۔

---

[1] Tiglath -pileser III

[2] Arpad آشوری کتبوں میں اسے Arpaddu لکھا ہے۔ اس کا ذکر یسعیاہ باب ۱۰، آیت ۹، باب ۳۶ آیت ۱۹ یرمیاہ باب ۴۹، آیت ۲۳ میں بھی آیا ہے۔ یہ حلب سے تیرہ میل شمال میں ہے۔

اردوس (اروداد) کے بادشاہ یاکین ایل نے شہر حوالے کر دیا، ساتھ ہی اس کی بیٹی حوالے ہوئی۔ دوسرے فونیقی قصبے بھی بعل شاہ صور کی سرکردگی میں اسرحدون کی اطاعت قبول کر بیٹھے تھے، بعل اور اسرحدون کے درمیان ایک تختہ عہد نامہ ہو گیا، جسے شاہ صور نے اس وقت توڑا، جب سمجھ لیا کہ غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار پھینکنے کا مناسب موقع آگیا ہے۔ دریائے کلب کے کنارے رعمسیس والی سِل کے قریب ایک سِل ہے جو یہ نقشہ پیش کر رہی ہے کہ اسرحدون عظمت و جلال کے ساتھ کھڑا ہوا کتبے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جس میں ممفس (مصر)، عسقلان اور صور کی تسخیر کا ذکر ہے۔ سنجرلی (جس کا پرانا نام شمأل تھا) شمالی شام عین تاب سے مغرب میں ہے۔ وہاں ایک اور چٹان ہے، جس پر اسرحدوں کی تمثال بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک رسا لیے کھڑا ہے، جسے بعل شاہ صور اور ترحاقا شاہ مصر کی ناکوں میں پرو رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترحاقا کبھی کسی کی قید میں نہ پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تمثال کا مقصد بھی دوسری عالمی جنگ میں محوری طاقتوں کے اعلانات کی طرح محض پراپیگنڈہ تھا۔ اسرحدون اور اس کے بیٹے عاشور بنی پال (۶۶۸ ق، م – ۶۲۶ ق، م) کے عہد میں مصر فتح ہو گیا اور آشوری سلطنت، جس کا دار السلطنت نینوی تھا، اپنی وسعت کی آخری حد پر پہنچ گئی۔

کلدانی اقتدار

کلدانی یا بابلِ جدید کے حکمران اپنے آپ کو آشوری سلطنت کے جانشین کہتے تھے، لہٰذا وہ شام کی حکومت کے بھی دعویدار تھے، لیکن فونیقی شہر جس طرح پہلے آقا کے تحت سرکشی پر تُلے رہے تھے، اسی طرح نئے آقا کے ماتحت سر اٹھاتے رہے۔ اس اثنا میں مصر آشوری سلطنت کا جوا اتار چکا تھا اور اس نے شام پر تسلط جمانے کے لیے پھر جد و جہد شروع کر دی تھی۔ فونیقی شہر بابلی اقتدار کے مقابلے میں مصر کو قبول کر لینے کی طرف زیادہ مائل تھے۔

۵۸۶ ق، م میں بخت نصر خود شمالی شام پہنچ گیا اور رِبلہ[۵۱] میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ ربلہ وادیٔ عاصی میں ہے۔ وہاں سے اس نے اپنی فوج کا ایک حصہ جنوبی جانب بھیج دیا، تاکہ فونیقی شہروں کو فتح کر لیا جائے اور یہودیہ کی تسخیر مکمل کر دی جائے۔ تیرہ سال کے محاصرے کے بعد ۵۷۲ ق، م میں صور نے ہتھیار ڈال دیے[۵۲]۔ اس اثنا میں بخت نصر شام کے نشیبی علاقے مواب، عمون، اور ملک کے دوسرے حصوں میں لڑتا رہا۔ صور کی تسخیر کے ساتھ فونیقیوں کی قومی زندگی نے دم توڑ دیا، یونانی نوآبادیاں آہستہ آہستہ فونیقی نوآبادیوں کی جگہ لے چکی تھیں، اب وہ باقاعدہ فونیقیوں کی بحری سرگرمیوں کی وارث بن گئیں۔ اس طرح فونیقی دنیا ختم ہو گئی، جس نے سرگرمی، علم اور روحِ حیات میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن فونیقی افراد نے اپنا تشخص سکندر کی فتوحات تک باقی رکھا۔ نووارد آرامی یا اسرائیلی اور فلسطینی اس تشخص پر زیادہ اثر نہ ڈال سکے۔

تہذیبی تاثیر

آشوری و بابلی تہذیب سے شامیوں نے بے شمار عناصر لیے، مادی بھی، مذہبی بھی اور لسانی بھی۔ یہ عناصر انجام کار یونانیوں کے ذریعے سے مغربی یورپیوں تک پہنچا دیے۔ ہل کا ذکر پہلے آچکا ہے، جو دوآبۂ دجلہ و فرات کے لوگوں

---

۵۱ Riblah اس نام کا اب ایک گاؤں ہے۔ جو حمص سے اکیس میل جنوب میں ہے۔

۵۲ حزقی ایل باب ۲۹ آیت ۱۸۔ نیز جوزیفس۔

نے ایجاد کیا تھا اور یہ پورے مشرق قریب میں پھیل گیا۔ ہل چلانے سے مزروعہ زمین کی پیداوار بڑھ گئی اور کھیتی باڑی میں جانوروں سے کام لیا جانے لگا۔ گاڑی بھی انھیں لوگوں نے ایجاد کی تھی۔ اور یہ ایجاد بھی بطور تحفہ مشرقِ قریب کو دے دی تھی۔ اس وجہ سے سفر کے لیے باقاعدہ ایک نظام تیار ہو گیا۔ انھوں نے وقت کو برسوں میں، برس کو بارہ مہینوں میں تقسیم کیا۔ ہفتے کے سات دن مقرر کیے اور یہ تقسیم ہمارے عہد تک برابر چلی آرہی ہے۔ ہفتے کے پہلے دن کا نام انھوں نے یوم شمس[۵۱] (اتوار) رکھا۔ اس لیے کہ یہ دن سورج کی پوجا کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے دن کا نام یوم قمر[۵۲] (پیر یا دوشنبہ) مقرر ہوا، اس لیے کہ اس روز چاند کی پوجا ہوتی تھی۔ ہفتے کا آخری دن، یعنی ہفتہ یا شنبہ یا سبت ستارہ زحل[۵۳] سے منسوب تھا۔ ہم (مسیحی) ایسٹر (فصح) میں عید مناتے ہیں، اس عہد کا انحصار انھیں قدیم لوگوں کی تیار کی ہوئی قمری تقویم پر ہے۔ وقت کی تقسیم کے ساتھ ان لوگوں نے سایہ ناپنے کے طریقے اور شمسی گھڑیاں یونانیوں تک پہنچائیں، تاکہ وہ وقت کا حساب لگا سکیں اور ایک ایسا فارمولا بھی تجویز کر دیا، جس سے گہن کے متعلق پیش گوئی کی جا سکے۔ ہمارے منطقہ بروج کی بارہ علامتیں قریباً وہی ہیں جو آشوریوں کی تھیں۔ آج کل جو پیمانے اور وزن رائج ہیں ان میں بیشتر بابلیوں کے ذریعے سے شامیوں کے پاس پہنچے تھے۔

ہکسوس

شام میں مصریوں کے ابتدائی تسلّط میں اس وجہ سے خلل پیدا ہو گیا کہ اٹھارھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں جنگجو اور پُراسرار لوگوں کا ایک گروہ برسرِ اقتدار آگیا۔ جنھیں ہکسوس کہتے ہیں۔ یہ پہلے شام پر مسلّط تھے، پھر مصر کے مالک بن گئے۔ ہکسوس نام اصلاً مصری ہے، یعنی ہیکو شوسویت[۵۴]، جس کے معنی ہیں اجنبی سرزمینوں کے حکمران۔ مصر کے مشہور مؤرخ مانیتو[۵۵] نے سب سے پہلے یہ نام استعمال کیا۔ وہ اس کے معنی ''چرواہے بادشاہ'' بتاتا ہے۔ پہلے یہ لقب بادشاہوں نے اختیار کیا تھا، پھر یہ پوری قوم کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ابتدا میں یہ لوگ ملغوبہ تھے۔ کہنا چاہیے کہ یہ انسانیت کا ایک ایسا محلول تھے، جس میں جنس وار تقسیم قطعاً نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ محلول مشرقی بحیرۂ روم کی لگن میں جوش کھا رہا تھا، پھر اسے کنارے پر پھینک دیا گیا اور وہاں سے یہ مصر پہنچ گیا۔ غرض ہکسوس ایک قوم نہ تھے، ایک تحریک تھے، جس میں سامیوں کے علاوہ غیر سامی یعنی حوری، حتّی اور متیانی بھی شامل تھے، بلکہ خابیرو کی ایک جماعت بھی ان میں شریک ہو گئی تھی۔ ممکن ہے، اس تحریک کا تعلق شمالی جانب ہندی ایرانی یا ہندی یورپیوں سے ہو، جن میں دوآبہ دجلہ و فرات کے کاشی بھی داخل تھے، البتہ ان میں منقسم اور نمایاں عنصر کنعانیوں یا اموریوں کا تھا، جیسا کہ ان کے ابتدائی بادشاہوں کے نام سے واضح ہوتا ہے، جو یادگاروں یا جواہرات پر کندہ ہیں۔ یہی تحریک تھی جو حتّیوں، حوریوں اور غالباً فرزیوں، یبوسیوں اور دوسرے غیر سامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جنوب میں فلسطین تک لے آئی۔ ان لوگوں کے ہیکلوں کے متعلق جو تھوڑی بہت شہادت ملی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بحیرۂ روم کے لوگوں کا ایک ابتدائی نمونہ ایک حد تک آپس سے ملے جلے نمونے سے بدل گیا تھا[۵۶]۔

---

[۵۱] Sunday [۵۲] Monday [۵۳] زحل کو انگریزی میں Saturn کہتے ہیں۔ اسی سے Saturday بنا ہے یعنی یوم زحل [۵۴] Henu Shoswet [۵۵] Manetho [۵۶] Engberg انگ برگ کی کتاب

ہندی یورپی گروہ سے ہکسوس کے تعلق کی ایک تصدیق یوں ہوتی ہے کہ ہکسوس نے گھوڑے استعمال کیے، جو اس وقت بڑی قیمتی متاع سمجھے جاتے تھے اور کاشی بھی اس میں شریک تھے۔ انھیں کی وجہ سے گھوڑے پہلے شام، پھر مصر پہنچے، ان کے علاوہ ہکسوس نے جنگی رتھوں کو بھی دونوں ملکوں میں رواج دیا۔[51] گھوڑے پر سواری نہیں کی جاتی تھی بلکہ گھوڑے جنگی رتھوں میں جوتے جاتے تھے۔ اس کے ظہور سے زمانۂ قدیم میں وہی کیفیت رُونما ہوئی ہوگی جو ہمارے زمانے میں ٹینکوں، زہریلی گیسوں یا ایسے ہی دوسرے خفیہ ہتھیاروں سے رُونما ہوئی۔ عام لوگ گھوڑے کی شکل ہی دیکھ کر ڈر جاتے تھے، اس لیے کہ انھوں نے یہ جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ہکسوس گھوڑے کے دفن کا خاص اہتمام کرتے تھے، یعنی اس کے لیے الگ قبر بناتے تھے یا مالک کے ساتھ دفن کرتے تھے (جیسا کہ تل العجول یا قدیم غزہ کے باقیات سے واضح ہوتا ہے) تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ بعض اوقات اسے قربانی کے لیے پیش کیا جاتا تھا اور اس کا گوشت کھایا جاتا تھا۔[52]

ہکسوس نے جن نئے ہتھیاروں کو رواج دیا، ان میں ایک خم دار فولادی تلوار اور ایک "مرکب کمان" تھی۔ یہ چیزیں پہلے پہل دوآبۂ دجلہ و فرات میں ایک اکادی خاندانِ حکومت کے ماتحت چوبیسویں صدی قبل مسیح میں نمودار ہوئی تھیں۔ ہتھیاروں میں ان کی برتری رتھ کے استعمال پر موقوف تھی، جس کی تجارت کی ایک گذرگاہ شمالی شام میں سے تھی۔ ہکسوس کے ماتحت معدنیات سے استفادہ شام و مصر میں نئی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ جواہرات، آرائش، ہاتھی دانت کے کام اور کندہ کاری و میناکاری کے فن میں نمایاں ترقی ہوئی۔ ہڈیوں پر کندہ کاری کا سلسلہ شام کے اندر سنگی دور ہی میں نمودار ہو چکا تھا۔ ہکسوس کے دَور میں میناکاری شروع ہوئی۔ ابتدا میں میناکاری کے نمونے بہت سادہ تھے، مثلاً سیدھے خط یا چھوٹے چھوٹے حلقے بنائے جاتے تھے، لیکن لکڑی کی صندوقچیوں یا فرنیچر کی دوسری چیزوں میں ہڈی یا ہاتھی دانت سے آرائشی بیل بوٹے بنانا دمشق میں اب تک فروغ پذیر ہے۔

ہکسوس نے ظروفِ گِلی کے نئے نمونے پیش کیے اور ہکسوس کا دَور ختم ہونے سے پیشتر فلسطین کے اندر ظروف سازی انتہائی کمال پر پہنچ چکی تھی۔

کنعانیوں میں شہروں کے استحکامات کے خاص نمونے رائج تھے۔ اس قسم کے استحکامات میں جنگی رتھوں کے لیے ضرورت کے مطابق محفوظ جگہیں مہیا نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا ہکسوس نے استحکامات کا نیا نمونہ رائج کیا۔ وہ عام طور پر ایک مستطیل حلقہ بنا لیتے جو قریباً آدھ میل لمبا ہوتا۔ ساتھ ساتھ بڑے بھاری بلند اور ڈھلوان دمدمے تیار کر لیتے۔ اس غرض سے بڑی عمدہ مٹی تیار کی جاتی۔ مزید حفاظت کے لیے اِردگرد ایک خندق کھود دی جاتی۔ شام میں ہکسوس کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ قطنہ میں ملتا ہے جو غالباً ہکسوس کا مرکزِ حکومت بھی تھا۔ قادش میں بھی کچھ نشان پائے جاتے ہیں۔ کرکمیش میں استحکامات کی جگہ مٹی کے انبار تو ملتے ہیں، لیکن استحکامات کا نقشہ مستطیل نہیں۔ فلسطین میں ہازور[53] اور قلعہ شکیم[54] کے نقشے مستطیل ہیں۔ لاکیش اور شاروحن[55] بھی ہکسوس ہی کے شہر تھے۔ اریحا

---

[51] رتھ یا جنگی گاڑی کے لیے مصری لفظ سامی ہے یعنی مرکبت، عربی مرکبہ۔ [52] پیٹرس Ancient Gaza جلد اوّل ص ۴۔

[53] Hazor اس کے معنی احاطے کے ہیں۔ آج کل اس مقام کو "تل القدح" کہتے ہیں اور یہ بحیرۂ طبریہ کے شمال میں ہے۔ [54] Shechem اس مقام کو آج کل البّلاطہ کہتے ہیں اور یہ موجودہ نابلس شہر سے باہر ہے۔

[55] Sharuhen

۱۶۷۵ ق،م سے ۱۶۰۰ ق،م تک ہکسوس کا ایک مستحکم مقام[۵۱] رہا۔ اس زمانے میں بیت شمس انتظامی لحاظ سے ہکسوس کے ماتحت تھا[۵۲]۔

شام اور مصر میں ہکسوس نے مقامی آبادی پر جاگیرداری کا نظام مسلّط کر دیا۔ ان کی ساری تنظیم ایک حد تک جاگیردارانہ حکومت کی تھی۔ دولت زیادہ تر امراء کے ہاتھ میں تھی۔ جو جنگی رتھوں میں بیٹھ کر لڑائیاں کرتے تھے۔ پوری تنظیم کی وضع عسکریت کی تھی۔ شام میں ان کی تہذیب اٹھارھویں اور سترھویں صدی قبل مسیح[۵۳] میں بروے کار رہی۔

ہکسوس مصر میں

شام سے ہکسوس آہستہ آہستہ مصر میں داخل ہونے لگے، جہاں ان کے ابتدائی نشانات انیسویں صدی قبل مسیح میں پائے جاتے ہیں۔ مصر پر اس وقت بارھویں شاہی خاندان کی حکومت تھی۔ لیکن وہ ۱۷۳۰ ق،م تک اقتدار حاصل نہ کر سکے۔ مانیتھو ان کے برسر اقتدار آنے پر کس تاثر سے لکھتا ہے:

> "خدائی غضب کے جھکڑ نے ہمیں آلیا، مشرق کی طرف سے ایک کم اصل گروہ آگیا
> جس کی آمد کے متعلق بالکل خیال نہ تھا۔ وہ ہمارے وطن پر حملہ آور ہوا اور زور و قوت
> کے بل پر بہ آسانی مسلّط ہو گیا۔ لڑائی تک نہ ہوئی، اس گروہ نے ہمارے حکمرانوں پر
> قابو پا لیا، ہمارے شہروں کو وحشیانہ انداز میں جلایا، ہمارے دیوتاؤں کے مندروں
> کو ڈھا دیا اور پوری ملکی آبادی کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کیا[۵۳]۔"

ہکسوس کا داخلہ مصر میں ایسی برائی نہ تھا کہ اس کا کوئی اچھا پہلو نہ ہو، مثلاً انھیں کی وجہ سے مصر میں گھوڑا اور دوسری چیزیں پہنچیں، جو مصریوں کی پرانی یادگاروں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ سائنس کے متعلق جو پہلی کتاب ہمیں ملی، وہ سترھویں صدی قبل مسیح کے مصر کی ہے اور اس زمانے میں ہکسوس وہاں حکمران تھے۔ مصر کے علم ریاضی کے متعلق ہمارے علم میں نمایاں ترین اضافہ جس کتاب سے ہوا، وہ ہکسوس کے ماتحت ۱۵۸۰ ق،م میں مرتب ہوئی تھی[۵۴]۔ ہکسوس نے اپنے دیوتا بعل کو مصریوں کے دیوتا سیت سے ملا دیا۔ اور اس طرح بعل کی عبادت بعد کے فرعونوں کے مذہب کا جزو بن گئی، خصوصاً رعمسیس کے خاندان کے بادشاہوں کی، جن کی اصل ہکسوس کی طرف راجع ہوتی ہے۔ انھوں نے بعل کے علاوہ اس کی بہن اور اس کی بیوی عنات کی پوجا بھی جاری کرائی اور اپنے ہاں کی دیوی عشتارت کو ایزیز سے ملا دیا۔ ہکسوس ہی کے دور میں اسرائیلی مصر پہنچے اور اسی دور میں حضرت یوسفؑ مصر میں برسر اقتدار آئے۔

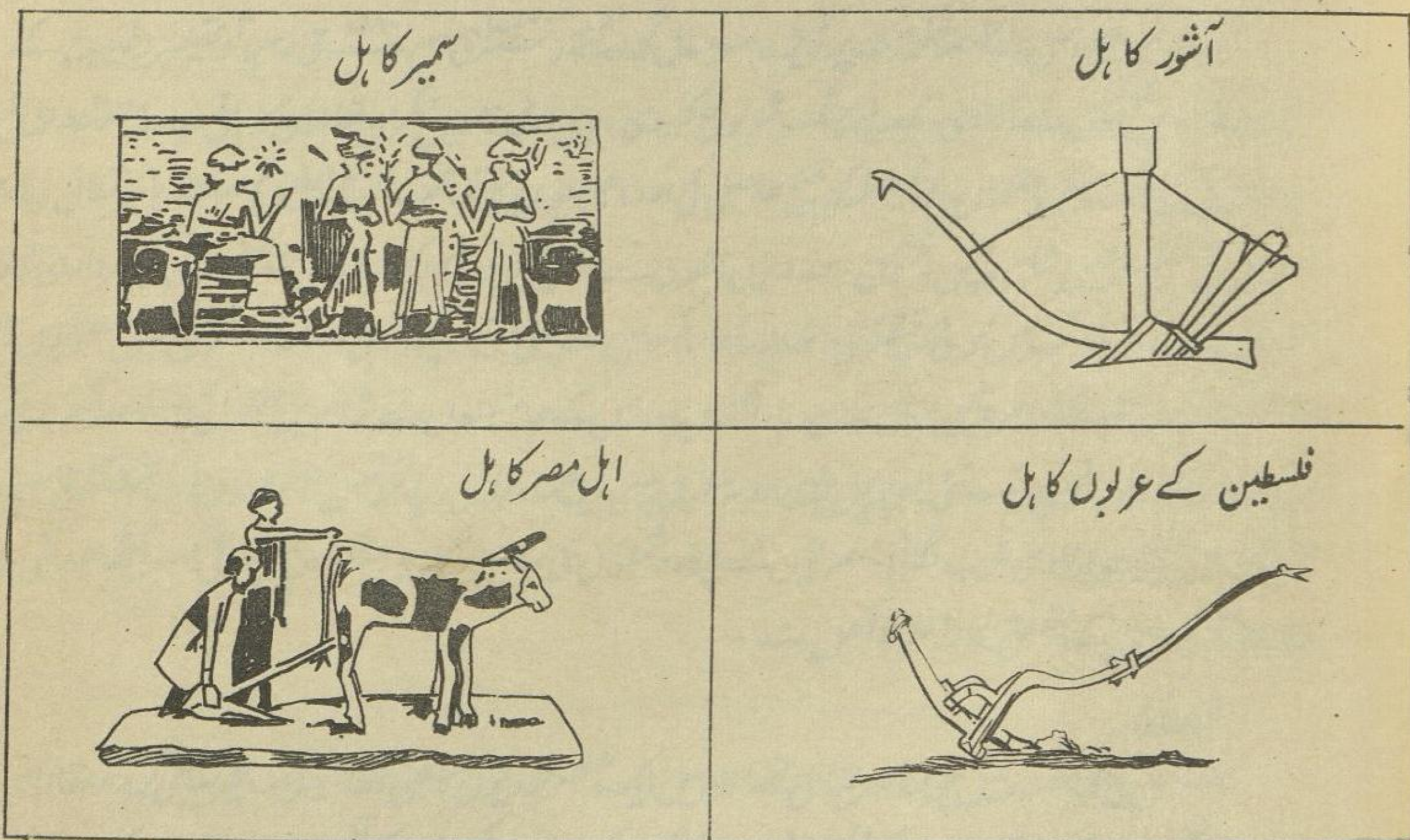
ہکسوس کے زمانے میں مصر کا دارالحکومت افاریس[۵۵] تھا جو ڈیلٹا میں واقع تھا۔ وہاں سے ان کی حکومت کا دائرہ وسط مصر

---

[۵۱] Story of Jericho ص ۱۔ [۵۲] بیت شمس کی جگہ اب عین شمس نام ایک گاؤں موجود ہے، جو یافا اور حبرون کے راستے پر یروشلم سے بیس میل مغرب میں ہے۔ اس کے قریب تل الرمیلہ ہے جہاں بیت شمس آباد تھا۔

[۵۳] جوزیفس۔ [۵۴] ٹی، ای، پیٹ Peet The Rhind Mathematical Papyrus

[۵۵] Avaris یہ شہر اسرائیلیوں نے گودام کے طور پر رعمسیس کے لیے تعمیر کیا تھا (خروج باب ۱، آیت ۱۱) کلاسیکی دور میں اسے تانیس Tanis کہتے تھے۔ وسطی عربی دور میں تنّیس بائیبل میں اس کا نام صوعن درج ہے (گنتی باب ۱۳، آیت ۲۲) اور آج کل اسے صان الحجر کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عبرانی نام ہے۔


آشور کا ہل
سمیر کا ہل
فلسطین کے عربوں کا ہل
اہل مصر کا ہل

تک پہنچ گیا۔ وہاں پندرھویں شاہی خاندان سے پیشتر جو ابتدائی ہکسوس بادشاہ ہوئے، ان کے نام واضح طور پر کنعانی یا اموری تھے، مثلاً عنات ہار، یعقوب ہار (ہار پہاڑوں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا) یعقوب یقینی طور پر تورات کا یعقوب تھا۔ پندرھویں اور سولھویں شاہی خاندانِ حکومت کے بادشاہ ہکسوس تھے۔ پندرھویں خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ خیان تھا جو کم از کم عارضی طور پر شام و مصر کو ملانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس طرح ایک وسیع سلطنت وجود میں آگئی تھی۔ اس کی یادگاریں بابل سے کریٹ تک بکھری ہوئی ہیں۔ بابل میں ایک شہر ملا ہے، جس پر اس کا نام کندہ ہے اور کریٹ میں بھی ایک سل پر اس کا نام درج ہے۔ اس خاندان کے ایک اور بادشاہ آبوفیس[۵۲] اوّل کی یادگاریں بھی بے شمار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہکسوس نے مصری زبان اپنا لی تھی اور انھوں نے اپنے نام مصری رکھنے شروع کر دیے تھے۔

نفرت انگیز ہکسوس کے عہد حکومت پر ڈیڑھ سو سال گزر گئے (۱۷۳۰ ق،م - ۱۵۸۰ ق،م) تو تھیبز (طیبہ) کے ایک شہزادے احموس[۵۲] اوّل نے آزادی کے لیے جنگ شروع کر دی۔ وہی اٹھارھویں حکمران خاندان کا بانی ہے۔ متعدد لڑائیوں کے بعد فاریس کی جنگ میں احموس نے فیصلہ کن فتح حاصل کی اور اجنبیوں کا تعاقب کر کے انھیں مصر سے باہر نکال دیا۔ چنانچہ ہکسوس کی مسلح فوجیں شام واپس آگئیں۔ اور وہاں انھوں نے سامی حکمرانوں کا ایک وفاق بنا کر خود اس کی سرداری سنبھال لی۔ احموس نے ان کے تعاقب میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ ہکسوس نے پہلی مرتبہ اپنے جنوبی حصار شاروحن[۵۳] میں مصریوں کا زبردست مقابلہ کیا، یہاں تک کہ محاصرہ تین سال جاری رہا۔ احموس اور اس کے جانشینوں نے شام میں حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح مصر کی خارجہ پالیسی ایک نئی راہ پر چل پڑی اور یہ سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔ تحوتمس ثالث (وفات ۱۴۴۷ ق،م) نے شام میں ہکسوس کی قوت پر کاری ضرب لگائی۔ مصریوں نے اپنے دشمنوں کی تمام یادگاریں مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ ایک وجہ ہے کہ ہکسوس کے متعلق ہمارا علم ناقص ہے۔

حوری

ہکسوس کی جماعت میں جو عناصر شامل تھے، ان میں ایک عنصر حوریوں کا بھی تھا۔ یہ ایک غیر سامی گروہ تھا۔ اس کا تعلق ہندی یورپی گروہ سے بھی نہ تھا اور اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے۔ ہکسوس کے آخری دور میں، نیز ان کے بعد حوریوں کی حضارت نے خوب فروغ پایا۔ یہ لوگ ہلالِ زرخیز کی شمالی و مشرقی سطوحِ مرتفع سے آئے تھے۔ ان کا اصل وطن جھیل ارومیہ اور کوہستان زاغروس کے درمیان تھا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں انھوں نے دوآبۂ دجلہ و فرات کے شمالی حصے پر حملہ کیا اور وہاں جم کر بیٹھ گئے۔ پھر شمالی شام کی طرف بڑھنے لگے اور مشرق قریب میں انھوں نے زبردست سلطنتیں قائم کیں۔ اموری پہلے سے شام کے اس حصے میں موجود تھے۔ ہلالِ زرخیز میں حوریوں کی آمد کا تعلق غالباً اسی حرکت عام سے ہے جس نے ہندی ایرانی گروہوں کو ایران و ہندوستان پہنچایا اور کاشیوں کو زاغروس سے بابل کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

---

۵۱ Tinnis ۵۲ Apophis

۵۳ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا مقام تل الفراعہ تھا (وادیٔ غزہ میں)، جو بیر السبع کے شمال مغرب میں ہے۔

میتانی سلطنت

۱۵۰۰ق،م کے آس پاس حوری اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور وہ میتانی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سلطنت اس درجہ طاقت ور بن گئی تھی کہ ایک وقت میں اس کی حدیں بحیرۂ روم سے میڈیا (مادہ) تک پھیلی ہوئی تھیں اور بلادِ عاشور بھی اسی میں شامل تھے۔ اس کا مرکزِ حکومت اشوکانی تھا۔ قیاس ہے کہ یہ مقام اسی جگہ تھا جسے آج کل فخاریہ کہتے ہیں اور یہ دریائے خابور پہ تل الحلف اور حران کے مشرق میں ہے۔ دوآبۂ دجلہ و فرات میں ان کے مرکز کا نام اُرنجا تھا (موجودہ زمانے کا کرکوک) جس کے حواشی میں سے ایک مقام نوزی[1] میں کھدائی ہوئی۔ مصری میتانی سلطنت کو نہارین کہتے تھے۔ غالباً یہ وہی سرزمین ہے، جسے تل العمارنہ کی تختیوں میں سوبارتوں، یعنی سوباریوں کی سرزمین لکھا ہے۔ سوباری بھی ایک غیر سامی گروہ تھے۔ یہ یقیناً حوریوں سے پہلے اس سرزمین میں آباد ہوئے تھے۔ میتانی دور میں حوریوں کی آبادی بہت بڑھی ہوئی تھی، لیکن امرا اور شاہی خاندان کے افراد کا تعلق ہندی یورپی نسل سے تھا۔ میتانی بادشاہوں نے اپنے ہمسایوں سے جو عہد نامے کیے، ان میں متھرا، ورونا، اندرا اور دوسرے معبودوں کا ذکر آیا ہے، جن کی پوجا ہندوستان میں ہوتی تھی۔ بادشاہوں کے نام بھی واضح طور پہ ہندی یورپی تھے مثلاً توشرت۔

یہ توشرت میتانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے آمون حوتب ثالث (وفات ۱۳۷۵ق،م) اور آمون حوتب رابع (وفات ۱۳۵۸ق،م) کے نام خط لکھے، جو تلِ العمارنہ کی تختیوں میں ملے ہیں۔ یہ اکاوی زبان میں ہیں، جو اس زمانے میں بین الاقوامی زبان تھی۔ ایک خط حوری زبان میں بھی لکھا گیا تھا، جو سلطنت کے اندر سرکاری زبان تھی۔ توشرت کی ایک بہن آمون حوتب ثالث کے حرم میں تھی اور ایک لڑکی کی شادی بھی آمن حوتب ثالث سے ہوئی تھی۔ اس کی وفات پر لڑکی سے آمن حوتب رابع نے شادی کر لی۔

ایک خط میں توشرت آمون حوتب ثالث سے ان لفظوں میں خطاب کرتا ہے:

"میرے بھائی، ممودیا، عظیم الشان بادشاہ بادشاہ مصر کے نام۔
میرا داماد، جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اور میں اس سے محبت رکھتا ہوں۔
توشرت جو عظیم الشان بادشاہ اور تیرا خسر ہے اور کہتا ہے۔
وہ تیرا محب ہے، میتانی کا بادشاہ ہے، تیرا بھائی ہے۔
میں بخیریت ہوں، امید کہ تو بھی بخیریت ہو، تیرے عیال بخیریت ہوں۔
میری بہن، تیری دوسری بیویاں، تیرے بیٹے،
تیرے جنگی رتھ، تیرے گھوڑے، تیری فوج،
تیری سرزمین، تیرے تمام مقبوضات۔

---

[1] اس کی زیادہ صحیح شکل نوزہ ہے۔ آج کل اس کا نام یورغان تپہ ہے، جو کرکوک سے دس میل مشرق کی جانب ہے۔ حیفا اور طرابلس کی پائپ لائن یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

تجھ پر بہت بہت سلام[1]۔

چودھویں صدی قبل مسیح میں میتانی سلطنت کی حالت بڑی نازک رہی۔ شمالی جانب حتیوں کی قوت اُبھر رہی تھی جنوبی جانب سے مصری سلطنت کے حدود وسیع ہو رہے تھے۔ ہمیں ابتدائی مصری دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تحوتمس اوّل، تحوتمس ثالث اور آمون حوتپ ثانی نے میتانیوں کے خلاف کامیاب جنگیں کیں۔ توشرتّ مصر کا وفادار دوست تھا، لیکن اس پر مشہور حتی فاتح شوبیلولیوما نے حملہ کر دیا اور اس کی فتوحات کا سلسلہ توشرتّ کے بیٹے حتی وزرا کے عہد میں بھی جاری رہا۔ آخر ایک عہد نامہ ہو گیا، جس کے مطابق شمالی شام پر حتی فاتح نے قبضہ کر لیا۔ مشرقی جانب اس علاقے کی حد دریائے فرات تک تھی اور جنوبی جانب یہ علاقہ لبنان تک جاتا تھا۔ میتانی سلطنت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا وہ آگے چل کر آشوری بادشاہ اودنیراری (۱۳۰۷ ق،م ۔ ۱۲۷۵ ق،م) کا باج گزار بن گیا اور اودنیراری کے جانشین شلم ناصر اوّل نے اسے آشوری سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح وہ سلطنت ناپید ہو گئی، جو ایک وقت میں مصر اور حتیوں کے برابر ہمہ گیر سلطنت ہونے کی دعوے دار تھی۔

حوری زبان

حوری زبان کی مکمل کلید اب تک نہیں مل سکی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ زبان نہ سامی تھی اور نہ اس کا تعلق ہندی یورپی زبانوں سے تھا۔ اس کے متعلق جو ابتدائی دستاویزیں ملیں، وہ چھ دینی تختیاں تھیں جو "ماری" سے اور چند "اللخ" (تل العطشانہ) سے ملیں۔ یہ مقام انطاکیہ کے میدان میں واقع ہے۔ "الالخ" میں حوریوں نے ایک نوآبادی اموری نوآبادی کے کھنڈروں پر بنا لی تھی، حوریوں کے متعلق جو سامان بوغازکوئی اور راس الشمرہ سے ملا، مذکورہ تختیاں اس سے چار سو سال پیشتر کی ہیں۔ راس الشمرہ سے متعدد حوری تختیاں ملیں اور ایک سمیری و حوری قاموس بھی مل گئی۔ قطنہ سے حوری افراد کے ناموں کی ایک فہرست دستیاب ہوئی۔ فوزی سے تختیوں کی بڑی تعداد ملی۔ یہ پندرھویں قبل مسیح سے شروع ہوتی ہیں۔ مقامی حوری محرروں نے یہ تختیاں اکادی زبان میں لکھیں اور کہیں کہیں حوری الفاظ بھی استعمال کرتے رہے۔ اکادی متن کو سامنے رکھ کر ان الفاظ کے معنی معیّن کیے گئے۔ ممکن ہے، یہ بات عجیب معلوم ہو کہ ان فوزی دستاویزوں سے عبرانی بزرگوں کے طریقِ زندگی پر تازہ روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً شادی کے ایسے معاہدے ملے ہیں، جن میں بانجھ بیوی کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ بچے پیدا کرنے کی غرض سے اپنے شوہر کے لیے ایک داشتہ مہیا کرے[2]۔

حوریوں کے باقیات

پندرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں حوری شام میں اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ مصریوں نے کنعان کو "خورو" کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی حضارت کے متعلق جو کچھ ملا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے منقش ظروفِ گِلی بناتے تھے اور سیاہ رنگ پر سفید نقش و نگار ہوتے تھے۔ ان کی تعمیر کا بھی خاص طرز تھا اور فنِ آرائش بھی خاص تھا۔ عہد نامۂ قدیم

---

[1] بیزولڈ Bezold ص ۸، Mercer ص ۱۹،

[2] مصنف نے اس سلسلے میں بائیبل کی کتاب پیدائش باب ۱۶، آیات ۲، ۳ کا حوالہ دیا ہے۔

میں بھی حوریوں کا ذکر ہے جنھیں زمانۂ حال تک پرانے غیر مشہور قبیلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ انھیں غاروں کے ساکن کہا گیا ہے، لیکن اب معلوم ہوتا ہے، یہ صحیح نہ تھا۔ حوّی بھی غالباً حوری ہی تھے۔

حوریوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے آشوریوں کے لیے وہ جسمانی خط و خال میراث میں چھوڑے، جن کی وجہ سے آشوری اپنی سامی برادری کے جنوبی لوگوں، یعنی بابلیوں سے ممتاز ہیں۔ جن سامی خط و خال کو یہودیوں سے خصوصاً منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ دراصل حتّی اور حوری خط و خال ہیں۔ جب حتّیوں نے میتانی کو مسخر کر لیا تو حوری حتّیوں کی مبہم اصطلاح میں شامل کر لیے گئے مشرقی شام میں حوریوں کے جو باقیات تھے، انھیں آرامیوں نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ لبنان میں زحلہ کے نزدیک فرزل نام ایک گاؤں ہے، جس میں ایک پرانا لفظ برزل[51] محفوظ ہے، جو راس الشمرہ کی دستاویز میں آیا ہے۔ اس کے معنی لوہے کے ہیں۔ بشریات کے ماہروں نے جو تحقیقات[52] اب تک کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لبنان میں انسانیت کے جس نمونے کو غلبہ حاصل ہے ــــــ مارانی اور دروزی ــــــ وہ چھوٹے سر والا ہے۔ شام کے شمال مغرب میں نصیریوں کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس کے برعکس صحرائے شام اور شمالی عرب میں جن بدوؤں کی اکثریت ہے، وہ لمبے سر والے[53] ہیں۔

حتّی

حتّیوں کے جو خط و خال یادگاروں میں محفوظ ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل حوریوں سے ملتے جلتے تھے۔ یہ لوگ اصلاً انا... کے اس علاقے سے نکلے، جسے دریائے ہالیس[54] کا علاقہ کہنا چاہیے وہ اپنے وطن کا نام ختّی بتاتے تھے[55] اور ان کے مرکزِ حکومت کا نام ختوشا... (ختّیوں کا شہر) تھا۔ آج کل اسے "بوغاز کوئی"، کہتے ہیں، جو انقرہ سے نوّے میل مشرق میں ہے۔ انگریزی نام یعنی حتّی عبرانی سے لیا گیا ہے۔ ابتدا میں ان کا مرکزِ حکومت "کشار"، تھا۔ اس کا سراغ اب تک لگایا نہیں جا سکا۔ ۲۰۰۰ ق م کے آس پاس ہندی یور... حملہ آوروں نے حتّیوں کو مغلوب کر لیا۔ ہندی یورپی فاتحوں اور اناطولیہ کے اصل باشندوں کی آمیزش سے ایشیائے کوچک... حتّی پیدا ہوئے۔ ان کے چہرے کا نقشہ یہ تھا: اُبھری ہوئی ناک، ذرا پیچھے کی طرف ہٹتی ہوئی پیشانی، ٹھوڑی ویسی ہی تھی، جیسی کہ اصل باشن... کی تھی۔ مشرقی اناطولیہ کے باشندوں اور ارمنوں میں اب بھی یہ نقشہ غالب ہے۔

حتّیوں کی پرانی بادشاہی

حتّیوں نے پہلے پہل سنہ ۱۵۹۵ ق م میں ایک نمایاں جنگی کارنامہ انجام دیا اور وہ تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوئے۔ یعنی ان کے بادشا... مرشلش اوّل نے بابل پر حملہ کیا، اسے لوٹا اور وہاں کے پہلے حکمران خاندان کا خاتمہ کر دیا جس سے حمورابی کا تعلق تھا۔ اس مرشلش نے ... (حلب) بھی فتح کر لیا تھا۔ اور اسے تباہ کر ڈالا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حلب کے باشندوں کو قید کر لیا، حدد اور دوسرے ... دیوتاؤں کو مالِ غنیمت کے طور پر ختوشاش بھیج دیا، جسے اس نے اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ اس نے پہلا دارالحکومت ...

---

[51] brzl
[52] ملاحظہ ہو کارل سی سلزر کی کتاب، ص ۱۰، نیز اسی مصنف کی دوسری کتاب ص ۲۰، ۲۱، ۳۷، ۵۰ اس کے علاوہ ولیم شنکلن Shanklin اور نجلاء عزالدین کا مقالہ وغیرہ۔
[53] کارلٹن ایس کون Coon کی کتاب Races of Europe ص ۶۲۳-۶۲۴- نیز ولیم شنکلن کے مقالات۔
[54] Halys
[55] Khatti مرکز Khattushash مصری دستاویز... میں اسے خیتا بتایا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی غالباً چاندی کے ہیں۔ Kheta

ترک کر دیا تھا۔ حلب نہ صرف حدد دیوتا کی پوجا کا مرکز تھا بلکہ ایک سلطنت کا بھی مرکز تھا جسے "یمخاض" کہتے تھے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس سے ذرا پہلے "یریم لیم" یمخاض کا حکمران تھا اور بیس چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس کے تابع تھیں۔ مرشلش کے ایک جانشین نے اراضیٔ ہکسوس میں پیش قدمی کی اور وہ جنوب میں "دمشونس" تک پہنچ گیا، جو از روئے صوت و تلفظ "دمشق" سے ملتا جلتا ہے[۱]۔ اگر ہم اپنے قیاس کو صحیح سمجھ لیں تو مدوّن تاریخ میں دمشق کا یہ پہلا ذکر ہے، لیکن حتّی بادشاہ کوہ طارس کے جنوب میں اپنی مستقل گرفت قائم نہ رکھ سکے اور یہی پہاڑ پرانی حتّی بادشاہی کی جنوبی حد بنا رہا۔

نئی بادشاہی

نئی یا دوسری حتّی بادشاہی ۱۴۵۰ق،م سے ۱۲۰۰ق،م تک قائم رہی۔ اس کا عروج عظیم الشان شوبیلولیوما (۱۳۸۰ق،م ‒ ۱۳۵۵ق،م) کے ماتحت کمال پر پہنچا۔ میتانی سلطنت کے اندر پیش قدمی سے شوبیلولیوما کے لیے شمالی شام میں مستقل قدم گاہ کا بندوبست ہو گیا اور اس نے ایسی حیثیت حاصل کر لی کہ فراعنۂ مصر سے جُبیلہ کے جنوب تک علاقہ چھین لے۔ اس بادشاہ کی حکومت کے آخری دور میں حتّی سلطنت مغربی ایشیا کی نہایت قوی اور طاقت ور سلطنت بن چکی تھی۔ ہکسوس میتانی اور حوری سب اس سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔ جسے اب واقعی "حتّی سلطنت" کہنا چاہیے۔ کوہستان طارس کے جنوب میں کرکمیس ایک بڑا مستحکم مقام تھا۔

شوبیلولیوما نے صرف جنگی قوت کے استعمال کو مدار کار نہ بنایا۔ بلکہ حسنِ تدبیر سے کام لیتا رہا۔ مثلاً ایشیائی علاقوں کو مصر کے خلاف بغاوت پر اُکسا دیتا۔ اغاریت کے امیر کو اس نے فرعون حلیف سے علیحدگی پر آمادہ کر لیا تھا۔ ان تدبیروں میں اسے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے اموری امیر عبد عشرتا اور اس کے بیٹے ازیرو کو "پانچویں کالم" کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے تعاون سے ازیرو نے ساحل فونیقیہ کے شہروں کی تسخیر کے لیے قدم اٹھایا۔ عین اسی زمانے میں ازیرو فرعون اخناتون کو خطوں پر خط لکھ رہا تھا کہ حتّیوں کی یورش کو روکنے کے گراں بہا فرض نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ نمائندہ فرعون سے ملاقات کی مسرّت حاصل کر سکتا۔ صورتِ حال اس درجہ غبار آلود ہو گئی کہ مصر کا جو نمائندہ شام میں مقیم تھا، وہ بھی دوست و دشمن میں واضح فرق و امتیاز نہ کر سکا۔

مصر کے ساتھ معاہدہ

جن علاقوں کو مصر کے اٹھارھویں خاندانِ حکومت کے آخری فرمانروا محفوظ نہیں رکھ سکے تھے، ان کی بازیافت کے لیے انّیسویں حکمران خاندان کے بادشاہوں نے سرگرمی دکھائی تو وقت کی دو بڑی استعماری طاقتوں (حتّی اور مصری) کے درمیان شام پر سیادت و برتری کے لیے کشمکش از سرِ نو شروع ہو گئی۔ قادش کی جنگِ عظیم ۱۲۸۷ق،م کے آس پاس ہوئی تھی، رعمسیس ثانی نے دعویٰ کیا تھا کہ اس جنگ میں مصر کو اپنے حریف (حتّیوں کے بادشاہ) موتلّش[۲] پر نمایاں فتح حاصل ہوئی ہے، تاہم اگر نتائج کا جائزہ لیا جائے تو یہ کامیابی ایسی شاندار نہ تھی جیسی کہ رعمسیس نے اسے ظاہر کیا تھا۔ رعمسیس نے کہا تھا کہ حتّیوں کے رئیس کو شکست ہوئی۔ اس کے تمام بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ حتّیوں کو دریائے عاصی کے پار بھگا دیا گیا۔ وہ پانی میں گر گئے

۱؎ گارسٹنگ کی کتاب The Hittite Empire ص ۳، نیز Heritage of Solomon ص ۳۰۔

۲؎ Muwatallish

اور گھڑیالوں کی سی کیفیت اُن پر طاری ہوگئی۔ سب ایک دوسرے کے اوپر منہ کے بل گرتے گئے اور ہیں نے جسے چاہا، موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[۵۱] حقیقت یہ ہے کہ حتی، رعمیس کو فریب دے کر ایسی جگہ لے گئے تھے، جہاں انھوں نے گھات کا انتظام کر رکھا تھا۔ رعمیس بہ مشکل جان بچا کر نکل سکا اور حتیوں کے جنگی رتھوں کا حملہ ایسا شدید ہوا کہ مصری جنگ جُو بکھر گئے۔ انجام کار رعمیس کو شمالی اور وسطی شام کے پورے علاقے خالی کرنے پڑے۔ سنہ ۱۲۷۲ ق،م میں وہ موتلش کے بھائی اور جانشین حتوشلیش[۵۲] کے ساتھ ایک غیر جارحانہ معاہدہ کر لینے پر مجبور ہوگیا۔ ازمنۂ قدیم سے اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی معاہدہ ہے، جو ہمیں اب تک دستیاب ہُوا ہے۔ اس کا مقصد و مدعا یہ بیان کیا گیا تھا کہ دونوں فریقوں کے درمیان امن و صلح اور خوش گوار برادرانہ تعلقات کی فضا پیدا ہو جائے۔ اس معاہدے میں شمالی شام کو جس میں اموردبھی شامل تھا، حتی علاقہ تسلیم کر لیا گیا۔ جنوبی شام، جس میں فلسطین بھی شامل تھا، مصریوں کے قبضے میں رہا۔[۵۳] یہ معاہدہ چاندی کی ایک تختی پر لکھا گیا تھا اور اس میں مصر کا ہیروغلیفی (تصویری)، اور بابل کا مسماری خط دونوں استعمال کیے گئے تھے۔ یہ تختی محفوظ ہے۔

سنہ ۱۲۰۰ ق،م کے آس پاس حتی سلطنت پر زوال و انحطاط کا دَور شروع ہوگیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پر بحیرۂ ایجیہ کے حلقے سے حملے شروع ہو گئے تھے۔ حملوں میں فریجیا والوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ چنانچہ شمالی شام میں حتی سلطنت کی جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئیں، جن کے مرکز کرکمیش، حلب اور حماۃ میں تھے۔ آشوریہ کے لوگ انھیں حتی ریاستیں کہتے تھے۔ اسی زمانے میں آشوری سلطنت وسعت پذیر ہونے لگی اور مغربی جانب اس کی پیش قدمی شروع ہوئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا ریاستوں کے سر پر آشوریوں کا خطرہ برابر منڈلاتا رہا، یہاں تک کہ وہ یکے بعد دیگرے اس بڑی سلطنت کی نذر ہو گئیں۔ سنہ ۷۱۷ ق،م میں سرجون ثانی نے کرکمیش کو مسخر کیا اور آخری آزاد حتی سلطنت صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئی۔

فلسطین سے تعلق

سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی حتیوں کی سیاسی حیثیت بالکل ختم ہوگئی، البتّہ اس اصطلاح نے اب حضارتی و قومی حیثیت حاصل کر لی۔ آشوری یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال کرتے رہے جو سابقہ حتی سلطنت کے علاقوں میں رہتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بہت بڑی اکثریت کو قدیم اناطولی باشندوں یا ہندی و یورپی حتیوں سے قطعاً کوئی قومی علاقہ نہ تھا۔ فلسطین کبھی حتی سلطنت میں شامل نہ ہوا، تاہم وہاں حتی عناصر کی خاصی کثرت تھی۔ عہد نامۂ قدیم میں حتی اصطلاح فلسطین کے ان تمام غیر سامی باشندوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جو عبرانیوں کی فتح و تسلط سے پہلے وہاں موجود تھے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ فلسطین کی آبادی میں حتی عناصر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی موجود تھے، بلکہ معلوم ہوتا ہے، حبروں کو حتی شہر سمجھا جاتا تھا۔[۵۴] یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عیسو بن حضرت اسحاقؑ (یعنی حضرت یعقوبؑ کا بڑا بھائی) کی حتی بیویاں تھیں اور بنی اسرائیل نے حتی عورتوں سے ازدواجی تعلقات پیدا کیے۔[۵۵] آثارِ قدیمہ میں چودھویں صدی قبل مسیح کے جن ندراتوں کا سراغ ملا ہے، نیز جو مہریں اور ہتھیار برآمد ہوئے ہیں، ان سے

---

۵۱ سٹین ڈارف اور سیل Steindorff and Seele ص ۵۱ ۵۲ بریسٹڈ کی کتاب Ancient Records جلد سوم

۵۲ Hattushilish ۵۳ پوری شرطیں بریسٹڈ کی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ ۵۴ پیدائش باب ۲۳، آیت ۲، ۲۰-۱۔ اس میں حتیوں کو "بنی حت" لکھا گیا ہے۔ ۵۵ پیدائش باب ۲۶ آیت ۳۴، احبار باب ۳، آیات ۵، ۶۔

کے دشمن ہیں[۵۱]"۔ یہ آرامی قبیلے کرکمیش کے پڑوس میں رہتے تھے، لیکن آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ آرامی مشرق میں بابل تک جا پہنچے اور کلدو (کلدانیوں یا نو بابلیوں) کو امداد دے رہے ہیں، جن کے ساتھ انھیں گہرا علاقہ تھا۔ تغلت پلاسر اور اس کے جانشینوں کے دوسرے کتبات میں "مات آریمی[۵۲]" یعنی آرامیوں کی سرزمین میں جھموں کا ذکر ہے۔

شمالی شام میں پیش قدمی

ان دستاویزوں، نیز آشور و بابل کی دوسری دستاویزوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں دوآبہ، دجلہ و فرات، نیز شمالی و وسطی شام کے بڑے علاقوں کو ساتی گروہ پامال کر چکے تھے اور کرکمیش جیسے چھوٹے حتی حلقوں کے سوا مذکورہ بالا علاقوں پر آرامی رنگ چڑھنے لگا تھا۔ تدریجاً وادی عاصی، نیز اس کے شمالی علاقے میں حتی، حوری اور اموری بھی آرامی سیل کی زد میں آگئے۔ پھر یا تو وہ آرامیوں میں جذب ہو گئے یا ان کے مستقل دباؤ کے ماتحت باہر دھکیل دیے گئے۔ کوہستان لبنان نے مغربی جانب پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اور اس علاقے میں حتی اور اموری گروہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ساحل کے میدانی علاقے میں کنعانی آبادیوں پر قطعاً کوئی اثر نہ پڑا۔ آرامی بارھویں صدی قبل مسیح میں دمشق جا پہنچے تھے اور آئندہ چل کر یہ شہر آرامی سلطنت کا مرکز بن گیا۔ رعمیسس ثالث (۱۱۹۸ق م۔ ۱۱۶۶ق م) کے وقائع میں دمشق نام کے آرامی بھیجے دیے گئے ہیں[۵۳]۔ حران دوآبہ میں آرامیوں کا ایک مرکز تھا۔ اس پر دمشق سے پہلے قبضہ ہو چکا ہوگا۔ رفتہ رفتہ نو واردوں نے کنعانیوں اور اموریوں کے درمیان سکونت اختیار کر لی۔ اور ان کی تہذیب کو اپنا لیا۔ لیکن ایک تہذیبی شے ایسی تھی، جو کسی سے نہ لی۔ یہ زبان تھی۔ اسرائیلی اور فلسطینی تیرھویں صدی کے اواخر میں آرامیوں کے جنوب میں آباد ہوئے تھے، انھوں نے اپنی بولی بدل لی، لیکن آرامیوں نے اپنی بولی بدستور قائم رکھی اور اس کے لیے مغربی ایشیا کی آئندہ زندگی میں دور رس کردار ادا کرنا مقدر تھا۔

دوآبہ میں آرامی حکومتیں

تیرھویں صدی کے اواخر تک آرامی اور اسرائیلی ہجرتیں اختتام کو پہنچ چکی تھیں اور دونوں قومیں نئے وطنوں میں ایک دوسری کے پہلو بہ پہلو آباد ہو چکی تھیں۔ پہلی آرامی حکومتیں وسطی فرات کے حلقے میں قائم ہوئیں جسے دوآبہ و شام کے درمیان گزرگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک حکومت آرام نہریم[۵۴] یعنی دریائی آرام تھی۔ دریاؤں سے مراد فرات اور اس کا معاون خابور ہیں، نہ کہ دجلہ۔ مصری نہارین اسی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہی نام تیرھویں صدی کے اواخر سے مسماری کتبات میں مذکور ہونے لگا۔ اور نویں صدی کے بعد ناپید ہو گیا، جب آشوریوں نے اس خطے کے آرامیوں کو واقعی مٹا دیا تھا۔ دوآبہ میں ایک اور حکومت فدام آرام نام تھی[۵۵]۔ یہ آرام نہریم جتنی بڑی نہ تھی۔ اس کا حلقہ حران کے حوالی تک محدود تھا۔ عہد نامۂ قدیم میں دونوں لفظ مترادف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ حران بڑی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور حران کے معنی ہی راستے کے ہیں۔ یہ شہر آرامی تہذیب کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ عبرانی

---

۵۱ لکن بل Luckenbill جلد اول۔ ۵۲ Mat Arimi ۵۳ آرامی لفظ "تیر اسکی"، ہے اس سے "درمشق"، نکلا یعنی معصار مشق ملاحظہ ہو میکس پرلر کی کتاب، سنیا شفر Schiffer کی کتاب، تل العمارنہ کی تختیوں میں بعض جگہ اس کی شکل "دِمشقا"، (بہ کسرہ دال) بعض جگہ کشکی اور بعض جگہ دُمشقا (بہ ضمہ دال) ہے۔ ۵۴ Aram Naharaim یعنی آرام نہرین (دو دریاؤں کے بیچ کا آرام)۔ ۵۵ "فدام" کا ہم معنی عربی میں "فدان" ہے جس کے معنی کھیت یا میدان کے ہیں۔ اور یہ زمین کا ایک پیمانہ بھی ہے، جو عربی دنیا میں رائج ہے۔

روایات نے عبرانیوں اور آرامیوں کے قدیم تعلقات کبھی فراموش نہ کیے۔ فلسطین میں آباد ہونے سے قبل ان کے بزرگ حرّان ہی سے آئے تھے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب حضرت اسحاقؑ کے لیے موزوں بیوی کی تلاش ہوئی تو ان کے قاصد حرّان ہی بھیجے گئے تھے۔ بعد میں حضرت یعقوبؑ کو لیہ اور راحیل سے شادی کے لیے حرّان ہی بھیجا گیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں کا مادری سلسلہ آرامی تھا۔ ایک آیت میں بابائے قوم کو آرامی قرار دیا گیا ہے[1]۔ کتاب پیدائش، جس میں عبرانی تاریخ کا ابتدائی دَور بیان ہُوا ہے، آرامیات اور آرامی الفاظ سے لبریز ہے[2]۔ عبرانیوں کے آباؤاجداد فلسطین آباد ہونے اور مقامی کنعانی بولی اختیار کر لینے سے پیشتر غالباً آرامی زبان بولتے تھے۔

آرام دمشق

لیکن آرامیوں نے جتنی حکومتیں قائم کیں، ان سب سے زیادہ اہم وہ تھی، جس کا مرکز پہلے ضوباہ اور بعد میں دمشق بنا۔ یہ گیارھویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی تھی۔ یعنی اسی زمانے میں جب عبرانیوں نے بادشاہی کی بنیاد رکھی تھی، پھر یہ بہت بڑی سلطنت بن گئی۔ اس کے حدود ایک طرف دریائے فرات پر تھے اور دوسری طرف دریائے یرموک پر۔ شمالی جانب یہ آشوری علاقے میں اور جنوبی جانب عبرانی حکومت میں تصرفات کر رہی تھی۔ کوہ لبنان کے مشرق کا پورا شامی علاقہ، نیز شمالی شام اور باشان[3] تا دمشق، تمام تک پوری طرح آرامیوں کے قبضے میں آ چکے تھے، عہد نامۂ قدیم میں جہاں آرام یا شام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہاں دمشق کا یہی خطہ مراد ہے دو سو سال کے بعد شام کے آرامی عبرانیوں کے خوفناک دشمن بن چکے تھے۔

ضوباہ اسی نام کی حکومت کا مرکز تھا۔ یہ لفظ اصل میں صہوبہ سے مشتق ہے، جس کے معنی سُرخ اور تانبے کے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ مقام اصل میں کالسس[4] تھا، اسے آج کل عنجر کہتے ہیں۔ یہ علاقہ البقاع میں زحلہ کی جنوبی سمت واقع ہے۔ اس حکومت کے بادشاہوں اور ان کے جنوبی حریفوں، یعنی عبرانیوں کے درمیان مقابلے طالوت کے زمانے سے شروع ہوئے۔ جو عبرانی سلطنت کا بانی ہے[5]۔ ضوباہ کے ابتدائی حکمرانوں میں سے ایک کا نام حدد عزر (حدّد مدد) تھا۔ اسے حضرت داؤدؑ نے شکست دی اور اس طرح تانبے کی کانوں پر قبضہ کر لیا[6]۔ حضرت داؤدؑ نے محض حدد عزر اور اس کے رفیقوں کو شکست ہی نہ دی، بلکہ عارضی طور پر دمشق کو بھی مسخر کر لیا۔ اس سے کچھ مدت بعد ہمیں یہ نظر آتا ہے۔ کہ دمشق کا حکمران رضین اپنے آپ کو حکومت ضوباہ کا باجگزار بتاتا ہے۔ اور وہ حضرت سلیمانؑ کے پورے دَور میں اسرائیلیوں کا دشمن بنا رہا۔ اس کے بعد ضوباہ کے مقابلے میں دمشق کو برتری حاصل ہو گئی۔ ۹۲۲ ق م میں عبرانی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ واقعہ شاہانِ دمشق کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہُوا۔ وہ برابر ایک ٹکڑے کو دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے۔

بن حدد اوّل[7] شاہ دمشق (۸۷۹ ق م - ۸۴۳ ق م) نے یہودیہ کے حکمران سے بڑے قیمتی خزائن وصول کیے۔ یہ ہیکل

۱ه استثنا باب ۲۶، آیت ۵۔ کہیں کہیں آرامی کا انگریزی ترجمہ سوری Syrian بھی کیا گیا ہے نیز جوزیفس۔ ۲ه پیدائش باب ۱۱، آیت ۲۸، باب ۱۲ آیت ۱، باب ۳۱، آیت ۱۱۔ "ویجر شاہد وتھا" (پیدائش باب ۳۱، آیت ۴۷) مطلب یہ ہے کہ علاقے کا آرامی نام یجر شاہد وتھا۔ اس کا عبرانی نام جلعاد رکھا گیا۔ ۳ه باشان کو بائیبل کے تراجم میں بسن لکھا گیا ہے۔ ۴ه Chalcis (تانبے کے لیے یونانی لفظ) آگے چل کر تو یہ نام ریاست کا مرکز حکومت تھا اس کا ذکر لوقا کی انجیل میں آیا ہے۔ (باب ۳ آیت ۱) ۵ه سیموئیل حصہ اوّل باب ۱۴، آیت ۴۷۔ ۶ه تواریخ حصہ اوّل باب ۱۸، آیت ۸۔ سیموئیل حصہ دوم باب ۸، آیت ۸۔ آخری حوالے میں ایک مقام "بیروکی" کا ذکر آیا ہے۔ جو موجودہ "بریتان" ہے جو بعلبک کے جنوب میں ہے۔ ۷ه بن عبرانی لفظ ہے جو آرامی بر (بہ کسر با) بعد ازاں بَر (بہ فتح با) کا مترادف ہے، یعنی بیٹا۔

سے بھی لیے گئے تھے اور یروشلم کے شاہی محل سے بھی۔ یہ خزانے لے کر شاہِ دمشق نے یہودی سلطنت کے دوسرے حصے یعنی اسرائیل پر حملہ کر دیا اور شرقِ اردن میں جلعاد پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔[51] حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت برائے نام عمری کے آخری دور (۸۷۵ ق م) سے آرام کی باجگزار تھی اور جب عمری کا بیٹا آحاب تختِ نشین ہوا تو اسرائیلی حکمران نے باقاعدہ خراج دینا بند کر دیا، یا آشوری حملے کے خلاف وفاق میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، حالانکہ حملے کا سخت خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے بن حدد اچانک اسرائیلی دارالحکومت سامریہ پہنچا تاکہ اسے اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرے۔

جنگ قرقر

اس آشوری یورش کی سب سے بڑی لڑائی وہ ہے، جو شلم ناصر ثالث نے ۸۵۳ ق م میں کی۔ شام کے بارہ حکمران متحد ہو گئے تھے اور بن حدد[52] اس متحدہ قوت کا رئیس و سپہ سالار تھا، جس کی فوج ایک ہزار دو سو جنگی رتھوں، ایک ہزار دو سو سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد دوسری بڑی فوج آحاب کی تھی۔ آحاب کے بعد شاہ حماۃ کی۔ مختلف فونیقی شہروں نے بھی اپنے اپنے حصے کی فوجیں پیش کی تھیں۔ بہرحال شلم ناصر کے مقابلے پر کُل ساٹھ ہزار فوج جمع ہو گئی تھی۔ قرقر کے میدان میں جنگ ہوئی، جو دریائے عاصی کے کنارے واقع ہے، لیکن کوئی قطعی نتیجہ نہ نکلا۔ آشوریوں کو بابل کی تسخیر کے لیے کئی سال انتظار میں گزارنے پڑے۔

حزائیل

بن حدد کے ایک جانشین حزائیل (خدا نے دیکھ لیا ہے۔ قریباً ۸۰۵ ق م) کو آرامیوں کی تاریخ کا سب سے بڑا جنگ جُو سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شلم ناصر کے دو حملوں کی کامیاب مزاحمت کے بعد خود اسرائیل کے خلاف پیش قدمی شروع کی اور وہ جنوبی سمت میں دریائے اردن الموجب تک بڑھتا چلا گیا جو بحیرہ لوط میں گرتا ہے۔[53] اس وقت اسرائیل کا بادشاہ یاہو[54] تھا، جس سے شلم ناصر نے خراج وصول کیا، اس کے جانشین یہوآخز[55] کے عہد میں اسرائیل کی حکومت صرف آرامی بادشاہ کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ حزائیل نے اس کے پاس صرف پچاس گھوڑے اور دس جنگی گاڑیاں چھوڑیں۔ حزائیل کا ایک مقصد یہ تھا کہ مصر و عرب کے تجارتی راستے اس کے قبضے میں آ جائیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے فلسطین کے ساحلی میدان میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر اس نے یروشلم پہنچنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ لیکن ہیکل سے اسے سونا اور قیمتی چیزیں دے کر مراجعت پر راضی کر لیا گیا۔[56] آشوریوں کے حملوں نے آرامی سلطنت کو خاصا کمزور کر دیا تھا۔ اس وجہ سے حزائیل کے جانشین سلطنت کے دور افتادہ جنوبی علاقوں پر اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔ یربعام ثانی ۷۸۵ ق م میں سامریہ کا بادشاہ بنا، اس نے محض اپنی سلطنت کے پرانے حدود بحال کر لیے، بلکہ دمشق و حماۃ پر حملے میں بھی سبقت کی۔

لیکن اصل خطرہ دوسری طرف سے گھات میں تھا۔ آشوریوں کی جنگی مشین پھر پیش قدمی کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ مناسب وقت

---

۵۱ سلاطین حصہ اوّل باب ۱۵، آیات ۱۸-۲۰، تواریخ حصہ دوم باب ۱۶، آیت ۴- یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ بائیبل کے تراجم میں بن حدد کو ہائے ہوّز سے لکھا ہے۔ ۵۲ لکن بل نے نام حدد عزر لکھا ہے (جلد اوّل)۔ ۵۳ سلاطین حصہ دوم باب ۱۰- آیات ۳۲-۳۳- ۵۴ Jehe

۵۵ Jehoahaz ۵۶ سلاطین حصہ دوم باب ۱۲- آیات ۱۷-۱۸-

۷۳۴ ق، م میں آیا، جب اسرائیل کے بادشاہ رملیاں کے بیٹے فقح[۵۱] نے اور دمشق کے بادشاہ رضین نے آخری شاہ یہودیہ کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا اور اسے آشوریہ کے بادشاہ سے امداد کے لیے درخواست کرنی پڑی[۵۲]۔ تغلت پلاسر ثالث فوراً آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس آشوری حملے میں دمشق کے سولہ صوبے اور پانسو اکانوے شہر پامال کر ڈالے گئے۔ بربادی کا نقشہ ایسا تھا "جیسے سیلاب آیا اور آبادیوں کی جگہ ملبے کے انبار چھوڑ گیا"[۵۳]۔ آشوریہ کے جو باجگزار اس جنگ میں دمشق کی دیواروں کے زیر سایہ لڑے اور موت کے گھاٹ اتر گئے، ان میں سے ایک پناموثانی شاہ شمال (زنجیری) بھی تھا۔ رضین میدان سے بھاگا، "وہ چوہے (ہرن) کے مانند" اپنے شہر کے دروازے میں داخل ہوا اور اس نے اپنے آپ کو "پرندے کے مانند پنجرے میں" بند کر لیا۔ محاصرہ جاری رہا۔ آخر ۷۳۲ق، م میں شہر فتح ہوا۔ بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تمام پھل والے درخت کاٹ کر باغات ویران کر ڈالے گئے۔ یہ باغات دمشق کے لیے فخر کا خاص سرمایہ تھے۔ ایک بھی درخت باقی نہ چھوڑا۔ باشندوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اس طرح آرام و دمشق انجام کو پہنچا اور آرامی برتری بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

آرامی تاجر

آرامیوں کی سیاسی اور فوجی پیش قدمیاں ختم ہو گئیں۔ لیکن ان کی تجارت اور تہذیب کی پُرامن مداخلت بعد میں بھی جاری رہی۔ یہ تہذیب جس نے نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں انتہائی عروج حاصل کیا، اس کا صحیح اندازہ آج اہل علم کے حلقے بھی نہیں کر رہے۔ موجودہ دور کے شامیوں کو اپنے آرامی آباؤ اجداد اور میراث کے متعلق کچھ احساس نہیں، حالانکہ بہت سے لبنانی اپنے فونیقی الاصل ہونے پر خاص زور دیتے ہیں۔ آرامی تاجروں کے قافلے پورے ہلالِ زرخیز میں پھرتے تھے اور شمالی سمت میں دجلہ کے منبع تک پہنچ جاتے تھے۔ انھوں نے جو بنجی اوزان چھوڑے تھے، وہ نینوا کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں نکل آئے ہیں۔ صدیوں تک شام کی بری تجارت ان کے قبضے میں رہی۔ جس طرح بحری تجارت ان کے کنعانی بھائیوں اور حریفوں کے ہاتھ میں رہی۔ آرامی دارالحکومت دمشق کو صحرائی علاقے کے لیے اسی طرح بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی جس طرح سمندر کے لیے ابتدا میں جُبلہ کو، بعد ازاں صور و صیدا کو حاصل رہی۔ آرامی تاجر فونیقیہ سے ارغواں اور افریقہ سے زردوزو گلکار پارچے، کتان، یشب، تانبا، آبنوس، ہاتھی دانت وغیرہ خریدتے تھے۔ سمندر کی چیزیں یعنی موتی بھی لیتے تھے، جن کے لیے ابتدائی زمانے سے خلیج فارس کو خاص شہرت حاصل تھی[۵۴]۔ یہی جنسیں ان کی تجارت کا خاص ذریعہ تھیں۔

آرامی زبان

آرامی زبان شمالی و مغربی سامی بولیوں میں سے ایک تھی اور آرامی تاجروں نے اسے ابتدا ہی سے دُور دُور تک پھیلا دیا تھا۔ پہلی آرامی تحریر وہ ہے جو ۷۳۱ق م میں بہ عہد تغلت پلاسر ثالث لکھی گئی۔ یہ ایک محرر کی تحریر تھی، جس نے ایک مفتوحہ شہر کی لوٹ کا حال بیان کیا۔ اس کے لیے مٹی کی تختی اور سوئی کو استعمال نہ کیا گیا۔ بلکہ یہ قلم سے پیپرس پر لکھی گئی اور اس میں ابجد استعمال کی گئی۔ آرامی زبان ابتدا میں شامیوں کی تجارتی زبان تھی۔ ۵۰۰ق، م کے آس پاس یہ پورے ہلالِ زرخیز میں صرف تجارت، سفارت اور

---

۵۱ Pekah ۵۲ سلاطین حصہ دوم باب ۱۶- آیت ۵ سے آخر تک۔ ۵۳ لکن بل جلد اول۔

۵۴ اوم سٹڈ Olmstead کی تاریخ فلسطین ص ۵۴۴-

حتی اثرات کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حرم میں بھی حتی خواتین موجود تھیں[۱]۔ حزقی ایل کی کتاب میں بے وفا یروشلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "تیرا باپ اموری تھا اور تیری ماں حتی تھی"[۲]۔

نظام سلطنت

حتی سلطنت اصلاً جاگیردار امور کی حکومت تھی، جس نے مختلف و متفرق قومی عناصر پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اس کی فوج کامیابیوں کا راز ہکسوس کی طرح گھوڑوں اور جنگی رتھوں کے استعمال میں مضمر تھا اور حتیوں کے خاص اسلحہ تھے۔ ہر رتھ میں تین آدمی سوار ہوتے تھے۔ ایک رتھ چلانے والا، دوسرا ڈھال والا اور تیسرا جنگ جو۔ ڈھال مربع ہوتی تھی۔ حتی میدانِ جنگ میں پیادہ فوج سے بھی کام لیتے تھے۔ اور اس فوج کے مختلف جیشوں کی سالاری امیر یا سردار کرتے تھے۔ کمان، جنگی تیر، برچھیاں اور خم دار تلواریں بھی ان کے اسلحہ میں شامل تھیں۔

زبان

حتیوں کی زبان ان کے گروہوں کی طرح مخلوط تھی، تاہم اسے ہندی یورپی زبان یا اس اصل کی زبان سمجھا جا سکتا ہے۔ یونانیوں کی طرح حتیوں کے جنگی امراء نسلاً ہندی یورپی تھے۔ ممکن ہے، دونوں کے امراء ایک قومی گروہ کے افراد ہوں اور ایک ہی زبان بولتے ہوں۔

حتی دستاویزوں کا سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جو ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک بوغاز کوئی سے برآمد ہوا۔ یہ دس ہزار سے زیادہ تختیاں تھیں، جو حکمرانوں نے شاہی محافظ خانے کے طور پر ۱۳۰۰ ق،م کے آس پاس جمع کی تھیں۔ ان میں مسماری خط استعمال کیا گیا ہے۔ جس کی کلید ایک چیک عالم[۳] نے دریافت کی۔ ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تختیاں ہیں۔ حتی اپنی عام ضرورتوں کے لیے مسماری خط سے کام لیتے تھے۔ لیکن جب یادگاریں بناتے تھے تو ان میں ہیروغلیفی (تصویری) خط استعمال کرتے تھے۔ جو تصویری کتبات پتھروں یا چٹانوں پر کندہ کیے جاتے تھے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ ایک سطر دائیں سے بائیں جانب تو دوسری سطر بائیں سے دائیں جانب ہوتی۔ اس رسم الخط کی کلید حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔ شام میں تین مقامات ہیں، جہاں ان کے تصویری کتبات والی یادگاریں ملتی ہیں۔ ایک کرکمیش (جرابلس) دوسرا حلب، تیسرا حماۃ[۴]۔ کرکمیش سے چوبیس سنگی کتبات حاصل ہوئے، جو اب برٹش میوزیم میں ہیں۔ حماۃ سے صرف چار کتبات برآمد ہوئے اور وہ استنبول کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ چار مہریں راس الشمرہ سے ملیں۔

حتی ادبیات کے سلسلے میں جو کچھ برآمد ہوا، اس میں زیادہ تعداد مذہبی گیتوں، دعاؤں، افسانوں، اجارہ ناموں اور خطوں کی ہے۔ ایک مجموعۂ قوانین بھی ملا ہے، جس کا تعلق چودھویں صدی قبل مسیح کے وسط سے ہے[۵]۔ اس مجموعے کی تعزیرات بہت

---

[۱] سلاطین حصہ اوّل باب ۱۱، آیت ۱، سموئیل حصہ دوم باب ۱۱، آیت ۳۔ اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ دوسرے حوالے میں حضرت سلیمانؑ کا نہیں، بلکہ حضرت داؤدؑ کا ذکر ہے۔ [۲] حزقی ایل باب ۱۶، آیت ۳، [۳] فریڈرک روزنے Friedrich Hrozny

[۴] Ignace J. Gelb کی کتاب حتی ہیروغلیفی کتبات ص ۸۔

[۵] روزنے کی کتاب بزبان فرانسیسی۔

ہلکی تھیں، حالانکہ سامیوں کی تعزیرات عموماً ہلکی نہیں ہوتی تھیں، اس میں "آنکھ کے بدلے آنکھ" والا قانون قطعاً موجود نہیں۔ زیادہ تر تعزیری قوانین زراعت کے متعلق رکھے گئے تھے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ زراعت اس دور میں اقتصادی نظام کی بنیاد تھی۔

مذہب

حتیوں کے مذہب کے متعلق زیادہ معلومات اب تک حاصل نہیں ہوئیں، مظاہر پرستی اپنی ابتدائی شکل میں بالکل نمایاں نظر آتی ہے۔ چشموں، دریاؤں، درختوں اور پہاڑوں کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ دیوتاؤں میں سب سے زیادہ معروف تیشوب تھا، جو آندھیوں اور جھکڑوں کا دیوتا تھا۔ اسی کو قومی دیوتا سمجھا جاتا۔ میتانی اسی کی پرستش کرتے تھے۔ مختلف شہروں کے دیوتاؤں کو اس کے مقامی مظاہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کا حتی نام "تلےپنوش"[۱] تھا۔ شام کا دیوتا حدد اس سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ مصریوں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا اس میں حدد کی رفیقہ کو عشتارت بتایا گیا ہے۔ لیکن اس کا حتی نام ابھی تک ٹھیک ٹھیک دریافت نہیں ہوا۔ شاید ما تھا[۲]۔ یہ دیوی زمین کی نمائندہ تھی اور مغلوب قوموں کی سب سے زیادہ پرانی دیوی تھی۔ تیشوب اور عشارت کی پوجا بالکل اسی طرح ہوتی تھی۔ جس طرح شام میں تموز عشتارت کی۔ مغرب میں ایڈونیس اور وینس کی اور ایشیائے کوچک میں آتیس[۳] اور سیبیل[۴] کی۔ تیشوب کو یوں پیش کیا جاتا تھا کہ ایک آدمی سانڈ پر کھڑا ہوتا اور اس نے ہاتھ میں بجلی پکڑ رکھی ہوتی۔ سب سے زیادہ طاقتور معبود سورج دیوی تھی۔ جو جنگ کی دیوی بن گئی اور اس نے زمین کی دیوی کی بھی کچھ صفتیں لے لیں۔ دیوتاؤں کا لباس جیسا کہ یادگاروں کی تمثالوں سے ظاہر ہوتا ہے، عموماً گھٹنوں سے اوپر کرتا ہوتا اور سر پر مخروطی شکل کی ٹوپی ہوتی، دیویوں کو بہت لمبے کرتے پہنائے جاتے اور ان کے سروں پر اسطوانہ نما بلند ٹوپیاں رکھی جاتیں۔ جوتے نوکدار ہوتے اور ان کا اگلا حصہ اوپر اٹھا ہوا ہوتا۔ یہ چیز دیوتاؤں اور دیویوں میں مشترک دیکھی گئی۔ انسانی شکلیں بھی اسی لباس میں بنائی جاتیں، مگر وہ جسامت میں دیوتاؤں سے کمتر ہوتیں۔ بھاری لباس اور اوپر اٹھے ہوئے جوتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم کی ابتدا سرد برفانی آب وہوا میں ہوئی۔

حتیوں نے شامیوں، مصریوں اور آشوریوں سے تعلقات پیدا کیے تو اجنبی دیوتاؤں اور دیویوں کو بھی اپنا لیا۔ مصری معاہدے میں ایسے الفاظ بھی آئے ہیں: "ایک ہزار دیوتا اور دیویاں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ حتیوں میں عورت کا درجہ مقابلۃً بلند تھا اور عام میلان ایک بیوی کی طرف تھا۔ اس کی تصدیق اوّل تو یوں ہوتی ہے کہ حتیوں کے دارالاصنام میں دیویوں کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ دوسرے جب شوبیلولیوما نے میتانی کے تخت کے لیے "متی وازا" کی حمایت کا فیصلہ کیا تو جو شرطیں منوائیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میتانی بادشاہ کی صرف ایک بیوی ہو اور وہ حتی شہزادی ہونی چاہیے۔

خابیرو کون تھے

عمارنہ کے دور میں جو حتی فوج شمالی شام کے اندر جنگی اقدامات کر رہی تھی، اس کے ساتھ اجنبی تنخواہ دار بھی شامل تھے، جنھیں مسماری کتبات میں خابیرو[۵] کہا گیا ہے۔ وہ جنوبی علاقوں کو پامال کر رہے تھے۔ خابیرو اکاوی لفظ ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ

---

[۱] Telepinush — [۲] Ma — [۳] Attis

[۴] Cybele — [۵] Khabiru

لفظ اصل میں عبری ہے (عبرانی) جس کے معنی ہیں "دوسری جانب سے آنے والا" "دریا کو عبور کرنے والا"، پندرھویں صدی قبل مسیح کی نوزی دستاویزوں میں خابیرو کو "رضا کار غلام" بتایا گیا ہے۔ ۱۳۰۰ق،م میں عپیرو[۵۱] کا ذکر آیا ہے۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ خابیرو کو عبرانی سمجھنا محل نظر ہے۔

حتیوں کی سرگزشت میں خابیرو کا ذکر پہلے پہل مرشلش اول (قریباً ۱۶۰۰ق،م) کے عہد میں آیا ہے۔ اسی نے ان لوگوں کو ملازم رکھا تھا۔ تل العمارنہ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خابیرو فرعون کے مقابلے میں باغیوں سے مل گئے تھے اور ۱۳۶۷ق،م میں انھوں نے شکیم پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان خطوط میں سے چند عبد خبا[۵۲] کے تھے۔ جو اورسلم (یروشلم[۵۳]) میں فرعون کا باجگزار تھا اور یہ اخناتون کے نام تھے۔ ان میں اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے خابیرو کے خلاف امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ جن سے عبد خبا کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ خابیرو کے متعلق کہیں کوئی واضح ذکر نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف عناصر کا ایک گروہ تھا جو وادیٔ دجلہ و فرات سے بھرتی کیا گیا تھا۔ یہ نام سب سے پہلے نارام سن (قریباً ۲۳۰۰ق،م) کے جنگجوؤں کے لیے استعمال ہوا۔ اور نارام سن قدیم اکادی حکمران خاندان سے تھا۔ پھر یہ نام اٹھارھویں صدی کے ایک خط میں بھی استعمال ہوا، جو ماری سے لکھا گیا تھا اور پندرھویں صدی کی نوزی تختیوں میں بھی یہ مذکور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مخصوص قومی گروہ نہ تھا، بلکہ خانہ بدوشوں، اجنبیوں اور قزاقوں کا ایک جتھا تھا، جو تنخواہ یا مال غنیمت کے لالچ میں ہر فوج کے ساتھ مل جاتا تھا۔

---

۵۱ Epiru ۵۲ Abd-Khiba ان میں سے پہلا لفظ یعنی "عبد"، سامی ہے جس کے معنی غلام کے ہیں، دوسرا لفظ حتیوں اور حوریوں کی ایک دیوی کا نام تھا۔ ۵۳ یروشلم کنعانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "بنیاد امن" یعنی وہ شہر جس کی بنیاد امن و سلامتی پر رکھی گئی۔ "شلم" اصل میں کنعانیوں کے نزدیک امن کا دیوتا تھا اور یہ لفظ ابی سلوم (ابن حضرت داؤدؑ) سلیمانؑ اور فونیقی ناموں میں بھی آیا ہے۔ راس شمرا/غاریت کی ایک تختی میں بھی اس کا ذکر ہے۔

ملاحظہ فرمائیں، بروز Burrows ص ۲۲۹۔

بارھواں باب

تیسرا بڑا سامی گروہ — آرامی

آرامی پہلے شمالی عرب کے صحرا میں خانہ بدوش قبائل کی زندگی بسر کر رہے تھے، بعد میں یہ لوگ آرامیوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ دوسرے بدوؤں کی طرح جو ان سے پہلے بھی گذر چکے تھے اور بعد میں بھی آئے، آرامی بھی وقتاً فوقتاً اپنے ہمسایوں، یعنی بابل اور شام کی قریبی سرزمینوں پر قبضہ جمانے کے لیے دباؤ ڈالتے رہتے تھے۔ دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصف آخر میں یہ لوگ وسطی دریائے فرات کے کناروں پر آباد ہو چکے تھے، وہیں انھوں نے ایک قوم کی صورت اختیار کی اور ایک زبان کو نشو ونما دے لی۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ آرامی زبان ایک مغربی سامی بولی سے پیدا ہوئی، جو دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصف اول میں دوآبۂ دجلہ و فرات کے شمال مغربی علاقوں کے اندر بولی جاتی تھی۔ آرامی نام ان لوگوں کو تغلت پلاسر اول (۱۱۰۰ ق،م) کے دور سے پیشتر نہیں ملا تھا اور اس وقت تک یہ لوگ وسط دریائے فرات کے ساتھ ساتھ آباد ہوتے ہوئے مغرب میں شام تک پہنچ گئے تھے۔ سولھویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں حتّیوں نے بابل اور شمالی شام پر حملے شروع کر دیے۔ تو بظاہر آرامیوں پر بھی نقل و حرکت کے دروازے کھل گئے اور صحرا سے آکر حضری زندگی اختیار کرنے والے نو آبادکاروں کو اس خطے میں مستقل قدم گاہ مل گئی۔ حتّیوں نے ڈیڑھ سو سال بعد میتانی سلطنت تباہ کر ڈالی، اس سے آرامیوں کے داخلے میں مزید سہولت پیدا ہو گئی۔ اموریوں اور کنعانیوں کے بعد آرامیوں کی یہ ہجرت صحرائی علاقے سے سامی گروہوں کی تیسری بڑی حرکت تھی۔

دوآبہ میں ابتدائی ظہور

یہ آرامی حرکت متعدد گروہوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی، اگرچہ اسے اس زمانے میں اس طرح تعبیر نہ کیا گیا۔ خابیرو کے علاوہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اخلامو[1] بھی اس حرکت میں شریک تھے۔ اخلامو کے معنی ہیں رفیق اور ساتھی۔ یہ قومی نہیں، جنسی نام تھا اور خیال یہ ہے کہ پہلے[ii] اموریوں نے یہ نام قبائل کے اس مجموعے کو دیا تھا، جو دریائے فرات پر رہتا تھا۔ آشوری بادشاہ آدد نیراری اول (۱۳۰۰ ق،م) ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے باپ نے اخلامو گروہوں کو شمالی دوآبہ میں مسخر کیا تھا۔ حتو شلش نے ۱۲۷۵ ق،م کے آس پاس شاہ بابل کو ایک خط لکھا تھا، جس میں دریائے فرات کے اخلامو دشمنوں کا بھی ذکر ہے۔ اس سے پیشتر ہم تل العمارنہ کے ایک خط میں پڑھتے ہیں کہ اخناتون کے عہد میں اخلامو شامی شہروں اور زمینوں پر قبضہ جما رہے تھے۔ یہ سب کچھ بے وفا مقامی سرداروں کی قیادت میں نہیں تو کم از کم ان کی خفیہ امداد سے ہو رہا تھا۔ بعد کی دستاویزوں میں آرامیوں اور اخلامو کے درمیان گہرے تعلقات بتائے گئے ہیں۔ تغلت پلاسر اول ایک خط میں لکھتا ہے: "میں اخلامی آرامی گروہوں کے درمیان پیش قدمی کر رہا ہوں جو میرے آقا آشور

---

[1] Akhlamu

اور سرکاری کاروبار ہی کی زبان نہ رہی، بلکہ باشندوں کی عام بولی بن گئی اور اس نے اپنی تمام ہمسر زبانوں پر، جن میں عبرانی بھی شامل تھی، فتح کامل حاصل کرلی یہاں تک کہ حضرت مسیح اور ان کی قوم کی زبان بھی یہی تھی[۵۱]۔ مسیحیوں کے متعلق پہلا نہیں تو دوسرا ذکر آرامی زبان ہی میں ملا ہے، جو لاطینی حروف میں ایک مکان کی دیوار پر لکھی گئی تھی۔ یہ مکان بظاہر ایک کلیسا تھا۔ گویا یہ تحریر ۹۰۶ء سے پیشتر کی ہے[۵۲]۔ مسیحیوں کی ایک نہایت مقدس دعا آرامی دعا سے نکلی ہے جسے قدیش (مقدس، پاک) کہتے ہیں۔ نصف آرامی دعا لفظاً لفظاً مسیحی دعا میں دہرائی جاتی ہے۔ وہ یوں شروع ہوتی ہے۔ "اس کے بزرگ نام کی تقدیس اور جلال بڑھے[۵۳]"۔ اجیقار کا افسانہ عام طور پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں آشوریہ اور بابل کے بعض حکیمانہ اقوال بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ ساتویں صدی قبل مسیح[۵۴] یا اس کے بعد آرامی زبان میں لکھا گیا تھا[۵۵]۔

آرامی زبان کا نفوذ صرف سامی حلقے تک محدود نہ رہا۔ دارائے اعظم (۵۲۱ ق م - ۴۸۶ ق م) کے ماتحت آرامی زبان حکومت ایران کے صوبوں کے درمیان روابط کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس طرح سکندر کی آمد تک یہ زبان ہندوستان و حبشہ کے درمیانی علاقے کی ایسی بولی بن گئی، جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ کسی حکومت کی پشتیبانی کے بغیر زبان کے اس طرح پھیلنے اور کامیاب ہونے کی کوئی مثال تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

آرامی زبان کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ فونیقی ابجد بھی پھیلتی گئی۔ آرامیوں نے سب سے پہلے یہ ابجد اختیار کی تھی، پھر اسے ایشیا کی دوسری زبانوں نے اختیار کرلیا۔ عبرانیوں نے اپنی ابجد چھٹی اور چوتھی صدی کے درمیان آرامیوں ہی سے لی تھی۔ اس سے پیشتر وہ فونیقی ابجد استعمال کرتے تھے۔ جن مربع حروف میں عبرانی بائیبل اب چھاپی جاتی ہے، وہ آرامی رسم الخط ہی سے نکالے گئے تھے۔ شمالی عرب کے باشندوں نے بھی اپنی ابجد آرامیوں ہی سے لی تھی، مگر بیچ میں نبطی واسطہ بن گئے۔ قرآن مجید اسی ابجد میں لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ارمنیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں نے آرامی سرچشمے ہی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ابجدیں ایجاد کیں۔ پہلوی اور سنسکرت دونوں زبانوں کے حروف اصلاً آرامی ہیں۔ ہندوستان سے بدھ مت کے مذہبی پیشوا سنسکرت ابجد کو چین اور کوریا کے قلب میں لے گئے۔ اس طرح فونیقی حروف مشرقی جانب آرامی زبان کے ذریعے سے مشرق بعید تک اور مغرب میں یونانیوں کے واسطے سے شمالی و جنوبی امریکہ تک پہنچ گئے۔ اس طرح انھوں نے پوری دنیا کا احاطہ کرلیا۔

آرامی کتبے

ابتدائی آرامی کتبے، جن کا اب ہمیں علم ہے، شمالی شام سے ملے تھے اور وہ نویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر سا کتبہ تل الحلف (غوزانہ[۵۵]) سے ملا۔ پھر ایک کتبہ ۸۵۰ ق م کے آس پاس کا دستیاب ہوا۔ یہ ایک قطر کی سل تھی، جس پر بن ہدد اول

---

۵۱ وہ آرامی زبان ہی تھی جس میں انجیلیں لکھی گئیں۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو چارلس سی ٹورے Torrey کی کتاب Our Translated Gospels

۵۲ نیوبولڈ Newbold کا مقالہ Five Transliterated Aramaic Inscriptions مزید حوالے کے لیے ملاحظہ ہو رسولوں کے اعمال باب ۱۱، آیت ۲۶۔

۵۳ اس کا عبرانی متن ملاحظہ ہو حزقی ایل باب ۳۸، آیت ۲۳۔

۵۴ اس کا ذکر پہلے طوبیاہ میں آیا ہے۔ یہ بہادر عبرانی، سریانی، آرامی، عربی اور دوسری زبانوں کی کہانیوں میں مذکور ہوا۔ اور امثال کا مصنف بھی اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ ایسوپ کی کہانیوں میں بھی اس کا اثر پایا جاتا ہے۔

۵۵ ریمان اے بومین Bowman کا مقالہ The Old Aramaic Alphabet of Tell Halaf

کا نام ہے اور یہ حلب سے ساڑھے چار میل شمال میں ملا جو بن حدد کے عہدِ حکومت میں دمشق کے تابع تھا۔ اس کی عبارت یوں ہے:

"یہ بُت بار حدد بن طاب رمّان بن حاضیان شاہ ارام نے اپنے
خداوند ملقارت کے لیے نصب کی، جب خداوند نے اس کی دعا جو
اس نے اس وقت منت مان لی گئی تھی[1]"

اسی طرح ذاکر شاہ حماۃ اور لعش (دشمۂ ق م)[2] کا مشہور کتبہ، جو پہلے قدیم ترین سمجھا جاتا تھا، تیسرے درجے پر چلا گیا۔ ذاکر نے یہ کتبہ اس وقت نصب کیا تھا، جب اسے سترہ بادشاہوں کے حملے سے نجات ملی تھی۔ ان میں دمشق، شمأل اور متعدد دوسرے فونیقی شہروں کے بادشاہ شامل تھے۔

ایک اور پرانا کتبہ، جو آرامیوں کی یادگار ہے، زنجرلی (شمأل) سے ملا، جو شمال میں آرامی سلطنت کا ایک مرکزی شہر تھا۔ ان یادگاری کتبوں کے علاوہ بہت سے عدالتی رجسٹر اور اوزان ملے، جن پر آرامی زبان کی تحریریں تھیں اور یہ آٹھویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی قبل مسیح تک کے تھے۔ پپیرس پر جو آرامی تحریریں مصرِ بالا میں یہودی آبادکاروں نے لکھی تھیں اور جو الیفنٹائن (موجودہ جزیرہ اسوان) سے ملیں، وہ پانسو قبل مسیح سے چار سو قبل مسیح تک کی ہیں۔

آخر آرامی زبان دو حصوں میں بٹ گئی: ایک مشرقی زبان جو وادیٔ فرات میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے نمونے ہمیں مندعی اور سریانی میں ملتے ہیں۔ دوسری مغربی زبان۔ اس کا نمونہ بائیبل کی آرامی زبان اور ترگوم میں ملتا ہے۔ علاوہ شمأل، حماۃ، تدمر کی بولیاں، نیز نبطی بولی اسی کی نمائندہ ہے۔ مندعی زبان ساتویں سے نویں صدی مسیحی تک ایک گیانی دھیانی فرقہ بولتا تھا، جو دریائے فرات کے کنارے رہتا تھا۔ سریانی زبان اولیسا (الرُّہا) میں بولی جاتی تھی پھر بہ جزوی ترمیمات کے ساتھ شام، لبنان اور دوآبہ دجلہ و فرات کے کلیسا کی زبان بن گئی اور تیسری صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک بولی جاتی رہی، پھر اس کی جگہ عربی نے لے لی[3]۔ آرامی مسیحیوں نے اولیسا کی بولی اختیار کر لی اور اسے مذہبی، ادبی اور شائستہ بول چال کی زبان بنا لیا۔ وہ شامی مشہور ہو گئے۔ ان کا ابتدائی نام یعنی آرامی اس وجہ سے ناخوشگوار ہو گیا کہ یہ کفر کے مترادف تھا۔ لہٰذا اس سے وہ اجتناب کرنے لگے اور اس کی جگہ باشندوں کے لیے یونانی لفظ سوری (شامی) اور زبان کے لیے سریانی لفظ استعمال ہونے لگا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یونانی سرزمینِ آرام کو سوریہ کہتے تھے۔ بائیبل کے سبعینی ترجمے، نیز لاطینی ترجمے میں باشندوں کو "سوری" اور زبان کو بھی "سوری" قرار دیا گیا ہے[4]۔ دورِ حاضر کی تعبیرات میں "سریان" کی اصطلاح

---

[1] مادس (افاین) نیز البرائٹ۔ [2] یالعش، اس کے دارالحکومت کا نام حزرک تھا، بائیبل میں اسے حدراک بتایا گیا ہے (دیکھیے زکریاہ باب ۹، آیت ۱) یہ دریائے عاصی پر حماۃ کے جنوب میں اور قطنہ کے مغرب میں واقع تھا۔

[3] عزرا باب چہارم آیت ۸، باب ۶، آیت ۱۸۔ باب ۷، آیات ۱۲-۲۶۔ دانی ایل باب ۲، آیت ۴۔ باب ۷، آیت ۲۸۔ جو آرامی کلمے حضرت مسیحؑ نے دہرائے۔ ان کے لیے دیکھیے مرقس کی انجیل باب ۵، آیت ۴۱۔ باب ۷، آیت ۳۴۔ چونکہ دانی ایل میں یہ زبان کلدانیوں نے استعمال کی، اس لیے اہلِ یورپ اسے غلطی سے کالڈی یا کلدانی کہنے لگے۔ کلدانی یا نو بابلی ایک اکادی زبان استعمال کرتے تھے۔

[4] عزرا باب ۴، آیت ۷۔ دانی ایل باب آیت ۴

اویساکی بولی اور اس سے پیدا ہونے والی بولیوں تک محدود ہے۔

مادّی حضارت

آرامیوں نے انھیں لوگوں کی حضارت اختیار کر لی، جن کے درمیان وہ بس گئے تھے۔ شمالی شام میں وہ حتّی آشوری حضارت کے وارث بن گئے اور اس کی ترقی کا سلسلہ جاری رکھا۔ وسطی شام میں انھوں نے کنعانیوں کی حضارت اختیار کر لی۔ ان کا شمالی و مغربی مرکز شمال[1] تھا۔ اس کی وضع قطع حتّی شہر کی سی تھی، لیکن وہاں کے بادشاہوں کے نام زیادہ تر آرامی تھے اور انھوں نے جو کتبے چھوڑے، وہ فونیقی حروف میں تھے۔ یہ ان چند آرامی شہروں میں سے ہے، جن میں کھدائی ہو چکی ہے۔

اس کے بادشاہوں میں سے ایک کا نام پناموّاول تھا۔ یہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے نصف اوّل میں گزرا ہے۔ اس نے ہدد دیوتا کا ایک بہت بڑا مجسمہ بنوایا تھا، جو ساڑھے نو فٹ اونچا تھا اور اس کے سر پر دو سینگوں والی ٹوپی رکھی تھی، ڈاڑھی گول اور گھنگریالی تھی۔ آنکھیں ذرا اندر دھنسی ہوئی اور ہاتھ پھیلا رکھے تھے، گویا وہ عقیدت مندوں کو برکت دے رہا ہے[2]۔ کمر کے نیچے کتبے میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ بادشاہ کا اصل مقصد عوام کی بہبود کے سوا کچھ نہیں۔ جو زمین مہربان دیوتاؤں نے اسے عطا کی، وہ جَو، گیہوں اور لہسن کی زمین تھی۔ لوگ زمین میں کھیتی باڑی کرتے اور انگور کے باغات لگاتے ہیں[3]۔ پناموّثانی (۷۳۲ ق م) کی یادگار میں ایک مجسمہ تیار کر کے اس کی قبر پر نصب کیا گیا تھا۔ یہ غالباً اس کے فرزند کا کام تھا۔ اس میں وہ بتاتا ہے: میرے والد پناموّ نے اپنے زمانے میں ساقی اور رتھ چلانے والے مقرر کیے۔ اس طرح شاہی دربار کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گیا۔

پناموّثانی کے بیٹے بار رکاب کی تمثال ایک نہایت عالی شان تخت پر بنائی گئی تھی، جو آبنوس، ہاتھی دانت اور سونے سے بنایا گیا تھا۔ یہ تخت آشوری بادشاہوں کے تخت سے شان و شکوہ میں کم نہ تھا۔ دیودار کے مخروطی سہاروں پر ٹکتا تھا اور نشست کے چاروں کونوں پر بیلوں کے سر بنا دیے گئے تھے۔ پاؤں رکھنے کے لیے ایک نہایت آراستہ پائدان بنایا گیا تھا۔ بڑے حاشیے والی عبا پہن رکھی تھی اور گرہ دار ٹوپی کی وضع حتّیوں کی سی تھی۔ ڈاڑھی اور زلفیں آشوریوں کے نمونے کی تھیں۔

گرجنے والا حدّد

جس دیوتا کی پوجا آرامیوں میں سب سے زیادہ ہوتی تھی، وہ طوفانوں کا دیوتا حدّد تھا، جسے اود اور ادو بھی کہتے تھے۔ یہ بجلی اور رعد کا بھی دیوتا تھا۔ اس کی ایک صفت مہربانی کی تھی، یعنی یہ مینہ برساتا تھا، جس سے زمین میں قوت نمو بڑھتی تھی اور ایک صفت قہر کی بھی تھی، یہ طوفانوں اور سیلوں کی شکل میں نمایاں ہوتی تھی۔ اس کا ایک لقب ریموں بھی تھا، یعنی گرجنے اور کڑکنے والا۔ نعمان شامی اپنے آقا شاہ دمشق کے دیوتا کو اسی لقب سے پکارتا تھا۔ بعض اوقات ان دونوں کو اکٹھا کر دیا جاتا تھا، یعنی ''حدّد ریموں''[4]۔ زنجرلی میں ایک تمثال ملی تھی، جس کے ایک ہاتھ میں سہ شاخہ آلہ تھا اور دوسرے میں ہتھوڑا۔ یہ دونوں چیزیں برق و رعد کی علامت تھیں۔ عاطیہ میں اسے ایک بیل کی پیٹھ پر بحالت قیام

---

[1] موجودہ زنجرلی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جو انطاکیہ اور دمشق کے درمیان ہے، یہیں عظیم الشان شمال شہر واقع تھا۔ [2] یہ مجسمہ ۱۸۹۰ء میں کارجین سے ملا تھا۔ جو زنجرلی سے ۱/۲ ۱ شمال مشرق میں ہے [3] گک ص ۱۹۱ پناموّ اپنے آپ کو پوڈری بادشاہ کہتا ہے، اسے یہودا سمجھا گیا ہے۔ [4] گک ص ۱۷۴۔

[5] اکادیوں نے یہ لفظ مغرب سے لیا، لیکن اسے ''ان یہ معنی آلہ سے کوئی تعلق نہیں) آشوری اسے رمان یا رمّان کہتے تھے۔ حدّد غالباً عربی لفظ ہدّ سے نکلا۔ جس کے معنی توڑنے کے ہیں۔

دکھایا گیا ہے، اسے تخلیقی قوتوں کا نشان سمجھنا چاہیے۔ حدد دیوتا کا سب سے بڑا معبد ہیراپولس[١] میں تھا، لیکن شام و لبنان کے دوسرے شہروں میں بھی اس کے لیے بہت سے ہیکل بنے ہوئے تھے۔ شام کے زراعت پیشہ لوگوں کو اس سے بڑی محبت تھی، لیکن آگے چل کر اس میں سورج کی پوجا ملادی گئی اور اس کے سر کو کرنوں سے آراستہ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیسا کہ بعلبک میں تھا۔ اغلب یہ ہے کہ جوپیٹر ہیلیوپولی طانس، جس کا مندر بعلبک میں بنا، دراصل حدد ہی تھا۔ رومیوں کے زمانے میں اسے جوپیٹر دمشقی بنا دیا گیا۔

روم کے سیارا ولا[٢] کے ساتھ جو باغ ہے، اس میں سنگِ مرمر کی ایک چھوٹی سی قربان گاہ ہے، اس پر ایک کتبہ تھا، جس میں یہ قربان گاہ لبنانی حدد کے نام پر نذر کی گئی تھی۔

پانامو اول نے حدد کے مجسمے پر جو کتبہ لگایا تھا، اس میں بیٹے کو قربانی کے وقت یہ دعا مانگنے کی ہدایت کی تھی: "دعا ہے کہ پانامو کی روح حدد کے ساتھ کھائے، اس کی روح حدد کے ساتھ پیے اور وہ حدد کو نذر پیش کرتے وقت خوش ہو[٣]۔" اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے آرامیوں کا عقیدہ بعد مرگ کے متعلق کیا تھا۔ ان کا دستور تھا کہ اپنے بچوں کے نام بار حدد رکھتے، یعنی حدد کا بیٹا یا کسی دوسرے دیوتا کا بیٹا کہہ کر پکارتے۔ یہ دستور شام میں مسیحیوں کے زمانے تک رائج رہا۔ اس سے دیوتا اور اس کے پجاریوں کا گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

اتار غاتس

حدد کی بیوی، یعنی توالد و تناسل کی دیوی کی پرستش ہیراپولس اور دوسرے آرامی مرکزوں میں اتار غاتس[٤] کے نام سے کی جاتی تھی۔ یونانی اور رومی اسے صرف شامی دیوی کہتے تھے۔ لوسیان[٥] نے کلاسیکی زمانے میں اس کی پوجا کا حال بیان کیا ہے۔ یہ شخص سمیساط کا شامی تھا۔ ۱۲۵ء میں پیدا ہوا اور اس نے یونانی زبان میں کتابیں لکھیں۔ اس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوی کی پوجا کے عام طور طریقے وہی تھے، جو امومت کی نمائندہ سامی دیویوں کے سلسلے میں رائج ہیں۔ ہیراپولس سے جو سکّے برآمد ہوئے ہیں، ان میں اسے تاج پہنے ہوئے دکھایا گیا ہے اور ایک شیر اس کے ساتھ ہے۔ اس کا نشان ہلال تھا، ساتھ قرصِ خورشید رکھی جاتی تھی۔ جلعاد میں کرنیون[٦] کے مقام پر اس کا ایک مندر تھا۔ عسقلان (فلسطین) میں اسے افرودیت بنا لیا گیا تھا اور وہاں اس کی پوجا کا مرکز تھا۔

سلوکیوں کے زمانے میں اتار غاتس کی پوجا یونانیوں میں بھی رواج پا گئی۔ یونان سے یہ روم پہنچی۔ جہاں اس کے نام پر ایک

---

١ Hierapolis آشوری میں نمپگی Nampigi آرامی میں نپّی گو Nappigu بعد میں بابج Mabug یا Mabbog بہ معنی پھلنا پھولنا۔ یونانی میں بمبیس اور لاطینی میں ہیراپولس یعنی مقدس شہر، آج کل اسے بلج کہتے ہیں۔

٢ Sciarra villa
٣ لک ص ۹۰
٤ یہ یونانی شکل ہے، جو غار سے ماخوذ ہے، یعنی عشتارت آرامی عتاہ پہلے دونوں نقطہ الگ تھے پھر انھیں ملا دیا گیا۔

٥ Lucian

٦ یا قرنیم غالباً یہ وہی مقام ہے، جسے بائیبل میں عشتارات قرنیم بتایا گیا ہے (پیدائش باب ۱۴، آیت ۵) موجودہ تل عشترا جو درعا سے گیارہ میل شمال مغرب میں ہے۔ یا تل الشعری، جو عشترا سے چار میل جنوب میں ہے۔

مندر بنا دیا گیا۔ رومی یادگاروں میں اسے ایک تخت پر بٹھایا گیا ہے اور اس کے دونوں طرف دو شیر ہیں۔ اس کے پروہت عام طور پر خواجہ سرا ہوتے تھے، جو وقتاً فوقتاً یونان اور اٹلی چلے جاتے تھے۔ تاکہ پیش گوئیوں اور وجد و حال سے لبریز رقص کے ذریعے سے آتار غاتس کی پوجا کو ترقی دیں اور ہیراپولس میں اس کا جو مرکز تھا، اس کے لیے خیرات جمع کریں۔

ہیراپولس سے ایک سکّہ برآمد ہوا، جس پر آتار غاتس کو ایک عجیب صورت میں پیش کیا گیا ہے، یعنی اس نے نقاب پہن رکھی ہے۔ اس کے بعد نقاب پوش آتار غاتس کی اور بھی کئی تمثالیں برآمد ہوئیں۔ تدمر کے معبد بعل میں جو نقش و نگار ہیں، ان میں عورتوں کو اسی طرح نقاب پوش دکھایا گیا ہے، جس طرح پرانے خیال کی برقع پوش مسلمان عورتیں ہوتی ہیں۔ بالکل یہی کیفیت دورا یوروپس[1] میں استر کاری کی ہے۔ دوسری یادگاروں میں صرف سر کو چھپایا گیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں قدیم زمانے سے نقاب شادی شدہ عورت کے لیے لازم سمجھا جاتا تھا اور یہی اس کا خاص نشان تھا۔ آشوری قوانین میں، جو دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے نصف ثانی کے ہیں، آزاد خاندانوں کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیے لازم تھا کہ بازار میں نکلیں تو سر کو خوب ڈھانپ لیا کریں۔

حدد اور آتار غاتس کے علاوہ آرامیوں کے دارالاصنام میں دوسرے درجے کے اور بھی معبود تھے، جن میں سے بعض کی حیثیت مقامی تھی، بعض ہمسایوں سے مستعار لیے گئے تھے۔ حدد، ایل، رکاب ایل، شمس اور رشوف وہ دیوتا تھے، جنھوں نے پنامو اوّل کے کتبے کے مطابق شاہی عصا اسے دیا اور اس کی تمام دعائیں قبول کر لیں۔ رکاب کا مطلب ہے رتھ چلانے والا، یہ آشوریوں کا سورج دیوتا تھا، جسے شامی اپنے ہاں لے آئے۔ شمس آشوریوں نے سورج دیوتا کا نام رکھا تھا، اس کی پوجا پوری سامی دنیا میں ہوتی تھی، رشوف وہی دیوتا تھا، جسے فونیقی "رشف" کہتے تھے، یہ عموماً ایک جنگجو سپاہی کی حیثیت میں بنایا جاتا تھا۔ زاکر اپنے ایک کتبے میں بعل شمین (آقائے سماوات) کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے:

> "جو کوئی زاکر شاہ حماۃ و لعش کا نام اس تختی سے مٹائے گا یا ایل ویر[2] کے سامنے اسے خراب
> کرے گا یا اسے جگہ سے ہٹائے گا یا ہاتھ اس کے خلاف اٹھائے گا ....
> .... تو بعل شمین، ایل ویر، شمس سہر، نیر آسمان اور زمین کے دیوتا
> اسے ہلاک کر ڈالیں گے[3]۔"

بعل شمین بدیہی طور پر حدد ہے۔ ایل ویر کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا۔ سہر[4] چاند کا دیوتا ہے، حران چندر دیوتا کا اصل مقام تھا۔ آشوری اسے "سین" کہتے تھے۔ تیما کے ایک سنگی کتبے میں، جو پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے، اس دیوتا کو شنگلہ[5] کہا گیا ہے۔ یہ آشوریوں سے لیا ہوا نام ہے، جس کے معنی ہیں "سین عظیم"۔ اس کتبے میں دو مزید دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک کا نام سلم ہے، تمثال یا مجسمہ یہ غالباً مقامی بعل کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے کا نام عشیرہ (عاشرہ[6]) ہے۔

---

۱ Dura Europus یہ مدفون شہر اتحادی فوجوں نے ۱۹۲۲ء میں دریافت کیا تھا۔ ۲ El Wer

۳ Pognon ص ۱۷۸ ۴ عربی لفظ "شہر" یعنی مہینا اسی سے ماخوذ ہے، چونکہ مہینوں کا تعین چاند کی بنا پر ہوتا تھا، اسی لیے یہ نام رکھ لیا۔

۵ Shingalla ۶ Asherah

تیرھواں باب

عبرانی گروہ

عبرانی ——— اموریوں، کنعانیوں اور آرامیوں کے بعد ——— چوتھا سامی گروہ تھے، جس نے شام میں توطن اختیار کیا۔ اموریوں کے عہد میں معاملات شام کا مرکزِ انجذاب شمال میں ملک کا وہ حصّہ تھا جسے عام طور پر شام کا "زرخیز نما حصّہ" کہتے ہیں۔ کنعانیوں کے دَور میں مرکز ساحلی علاقے کی طرف منتقل ہو گیا۔ آرامیوں کے زمانۂ اقتدار میں یہ مرکز اندرونِ ملک میں تھا۔ عبرانی شام میں پہنچے تو جنوب میں فلسطین کو نمایاں اور مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

عبرانیوں کی اصل

اس زمانے میں شام کے جنوبی حصّے کو کنعان کہتے تھے، یہیں سے عبرانی داخل ہوئے۔ ان کی ہجرت کو تین مختلف حرکتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان واضح حدِ فاصل موجود نہیں۔ پہلی ہجرت دوآبہ دجلہ و فرات سے شروع ہوئی تھی اور یہ اٹھارھویں صدی قبل مسیحؑ کا واقعہ ہونا چاہیے، جب ہکسوس حوری بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل پر پہنچے تھے۔ دوسری ہجرت چودھویں صدی میں آرامیوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ یہ تل العمارنہ کا عہد ہے۔ تیسری ہجرت وہ ہے جو مصر سے نیز جنوب مشرق سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشعؑ کے زیرِ قیادت تیرھویں صدی قبل مسیحؑ کے اواخر میں ہوئی، اس کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے۔[۵۲] جب عبرانیوں کے بزرگ دوآبہ سے پیشتر دین کر آئے تھے تو اس وقت ساحلی علاقے میں کنعانیوں کو بہت بڑی اکثریت حاصل تھی۔ سطح مرتفع پر اموری آباد تھے، لیکن یہ آبادی راحت پسند اور تن آسان تھی اور زیادہ گھنی نہ تھی، لہٰذا نو واردوں کو آبادکاری کا اچھا موقع مل گیا۔ چھوٹے گروہوں نے ان مقامات پر قبضہ جما رکھا تھا، جو دُور اُفتادہ تھے اور ہر ایک کے وہاں پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ نو واردوں نے ان سب سے شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر لیے۔ اس طرح عبرانی وجود میں آئے، جن کی اصل و نسل میں سامیوں، حوریوں، حتّیوں اور دوسرے غیر سامی عناصر کا خون شامل تھا۔

باہر سے جو خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش آتے تھے، شام پہنچتے ہی تن آسان بن جاتے اور اپنی قوت کا اصل سرچشمہ یعنی نقل و حرکت چھوڑ بیٹھے، عبرانیوں کے تعلق میں شامل کی یہ خصوصیت بطور خاص نمایاں ہوئی۔ جو لوگ آگے چل کر عبرانی کہلائے، وہ صحرا نوردی اور طالع آزمائی کرتے ہوئے آئے تھے، یا انھوں نے تنخواہ دار سپاہیوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور کسی جماعت یا گروہ سے ان کا ربط اور تعلق نہ تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے سے پیشتر کے آبادکاروں کے درمیان مقیم ہو گئے، جو ان سے زیادہ مہذب تھے۔ وہاں انھوں نے کھیتی باڑی کرنے، مکان بنانے کا ڈھنگ سیکھ لیا اور ان تمام فنون میں مشغول ہو گئے، جنھیں عام طور پر فنون حالت امن

---

۵۲ تھیو فائل جے میک Meek کی کتاب Hebrew Origins ص ۳ سے آگے۔

کہا جاتا تھا، بلکہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عبرانیوں نے اپنی سامی بولی چھوڑ کر کنعانی زبان اختیار کرلی۔ فونیقی زبان اور پرانی عبرانی زبان، جس میں عہد نامۂ قدیم لکھا گیا تھا، صرف بول چال میں الگ الگ ہیں۔ بہرحال قدیم عبرانی لوگ بہ حیثیت مجموعی کنعانیوں کی مادی حضارت کے بنیادی پہلوؤں کے وارث بن گئے اور انھوں نے کنعانیوں کی بہت سی مذہبی عبادتوں، عادتوں اور دینی رسموں کو کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھا۔

سرداران قبیلہ کا دور

شام میں عبرانیوں کے ابتدائی دور پر پردہ پڑا ہوا ہے اور اس کے متعلق جو بھی دستاویزیں ملتی ہیں، ان کا اسلوب تحریر افسانوی اور روایاتی ہے۔ عبرانی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ[۵۱] علیہ السلام ——— یا وہ قبیلہ، جس سے ان کا تعلق ہے ——— دوآبۂ دجلہ و فرات کے شہر "اور" سے چلے اور حرّان کے راستے فلسطین پہنچ کر عارضی طور پر حبرون میں مقیم ہوگئے۔ ان کے جانشین حضرت اسحاقؑ[۵۲] تھے۔ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے کا نام یعقوبؑ[۵۳] تھا۔ حضرت یعقوبؑ کئی سال تک فدان آرام میں رہے۔ پھر وہ اپنے بڑے بھائی عیسو کے مقابلے میں زیادہ صاحب فضیلت قرار پائے[۵۴]۔ اور انھوں نے اپنا نام بدل کر اسرائیل[۵۵] رکھ لیا۔ عیسو کا دوسرا نام ادوم (سرخ) تھا۔ اس کے اخلاف نے انجام کار کوہ سعیر کے مقامی باشندوں سے زمینیں چھین لیں اور خود ادومیوں کے لقب سے مشہور ہوئے[۵۶]۔ یوں عیسو عبرانیوں کی زندگی اور فکر کے دھارے سے باہر نکل گیا، جس طرح پیشتر حضرت اسماعیلؑ[۵۶] کو حضرت اسحاقؑ کے مقابلے میں الگ کر دیا گیا تھا۔ وہ ایک مصری کنیز حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھے[۵۷]۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے ہوئے جن میں سے گیارھویں، یعنی حضرت یوسفؑ[۵۸]، جو راحیل کے بڑے بیٹے تھے، ایک گروہ کے ہاتھ فروخت ہوئے، جو مصر جا رہا تھا، وہاں انھوں نے سلطنت مصر میں بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے اخلاف نے کئی پشتیں مصر میں گزاریں۔ پھر وہ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں "ارض موعود" کی طرف لوٹے۔

یہ ابتدائی عبرانی سرگزشت کا سرسری خاکہ ہے جو اصل واقعے کے سینکڑوں سال بعد مرتب ہوا اور یہ افواہوں یا زبانی روایتوں کے طویل سلسلے پر مبنی تھا۔

ان وقائع نگاروں نے عبرانیوں کے جدّ اعلیٰ کی کہانی بیان کر دینے پر قناعت نہ کی، بلکہ وہ اسے پھیلاتے پھیلاتے انسانیت کی کہانی تیار کرنے میں لگ گئے اور انھوں نے تخلیق کے آغاز سے اصل خاکے کی ابتدا کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بابلی روایات بھی لے لیں۔ اس حقیقت کا احساس گزشتہ صدی کے وسط تک نہیں کیا گیا تھا۔ ہاں جب سماری کتبوں کی کلید مل گئی اور تخلیق عالم، نیز طوفان وغیرہ کے متعلق ویسی ہی کہانیاں سامنے آگئیں، جیسی بائیبل کی کتاب پیدائش میں درج تھیں تو اس وقت احساس ہوا۔ بلاشبہ عبرانی مؤرخوں نے ان کہانیوں کو عمدہ شکل دے دی اور ان سے اخلاقی نتائج پیدا کیے۔ پھر انھیں ایسے حسین و جمیل اسلوب میں پیش کیا، کہ یہ

---

۵۱ عبرانی زبان میں "ابہرام"، Abh-ram یعنی جد رفیع یا جد عالی۔ ۵۲ عبرانی میں "یسحاق"، جس کے معنی ہیں "خدا خوش ہو"۔ ۵۳ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش، باب ۲۵، آیت ۲۳، پھر آیات ۲۷، ۳۴۔ ۵۴ عبرانی میں "یسرائیل" جس کے معنی ہیں "حکم صرف اللہ کے لیے ہے"۔ ۵۵ استثنا باب ۲، آیات ۴ تا ۲۲۔ ۵۶ یشمع ایل جس کے معنی ہیں "اللہ نے سن لیا"۔ ۵۷ یہاں بحث کی ضرورت نہیں، تاہم اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت ہاجرہ کنیز نہ تھیں، بلکہ مصر کی شہزادی تھیں۔ ۵۸ عبرانی یوسف جس کے معنی ہیں "اللہ اضافہ کرے"۔

عالمِ انسانیت کی ادبی میراث کا ایک حصہ بن گئیں۔ اس حیثیت میں یہ تمام سرزمینوں اور تمام زبانوں کے خواندوں کے لیے دلچسپی اور ہدایت کا سرچشمہ بنی رہیں۔ سردارانِ قبیلہ کا عہد شروع ہونے سے پیشتر جو تاریخ عبرانی وقائع نگاروں نے مرتب کی ہے، صاف ظاہر ہے کہ وہ تاریخ نہیں۔ خود سردارانِ قبائل کے وقائع میں سے بھی چھان پھٹک کر تاریخی حقائق نکال لینا سہل نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی کہانی عبرانیوں کی ابتدائی ہجرت کا آئینہ ہے، اسرائیل کی کہانی سے دوسری ہجرت کا پتا چلتا ہے، البتہ حضرت موسیٰؑ کی کہانی کو قطعی طور پر تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

خروج

اسرائیلیوں کی حقیقی تاریخ بحیثیت قوم اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب انھوں نے مصر سے خروج کیا۔ یہ عہد آفرین واقعہ تیرھویں صدی قبل مسیحؑ کے ثلث آخر میں پیش آیا۔ ہکسوس کے مصر میں عبرانیوں کے ایک قبیلے قبیلۂ راحیل — کو مصر میں قیام کا موقع مل گیا اور اس نے وہاں خوب ترقی کی۔ ان کی آبادی جشن[۵۱] میں تھی جو ہکسوس کے دارالحکومت افاریس کے قریب تھا۔ پھر ایک ایسے فرعون کا دور آیا، جو یوسفؑ کو نہیں جانتا تھا[۵۲]۔ یہ بظاہر رعمیسس ثانی (۱۲۹۹ ق م - ۱۲۳۲ ق م) تھا۔ خروج غالباً ۱۲۹۰ ق م کا واقعہ ہے۔ رعمیسس کے بیٹے مرنفتاح کا ایک کتبہ تھیبز (طیبہ) میں تھا اور ۱۲۳۰ ق م کا ہے اور اس میں پہلی مرتبہ ایک قوم کا نام اسرائیل بتایا گیا ہے، جو فلسطین میں تھی۔ ممکن ہے، یہ اشارہ ان اسرائیلیوں کی طرف ہو، جو نقلِ وطن کر کے مصر نہیں گئے تھے۔

تیرھویں صدی قبل مسیحؑ کے شروع میں راحیل قبیلے کے لوگ مصر سے نکلے اور بڑی مدت تک سینا اور قادش برنیا[۵۳] کے آس پاس چکر لگاتے رہے۔ وہاں انھیں ناگفتہ بہ مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔ وہ طویل اور خوفناک شور زار، جس کے مصائب پشتوں تک عبرانیوں کے حافظے کو متاثر کرتے رہے، اب پانچ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ مصر و فلسطین کے درمیان ایک سو چالیس میل لمبی موٹروں کی پختہ سڑک بن گئی ہے، مدین میں، جو جزیرہ نمائے سینا کا جنوبی حصہ ہے، "آسمانی میثاق" منعقد ہوا۔ ان کے قائد اور رہنما حضرت موسیٰؑ نے، جن کا نام صوت کے لحاظ سے مصری معلوم ہوتا ہے، بمعنی بیٹا، مدین کے کاہن کی بیٹی سے شادی کر لی، جو یہوہ[۵۴] کا پرستار تھا اور اس نے حضرت موسیٰؑ کو نئی عبادت سکھائی[۵۵]۔

---

۵۱ Goshen اغوشن مگر بائیبل میں اس کا تلفظ جشن ہے۔ یہ مصر کا ایک ضلع تھا، جو مشرقی حصے میں جزیرہ نمائے سینا سے قریب تر واقع تھا۔ ۵۲ خروج باب ۱، آیت ۸۔ ۵۳ خیال یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جسے آج کل "عین قدیس" کہتے ہیں۔ یہ بئر السبع سے ۵۱ میل جنوب میں ہے۔ ۵۴ خروج باب ۳، آیت ۱۔ باب ۱۸، آیت ۱۰-۱۲۔ Jehovah چار حرفی عبرانی لفظ یاھویہ YHWH کی انگریزی شکل ہے۔ شاید یہ ھوہ کا مضارع ہے۔ ۵۵ یہاں جتنے واقعات بیان کیے گئے ہیں، میرے نزدیک محلِ نظر ہیں۔ مثلاً اول حضرت موسیٰؑ نے مدین میں جو شادی کی تھی وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلنے کے وقت نہیں کی تھی۔ بلکہ یہ بہت پہلے کا واقعہ ہے، جب ایک مصری حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اور یہ نبوت سے پہلے پیش آ چکا تھا۔ نبوت کے بعد حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں بطور داعیِ حق گئے۔ خاصی کشمکش کے بعد بنی اسرائیل کے ساتھ خروج کا واقعہ پیش آیا۔ یقیناً اس بزرگ نے جنھیں مدین کے کاہن قرار دیا گیا ہے اور جنھیں عام طور پر حضرت شعیب علیہ السلام سمجھا جاتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی تربیت فرمائی تھی۔ لیکن نبوت کے بعد وہ دینی معاملات میں کسی کی رہنمائی کے محتاج نہ رہ سکتے تھے، بلکہ خود رہنمائے دین بنا دیے گئے تھے۔

شمالی عرب کا یہ معبود دراصل صحرائی معبود تھا۔ ابتدا میں اس کی حیثیت چندر دیوتا کی تھی، جسے خیمے میں رکھا جاتا تھا اور اس کی عبادت عیدوں اور قربانیوں پر مشتمل تھی۔ قربانیاں ریوڑوں میں سے کی جاتی تھیں[51]۔ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے اسرائیلیوں نے بھی مدینوں قینیوں[52] اور شمالی عرب کے دوسرے بادیہ نشینوں سے شادیاں کر لی ہوں گی۔

آبادی

۱۲۵۰ ق،م کے آس پاس صحرا میں پیدا ہونے والے خانہ بدوشوں کا یہ ہلا گروہ جنوب و مشرق سے شرقِ اردن کے بادیہ میں نمودار ہوا اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ زرخیز زمینوں پر قابض ہو جائے۔ اس گروہ کی تعداد چھ سات ہزار سے زیادہ نہ ہوگی[53]۔ اس لیے کہ صحرائی زندگی کے حالات، پانی کی قلت، وسائل خوراک کی کمی اور جانوروں کے چرانے کے لیے جگہ کی تنگی کے باعث اس سے زیادہ لوگ جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ادوم، موآب اور عمون کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بحیرۂ لوط کے مشرق اور شمال مشرق میں واقع تھیں۔ انھیں ایک طرف چھوڑ دیا گیا اور انھیں اس وقت تک مسخر کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی، جب تک عبرانیوں کی بادشاہی قائم نہ ہو گئی۔

شرقِ اردن میں عبرانیوں نے پہلی کامیابی سیحون کے اموری بادشاہ پر حاصل کی۔ پھر انھوں نے شاہ عوج[54] پر فتح پائی، جسے جبّاروں کا بادشاہ کہا گیا ہے، لیکن خاص فلسطین میں جو مستحکم اور قلعہ بند شہر سب سے پہلے فتح ہوئے، بلکہ (تل الدویر) عی[55] اور اریحا ان کا سقوط ایک عجیب و غریب نظارہ[56] تھا۔ یوشع نے یہوہ کے حکم سے اریحا کو جلا دیا اور جو کچھ اس میں تھا، وہ بھی نذرِ آتش ہو گیا[57]۔ مجدّو شمال میں تھا، وہ قریباً ایک سو سال بعد مسخّر ہوا۔ علاقہ جلیل میں عبرانیوں کی پیش قدمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حصور[58] عارضی طور پر فتح ہو گیا۔ یہ شمال میں ایک کنعانی حکومت کا مرکز تھا۔ قاضیوں کے زمانے میں حصور کو دوبارہ فتح کرنا پڑا۔ دوسرے مشہور شہر مثلاً بیت شان یروشلم اور جزر ۱۰۰۰ ق،م سے پہلے یا اس سے کچھ مدت بعد تک فتح نہ ہوئے۔

عبرانیوں کی یہ فتوحات جزوی طور پر فوجی فتوحات تھیں اور جزوی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ آہستہ آہستہ "شیر و شہد" کی سرزمین میں پُرامن طریق پر داخل ہوتے رہے۔ جب انھیں مزروعہ علاقوں میں مستقل قدم گاہ مل گئی تو وہ پیشتر کے آباد لوگوں سے شادیاں کرنے لگے اور ان ہم قوموں سے اتحاد پیدا کر لیا، جو وطن ہی میں رہے تھے اور مصر نہیں گئے تھے۔ اس طرح وہ برسرِ اقتدار آ گئے۔ ان کے مؤرخوں کے دل و دماغ میں طبعاً لڑائیوں ہی کو خاص اہمیت حاصل رہی اور انھوں نے واقعات بیان کرتے ہوئے لڑائیوں پر نہ صرف زور دیا بلکہ بیشتر واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ بحیثیت مجموعی اس پورے عمل کی حیثیت ایسی تھی کہ مقامی

---

[51] خروج باب ۳، آیت ۱۸، باب ۵، آیت ۱۔ گنتی باب ۱۰، آیات ۳۵-۳۶۔ [52] قینی لوہار (عربی واحد قین) قضاۃ باب ۱، آیت ۱۶، باب ۴ آیت ۱۱، گنتی باب ۱۰ آیت ۲۹۔ سینا اور وادی عربہ کی معدنیات کا علم مصریوں اور عربوں کو اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

[53] خروج باب ۱۲، آیت ۳۷، گنتی باب ۱ آیات ۲۱ سے آگے، باب ۲ آیات ۴ سے آگے۔ [54] گنتی باب ۲۱، آیات ۲۱ سے آگے، باب ۲۱ آیات ۳۳ سے آگے۔ [55] یوشع باب ۱۰، آیات ۳۰، ۳۱، یہ مقام دیر دبوان کے قریب ہے۔ [56] یوشع باب ۶، آیت ۱۵۔

[57] یوشع باب ۶، آیت ۲، آیت ۲۴۔ [58] حصور تل الوقاص یا تل القدح ہے جو جسر بنات یعقوب سے کوئی پونے چار میل کے فاصلے پر ہے۔

[59] قضاۃ باب ۴ آیت ۲، باب ۲۳، آیت ۴۔ سموئیل باب ۱۲ آیت ۹۔

باشندے عہد ناموں کے ذریعے سے، فتوحات کے بل پر یا تدریجی انجذاب سے عبرانیوں کے دائرے میں آ گئے۔

زمین پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے گیارہ قبیلوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ بارھواں قبیلہ جسے مذہبی پیشوائی کا منصب حاصل تھا، یعنی لاوی کا قبیلہ، اسے مذہبی خدمات و ضروریات کے لیے تمام قبیلوں میں تقسیم کر دیا گیا، اس تقسیم کے سلسلے میں یہودہ اور بن یمین کے قبیلے یروشلم کے اردگرد پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے اور باقی قبیلوں کو شمال کی جانب زیادہ زرخیز میدانوں میں جگہ مل گئی۔

دَورِ قضاۃ

آبادکاری کا دَور بارھویں صدی کے ربع آخر سے گیارھویں صدی کے ربع آخر تک رہا۔ اس مدت کو عام طور پر "دَورِ قضاۃ" کہا جاتا ہے۔ یہ قاضی (جج) دراصل قومی ہیرو اور حکمران تھے، جو ضرورت کے وقت خود بخود بروے کار آ گئے اور انھوں نے ہمسایہ دشمنوں یا بیرونی جابروں کے مقابلے میں قومی گروہوں کی قیادت کا فرض انجام دیا۔ قاضیوں میں ایک اسرائیلی خاتون بھی شامل تھی، جس کا نام دبورہ[۵۱] تھا۔ اس نے برق[۵۲] کی معیت میں چھ قبیلوں کی قیادت کی اور شمالی سمت میں کنعانیوں کا مقابلہ کر کے آخری فتح حاصل کی[۵۳]۔ اسی طرح جدعون[۵۴] نے تین سو رفیقوں کے ساتھ مدیانیوں کو سخت شکست دی[۵۵]۔ ان قضاۃ میں سب سے زیادہ شہرت سمسون کو حاصل ہوئی۔ عبرانیوں کے خیال طراز قصہ گویوں نے فلسطینیوں سے سمسون کی لڑائیوں پر رنگ آمیزیوں کی دبیز تہیں چڑھا دی ہیں[۵۶]۔ مدیانی بدوی حملہ آور تھے، جنھوں نے اپنے چھاپوں میں سب سے پہلے پالتو اونٹوں سے کام لیا۔ اس طرح جنگ کا ایک نیا ذریعہ سامنے آ گیا، جو دور و دراز حملوں میں خصوصاً بے حد مؤثر ثابت ہُوا۔

فلسطینی

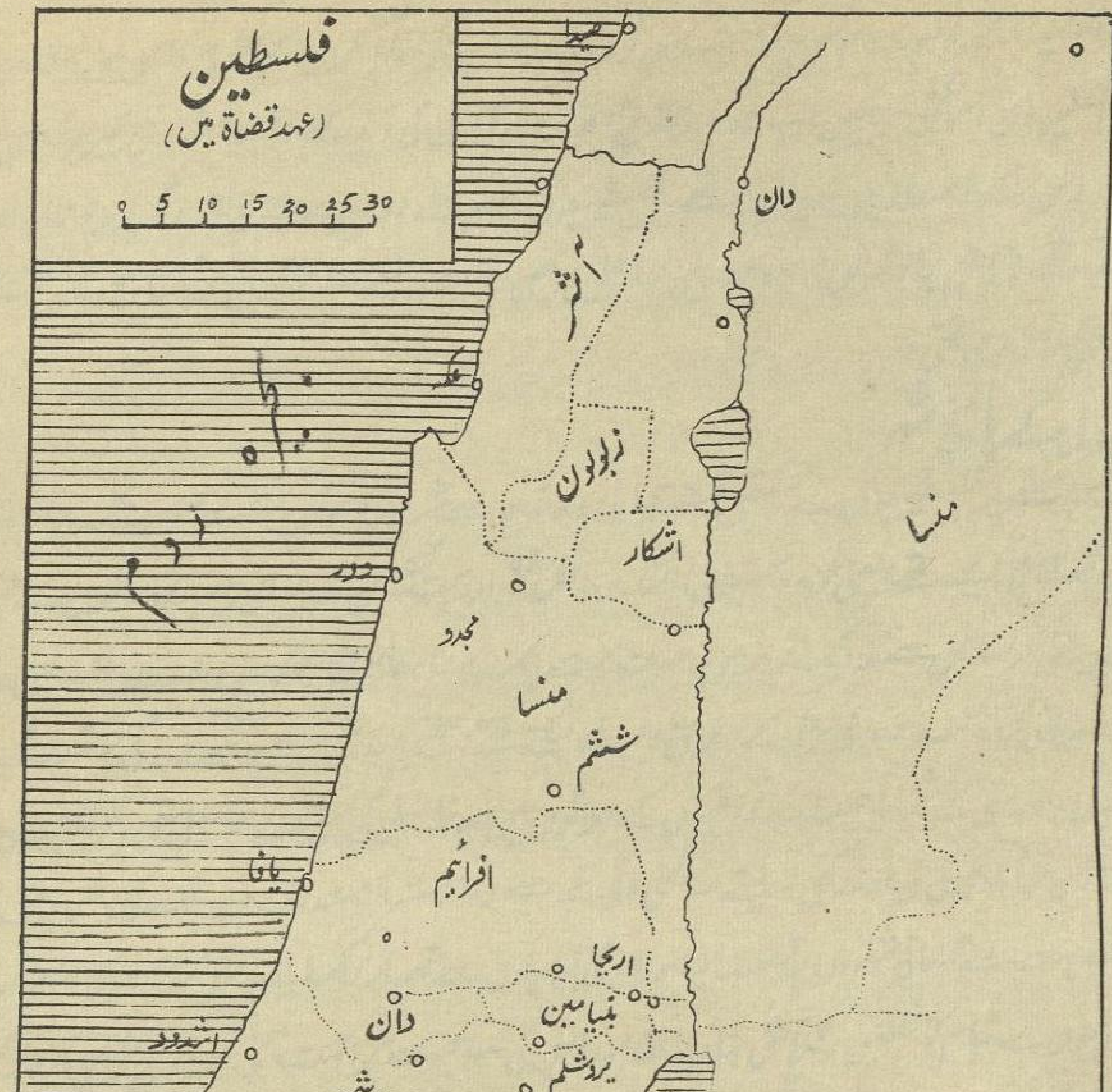
بلاد و اراضی پر قبض و تصرف کے لیے کشمکش کے سلسلے میں عبرانیوں کو جن حریفوں سے سابقہ پڑا، ان میں سے فلسطینی سب سے زیادہ خوفناک تھے۔ یہ بحری قزاقوں کے ان پانچ گروہوں میں سے ایک تھے، جو بحیرۂ ایجہ کے حلقے سے آئے تھے۔ عبرانی گروہ وسطی سطوح مرتفع پر قابض ہو گئے تو اس سے تھوڑی دیر بعد فلسطینیوں نے ساحلی علاقے پر تصرف جما لیا۔ ایشیائے کوچک اور بحیرۂ ایجہ کے حلقے میں تیرھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی کے اوائل میں کچھ ایسی غیر واضح نقل و حرکت شروع ہوئی جس کے نتیجے میں پورے قبیلوں کو جگہ چھوڑنی پڑی اور وہ نئی قیام گاہوں کی تلاش میں نسبتہً کم اضطراب انگیز علاقوں کی طرف نکل پڑے۔ مہاجرین کے بڑے بڑے گروہ، جن میں فلسطینی قبائل بھی شامل تھے، خشکی اور تری کے راستے شام پہنچ گئے اور وہ بہت سی حکومتوں کو پامال کرتے ہوئے، (مثلاً اوغاریت[۵۷]) مصری ساحل پر پہنچ گئے، جہاں ۱۱۹۱ ق،م میں رعمسیس ثالث نے انھیں بحری اور بری لڑائیوں کے بعد آگے بڑھنے سے روک دیا[۵۸]، تاہم انھیں جنوبی شام کے ساحل پر بس جانے کی اجازت دے دی۔

---

۵۱ Deborah　۵۲ Barak

۵۳ قضاۃ باب ۴ آیت ۴-۱۴ - ۵۴ Gideon　۵۵ قضاۃ باب ۷، آیت ۱۵ سے آگے ۵۶ قضاۃ باب ۱۵، باب ۱۶-

۵۷ اوغاریت کا ذکر پہلے آ چکا ہے، صور اس سے تھوڑی دیر بعد تباہ ہُوا۔ ۵۸ دیکھیے بریسٹڈ کی Records جلد ششم، جہاں پیلست Pelest کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ آیا ہے، "پیلا لیست" Palaeste الیریا کے حلقے میں (ایپی رس یونان) ایک مقام کا نام تھا۔ دیکھیے بونفلنتے Bonfante کا مقالہ فلسطینی کون تھے؟ امریکن جرنل آف آرکیالوجی جلد ۵۰، ص ۲۵۱۔



فلسطین
(عہد قضاۃ میں)
0 5 10 15 20 25 30
صیدا
دان
آشر
عکہ
زبولون
اشکار
منسا
دور
مجدو
منسا
یافا
افرائیم
اریحا
بنیامین
دان
اشدود
بیت شمس
یروشلم
بیت لحم
جرون
روبن
عسقلان
غزہ
موآب
بیرسبع
ادوم

یہی علاقہ آگے چل کر فلسطینا کے نام سے موسوم ہوا۔ ایک اور گروہ، جس کا نام تجکر تھا [۵۱]، کرمل کے جنوبی دامن میں بمقام دور آباد ہوا۔ دو صدی بعد مصری سفیر ون آمون [۵۲] کو یہیں ان سے سابقہ پڑا تھا۔ ون آمون کی آمد کے وقت مشرقی بحیرہ روم میں قزاقی کا جو سلسلہ جاری تھا، اس کے ذمہ دار یہی دریانورد تھے۔ فلسطینیوں سے پہلے دوسرے دریانورد گروہ یونان اور ایشیائے کوچک سے آئے تھے (بعض براہ قبرص)۔ وہ مصری ساحل پر بھی اترے تھے اور فرعون مرنفتاح نے ۱۲۲۵ ق م کے آس پاس انھیں ہزیمت دی تھی۔

فلسطینیوں کے پانچ شہر

ساحل کے جس حصے پر فلسطینیوں نے مستقل قبضہ جمایا، وہ غزہ سے شروع ہو کر یافا کے جنوب تک جاتا تھا۔ پانچ بڑے شہروں میں انھوں نے قدم جما لیے تھے، یعنی غزہ، عسقلان، اشدود، عکرون [۵۳] اور جت [۵۴]۔ ان کے سامی نام نئے حاکموں کے عہد میں بھی باقی رہے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ ساحل سے نزدیک تر رہیں۔ صرف جت ایک ایسا مقام تھا، جو زیادہ اندرون ملک میں واقع تھا [۵۵]۔ ساحل سے قریب تر رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمندر سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتے تھے اور عقبی پہاڑیوں میں انگوروں کی کاشت کرتے تھے۔ کوہ کرمل کو فلسطینیوں اور ان کے شمالی ہمسائے فونیقیوں کے علاقوں میں حدِ فاصل کی حیثیت حاصل تھی۔ فلسطینیوں نے غالباً لد اور صقلغ [۵۶] کے سوا کسی نوآبادی کی بنیاد نہ رکھی۔ اپنے ساحلی علاقے سے وہ آہستہ آہستہ اندرون ملک کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے بہت سے کنعانی شہروں پر قبضہ جما لیا اور ان کی آبادیوں سے ہتھیار رکھوا لیے۔ فراعنۂ مصر کی بے شمار تعزیری مہموں اور جبری وصولیوں نے شام کو مفلس و قلاش بنا دیا تھا اور اس کی صلاحیت مزاحمت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ نہ تو صحرا گرد جتھوں کے حملوں کی روک تھام ممکن تھی اور نہ دریانورد جتھوں کو پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ اگر مصر کی سامراجی حکومت کو شام پر پورا اقتدار حاصل ہوتا تو عبرانی یا فلسطینی کبھی کامیابی حاصل نہ کر سکتے، جیسی انھوں نے حاصل کی۔

رعمسیس ثالث نے اپنی فتح کی یادگار میں جو عمارت بنائی، اس پر فلسطینیوں کی صورتیں بھی مرتسم تھیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا (فلسطینیوں کا) تعلق یورپ سے تھا۔ انھوں نے ظروفِ گِلی کا جو نمونہ جاری کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یونانی جزیروں، خصوصاً کریٹ [۵۷] سے آئے تھے۔ ان کی عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ابتدا میں وہ مقامی آبادیوں سے الگ تھلگ رہے۔ گویا وہ اجنبی فوجی گروہ تھے، جو مختلف چھاؤنیوں میں تقسیم تھے اور ایک بیرونی حضارت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کے پانچ شہروں میں پانچ ہی حکومتیں بن گئی تھیں۔ ہر ایک کا حاکم [۵۸] الگ تھا اور ان سب نے ایک وفاق کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشدود کو

---

[۵۱] Tjeker [۵۲] Wenamon [۵۳] Ekron [۵۴] Gath [۵۵] نقشے میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ساحل سے زیادہ دور نہیں۔ شاید یہ تل عرق المنشیہ ہو جو بیت جبرین Eleutheropolis سے بجانب مغرب ۶½ میل پر ہے۔ [۵۶] یہ یہودیہ کے انتہائی جنوب میں ہے۔ غالباً اسے تل الخویلفہ سمجھنا چاہیے، جو تل المشریعہ سے دس میل مشرق میں ہے۔ [۵۷] صحیفہ آموس باب ۹، آیت ۷، نیز یرمیاہ باب ۴۷، آیت ۴ میں اسے کفتور لکھا گیا ہے۔ [۵۸] حاکم کے لیے صحیفہ یشوع (باب ۱۳، آیت ۳)، قضاۃ (باب ۳، آیت ۳، باب ۱۶، آیت ۵) اور سموئیل حصہ اوّل (باب ۶، آیت ۱۶) میں لفظ سرن Seren استعمال ہوا ہے۔ یہ چند فلسطینی الفاظ میں سے ہے، جو باقی رہ گئے ہیں، ایک اور لفظ "کوبع" ہے بمعنی مغفر یا خود جو عبرانی کے ساتھ عربی میں بہ شکل "قبع" پہنچا، بعض اصحاب اسے حتی الاصل سمجھتے ہیں۔ لاطینی لفظ Caput بھی اسی سے نکلا۔

سب پر برتری حاصل تھی۔ بیت پلت Beth-Pelet (خربتہ المشاش)، سے جو بیر السبع کے نزدیک ہے، مٹی کا ایک تابوت ملا، جس کے بالائی حصے پر حاکم کی تمثال بنی ہوئی تھی۔ اس کے لب زیریں پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی اور بال گندھے ہوئے تھے۔ یہ مقام یہود کے انتہائی جنوبی حصے میں تھا۔

گیارھویں صدی قبل مسیح کے نصف ثانی میں فلسطینیوں کی قوت کمال عروج پر پہنچ گئی۔ ۱۰۵۰ء ق م کے قریب انھوں نے عبرانیوں کو شکست دی اور "تابوت سکینہ" چھین لیا، جسے وہ اشدود لے گئے[۵۱] ۱۰۲۰ء ق م کے آس پاس انھوں نے پہاڑی علاقے میں فوجی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ طالوت کے عہد حکومت میں (وفات ۱۰۰۴ء ق م) ان کی سرحد تصرف اندرون ملک میں بیت شان تک پہنچ گئی تھی[۵۲] اس کا مطلب یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس وقت فلسطینیوں کو بنی اسرائیل پر برتری حاصل تھی۔

فلسطینیوں کی برتری کا اصل سبب یہ تھا کہ ان کے اسلحہ اعلیٰ درجے کے تھے اور وہ دھاتوں کو پگھلا کر ضرورت کے مطابق جارحانہ دفاعی اسلحہ تیار کر لیتے تھے۔ جالوت کی کہانی ایک مسلح فلسطینی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ یعنی اس کے بھالے کی چھڑ ایسی تھی، جیسے "جلاہے کا شہتیر"۔ اس کے نیزے کا پھل "چھ سو مثقال لوہے کا تھا" اور اس کی ڈھال اتنی بھاری تھی کہ ایک الگ شخص اسے اٹھائے آگے آگے چلتا تھا[۵۳] عبرانی بہادروں کے جو اعلیٰ جنگی کارنامے بیان ہوئے ہیں، مثلاً سمسون اور حضرت داؤد کے کارنامے، ان کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے فلسطینی قوت کا یہ پس منظر پیش نظر رہنا چاہیے۔

لوہا

فلسطینیوں کو لوہا پگھلا کر اس سے کام لینے کا علم تھا اور وہ اس فن میں یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اسرائیلیوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ آلاتِ زراعت، نیز بھالے کلھاڑیاں، کدالی صرف فلسطینی لوہاروں سے تیز کرائے جائیں[۵۴] جنگ کے زمانے میں یہ امر سخت مشکلات کا باعث بن گیا، جیسا کہ طالوت کے عہد حکومت میں تجربے سے واضح ہوا۔

فلسطینیوں کی آمد سے پیشتر حتّیوں نے تیرھویں صدی کے اوائل میں لوہے کا شاذ ہی استعمال کیا تھا، جیسا کہ حتوشلش کی خط و کتابت سے واضح ہے۔ اس وقت تک لوہا بحیرۂ اسود کے کنارے کی بعض کانوں سے نکالا جاتا تھا، شام میں اس دھات کا عام استعمال فلسطینیوں کی آمد سے پیشتر شروع نہ ہوسکا۔ لوہا پگھلانے اور صاف کرنے کا عمل حتّیوں کی طرح فلسطینی بڑے اہتمام سے مخفی رکھتے تھے۔ کنعانیوں نے فلسطینیوں سے آہنی رتھوں کا استعمال سیکھ لیا تھا، اسی وجہ سے انھیں حملہ آور اسرائیلیوں پر واضح فوقیت حاصل رہی[۵۵]

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے تک (وفات ۹۶۰ء ق م) غیر فلسطینی عناصر کو لوہا پگھلانے اور صاف کرنے کا پُرپیچ عمل

---

۵۱ سموئیل حصہ اول باب ۵، آیت ۱۔ "تابوت سکینہ" کے سلسلے میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ سامیوں نے اس کے قبل یا بعد میں ایسی ہی چیزیں اختیار کیں۔ مثلاً اسلام سے پیشتر کے عربوں کا "قبہ"، مسلمانوں کا "محمل"، بدوؤں کا "عطفہ"، دیکھیے جولین کی کتاب The Ark, the Ephod and the "Tent of Meeting"

۵۲ سموئیل باب ۱۳، آیت ۳ سے آگے نیز باب ۳۱، آیت ۱۳۔

۵۳ سموئیل حصہ اول باب ۱۷، آیت ۷۔

۵۴ ایضاً باب ۱۳، آیات ۱۹، ۲۲۔

معلوم نہ ہو سکا۔ اس وقت فلسطین پر فلسطینیوں کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی[1]۔ حضرت داؤدؑ نے فلسطینیوں کو مسخر کرنے کے علاوہ ادوم کو بھی فتح کر لیا، جو خام لوہے کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لبنان میں بھی یہ دھات موجود تھی، جہاں فونیقیوں نے اس سے جہاز سازی میں کام لیا۔ یوں فلسطینیوں نے شامی حضارت کو برنجی دور سے اٹھا کر اعلیٰ آہنی دور میں پہنچا دیا۔ یقیناً یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ فلسطینیوں نے اپنے فونیقی ہمسایوں اور جانشینوں میں دور دور تک بحر پیمائی کا ذوق پیدا کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ پورے بحیرۂ روم، نیز بحیرۂ قلزم اور مشرقی اوقیانوس میں جہاز پھرنے لگے۔ علاوہ بریں مادی حضارت کے چند مزید آثار ملتے ہیں۔ مثلاً ظروفِ گلی کی وضع و ہیئت، آلاتِ زراعت، لوہے کے بسولے اور چھینیاں۔ ان کے سوا فلسطینیوں نے کوئی قابلِ ذکر یادگار نہ چھوڑی۔ وہ اجنبی باشندے تھے، اس لیے ان کا اقتدار دوام کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ الّا یہ کہ مہاجرت سے اپنے اندر نیا خون داخل کرتے رہتے۔ یہ امر اس وقت کے حالات کے اعتبار سے غیر ممکن تھا۔ حضرت داؤدؑ کے آخری دورِ حکومت میں ان کی نو آبادیاں ناپید ہونے لگیں۔ مرورِ وقت کے ساتھ سامیوں نے انھیں اپنے اندر جذب کر لیا اور کوئی ایسی چیز باقی نہ رہی، جس سے ان کی زبان، ان کے مذہب، ان کے فنِ تعمیر یا زندگی کے دوسرے عمدہ پہلوؤں کا اندازہ ہو سکتا۔ پانچویں صدی قبل مسیحؑ کے وسط میں صحیفہ نحمیاہ میں انھیں فلسطینی نہیں، اشدودی کہا گیا ہے، جو ایک اشدودی بولی بولتے تھے[2]۔ اکیس[3] ان چند فلسطینی ناموں میں سے ایک نام ہے، جو باقی رہ گئے ہیں۔ ان کا ایک دیوتا "دجون" تھا[4]۔ اسے غلے کا دیوتا مانا جاتا تھا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ بھی کنعانی دارالاصنام سے لیا گیا تھا۔ اس کا معبد اشدود میں تھا اور اس کی رفیقہ عشتارت کا مرکزِ عبادت عسقلان میں تھا۔ دجون کا معبد، حکم غزہ کے قصر[5] اور دوسرے فلسطینی معبدوں کے اسلوبِ تعمیر کے متعلق، جن کا ذکر عہد نامۂ قدیم میں آیا ہے، کچھ معلوم نہیں۔

---

[1] تواریخ حصہ اوّل باب ۲۲، آیت ۳۔ [2] صحیفہ نحمیاہ باب ۴، آیت ۷، باب ۱۳، آیت ۲۴۔ [3] سیموئیل حصہ اوّل باب ۲۷، آیت ۲۔

[4] قضاۃ باب ۱۶، آیت ۲۳۔ سیموئیل حصہ اوّل باب ۵، آیات ۲، ۷۔ تواریخ حصہ اوّل باب ۱۰، آیت ۱۰۔ مکابی باب ۱۰، آیت ۸۴۔

[5] قضاۃ باب ۱۶، آیات ۲۳ سے آگے۔

چودھواں باب

عبرانی بادشاہی

دورِ اتحاد

فلسطینیوں کے اقدامات کی مزاحمت کا تقاضا یہ ہُوا کہ عبرانیوں کے لیے بادشاہی کا انتظام کر دیا جائے۔ بادشاہی سے عبرانی قوم کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ بادشاہی کے ماتحت عبرانیوں نے اپنے اندر وہ قومی خصوصیتیں پیدا کر لیں جو دورِ حاضر میں "نیشنل ازم" (قوم پروری) کی خصوصیتیں سمجھی جاتی ہیں، تاہم وہ اس کے سیاسی پہلو کو نظر انداز کر گئے۔ تمام قدیم سامی گروہوں میں سے صرف سامی تھے جنھوں نے نہایت تیز نیشنل ازم کو نشو و نما دی اور صرف وہی ہیں، جنھوں نے اپنی قومی صفات نیز انفرادیت بحال رکھی۔ یقیناً مذہب نے ان کے اتحاد و تعاون میں سب سے بڑھ کر مساعدت کی۔

ان کے ہمسایوں مثلاً ادومیوں، موآبیوں اور عمونیوں کے ہاں بادشاہی کے سلسلے جاری تھے، فلسطینیوں کے ہاں بادشاہ نہیں، حاکم ہوتے تھے جنھوں نے ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق قائم کر رکھا تھا۔ فونیقیوں کے ہاں شہری ریاستیں تھیں، جن میں سے بعض، مثلاً بیبلوس، صیدا اور صور قومی ریاستوں کا درجہ حاصل کر چکی تھیں، لیکن عبرانیوں کے ہاں صرف قاضی تھے، یعنی وہ لیڈر، جو ضرورت پیش آجانے پر اچانک بروئے کار آجاتے تھے، فلسطینیوں سے کش مکش تیز ہو گئی تو اسرائیلی قوم کے بزرگ اپنے مذہبی رہنما سموئیل کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کر دیں جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے[۵۱]۔ سموئیل نے ایک ایسے شخص کو بادشاہ مقرر کیا کہ "قد آوری میں لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے"[۵۲]۔ طالوت[۵۳] اس کا نام تھا۔ ۱۰۲۰ ق م میں تیل کی کپی اس کے سر پر انڈیلی اور اسے بادشاہ نامزد کر دیا۔ گویا بادشاہی کا نظریہ ہی باہر سے نہ لیا گیا، بلکہ اس کا انتظام بھی تدریجاً ہمسایہ حکومتوں کے نظام پر ڈھال لیا گیا۔ البتہ دو حیثیتوں سے یہ نظام ممتاز تھا۔ اوّل قبائلی تنظیم انتظامی مقاصد کے لیے باقی رکھی گئی۔ دوم بادشاہ کے لیے لازم تھا کہ وہ یہواہ کے حکموں کے مطابق حکومت کرے، جس طرح یہ حکم نبیوں کے ذریعے سے الہام ہوئے۔

پہلا یہودی بادشاہ قائم کردہ امیدیں پوری نہ کر سکا، بلکہ وہ ناکام رہا۔ اس کا کردار کمزور تھا اور طبیعت میں سوداویت تھی۔ وہ اپنے وطن جبعہ[۵۴] میں بدوی شیخ کی طرح خیمہ لگا کر رہتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بادشاہی ابتدا میں اس کے اپنے قبیلے یعنی بن یمین کی

---

۵۱ سموئیل حصّہ اوّل باب ۸، آیت ۵ - ۵۲ ایضاً باب ۹، آیت ۲ - ۵۳ بائبل میں اسے ساؤل لکھا ہے۔ لیکن قرآن میں اس کا نام طالوت آیا ہے، اس لیے ہم نے قرآن کے نام کو ترجیح دی۔ (مترجم)

۵۴ Gibeah موجودہ تل الفول، جو یروشلم سے چار میل شمال میں ہے۔ ملاحظہ ہو سموئیل باب ۱، آیت ۲۶، باب ۱۱، آیت ۶ -

حدوں سے زیادہ آگے نہ جا سکی، لیکن اس کا انتخاب بجائے خود فلسطینی آقاؤں کے خلاف بغاوت کے مترادف تھا۔ لمبی مدت تک کشمکش جاری رہی، آخر کار فلسطینیوں نے جلبوعہ[۵۱] کی لڑائی میں اس کے تین بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود وہ سخت زخمی ہوا اور اس نے خودکشی کر لی۔ فلسطینیوں نے اس کا سر کاٹا، اس کی نعش، نیز اس کے بیٹوں کی نعشیں، بیت شان کی دیوار سے لٹکا دیں۔ اور اس کے اسلحہ جنگی غنیمت کے طور پر عشتارت کے مندر میں بھیج دیے[۵۲]۔

حضرت داؤدؑ

عبرانی بادشاہت کے اصل بانی حضرت داؤدؑ ہیں (۱۰۰۰ ق م۔ ۹۶۰ ق م) وہ طالوت کے اسلحہ بردار تھے۔ فلسطینیوں کی سیادت میں ان کی بادشاہی کا آغاز ہوا، لیکن انھوں نے نہ محض کامل آزادی حاصل کر لی، بلکہ اپنی بادشاہی کی حدیں اس قدر پھیلا لیں کہ نہ اس سے پہلے کبھی پھیلی تھیں اور نہ بعد میں پھیلیں۔ حضرت داؤدؑ نے مہموں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ اس طرح عبرانیوں کی گردنیں فلسطینیوں کے جوئے سے آزاد کرا لیں۔ علاوہ بریں ادوم، موآب اور عمون کو مسخر کر لیا اور زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ شیبی شام کے آرامی علاقے کو بھی، ریاست حماۃ تک اپنے قبضے میں لے لیا[۵۳]۔ حضرت داؤدؑ کی فوجیں دمشق کے بازاروں میں بھی پھر نکلیں۔ غرض آپ کی قائم کردہ سلطنت حد درجہ قوی قومی سلطنت تھی، جس کی کوئی مثال فلسطین کی تاریخ میں نہیں ملتی[۵۴]۔ ادوم کی تسخیر سے تیما و عرب کا تجارتی راستہ عبرانی سلطنت کے قبضے میں آ گیا۔ اس چھوٹے سے ملک یا اس کے دو شمالی ہمسایہ علاقوں، موآب و عمون میں، تیرھویں صدی قبل مسیح سے پیشتر کبھی کسی بادشاہی کا ذکر نہیں سنا گیا تھا۔ ایک صدی پیشتر آرامیوں کی کچھ شاخیں اور کچھ خابیرو بظاہر اس خطے میں آباد ہو گئے تھے، جو بیسویں صدی سے خانہ بدوشوں کی جولاں گاہ چلا آتا تھا۔ بیسویں صدی سے پیشتر کی تہذیب کے تمام آثار ہکسوس اور آرامیوں نے برباد کر دیے ہوں گے۔ موجودہ زمانے میں جو چھان بین کی گئی، اس میں شرق اردن کے اندر اس طویل مدت کی کوئی قابل ذکر چیز دستیاب نہیں ہوئی۔

عبرانی سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں، اس کی حدیں خوب پھیل گئیں، اس کے ہمسائے مسخر ہو گئے اور حضرت داؤدؑ نے عارضی طور پر اپنی قوم میں وحدت پیدا کر دی۔ انھوں نے سرکاری طور پر مردم شماری کرائی۔ یہ پہلی مردم شماری ہے، جس کا ذکر تاریخ کے صفحات میں آیا ہے۔ اس وقت کل آبادی غالباً چھ یا سات لاکھ ہو گی[۵۵]۔ مرکز حکومت کے لیے داؤدؑ نے یروشلم کو چنا، جو یبوسیوں کا مستحکم حصار تھا اور داؤدؑ نے ان سے چھین لیا تھا۔ یہ جگہ بہت اچھی تھی۔ شہر ابتدائی قبائلی آبادیوں سے باہر تھا اور سلطنت کے جنوبی اور شمالی حصوں کی سرحد پر واقع تھا اور ملک کے اندرونی حصے کی ایک نہایت اہم شاہراہ کی حفاظت اس کے ذریعے سے ہو سکتی تھی، یعنی وہ شاہراہ جو شمالاً جنوباً اردن کی غربی سطح مرتفع سے گزرتی تھی، نیز اس کی حفاظت آسان تھی۔ یہیں حضرت داؤد نے اقامت اختیار کر لی اور پتھر کا ایک محل تعمیر کرایا جس میں لبنان کے دیودار استعمال کیے گئے۔ صور کے معماروں اور نجاروں نے یہ کام

---

۵۱ Gilboa موجودہ جبل الفقوعہ، جو کوہ افرائیم کا شمالی و مشرقی حصہ ہے۔ موجودہ قریہ کا نام جلبون ہے جو سابقہ نام کو تازہ کرتا ہے۔

۵۲ سیموئیل (اول)، باب ۳۱ آیات ۱ تا ۱۰، تواریخ (اول)، باب ۱۰، آیات ۱ تا ۱۰۔ ۵۳ سیموئیل الوابا ۸، ۱۰، ۱۲، آیات ۲۶، ۳۱۔ گنتی باب ۲۴ آیت ۷۔ ۵۴ چونکہ ساحلی علاقہ اس میں شامل نہ تھا، اس وجہ سے جارج ایڈم سمتھ کا یہ بیان غلط نہیں معلوم ہوتا کہ فلسطین نہ کبھی ایک قوم کے قبضے میں آیا اور نہ آئندہ آئے گا۔ ۵۵ سیموئیل دوم باب ۲۴ آیت ۹، تواریخ اول باب ۲۱، آیت ۵۔

انجام دیا جنھیں حضرت داؤدؑ کے دوست فونیقی بادشاہ حیرام نے بھیجا تھا (۹۸۱ ق،م - ۹۴۷ ق،م[۵۱])۔ صور اور اسرائیل کے درمیان دوستی دونوں کے فائدے پر مبنی تھی۔ صور میں غلہ بہت کم پیدا ہوتا تھا، اسرائیل کے پاس بحری تجارت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ محل کے علاوہ حضرت داؤدؑ نے ایک قومی معبد بھی نئے دارالحکومت میں بنوایا، جو یہواہ کی عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرح یہواہ کا دین متحدہ حکومت کا سرکاری دین بن گیا۔ عبرانیوں کے لیے حضرت داؤدؑ ایک مثالی بادشاہ تھے۔

حضرت داؤدؑ کے ماتحت، جو ایک جنگی آدمی تھے، عبرانی ادبیات کا آغاز ہوا اور وہ آگے چل کر قدیم مشرق کی نہایت بیش قیمت اور رفیع القدر میراث بن گئے۔ یہی زمانہ ہے، جس میں مذکیر (یاد دلانے والا) نام عہدہ وجود میں آیا۔ اس عہدہ دار کا سرکاری فرض یہ تھا کہ تمام اہم واقعات لکھتا جائے اور سرکاری احوال کا ریکارڈ قائم رکھے[۵۲]۔ محرّر فونیقیوں میں سے لیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر کاہنوں نے بھی سرکاری ریکارڈوں کی طرح متوازی دستاویزوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھیں دستاویزوں سے ابتدائی بادشاہی کے واقعات لیے گئے اور انھیں جزو "عہد نامۂ قدیم" میں شامل کر لیا گیا۔ اس دور کا مؤرخ جو بھی ہو، اپنی معلومات واضح انداز میں اور بالکل موضوعی نقطۂ نگاہ سے پیش کرتا ہے۔ وہ حضرت داؤدؑ کے حالات بادشاہی کی حیثیت میں نہیں، بلکہ انسان کی حیثیت میں بھی بیان کرتا ہے۔ اور لکھنے کا انداز ایسا ہے، جو صرف معاصر ہی اختیار کر سکتا تھا۔ "سلاطین اوّل" کے پہلے دو باب عبرانی نثر کا اوّلین مرقع ہیں۔ سیموئیل دوم میں حضرت داؤدؑ کی سیرت نویں باب سے بیسویں باب تک بیان کی گئی ہے۔ یہ تاریخی اسلوب تحریر کا شاہکار ہے۔ اس سے پیشتر ایسی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ نامعلوم مؤرخ، جو وقت کے اعتبار سے بہت قدیم زمانے کا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ تحریر سے موجودہ زمانے کا معلوم ہوتا ہے حضرت داؤدؑ کے ماتحت منظومات کی فراہمی بھی شروع ہو گئی تھی اور خود حضرت معمولی شاعر نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور موسیقی کی خداداد صلاحیتوں نے اتنا گہرا اثر ڈالا کہ آنے والی نسلوں نے متعدد مزامیر ان سے منسوب کر دیے۔ یہ زبور تاثیر و نفوذ میں اتنے ہمہ گیر اور اس درجہ زمان و وقت سے بالا ہیں کہ آج بھی انھیں روحانی رفعت اور روحانی جذبات کا مصور مانا جاتا ہے[۵۳]۔

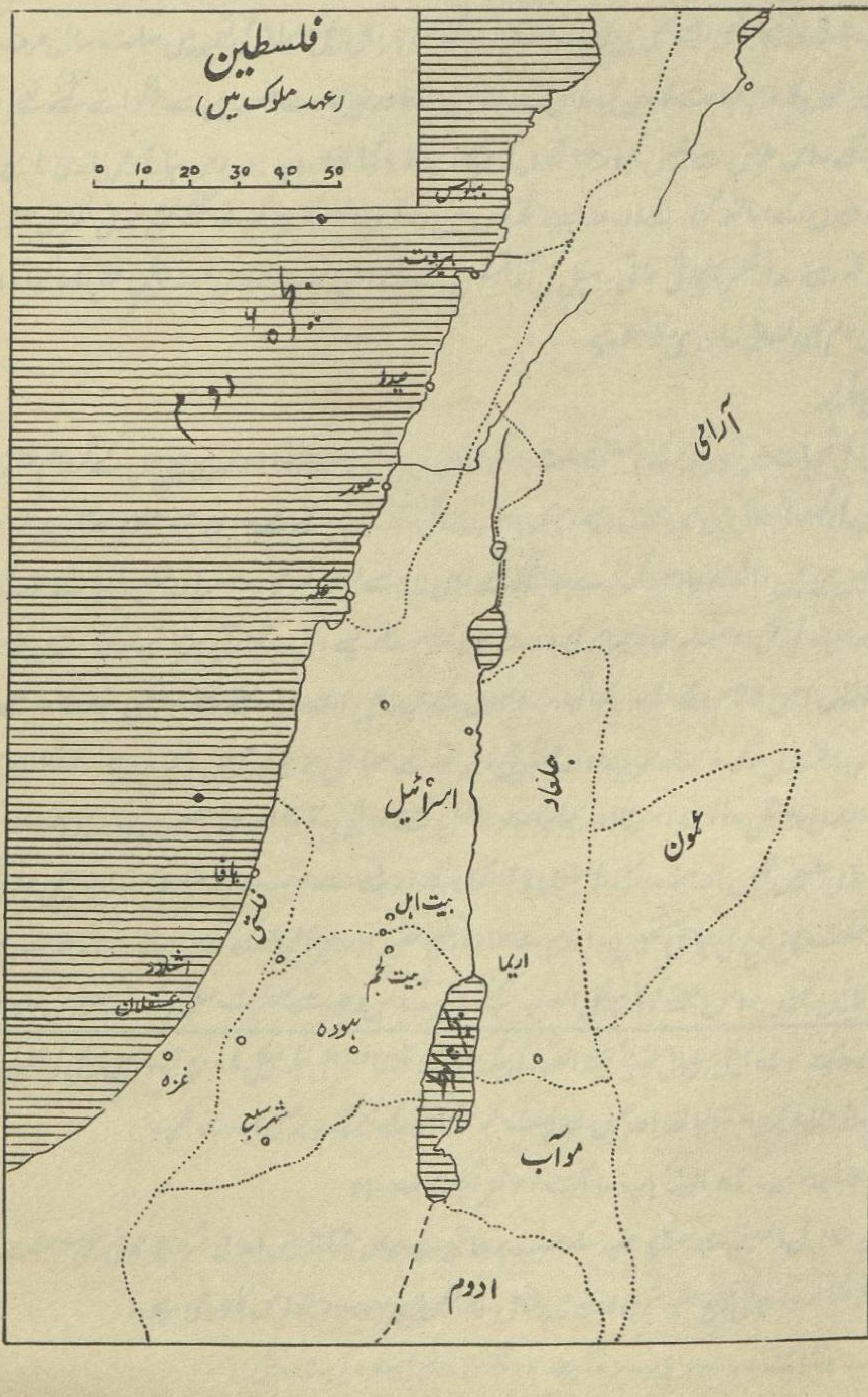
سلیمانؑ جلالت شان کے ساتھ

داؤدؑ کی وفات پر ان کے فرزند سلیمانؑ جانشین ہوئے (۹۶۰ ق،م - ۹۲۵ ق،م)۔ ان کے ماتحت عبرانی بادشاہی شوکت و ابہت اور جلال و شکوہ کی خیرہ کن بلندیوں پر پہنچ گئی۔ سلیمانؑ کے تجارتی اور صنعتی کارناموں، کان کنی کی وسیع سرگرمیوں، عظیم القدر تعمیرات اور اعلیٰ پیمانے پر بود و ماند کی کوئی مثال عبرانیوں کی شاہی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان پُر جوش سرگرمیوں کے درمیان وہ فرمانروائی کرتے رہے اور ان کا دربار ظاہری وضع و قطع کے اعتبار سے مصر و آشور کا نمونہ تھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں عبرانی قوم پوری طرح مشرقی زندگی اور تہذیب کے دھارے میں پہنچ گئی۔

داؤدؑ کی طرح سلیمانؑ کا محل بھی فونیقی معماروں ہی نے بنایا تھا اور اس میں لبنان کے دیودار استعمال ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر

---

۵۱ سموئیل دوم باب ۵، آیت ۱۱۔
۵۲ سموئیل دوم باب ۲، آیت ۱۶۔ سلاطین دوم باب ۱۸، آیات ۱۸ و ۳۷۔
۵۳ ظاہر ہے کہ ان عقائد سے مترجم کو کوئی تعلق نہیں۔



فلسطین
(عہد ملوک میں)
0 10 20 30 40 50
ببلوس
بیروت
صیدا
صور
عکہ
آرامی
اسرائیل
جلعاد
عمون
یافا
بیت ایل
بیت لحم
اشدود
عسقلان
یہودہ
غزہ
شہر سبع
اریحا
موآب
ادوم

میں تیرہ سال لگ گئے۔ محل کے جس حصے میں خود حضرت سلیمانؑ رہتے تھے، اس میں دیودار کے اتنے ستون استعمال کئے گئے تھے کہ وہ "لبنان کے بن کی لکڑی کا محل" مشہور ہوگیا تھا[1]۔

سلیمانؑ نے جو ہیکل بنایا وہ قومی لحاظ سے زیادہ اہم تھا۔ قیاس یہ ہے کہ اصل ہیکل اسی جگہ تھا جہاں اب "قبۃ الصخرا" موجود ہے[2]۔ پہلے یہاں شاہی معبد بنانے کی تجویز تھی، جسے محل ہی کا ایک حصہ قرار دیا گیا تھا بہرحال ہیکل سلیمانی کی تعمیر میں سات سال صرف ہوئے اور آگے چل کر یہ مقام عبرانیوں کا عام عبادت گاہ بن گیا۔ اس کے لئے بھی معمار اور میر عمارت صور ہی سے منگوائے گئے تھے اور لبنان سے دیودار منگوائے گئے تھے۔ اس غرض سے تیس ہزار عبرانیوں کو بیگار پر لگایا گیا تھا۔ ان میں دس ہزار آدمی باری باری ایک مہینا لبنان میں حیرام کے آدمیوں کے ساتھ گزارتے اور دو مہینے گھروں میں رہ کر اپنا کام کاج کرتے تھے[3]۔ کٹی ہوئی لکڑی سمندر کے راستے یافہ بھیجی جاتی اور یافہ سے یروشلم پہنچائی جاتی۔ ہیکل کی آرائش کے لئے اس عہد کا کنعانی نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا۔ اس کے خادم کنعانی تھے۔ بلکہ ہیکل نام بھی کنعانی زبان ہی کا لفظ ہے۔

عصیون جابر

حضرت سلیمانؑ کی تعمیرات میں شہروں کے استحکامات، فوجیوں کی بارکیں اور غلّے، دوسری چیزوں کے گودام شامل ہیں۔ مجدّو میں ان کے اصطبلوں کی کھدائی حال ہی میں ہوئی ہے، جہاں ان کے جنگی رتھ رکھے جاتے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سائبانوں کی دہری قطاریں تھیں جن میں ساڑھے چار سو گھوڑے رہ سکتے تھے۔ ان میں سے بعض گھوڑے مصر اور سلیشیا سے لائے گئے تھے[4]۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے فونیقی دوست شاہ حیرام کی مدد سے بحیرۂ قلزم کے لیے ایک تجارتی بیڑا تیار کیا، جس کا مرکز عصیون جابر[5] تھا۔ بعد ازاں اس کا نام ایلات رکھا گیا۔ رومیوں کے عہد میں اسے ایلہ کہتے تھے۔ اس بندرگاہ سے حضرت سلیمانؑ کا بیڑا صوری افسروں کے ماتحت عرب اور مشرقی افریقہ کے سواحل پر بحری مہمیں انجام دیتا رہا[6]۔ ان مہموں کا اصل مقصد یہ تھا کہ بخور، چندن، ہاتھی دانت، سونا اور جواہرات حاصل کئے جائیں۔ تانبا اور لوہا عصیون جابر میں صاف کیا جاتا تھا۔ یہ برآمد کی سب سے بڑی جنسیں تھیں اور سمندر کے راستوں یا قافلوں کے ذریعے سے عرب اور ہندوستان بھیجی جاتی تھیں اور ان کے بدلے میں مختلف چیزیں لی جاتی تھیں۔ ادوم کے علاوہ خلیج عقبہ اور بحیرۂ لوط کے درمیان پورے علاقے میں تانبے اور لوہے کی گراں بہا کانیں تھیں۔ اس حصے کو آج کل العربہ کہتے ہیں۔ اس وجہ سے حضرت سلیمانؑ نے عصیون جابر میں ان دھاتوں

---

[1] سلاطین اوّل باب ۷، آیت ۲ [2] ہیکل سلیمانی یقیناً قبۃ الصخرا کی جگہ نہیں تھا قبۃ الصخرا کی جگہ ہیکل کا مذبح تھا۔ اصل ہیکل کی آخری مشرقی دیوار ہی تھی جسے یہودیوں نے "دیوار گریہ" بنالیا تھا اور جس سے لپٹ کر رونا ان کے نزدیک بڑی عبادت تھی۔

[3] سلاطین اوّل باب ۵ آیت ۱۳-۱۴ [4] ایضاً باب ۱۰ آیت ۲۲ نیز آیات ۲۸-۲۹

[5] Ezion-geber یہ مقام تل الخلیفی ہے جو خلیج عقبہ کے سرے پر واقع ہے۔ یہاں ۱۹۳۸ء میں کھدائی شروع ہوئی تھی ملاحظہ ہو Nelson Glueck کا مقالہ۔ آج کل خلیج عقبہ شرق اردن میں شامل ہے لیکن ابن سعود بھی دستوراً اس کا مدعی ہے۔

[6] سلاطین اوّل باب ۹ آیات ۲۶-۲۷، باب ۱۰، آیت ۱۱۔ تواریخ دوم باب ۹ آیت ۲۱

کے پگھلانے کا کارخانہ قائم کردیا تھا۔خیال ہے کہ قینیوں نے سب سے پہلے یہ فن حضرت سلیمانؑ کی رعایا میں سے ادومیوں کو سکھایا ہوگا۔ عرب سے جو قافلے مسالے لے کر آتے تھے اور وہ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت سے گزرتے تھے۔ ان سے محصول لیا جاتا تھا۔

افسانہ طرازی اور رومانیت کے اشتراک سے حضرت سلیمانؑ کا اسم گرامی نسل بعد نسل قوت، شان و شکوہ اور حکمت و دانش کے مترادف بن گیا ہے، یہاں تک کہ جن[1] بھی زمین پر اور ہوا میں ان کے احکام کی فرمانبرداری میں سرگرم رہتے تھے۔ سلیمانی دربار کی شوکت ہی نے جنوبی عرب کی ایک ملکہ کو اپنی طرف کھینچا۔ یہ اسلامی روایات کی بلقیس تھی۔ حبشہ کا حکمران خاندان حضرت سلیمانؑ و بلقیس ہی کی نسل سے ہونے کا مدعی ہے اس خاندان کے موجودہ بادشاہ کے سرکاری خطابات میں سے ایک خطاب "شیر یہودا" کا بھی ہے۔ حضرت سلیمانؑ حکیم کی ذاتِ گرامی سے بہت سی مثلیں منسوب ہیں جن میں سے بعض نے قانون کی حیثیت اختیار کرلی ہے[2]۔

تاریخی دستاویزوں سے ان نظریات کی تائید نہیں ہوتی جو سلطنت حضرت سلیمانؑ کو میراث میں ملی تھی، وہ اس سے بہت وسیع تھی، جو خود انہوں نے اپنی اولاد کے حوالے کی علاقہ فلسطیا نے فرعون کی سیادت قبول کرلی تھی، مشہور کنعانی حصار جزر پر فرعون قابض ہوگیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے فرعون کی بیٹی سے شادی کرلی تھی اور یہ قلعہ فرعون کی طرف سے بیٹی کے جہیز میں دے دیا گیا۔ یہ شہزادی حضرت سلیمانؑ کے اس حرم میں داخل ہوئی جس میں سات سو شہزادیاں اور تین سو خواتین تھیں[3]۔ اپنے اہلِ حرم ہی کے زیرِ اثر حضرت سلیمانؑ نے یروشلم کے نزدیک صیدا، موآب اور عمون کے ...... دیوتاؤں کی پرستش کے لئے "بلند مقامات" بنوائے[4]۔ حضرت سلیمانؑ کے آخری عہد حکومت میں آرامی رضین نے اپنے آپ کو آزاد کرالیا اور وہ حضرت سلیمانؑ کے زیرِ اقتدار نہ رہا، اس سے پیشتر ادومی امیر حدد حضرت سلیمانؑ کے لئے مصیبت کا باعث بنا رہا[5]۔ حالانکہ حضرت داؤدؑ نے تعاقب کرکے اسے بھگا دیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے بیگار سے کام لیا۔ غالباً اس وجہ سے، نیز بہت زیادہ خروج کے باعث عوام میں بے چینی پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت سلیمانؑ کے جانشین کے ماتحت سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

تقسیم شدہ سلطنت

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ماتحت دو جداگانہ گروہ، یعنی اسرائیل اور یہودا عارضی طور پر متحد ہوگئے تھے۔ حالانکہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ بڑی حد تک مدیانیوں میں شامل ہو چکے تھے۔

[2] یہ لفظاً اصلاً آرامی ہے جس کے معنی ہیں چھپا ہوا۔ مستور، مصنف کے عقیدے سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآن اس کا مصدق ہے۔

[3] حضرت سلیمانؑ کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مترجم بالکل بے تعلق ہے [4] سلاطین اول باب ۱۱، آیت ۳۔ یہ بائبل کا بیان ہے جو ہرگز مستند نہیں [5] ایضاً باب ۱۱، آیت ۵، آیت ۸ مترجم کے نزدیک یہ حضرت سلیمانؑ پر افترا ہے اور اس کی اصل غالباً یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک حق شناس و عادل حکمران و داعی حق کی حیثیت سے کسی کے دین میں اکراہ کے قائل نہ تھے حق ناشناس راویوں نے اس روش کو غلط رنگ میں پیش کردیا اور یہ نہ دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر پیغمبر کو دعوت کا حکم دیا ہے اور اکراہ کی ممانعت فرمائی ہے۔

[6] سلاطین اوّل باب ۱۱ آیت ۱۴-۲۲۔

ان کے اقتصادی نظام مختلف تھے۔ شمالی حصے کے لوگ زراعت پیشہ تھے ان کا گزارہ گیہوں، زیتون، انگور اور اپنی زرخیز زمینوں کی دوسری پیداوار پر تھا۔ جنوبی حصے کے لوگ سطح مرتفع میں رہتے تھے، جہاں کی زمینیں بھیڑ بکریاں اور دوسرے جانور پالنے کے لئے بہت موزوں تھیں۔ ان کا گزارا ریوڑ پالنے پر تھا۔ قبیلہ افرائیم اور دوسرے شمالی قبیلے کنعانی اثرات کے کھلم کھلا خلاف تھے وہ الوہیم (ایل کی جمع) کی عبادت کو ترجیح دیتے تھے اور عبادت کا نظام ان رسموں اور طریقوں سے ماخوذ تھا جو کنعانیوں سے مخصوص تھے۔ یہووا اور بن یامین کے قبیلے جنوب میں رہتے تھے ان کے نزدیک یہودا کی عبادت کو ترجیح حاصل تھی جس کا مرکز یروشلم کا ہیکل تھا اور اس کا طریقِ عبادت زیادہ سادہ تھا۔ ان دونوں گروہوں میں فوری افتراق اقتصادی معاملے پہ ہوا۔

حضرت سلیمانؑ کی وفات پر (۹۴۵ ق م کے آس پاس) بارہ قبیلوں کے نمائندوں کا ایک اجتماع اس غرض سے شکیم میں ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے فرزند رحبعام کے لئے بادشاہی کی رسم مسح ادا کی جائے۔ اس وقت سوال اٹھایا گیا کہ آیا نیا بادشاہ محاصل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟ نوجوان بادشاہ نے جس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی، بڑی تیزی سے جواب دیا۔

"میرے باپ نے تم کو کوڑوں سے ٹھیک کیا تھا، میں تم کو بچھوؤں سے
ٹھیک کروں گا[1]"

یہ سنتے ہی دس قبیلوں نے رحبعام کو بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ قبیلۂ افرائیم میں سے یربعام کو اپنا بادشاہ چننے پر آمادہ ہو گئے جو پوری مجلس کی طرف سے ترجمان تھا۔ چنانچہ ان دس قبیلوں نے اسرائیل کے نام سے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ جس کا مرکز ابتدا میں سکیم تھا پھر ترضہ[2] میں اور آخر کار سامریہ میں منتقل ہو گیا۔ باقی دو قبیلے، یعنی یہودا اور بن یامین رحبعام کے وفادار رہے۔ اس سلطنت کا نام سلطنت یہودا قرار پایا اور یروشلم اس کا مرکز تھا۔

دونوں حکومتیں حریف تو تھیں ہی مگر بعض اوقات ان میں باقاعدہ دشمنی کی آگ بھی بھڑک اٹھتی تھی۔ دونوں پر نشیب و فراز کی حالتیں طاری ہوئیں۔ کبھی قوت کا پانسا اسرائیل کی طرف پلٹ جاتا اور کبھی یہودا کی طرف۔ اسرائیل میں داخلی اختلال کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ وہاں بار بار حکمرانوں میں تبدیلیاں ہوئیں یہاں تک کہ دو سو سال میں یکے بعد دیگرے انیس بادشاہ مسند نشین ہوئے۔ پھر بغاوتیں بھی ہوتی رہیں تو دونوں حکومتیں ایک دوسری کے خلاف سازشیں بھی کرتی رہتی تھیں یہی داخلی افتراقات انجام کار ان کی تباہی کا موجب بنے۔ دوسرے شامیوں کی طرح عبرانیوں نے بھی حضرت داؤد کے اس حکیمانہ قول کو کبھی دل میں جگہ نہ دی: "دیکھئے کیسی اچھی اور خوشی کی بات ہے کہ بھائی باہم مل کر رہیں[3]۔"

مملکت اسرائیل

اسرائیل کے ابتدائی بادشاہوں میں سب سے زیادہ ممتاز عمری (۸۸۵ ق م۔ ۸۷۴ ق م) تھا جس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اصل عربی اور غالباً نبطی تھی۔ اس کی سب سے بڑی یادگار سامریہ[4] شہر تھا۔ اسی نے شہر کی بنیاد رکھی، وہاں استحکامات کا

---

[1] سلاطین اول باب ۱۲، آیت ۱۱۔ [2] Tirzah [3] زبور ۱۳۳، آیت ۱۔

[4] موجودہ سبسطیہ یہ لفظ اصلاً یونانی ہے Sebastos سے نکلا ہے جس کے معنی معزز اور باہیبت کے ہیں یہ نام ہیرودیس نے قیصر آگسٹس کے اعزاز میں رکھا تھا جب ۲۷ ق م میں اس نے اس شہر کو نئے سرے سے آباد کیا تھا۔

بندوبست کیا اور مرکزِ حکومت کو ترضہ سے وہاں منتقل کرلیا[1] نئے مرکزِ حکومت میں اس نے ایک محل تعمیر کرایا، جسے اس کے بیٹے اخی اب نے وسیع کیا اور اس کی آرائش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہی محل ہے جسے "ہاتھی دانت کا گھر"[2][3] کہا گیا ہے۔ زمانۂ حال میں یہاں کھدائی ہوئی تو ظاہر ہوا کہ تعمیر میں واقعی ہاتھی دانت بھی استعمال کیا گیا تھا اور بیشتر حصے میں سونے کے اوراق سے بھی کام لیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ہاتھی دانت کا باریک کام کرنے والے لوگ شمالی شام ہی میں تھے۔ دولت مندوں کے مکانوں میں دیودار کی لکڑی کے اندر ہاتھی دانت کے بیل بوٹے بنا دیے جاتے تھے۔ غالباً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے محلوں میں بھی جو یروشلم میں تھے اس قسم کا کام موجود تھا۔ عہد نامۂ قدیم میں جن قصروں کا ذکر آیا ہے، ان میں سے صرف سامریہ کا شاہی قصر اب تک دریافت ہوا ہے۔ عمری نے اپنے معاصروں پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ اس کے خاندان کو حکومت سے خارج ہوئے ایک سو سال گزر چکے تھے، پھر بھی آشوری سرگزشت میں جہاں سامریہ کا ذکر آیا ہے وہاں اسے "بیت عمری" ہی کہا گیا ہے۔

اخی اب (۸۷۴ ق م - ۸۵۲ ق م) نے ہمسایوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے، لیکن اسے اپنے ملک میں یقیناً مشکلات سے سابقہ پڑا۔ دمشق کے حلیف کی حیثیت میں اس نے قرقر کی غیر فیصلہ کن جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ صور و صیدا کے بادشاہ ابتعل[4] کی بیٹی ایزبل[5] سے اس نے بیاہ کیا۔ ایزبل اپنے شوہر پر پوری طرح حاوی ہوگئی اور اس نے اسرائیل میں صوری بعل کی عبادت جاری کرانے کی کوشش کی[6]۔ اسی وجہ سے بعل کے مذہب اور یہواہ کے مذہب میں نہایت تلخ اور طویل کش مکش شروع ہوگئی۔ دونوں کی کوشش یہ تھی کہ اسرائیل کی مذہبی زندگی میں برتری حاصل کرلیں۔

خاندانِ عمری کے خلاف ردعمل کی ابتدا ایلیاہ[7] اور الیشع[8] سے ہوئی۔ بعد ازاں اس نے ایک فوجی افسر یاھو کی بغاوت کے رنگ میں ظہور کیا جس کی وجہ سے خاندانِ عمری تباہ ہوگیا۔ یاھو کے حکم سے بوڑھی ملکہ ایزبل کو ایک کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا اور وہاں گلیوں کے کتے اس کی لاش کو کھاتے رہے[9]۔ ۸۴۲ قبل مسیح میں یاھو خود تخت نشین ہوا اور اس نے یہواہ کا دین ازسرِنو قائم کر دیا اور اسی کو اسرائیل کا واحد دین قرار دیا۔ وہ بیرونی جنگوں میں اس سے بدرجہا زیادہ کامیاب ہوا۔ شلم ناصر ثالث نے ایک سیاہ سنگی ستون تیار کرایا تھا، جس میں یاھو کو یا اس کے نمائندے کو آشوری بادشاہ کے پاؤں چومتے اور سونے چاندی، سیسے کی کشتیاں بطور خراج پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے[10]۔ یاھو کے عروج سے تھوڑی دیر پہلے موآب کے بادشاہ میشا نے اسرائیل کے خلاف بغاوت کی اور اپنی آزادی کی یادگار میں بمقام دیبون[11] ایک پتھر نصب کرایا۔ یہ پتھر ابتدائی عبرانی کتبوں میں سے طویل ترین کتبے کا حامل ہے۔ بائبل کی عبرانی سے اس کتبے کی زبان صرف بولی میں مختلف ہے۔ اسی زمانے میں یہوداہ کے خلاف ادومیوں کی بغاوت کامیاب ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ دونوں حکومتوں کی کمزوری کا ثبوت تھا۔

---

[1] سلاطین باب ۱۶، آیت ۲۴۔ سامریہ شکیم سے چھ میل شمال مغرب میں تھا۔ ترضہ کی جگہ اب تک متعین نہیں ہوسکی [2] سلاطین اول باب ۲۲، آیت ۳۹ [3] عاموس باب ۳ آیت ۱۵، باب ۶، آیت ۴ [4] Ethbaal [5] Jezebel [6] سلاطین اول باب ۱۶، آیت ۳۱، نیز جوزیفس [7] Elijah غالباً یہی حضرت الیاسؑ ہیں۔ [8] Elishah غالباً یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں الیسعؑ کے نام سے دو جگہ آیا ہے۔ [9] سلاطین دوم باب ۹ آیات ۳۳، ۳۵ [10] یہ ستون اب برٹش میوزیم میں ہے [11] اس مقام کا نام آج کل ذیبان ہے اور یہ مشرقی اردن میں واقع ہے۔ پتھر فرانس کے مشہور قصر لوور میں ہے جہاں بے شمار قیمتی چیزیں محفوظ ہیں۔

یاہو کے تیسرے جانشین یربعام ثانی (٧٨٦ ق م - ٧٤٦ ق م) کے ماتحت قوت کا ایک نیا مظاہرہ ہوا۔ جو ایک حد تک غیر متوقع تھا۔ اس عہد میں شمالی سرحد آرامی علاقے میں آگے بڑھا دی گئی[1]۔ اس نے سامریہ کی حفاظت کے لئے دوہری فصیل بنا دی تھی، جسے اب کھود کر نکال لیا گیا ہے۔ یہ فصیل بعض مقامات پر تینتیس فٹ چوڑی تھی۔ یربعام ثانی کے عہد کی ایک امتیازی بات یہ ہے کہ اس عہد کے اختتام پر عاموس نبی نے بیت ایل[2] میں پیش گوئیاں کیں۔

اسرائیل کو تھوڑی دیر کے لئے سانس لینے کا موقع مل گیا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ آشوریہ اس وقت اپنے پیش قدمی کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ مصر کی قوت بھی گہنائی ہوئی تھی۔ جب تغلت پلاسر ثالث (٧٤٥ ق م - ٧٢٧ ق م) کا ظہور ہوا، جو آشوریوں کی سامراجی قوت کو بحال کر دینے کا ذمہ دار تھا، تو صورت حال بدل گئی۔ اس نے تیز مہموں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس میں دمشق، جلعاد، جلیل اور میدان صارون یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے اور انھیں سلطنت آشور کے صوبے بنا لیا گیا[3]۔ تغلت پلاسر اس امر پر مطمئن نہ تھا کہ سابقہ مقامی حکمرانوں کو خراج گزار بنا کر چھوڑ دے، اس نے آشوریہ سے حاکم بنا کر بھیجنے شروع کئے تاکہ وہ مفتوحہ علاقوں پر حکومت کریں۔ دمشق کے آخری بادشاہ رضین اور اسرائیل کے بادشاہ فقح نے یروشلم کے بادشاہ آخز کو اپنے ساتھ ملا کر مشترکہ دشمن کے خلاف ایک وفاق بنا لینے کی کوشش کی۔ اسرائیل کی قوت سابقہ قوت کا محض ایک جزو رہ گئی تھی۔ سامریہ نے بھی یہودا، فلسطیا، عمون، موآب اور ادوم کی طرح بھاری خراج ادا کر کے اپنے آپ کو بچایا۔

اسرائیل کا خاتمہ

چند سال کے بعد اسرائیل کے بادشاہ ہوسیع کو مصر سے امداد کی امید پیدا ہوئی، لہٰذا اس نے آشوریوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ شلم نامر خامس نے جو تغلت پلاسر کا جانشین تھا، اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ شہر سامریہ کے استحکامات اتنے زبردست تھے کہ تین سال تک محاصرہ جاری رہا[4]۔ آخر شلم نامر کے جانشین سرجون ثانی کے عہد (٧٢٢ ق م یا ٧٢١ ق م) میں سامریہ فتح ہو گیا۔ سرجون اسرائیل کے تمام نوجوانوں کو جو قوم کا سرجوش تھے اور جن کی تعداد ستائیس ہزار دو سو اسی تھی، قید کر کے میڈیا (مادہ) لے گیا۔ یوں اسرائیل کی سلطنت ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئی۔ شمالی سلطنت کی آبادی دریائے اردن کے مغرب میں چار لاکھ سے کم نہ تھی، ان میں سے صرف ایک حصے کو جلا وطن کیا گیا تھا۔ یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ دس قبیلے "گم ہو گئے" تھے تو یہ واقعہ صحیح نہیں۔ جو لوگ جلا وطن ہوئے تھے وہ بھی آگے چل کر قوم میں شامل ہو گئے تھے۔ برطانیہ اور امریکہ کے بعض حلقوں نے ان کی تلاش اور ان کے نسب ناموں کے تجسس کے لئے جو تگ و دو کی وہ مضحکہ خیز تھی۔ بارھویں صدی کے سیاح بن یامین کو تاریخی حقائق کا زیادہ اندازہ تھا جب اس نے لکھا کہ نیشاپور (مشرقی ایران) کے پہاڑوں میں جو یہودی رہتے ہیں وہ ابتدائی جلا وطنوں کی اولاد ہیں[5]۔

---

[1] سلاطین دوم باب ١٤۔ آیت ٢٥

[2] بیت ایل کے معنی ہیں "خدا کا گھر" اس کے کھنڈر بیتین کے نام سے یروشلم کے شمال میں گیارہ میل پر ہیں۔

[3] سلاطین دوم باب ١٥، آیت ٢٩

[4] سلاطین دوم باب ١٧، آیت ٦

[5] The Itinerary of Rabbi Benjamin of Tudeia ص ٢٨۔

سامری

سرجون نے ایک طرف تو جلا وطنی کے ذریعے سے وہ تمام لوگ باہر نکال دیئے جو آشوریہ کے پہلو میں کانٹوں کی حیثیت رکھتے تھے، دوسری طرف اس نے اور اس کے جانشینوں نے آبادکاری کی پالیسی جاری رکھی جن اسرائیلیوں کو قید کرکے لے گئے تھے ان کی جگہ بابل، عیلام، شام اور عرب سے قبیلوں کو اٹھا کر سامریہ اور اس کے علاقے میں آباد کر دیا گیا[۱] نئے لوگ اسرائیلیوں سے خلط ملط ہو گئے اور وہ سب سامری کہلائے۔ ان کے مذہبی عقائد بھی یہواہ کی عبادت میں مشترک ہو گئے[۲] ۴۳۲ ق۔م میں عزرا اور نحمیاہ جلاوطنی سے واپس آگئے اور انھوں نے نسلی پاکیزگی پہ زور دیا تو دونوں طبقوں کے درمیان آخری مرتبہ افتراق پیدا ہوا۔ عزرا اور نحمیاہ نے سردار کاہن کے ایک پوتے کو اس لئے یروشلم سے بھگا یا کہ اس نے ایک سامری گورنر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی[۳] یہ نوجوان جسے بھگایا گیا تھا۔ سامریوں کا کاہن بن گیا اور اس کے لئے کوہ جرزیم میں ایک ہیکل تعمیر ہوا جو یروشلم کے ہیکل کا حریف تھا۔ اس زمانے میں یہودیوں کی "کتاب مقدس" تورات کی ابتدائی پانچ کتابوں پہ مشتمل تھی۔ اور سامری صرف انھیں کتابوں کو مقدس سمجھتے رہے۔ یہ مختلف قدیم عبرانی حروف میں لکھی جاتی رہیں اور سامریوں کے نزدیک صیہون نہیں بلکہ جوزیم "مقام مقدس" ہے۔

وقت گزرتا گیا، سامریوں اور یہودیوں کے درمیان عداوت بڑھتی گئی۔ ان میں شادی بیاہ کے تعلقات کبھی جائز نہ سمجھے گئے۔ حضرت مسیحؑ نے ایک سامری عورت سے پانی مانگا۔ وہ اس بات پہ حیران ہوئی کہ یہودی ہو کر سامری سے پانی مانگا گیا[۴] حضرت مسیحؑ نے اپنی ایک نہایت عمدہ تمثیل میں اس سامری کو اعلیٰ رنگ میں پیش کیا جس سے نفرت کی جاتی تھی۔ اس تمثیل میں سامری ہی کا عمل اور سلوک سب سے بہتر تھا[۵] جب انٹیاکس اپی فینز[۶] (۱۷۵ ق۔م ۔ ۱۶۴ ق۔م) نے ظلم و جور شروع کیا تو یہودیوں کے ساتھ سامریوں پر بھی آفتیں آئیں، اگرچہ وہ بہ ظاہر مصالحت پر آمادہ تھے اور کوہ جرزیم پر اپنے ہیکل کو زیوش[۷] کے لئے وقف کر دینے پر تیار تھے۔

یہ گروہ بھی متحجر آثار کی طرح مختلف زمانوں میں باقی رہا اور اب تک باقی ہے۔ اب ان میں سے کوئی دو سو افراد نابلس میں ہیں، جو قدیم زمانے کا شکیم ہے، موجود ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں سامریوں کے گروہ غزہ، قاہرہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں رہتے تھے۔ آج ان کی زبان عربی ہے۔ اگر کوئی سیاح عیدِ فصح کے موقع پر نابلس چلا جائے تو انھیں فصح کا برہ ذبح کرتے ہوئے پائے گا۔

---

[۱] سلاطین دوم باب ۱۷، آیت ۲۴

[۲] سلاطین دوم باب ۱۷، آیات ۲۵-۳۴

[۳] نحمیاہ باب ۱۳-آیت ۲۸، نیز جوزیفس

[۴] انجیل یوحنا باب ۴ آیت ۹۔

[۵] لوقا باب ۱۰، آیات ۳۰-۳۷۔

[۶] Antiochus Epiphanes

[۷] Zeus

یہودا کی بادشاہی

یہودا کے تخت پر بھی اسرائیل کی طرح انیس بادشاہ بیٹھے، لیکن یہ بادشاہی اسرائیل کے مقابلے میں کوئی ایک سو تیس سال بعد تک قائم رہی۔ اہم سیاسی واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ مصری فرعون نے یہودا پر حملہ کیا۔ جب سلطنت دو حصّوں میں بٹ گئی تو مصر کے فرعون شیشنق[1] (تورات میں اسے شیشق کہا گیا ہے) نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۹۲۰ ق م میں حملہ کر دیا۔ شیشنق دراصل لیبیا کا تھا، جس نے مصر کے بائیسویں شاہی خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ غرض اس نے شہروں کو تباہ کیا۔ یروشلم کو لوٹا، ہیکل اور محل میں جتنی قیمتی چیزیں جمع تھیں، انھیں مالِ غنیمت قرار دے کر اٹھائے گیا[2]۔ رحبعام اس حملے کو روک نہ سکتا تھا۔ فرعونِ مصر کی ایک بیٹی نے رحبعام سے شادی کر لی۔ اس فرعون کے ایک پیشرو کی بیٹی نے حضرت سلیمانؑ سے شادی کی تھی۔

آٹھویں صدی قبل مسیحؑ میں مصر اور آشوریہ کے جارحانہ اقدامات رک گئے تو اسرائیل کی طرح یہودا نے بھی صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ عزریاہ (جسے بعض اوقات عزریاہ بھی کہا جاتا ہے ۷۸۳ ق م – ۷۵۱ ق م) کے طویل عہدِ حکومت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت کے عام حالات پھر بہتر ہو رہے تھے۔ اس بادشاہ نے فوج کی ازسرِنو تنظیم کی یروشلم کے استحکامات میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، انھیں دور کیا۔ فلسطینوں اور عربوں پر فتوحات حاصل کیں۔ عمونیوں اور دوسرے دشمنوں سے خراج لیا[3]۔ اس کی سرگرمیاں صرف فوجی معاملات تک محدود نہ رہیں، اس نے آبیاری کا بندوبست کر کے زراعت کو ترقی دی۔ بے آباد علاقوں میں ریوڑوں کی حفاظت کے لئے برج تعمیر کرائے جو اب تک موجود ہیں[4]۔

حزقیاہ

۷۲۱ ق م میں اسرائیل کا خاتمہ ہو گیا تو آشوریہ کو یہودا پر حملے کے لئے براہِ راست موقع مل گیا۔ چنانچہ چند سال بعد حزقیاہ (۷۱۵ ق م – ۶۹۳ ق م) کے عہدِ حکومت میں یہودا آشوریہ کا خراج گزار بن گیا۔ مصر نے حزقیاہ کو اکسایا اور وہ یسعیاہ کی تنبیہات کو نظرانداز کر کے مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے فلسطینی شہروں اور دوسری ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ اتحاد کے معاہدے کر لیے۔ چونکہ محاصرے کا خطرہ تھا، اس لئے اس نے پہاڑی سے سترہ سو فٹ لمبی نالی نکلوائی، تاکہ یروشلم کو پانی کی دقّت پیش نہ آئے۔ اسی کا نام چشمۂ شلوخ[5] مشہور ہوا۔ اس کی دیوار پر چھ سطروں کا ایک عبرانی کتبہ اتّفاقیہ مل گیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ پہاڑ کی دونوں طرفوں سے کھدائی شروع ہوئی تھی اور اندازہ ایسا صحیح تھا کہ جب مزدور کدال اٹھاتے تھے اور بیچ میں پہاڑ تین ہاتھ باقی تھا تو دونوں طرف کے مزدور ایک دوسرے کی آواز سنتے تھے، اس لئے کہ چٹان بیچ میں سے پھٹی ہوئی تھی[6]۔

اس مقابلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آشوریہ کے بادشاہ سرجون اور اس کے جانشین سنحرب (۷۰۵ ق م – ۶۸۱ ق م) نے فونیقی

---

[1] Shishonk

[2] سلاطین اول باب ۱۴۔ آیات ۲۵-۲۶

[3] تواریخ باب ۲۶۔ آیات ۶-۸

[4] ایضاً باب ۲۶ آیات ۹، ۱۰۔

[5] Siloam tunnel بعض اسے برکتہ سلوان کہتے ہیں۔

[6] اس کے حروف موابی پتھر سے زیادہ مختلف نہیں۔

اور فلسطینی شہروں کے خلاف حملے کیے۔ اور پے در پے تعزیری مہمیں بھیجیں جو انجام کار ۷۰۱ ق م میں یروشلم کے محاصرے پر منتج ہوئیں۔ سیخرب نے صیدا اور عکہ پر قبضہ کیا۔ اشدود، عمون، موآب اور ادوم کے سفیر حوالگی کی عرضیاں لے کر پہنچ گئے پھر فلسطینی ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے یافا اور دوسرے شہروں کو عسقلان اور سرحد مصر تک مسخر کیا۔ وہاں سے وہ مشرق کی طرف پلٹا اور لخیش پر قبضہ جمایا۔ صور اور عکرون[51] مقابلہ کرتے رہے۔ اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ مصری فوج بڑھی چلی آ رہی ہے۔ سیخرب نے مناسب نہ سمجھا کہ یروشلم جیسے مستحکم مقام کو پیچھے چھوڑ جائے چنانچہ اس نے فوج کا ایک حصہ یروشلم کی طرف بھیج دیا اور خود مصریوں کے مقابلے کے لیے جنوبی جانب چلا گیا۔ التقہ[52] کے مقام پر مصر و حبشہ کی متحدہ قوت سے جنگ ہوئی۔ متحدہ قوت کا سالار ۲۰ سالہ جوان ترھاقہ[53] (طہرقا) تھا۔ متحدہ قوت کو شکست ہوئی۔ لیکن سیخرب ابھی اپنی پوری فوج یروشلم کے خلاف لا نہ سکا تھا کہ "خدا کے فرشتے نے آشور کی لشکر گاہ میں ایک لاکھ پچاسی ہزار آدمی مار ڈالے"[54] یہ ایک رات میں ہو گیا۔ خیال یہ ہے کہ یہ وہی طاعون کی وبائی بیماری تھی جو ۱۷۹۹ء میں نپولین کی فوج کے لیے مصیبت کا باعث بنی اور جس سے مسلمان مذاکرین ہمیشہ ہراساں رہے۔

یروشلم تو تسخیر سے محفوظ رہا، لیکن ارد گرد کا علاقہ برباد ہو گیا۔ یسعیاہ اور بادشاہ کا عقیدہ بہ ظاہر یہ تھا کہ خدا ہر حال میں شہر کو محفوظ رکھے گا[56] حزقیاہ کو تخت پر قبضہ جمائے رکھنے کی اجازت مل گئی لیکن اسے تمام بقایا خراج ادا کرنا پڑا اور جب سیخرب نینوئی واپس ہوا تو حزقیاہ نے اپنی بیٹیاں، محل کی دوسری عورتیں اور قیمتی خزانے نینوئی بھیجے۔ سیخرب اپنا کارنامہ بہ فخر انداز میں یوں پیش کرتا ہے:

"باقی رہا حزقیاہ یہودی، جس نے میری اطاعت قبول کی تھی تو میں نے اس کے
چھیالیس مستحکم اور محصور شہروں، نیز آس پاس کے بے شمار قصبوں کا محاصرہ
کیا، ان پر قبضہ جمالیا۔ انھیں لوٹا اور انھیں مال غنیمت سمجھا۔ میں نے اسے
یروشلم، جو شاہی حکومت کا مرکز ہے اسی طرح بند کر دیا، جس طرح پرندہ پنجرے
میں بند ہو جاتا ہے .... اس حزقیاہ پر میری ہیبت انگیز
شوکت غالب آگئی[55]"

سیخرب نے دعویٰ کیا ہے کہ میں دو لاکھ اور ایک سو پچاس آدمی پکڑ کر لے آیا۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودا کی کل آبادی اتنی ہوگی، جسے وہ فتح کے بعد مال غنیمت میں شمار کرتا ہے۔

یوسیاہ کی اصلاحات

سیخرب کے حملے کا اثر یہ ہوا کہ یہودا اور بھی کمزور ہو گیا۔ اور اس کی قوت مزید گھٹ گئی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے ابتدائی پچیس سال

---

۵۱ Ekron اسے آج کل عقیر کہتے ہیں۔ جو جزر سے چھ میل مغرب میں ہے۔

۵۲ Eltekeh یہ غالباً خربۃ المقنع ہے جو عقیر سے جنوب مشرق میں چھ میل پر ہے۔

۵۳ Tirhakah

۵۴ سلاطین دوم باب ۱۹، آیت ۳۵ ہیروڈوٹس کتاب دوم باب ۱۴۱۔

۵۵ ایضاً باب ۱۹ آیت ۶، ۷، ۲۰

۵۶ کمن یل جلد دوم شرط اور جلد اوّل وغیرہ۔

میں یہ سلطنت طاقت ور نینوی کے آگے جھکی رہی اور خراج باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا جب معلوم ہوا کہ آشوریہ میں ضعف پیدا ہو چکا ہے، تو یہوداکی سلطنت نے پھر کچھ ہمت باندھ لی۔ یوسیاہ کے ماتحت یہی صورت پیش آئی۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا (تقریباً سنہ ۶۳۸ ق م) اس کے عہد میں سلطنت کی حدیں شمال کی طرف بڑھیں۔ اس توسیع کا مطلب یہ تھا کہ اسرائیل اور یہوداکو پھر متحد کر دیا جائے۔ سنہ ۶۱۲ ق م میں کلدانیوں نے نینوی فتح کر لیا۔ اس پر مصر کو حوصلہ ہوا اور اس نے اپنی سلطنت شمالی شام کی جانب بڑھانی شروع کر دی۔ چنانچہ فرعون نیخو[1] فوج لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ شمالی شام کی جانب بڑھا۔ یوسیاہ اپنے آپ کو آشوریہ کے جانشین بابلیوں کا خراج گزار مانتا تھا۔ اس نے مصری پیش قدمی کو روکنا چاہا اور مجدو کے میدانِ جنگ میں ایک تیر سے مہلک زخم کھایا[2]۔

اس نے مذہبی مصلح کی حیثیت میں غیر فانی شہرت حاصل کی۔ سنہ ۶۲۱ ق م میں ہیکل کی مرمت ہو رہی تھی تو وہاں سے ایک کتاب ملی جو غالباً کتابِ استثنا تھی یا اس کا کوئی اہم حصہ تھا۔ یہ کتاب بظاہر اس زمانے میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی جب الحاد اور ظلم و جبر کا دور شروع تھا، خصوصاً حزقیاہ کے بیٹے منسی کا عہد (سنہ ۶۹۳ ق م۔ سنہ ۶۳۹ ق م)[3] اس کتاب کے مطالعے کا اثر بادشاہ اور عوام پر اتنا ہوا کہ انھوں نے یہوواہ اور صرف یہوواہ کی عبادت کا عہد کر لیا۔ انھوں نے وہ سب برتن جلا دیے۔ جو بعل، اشیرہ، سورج، چاند اور دوسرے ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل میں موجود تھے۔ ساتھ ہی یہوداہ اور اسرائیل میں تمام "بلند مقامات" تباہ کر ڈالے[4]۔

یہوداکے آخری دن

اس کے بعد یہوداکی سلطنت ڈانواں ڈول رہی۔ وہ کبھی اس طاقت کے آگے جھک جاتی تھی، جو فرات کے کنارے نئی نئی ابھری تھی، یعنی بابل اور کبھی اپنے پرانے حلیف یعنی مصر سے رشتۂ اتحاد جوڑ لیتی تھی۔ یوسیاہ کے بیٹے یہویاقیم[5] (سنہ ۶۰۸ ق م۔ سنہ ۵۹۷ ق م) نے مصر ہی سے اتحاد کیا۔ ابتدا میں اسے فرعون نیخو نے تخت پر بٹھایا تھا۔ لہٰذا اس نے بخت نصر کی مخالفت کی، جس کے باپ نبوپلاسر نے آشوریہ کے خلاف کامیاب بغاوت کی تھی اور اہلِ میڈیا سے اتحاد کر کے نینوی کو تباہ کر ڈالا تھا۔ اسی نے نئی بابلی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ بخت نصر بھی اپنے باپ کی فوج میں سپہ سالار رہا تھا، جب سنہ ۶۰۵ ق م میں بمقام کرکمیش فرعون نیخو کو تباہ کن شکست دے کر اس نے اپنی جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا اور مصر کے تمام ایشیائی مقبوضات چھین لیے تھے[6]۔ یہ اس عہد کا انقلابی واقعہ تھا۔ مغربی ایشیا میں برتری کا جو مسئلہ مدت سے معلق چلا آتا تھا، وہ قطعی طور پر طے

---

[1] Necho

[2] سلاطین دوم باب ۲۳، آیات ۲۹-۳۰ تواریخ دوم باب ۳۵۔ آیات ۲۰-۲۴ ہیروڈوٹس

[3] سلاطین دوم باب ۲۱، آیات ۱۶۔ تواریخ دوم باب ۳۳، آیت ۹

[4] سلاطین دوم باب ۲۳، آیات ۱، ۲۵۔ تواریخ دوم باب ۳۴، آیات ۲۹ تا ۳۵، آیت ۱۸

[5] Jehoiakim

[6] سلاطین دوم باب ۲۴، آیت ۷

ہو گیا۔ بابل کو کلدانیوں کے ماتحت مغربی ایشیا کے معاملات میں اقتدار کی وہ حیثیت حاصل ہو گئی جس میں کسی کے لیے چون وچرا کی گنجائش نہ رہی۔ یہویاقیم بخت نصر کا حریف نہیں بن سکتا تھا۔ بابلی فوج ۵۹۷ء ق م میں یروشلم پہنچی اور باغی بادشاہ کو بابل لے جانے کے لیے بیڑیاں پہنادی گئیں۔[1] لیکن وہ یا تو مر گیا یا مارا گیا اور اس کی نعش یروشلم کے دروازوں سے باہر پھینکوادی گئی۔ یرمیاہ نے یہویاقیم کے خلاف ایک طومار لکھا تھا، بادشاہ نے چاقو سے اس کے ٹکڑے کیے تھے اور آگ میں جلا دیے تھے۔[2] اس میں پیش گوئی کی تھی کہ یہویاقیم کا "دفن گدھے کا سا ہوگا"[3]۔ بخت نصر نے اس واقعے سے کچھ مدت پہلے دریائے عاصی کے کنارے ایک تحریر کندہ کرائی تھی۔ پھر ایک اور تحریر وادیٔ برنیا میں کندہ کرائی، جو ربلہ کے مغرب میں ہے۔ ایک جگہ بخت نصر ایک دیودار کے نیچے کھڑا ہے، دوسری جگہ وہ ایک چھلانگ مارتے ہوئے شیر کو مار رہا ہے۔[4]

یہویاقیم کا بیٹا اور جانشین یہویاکین باپ سے زیادہ عقلمند نہ تھا۔ ۵۹۷ء ق م میں اسے تخت پر بیٹھے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے، جب بخت نصر خود یروشلم کے دروازوں پر آپہنچا۔ مختصر سے محاصرے کے بعد شہر فتح ہو گیا۔ نوجوان یہویاکین، اس کی بیویوں، ماں، کارکنوں، سات ہزار سپاہیوں اور ایک ہزار کاریگروں کو بابل لے گئے۔ حزقی ایل جیسا مذہبی پیشوا بھی قیدیوں میں تھا۔ یہویاکین کا چچا صدقیاہ جو یوسیاہ کا بیٹا تھا، بخت نصر کے حکم سے بادشاہ بنا۔

یروشلم کا سقوط

۲۱ سالہ صدقیاہ ۵۹۷ء ق م۔ ۵۸۶ء ق م کئی سال تک بخت نصر کا وفادار رہا، پھر وہ یہودیوں کی پرانی بیماری کا شکار ہو گیا۔ یعنی اس نے آزادی کا پرچم لہرادیا۔ قومی لیڈر اسی کے لیے اس پر زور ڈال رہے تھے اور خود اسے مصر کی امداد پر بھروسا تھا۔ بخت نصر کو سخت طیش آیا۔ اس نے فوراً ایک فوج بھیج دی اور فیصلہ یہ کیا کہ یروشلم کو تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ شہر کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ محاصرہ ایک مرتبہ عارضی طور پر اٹھا لیا گیا، اس لیے کہ مصر سے ایک فوج ہوفرع[5] کے ماتحت پہنچ گئی تھی، لیکن اس سے نپٹتے ہی پھر پورے زور سے محاصرہ شروع ہو گیا۔ ڈیڑھ سال کی سختیوں نے محصور فوج کی قوت برداشت آخری مرحلے پر پہنچا دی اور شہر کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ یہودی بادشاہ رات کی تاریکی میں اپنی فوج کو لے کر بچ نکلا، لیکن اس کا تعاقب کیا گیا اور ریحا کے میدان میں اسے جا پکڑا۔ بخت نصر ربلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہیں بادشاہ کو لے گئے۔ بخت نصر نے پہلے صدقیاہ کے بیٹوں کو باپ کی آنکھوں کے سامنے قتل کرایا پھر یہ کہہ کر اس کی آنکھیں نکلوادیں کہ جو منظر وہ دیکھ چکی ہیں، اس کے بعد اور کوئی منظر نہ دیکھنا چاہیے۔ آخر اندھے بادشاہ کو بیڑیاں پہنا کر بابل لے گئے، یروشلم شہر اور ہیکل کو تباہ کر دیا گیا۔ شہر اور ملک کے ممتاز آدمی کوئی پچاس ہزار ہوں گے۔

---

[1] تواریخ دوم باب ۳۶، آیت ۶۔

[2] یرمیاہ باب ۳۶، آیات ۲۱-۲۳۔

[3] یرمیاہ باب ۲۲، آیات ۱۹، ۲۰۔

[4] سلاطین دوم باب ۲۴، آیات ۸، ۱۶؛ تواریخ دوم باب ۳۶ باب ۹-۱۰۔

[5] Hophra

[5] سلاطین دوم باب ۲۵، آیات ۱-۷۔ تواریخ دوم باب ۳۶ آیات ۱۱-۲۰ یرمیاہ باب ۳۹، نیز ۵۲ آیات ۴-۲۷۔

ان سب کو قیدی بنا کر لے گئے۔ صرف بے حقیقت لوگ پیچھے رہ گئے۔ یہودا کا ہر اہم قصبہ ویران کر ڈالا گیا[1] اور صدیوں تک ویران رہا۔ ۵۸۲ء ق م میں بخت نصر نے یہودا کے ہمسایے کو بھی مسخر کر لیا۔ صرف صور باقی رہ گیا جس کا محاصرہ ۵۷۲ء ق م تک جاری رہا۔ صور کا بادشاہ اور مدافع ایتبعل ثالث تھا۔ ۵۷۴ء ق م میں اس کی جگہ بعل ثانی نے لے لی۔ ۵۶۴ء ق م میں صور کے اندر بھی بغاوت ہوئی، جسے فرو کر دیا گیا۔ غرض پورا شام خوب اچھی طرح کلدانیوں کی گرفت میں آ گیا۔

---

[1] یرمیاہ باب ۳۹، آیات ۸-۱۰، باب ۵۲ آیات ۱۲-۳۰، تواریخ دوم باب ۳۶، آیات ۱۷-۲۱، جوزیفس

پندرھواں باب

حضارتی اور روحانی زندگی کے مختلف پہلو

توحید

عبرانیوں نے فلسطین پہنچ کر ابتدائی دور میں مشرقِ قریب کے اس حضارتی نمونے کی پیروی شروع کر دی، جس کے مثل کنعانی تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، کنعانیوں نے عبرانیوں کو زبان، نیز اس کے ساتھ ابجدی تھی جب نئے مقام میں عبرانیوں کے قدم جم گئے تو انھوں نے پرانی سامی بولی ترک کر کے وہ زبان اختیار کر لی، جو ان کے ہمسایے بولتے تھے۔ ان کی اپنی زبان محض ایک بولی تھی، اس لیے، ادبیات پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہونے سے پیشتر ضروری تھا کہ وہ اپنے ہمسایوں سے فنِ تحریر سیکھ لیتے اور اس میں مشق بہم پہنچا لیتے۔

عبرانی لوگ خانہ بدوش بدوؤں کی حیثیت میں فلسطین پہنچے تھے۔ کنعانیوں سے انھوں نے کھیتی باڑی سیکھی۔ فلسطین میں توطن اختیار کر لینے کے بعد وہ ریوڑ چرانے کے درجے سے زراعت کے درجے پر پہنچے۔ یہودا کے کوہستانی خطوں میں عبرانیوں کے بہت سے اخلاف پہلے کی طرح ریوڑ پالتے اور چراتے رہے، لیکن شمالی حصّے کے زرخیز میدانوں میں کھیتی باڑی ہی ان کے معاش کا بڑا ذریعہ بن گئی۔

کھیتی باڑی سیکھنے کے علاوہ عبرانیوں نے کنعانیوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلّقات بھی پیدا کر لیے اور کنعانیوں ہی سے انھوں نے وہ مذہبی افکار و اعمال بھی سیکھ لیے، جو پیداوار کی افزائش اور اچھی فصلوں کے حصول کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے رسوم و شعائر کا وہ پورا انتظام اپنا لیا، جس میں لکڑی کے کھمبے "اونچے مقامات" سانپ کی پوجا[1] اور سنہری بچھڑا[2] شامل تھے۔ شام اور دوآبۂ دجلہ و فرات کے باشندوں کا یہ عام عقیدہ تھا کہ عبادت کا مناسب طریقہ جانوروں کی قربانی ہے، نیز فصلوں اور ریوڑوں کی پیداوار کا ایک حصّہ مقدّس معبدوں کی نذر کرنا چاہیے۔ تابوتِ سکینہ کے روبرو حضرت داؤد کا رقص[3] کنعانیوں کے رقص افزائشِ پیداوار کی یاد تازہ کرتا تھا۔ آج کل درویشوں کے مختلف طبقے خاص مراسم کے موقع پر جو متناسب حرکات کرتے ہیں یہ بھی دراصل اس ابتدائی رقص ہی کے آثار ہیں اور اب تک چلے آ رہے ہیں۔

---

[1] سلاطین دوم باب ۱۸، آیت ۴۔

[2] سلاطین اوّل باب ۱۲، آیات ۲۸، ۲۹ تواریخ حصّہ دوم باب ۱۳، آیت ۸۔

[3] سموئیل دوم باب ۶ آیت ۱۴۔

توراۃ میں بعض مراسم و مروّجات کی ممانعت آئی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عبرانیوں نے اس قسم کی چیزیں اپنے ہمسایوں سے لی تھیں۔ آگے چل کر رہنماؤں نے ان رسموں اور ریتوں کو عبرانی مذہب کے رجحانات سے مطابق نہ سمجھا۔ حلوان کو اس کی ماں کے دودھ میں پکانے کی ممانعت[۱] عجیب معلوم ہوتی تھی اور اس کی غلط توجیہات کی گئیں، لیکن اُغاریت کا ذخیرۂ ادبیات سامنے آیا تو معلوم ہُوا کہ وہاں یہ رسم جاری تھی۔

بلا شبہہ یہواہ کو سب سے بڑا معبود مانا جاتا تھا اور چونکہ عبرانی فتح یاب ہوئے تھے، اس لیے اس امر کو منوا بھی سکتے تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مقامی طور پر جن معبودوں کو زمین کی زرخیزی کے ضامن سمجھا جاتا تھا، وہ سب خارج ہو گئے تھے۔ یہواہ کا تعلق سلطنت کے معاملات سے تھا۔ عام زندگی کے معاملات ——— زراعت و تجارت ——— اس کے خصوصی مشغلے نہ تھے۔ بعض اوقات ——— خصوصاً عبرانی مملکت کے شمالی حصے میں ——— یہواہ بعل کے اوصاف پیدا کر لیتا تھا، مثلاً اسی کو آسمانوں کا مالک، مینہ برسانے والا اور طوفانوں کا مختار مانا جاتا تھا۔ عبرانی والدین اپنے پہلوٹھے بچّوں کے نام عموماً یہواہ کے نام سے نسبت دے کر رکھتے تھے، لیکن دوسرے بچوں کے نام بعل سے نسبت دے کر رکھے جاتے تھے۔ ابتدائی دور میں بعل والے ناموں کی تعداد بڑھتی رہی۔ مثلاً طالوت (ساؤل) کے ایک بیٹے کا نام اشبعل، یونتن کے بیٹے کا مریبعل" اور حضرت داؤدؑ کے بیٹے کا "تعلیدع" تھا[۲]۔ کنعانیوں کا یہ دیوتا (بعل) یہواہ کا ایسا حریف بن گیا تھا کہ اخی اب اور ایزبل کے عہدِ حکومت میں صرف سات ہزار ایسے آدمی نکلے ہیں، جن کے گھٹنے بعل کے آگے نہیں جھکے تھے[۳] اور یہ ایسی تعداد تھی، جو بہ ظاہر ایلیا نبی کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔

فنون

عبرانیوں کے مذہب اور فنِ تعمیر کی اصل کے کنعانی ہونے میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔ قدیم عبرانیوں کی صرف ایک ہی عظیم الشّان مذہبی عمارت تھی، یعنی ہیکل سلیمانی۔ یہ عمارت صوری اربابِ فن نے بنائی تھی اور اس میں کنعانیوں ہی کے مقدس معبد کا نقشہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس میں آرائش و زیبائش بھی کنعانیوں ہی کے نمونے کی تھی۔ یروشلم کا شاہی محل فونیقیوں کی کاریگری کا کرشمہ تھا۔ نخلِ حیات کی حفاظت کے لیے دو کرّوبی بنائے گئے تھے، جن کے جسم جانوروں کے تھے اور سر آدمیوں کے۔ یہ وہی نمونہ تھا، جو قدیم سامیوں میں رائج تھا۔ ہم نے کرّوبیوں کا جو تصوّر قائم کر رکھا ہے، یہ ہے، ایک بچّہ ہے، جس کے چھوٹے چھوٹے پَر لگے ہوتے ہیں، یہ تصور علمی نشاۃِ ثانیہ کے فنون میں سے گزرتا ہوا آشوریوں کے پَردار سانڈ پر نہیں، بلکہ شامیوں کے پردار ابوالہول یا پردار شیر پر پہنچتا ہے، جس کا سر آدمی کا سا تھا۔ مقدِس کے پردوں اور ہیکل سلیمانی کی دیواروں پر کرّوبیوں[۴] کی تصویریں بنا کر اُنھیں آراستہ کیا گیا تھا۔ اسرائیلیوں کے نزدیک خدا کا یہ تصوّر تھا کہ وہ کھڑا ہے یا کرّوبی پر سوار ہے[۵]۔

---

[۱] خروج باب ۲۳، آیت ۱۹، باب ۳۴، آیت ۲۶

[۲] تواریخ اوّل باب ۸، آیات ۳۳، ۳۴، باب ۹، آیات ۳۹، ۴۰، باب ۱۴، آیت ۷

[۳] سلاطین اوّل باب ۱۹ آیت ۱۸ — [۴] Cherubs

[۵] سموئیل دوم باب ۲۱، آیت ۱۱۔ زبور ۱۸، آیت ۱۰۔

ہیکل میں عبادت کے جو طریقے رائج تھے، ان میں آلاتِ موسیقی کی بھی ضرورت پڑتی تھی[1]۔ ابتدا میں ساز بجانے والے اور گانے والے کنعانی تھے، جب حضرت داؤدؑ نے مقدس عبرانی مزامیر کا سلسلہ شروع کیا اور حضرت سلیمانؑ نے اسے ترقّی دی تو کنعانی نمونہ ہی پیشِ نظر رکھا گیا، اور کوئی نمونہ تھا ہی نہیں۔ آگے چل کر عبرانی موسیقاروں کے جو گروہ بن گئے تھے، وہ اپنے نسب نامے ان خاندانوں تک پہنچا کر بہت خوش ہوتے تھے، جن کے نام کنعانی تھے[2]۔ مجدّو میں ایک خاکہ ملا ہے، جس میں ایک عورت عود بجا رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین میں یہ ساز حضرت داؤدؑ سے دو ہزار سال پہلے متعارف تھا۔ کتابِ پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کے ساز بہت پرانے تھے اور قابیل کی اولاد میں سے ایک شخص تھا "جو بین اور بانسری بجانے والوں کا باپ تھا"[3]۔ جب کوئی ساز رائج ہو جاتے تو طبعاً اس سے عام موسیقی اور مقدّس موسیقی دونوں میں کام لیا جانے لگا۔

بجانے والے سازوں میں سے عبرانیوں کے ہاں تقدم دف کو حاصل ہے، جس کا ذکر بائیبل میں بار بار آیا ہے[4] اور جو آلات منہ سے بجانے جاتے تھے، اُن میں بین، بانسری، ترمچی، تُرہی بالکل قابلِ ذکر ہیں۔ بین سادہ سی چیز تھی، اس کی نلیاں اکہری بھی ہوتیں اور دوہری بھی۔ اس کا نمونہ وہی تھا، جو آج کل بھی شام کے گڈریوں میں رائج ہے۔ ترمچی یا تُرہی بکرے یا مینڈھے کے سینگوں سے بنائی جاتی تھی اور آج کل بھی یہودیوں کے عبادت خانوں یا مذہبی مجلسوں میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ تاروں والے آلاتِ موسیقی میں سے بربط نے رواج عام حاصل کر لیا۔ ان آلات میں جو سُر استعمال کیے جاتے تھے ان کا ہمیں کوئی تصوّر نہیں۔

آلاتِ موسیقی کے ساتھ گیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ابتدائی دَور کے گیتوں میں سے جو محفوظ رہ گئے ہیں، ایک وہ تھا، جو دبورہ نے کنعانیوں پر اسرائیلیوں کی فتح کا جشن مناتے ہوئے گایا تھا[5]۔ ہیکل کی طرف زیارت کے لیے جاتے ہوئے زائر جو گیت گاتے تھے وہ کتابِ زبور میں شامل ہو گئے ہیں[6]۔ یہ گیت شاعروں نے مرتب کیے تھے۔ اُغاریت کی شاعری کی طرح عبرانی شاعری کو بھی متوازیت نے خاص حیثیت دی۔ کنعانیوں سے جو نظریے اور نمونے مستعار لیے گئے تھے انھیں کی بنا پر زبور اور عہد نامہ قدیم کی دوسری شاعرانہ تالیفات میں ایک جلال، ایک عظمت اور ایک مترنّم لَے پیدا ہو گئی۔ عہد نامۂ قدیم کا قریباً نصف حصہ وضع و ساخت کے اعتبار سے شعر ہے۔

منزلی معاملات

عبرانیوں نے مذہب اور فن کی طرح زندگی کے عام معاملات میں بھی انھیں لوگوں کے طور طریقے اختیار کر لیے، جن کے درمیان وہ مقیم ہو گئے تھے اور ان سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ان کا تصوّرِ حیات اور عقیدۂ بعد الموت عملاً وہی تھا، جو کنعانیوں کا تھا۔ تجہیز و تکفین کی رسمیں بھی ویسی ہی تھیں، میت کو قبر میں رکھتے تو زندگی کی روزانہ ضرورت کی چیزیں بھی ساتھ رکھ دیتے؛

---

[1] تواریخ اوّل باب ۲۵

[2] البرائٹ Archaeology and the Religion of Israel ص ۱۴، ۱۲۶، ۱۲۷

[3] کتاب پیدائش باب ۴، آیت ۲۱

[4] خروج باب ۱۵، آیت ۲۰، قضاۃ باب ۱۱، آیت ۳۴، سموئیل اوّل باب ۱۸، آیت ۶۔ زبور ۶۸، آیت ۲۵

[5] قضاۃ باب ۵

[6] زبور ۱۲۰ تا ۱۳۴

مثلاً رکابیاں، کوزے وغیرہ۔ ان کا لباس، زیورات، ظروف گلی اور دوسرے فنون کنعانیوں ہی کی طرز کے تھے۔ ایک لمبی عبا جس کی وضع خاص ہوتی تھی، بادشاہ اور نبی پہنتے تھے۔ آگے چل کر اسے عورتوں نے اختیار کر لیا۔ باریک سوتی کپڑا بھی اونچے درجے کے لوگ استعمال کرتے تھے اور اس کے لیے مستطیل چادریں لی جاتی تھیں۔

کاتنا اور بُننا گھریلو صنعتیں شمار ہوتی تھیں اور زیادہ تر لوگ اپنی ضرورت کے لیے کات بُن لیتے تھے۔ دانشمند اور حکیم عبرانی کے نزدیک اچھی بیوی کی خصوصیت میں یہ اوصاف بھی شامل تھے کہ "وہ اون اور کتان ڈھونڈتی ہے اور خوشی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کام کرتی ہے"[1] قریۂ سفر[2] میں ایسے پتھر ملے، جو کپڑا بُننے کے وقت اس غرض سے لٹکائے جاتے تھے کہ کپڑے یا سوت میں شکن نہ پڑے۔ لجنیش میں کپڑا بُننے کی مشین کے ٹکڑے اور رنگنے کے برتن ملے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشہ ور جلاہے بھی موجود تھے جو عام لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی غرض سے کپڑا بُنتے تھے[3]۔ قریۂ سفر اور لجنیش دونوں ابتدائی دور کے کنعانی مرکز تھے۔ جواہرات کی تلاش میں کوئی گروہ عبرانی کاریگروں پر برتری کا دم نہیں مار سکتا تھا۔ بادشاہی کے عہد کی مُہریں دستیاب ہوئی ہیں، جن سے مُہر کنی کے فن میں اعلیٰ درجے کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ بائبل میں منشیوں، کتان بافوں اور سناروں کے خاندانوں کی نسبت حوالے ملتے ہیں[4]۔ ان سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پیشہ وروں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کی تنظیم موجود تھی جو موجودہ زمانے کے گلڈوں سے ملتی جلتی تھی، یعنی مختلف پیشوں کے ارکان ایک دوسرے کے اقتصادی، معاشرتی یا مذہبی منافع کے لیے ایکا کر لیتے تھے۔

کتان کا کپڑا مقامی سن سے بنتا تھا۔ یہ قدیم جنس بالکل ابتدائی دور میں مشرقی بحیرۂ روم کے سواحل پر اور مصر میں فروغ پا چکی تھی۔ عبرانیوں کے قبضے سے پیشتر یہ اریحا کے میدان میں بہت ہوتی تھی[5]۔ سن اب فلسطین سے ناپید ہو چکا ہے، البتہ جنگلی سن کے پھول موسمِ بہار میں شام و لبنان کی فضا کو رنگین بنا دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کپاس کی کاشت شروع ہوئی، لیکن کپڑا بُننے کے لیے اُون پہلے سے استعمال ہوتی تھی۔ خوش حال متوسط طبقے کے لباس کے لیے وطنی اون استعمال کی جاتی تھی اور وطن ہی میں کپڑا بنتا تھا۔ جزر سے جو تقویم ملی ہے وہ دسویں صدی قبل مسیح کے درمیانی دور کا حال بیان کرتی ہے۔ اس میں سن کے علاوہ گیہوں، زیتون اور شہد بھی تھا[6]۔ غلّوں میں گیہوں کو سب سے اونچا درجہ حاصل تھا۔ دشمن جب حملے کرتے تھے تو ان کا رُخ کھلیانوں ہی کی طرف ہوتا تھا[7]۔ یہی کیفیت آج کل ہے۔ مختلف مقامات کی کھدائی میں چھوٹی چھوٹی چکیاں برآمد ہوئی ہیں، جن میں غلّہ پیسا جاتا تھا۔ بیت شمس میں تنور بھی لگے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روٹی پکانے کے جو طریقے اس زمانے میں رائج تھے، ان سے بعض اب تک تنوروں کی شکل میں رائج چلے آتے ہیں[8]۔ تیل نکالنے

[1] مثال باب ۳۱، آیت ۱۳۔ Kirjath-sepher کے معنی ہیں قریۂ کتب، اب اس کا نام تل بیت مرسم ہے جو حبرون سے تیرہ میل جنوب مغرب میں ہے۔

[2] دیکھیے براؤئس Barrois کی کتاب مینوکل جلد اول ص ۴۸۲ – ۴۸۷

[3] تواریخ اوّل باب ۲، آیت ۵۵، باب ۴، آیت ۲۱، نحمیاہ باب ۳، آیت ۸، ۳۱، عاموس باب ۷، آیت ۱۴۔

[4] یوشع باب ۲، آیت ۶۔

[5] استثنا باب ۸، آیت ۸۔

[6] سیموئیل اوّل باب ۲۳، آیت ۱۔

[7] ایلیہو گرانٹ Elihu Grant ارسلیہ ص ۴۹ The People of Palestine ص ۸۷ سے آگے۔

کے کولھو اور شراب بنانے کے حوض عام تھے۔ لخیش میں زیتون ڈالنے کے بڑے بڑے گھڑے ملے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہی کے زمانے میں یہاں تیل نکالنے کے بڑے کارخانے تھے۔ عبرانیوں نے کنعانی چراغ لے لیا، جس میں زیتون کا تیل پڑتا تھا اور سات سو سال تک وہ اسی کو استعمال کرتے رہے۔ ۸۰۰ ق م کے آس پاس دوآبۂ دجلہ و فرات سے نئی وضع کے چراغ آئے۔ ایک نمونہ بیت شمس سے ملا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان چراغوں میں ایک طرف چھوٹی سی دستی لگی ہوتی تھی، اس کا اوپر کا حصہ بند ہوتا تھا اور بیچ میں بتی کے لیے ایک سوراخ رکھا جاتا تھا۔ تل النصبہ[۱] سے ایک مٹی[۲] کا برتن ملا، جس کی شکل مخروطی چھتے کی سی تھی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شہد کی مکھیاں پالی جاتی تھیں۔ بائبل میں پیاز، لہسن، لوبیے کی پھلیوں، کھیرے، ککڑی، دھنیے، سبزیوں اور دالوں کا ذکر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہودیوں کا کھانا پینا ہمسایوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ مٹر اور مسور کو شوربا بنانے کے لیے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ انگور کی شراب اور اس سے پیدا ہونے والی دوسری چیزوں کو عبرانیوں کی رسموں، ریتوں اور اقتصادیات میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس پودے کو بجائے خود زرخیزی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ شراب ہیکل میں نذر کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ابتدائی دور کی عبادت گاہوں اور قبروں میں پچی کاری اور سنگ تراشی ملاحظہ کی جائے تو اس میں انگور کی بیلیں بنی ہوئی نظر آئیں گی۔ انار کو بھی آرائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کا عرق ٹھنڈک پیدا کرنے والا مشروب سمجھا جاتا تھا۔

پھولوں میں سب سے بہتر سوسن کا پھول تھا۔ ہیکل کی آرائش میں بھی اس سے کام لیا گیا، بعد میں یہ سکّوں پر بھی استعمال ہوا۔ حضرت سلیمانؑ کی غزل الغزلات میں اس کی طرف، نیز دوسرے پودوں اور پھولوں کی طرف بہ کثرت اشارے موجود ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شقائق نعمان اور ڈیزی بھی شامل تھے۔ اب تک یہ کیفیت ہے کہ بہار کا موسم آتا ہے تو ان پھولوں کی کثرت سے شام کی سرزمین پر رنگا رنگ شطرنجی بچھ جاتی، معلوم ہوتا ہے، حضرت مسیحؑ نے بھی جنگلی سوسن کی بہار دیکھی تھی، اس لیے کہا کہ سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو۔ "میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا۔"[۳]

سکّے

فلسطین میں پانچویں صدی قبل مسیحؑ سے پیشتر سکّے یعنی ٹھپا لگے ہوئے روپے پیسے جاری نہیں ہوئے تھے۔ اس سے پیشتر بابلی نظام رائج تھا، جس میں وزن کے لیے مثقال کو معیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔[۴] جب جنس کا تبادلہ جنس سے نہیں کیا جاتا تھا، تو میزان کے ذریعے سے کاروبار انجام پاتا تھا۔ نظام مثقال کی بنا پر بہت سے اوزان مختلف مقامات سے برآمد ہوئے ہیں۔

---

[۱] تل النصبہ یروشلم کے شمال میں آٹھ میل پر اور البیرہ سے چھ میل جنوب میں ہے۔ لوگ اس کو "مدینہ مصفا" سمجھتے ہیں۔

[۲] سلاطین اوّل باب ۱۵، آیت ۲۲، سموئیل اوّل باب ۷، آیات ۱۵، ۱۶۔

[۳] متی باب ۶، آیت ۲۸۔

[۴] خروج باب ۲۱، آیت ۲، استثنا باب ۱۵، آیت ۱۲۔

پانچویں صدی کے اوائل میں ایتھنز سے چاندی کے سکّے مشرقِ قریب میں داخل ہوئے، اور فلسطین وعرب میں انھیں کو اختیار کر لیا گیا۔ یہی اس زمانے میں بین الاقوامی سکّے تھے۔ جو قدیم ترین عبرانی سکّہ اب تک دستیاب ہوا ہے، وہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط کا ہے اور شاید یرمیاہ نے بنوایا تھا۔

مذہبی رہنما

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبرانیوں نے فنون یا سیاسیات یا اقتصادیات کے دائرے میں ترقی کا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، تو ان کا خاص کارنامہ کیا تھا؟ بلاشبہ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا کارنامہ مذہبی دائرے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دائرے میں عبرانی کائناتِ انسانیت کے اخلاقی معلّم بن گئے۔ ان کے کمالات کا پورا مرقع عہد نامۂ قدیم میں پیش ہوتا ہے۔

مسیح سے پیشتر کے دَور میں اَدب کا کوئی ایسا ممتاز اور بلند پایہ مرقع ہمارے ہاتھوں میں نہیں پہنچا۔ علاوہ بریں عہد نامۂ قدیم ایک تہذیب کی زندہ یادگار ہے۔ قدیم تہذیبوں میں دوسرے ادبی باقیات ان گنت پشتوں تک گمنامی میں پڑے رہے ہیں۔ موجودہ دَور میں آثارِ قدیمہ کے لیے کھدائیاں شروع ہوئیں تو ہمیں ملے، لیکن عہد نامۂ قدیم غیر مختل روایت کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، یہ ہر دَور میں مرد وزن کی زندگی کے لیے ایک متحرک قوّت بنا رہا۔ اصل مواد انضباط کی آخری شکل اختیار کرنے سے پیشتر مختلف دوروں سے گزرا۔ اس میں سے انتخاب ہوا۔ کچھ حصے حذف کر دیے گئے۔ پھر بڑے عمدہ انداز میں اسے ترتیب دیا گیا۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی معنوی وحدت جاری وساری ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں آیا جب اس مواد کے لیے زیادہ سے زیادہ سرگرم مطالعہ اور تحقیق کا سلسلہ عمل میں نہ آیا۔ زمانۂ قدیم، قرونِ وسطیٰ اور دورِ حاضر میں اربابِ فن شاعر اور محرّر بائبل کے مختلف حصّوں سے فیضان حاصل کرتے رہے ہیں۔ تمام مہذب زبانوں پر بائبل کی تلمیحات اور بائبل کے نظریات کی چھاپ موجود ہے۔

عہد نامۂ قدیم کی تصنیف میں مؤرخوں کے علاوہ متعدد معلّموں نے حصّہ لیا۔ ان میں سب سے پہلے وہ مقنّن تھے جو حضرت موسیٰؑ کی شکل میں نمایاں ہوئے، اور یہواہ کے ترجمان کی حیثیت میں کلام فرماتے تھے۔ موسوی قانون کی طرح حمورابی نے بھی قوانین کا ایک مجموعہ تیار کرایا، جو اگرچہ موسوی قانون سے زائد از پنج صد سال پیشتر تیار ہوا تھا، تاہم اس میں تجارتی اور صنعتی ماحول اعلیٰ پیمانے پر موجود ہے۔ عبرانیوں کے قانون کا ماحول گلّہ بانی اور زراعت کا ماحول تھا۔ حمورابی کے قانون میں غلام چوتھے سال آزاد ہو جاتا تھا، موسوی قانون میں غلام کو ساتویں سال آزاد کیا جاتا تھا[1]۔ حمورابی کے قانون میں چوری کی سزا یہ تھی کہ مسروقہ مال دوگنا سے تین گنا تک دیا جائے۔ موسوی قانون میں یہ سزا چار گنا تک تھی[2]۔ حمورابی کے قانون میں ماں یا باپ کو مارنے والے کی سزا یہ تھی کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ موسوی قانون میں موت کی سزا تھی[3]۔ حمورابی نے رشوت لینے والے قاضیوں کے لیے سزا تجویز کی تھی اور موسوی قانون میں رشوت کی صرف ممانعت آئی ہے۔ دونوں مجموعہ ہائے قوانین میں مروجہ معمولات کو قانون کی شکل دے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ بدوؤں کا انتقامی اصول لگا دیا گیا ہے، یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ[4]

---

[1] خروج باب ۲۱، آیت ۲، استثناء باب ۱۵، آیت ۱۲

[2] خروج باب ۲۲، آیت ۱۔

[3] خروج باب ۲۱، آیت ۱۵۔

[4] خروج باب ۲۱، آیت ۲۴، استثناء باب ۱۹، آیت ۲۱۔

بلاشبہ یہ سابقہ حالت کے مقابلے میں ترقی کی طرف اقدام تھا، اس لیے کہ غیر محدود انتقام کی جگہ مناسب سزا رکھ دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰؑ کا قانون یہواہ کی طرف سے تھا۔ حمورابی بھی "شمس" کی طرف سے قانون ملنے کا مدعی ہے، مگر لیکن حضرت موسیٰؑ کے قانون کا اخلاقی عنصر جو احکام عشرہ میں شامل ہے، اس کا مقابلہ کوئی مجموعۂ قوانین نہیں کر سکتا۔ ان دس حکموں پر اضافہ حضرت مسیحؑ نے کیا۔ ان حکموں میں ممانعت صرف عمل کی دنیا تک محدود نہ رہی، بلکہ فکر و رغبت پر بھی حاوی ہو گئی۔

ایک اور عبرانی معلّم وہ تھا، جسے کاہن کہتے تھے[۱]۔ کاہن صرف تعلیم نہیں دیتا تھا، بلکہ تعلیم سے زیادہ عمل کرتا تھا۔ کاہن قربانی کے موقع پر اور تمام دوسری مذہبی رسموں میں موجود رہتا تھا اور اس طرح خدا اور انسان کے درمیان واسطے کا کام دیتا تھا۔ قدیم زمانے میں کاہنوں اور پروہتوں کی خاص جماعتیں بن گئی تھیں۔ عبرانیوں میں کاہن کا منصب موروثی تھا اور یہ صرف ہارونؑ کے خاندان تک محدود تھا[۲]۔

ایک اور معلّم تھا، جسے حکیم یا دانشمند کہنا چاہیے۔ یہ شخص جماعت کے بجائے افراد کو خطاب کرتا تھا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ نجات حاصل کی جائے، رضائے معبود پر نجات کو ترجیح دی جائے، حکمت و دانش خود انسان کے اندر پیدا ہوتی تھی۔ یہ اُس کے اپنے مشاہدات و تجربات سے اخذ کی جاتی تھی۔ عبرانی حکمت کی خاص طور پر قابلِ ذکر کتابیں یہ ہیں: "صحیفۂ ایوبؑ"، "صحیفۂ امثال"، "صحیفۂ مواعظ"۔ ان سب میں بلند پایہ بے شبہ صحیفۂ ایوبؑ ہے۔ یہ کتاب حکمت کی تمام کتابوں میں سب سے بڑھی ہوئی ہے۔

صحیفۂ ایوبؑ کا مصنف محض ایک بے مثال دانش مند ہی نہ تھا، بلکہ ایک بے مثال شاعر بھی تھا۔ عبرانی شاعری بھی دوسری زبانوں کی شاعری کی طرح نہایت زبردست جذبات کو ایک خاص شکل میں پیش کرنے پر مبنی تھی۔ عبرانیوں میں غنائی شاعری عام تھی۔ مغنّی کی حیثیت میں عبرانی شاعر فتح و نصرت کے ترانے گاتا تھا، اس لیے کہ یہواہ کی رحمت سے نجات حاصل ہونے پر خوشیاں مناتے۔ مزامیر ترتیب دینے والے کی حیثیت میں وہ ایک تائب کے جذبے کا اظہار کرتا تھا جو خدا سے رحم مانگتا، یا اس کی رحمت پر خوشی کا اظہار کرتا تھا[۳] یا کوئی کمزور یا کوئی بیچارہ آدمی تکلیف کی حالت میں خدا کو پکارتا یا اس کی نصرت دیاوری کے لیے حمد کے گیت گاتا[۴]۔ شاعر کو عبرانیوں میں ایک معلّم کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

انبیاء

معلّموں میں نبی کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ نبی سے وہ شخص مقصود نہیں جو پیش گوئیاں کرے، بلکہ وہ شخص ہے، جو خدا کی طرف سے ہدایت کی دعوت دے۔ اور روئے اشتقاق اس اصطلاح کے معنی یہی ہیں[۵]۔ عبرانی مذہب کی ابتدا نبیوں ہی سے ہوئی۔ نبوت، عبادتِ بعل اور دوسری اجنبی عبادتوں کے خلاف ایک عدلائے احتجاج تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہواہ کے مذہب کو قائم رکھا جائے۔ نبی یہواہ کی طرف سے مدافعین کا کام انجام دیتے تھے۔ اس بنیاد سے شروع ہو کر عبرانی انبیاء روحانی فکر و نظر کی بلند

---

[۱] Kohen ۔ [۲] خروج باب ۲۸، آیت ۱، گنتی باب ۱۹، آیت ۴۰۔

[۳] زبور ۵۱، آیت ۳۲۔

[۴] زبور، ۳، ۳۸، ۲۳۔

[۵] عبرانی لفظ نبی وضع میں عربی ہے اور اُس کے معنی ہیں خبر دینے والا۔ اس کی اصل قدیم سامی ہے۔ اکادی میں اس لیے "نبو" ہے، یعنی پکارنا۔

اور پاکیزہ دنیا میں پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک نیا مذہب مکمل کر دیا، جو توحید پر مبنی تھا۔ جس کا مرکز وہ معبودِ اعلیٰ تھا، جو سب کا یکساں معبود ہے۔ نبی یہ تعلیم دیتے تھے کہ یہ خدا عادل ہے اور اپنے تمام پیروؤں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ پاکیزہ اخلاق پر کاربند رہیں اور راست باز بنیں۔ یہ خدا قربانیوں سے نہیں، بلکہ پاکیزہ طرزِ زندگی سے راضی ہوتا ہے۔ اسے عبادت کی رسموں سے نہیں، بلکہ سیرت اور کردار سے دلچسپی ہے۔ یعنی ان انبیا کی تعلیم کا بنیادی اصول خالصتہً اخلاقی توحید تھا۔

ان دونوں مذہبوں کی ایک دنیا موجود تھی، جن میں خاص اعمال اور خاص پابندیاں مقرر تھیں، ان کی پیروی لازم تھی۔ اسی طرح خدا کی رضا حاصل ہو سکتی تھی یا اس کے غضب سے بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی، لیکن عبرانی انبیا نے خدا، انسان اور ان کے تعلقات سے نئے رنگ میں پیش کیے۔ ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ روح نجات حاصل کرے؟ بلکہ وہ فرد کی نشوونما تھا، اور معاشرے کی حفاظت کے آرزو مند تھے۔ وہ مجلسی انصاف کے داعی بن گئے، بابل، حتی یا یونان کے کسی معلم نے مذہب و اخلاق کو اکٹھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کسی نے مجلسی ضوابط کو الٰہی احکام و فرامین قرار نہیں دیا تھا "کتاب الاموات" یا مصر کے دوسرے ادبیات میں اخلاقی عنصر مقابلتہً بہت ضعیف اور کمزور ہے۔ حضرت مسیحؑ نے نبوت کو نہ کہ قانون وکہانت کو اپنی تعلیم کی بنیاد و اساس بنایا۔ اسی اساس مشترک پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا کام جاری رکھا اور اسے تکمیل پر پہنچایا)۔ للہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ عبرانی نبوت نے کائناتِ انسانیت کی روحانی تاریخ میں سب سے بڑی تحریک جاری کی"[۲]

نبوی اسلوب فکر نے نہ محض باری تعالیٰ اور اس کی صفات، نیز خدا اور انسان کے ساتھ انسانی تعلق کے متعلق نئے تصورات پیدا کیے، بلکہ ادبیات کا ایک نیا نمونہ پیدا کر دیا، جو مترنم، متوازن اور مؤثر تھا۔ ترجمے میں اس کا بیشتر اثر باقی نہیں رہتا۔ نبوی ادبیات کا بڑا حصہ سنہ ۷۵۰ ق م اور سنہ ۵۵۰ ق م کے درمیان بروئے کار آیا۔

بابلیوں، مصریوں، آشوریوں اور یونانیوں کا بڑا سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک خاص توحید کا تصور پیدا کیا، یعنی وہ خدا کو ایک تو سمجھتے تھے، مگر اُسے لاشریک نہیں مانتے تھے اور دوسرے دیوتاؤں کو کاملاً حذف نہیں کرتے تھے۔ عبادت میں انھوں نے جو اعلیٰ درجہ حاصل کیا، یہ تھا کہ ایک معبود کو پوجتے تھے، اگرچہ اس کے شریک دوسرے معبودوں کے وجود کے بھی معتقد تھے۔ عبادت میں بعض کا رُخ مردوخ کی طرف ہوتا، بعض کا آتون کی طرف اور بعض کا اپولو کی طرف اور اس وقت یہی ظاہر ہوتا کہ وہ اور کسی معبود کے معتقد نہیں، تاہم ظاہر ہے کہ اس طرح وہ موحد نہیں بن سکتے تھے۔ توحید ایک زبردست اور مستقل نظامِ عقائد ہے، جس کا مدعا محض یہ نہیں کہ محدود دائروں میں دوسرے معبودوں کی کارفرمائی سے انکار کیا جائے، بلکہ دوسرے معبودوں کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظامِ عقائد کے مطابق خدا کی ذات کسی خاص قوم اور قبیلے تک محدود نہیں رہ سکتی، بلکہ

---

[۱] قدیم اقوام میں سے صرف مصریوں کے ہاں موت کے بعد زندگی کا ایک مفصل لائحہ موجود تھا۔ عبرانیوں کا برزخ یا عالمِ ارواح مبہم اور غیر متعین تھا۔ اس کا کوئی واضح نقشہ پیشِ نظر نہیں تھا۔ راست باز اور شریر دونوں اس میں جاتے، خصوصاً شریر اور برے لوگ اور وہاں بے عملی کی ناخوشگوار زندگی گزارتے۔

[۲] جولیس، اے، بیور (Bewer) کی کتاب The Literature of the Old Testament in its Historical Development ص ۸۷

اسے تمام قوموں کا اور پوری کائنات کا خدا ماننا چاہیے۔ ناقص توحید دراصل توحیدِ خالص اور شرک کے درمیان کی ایک منزل ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کے نزدیک یہوواہ صرف عبرانیوں کا معبود تھا اور اس کا دائرۂ حکومت صرف عبرانیوں کی سرزمین تک محدود تھا۔ یہ طریقِ فکر اس زمانے میں عام تھا۔ عبرانی یہوواہ کی ابتدا قبائلی معبود سے ہوئی تھی اور وہ مصریوں کے خلاف آزار رساں تدبیریں اختیار کر کے خوش ہوتا، جو عبرانیوں پر ظلم و جبر کر رہے تھے۔ پھر وہ قومی خدا بن گیا اور اُس نے اموریوں نیز کنعانیوں کے استیصال کا اختیار دے دیا[1] اور بعل کے، جو رقیب معبود تھا، سیکڑوں مذہبی پیشواؤں کے قتل کا حکم صادر کر دیا[2]۔ جب انبیاء کا دور آیا تو یہوواہ پوری کائنات کا خدا بن گیا اور اسے محبت، عدالت، رحم اور غفران کا خدا کہا جانے لگا۔ اس ارتقاء کے اسباب و تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے[3]۔ زمانۂ قدیم کے نظامِ استدلال کی کیفیت یہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فتح پا لیتی تھی تو سمجھا جاتا تھا کہ فاتح قوم کا معبود زیادہ طاقتور ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مفتوح قوم کے لوگ اس نئے معبود کو قبول کر لیتے۔ عبرانی انبیاء نے استدلال کا یہ طریقہ اختیار کر لیا۔ جس زمانے میں آشوری لشکر یہوواہ کی قوم کو پامال کر رہے تھے، تو عبرانی انبیاء یہ تعلیم دے رہے تھے کہ یہوواہ آشوریوں کو اپنی برگزیدہ قوم کی سزا دہی کے لیے استعمال کر رہا ہے، اس لیے کہ برگزیدہ قوم نے یہوواہ کے حکموں سے تجاوز کیا۔ اس طرح شکست کو فتح کا لباس پہنا دیا گیا۔ اس طرح یہوواہ کی حیثیت نہ صرف قائم رکھی گئی، بلکہ اس کا درجہ بلند ہو گیا اور وہ عالمگیر معبود بن گیا۔

موحدِ اوّل — عاموس

یہ امر قرینِ یقین نہیں معلوم ہوتا کہ یہودا کے ایک غیر معروف گاؤں اور اُس پاس کے بنجر نالہ کا ایک چرواہا جو گولر کے پھل بوٹتا تھا تاریخِ عالم میں پہلا شخص ہو گا، جس نے خدا کی توحید اور صفتِ آفاقیت کا تصور پیش کیا۔ یہ شخص تقوعؑ[4] کا عاموس تھا، جس کی دعوت کا اعلان ۷۵۰ ق م کے آس پاس ہوا۔ عاموس نے اپنا پیغام زبانی پہنچایا۔ لکھ کر بھیجنا تو کیا۔ ممکن ہے، وہ پڑھا لکھا بھی نہ ہو۔ اس کی دعوت شمالی مملکت میں یوعبریعام ثانی نشر ہوئی، جس کی فتوحات کے باعث عبرانیوں کو نئی ثروتیں ملیں اور نئی راحت جوئیاں اور کامرانیاں سوجھیں۔ عاموس ہی پہلی شخصیت ہے، جس نے خدا کو خدائے اسرائیل نہیں بلکہ خدائے کائناتِ اقوام قرار دیا[5]۔ جس نے کہا کہ خدا عادل ہے۔ اُس نے یہوواہ کی زبان سے مندرجہ ذیل الفاظ کہے:

---

[1] یشوع باب ۱۰، آیات ۸-۴۲۔

[2] سلاطین اول باب ۱۸، آیات ۳۶-۴۰۔ استثناء باب ۱۳، آیات ۱۳-۱۸- باب ۱۷، آیات ۲، ۵۔

[3] معلوم نہیں اس میں مشکل کیا ہے۔ دراصل یہ ارتقا ہے ہی نہیں، بلکہ جو اختلاف نظر آتا ہے وہ حالات اور ماحول میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ یہی بنیادی غلطی مصنف کو ایک ایسے دائرے میں لے گئی۔ جہاں وہ حضرت موسیٰؑ اور داؤدؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی شان سے بے پروا ہو گئے۔

[4] اس کا نام خربتہ تقوع یا تقوعہ کی شکل میں اب تک محفوظ ہے، یہ بیت الحم سے چھ میل جنوب میں ہے۔

[5] صحیفہ عاموس باب ۹ آیات ۵، ۷۔

۲۱- میں تمہاری عیدوں کو مکروہ جانتا اور ان سے نفرت رکھتا ہوں اور میں تمہاری
مقدس محفلوں سے بھی خوش نہ ہوں گا۔
۲۲- اگرچہ تم میرے حضور سوختنی اور نذر کی قربانیاں گزارو گے تو بھی میں قبول
نہ کروں گا اور تمہارے فربہ جانوروں کی شکرانے کی قربانیاں خاطر
میں نہ لاؤں گا۔
۲۳- تو اپنے سرود کا شور میرے حضور سے دور کر، کیونکہ میں تیرے رباب کی
آواز نہ سنوں گا۔
۲۴- لیکن عدالت کو پانی کے مانند اور صداقت کو بڑی نہر کی مانند جاری
رکھ[1]

یسعیاہ اور خدا کی قدوسیت

یسعیاہ کی نبوت کا دور ۷۳۸ ق م میں شروع ہوا۔ وہ بھی عاموس نبی کی طرح نظری توحید ہی کی مصطلحات میں سوچتے تھے اور وہ بھی فرماتے تھے کہ خدا کے سوا جن معبودوں کی پرستش کی جا رہی ہے، وہ سراسر بے کار ہیں اور انسانوں نے خود ہی انھیں گھڑ لیا ہے[2]۔ انھوں نے اپنے عہد کے افکار کا دھارا آگے بڑھایا۔ خدا کی قدوسیت پر خاص زور دیا۔ انھوں نے فرمایا۔

قدوس، قدوس، قدوس رب الافواج ہے، ساری زمین اس کے
جلال سے معمور ہے[3]

اُن کا عہد فتنہ و فساد سے لبریز تھا۔ اسی عہد میں سرجون نے سامریہ کو فتح کیا (۷۲۲ ق م) اسی عہد میں سنحرب نے یروشلم پر حملہ کیا (۷۰۱ ق م) یسعیاہ اپنے معاصروں سے بدرجہا بلند تر رہے اور انھوں نے حبِ وطن کا ایک درخشاں نمونہ پیش کیا، جو کسی بھی قربانی میں متامّل نہیں ہوتا، اس لیے کہ خدائے قدوس نے ان کے قلب کو غیر متزلزل یقین کی روح سے بھر دیا تھا۔ وہ تین سال تک برہنہ اور ننگے پاؤں پھرتے رہے، تاکہ واضح ہو جائے، آشور کے فرمانروا مصری اور کوشی اسیروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے[4]۔ یسعیاہ نے مسیح علیہ السّلام کے پیدا ہونے کی بشارت بھی دی تھی۔ انھوں نے ایمان و یقین کی آنکھ سے ہمہ گیر امن کے دور کو رویا میں دیکھا تھا۔ جو "سلامتی کے شہزادے" کے ماتحت شروع ہوگا۔ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ اس دور میں قومیں اپنی تلواروں کو توڑ کر پھالیں بنالیں گی اور بھیڑیے برّوں کے ساتھ رہیں گے[5]۔ غرض انھوں نے

---

[1] صحیفہ عاموس باب ۵، آیات کے نمبر ساتھ لگا دیے گئے ہیں
[2] یسعیاہ باب ۲، آیات ۸-۱۸، باب ۱۰ آیت ۱۰
[3] یسعیاہ باب ۶، آیت ۳۔
[4] یسعیاہ باب ۲۰، آیت ۳۔
[5] ایضاً باب ۲، آیات ۲،۴، باب ۹، آیات ۶،۷۔ باب ۱۱ آیات ۱، ۹۔

ایک ایسے نئے دَور کی دعوت دی، جو ترقّی کے دو ہزار چھ سو سال کی مدّت میں بھی رُونما ہوا۔ یسعیاہ ثانی بھی، جو صحیفۂ یسعیاہ کے چالیسویں باب سے پچپنویں باب تک کا مصنف تھا، توحید ہی کا داعی تھا۔

یرمیاہ اور میثاقِ جدید

عاموس اور یسعیاہ کے برعکس یرمیاہ نے اپنی دعوت بصورتِ مکتوب پیش کی۔ ان کا دورِ نبوّت (۶۲۶؁ ق،م – ۵۸۶؁ ق،م) طویل آلام و مصائب کا دَور تھا۔ عہد نامۂ قدیم میں غالباً ان کا کردار سب سے بڑھ کر شریفانہ تھا۔ ان کے سامنے بخت نصر نے ۵۹۷؁ ق،م میں یروشلم پر حملہ کیا اور ۵۸۶؁ ق،م میں اسے ویران کر ڈالا۔ عاموس اور یسعیاہ ثانی کی طرح یرمیاہ بھی داعی توحید تھے، لیکن ان کی توحید زیادہ جامع اور عملی تھی۔ انھوں نے غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کیا کہ یھواہ کے سوا جو معبود ہیں، وہ باطل ہیں، انسانوں نے خود بنائے ہیں اور محض وسواس کے کرشمے ہیں[۱]۔ انھوں نے بھی یسعیاہ کی طرح ایک مثالی دَور کا خواب دیکھا تھا، جس میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گا[۲]۔

صحیفۂ یرمیاہ کا بہترین حصہ چار باب (۳۰–۳۳) ہیں جنھیں بعض نے عہد نامۂ قدیم کے اندوختہ غور و فکر کا نہایت پاکیزہ نمونہ قرار دیا ہے، یہاں یھوداہ نے اپنے بندوں سے نیا عہد باندھا۔ یہ عہد عبرانیوں کے آبا و اجداد کی طرح سنگی الواح پر نہیں، بلکہ انسانی قلوب پر نقش ہُوا[۳]۔ حضرت مسیح علیہ السّلام نے آخری فسح میں نئے عہد کو اپنایا اور عبرانیوں کے نام خط لکھنے والے نے اس کے متعلق حوالہ دیا[۴]۔ اسی سلسلے میں یرمیاہ نے انفرادی ذمہ داری کا اصول پیش کیا، یہ ابتدائی اصول سے متناقض تھا، جو یہ تھا کہ باپ دادا نے کھٹّے انگور کھائے اور ان سے اولاد کے دانت کھٹّے ہو گئے[۵]۔ اخلاقی احساس کا یہ وہ درجہ تھا، جو ہمارے عہد میں یورپی اقوام کو بھی نصیب نہ ہُوا، جیسا کہ دوسری عالمی جنگ میں ان کی روش سے واضح ہے۔

دوسرے انبیاء کا فیضان

دوسرے انبیاء نے بھی اپنے اپنے عہد میں ضروری کارنامے انجام دیے۔ ہوسیع شمالی مملکت کا باشندہ تھا۔ وہ ۷۴۵؁ ق،م اور ۷۳۵؁ ق،م کی درمیانی مدّت میں تھا۔ اسے گھریلو زندگی میں ایک المناک تجربے سے سابقہ پڑا۔ اس نے یہ پاکیزہ نکتہ پیش کیا کہ خدا سراپا محبت ہے[۶]۔ بیوی سے اُس کے تین بچّے ہوئے لیکن وہ راہِ وفا سے ہٹ گئی، بایں ہمہ ہوسیع اس سے محبت کرتا رہا۔ ٹھیک اسی طرح یھواہ کو اسرائیل سے محبّت تھی اگرچہ وہ خدا کے نافرمان رہے۔ میکاہ (۷۳۰؁ ق،م – ۷۲۲؁ ق،م) یسعیاہ کا ہم عصر تھا اور اس نے غریبوں کی ترجمانی کی، جو ظلم و جور کی وجہ سے سخت تکلیفیں اٹھا رہے تھے، نیز ان کے تعلّق میں عدل و انصاف میں خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس نے بھی اچھے اور خوش گوار حالات آنے کی پیش گوئیاں کی تھیں[۷]۔ مجلسی انصاف کے داعی کی حیثیت میں

---

[۱] یرمیاہ باب ۵ آیت ۷، باب ۱۴، آیت ۲۲۔ باب ۱۰، آیات ۱۰، ۱۱۔ باب ۱۶، آیات ۲۰،۱۷۔ ۲۱۔

[۲] ایضاً باب ۲۳، آیت ۵۔ [۳] ایضاً باب ۳۱۔ آیات ۳۱، ۳۴۔ باب ۳۲ آیت ۴۰۔

[۴] متی کی انجیل باب ۲۶، آیت ۲۸۔ لوقا کی انجیل باب ۲۲، آیت ۲۰۔ عبرانیوں کے نام باب ۱۰، آیات ۱۶، ۱۷۔

[۵] یرمیاہ باب ۳۱۔ آیات ۲۹، ۳۰، حزقی ایل باب ۱۸، باب ۲، ۴۔

[۶] ہوسیع باب ۱۴، آیت ۴۔ [۷] میکاہ باب ۴، آیات ۱، ۸۔

اس کے یہ الفاظ ہمیشہ غیر فانی رہیں گے۔

۶۔ میں کیا لے کر خداوند کے حضور آؤں اور خدا تعالیٰ کو کیوں کر سجدہ کروں؟
کیا سوختنی قربانیوں اور ایک سالہ بچھڑوں کو لے کر اُس کے حضور آؤں ؟
۷۔ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟
کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض میں اور اپنی اولاد کو اپنی جان کی
خطا کے بدلے میں دے دوں ؟
۸۔ اے انسان اُس نے تجھ پر نیکی ظاہر کر دی ہے۔ خداوند تجھ سے اس کے
سوا کیا چاہتا ہے کہ تُو انصاف کرے اور رحم دلی کو عزیز رکھے اور اپنے
خدا کے حضور فروتنی سے چلے؟[۱]

حزقی ایل نبی، یرمیاہ نبی کے ہم عصر تھے اور انھوں نے اپنے صحیفے کے اٹھارھویں باب میں انفرادی ذمہ داری کا ذکر کرتے ہوئے ان اخلاقی مقاصد کی تلقین کی، جو بیسویں صدی کی مسیحی قومیں اپنی لڑائیوں میں پیش نظر نہ رکھ سکیں۔ عبرانی انبیا کے مواعظ اس اعلیٰ سطح پر پہنچ گئے تھے کہ شاید حضرت مسیحؑ اور پولس رسول کے سوا ان سے بلند تر کوئی نہ جا سکا۔ اسلام دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں تیسرا تھا۔ اس نے یہودیت اور مسیحیت کی اخلاقی توحید اپنا لی۔ زرتشتیوں کے مذہب میں ان دو ابتدائی مذہبوں کے نمایاں اوصاف نظر آتے ہیں۔ یہودیت اور مسیحیت کی توحید قدیم سامی تہذیب کا تیسرا بڑا کارنامہ تھی۔

---

[۱] میکاہ باب ۶۔ آیات کے نمبر سامنے دے دیے گئے ہیں۔

سولھواں باب

شام ایرانیوں کے زیرِ حکومت

نئی بابلی حکومت کا دور

۶۱۲ ق م میں نو بابلی سلطنت کے بادشاہ بنوپلاسر اور میڈیا کی سلطنت کے بادشاہ نے متحد ہو کر عظیم الشان نینوی کو تباہ کر ڈالا اور تین سال بعد آشوری فوج کے باقیات بھی نو بابلی فوج نے حرّان کے قریب برباد کر دیے۔ اس وقت یہ سوال سامنے آیا کہ بحیرۂ روم کے مشرقی علاقوں کی میراث نو بابلی سلطنت کو ملنی چاہیے یا قدیم مصری مملکت کو۔ آخری فیصلے میں دیر نہ لگی۔ ۶۰۵ ق م میں بنوپلاسر کے بیٹے بخت نصر نے فرعون نیخو کو کرکمیش میں تباہ کن شکست دی۔ اس کے بعد واضح ہو گیا کہ یہ میراث کس کے حوالے ہونی چاہیے۔ بعد فرعون نے اپنے پیشرو نیخو کے تجربے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے پھر برتری کے لیے کوشش کی، لیکن فلسطین کے میدانِ جنگ میں اس کا حشر بھی وہی ہوا جو نیخو کا ہو چکا تھا۔ شام کے نئے آقا جنھیں کلدانی بھی کہتے تھے، آشوری بابلیوں کے عمامی بھائی تھے، لیکن انھوں نے غالباً بعد میں ہجرت کی اور آرامیوں کے ساتھ انھیں کچھ نہ کچھ تعلّق ضرور تھا۔

اس اثنا میں ان قوموں کے اندر ایک نیا سوال پیدا ہوا، جو صدیوں تک آشوریوں کے پاؤں تلے دبی رہتی تھیں اور واضح رہے کہ آشوریوں کی جنگی قوت اس وقت تک کی دنیا میں عظیم ترین جنگی قوت تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان کے لیے از سرِ نو آزادی حاصل کرنے کا موزوں وقت نہیں آگیا؟ بخت نصر (۶۰۵ ق م - ۵۶۲ ق م) نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم کو تباہ کیا اور تیرہ سال کے محاصرے کے بعد ۵۷۲ ق م میں صور کو مسخر کر لیا۔ یہ مندرجہ بالا سوال کا آخری اور قطعی جواب تھا، یعنی شام کبیر پر آئندہ اڑتالیس سال تک پھر دو آبہ دجلہ و فرات سے حکومت ہوتی رہی۔

بابل کا سقوط

۵۳۹ ق م میں نو بابلی سلطنت ختم ہوئی۔ مزید مشرق میں ایرانیوں کی قوت نے سائرس (خورس یا خسرو) کی سالاری میں ظہور کیا اور اپنے حساب سے بابل پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں یہاں دو سلطنتیں تھیں، ایک میڈیا کی، دوسری ایرانیوں کی۔ دونوں کے درمیان قریبی رشتہ داری تھی، سائرس نے دونوں کو اپنے ماتحت متحد کر لیا اور ایشیائے کوچک میں لیڈیا کے بادشاہ کروسس کو شکست دے کر اس کی سلطنت پر قبضہ جما لیا[۱]۔ اس وقت بابل پر نابونیدس[۲] (۵۵۶ ق م - ۵۳۹ ق م) حکمران تھا۔ یہ قدامت پسند بادشاہ تھا۔

---

۱ Croecus یہ وہی شخص ہے جسے ہمارے ہاں "قارون" کہتے ہیں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ قارون نے یونانی زبان میں کروسس کی صورت اختیار کر لی اور مثال بن گئی۔ قارون کی طرح دولتمند کروسس یا قارون نے لڑائی شروع کرنے سے پیشتر دو مرتبہ کاہنوں سے انجام کے بارے میں استفسار کیا تھا، دونوں مرتبہ جواب ملا کہ اس کے ہاتھوں ایک بڑی سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ بلاشبہ سلطنت تباہ ہوئی، لیکن یہ خود اس کی سلطنت تھی۔

۲ Nabonidus

اور اس نے پرانے زمانے کے تمام باقیات جمع کر کے اپنے مرکزِ حکومت میں جا بجا نصب کرا دیے تھے۔ ان میں دوسرے شہروں کے دیوتاؤں کے مجسّمے بھی تھے۔ اس سے بابل کے پروہتوں میں سخت نفرت پیدا ہوئی اور رعایا بےچینی کا مرجع بن گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ نابونیدس نے شمالی حجاز کے ایک نخلستان تیما میں، جو بابل سے بہت دور تھا، محل بنایا اور وہیں رہنے لگا، اور سلطنت اپنے بیٹے بیلشضر[1] کے نااہل ہاتھوں میں سونپ دی۔ ولی عہد سلطنت کو عیش و عشرت سے دل چسپی تھی۔ وہ اس محل میں رہتا تھا، جو بخت نصر نے بڑے اعلیٰ پیمانے پر بنایا تھا اور مرکزِ حکومت کے استحکامات درست رکھنے پر قطعاً توجہ نہ دی۔ محل کی دیوار پر تقدیر کی تحریر ہر اس شخص کو صاف نظر آ رہی تھی جو چشمِ بصیرت سے بہرہ ور تھا۔ یعنی "تیری مملکت منقسم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دے دی گئی[2]"۔

جدید عالمی سلطنت

بابل پر پہلی ضرب ۵۳۹ ق م میں لگی، لیکن قلعہ اور شاہی محل مارچ ۵۳۸ ق م تک فتح نہ ہو سکے۔ ساتھ ہی بابلی سلطنت، پوری کی پوری، جس میں شام و فلسطین بھی شامل تھے، نئی ایرانی سلطنت میں شامل ہو گئی۔ بابل کی تسخیر محض ایک سلطنت کی تباہی نہ تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ وہاں ایک دور ختم ہو گیا تھا جسے سامی دور کہا جا سکتا تھا اور نیا دور شروع ہوا جو ہندی یورپی دور تھا۔ سامی سلطنت کا وقت جا چکا تھا، اور ایک ہزار سال سے پیشتر یہ وقت لوٹنے والا نہ تھا۔ جب یہ وقت دوبارہ آیا تو نئے نمائندوں، یعنی عربوں کی سرپرستی میں آیا جنھوں نے عہدِ قدیم کے بین الاقوامی معاملات میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا تھا۔ جن ایرانیوں سے ہندی یورپی دور کی ابتدا ہوئی ان کا تعلق ہندی ایرانی شاخ سے تھا۔ ساری دنیا پر ان کی حکمرانی کے وارث یکے بعد دیگرے مقدونی، رومی اور بیزنطینی ہوئے۔ یہ سب کے سب ہندی یورپی تھے۔

شام اور فلسطین کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ایک عظیم الشّان مملکت کے اجزا بن گئیں، جو عہدِ قدیم کی سب سے بڑی سلطنتوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کے ظہور سے پچیس برس کے اندر اندر اس سلطنت میں پوری مہذب دنیا آ گئی، جو مصر اور ایشیائے کوچک کے آئی اونی شہروں[3] سے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس کی حریص نگاہیں ہیلسپانٹ کے پار یورپ کے اس حصّے کی طرف اٹھنے لگیں، جو برّاعظم کا تنہا مہذب حصّہ تھا۔ سلطنت کے دور افتادہ حصّوں کو ایسی سڑکوں کے ذریعے سے ملا دیا تھا جن سے بہتر سڑکیں کبھی نہیں بنی تھیں۔ پوری سلطنت میں ایک سکّہ جاری ہوا اور ایک سرکاری زبان مقرر ہو گئی، یعنی آرامی۔ ایرانی زبان کے علاوہ آرامی زبان بھی مغربی صوبوں کی سرکاری زبان بن گئی۔ پہلے یہ مدت سے تجارتی زبان چلی آتی تھی۔ ان صوبوں کے لیے تمام فرامین اور دستاویزیں سرکاری آرامی اسلوب کے مطابق جاری ہوتی تھیں۔ ایران نے جو امن و سکون پیدا کر دیا تھا اس کے ماتحت فنیقی شہروں نے پھر بین الاقوامی تجارت کے مرکزوں کی حیثیت میں فروغ پانا شروع کیا۔

---

[1] Belshazzar اصل اکادی لفظ بیل شار اوصر تھا یعنی (بیل بادشاہ کا محافظ ہو)

[2] دانی ایل باب ۵، آیت ۲۸۔

[3] Ionioan cities

سلطنت کی تنظیم

اس وسیع اور عظیم الشان سلطنت کی تنظیم کا بار دارا نے اوّل[۱] (۵۲۱ ق م – ۴۸۶ ق م) کے کندھوں پر آ پڑا، جو عہدِ قدیم کے نہایت قابل اور روشن خیال بادشاہوں میں سے ہے۔ دارا ہی نے سڑکیں تعمیر کرائیں اور حمل و نقل کے وسائل کی اصلاح کی۔ دارا ہی نے ڈاک کا نظام جاری کیا۔ محاصل کے نظام کو بہتر بنایا اور مصر و ایران کے درمیان بحری آمد و رفت کے لیے ایک بیڑے کا انتظام کیا۔ فونیقیوں کو اس بیڑے میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ دارا نے اپنے تمام علاقوں کو تیئیس صوبوں میں تقسیم کیا۔ صوبے کا نام "مرزبانی" رکھا اور اس کے حاکم کو "مرزبان" کہتے تھے۔ مرزبان عام انتظامی امور کا ذمہ دار تھا، مگر اسے سالارِ عسکر کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک جرنیل ہوتا تھا اور سکرٹری (ادبیر)۔ یہ دونوں عملاً دونوں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ تھے اور دونوں کو اختیار حاصل تھا کہ جس معاملے کے متعلق چاہیں مرکز کو براہِ راست اطلاع دے دیں۔ پہلے سوسؔ[۲] اور بابل کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور بادشاہ مختلف اوقات میں دونوں مقامات پر رہتا تھا۔ اب ایک تیسرا مرکز قائم کر دیا گیا، یعنی پرسی پولسؔ[۳]۔ یہاں دارا نے بہت سی عمارتیں بنوائیں جنھیں بعد میں سکندر نے تباہ کر ڈالا۔ مختلف صوبوں میں محکوم قوموں کو مناسب حد تک آزاد حیثیت حاصل تھی۔ اس وجہ سے حالات میں فی الجملہ استقرار پیدا ہوا۔ ہر مرزبان کو خراج کی ایک خاص رقم شاہی خزانے میں داخل کرنی پڑتی تھی۔ ایسے سرکاری افسر مقرر تھے جو مملکت میں دورے کرتے رہتے۔ وہ شاہی اقتدار کے لیے "چشم و گوش" کا کام دیتے تھے، یعنی تمام حالات دیکھتے تھے، تمام ضروری چیزیں سنتے تھے اور سب کچھ بادشاہ تک پہنچا دیتے تھے۔

حکمرانی کے اس استعاری نظام میں مقامی خود اختیاری کے ساتھ مرکز کی ذمہ داری اور بالاتر ضبط و نظم کو جمع کر دیا گیا تھا۔ دارا کا یہ نظام سابق کے تمام نظاموں سے بڑھا ہوا تھا، حقیقت یہ ہے کہ رومیوں کے دَور تک ایسا کوئی دوسرا نظام قائم نہ ہو سکا۔ اس میں مصری اور اشوری نظاموں کے بہترین اوصاف جمع تھے اور بدترین اوصاف حذف کر دیے گئے تھے۔ شام و فلسطین اور قبرص کو ملا کر سلطنت کا پانچواں صوبہ یا پانچویں "مرزبانی" قرار دیا گیا تھا جس کا نام "عبر نہرا" یعنی دریا پار کا صوبہ تھا[۴]۔ اس صوبے سے ساڑھے تین سو قنطار[۵] خراج وصول کیا جاتا تھا، یہ خراج بہت ہلکا تھا۔ قبرص میں اس وقت بھی بہت سی فونیقی نو آبادیاں موجود تھیں۔

اسیری کا خاتمہ

سائرس بابل میں داخل ہوا (۵۳۹ سنہ ـ ۵۳۸ سنہ ق م) تو وہاں اسے یہودیوں کی ایک آبادی ملی۔ یہ ان لوگوں کی اولاد تھے جنھیں بخت نصر ۵۹۷ سنہ ق م اور ۵۸۶ سنہ ق م میں قید کر کے لے آیا تھا۔ یہ سمجھ لینا ہرگز مشکل نہیں کہ ان یہودیوں نے شہر کی تسخیر

---

۱ یہی بادشاہ ہے، جسے ہمارے مؤرخ عام طور پر دارا گشتاسپ کہتے ہیں۔

۲ Susa ۳ Persepolis لفظی معنی شہرِ ایران۔

۴ یہاں دریا سے مراد دریائے فرات ہے، یعنی وہ علاقہ جو دریائے فرات کے پار ہے، بالکل اسی قسم کا نام عربوں نے ترکستان کے لیے تجویز کیا، یعنی ماوراءالنہر (دریائے جیحوں سے پار کا علاقہ)۔

۵ قنطار ٹیلنٹ (Talents) کے لیے بائیبل کا لفظ ہے یہ یہودیوں کا ایک پیمانہ تھا جس کی مقدار میں بدا زمنہ مختلف اختلاف رہا۔ پھر ایک اختلاف سونے اور چاندی کے قنطار کا بھی تھا۔

کو سہل بنانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہوگی۔ ایرانی فاتح نے فوراً ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ جو یہودی اپنے وطن واپس جانا چاہیں، واپس چلے جائیں اور ہیکل از سرِ نو تعمیر کر لیں[1]۔ غالباً وہ سمجھتا تھا کہ فلسطین میں جو یہودی اس کے رحم و لطف کی بنا پر مقیم رہیں گے، وہ مصریوں کی حامی جماعت کے خلاف مؤثر توازن قائم رکھ سکیں گے، اور فلسطین کے سلسلے میں ایک فریق ایسا ضرور موجود تھا، جو مصر کا حامی تھا۔ غرض سائرس نے آشوریوں اور کلدانیوں کی یہ پالیسی منقلب کر ڈالی کہ مفتوح قوموں کو جلا وطن کیا جائے۔ اس وجہ سے یہودیوں نے اسے خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا نجات دہندہ قرار دے کر اس کا خیر مقدم کیا[2]۔

یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں کہ یہودیوں کی کتنی تعداد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ عزرا اور نحمیاہ میں تعداد "۴۲۳۶۰" بتائی گئی ہے۔ جلا وطنوں کی اصل تعداد یعنی اٹھاون ہزار پیشِ نظر رکھی جائے تو یہ بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے، نیز میزانِ کُل سے پیشتر جو تفصیلی فہرست دی گئی ہے، یہ تعداد اس کے مطابق نہیں[3]۔ واپسی کی دعوت صرف ان لوگوں نے قبول کی ہوگی، جو اپنے حالات پر مطمئن نہیں تھے اور جنہیں نئی سرزمین میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وطن کی یاد نے بہت سے یہودیوں کو پریشان کیا ہوگا۔ ان کے شاعر نے اس یاد کا ذکر بڑے ہی مؤثر اور غیر فانی الفاظ میں کیا ہے:

۱۔ ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے اور صیون کو یاد کر کے روئے۔

۲۔ وہاں بید کے درختوں پر ان کے وسط میں
ہم نے اپنی ستاروں کو ٹانگ دیا۔

۳۔ دیکھو وہاں ہم کو اسیر کرنے والوں نے گیت گانے کا حکم دیا۔
اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کرنے کا
اور کہا، صیون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سناؤ۔

۴۔ ہم پردیس میں
خداوند کا گیت کیسے گائیں؟

۵۔ اے یروشلم اگر میں تجھے بھولوں
تو میرا داہنا ہاتھ اپنا ہنر بھول جائے۔

۶۔ اگر میں تجھے یاد نہ رکھوں،
اگر میں یروشلم کو
اپنی بڑی سے بڑی خوشی پر ترجیح نہ دوں،
تو میری زبان میرے تالو سے چپک جائے[4]۔

---

[1] عزرا باب ۱، آیات ۳، ۵ [2] یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۸، باب ۴۵، آیت ۱

[3] عزرا باب ۲ آیت ۶۴؛ نحمیاہ باب ۷، آیت ۶۶

[4] زبور ۱۳۷؛ آیات کے نمبر سامنے مرقوم ہیں۔

بہت سے دوسرے جلاوطنوں نے یقیناً یرمیاہ کے مشورے پر عمل کیا ہوگا

۵- تم گھر بناؤ اور اُن میں بسو اور باغ لگاؤ اور ان کا پھل کھاؤ۔

۶- بیویاں کرو تاکہ تم سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں۔ اور اپنے بیٹوں کے لیے
بیویاں اور اپنی بیٹیاں شوہروں کو دو، تاکہ ان سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں
اور تم وہاں پھلو پھولو اور کم نہ ہو۔

۷- اور اس شہر کی خیر مناؤ، جس میں مَیں نے تمھیں اسیر کروا کر بھیجا ہے
اور اس کے لیے خداوند سے دعا کرو، کیوں کہ اس کی سلامتی میں
تمھاری سلامتی ہوگی [۱]

جلاوطنوں میں سے جو لوگ خوشحال تھے، انھوں نے ٹھہرے رہنے کو ترجیح دی اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ اس عہد کی کاروباری دستاویزوں میں بہت سے عبرانی نام ملتے ہیں اور بعض نام بابلی دیوتاؤں کے نام سے مرکّب ہیں۔ یہودیوں کی سب سے بڑی آبادی "نہر کبار"[۲] پر تھی، جسے اہل بابل "کبارو[۳]" یعنی "بڑی نہر" کہتے تھے۔ دریائے فرات کی یہ بڑی نہر بابل کے جنوب مشرق میں تھی۔ جن یہودیوں[۴] نے دوسروں میں جذب ہونا قبول نہ کیا، وہ اس جمعیت کے ابتدائی رکن تھے جس نے آگے چل کر ڈیاسپورا[۵] کا نام اختیار کیا، یعنی وہ یہودی، جو فلسطین سے باہر رہتے تھے۔ جس زبردست عامل نے یہودیوں کو ہجرت کے زمانے میں بھی اکٹھا رکھا وہ ان کا یگانہ مذہب تھا۔

جو یہودی واپس ہوئے ان کا قائد زربابل[۶] تھا۔ یہ بادشاہ یہویاکین کے اخلاف میں سے تھا۔ زربابل اپنے ساتھ ہیکل کے وہ تمام خزانے بھی لے گیا جو بخت نصر لوٹ کر بابل لے آیا تھا اور کچھ مدّت تک زربابل ہی یہودیوں کا مسلّمہ گورنر رہا۔ آخر بہت سی مشکلات کے بعد ہیکل کی تعمیر ۵۱۵ ق م میں بہ عہد دارا پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کا خرچ حکومت نے برداشت کیا۔

سائرس کے نمونۂ عمل کی پیروی کرتے ہوئے ارتخششت اول[۷] ۴۶۵ ق م۔ ۴۲۴ ق م نے جلاوطنوں کے دو مزید گروہوں کو واپسی کی اجازت دی۔ ایک کا لیڈر نحمیاہ تھا اور دوسرے کا عزرا۔ نحمیاہ کی عمر اس وقت اکّیس سال کی تھی اور وہ شاہی دربار میں ساقی رہ چکا تھا، غالباً خواجہ سرا بھی تھا۔ وہ ۴۴۵ ق م کے آس پاس یروشلم پہنچا اور اس کا معیّن مقصد یہ تھا کہ شہر کی فصیلیں ازسرِنو تعمیر کرائے۔ یہ کام اس نے اپنے ہمسایوں کی مخالفت کے باوجود پورا کر لیا۔ مخالفوں میں

---

۱ حزقی ایل باب ۲۹ ۲ Chebar ۳ Kabaru

۴ ابتدا میں لفظ یہودی کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلاں شخص یہودا کے قبیلے یا یہودا کی سلطنت سے تعلّق رکھتا ہے، پھر یہ لفظ ان عبرانیوں کے لیے بولا جانے لگا، جو اسیری سے واپس وطن پہنچ گئے تھے۔ آخر میں پوری عبرانی قوم کے لیے یہ استعمال ہوا۔ اب اسرائیلی سے مراد وہ شخص ہے جو اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السّلام کی اولاد میں سے ہو۔

۵ Diaspora ۶ Zerubbabel

۷ Artaxerxes جسے ہمارے ہاں اردشیر بھی کہتے ہیں۔

سامریہ کے حاکم عنبلاط[1] اور ایک عربی سردار جشمو[2] کے علاوہ ممتاز مقامی یہودی بھی تھے۔ نحمیاہ ایرانی تاج کے ماتحت سنہ ۴۴۴ ق م سے سنہ ۴۳۲ ق م تک اپنے ہم قوموں پر حکومت کرتا رہا۔ زربابل کے ماتحت فلسطین کی حکومت الٰہی حکومت تھی۔

بائیبل کی جس روایت[3] کو علما کا بڑھتا ہوا گروہ قبول کر چکا ہے، اس کے مطابق نحمیاہ سے پہلے عزرا یروشلم واپس ہوا تھا۔ وہ کاہن بھی تھا اور کاتب بھی اور اس کے لیے شاہی فرمان صادر ہوا تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کے عمل و عقیدہ کی اصلاح کرے۔ عزرا نے جہاں مذہب کی صحت و اخلاص پر زور دیا، وہاں نسل خالص رکھنے پر بھی خاص توجہ کی۔ اس کا یہ نسلی پروگرام اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ غیر یہودی بیویوں کو یہودیوں سے طلاق دلوائی گئی اور ان کے بچوں کو ناجائز اولاد قرار دیا گیا[4]۔ اسی سلسلے میں وہ نحمیاہ سے بھی آگے بڑھ گیا، جس نے معاملے کو محض اس حد تک محدود رکھا تھا کہ ایسے شوہروں پر لعنت بھیجی، انھیں مارا، ان کے بال نوچ ڈالے۔ اور انھیں خدا کی قسم کھا کر وعدہ[5] لیا کہ ایسا کام پھر نہیں کریں گے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس میں نحمیاہ نے غیر یہودی عورت سے شادی کرنے والے شوہر کو ملک سے بھگا دیا تھا[6]۔

زربابل اور نحمیاہ کے ماتحت یہودی ایک خاص درجہ، خود اختیاری سے مستفید رہے، لیکن عبرانی زبان صرف اسی وجہ سے ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ جلا وطن ہو گئے تھے یعنی غیر وطن میں رہنا پڑا، جس کی بولی دوسری تھی بلکہ یہودیہ میں بھی یہ زبان ختم ہو چکی[7] تھی اور اس کی جگہ آرامی نے لے لی تھی۔ عبرانی کی حیثیت محض مقدس زبان کی رہ گئی تھی اور یہودی خود سرکاری خط و کتابت میں آرامی ہی استعمال کرتے تھے[8]۔ عبرانی اگرچہ مر گئی تھی، لیکن اس نے بہت سی مہذب زبانوں کے لیے الفاظ کی ایک قیمتی میراث چھوڑی۔ انگریزی زبان میں جو نام بہت عام ہیں مثلاً جان[9]، جوزف[10]، پال[11]، میری[12] یہ سب عبرانی الاصل ہیں۔

ایرانی فونیقیہ میں

ایرانی ایک طرف یہودیوں کو شہ دے رہے تھے کہ وہ اپنے سابقہ وطن کو از سرِ نو تعمیر کر لیں، دوسری طرف فونیقی وسائل سے کام لے کر اپنی سلطنت کو پھیلا رہے تھے۔ سائرس کے بیٹے کیمبیسز[13] (سنہ ۵۲۹ ق م۔ ۵۲۲ ق م) نے مصر پر جو حملہ کیا تھا، اس میں فونیقی جہازوں ہی نے مدد کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نوبیا تک مصر سلطنتِ ایران میں شامل ہو گیا تھا۔ فلسطین کو مصر کے دریائی

---

[1] Sanballat اصل لفظ آشوری ہے اور اسے Sin-ubal-lit لکھتے ہیں، جس کا مطلب ہے "صن دیوتا زندگی بخشتا ہے"۔

[2] Gashmu غالباً کسی عربی قبیلے مثلاً ثمود میں سے تھا، جسے سرجون نے فلسطین بھیج دیا تھا۔

[3] عزرا باب ۷، آیت ایک سے آگے۔

[4] ایضاً باب ۱۰، آیات ۳، ۵، ۱۰ سے آگے۔

[5] نحمیاہ باب ۱۳، آیت ۲۵۔

[6] یہ ذکر پہلے آچکا ہے۔

[7] نحمیاہ باب ۱۳، آیت ۲۴۔

[8] عزرا باب ۴، آیت

[9] John (یوحنا)

[10] Joseph (یوسف)

[11] Paul (پولوس)

[12] Mary (مریم)

[13] Cambyses

صحرا میں فوجوں کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ اس غرض سے عربوں کے اونٹ کرایے پر لیے گئے تھے۔ کیمبیسز نے واپس ہوتے ہوئے شام میں کسی مقام پر وفات پائی۔[1]

زرکسیز (۴۸۶ ق م۔ ۴۶۵ ق م) کے تحت ایرانیوں نے یونانیوں پر حملہ کیا، تو اس وقت بھی فونیقی بیڑے کو ایرانی بحریات میں بنیاد و اساس کی حیثیت حاصل تھی۔[2] بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ فونیقیوں نے اپنے قدیم بحری حریف پر ضرب لگانے کے لیے اس موقع کا خیر مقدم کیا اور دو سو سات جہاز شاہنشاہ ایران کی خدمت میں پیش کیے۔ کوہ ایتھوس[3] کے ارد گرد طوفانوں سے بچنے کے لیے خاکنائے میں نہر تیار کر لینا بھی بہت بڑا کارنامہ تھا اور اس کارنامے میں فونیقیوں کی ہنرمندی کمال پر ظاہر ہوئی تھی۔ سلمیس کی بحری جنگ (۴۸۰ ق م) میں پورا بیڑا تباہ ہو گیا۔

یونان کے ساتھ جنگ چھڑنے کا ذمہ دار زرکسیز کا باپ دارا تھا، جس کی فوج نے ۴۹۰ ق م میں بہ مقام میراتھان شکست کھائی تھی۔ دارا کے نزدیک یونانیوں کی حیثیت وحشیوں اور بحری قزاقوں سے زیادہ نہ تھی اور ان کی وجہ سے ایشیائے کوچک کے سواحل پر ہمیشہ فتنہ و فساد بپا رہتا تھا۔ جس حضارت کا نمائندہ دارا تھا، وہ یقیناً درجے میں اس عہد کی یونانی حضارت سے فروتر نہ تھی۔ دارا اور اس کے قریبی جانشین زرتشت کے پیرو تھے، جن کے نزدیک زندگی حق و باطل کی قوتوں میں غیر مختتم کش مکش کے سوا کچھ نہ تھی۔ حق کی قوتوں کا نمائندہ اہورمزد اور باطل کی قوتوں کا مجسمہ اہرمن تھا۔ زرتشت کے اخلاقی اصول صرف یہودیت کے اصول سے فروتر تھے۔ یونانیوں کے نزدیک، جیسا کہ ان کے شاعروں اور مؤرخوں کی تعبیرات سے واضح ہوتا ہے، لڑائیاں دراصل اس لیے ہو رہی تھیں کہ آزادی کو مشرقی مطلق العنانی سے محفوظ رکھا جائے۔ میراتھان اور ترماپلی کے میدان ہائے جنگ کو بہت جلد شرف و عظمت کے خلعت پہنا دیے گئے۔ جن مجاہدوں نے ان میدانوں میں جانیں قربان کی تھیں، انھیں غیر فانی قومی ابطال کا درجہ دے دیا گیا۔ دنیا کے نزدیک ایران و یونان کی کشمکش مشرق و مغرب کے درمیان کش مکش کا صرف پہلا دور تھا۔ یہی کش مکش تھی جسے آگے چل کر سکندر، پمپے، معاویہؓ اور صلاح الدین ایوبی سے نپولین اور ایلنبی تک نے جاری رکھا۔[4]

فونیقی دار الحکومت، طرابلس

یونانیوں کے ماتحت دمشق شام کا سب سے بڑا شہر تھا۔[5] فونیقیہ میں چار شہروں کو مقامی خود مختاری کا حق دیا گیا

---

[1] جوزیفس، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کی وفات دمشق میں ہوئی۔ ہیروڈوٹس مقام وفات اگبتانہ (Agbatana) بتاتا ہے۔ پلینی اسے اکتبانہ کہتا ہے۔ یہ کوہ کرمل کا ایک گوشہ ہے، جو سمندر کے اندر بڑھا ہوا ہے۔ گویا راس بن گیا ہے۔

[2] ہیروڈوٹس

[3] Athos یونان کا ایک حصہ، جو مشرقی جانب سمندر کے اندر بڑھا ہوا ہے۔

[4] مصنف کی یہ رائے مترجم کے نزدیک محلِ نظر ہے۔ مثلاً صلاح الدین ایوبی نے کبھی مغرب پر حملہ نہ کیا، البتہ مغربی حملہ آوروں، یعنی صلیبیوں کی قوت پر ایسی ضربیں لگائیں کہ وہ پھر اٹھ نہ سکے۔ نپولین یقیناً اس خیال سے مصر نہیں پہنچا تھا کہ مغرب کی جنگ مشرق سے لڑے اور شام کی لڑائیاں اس کے سفر مصر کا ضمیمہ تھیں۔ ایلنبی کی حیثیت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ شریف حسین کی غداری نے انگریزوں کو عرب میں مداخلت کا موقع دے دیا اور ایلنبی نے عربوں کی مدد سے شام فتح کر لیا۔

[5] سٹرابو۔

تھا ـــــــ ارودس (ارورد) بیبلوس (جبیل)، صیدا اور صور ــــــــ انھیں یہ حق بھی حاصل تھا کہ چار چھوٹی ملحقہ ریاستوں پر حکمرانی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں ان چاروں ریاستوں نے باہم وفاق قائم کر لیا اور ایک نیا شہر یعنی طرابلس (طرابلس الشام) وفاقی اداروں کا مرکز قرار پایا۔ ابتدا میں یہاں تین الگ الگ آبادیاں قائم ہوئی تھیں اور یہ صور، صیدا، اور ارودس (ارورد) کے نمائندوں کی آبادیاں تھیں اور ان کے نام بھی الگ الگ تھے۔ ارتخشت ثالث (۳۵۹ ق م تا ۳۳۸ ق م) کی حکومت کے پہلے سال یہ تینوں آبادیاں باہم مل گئیں اور اس مقام کا نام "اثار" قرار پایا یہ نام ۱۸۹ ق م تا ۳۵۱ ق م) کے ایک سکّے پر بھی منقوب ہے۔ یونانیوں نے اس مقام کو "ٹرائی پولس" پکارنا شروع کیا۔ اسی نے عربی میں طرابلس کی صورت اختیار کر لی[1]۔ چونکہ اسی جگہ فونیقیوں کی مشترک اسمبلی کے اجلاس ہوتے تھے، لہٰذا یہی شہر فونیقیوں کا دارالحکومت بن گیا[2]۔ اسمبلی کے اجلاس سالانہ ہوتے تھے اور قریباً تین سو مندوب اس میں شرکت کرتے تھے۔ جلسوں میں ایرانی امیر مقامی نمائندوں کے ساتھ اس نخوت سے پیش آتے تھے کہ انجام کار فونیقیوں نے تعلق کے انقطاع کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے غالباً چوتھی صدی قبل مسیح ہی میں محسوس کر لیا ہوگا کہ ایران کی عظمت کا آفتاب ڈھلنے لگا ہے۔

صیدا راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا

ارتخشت (اردشیر) کے خلاف بغاوت کی ابتدا طرابلس کے اس حصّے سے ہوئی، جو صیدا کی نوآبادی تھا۔ پھر یہ آگ پورے فونیقی ساحل پر پھیل گئی۔ اس میں انگیخت کا کام حسب معمول مصر نے کیا۔ بغاوت کا مرکز بادشاہ تینیس کے ماتحت صیدا میں منتقل ہو گیا۔ اہل صیدا نے شاہی تفریح گاہ اور آس پاس کے تمام درخت کاٹ ڈالے۔ ایرانی رسالے کے لیے گھاس کے جو انبار جمع کیے گئے تھے انھیں آگ لگا دی گئی۔ تنخواہ دار فوجی فراہم کر لیے، کشتیاں، اسلحہ اور رسد ضرورت کے مطابق اکٹھی کر کے آئندہ جہاد کی تیاری کر لی گئی۔ ۳۵۱ق م میں ارتخشت تین لاکھ پیادے اور تین ہزار سوار لے کر بابل سے روانہ ہوا[3]۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ شام اور سلیشیا کے مرزبان، جو بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کوشاں تھے، فونیقیہ سے نکال دیے گئے تو ممتاز فونیقی شہروں نے ایرانیوں کو نکال کر آزادی کا اعلان کر دیا۔ تینیس نے جب سنا کہ ارتخشت خود بے اندازہ لاؤ لشکر کے ساتھ آ رہا ہے تو وہ ہمّت ہار بیٹھا، چنانچہ خود بھاگ گیا اور شہر کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔ باشندے فیصلہ کر چکے تھے کہ آزادی کی حفاظت کے لیے جانیں قربان کر دیں گے، حالتِ یاس میں انھوں نے بندرگاہ کے تمام جہاز نذرِ آتش کر دیے تاکہ کسی شہری کے دل میں بچ نکلنے کی رغبت کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ وہ اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے اور بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے انھیں اور ان کے املاک کو بھسم کر گئے[4]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طرح چالیس ہزار

---

[1] ٹرائی پولس کے معنی ہیں تین شہر۔ چونکہ ابتدا میں تین مختلف آبادیاں تھیں، جو بعد میں ایک شہر بنیں اس لیے یونانیوں نے اسے ٹرائی پولس کہا۔ عربوں نے اس کو طرابلس بنایا۔

[2] جارج ایف ہل Catalogue of the Greek Coins of Phoenicia

[3] ڈیوڈورس

[4] ایضاً

سے زیادہ نفوس تباہ ہو گئے۔ جو تھوڑے سے باقی رہ گئے تھے، انھیں قیدی بنا کر بابل پہنچا دیا گیا۔[1] پورا شہر، جو ایک زمانے میں بحیرۂ روم کی ملکہ متصوّر ہوتا تھا، شعلوں کی نذر ہو گیا اور اس کی دستاویزوں سے بھی علمی دنیا محروم ہو گئی۔ صفحۂ ہستی سے صیدا کے محو ہونے کا یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی مرتبہ اسے اسر حدّون نے ۶۷۷ ق م میں بُری طرح برباد کیا تھا۔ صیدا کے دردناک انجام نے تمام فونیقی شہروں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے جوانگی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

حضارتی پہلو

ایرانی اقتدار کے زیر اثر شامی ثقافت و حضارت کے نشوو ارتقا اور رجحانات کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شام کی پوری سرگزشت میں معلومات کی قلت کا ایسا دور کبھی نہیں آیا جیسا کہ ایرانی دور تھا۔ ہماری معلومات کے ماخذ کیا ہیں؟ چند سکّے ہیں یا منتشر کتبے ہیں۔ ان کے علاوہ عبرانی اور کلاسیکی تحریرات ہیں۔ عبرانی ماخذ ۴۰۰ ق م کے آس پاس اچانک ختم ہو جاتے ہیں۔ آثارِ قدیمہ بھی اس باب میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکے۔ تاہم یقین ہے کہ شامی تہذیب سامی اصول میں وحدت پیدا کرتی رہی اور کلدانی اقتدار کی طرح اس میں غلبہ آرامی و فونیقی اصول کو تھا۔

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ احیقار کی کہانی پہلے پہل ایرانی اقتدار کے زمانے میں مرتب ہوئی تو اسے ادبیات کے اس نمونے کی کلید سمجھ لینا چاہیے، جو اس عہد میں فروغ پذیر ہوا۔ اسے حکیمانہ ادب قرار دینا چاہیے۔ اس دور میں یہودیت پر ایرانی اثر نے ثنویت کی طرف رجحان کی شکل اختیار کی، یعنی خدائے واحد کے حریف کی حیثیت میں ایک وجود نے نشوونما پائی۔ یہ ثنوی تصور عہد نامۂ جدید میں بھی پہنچ گیا، جہاں اس نے حق کے خلاف باطل اور نور کے خلاف ظلمت کی صورت میں ظہور کیا۔ یہودیوں نے آہستہ آہستہ ایک الٰہی حکومت کا نظام تیار کیا، جس میں فرشتے عامل تھے۔ پھر ان میں یوم حساب کے عقیدے نے نشوونما پائی، جس کے مطابق موت کے بعد انسانوں کو جزا یا سزا ملے گی۔ ان عقائد کو ایرانی تحریک ہی کے نتائج قرار دیا جا سکتا ہے۔ اخنوخ کی کتاب (باب ۴۱ آیت ۱) میں یوم حساب کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انسانوں کے اعمال میزان میں تولے جائیں گے۔ یہ ایرانی اثر کی دلیل ہے، اگرچہ میزان اس سے پیشتر بابلی اور مصری ماخذ تک جاتی ہے۔ صحیفۂ دانی ایل میں یوم حساب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے (باب ۷ - آیات ۹ - ۱۲) وہ ایرانی نہیں، صرف چند قدیم ایرانی الفاظ عبرانی اور آرامی میں راہ پا سکے ہیں۔ مثلاً لفظ فردوس عبرانی اور یونانی کے راستے آیا۔[2]

جس حد تک تعمیرات کا تعلق ہے، صرف ایک قصر اور ایک معبد تل الدویر (لخیش) میں ملا ہے۔ قصر کو پانچویں صدی قبل مسیحؑ کے وسط کی تعمیر سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں سے سرخ رنگ کا ایک ظرف ملا جو اٹیکا کا بنا ہوا تھا۔ یہ قصر بہ ظاہر ایرانیوں کی قیام گاہ تھا۔ اس میں گول نالیاں بنی ہوئی تھیں، نیز آرام و آسائش کی دوسری چیزیں مہیا تھیں۔ پچھلے دنوں ایک ویران ایرانی محل واقع صیدا (۳۵۱ ق م) سے ایسے مجسّمے دستیاب ہوئے جو پرسی پولس کے مجسّموں کا نمونہ تھے۔ اس مقام سے تابوت بھی بہ کثرت

---

[1] سڈنی سمتھ ص ۱۴۹ اومسٹوڈ Olmstead کی کتاب History of the Persian Empire ص ۴۳۶ - ۴۳۷۔

[2] فردوس کے ابتدائی معنی "باغ" کے تھے، پھر اس کا مطلب "مبارک آدمیوں کا آسمانی مسکن" سمجھا جانے لگا۔ عربی لفظ فردوس آرامی کے ذریعے سے آیا۔

ملے ہیں جو سنگ مرمر کے تھے۔ یوں واضح ہوتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح تک، اٹیکا کا فن سنگ تراشی فونیقیہ میں عام ہو چکا تھا۔ اسی صدی میں یونانی ڈرامے نے معیاری حیثیت اختیار کی اور وہ اس سے ایک صدی پیشتر خاص رواج پا چکا تھا۔ انھیں دو صدیوں میں یونان کے ظروفِ گلی کو بھی بحیرۂ روم کے مشرقی کنارے کی سرزمین میں وسیع پیمانے پر خریدا جانے لگا۔ جو ظروفِ گلی ملک کے اندر بن رہے تھے ان کی صنعت پر ایرانی اقتدار میں زوال آیا رہا۔ بہ حیثیتِ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی تک یونان فونیقیہ سے حضارت مستعار لے رہا تھا اور پانچویں صدی میں اس نے حضارت لوٹانی شروع کر دی۔ چھٹی صدی میں داد و ستد کا معاملہ متوازن تھا۔ اسی صدی میں یونان کی تجارتی نوآبادیاں شامی زمین میں نمودار ہوئیں۔ پھر ان کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ سکندر کی فتوحات سے کم از کم ایک صدی پیشتر ساحلی شہروں میں یونانی تاجر اور فن کار پھیلے ہوئے تھے۔

حصّۂ سوم

سترھواں باب

سکندر اور اس کے جانشین سلوکی

مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس[1] نے ایک منصوبہ تیار کیا تھا کہ ایشیائے کوچک میں جو یونانی شہر ہیں، انھیں سلطنتِ ایران کے چنگل سے آزاد کرایا جائے، نیز دارا اور زرکسیز (حملہ آور) کی حیثیت میں، یونان آئے تھے، یہ آنا اُتارا جائے۔ اس کے شہرۂ آفاق اور نامور فرزند سکندر نے اس منصوبے کو لباسِ عمل پہنایا، جو باپ سے زیادہ سرگرم تھا۔ فیلقوس مقدونیہ کو یونانی ریاستوں کی قیادت کے منصب پر پہنچا چکا تھا، جب ایک قاتل کے خنجر نے اس کا رشتۂ حیات کاٹ دیا۔

اسوس کی جنگ

سکندر کی عمر بیس سال کی تھی، جب اس نے ۳۳۴ ق م کے موسم بہار میں تیس ہزار اور چالیس ہزار کے درمیان لشکر کے ساتھ ہیلسپانٹ[2] کو عبور کیا اور ایشیائے کوچک میں سے انتہائی تیزی کے ساتھ گزر گیا، جو اس زمانے میں سلطنتِ ایران کا ایک حصہ تھا۔ اس نے سیلیشیا کے ابواب اور میدانی علاقے میں قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ دارائے ثالث (۳۳۶ ق م۔ ۳۳۰ ق م) سے مقابلہ پیش آگیا، جو دو لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل فوج لیے کھڑا تھا اور اس فوج میں متفرق گروہ شامل تھے، ہمیں مشرق کا ایک متأخر مورخ[3] بتاتا ہے کہ ایشیا کی تمام اقوام کو فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ بڑے ہجوم کو دیکھ کر مقدونوی فوج لڑائی کے لیے تیار ہی نہ ہوگی۔ اسوس[4] کے مقام پر لڑائی ہوئی (۳۳۳ ق م) یہ ایک تنگ گھاٹی تھی جہاں ایرانیوں کی کثرتِ تعداد کچھ کام نہیں دے سکتی تھی اور سکندر نے بہ آسانی فتح حاصل کر لی۔ دارا ایک شاندار رتھ میں بیٹھا ہوا تھا اور لڑائی کا معاینہ کر رہا تھا، جس میں پہلو بہ پہلو چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ جب اس کی فوج نے راہِ فرار اختیار کی تو وہ بھی ساتھ ہی مشرق جانب بھاگ گیا اور اپنے خیموں، خرگاہ اور حرم کو پیچھے چھوڑ گیا۔ سکندر نے شاہی حرم کے ساتھ جو ان مردانہ احترام کا برتاؤ کیا۔ فتح کی یادگار میں ایک شہر کی بنیاد رکھی جو اب تک اس کے نام سے موسوم ہے، یعنی سکندرونہ۔ اس فیصلہ کُن فتح کا طنطنہ یونانیوں کے لیے نئی عظمت کا ضامن بن گیا اور ایرانیوں کے قلوب خوف وہراس سے نہیں تو کم از کم شکوک سے ضرور لبریز ہو گئے۔

---

[1] Philip

[2] Hellespont گیلی پولی اور ایشیاے کوچک کے درمیان پانی کا تنگ دھارا، جس کا بیرونی دروازہ دردانیال ہے اور اب پوری آبنائے کو دردانیال کہتے ہیں۔

[3] جوزیفس Josephs

[4] Issus ایرین، پولیبس اور ڈیو دورس، جنگ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلیو ڈبلیو ٹارن Tarn کی انگریزی کتاب Alexander نیز کیمبرج کی تاریخ قدیم جلد ششم۔

صور کا مقابلہ

سکندر نے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب نہ کیا، بلکہ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی جانب بڑھا، تاکہ سمندر پر اس کا تسلط پختہ ہو جائے اور عقب میں وسائل حمل و نقل خلل سے محفوظ رہیں۔ اُس نے اپنے ایک سالار پارمینیو[۵۱] کو رسالے کے ساتھ وادیٔ عاصی میں بھیجا، تاکہ دمشق پر قبضہ کر لے، جو شام میں ایرانیوں کا صدر مقام تھا۔ اسوس کی فتح نے پورا ملک اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہ خود ساحلی راستے پر بڑھا۔ ماراتھوس[۵۲]، ارواد، بیبلوس اور صیدا یکے بعد دیگرے تسلیم ہو گئے۔ صرف صور نے حملہ آور کے مقابلے میں اپنے دروازے بند رکھنے کی جسارت کی۔ اسے فونیقی ساحل کی ملکہ سمجھا جاتا تھا اور وہ سیحرب، اسرحدون اور بخت نصر سے مردانہ وار لڑ چکا تھا۔ سکندر نے نصف میل لمبا اور دو سو فٹ چوڑا بند بنوایا۔ اس طرح خشکی کو دو میل لمبے جزیرے سے ملا دیا جس میں شہر صور آباد تھا۔ بدنصیب صور کو امید تھی کہ شمالی جانب کے ہمسر شہر اسے مدد دیں گے۔ اس کے برعکس ان شہروں نے اپنے جہاز حملہ آور کے حوالے کر دیے۔ صور کو یہ بھی امید تھی کہ اُس کی دور افتادہ شاخ قرطاجنہ سے کمک پہنچے گی، جہاں صور کے بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے پناہ کی غرض سے بھیج دیے گئے تھے۔ لیکن کوئی بھی امید پوری نہ ہوئی۔ خشکی اور تری دونوں جانب سے محاصرہ سات مہینے جاری رہا۔ آخر صور نے ہتھیار ڈال دیے۔ کوئی دو ہزار آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور تیس ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ اس زمانے کی لڑائیوں میں عام دستور یہی تھا۔ اس فتح کی خوشی میں کھیلوں کا انتظام کیا گیا۔ شہر کے دیوتا ملقارت کے معبد میں قربانیاں کی گئیں اور عبادت کی دوسری رسمیں ادا ہوئیں، ملقارت کو سکندر نے یونانی ہرکولیز کا مثنیٰ قرار دیا[۵۳]۔

سکندر کی پیش قدمی میں صور کی مزاحمت فونیقیہ کے قومی جوش کا آخری انفجار تھا، جو تاریخ کے اوراق پر مرقوم ہُوا۔ قدیم روایت کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر گیا۔ پرانا جوش پھر نہ اُبھر سکا۔

سکندر ابھی صور کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا، جب دارا کی طرف سے پیغام ملا کہ میں سلطنت کی تقسیم پر آمادہ ہوں۔ دریائے فرات کا مغربی حصہ اور اس کی پوری دولت آپ کو دیتا ہوں، اپنی بیٹی کی شادی بھی آپ سے کر دوں گا۔ پارمینیو نے مشورہ دیا کہ یہ پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔ ساتھ ہی کہا کہ "اگر میں سکندر ہوتا تو ضرور قبول کر لیتا"۔ سکندر نے فی الفور جواب دیا کہ "اگر میں پارمینیو ہوتا تو اسے ضرور مان لیتا۔[۵۴]"

غزہ پانچ فلسطینی شہروں کا سرتاج تھا۔ اُس نے صور کے تلخ تجربے کا کچھ خیال نہ کیا اور پوری مردانگی سے مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن زیادہ دیر تک ٹھہرا نہ رہ سکا۔ دو مہینے کے محاصرے کے بعد محصور فوج بے بس ہو گئی اور اسے تباہ کر ڈالا گیا۔ بہت سے عرب بھی اس میں شامل تھے۔ فوج کا سالار ایک خواجہ سرا تھا۔ اسے سکندر کی جنگی گاڑی کے پیچھے باندھ کر شہر کے ارد گرد پھیرا گیا اور پوری آبادی غلام بنا کر بیچ ڈالی گئی۔ سکندر اسوس کی جنگ میں بھی معمولی زخمی ہوا تھا۔ غزہ کی جنگ میں بھی یہی کیفیت پیش آئی۔ مسالوں کے بھاری ذخیرے ہاتھ لگے، اس لیے کہ غزہ عرب اور آس پاس کی دوسری سرزمینوں کی پیداوار باہر بھیجنے کے لیے بحیرۂ روم کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا۔ غزہ پر قبضے سے بحیرۂ روم پر ایرانی برتری کے تابوت میں ایک

---

۵۱ Parmenio — ۵۲ Marathus

۵۳ ایرین — ۵۴ پلوٹارک

اور میخ ٹھونک دی گئی۔

مصر کی تسخیر

اب مصر کا راستہ کھلا پڑا تھا، اسے فتح کر لیا جاتا تھا تو ایرانی بیڑا بالکل بے کار ہو جاتا۔ اہلِ مصر بہ طیبِ خاطر آقاؤں کے مبادلے پر تیار ہو گئے۔ سکندر مصر میں تھا تو اُس نے آمون[1] کے معبد کی زیارت کی۔ یہ معبد صحرائے لیبیا کے اس نخلستان میں تھا، جسے آج کل نخلستان سیوہ کہتے ہیں اور اصل نخلستان سرحدِ مصر سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں کے کاہن نے سکندر کو آمون دیوتا کا فرزند قرار دیتے ہوئے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ مصر میں بھی سکندر نے ایک شہر کی بنیاد رکھی، جو آج بھی اس کے نام کا شاہد ہے، یعنی اسکندریہ۔ یہ دونوں واقعے مستقبل کے لیے بے حد اہم ثابت ہوئے اور خود سکندر اس اہمیت کا کوئی احساس نہیں کر سکتا تھا۔ الوہیت اور بادشاہی کے درمیان گہرے تعلقات کا سلسلہ یہیں سے یونانی و رومی دنیا میں جاری ہوا اور آگے چل کر ہر لحاظ سے مستحکم ہو گیا۔ مشرق میں بادشاہوں کو ابتدا ہی سے خدا کا نامزد سمجھا جاتا تھا، لیکن یورپ میں اس قسم کا کوئی نشان سکندر اور اس کے جانشینوں سے پیشتر موجود نہ تھا۔[2] اسکندریہ مرورِ زمان کے ساتھ ترقی کرتے کرتے یونانی حضارت کا مرکز بن گیا اور اسے ایتھنز کا مشرقی جانشین سمجھنا چاہیے۔ رومیوں کے عہدِ اقتدار میں یہ روما سے دوسرے درجہ پر تھا۔ ڈیلٹا کی شمالی و مغربی نوک پر ایک بندرگاہ کی تاسیس تاریخی نقطۂ نگاہ سے تسخیرِ مصر کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اہم تھی۔

فیصلہ کن جنگ

۳۳۱ق م کے موسمِ بہار میں سرگرم و مستعد فاتح نے شام کی طرف مراجعت کی، جہاں وہ خاصی دیر تک سامریوں کو سزائیں دیتا رہا، جنھوں نے اس کے نائب کو قتل کر دیا تھا، نیز اُس نے اعلیٰ درجے کی شان شوکت کے ساتھ کھیلوں اور معبدِ صور کی عبادت کا انتظام کیا۔ رہا یہ سوال کہ مصر سے لوٹتے ہوئے وہ یروشلم گیا اور اس کی حوالگی عمل میں آئی تو اس کا قطعی جواب مشکل ہے۔ اب اُس نے جو راستہ اختیار کیا، وہ شام مجوف اور وادیٔ عاصی میں سے گزرتا ہوا دریائے فرات کی طرف جاتا تھا۔ اس سفر میں بھی اس نے ایک شہر کی بنیاد رکھی، جسے غالباً اس کے جرنیل سلوکس نکاتور نے مکمل کیا اور اس کا نام نقفوریم[3] رکھا۔ شمالی و مشرقی دوآبے سے گزرتے ہوئے اس نے نینوی سے ذرا اوپر دریائے دجلہ کو عبور کیا۔ اس مقام اور اربیلہ (جو مشرق کی جانب ہے) کے درمیانی میدان میں ہخامنشی خاندان کی آخری فوج تباہ کی۔ یہ وہی خاندان تھا جس نے سائرس اور دارائے اعظم جیسی شخصیتیں پیدا کیں۔ دارائے ثالث خود بچ نکلا۔[4] اب سکندر نے بابل کا رُخ کر لیا، جو ایرانی حکومت کا مرکزی مقام تھا اور اس کی فصیل تین سو فٹ بلند تھی۔ مقامی پروہتوں اور ایرانی امیروں نے تحفے اور ہار

---

[1] Ammon

[2] اس امر پر نہایت تعجب ہے کہ بعض اہلِ علم حضرات عموماً باتوں کو بھی شرق و غرب کے درمیان وجہِ امتیاز بنانے کی کوشش کرتے ہیں جب ایشیا میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں تو یورپ پر وحشت طاری تھی۔ یونان میں ہیلقومس کی بادشاہی مطلق العنانی کے لحاظ سے کسی بڑی شہنشاہی سے کم نہ تھی۔ یقیناً سکندریہ یورپ پہنچانے کا ذمہ دار نہیں یہ چیز پہلے سے وہاں موجود تھی۔

[3] Nicephorium یہ شہر آج کل رقہ کے نام سے مشہور ہے اور دریائے فرات کے کنارے کے معروف مقامات میں سے ہے۔

[4] ایرین

لے کر نووارد کا استقبال کیا۔ بے اندازہ خزانے سکندر کے ہاتھ لگے، لیکن یہ خزانے ایرانی شہنشاہوں کی اس افسانوی دولت کے مقابلے میں ہیچ تھے، جو موسم بہار کے مرکز سوس میں جمع تھے۔ بابل سے اٹھ کر سکندر نے سوس پر قبضہ جمایا، پھر وہ موسم سرما میں بلند اور دشوار گزار پہاڑیوں پر سے گزرتا ہوا پرسی پولس پہنچ گیا۔ وہاں بھی خزانوں پر قبضہ کر لیا گیا اور جو شاہی محل دارائے اعظم نے تعمیر کرایا تھا، اسے آگ لگا دی گئی۔ کہا گیا کہ زرکسیز نے ایتھنز میں یونانی مندر تباہ کیے تھے، یوں اس تباہی کا بدلہ لے لیا گیا۔

۳۳۰ ق م کے موسم بہار میں سکندر وادیٔ پرسی پولس سے نکلا اور ایک تیز رفتار لشکر کے ساتھ شمال کے رخ ہو لیا۔ وہ اکتباذہ (میڈیا کا قدیم دارالحکومت، موجودہ ہمدان) پہنچنا چاہتا تھا، جہاں دارا پہنچ چکا تھا۔ سکندر کی آمد کا شہرہ ہوا تو دو درباریوں نے سازش کر کے اسے خیمے میں قتل کر دیا۔ سکندر اس وقت موقع پر پہنچا، جب دارا مارا جا چکا تھا۔ مقتول دارا کی نعش پرسی پولس بھیج دی گئی تاکہ اسے شاہی اعزازات کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس وقت سے سکندر اپنے آپ کو آخری ایرانی شہنشاہ کا جائز وارث سمجھنے لگا۔

سکندر کو جو کچھ حاصل ہو چکا تھا، وہ اس پر قانع نہ ہوا اور مزید مشرق کی طرف پیش قدمی کر دی، یہاں تک کہ سیر دریا[1] کے پار بھی ایک حملہ کیا۔ پھر جنوبی جانب کا رخ کر لیا اور وادیٔ کابل میں سے گزرتا ہوا شمالی و مغربی ہند میں پنجاب پہنچ گیا۔ ہندوستان کی لڑائیوں میں اس کی تھکی ہوئی فوج اور جرنیل بے چینی کا اظہار کرنے لگے۔ بلکہ بعض نے بغاوت بھی کر دی۔ آخر سکندر بابل واپس چلا گیا۔ وہاں شراب نوشی اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ ابھی عمر کی تینتیس بہاریں پوری نہیں ہوئی تھیں کہ اس نے بخت نصر کے محل میں بخار سے بیمار ہو کر وفات پائی (جون ۳۲۳ ق م) وہ اپنے پیچھے جرأت و ہمت، تحمل و برداشت، پر جوش سرگرمی اور ولولہ انگیز تخیل کا بے مثال مرقع چھوڑ گیا۔ اس کا نام ہر قسم کے عجیب و غریب جالوں سے مزین ہوا۔ دانی ایل (باب ۸ آیات ۵ تا ۱۱) میں صریح اشارہ اسی کی طرف ہے اور قرآن میں بھی سکندر ذوالقرنین کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قدرت نے خاص کام سونپا تھا۔[2]

مشرق و مغرب کا امتزاج

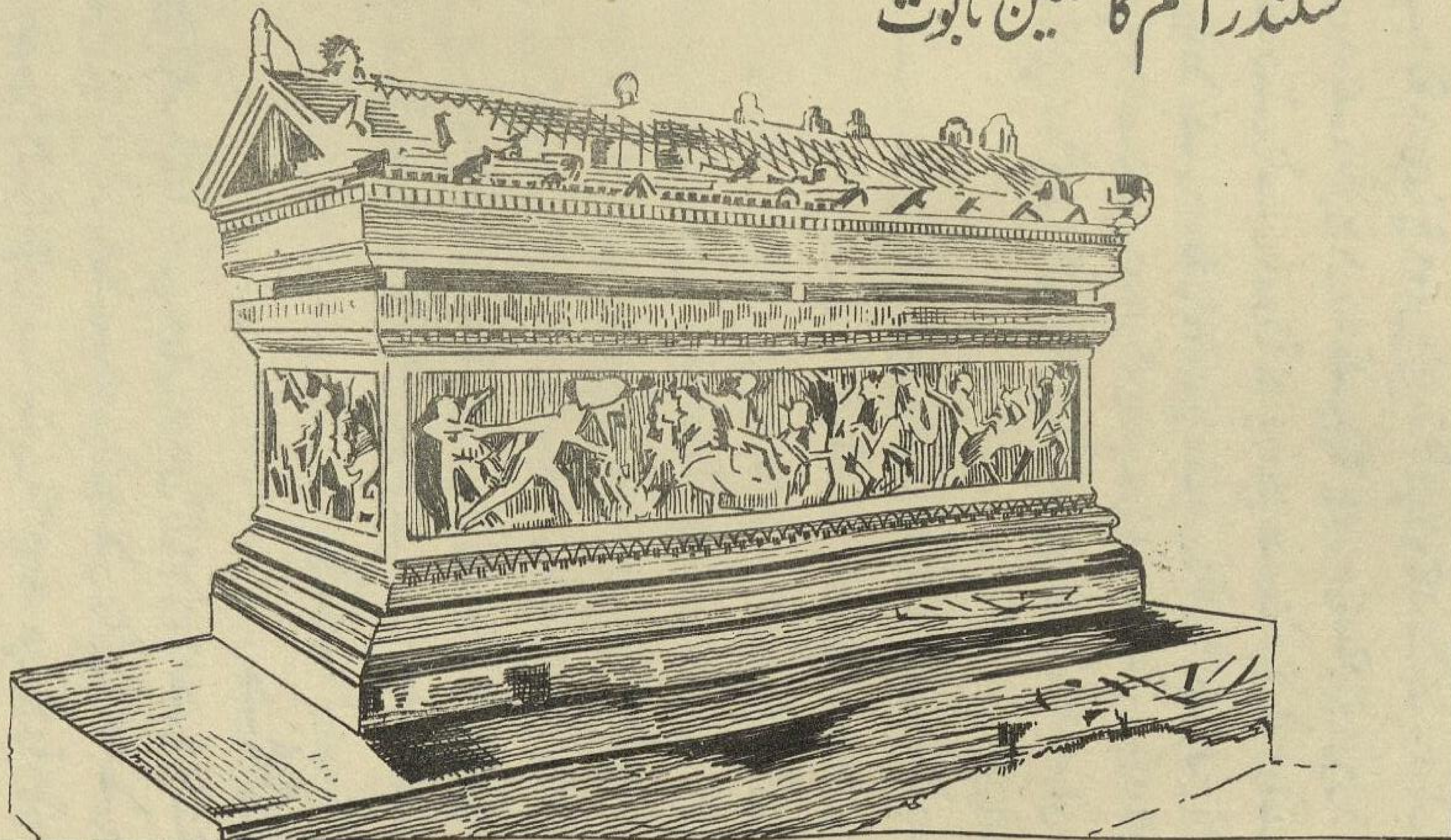
سکندر نے شاید سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ یونان اور مشرق کے افکار و ادارات کے لیے امتزاج کا موقع بہم پہنچا دیا۔ حضارتی نفوذ اس سے پیشتر شروع ہو چکا تھا، لیکن سکندر کی فتوحات نے اس کی رفتار تیز کر دی اور اس کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ خود اس نے یونانی اور ایشیائی خون میں آمیزش کی مثال یوں پیش کی کہ پہلے باختر کی شہزادی رخسانہ[3] سے شادی کی، پھر سوس پہنچ کر ایران کے شاہی خاندان کی دو شہزادیاں اپنے حرم میں داخل کیں۔ اپنے افسروں اور سپاہیوں کو بھی اس مثال کی تقلید پر

---

[1] Jaxartes ترکستان کا مشہور دریا جسے سیر دریا اور سیحوں کہتے ہیں۔

[2] قرآن مجید میں ذوالقرنین کا ذکر موجود ہے اور سکندر کا نام قطعاً موجود نہیں۔ بلاشبہ بعض مفسروں نے، جو تاریخی حالات سے زیادہ واقف نہ تھے، سکندر کو ذوالقرنین سمجھ لیا اور بعض شاعروں نے افسانے تیار کر لیے۔ مثلاً نظامی کا سکندر نامہ، جسے تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ مصنف نے خدا جانے قرآن مجید سے ایک غلط چیز کیوں منسوب کر دی۔ اب محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذوالقرنین سے اشارہ بہ ظاہر سائرس کی طرف ہے۔

[3] اس شہزادی کا نام غالباً روشنک تھا۔ جس نے یونانی میں Roxana کی شکل اختیار کی، وہاں سے پھر ہماری زبان میں منتقل ہوا تو "رخسانہ" بن گیا۔



سکندر اعظم کا سنگین تابوت

آمادہ کیا۔ دربار کے موقع پر سکندر مشرقی لباس زیب تن کرتا تھا۔ ڈیوڈورس[1] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایرانیوں کے نرم و ملائم اور غیر مردانہ اوضاع و اطوار اختیار کر لیے تھے اور وہ ایشیائی بادشاہوں کی عیش رانیوں کا پیرو بن گیا تھا[2]۔ اس نے یورپ اور ایشیا کو جہازوں، شہتیروں اور احمقانہ رشتوں سے جوڑنے کی کوشش نہ کی، جیسا کہ زرکسیز نے کیا تھا، بلکہ آئینی محبت، پاکبازی کی شادیوں اور بچوں کے اشتراک سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا چاہا[2]۔ تاریخ میں وہ موقع بڑا ہی اہم تھا جب دجلہ کے کنارے ایک بڑے جشن کا انتظام ہوا تھا جس میں نو ہزار مقدونی اور ایرانی شریک تھے۔ اس موقع پر سکندر نے دلوں کے مل جانے اور ایک مشترکہ دولت ظہور میں آجانے کی دعا کی تھی۔ سکندر سے پہلے انبیا نے قومی حدوں سے گزرتے ہوئے انسانی برادری کا خواب دیکھا تھا، اگرچہ وہ تصور نامکمل سا ہی تھا، لیکن سکندر ایک دنیا دار آدمی تھا۔ اس نے بھی ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا جس میں یونانیوں اور اجنبیوں کے درمیان کوئی حد بندی نہ تھی اور اس معاشرے کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے اس نے باقاعدہ سعی و کوشش کی۔ وہ جگمگاتی ہوئی امید جسے آگے چل کر فونیقی فلسفی زینو[3] نے اپنی کتاب جمہوریت میں پیش کیا انسانوں کے ذہنوں سے کبھی زائل نہ ہوئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سکندر نے جا بجا ستّر سے زیادہ شہر بسائے۔ یہ شہر تین مقصد پورے کر رہے تھے۔ اوّل یہ کہ اس کی فوج کے جو آدمی زخمی یا سن رسیدہ ہونے کے باعث الگ ہو جاتے تھے، وہ اطمینان سے ان میں آباد ہو جاتے، دوسرا یہ کہ حمل و نقل کے راستوں پر فوجی چوکیوں کا کام دیتے تھے، تیسرا یہ کہ ان شہروں کو یونانی حضارت کے مرکزوں کی حیثیت حاصل تھی اور ان مرکزوں سے یونانی حضارت کا اثر اردگرد پھیلتا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اپنے استاد ارسطو کا بڑا لائق شاگرد تھا۔ ارسطو نے ہومر کی کتاب ایلیڈ کا ایک نسخہ خود درست کیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ سکندر وہ نسخہ نیز اپنا خنجر سوتے وقت تکیے کے نیچے رکھ لیتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ایشیا سے اپنے استاد کو خط لکھا تھا، جس کا مضمون یہ تھا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں دوسروں پر علم میں بازی لے جانے کا آرزو مند ہوں، یہ نہیں کہ میری قوت و طاقت بڑھ جائے یا میری سلطنت بہت وسیع ہو جائے[2]"۔ یونانی زبان اس وقت سے علم و فضل حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ تین سو سال بعد مسیح نے اپنا پیغام دنیا کو سنایا تو یہ فوراً یونانی میں منتقل ہوا اور پوری مہذب دنیا تک پہنچ گیا۔

سلطنت کے ٹکڑے

مقدونیہ کی سلطنت تیزی سے وجود پذیر ہوئی تھی اور اس کی حدیں دُور دُور تک پہنچ گئی تھیں لیکن بانی کی وفات کے ساتھ ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے سالار بہترین ٹکڑوں کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ لڑائیاں بہت طوالت پکڑ گئیں اور ان میں بڑی خونریزی ہوئی۔ ہنگامہ فرو ہوا تو چار سالار چار سلطنتوں کے مالک بن چکے تھے۔ بطلیموس[4] نے مصر سنبھال لیا، سلوکس[5] نے بابل کی سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ اینٹی گونس[6] نے ایشیائے کوچک لے لیا اور اینٹی پیٹر[7] مرکز یعنی مقدونیہ کا مالک بن گیا۔ صحیفۂ دانی ایل کے بیان کے مطابق:

---

[1] ڈیوڈورس

[2] پلوٹارک

[3] Zeno جسے رواقی فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[4] Ptolemy

[5] Seleucus

[6] Antigonus

[7] Antipater

تو بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے۔"[1] ان چار سالاروں میں سے بطلیموس سب سے زیادہ ہوشیار اور دور اندیش تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی سلوکس ان میں قابل ترین تھا۔

سلوکس اوّل (۳۱۲ ق م ۔ ۲۸۰ ق م) نے جونکاٹور (فاتح) کے لقب سے مشہور ہوا۔ سکندر کے ماتحت ہندوستان کی مہم میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ جب سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو شام و فلسطین پر اس کا قبضہ نہیں تھا اس لیے کہ یہ علاقے بھی ایشیائے کوچک کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ۳۱۲ ق م میں بطلیموس نے سلوکس کی امداد سے اینٹی گونس کو بہ مقام غزہ شکست دی اور فلسطین کو مصری سلطنت کا جزو بنا لیا چنانچہ یہ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدّت تک مصر ہی کے کیسا تھ رہا، البتہ اس میں بعض اوقات عارضی خلل پیدا ہوئے۔ اس اثنا میں بابل سلوکس کے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ۳۱۲ ق م میں اس نے بابل واپس لے لیا اور ۳۰۱ ق م اینٹی گونس کو بہ مقام اپسوس[2] ایک اور شکست دینے میں حصّہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلوکس نے شام اور ایشیائے کوچک کا مشرقی حصّہ لے لیا اس طرح وہ دریائے فرات سے بحیرۂ روم تک کے علاقے کا مالک بن گیا۔[3] اس نے دریائے عاصی کے کنارے ایک شہر آباد کیا جس کا نام اپنے باپ کی یادگار میں انطاکیہ[4] رکھا۔ یہی شہر شام کی حکومت کا مرکز قرار پایا۔ ۳۱۲ ق م شامی بادشاہی کے ظہور کا سال سمجھا جاتا ہے۔ اسی سال سے سلوکی سنہ کا آغاز ہوا[5]۔ یہیں سے شاہانِ شام کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ آبادکاری کے علاوہ سلوکیوں کا دوسرا نہایت عظیم الشّان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پورے مشرق قریب کے لیے ایک معیاری تقویم قائم کی۔ اس اثنا میں بطلیموس اپنی سلطنت کی حدیں بڑھاتے بڑھاتے اس خط تک لے گیا جو ارواد (ارادوس) کے شمال اور حمص کے جنوب میں پہنچتا تھا۔ یہ خط ۲۵۰ ق م میں پیچھے ہٹتے ہٹتے بیروت و دمشق کے جنوب میں آ گیا مگر پچیس سال بعد پھر آگے بڑھا اور ارواد کے شمال میں پہنچ گیا۔

سلوکس نے مشرقی جانب اپنی سلطنت کی حدیں پھیلاتے پھیلاتے پورے ایران کو اس میں شامل کر لیا گویا اس کی مشرقی حد شمال میں دریائے جیحوں اور جنوب میں دریائے سندھ پر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں شام کی سلطنت سکندر کی سلطنت کے تمام ایشیائی مقبوضات پر مشتمل تھی۔ سکندر کی سلطنت کے پارہ پارہ ہونے پر جو حکومتیں وجود میں آئی تھیں ان میں سے سلوکس کی سلطنت سب سے زیادہ وسیع اور سب سے زیادہ طاقتور تھی لیکن وہ اس پر مطمئن نہ تھا چنانچہ ۲۸۱ ق م میں سکندر کا ایک اور جرنیل لیسیماخس[6] مر گیا اور اس وجہ سے مقدونیہ کا تخت خالی ہو گیا تو سلیوکس نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی نیّت سے ہیلسپانٹ کو عبور کیا۔ وہ مقدونیہ پہنچا، کامیاب ہوا۔ لیکن چند ماہ بعد وہیں مارا گیا۔

سکندر نے ہر جگہ یونانیت پھیلانے کی جو پالیسی اختیار کی تھی، سلیوکس نے اس کی پیروی کے سلسلے میں کم و بیش سولہ شہر اپنے باپ اینٹیاکس[7] کے نام پر آباد کیے، نو اپنے نام پر پانچ اپنی والدہ لاؤڈیشیا[8] کے نام پر، اور تین اپنی باختری بیوی اپاما[9]

---

[1] صحیفۂ دانی ایل باب ۸ آیت ۸ — [2] Ipsus

[3] اپیئن Appian

[4] باپ کا نام اینٹاکس تھا، شہر کا نام اینٹاک (Antioch) رکھا جو عربی میں انطاکیہ بن گیا۔

[5] شامی اور یہودی اسے یونانی سنہ کہتے تھے۔ اس کے سال کا آغاز یکم اکتوبر سے ہوتا تھا۔

[6] Lysimachus — [7] Antiochus

[8] Laodicea اس نام کا جو شہر شام کے ساحل پر آباد ہوا اس کا نام انگریزی میں Latakia اور عربی میں لاذقیہ بن گیا — [9] Apama

کے نام پر سلوکیہ[1] (موجودہ سلوقیہ) اور دریائے عاصی کے دہانے کی حفاظت کے لیے تعمیر ہوا تھا اور یہ انطاکیہ کی بندرگاہ بھی تھا۔ اسے یا تو خود سلیوکس نے یا اس کے کسی قریبی جانشین نے بسایا تھا۔ اس کی نعش کو مقدونیہ سے لا کر اسی مقام پر دفن کیا گیا اور دیوتا کی حیثیت میں اس کی پوجا ہوتی رہی[2]۔ بعدازاں یہ مقام پورے خاندان (شاہی) کا گورستان بن گیا۔ لاؤڈیشیا کے نام پر جو شہر آباد ہوئے ان میں سے شامی ساحل کے شہر کو عربوں نے لاذقیہ بنا لیا۔ یہ اب بھی خوب رونق پر ہے اور ساحل کی بہترین بندرگاہ سمجھی جاتی ہے۔ اپامیا نام کا شہر دریائے عاصی پر بسایا گیا تھا۔ عرب جغرافیہ والوں نے اس کا ذکر افامیا کے نام سے کیا ہے۔ یہ اب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور اب اس کا نام قلعۃ المضیق یعنی آبنائے کا حصار ہے۔ شامی مملکت میں یہ مقام بہت ترقی کر گیا تھا۔ یہاں فوج اور جنگی خزانہ رہتا تھا نیز گھوڑے پالنے کا ایک وسیع مرکز یہاں قائم کیا گیا تھا جس میں تیس ہزار گھوڑیاں اور تین سو سانڈ گھوڑے[3] رہتے تھے۔ اس مرکز میں ہاتھی بھی پالے جاتے تھے اور انہیں جنگی تربیت دی جاتی تھی۔ اینٹیاکس کے نام پر جو شہر آباد ہوئے ان میں سے پائے تخت یعنی انطاکیہ سب سے زیادہ اہم تھا۔

سلیوکس اوّل نے جو سلطنت پیدا کی تھی وہ اس کے قریبی جانشینوں ہی کے ماتحت زوال میں آ گئی۔ اس کے چوتھے جانشین سلیوکس ثانی کیلی نیکس[4] (۲۴۶ ق م - ۲۲۶ ق م) کے عہدِ حکومت میں بطلیموس اورجیتیس[5] نے شام پر حملہ کیا اور انطاکیہ پر قابض ہو گیا۔ پھر کسی مقابلے کے بغیر دریائے فرات پر پہنچ گیا لیکن اس کے پیچھے مصر میں ہنگامے بپا ہو گئے لہٰذا اسے لوٹنا پڑا اور سلیوکس کو اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لے لینے کا موقع مل گیا۔ اس اثنا میں پارتھیوں نے شامی مملکت کی بدنظمیوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا۔ پارتھیا[6] کے بادشاہ ارشک[7] نے ۲۴۸ ق م کے تھوڑی دیر بعد سلیوکس کو شکست دی۔ اس وقت سے پارتھیا کی سلطنت کا آغاز ہوا۔ ادھر پرگیم[8] کا بادشاہ بھی اپنا دائرۂ اقتدار ایشیائے کوچک میں بڑھا رہا تھا۔

اینٹیاکس ثالث (۲۲۳ ق م - ۱۸۷ ق م) کی تخت نشینی پر سلوکی مملکت کے بہت سے علاقے بھی چھن چکے تھے اور اس کی عظمت بھی ماند پڑ چکی تھی۔ اینٹیاکس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھال لے چنانچہ وہ فوج لیکر پہلے مشرق کی طرف بڑھا تاکہ ایرانی علاقوں کو دوبارہ فتح کر لے اس میں وہ کامیاب ہوا۔ اس کی فوج ہندوکش کو عبور کر کے وادی کابل کی جانب اتری، پھر جنوب کی طرف پیش قدمی کرتی ہوئی ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گئی یعنی ایران و ہندوستان کے دورافتادہ لوگوں کو دوسری مرتبہ مقدونی فوج سے دوچار ہونا پڑا۔ واپسی میں بابل پہنچ کر اس نے عرب کا جائزہ لیا جس طرح سکندر اس سے پیشتر لے چکا تھا۔ عرب کے مسالوں اور گرم علاقوں میں پیدا ہونے والی دوسری چیزوں کی اہمیت کسی شرح کی محتاج نہ تھی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا

---

[1] Seleucia

[2] اپیئن

[3] سٹرابو

[4] Callinicus

[5] Euergetes

[6] Parthia ان بادشاہوں کو فارسی والے عموماً اشکانی بادشاہ کہتے تھے۔

[7] Arsaces ارساسیس جسے "اشک" "ارشاک" اور "ارشک" کہتے ہیں۔ اسی اشک سے خاندان اشکانی مشہور ہوا۔

[8] Pergamum

کہ بحری راستوں کے نقطۂ نگاہ سے عرب کو سلوکی سلطنت کے مشرقی و مغربی حصوں میں درمیانی حیثیت حاصل تھی، یہ مصلحتیں بڑی وزنی تھیں۔ اینٹیاکس کے بیڑے نے دریائے دجلہ سے ساحلِ عرب کے ساتھ ساتھ چکر لگایا اور اس پر واضح ہو گیا کہ اس صحرائی جزیرہ نما پر مستقل قبضے کے لیے انتظامات بالکل بے سود ہیں۔ لہٰذا وہ ۲۰۴ء ق م میں دریائے دجلہ کے راستے سلوکیہ واپس پہنچ گیا جو مشرقی مرزبانی کا دارالحکومت تھا۔

پھر اینٹیاکس نے اپنے جنوبی دشمن بطلیموس کی طرف توجہ کی۔ ۲۱۷ء ق م میں اس نے شام کے گئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کی کوشش کی تھی، لیکن رافیا[1] کے سرحدی مقام کی جنگ میں شکست کھائی۔ ۱۹۸ء ق م میں دوبارہ پیش قدمی کی تو وہ کامیاب ہوا۔ بانیاس[2] میں اس نے مصری فوجوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں شامی فوج نے ہاتھی بھی استعمال کیے تھے، جن کی خاصی بڑی تعداد وہ ہندوستان سے لے آیا تھا۔[3] غرض تئیس سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد اینٹیاکس نے مملکت کے وہ تمام علاقے دوبارہ فتح کر لیے جو اس کے باپ اور دادا کے ہاتھ سے چھن گئے تھے اور اس طرح اینٹیاکس اعظم کا لقب حاصل کر لیا۔

اس زمانے میں روما سے ایک سفارت اس کے دربار میں پہنچی جس نے مطالبہ کیا کہ مصر پر پیش قدمی نہ کی جائے۔ روما اور انطاکیہ کے درمیان یہ پہلی سفارت تھی، جس کے متعلق ہمیں علم ہے اور اس وقت سے قدیم معاملات میں نیا دور شروع ہوا۔ یہی زمانہ ہے جب ہینی بال نے شام میں پناہ لینی چاہی تھی اور اینٹیاکس پر زور ڈالا تھا کہ اٹلی پر حملہ کیا جائے۔[4] اینٹیاکس کو اس عفریت کی قوت کا پورا اندازہ نہ تھا جو مغرب میں سر اٹھا رہا تھا۔ اس نے یونان پر ضرب لگانے کا فیصلہ کیا، جس میں رومی مداخلت کرنے لگے تھے۔ وہاں تھرماپلی میں رومیوں سے شکست کھائی (۱۹۱ء ق م)۔ اگلے سال میگنیزیا (مغربی ایشیائے کوچک) کے قریب رومیوں کے مقابلے میں اسے ایک اور شکست سے سابقہ پڑا اور ۱۸۸ء ق م میں وہ مجبور ہو گیا کہ کوہستانِ طارس سے پار کے تمام علاقے رومیوں کے حوالے کر دے، ساتھ ہی بھاری تاوان جنگ ادا کرے۔[5] یوں ایشیائے کوچک چھن گیا۔ بڑی تجارتی راستے بھی ہاتھ سے گئے اور یونانی تہذیب سے براہِ راست علاقہ بندی کا بھی کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ گویا سلوکی خاندان حکومت کی تاسیس کے بعد فتح و ظفر کی بہترین ساعت میں اس پر ایک کاری ضرب لگ گئی۔

ذلت خیز صلح اور بھاری خراج نے شام کو یقیناً کمزور کر دیا تاہم تھوڑی دیر بعد وہ پھر جارحانہ اقدامات کے لیے تیار ہو گیا چنانچہ جب معلوم ہوا کہ مصر شام مجوف پر حملے کی تیاری کر رہا ہے — اور یہ علاقہ ہمیشہ وجہ نزاع بنا رہا — تو اینٹیاکس چہارم (۱۷۵ء تا ۱۶۴ء ق م) نے

[1] RAUFIA یہ آج کل تل رفح کہلاتا ہے اور غزہ کے جنوب میں ہے۔ Pan

[2] Paneas دریائے اردن کے منبع پر ایک احاطہ بنا ہوا تھا اور ایک دیوتا بھی تھا جسے یونانیوں نے اپنے دیوتا کے نام پر مخصوص کر لیا۔ عرب اسے بانیاس کہنے لگے۔ انجیلوں میں اس مقام کو "قیصریہ فلپی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

[3] پولی بیئس

[4] اپیئن

[5] لیوی Livy

[6] پولی بیئس

بر و بحر دونوں طرف سے حملہ کیا۔ ۲۱۹ ق م میں مصری فوج کو پیلوسیم[1] کے سرحدی قلعے پر شکست فاش دی اور اس جنگ میں مصر کا بادشاہ بطلیموس فلومیٹر گرفتار ہو گیا۔ بہت تھوڑی مدت میں مصر زیریں انٹیاکس کے قبضے میں آ گیا۔ اسکندریہ حوالگی پر آمادہ نہ ہوا اور اپنی تابیس کے بعد بھی مرتبہ اسے محاصرے سے سابقہ پڑا لیکن روما نے دباؤ ڈالا تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اینٹیاکس اس وقت تک روما کو تاوان جنگ کی قسطیں ادا کر رہا تھا چنانچہ شامی فاتح مصر کو خالی کر کے وطن واپس چلا گیا۔

مکابی بغاوت

بلاشبہ روما کی بے پناہ قوت اینٹیاکس کی جنگی سرگرمیوں پر پابندیاں لگا سکتی تھی لیکن یونانیت کے داعی کی حیثیت میں اس کی تبلیغی سرگرمیوں کو روکنا روما کے بس کی بات نہ تھی مصر کی تسخیر سے اینٹیاکس کو اپنی زندگی کے دو بڑے مقصدوں میں سے ایک کے پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اپنی سلطنت میں ثقافتی وحدت پیدا کر دے۔ اس سلسلے میں وہ سلیوکس کی روایتی پالیسی پر کاربند رہا جس کا ماحاصل یہ تھا کہ یونانیت ہی وہ مشترک بنیاد ہے جس پر پوری رعایا کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اینٹیاکس بہت آگے نکل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو خدا کا مظہر قرار دیا[2] اور اس حیثیت میں وہ زیئس اولمپیس کا متبنیٰ بن گیا۔ شامی معبود رقابت سے آزاد تھے۔ انھیں بادشاہ کی پرستش پر کوئی اعتراض نہ ہوا لیکن یہودیوں کا معبود اس دعوے کو کیوں کر قبول کر سکتا تھا؟

یروشلم کے برسر کار امراء، دولت مند اور جدت پسند یہودی بیرونی حرکات کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ انہوں نے یونانی زبان اور عادات و رسوم اختیار کر لی تھیں۔ نئے معاملے میں بھی وہ تعاون کے لیے تیار تھے۔ انہیں انطاکی کہلانے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ نوجوانوں میں یونانی لباس کا رواج ہو رہا تھا اور یونانی جمنیزیم بھی نمودار ہو چکا تھا۔ ان کے تعاون پر بھروسا کرتے ہوئے اینٹیاکس نے یہواہ اور زیوس کو ایک قرار دیا اور یونانی دیوتا کے لیے ہیکل میں ایک مذبح کھڑا کر دیا۔ یہی وہ سلسلہ تھا جس کے متعلق صحیفۂ دانی ایل میں کہا گیا تھا: "اور وہ محکم مقدس کو ناپاک اور دائمی قربانی کو موقوف کریں گے اور اجاڑنے والی مکروہ چیز کو اس میں نصب کریں گے۔"[3] مصر سے واپس ہوتے ہوئے اس نے ہیکل کے تمام خزانے بھی اٹھوا لیے پھر شام کے تمام مقدس مقامات کی دولت سمیٹ لی۔ اس لیے کہ اسے اپنی بہت سی رغبتوں اور منصوبوں کی تکمیل کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔

اگرچہ اینٹیاکس کے زیوس اولمپیس کا نام یونانی تھا تاہم اس میں اور مشرقی بعل میں کوئی فرق نہ تھا۔ نیم سامی معبدوں میں نیم سامی صفات کے ساتھ اس کی پوجا ہوتی تھی اور نیم سامی لباس میں اسے پیش کیا جاتا تھا۔[5] یہودیوں میں سے جو لوگ اصولِ دین کے پابند تھے اور جن میں قوم پروری کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا وہ اس حکم کی مخالفت کا عزم بالجزم کر بیٹھے۔ یہودیہ[6] سے

---

[1] Pelusium الفرما۔ [2] یونانی میں Epiphanes جو زیفینیس یعنی مظہر خدا جس نے مسلمانوں میں ظل اللہ کی شکل اختیار کی۔

[3] صحیفۂ دانی ایل باب ۱۱، آیت ۳۱۔

[5] ایم راسٹازوف Rostovizeff کی کتاب The Social and Economic History of the Hellenistic World ص ۴۸،

[6] Juddaea یہ جغرافیائی نام سب سے پہلے عزرا میں سلطنتِ ایران کے ایک صوبے کے لیے استعمال ہوا۔ باب ۵، آیت ۸۔

۱۶۸ سنہ ق م میں بغاوت کا آغاز ہوا۔ اس بغاوت کا قائد یہودا تھا، جو ماتھیاس نام ایک غریب کاہن کا فرزند تھا اور اسکا تعلق ہسمونیوں کے خاندان سے تھا۔ یہودا نے آگے چل کر مکابی[1] کا لقب اختیار کر لیا۔ اس بغاوت کا رخ ابتدا میں حکومت سے کہیں زیادہ طبقہ بالا کی طرف تھا جو عوام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے اور ان سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہودا نے اپنے بھائیوں کی امداد سے چھاپہ مار دستوں کی تنظیم کا بندوبست کیا، جو پہاڑی علاقوں میں بیٹھ کر چھاپے مارتے اور شاہی فوجوں کے ساتھ جم کر لڑنے سے گریزاں رہتے تھے۔ اینٹیاکس کے مخالف یہودیوں میں بعض ایسے افراد بھی شامل تھے جنہیں انتہائی پابندیٔ مذہب کی بنا پر "تقویٰ شعار" اور "خدا ترس" سمجھا جاتا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ یوم سبت آتا تو اس خیال سے کسی پر ہاتھ نہ اٹھاتے کہ اس مقدس دن کی بے حرمتی ہو گی چنانچہ انھیں بہ آسانی ذبح کر ڈالا گیا۔ تاریخ میں مذہبی شہادت کے جو واقعات مرقوم ہیں ان میں سے یہ ابتدائی واقعات ہیں۔ مکابی بھائیوں کی کوشش سے یروشلم پر قبضہ کر لیا گیا، ہیکل کو تمام غیر مذہبی چیزوں سے پاک کر دیا گیا اور روزانہ اصولِ مذہب کے مطابق جو قربانیاں ہوتی تھیں وہ بحال ہو گئیں اسی واقعے کی یاد میں "عید حنوکہ[2]" منائی گئی، جو اب تک ہر سال منائی جاتی ہے۔

یہودی جمہوریت

مکابی بغاوت ابتدا میں مذہبی ہیجان کی حیثیت رکھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس تحریک نے قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی جس کا مدعا یہ تھا کہ فلسطین کو آزاد کرایا جائے۔ اس کا تصادم صرف شاہی فوجوں سے نہ تھا بلکہ اصولِ دین کے ان قوم پرور حامیوں سے بھی تھا جو عبرانیت کے لیے عقیدت میں بالکل غیر متزلزل تھے اور اس نئی ثقافت کی حمایت کرتے تھے جو یونانیت پر مشتمل تھی اور جو اصلاح کے حامی تھے۔ دونوں صورتوں میں مکابی کامیاب ہوئے ۱۴۱ سنہ ق م میں یہودا کا بھائی سمعان[3] کاہن اعظم اور حاکم منتخب ہوا۔ سیلیو کی بادشاہ ڈیمیٹریس ثانی نکاتور نے یہودیوں کو سمعان کے ماتحت آزادی دے دی[4]۔ سمعان نے اپنے سکے ضرب کرائے۔ یروشلم میں نیا دور شروع ہوا۔ دستاویزوں پر یوں تاریخیں لکھی جانے لگیں: "سمعان کاہن اعظم اور حاکم کی حکمرانی کے پہلے سال میں"۔ ایک نئی یہودی جمہوریت وجود میں آگئی، جو اسّی سال بعد تک قائم رہی اور رومیوں کی آمد پر ختم ہوئی۔

مکابی یہودی کامیابی حاصل کرنے کے بعد پرانے یہودیوں سے بھی زیادہ تنگ نظر قوم پرست بن گئے۔ وہ غیر یہودی افراد سے بھی لڑتے تھے اور ان بھائیوں سے بھی دست گریباں رہتے تھے جو یونانی طور طریقوں کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ یوحنا ہرکانوس اول[5] (۱۳۵ سنہ ق م ۱۰۵ سنہ ق م)، اپنے باپ سمعان کی جگہ برسر اقتدار آیا تو اس نے سامریوں پر حملہ کر دیا جنھوں نے اینٹیاکس کے منصوبے کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس حملے میں ان کا شہر بھی تباہ کر ڈالا اور معبد بھی[6]۔ اس سے پیشتر وہ ان ادومیوں کو ختنہ کرانے پر مجبور کر چکا تھا اور انہیں یہودی بنا چکا تھا جو جنوبی یہودیہ میں داخل ہو چکے تھے۔ مکابیوں کے ابتدائی دور میں یہودی جمہوریت کی حیثیت "الٰہی حکومت" کی تھی۔ یوحنا نے اپنے سکوں پر یہ عبارت کندہ کرائی تھی: "کاہن اعظم یوحنا"۔ اس کے بیٹے ایرسٹوبولس[7] (۱۰۵ سنہ ق م ۱۰۳ سنہ ق م)، نے شاہی

۱؎ Maccabeus تابر کا نام تھا اور وہ Dudas Mattathia کا بیٹا تھا۔
۲؎ Hanukkah
۳؎ Simon
۴؎ جوزیفس
۵؎ John Hyrcanus
۶؎ جوزیفس
۷؎ Aristobulus

لقب اختیار کر لیا یا جوزیفس کے الفاظ میں اپنے سر پر تاج رکھ لیا۔[1] اس کا اور بعد کے تمام بادشاہوں کا ایک نام یونانی ہوتا تھا ایک عبرانی۔ اس کے بیٹے اور جانشین سکندر جنایوس[2] (۱۰۳ ق م تا ۷۶ ق م) کے عہدِ حکومت میں یہودی مملکت اپنی انتہائی حد پر پہنچ گئی۔ اس وقت سے یونانی اور عبرانی کلمات سکّوں پر عام ہو گئے۔ جس جلیل کا ذکر انجیل میں آیا ہے وہ ارسٹوبولس ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔ یہاں مدت سے غیر یہودی آباد تھے[3] اور اب اتوری[4] بھی پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ اصلاً عرب تھے لیکن آرامی بولی بولتے تھے۔ ان سب کے سامنے دو صورتیں پیش کر دی گئیں۔ اوّل یہ کہ ختنہ کرا لو اور بیٹھے رہو، دوسری یہ کہ ملک چھوڑ کر نکل جاؤ۔ اکثریت نے پہلی صورت قبول کر لی۔[5] تاہم جن لوگوں میں حضرت مسیحؑ وعظ و نصیحت فرماتے رہے اور جن سے انھیں حواری ملے ان میں سے اکثر غیر یہودی تھے اور عبرانی تکلّف سے بولتے تھے[6] انھیں اصل یہودیوں سے فروتر مانا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ ان میں سے نبی پیدا نہیں ہو سکتا۔[7] ہرکانوس اور اس کے بیٹے نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ آسمونی خاندان کے باقی افراد کے لیے نمونہ بنا رہا۔ جس نئے شہر یا گروہ کو وہ مسخر کرتے اس کے سامنے یہودیت یا بربادی کا متبادل مطالبہ شروع کر دیتے۔[8]

سلیوکی مملکت کا آخری دور

سلیوکیوں کی قوت ایک طرف یہودیوں کے دباؤ کے ماتحت سمٹتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہمسایہ عربی قبائل خصوصاً نبطی، پریشانیاں پیدا کر رہے تھے، جو مملکت کے جنوبی کنارے پر رہتے تھے۔ مشرقی جانب پارتھیا یا خزر اور دوسری سرحدی سلطنتیں آزادی حاصل کر لینے کے لیے کوشاں تھیں۔ ۱۳۰ ق م کے آس پاس ایک عرب خاندان الرُّہا[9] میں برسرِ کار آ گیا۔ یہ برائے نام پارتھیا کا سہارا لیے کھڑا تھا اور اس کے اکثر بادشاہوں کا نام ابجر[10] تھا۔ ایک اور عرب قبیلے کے شیخ حاکموں نے نئی ریاست پیدا کر لی جس کا مرکز حمص تھا۔ وہ برائے نام سلوکیوں کے ماتحت تھے۔ ایک اور ریاست اتوریوں نے نشیبی شام میں قائم کر لی جس کا مرکز عنجر[11] تھا۔ رابع کے جانشین فی الجملہ نالائق تھے۔ ان کے تحت سلیوکی خاندان، جو پشتوں تک دنیا کے سامنے مشرقی شہنشاہی خاندان سمجھا جاتا تھا، تیزی سے اپنا وقار، اپنی قوت اور ہیبت کھو بیٹھا۔ جب سے سلیوکیوں نے ”مظہرِ خدا“ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت سے ایک صدی تک مقامی بغاوتوں، داخلی منافستوں اور خاندانی جھگڑوں کا ہنگامہ بپا رہا جس میں علاقے آہستہ آہستہ چھنتے گئے۔ جو سلطنت ایک زمانے میں زیریں بحیرۂ روم اور بحیرۂ ایجہ سے ترکستان و ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی، وہ سمٹتے سمٹتے شمالی شام کی ایک مقامی ریاست رہ گئی۔

عربوں میں نبطیوں نے ۲۲۱ ق م کے آس پاس ادومیوں کو پیٹرا سے نکال دیا تھا اور اب وہ خاصی قوت کے مالک

---

[1] جوزیفس
[2] Alexander Jannaeus
[3] یسعیاہ باب ۹ آیت ۱، متّی کی انجیل باب ۴ آیت ۱۵۔ مکابی باب ۵ آیت ۱۵۔
[4] Ituraeaus
[5] جوزیفس
[6] مرقس کی انجیل باب ۱۴ آیت ۷۰، لوقا کی انجیل باب ۲۲ آیت ۵۹، رسولوں کے اعمال باب ۲ آیت ۷، یوحنا کی انجیل باب ۱ آیت ۴۶، باب ۷ آیت ۵۲،
داہیون جلد دوم ص ۲۵۶۔
[8] جوزیفس
[9] Edessa
[10] Aogar
[11] Chaleis

بن گئے تھے ۸۵ ق م کے آس پاس نبطیوں نے نشیبی شام سلیوکیوں سے چھین لیا۔ دمشق نے بھی اس خیال سے ان کی حفاظت قبول کر لی کہ کہیں ایتوریوں کے ہاتھ پڑ کر زیادہ خوفناک مصیبتوں کا شکار نہ ہونا پڑے[۱]۔ ایتوری اس زمانے میں صیدا اور تھیو پروسوپن[۲] کے درمیانی ساحلی علاقے کو پامال کر رہے تھے۔ بیبلوس و بیروت ان کے ہاتھوں برباد ہو چکے تھے۔ دوسرے فونیقی شہر دوبارہ مقامی آزادی حاصل کر رہے تھے۔ فونیقیہ اور مصر کے درمیانی ساحل پر جو شہر آباد تھے، ان میں سے صرف چند کو یونانیت کے طور طریقوں کی پرورش کے لیے چھوڑا گیا مثلاً عسقلان۔ باقی شہر مثلاً غزہ، جہاں یونانی حضارت خوب ترقی پر تھی محض بے آباد کھنڈر رہ گئے تاکہ یہودیوں کے انتقام کی یاد تازہ کرتے رہیں[۳]۔

سلیوکیوں کے دورِ زوال میں مملکت کے تمام مشرقی صوبے چھن گئے۔ ۱۳۰ ق م تک پارتھیوں نے اپنی سلطنت دریائے فرات سے دریائے سندھ تک اور دریائے جیحوں سے بحرِ ہند تک پھیلالی تھی۔ مغربی سمت میں پارتھیوں کی پیشقدمی کو آرمینیا کے بادشاہ تغرنیز[۴] (دو کران)، اور اس کے خسر متھراڈیٹیز[۵] اعظم والیِ پانٹس نے روکا۔ تغرنیز کے ماتحت ارمنی مملکت اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔

اس حریص بادشاہ نے دوآبہ دجلہ و فرات کو پامال کیا جس پر پارتھی قابض تھے۔ ۸۳ ق م میں شمالی شام اور سیلیشیا کو روندا جو ابھی تک سلیوکیوں کے ماتحت تھا اور جس کی آبادی آرامیوں سے مشابہ تھی۔ دو شاہی بادشاہوں فلپ اوّل، فلاڈلفس اور اینٹیاکس خامس یوسیبس کے متعلق بعد میں کچھ نہ سنا گیا۔ تغرنیز نے بالائی دجلہ کے خطّے میں ایک نیا شہر آباد کیا جس کا نام تغرانو سرتا[۶] رکھا اور شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اہلِ شام مقامی جھگڑوں اور شاہی خاندان کی کشمکشوں کے باعث حد درجہ پریشان حال تھے لہٰذا ان سے مزاحمت کی امید ہی نہ ہو سکتی تھی۔ یونانی شہروں نے بھی اس خیال سے حملہ آور کا خیر مقدم کیا کہ ممکن ہے، طبعی زندگی بسر کرنے کا دلخواہ موقع میسّر آجائے۔ چنانچہ سب نے نئی حکومت کو قبول کر لیا۔ جنوبی سمت میں تغرنیز پیش قدمی کرتا ہوا عکا تک پہنچ گیا جس کا نام اس زمانے میں تالمائس[۷] تھا۔ ۶۹ ق م اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب یہودی مملکت کے لیے براہ راست خطرہ پیدا ہو گیا فلسطین کو مصر پر پیش قدمی کے لیے قدم گاہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ روما کی نظریں بھی مصر پر جم چکی تھیں، خصوصاً اس لیے کہ اس زمانے میں بطلیموسی خاندان کا تخت متزلزل ہو چکا تھا۔

۱۔ جوزیفس

۲۔ Theouprosopon (فونیقی میں اس کے معنی "وجہ اللہ" ہیں)، اسے آج کل راس الشقعہ کہتے ہیں نہ کہ راس الشقعہ جیسا کہ اربل نے جلد دوم میں لکھا ہے۔

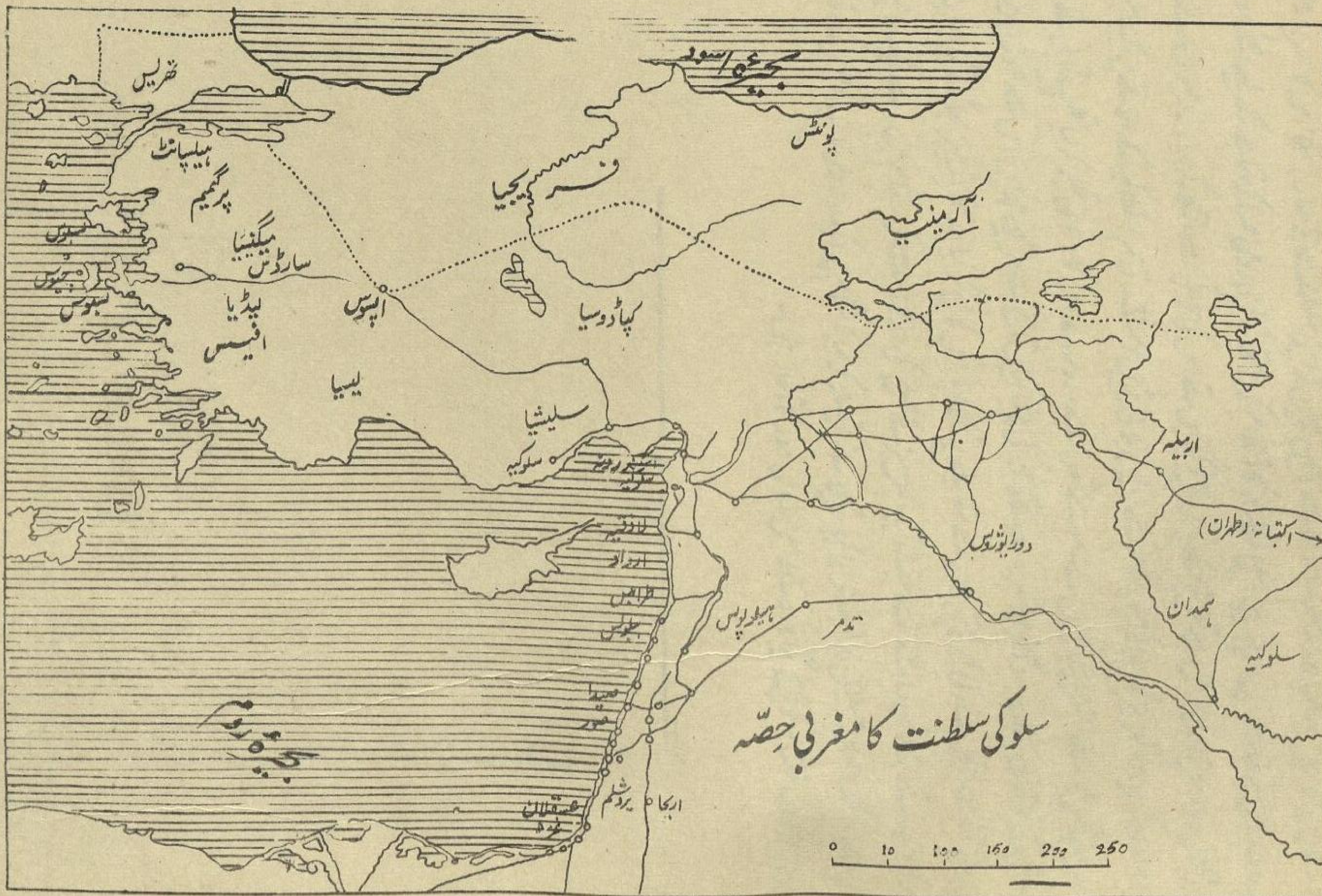
۳۔ یہودان جلد دوم ص ۲۷۷

۴۔ Tigranes

۵۔ Mithrı ates متھرا فارسی اور سنسکرت میں سورج کو کہتے ہیں، متھراڈیٹیز دراصل فارسی میں "مہر داد" یعنی سورج کا عطا کردہ ہے اور اس نام کے کئی اشکانی بادشاہ گزرے ہیں، اشکا سے مراد پارتھی ہیں۔

۶۔ Tigranecerta یہ سٹرابو کا بیان ہے اور تغرانو سرتا وہی مقام ہے جس کا نام آج کل "میافارقین" ہے۔ یہ اناطولیہ میں ہے، نقشوں میں محض فارقین نام ملے گا۔

۷۔ Ptolemais یعنی بطلیموس کا بسایا ہوا شہر۔


سلوکی سلطنت کا مغربی حصّہ
بحیرۂ اسود
ٹھریس
ہیلسپانٹ
پرگمیم
میگنیشیا
سارڈس
لیڈیا
افیسس
ایپسوس
لیسیا
فریجیا
پونٹس
آرمینیا
کپاڈوسیا
سلیشیا
سلوکیہ
دوراپوروس
اربیلہ
اکتبانہ (طہران)
ہمدان
سلوکیہ
ہیلیوپولس
تدمر
صیدا
صور
یروشلم
اریحا
بحیرۂ روم
0 10 100 150 200 250

شام پر رومیوں کا قبضہ

جس زمانے میں تغرینز پارتھیا اور شام سے علاقے چھین چھین کر اپنی سلطنت بڑھا رہا تھا، اس کا خسر اور حلیف متھراڈیٹیز ایشیائے کوچک اور رومی مقبوضات میں اپنے لیے وسیع مملکت کا انتظام کر رہا تھا۔ آخری رومی عساکر مقابلے کے لیے اٹھے اور اسے اس کی مملکت سے باہر نکال دیا۔ وہ پناہ کی غرض سے تغرینز کے پاس پہنچ گیا جس نے اس کی حوالگی سے انکار کر دیا۔ رومیوں نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور تغرینز کو اپنی فوجیں شام سے واپس بلانی پڑیں (۶۹ء ق م) انطاکیہ کے علاقے پر ایک سلیوکی شہزادے نے قبضہ کر لیا جو اینٹیاکس ثالث وعشر ایشیاٹیکس کے نام سے مشہور ہے۔ روما نے اس کا دعویٰ تسلیم کر لیا۔ فلپ ثانی نے اس دعوے کی مخالفت کی۔ سلیوکی خاندان کے یہ دو آخری شہزادے تھے جن کی پیشانیاں تاج سے مزین ہوئیں اس سے تھوڑی دیر بعد متھرا ڈیٹیز نے چھنی ہوئی مملکت واپس لے لی پھر پمپی[1] اس کے مقابلے پر نکلا، پانٹس کو فتح کر لیا اور متھراڈیٹیز بھاگ گیا۔ اسطرح ایشیائے کوچک میں روما کا سب سے بڑا دشمن راستے سے ہٹ گیا۔ تغرینز نے صلح کی درخواست کی۔ شام میں اسے ایک اہم واقعے کی حیثیت حاصل ہے۔ آئندہ سال فلسطین پر قبضہ کر لیا گیا۔ پمپی نے فیصلہ کر لیا کہ شام پر ایک رومی نائب قونصل کے ذریعے سے حکومت ہوگی۔ پرانا دور اختتام کو پہنچ گیا اور نئے یعنی رومی دور کا آغاز ہوا۔

---

[1] Pompey روما کا مشہور سالار اور جولیس سیزر کا معاصر، پہلے سیزر کا رفیق رہا، پھر اختلاف پیدا ہوا، ایک لڑائی میں پمپی مارا گیا۔

اٹھارھواں باب

یونانیت کا دور

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مغربی ایشیا میں یونانیت سکندر کی فتوحات سے پہلے پہنچ چکی تھی، تاہم ان فتوحات نے یونانیت کی ترقی میں آسانیاں بہم پہنچا دیں۔ سلیوکیوں کے دستورِ عمل نے اس کی رفتار بھی تیز کر دی اور اثرات میں بھی زیادہ گہراؤ پیدا ہو گیا۔ یونانی اور سامی حضارتوں کے تداخل سے وہ مرکب تہذیب پیدا ہوئی جسے یونانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ یونانی تہذیب سے الگ شے ہے۔ یونانیت سلیوکی دور کا سب سے اہم مظہر تھی۔ اس نے محض شام ہی میں نہیں بلکہ پورے مغربی ایشیا اور مصر میں برتری حاصل کر لی۔ یہ دو سامی تہوں کے بیچ میں آ گئی تھی۔ نیچے آرامی حضارت کی تہ اور اوپر عربی حضارت کی تہ۔ یونانیت شام میں کم و بیش ایک ہزار سال قائم رہی اور اسلامی فتوحات پر اس کا دور ختم ہوا۔

یونانی نوآبادیاں

یہ انتخابی یونانی حضارت تھی، جو زیادہ تر غیر یونانی علاقوں میں پھیلی۔ اس کی پرورش گاہ شہروں کا وہ سلسلہ تھا جن کی آبادی کے ذمہ دار سکندر اور اس کے جانشین تھے۔ شہروں کے لیے مقام تجویز کرنے والے لوگ جگہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے مثلاً ایسے مقامات منتخب کرتے جو جنگی نقطۂ نگاہ سے موزوں ہوتے یا جنہیں معاملات میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی یا دریاؤں کی وادیوں میں شہر آباد کرتے۔ ان میں یونانی زبان بولی جاتی اور ان کا نظم و نسق بھی یونانی ہی ہوتا۔ یونانی لوگ ایسے ہی مقامات پر اپنی حیثیت بحال رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ دیسی آبادیوں میں بکھر جاتے تو ظاہر ہے کہ اصل حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ آباد کار یا تو یونانی اور مقدونی سپاہی تھے یا تنخواہ دار تھے جنہیں آبادکاری کے لیے شاہی فرمان مل جاتا تھا۔ ان میں سے بعض لوگ مقامی عورتوں سے بھی شادیاں کر لیتے۔ غیر مصافی لوگ تدریجاً ان آبادیوں میں جمع ہونے لگے۔ انھیں یا تو نفع کی امید کھینچ لاتی تھی یا وہ سیاسی اور اقتصادی تقاضوں کے ماتحت اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ مخلوط النسل لوگ یا وہ دیسی باشندے ان آبادیوں میں پہنچنے لگے، جو یونانیت کے حواشی میں سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح یہ آبادیاں تاجروں، فن کاروں، علم دوست آدمیوں اور غلاموں کا مرکز بن گئیں۔

جن مرکزوں سے یونانی حضارت نکل نکل کر باہر پھیلنی شروع ہوئی، ان میں اولین درجہ انطاکیہ کو حاصل ہے، جو سلیوکیوں کا پایۂ تخت تھا۔ یہ دریائے عاصی کے کنارے پر ۳۰۰ ق م کے آس پاس تعمیر ہوا تھا۔ سمندر سے اس کا فاصلہ کوئی بیس میل ہو گا۔ شہر کا موقع اور محل بڑا ہی حسین و جمیل تھا۔ سلیوکیوں کے ماتحت یہ ایشیا کا سب سے بڑا سیاسی شہر بن گیا۔ یونانی حضارت کے مرکز کی حیثیت میں اسکندریہ، قسطنطنیہ اور شاید مزید ایک دو یونانی نوآبادیوں کو اس پر فوقیت حاصل تھی، اس کے بعد سلیوکیہ،

لاذقیہ اور اپامیا کا درجہ تھا۔ حضرت مسیحؑ سے پیشتر کی دو صدیوں میں ان شہروں کے اندر متعدد فصحائے ادب اور فلسفی پیدا ہوئے لیکن ان میں سے پوسی ڈونیئس[1] کے سوا کوئی اوّل درجے پر نہ پہنچ سکا۔

جس زمانے میں سلیوکی شمال لبنان میں یونانی شہر آباد کر رہے تھے، مصر کے بطلیموسیوں نے یہی کام جنوب میں شروع کر دیا تھا تاہم یہ واضح رہنا چاہیئے کہ مصر کے مقدونوی حکمران یونانیت کی نشر و اشاعت کا ویسا جذبہ نہیں رکھتے تھے جس سے شام کے مقدونی حکمران بہرہ مند تھے۔ بطلیموسیوں نے بحیرۂ جلیل (طبریہ) کے کنارے فلوٹیریا[2] آباد کیا۔ یہ نام بطلیموس ثانی فلاڈلفیس کی بہن فلوٹیرا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ پیلا[3] جو بعد ازاں ڈیکاپولس[4] میں شامل ہوا، غالباً سکندر نے بسایا تھا اور یہ نام مقدونیہ کے پائے تخت کے نام پر رکھا تھا۔ ڈیکاپولس کے شہروں میں سے ایک جراسا[5] بھی تھا جس کی بنیاد غالباً انٹیاکس رابع نے رکھی تھی اور اسے انطاکیہ بر دریائے خریزورہواس[6] کہا گیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے شہر آباد ہوئے۔ مثلاً ایری تھوسا[7] الرستن، جو دریائے عاصی کے کنارے حماۃ کے جنوب میں ہے اور سیرہوس[8] (قورس) جو حلب کے شمال میں ہے۔ ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ مقدونی الاصل[9] تھے۔ اکثر حالتوں میں بعض مقامی گاؤں یا قلعے یونانی و مقدونی شہروں کی شکل اختیار کر گئے۔

یونانی شہر پہلے سے بنے ہوئے نقشے کے مطابق تعمیر ہوتے تھے۔ ان میں تھیٹر، حمام، جمنیزیم، اجتماع گاہیں اور دوسری ضروری عمارتیں ہوتی تھیں، جن میں مختلف لوگ معاشرے کے ارکان کی حیثیت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے ان شہروں میں یونان کی شہری ریاستوں کی سیاسی تنظیمات برقرار رکھی جاتی تھیں، لیکن شہریوں کے لیے نشو و ارتقا کے مواقع بھی خاصے بہم پہنچائے جاتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم کا لاینفک جزو بنے رہیں۔ ان خصوصیتوں کے پیش نظر نئی آبادیاں پرانی سامی آبادیوں سے مختلف تھیں، اس لیے کہ سامی آبادیاں یا تو کسی قلعے کے اردگرد آباد ہوتیں یا کوئی چشمہ اور معبد ان کا مرکز ہوتا۔ پھر ان کے پھیلاؤ میں کوئی نقشہ پیش نظر نہ رکھا جاتا اور جمہوری طرز زندگی کے اظہار کے لیے بھی ان میں کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ شام میں شہروں کی تعداد پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔

شہروں میں نو آبادیاں

سلیوکیوں اور بطلیموسیوں کے ماتحت محض نئے شہروں کی ہی بنیاد نہ رکھی گئی بلکہ پرانے شہروں میں بھی نئی آبادیاں بنیں اور ان

---

[1] Posidonius

[2] Philoteria غالباً یہی مقام آج کل خربتہ کرک کہلاتا ہے جو بحیرۂ جلیل یعنی بحیرہ طبریہ کے جنوبی گوشے میں ہے۔

[3] Pella یہ مقدونیہ کا دار الحکومت تھا، جو سکندر کے باپ فلپ نے آباد کیا تھا۔ مقدونیوں نے ایک پیلا شام میں بنایا تھا۔ غالباً اس کو عربی میں فحل (بہ کسرہ فا) یا فحل (بہ ضمہ فا) کہنے لگے۔

[4] ڈیکاپولس کے لفظی معنی دس شہر کے ہیں

[5] Gerasa موجودہ جراش

[6] Chrysorrhoas یہ ایک ندی تھی جو پاس ہی سے نکلتی تھی۔

[7] Arethusa

[8] Cyrrhus

[9] مقدونی الاصل اس لیے کہا کہ ایری تھوسا ایک یونانی جزیرے کی پری کا نام تھا اور سروس مقدونیہ کا ایک شہر پیلا کے قریب تھا۔

کے سامی ناموں کے بجائے نئے نام رکھے گئے۔ عکا بطلیموس ثانی فلاڈلفیس (۲۸۵ ق م - ۲۴۷ ق م) کے ماتحت تالمائیس بن گیا اسی بادشاہ کے اعزاز میں ربہ عمون[1] کا نام فلاڈلفیا رکھا گیا۔ بیت شان (موجودہ بیسان) کا نام سقوپولس[2] تجویز ہوا۔ شمال میں بیروت کو دوسری صدی قبل مسیح میں لاذقیہ اور حماۃ کو اینٹیاکس رابع کے اعزاز میں "اپی فینیا[3]" بنا دیا گیا۔ اس کے پاس ہی ایک مقام شیزر تھا جس کا نام سسلی کے ایک شہر کے نام پر لاریسا[4] تجویز کر دیا گیا۔ اڈیسا نام کا ایک قصبہ مقدونیہ میں موجود تھا[5]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سکندر نے خود اسے مقدونی نوآبادی بنایا اور اس کا نام اینٹوکیہ کالیروہ رکھا۔ اینٹیاکس رابع نے اسے از سر نو آباد کیا اور اس کا نام انطاکیہ رکھا[6]۔ نصیبس (موجودہ نصیبین) اس شاہراہ پر واقع تھا جو شام سے دجلہ پار کے ملکوں کی طرف جاتی تھی۔ ایک کتبے کے مطابق اسے نکاتور نے بنایا تھا۔ جن شہروں میں یونانی نوآبادیاں قائم ہوئیں ان میں مقامی باشندوں کو وسیع قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دی گئی، حالانکہ نئی آبادیوں میں یہ دستور نہیں تھا۔ جن پرانے شہروں میں یونانی یا مقدونی نوآبادیاں بنی تھیں ان میں سے اکثر پہلی حالت پر چلے گئے۔

یہ امر دلچسپ اور قابل توجہ ہے کہ جن شہروں میں نوآبادیاں بنا کر نام بدلے گئے تھے ان میں سے اکثر نے اپنے یونانی نام بدل لیے، ساتھ ہی یونانیت کا معمولی سا چربہ بھی اتر گیا، ان کے سامی خصائص پھر ابھر آئے اور سامی نام بحال ہو گئے وہ اب انھیں ناموں سے معروف ہیں۔ بیرویا[7] آج حلب ہے۔ چالسس[8] نشیبی شام کا شہر ہے، یہ آج کل عنجر کہلاتا ہے۔ ایلیوتھروپولس[9] بیت جبرین ہے۔ طرابلس کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ شکیم کو شہنشاہ ٹائیٹس نے از سر نو تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام نیپولس (نیا شہر) رکھا تھا۔ اب وہ نابلس کہلاتا ہے۔ اسی طرح بہت سے اضلاع، پہاڑ اور دریا یونانی ناموں سے موسوم ہوتے تھے، اب سامی ناموں سے معروف ہیں۔

یونانی اور مقدونی آبادکاروں نے بہت سے فنی اور تعمیری، نیز دوسرے حضارتی عناصر کو رواج دیا تھا، وہ سب رائج رہے اور رومی دور میں نمایاں ہوئے۔ یونانیت کی بادشاہی تباہ ہو گئی لیکن اس کی حضارت تباہ نہ ہوئی۔ محراب اور محرابی چھت پہلے بھی موجود تھی، لیکن کارنتھ کا نمونہ آہستہ آہستہ عام ہو گیا۔ ہیرودیس کے خاندان نے رومیوں کے عہدِ حکومت میں جو معبد[10] اور حریم تعمیر کرائے ان میں یونانیت ہی کا انداز پیشِ نظر رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانیت کے جو باقیات شام میں موجود ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق رومیوں کے عہد سے ہے۔

---

1. Rabbath-Ammon اسی کا نام آج کل عمان ہے جو مملکت اردن کا مرکزِ حکومت ہے۔

2. Scythopolis یہ نام اس لیے پڑا کہ سیتھیوں کے گروہ ۶۲۷ ق م میں پہنچے اور شام کو خوب لوٹا۔

3. Epiphania

4. Larissa

5. Edessa مطلب یہ کہ اس نام کا ایک قصبہ یہاں بھی آباد کیا گیا۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور اسے الرہا کہتے ہیں۔

6. Antiochia Callirrhoe اس کی شکل رومی میں غالباً "اوعائی" تھی، عربی میں اسے الرّہا کہنے لگے۔ ترکوں نے بگاڑ کر اورفا بنا لیا۔

7. Beroea

8. Chalcis عنجر اصل میں عین الجر تھا۔

9. Eleutheropolis

10. اسے بیت جبریل بھی سمجھا جا سکتا ہے یہ غزہ یروشلم کی سڑک پر واقع ہے

یونانیت کے درجات

شام کے مختلف حصّوں میں یونانی محرکات کے درجے مختلف رہے۔ شمال میں محض شہر ہی نہیں بلکہ دوسرے مقامات کو بھی وطنی ناموں سے موسوم کر لیا گیا۔ مقامی دیوتاؤں کو بھی یونانی دیوتاؤں سے مشابہت دے کر نئے نام رکھ لیے گئے۔ بعل کو زیوس بنا لیا گیا۔ ہندی یورپی افسانوں اور اساطیر کو نئی سرزمین میں مقامی رنگ دے دیا گیا۔ انطاکیہ سے چار میل جنوب میں ایک تفریحی باغ دفنہ[1] کے نام سے موجود تھا۔ دراصل یہ ایک پری کا نام تھا جس کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ اپولو دیوتا نے اس کے جمال سے مسحور ہو کر پیچھا کیا۔ اس تعاقب سے بچنے کے لیے پری نے شجر کی شکل اختیار کر لی۔ اس پورے منظر کا تعلق عشقیہ سے تھا وہاں اپولو کا ایک معبد تھا جو درختوں کے ایک جھنڈ میں واقع تھا۔ دفنہ میں جو معبد تھا، وہاں پانی کی بھی کمی نہ تھی[2]۔ اس مقام کے لوگوں کے لیے پناہ کی جگہ بنا دیا گیا تھا۔ اہل انطاکیہ اور دوسرے شامی وہاں جمع ہو کر رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی شمالی شام نیا مقدونیہ بن گیا جہاں حملہ آور یونانی عنصر نے اسے وطنی رنگ میں رنگ لیا۔

اب فونیقی شہروں کی کیفیت پیش نظر لائیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان شہروں نے یونانی دنیا کے ساتھ اگر پہلے نہیں تو کم از کم گیارھویں صدی قبل مسیح میں ضرور تعلق پیدا کر لیا تھا۔ یونانیوں کی آمد تک فونیقی شہر اپنی قومی روح زائل کر چکے تھے۔ لہٰذا انہیں شامی ترکیب کا عمل پورا کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ صور، صیدا، ارواد، بیروت، ماناختوس نے ہچکچاہٹ کے بغیر ایسے سکے بنانے شروع کر دیے جن پر فونیقی افسانوں کے ساتھ یونانی افسانے بھی مضروب ہوتے تھے جو یونانیت فونیقی شام میں جڑ پکڑ گئی، اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور وہ آرامی شام کے مقابلے میں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں ایک تعلیم یافتہ فونیقی کو یونانی شہر میں قطعاً کوئی تکلف محسوس نہ ہوتا تھا اور بالکل یہی کیفیت ایک یونانی کو فونیقی بندرگاہوں میں پیش آتی تھی۔ صیدا اور صور، نیز انطاکیہ اور لاذقیہ میں یونانی فلسفے اور ادبیات کی نشو و نما سرگرمی سے جاری رہی۔ مسیحؑ سے پیشتر کی دو صدیوں میں جو ممتاز یونانی مصنف پیدا ہوئے۔ ان میں سے بعض صور اور صیدا ہی کے باشندے تھے۔ ان میں سے ایک زینو صیدائی تھا۔ وہ اپنے ہم نام زینو قبرصی کا استاد تھا (۳۳۴ ق م ۔ ۲۶۲ ق م) جس نے رواقی فلسفے کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ اس عہد کی سب سے بڑی تخلیق تھی۔ زینو قبرصی کا وطن سٹیوم[3] تھا۔ یہ ایک فونیقی نوآبادی تھی اور وہاں کے ممتاز فرزند زینو کو معاصرین فونیقی سمجھتے تھے "وہ اپنے عہد کا شریف ترین تھا"۔ قبرص سے ایتھنز چلا گیا اور وہاں کے رواقی رواق میں درس دیتا رہا (۲۶۲ ق م) وہ سکندر کے سپہ سالار اینٹی گونس کا دوست تھا، لیکن اس نے سیاسیات سے اپنا دامن بالکل آلودہ نہ کیا۔ اس کی وفات پر ایتھنز نے اعزاز کے سلسلے میں جو اعلان جاری کیا اس کے آخری الفاظ یہ تھے "اس نے اپنی زندگی کو سب کے لیے مثال اور نمونہ بنا دیا اور جن امور کی وہ تعلیم دیتا تھا، ان کی خود بھی پابندی کرتا تھا"۔

کسی شخص نے اس کی قبر پر جو شعر لکھے، ان میں یہ بھی تھے۔

---

[1] Daphne

[2] پانی کی افراط ہی کے باعث اس جگہ کا نام عربی میں بیت الماء مشہور ہوا۔

[3] Citium

اگر تیرا وطن فونیقیہ تھا

تو اس سے تجھے کیا نقصان پہنچتا ہے؟ کیا قدموس وہاں سے نہیں آیا تھا؟

جس نے یونان کو کتابیں دیں اور فنِ تحریر سکھایا؟

ایتھنز میں فلسفے کے ایک اور دبستان کا رئیس بھی فونیقی تھا یعنی ڈیوڈورس[1] جسے صور کا مشائی کہتے ہیں۔ یہ ۱۱۰ ق م تک بھی سرگرمِ عمل تھا۔ سسرو نے اپنے خطبات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اخلاقی اقوال سے ایک یہ تھا کہ سب سے بڑی نیکی وہ ہے جس میں نیکی اور حذفِ الم کا امتزاج ہو۔ اس فارمولے کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ڈیوڈورس نے رواقی اور لذتی فلسفے کے بنیادی نکتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔

عسقلان کا اینٹیاکس زیادہ مشہور فلسفی تھا جس نے افلاطونیوں اور رواقیوں کے نقطۂ نگاہ میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شام میں ایک اکادمی قائم کی تھی، پھر ایک اکادمی اسکندریہ میں اور مزید ایک ایتھنز میں بنائی۔ سسرو نے چھ مہینے تک اس کی ایتھینی اکادمی میں تعلیم پائی اور وہ اس کا ذکر محبت و احترام سے کرتا ہے۔ پلوٹارک کہتا ہے کہ وہ بڑا پرتاثیر اور زبردست خطیب تھا۔ سٹرابو عسقلان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اینٹیاکس کی پیدائش اس شہر کے لیے عزت و احترام کی دستاویز ہے۔

آرامیت کی بقا

یونانی زبان اور یونانی حضارت نے فاتح قوم کے ساتھ مل کر ایک نئی شان پیدا کر لی۔ یونانی ادبیات اور تہذیب کی برتری دونوں فریقوں کے نزدیک مسلم تھی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ یونانی مشرق محض ایک مصنوعی تخلیق تھی اس کے ہنگامے میں بعلیت اور یہودیت کی پرانی روایات قائم رہیں، بلکہ سلیوکیوں نے مقامی عبادات کو یونانی شکل میں اختیار کر لیا۔ ان میں سے اکثر مقامی دیوتاؤں کی عزت کرتے تھے ——— جب سلیوکس اول موزوں بندرگاہ کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا تو اس نے کوہ کاسیئس[2] کے زیوس کے لیے قربانی کی۔ یہ طوفان و رعد کا مقامی دیوتا تھا۔ مشہور ہے اس نے ایک عقاب بھیجا جس نے سلیوکس کو مناسب جگہ بتائی۔ سلیوکس کی بیوی نے بمبیس، ہیراپولس[3] (منبج) میں دیوی اتارغاتس کیلئے ایک معبد تعمیر کرایا تھا جہاں اس سامی دیوی کی عبادت ہوتی رہی۔ ببلوس کے اسرار افرودیت اور ایڈونیس سے وابستہ ہونے لگے لیکن اس کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مشرقی دنیا کو یونانیت کا رنگ دیا گیا بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یونانی دنیا پر مشرقیت کا رنگ چڑھایا گیا۔ آرامی بدستور لوگوں کی بولی رہی اور سامی طریقِ زندگی پر ان کا اعتقاد بدستور قائم رہا۔ حضرت مسیحؑ سے تین صدی بعد تدمر میں یونانی اور آرامی زبانیں پہلو بہ پہلو سرکاری طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ دورا یوروپس میں کتبوں کے لیے یونانی اور آرامی رسم الخط استعمال ہوئے۔ یونانی آبادکار رفتہ رفتہ جس پیمانے پر سامی زندگی سے متاثر ہوئے مقامی لوگ یونانی زندگی سے اتنے متاثر

---

[1] Diodorus

[2] Mount Casius

[3] Bambyce-Hierapolis

نہ ہو سکے۔ بعد کے بعض سلیوکی بادشاہوں نے آرامی لقب اختیار کر لیے۔ مثلاً سکندر اوّل (۱۵۰ ق م - ۱۴۶ ق م) نے بالاس[1] اور سکندر ثانی (۱۲۸ ق م - ۱۲۲ ق م) نے جو سلیوکی خاندان سے نہ تھا زبیناس[2] کا لقب اختیار کیا۔ آرامی، شام اور یہودی فلسطین میں مقامی حضارت بحیثیت مجموعی قائم رہی۔ اس نے اتنا قبول نہ کیا، جتنا دیا۔

تعلیم یافتہ شامی یونانی زبان کا مطالعہ کرنے لگے اور اسی زبان میں انہوں نے تصنیفات بھی کیں لیکن یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ گھروں میں یونانی زبان بولتے تھے، البتّہ یونانی نوآبادیوں کے باشندوں کی حالت دوسری تھی۔ جن پرانے شہروں میں نئی بستیاں بنی تھیں، ان میں دو زبانیں بولی جاتی تھیں، مگر ملک کے عوام نے اپنی بولی اور اپنے طور طریقے قائم رکھے۔ لوگوں کی اکثریت اس سے زیادہ یونانی نہیں بنی تھی، جتنی موجودہ زمانے میں فرانسیسی بنی۔ یونانیت نے جو اصلی کام کیا یہ تھا کہ خالص سامی سیاسی اور ذہنی نظام کا شیرازہ کھول دیا۔ اس طرح آگے چل کر رومی اثرات کے لیے دریچہ وا ہو گیا۔ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد از سرِ نو تنظیم و انضباط کا امکان پیدا ہوا۔

ادبی سرگرمیاں

سلیوکی شام کے آرامی ادبیات کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ نہ اس دَور کے آرامی سکّے دریافت ہوئے ہیں۔ یونانی شاعری کے سامنے دیسی ادبی سرگرمیاں اس لیے ماند پڑ گئیں کہ ان کا درجہ پستی میں صفر کے برابر پہنچ گیا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں بہت سے مصنّف گزرے، جن کے نام یونانی تھے اور وہ یونانی ہی میں لکھتے رہے، حالانکہ شامی الاصل تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں بہت سے مقالے اور دوسری تحریریں فرانسیسی زبان میں پیش نظر آئیں، جن کے لبنانی مصنفوں کے نام بھی فرانسیسی تھے۔ تاہم قریباً ناممکن تھا کہ اس کی عربیّت چھپ سکے۔ یہ سمجھ لینا بھی بالکل بجا ہے کہ آرامی زبان میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہوگا، لیکن وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ بعض عبرانی تصانیف کا بھی یہی حشر ہوتا لیکن خوش نصیبی سے انہیں کوئی یونانی مترجم مل گیا اور اب انہیں "صحائف محرفہ" کی حیثیت میں قبول کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے متعلق ہماری معلومات کا اہم ذریعہ مکابیّین اوّل ہے یہ کتاب (۱۰۵ ق م اور ۶۳ ق م) کے درمیان لکھی گئی اور عبرانی سے اسے یونانی میں منتقل کیا گیا۔ اخنوخ کی کتاب جسے جعلی سمجھا جاتا ہے، عبرانی یا آرامی میں لکھی گئی تھی اور یہی زمانہ اس کی تحریر کا ہے۔ مگر یہ پوری پوری صرف حبشی زبان میں قائم رہی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تمام آدمیوں کے لیے خلود ہے، حالانکہ پہلے خلود صرف راستبازوں کے لیے مقرر تھا۔ پھر جزا و سزا بھی ساتھ لگا دی گئی ہے یہ اسی عہد کا سب سے بڑا نظریہ ہے۔ اخنوخ میں جن مسائل پر بحث کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ راستباز کامیاب ہوں گے۔ اس نے یہودی اور یونانی قلوب پر گہرا اثر ڈالا۔ دو عبرانی کتابیں سلیوکیوں ہی کے عہد میں لکھی گئیں جنھیں دینی کتب کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ایک "واعظ" جو ۲۰۰ ق م کے آس پاس اپر طبقے کے ایک یونانیت مآب یہودی نے لکھی، دوسری کتاب دانی ایل جو مسیحؑ سے پیشتر دوسری صدی میں لکھی گئی۔ ان دو میں سے "واعظ" بہ لحاظِ فکر و نظر یونانیت سے قریب

---

[1] Balas معلوم ہوتا ہے یہ اصل میں بعلہ تھا جسے بعل کی کوئی شکل سمجھنا چاہیے۔

[2] Zahinas یہ اصل میں زبینا ہے۔ یہ معنی خرید کردہ۔ یہ نام عزرا (باب ۱۰، آیت ۴۳) میں بھی آتا ہے۔ غالباً ابتدا میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے خرید کیا۔

ہے۔

سلیوکی سلطنت کا کوئی حصّہ فن، ادب، یا سائنس کی تحقیقات کا حقیقی مرکز نہ بن سکا۔ سلیوکی بادشاہ علم وفضل کے کشادہ دل سرپرست نہ تھے۔ یہی کیفیت بطلیموسیوں کی تھی۔ صرف ایک بطلیموس اوّل کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے جو اسکندریہ کے شہرۂ آفاق کتب خانے اور عجائب خانے کا بانی تھا۔ مختلف مرکزوں میں کتب خانے قائم ہو چکے تھے اور ایک کتب خانہ انطاکیہ میں بھی تھا۔ مواصلات کی حالت سدھر گئی تھی، مشترکہ تہذیب پھیل رہی تھی اور ایک زبان رواج پا چکی تھی۔ ان حالات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر حکمرانوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا سامان ہوتا تو علم وفضل خوب اشاعت پاتے۔ مشرقی صوبوں میں صرف ایک نام قابل ذکر ہے اور وہ اس سلیوکس کا نام ہے جس نے دریائے دجلہ کے سلیوکیہ کی بنیاد رکھی۔ وہ اصل میں کلدانی تھا اور مسیحؑ سے پیشتر دوسری صدی میں گزرا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ سورج کائنات کا مرکز ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ایرسٹارکس[۱] کے نظریے کی پیروی کی اور اس کیلئے ثبوت بہم پہنچاتا رہا۔ سلیوکس نے سمندر کی لہروں کے مدوجزر کے لیے صحیح عملی ثبوت پیش کئے۔ جن کا ذکر پوسی ڈونیس شامی نے کیا ہے۔

پوسی ڈونیس

شام کے عہد یونانیت میں دو مورخ اور جغرافیہ دان، چند علمائے ہیئت اور تھوڑے سے شاعر پیدا ہوئے، جن میں سے کسی کو بھی پہلا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ نیز خاصی بڑی تعداد فلسفیوں کی تھی جن میں سے زیادہ تر کا تعلق رواقی دبستان سے تھا۔ یہ سب دوسری یا پہلی صدی قبل مسیحؑ میں پیدا ہوئے۔ رواقیت نے ابتدا ہی میں شامی تصوّریات سے گہرا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ شاخ فلسفہ سامیت سے متاثر یونانیوں یا یونانیت سے متاثر سامیوں کے نزدیک دل پسند رہی۔ اس میں مواخات، عالمی حکومت، نیکی اور پاکیزہ زندگی پر خاص زور دیا جاتا تھا اور جن چیزوں کا تعلق جسم سے تھا، یعنی قوت وضعف، صحت وبیماری، دولت وعزت وغیرہ ان سے بے توجہی برتی جاتی تھی۔ فلسفے کی یہ شاخ ایک لحاظ سے مسیحیت کی پیرو تھی۔ شامی مصنفوں میں ممتاز ترین فرد پوسی ڈونیس ساکن افامیا تھا۔ وہ رواقی فلسفی، مورخ اور عالم طبیعیات تھا۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف یہ تھی کہ پولیبس کی تاریخ کا ضمیمہ تیار کیا جو لیوی، سٹرابو، پلوٹارک اور دوسرے مورخوں کے لیے معلومات کا ذخیرہ بن گیا۔ اس نے ابتدائی دَور کے رومیوں کی تعلیم کے اہم کام میں حصّہ لیا اور آگسٹس کے عہد کی عظمت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

پوسی ڈونیس ۱۳۵ھ ق م میں پیدا ہوا۔ ایتھنز میں تعلیم پائی، اٹلی، گال، ہسپانیہ اور سسلی میں سیر وگردش کے بعد روڈز کی رواقی درس گاہ میں سر معلم بن گیا۔ وہیں ۵۱ھ ق م میں وفات پائی۔ اس کے درس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ مشہور رومی پمپی شام سے واپس ہوا تو صرف اس کا درس سننے کے لیے روڈز میں ٹھہرا۔ عظیم القدر سالار فلسفی کی قیام گاہ پر پہنچا تو اپنے تبردار کو ہدایت کر دی کہ دروازے پر دستک نہ دے اور اپنے تبر کو اس کے دروازے پر سرنگوں کر کے خراج عقیدت ادا کیا۔ سسرو بتاتا ہے کہ میں نے بھی پوسی ڈونیس کا درس سنا تھا۔ یونانیت کے عہد کا وہ سب سے بڑا عالم تھا جس پر روم کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ اس کی تصانیف سے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں سامی شہروں کے بالائی طبقے کی زندگی اور بعض طبی پیداواروں

---

[۱] Aristarchus

کی کیفیت بیان کی گئی ہے:

"وہاں بہت سے کلب تھے، جن میں لوگ مسلسل تفریح میں مشغول رہتے وہ ورزش گاہوں کو حمام کے طور پر استعمال کرتے۔ قیمتی تیل اور مرہم کی مالش کراتے۔ "درس گاہوں" (انہوں نے یہی نام تجویز کر رکھا تھا) کو اپنے ارکان کی طعام گاہوں کے لئے استعمال کرتے، گویا وہ ان کے اپنے مکان تھے۔ دن کا زیادہ وقت شراب پینے اور کھانے کھانے میں گزارتے، بلکہ خاصی مقدار ساتھ بھی لے جاتے، اس اثنا میں ساز خوب زور سے بج رہے ہوتے اور ان کے شور سے شہروں کے در و دیوار گونجتے رہتے۔"

"عرب میں پر سیہ[1] اور پستہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ پستے کی شکل و صورت انگور کی سی ہوتی ہے اور چھلکا سفید ہوتا ہے۔ عام وضع ذرا بیضوی ہوتی ہے گویا اسے آنسو سے مشابہ سمجھنا چاہیے۔ انگور کے خوشوں کی طرح اس کے دانے بھی گچھوں کی صورت میں لگتے ہیں، چھلکے کے اندر اصل پستہ زردی مائل سبز ہوتا ہے۔ اس کا ذائقہ چلغوزے جیسا خوش گوار نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے[2]۔"

شامی یونانی شاعر

شام کی یونانی شاعری میں اگرچہ نمایاں جدت نہیں ملتی تاہم اس میں تنوع خاصا پایا جاتا ہے، نیز جمالِ فطرت کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ تخیل اور رنگ کی افراط دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی مزاج کا بھی اچھا ذوق نمایاں ہے۔ بہت سے شاعر ارتجال اور لطیفہ گوئی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ صیدا کا اینٹی پیٹر[3] اصل میں صور کا باشندہ تھا، وہ حضرت مسیحؑ سے پیشتر کی صدی کے اوائل میں گزرا ہے۔ تذکاری اشعار اور لوح مزار کے اشعار خوب لکھتا تھا۔ اس کے مندرجہ ذیل جوش انگیز اشعار ایک فونیقی بندرگاہ میں قیام کی یاد کا مرقع ہیں:

"وقت آگیا ہے کہ جہاز تیزی سے روانہ ہو۔ سمندر کے سینے کے ساتھ
کوئی ظلمت افروز طوفان، شکن نما لہریں چمٹائے ہوئے نہیں۔
چھت کے نیچے ابابیل گھونسلا بنا رہی ہے۔
مرغزاروں میں نرم و نازک پتے مصروفِ تبسم ہیں۔

---

[1] ایک خاص پھل والا پودا ہے، اس کا پھل مقدس سمجھا جاتا ہے

[2] بوشیئر Bouchier ص ۲۰۲۔

[3] Antipater

ملاحو! اپنی زنجیریں، جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں، اوپر کھینچ لو
اپنے لنگر جو ریت میں دبے ہوئے ہیں، اٹھا لو
اپنے عمدہ بنے ہوئے بادبان میری صدا پر پھیلا دو
باخوس کے فرزند! بندرگاہ کے مالک کا یہی فرمان ہے۔[1]

اینٹی پیٹر فکر و نظر اور فلسفے کے اعتبار سے لذّتی تھا وہ کہتا ہے :

"جن آدمیوں کو نجوم میں دسترس حاصل ہے وہ کہتے ہیں تیری عمر تھوڑی ہے بلاشبہ
سلیوکس[2]! یہ درست ہے، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ عالم اسفل کا ایک ہی
راستہ ہے، جس پر سب چلے جا رہے ہیں۔ اگر میں جلد پہنچ جاؤں گا تو نتیجہ یہ
ہوگا کہ میں مینوس[3] سے جلد مل لوں گا۔ آؤ شراب پییں۔ حق یہ ہے کہ شراب
اس راستے کے لیے گھوڑے کی سواری ہے اور پیدل چلنے والے عالم اسفل کی
پگ ڈنڈی پر چلتے ہیں۔"[4]

فلودیمس[5] ایک اور لذّتی شاعر ہے، جو مسیح سے پیشتر کی صدی میں بہ مقام جدرہ[6] پیدا ہوا۔ جدرہ ایک مقدونوی نوآبادی تھی، جو ماورائے اردن کے نیم خانہ بدوشوں کے درمیان ایک بلند جگہ پر دریائے ہیرومیکس[7] کے کنارے بسائی گئی تھی۔ یہ مقام بحیرۂ جلیل (طبریہ) کے جنوبی حصّے میں ہے۔ فلودیمس سسرو کے زمانے میں روم چلا گیا تھا اور وہیں آباد ہو گیا تھا۔ سسرو نے گرم جوشی سے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کے جو اشعار باقی رہ گئے ہیں وہ ہلکے پھلکے اور تغزّل کے انداز کے ہیں، اس سے سسرو کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ فلودیمس فکر و نظر کے اعتبار سے آزاد و لاابالی تھا۔ لیکن اس کی شعر گوئی کا اسلوب بہت عمدہ تھا۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

میں ڈیموساکن باخوس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں، پھر

---

[1] بوشنر ص ۱۰۳ - ۱۰۴، نیز Greek Anthology

[2] Seleucus اشارہ بہ ظاہر سیلیوکس کلدانی کی طرف ہے، جو نجومی اور ہیئت دان بھی تھا۔

[3] Minos یہ کریٹ کا بادشاہ اور قانون ساز تھا اور افسانوی روایات کے مطابق مرنے کے بعد عالم اسفل کی تاریکیوں کے قاضیوں (جوی) میں شامل ہو گیا۔

[4] Greek Anthology [5] Philodemus

[6] Gadara اس کے لیے ملاحظہ ہو جوزیفس۔ یہ مقام یعنی جدرہ موجودہ کے قریب ہے۔ مرقس (باب ۵ آیت ۱) اور لوقا (باب ۸، آیات ۲۶ - ۳۷) میں بھی اس کے باشندوں کا ذکر آیا ہے اور تراجم میں انہیں "گراسینی" لکھا ہے۔

[7] Hieromax یہ نام بعد میں "یرموک" بن گیا جس کے قریب عربوں اور رومیوں کے درمیان دنیا کی ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی اور چھبیس ہزار مسلمانوں نے ڈیڑھ دو لاکھ کے رومی لشکر پر فتح پائی۔ یہ جنگ بالعموم جنگِ یرموک ہی کہلاتی ہے۔

مجھے ساموس کی دیمو سے الفت ہو گئی۔ خیر یہ بھی کوئی ایسی بات نہ تھی بعد میں ملکوس کی دیمو کے دام عشق میں پھنس گیا۔ اب معاملہ مذاق کی حد سے گزر چکا تھا۔ ایک قدم اور آگے بڑھا تو آرگوس کی دیمو نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ مقدر نے میرا نام "فلودیم" رکھا، یعنی محب عوام، یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر وقت کسی نہ کسی دیمو کی آرزو پریشان کرتی رہتی ہے۔[1]

ملیاغر

اس غیر شاعرانہ ماحول کا سب سے بڑھ کر دلچسپ شاعر ملیاغر[2] ساکن جدرہ تھا۔ وہ قومی لحاظ سے شامی تھا۔ گھر میں غالباً آرامی زبان بولتا تھا۔ اس کے علاوہ فونیقی اور یونانی بھی جانتا تھا۔ اس عہد کے دوسرے شامی اہل قلم کی طرح اسے بھی روزگار کی تلاش میں وطن سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ وہ بیس سال کا تھا (۱۱۵ ق م کے آس پاس) جب جدرہ سے نقل مکان کر کے صور چلا گیا۔ ہمیں اس کے اشعار سے صور شہر کی اندرونی زندگی کے متعلق کہیں کہیں جھلک ملتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے میں صور کی زندگی عیش و نشاط سے لبریز ہو گی، گویّے اور ساز نواز عام تھے، شراب بکثرت پی جاتی تھی۔ امیر آدمیوں کی بیگمات ایک لحاظ سے پردے میں رہتی تھیں۔ جب وہ بازاروں میں نکلتیں تو ان کے ساتھ خدّام ہوتے۔ پھر ملیاغر صور سے جزیرۂ کوس چلا گیا۔ وہاں اس نے گزرے ہوئے شعرا کی منتخب نظمیں مرتب کیں اور اس مجموعے کا نام "الکلیل" رکھا۔ ان میں سے ہر نظم کو اس نے کسی خوبصورت پھول یا خوشنما شجر سے تشبیہ دی ایک اور چھوٹی سی نظم میں وہ سات لڑکوں کا ذکر کرتا ہے، جو صوری تھے اور ان سے وہ خود واقف تھا۔ پھر انہیں تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے، ایک سوسن ہے، ایک خوشبو سفید بنفشہ ہے، ایک گلاب ہے، ایک انگور ہے، ایک شگوفہ ہے، ایک سنہری زلفوں والا زعفران ہے، ایک صعتر کی شاخ ہے، ایک سدا بہار زیتون کا شگوفہ ہے۔

یہ اشعار ملیاغر نے لوح مزار کے لیے کہے:

۱۔ "صور میری دایہ تھا اور جدرہ نے، جو اصلاً اٹیکی ہے اور شام میں واقع ہے مجھے جنم دیا، میں ملیاغر یوکریٹس سے پیدا ہوا ہوں، شعر کی دیویوں کی معاونت سے میں مینی پوس[3] کی عروسوں کا مقابلہ کرتا ہوں، اگر میں شامی ہوں تو مضائقہ؟ اجنبی! ہم ایک مقام پر رہتے ہیں اور وہ دنیا ہے۔ ایک ہنگامے نے ہم سب فانی انسانوں کو جنم دے دیا۔"[4]

---

[1] Greek Anthology [2] Meleager

[3] Menippus جدرہ کا ایک ہجو گو شاعر تھا جو ۲۸۰ ق م کے آس پاس مشہور ہوا وہ پہلے غلام تھا بعد میں وہ فلسفے کے اس دبستان سے متعلق ہو گیا جسے عام طور پر کلبی دبستان کہتے ہیں وہ انسانوں کی خصوصاً فلسفیوں کی حماقتوں پر تعریض آمیز انداز میں نکتہ چینی کرتا ہے۔ لوسیان نے اس کی ہجویہ نظموں سے بہت اقتباسات پیش کیے ہیں اس نے بڑی عمدہ مقفیٰ نثر لکھی اور اس میں جا بجا اشعار درج کیے" اس صورت حال کو دیکھ کر الحریری کے مقامات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

[4] Greek Anthology

۲۔ اجنبی، یہاں سے چلتے وقت آواز نہ نکلے، چپ چاپ چلا جا۔ پیر تقویٰ شعار اموات کے درمیان سو رہا ہے وہ اس خواب میں لپٹا ہوا ہے، جو سب کے حصّے میں آنے والا ہے۔ میں یوکریٹس کا بیٹا ملیاغر ہوں جس نے عشق و محبت کی حسین اور شک آور دیوی کا رشتہ شعر کی دیوی اور عروسوں سے جوڑ دیا، آسمان زاصور اور جدرہ کے مقدس خطے نے اس کی پرورش کی اور پروان چڑھایا۔ محبوب جزیرہ کوس نے بڑھاپے میں اسکی خبر گیری کی۔ اگر تو شامی ہے تو اسلام قبول کر، اگر تو فونیقی ہے تو میں تجھے "نائی دیوس" کہتا ہوں[۱] اور اگر تو یونانی ہے تو تیرے لیے میری زبان پر "کیرے"[۲] ہے، تو بھی اسی طرح جواب دے[۳]۔

۱؎ Naidius فونیقی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "خوش آمدید"، "مرحبا"۔

۲؎ Chaire یہ یونانی لفظ ہے اس کے معنی خوش آمدید اور اسلام کے ہیں

۳؎ Greek Anthology

انیسواں باب

سیلوکی ادارے

بادشاہی

سیلوکی مملکت کے سیاسی اداروں میں یونانی و مقدونی اور شامی و ایرانی عناصر کی عجیب و غریب آمیزش تھی، ایرانی عنصر کو تمام دوسرے عناصر پر غلبہ حاصل تھا۔ حکومت کا رئیس اعلیٰ خود بادشاہ تھا اور اسے مطلق العنانی کے اختیارات حاصل تھے۔ دراصل وہی مملکت تھا۔ تمام اختیارات اسی سے صادر ہوتے تھے وہ اپنی خوشی کے مطابق ملازم رکھتا تھا اور جب چاہتا تھا، انہیں برطرف کر دیتا تھا۔ اس کی فرمانروائی شخصی و خاندانی تھی اور اس کی بنیاد فتح و تسخیر اور جانشینی کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کے ارد گرد تقدس کا ایک ہالہ موجود تھا۔ یہ سکندر اور مشرقی بادشاہوں سے حاصل ہوا تھا۔ بانی خاندان کی نسل کے آسمانی ہونے کا ایک اعلان "ہاتف غیبی" کی طرف سے ہو چکا تھا اور عوام نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے جانشینوں کے ماتحت یہ شاہی القاب کا جزو بن گیا۔ غیر یونانی دیسی آبادی نے ایسی روش اختیار کر لی تھی۔ جس کے بیان بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے چپ چاپ قبول کر لینا قرار دیا جائے۔

قصر شاہی کے نظام میں قرمز و طلا کی نمائش بہت تھی، حاجب اور خواجہ سرا خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ان تمام چیزوں میں مغربیت کے بجائے مشرقیت زیادہ نمایاں تھی۔ رسمی تقریبات میں بادشاہ تاج پہ رکھتا تھا۔ اس لیے کہ یہ بادشاہی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ سکوں پر جو صورتیں منقش ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج دراصل ایک زریں پٹی ہوتی تھی۔ علاوہ بریں خاتم بھی شاہی نشان تھی۔[1] سلوکس کی خاتم پہ ایک لنگر کی شکل منقش تھی، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا سبب کیا تھا۔[2] اس کے سکوں اور وزنوں پہ بھی یہی صورت بنی ہوئی تھی۔ باقی رہا شاہی لباس تو اس کی وضع قطع مقدونیہ کے قومی لباس کی تھی تاہم اس میں بہت شکوہ پیدا کر لیا گیا تھا اور اس کا رنگ ارغوانی ہوتا تھا۔ ارغوانی رنگ کا لباس بادشاہ اور کاہن اعظم کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔[3]

شاہی دعوتوں میں بڑی شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کیے جاتے تھے۔ اعلیٰ درجے کی شرابیں رکھی جاتیں، ساز بجتے۔ مُر اور دوسری مشرقی خوشبوؤں کی افراط ہوتی۔ پوسی ڈونس نے ایسی بعض استقبالی محفلوں کی تصویریں چھوڑی ہیں۔[4] جو دفنہ میں کھیلوں کے موقع پر انطیاکس سابع سائڈیٹس (۱۳۷ء ق،م تا ۱۲۸ء ق،م) نے ترتیب دی تھیں

---

[1] مکابیین اول باب ۶، آیت ۱۵ [2] اپیئن

[3] مکابیین اول باب ۱۰، آیت ۲۰، باب ۱۱، آیت ۵۸، پولی بئس کتاب ۷، ۲ باب اول

[4] ایتھنائیوس (Athenaeus) کتاب ۱۲ باب ۵۴۰ [5] Antiochus VIII Grypus

ہمیں بتایا گیا ہے کہ بادشاہ ان محفلوں میں شریک ہونے والے ہر مہمان کے لیے بری اور بحری جانوروں کے گوشت کی اتنی بڑی مقدار مہیا کر دیتا کہ چھکڑا بھر جاتا۔ اس کے علاوہ شہد کے چھتے، مرکے اکلیل، خوشبوئیں اور دوسری چیزیں خاصی مقدار میں ہوتیں۔ اینٹیاکس ثامن گریپس[1] (خم دار ناک والا ۱۲۵ ق،م - ۹۶ ق،م) کا طریقہ یہ تھا کہ دعوتوں کے موقع پر کھانا کھانے والوں کو زندہ بطخیں، خرگوش، غزال، نیز سنہری ہار، چاندی کے ظروف، غلام، گھوڑے اور اونٹ دیتا، ہر شخص اونٹ پر سوار ہو کر بادشاہ کا جام صحت نوش کرتا اور سب چیزیں، جن میں غلام بھی شامل ہوتے، ساتھ لے جاتا۔ دعوتوں کے علاوہ شکار اور سواری بادشاہوں کی خاص تفریحات تھیں۔

دربار

درباری لوگ بادشاہ کے ارد گرد جمع رہتے۔ دربار کی زبان یقیناً یونانی تھی۔ یہ غیر اغلب ہے کہ سلیوکس بادشاہوں کو اپنی رعایا میں سے کسی کی مادری زبان آتی تھی۔ ابتدائے عمر ہی میں شہزادوں کو تعلیم کی غرض سے ایتھنز یا روم بھیج دیا جاتا۔ دربار میں سب سے بڑا عہدہ "وزیر معاملات" کا تھا اور اسے ایرانیوں کے منصب وزارت کے برابر سمجھنا چاہیے، اس طبقے میں عدالتِ شاہی کا رئیس، وزیر مال، معتمد مال، فوج کا سالارِ اعلیٰ اور رئیس الاطبا شامل تھے۔ صوبوں کے حاکموں کو مرزبان کہا جاتا تھا۔ ان کے ماتحت ضلعوں کے حاکم، سیکرٹری اور محاصل کے نگران (تحصیلدار) ہوتے تھے۔ وزیر مال کا عہدہ بہت مرغوب سمجھا جاتا تھا[2]۔

مقدونی امرا اپنے آبائی وطن سے باہر نکل کر نئی سرزمین میں جاگیریں ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ نئے امرا بھی شامل ہو گئے تھے جنہیں بادشاہ کی نگاہِ التفات نے بلند درجے پر پہنچا دیا تھا۔ اس لیے مقدونی امرا اپنے وطن کی طرح، بادشاہی اختیارات کے لیے تھوڑی بہت روک نہیں بن سکتے تھے۔ شاہی محل کی عورتیں بھی بعض اوقات جھگڑے میں شریک ہو جاتیں اور اختیارات حاصل کرنے کے لیے سازشوں میں لگ جاتیں۔ سلیوکی اور بطلیموسی بادشاہ غالباً سکندر کے جانشینوں کی ابتدائی نسل کے بعد، عام طور پر ایک ہی شادی کرتے تھے، لیکن وہ خواصیں رکھ لیتے تھے۔ اینٹیاکس رابع نے اپنی ایک خواص کو طرسوس میں، نیز سلیشیا کے ایک اور شہر میں شاہی اختیارات دے دیے، جس سے عوام میں بڑی بددلی پھیلی[3]۔ دونوں حکمران خاندانوں کے بادشاہ (سلیوکی اور بطلیموسی) اپنی بہنوں سے بھی شادیاں کر لیتے تھے۔ یہ وہی دستور تھا، جس پر مصر کے فرعون اور ایران کے شہنشاہ بھی کاربند تھے۔ شاہی خاندان کے افراد اور امرا غلام بہ کثرت رکھتے تھے۔ یونانیت کے معاشرے میں ہر جگہ غلاموں کی کثرت رہی، خسیوں کی عموماً قلت تھی[4]۔

فوج

فوج اور بحری قوت ہر حال میں بادشاہ کے تابع رہتی۔ سلیوکی فوج کو معاملات حکومت میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ سلیوکس اوّل نے جب اپنے بیٹے اور جانشین اینٹیاکس اوّل کی شادی اس کی علاتی ماں سے کی تو ضروری سمجھا کہ فوج کی رضامندی حاصل کر لے۔ اسی طرح اس نے بعض صوبوں کا انتظام سپرد کرتے وقت اہل فوج سے رائے لی[5]۔ فوج ابتدائی مراحل میں مملکت کے تمام مقدونیوں اور

ے۱ Antiochus VII Sidetes

ے۲ تفصیلات کے لیے ایپٹن کی کتاب ملاحظہ فرمائیے۔

ے۳ مکابیین دوم باب ۴، آیت ۳۰،

ے۴ دربار اور اس کے طور طریقوں کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے۔ ای۔ بکر مین (E. Bikerman) کی فرانسیسی کتاب ص ۳۱-۵۰۔ ے۵ ایپٹن۔ ے۶ پولی بئس کتاب پنجم باب ۵۶۔

یونانیوں پر مشتمل تھی اور یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا، جس سے کام لے کر لوگ بلند مرتبے پر پہنچ سکتے تھے۔ فوج کا اصل مرکز افامیا تھا، لیکن شاہی محافظ فوج کا ایک جیش انطاکیہ میں بھی رہتا تھا۔ رافیا کی لڑائی میں جو ۲۱۷ء ق،م میں ہوئی، اینٹیاکس ثالث کی فوج میں بیس ہزار یورپی آباد کار تھے، ان کے ساتھ مختلف قوموں میں سے چنے ہوئے دس ہزار جنگجو، نیز دس ہزار عرب اور دوسرے اہل قبائل تھے۔ علاوہ بریں تنخواہ داروں کا بھی خاص بڑا گروہ تھا، اس طرح پوری فوج میں باسٹھ ہزار پیادے اور چھ ہزار سوار ہو گئے تھے[1]۔ رسالے کا درجہ پیادہ فوج سے بلند تھا اور رسالے والوں کو تنخواہ بھی زیادہ ملتی تھی۔

فوج کی روح پیادوں کی خاص صفیں تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر یونانی اور مقدونی آباد کار بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کی تعداد مختلف اوقات میں مختلف رہی۔ میگنیزیا کی جنگ (۱۹۰ء ق،م) میں ان صفوں کی تعداد سولہ ہزار تھی[2]۔ ان سپاہیوں کے پاس تلواروں کے علاوہ اکیس اکیس فٹ لمبے برچھے ہوتے تھے، نیز سروں پر خود اور ڈھالیں ہوتی تھیں۔ یونانیوں اور مقدونیوں کا قومی ہتھیار برچھا تھا نہ کہ تلوار اور برچھا ہی آخر تک ان کا سب سے بڑا ہتھیار رہا۔ دور سے اسلحہ پھینکنے والوں میں تیر انداز بھی تھے — نیزہ انداز بھی اور گوپیا چلانے والے بھی۔ یہ لوگ عموماً آبادی کے غیر یونانی عناصر سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ یونانیوں کے توپخانے میں منجنیقیں شامل تھیں۔ ان کی وجہ سے محاصرے کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہوا اور شہروں کی حفاظت کے لیے بھی نئی تدبیریں سوچی گئیں۔ رافیا کی جنگ میں دو ہزار ایرانی اور کرد تیر اندازوں نے حصہ لیا۔ میگنیزیا کی لڑائی میں کوئی ایک ہزار مادی (اہل میڈیا) سوار اور شاہی رسالے کے ایک ہزار آدمی شریک تھے۔ ان میں سے زیادہ تر شامی تھے۔ عرب تیر انداز سانڈنیوں پر سوار ہو کر رسالے کے آگے رہتے۔ ان کے پاس چار چار ہاتھ لمبی سبک تلواریں ہوتیں، تاکہ وہ بلندی سے دشمن پر بہ آسانی وار کر سکیں[3]۔

جنگی ہاتھی

مغربی ایشیا میں اونٹ اور گھوڑے کو جنگ کے لیے استعمال کرنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری تھا، لیکن سلیوکی فوج میں جنگی ہاتھیوں کا شمول ایک نیا عنصر تھا۔ یہ جانور سلیوکیوں کا خاص نشان بن گیا، جیسا کہ سکوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ افامیا کی لشکرگاہ میں ہاتھی رکھے جاتے تھے۔ انہیں جنگ کے لیے سدھانے کا کام بہ ظاہر ہندوستانیوں کے ذمے تھا۔ صرف شامی بادشاہ ہندوستان سے ہاتھی حاصل کر سکتے تھے۔ مصر کے فرعون جنگ کے لیے افریقہ کے ہاتھی استعمال کرتے تھے۔ ۲۷۳ء ق،م میں باختر کے حاکم نے بیس ہاتھی اینٹیاکس ثالث کے پاس بھیجے، جن سے مصر کے خلاف کام لیا گیا۔ میگنیزیا اور رافیا کی لڑائیوں میں ہندوستانی اور افریقی ہاتھیوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ دونوں موقعوں پر ہندوستانی ہاتھی جیت گئے۔ لیکن وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی ہاتھیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان لڑائیوں سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً صحیح نہیں ہوگا کہ ہندوستانی ہاتھی افریقی ہاتھیوں سے زیادہ طاقت ور تھے۔ رافیا کی جنگ میں اینٹیاکس کے پاس ایک سو دو ہاتھی تھے[4]۔ سلیوس اول نے اپسوس کی لڑائی

---

[1] پولی بئس کتاب پنجم باب ۷۹

[2] اپیئن

[3] لیوی کتاب، ۳ باب ۴۰

[4] پولی بئس کتاب ۵، باب ۷۹۔

(۳۰۱ ق م) میں چار سو اسی ہاتھی استعمال کیے۔ زیادہ تر اسی وجہ سے اسے کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ایشیائی علاقوں کا مالک بن گیا۔ مجموعی طور پر سلیوکیوں کے پاس قریباً پانسو ہاتھی تھے۔[1]

میدانِ جنگ میں ہندوستانی مہاوت ہاتھی کی گردن پر بیٹھتا۔ ہاتھی کی پشت پر لکڑی کا ایک برج رکھا جاتا جس میں چار جنگجو بٹھائے جاتے تھے۔[2] اس جنگجو حیوان کا نظارہ یقیناً بڑا ہیبت انگیز ہوگا۔ ایک یہودی نے مکابیوں کی ایک جنگ میں ہاتھیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی پیٹھ پر برج لدے ہوتے تھے اور برج میں بتیس آدمی بیٹھتے تھے۔[3] وہ یہودی بتاتا ہے کہ ہاتھیوں کو انگور اور توت کا خون نما رس دکھا کر جنگ کے لیے برانگیختہ کیا جاتا تھا۔[4]

میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کے جیش کی کمان ایک خاص افسر کے حوالے کی جاتی تھی۔[5] وہ ہاتھیوں کو نہ صرف ہاتھیوں سے لڑاتا تھا۔ جیسا کہ رافیا کی جنگ میں ہوا، بلکہ انہیں رسالے کی نقل و حرکت کے لیے پردے کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا، جیسا کہ اپسوس کی جنگ میں کیا گیا سیلیوکی ہاتھیوں سے بظاہر یہی ضروری کام لیتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں مستحکم مقامات کی شکست و ریخت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے ہاتھیوں کو عہد قدیم کے ٹینک سمجھنا چاہیے۔[6] دشمن کی پیادہ فوج کو پہلی مرتبہ ہاتھیوں کی فوج سے سابقہ پڑتا تو وہ حملہ دشمن کے لیے مہلک ثابت ہوتا، لیکن تجربہ کار پیادہ فوج ہاتھیوں کے حملے سے زیادہ متاثر نہ ہوتی۔

۱۶۳ ق م میں رومیوں کو اطلاع ملی کہ شام میں جنگی ہاتھی بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک مشن بھیج دیا تاکہ ہاتھی مار دیے جائیں۔ اس کم یاب اور پالتو جانور کے ناحق مارے جانے پر لاذقیہ کے ایک باشندے کو اتنا غصہ آیا کہ جب مشن کا رئیس شہر کے جمنیزیم میں مالش کرا رہا تھا۔ اس نے اسے خنجر مار کر ہلاک کر ڈالا۔[7] اس سے کچھ عرصہ بعد سلیوکیوں کو بطلیموسیوں کے ہاتھی مل گئے۔ پھر ان کا ذکر کہیں نہ آیا۔ سکندر کی وفات سے مندرجۂ بالا واقعے تک کی درمیانی مدت میں ہاتھیوں نے مغربی ایشیا کی جنگوں میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

بیڑا

جس رومی مشن کو ہاتھیوں کی بربادی کے لیے بھیجا گیا تھا، اس کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا تھا کہ سیلیوکی بیڑے کو جلا دے، اس لیے کہ اینٹیاکس ثالث کو معاہدۂ صلح کے مطابق جتنے جہاز رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، ان سے تعداد بڑھالی گئی تھی۔ بلاشبہ بیڑے نے ان جنگوں میں کوئی اہم حصہ نہ لیا، جن کی تفصیلات ہمیں معلوم ہو سکی ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیڑا خاصا پریشان کُن عنصر ہوگا۔ اسی لیے معاہدے میں اس کا ذکر آیا۔ جہازوں کی تعداد اور ایشیائی سمندروں میں اس کی سرگرمیوں کا دائرہ محدود رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ بیڑے کا ایک چھوٹا سا حصہ غالباً خلیج فارس میں رکھا جاتا تھا۔[8] مجموعی طور پر بحری قوت کا وظیفہ یہ تھا کہ فوج کے ساتھ تعاون کرے اور فوجی نقل و حرکت کی حفاظت کا فرض انجام دے۔ بحری فوج کے زیادہ تر افراد یقیناً فونیقی ہوں گے۔

۱۔ سٹرابو کتاب نمبر ۱۶ باب ۲

۲۔ لیوی کتاب نمبر ۳۷ باب ۴۰

۳۔ مکابین اول باب ۶ آیت ۳۷

۴۔ ایضاً ایضاً آیت ۳۴

۵۔ ایڈیٹن

۶۔ Hellenistic Military and Naval Developments

۷۔ ایڈیٹن۔

۸۔ پولی بیئس کتاب نمبر ۱۳ باب ۹۔

یہ جہاز پنج قطاری ہوتے تھے۔ اس لیے کہ ایسے ہی جہازوں نے سہ قطاری جہازوں کی جگہ لے لی تھی، جو زیادہ طاقت ور نہیں سمجھے جاتے تھے۔ نئے جہاز غالباً فونیقیہ یا قبرص میں سکندر کی وفات سے تھوڑی دیر بعد ایجاد ہوئے تھے۔[1] یہ جہاز چپوؤں کی واحد قطار کے ذریعے سے کھیئے جاتے تھے اور ہر چپو کے لیے پانچ آدمی ہوتے تھے۔ ان کے اوپر ایک عرشہ ہوتا جس میں فوجیں سوار ہوتیں۔ ان کی حفاظت کے لیے عرشے پر لکڑی کے برج بنا دیئے جاتے۔ ان جہازوں کو دشمن کے جہازوں سے بھڑا دینے کا کام بھی لیا جاتا۔ اس فن میں فونیقی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

صوبوں کا نظام حکومت

سلیوسی مملکت نے فوجی تنظیم کی یکسانی اور صوبوں کے انتظامات کی یک جہتی زیادہ تر ایرانیوں سے میراث میں لی، ہمیں صوبائی حکومتوں کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ حکمرانی کا پرانا نظام قائم رکھا گیا ہوگا۔ انتظامی حلقوں میں ایرانی مصطلحات بھی بدستور باقی رہیں۔ اپیین نے لکھا ہے کہ سلیوکس اوّل کے ماتحت بہتر مرزبان تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تعداد میں غالباً چھوٹے حلقے بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ پوسی ڈونیس[2] کا بیان ہے کہ شام میں آٹھ مرزبان تھے، چار شمالی حصے میں اور چار جنوبی حصے میں۔ شمالی صوبے چار نوآبادیوں کے گرد قائم تھے، یعنی انطاکیہ، سلیوکیہ، افامیا اور لاذقیہ، دمشق اور لبنان کو شاید فونیقیہ میں ملا کر جنوبی شام کا پہلا صوبہ بنایا گیا تھا۔ سامریہ اور جلیل کو ساحلی علاقے سے ملا کر دوسرا صوبہ قرار دیا گیا تھا۔ شرقِ اردن اور ادومیا باقی دو صوبے تھے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، یہودیہ زیادہ تر مدت کے لئے سلیوکیوں کے ماتحت ایک خراج گزار کاہنی ریاست بنا رہا ہر صوبے کو انتظامی لحاظ سے ضلعوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور ہر ضلع کا الگ حاکم مقرر ہوتا تھا۔ ان انتظامی حلقوں کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ غالباً یہ حلقے وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے۔ شاہی دار الضرب انطاکیہ میں تھا، لیکن صور، صیدا، ارواد اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی چھوٹے دار الضرب موجود تھے۔

شہر

یونانی و مقدونی نوآبادیاں قدیم خود مختار شہری ریاستوں کے اصول پر قائم کی گئی تھیں۔ جن شہروں پر یونانیت کا رنگ چڑھ چکا تھا وہ شہری ریاستوں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان سے محاصل وصول کیے جاتے، نیز وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے شاہی فرمانوں کی اطاعت ان کے لیے ضروری ہوتی۔ باقی داخلی انتظامی معاملات میں وہ خود مختار ہوتے، جن شہروں پر خاص نظر عنایت ہوتی، انہیں آس پاس کے علاقوں کا انتظام بھی سونپ دیا جاتا۔ انطاکیہ کے باشندے یونانیوں کی حیثیت میں ووٹ دیتے تھے، نیز انہیں شہنشاہی عسکری مجلس میں ووٹ دینے کا حق غالباً حاصل تھا۔ یونانی شہروں کی تعمیری خصوصیت یہ تھی کہ ان کی گلیاں سیدھی رکھی جاتیں۔ تمام گلیاں ایک دوسری کو زاویہ قائمہ میں قطع کرتیں۔ کسی بلند مقام سے شہر کی آبادی پر نظر ڈالی جاتی تو وہ شطرنج کی بساط معلوم ہوتیں۔ عام نمونہ یونانی شہروں کا سا تھا، یعنی بیچ میں عام چوک اور اس کے پاس معبد۔ دُورا یوروپس کا عام چوک اٹھائیس ہزار اناسی مربع گز تھا۔ اس کی عام گلیاں یا بازار اٹھارہ سے چوبیس فٹ تک چوڑے تھے سب سے بڑے بازار کی چوڑائی چھتیس

---

[1] ٹامسن ص ۱۳۲

[2] سٹرابو کتاب نمبر ۱۶ باب ۲

نٹ تھی ۔ افسوس کہ دورا یوروپس کے سوا اب تک کسی سلیوکی شہر کے آثار کی کھدائی نہیں ہوئی ہے۔ باقی رہے " وطنی " شہر تو وہ وضع قطع اور پالیسی دونوں کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ان شہروں میں وطنی عنصر اپنے عام طریقے سے مطابق زندگی بسر کرتا رہا۔

محاصل

وطنی کسان دیہات میں رہتے۔ وہ اپنے پرانے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرتے۔ حکمران خاندان کی تبدیلی سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جس زمین میں وہ کھیتی باڑی کرتے تھے، اس کا مالک یا تو بادشاہ ہوتا یا زمیندار، کاشتکار زمین کے ساتھ ہی بکتے اور خریدے جاتے، ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی، البتہ ان سے محاصل جنس کی صورت میں وصول کیے جاتے۔

سلیوکیوں نے فصل میں سے عشر (دسواں حصہ) وصول کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ عمل بہت پرانے زمانے سے چلا آتا تھا۔ متفرق اشاروں سے متبادر ہوتا ہے کہ محاصل افراد پر نہیں، بلکہ جماعت پر لگائے جاتے تھے۔ ان کا بڑا حصہ جنس کی صورت میں کاہن اعظم قبیلے یا قوم یا شہر کی طرف سے ادا کر دیا۔ مختلف محاصل، ان کی مقدار اور تشخیص کے طریقے کے متعلق ہمارا علم بہت ناقص ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ قدیم رواج کی بنا پر طے ہوتا تھا اور ہر رواج کو فوری اقتصادی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا تھا۔

خراج اور زمین کے مالیے کے علاوہ جو یہودیہ میں خاصا تھا، شاہی محاصل وصول کیے جاتے تھے، مثلاً کس ٹیکس، تاج کا ٹیکس اور نمک کا محصول۔ انیٹیاکس ثالث نے سنہ ۲۰۰ ق م کے آس پاس یروشلم کے لیے ایک فرمان صادر کیا تھا جس کے مطابق شہر کو تین سال کے لیے محاصل سے آزاد کر دیا تھا اور اس کے بعد ایک تہائی محصول کی معافی دے دی تھی۔ نصف صدی بعد بیک وقت دو سلیوکی امیر بادشاہی کے دعوے دار بن گئے اور اس زمانے میں یہ چیز عام تھی۔ ان دونوں نے یہودیوں کی حمایت ہر قیمت پر حاصل کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی، ان میں سے ایک نے، جس کا نام ڈیمیٹریس اول سوٹر تھا، ۱۵۲ ق م میں یہودیوں کے کاہن اعظم یوناتھن کو خط لکھا کہ میں خراج اور محاصل کا بڑا حصہ چھوڑنے کو تیار ہوں۔ اس میں ٹی کس محصول، نمک کا محصول، اور تاج کا محصول بھی شامل ہیں، علاوہ بریں کھیتوں کی پیداوار کا ایک تہائی اور پھل والے درختوں کی پیداوار کا نصف حصہ معاف کرتا ہوں، جو عموماً بادشاہ لیتا تھا۔ اس نے یروشلم کو رواجی عشر سے بھی آزاد کر دینے کی پیشکش کی تھی۔ انیٹیاکس

---

۱ ایم ٹی راستوزیف (Rostovtzeff) The Excavations at Dura-Europes جلد نہم ص ۲۳-۲۵

۲ دورا یوروپس کے نقشے کے لیے ملاحظہ ہو راستوزیف کی کتاب Caravan Cities ص ۱۵۴

۳ مکابیین اوّل باب ۱۰، آیات ۲۹، ۳۰، نیز جوزیفس

۴ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی پہلے بادشاہوں کو سنہری تاج پیش کرتے تھے، پھر ان کی قیمت نقد دینے کا دستور ہو گیا۔

۵ جوزیفس ۶ Demetrius I Soter

۷ جوزیفس، نیز مکابیین اوّل باب ۱۰، آیات ۲۹، ۳۰۔

اور ڈیمیٹرئس دونوں نے محصول نمک کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جن مقامات میں نمک بنتا تھا، وہ تاج کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ معدنیات، پتھر نکالنے کے مرکز، جنگلات اور ماہی گیری کے مرکز بھی غالباً بادشاہوں ہی کی ملکیت تھے۔ اینٹیاکس نے اپنے ایک فرمان میں یہودیوں کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے ہیکل اور دوسری عمارتوں کے لیے لبنان سے بلا محصول لکڑی لے آئیں[1]۔

---

[1] مزید معلومات کے لیے بکرمین (Bikerman) کی کتاب ص ۱۰۶ - ۱۳۲ - ملاحظہ فرمائیں، نیز راسٹوویف کی کتاب Social and Economic History ص ۴۴۴ -

بیسواں باب

تجارت اور صنعت و حرفت

شام کو سلیوسی مملکت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل تھا۔ انطاکیہ اس کا سیاسی سر تھا، سلیوکیہ تجارتی مرکز تھا، افامیا اس کی لشکر گاہ تھا۔ جو سلیوکیہ (دریائے دجلہ پر) واقع تھا، وہ مملکت کا شرقی مرکز حکومت تھا اور سارڈس مغربی مرکز حکومت تھا۔ ابتدائی دور کے سلیوکی بادشاہوں کا ایک اہم کام یہ تھا کہ مملکت کے مختلف حصوں اور سیاسی اور تجارتی مرکزوں کو آرام دہ اور محفوظ سڑکوں کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں۔ جب کوئی نو آبادی قائم کی جاتی، تو اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا کہ مقامی سڑکوں اور موجودہ شاہراہوں سے اس کا رشتہ جڑ جائے۔ شام و مصر کے یونانی بادشاہ نئی سڑکوں کا اضافہ کرتے ہی رہتے تھے۔ چونکہ آمد و رفت کے وسائل بہت اچھے ہو گئے تھے۔ اور یونانی دنیا کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد بھی حضارت کی عمومی یکسانی قائم تھی۔ ایک زبان بولی جاتی تھی، ایک قسم کے سکے رائج تھے، ان وجوہ سے تجارت کو بڑی تقویت پہنچی۔ نو آبادیوں کے قیام کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ یونانی تجارت اور صنعت و حرفت کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ اس طرح تاجر، کاروباری آدمی اور فن کار جا بجا پہنچ گئے۔

سلیوکیوں کی پالیسی

شام کی تجارت داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر مملکت اور آبادی کے لیے بہ طور خاص اہم تھی۔ سلیوکیوں کی پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عرب، ہندوستان اور وسط ایشیا کا تجارتی سامان اوّلاً اس غرض سے لانا چاہتے تھے کہ مقامی ضرورتیں پوری ہوں، نیز سامان مملکت میں سے گزار کر آگے بھیجا جائے۔ ثانیاً وہ چاہتے تھے کہ شام کے تجارتی متعلقات مغرب سے اور خصوصاً یونانی و رومی دنیا سے ترقی کر جائیں۔ تجارتی سامان آگے پہنچانے کے سلسلے میں مصر شام کا حریف تھا۔ سلیوکیوں اور بطلیموسیوں کے درمیان جو لامتناہی فوجی کشمکش جاری رہی، اس کی بنیادیں سیاسی بھی تھیں اور اقتصادی بھی۔

ہندوستان

ہندوستان کا سر و سامان سمندر کے راستے یمن[۱] کے تجارتی مرکزوں میں پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے عربی سامانِ تجارت میں شامل ہو کر قافلوں کے ذریعے سے پیٹرا، نیز بطلیموسی علاقوں کی طرف جاتا تھا۔ ایک راستہ اور بھی تھا، یعنی وہ خلیج فارس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ عقیر سے ہوتا ہوا دریائے دجلہ والے سلیوکیہ میں پہنچا، سلیوکیہ میں اس کے علاوہ خشکی کے راستے قافلوں کے ذریعے سے آیا ہوا سامان بھی جمع ہوتا، پھر یہ سارا سامان بالائی فرات اور دورا یوروپس سے انطاکیہ پہنچ جاتا یا دریائے دجلہ کے شرق میں پرانا راستہ اختیار کر لیا جاتا، یعنی جس حصے کو آج کل عرب جزیرہ ابن عمر کہتے ہیں اس میں سے گزر کر سامان نصیبین پہنچتا

---

[۱] یمن جسے عرب العرب الیمونہ کہتے ہیں، یعنی عرب آبادان

وہاں سے اوپیا ہوتا ہوا انطاکیہ یا دمشق چلا جاتا۔ ان حالات میں دریائے دجلہ والا سلیوکیہ مشرق کے سامانِ تجارت کو آگے بھیجنے کا ایک مرکز تھا۔ اس حیثیت میں وہ قدیم بابل کا وارث اور قرونِ وسطیٰ کے بغداد کا پیشرو بن گیا۔ مسیح سے پیشتر تیسری صدی میں سلیوکیہ دجلہ والا تجارتی راستہ بہت پُررونق رہا، لیکن دوسری صدی کے اواخر اور پہلی صدی کے اوائل میں فتنہ و فساد شروع ہوا، تو تدمر والا صحرائی راستہ زیادہ محفوظ سمجھا گیا، خصوصاً اس لیے کہ تدمری قبائل راستے کی حفاظت بھی کر سکتے تھے اور پانی کی بہم رسانی بھی ان کے لیے مشکل نہ تھی۔ نخلستان تدمر والا راستہ چونکہ مسافت میں بھی کم تھا اس لیے یہ قریباً چار سو سال تک بہ کثرت استعمال ہوتا رہا۔

قافلے مصر، ہجیرا یا فلسطینی ساحل سے روانہ ہوتے اور ساحلی راستے سے لاذقیہ پہنچتے۔ وہاں سے سلیوکیہ اور انطاکیہ چلے جاتے یا وہ صیدا اور صور سے دمشق پہنچ جاتے۔ اس سلسلے میں وہ قدیم زمانے کی مشہور شاہراہ اختیار کر لیتے، جو قافلے اروادیا مارا تھوس سے چلتے، وہ بھی یا تو ساحل کے ساتھ ساتھ شمال جانب چلے جاتے یا مشرقی جانب مڑ کر حمص اور افامیا چلے جاتے سلیوکیہ یا اس کا ہمسایہ انطاکیہ قافلوں کے مل جانے کی جگہیں تھیں۔ انطاکیہ دریائے عاصی پر واقع تھا اور اس زمانے میں دریائے عاصی کے اندر جہازرانی ممکن تھی۔

اپنے دورِ عروج میں سلیوکی بادشاہ تجارتِ ریشم کی شاہراہ کے بھی واحد مالک تھے۔ یہ شاہراہ ایرانی سطحِ مرتفع کو قطع کرتی ہوئی وسطِ ایشیا سے گزر کر دور منگولیا تک جاتی تھی۔ اس شاہراہ کا بڑا حصہ سلیوکی علاقوں میں سے گزرتا تھا۔ دوآبۂ دجلہ فرات میں ہندوستان اور مغربی عرب کی تجارتی جنسیں جمع ہو جاتیں، وہاں سے انہیں تصیبین اور اڈیسا دورا یوروپس کے راستے مغربی جانب بھیج دیا جاتا۔

دورا یوروپس

سلیوکیوں کے ماتحت بڑی تجارتی شاہراہوں کی حفاظت کے لیے نوآبادیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو مستحکم بھی تھیں اور خوش حال بھی، ان میں قافلے والوں کی استراحت کے لیے عمدہ جگہیں مہیا تھیں اور اونٹوں کو ٹھہرانے کے لیے موزوں مقامات مہیا تھے۔ دورا یوروپس[1] کی حیثیت بھی یہی تھی۔ سلیوکس اوّل نے ۳۰۰ ق م میں اس کی بنیاد رکھی اور یہ نوآبادی شاہی مرکزِ حکومت اور دوآبہ کے مرکزِ حکومت کے وسط میں صحرائی راستے پر واقع تھی۔ یہ نوآبادی ترقی کرتے کرتے ایک مستحکم حصار اور تجارتی مال کا اہم مرکز بن گئی۔ اس کا موقع و محل طبعاً مستحکم تھا۔ نوآبادی ایک چٹان پر واقع تھی، جو دریائے فرات کے کنارے تھی اور اس کے دونوں جانب دو گہری ندیاں بہتی تھیں۔ پارتھیوں کے ماتحت اس شہر نے تجارت میں بلند ترین حیثیت حاصل کر لی۔ رومی اسے دریائے فرات کی سمت میں سرحدی قلعے کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ ساسانیوں نے ۲۵۶ء میں اسے فتح کر لیا اور تباہ کر ڈالا، پھر یہ ویران ہو گیا۔ اس کے کھنڈروں کو آجکل "صالحیہ" کہتے ہیں۔ دنیا کو اس کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک انگریز افسر یہاں خندقیں کھدوا رہا تھا، اتفاقیہ اسے استرکاری کے چند دلچسپ نمونے مل گئے پھر کھدائی شروع ہوئی تو ایسے کھنڈر نکلے کہ دورا کو مشرق کا پومپے کہنے لگے۔

---

[1] دورا (دانی ایل باب ۳، آیت ۱) کے معنی دیوار یا حلقے کے ہیں۔ یوروپس سلیوکس اول کی مقدونی جائے پیدائش تھا۔

جرھا

خلیج فارس میں جرتھا نہایت اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہ عربی شہر خلیج فارس کے پورے مغربی ساحل اور عرب کے اس حصّے کے تمام کاروانی راستوں کا مرکز تھا، ان میں سے ایک راستہ جنوب کی طرف جاتا تھا اور جرھا کو یمن سے ملا دیتا تھا۔ دوسرا راستہ صحرائے طیما سے گزرتا ہوا پیٹرا چلا جاتا تھا۔ سمندر کے راستے بھی ہندوستان اور سلیوکی سلطنت کے درمیان جرھا ہی واسطہ تھا۔ اس تجارتی مرکز اور یہاں کے تاجروں کے بارے میں ہمیں جو تھوڑی سی معلومات حاصل ہیں وہ کلاسیکی ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں۔[۱] لیکن پلینی نے جو یہ لکھا ہے کہ اس شہر کے برج نمک کے مربع بلاکوں سے بنے ہوئے تھے تو اس کی تشریح مشکل ہے۔ کوئی ایسی شہادت ان مآخذ سے ہمیں نہیں مل سکی جس سے ثابت ہو تا کہ اہل جرھا کبھی سلیوکیوں کی رعایا تھے۔ اینٹیاکس ثالث نے مشرقی مہم سے لوٹتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا۔ اہل جرھا نے احتراماً اس کی خدمت میں پانسو مثقال چاندی، ایک ہزار مثقال لوبان اور دو سو مثقال مُر اور دارچینی کا تیل پیش کیا تھا۔[۲]

سلیوکی اہل جرھا ہی سے عربی زبان تجارت کی خاص چیزیں حاصل کرتے تھے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب جنوبی شام، بطلیموسی سلطنت کا جزو بن چکا تھا۔ تجارتی سامان میں مُر، لوبان اور دوسری خوشبوئیں شامل تھیں۔ پوری سلیوکی مملکت میں لوبان کی سخت مانگ تھی، اس لیے کہ یونانیوں، یہودیوں یا دوسرے سامیوں کی کوئی عبادت لوبان سلگائے بغیر نہ ہو سکتی تھی۔ پوری یونانی دنیا میں ہر مذبح پر لوبان سلگتا رہتا تھا۔ بعد ازاں مسیحی دنیا میں یہی دستور رہا۔ دارچینی بھی گرم علاقوں کی ایک اہم پیداوار تھی۔ یہ ہندوستان سے آتی تھی، لیکن یونانی اسے عرب کی جنس سمجھتے تھے۔ ہندوستانی سامان کی خاصی مقدار اہل جرھا کے ذریعے سے سلیوکی علاقوں میں پہنچتی تھی۔

مغرب کے ساتھ تجارت

عرب، ہندوستان اور وسط ایشیا سے جو جنسیں جہازوں میں بھر کر شام بھیجی جاتی تھیں، ان کا ایک حصّہ مقامی ضرورتوں میں صرف ہوتا اور ایک حصّہ مغربی ملکوں کی طرف بھیج دیا جاتا۔ سلیوکیوں کے زمانے میں مغرب کے ساتھ خشکی کے راستے بھی تجارت ہوتی تھی اور سمندر کے راستے بھی۔ شام کی خوش حالی میں اس تجارت کا بھی خاصا حصّہ تھا اس تجارت میں شام کی زرعی پیداوار اور مصنوعات کے علاوہ وہ سامان بھی شامل ہوتا تھا جو مشرقی سرزمینوں سے آتا تھا۔ یونانی ریاستوں اور دوسرے اجنبی ملکوں کے ساتھ غلاموں کی تجارت بھی فروغ پر تھی۔ بطلیموسیوں کے مقابلے میں سلیوکیوں کی توجہ اس تجارت پر بہت زیادہ تھی۔ جنگوں میں جو قیدی پکڑے آتے وہ بردہ فروشی کی منڈیوں کی رونق بن جاتے۔ ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ بحری قزاق مختلف جہازوں پر چھاپے مارتے تو مظلوموں کو پکڑ لاتے اور غلام بنا کر بیچ دیتے۔ تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں شام اور ہمسایہ سرزمینوں میں سے غلاموں کی بڑی تعداد

---

[۱] Gerrha یہ غالباً وہی مقام تھا جسے آجکل عقیر کہتے ہیں اور خلیج فارس میں نجدی ساحل کا مشہور مقام ہے۔ اگرچہ اب ایک معمولی آبادی رہ گیا ہے اور اسے عُجیر کہہ کر پکارتے ہیں۔

[۲] سٹرابو کتاب ۱۶، آیت ۳ نیز ڈیوڈورس کتاب ۳، باب ۴۲۔

[۳] پولی بئس کتاب ۱۳، باب ۹۔

مغرب کے یونانی شہروں میں پہنچتی رہی۔ غلاموں کی مانگ اس زمانے میں ویسی ہی تھی، جیسی ہمارے زمانے میں گھریلو ملازموں کی مانگ ہے۔ علاوہ بریں کانوں میں کارکنوں کی ضرورت تھی، تعمیرات اور رفاہ عامہ کے کام بھی غلاموں ہی کے ذریعے سے انجام پاتے تھے۔ معبدوں میں بھی غلام رکھے جاتے تھے اور اس انسانی جنس کی تجارت کی جاتی تھی۔

نئی فونیقی آبادیاں

بحری راستے میں روڈز ایک خاص وقت تک کے لیے ممتاز تجارتی قوت بنا رہا۔ سنہ ۱۶۶ ق، م میں کار تھج پر زوال آگیا تو جزیرہ ڈیلاس[1] نے عروج حاصل کر لیا، یہاں اپولو کے اعزاز میں ایک معبد بن گیا تھا جسے بہت مقدس مانا جاتا تھا اور زمانہ قدیم کے لوگوں کی یہ ایک مشہور مذہبی عمارت تھی۔ ڈیلاس بھی وسیع تجارتی مرکز بن گیا جہاں سے سامان آتا جاتا رہتا تھا۔ بیروت نے بحیرہ ایجہ کے جزیروں سے خاص تجارتی تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ سنہ ۱۴۲ ق، م میں تریفون[2] نے بیروت کو تباہ کر ڈالا۔ تریفون سلیو کی تاج و تخت کے دعوے داروں میں سے تھا۔ سکوں کی شہادت سے واضح ہوتا ہے[3] کہ بیروت بہت جلد سنبھل گیا اور اس میں اتنی جان تھی کہ جزائر ایجہ میں اپنی ایک نوآبادی قائم کرے۔ یہ نوآبادی پوسی ڈون کے نام پر بنی تھی، جو بیروت کا سرپرست دیوتا تھا۔ یہاں ایک معبد بھی تھا جس کے ساتھ دوسری عمارتیں اور رواق بنے ہوئے تھے ان میں فونیقی سامان تجارت کی نمائش ہوتی تھی۔ ڈیلاس کی تجارتی، اجتماعی اور مذہبی سرگرمیوں میں اہل بیروت سے صرف اطالویوں کا درجہ فائق تھا۔

سلیوکیوں اور بطلیموسیوں کے ماتحت فونیقی شہروں کی تجارتی اور استعماری سرگرمیوں میں ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ ایک سے زیادہ نوآبادیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ فونیقی تاجروں نے دور افتادہ جدروسیا میں سے خوف انگیز سفر کر کے سکندر کی پیروی کی۔ صیدا کے جو باشندے شکیم میں رہتے تھے۔ انہوں نے مکابیوں شورش کے وقت اجازت مانگی تھی کہ کوہ جرزیم پر عبرانیوں کا جو معبد ہے اسے جوپیٹر کا معبد بنا لینے دیا جائے۔ یہ لوگ غالباً فونیقی تھے۔ جنہوں نے یونانیت کا اثر قبول کر لیا تھا۔ صیدا کی ایک نوآبادی مریسہ[4] بھی تھی جو جنوبی جانب ادومیا میں واقع تھی۔ مریسہ بطلیموسی عہد میں ایک خوش حال تجارتی شہر بن گیا۔ یہ ان ادومی شہروں میں سے تھا، جن کے مردوں نے یوحنا ہرکانوس کے عہد میں ختنہ کرانا قبول کر لیا تھا اور جلاوطنی قبول نہ کی تھی۔

سلیوکیوں کے ماتحت شام کی تجارت کے اس فروغ میں یہودیوں نے اس سے زیادہ نمایاں حصہ نہ لیا۔ جتنا انہوں نے ابتدائی دور میں لیا تھا۔ ان کے مؤرخ اور ترجمان جوزیفس (۳۷ء۔ سنہ ۱۰۰ء) کا بیان ہے "ہم نہ تو ساحلی علاقوں میں رہتے ہیں، نہ تجارت ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے اور نہ ہم اس ربط ضبط پر خوش ہیں، جو تجارت کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے[5]۔"

---

[1] Delos   [2] Tryphon

[3] سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲، نیز Catalogue of Greek Coins of Phoenicia

[4] Marisa بائیبل میں اس کا ذکر (تواریخ دوم باب ۱۱ آیت ۸، نیز باب ۱۴، آیات ۹-۱۰) میں آیا ہے۔ کہتے ہیں، یہ تل سندحنہ ہے جو بیت جبرین سے ایک میل جنوب میں ہے۔

[5] جوزیفس

زرعی پیداوار

یونانیت کے آخری دور میں شام نے باغات و زراعت میں بڑا اونچا درجہ حاصل کر لیا۔ ترقی کی ابتدا بطلیموسیوں کے ماتحت نشیبی شام، فونیقیہ اور فلسطین سے ہوئی۔ غلّہ (جو اور گندم) انگور اور دوسرے پھل، شراب اور سبزیاں پہلے سے پیدا ہوتی تھیں، اب مانگ بہت بڑھ گئی تو ان جنسوں کی پیداوار کے طریقے بہتر ہو گئے اور پیداوار کی مقدار میں بھی بہت اضافہ ہو گیا۔ رومنیات کے لیے وسیع منڈیاں مہیا ہو گئیں۔ اس سلسلے میں مقامی پھول استعمال کیے جاتے تھے۔ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ زیادہ ربط ضبط کا نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی جنسوں کا مبادلہ وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا اور باہر سے نئے درخت لا کر لگائے گئے۔

مصری لوبیا، مسور، رائی اور دوسرے مصری پودے بطلیموسیوں کے ماتحت جنوبی شام میں رائج ہوئے پستے کا درخت ایران سے آیا تھا، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اور یہ شام میں لگایا گیا تھا۔ شام ہی سے یہ درخت اپنے نام کے ساتھ یونان اور اٹلی پہنچ گیا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ دوسرے ایرانی درختوں مثلاً خوبانی، شفتالو اور آلو بالو یا گیلاس نے اس کے برعکس راستہ اختیار کیا، یعنی وہ پہلے اٹلی پہنچے، پھر یونانی مشرق میں نمودار ہوئے۔ دوسرے ایرانی درختوں مثلاً سنگترے اور لیموں کے متعلق یونانیت کے عہد میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کپاس اگرچہ مصر اور ہندوستان میں بہت پہلے سے کاشت ہوتی تھی اور سنہ ۵ ق، م کے آس پاس آشوریہ پہنچ گئی تھی، لیکن سلیوکی شام میں اسے وسیع پیمانے پر کبھی کاشت نہ کیا گیا یہ ایک عجیب و غریب چیز سمجھی جاتی تھی۔ مغربی ایشیا میں جنگلی ریشمی کیڑوں سے مقامی ریشم بنتا تھا، مگر اصل چینی ریشم کی درآمد سنہ ق، م میں شروع ہوئی۔ چینی اور چاول ہندوستان سے منگائے جاتے تھے۔ پلینی ضمناً بتاتا ہے کہ سلیوکس اول نے ہندوستانی اَمُومَم کو کاشت کرانے کی بے سود کوشش کی، یہ بڑی ہی نازک خوشبوئیں ہیں۔ اسی طرح پلینی ہمیں بتاتا ہے کہ دارچینی بھی کوشش کے باوجود شام کے قرب و جوار میں پنپ نہ سکی۔

صنعت و حرفت

بطلیموسیوں کے ماتحت شراب اور تیل کی صنعت بہت ترقی کر گئی۔ یہ دونوں چیزیں، نیز زیتون، روٹی اور مچھلی لوگوں کی خوراک کے اہم اجزا تھے۔ فرعون کے دور کی طرح یونانیت کے دور میں لکڑی کی تجارت بھی فروغ پر تھی۔ مصر میں درخت تھے نہیں۔ لہٰذا وہ لبنان کے دیوداروں سے، جو ہمیشہ بادشاہ کے املاک میں شامل ہوتے تھے، نیز بسن کے بلوطوں سے فائدہ اٹھاتا تھا سلیوکیوں کے دور میں بھی بادشاہ شام و لبنان کے جنگلات کی لکڑی اسی طرح فروخت کرتے تھے، جس طرح ایرانی، آشوری اور فونیقی اپنے اپنے دور میں کرتے رہے تھے۔ بحیرۂ جلیل سے خوشبودار پودے ملتے تھے اور اریحا بلسم کی پیداوار کا مرکز تھا۔

پارچہ بافی فونیقیوں ہی کے زمانے میں نہیں، بلکہ ان سے بھی پیشتر کے زمانے میں موجود تھی، اس کی برتری قائم رہی۔ شامی پارچہ بافوں

---

۱ ایف، ایم ہیشل ہائم Heichelheim کی کتاب Roman Syria نیز روسٹوزیف

۲ Amomum یہ غالباً بلسم تھا، جس سے یونانی اور رومی نہایت قیمتی خوشبو بناتے تھے۔

۳ رومیوں اور فونیقیوں کے عہد میں صنوبر، سرو، دیودار وغیرہ بادشاہوں کی خاص ملکیت سمجھے جاتے تھے۔

۴ سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲۔

نے کاریگری اور ہنرمندی کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ البتہ کپڑوں کے نمونے بدلتے رہے، تاکہ گاہکوں کے ذوق کی تسکین ہو سکے۔ شام میں اُون کی تجارت خصوصی طور پر بہت وسیع تھی۔ ارغوانی رنگ کی جنس کی ہمیشہ مانگ رہی۔ اونی کپڑا مسیحی سنہ کے آغاز تک بھی منگولیا میں منگایا جاتا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ غالباً شام کے دورِ بازنطینی میں شروع ہوا۔

مٹی اور کانچ کے سامان کی صنعت قدیم زمانے سے مشرقِ قریب کی ایک خصوصیت رہی۔ شام نے اس صنعت میں بھی اپنی پرانی شہرت بحال رکھی۔ یونانی ظروف گلی سکندر کی فتوحات کے بعد مشرقِ قریب کی منڈیوں میں بہ کثرت آ گئے شامی کاریگروں نے اس نمونے کی نقل شروع کر دی اور ویسے ہی ظروف بنانے لگے۔ ابتدا میں مٹی کے وہ ظروف زیادہ اچھے سمجھے جاتے تھے جن کا رنگ سیاہ ہوتا تھا اور ان میں چمک پائی جاتی تھی۔ پھر سرخ رنگ نے ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ برتنوں کے ایسے ٹکڑے ہر جگہ ملے جن پر اٹیکا اور روڈز کی چھاپیں تھیں۔ صور و صیدا کے بلوریں برتن بڑی قیمت پاتے تھے اور ہر جگہ پسند کئے جاتے تھے۔ رومیوں کے زمانے تک یہ شہر بہترین بلور دنیا کے لیے فراہم کرتے تھے۔ ان شہروں، نیز دوسرے فونیقی بلاد میں کاٹ کاٹ کر بلوری چیزیں بنتی تھیں پھر شیشے کو ڈھال کر برتن بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ اہم ایجاد غالباً پہلی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ہوئی۔

یونانیت کے دور میں گلی تختیوں کی جگہ چمڑے یا جھلّی یا پیپروس پر لکھنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ دوسری صدی سے جھلّی یا چرمی کاغذ برگیم کی خاص صنعت بن گیا تھا۔ اسکندریہ نے دنیا کے لیے پیپروس مہیا کیا۔ تحریر کا یہ سامان مصر سے شام و فلسطین پہنچا۔ ایسے اشارے ملتے ہیں کہ وہاں پیپروس پیدا ہونے لگا تھا[۲]۔ پیپروس بنانے کا طریقہ غالباً یہ تھا کہ اس کے درخت کی چھال اتارتے، پھر تنے کو طولاً پتلے پتلے ٹکڑوں میں کاٹتے اور انہیں عمودی صورت میں ایک تختے پر رکھتے جاتے، پھر دوسری تہ مستطیلاً رکھ دیتے۔ پھر ان سب کو پانی سے نم دیتے رہتے، پانی میں سریش بھی ملا دیتے اور انہیں دھوپ میں خشک کر لیتے اس طرح جو اوراق مہیا ہوتے، انہیں الگ الگ بھی استعمال کرتے اور ضرورت کے وقت لئی سے جوڑ کر پلندہ بھی بنا لیتے۔ فونیقیہ سے یہ چیز یونان پہنچی اور چھٹی صدی میں وہاں عام طور سے رائج تھی۔

اس زمانے میں دھاتوں کے کام نے بڑی ترقی کی۔ اینٹیاکس اپی فینز عموماً اپنے درباریوں سے بچ کر نکل جاتا اور سونے چاندی کا کام کرنے والے کاریگروں کی دکانوں میں پہنچ کر ان سے فنی امور کے متعلق باتیں کرتا، خصوصاً ان لوگوں سے جو دھاتیں ڈھالتے تھے اور ان سے طرح طرح کی چیزیں بناتے تھے۔ چاندی[۳] عرب کے بنطی علاقے سے آتی تھی، سونا وہاں سے بھی آتا تھا اور کوہستانِ طارس سے بھی۔ لوہے کا ایک مرکز کوہستان طارس تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی فلسطین، خصوصاً ادومیہ نیز لبنان میں بیروت کے قرب و جوار سے بھی خام لوہا ملتا تھا۔ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے یہ دھات بلاشبہ بہت قیمتی تھی۔ بطلیموسیوں نے لبنان کے حلقے میں تانبے اور لوہے کی کانوں کے علاوہ دوسری کانوں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ استفادے کا یہ سلسلہ رومیوں کے عہد میں بھی جاری رہا[۴]۔ موتی سکندر کے زمانے سے پیشتر اہلِ مغرب نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اب زیورات کے لیے یہ بڑی قیمت

۱۔ پیپروس ہے جس سے لفظ Paper (کاغذ) نکلا ہے۔

۲۔ پولی بس کتاب ۲۶، باب ۱

۳۔ اس سلسلے میں دیکھیے ہسٹن ہاٹم ص ۱۵۶ - ۱۵۷۔

دے کر خریدے جاتے تھے۔

سکّے

تمام یونانی بادشاہیوں میں سکّے ڈھالے جانے لگے تھے تاکہ تجارت کو فروغ حاصل ہو۔ پہلے جنس کے مبادلے میں جنس لی جاتی تھی، اب آہستہ آہستہ روپے کو مبادلے کا ذریعہ مان لیا گیا تھا۔ روپے کے ساتھ ہی شاہی اوزان انطاکیہ اور سلیوکیہ میں جاری ہوئے۔ مختلف صوبوں اور شہروں میں مختلف وزنوں اور پیمانوں کی اجازت دے دی گئی تھی۔

ترفہ کے مظاہرے

تجارت بڑھ گئی۔ سرکاری سکّے اور سرکاری اوزان جاری ہو گئے، زراعت نے ترقی کر لی اور اس کے طریقوں کی بھی اصلاح ہو گئی۔ ان وجوہ سے سلیوکی شام میں مقابلۃً "خوش حالی کا دور آ گیا۔ تاریخ کے اوراق پر ایسی روئیدادیں محفوظ رہ گئیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے بڑے بڑے آدمیوں نے دولت کے کتنے انبار جمع کر لیے تھے۔ مثال کے طور پر ہرمیاس[۱] اینٹیاکس اعظم کا بڑا وزیر تھا۔ ۲۲۰ ق م کے آس پاس اس نے ایک موقع پر پوری شاہی فوج کی تنخواہ اپنی جیب سے ادا کر دی تھی[۲] اور دیونیسی اوس[۳] اینٹیاکس ایپی فینز کا ایک دوست تھا، ہمیں بتایا گیا ہے کہ دفنہ میں کھیلوں کے موقع پر جو جشن ہوا تھا، اس میں وہ شرکت کے لیے نکلا تو جلوس کے ساتھ نکلا۔ جس میں ایک ہزار غلام چاندی کے برتن سروں پر رکھے ہوئے ساتھ تھے، جن میں سے کوئی بھی وزن میں ایک ہزار درہم سے کم نہ تھا۔ پھر چھ سو ساقی تھے، جنہوں نے سونے کے برتن اٹھا رکھے تھے، دو سو عورتیں تھیں جو سنہری صراحیوں سے خوشبودار تیل چھڑک رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جلوس میں اسّی عورتیں تھیں وہ ایسے محافوں میں بیٹھی تھیں جن میں سنہری بازو لگے ہوئے تھے اور پانسو عورتیں چاندی کے بازوؤں والے محافوں میں سوار تھیں[۴]۔ بادشاہ خود بھی چاہتا تھا کہ رومیوں پر بازی لے جائے، چنانچہ اس نے دفنہ میں کھیلوں کے موقع پر چاندی اور سونے کی جو نمائش کی وہ بالکل افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ پریڈ میں سلیشیا کے تین ہزار فوجی شامل تھے ان کے سروں پر سنہری تاج تھے، دس ہزار مقدونیوں کی ڈھالیں سنہری تھیں۔ پانچ ہزار کی روپہلی اور پانچ ہزار کی برنجی۔ تین ہزار شہری سپاہی تھے جن کی اکثریت نے چہرے کی حفاظت کے لیے سنہری خول اور سر پر سنہری تاج پہن رکھے تھے۔ باقیوں کے ہاں چہرے کی حفاظت کے خول چاندی کے تھے[۵]۔

آبادی

پوسی ڈونیئس کی شہادت پیش نظر رکھی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے اوائل میں درجہ معیشت بہت بلند تھا وہ کہتا ہے: شام کے تمام باشندے ضروریات زندگی کے سلسلے میں ہر تکلیف و زحمت سے آزاد ہیں، اس لیے کہ ان کی زمین میں تمام چیزیں بہ افراط پیدا ہوتی ہیں[۶]۔" درجہ معیشت کی بلندی کے ساتھ یہ سمجھ لینا بالکل بجا ہو گا کہ آبادی بڑھ گئی تھی اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ باقی خاندان اور اس کے ابتدائی جانشینوں نے نوآبادیوں کے قیام پر خاص توجہ مبذول رکھی تھی۔ رومیوں کے عہد تک افزائش

۱۔ Hermias
۲۔ پولی بس کتاب ۵، باب ۵۰
۳۔ Dionysius
۴۔ ایتھنی نائی اوس Athenaeus کتاب ۵، باب ۱۹۵
۵۔ ایضاً ایضاً باب ۱۹۴۔
۶۔ ایضاً ایضاً باب ۲۱۰۔

کا سلسلہ جاری رہا۔ سٹرابو (سنہ ۶۳ ق،م۔ سنہ ۲۴ء) بتاتا ہے کہ انطاکیہ عظمت و ثروت میں دجلہ والے سلیوکیہ اور مصر کے اسکندریہ سے زیادہ پیچھے نہ تھا۔[1] سٹرابو سے تھوڑی دیر بعد پلینی کے وقت میں سلیوکیہ کی آبادی چھ لاکھ بیان کی گئی ہے۔[2] قیصر آگسٹس کے ماتحت اسکندریہ کی آبادی بھی اتنی ہی تھی۔ قیام سلطنت سے پیشتر رومیوں کے عہد میں شام کی آبادی کا اندازہ پچاس لاکھ اور ساٹھ لاکھ کے درمیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیس لاکھ فلسطین میں رہتے تھے۔[3]

---

[1] کتاب ۱۶، باب ۲۔
[2] پلینی کتاب ۶، باب ۳۰
[3] جولیس بیلوچ Jelius Beloch کی جرمن کتاب ص ۲۴۲۔

اکیسواں باب

شام، رومی ولایت کی حیثیت میں

شہنشاہی سے پیشتر کا دور

مغربی ایشیا میں رومیوں کی فوجی پیش قدمی کا سلسلہ میگنیزیا کی جنگ (۱۹۰ ق،م) سے شروع ہوا۔ یہ سلسلہ برابر رُو بہ ترقی رہا، یہاں تک کہ پمپی نے ۶۴ ق،م میں شام کو فتح کر لیا۔ الحاق کے وقت شام پر افراتفری کا دور طاری تھا اور اس کے ذمہ دار آخری دور کے بے حیثیت اور کمزور سلیوکی بادشاہ تھے۔ شمالی سمت میں عرب رؤسا نے مختلف شہروں پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ جنوب میں یونانی صوبوں پر نبطیوں اور یہودیوں کا تصرف جاری تھا۔ قزاقوں کے سردار مختلف ساحلی فنیقی شہروں میں قابض ہو چکے تھے اور انہیں بحری قزاقی کے مرکزوں کی حیثیت میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لبنان کا کوہستانی علاقہ بھی سلیشیا کی طرح اس جغرافیائی ماحول کا حامل تھا، جو قزاقوں کی حفاظت کے لیے سازگار سمجھا جا سکتا تھا اور سلیشیا اس زمانے میں مشرقی بحیرۂ روم کی جانب بحری قزاقی کا بہترین مرکز تھا۔ قزاقوں نے سلیشیا کے پہاڑوں میں جہاں کہیں موزوں گوشے پائے، پہاڑی قلعے تعمیر کر لیے، تاکہ اپنے اہل و عیال اور خزانے وہاں چھپائے رکھیں اور خطرہ پیدا ہو جائے تو خود بھی ان میں پناہ لے لیں[1]۔ جب تک دوآبہ دجلہ و فرات اور مشرقی سرزمینوں کے ساتھ زیادہ فائدہ بخش تجارت کا امکان باقی تھا، بحری قزاقی یا رہزنی کے لیے کشش پیدا ہو ہی نہ سکتی تھی، لیکن جب سلیوکیوں کے عہد میں انتظامی شیرازہ درہم برہم ہو گیا، پارتھیوں اور ارمنوں کی پے در پے فتوحات نے اندرون ملک کے ساتھ تجارت کو برباد کر دیا۔ تو صورتِ حال بدل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک سلیوکی بادشاہ، جس کا نام تریفون تھا (۱۴۲ ق،م۔ ۱۳۷ ق،م) خود ابتدا میں غلام تھا اس نے سلیشیا میں بحری قزاقی کی حوصلہ افزائی کی اور اسے تخت پر اپنا قبضہ مستحکم کر لینے کا ذریعہ بنا لیا[2]۔

بحری قزاق سمندری شاہراہوں میں رہزنی کرتے تھے۔ مشرقی بحیرہ روم میں ان شاہراہوں کا علم سب کو تھا اور ان میں جہازوں کی بہ کثرت آمد و رفت تھی۔ پمپی کی آمد سے پیشتر ان لوگوں نے ایک بین الاقوامی بحری قوت کا بندوبست کر لیا تھا اور مشرقی بحیرۂ روم کا پورا طاس ان لوگوں کی جولاں گاہ تھا۔ اس وجہ سے رومہ میں رسد کی کمی ہو گئی تھی اور رومہ غلے کی بہم رسانی کے لیے باہر ہی کا محتاج تھا۔ اگرچہ پمپی نے شام کے الحاق سے پیشتر اس خطے میں بحری قزاقی کا بہ ظاہر استیصال کر دیا تھا[3] لیکن ان میں سے بعض قزاق اس کے جانشین کے زمانے میں بھی زوروں پر تھے[4]۔

۱۔ تھیوڈور موسن Mommsen کی کتاب تاریخ رومہ History of Rome جلد چہارم ص ۱۴۳۔

۲۔ ایضاً ۔۔۔ جلد سوم ص ۷۸، جلد چہارم ص ۵۹ ۳۔ ایضاً جلد چہارم ص ۱۴۲، ۱۴۶

۴۔ دیو Dio کی کتاب Historia Romana کتاب ۳۹، باب ۵۶۔

جغرافیے اور روایات کے اعتبار سے جس علاقے کو شام کہا جاتا تھا، پمپی نے سنہ ۶۴ ق م میں اسے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کا نام "صوبہ شام" رکھا تھا، گویا سلطنت شام کی جگہ صوبۂ شام نے لے لی اور انطاکیہ اس کا دار الحکومت رہا۔ سلیشیا جداگانہ صوبہ بن گیا۔ عرب رئیسوں کو ہٹایا نہ گیا، البتہ دائرۂ عمل میں ان کے اختیارات گھٹا دیئے اور وہ سالانہ خراج ادا کرنے لگے۔ نبطیوں کے بادشاہ نے نقد رقم کی ایک مقدار دے کر دمشق اپنے قبضے میں رکھا۔ یہودیہ صوبہ شام کے انتظامی حلقے میں ایک محکوم ریاست رہ گئی[1]۔ لیکن جن شہروں کا انتظامی ڈھانچا یونانی تھا اور یہودیوں نے انہیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ ملا لیا تھا، ان کی سابقہ حیثیت بحال کر دی گئی اور انہیں صوبائی گورنروں کے ماتحت داخلی آزادی دے دی گئی۔ ان میں سے دس شہروں نے ایک جمعیت بنالی تھی، جو ڈیکاپولس کے نام سے مشہور ہوئی۔ آگے چل کر اس جمعیت میں اور شہر بھی شامل ہو گئے۔ سنتھوپولس (بیسان) کے سوا اس جمعیت کے تمام شہر دریائے اردن کے مشرق میں واقع تھے۔ انطاکیہ، سلیوکیہ، غزہ اور دوسری نوآبادیوں کو بھی داخلی آزادی مل گئی اور انہیں صوبائی گورنروں کے تابع کر دیا گیا۔

نائب قونصل

صوبہ شام کو ایشیائی مقبوضات میں اتنی اہم حیثیت حاصل تھی کہ اس کے لیے براہ راست ایک رومی نائب قونصل مقرر کیا گیا، جسے فوجیں بھرتی کرنے اور اعلان جنگ کر دینے کا بھی اختیار حاصل تھا[2]۔ بعض ممتاز رومی افسروں کو یہ خدمت سونپی جاتی رہی، سب سے پہلے گابینیوس[3] (سنہ ۵۷ ق م - سنہ ۵۵ ق م) مقرر ہوا۔ وہ پمپی کا بڑا قابل نمائندہ تھا۔ اس نے یہودی بادشاہی کے اختیارات میں اور کمی کر دی۔ ایرسٹوبولس[4] کا پوتا ہرکانوس ثانی اس زمانے میں کاہن اعظم تھا۔ رومی حاکم نے اس سے شاہی منصب چھین لیا۔ رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے۔ پورے یہودی علاقے کو پانچ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ایک پر الگ الگ حاکم مقرر کیے جنہیں سنہدرین کہتے تھے۔ گابینیوس نے بہت سے یونانی شامی شہر از سر نو تعمیر کرائے۔ جنہیں مکابیوں نے تباہ کر ڈالا تھا، مثلاً سامریہ، سنتھوپولس دورا اور غزہ[5]۔

گابینیوس کے بعد کراسوس[6] نائب قونصل مقرر ہو کر آیا یہ حکومت ثلاثہ[7] کا ایک رکن تھا۔ باقی دو رکن پمپی اور جولیس سیزر تھے کراسوس کی حرص لامتناہی تھی۔ اس نے سنہ ۵۴ ق م میں شام پہنچتے ہی اسے پارتھیا کے خلاف فوجی مرکز بنالیا۔ پارتھیا کا دار الحکومت طیسی فون تھا[8] اور اس کی دولت و ثروت بے اندازہ سمجھی جاتی تھی۔ پونٹس اور آرمینیا یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے۔ شام پر قبضہ جما لیا گیا۔ اب

---

[1] جوزیفس

[2] اپین

[3] Gabinius

[4] Aristobulus

[5] جوزیفس

[6] Grassus

[7] حکومت ثلاثہ سے مراد ہے تین آدمیوں کی حکومت۔ روم میں یہ حکومت دو مرتبہ قائم ہوئی۔ پہلی مرتبہ تین جرنیلوں نے پورے اختیارات اپنے قبضے میں لے لیے تھے، یعنی پمپی، جولیس سیزر، اور کراسوس نے۔ دوسری مرتبہ یہ تین آدمی مختار بن گئے: اینٹونی، اکٹوین اور لیپی ڈس۔ پہلی میں سیزر کامیاب ہوا، لیکن مارا گیا۔ دوسری میں آکٹوین کامیاب ہوا اور شہنشاہ آگسٹس بنا۔

[8] Ctesiphon یہ شہر ساسانیوں کے زمانے میں طاق کسریٰ اور مسلمانوں کے ظہور کے وقت مدائن کے نام سے مشہور تھا اس لیے کہ یہاں کئی شہر یکے بعد دیگرے آباد ہو چکے تھے، مثلاً سلیوکیہ دجلہ۔ عربی میں مدائن مدینہ کی جمع ہے، اس لیے یہ مدائن مشہور ہوا۔ خاقانی کا مشہور مرثیہ طاق کسریٰ اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔

روما کو براہ راست پارتھیا سے تعلق پیدا ہو گیا۔ ۵۳ ق م میں کراسوس دوسری مرتبہ پارتھیوں کے خلاف فوج لے کر روانہ ہوا۔ اس کا ایک حلیف اڈیسا کا عرب رئیس ابجر[۱] بھی تھا۔ اس نے راستے میں دغا بازی سے کام لیا۔ کراسوس کی فوج کرہائی[۲] (حران) سے تیس میل جنوبی جانب بادیۂ شام میں تباہ ہو گئی اور خود کراسوس مارا گیا۔ ابجر نے اس کا سر اور دایاں ہاتھ کاٹ کر پارتھی بادشاہ کے پاس سلیوکیہ دجلہ بھیج دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پارتھی بادشاہ نے سونا پگھلا کر کٹے ہوئے سر کے گلے میں یہ کہتے ہوئے اتارا[۳] "اس جنس سے اپنا پیٹ بھر لے، جس کی تجھے زندگی بھر ہوس رہی تھی"

کراسوس کا جانشین کسیوس[۴] مقرر ہوا، جو کراسوس کا قابل خزانچی تھا اور بعد میں وہ جولیس سیزر کے قاتلوں میں شامل ہو گیا۔ اسے کراسوس کی تباہ کن شکست سے اندازہ ہو چکا تھا کہ پارتھی بادشاہ ضرور حملہ کریں گے، چنانچہ ابتدا میں اس کی توجہ صرف دفاع پر جمی رہی۔ پارتھیوں کا حملہ دو سال بعد ۵۱ ق م ہوا۔ نائب قونصل نے دو لشکروں کے ساتھ انطاکیہ میں جم کر مقابلہ کیا۔ پارتھیوں نے جب دیکھا کہ محاصرہ طوالت پکڑ رہا ہے تو وہ دریائے عاصی کے ساتھ ساتھ واپس ہو گئے، بلکہ انجام کار پورے شام سے نکل گئے[۵] تاہم ان کے حملے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے مقامی حاکم بر روئے کار آ گئے، جن میں اکثر پارتھیوں کو ترجیح دیتے تھے۔

پھر روما میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور پوری رومی مملکت کے حالات غیر یقینی صورت اختیار کر گئے۔ اس وجہ سے شام میں پھر ایک مرتبہ بے ترتیبی پھیل گئی۔ جولیس سیزر اور پمپی کی جنگ سے متھراڈیٹس اعظم (مہرداد) کے بیٹے نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ اپنی آبائی سلطنت پونٹس کا بادشاہ بن گیا۔ پھر جولیس سیزر خانہ جنگی کو ختم کر کے انتظام سلطنت کی درستی کے لیے نکلا تو وہ شام بھی پہنچا (۴۷ ق م) اور وہاں مختلف شہروں کو خاص حقوق عطا کیے۔ دوسری مرتبہ حکومتِ ثلاثہ قائم ہونے کے بعد رومی مملکت تقسیم ہوئی تو مشرقی علاقے مارک انٹونی کو دیے گئے، ان میں شام اور مصر بھی شامل تھے۔ انٹونی چار سال تک ان علاقوں پر حکومت کرتا رہا (۴۰ ق م - ۳۶ ق م) لیکن اس حکومت سے نہ تو امن قائم ہوا اور نہ نظم و نسق میں استحکام پیدا ہو سکا۔ انٹونی کلیوپیٹرا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا اور مملکت کے معاملات اس نے پس پشت ڈالے رکھے۔ پارتھیوں نے (۴۰ ق م - ۳۸ ق م) میں پھر ایک زبردست حملہ کیا۔ اور صور کے سوا پورا شام رومیوں سے چھین گیا[۶] آخر بڑی مشکل سے امن بحال ہوا۔ اب اینٹونی نے فونیقیہ اور نشیبی شام کے بڑے علاقے اپنی محبوبہ (کلیوپیٹرا) کو سونپ دیے اور اس کے بطن سے اینٹونی کا جو بیٹا تھا، اسے بطلیموس کے لقب سے شام کا بادشاہ بنا دیا۔ اس بچے کی رگوں میں سلیوکی خون بھی موجزن تھا، اس لیے کہ سلیوکیوں اور بطلیموسیوں کے درمیان شادیاں بھی ہوتی رہی تھیں ایکٹیم[۷] کی مشہور بحری جنگ کے بعد (۳۱ ق م) آگسٹس[۸] کامیاب ہوا۔ اینٹونی اور کلوپیٹرا ہار گئے۔ آئندہ کا رومی شاہنشاہ مصر سے مراجعت کے وقت فلسطین و شام سے بھی گزرا۔ وہاں تمام لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اس لیے کہ وہ مستقل و پائدار حکومت

---

۱ Abgar
۲ Carrhae
۳ دیکھیے دیو (Dio) کتاب نمبر ۱۱ باب ۲۷ - نیز پلوٹارک باب ۳۳
۴ Cassius
۵ دیو کتاب نمبر ۱۱ باب ۲۹
۶ بوشئر Bouchier ص ۲۹
۷ Actium مشہور بحری جنگ جس میں اینٹونی مارا گیا اور آکٹیوین کو کامیابی حاصل ہوئی
۸ Octavian

کے آرزومند تھے۔ چار سال بعد آکٹیوین کو رومی مجلس عالیہ نے آگسٹس (محترم و موقر) کا لقب دے دیا۔ اس وقت سے اس کی شاہنشاہی حکومت کی ابتدا ہوئی۔ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کا افتتاح ہو گیا۔

بادشاہ ہیرودیس کے عہد میں

جب اینٹونی کو مشرقی معاملات کی مختاری مل گئی تو اس نے مکابیوں کو نظر انداز کر کے خاندان ہیرودیس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ اس خاندان کا بانی اینٹی پیٹر[۱] ایک دور اندیش اور مدبر تھا۔ وہ برائے نام یہودی سمجھا جاتا تھا۔ اسے رومی شہریت کے حقوق مل گئے تھے۔ جولیس سیزر شام پہنچا تو اس نے اینٹی پیٹر کو یہودیہ کا مالی وکیل مقرر کر دیا۔ ہرکانوس کاہنِ اعظم بالکل بے دست و پا تھا۔ اینٹی پیٹر تمام اختیارات کا مالک بن گیا۔ اس کے بیٹے ہیرودیس نے ہرکانوس ثانی کی پوتی سے شادی کر لی۔ اس طرح دونوں خاندانوں میں اتحاد پیدا ہو گیا[۲]۔ ۳۷ ق، م میں ہیرودیس نے جو آگے چل کر اعظم کے لقب سے مشہور ہوا، یروشلم پر قبضہ کر لیا اور بادشاہی کے رنگ ڈھنگ اختیار کر لیے۔ روما کی مہربانی سے وہ تینتیس سال بادشاہ بنا رہا۔

ہیرودیس نے قومی مفاد کے مقابلے میں رومی مفاد کو ترجیح دی، جس کام میں اینٹیاکس ایپی فینز ناکام رہا تھا۔ اس میں ہیرودیس کامیاب ہو گیا، یعنی اس نے یہودیہ کو زور و قوت سے یونانیت کی پیروی پر لگا دیا۔ اس نے بعض ایسی عمارتیں بنوائیں جن سے ملک کی صورت بدل گئی۔ یروشلم میں ایک میدان گھوڑ دوڑ کے لیے بنوایا۔ تھیٹر تعمیر کرایا، کھیلوں کے لیے ایک خاص میدان تیار کرایا، جہاں علانیہ کھیل ہوتے تھے حالانکہ انہیں یہودیت سے کوئی مطابقت نہ تھی۔ پھر اس نے ہیکل از سرِ نو تعمیر کرایا۔ سامریہ کو اپنا مرکز بنا لیا۔ جہاں بڑی عمدہ عمارتیں تعمیر کرائیں اور قیصر آگسٹس کے نام پر شہر کا نام سباسطیہ[۳] رکھا۔ اس کی عمارتوں کے کھنڈر کھدائی میں نکل آئے ہیں۔ اپنے سرپرست شاہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اس نے ساحل پر ایک برج ستراتون تعمیر کرایا، جس کا نام قیصریہ[۵] رکھا۔ یہ آگے چل کر رومی فلسطین کا مرکزِ حکومت بن گیا۔ ہیرودیس ہی کے دربار میں دمشق کا نکولاوس رہتا تھا اور مورخ کی حیثیت میں اس کا درجہ پوسی ڈونیئس سے بڑھا ہوا تھا نکولاوس قیصر آگسٹس سے واقف تھا۔ اس نے دنیا بھر کی ایک تاریخ لکھی، جس کا صرف ایک حصہ جوزیفس کی بدولت مطالب کے اعتبار سے محفوظ رہ گیا[۶]۔

ہیرودیس نے دس بیویاں کیں اور ان میں سے بعض کو اس نے خود قتل کر دیا، جس طرح کہ اپنے خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ سلوک کیا تھا۔ اس کی مستبد حکومت کے خلاف جب کوئی بغاوت اٹھی تو بڑی سختی سے کام لے کر اسے فرو کر دیا گیا۔ وہ ۴ ق، م میں مرا، یعنی حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے ایک یا دو سال بعد اور حضرت کی پیدائش کی تاریخ اہلِ تحقیق نے ۶ ق، م سے ۵ ق، م تک بتائی ہے۔ ہیرودیس نے اپنی پہلی وصیت بدل کر اپنے بیٹے ارخیلاوس[۷] کو پوری مملکت دے دی تھی، ارخیلاوس

۱۔ Antipater

۲۔ جوزیفس ۳۔ جوزیفس

۴۔ یونانی لفظ Sebaste کے معنی ہیں، موقر و محترم، اس کے لیے لاطینی مترادف آگسٹس ہے۔

۵۔ جوزیفس، پلینی اور سترابو۔ ستراتون (Straton) غالباً اس زمانے میں صیدا کا بادشاہ تھا، جب سکندر نے اسے فتح کیا تھا۔

۶۔ اس حصے کا تعلق ہیرودیسی خاندان کے واقعات سے ہے۔

۷۔ Archelaus

نے اپنے بھائی ہیرودیس اینٹی پاس سے جنگ کی اور مملکت کا بڑا حصہ لے لیا، لیکن اسے بادشاہ کا لقب نہیں، بلکہ حاکم قوم کا لقب ملا۔ اینٹی پاس کو جلیل کی حکومت دے دی گئی تھی۔ اسی نے شہر طبریہ آباد کیا تھا اور یہ نام قیصر ٹائبیریس کے نام پر اختیار کیا گیا تھا۔ اپنے باپ اور خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اینٹی پاس بھی دو رخہ چلتا تھا۔ گھر میں ہوتا تو اپنے آپ کو یہودی کہتا باہر جاتا تو یونانی قرار دیتا۔ ۶ء میں ارخیلاؤس معزول ہو گیا۔ اس وقت سے یہودیہ کے لیے براہ راست رومی حاکم مقرر ہونے لگے۔ ان میں سے پانچواں حاکم پونٹس پلاطس تھا۔

رومی یونانیت

رومی وضع کی یونانیت کا آغاز ۶۴ ق م میں ہوا اور یہ ۳۲۳ء میں ختم ہوئی۔ جب قسطنطین اعظم نے دارالحکومت روم کی جگہ بیزنطیم میں منتقل کر لیا اور بحیرۂ روم کی سرگزشت میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ واضح رہنا چاہیے کہ رومی تہذیب خود ابتدائی یونانی تہذیب کی وارث تھی۔ اسی سے رومی تہذیب نے فائدہ اٹھایا اور اسی کو جاری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بحیرۂ روم کی اقوام میں سے صرف رومی تھے، جنہوں نے ہندی، یورپیوں کی حیثیت میں اپنے ہم نسل یونانیوں سے بہت کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت دکھائی اور معاملہ محض نمائش تک محدود نہ رکھا۔ باقی رہیں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی سامی اور حامی قومیں تو ان کے نزدیک یونانی تہذیب اجنبی رہی، جو قوت کے بل پر مسلط ہو گئی تھی۔

پہلی صدی عیسوی میں لاطینی اور یونانی تہذیبوں میں کامل تطابق پیدا ہو گیا۔ مفاہمت یوں ہوئی کہ عام بول کی زبان یونانی ہے جو شرق میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اور نظم و نسق میں سرکاری زبان لاطینی استعمال کی جائے۔ یونانی لوگ سیاسی اور انتظامی اعتبار سے ذرا کمزور تھے، ان معاملات میں رومیوں کی صلاحیت سب کے نزدیک مسلّم تھی۔ البتہ فلسفے اور فنونِ لطیفہ کے دائروں میں رومی بے حیثیت تھے اور وہاں یونانیوں کو کمال حاصل تھا۔ اس طرح یونانیت نے رومیوں کی سرپرستی میں مزید قوت اور ثروت فراہم کی اور شام میں اپنی پیش قدمی حسب سابق جاری رکھی۔ رومیوں کی حفاظت کی بدولت یہ "بربری" خطرے سے محفوظ رہی۔ شام کے یونانی شہروں کی زندگی، ان کے سیاسی اوضاع کی خصوصیات، ان کے جشن، ان کی تفریحیں، ان کی ذہنی عمارتیں جاری ہیں۔ رومیوں نے جن مقامی حکمران خاندانوں کو باقی رکھا تھا ــــ ہیرودیس یہودیہ میں، حارث[۵] پیٹرا میں اور اذینہ[۶] تدمر میں ــــ ان کے ظاہری اوضاع یونانی تھے۔

رومیوں نے جو صوبائی نظام اختیار کیا تھا، اس کے مطابق مقامی گروہوں کی داخلی آزادی پر بہت کم پابندیاں عائد تھیں وہ اپنے مذہب، اپنی زبان اور رسوم پر قائم رہنے میں آزاد تھے۔ رومیوں نے ان کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کر لی یہ کام اطاوی

---

۱ Herod Antipas

۲ Ethnarch

۳ لوقا کی انجیل باب ۳، آیت ۱۔

۴ تراجم انجیل میں اسے پُنطیُس پیلاطُس لکھا ہے۔ ٹائبیریس کو "تبریس" اور جلیل کو گلیل۔ پیلاطس ہی تھا جس نے انجیلی روایات کے مطابق حضرت مسیح کیلئے سولی کا حکم صادر کیا تھا۔

۵ Aretas

۶ Odenathus

فوجوں کے ذریعے سے انجام پاتا تھا۔ اس فوجی خدمت کے بدلے میں مقامی آبادی سے خراج وصول کیا جاتا تھا۔ رومی گورنروں کے ذمے مقامی معاملات کی عام نگرانی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے مقرر ہو کر آتے تھے اور انہیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ البتہ وہ مشتبہ ذرائع سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے تھے یا محاصل اجارے پر دے دینے میں انہیں کچھ رقمیں وصول ہو جاتی تھیں۔

بائیسواں باب

ابتدائی رومی شاہنشاہوں کا زمانہ

صوبائی حکومت

جب رومہ کی سلطنت ایک عالمی حکومت بن گئی تو سیاسی تاریخ کا مرکز پہلی مرتبہ ایشیا سے یورپ میں منتقل ہوا اور خلافت اسلامیہ کے زمانے کو چھوڑ کر یہ مرکز وہیں رہا۔ رومیوں کے سامنے صرف ایک نمونہ تھا، جس کی پیروی وہ مغربی ایشیا کے صوبوں کی حکمرانی میں کر سکتے تھے اور وہ سلیوکیوں کا نمونہ تھا۔ لہٰذا یہ طبعی تھا کہ رومی شاہنشاہ انہیں اصول کو عمومی حیثیت میں اپنا نصب العین بناتے اور حکومت کی وہی شکل قائم رکھتے، جو ان کے پیرو یونانی بادشاہوں کے عہد میں رائج تھی۔

چونکہ صوبہ شام اس سلطنت کے حاشیے پر واقع تھا، جو رومہ کی واحد قابل توجہ حریف اور خوفناک دشمن تھی ــــــ سلطنت پارتھیا ــــــ اس لیے اسے عملاً شاہی صوبہ رکھا گیا، یعنی شاہنشاہ خود رسمی طور پر اس کا حاکم تھا۔ چنانچہ یہاں جو حاکم مقرر[1] ہوتا تھا، اس کا درجہ ہمیشہ قونصل کا ہوتا تھا۔ اس کی میعاد تقرر تین یا پانچ سال رکھی جاتی۔ گال کی حکومت کی طرح شام کی حکومت کو حد درجہ عزت و وقار کا درجہ حاصل تھا اور اس کی طلب سب سے بڑھ کر رہتی تھی[2]۔ مشرق میں شام اور مغرب میں گال فوجی ضبط و نظم کے دو بڑے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ حاکم کے ساتھ کارکنوں کی خاصی تعداد امداد کے لیے مقرر ہوتی۔ ان میں وہ مالی وکیل بھی شامل تھے جو سرکاری خراج وصول کیا کرتے تھے۔ محصول براہِ راست بھی وصول کیے جاتے۔ کبھی کبھی محاصل کا اجارہ بھی دے دیا جاتا۔ حاکم کے ماتحت زبردست فوجی قوت ہوتی، جس میں چار جیش ہوتے۔ سلطنت کے ابتدائی دور میں یہ فوجی عموماً اطالوی ہی ہوتے، حاکم شام کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ مغربی ایشیا میں تمام رومی مقبوضات کی حفاظت کا فرض انجام دے۔ ابتدائی دور کے حاکموں میں سے ایک قیرینیوس[3] بھی تھا، جسے قیصر آگسٹس نے مقرر کیا تھا اور اس نے یہودیوں کی مردم شماری کرائی تھی۔ پونٹس پلاطس دراصل یہودیہ کا مالی وکیل تھا (۲۶ء تا ۳۶ء) اور ٹائبیریس نے اسے حاکم شام کے ماتحت تمام انتظامات کا مختار بنا دیا تھا۔ ایک حاکم نے جس کا نام ویٹیلیوس[4] تھا، پلاطس کو اس وجہ سے برطرف کر دیا کہ اس نے سامریوں کے ساتھ برا برتاؤ کیا تھا[5]۔

---

۱ دیکھیے لوقا کی انجیل باب ۲، آیت ۲۔

۲ گورنروں کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو گستاو اے ہیرر Harrer کی کتاب۔

۳ Quirinius لوقا کی انجیل میں اسے کورینیوس Cyrenius لکھا ہے۔ جوزیفس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو ۶ء کے آس پاس شام کا گورنر بنایا گیا۔ جس حاکم کے زمانے میں حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے اس کا نام کوئنٹلیس ویرس Quintilius Varus

۴ Vitellius

۵ جوزیفس نیز لوقا کی انجیل باب ۳، آیت ۱۔

مقامی حکومت

مقامی گروہ مختلف نظاموں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے۔ یونانی و مقدونی نوآبادیوں کے اپنے مجسٹریٹ ہوتے تھے جن کے ساتھ ایک سینٹ ہوتا اور ایک عوامی مجلس۔ اس انتظام کا نمونہ وہی تھا جس پر یونان کی ابتدائی شہری ریاستوں کا نظام مبنی تھا۔ فونیقی شہری ریاستوں نے اپنے ہاں کا نظام جاری رکھا یعنی انتظامات کی باگ ڈور امراء کے ہاتھ میں تھی۔ اس نظام پر ایک حد تک یونانی رنگ چڑھ گیا تھا۔ اندرونِ ملک کی آرامی آبادیوں نے اپنا پرانا نظم و نسق جاری رکھا۔ عربوں میں ایک سے زیادہ نظام جاری تھے حمص کی حکومت کاہن حاکموں کے ہاتھ میں تھی۔ چالسس (عنجر) میں بھی جو مزید جنوبی جانب نشیبی شام میں تھا، ایک مقامی حکمران موجود تھا ان دونوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا سلسلہ پہلی صدی عیسوی تک جاری رہا صحرا کے حاشیے پر، جہاں خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قبائل موجود تھے اور زندگی کے اوضاع بھی خانہ بدوشی یا نیم خانہ بدوشی کے تھے، وہاں قبائلی نظام جاری تھا اور قبیلے کے شیخ کو حکومت کا ذمہ دار گروانا جاتا تھا۔ یہودیہ میں بادشاہی نہیں رہی تھی، مگر کاہن اعظم کو جماعت کا رئیس سمجھا جاتا تھا، اسے یہودی امرا منتخب کرتے تھے۔ اس تنوع اور اختلاف کے ہوتے ہوئے رومہ نے انتہائی رواداری کا مظاہرہ کیا۔

نظم و نسق کے اس اختلاف و تنوع کے پیچھے ایک قومی اور حضارتی یکسانی موجود تھی، جو سابق کی تمام مروج چیزوں پر فائق تھی۔ اس وقت تک تمام شامیوں نے پوری طرح سامیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا وہ ایک زبان بولتے تھے، یعنی آرامی اور ان میں سے پڑھے لکھے ایک زبان میں تحریر و کتابت کے عادی تھے اور وہ یونانی زبان تھی، فونیقیوں پر ان کے مشرقی ہمسایوں اور ہم قوموں یعنی آرامیوں کے مقابلے میں یونانیت کی زیادہ بہتر تہ چڑھ چکی تھی اور وہ پہلی صدی عیسوی تک اپنی مادری زبان پر قابو کھو چکے تھے، جو ان کی افریقی نوآبادیوں میں بہت بعد تک رائج رہی۔ یہودیوں کا دائرہ اس وقت تک صرف یہودیہ تک محدود نہیں رہا تھا، بلکہ وہ تمام بڑے شامی شہروں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر چکے تھے، وہ عبرانی کو ایک مقدس زبان قرار دیتے تھے، عربوں کے دو گروہ تھے، اول اتوری، جنہیں شمالی فلسطین میں اقتدار حاصل تھا، دوم ادومی جو فلسطین کے جنوبی و مغربی حصے میں آباد تھے وہ برائے نام یہودی محسوب ہوتے تھے یہ دونوں گروہ آرامی زبان اختیار کر لینے کی طرف مائل تھے۔ تاہم جو عرب اس وقت تک حضری نہیں بنے تھے، وہ برابر عربی بولتے تھے۔ مزید جنوب میں نبطی تھے عربوں میں سے انہیں رومیوں کے ساتھ زیادہ گہرا تعلق پیدا کر لینے کا موقع ملا وہ بول چال میں برابر عربی کے استعمال پر مصر رہے تاہم کتابت کے لیے انہوں نے بھی آرامی زبان ہی اختیار کر لی۔ غرض بہ حیثیت مجموعی بہ نقشہ تل العمارنہ کے عہد کی قومی اور حضارتی قوضویت سے بالکل مختلف تھا۔

یونانی و مقدونی عنصر تمام شامی شہروں میں بکھرا ہوا تھا، خصوصاً ان شہروں میں جو سلیوکیوں نے آباد کیے تھے —— انطاکیہ، سلوکیہ اپامیا اور لاذقیہ —— بالکل یہی کیفیت تجارتی مرکزوں کی تھی، یعنی ساحل کے فونیقی اور فلسطین کے شہر اور اندرونِ ملک میں دمشق اور تدمر۔ یہ آبادکاران مقدونیوں اور یونانیوں کے اخلاف تھے، جو جنگجوؤں، تاجروں، فن کاروں یا طالع آزماؤں کی حیثیت میں مشرق پہنچ گئے تھے، خواہ ان کی غرض یہ تھی کہ سیاست میں اونچا درجہ حاصل کریں یا یہ تھی کہ دوسرے ذرائع سے دولت کمائیں۔ رومیوں نے صرف چند نوآبادیاں قائم کیں، ان کے جنگجوؤں کی ایک نوآبادی آگسٹس کے زمانے میں بمقام بیروت قائم ہوئی، دوسری بعلبک میں قائم ہوئی۔ دونوں نے رومی حضارت کے خاص مرکزوں کا درجہ حاصل کیا۔ لاطینی بسنے والی نوآبادیوں کے مقابلے میں یونانی بدلنے

والی نوآبادیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ پھر لاطینی بولنے والی نوآبادیوں کے بہت سے لوگ بھی یونانی جانتے تھے اور وہ اسی زبان میں مقامی باشندوں یا دوسرے آبادکاروں سے بات چیت کرتے تھے، لیکن یونانیوں کے برعکس رومیوں کی عادت یہ تھی کہ وہ الگ تھلگ رہتے تھے اور ان لوگوں کی معاشرت کا انہیں کوئی احساس نہ تھا جن پر وہ حکمران تھے۔ رومیوں کی غرض محض یہ تھی کہ شام کو دشمن کے خلاف مرکز کے طور پر استعمال کرسکیں اور اس کے وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔ شامیوں کو رومیوں کی جنگی کارروائیوں سے قطعاً کوئی سروکار نہ تھا، البتہ ان کی اپنی حفاظت کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا تو ضرور اس کی طرف متوجہ ہوتے۔

رومیوں کا کام

شام ویسی ہی بلند تہذیب کا مالک تھا، جیسی رومیوں کی تہذیب تھی، اگرچہ شامی تہذیب کی حیثیت مختلف تھی۔ اس وجہ سے رومی نظم و نسق شام میں اس پیمانے پر کامیاب یا بہ اعتبار نتائج شاندار ثابت نہ ہوا، جس پیمانے پر ہسپانیہ یا گال جیسے نامہذب علاقوں میں ثابت ہوا۔ شام میں جو نئی یونانی نوآبادیاں، فونیقی شہر اور یہودی قصبے موجود تھے، ان کی مجلسی و اجتماعی اور ذہنی اقتصادی زندگی خاصی ترقی یافتہ تھی۔ ان میں علوم و فنون، فلسفے اور ادبیات کے دبستان موجود تھے وہ رومیوں سے کچھ زیادہ حاصل نہیں کرسکتے تھے ان کے لیے لاطینی زبان ایک بند کتاب بنی رہی۔[1] لیکن عربوں اور آرامی عربوں کی کیفیت مختلف تھی۔ ان کے درمیان شرقی لبنان کے مشرق میں، نیز شرقِ اردن کے حضری علاقے میں رومیوں کی نوآبادیاں موجود تھیں۔ ان کی ابتدا اطالوی آبادکاروں سے ہوئی تھی۔ ان کے اردگرد اور گروہ جمع ہوگئے اور ایک خاص وضع کی جماعتیں نشو و ارتقا پاگئیں یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ٹراجن نے ۱۰۶ء میں شرقِ اردن اور حوران کو سلطنت میں شامل کرلیا۔ حوران ایک زمانے میں نبطیوں کے ماتحت تھا۔ آگسٹس نے اسے ہیرودیس کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۰۶ء میں ٹراجن نے پیڑا کو مسخر کرلیا چنانچہ اسے عربی صوبے کے نام سے سلطنت کا جزو بنا یا گیا، شام مشرقِ قریب میں رومی قوت کا مرکز تھا، یہی وجہ ہے کہ نظم و نسق کے ذمہ داروں نے صحرائی علاقے کے حاشیے پر چوکیوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا تاکہ آباد و مہذب علاقے زیادہ محفوظ ہو جائیں۔ ان چوکیوں میں وہ امدادی فوج بٹھائی جاتی تھی، جو حلیف قبیلیوں میں سے بھرتی کی جاتی تھی۔ مشرق سے مغرب کی طرف آنے والی شاہراہ، جو دجلہ و فرات کے شہروں کو بحیرۂ روم سے ملاتی تھی اور تدمر سے گزرتی تھی، محولہ بالا علاقے ہی میں سے جاتی تھی، اس علاقے میں سے ایک راستہ شمالاً جنوباً بھی گزرتا تھا جسے رومی "طریق مارس"[2] کہتے تھے اور بائیبل میں اسے "شاہراہ" کہا گیا ہے۔[3] یہ شاہراہ دمشق سے حوران اور وہاں سے جلعاد و موآب ہوتی ہوئی جنوب میں عرب کے کاروانی راستے سے مل جاتی تھی، یہ مسیح علیہ السلام سے بیشتر دوسرے ہزار سال میں بنی تھی۔ شرقِ اردن کی یہ سب سے بڑی سڑک تھی، ٹراجن نے اس پر فرش لگوا دیا اور رومی فوج سے عسکری شاہراہ کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ بعد ازاں مسلم زائرین و حجاج بھی اسی سے جاتے آتے رہے۔[4] نئی سہولتوں کے بہم پہنچنے سے خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش گروہوں میں بھی حضری زندگی اختیار کرلینے کا رجحان پیدا ہوا۔ رومیوں کی

---

[1] بوشیر ص ۵

[2] Via Maria

[3] پیدائش باب ۱۴، آیات ۱-۵۔ گنتی باب ۲۱، آیت ۱۷، باب ۲۱، آیت ۲۲۔ رومی سڑکوں سے متعلق مزید معلومات کے لیے پیٹر تامسن کی جرمن کتاب نیز کرسٹینا پی گرانٹ کی کتاب The Syrian Desert دیکھیے

[4] شرقِ اردن کی حکومت نے اس سڑک کو از سر نو درست کرا دیا ہے اور اب اسے ملک عبداللہ کی سڑک کہتے ہیں۔

پالیسی کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ لوگوں میں جم کر بیٹھنے اور حضری زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

غرض رومی نظم و نسق نے شام میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا، یہ تھا کہ اسے اندرونی اختلال سے پاک رکھا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں حفاظت کا بندوبست کیا۔ اس طرح شام کے لیے ایک وسیع اور عالمی منڈی کا دروازہ کھول دیا۔

شام کا دورِ عروج

شاہنشاہی حکمرانی کی پہلی صدی میں (۳۱ق م - ۶۸ء) شام تیزی کے ساتھ یقینی طور پر انحطاط کے غار سے باہر آگیا، جس میں اجنبی حکمرانی اور خانہ جنگی نے اسے گرادیا تھا۔ یہ اس سلطنت کا ایک جزو تھا، جو اٹلانٹک اور بحیرۂ شمالی سے دریائے فرات تک، دریائے رہائن اور دریائے ڈینیوب سے صحرائے اعظم تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہنشاہی عساکر کے زیر سایہ امن و نظم کا دور دورہ تھا، رہزنی اور قزاقی سے حفاظت کا پورا بندوبست ہو چکا تھا، پارتھیوں اور عربوں کی یورشیں روک دی گئی تھیں۔ جنگی اہمیت والے درّوں مثلاً درہ سیلیشیا کی پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ سڑکوں کا جال بچھ چکا تھا، جن کی وجہ سے سلطنت کے تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہو کر ایک مربوط کل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ یہ انتظامی اور ہندسی ہنرمندی کا نہایت ممتاز کارنامہ تھا۔ شام کی سڑکوں پر جو سنگ ہائے میل نصب تھے، ان میں سے متعدد اس وقت تک موجود ہیں، رومیوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سڑکوں کی درستی کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان پر کہیں پانی جمع نہیں ہونے دیتے تھے۔ آگسٹس نے ڈاک کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے مرکزی حکومت نے صوبائی کارندوں کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ تجارت کو خوب فروغ ہوا۔ خوشحالی کا درجہ پھر بلند ہو گیا۔ ۶۸ء کے بعد پوری رومی سلطنت کو طویل مدت کے لیے بڑے داخلی ہنگاموں سے نجات مل گئی۔ ۹۶ء سے ۱۸۰ء تک مسلسل قابل شاہنشاہ تخت نشین ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ نروا سے شروع ہوا اور مارکس آریلیس پر ختم ہوا۔ اس عہد کو "صالح شاہنشاہوں کا عہد" کہتے ہیں[1]۔ کسی بڑی سلطنت کا نظم و نسق اس سے بہتر نہ تھا جیسا کہ دوسری صدی عیسوی میں رومی سلطنت کا رہا۔ ہیڈرین (۱۱۷ء - ۱۳۸ء) پہلے شام میں نائب رہ چکا تھا۔ اس کی شاہنشاہی کے زمانے میں سلطنت عروج کے آخری نقطے پر پہنچ گئی۔ اس کے پیشرو ٹراجن (۹۸ء - ۱۱۷ء) کے عہد میں رومی شام کے حدود زیادہ سے زیادہ وسیع ہو گئے اور اس کی خوشحالی و اقبال مندی کمال پر پہنچ گئی[2]۔

اس صدی میں اٹلانٹک سے وسط ایشیا تک قریباً پوری مہذب دنیا ایک حکمران کے ماتحت متحد تھی۔ اس سے پیشتر کبھی ایسی

---

[1] ان صالح بادشاہوں کا شجرۂ نسب یہ ہے:

۱۲- نروا	Narva	۹۶ء - ۹۸ء
۱۳- ٹراجن	Trajan	۹۸ء - ۱۱۷ء
۱۴- ہیڈرین	Hadrian	۱۱۷ء - ۱۳۸ء
۱۵- انٹونینس پائس	Antonim Pius	۱۳۸ء - ۱۶۱ء
۱۶- مارکس آریلیس	Marcus Aurelius	۱۶۱ء - ۱۸۰ء

یہ بتا دینا چاہیے کہ ان کے درمیان نسبی تعلق نہ تھا۔ بلکہ سب کا تعلق متبنیٰ باپ اور متبنیٰ بیٹے کا تھا۔ انٹونینس پائس کا نسبی بیٹا کموڈس Commodus تھا جو مارکس آریلیس کے بعد ۱۸۰ء میں بادشاہ بنا اور ۱۹۲ء تک تخت نشین رہا۔

[2] بوشٹر ص ۴۰۔

شاہنشاہی ظہور میں نہیں آئی تھی۔ اس وسیع مملکت میں تہذیب کا چراغ بلندی پر روشن تھا اور تاریخ کے کسی سابق دور میں اس کی روشنی اتنی صاف اور شاندار کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مملکت کے وسط میں بحیرۂ روم واقع تھا یہ تہذیب کی شعاعوں اور حیات نو کی ضیا باریوں کا مرکز تھا۔ سفر کی سہولتوں اور جان و مال کی حفاظت کا یہ عالم تھا کہ جو شخص جب چاہتا۔ انگلستان میں یارک سے دریائے فرات تک بے تکلف سفر کر سکتا تھا۔ ایک زبان، یعنی یونانی کی ایک خاص وضع سے کام لیتا ہوا وہ ہسپانیہ سے وادی سندھ تک ہر آبادی میں اپنی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔

شام کی پوزیشن ایک ممتاز صوبے کی حیثیت میں سلطنت کے اندر اس وجہ سے بطور خاص محفوظ ہو گئی کہ ۶۹ء میں جو عساکر یہاں تھے، انہوں نے اپنے سالار اعظم ویسپیسیان[1] کو شاہنشاہی تخت پر بٹھا دیا اور حریف کامیاب نہ ہو سکا، جسے جرمنی والے عساکر کی حمایت حاصل تھی۔ ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر گئی کہ افواہ پھیلی، مارکس آریلیس مر گیا ہے۔ شام کے لشکروں نے اپنے سالار ایویڈیس کاسیس[2] کی شاہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ شخص شمالی شام کے مقام کرہائی کا باشندہ اور مشرقی صوبوں کا حاکم تھا۔

اقتصادی پیداوار

تحفظ کے احساس، سڑکوں کے نظام کی توسیع اور عالمی تجارت کے مواقع کی بہم رسانی نے اقتصادی پیداوار کو اتنی ترقی دی۔ کہ پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی، خوش حالی درجہ معیشت میں منعکس ہوئی اور نئے شہر وجود میں آ گئے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی میں شام کبیر کی آبادی بڑھتے بڑھتے ستر لاکھ تک پہنچ گئی ہو گی۔ اس سے آگے آبادی کسی بھی عہد میں نہ بڑھی۔ جس حد تک نشیبی شام کا متعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پیداوار میں افزائش کا ایک اور سبب تھا یعنی دریائے عاصی سے زمینوں کی آبیاری کا انتظام وسیع پیمانے پر کر لیا گیا تھا۔ رومی عہد کی فنی ایجادات کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ رول ہل میں بعض اصلاحات کر دی گئیں۔ دوسرے وہ شے ایجاد ہوئی، جسے ارشمیدس کا پیچ کہتے ہیں، تیسرے پن چکی ایجاد ہوئی، پن چرخی میں بھی اصلاح ہو گئی، یقین ہے کہ پوری وادی اعلیٰ پیمانے پر کاشت کا مرکز بن گئی ہو گی۔ آج کل یہ بالکل بنجر ہے۔ حمص کے مشرق میں تیل نکالنے کے شکنجے ملے ہیں، حالانکہ اب وہاں کوئی ایسا درخت موجود نہیں، جس کے پھل سے تیل نکالا جا سکتا ہو۔ آگسٹس کے زمانے میں مردم شماری میں افامیا کی آبادی ایک لاکھ ستر ہزار تھی۔ اب وہ بالکل ویران ہے، شرق اردن آج کل زیادہ صحرا بنا ہوا ہے، لیکن جوزیفس کے عہد میں یہاں بہ کثرت فصلیں پیدا ہوتی تھیں اور میدانی علاقے میں کھجور، انگور اور زیتون کے درخت ہوتے تھے۔ شرق اردن سے ملا ہوا علاقہ شمال میں حوران ہے، اس کی زرخیزی ضرب المثل تھی۔ پہلے اس علاقے میں ریوڑ چرائے جاتے تھے اور نیم خانہ بدوش قبائل رہتے تھے۔ رومیوں کی سرپرستی میں یہ علاقہ شہروں اور دیہات سے بھر گیا۔ پورے علاقے میں بند تعمیر کر کے پانی کے ذخیرے مہیا کر لیے گئے تھے۔ بارش اگرچہ بے قاعدہ ہوتی تھی، مگر خاصا پانی جمع ہو جاتا تھا اور اس سے فصلوں کی آبیاری کا کام لیا جاتا تھا۔ حوران صحرا کی عین دہلیز پر واقع ہے۔ بُصریٰ[3] اس کا دار الحکومت تھا۔ صحرا کے قبائلی سب سے پہلے بصریٰ ہی میں آباد ہوئے تھے اور انہوں نے کھیتی باڑی شروع کی تھی۔ ٹراجن کے عہد حکومت میں

---

[1] Vespasian

[2] Avidius Cassius

[3] پرانے زمانے میں اسے Bostra لکھتے تھے۔ ترک اس کو شام کہتے تھے، یعنی دمشق قدیم، لیکن اب اسے بُصریٰ کہتے ہیں۔

شہر کی توسیع ہوئی، اس میں استحکامات کا انتظام کیا گیا اور نام تو دا ٹرا جانا بصریٰ[۱] رکھا گیا، دمشق، بحیرہ روم، بحیرہ قلزم اور خلیج فارس کی طرف جانے والی سڑکیں یہاں ملتی تھیں۔ ڈایوکلیشین[۲] (۲۸۴ء۔ ۳۰۵ء) کے بعد بصریٰ عربی صوبے کا دار الحکومت بن گیا۔ اس علاقے نے رومیوں کے عہد میں خوش حالی کا جو درجہ حاصل کیا وہ اموییوں کے عہد میں بھی حاصل نہ ہو سکا، اگرچہ دمشق امویوں کا مرکز تھا۔[۳]

زراعت

سٹرابو (وفات قریباً ۲۴ء)، پلینی (وفات ۷۹ء)، اینتھناؤس[۴] (۲۲۸ء) اور دوسرے لاطینی مصنفوں کی متفرق عبارتوں سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ شام میں زراعت عموماً بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی، لبنان کے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں درختوں سے بھر پور تھیں ان کا منظر وہی تھا جو پہلے نظر آتا تھا۔ بہت سے مصنفین نے ان پہاڑوں کو لکڑی کے مشہور خطوں میں شامل کیا ہے سمجھا جا سکتا ہے کہ کم از کم دیوداروں کی ضرور حفاظت کی جاتی ہوگی اور انہیں قاعدے کے مطابق کاٹا جاتا ہوگا۔ پلینی نے شام کے درختوں میں مندرجہ ذیل شامل کیے ہیں، کھجور، پستہ، انجیر، دیودار، عرعر (سرد کوہی) مسلم (تارپین کا درخت) اور سماق، پہلی صدی مسیحی میں شام کے بہت سے درخت اٹلی پہنچ گئے۔ وٹیلیئس[۵] کے بارے میں، جو قیصر ٹائبیریس کی طرف سے نائب مقرر ہوا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے انجیر اور پستے کی کئی قسمیں اپنے دیہاتی مقام البا لونگا[۶] پہنچا دی تھیں۔ نکولاسے دمشقی، ہیرودیس کے ساتھ روما گیا تھا تو اس نے بہترین قسم کی کھجوریں آگسٹس قیصر کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شہد کی طرح شیریں تھیں اور اتنی لمبی تھیں کہ چار دانے آگے پیچھے رکھ دیئے جاتے تو ایک بالشت کے برابر ہو جاتے تھے۔[۷] ان کھجوروں کا نام ہی نکولائی کھجوریں پڑ گیا تھا۔ انگوروں اور دوسرے میوہ دار درختوں کی کاشت میں پانی کی مشینوں کے علاوہ کھاد کے ترقی یافتہ وسائل اختیار کیے جاتے تھے۔[۸] کشمش کا پودا پلینی کے زمانے سے بہت پہلے اٹلی پہنچ گیا تھا اور عناب کا درخت پلینی سے کچھ دیر پہلے پہنچا تھا۔[۹] روغنی پھلوں والے درختوں کے سلسلے میں پلینی نے ایک درخت کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے، جو شام کے ساحلی علاقے میں خود رو ہوتا تھا۔ اس سے جو روغن نکلتا تھا، اس میں سے خوشگوار بو نکلتی تھی اور طبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، ممکن ہے یہ بطم کی کوئی قسم ہو۔

غلہ خاص غذائی جنس تھی۔ عام خوردنی اجناس کے علاوہ چاول ساحلی علاقے میں کہیں کہیں بوئے جاتے تھے اس لیے کہ یہ آبیاری کے خاص انتظامات کے متقاضی تھے۔ غلے کے ساتھ پتوں والی سبزیاں بھی کاشت کی جاتی تھیں۔[۱۰] گوشت کی باقاعدہ مانگ صرف امراء کے

---

[۱] Nova Traiana Bostra

[۲] Diocletian

[۳] معجم البلدان یاقوت حموی جلد دوم ص ۳۵۸۔

[۴] Athenaeus

[۵] Vitellius

[۶] Alba Longa

[۷] پلینی کتاب ۱۳، باب ۹ اینتھناؤس کتاب ۱۴، باب ۲۲۔

[۸] ملاحظہ یوحنا کی انجیل باب ۲۱، آیت ۳۳

[۹] دیکھیے پلینی کی کتاب ۱۳، باب ۱۰، کتاب ۱۵، ابواب ۱۲، ۱۴

[۱۰] سٹرابو کتاب ۱۵، باب ۱۔

طبقوں کو ہوتی تھی۔ سبزیوں میں سے عدس، لوبیا، فرانسیسی بین (فراشبین)، مسٹر، وچ اور باقلائے مصر قابل ذکر ہیں۔ باقلائے مصر مویشی کے لیے بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ گانٹھ والی سبزیوں میں پیاز، گندنا اور لہسن کو غریب لوگ بے حد پسند کرتے تھے۔ مسالوں میں سے دھنیا، زیرہ، رائی سونف، ادرک اور پودینہ شام میں بہ کثرت ہوتے تھے۔[1] ماخذ میں یروشلم کے گگر مٹے، ہیلیوس کے لہسن اور عسقلان کی پیاز کا ذکر کیا گیا ہے۔[2] عسقلان میں حنا بھی ہوتی تھی، جو بڑی قیمت پاتی تھی۔ شام کی گوبھی بھی بہت پسند کی جاتی تھی۔ مولی کی مختلف قسموں کا ذکر کرتے ہوئے پلینی کہتا ہے کہ شام کی مولی بہترین ہے، جو حال ہی میں اٹلی پہنچی ہے۔[3] تاریخ طبعی کے اس مستند استاد کے نزدیک انطاکیہ اور لاذقیہ کی سوسن سب سے بڑھ کر قیمتی مانی جاتی تھی۔[4] پیپرس بھی کاشت کیا جاتا تھا اور اسے تحریر کے کام میں لایا جاتا تھا۔ سن، سن ککڑا اور کپاس کی کاشت پورے مغربی ایشیا میں ہوتی تھی۔ اصل السوس (ملٹھی) اب بن انطاکیہ کے آس پاس دلدلی زمینوں کے نزدیک یا دریاؤں کے کناروں پر خود رو ہوتی ہے۔

باغات

شام کے باغات بھی قدیم رومی تہذیب کا ایک خوش گوار پہلو تھے۔ باغات لگانے کا سلسلہ سامیوں کے ابتدائی زمانے ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ان پھلوں، سبزیوں اور پھلوں کو وسیع پیمانے پر کاشت کیا گیا، جن کا انحصار موسم گرما کی آبیاری پر تھا۔ سامی بہشت بھی ایک باغ تھا، جو خدا نے عدن کے مشرق کی طرف لگایا تھا۔[5] اس کی وضع و ہیئت بھی ان دنیوی باغوں کی سی تھی، جو فلسطین سے ایران تک لگے ہوئے تھے اور ان میں آبیاری کا خاص بندوبست کیا گیا تھا۔ باغ لگانے کی تحریک ایرانیوں کے دور اقتدار میں ہوئی اور رومیوں کے عہد میں یہ سلسلہ کمال پر پہنچ گیا۔ لوگ محض اپنے نجی باغ ہی نہیں لگاتے تھے، بلکہ عوامی باغ بھی ہوتے تھے۔ مثلاً مقدس باغات یا وہ باغات، جو معبدوں کے صحن میں لگائے جاتے تھے۔ دفنہ، جہاں معبد بھی تھا اور باغ بھی اور وہ اپولو کے لیے مخصوص تھا، رومی دنیا میں اسے جمیل ترین خطوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے مملکت کے زائر اور ناظر دونوں آتے تھے۔ پھولوں کے ایسے خیابان جن میں لوگ عیش و راحت کی غرض سے الگ جا بیٹھتے تھے، بحیرہ روم کی تہذیب کے خاص مظہر تھے۔ انطاکیہ، دمشق اور یروشلم میں ایسے خیابان موجود تھے، وہاں سے یہ رومہ پہنچے، پھر غرناطہ (اندلس) میں نمودار ہوئے۔ دمشق کے خاص مکانوں کے صحن دیکھو، ان میں اب بھی فوارے لگے ہوئے ہیں، جن سے پانی ایک جادو کی شکل میں نکلتا ہے۔

صنعت و حرفت

صور و صیدا کے اضلاع میں پارچہ بافی کی صنعت جاری تھی۔ رنگ بنانے کی صنعت وہاں رومیوں کے عہد میں بھی جاری رہی۔ فونیقیہ کے ارغوانی رنگ کو ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سٹرابو کے زمانے میں رنگ سازی کے کارخانوں کی اس درجہ کثرت ہو گئی

---

[1] گنتی باب ۱۱، آیت ۷۔ یسعیاہ باب ۲۸، آیات ۲۵، ۲۷۔ متی کی انجیل باب ۱۳، آیت ۳۱۔ باب ۲۳، آیت ۲۳۔ مرقس کی انجیل باب ۴، آیت ۳۱۔

[2] سٹرابو کتاب ۱۶، باب ۲، پلینی کتاب ۱۹، باب ۳۲۔

[3] کتاب ۱۹، باب ۲۶۔

[4] کتاب ۲۱، باب ۱۱

[5] پیدائش باب ۲، آیت ۸۔

تھی کہ صور رہنے کے لیئے ناخوش گوار مقام بن گیا تھا[1] پلینی کہتا ہے کہ سماق کے پتے چمڑا رنگنے کے لیئے استعمال کیئے جاتے تھے[2] آج بھی ان سے یہی کام لیا جاتا ہے شام و مصر میں سوتی پارچے اور چمڑے کے بہترین مرکز تھے سب صنعتیں دستکاری پر موقوف تھیں نہ نئے تجربے کئے جاتے تھے اور نہ کوئی مشینری ایجاد ہوئی تھی اس لیئے صنعت ایک حالت پر قائم رہی متعدد شامی درخت اور پودے دوا سازی، اور عطر سازی کے لیئے استعمال ہوتے تھے یہ چیزیں ملکی ضرورت کے کام بھی آتی تھیں اور باہر بھی بھیجی جاتی تھیں شام کی شرابوں کو دنیائے قدیم میں خاص ہر دلعزیزی حاصل تھی انطاکیہ، ہیلیوس، طرابلس (الشام)، بیروت (لبنان)، حوران، عسقلان اور غزہ شراب سازی کے مرکز تھے، افامیا کی شراب کو شہد کی آمیزش کے لیئے بہت موزوں سمجھا جاتا تھا جلیل کی شراب کا ذکر عہد نامہ جدید میں بھی آیا ہے[3]

معدنیات میں سے جو چیز پہلے پہل زیادہ مقدار میں ملی وہ رال تھی جس کے وسیع ذخیرے بحیرہ لوط کے حلقے میں موجود تھے اور کچھ ذخیرے صیدا کے قرب و جوار میں بھی مل جاتے تھے[4] شامی شنگرف اور ہڑتال مصوری میں استعمال ہوتے تھے ہڑتال شہر[illegible]ـت کی پائی جاتی تھی یعنی زرنیخ زرد[5] کہربا سے جو کام لیئے جاتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عورتیں تکلوں کے لیئے ٹکیاں بنوا آتی تھیں[6]۔

چونے کا پتھر جو دمشق سے ملتا تھا اس کا رنگ دوسری قسموں کے مقابلے میں زیادہ سفید ہوتا تھا[7] معلوم ہوتا ہے کہ جپسم شام میں اسی طرح تیار ہوتا تھا جس طرح آج کل پیرس میں پلستر تیار کیا جاتا ہے انطاکیہ کے نزدیک پتھروں کے ذخیرے موجود تھے وہاں سیلیوس پولس کی طرح کھریا مٹی کے ذخیرے تھے تانبا کوہ لبنان میں بھی نکلتا تھا اور جنوبی فلسطین میں بھی، مثلاً اریحا کے آس پاس یا دریائے اردن کے منبع کے قریب، مشرق قریب کی زیادہ تر کانوں پر حکومت کا قبضہ تھا اور وہ غلاموں سے ان کانوں میں کام لیتی تھیں بت بھی [illegible] تراشے جاتے تھے جب شاہنشاہ کیلگولا (۳۷ء ۔ ۴۱ء) نے اپنا ایک بڑا مجسمہ تیار کرانا چاہا تا کہ اسے یروشلم کے ہیکل میں رکھوا دے تو شام کے نائب حکومت نے صیدا کے ایک کاریگر کو اس کام پہ لگایا[8] ہر پیشے کے آدمیوں نے اپنی حفاظت اور فائدے کے لیئے انجمنیں بنائی تھیں مثلاً تاجر، جہاز ساز، دو کاندار، فن کار۔ تدمر میں سناروں کی بھی ایک انجمن تھی اور جباساد (جرش) میں کمہاروں نے ایک خاص جماعت بنا رکھی تھی شاہنشاہ ڈایو کلیشن نے انطاکیہ، دمشق اور اوڈیسا میں اسلحہ کے سرکاری کارخانے قائم کر دیئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بیشتر بھی وہاں ایسے کارخانے کسی نہ کسی شکل میں وہاں موجود ہوں گے

تجارت

تجارت خواہ داخلی تھی یا خارجی، دولت حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھی مشرق قریب میں رومی دور کے سب سے زیادہ دولت مند

---

[1] کتاب ۱۲، باب ۲۔

[2] کتاب ۱۳، باب ۱۳ عہد نامہ جدید میں یافا کے ایک دباغ کا ذکر ہے (اعمال باب ۹ آیت ۴۳ باب ۱۰ آیت ۶)

[3] یوحنا کی انجیل باب ۲ (آیت ۲۔

[4] پلینی کتاب ۳۵۔ باب ۵۱۔

[5] ایضاً کتاب ۳۰ باب ۲۲۔

[6] ایضاً کتاب نمبر ۳۷ باب ۲

[7] ایضاً کتاب ۳۶ باب ۱۲۔

[8] فلو Philo (جو دائیس) کی کتاب Opera

شہر وہ تھے جہاں تجارت کی ریل پیل تھی مثلاً پیٹرا، تدمر، جرش اور فونیقی ساحل کے مشہور مقامات تاجروں کے بعد دولت میں دوسرا درجہ صنعت کاروں اور زمینداروں کا تھا۔

تاجر عموماً ملکی باشندے تھے رومی تاجر اس وقت نمودار ہوئے جب پمپی نے شام کا الحاق کر لیا تھا اور یہ تاجر بحیرۂ روم کی مشرقی سرزمین کے لئے ایک انوکھا نظارہ تھے وہ یا تو خالص اطالوی ہوتے یا یونانی و اطالوی۔ پہلے پہل انطاکیہ میں ان کی آبادی شروع ہوئی قیصر آگسٹس کے زمانے تک یہ لوگ پیٹرا پہنچ گئے تھے، لیکن پہلی صدی عیسوی میں ان تاجروں نے شامیوں کے مقابلے میں پیچھے ہٹنا شروع کیا، اس لئے کہ ایک تو شامی تاجر زیادہ تجربہ کار اور دوراندیش حریف تھے، دوسرے رومی تاجروں کے لئے مغرب میں نئی منڈیاں کھل گئی تھیں، یہاں تک کہ مشرق سے وہ بالکل ناپید ہو گئے تجارت بھی صنعت و حرفت کی طرح انفرادی ہی رہی کمپنیوں یا اشتراک کا سلسلہ شاذ ہی دکھائی دیا، بردہ فروشی بدستور زوروں پر رہی جن مقروضوں کا دوالیہ نکل گیا، ہو تا وہ قرض دہندوں کے حوالے ہو جاتے، پیشہ ور بردہ فروش غافل نوجوانوں کو پکڑ کر فروخت کر ڈالتے، بچوں کو اغوا کر لیتے یا جن بچوں کو غیر مطلوب سمجھا جاتا انہیں خرید لیتے۔

شامی تجارت کے لئے رومیوں کے عہد میں سنہری دور وہ تھا جب تدمر، جرش، بصرا، پیٹرا اور دورا یوروپس کے کاروانی شہر پر رونق تجارتی مرکز تھے بحری راستوں کو تقویت اس نہر سے پہنچی جسے شاہنشاہ ٹراجن نے از سر نو جاری کر دیا تھا اور دریائے نیل کا تعلق بحیرۂ قلزم کی شمالی و مغربی شاخ سے پیدا ہو گیا تھا یہ نہر پہلے پہل ابتدائی دور کے فرعونوں نے کھدوائی تھی فونیقی شہروں سے کھجوریں اور گندم کا نہایت عمدہ آٹا باہر بھیجا جاتا تھا[1] شام سے جو لوبان دوسرے ملکوں میں جاتا تھا وہ اصل میں جنوبی عرب سے آتا تھا، جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی دوائیں نیز خوشبودار پودوں سے نکالا ہوا عطر مغربی ایشیا سے پوری رومی دنیا میں پہنچتا تھا خوشبوئیں اور دوائیں، واقعی بہت ہر دلعزیز تھیں لاطینی کتابوں میں شامی گوند، سلفیوم، مجید، اریس اور بال چھڑ کا ذکر جا بجا آتا ہے شراب مختلف قسم کے تیل، خشک میوے مرہم اور مالش کی چیزیں خاصی مقدار میں برآمد کی جاتی تھیں، مصر قبرص، اٹلی اور جنوبی روس میں شیشے کے برتن ملے ہیں جو پہلی صدی عیسوی میں بنائے گئے تھے اور ان پر صیدا کے ایک شخص اینون کا نام درج تھا یہ شام کا نہایت مشہور شیشہ گر تھا خیال یہ ہے کہ اس کی کارگاہ کا ایک دفتر روما میں بھی ہو گا۔ صیدا کے ایک اور شیشہ گر نے اپنے دفتر کی ایک شاخ کورن جیسے دور افتادہ مقام میں قائم کر رکھی تھی پہلی صدی عیسوی کے وسط میں بہترین برنجی کام کرنے والے کاریگر بھی صیدا ہی میں رہتے تھے شام کے پارچہ بافوں کی بعض چیزیں ملک سے باہر مختلف مقامات میں ملیں مثلاً انہ اس قسم کا سوتی کپڑا، اونی سامان اور خوانی ریشم۔

شام میں جو چیزیں درآمد ہوتی تھیں یہ تھیں یونان اور اٹلی سے مٹی کے برتن، مصر اور ہسپانیہ سے خشک مچھلی جنوبی عرب سے مر اور لوبان ہندوستان سے مسالے اور جواہرات اور چین سے ریشم، عکہ مچھلی کی تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا جو لوگ ساحل پر آباد تھے وہ غذا میں عموماً سمندری جانور استعمال کرتے تھے پیپرس مصر سے آتا تھا اس سے لکھنے کا کام بھی لیا جاتا تھا اور اسے جہازوں کے دستوں میں بھی استعمال کرتے تھے۔

---

[1] ایتھی نائیوس Athenaeus کتاب اول باب ۲۸۔

تیئیسواں باب

شہری اور دیہاتی زندگی

دیہات

رومی عہد کے شام میں دیہاتی زندگی کی عام کیفیت پیشتر کے عہد سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ پوری زمین ہزاروں دیہات سے بھری تھی۔ ان میں عموماً کسان رہتے تھے جو تاکستانوں یا کھیتوں کی پیداوار پر زندگی بسر کرتے۔ ان دیہات میں نہ تو غلام کسانوں کا کوئی نشان پایا جاتا ہے، نہ غلاموں سے حقیر محنت مزدوری لی جاتی تھی۔ پولیس کا انتظام ان شہروں کے ذمے تھا جن کے علاقوں میں دیہات واقع تھے۔ ایسی کوئی بھی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ دیہات تعلیم یا حفظانِ صحت یا خیرات کے لئے روپیہ خرچ کرتے تھے[1]۔

اندازہ یہ ہے کہ ہر گاؤں کے آس پاس کی زمین شاملات یعنی مشترکہ ملکیت میں رکھی جاتی تھی اور اس سے جو کچھ وصول ہوتا وہ گاؤں کی مشترکہ ضرورتوں پر خرچ کیا جاتا۔ ایسے گاؤں بھی تھے جو وقتاً فوقتاً افراد کی ذاتی ملکیت بنتے رہے۔

دیہات کی عام آبادی کسانوں اور ان لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی جو کسانوں کے لئے مختلف خدمتیں انجام دیتے تھے، مثلاً بڑھئی، لوہار، موچی دکاندار وغیرہ۔ یہ دیہات رومیت کے رنگ سے بھی اسی طرح بڑی حد تک پاک رہے جس طرح یونانیت کے رنگ سے پاک رہے تھے۔ دیہاتی آبادی خصوصاً ان دیہات کے باشندے جو شہری مرکزوں سے دور تھے، زندگی کے روایتی طریقوں سے مضبوطی کے ساتھ چمٹے رہے۔ دمشق سے جنوب مشرق میں کوئی ایک سو میل کے فاصلے پر ایک ایسا پہاڑی خطہ ہے جو گذشتہ زمانے میں آتش فشاں رہ چکا تھا۔ وہاں "الصفا" میں کتبے ملتے ہیں وہ مسیحیت کی پہلی تین صدیوں کے ہیں۔ ان کے رسم الخط اور مضمون سے قدیم عادات و رسوم کی پابندی کا اظہار ہوتا ہے[2]۔

دولت مند طبقہ

کسانوں سے اوپر مقامی امراء کا طبقہ تھا۔ ان میں بڑے زمیندار نیز بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑوں کے مالک شامل تھے جو آس پاس کے قصبوں میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس طبقے کے افراد مذہبی معاملات میں بھی پیشوائی کا وظیفہ انجام دیتے تھے۔ کاروانی شہروں، ساحلی قصبوں اور یونانی و رومی نوآبادیوں میں دولت مند تاجر اور صنعت کار نیز سرکاری افسر رہتے تھے۔ شہروں میں غلامی نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو کام کرنا اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا تھا۔ بعض دولت مند لوگ اپنی فرصت کے اوقات شہر یا حکومت کی خدمت میں بسر کرتے۔ بعض ادب و فن میں مشغول رہتے، لیکن اکثریت ان "شریف" لوگوں کی تھی جو سارا وقت کھیلوں، رنگ رلیوں اور مجلسی مشغولیتوں میں

---

[1] جارج ایم ہارپر جونیئر George M. Harper کی کتاب Village Administration in the Roman Province of Syria

[2] Rene Dussaud کی فرانسیسی کتاب۔

بسر کرتے تھے ملک کی آب و ہوا اور زندگی کے روایتی تصورات[۱] ایسے تھے کہ عادات میں اعتدال قائم رہتا پھر خاندان کے ساتھ وفاداری کا احساس لوگوں کے دلوں میں برابر تازہ رہتا ابتدائی قبائلی زندگی کی یہ نہایت قیمتی میراث تھی اور یہ احساس اب تک ایک زندہ قوت[۲] بنا ہوا ہے۔

اجتماعی حالات

دیہاتی عورتیں جس طرح آج کل بے پردہ پھرتی ہیں[۳] اسی طرح قدیم زمانے میں بھی بے پردہ پھرتی تھیں[۴] البتہ[۵] شہر کی عورتیں نقاب پہنتی تھیں یہ نقاب یا تو ایسا برقعہ ہوتا تھا جو سر اور چہرے کو چھپا لیتا تھا یا اسے ذرا لمبا رکھ کر کندھوں کے نیچے تک لے آتے تھے گویا اس کی شکل موجودہ دور کے نقاب سے ملتی جلتی تھی عورتوں کے جو مجسّمے[۶] ملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان کے ہاں جسم گودا جاتا تھا خصوصاً چھاتی کو اور یہ طریقہ اب تک جاری ہے۔

رومی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ہرگز تسلیم نہ کر سکتے تھے[۷] لہٰذا یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ شام کے جو حصے[۸] براہ راست رومیوں کے ماتحت آ چکے تھے ان میں تعددِ ازدواج رواج پا ہی نہیں سکتا تھا ختنہ ایک پرانی سامی رسم تھی معلوم ہوتا ہے کہ شہری یورپی قوموں سے تعلق[۹] پیدا ہونے کے بعد اس کا رواج گھٹ گیا تھا[۱۰] مسیحیت[۱۱] کے زیر اثر اسے بالکل ترک کر دیا گیا تھا۔

ساحلی قصبوں میں سے جہاں جہاں یونانیت یا رومیت[۱۲] کا رنگ چڑھ چکا تھا[۱۳] وہاں تفریحات کے مشغلے بھی وہی تھے جو یونانیوں اور رومیوں میں رائج تھے مثلاً کشتیاں لڑنا جنگی رتھ دوڑانا، گانے میں مقابلہ کرنا اور ناٹک دکھانا جو علاقے صحرا کے حاشیے پر واقع تھے وہاں ساندنیوں کی دوڑ بھی عام طور پر رائج تھی دولت مند لوگ شکار کھیلا کرتے تھے یادگاری عمارتوں میں ایسے نظارے بھی ملتے ہیں کہ تیر انداز یا نیزہ باز سوار ریچھ، ہرن، غزال یا جنگلی سؤر کا شکار کر رہے ہیں بعض اوقات شکاری کتوں سے بھی کام لیا جاتا تھا حمام کی ابتدا سلیوکی شام میں ہوئی[۱۴] اس میں پہلے ورزش کی جاتی تھی[۱۵] پھر گرم پانی سے نہایا جاتا تھا یہ سلسلہ رومی عہد میں بھی جاری رہا۔

سلطنت کے ابتدائی دور ہی سے رومیوں کے دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ شام کے لوگ گانے بجانے، رقص کرنے، سرکس میں ہنرمندی دکھانے یا ایسے ہی دوسرے تفریحی مشاغل میں بڑے ماہر ہوتے ہیں[۱۶] چنانچہ لاطینی ادب میں لاؤدلیا (لاذقیہ) کے چابک سواروں، بیریتس (بیروت) کے ایکٹروں، صور کے سرکس والوں، قیصریہ کے رقاصوں[۱۷]، ہیلیوپولیس کے نئے نوازوں، غزہ کے مغنیوں اور عسقلان کے پہلوانوں کا ذکر ملتا ہے پیشہ ور شاہی فنکار طائفے بنا کر مختلف مقامات پر پھرتے رہتے تھے اور جگہ جگہ اپنے کمال کی نمائش کرتے تھے عرسوں اور جشنوں کے موقع پر انہیں معاوضہ طے کر کے بلا لیا جاتا تھا روما میں ایسے طائفوں کی خوب سرپرستی ہوتی تھی[۱۸] ان میں سے بعض انطاکیہ سے آئے تھے مشہور رومی ہجو گو شاعر جوینل[۱۹] (تقریباً ۶۰ء تا ۱۴۰ء) بڑے غضب ناک لہجے میں کہتا ہے۔

مدت سے شام کا دریائے عاصی اپنا پانی اردو مہ کے دریا ٹائبر میں ڈال رہا ہے۔

---

[۱] Juvenal

ساتھ ہی اپنی زبان اپنے اوضاع و اطوار، اپنی بانسریاں اور اپنے ڈھلوان

ناردوں والے ساز لے آیا ہے:

رومی عام طور پر شام کے ناز نخرے والی عورتوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس طرح موجودہ زمانے میں پیرس کی ناز نخرے والی عورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے ایتھی نائی اوس کے بیان کے مطابق فونیقیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناشائستہ گانوں سے لبریز تھا۔ شاہنشاہ ویرس پارتھیا کی مہم سے لوٹا (سنہ ۱۶۶ء) تو اس اخلاق باختہ حکمران نے لاذقیہ اور دفنہ میں خاصی مدت تک عیش و عشرت کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر وہ دارالحکومت میں پہنچا تو شامی مغنیوں، ایکٹروں، نقالوں اور دل لگی کا سامان بہم پہنچانے والے دوسرے گروہوں کو اپنے ساتھ لایا جن سے اس وقت کا مذاق متاثر ہوا۔

انطاکیہ اور دفنہ

عیش و عشرت اور آوارگی کی زندگی میں درجہ امتیاز انطاکیہ اور اس کے ہمسائے دفنہ کو حاصل رہا۔ رومی شام میں اور کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جہاں عیش و آرام زندگی کا نصب العین اور فراغت زندگی کا ماحصل رہا ہو جیسا شمالی شام کے اس مقام میں پایا جاتا ہے۔ پومپے نے انطاکیہ کو خود مختاری کا حق دے دیا تھا اور یہ حق اسے سلیوکیوں کے عہد میں بھی حاصل تھا۔ سیپٹیمئس سویرس نے انطاکیہ کا یہ حق اسوس میں فتح حاصل کرنے کے بعد (سنہ ۱۹۴ء) چھین لیا تھا۔ اس لئے کہ انطاکیہ نے سویرس کے حریف کی مدد کی تھی چنانچہ انطاکیہ سے دارالحکومت کا رتبہ چھین کر اسے لاذقیہ کا ایک گاؤں بنا دیا گیا۔ سویرس کے جانشین کیراکلا نے اسے ایک نوآبادی بنا دیا۔ جولیس سیزر نے دوسری عمارتوں کے علاوہ یہاں ایک تھیٹر اور ایک امفی تھیٹر بھی بنوایا۔ پلے ہیرودیس نے اس کے لیے ایک سڑک کا انتظام کر دیا۔ نیز ستونوں والی ایک عمارت بنوائی کیلگولا، تراجن اور ہیڈرین نے حمام تعمیر کرائے انٹونینس پائس نے مصر سے سنگ خارا منگوا کر انطاکیہ کے بڑے بازار میں فرش لگوا دیا۔ کموڈس (سنہ ۱۸۰۔۱۹۲ء) نے اولمپیائی کھیلوں کا انتظام از سر نو کیا۔ جوزیفس کے زمانے میں انطاکیہ رومی سلطنت کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ پہلا درجہ رومہ کو حاصل تھا اور دوسرا اسکندریہ کو رات کے وقت انطاکیہ کے بازاروں اور چوکوں میں چراغ روشن رہتے تھے۔ دوسرے شہروں کے مقابلے میں اس شہر کی یہ کیفیت تھی کہ رات کے وقت روشنی دن کو جلوہ افروزی کا مقابلہ کرتی تھی۔ انطاکیہ کا ایک خطیب لبانیوس (سنہ ۳۱۴۔۳۹۳ء) تھا وہ اپنے وطن کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی جگہ چراغوں کی روشنی نمودار ہوتی ہے مصر میں جشن کے موقع پر جو روشنیاں ہوتی ہیں وہ ہمارے شہر کی روشنیوں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ہمارے دن اور رات میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف روشنی کے فرق تک محدود ہے۔"

دور قدیم کے کسی شہر کے متعلق اس قسم کے حالات کا سراغ نہیں ملتا۔ لبانیوس دفنہ کے چشموں اور وہاں سے انطاکیہ تک کی نہر

ا؎ Anthenaeus — ۲؎ Verus

۳؎ Septimius Severus — ۴؎ Caracalla

۵؎ Liganius

کا ذکر کرتے ہوئے فخریہ کہتا ہے:۔

"عوامی حماموں میں جو نہریں پانی لاتی ہیں ان کی حیثیت دریاؤں کی سی ہے بہت سے نجی حماموں کا بھی یہی حال ہے . . . . . . شہر میں جتنے مکان ہیں اتنی ہی آب رواں کی نالیاں ہیں بلکہ بعض مکانوں میں کئی کئی نالیاں ہیں اکثر دکانیں بھی اسی نعمت سے مستفید ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عوامی کنوؤں پر کبھی ایسے جھگڑوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کون پہلے پانی بھرے . . . . . . یہ ایسی مصیبت ہے جو بہت سے قصبوں کے لیئے لعنت بنی ہوئی ہے یعنی کنوؤں پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ٹوٹے ہوئے کوزوں پر چیخ پکار شروع ہو جاتی ہے ہمارے ہاں عوامی چشمے شہر کے لئے زینت کا باعث ہیں ان سے پانی لینے کی ضرورت کسی کو پیش نہیں آتی کیونکہ سب کے لئے گھروں کے اندر پانی لینے کا انتظام بھی موجود ہے پانی اتنا صاف ہوتا ہے کہ برتن کے اندر نظر ڈالی جائے تو وہ خالی معلوم ہوگا اور اتنا خوشگوار پایا ہے کہ خواہ مخواہ پینے کو جی چاہتا ہے"۔

انطاکیہ اور دفنہ کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ تھا سڑک کے دونوں طرف پارک بنے ہوئے تھے چشمے بہ رہے تھے جگہ جگہ بنگلے اور شاندار عمارتیں کھڑی تھیں شہر کے دروازے سے مقدس شادمانی کے منظر تک ایسا ہی ماحول موزوں تھا دفنہ کا گھیر قریباً دس میل ہوگا یہ پورا علاقہ ایک تفریحی پارک لبانیوس کے الفاظ میں پریوں کی ملکہ کا ایک نہایت پاکیزہ عطیہ تھا یہ مقام اپنے بہتے پانیوں، سایہ دار ستونوں خوبصورت درختوں اور لمبے سروں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور تھا اور یہ اپولو دیوتا کے لئے خاص کر دیا گیا تھا بعد کے دور میں مسیحی شاہنشاہوں نے بھی درخت کٹوانے گوارا نہ کیئے چھٹی صدی مسیحی تک درختوں کو کاٹنے کی ممانعت کا قانون جاری تھا اس مقدس مقام پر ایک چشمہ ایسا تھا جس کے پانی کے اندر خاص اوقات میں ایک عجیب ہل چل سی پیدا ہو جاتی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی جو پروہت وہاں رہتے تھے ان پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ مختلف سوالات کا جواب دیتے تھے شاہنشاہ بھی استخارے کے لیئے دفنہ پہنچتے یہاں اپولو اور ڈائنا کا مندر سیوکس نے بنوایا تھا اور اسے دارالامن قرار دیا تھا اس کے دونوں جانب ستونوں کی قطاریں تھیں اور دیواریں چمکیلے سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں اپولو کا بت اتنا بڑا تھا کہ چھت کے قریب تک پہنچا تھا ابتداء میں شاہنشاہ دفنہ جاتے تھے تو ان کے قیام کے لئے خیمے لگائے جاتے تھے ڈایوکلیشن (۲۸۴ء تا ۳۰۵ء) نے وہاں ایک محل تعمیر کرایا جسے ووسیس (۳۶۴ء ۔ ۳۹۵ء) نے بہت خوبصورت بنادیا ہیڈرین شام میں نائب سلطنت تھا وہ انطاکیہ میں تھا جب خبر ملی کہ اسے شاہنشاہ بنادیا گیا ہے چنانچہ اس نے انطاکیہ میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں اور دفنہ میں ایک تھیٹر بنوایا جن نہروں سے دونوں شہروں کے لئے پانی مہیا ہوتا تھا ہیڈرین نے ان کی درستی اور توسیع کرائی دفنہ کو اور بھی متعدد عمارتوں سے آراستہ کیا سلطنت میں کوئی دوسرا شہر شان و شکوہ اور جلال میں دفنہ کی عمارتوں سے بڑھا ہوا نہ تھا اس کا بڑا بازار دو میل لمبا تھا اس کے دونوں طرف بھاری ستون تھے جو بازار کی چھت سنبھالے کھڑے تھے۔ عین وسط

۵۰؎ پراکوپیس ۔ Procopius کتاب دوم باب ۱۴

میں گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے سڑک بنی ہوئی تھی جو دریائے عاصی کے ساتھ ساتھ شہر میں سے گزرتی تھی۔

سلیوکیوں کے زمانے سے دفنہ شام میں کھیلوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا انطاکیہ کا ایک دولت مند رکن سینٹ شاہنشاہ آگسٹس کے ساتھ رومہ واپس گیا تو اس نے اپنی جائداد کے متعلق وصیت کر دی کہ اس رقم سے دفنہ میں ہر سال تیس دن تک جشن کا سلسلہ جاری رہے۔ اس موقع پر اولمپیائی کھیل ہوں مثلاً ناچ، ناٹک، جنگی رتھوں کی دوڑ، پہلوانوں اور جنگ جوؤں کے مقابلے یہ جشن ہر سال ہوتا تھا تیسری صدی کے آغاز میں تیس دن کی مدت بڑھا کر پینتالیس دن کر دی گئی عورتیں بھی جشن اور کھیلوں میں شریک ہوتی تھیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں اخلاقی بے قاعدگی کے منظر بھی رونما ہوتے تھے اس وجہ سے دفنہ آوارگی کے لئے ضرب المثل بن چکا تھا۔

اہلِ انطاکیہ بڑے متکبر، شورش پسند اور طناز تھے وہ انہیں مذاق اڑانے کے فن میں خاص شہرت حاصل تھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو کبھی نہ سمجھے کہ ان کا شہر سلطنت کا مرکز رہ چکا ہے اور سلطنت کے ہر مدعی کی حمایت کے لئے تیار ہو جاتے تھے جسے شامی فوج پیش کر دیتی تھی جو شاہنشاہ ان کے شہر میں مقیم ہوتے رہے ان سے ہمیشہ انہوں نے جھگڑا کیا ہیڈرین نے ان سے سکے بنانے کا حق چھین لیا مارکس آریلیس نے ان کے حق نمائندگی پر خط کھینچ دیا سپٹیمیس سویرس نے شام کے حاکم کا مرکز لاذقیہ میں تبدیل کر دیا عارضی طور پر مرکز وہیں رہا اور انطاکیہ کو بھی ایک وقت تک لاذقیہ کا ممنون رہنا پڑا شہروں کی اچھی روش دیکھ کر شاہنشاہ ان کے لئے خاص حقوق یا خطابات کا بندوبست کر دیتے تھے لیکن جب ان شہروں سے بے وفائی سرزد ہوتی تو ان سے یہ حقوق چھین لئے جاتے سویرس نے فرمان صادر کر دیا کہ شام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک شمالی صوبہ جس میں فوج کے دو جیش رکھے گئے اس کا نام شمالی شام قرار پایا دوسرا جنوبی صوبہ جس کا نام فونیقائی شام تجویز ہوا اسے فوج کا ایک جیش رکھنے کی اجازت تھی شاہنشاہ جولین نے ۳۶۲ء کا موسم سرما انطاکیہ میں گزارا تھا جب وہ ایران پر حملے کی تیاری کر رہا تھا شاہنشاہ نے شرابوں اور رقص و سرود کی قیمتیں ایک خاص اسلوب پر لانے کی کوشش کی تو اہلِ انطاکیہ بگڑ بیٹھے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انتظامی مجلس و سینٹ کے رکن تھے وہ خود بھی چور بازاری میں شراب بیچتے تھے اور رقص و سرود کے طائفے بھی انہیں کے زیر اہتمام کام کرتے تھے شہر کی اکثریت مسیحیت کی پیرو تھی لیکن شاہنشاہ مسیحی نہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ سابقہ لامذہبی بحال ہو جائے اہلِ انطاکیہ نے شاہنشاہ کا مذاق اڑایا اور کہا تو کیا ہے؟ ایک بونا ہے جس نے بکرے کی سی داڑھی لگا رکھی ہے وہ سب داڑھی مونچھیں صاف رکھتے تھے اور بڑھاپے میں بھی کوئی شخص داڑھی چھوڑتا نہیں تھا جولین سے بہت پہلے ٹراجن نے انطاکیہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اس لئے کہ وہ پارتھیوں کے خلاف ایک مہم تیار کر رہا تھا اسی مہم میں اس کی زندگی ختم ہوئی ۱۱۵ء کے موسم سرما میں وہاں ایک سخت بھونچال آیا اور شاہنشاہ کی جان بمشکل بچی ایک چشم دید شاہد کا بیان ہے کاسیئس[۱] پہاڑ پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی چوٹیاں جھک گئی ہیں اور وہ ٹوٹ کر شہر پر آگرے گی۔

انطاکیہ پر ایک بڑی آفت یہ آئی کہ ۲۶۰ء میں ایران کے بادشاہ شاپور اول نے اس پر قبضہ کر لیا اور ایرانی اس وقت شہر میں داخل ہوئے جب باشندے ناٹک سے دل بہلا رہے تھے یہاں تک کہ ایک ایکٹر کی بیوی یکایک چیخ اٹھی، میں خواب دیکھ رہی ہوں یا واقعی ایرانی آپہنچے ہیں! اس پر لوگوں نے پلٹ کر دیکھا تو تیروں کی بارش ہو رہی تھی شہر کو آگ لگا دی گئی اور اس کے باشندے بے دردی سے مارے گئے عجیب بات یہ ہے کہ ایک بھی ایرانی کی جان ضائع نہ ہوئی۔

---

۱ Mt. Casius

لاذقیہ اور افامیا

انطاکیہ کا ایک حریف لاذقیہ تھا جو جنوب میں واقع تھا یہ بھی بلند پایہ لوگوں کے لئے خاص تفریح کا مقام تھا شہر کے پاس پہاڑیاں تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہر پر سایہ کئے ہوئے ہیں پہلی صدی عیسوی میں ان پہاڑیوں پر دامن سے چوٹی تک انگور ہی انگور لگے ہوئے تھے پھر انگوروں کے یہ باغ مشرقی جانب افامیا کے قریب تک پہنچ گئے تھے لاذقیہ کی اچھی بندرگاہ سے انگور اسکندریہ بھیجے جاتے تھے ہیرودیس (وفات ۴ ق م) نے یہودی بادشاہی کی اس پالیسی کا آغاز کیا تھا کہ مختلف نوآبادیوں کو خاص حقوق دیئے جائیں اور اس ذریعے سے شاہنشاہ کی نظروں میں اعتماد حاصل کیا جائے اس نے لاذقیہ کے لئے پانی کی ایک خاص نہر بنائی تھی جس کے بعض اجزا اب تک باقی ہیں لاذقیہ کی ایک ہمسر نوآبادی افامیا ساحل سے کسی قدر ہٹی ہوئی تھی اس میں اعلےٰ درجے کے شاہی باغ تھے جن میں شکار کی کثرت تھی نیز آس پاس نہایت عمدہ مرغزار تھے اس کے معبد میں بھی استخارے کا خاص انتظام تھا غالباً اسی جگہ سے شام کے شاہی خاندان کی والدہ جولیا دومنا[1] کو آئندہ عظمت کی بشارت ملی تھی اور اسی بشارت کی بنا پر سپٹیمیس سیویرس نے تاج و تخت کے لئے تدبیروں کا سلسلہ شروع کیا تھا شاہنشاہ بن جانے کے بعد سیویرس پھر افامیا پہنچا یہاں بعل کا معبد بہت مشہور تھا اور اس کی شاخیں وائی سون[2] (جنوبی فرانس) تک جا پہنچی تھی وہاں بھی ایک مذبح بنایا گیا تھا جس پر مرقوم تھا "یہ تقدیر کے رہبر بعل کے لئے ہے" افامیا کے بعض باشندوں نے بیزنطینی اور مسیحی دور میں امتیازی درجے حاصل کیے۔

حمص

افامیا کے جنوب میں دریائے عاصی کے کنارے حمص واقع تھا جہاں کی حکومت رومیوں کے عہد میں ان پروہتوں کو حاصل رہی، جو پہلے سے حکمران چلے آتے تھے بعض دوسرے شہر بھی تھے جن کی عنانِ حکومت مقامی امرا کے ہاتھ میں تھی مثلاً دمشق تدمر اور ادیسا۔ ان میں سے ہر شہر ایک چھوٹی سی ریاست کا مرکز تھا تدمر کی سلطنت آگے چل کر بہت وسعت اختیار کر گئی حمص کے امرا بھی تدمر اور دمشق کے امرا کی طرح ایک مدت تک شاہنشاہی امرا میں شامل رہے اور انہیں سلطنت کے نظم و نسق میں حصہ دار بنا لیا گیا اس سے بہت بعد وہ شامیوں نے شاہنشاہی تخت پر قبضہ جما یا حمص کے شاہی خاندان کا بانی ایک شخص تھا جس نے سیمپسی جریمس[3] کا لاطینی نام اختیار کر رکھا تھا اس کے خلاف کو ڈومیشین[4] بحکم (۸۱ء۔ ۹۶ء) نے بے دخل کر دیا تھا لیکن خاندان کی ایک شاخ ویلیرین[5] کے زمانے میں پھر نمودار ہو گئی اور ۲۵۸ء میں حمص کا ایک جیش اسی طرح پارتھیوں کے خلاف لڑا جس طرح ادیسا کے ابجر اور تدمر کے بادشاہ مختلف مواقع پر لڑ چکے تھے حمص میں بعل کا جو معبد تھا اسے بدیں وجہ ایک ممتاز کارنامہ انجام دینے کا موقع مل گیا کہ اس کا ایک نوجوان پروہت بیسیانوس[6] ایلاگیبلوس[7] کے لقب سے قیصروں کے تخت کا مالک بن گیا (۲۱۸ء۔ ۲۲۲ء) یہ نام حمص

---

[1] Julia Domna

[2] Vaison

[3] Sampsigeramus

[4] Domitian

[5] Valerian

[6] Bassianus

[7] Elagabalus

کی ایک دیوی کا تھا۔اس شہنشاہ کے عہد میں جو سکے[1] مضروب ہوئے ان میں شہر کو مرکزِ حکومت قرار دیا گیا تھا۔اس کے ہمیشرد کیراکلا کے سکوں میں اسے نوآبادی بتایا گیا ہے۔کیراکلا ہی حمص کو لیبانی فونیقیہ کا مرکزِ حکومت بنایا تھا۔

دمشق

سلیوکیوں اور رومیوں کے عہد میں شام کا سابقہ اور آئندہ مرکزِ حکومت دمشق، انطاکیہ اور بعض ساحلی شہروں کی عظمت کے روبرو ماند پڑ رہا۔کلاسیکی مصنفوں نے اس پر بہت کم توجہ کی۔سٹرابو کے زمانے میں بھی دمشق کے علاقوں پر ڈاکوؤں کے حملے ہوتے رہتے تھے۔جنوبی سمت میں دعرہ[1] کی پہاڑیاں ہیں۔ان میں پناہ کے لئے ایک غار تھا۔جس میں بیک وقت چار ہزار آدمی سما سکتے تھے۔یہ ڈاکو عرب آبادان (دمین) کی طرف سے آنے والے قافلوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔دمشق کا رقبہ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ شاہنشاہ طائبیریس کے زمانے میں اس کے اور صیدا کے درمیان سرحد کا جھگڑا پیدا ہو گیا۔[2] اس کی ثروت کے ذریعے تین تھے۔اول تجارت، دوم پھلوں کے باغات کی آمدنی جن کی آبیاری کا انتظام تھا۔سوم مضافات کی آمدنی۔دوسری صدی عیسوی میں دمشق کی حیثیت بظاہر سدھر گئی۔ہیڈرین نے اسے اعلیٰ شہر کا درجہ دے دیا۔الیگزانڈر سیویرس (۲۲۲ء۔۲۳۵ء) نے اسے نوآبادی کے حقوق عطا کر دیئے۔ایوکلیشین کا زمانہ آیا تو دمشق اسلحہ سازی کا مرکز بن گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے باشندوں نے اسلحہ سازی میں مہارت پیدا کر لی۔دمشق کے تاجر وہاں کے سامی دیوتا حدورتان کو دمشقی جوپیٹر کے نام سے مغرب میں اٹلی تک لے گئے۔جوپیٹر کا ایک پروہت جس کا نام اپٹمیس میکسیمس[2] دمشقی تھا، بندرگاہ پتیولی[3] کی مقامی مجلس کا رکن تھا۔اس مقام کو آج کل پوزوالی[4] کہتے ہیں۔

بیروت

ساحلی شہروں میں سے بیروت نے تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔صیدا کو ایلاگیبلس نے نوآبادیوں کے حقوق دے دیئے تھے۔صور نے ہیڈرین کے ماتحت مرکزی شہر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔سپٹمیس سیویرس کا زمانہ آیا تو اس نے صور کو نوآبادی کا درجہ دے دیا کیونکہ جب شاہنشاہی اقتدار کے لئے جدّوجہد شروع ہوئی تو صور نے سیویرس کا ساتھ دیا تھا۔اس کے خلاف بیروت سیویرس کے مدّمقابل نائیجر کا حامی تھا۔تاہم بیروت رومیوں کے ابتدائی دور ہی میں نوآبادی کا درجہ حاصل کر چکا تھا اور خود قیصر آگسٹس نے اپنی بیٹی کے نام پر بیروت کو کولونیا جولیا آگسٹا فیلکس[5] کا معزز گراں بار نام دے دیا تھا۔قیصر آگسٹس کے عہد میں بندرگاہ کی اصلاح ہو گئی۔دوہری ہلالی نما گودی بنا دی گئی تھی جس کے دونوں کناروں پر برج تھے۔ان میں زنجیر لگا دی گئی تھی جسے پھیلا کر غیر مطلوب جہازوں کا داخلہ روکا جا سکتا تھا۔چونکہ یہاں آگسٹس کے زمانے سے ایک فوج رہتی تھی۔اس وجہ سے بیروت چھاؤنی بن گیا اور جب کبھی نائب حکومت کو ضرورت پڑتی بیروت کے باشندے چیزیں مہیّا کرتے۔علاوہ بریں بیروت کو ابتدائی زمانے ہی سے یونانیّت کے سمندر میں رومی جزیرے کی حیثیت حاصل تھی۔یہودی بادشاہوں نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ نوآبادیوں کے لئے خاص سہولتوں کا انتظام کر دیتے۔

---

[1] Trachonitis جسے عربی میں دعرہ کہتے ہیں   ہے جوزیفس

[2] Damascenus Optimus Maximus

[3] Puteoli   [4] Pozzuoli

[5] Colonia Julia Augusta Felix

تاکہ شاہنشاہ کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے بیروت کے لئے بھی بہت سے مادی عطیات کا انتظام کر دیا۔ ہیرودیس اعظم کے پوتے اگریپا اوّل[1] (۴۱ء۔۴۴ء) نے بیروت میں ایک نہایت عالیشان اور نفیس تھیٹر، ایک افی تھیٹر، ایک حمّام اور متعدد غلام گردشیں بنوائیں اور ان پر بڑا روپیہ خرچ کیا۔ ان کا افتتاحی جشن راگ رنگ سے کیا گیا اور پہلی نمائش میں جنگ جوؤں کے سات سو جوڑوں نے حصّہ لیا۔ اس موقع پر بہت سے مجرم بھی اکھاڑے میں لائے گئے۔ جنگ جوؤں نے حملہ کر کے انہیں تباہ کر ڈالا۔ چند سال بعد ٹائٹس نے اپنے باپ ویسپیسین[2] کی سالگرہ پر اسی قسم کی نمائش کا انتظام کیا۔ البتہ اس موقع پر قتل کے لیے عام مجرم نہیں بلکہ یہودی قیدی پیش کئے گئے۔ اگریپا ثانی (۵۰ء۔۱۰۰ء) نے بیروت کو اپنی محبوب قیام گاہ قرار دے لیا تھا۔ اس نے کئی مجسّمے نصب کرائے اور ہر سال کھیل تماشے کا انتظام ہوتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی تک ناٹک و سرکس وہاں عام تھے۔

بیروت نے سرگرمیوں کے ایک اور دائرے میں بھی امتیاز حاصل کر لیا۔ یہاں رومی قانون کی ایک مشہور درس گاہ قائم ہو گئی تھی۔ جب تک سلطنت باقی رہی یہ درس گاہ پوری مشرقی دنیا کے قانون دانوں کا مرکز بنی رہی۔ پوسی ڈون (نیپچون)[3] اس شہر کا خاص دیوتا تھا۔ سکوں پر اس کی تصویر بنائی جاتی تھی یا تو اس کے ہاتھ میں سہ شاخہ ترسول ہوتا یا بحری گھوڑے اس کی گاڑی کھینچتے۔

ہیلیو پولس

بیروت کے ساتھ نشیبی شام میں ایک ہمسر نوآبادی تھی یعنی ہیلیو پولس۔ جب اس کے بعل دیوتا کو سورج دیوتا مان لیا گیا تو سلیوکیوں نے اسے یونانی نام دے دیا جس کے معنی ہیں شہر شمس۔ رومیوں کے زمانے میں یہ نام قائم رہا۔ پرانا سامی نام شہر بعل نہیں بلکہ البقاع کا بعل تھا جو اب بھی بعلبک کی صورت میں باقی ہے۔ آگسٹس نے اسے نوآبادی بنا دیا تھا اور وہاں اسی فوج کا ایک حصّہ مقرر کر دیا تھا جس سے بیروت کی آبادی ہوئی۔ آگسٹس کے عہد میں جو سکے مضروب ہوئے ان میں شہر کے نام کولونیا جولیا آگسٹا ہیلیو پولس[4] ہے لیکن یہ شہر بہ مقابلہ بیروت مدنیت میں اور بہ مقابلہ انطاکیہ یونانیت میں کم درجے پر رہا۔ البتہ سامیت میں یہ دونوں سے بڑھا ہوا تھا۔

انطاکیہ کے گویوں کی طرح ہیلیو پولس کے نے نواز پوری سلطنت میں مشہور تھے۔ ان کی طلب صرف جشنوں ہی کے موقع پر نہیں، بلکہ معبدوں میں بھی خاص عبادتوں کے وقت پڑتی تھی۔ شہر کی عورتیں حسن و جمال کے لئے خاص طور پر مشہور تھیں۔ یہ عطیہ انہیں شام کی دیوی سے ملا تھا جو لبنانی پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پھرتی رہتی تھی۔ مرد خوش گفتاری اور فصاحت کے لئے مشہور تھے۔ یہ جوہر انہیں اپنے پہاڑی علاقے کی دیویوں سے ملا تھا۔ دنیا میں اس شہر نے اپنے عظیم الشان معبد کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔

ابتدا میں یہ معبد شام کے دیوتا حدد کی پرستش کے لئے بنا تھا اور شاید اس کی بنیاد سلیوکیوں سے پیشتر کے عہد میں پڑی ہو۔ رومی شاہنشاہوں نے اسے از سر نو بنوایا اور بہت وسیع کر دیا۔ اس سے قبل یہاں کے استخارے کا چرچا ہو چکا تھا۔ ٹراجن نے پارتھیوں پر دوسری مرتبہ حملہ کرنے سے پیشتر (۱۱۶ء) یہاں استخارے کی آزمائش کی تھی۔ وہ یوں کہ ایک سادہ کاغذ لفافے میں رکھ کر مہریں

---

[1] Agrippa

[2] Vespasion

[3] Poseidon (Neptune)

[4] Colonia Julia Augusta Heliopolis

لگادی گئی تھیں اور اسے معبد میں پیش کر دیا گیا تھا جواب میں بھی ویسا ہی سادہ کاغذ ملا جس سے ٹراجن کے دل میں پیشگوئی کی قدر و قیمت بڑھ گئی پھر اس نے بطور خاص معلوم کرنا ضروری سمجھا کہ مہم کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کا جواب رمزیہ انداز میں یہ ملا کہ لکڑیوں کا ایک گٹھا کپڑے میں لپیٹ کر حوالے کر دیا گیا۔ ٹراجن نے سلیشیا میں وفات پائی (۱۱۷ء) وہاں سے اس کی ہڈیاں روم بھیجی گئیں یوں یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اگرچہ یہ تعبیر بعد از وقت سمجھ میں آئی۔

یہاں کے معبد کی توسیع اینٹونینس پائس[1] (۱۳۸ء۔۱۶۱ء) نے شروع کی اور کیرا کلا (۲۱۱ء۔۲۱۷ء) کے وقت تک کام آہستہ آہستہ جاری رہا۔ شاہی خاندان کے دوسرے شاہنشاہوں نے بھی تعمیر کی تکمیل کا سلسلہ قائم رکھا اور اس معبد کو دنیا کے عجائبات میں سے بنا دیا۔ سپٹیمیس سیویرس نے جو سکے ڈھلوائے ان کی پشت پر اس معبد کی تصویر پہلے پہل نمودار ہوئی کیرا کلا اور اس کی شاہی والدہ جولیا ڈومنا نے اپنے سکوں پر ہیلیوپولس کو ایک افسانے کی صورت میں پیش کیا۔ اس معبد کی غلام گردش میں ان دونوں کے لئے احترام کے حلف لاطینی زبان میں لکھے گئے تھے جو ایک حد تک اب بھی پڑھے جا سکتے ہیں فلپ عربی (۲۴۴ء۔۲۴۹ء) کے سکوں میں بھی اس معبد کا نام آتا ہے۔

معبد میں دیوتا کا سنہری مجسمہ رکھا گیا تھا جس کی شکل ایک ایسے بے ریش نوجوان کی تھی جس نے جنگی رتھ چلانے والے کا لباس پہن رکھا تھا اس کے دائیں ہاتھ میں ایک تازیانہ تھا بائیں ہاتھ میں اس نے بجلیاں اور گیہوں کے خوشے پکڑ رکھے تھے خاص سالانہ جشنوں کے موقع پر اس بت کو پھرایا جاتا ہے ہیلیوپولس کے خاص آدمی اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے اس سے پہلے اپنے سر منڈواتے اور حلف اٹھاتے کہ وہ زہد اور پاکیزگی کی زندگی بسر کریں گے اس معبد میں مخروطی شکل کے سیاہ پتھروں کو بھی مقدس مانا جاتا تھا ان میں سے ایک پتھر ایلاگبیلس نے روما کے ایک مندر میں منتقل کر دیا تھا سالانہ جشن کے موقع پر شہر میں ایک میلا ہوتا۔ اس معبد نے ہیلیوپولس کو صدیوں تک بحیرہ روم کی شرقی سرزمینوں کو متاثر شہر بنائے رکھا اور شام میں اسے انطاکیہ کے بعد دوسرا درجہ حاصل تھا اس دیوتا کو ہیلیوپولس کے جوپیٹر کے نام سے سوداگر اور جنگ جو مغرب میں دور دور تک لے گئے اس کا پورا نام جوپیٹر آپٹمس میکسیمس ہیلیوپولیٹینس تھا[2]

اس معبد کے کھنڈر رومی دور کی عمارتوں کے کھنڈروں میں سب پر فوقیت لے گئے حتیٰ کہ روما کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں نے معبد کو قلعہ بنا لیا وہ کہتے تھے کہ اسے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا اس لئے کہ ان کے قبضے میں جن تھے اور جنوں کے سوا ایسی عمارت کون بنا سکتا تھا مگر چہ بارہا یہ کھنڈر زلزلوں سے تباہ ہوئے اور تاتاریوں نے بھی انہیں برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اب بھی دیکھنے والا ان کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بلا احصار کے حلقے میں دو معبدوں کے کھنڈر ہیں ان میں سے ایک جوپیٹر معبد کے ہے اور دوسرا اس کی بیوی آتارغاتس (عشتارات) کے لئے تھا جسے عام طور پر باخوس سے منسوب کیا جاتا ہے ان دو میں سے آتارغاتس کا معبد بعد میں بنا یہ چھوٹا ہے اور یہ بہتر طریقے پر محفوظ ہے حقیقت یہ ہے کہ شام کی تمام قدیم عمارتوں میں سے یہ سب سے زیادہ محفوظ ہے اور اس پر نہایت اعلیٰ درجے کی سجاوٹ ہوئی ہے جوپیٹر معبد کے

---

[1] Antoninus Pius

[2] Jupiter Optimus Maximus Heliopolitanus

کے ارد گرد زرد پتھر کے بڑے بڑے ستون کھڑے تھے جن کے تاج کارنتھی وضع کے تھے اور ان پر آرائشی پٹی لگی ہوئی تھی ان ستونوں میں سے چھ آج تک محفوظ ہیں ان کا رخ لبنانی پہاڑوں کی طرف ہے اور ان سے ہیبت خیز جلال نمایاں ہے در اصل پورے معبد کا باقی حصہ یہی ستون ہیں ہر ستون کے تین حصے ہیں یہ باسٹھ فٹ اونچے اور ساڑھے سات فٹ موٹے تھے اور رنگ سماق کے تھے؛ جو مصر سے منگوایا تھا جسٹینین بعلبک سے یہ پتھر ایا صوفیہ کی تعمیر کے لئے لے گیا تھا ان میں سے ایک راستے میں ٹوٹ گیا تھا اسی سے جوڑ واضح ہوئے تھے۔

جس وسیع صحن میں مذبح تھا وہ تقریباً تین سو چالیس فٹ مربع تھا اس کے ارد گرد اڑتالیس ستون کھڑے تھے اس کے مغربی جانب ایک گرجا تھا جس میں تین محراب والی کھڑکیاں تھیں یہ چھٹی صدی مسیح میں بنا تھا لیکن عام طور سے قسطنطین یا تھیوڈوسئیس سے منسوب کرتے تھے جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرے پورا معبد جو اب بھی خاصے فاصلے سے نظر آتا ہے ایک کھلے چبوترے پر تعمیر ہوا تھا جو بڑے بڑے محراب دار ستونوں پر کھڑا ہے بیرونی دیوار کی شمالی و جنوبی سمت میں بڑے بڑے پتھر استعمال کئے گئے ہیں مدعا غالباً یہ تھا کہ زلزلے کی حالت میں بھی معبد کو محفوظ رکھا جا سکے گا ان میں سے تین پتھر زمین سے بیس فٹ کی بلندی پر لگے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک قریباً باسٹھ فٹ لمبا چودہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ موٹا ہوگا اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک پتھر میں اتنا سامان موجود ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو ساٹھ فٹ مربع اور چالیس فٹ اونچا مکان تعمیر کرے جن کی دیواریں کم از کم ایک فٹ چوڑی ہوں شہر کے بیرونی حصے میں ایسا ہی ایک پتھر ابھی تک اس جگہ پڑا ہوا ہے جہاں سے یہ کھود کر نکالے گئے تھے۔

ان پتھروں کے حجم اور ستونوں کی عظمت ہی میں نہیں بلکہ آرائش کی تفصیلات میں معبد کی عظمت نمایاں ہے خصوصاً آرائشی پٹی میں جو باریک کام ہوا ہے وہ بڑا عجیب ہے اور وہ اب تک محفوظ ہے آرائش میں گیہوں کے خوشے اور پوست کے ڈوڈے ہیں جو زندگی اور موت کے نشان سمجھے جاتے تھے پھل والے جن میں جو پردہ اٹھا رہے ہیں عشق و محبت کا دیوتا تیر کمان سنبھالے ہوئے ہے یا کسی اژدہا یا بالغ پر سوار ہے دروازوں کے پاس جو پائے ہیں ان پر انگور کی بیلیں ابھار کھدے ہوئے ہیں بیلوں کے درمیان ہندسی شکلیں دکھائی گئی ہیں بادشاہوں اور دیوتاؤں کے نصف بالائی حصوں سے چھتیں آراستہ کی گئی ہیں آثار غالباً دیوی کے معبد میں دروازوں پر بیل بوٹے اور شکلوں کا کام خصوصاً بہت ہی عمدہ ہے

بالاحصار سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر ایک گول معبد ہے جو شاہنشاہی کے آخری دور کی عمارت معلوم ہوتا ہے اور یہ زہرہ کے لئے یا تقدیر کی دیوی کے لئے مخصوص تھا قرون وسطیٰ میں اسے گرجا بنا لیا گیا اور اسی وجہ سے یہ محفوظ رہ گیا یہ مقدس بار برا کے لئے مخصوص ہو لیہ موجودہ قصبے کے وسط میں واقع ہے۔

جنوبی شام کے شہر

جنوبی شام میں رنگ رنگ کے شہر پہلو بہ پہلو موجود تھے مثلاً قدیم فلسطین کے ساحلی شہر ——— غزہ اس کے حوالی میں انتھیڈون، عسقلان، یافا، عکا ——— ان سب پر یونانیت کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ سٹرابو کے بیان کے مطابق یافا قزاقوں

سلہ ہیرودیس نے اس کا نام بدل کر اگریپاس رکھ دیا تھا ملاحظہ ہو جوزیفس، اب خربتہ تیدا کہتے ہیں گویا تیدا میں پرانا نام جزواً باقی ہے

سرداروں کی خاص پناہ تھا۔[1] پھر وہ یہودی شہر تھے جن کی بنیاد ہیرودیسی خاندان نے رکھی تھی ———— قیصریہ جو ساحل بحر پر تھا، سبسطیہ، طبریہ، قیصرہ فلپی۔ ان کے علاوہ رومیوں کی قائم کی ہوئی نوآبادیاں تھیں جن میں سے ایک نیاپولس (نیا شہر) بھی تھا جو عہد نامۂ قدیم میں اس مقام کو شکیم کہا گیا ہے یہودیوں کی رزم وپیکار کے زمانے میں اس شہر کا نام ستھیوپولس (ستھیوں کا شہر) تھا یہاں کے یہودی رومیوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے اور رومیوں کے دو جیشوں نے یہاں موسم سرما بسر کیا[2] بعد ازاں سرکش یہودیوں نے اس شہر کو تباہ کر ڈالا جنگ کے بعد وسپیشن نے یہ شہر پھر سے تعمیر کرایا اس کا پہلا اور اصل نام فلیویوس[3] تھا لہٰذا اس نے اپنے نام پر شہر کا نام فلیویا نیاپولس رکھا یہی نام اب "نابلس" بنا ہوا ہے۔ نیاپولس جسٹن مارٹر[4] کا مولد تھا یہ ابتدائی دور کا مشہور پادری تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے روم میں ایک مسیحی درس گاہ جاری کی تھی وہیں اسے ۱۶۵ء کے آس پاس موت کی سزا دی گئی وسپیشن نے اماؤس کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا جس میں اپنے آٹھ سو جنگ جو متعین کئے۔ لوقا کی انجیل میں (باب ۲۴ آیت ۱۳) اس اماؤس کا ذکر ہے جو یروشلم سے دس میل دور سڑک پر واقع ہے۔ اسے اس اماؤس سے الگ سمجھنا چاہیے جسے آج کل عمواس کہتے ہیں اور یہ یروشلم سے شمال مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ حوران میں فلپ پولس اس امر کی مثال پیش کر رہا ہے کہ کس طرح ایک گاؤں کو شہر کا درجہ مل گیا یہ مقام ابتدا میں بصریٰ کے پاس ایک غیر معروف گاؤں تھا۔ ۲۴۴ء میں فلپ عربی نے اسے شہر کا درجہ دے دیا کیونکہ یہ مقام اس کا مولد تھا ۲۴۴ء ہی میں اسے قیصروں کے تخت پر بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ اس شہر میں ایک نئے عنصر یعنی اطالوی آباد کاروں نے بھی اضافہ کیا اور یہ رومی نوآبادی بن گیا عرب جغرافیہ دان اسے مدینہ شہبا قرار دیتے ہیں[5]۔

اندرون ملک دس شہروں کی جمعیت قائم رہی یعنی ڈیکاپولس (جمعیت بلاد دہ گانہ) پلینی نے ان شہروں کی تفصیل بتائی ہے اور اسے منطقہ دیکاپولس قرار دیا ہے۔ یہ منطقہ اس مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں مرج ابن عامر[6] وادی اردن میں شامل ہوتی ہے اور مشرقی جانب پھیلتی ہے اسی منطقے میں انہیں شہروں کو اہمیت حاصل تھی لیکن ان کی تعداد میں وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہی بطلیموس نے ان کی فہرست یہ بتائی ہے بیت شان، پیلا، دیون[7]، ہیوش، فلاڈلفیا[8]، جدرہ، رافانا[9]، کناتا[10]، ہیپوس[11]، دمشق۔ بعد ازاں ان میں اور شہر شامل ہوتے گئے

---

۱ سترابو کتاب ۱۶۔

۲ جوزیفس

۳ Flavius

۴ Justin Martyr

۵ یاقوت معجم البلدان جلد سوم ص ۲۳۹

۶ Esdraelon

۷ یہ نام ایک مقدونی شہر کے نام پر رکھا گیا تھا آج کل اسے تل الاشعری کہتے ہیں۔

۸ ربہ عمون آج کل عمان دارالحکومت اردن۔

۹ الکانہ جو حوران میں ہے۔

۱۰ قنوات جو الرافہ کے جنوب مشرق میں ہے۔

۱۱ قلعۃ الحصن، بحیرہ طبریہ کے مشرق میں ہے۔

یہاں تک کہ تعداد اٹھارہ تک جا پہنچی۔ یہودیوں کے عہد میں بیت شان کو تمام دوسرے شہروں پر فوقیت حاصل رہی۔ اس لیے کہ وہ دریائے اردن کے مغرب میں واقع تھا۔ مارکس آریلیس کا فلسفی اور معلم باسیلیس اصغر[1] بیت شان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ دہ گانہ شہروں کا ایک ممتاز شہر جرش تھا، جو جھیل طبریہ سے پینسٹھ میل اور حدرہ سے بتیس میل جنوب مشرق میں تھا۔ حال میں یہاں کھدائی ہوئی اور یونانی عہد کے شہر کا پورا نقشہ سامنے آگیا۔ اس میں تھیٹر بھی تھے، معبد بھی، سٹیڈیم (ورزش گاہ) بھی اور فورم (چوک) بھی۔ بازاروں میں دونوں طرف ستونوں کی قطاریں تھیں۔ یہ نقشہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا معلوم ہوتا ہے۔ رومی دور کے شام کے عظیم الشان کھنڈر دیکھنے ہوں تو وہ پیٹرا، تدمر اور ہیلیوپلس (بعلبک) میں نظر آئیں گے۔ جب حضرت مسیحؑ نے دعوت حق شروع کی تھی تو دہ گانہ شہروں ہی کا ہجوم ان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔[2]

---

[1] Basilides the Younger

[2] متی کی انجیل باب ۴، آیت ۲۵۔

چوبیسواں باب

ذہنی سرگرمیاں

رومی دور کے شام نے تفریحی مشاغل کے دائرے میں تو بڑا امتیاز حاصل کیا، سرکس اور تھیٹر کے لئے موزوں شخصیتیں پیدا کر دیں لیکن ذہنی کارناموں میں اپنے ہمسائے مصر سے پیچھے رہ گیا۔ مصر اسکندریہ کے کتب خانے اور درس گاہ کی وجہ سے علم کا مرکز بن گیا۔ شام کے اندر ابتدائی دور میں جو ادبی چیزیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر عاشقوں، قزاقوں، پیشگوئی کرنے والوں اور سیاحوں کی کہانیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر پروبس بیروتی کو مستثنیٰ کر دیا جائے جو لاطینی زبان کا ماہر اور نقاد تھا تو بمشکل کوئی شامی سامنے آئے گا جس نے لاطینی ادبیات کے لئے کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہو۔ انطاکیہ رومی ایشیا کا سب سے بڑا اور دولت مند ترین شہر تھا، پوری سلطنت کے شہروں میں اسے تیسرا درجہ حاصل تھا لیکن وہاں کے ایک بھی مشہور مصنف کا نام نہیں لیا جا سکتا۔

مارکس ویلیریس پروبس[1] پہلی صدی مسیحی کے نصف آخر میں گزرا ہے اس نے سپاہی کی حیثیت میں زندگی شروع کی مگر بعد ازاں روما کے کلاسیکی ادبیات کے مطالعے میں ہمہ تن الگ ہو گیا اور روما ہی میں مقیم ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ورجل[2]، ہوریس[3] اور دوسرے بڑے شاعروں کے کلام پر انتقادات شائع کئے۔ اس طرح کلاسیکی ذوق کی بنیاد رکھی جو شاہنشاہی عہد میں نمایاں ہوا۔ پروبس کو لاطینی زبان کے سب سے بڑے ماہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تاریخ

اہل شام نے یونانی ادبیات کے لئے زیادہ نمایاں خدمات انجام دیں۔ سلطنت کے ابتدائی دور کی شامی تاریخ کے لئے ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ ایک یہودی مورخ کی کتاب ہے جو یونانی زبان میں لکھی گئی۔ یہ جوزیفس تھا جو ۳۷ء کے قریب یروشلم میں پیدا ہوا۔ اس کی دو کتابیں مشہور ہیں اول "آثار یہود"[4]، دوم "محاربات یہود"[5]۔ جوزیفس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی ماں کا سلسلہ نسب مکابیوں سے جا ملتا ہے۔ عنفوان شباب میں وہ اس غرض سے روما گیا کہ اپنے ہم مذہبوں کے پیشواؤں کا مقدمہ شاہنشاہ نیرو کے سامنے پیش کرے۔ واپس آیا تو اس یہودی فوج کا سالار بن گیا جس نے رومی اقتدار کے خلاف سرکشی کا علم بلند کیا تھا۔ جنگ میں وہ دشمن کے ہاتھ

---

[1] Marcus Valerius Probus

[2] Vergil

[3] Horace

[4] Antiquities of the Jews

[5] The Jewish War

گرفتار ہوگیا۔ وسپیسین نے اس کی جان بخشی کردی۔ اس وقت سے جوزیفس خاندانِ وسپیسین کے ساتھ وابستہ ہوگیا اور وسپیسین کے بیٹے ٹائیٹس کے ساتھ روما پہنچا جہاں اس نے فلیویس نام اختیار کرلیا کیونکہ وہ فلیوین خاندان سے وابستہ تھا اور وہ کتابیں تصنیف کیں جو اب تک محفوظ چلی آرہی ہیں۔ "آثارِ یہودیہ" میں اس نے بائیبل کے عہد نامۂ قدیم سے بہت کچھ لیا اور یہودیوں کی پوری تاریخ کا خاکہ پیش کردیا۔ اس کتاب میں مکابیوں کے آخری دور اور ہیرودیسی حکومتوں کے متعلق بہت تفصیلات آگئی ہیں۔ دوسری کتاب یعنی "محاربات یہود" اصلاً آرامی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس میں روما کے ساتھ مہلک جدوجہد کے مفصّل حالات بیان کیے ہیں اور جوزیفس ان حالات کا عینی شاہد تھا۔ تحریر میں الیاس رنگ بھی پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف اپنے سرپرستوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔

تاریخ نگاری کے دائرے میں جوزیفس کے سوا اہلِ شام میں سے کوئی قابلِ ذکر نام مشکل ہی سے ملے گا۔ بیبلوس (جبیل) کے فلو[۵۱] (۶۱ء۔۱۴۱ء) کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ یہ بڑا نجومی تھا اور اس نے فونیقی مذہب کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کے بعض اجزا یوسیبیوس[۵۲] نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیے۔ ایک شخص مناندر[۵۳] کا بھی ذکر آتا ہے جو لاذقیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں۔ مناندر نے خطابت میں کمال حاصل کیا تھا۔ اس کا زمانہ تیسری صدی مسیحی کا ہے اور اس نے فونیقیہ کی بعض تاریخی داستانیں بھی مرتب کردی تھیں۔ دوسری صدی مسیحی کے نصف آخر میں ایک اور مصنف گزرا جس کا نام یملیخوس[۵۴] تھا۔ یہ ایک حد تک پراسرار مصنف تھا جس نے بابل کی تاریخ لکھی۔ نوجوانی ہی میں اسے آرمینیا کے بادشاہ نے اپنا درباری بنا لیا تھا۔ یہاں اس نے بابلی زبان سیکھی اور ایرانی جادوگری سے شناسائی حاصل کرلی۔ یہ شخص اپنے متعلق بتاتا ہے کہ میری ماں اور باپ دونوں شامی تھے۔ زندگی کے آخر دور میں اس نے یونانی زبان سیکھی اور تاریخ کے علاوہ ایک عشقیہ داستان بھی یونانی میں مرتب کی جو یونانی ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب نہیں تو پہلی کتابوں میں سے ضرور ہے۔

جغرافیہ

جغرافیے میں حد درجہ نمایاں کارنامہ مارینوس[۵۵] کا ہے جو صور کا باشندہ تھا اور دوسری صدی مسیحی میں گزرا ہے۔ مارینوس پہلا شخص ہے جس نے ریاضی کے قاعدے کے مطابق طول البلد اور عرض البلد قائم کرکے نقشے تیار کیے۔ اس سے پیشتر نقشوں میں صرف سفر یا یا سیاحت کے مقام دے دیے جاتے تھے۔ مارینوس نے تمام مقامات طول البلد اور عرض البلد پیشِ نظر رکھ کر ٹھیک ٹھیک لکھے اور ان کی جگہوں کے متعلق جو بے چینی پائی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ مارینوس نے علمی جغرافیے کی بنیاد رکھی۔ بطلیموس نے اس کے حوالے دیے ہیں اور اعتراف کیا ہے کہ میری تمام معلومات مارینوس کے جغرافیے پر مبنی ہیں۔

علمی دائرے میں صرف ایک اور کتاب ہماری توجہ جذب کرتی ہے جس کا مصنف انامیا کا ایک طبیب ارغیجنیس[۵۶] تھا۔ یہ شخص دوسری صدی مسیحی کے اوائل میں روما کے اندر طبابت کرتا تھا۔ اس وقت طراجن روما کا شہنشاہ تھا۔ جووینل نے کئی مرتبہ ارغیجنیس کا ذکر کیا ہے

---

۵۱ Philo — ۵۲ Eusebius

۵۳ Menander — ۵۴ Jamblichus

۵۵ Marinus — ۵۶ Archigenes

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکزِ حکومت کے معزز طبقے میں اس کے علاج کو خاص اہمیت حاصل تھی خصوصاً دماغی بیماریوں میں اسے بہت ماہر مانا جاتا تھا۔ ارخی جینس نے نبض پر ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کی شرح جالینوس نے لکھی۔ ارخی جینس کے متعدد شاگرد تھے جنھیں سالہا سال تک طبابت میں عزت کا درجہ حاصل رہا۔

خطابت و بلاغت

مارینوس کا ایک ہم وطن ایڈریانوس[1] تھا، جو خطیب بھی تھا اور فلسفی بھی۔ اس وقت ادبیات میں سے خطابت کے شعبے کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ نظری اعتبار سے خطیب کا کام یہ تھا کہ عدالت میں جاکر لوگوں کی طرف سے مقدمے پیش کرے اور دوسروں کو وکالت کا فن سکھائے۔ عملاً خطیب کا کام خطبے دینا تھا چنانچہ وہ دورے کرتا رہتا اور مختلف مقامات پر پڑھے لکھے حاضرین کی مدد سے اپنی خطابت کے جوہر نمایاں کرتا۔ خطیب ذاتی عقیدے سے قطعِ نظر کرتے ہوئے مسائل کے وسیع سلسلے پر خطبے دیتے تھے۔

ایڈریانوس صور کو چھوڑ کر ایتھنز جا بسا جہاں اسے خطابت کا استاد بنا لیا گیا۔ اپنے افتتاحی خطبے میں اس نے اہلِ ایتھنز کی عقل کی نہیں اپنی عقل کی تعریف کی۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے: "فونیقیہ سے دوبارہ خطوط آپ کے پاس پہنچ گئے ہیں"۔ استاد کی حیثیت میں وہ بڑے طمطراق سے اپنے فرائض ادا کرتا۔ بہت قیمتی لباس پہنتا جس پر جواہرات ٹنکے ہوتے اور جس گاڑی پر سوار ہو کر جاتا اس کے گھوڑے کی باگوں پر چاندی جڑی ہوتی تھی۔ طلبہ "فونیقی" کہہ کر اس کا ذکر کرتے اور بعض اوقات اس کے لہجے کی نقالی کے لیے کوشاں ہوتے۔ ایتھنز میں ایڈریانوس کی ملاقات شاہنشاہ مارکس آریلیس سے ہوئی۔ شاہنشاہ ایتھنز سے لوٹا تو ایڈریانوس کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دے گیا۔ ایڈریانوس کو ایتھنز چھوڑتے وقت بڑی خوشی ہوئی۔ وہاں اس پر ایک سوفسطائی کے قتل کا الزام لگ چکا تھا اور مقدمہ بھی چل چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سوفسطائی نے ایڈریانوس کی بے عزتی کی تھی۔ شاہنشاہ نے ایڈریانوس کو اپنی دوستی سے نوازا اور اس کے خطبے کے لیے ایک موضوع بھی تجویز کیا۔ آریلیس کے جانشین کموڈس[2] نے ایڈریانوس کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔

ایڈریانوس کا ایک شاگرد انیٹی پیٹر ساکن ہیراپولس تھا جسے شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ انیٹی پیٹر کے وہ خطبے بھی موجود ہیں جو اس نے لکھ کر دیے اور وہ بھی موجود ہیں جو اس نے وقت کے وقت زبانی دے دیے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے معاصروں پر کوئی ترجیح حاصل نہ تھی۔ البتہ خطوط نگاری کے فن میں وہ سب سے بڑا ہوا تھا، اسی لیے سیویرس نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا تھا۔ علاوہ بریں اپنے دو بیٹوں کیراکلا اور گیٹا[3] کا اتالیق بنا دیا تھا۔ ۲۱۳ء میں کیراکلا نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو انیٹی پیٹر نے بڑا سخت خط لکھا اور تعزیت کرتے ہوئے کیراکلا سے کہا کہ اب تیری ایک آنکھ رہ گئی ہے اور ایک ہاتھ۔ اتالیق نے تم دونوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہتھیار سنبھالنا لیکن تم نے ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار استعمال کیے[4]۔ سیویرس نے انیٹی پیٹر کو قنصل کا درجہ دے دیا اور

---

[1] Adrianus

[2] Commodus

[3] Geta

[4] فلوسٹریٹس اور یوناپیس Philostratus and Eunapius ص ۲۷۱۔

بتھینیا کی حکومت اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہاں اس نے تلوار کے استعمال میں بڑی تیزی دکھائی، اس وجہ سے اسے برطرف کر دیا گیا، چنانچہ وہ اپنے وطن میں جا بیٹھا اور وہاں فاقہ کشی کرتے کرتے مر گیا۔

انٹونینس اور مارکس آریلیس کے عہد میں شمالی شام کی ایک اور ادبی شخصیت خاص توجہ کی محتاج ہے۔ یہ کوماجین کے دارالحکومت سمیساطا کا رہنے والا لوسیئن تھا، وہ ۱۲۵ء میں پیدا ہوا۔ پہلے انطاکیہ میں وکالت کرتا رہا۔ اس زمانے میں تقریر کرنے والے لوگ اس سے تقریریں لکھوا لیتے تھے۔ پھر اس نے پھر پھر کر لیکچر دینے شروع کیے چنانچہ ایشیائے کوچک، مقدونیہ، یونان، اٹلی اور فرانس کا دورہ کیا۔ فرانس میں کچھ مدت تک فلسفے کا پروفیسر بھی رہا، پھر اپنے وطن واپس آ گیا۔ وہ شامی تھا اور اس بات پر بار بار زور دیتا تھا، تاکہ اس کے معاصر اس حقیقت کو بھول نہ جائیں۔ آرامی اس کی مادری زبان تھی لیکن اس وقت کے دوسرے شامیوں کی طرح اس نے بھی یونانی زبان میں تعلیم پائی۔ اس زمانے میں سفر کے لیے بڑی سہولتیں میسر تھیں، گزشتہ سو سال کو چھوڑ کر ویسی سہولتیں کسی زمانے میں میسر نہ آئیں۔ لوسیئن نے ان سہولتوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور سلطنت کے تمام ترقی یافتہ حصے دیکھ لیے۔ شامیوں کے شوقِ دور و سیر کے ساتھ اسے فکر کی ثروت اور بوقلمونی بھی حاصل تھی۔ اس کی کوئی بیاسی تصانیف ہم تک پہنچی ہیں، جن میں سے بعض یقیناً الحاقی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کتاب "مکالمات"[1] ہے۔ ایک تصنیف کا نام "ایک سچی کہانی" ہے اسے "سند باد جہازی" "گلیور کی سیاحت"[2] اور اس قسم کی دوسری کتابوں کی پیش رو سمجھنا چاہیے۔ ایک کتاب کا نام "شامی دیوی" ہے یہ رومی عہد کے شام کے متعلق مذہبی معلومات کا نہایت مستند ذخیرہ ہے۔

تاریخ نگاری میں لوسیئن کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے مُردوں کے درمیان مکالمات کا طریقہ شروع کیا اور اس سے طربیہ ڈراموں، نیز ہجویات میں کام لیا۔ دورِ حاضر میں اس طریقے کی پیروی فانتینیل[3]، لارڈ لٹلٹن[4] اور دوسرے لوگوں نے کی۔ لوسیئن کے طنز میں شدت ہی نہیں، وسعت بھی ہے۔ اولمپیائی دیوتا اور دیویاں، یونانی فلسفی، رومی امراء، مبلّغین مذہب، سیاح، غیر متوازن جوشیلے آدمی، غرض سب اس کے طنز کا ہدف بنتے رہے۔ اس کے قلم سے ہومر، ہیسیڈ یا ہیروڈوٹس کے لیے بھی کوئی کلمۂ احترام نہ نکلا، مزید براں اس کی تخریب کے ساتھ تعمیر شامل نہیں۔ اس کی کتاب کا ہیرو فلسفیوں کے دعووں اور جھگڑوں سے تنگ آ کر فیصلہ کر لیتا ہے کہ ستاروں میں پہنچ جائے تاکہ فلسفیانہ نظریات کے اندازے کا پیمانہ اسے مل جائے۔ چنانچہ یہ ہیرو بازی لگا کر پہلے چاند میں پہنچتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر انسانوں کی کشمکشوں اور جھگڑوں کا جائزہ لیتا ہے پھر وہ اولمپس جا کر اپنے آپ کو زیوس کے سامنے پیش کر دیتا ہے سو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر دعائیں کیونکر پہنچتی ہیں۔ دعائیں بے شمار سوراخوں میں داخل ہوتی ہیں۔ ان سوراخوں پر سے پردے ہٹائے جاتے ہیں تو زیوس انھیں سن لیتا ہے۔ پھر وہ جانبدارانہ فیصلے کرتا ہے۔ جو شخص زیادہ بڑا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ بہرحال

---

[1] Dialogues

[2] Gulliver's Travels انگریز مصنف سوفٹ کی مشہور کتاب۔

[3] Fontenelle

[4] Lyttelton

اس کا فیصلہ فلسفیوں کے خلاف صادر ہوتا ہے اور وہ بتا دیتا ہے کہ چار روز میں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ وہ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا جب اسے مصر کا حاکم بنایا گیا۔ یہ تقرر غالباً کموڈس نے کیا تھا۔ بظاہر دہیں اس نے صدی کے اختتام پر وفات پائی۔

فلسفہ

فلسفے کے دائرے میں شامی مفکروں نے خاصا بڑا کام کیا، خصوصاً نو فلاطونی نمونے کے فلسفے کے لیے۔ یہ اس روایت کی پیروی تھی جو سیلوکیوں کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ سٹرابو اپنے زمانے کے ان ممتاز فلسفیوں سے بہت متاثر ہوا تھا جو صیدا کے باشندے تھے۔ ان میں سے دو اس کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جوہری نظریہ پہلے پہل اسی شہر میں وضع ہوا تھا۔ صور نے بھی فلسفے میں اپنی شہرت برقرار رکھی۔ سٹرابو اس شہر کے ایک رواقی فلسفی کا ذکر کرتا ہے جس کا نام انیٹی پیٹر تھا غالباً یہ وہی انیٹی پیٹر ہے جس کا ذکر شاعر کی حیثیت میں پلینی نے کیا ہے اور کہا ہے کہ یوم ولادت پر اسے ہر سال بخار ہو جاتا تھا صور کا ایک مشہور فلسفی میکسیمس[1] تھا جس نے طویل سفر کیے۔ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ روم گیا اور کموڈس کے زمانے میں وہاں مقیم بھی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مارکس آریلیئس کا اتالیق تھا۔ لیکن ایک گروہ کو اس سے اختلاف ہے بہرحال میکسیمس اعلیٰ درجے کا مفکر نہیں، صرف سوفسطائی اور خطیب تھا۔ دوسرے فلاطونیوں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ خدا اور مادہ ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی خدا اور انسان کے درمیان واسطے ہیں۔ اس کے اکتالیس مقالے محفوظ ہیں جن میں وہ تشبیہیں بے تکلف استعمال کرتا ہے اور شعر بھی جا بجا درج ہیں۔

افامیا فلسفے کے مرکز کی حیثیت میں صور سے منزلوں آگے نکل گیا۔ غالباً مارکس آریلیئس کے ماتحت افامیا کا ایک فرزند نومینیوس[2] نو فلاطونیت کا حقیقی بانی بن گیا۔ مصر کے یونانی فلسفی پلوٹینس[3] کے سر اس عزت کا سہرا باندھا جاتا ہے لیکن اس پر باقاعدہ یہ الزام لگایا گیا کہ سب کچھ اس نے افامیا کے اس فلسفی سے حاصل کیا۔ نومینوس نے غالباً اسکندریہ میں یونانی تعلیم حاصل کی۔ پھر ایتھنز چلا گیا اور زندگی کے آخری دور میں وطن واپس آیا۔ لامذہب فلسفی بھی اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ مثلاً فرفیریوس[4] اور یمبلی خوس۔ مسیحی پادریوں نے بھی اس سے استفادہ کیا، مثلاً کلیمنٹ[5] ساکن اسکندریہ، اریجن[6] وغیرہ نومینیوس یونانی اور مصری اثرات سے بھی واقف تھا اور بائبل کے عہد نامۂ قدیم سے بھی اسے پوری آگاہی حاصل تھی۔ اسی وجہ سے اس کی تحریرات دوسرے فلسفیوں سے ممتاز ہیں۔ اس کے نزدیک حضرت موسیٰ پیغمبر تھے، ہومر شاعر تھا، افلاطون یونانی موسیٰ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ

---

[1] Maximus

[2] Numenius

[3] Plotinus

[4] Porphyry

[5] Clement

[6] Origen

خدا تین الوہیتوں سے مرکّب ہے، اوّل باپ، دوم خالق، سوم مخلوق یعنی دُنیا۔ تیسری صدی میں افامیا میں ایک نو فلاطونی درس گاہ قائم ہو گئی جسے کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور حاصل تھی۔ یہ امیلیوس[2] نے قائم کی تھی۔ تدمر کی ملکہ زنو بیا اس کی سرپرست تھی۔ امیلیوس، نومینیوس کا مدّاح اور فکری اعتبار سے اس کا ہم خیال تھا۔ وہ پلوٹینس کا شاگرد تھا جس نے نو فلاطونی مسلک پہلی مرتبہ منظم کیا اور فرفیوریوس کا استاد تھا، جو نو فلاطونیت کا ایک بڑا شامی داعی تھا۔

فرفیوریوس سنہ ۲۳۲ء میں بہ مقام تبنیہ[3] پیدا ہوا۔ اس نے پہلے صور میں تعلیم پائی، پھر ایتھنز چلا گیا جہاں اس کے استاد لانگینوس[4] نے اس کا سامی نام بدل کر یونانی نام رکھ دیا۔ سامی نام ملک تھا اور یونانی نام فرفیوریوس یعنی وہ شخص جو ارغوانی شاہی لباس میں ملبّس ہو۔ پلوٹینس کی شہرت فرفیوریوس کو روم لے گئی، جہاں چھ سال تک وہ نو فلاطونیت میں درجہ اختصاص حاصل کرتا رہا۔ پھر اس نے روم ہی میں تعلیم دینی شروع کر دی اور وہیں سنہ ۳۰۴ء میں وفات پائی۔ وہاں اس نے اپنے استاد کی ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی لیکن فرفیوریوس کے لیے پلوٹینس کی حیثیت ایک نام سے زیادہ نہیں رہی تھی، وہ خود گوناگوں علوم کا مصنف تھا مثلاً فلسفہ، نحو، خطابت، ریاضیات، نفسیات، موسیقی اور نباتیات۔ نو فلاطونیوں میں اسے فاضل اجل کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اپنی تعلیمات میں کہتا تھا کہ جانوروں میں یقیناً عقل ہے، لیکن اس امر کا قائل نہیں تھا کہ انسانی روحیں ان کے جسموں میں منتقل ہو جاتی ہیں، روح کے تزکیے کے لیے وہ پلوٹینس سے بڑھ کر بعض متقشفانہ اعمال پر زور دیتا تھا، مثلاً شادی نہ کی جائے، گوشت نہ کھایا جائے، کھیل تماشوں سے پرہیز کیا جائے۔ اس کی بہت سی تصانیف جن میں ایک رسالہ بھی شامل تھا جو عیسائیوں کے خلاف لکھا گیا تھا، سنہ ۴۴۸ء میں بر سر عام جلائی گئیں۔ یہ تھیوڈوسیس ثانی کا زمانہ تھا۔

یمبلی خوس، فرفیوریوس کا شاگرد اور پلوٹینس کا پیرو تھا۔ یہ چالسیس (عنجر) کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنے فاضل ہم وطنوں کے طریقے کے خلاف وطن ہی میں زندگی گزاری اور ہر سال جدرہ کے گرم چشموں پر ضرور جاتا تھا۔ سنہ ۳۳۰ء میں وفات پائی۔ معاصرین میں اسے جو شہرت حاصل تھی موجودہ زمانے کے فضلاء اس کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یمبلی خوس نے سحر کاری اور عجائب نگاری کے ذریعے سے ناموری حاصل کر لی تھی اس کے شاگرد اور بعد کے نو فلاطونی اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس کا لقب ہی "الٰہ" پڑ گیا تھا۔ اس نے الٰہیات کے متعلّق نظریات کے ساتھ اعداد کے متعلّق نظریات ملا دیے تھے، جس طرح فیثاغورس کے نئے پیرو کرتے تھے۔ وہ علمی ریاضیات پر ان چیزوں کی ترجیح دیتا تھا جن حد تک علمِ کائنات کا تعلّق ہے، وہ اپنے دبستان کے دوسرے لوگوں کی طرح بقائے عالم کا قائل تھا۔ نفسیات میں اس نے روح کو انسانوں سے نیچے کے طبقے اور انسانوں سے اونچے طبقے کے درمیان واسطہ قرار دیا تھا۔ فرفیوریوس کے برعکس وہ جانوروں کے لیے عقل کا قائل نہ تھا۔

سلہ ملاحظہ ہو گتھری، Guthrie، ص ۳۰۵

سلہ Aemelius

سلہ Batanaea

سلہ Longinus

سلہ Theios

بیروت کی قانونی درس گاہ

اناطولیا نے فلسفے میں امتیاز حاصل کیا، بیروت قانون میں آگے نکل گیا۔ یہ روما کی اس قانونی درسگاہ کی برکت تھی جو تیسری صدی کے اوائل سے چھٹی صدی کے وسط تک فروغ پر رہی۔ اس درسگاہ کی بنیاد سپٹیمس سیویرس ۱۹۳ء تا ۲۱۱ء نے رکھی جس کی یادگار میں بیروت کے اندر ایک معبد بنا اور ایک مجسمہ نصب ہوا۔ شامی خاندان کے جانشین اس درس گاہ کو ترقی دیتے رہے۔ یہ محض اسی لحاظ سے قابلِ ذکر نہ تھی کہ پہلی مشہور درس گاہ تھی، بلکہ یہ سب سے زیادہ دیر تک قائم بھی رہی۔ یہ روما کی تخلیق تھی اور رومی سلطنت میں تحقیقی ذہنی سرگرمی رہی۔ اس قسم کی درس گاہیں آگے چل کر اسکندریہ، ایتھنز اور دوسرے مقامات پر بھی قائم ہوئیں لیکن بیروت کی سبقت بدستور بحال رہی رہی۔ اسکندریہ اور ایتھنز اتنے رومی نہ تھے جتنے یونانی تھے، بیروت اتنا یونانی نہ تھا جتنا رومی تھا۔ پھر بیروت کی خوش نصیبی یہ تھی کہ ممتاز طلبہ اور اساتذہ کا ایک طبقہ اس کی طرف کھنچا چلا آیا جن کی وجہ سے درسگاہ نے ایک جامعہ (یونیورسٹی) کی حیثیت اختیار کرلی اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ اس زمانے میں سرکاری ملازمت کے لیے قانونی تعلیم و تربیت حاصل کرنا لازم تھا۔

پاپینیاں

جس درس گاہ کو جسٹینین کے ضابطۂ قوانین میں غیر فانی شہرت حاصل ہوئی اس کی عظمت کو دو ناموں نے چار چاند لگا دیے، ایک پاپینیاں دوسرا اُلپیاں۔ جسٹینین نے بیروت کو "قوانین کی ماں اور دایہ" قرار دیا۔ پاپینیاں کا لاطینی نام آمیلیس پاپیانوس[1] تھا، غالباً حمص کا باشندہ تھا۔ خیال یہ ہے کہ پاپینیاں بیروت کی درس گاہ میں قانون کا استاد مقرر ہو چکا تھا، پھر جولیا ڈومنا کے شوہر سپٹیمس سیویرس نے اسے اپنے پاس بلا لیا تاکہ وہ روما میں رہے اور امورِ سلطنت میں مشیر کا کام دے۔ کہتے ہیں کہ پاپینیاں جولیا ڈومنا کا رشتہ دار تھا۔ کیرا کلا شاہنشاہ بنا تو اس نے پاپینیاں کو عہدے سے برطرف کر دیا، اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا، پھر حکم دے دیا کہ پاپینیاں کا سر بھی قلم کر دیا جائے۔ جلاد نے تلوار کی جگہ تبر استعمال کرنا چاہا تو کیرا کلا نے اسے برا بھلا کہا۔ یہ واضح نہ ہو سکا کہ پاپینیاں کو قتل کی سزا کیوں ملی، لیکن یہ اندازہ کر لینا مشکل نہیں کہ کیرا کلا جیسے خود رائے بادشاہ کے لیے پاپینیاں جیسا سخت گیر نگران اور دیانت دار آدمی قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ قتل کے وقت اس کی عمر صرف سینتیس سال کی تھی لیکن کسی رومی قانون داں نے ایسی بیش بہا علمی میراث اپنے پیچھے نہ چھوڑی۔ جسٹینین نے جو مجموعۂ قوانین تیار کرایا اس میں کم و بیش پانچسو پچانوے اقتباسات پاپینیاں کی تحریرات میں سے لیے گئے تھے۔ جن لوگوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا ان میں سے ایک اناطولیوس[2] تھا جو بیروت میں قانون کا پروفیسر تھا۔ خود پاپینیاں کی ایک کتاب قانونی درسگاہوں کے تیسرے سال کے نصاب میں شامل تھی۔ سولھویں صدی کا ایک بڑا شارح قانون لکھتا ہے کہ اب تک جتنے قانون دان گزرے یا آئندہ آئیں گے پاپینیاں ان سب پر فائق تھا۔ نہ کوئی شخص قانون میں اب تک اس سے بڑھا ہے اور نہ آئندہ اس کے برابر پہنچے گا۔ پاپینیاں کمالِ علم و فضل کے علاوہ حد درجہ کیش اور نہایت پاکیزہ سیرت آدمی تھا اس بنا پر اسے قانون دانی کا ایک قابلِ تقلید پیکر سمجھنا چاہیے۔

اُلپیاں

[1] Aemilius Papinianus اسے عام طور پر Papinian کہا جاتا ہے

[2] Anatolius

پاپینیاں کے ہم وطنوں میں سے اُلپیاں اس کا جانشین اور حریف تھا۔ اس کا لاطینی نام ڈومیٹیس الپیانوسؒ تھا وہ صور کا باشندہ تھا اور اس کے شمالی ہمسائے بیروت میں تعلیم دیتا تھا۔ پروفیسری سے اسے مہذب دنیا کے مرکزی شہر یعنی روم بلا لیا گیا تاکہ سلطنت کے کاموں میں پاپینیاں کا ہاتھ بٹائے۔ کیرا کلا کا جانشین ایلاگیبالوس ۲۱۸ء میں بادشاہ بنا تو اس نے الپیاں سے تمام مناصب چھین لیے چار سال بعد الیگزانڈر سیویرس مسند نشین ہوا تو اس نے الپیاں کو شاہی مشیر بنایا۔ اس حیثیت میں الپیاں نے بعض عدالتی اور دوسری اصلاحات کیں جو بعض فریقوں کے لیے خوشگوار نہ تھیں۔ ۲۲۸ء میں سپاہی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے بھاگ کر شاہی محل میں پناہ لی۔ سپاہی رات کے وقت شاہی محل میں جا پہنچے تو الپیاں نے بادشاہ اور اس کی والدہ کے روبرو خودکشی کر لی۔

الپیاں نے زیادہ عمر پائی اور پاپینیاں سے زیادہ وسیع پیمانے پر قانون کی خدمت انجام دی۔ مجموعۂ قوانین مرتب کرنے والوں نے الپیاں کی تحریرات سے اڑھائی ہزار اقتباسات لیے گویا مجموعے کا ایک تہائی حصہ صرف الپیاں کے اقتباسات پر مشتمل تھا ۴۳۸ء میں مشرقی رومی سلطنت کے لیے نیا مجموعۂ قوانین تیار ہوا۔ اس کے مطابق پاپینیاں اور الپیاں کی تمام تحریرات کو عدالتوں کیلئے مستند قرار دے دیا گیا اور دونوں قانون دانوں کی تحریرات کے وسیع اقتباسات کا اثر یورپی نظام ہائے قانون پر دیرپا ثابت ہوا۔

پانچویں صدی عیسوی تک بیروت میں لاطینی زبان ذریعۂ تعلیم تھی پھر اس کی جگہ یونانی نے لے لی۔ اس وقت تک بیروت ذہنی اور سیاسی اعتبار سے روم کے بجائے قسطنطنیہ کے حلقے میں آچکا تھا۔ رومی شاہنشاہی کے دور میں شامی ادبیات کے بعض ٹکڑے غیر مستند زبان میں لکھے گئے۔ ان سے جو خوشگوار اثر پڑا وہ یونانی اور لاطینی کی تمام کلاسیکی کتابوں کے مجموعی مطالعے سے بھی بڑھا ہوا تھا یہ انجیلیں تھیں نیز ابتدائی دور کے عیسائیوں کی دوسری تحریریں جن کے برابر کوئی دوسرا اثر نہ پہنچ سکا۔

لہ Domitius Ulpianus عام طور پر اسے الپیاں Ulpian کہا جاتا ہے۔

پچیسواں باب

مسیحیت کا ظہور

سنہ ق م یا اس کے قریب اس شخصیت نے دنیا میں قدم رکھا جس کی وجہ سے تاریخی سنین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے[1]۔ اس وقت روم دنیا کی ملکہ تھی۔ اس شہر اور عظیم الشان قیصر کے قائم کردہ شاندار تخت سے تیز روشنی کی کرنیں نکل کر دُور دُور پہنچ رہی تھیں۔ سلطنت کے ایک دور افتادہ صوبے میں ایک نجار کے بیٹے کا تھوڑے سے ساتھی اپنے ساتھ جمع کر لینا، انھیں تعلیم دینا، وعظ کہنا، بیماروں کو تندرست کرنا اور اپنے عقائد کے لیے سولی پر چڑھ جانا ——— ان امور پر مؤرخ کے لیے توجہ کرنے کی کون سی ضرورت تھی؟ ایک غیر معاصر مؤرخ، جو حضرت مسیحؑ[3] کا ہم مذہب اور ہم وطن تھا، انھیں "دانشمند حکیم" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے معجزات سرزد ہوتے رہے۔ بایں ہمہ اس مؤرخ نے حضرت مسیحؑ کا حال صرف چند سطروں میں بیان کیا ہے، جس کے آخر میں لکھتا ہے: "مسیحیوں کا فرقہ جس نے اپنے بانی کا نام پایا، اب تک محو نہیں ہوا"[4]۔ صرف ایک لاطینی مؤرخ نے مسیحؑ کا ذکر کیا ہے اور وہ سرسری طور پر بتاتا ہے کہ انھیں ٹائبیریس کے عہد میں پونٹیئس پلاطس نے موت کی سزا دی۔ اسے ۳۰ء یا ۲۹ء کا واقعہ قرار دیا گیا ہے لیکن جو لوگ جلیل اور یہودیہ میں مسیحؑ سے قریب تر تھے اور بخوبی جانتے تھے، مسیحؑ معمولی آدمی نہیں بلکہ خدا کا بیٹا ہے، ان کی زندگیوں کا نقشہ فوراً بدل گیا اور انھوں نے بھی مسیحؑ کی طرح اپنے عقائد کے لیے جان دے دینے سے تامّل نہ کیا۔ بعض نے اپنے خداوند کی تعلیمات اور کارناموں کے متعلق دستاویزیں تیار کیں۔ یہی انجیلیں ہیں جو مسیحؑ کی زندگی کے متعلق معلومات کا اوّلیں سرچشمہ ہیں۔ یہ بنیادیں بظاہر بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ عظیم الشان اور اعلیٰ تہذیب کی مالک رومی سلطنت کے ایک چھوٹے سے علاقے میں چند دہقان اس کے پیرو تھے۔ جو سلطنت بظاہر بڑی پائیدار اور مستقل نظر آتی تھی، وہ زوال میں آ گئی اور محو ہو گئی لیکن یہ دین روم اور یونان کے تمام فلسفوں اور عقیدوں سے بدرجہا زیادہ پائیدار ثابت ہوا۔

حضرت مسیحؑ کی زندگی کا کوئی بھی غیر معمولی واقعہ ——— کنواری سے پیدائش، ستاروں کا سجدہ، معجزات، صلیب

ل اشارہ حضرت مسیحؑ کی طرف ہے جن کی وجہ سے سنین کا ایک حصہ قبل مسیحؑ اور دوسرا حصہ عیسوی قرار پایا۔

ٹ حضرت مسیحؑ کی زندگی کا وہ مرقع ہے جو پیروانِ مسیحیت انجیلوں کی بنا پر پیش کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں کہ حضرت مسیحؑ یوسف نجار کے فرزند تھے یا آپ کو سولی پر چڑھایا گیا۔

ٹ جوزیفس "آثارِ یہودیہ" کتاب ۱۸ باب ۳

ٹ عبرانی میں "ماشیاح"۔ جو یہودی بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا، یہی لفظ شاہ موعود کے لیے استعمال ہوا۔ جیزز (یسوع) "یوشع" کی یونانی شکل ہے۔ عبرانی میں یہ لفظ یہوشواہ ہے۔

وفات، دوبارہ ظہور، آسمان پر صعود ـــــ ایسا نہیں جس کی مثالیں مشرق قریب کے مذہبی ذخیروں میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ مسیحؑ کی شاید ہی کوئی تلقین ہو جو یہودی نبیوں یا پیشتر کے سامی ہادیوں کی تعلیمات میں نہیں آچکی تھیں لیکن ایسی مثال کوئی نہیں ملتی جہاں شریفانہ خیالات کی اس درجہ کثرت ہو اور بلند افکار پر اتنا زور دیا گیا ہو۔ ایسا کردار بھی بمشکل ہی ملے گا جس نے اپنی ہر تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہو۔ ایک زرّیں اصول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "جو شخص تیرے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ بدلے میں بھلائی کرو" اس زرّیں اصول کی مثال بھی مسیحؑ سے سات سو سال پیشتر آشوریوں کے ہاں موجود تھی۔ انجیلوں میں حضرت مسیحؑ کے دوسرے جو قول مذکور ہیں، وہ بھی پیشتر سے آرامی، یہودی، یا کنعانی زبانوں میں موجود تھے۔ بڑے دن کا پیغام بھی (لوقا کی انجیل باب ۲ آیت ۱۴) دراصل بعل کے اس پیغام کی تکرار ہے، جو عنات کو دیا گیا تھا:

زمین پر سے جنگ کو مٹا۔
غصّے کو ختم کر دے۔
روئے ارض پر صلح پھیلا دے۔
تاکہ میدانوں میں محبت عام ہو جائے۔[1]

اس جدید پیغام کی بنیاد محبّت تھی، یعنی اللہ کی محبت اور انسان کی محبّت ایک محبت دوسری محبّت سے وابستہ تھی۔ خدا خود محبت ہے اس محبّت کی بدولت مسیحیوں نے پورے عالم انسانیّت کو ایک کنبہ بنا دیا اور ایک باپ کے فرزند ٹھہرا دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابتدائی دَور کی مسیحیّت نے مختلف قوموں کی جگہ آفاقی برادری کا اصول پیش کیا۔ یونانی اور رومی انسانیّت کو قوموں کی شکل میں دیکھتے تھے۔ شام کے مسیحیوں نے سب سے پہلے دنیا کو ایک آفاقی نصب العین دیا۔ انھوں نے جس معاشرے کی بنیاد رکھی، اس میں دنیوی غرض کوئی نہ تھی بلکہ متواتر اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ خدا کی عبادت بے غرضانہ طریق پر کی جائے اور انسان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔ ظاہری رسوم و آداب کے بجائے روحانیت پر زیادہ توجّہ کی جائے۔

یونانیوں میں جتنے عقیدے رائج تھے ان میں سے ایک بھی نہ تھا جس میں محبّت کو بنیادی حیثیت دی گئی ہو۔ ایک رواقی فلسفہ تھا جو اس مقصد کے لیے کوشاں تھا۔ کسی نے یہ نہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ انسانیّت میں سے پست ترین ہستیوں کا بھی یکساں طلب گار ہے۔ غریبوں اور ذات باہر لوگوں، خطا کاروں اور گنہ گاروں کے لیے کسی نے کوئی پیغام نہیں دیا تھا۔ جو مذہب رائج تھے ان میں سے کوئی نہ تھا جس نے زندگی اور چلن کے اندرونی چشموں پہ اثر ڈالا ہو۔ سب کا زور آداب و رسوم پر تھا۔ کسی نے مذہب اور اخلاق کے درمیان مؤثّر تعلّق پیدا نہ کیا۔ کسی نے حیات بعد الموت کا اتنا زیادہ خیال نہ رکھا۔

مسیحیت نے اخلاقی زندگی اور مذہب کے درمیان گہری وابستگی پیدا کر دی۔ اس وقت سے احسان عمل عدل نہ رہا، بلکہ عمل ایمان بن گیا۔ کم نصیب اور مظلوم لوگوں کو نئے مذہب سے آیندہ زندگی میں امید دلائی اور سکھایا کہ راست بازوں کو جو راحتیں اس زندگی میں نہیں ملیں، وہ آیندہ زندگی میں ملیں گی۔ یونانی و رومی صرف ان لوگوں کی روحوں کو غیر فانی قرار دیتے تھے جو دوسروں پر احسان کرتے تھے یا کسی پر اسرار مذہب کے پیرو بن جاتے تھے۔

---

[1] Albrecht Goetze کی کتاب "روئے ارض پر امن" (Peace on Earth)

اس طرح نئے مذہب کے افکار، اخلاق، عقیدۂ معاد اور یقینی اصول، روحانی، ذہنی اور اجتماعی تقاضوں کے لیے تسکین کا سامان بن گئے۔ روشن خیال لوگ اپنے روایتی مذہب کے ذریعے سے بھی اسی قسم کی کوششیں کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن وہ ناکام رہے۔ پھر کلیسا نے ایک منظم ادارے کی حیثیت میں ایسے طریقے وضع کیے، جو دوسرے مذاہب کے طریقوں سے بہت ترقی یافتہ تھے۔ غرض یہ شامی مذہب آہستہ آہستہ مگر استواری کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے بڑھاتے روحانی برتری کے مقام پر پہنچ گیا۔ اس کے ذریعے سے شامی حضارت نے دنیا کی ترقی اور پیش قدمی میں اپنا تیسرا اور سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ مہذب دنیا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتی کہ شام کی مسیحی ادبیات ہی میں اعلیٰ ترین افکار پہلے پہل ظاہر ہوئے تھے۔

مسیحیت کی ترقی

مسیحیت نے جو ترقی کی، اس کی رفتار شروع میں بہت دھیمی تھی۔ پہلی صدی کے اختتام تک مسیحیت عام رومی شہریوں کو یا تو یہودیوں کا ایک غیر معروف فرقہ نظر آتی ہو گی یا وہ سمجھتے ہوں گے کہ مشرق قریب میں جو نئے فلسفے پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے ایک مسیحیت بھی ہے۔ شروع میں مسیحیوں کے جو اجتماعات ہوتے تھے، ان میں زیادہ تر یہودی ہی شریک ہوتے تھے۔ شہنشاہ ڈومیٹین نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو دہریت کے الزام میں موت کی سزا دی اور دہریت کا تعلق یہودیت سے تھا۔ٹ اس سے مراد مسیحیت ہی ہے۔ ٹراجن کا دور آیا تو نئے مذہب کے ممکنات کی طرف قومی توجہ ضروری ہو گئی۔ مسیحیت تمام دوسرے مذہبوں کو چیلنج دے چکی تھی لہٰذا یونانی اور لاطینی مصنف اس نئے مذہب کے خلاف ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ ان مصنفوں کی رائے کے مطابق تمام پرانے مذہب قومی تاریخ کی سابقہ عظمت و شان سے وابستہ ہو چکے تھے۔ رومیوں کے نزدیک وہ تمام شہنشاہی اقتدار کے نشان تھے۔ علاوہ بریں نئے مذہب کے بعض خط و خال یونانی اور رومی قلوب کو اجنبی معلوم ہوتے تھے، جو خلا پیدا ہوا، اس پر سے پولوس رسول اور دوسرے مسیحی پادریوں کے ذریعے سے پل بندی کا انتظام ہو گیا۔ ان ابتدائی مصنفوں نے مسیحیت کو یونانیت کا پروانہ دے کر اسے عالمگیر اشاعت کے قابل بنا دیا۔ پولوس رسول یونانی فلسفہ بھی جانتا تھا اور یونانی زبان بھی۔ اس نے فلسفیانہ ترکیبیں اور اصطلاحیں استعمال کیں اور پرانے مذہبوں میں سے مختلف نکتے لے لیے۔ غرض پولوس نے ایسی رہنمائی کا انتظام فرما دیا تھا۔ جس سے مسیحیت اور یونانی حضارت کے درمیان مصالحت ہو گئی، مسیحیت پر یونانی رنگ چڑھ گیا اور وہ یونانیوں اور رومیوں کے لیے خوش گوار بن گئی۔ اعتراف کر لینا چاہیے کہ خود یونانی اور رومی عقیدے بھی توحید کی طرف آ رہے تھے۔ لوگ زیادہ بڑی تعداد میں ملکوں کے اندر پھرنے لگے۔ میل ملاپ بڑھا تو مقامی دیویوں اور دیوتاؤں سے عقیدت کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی صرف چند دیوتا باقی رہ گئے جن کا دائرہ عمل وسیع تھا۔ جمہوری نظام کی جگہ شہنشاہی نظام قائم ہو گیا۔ تو اس سے بھی مذکورہ بالا تحریک کو تقویت پہنچی جب زمین پر ایک اعلیٰ حاکم کی اطاعت کا حلقہ گردن میں ڈال لیا جائے تو طبعاً مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر بھی ایک ہی اعلیٰ ہستی سے عقیدت رکھی جائے۔ ان تمام اسباب نے مسیحیت کو تقویت پہنچائی، لیکن آخری کامیابی سے پیشتر اس کے معتقدین کو عقوبت اور ایذا کے خطرناک مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

ٹ ڈیو (Dio) کی کتاب ۶۷ باب ۱۴۔

دورِ عقوبت

یونانی اور رومی چونکہ بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والے تھے، اس لیے مخالف عقیدے رکھنے والوں کے متعلق ان کی روش روادارانہ نہ تھی، بلکہ وہ یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ اپنے سابقہ دیوتاؤں میں برابر نئے دیوتاؤں کا اضافہ کرتے رہتے تھے۔ خود روما میں جو سلطنت کا مرکز تھا، مصریوں کے عجیب طریقِ عبادت اور یہودیوں کے مراسم کو برداشت کیا جاتا تھا اور خدا نے صرف لاطینی اور یونانی ہی میں نہیں، بلکہ عبرانی، فونیقی اور آرامی میں بھی دکھائے جاتے تھے۔ مذہب کے بارے میں ان کی پالیسی "زندہ رہو اور رہنے دو" پر مبنی تھی۔ مسیحی توحید پرست تھے اور وہ اس معاملے میں کسی سے مصالحت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ ابتدا میں جو لوگ مسیحی ہوئے وہ اپنے قصبوں کے مذہبی یا عوامی اجتماعات میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ مسیحیت سے پیشتر جو مراسم رائج تھے، ان کے متعلق اس ناروادار ی اور نئے لوگوں کو مسیحی بنانے کی سرگرم کوششوں کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ تصادم ہو۔

عقوبت کا سب سے بڑا اور پہلا واقعہ شہنشاہ نیرو کے زمانے میں پیش آیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ۶۴ء میں یکایک آگ لگی اور شہر روما کا مرکزی حصہ جل گیا۔ اس پر باشندے سخت مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ واقعہ شہنشاہ کی مجنونانہ حرکتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ سنتے ہی نیرو پر ہراس طاری ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ الزام روما کے مسیحیوں پر تھوپ دیا اور حکم دے دیا کہ ان سب کو تباہ کر ڈالا جائے[1]۔ اگرچہ یہ واقعہ مقامی تھا، تاہم اس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر مسیحیوں کے خلاف ہنگامے بپا ہوتے رہے۔ ۶۸ء کے قریب پولوس کو روما میں اس لیے موت کی سزا دے دی گئی کہ وہ نیرو کے فرمان کے مطابق مسیحی ہونے کی حیثیت میں اس کا مستحق تھا۔ غالباً پطرس رسول کو بھی اسی زمانے میں روما کے اندر سولی پر چڑھایا گیا، جس زمانے میں پولوس کو تلوار سے شہید کیا گیا اور بھی بہت سے مسیحیوں نے جانیں دیں۔ چونکہ مسیحی دوسری قوموں سے الگ تھلگ رہتے تھے، اس لیے ان کے متعلق شبہات پیدا ہوئے اور چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ جب کسی شہر یا گروہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا تو مسیحیوں کو صدقے کا بکرا بنا لیا جاتا۔ صوبوں کے حاکم بھی مسیحیوں کو سزا دیئے جانے کے مواقع پر موجود ہوتے، اس لیے کہ انہیں خفیہ انجمنوں کا ممبر سمجھا جاتا تھا۔

عقوبت کا دوسرا بڑا دور ۹۵ء میں شروع ہوا جب ڈومیٹین شہنشاہ تھا۔ یہ بھی ایک مقامی واقعہ تھا اور اس میں یہودی خاص طور پر پیشِ نظر رکھے گئے تھے۔ رومی اس زمانے میں مسیحیوں کو بھی یہودی سمجھتے تھے۔ اس وقت جن لوگوں پر مقدمے چلائے گئے۔ ان میں مسیح کے بھائی یہوداہ کے پوتے بھی شامل تھے، جنہیں "سادہ لوگ" قرار دے کر رہا کر دیا گیا۔ ۱۱۲ء میں ٹراجن نے یہ فرمان جاری کیا کہ جو مسیحی سلطنت کے دیوتاؤں کے سامنے نہ جھکیں اور دربار میں آنے پر شہنشاہ کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کریں انہیں غداروں کی سزا دی جائے۔ شہنشاہ کی پوجا بہت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی، جس کی ابتدا آگسٹس نے کی تھی۔ پھر یہ تخت کے ساتھ وفاداری کا مشہور نشان بن گئی۔ ٹراجن کے فرمان نے مسیحیوں کو قریباً دو صدیوں تک قانونی حفاظت سے محروم رکھا۔ مختلف موقعوں پر انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سزائیں دی گئیں۔ تیسری صدی میں سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور مسیحی کلیسا نے پختگی و استواری کے ساتھ

---

[1] ٹیسی ٹس Tacitus کتاب ۱۵، باب ۴۴

[2] پطرس رسول کا پہلا عام خط باب ۴، آیات ۱۴، ۱۶ پولوس کا دوسرا خط تیمتھیس کے نام، باب ۴ آیات ۶، ۸۔

سربلندی کے سفر کا آغاز کر دیا۔ حکمران اس وجہ سے مسیحیت پر ضربیں لگاتے رہے کہ اس طرح سلطنت کا وقار بحال ہو جائے گا۔ ۲۵۰ء سے ۲۵۱ء میں ڈیسیئس نے وہ سزا پھر سے بحال کر دی، جو سلطنت کے دیوتاؤں کی سرعام پوجا سے انکار پر دی جاتی تھی۔ ۲۵۷ء سے ۲۵۸ء میں ویلیرین نے حکم دے دیا کہ مسیحی سرعام قربانیاں کریں جس طرح رومی لوگ کرتے تھے اور ان کے اجتماع کی ممانعت کر دی۔ اس پر بعض لوگوں نے مذہب کو کم از کم ظاہرداری کے طور پر ترک کر دیا۔

چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کے لیے بہت بڑی عقوبت و تعزیر کا بانی ڈایو کلیشین تھا۔ اس نے فروری ۳۰۳ء میں فرمان صادر کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی گرجے مسمار کر دیئے جائیں، مسیحیوں کی کتابیں جلا دی جائیں اور جتنے مسیحی دیوانی یا فوج میں ملازم ہیں، وہ سب برطرف کر دیئے جائیں۔ موت کے سوا ہر قسم کی سزاؤں کا حکم دے دیا گیا، لیکن جس حد تک عمل کا تعلق ہے، موت کی سزائیں بھی وسیع پیمانے پر دی گئیں۔ ڈایو کلیشین کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کھلم کھلا مسیحیوں کی طرفداری کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹی خود مسیحی ہیں[1]۔ اس وجہ سے مندرجہ بالا فرمان سراسر تعجب خیز تھا۔ بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو ملک بھر میں خاص حفاظت حاصل تھی اور وہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس وجہ سے اونچے درجے کے سرکاری افسروں اور رومی مذہب کے پروہتوں کے دل میں رقابت کی آگ بھڑکی۔ انہوں نے فرضی سازشوں اور بغاوتوں کے افسانوں سے شہنشاہ کے کان بھرے اور حکم تعزیر حاصل کر لیا۔ دس سال تک یہ سلسلۂ عقوبت انتہائی تندی اور جوش و خروش سے جاری رہا۔ تعزیر کے عجیب و غریب طریقے نکال لیے گئے، جن سے انتہائی کینہ توزی ٹپکتی تھی۔ یوسیبیوس ہمیں بتاتا ہے کہ عرب میں جو مسیحی تھے، انہیں تبر سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا اور انطاکیہ کے مسیحیوں کو لوہے کی سیخوں پر لٹا کر آگ سے بھونا جاتا تھا[2]۔ اس مؤرخ نے یہ بھی بتایا کہ عورتوں نے عصمت و آبرو کے خوف سے دریائے عاصی میں گر کر جانیں دے دیں۔ اتنے مسیحیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا کہ جلّادوں نے ایک مینار تعمیر کرایا اور اس پر کھدوایا کہ مسیحیت کا نام مٹا دیا گیا اور اس نے جو اوہام پھیلائے تھے وہ بھی محو ہو گئے۔ دیوتاؤں کی پوجا سابقہ اخلاص و شان کے ساتھ بحال ہو گئی۔ چند سال بعد قسطنطین کے عہد میں مسیحیت کو سلطنت کا مذہب قرار دے کر قبول کر لیا گیا۔ رومی سلطنت کے ماتحت مسیحیوں پر ڈایو کلیشین کا جاری کیا ہوا دورِ عقوبت اپنی نوعیت کا آخری دور تھا۔

دوسرے مذاہب

جب مسیحیت نے عالمگیری برتری کے لئے سفر شروع کیا تو دوسرے مشرقی الاصل مذہب اس کے حریف تھے۔ ان میں سے خاص اہمیت "پراسرار" مذاہب کو حاصل تھی۔ ان مذاہب کی ابتدا نباتات و نمو کے دیوتاؤں سے ہوئی تھی، پھر دوسرے بہت سے دیوتا شامل ہوتے رہے اور ان دیوتاؤں کو یونانیوں اور رومیوں نے قبول کر لیا تھا۔ ابتدائی دیوتاؤں میں سے ایک ڈیوی سوس تھا، جسے شراب اور روحِ حیاتِ نبات کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ دیویوں میں سے ایزیز کو (جو مصری دیوی تھی) سب پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کے مذہب کو ۲۱۵ء میں کیرکلا نے سرکاری رومی مذاہب کے اندر شامل کر لیا تھا۔ ایزیز کی پوجا نے اس درجہ ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی کہ پہلی مسیحی صدیوں میں یہ پوجا سلطنت بھر کے اندر پھیل گئی تھی۔ اس کی تمثال بنائی گئی تو دکھایا گیا کہ یہ دیوی ایک بچے کو دودھ پلا رہی

---

[1] لیکٹینٹس۔ Lactantius کتاب ۱۵۔

[2] یوسیبیوس کتاب ۸ باب ۱۲۔

ہے اور بچہ ہورس دیوتا تھا۔ یہی مجسمہ مسیحیوں کے لیے مریم عذرا کا نمونہ بن گیا۔

پُراسرار مذہب میں سے جو سب سے آخر میں پیدا ہوا اور جس نے سب سے بڑھ کر ہر دلعزیزی حاصل کی، وہ متھرا کا مذہب تھا۔ متھرا ابتداً ایرانیوں کا سورج دیوتا تھا۔ یہ دراصل زرتشتی مذہب تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ رومی سپاہیوں کے اندر زیادہ مہر دلعزیز ہو گیا۔ انہیں اس مذہب کی محکم حیثیت خاص طور پر دلکش معلوم ہوئی۔ اس میں یہ سکھایا جاتا تھا کہ ایک مہربان قوت اور ایک شریر قوت کے درمیان مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔ ایک وقت میں ایسا نظر آتا تھا کہ مسیحؑ اور متھرا کے درمیان مسابقت کا معرکہ گرم ہے

پُراسرار مذاہب کا ایک پہلو یہ تھا کہ ان کی بعض باتیں مخفی رکھی جاتی تھیں۔ ان میں صرف انہی لوگوں کو شرکت کا موقع ملتا تھا جو مذہب میں شامل ہو جاتے تھے۔ مذہب میں شامل کرنے کی رسم کا خاص پہلو یہ تھا کہ انہیں بتلا دیا جاتا تھا۔ تم نے نجات حاصل کر لی ہے۔ نجات اس آسمانی نجات دہندہ کے ساتھ ذاتی وابستگی پر مبنی سمجھی جاتی تھی، جو خود زندگی اور موت کا تجربہ کر چکا تھا۔

پُراسرار مذاہب کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ سرکاری اور خاندانی مذاہب کے مقابلے میں افراد کے لیے ذاتی تجربات کے مواقع زیادہ تھے۔ ان مذاہب کو سرکاری مذاہب کا درجہ حاصل نہ تھا، لہٰذا انہوں نے نئے حلقہ بگوش حاصل کرنے کے لیے نئے نئے منصوبے تجویز کیے۔ دوسرے مذاہب کی طرح ان مذاہب میں بھی خاص رسمیں اور تقریبیں تھیں، ان میں تجدید بلکہ بدمستی و مدہوشی کا عنصر عموماً غالب رہتا تھا۔ پھر ان میں یہ بھی سکھایا جاتا تھا کہ جو شخص ابتدائی شرطیں پوری کرے وہ برکت و راحت کی زندگی بسر کریگا۔ موت کے بعد اسے آسمانی دائروں میں داخل مل جائے گا اور دیوتاؤں کے ساتھ رہے گا۔ اس اعتبار سے، نیز نظریہ نجات کے اعتبار سے یہ پُراسرار مذاہب مسیحیت کے ساتھ گہری مشابہت رکھتے تھے اور ان میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ یونان و روما کے مذاہب ویسی دلکشی پیش نہیں کر سکتے تھے۔

عرفانی فرقے اور پُراسرار مذاہب ایک ہی نمونے کی چیزیں تھیں۔ دونوں میں مرکزی نکتہ "عرفان" اعلیٰ علم اور روحانی روشنی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ چیزیں مخصوص آدمیوں کو حاصل ہوتی تھیں، جن کی بدولت روح غلامی کے حالات سے آزادی حاصل کر لیتی تھیں۔ مسیحی روایت یہ ہے کہ شمعون جادوگر عرفانی تحریک کا بانی تھا۔[1]

پہلی دو صدیوں میں شام کے اندر بھی مسیحیت کے حریف موجود تھے۔ ان میں سب سے زیادہ صاحبِ قوت حدد دیوتا تھا۔ جسے یونانیت کے دور میں دمشق، ہیلیو پولس اور ہیرا پولس کے زیوس کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کی پرستش پوری سلطنت میں پھیل گئی تھی۔ اس کی بیوی اتار غاتس ایزیز اور عذرا کی حریف تھی۔ ایک اور زیوس یا جوپیٹر کا تعلق دولیکہ[2] سے تھا، یہ اس جگہ رہتا تھا، جہاں لوہا ملتا تھا۔ وہ اصل میں حتیوں کا دیوتا تیشوب تھا۔ پھر دولیکہ سے زیوس یا پیٹر کی حیثیت میں اس کی پوجا پھیلی گئی۔ رومیوں کی فتوحات کے ساتھ یہ پوجا بھی ہر جگہ پہنچی۔ دوسرے مشرقی مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی تاجروں، سپاہیوں اور غلاموں کے ذریعے سے بیشتر یورپی ممالک میں پہنچ گیا۔ شروع میں آہن گر اس کے پیرو تھے۔ چین کے مغرب میں ایشیا کا جتنا علاقہ ہے، اس میں بہترین آہن گر شام ہی کے تھے۔ انہیں جہاں لوہا مل جاتا، وہیں اپنے کارخانے قائم کر لیتے،

---

[1] رسولوں کے اعمال باب ۸، آیت ۹ سے آگے۔ [2] Doliche یعنی عینتاب

اور جوفن انہیں باپ دادا سے میراث میں ملا تھا، اس سے کام لیتے۔ ان کا دیوتا بھی ساتھ ساتھ جاتا ہے شک رومیوں نے شامیوں پر فتح حاصل کر لی تھی، لیکن رومی دیوتاؤں نے اپنے گھر میں شامی دیوتاؤں کے لیے جگہ خالی کر دی[1]۔

شامی مسیحیت کے مرکز

شام کی منظم مسیحیت کا پہلا بڑا مرکز انطاکیہ میں تھا۔ انطاکیہ کا کلیسا ایک لحاظ سے ان تمام کلیساؤں کا سرچشمہ بن گئے جو غیر یہودی زمینوں میں قائم ہوئے۔ یہیں سے پولوس رسول اور مسیحیت کے دوسرے مبلغ تبلیغ کے لیے نکلتے تھے اور اپنی جدّ و جہد کی روداد میں پیش کرنے کے لیے انطاکیہ ہی آتے تھے۔ جب رومیوں نے ۷۰ء میں یروشلم کو تباہ کر دیا تو انطاکیہ ہی مسیحیت کا واحد مرکز رہ گیا۔ ایک خاص وقت تک اس کلیسا کو آس پاس کے مذہبی مرکزوں پر اقتدار حاصل رہا۔ اس کے اسقف (بشپ)، کو چوتھی صدی مسیحی میں بڑا اسقف (آرچ بشپ)، کہا جاتا تھا۔ اسقفوں کی تین مجلسیں مختلف اوقات میں یہاں منعقد ہوئیں۔ ان میں سے پہلی مجلس ۲۶۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔ انطاکیہ میں مسیحی الٰہیات کی ایک درسگاہ بھی قائم ہوئی تھی، جس کا بہترین نمائندہ جان کریسوسٹم[2] تھا۔ جس نے ۴۰۷ء میں وفات پائی۔ دوسرے مذاہب میں جذباتی اور سِرّی رجحانات زیادہ تھے۔ مذکورہ بالا درسگاہ میں انسانی عنصر، یعنی ہمدردی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور بتایا جاتا تھا کہ توجہ تاریخی مسیح پر جانی چاہیے۔ یونانی زبان اس درس گاہ کی زبان تھی۔

رسولوں کے زمانے سے یونانی اور آرامی، دونوں زبانیں عبادت میں استعمال ہوتی تھیں۔ جب انطاکیہ نے یونانی زبان بولنے والے شامی حصے میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تو آرامی زبان بولنے والے حصے میں ادیسا کو ویسی ہی حیثیت حاصل ہو گئی یہ شاید دوآبۂ دجلہ و فرات میں مسیحیت کا ابتدائی مرکز تھا۔ یہی سریانی ادبیات کا گہوارہ رہا۔ یہاں سریانی زبان میں بائبل کے ترجمے غالباً دوسری صدی کے اواخر میں کیے گئے۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں مسیحیت کے متعلق جو اختلافات پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے شامی مسیحیت متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔

مسیحی پادری

مسیحیت کی اشاعت میں مصنفوں کے اس سلسلے کا بھی خاصا حصہ ہے، جنہیں کلیسائی پادری کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کلیسائی نظریات وضع کیے اور انہیں پھیلایا۔ ان میں سے چھ ابتدائی بزرگوں کو رسولی پادری کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگیوں کا ایک حصہ بھی رسولوں کی معاصرت میں گزرا تھا۔ ان میں سے ایک شام کا باشندہ تھا جس کا نام اگناٹیس[3] تھا۔ یہ پطرس رسول کے بعد انطاکیہ کا اسقف بنا تھا[4]۔ روایت یہ ہے کہ جب ٹراجن ۱۱۵ء میں انطاکیہ آیا تو اگناٹیس نے شہنشاہ کے سامنے ایسی بے پروایانہ روش اختیار کی کہ اسے روما بھیج دیا گیا تا کہ اکھاڑے (اکھاڑہ) میں درندوں کے سامنے ڈال کر مروا دیا جائے۔ اس کی مختلف تصانیف میں سے

---

[1] مومسن (Mommsen) کی کتاب "صوبے" (Provinces) جلد دوم، ص ۱۲۳

[2] کریسوسٹم کے لفظی معنی ہیں، سونے کے منہ والا

[3] Ignatius

[4] یوسیبوس کتاب ۳، باب ۳۶۔

سات رسالے باقی ہیں۔

نیقیہ[1] کی مجلس منعقد ہونے سے پہلے (۳۲۵ء) جو پادری گزرے، ان میں سے دو شامی تھے، ایک جسٹن، جو شہادت پانے کے باعث شہید مشہور ہوا دوسرا اوریجن[2]۔ جسٹن نابلس میں پیدا ہوا (۱۰۰ء کے آس پاس) لیکن اس کے والدین سامری نہ تھے اسے افلاطون کے فلسفے سے خاص ذوق تھا۔ پھر ایک مسکین اور مقدس بوڑھے آدمی سے ساحل بحر پر ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ بات چیت سے جسٹن اتنا متاثر ہوا کہ مسیحیت کا حلقہ بگوش بن گیا۔ اس بزرگ نے جسٹن کو یہ مشورہ دیا کہ عبرانی پیغمبروں اور مسیح کی سیرتوں کا مطالعہ کرے۔ اس کا ذکر عموماً فلسفی کی حیثیت میں آتا ہے۔ اس نے افلاطونی اور رواقی فلسفوں کے عناصر مسیحی الٰہیات میں شامل کر لیے اور عرفانی تعلیمات کی مخالفت کرتا رہا۔ جسٹن کا معاصر ایک عرفانی مسیحی تھا، جس کا نام مارسیون[3] بتایا جاتا ہے وہ کہتا تھا کہ عہد نامۂ قدیم کا خدا اور عہد نامۂ جدید کا خدا ایک نہیں، نیز مسیح کو صلیب کا جو دکھ اٹھانا پڑا، اس کی حیثیت محض نمائشی تھی۔ مارسیون نے مذہب سے الحاد کی جو تحریک چلائی وہ روما سے انطاکیہ پہنچی اور شام کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔

جسٹن نے روما کے شاہنشاہ انٹونیس پائس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> "جس حد تک ہمارا تعلق ہے، ہمیں یقین ہے کہ جب تک ہمیں معصیت کار ثابت نہ کیا جائے یا یہ ثبوت بہم نہ پہنچایا جائے کہ ہم نازیبا زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ کسی کے کہنے سے ہم برے نہیں بن سکتے۔ باقی رہے تم، تو تم ہمیں جان سے مار سکتے ہو، مگر ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"[4]

کہا جاتا ہے کہ جسٹن نے روما میں پہلی مسیحی درسگاہ قائم کی تھی۔ وہیں اس پر الزام لگا اور وہیں اسے قتل کیا گیا، کیونکہ اس نے دیوتاؤں کے لیے قربانی سے انکار کر دیا تھا۔ یہ غالباً مارکس آریلیس کے عہد کا واقعہ ہے۔ مشرقی اور مغربی کلیسا، دونوں نے جسٹن کو مقدس قرار دے دیا۔ صور میں اب تک اس کی قبر بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے جادوگر اوریانوس کی قبر ہے۔

۱؎ Nicene

۲؎ Origen یہ پادری قیصریہ میں درس دیتا رہا اور صور میں وفات پائی (۲۵۴ء)

۳؎ Marcion

۴؎ جسٹن کی کتاب Apologia

چھبیسواں باب

سُریانی اثر اور رومی اثر کا مقابلہ

مسیحیت رومی سلطنت کے نہایت دُور افتادہ حصوں میں داخل ہو گئی اور اس نے انجام کار یونانی و رومی مذہبوں اور مشرقی حریفوں پر فتح حاصل کر لی۔ یہ شامی اثرات کا صرف مذہبی پہلو تھا۔ اس اثر کے اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی پہلو بھی تھے۔ اس اثنا میں رومی اثرات مخالف رُخ پر کارفرما تھے۔

شہرّیت کے ذریعے سے رومی اثر

رُومہ سے جتنا بعد زیادہ ہوا، اتنا ہی رومی اثر کم ہو گیا۔ شام میں اطالوی آبادکاروں کی تعداد اتنی نہ تھی کہ وہ رومی حضارت کے لیے روشنی کا مرکز بن سکتے۔ زیادہ تر لوگ سرکاری افسر تھے، جو ٹیکس جمع کرتے، اہم مقدمات سنتے اور ان کے فیصلے صادر کرتے۔ کھیلوں، جشنوں اور میلوں میں شریک ہوتے اور انہیں بہر حال بیرونی اور اجنبی سمجھا جاتا، لیکن رومی شہنشاہوں کا ابتدا ہی سے یہ دستور تھا کہ وہ مختلف نوآبادیوں کے دیسی باشندوں کو رومی شہریت کے حقوق عطا کر دیتے، مثلاً بیروت، ہیلیوپولس، یہ حق ان لوگوں کو ایک خاص حیثیت کا مالک بنا دیتا۔ جن دوسرے شہروں کو نوآبادی کی حیثیت حاصل نہ تھی، وہ خاص معاہدے یا عطیے کے ذریعے سے شہریت یا حقوق حاصل کر لیتے۔ مثلاً صور کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ اس کے باشندوں سے معمولی ٹیکس بھی نہیں لیے جاتے تھے۔ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" رومیوں کا پرانا سیاسی ہتھکنڈا تھا۔ اس سے کام لے کر انہوں نے مختلف شہروں اور گروہوں کو روم کے خلاف متحد ہونے سے باز رکھا۔

جب ٹراجن قیصروں کے تخت پر بیٹھا تو غیر اطالوی باشندوں کو رومیوں کے برابر حقوق دینے کی پالیسی پر زیادہ وسعت سے عمل ہونے لگا، کیونکہ ٹراجن خود ہسپانیہ کا باشندہ تھا، گویا غیر اطالوی تھا۔ یہ پالیسی ۲۱۲ء میں کمال پہ پہنچ گئی جب کیراکلاّ نے تمام صوبوں کے آزاد باشندوں کو پورے شہری حقوق دیئے جانے کے متعلق اپنا مشہور فرمان جاری کیا۔ اس وقت سے ہر شامی رومی شہری بن گیا اور اگر وہ مقرر کی ہوئی شرطیں پوری کر دیتا تو سلطنت میں بلند ترین عہدہ حاصل کر لیتا، عملی نقطۂ نگاہ سے اس فرمان کے فائدے صرف بعض اجتماعی حقوق اور خاص اقتصادی سہولتوں تک محدود رہتے۔ پولوس رسول نے بڑے زور سے کہا تھا کہ میں رومی شہری ہوں[1] اور میں قیصر کے ہاں اپیل کرتا ہوں[2]۔ اس قسم کے الفاظ ان دنوں بہت سے رومیوں کی زبان پر آتے ہوں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شام کے باشندے شامی ہونے کی حیثیت بھول گئے تھے۔ رومیوں کی سرپرستی میں یونانی تہذیب کا راستہ

---

[1] رسولوں کے اعمال باب ۲۲، آیت ۲۷۔

[2] ایضاً باب ۲۵، آیت ۱۱۔

درست تھا۔ اس نے اس خاردار مسئلے کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ مختلف قوموں کو ملا کر ذہن و فکر اور سیاسیات کے دائرے میں سرسری طور پر ایک کُل کی حیثیت دے دی جائے۔ سکندر نے ایک خواب دیکھا تھا اور وہ یہ کہ فاتحین اور مفتوحین کے درمیان اشتراک پیدا ہو جائے۔ اس کے اس فراموش شدہ خواب کے متعلق معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی جزوی تعبیر نکل آئی ہے۔

فوجی خدمات کا ذریعہ

رومی ابتدا ہی سے غیر اطالویوں کو معاونوں کی حیثیت میں استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ لشکروں میں دیسی باشندوں کی تعداد بڑھ گئی، جو لوگ فوجوں میں شریک ہوتے تھے، وہ خود بخود رومی شہری بن جاتے تھے۔ رومی فوجوں کے شامی سپاہیوں کو سلطنت کے مختلف شہروں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ جب تیسرے لیجن کو وسپیسین کی حکومت قائم کرنے کے لیے اٹلی جانا پڑا تو اس کے سپاہیوں نے شامی رسم کے مطابق[1] طلوع شدہ سورج کو سلام کیا۔ جس لشکر کو نیومیڈیا میں رکھا گیا تھا، اس میں افامیا، دمشق، طرابلس، القدس، بیروت، صیدا اور صور کے شامی باشندوں کا تناسب زیادہ تھا۔ لاطینی فوج کی سرکاری زبان تھی اور جو شامی مغربی صوبوں میں رہ آئے تھے، انہوں نے اپنے کتبات سے واضح کر دیا تھا کہ وہ اس زبان کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے رومی نام اختیار کر لیے تھے یا کم از کم ان کا ابتدائی نام ضرور رومی ہوتا تھا۔

مجسٹریٹوں کی سرکاری زبان بھی لاطینی ہی تھی، سرکاری فرمان لاطینی زبان ہی میں صادر ہوتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یونانی زبان میں ان کا ترجمہ کر دیا جاتا تھا۔ مختلف مقامی تقویموں کی جگہ رومی تقویم نے لے لی تھی اور ناپ تول کے لیے رومی نظام عام طور پر اختیار کر لیا گیا تھا۔

یہودیوں کی مزاحمت

شام کی متعدد قوموں میں سے یہودی تھے، جنہوں نے رومی تحریک کا کم سے کم اثر قبول کیا۔ امرا پہلے ہی سے یونانی رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ صدوقی، امرا کی جماعت کے نمائندے تھے، تمام عہدے ان کے قبضے میں تھے اور روز مرہ سے ان کو پوری حمایت ہوتی تھی۔ فریسی، عوام کے نمائندے تھے۔ وہ پختگی سے اصل مذہب پر قائم تھے اور ان کا نصب العین یہ تھا کہ رومیوں سے آزادی حاصل کر لیں۔ جس حد تک نظریات کا تعلق ہے، فریسی اس گروہ سے ملتے جلتے تھے، جسے مکابیوں کے زمانے میں ہاسیدیم کہا جاتا تھا۔

یہودیوں کے مذہب میں توحید پر حد درجہ زور دیا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ پہلے کے زمانے سے ایک خاص معزز جماعت کی حیثیت میں سلوک ہوتا تھا۔ شہنشاہوں نے انہیں فوجی خدمت اور شہنشاہی احترام کے خاص طور طریقوں سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ رومی فرماں روا عبادت کے موقع پر قربانیاں کرتے تھے، یہودیوں کے لیے ان تقریبوں میں بھی شریک ہونا ضروری نہ تھا۔ غرض انہوں نے اپنی علیحدگی اور انقطاع کی پالیسی قائم رکھی[2] اور اپنے قومی احساسات کی پرورش میں لگے رہے۔ اس طرح جا بجا تصادم کی نوبت آئی، جس نے پھیلتے پھیلتے قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ۶۶ء۔ ۷۰ء

[1] ٹیسی ٹس کتاب ۳، باب ۲۴۔

[2] جوزیفس "آثار یہود" کتاب ۱۴، آیت ۱۲

تک نیرو کے ماتحت اور ۱۳۲ء سے ۱۳۵ء تک ہیڈرین کے ماتحت قومی بغاوتیں ہوئیں۔ ان دو بغاوتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان آخری تفرقہ پیدا ہو گیا۔ اس سے یہودی معاشرے کو سخت نقصان پہنچا۔

یروشلم کی تباہی

نیرو نے یہودیوں کی بغاوت فرو کرنے کا کام اپنے جرنیل وسپیسین[1] کے حوالے کیا، جس نے ۶۷ء-۶۸ء میں میدانی علاقے کو بھی فتح کر لیا اور بکھرے ہوئے قلعے بھی لے لیے جو شہر برباد کیے گئے، ان میں یافا بھی شامل تھا۔ رومی فوج پچاس ہزار تھی اور اسے بہت ہی معمولی مقابلہ پیش آیا۔ وسپیسین یروشلم کا محاصرہ کرنے والا تھا، کہ نیرو مر گیا اور خود وسپیسین کے سر پر شاہی تاج رکھ دیا گیا۔ اس نے فوجی کارروائیاں اپنے بیٹے ٹائیٹس کے حوالے کر دیں، جس نے پانچ مہینے تک یروشلم کا محاصرہ جاری رکھا۔ ستمبر ۷۰ء میں شہر فتح ہو گیا۔ محصور شہر کے دردناک انجام کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب رومی سپاہیوں نے شہر پر حملہ کیا تو محصور خاندانوں نے باہم سب کو مار دینے کے عہد کر لیے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی بچوں کو قتل کیا، ہتھیار اِدھر اُدھر پھینک دیئے اور سب زمین پر لیٹ گئے، تاکہ اس شخص کے ہاتھوں قتل ہو جائیں جو قرعہ اندازی سے یہ دردناک کام پورا کرنے پر مامور ہو۔ ان حالات کا نقشہ اس مؤرخ کے قلم سے پیش ہوا ہے، جو خود جنگ میں شریک تھا۔

> "شوہروں نے انتہائی محبت سے بیویوں کے ساتھ معانقہ کیا۔ بچوں کو گود میں اٹھایا اور انہیں وداعی بوسے دیئے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی، لیکن جو عزم وہ کر چکے تھے، اسے پورا کیے بغیر نہ رُکے اور اسے ایسے انداز میں پورا کیا گویا یہ سب کچھ اجنبیوں کے ہاتھ سے ہو رہا تھا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے تو کن کن مصیبتوں سے سابقہ پڑے گا.....
>
> وہ بڑی بری حالت میں تھے، اگر ضرورت ایسی آ پڑی تھی کہ بیوی بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا انہیں کمتر درجے کا گناہ معلوم ہوتا تھا۔"[2]

شہر تباہ کر ڈالا گیا۔ ہیکل کو آگ لگا دی گئی۔ یہ وہی شاندار عمارت تھی، جو ہیرودیس نے بنائی تھی۔ اس سے پیشتر وہاں کئی مرتبہ عمارتیں بن چکی تھیں۔ ٹائیٹس نے بربادی ایسے درجے پر پہنچا دی کہ لوگ یہ بھی بھول گئے، ہیکل یروشلم کی مشرقی پہاڑی پر تھا یا مغربی پر۔ حرف بائبل کے بیانات سامنے رکھ کر اس کا نقشہ تیار کر لینے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دس لاکھ یہودی اس جنگ میں تباہ ہوئے۔ بہت سے قیدیوں کو ایک دوسرے سے لڑنے یا اکھاڑے میں درندوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کیا گیا، جو باقی بچے ان کے لیے مرکز حکومت یعنی یروشلم آنا ممنوع قرار دیا گیا۔ حق یہ ہے کہ یروشلم مرکز حکومت رہا ہی نہیں تھا۔ یہودیہ سیاسی ریاست کی حیثیت میں ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت یہودیوں کی جو حالت ہوئی وہ اب تک قائم ہے۔ یعنی وہ ایسے لوگ تھے، جن کا کوئی وطن نہ تھا۔ اس سے پیشتر اشوری اور کلدانی یہودیوں کو جا بجا منتشر کر چکے تھے، اس انتشار کی تاریخ میں ایک رومی باب کا اضافہ ہو گیا۔

---

[1] ڈیو Dio باب ۵۳، باب ۲۲۔

[2] جوزیفس۔ "واجات یہود" کتاب دوم، باب ۱۸۔

جب ہیکل جل رہا تھا تو ایک رومی سپاہی نے ہمت کر کے ایک ہفت شاخہ شمع دان اٹھا لیا تھا اور ٹائیٹس فاتح کی حیثیت میں روما واپس گیا تو جلوس کے ساتھ یہ شمع دان بھی تھا۔ روما میں چوک کے پاس اس فتح کی یادگار میں جو محراب بنائی گئی تھی، اس پر اب تک ایک سپاہی اس شمع دان کو بلند کیے کھڑا ہے۔ باقی رہی یہودیت تو عقیدت مند کے زوال کے ساتھ اس پر بھی زوال آ گیا۔ اس کی قومی بنیاد بڑی تنگ تھی، نیز بعض خاص رسوم کی وجہ سے اس قابل نہیں رہی کہ پھیل سکے۔ چنانچہ یہودی فاضلوں نے، جن کی ابتدا اسکندریہ کے فلو سے ہوئی تھی، یونانیوں اور رومیوں کی ذہنیت کو اپیل کرنے کی جتنی کوششیں کیں، وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

موت کی آخری ضرب اس وقت لگی، جب ایک پُراسرار لیڈر شمعون برکوکبا[1] (بار کوخبا) نے ۱۳۲ء میں بغاوت کا جھنڈا اٹھایا اور ۱۳۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہیڈرین نے بغاوت کو کچل ڈالا اور یروشلم کو ایک رومی نوآبادی بنا لیا۔ اس کا نام ایلیا کیپی ٹولینا[2] رکھا۔ ایلیوس[3] اس کا پہلا نام تھا۔ اس نے پرانے ہیکل کی جگہ ایک نیا ہیکل تعمیر کرایا اور اسے دارالحکومت کے جوپیٹر سے منسوب کیا۔ ڈیو کا اندازہ یہ ہے کہ نو سو پچاسی دیہات برباد ہوئے اور پانچ لاکھ اسی ہزار آدمی موت کے گھاٹ اترے۔

روما میں شامی خاندان

روما میں شامی اثرات کے دروازے دوسری صدی کے اواخر میں چوپٹ کھول دیئے گئے، جب حمص کی ایک خاتون کا شوہر قیصروں کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خاتون کا نام جولیا ڈومنا تھا یہ معبد اللہ جبل (واقع حمص) کے پروہت کی بیٹی تھی اور اس کے شوہر کا نام سپٹیمیس سیویرس تھا، جو شام کی رومی فوج کا سالار تھا۔ ان کی شادی ۱۸۷ء کے آس پاس ہوئی۔

سپٹیمیس، لیپٹس (موجودہ زمانے کا لبدہ جو طرابلس الغرب میں ہے) میں پیدا ہوا، جو افریقہ میں ایک فونیقی نوآبادی تھی۔ تاریخ میں صرف یہی ایک رومی شہنشاہ تھا، جسے افریقہ سے تعلق تھا۔ لاطینی اس کے لیے اجنبی زبان تھی اور وہ عمر بھر اسے تکلف سے بولتا رہا۔ اس کی اصل زبان پیونی تھی، جو آرامی سے اصلاً مختلف نہ تھی اور آرامی اس کی بیوی کی زبان تھی۔ وہ ۱۹۳ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے ایک مشتبہ دستاویز کے ذریعے سے اپنے آپ کو انٹونی خاندان کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اور اس کا واسطہ مارکس آریلیس تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ملکہ بڑی حسین و جمیل تھی، نیز خاص ذہنی، سیاسی اور ادبی صلاحیتوں کی مالک تھی۔ اسے آگسٹا کا خطاب دیا گیا اور وہ امورِ سلطنت کی کفالت میں اپنے شوہر کی معاون بن گئی۔ ان کا سب سے بڑا مشیر مشہور قانون دان پاپینیاں تھا جو ملکہ کا رشتہ دار تھا۔ اس کا شوہر برطانیہ میں لڑتے ہوئے مارا گیا (۲۱۱ء) لیکن ملکہ کا اقتدار اپنے دونوں بیٹوں کیرا کلا اور گیٹا پر قائم رہا، جو مشترکہ حیثیت میں بادشاہ بنائے گئے تھے۔

کیرا کلا کا اصل نام بسیانوس[4] تھا اور یہ نام اس کے نانا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کیرا کلا عرف تھا اور یہ ایک لبادے کی بنا پر رکھا

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ آرامی نام ہے اور اس کے معنی ہیں "ابن کوکب" (ستارے کا بیٹا) اور شاید یہ لقب بائیبل کی کتاب گنتی کے باب ۲۴، آیت ۱۷ سے ماخوذ ہے، جب وہ ناکام ہوا تو یہودیوں نے اسے برکوزِ (جھوٹوں کا بیٹا) کہنا شروع کر دیا

[2] Aelia Capitolina

[3] Aelius

[4] Bassianus

گیا، جسے کیراکلاؔ نے رواج دیا تھا۔ وہ خود لیانز (علاقہ گال) میں پیدا ہوا تھا، دونوں بھائیوں کے درمیان بچپن ہی سے نفرت کی خلیج ہو گئی تھی۔ کیراکلاؔ عمر میں بڑا تھا اور چاہتا تھا کہ سلطنت کا واحد مالک بن جائے۔ دونوں میں صلح کرانے کے لیے ملکہ نے اپنے ہاں دعوت دی۔ کیراکلاؔ وہاں پہنچا اور گیٹا کو ماں کے کمرے ہی میں قتل کر ڈالا۔ جولیا نے اپنے بیٹے کو بچانے میں دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا اور اس وجہ سے اس کا بازو زخمی ہوا۔ یہ ۲۱۲ء کا واقعہ ہے۔ اسی سال کیراکلاؔ نے رومی شہریت تمام صوبوں کے آزاد آدمیوں کو دے دینے کا فرمان جاری کیا۔ اس وقت اس کی عمر تیئیس سال تھی، گویا وہ اپنے بھائی سے ایک سال بڑا تھا۔ بعدازاں بدنصیب ملکہ کی قسمت میں یہ رہ گیا کہ ایک بیٹے کی موت اور دوسرے کی زندگی پر آنسو بہاتی رہے۔[1]

کیراکلاؔ خونریزی کا دور شروع کر چکا تھا، پھر اسے کوئی حد نہ ملی، جہاں پہنچ کر رک جاتا۔ جو لوگ اس کے بھائی کے حامی سمجھے جاتے تھے، وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ ان کی تعداد بیس ہزار تھی، ان میں پاپینیان بھی شامل تھا جو سپٹیمس کے دربار کی زینت بنا رہا تھا۔ چنانچہ کیراکلاؔ تلوار کے زور سے حکومت کرتا رہا۔ پرانے جرنیلوں میں سے اسے ہینی بال بہت پسند تھا، چنانچہ اس نے ہینی بال کے مجسمے تیار کرا کے بہت سے مختلف شہروں میں نصب کرائے۔ پھر اس نے سینٹ (مجلس عالیہ) سے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی دیوتاؤں میں شامل کر لیا جائے۔ ایک معاصر مؤرخ کیراکلاؔ کا نقشہ یوں پیش کرتا ہے۔

> "کیراکلاؔ کا تعلق تین نسلوں اور علاقوں سے تھا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس میں
> کسی کی کوئی خوبی منتقل نہ ہوئی، البتہ سب کی برائیاں جمع ہو گئیں۔ مثلاً گال کا
> تلون، بزدلی اور عاقبت نااندیشی، افریقہ کی درشتی اور ظلم و جور، شام کی
> عیاری، جہاں سے اس کی والدہ تھی۔"[2]

خونریزی کے اس طوفان میں ملکہ بالکل بے دست و پا تھی، وہ اپنے مقتول بیٹے پر ایک آنسو بہانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ کیراکلاؔ نے اپنی خط و کتابت اور سرکاری کاغذات اس کے حوالے کر دیئے تھے اور اس کے ہاں پاپینیان اور اُلپیان کے علاوہ تین آدمیوں کو خاص حیثیت حاصل تھی۔ ایک ڈایو جینز لارٹیوس[3] جس نے یونانی مورخوں کے سوانح لکھے، دوسرا ڈیو کاسیوس[4] جو مورخ بھی تھا اور سرکاری افسر بھی، تیسرا فلوسٹریٹس سوفسطائی[5]۔ مشہور یونانی طبیب جالینوس بھی اس حلقۂ علم میں شامل تھا، جو شام کی معمولی اصل خاتون نے اپنی گوناگوں قابلیتوں اور علم پروری کی بنا پر قائم کر لیا تھا۔ ملکہ کے باپ کا لاطینی نام بسیانوس تھا، جس کے معنی مسکین اور پست کے ہیں۔ اس کے نام کے ساتھ ڈومنا کا لقب لگا، جس کے معنی خاتون کے ہیں۔ رومی خاتونوں میں اس قسم کی خصوصیتیں بہت کم دیکھی گئیں۔ بلاشبہ متعدد مؤرخوں نے اس کے اخلاق کو داغ دار بتایا ہے، لیکن ڈیو نے ایسی کوئی چیز بیان نہیں کی۔

---

[1] گبن: زوال و انحطاط سلطنت روما جلد اول ص ۱۴۱۔

[2] ڈیو کتاب ۷۸ باب ۶۔

[3] Diogenes Laertius

[4] Dio Cassius

[5] Philostratus

جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کا بیٹا میکرینوس کی انگیخت پر اوبیسا میں مارا گیا (۲۱۷ء) تو وہ اتفاق سے انطاکیہ میں تھی، میکرینوس شاہی لشکر کا سالار اعظم تھا اور وہی کیرالکلا کا جانشین بنا۔ یہ خبر سنتے ہی جولیا نے فاقہ کشی کے ذریعے سے خودکشی کی کوشش کی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ اسے اپنے اس بیٹے کی وفات پر رنج تھا، جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے امید تھی کہ تنہا پوری سلطنت کی ملکہ بن جائے گی اور سیمی ریمس[1] نیز نیٹوکریس[2] کی برابری کرے گی، خصوصاً اس لیے کہ یہ دونوں خاتونیں بھی اسی علاقے سے آئی تھیں، جس علاقے سے جولیا آئی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی، آخر کامیاب ہو گئی اور اس کی نعش روما لے جا کر دفن کی گئی۔

جولیا ڈومنا نے جو کام شروع کیا تھا، وہ اس کی چھوٹی بہن جولیا میزا[3] نے جاری رکھا، جو زیادہ لائق تھی۔ میزا حمص میں پیدا ہوئی اور بہن کی شادی کے بعد روما پہنچ گئی۔ چنانچہ اپنے بھانجے کیرالکلا کے قتل تک وہیں رہی۔ وہ خاص بصیرت اور سیاسی تدبر کی مالک تھی اور اس کے پاس دولت کی بھی کمی نہ تھی، لہٰذا اس نے میکرینوس کے خلاف سازش کی اور اس کا تختہ الٹ کر اپنے نواسے ایلاگبالوس کو شہنشاہ بنا دیا۔ میزا کا شوہر ایک دولت مند آدمی تھا، جو مختلف صوبوں میں فوجوں کا کماندار رہا۔ پھر ۲۱۷ء میں قنصل کے منصب پر پہنچ گیا۔ ایلاگبالوس کا باپ شامی افامیا کا باشندہ تھا اور خود وہ حمص میں پیدا ہوا، جہاں اسے نانا کا موروثی منصب مل گیا۔ شامی فوج نے ڈومنا کی بہن کے اس نواسے کی حمایت کی۔ میکرینوس کو شکست ہوئی اور وہ انطاکیہ میں مارا گیا (۲۱۸ء)۔

سورج دیوتا روما میں

روما کا شہنشاہ مذہبی پیشوا بھی تھا۔ وہ اپنے جنگی رتھ کے ساتھ دارالحکومت میں داخل ہوا تو اس کے رتھ میں حمص کا سیاہ پتھر بھی تھا۔ یہ حمص کے بعل، یعنی سورج دیوتا کا نشان تھا۔ پہلے یہ پتھر حمص کے شاندار معبد میں رکھا ہوا تھا اور اسے سونے چاندی اور جواہرات سے آراستہ کیا گیا تھا اور جو شخص اس معبد میں پہنچ جاتا، وہ کتنا بھی مجرم ہوتا، مگر اسے ہاتھ نہ لگایا جا سکتا۔ اسی شامی دیوتا کی پوجا روما میں شروع ہو گئی۔ اس کی عبادت کا نظام خاص طور پر شاندار اور گراں خرچ تھا۔ قیمتی چڑھاوے چڑھائے جاتے، قربانیاں کی جاتیں، مذبحوں میں بخور ڈالے جاتے، ان پر قیمتی شراب چھڑکی جاتی۔ شہنشاہ کو بہت سے خطاب حاصل تھے۔ ان میں ایک نئے خطاب کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی "غیر مفتوح سورج دیوتا کا نہایت معزز پروہت ایلاگبالوس"۔ جس حد تک ایلاگبالوس کے اندر حکمرانی کا تعلق ہے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس کے مربی کیرالکلا کے اسلوب حکمرانی کا اجرا تھا، یعنی مسلسل بداخلاقیاں اور پرلے درجے کی حماقتیں۔ اس کی ماں جولیا میزا کاروبار حکومت چلاتی تھی۔ جب اس مخدومہ کو معلوم ہوا کہ ایلاگبالوس کا زوال قریب ہے تو اس نے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ الیگزانڈر سیویرس کو اپنا جانشین نامزد کر دے، جو جولیا میزا کا دوسرا نواسا تھا۔ ۲۲۲ء میں ایلاگبالوس فوج کے ہاتھ سے قتل ہو گیا اور الیگزانڈر اس کا جانشین بنا۔ جانشینی کے وقت اس کی عمر بمشکل تیرہ برس کی تھی۔ اس کا باپ عرقہ[4] کا باشندہ تھا۔ الیگزانڈر کی والدہ اپنی

---

[1] Semiramis

[2] Nitocris

[3] Julia Maesa

[4] Arqah ، ملاحظہ ہو ڈیو کتاب ۷۹، باب ۳۰۔

بہن کی طرح بیوہ تھی۔ اسے آگسٹا کا خطاب دیا گیا اور وہی بہ طور نائب کاروبارِ حکومت چلاتی تھی۔ ایگزانڈر شامی خاندان کا آخری اور بہترین بادشاہ تھا۔ اس نے وہ تمام مذہبی عجائبات اور مقدس پتھر اصل مقامات پر واپس کر دیئے، جنہیں اس کا پیشرو روما لے آیا تھا یہ حکم بھی دے دیا کہ جب تک میں زندہ ہوں، میری پوجا نہ کی جائے اور اس نے اپنے عبادت خانے میں زرتشت، ابراہیم اور مسیح کے مجسّے بھی رکھ لیے تھے۔ اس کی والدہ اوریجن سے مذہبی خطبے سنتی۔ ایگزانڈر نے دربار میں عیش ونشاط کے تمام طریقے روک دیئے، ٹیکس گھٹا دیے، سکّوں کا معیار بلند کر دیا اور علوم وفنون کی حوصلہ افزائی کی، لیکن اس میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ اپنی ماں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیتا، نہ وہ فوجیوں کی بے راہ روی کو روک سکتا تھا۔ ایک بغاوت میں اس کا مشیر اور سالار لشکر اُلپیان مارا گیا۔ ایک اور بغاوت میں ڈیو کاسیوس کی سالاری چھن گئی۔

۲۳۳ء میں ایگزانڈر نے ایرانیوں پر فتح کا جشن بہ مقام روما منایا۔ اس فتح میں دوآبہ دجلہ وفرات کا علاقہ ایرانیوں سے چھن کر رومیوں کے حوالے ہوگیا تھا۔ ساتھ ہی ایران میں قومیت کا احیا ہوا اور لوگ ایک نئے لیڈر کی سرکردگی میں از سرِ نو لڑائی کے لیے تیار ہو گئے یہ ساسانی خاندان کا بانی اردشیر تھا جس نے ۲۲۷ء میں پارتھیا کے کھنڈروں پر نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ادھر گال پر جرمن قبیلوں نے حملہ کر دیا۔ ایگزانڈر مقابلے کے لیے گال گیا۔ وہاں فوج نے بغاوت کی، جس میں وہ خود اور اس کی ماں مارے گئے۔

فلپ عربی

کوئی دس سال بعد روما کے تخت پر پھر ایک شامی بیٹھا، یہ فلپ عربی تھا۔ فلپ، حوران کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا وہ شاہی فوج کا سالار تھا۔ فلپ کا پیشرو ایرانیوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تو فوج نے خود اسے شہنشاہ منتخب کر لیا۔ سینٹ نے ۲۴۴ء میں اس انتخاب کی تصدیق کر دی۔ اس شامی شہنشاہ نے اختیارات کے ظالمانہ استعمال سے اپنے لیے نفرت پیدا نہ کی، تاہم اپنے محبوب پیشرو کو تباہ کرنے کے لیے اس نے جو طریقے اختیار کیے تھے، انہیں فراموش کرنا مشکل تھا۔ اس نے دریائے ڈینیوب کے زیریں حصّوں میں وحشی قبیلوں کے خلاف مہمیں جاری رکھیں اور اپنے لیے جرمینکس میکسمس کا لقب حاصل کیا۔ یہی شامی عرب تھا جس نے ۲۴۸ء میں، اس جشن کی صدارت کی جو روما کی ہزارویں سالگرہ کے موقع پر منایا گیا تھا۔ کھیل اور دوسری تقریبوں میں بڑی دھوم دھام اور شان وشوکت نمایاں تھی۔ اس شہنشاہ کو اگر مسیحی نہیں تو مسیحیوں کا حامی ضرور سمجھا جاتا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اوریجن نے چند خطوط اسے اور ملکہ کو لکھے تھے۔ یہ مان بھی لیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ کلیسا پر فلپ نے کوئی اثر نہ چھوڑا اور مؤرخین قسطنطین ہی کو پہلا مسیحی شہنشاہ قرار دیتے ہیں۔ ۲۴۹ء میں فلپ کو بھی وہی حالت پیش آئی، جو اس زمانے کے بہت سے دوسرے شہنشاہوں کو پیش آچکی تھی، یعنی باغی فوج کے ہاتھوں موت۔ کہا جاتا ہے کہ فلپ کے جانشین نے افریقہ سے شیر منگوا کر بادیہ شام میں چھڑوا دیئے تھے، تاکہ وہاں کے سرکش قبیلے مسلسل پریشان رہیں۔

اقتصادی توسیع

لاطینی صوبوں میں شامی اقتصادیات کی توسیع نوآبادیوں کی اس تعداد سے نمایاں ہے، جس کی سرگزشت ابتدا سے سلطنت کے آخر تک بہ آسانی معلوم کی جاسکتی ہے، خصوصاً دوسری اور تیسری صدی میں بحیرۂ روم کی دنیا کے اندر آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے ذمّہ دار "سیری" یعنی مشرقی حصّوں کے باشندے تھے۔ شامی جہاز ابتدائی زمانے کی طرح سمندر میں پھرتے تھے۔

پرانے فونیقی اوصاف از سرِ نو زندہ ہو گئے تھے، یعنی کاروبار میں سرگرمی اور مستعدی، ہر قسم کے حالات سے مطابقت، نفع بخش تجارت کی صلاحیت، بڑے اور چھوٹے سودے کر لینے کی قابلیت۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطنت کی تمام قوموں میں سے تجارتی طالع آزمائیوں میں سب سے بڑھ کر سرگرم شام کے لوگ تھے[1]۔

شامی نوآبادیاں بحیرۂ روم کے سواحل کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئیں۔ ان کے ساتھ شام کے اقتصادی، اجتماعی، اور مذہبی خصائل بھی اشاعت پاتے رہے۔ پھر یہ نوآبادیاں سواحل سے ہٹ کر ممالک کے اندرونی حصوں میں پھیلنے لگیں اور تجارتی شاہراہوں نیز بڑے بڑے دریاؤں کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ قائم ہوتا گیا۔ جزیروں میں سے ڈیلاس[3] اور سسلی بہت بڑی شامی نوآبادیوں کے مرکز تھے۔ اطالوی بندرگاہوں میں سے نیپلز اور آسٹیا[5] کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ شامی تاجر ڈینیوب کے راستے پینونیا اور دریائے رون کے راستے لیانز پہنچ گئے[4]۔ شام کے کاروباری آدمیوں نے ہسپانیہ میں بھی مرکز بنا رکھے تھے، لیکن ان کی سرگرمیوں کا اصل میدان علاقہ گال تھا۔ لبنان سے دوسری صدی عیسوی کی ایک تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ یہ ان ملاحوں کے نام تھی۔ جو گندم باہر لے جانے کے ذمہ دار تھے۔ گال میں تیسری صدی عیسوی کی ایک لوح ملی ہے جس پر دو زبانوں میں عبارت کندہ تھی۔ عبارت میں قنوات کے ایک شامی تاجر کا ذکر ہے، جس نے دریائے رون کے طاس میں دو کارخانے قائم کر رکھے تھے اور ان کے لیے وہ اکیوی ٹینیا[6] سے سامان منگواتا تھا۔ اس کا نام تیم[7] (یا ہولین) بن سعد تھا۔

جس حد تک درآمد کا تعلق ہے، شامی تاجروں نے اس پورے سامان کے لیے اجارہ داری قائم کر لی تھی، جو لاطینی صوبوں سے بحیرۂ روم کی مشرقی زمینوں میں آتا تھا اور بنکروں کی حیثیت میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شرابیں، مسالے، غلہ، بلور کی چیزیں کپڑا اور جواہرات خاص چیزیں تھیں، جنہیں وہ منگاتے تھے۔ بعض چیزیں مقامی صنعت گروں اور فنکاروں کے لیے اچھا نمونہ بن گئیں اور انہوں نے آہستہ آہستہ خود وہی چیزیں بنانی شروع کر دیں۔ شامی تاجر جہاں جہاں آباد ہوئے، انہوں نے اپنے معبد قائم کر لیے۔ غزہ کے بعل کی پوجا آسٹیا میں ہوتی تھی۔ بیروت کے بعل کی پرستش ہسپانیہ تک جا پہنچی تھی۔ اس بعل کا نام "بعل مرقود" (رقص کا دیوتا) تھا اور اس کا معبد دیر القلعہ میں مل گیا ہے۔ یہ اس پہاڑی پر ہے، جو بیروت کے سر پر کھڑی ہے۔ اسی معبد کے بعض ستون حال میں بیروت کے مارونی گرجے کی تعمیر میں استعمال ہوئے۔ پیٹولی میں متعدد قربان گاہیں تھیں، ان میں سے ایک میں دو سنہری اونٹ ایک عقیدت مند نے نبطی دیوتا ذوالشریٰ کی نذر کیے تھے۔ شہر کے دوسرے پجاریوں نے ہلیوپولس کے جوپیٹر کے لیے نذرانے پیش کیے۔ مغرب میں جو چیزیں آئیں، ان کے ساتھ تمام تحریریں لاطینی میں تھیں، البتہ رومہ کے ایک ندمرّی باشندے نے ندمرّی دیوتا کے لیے ایک تحریر آرامی زبان میں لکھی تھی۔

---

۱ آر بھرای، آر بوک (Boak) کی کتاب

۲ A History of Rome to 565 A.D

۳ Dellos

۴ لیانز فرانس میں ہے اور پینونیا غالباً ہنگری میں تھا

۵ Ostia

۶ Aquitania

۷ Thayyim

جو شامی تاجر، آباد کار، سپاہی اور غلام لامذہبی رسمیں جوش و خروش سے جگہ جگہ پہنچاتے رہے۔ انہوں نے مسیحیت کو بھی ویسے ہی جوش و خروش سے مختلف مقامات پر شائع کیا۔ مغرب میں مسیحیت کا نشوو ارتقا ہوا تو شامیوں کے اثرات اس میں نمایاں رہے مثلاً رہبانیت، خانقاہی نظام اور عبادت کے زیادہ جذباتی طریقے، صلیب کے لیے عقیدت اور مذہبی نشان کے طور پر اس کا تعین بھی شامیوں ہی سے یورپ پہنچا۔ روما میں ان کی آبادی خاصی اہم تھی اور ان میں سے متعدد پوپ منتخب ہوئے۔

ستائیسواں باب

بیزنطینی عہد کا شام

رومی سلطنت کا آخری دور

تیسری صدی عیسوی میں لاطینی صوبوں کے اندر شام کے مذہبی اور اقتصادی نظاموں کی توسیع بہت تیز ہوگئی۔ اس صدی میں یونانی و لاطینی تہذیب کا ایک دور ختم اور دوسرا دور شروع ہوا۔ اب تک سلطنت میں ایک حد تک یکساں نمونے کی حضارت قائم رہی تھی۔ اب اس کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔ اس کی مادی بنیاد طویل خانہ جنگیوں اور متواتر بیرونی حملوں نے کھوکھلی کردی۔ اس کے ہلتے ہوئے ذہن اور روحانی ستونوں پر مسیحی افکار کی نئی موجوں کی یورش شروع ہوگئی۔ تبدیلی بڑی تیزی سے آئی اور اس نے سراپا بدل ڈالا۔ ایک نئی حضارتی سٹیج تیار ہوئی۔ یہ بیزنطینی سٹیج تھی، جو مسیحیت اور پرانے لامذہبی عقائد والی یونانیت سے پیدا ہوئی۔ اس نے پہلی حضارت کی جگہ لے لی۔ اس کا رنگ مسیحی، یونانی اور مشرقی تھا اور اس کا مرکز قسطنطینیہ بنا۔

نیا دارالحکومت — قسطنطنیہ

اس شہر کا نام قسطنطین کے نام پر رکھا گیا، جو ۳۰۶ء میں باشتراک شہنشاہ بنا اور ۳۲۴ء سے ۳۳۷ء تک اکیلا بادشاہ رہا۔ اس کی بنیاد قدیم بیزنطیم کے مقام پر رکھی گئی تھی، جہاں یورپ اور ایشیا ملتے ہیں، اور ۱۱ مئی ۳۳۰ء کو اسے نیا دارالحکومت قرار دیا گیا تھا۔ اس کا حربی اور جغرافیائی محل فوجی اور اقتصادی فوائد کا حامل تھا اور ان تمام عوامل نے مل کر نئے شہر کو طبعی مرکز بنا دیا تھا جس کے اردگرد مشرقی دنیا مستعدی سے جمع ہوسکتی تھی۔ بہت جلد "نئے رومہ" کے سامنے، جو آبنائے فاسفورس پر واقع تھا۔ "پرانے رومہ" کی شان و شوکت ماند پڑگئی جو دریائے ٹائیبر کی زینت بنا ہوا تھا۔

دارالحکومت کو منتقل کرنے کا واقعہ بجائے خود سلطنت کے نصف مشرقی حصے کی برتری کا اعتراف تھا۔ اسی نصف کے صوبے دولت، ثروت اور طبعی وسائل کے اعتبار سے زیادہ اہم تھے۔ پوری سلطنت کا رُخ اس طرف پھر گیا۔ جس بڑی اور مہذب سلطنت سے رومہ کو مسلسل مقابلہ درپیش تھا، یعنی ایران، وہ مشرق ہی میں واقع تھی۔ معاملات عالم میں کشش کا مرکز پھر مشرق کی جانب منتقل ہو رہا تھا۔

نیا مذہب — مسیحیت

سلطنت کے لیے نئے دارالحکومت کی تاسیس سے پیشتر قسطنطین نے نئے مذہب کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا۔ اس نے میلان سے جو فرمان ۳۱۳ء میں شائع کیا، اس میں اپنی سلطنت کے مسیحیوں کے ساتھ کامل رواداری کے برتاؤ کا اعلان کردیا۔[1] ۳۲۵ء میں اس نے

---

[1] یوسیبوس کتاب ۱۰، باب ۵ -

سلطنت کے تمام اسقفوں کی عالمی مجلس نیقیہ (بیتھینیا) ایشیائے کوچک میں منعقد کی یہ اپنی نوعیت کی پہلی مجلس تھی اس میں آریوسیت[1] کو مردود قرار دیا گیا اور مسیحی عقائد کو مدون کر لیا گیا یہی مجموعہ "عقیدۂ نیقیہ[2]" کے نام سے مشہور ہے۔

قسطنطین کے قبول مسیحیت کی جو داستان بیان کی جاتی ہے وہ غالباً افسانہ ہے کہا جاتا ہے کہ جب قسطنطین نے ۳۱۲ء میں روم پر یورش کی تو آسمان میں ایک روشن صلیب نظر آئی جس پر یونانی زبان میں مرقوم تھا کہ اس کے ذریعے سے تم کامیابی حاصل کرو گے کم از کم یہ یقین ہے کہ قسطنطین نے اپنے حریف میکسنتیوس[3] کے خلاف پیش قدمی کی تو صلیب کو شاہی علم کا نشان بنایا۔ تاریخی اعتبار سے یہ بحث بالکل غیر اہم ہے کہ قسطنطین نے ضرورت کی بنا پر یا عقیدے کی بنا پر مسیحیت قبول کی یہ واقعہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ مسیحیت پہلے ایک اجنبی اور غیر معروف سلسلہ تھی، اب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گئی اگر یونان نے رومیوں کے ذہن و فکر کو مسخر کر لیا تھا تو شام ان کی روحوں پر مسلط ہو گیا۔

اس وقت تک سلطنت کے نہایت ذی اثر اصحاب مسیحیت کے حلقہ بگوش بن چکے تھے اگرچہ اکثریت (جن میں قسطنطین کے پیرو بھی شامل تھے) کا مذہب وہی تھا، جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ نظام، تنظیم، دولت ثروت اور قوت نفوذ اقلیت ہی کو حاصل تھی قسطنطین کی والدہ ہلینا ایک مخلص مسیحیہ تھی۔ اس نے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے یروشلم کا سفر اختیار کیا۔ روایت یہ ہے کہ اسے اصل صلیب[4] مل گئی اور یہ اسی جگہ سے ملی جہاں اب "کنیسۃ القیامہ[5]" موجود ہے۔ وہاں قسطنطین نے پہلا مسیحی کلیسا بنوایا۔ شہنشاہ اور اس کی والدہ نے مقامات مقدسہ کی زیارت کا جو جذبہ پیدا کیا اس سے اہل شام کو مسیحی بنانے کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔

قسطنطین کے عہد کے ان دو واقعات نے ـــــ روم سے دار الحکومت تبدیل کر کے قسطنطنیہ لانا اور مسیحیت کو سرکاری مذہب قرار دینا ـــــ اس عہد کو تاریخ یورپ کا ایک نہایت نمایاں سنگ میل بنا دیا۔ انھی کی بنا پر قسطنطین کے لیے "اعظم" کا لقب درست ثابت ہوتا ہے۔ قسطنطین نے جس نئی سلطنت کی بنیاد رکھی وہ مذہب کے اعتبار سے مسیحی، زبان کے اعتبار سے یونانی اور فکر و نظر کے اعتبار سے مشرقی تھی یہ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے باوجود سوا گیارہ سو سال تک قائم رہی۔ ساتویں صدی عیسوی سے یہ مسلمانوں کے خلاف حفاظت کا مورچہ بنی رہی بالآخر ۱۴۵۳ء میں اسلام کے نئے مجاہدوں یعنی

---

[1] Arianism اس فرقے کا بانی آریوس Arius جو اسکندریہ میں رہتا تھا اس نے اقانیم ثلاثہ کی تعلقات امتیاز و تبعیت کی بنا پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ بیٹے (مسیح) کی فطرت باپ (خدا) جیسی ہے بالکل وہی نہیں، اس میں مسیح کی الوہیت سے انکار کا رجحان نمایاں تھا لہٰذا اسے مردود قرار دیا گیا لیکن آریوسی عقیدہ گاتھوں، لمبارڈوں اور دوسرے جرمن قبیلوں میں پھیل گیا۔

[2] یعنی وہ مجموعہ عقائد جس کا فیصلہ نیقیہ کی مجلس میں ہوا۔

[3] Mexanism

[4] یعنی وہ صلیب جس پر عام مسیحی روایات کے مطابق حضرت مسیح کو چڑھایا گیا

[5] کنیسۃ القیامہ سے مراد ہے وہ کنیسہ جو مسیح کے زندہ ہو جانے کے مقام پر تعمیر ہوا۔ مسیحی روایت یہ ہے کہ حضرت مسیح کو جہاں سولی پر چڑھایا گیا تھا وہاں قریب ہی ایک قبر بنی ہوئی تھی اس میں نعش کو لٹا کر اوپر پتھر رکھ دیا گیا اور تیسرے دن حضرت مسیح جی اٹھے اسی جگہ یہ شہرۂ آفاق کنیسہ بنا جو زیارت گاہ دنیائے مسیحیت ہے وہ قبر اب تک دکھائی جاتی ہے اسے انگریزی میں کلیسائے قبر مقدس Church of the Holy Sepulchr کہتے ہیں

عثمانی ترکوں کے ہاتھوں مسخر ہو گئی۔[1]

قسطنطنیہ کے دارالحکومت بننے کے بعد چند سال تک سلطنت کی خارجی اور نظری وحدت قائم رکھی گئی مگر عملاً دونوں حصے ایک سے زیادہ مرتبہ الگ الگ ہوئے اور ان کے حکمران بھی الگ الگ تھے جب تھیوڈوسیس اعظم مرگیا تو ۳۹۵ء میں آخری مرتبہ سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھیوڈوسیس کے دو بیٹوں ہنوریس اور آرکیڈیس میں سے ایک نے مغربی حصّہ اور دوسرے نے مشرقی حصّہ سنبھال لیا گویا تھیوڈوسیس (۳۷۹ء۔۳۹۵ء) متحدہ سلطنت کا آخری شہنشاہ تھا اس وقت سے مشرقی رومی سلطنت وجود میں آئی۔ اس کی تقدیر کا ستارہ بلند ہوتا گیا اور دوسرے حصے کا اختر تقدیر رو بہ زوال رہا آخر ۴۷۶ء میں روما کو جرمن قبیلوں نے مسخر کر لیا۔ تھیوڈوسیس کو اعظم کا لقب اس لئے ملا تھا کہ اس نے گاتھوں کی یورشوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا تھا اور راسخ العقیدہ مسیحیت کو تقویت پہنچائی تھی ایک جولین (۳۶۱ء۔۳۶۳ء) کو چھوڑ کر قسطنطین کے تمام جانشین مسیحیت کے حلقہ بگوش تھے۔

انتظامی تقسیمات

چوتھی صدی کے اواخر میں شام کے متعدد ضلعے بن گئے تھے اس کی شمالی حصے کا نام بدستور شام رہا مگر یہ دو حصوں میں بٹ گیا ایک حصے کا نام "شام اولیٰ" تھا انطاکیہ اس کا دارالحکومت قرار پایا اور سلوکیہ، لاذقیہ، جبلہ، بیرویا (حلب) اور چالسس اوبیلیوم اس کے بڑے شہر تھے دوسرے حصے کا نام "شام ثانیہ" تھا اپامیا اس کا مرکز تھا اور اپی فینیا (حماۃ)، ایری تھوزا (الرستن)، لاریسہ (شیزر) اس کے دوسرے شہر تھے فونیقیہ کو بھی اسی طرح دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا تھا ایک فونیقیہ اولیٰ جس کا مرکز صور تھا اور بطلموسیہ (عکا)، صیدا، بیروت، جبیل، بوتریس، طرابلس، عرقہ اور ارادوس دوسرے شہر تھے۔ دوسرا فونیقیہ ثانی جس کا مرکزی شہر دمشق تھا اور اسی میں حمص، ہیلیوپولس اور تدمر شامل تھے فونیقیہ اولیٰ ساحلی علاقے پر مشتمل تھا فونیقیہ ثانیہ ان اندرونی علاقوں پر شامل تھا جو پہلے کبھی فونیقیہ یا لبنان میں شامل نہیں ہوئے تھے فلسطین کے تین حصّے کر دیے گئے تھے فلسطین اولیٰ جس کا بڑا شہر قیصریہ تھا یروشلم، نابلس، یافا، غزہ، عسقلان اور دوسرے شہر اسی حصّے میں تھے دوسرا فلسطین ثانیہ جس کا دارالحکومت سیتھوپولس (بیسان) تھا جدرہ، ابلہ، طبریہ اس کے دوسرے شہر تھے۔ تیسرا فلسطین ثالثہ اس کا بڑا شہر پیٹرا تھا اس میں سابقہ عربی صوبہ شامل تھا۔

تجارت

معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کی تقسیم اور صوبے کے تجزیے سے شام کی داخلی یا خارجی تجارت پر کوئی برا اثر نہ پڑا رومی عہد کی طرح بیزنطینی عہد میں بھی بحیرۂ روم کی تجارت شامیوں اور یونانیوں کے ہاتھ میں رہی سینٹ جیروم نے لکھا ہے کہ شامی تاجر نفع اور تجارت کی حرص میں پوری رومی دنیا کے اندر چکر لگاتے ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہیں یہ چوتھی صدی کے حالات کا نقشہ ہے بحیرہ روم کی دنیا میں شامیوں کی نوآبادیاں بدستور خوش حال رہیں شامی تاجر دوسرے تجارتی مرکزوں میں بھی داخل ہو گئے مثلاً روما، نیپلز، قرطاجنہ[2] مارسائی[3] بورڈو[4]۔ وہ عسقلان اور غزہ سے شراب، قیصریہ سے ارغوان، صور اور بیروت سے ریشمی کپڑے، دمشق سے تلواروں کے

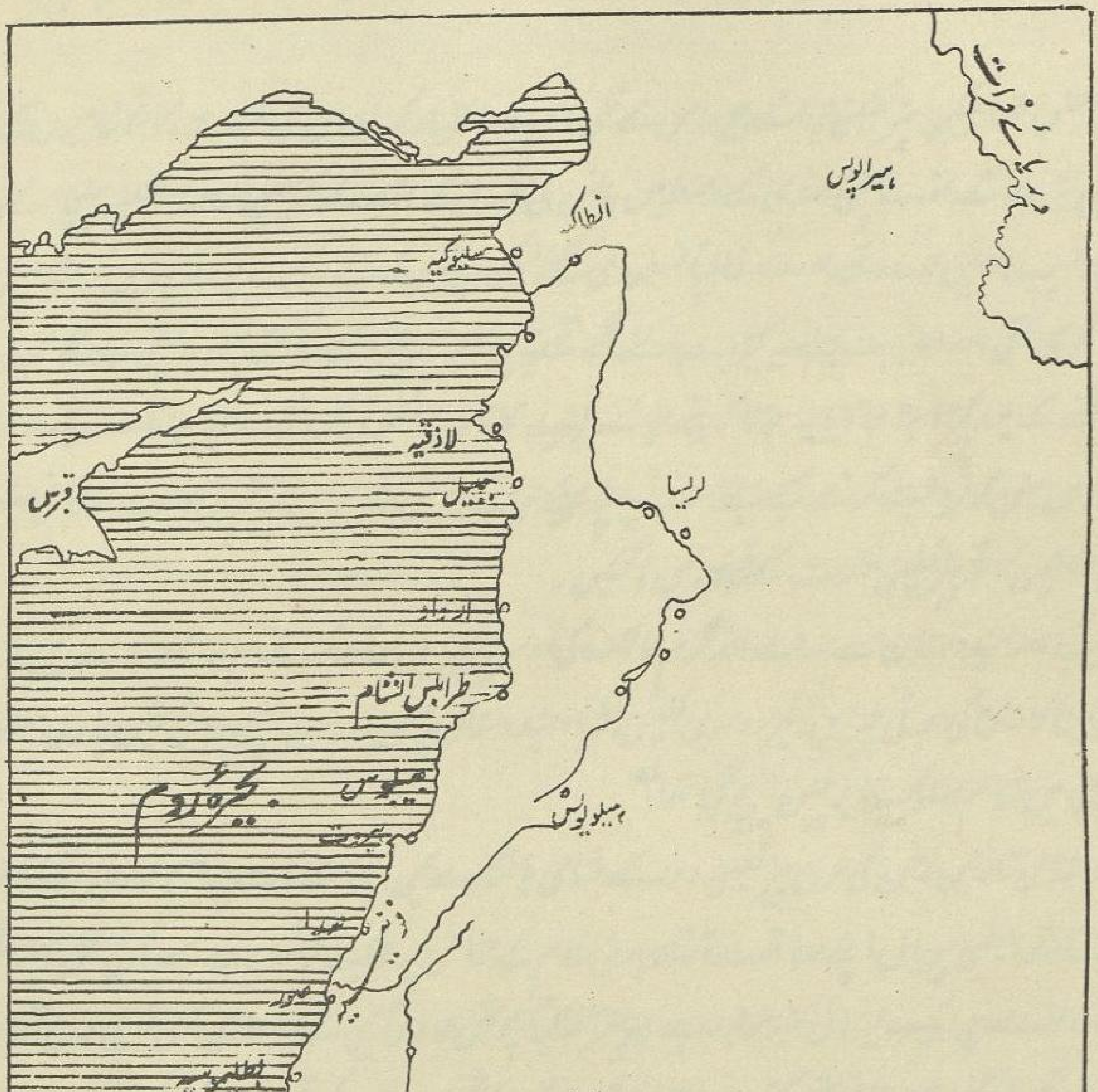
---

[1] J. B. Bury کی کتاب History of the Later Empire

[2] Carthage

[3] Marseille جنوبی فرانس کی مشہور بندرگاہ

[4] Brodeaux



شام بزنطینی عہد میں

پھل اور پستہ اور متعدد دوسرے شہروں سے کارچوبی پارچے منگواتے تھے کلیسائی ضروریات کے لیے کارچوبی پارچات کی بڑی ضرورت تھی۔

ریشم قدیم تجارتی جنس تھا لیکن بیزنطینی زمانے میں اس نے نئی اہمیت اختیار کر لی اس کی تجارت کا ملاً شامیوں کے ہاتھ میں تھی روایات یہ ہیں کہ ریشمی کیڑے کے انڈے چھٹی صدی کے وسط میں بانس کی نلکیوں کے اندر رکھ کر چین سے قسطنطنیہ پہنچائے گئے۔ یہ جسٹینین کا زمانہ تھا مسیحی راہب انہیں لائے تھے اور وہ غالباً نسطوری تھے لیکن یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ شامیوں کو جنگلی ریشمی کیڑوں سے آگاہی تھی اور وہ بہت پہلے یہ کیڑے پالنے لگے تھے چین کا ریشم بیڑا کے راستے بعض فونیقی بندرگاہوں میں پہنچتا تھا وہاں اسے رنگنے کے بعد کپڑا بنا جاتا یا یہ ہوتا کہ بنے ہوئے کپڑے کا تانا بانا کھول کر رنگ لیا جاتا اور دوبارہ اسے بنتے۔ رومیوں کی منڈیوں میں اس جنس کو فروخت کرنے کے لیے سب پارچے بھیجے جاتے غرض شام میں ریشم کی صنعت ارغوانی صنعت سے وابستہ ہو گئی اور دونوں صنعتیں کاملاً بیزنطینی حکومت کے قبضے میں آ گئیں۔

شام کے تاجر عرب اور ہندوستان سے مسالے اور گرم ممالک کی دوسری چیزیں درآمد کرتے تھے ان کے بدلے میں شام سے کانچ اور بلور کے برتن، میناکاری کی ہوئی چیزیں، نیز دوسری نفیس اشیا ہندوستان، چین اور عرب بھیجی جاتی تھیں ہماری معلومات یہ ہیں کہ تیسری صدی عیسوی میں شام کا ایک تاجر چین پہنچ گیا تھا۔

موجودہ دور کے شامی تارکین وطن کی طرح بیزنطینی دور کے شامی باشندے بھی نئے مقامات پر پہنچ کر وہاں کے باشندے بن جاتے کچھ لوگ واپس آتے تو اجنبی بیویاں اپنے ساتھ لے آتے بادیۂ شام کے حواشی پر ایک گاؤں ہے جسے آج کل امتان کہتے ہیں اس کی مسجد کے دروازے پر ایک یونانی کتبہ موجود ہے۔ یہ پتھر غالباً چوتھی صدی مسیحی کے وسط میں کسی قبر کی لوح تھا اور یہ قبر کسی تاجر نے اپنی فرانسیسی بیوی کی یادگار میں بنائی تھی کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ریمین کی تھی جو اپنے وطن سے بہت دور جان بحق ہوئی۔ اورلیانز میں شامی نوآبادی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ جب ۵۸۵ء میں شاہ گونٹرانڈ شہر میں داخل ہوا تو شامیوں نے مدح کے ترانے گاتے ہوئے اس کا استقبال کیا یہ ترانے شامی، لاطینی اور یہودی زبان میں گائے گئے تھے پیرس میں بھی شامی تاجر خاصی اہمیت کے مالک تھے میروونجی بادشاہوں کے زمانے میں ۵۹۰ء کے قریب شامیوں نے اپنے ایک تاجر کو استقف چن لیا اور مذہبی امور کا انتظام اس کے حوالے کر دیا اس شخص کا نام یوسیبیئس تھا۔

فن کار تارکین وطن

اکثر شامی تارکین وطن کاروباری آدمی تھے لیکن بعض غلام، سپاہی، راہب یا فن کار بھی تھے شامی معماروں اور سنگ تراشوں

---

۵۱ Hirth ص ۲۰۶۔

۵۲ Imtan مشنہ یا المثنہ جو مسلمہ (حوران) کے جنوب مشرق میں ہے۔

۵۳

۵۴ Eusebius

۵۵ Gontrand

نے آخری دور کی یونانی طرز وضع کے نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا جسے عموماً بزنطینی طرز کہا جاتا ہے مشرقی صوبوں کے ماہرین فن تیسری صدی سے روم میں کام کرنے لگے تھے جس انجینئر نے ٹراجن کے لئے ڈیشیا[1] کی دوسری مہم کے وقت دریائے ڈینیوب پر پل بنایا تھا، وہ دمشقی تھا اور اس کا نام اپولوڈورس[2] تھا۔ اسی شخص نے آگے چل کر روم میں ٹراجن کے لئے ایک چوک کا نقشہ پیش کیا جس کے ساتھ ایک معبد اور ایک کتب خانہ تھا یہ سب کچھ ٹراجن کی فتوحات کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ اس کے ستون اب تک باقی ہیں بلند ستون پر مجسمہ نصب کرنے کا طریقہ شمالی شام ہی کی خصوصیت تھا جو مغرب میں پھیلا۔

اغلب ہے شام ہی کے ہنرمند کاریگروں کو ریونا[3] میں نئے دار الحکومت کی آرائش کے لئے بلایا گیا تھا۔ جہاں ہنوریئس، (۳۹۵ء۔ ۴۲۳ء) اپنا دربار لے گیا تھا تاکہ روم پر جرمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے یہ کاریگر وہیں رہ گئے تاکہ مقامی باشندوں کو اپنا فن سکھا دیں۔ انہیں نے پچی کاری کا فن اور دوسرے آرائشی طریقے جاری کئے پانچویں صدی میں ریونا شمالی اٹلی کا فنی مرکز بن گیا اس کی درسگاہ فنون و تعمیر کو نصف شامی بتایا گیا ہے ریونا کے بعد وینس اطالوی سرزمین میں مشرقی حضارت کا نمائندہ بن گیا یہ شہر کو بھی نصف شامی بتایا گیا ہے یہاں شامی اسقف مقرر ہوتے تھے گال (فرانس) کا ایک سیاح ریونا پہنچا وہ غالباً جنوبی فرانس میں شامیوں سے تعارف حاصل کر چکا ہوگا اس نے بتایا کہ میں نے ریونا میں ایک شامی کو زبور گاتے ہوئے سنا تھا یقیناً روم میں کئی مذہبی عہدیدار اور راہب موجود ہوں گے جو شامی تھے۔

ادبیات و تعلیم

بزنطینی شام کی ذہنی زندگی کا ابتدائی دور پیش نظر رکھا جائے تو ایک عجیب اضطرابی کیفیت نظر آتی ہے مسیحیوں اور غیر مسیحیوں، یونانی اور لاطینی مصنفوں کے درمیان سالہا سال تک مجادلات جاری رہے ان کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب قسطنطین نے قبول مسیحیت کا اعلان کیا، نو فلاطونیت کے اعلیٰ فروغ کا دور تیسری صدی پوری، نیز چوتھی صدی کا پہلا عشرہ ہے۔ اس کے دو بڑے شامی شارح تھے ایک فرفوریوس دوسرا یمبلی خوس اور نو فلاطونیت مردہ نہیں ہوئی تھی بلکہ پادری قدم بہ قدم آگے آ رہے تھے تاکہ فکر و نظر کی قیادت سنبھال لیں سوفسطائی اور خطیب پیچھے ہٹ رہے تھے لیکن بالکل ختم نہیں ہوئے تھے

لبانیوس

چوتھی صدی کے شامی خطیبوں اور بلغا میں سب سے زیادہ کثیر التصانیف لبانیوس[4] (۳۱۴ء۔ ۳۹۳ء) تھا وہ انطاکیہ کا باشندہ تھا اور نام سے ظاہر ہوتا ہے اس کا تعلق لبنان سے تھا انطاکیہ اور ایتھنز میں تعلیم پانے کے بعد لبانیوس نے نئے شہنشاہی

---

[1] Dacian کلاسکی زمانے میں یہ اس علاقے کا نام تھا جو ڈینیوب اور کوہستان کارپیتھی کے درمیان تھا اب یہ علاقہ ہنگری اور رومانیا میں شامل ہوا ہے

[2] Apollodorus

[3] Ravenna بحیرہ ایڈریاٹک کے کنارے اٹلی کا شہر جو بولون کے شرق میں ہے۔

[4] Libanius

دارالحکومت[1] میں اپنی ایک درس گاہ قائم کی وہ نیقیہ اور نکومیڈیا میں بھی تعلیم دیتا رہا چالیس سال کی عمر میں وطن واپس آگیا اور وہاں چالیس سال تک خطیب، معلم اور مدبر کی حیثیت میں سرگرم عمل رہا۔ شہنشاہ اور بلند پایہ سرکاری کارکن اس سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔

لبانیوس نے لاطینی کا مطالعہ کبھی نہ کیا۔ مسیحیت سے اسے نفرت تھی کہتا تھا کہ یہ حقیقی حضارت کی دشمن ہے۔ یونانیت کے سوا اسے ہر شے بے کار نظر آتی تھی جب انطاکیہ میں اس کے قابل شاگرد کریسوسٹم نے یونانی دیوتاؤں کو چھوڑ کر مسیحیت اختیار کر لی لبانیوس کو بہت دکھ ہوا اور اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ لبانیوس کا ایک اور شاگرد باسل کبیر[2] (۳۲۹ء-۳۷۹ء) تھا جس نے قسطنطنیہ یا انطاکیہ میں لبانیوس سے فیض حاصل کیا تھا۔ آگے چل کر قیصریہ کا اسقف بن گیا یہ مقام کپاڈوشیا۔ باسل، آریوسیت کے خلاف اصل مسیحیت کا بہت بڑا داعی تھا لبانیوس کی زندگی کا آخری دور تلخی میں گذرا اوّل اسے جسمانی تکالیف پہنچیں اس لیے کہ اس پر بجلی گر گئی تھی پھر وثنی علوم پر زوال طاری ہو گیا جن کا وہ بہت بڑا حامی تھا۔ ۳۶۳ء میں اس کے مداح اور سرپرست شہنشاہ جولین نے وفات پائی۔

لبانیوس کی جو تصانیف اب موجود ہیں وہ زیادہ تر اس کے خطوط اور خطبوں پر مشتمل ہیں ان میں لبانیوس کے عہد اور مقامات کی واضح تصویر آگئی ہے۔ یہاں سے ایک دریچہ کھلتا ہے جس میں سے جھانک کر ہم وقت کے تعلیمی ذرائع کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ انطاکیہ میں تعلیم کا اصل وقت موسم سرما اور موسم بہار تھا۔ گرمیوں کے مہینوں میں جشنوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ درس بہت سویرے شروع ہو جاتا اور دوپہر تک جاری رہتا۔ بعض طالب علموں کی عمریں سولہ سولہ سال تھیں۔ اعلیٰ تعلیم بلغا کے سپرد تھی۔ بلغا کو پروفیسر بنانے کے لیے انتخاب ہوتا۔ شہروں کی مجالس انتخاب میں حصہ لیتیں اور چھوٹے قصبوں میں عام لوگوں سے رائیں لی جاتیں۔ بلغا طالب علموں کو تعلیم دیتے۔ ان کے سامنے بلاغت کے نمونے پیش کرتے اور نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے۔ انطاکیہ میں ان کی تین مجالس تھیں۔ اور ہر مجلس کا الگ صدر تھا۔ انہیں ان خدمات کے عوض شہروں سے بھی تنخواہیں ملتیں اور طالب علم بھی رقمیں پیش کرتے۔ یونان کی کلاسیکی تصانیف کو نصاب میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ لاطینی صرف وہی سیکھتے جو سرکاری ملازمت کے خواہاں ہوتے۔ منطق پر زیادہ زور دیا جاتا۔ فرفیریوس نے ارسطو کی تصانیف سے لوگوں کو از سر نو روشناس کرایا اور اس کا نام دوبارہ روشن ہو گیا۔

امیانوس مارسیلس

لبانیوس کا ایک معاصر امیانوس مارسیلس[3] (۳۳۰ء-۳۹۵ء) بھی انطاکیہ ہی کا باشندہ تھا۔ ایک امیر یونانی گھرانے میں پیدا ہوا۔ شروع میں فوج کی ملازمت کر لی اور اسے دجلہ و فرات اور فرانس میں لمبی مدت تک شاندار خدمات انجام دے کر اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا۔ زندگی کے آخری دور میں ٹیسی ٹس[4] کی تاریخ کا سلسلہ بزبان لاطینی آگے جاری کیا لیکن اس کا صرف ایک حصہ باقی ہے اس کتاب میں اس نے نسلی اور شخصی کردار، نیز اجتماعی اداروں پر حملوں سے زیادہ توجہ مبذول کی مسیحیت کے تعلق میں اس نے لبانیوس سے زیادہ رواداری کا ثبوت دیا اور لبانیوس ہی کی طرح وہ بھی اپنے شہر اور وطن پر بے انتہا فخر کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ انطاکیہ کا کوئی ثانی نہیں وہاں مقامی

---

[1] اس سے مقصود قسطنطنیہ ہے۔

[2] Basil the Great

[3] Ammianus Marcellus

[4] Tacitus

اندورآمد کی ہوئی جنسوں کی ریل پیل ہے۔ فونیقیہ کوہ لبنان کے دامن میں واقع ہے یہ خطہ حسن و جاذبیت سے لبریز ہے۔ فلسطین میں کاشت کی ہوئی اور عمدہ زمینوں کی افراط ہے، عرب کے اس حصے میں، جو رومیوں کے ماتحت ہے ہر قسم کا اعلیٰ سامان تیار ہوتا ہے اور اس میں جا بجا مضبوط قلعے اور حصار بنے ہوئے ہیں یہاں کے بڑے شہروں میں بُصریٰ، جرسا اور فلاڈلفیا و عمّان کے اردگرد حفاظت کے لیے مستحکم فصیلیں موجود ہیں۔

جان کریسوسٹم[1]

لبانیوس اور امیانوس جیسے مصنفوں کی بدولت انطاکیہ شمالی شام کا علمی مرکز بن گیا۔ آریوس اور نسطوریوس نے یہیں تعلیم پائی تھی۔ مسیحی خطیبوں اور مصنفوں کے درخشاں کارناموں نے اس کی چمک دمک میں اضافہ کر دیا۔ ان میں سب سے بڑا جان کریسوسٹم (۳۴۷ء-۴۰۷ء) تھا۔ جان نے وکالت کے لیے تعلیم پائی تھی لیکن بہت جلد اسے چھوڑ کر شہر کے پاس ایک پہاڑی پر بیٹھ گیا اور راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ پہاڑ سیلپیوس[2] ہی تو نہیں تھا جو انطاکیہ کے جنوب میں واقع ہے؟ یہاں ایک غار میں مدہم سی روشنی صدیوں سے نظر آتی ہے جسے مقامی مسلمان ایک مسلمان ولی کی یادگار میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے وطن میں جان نے اعلیٰ پیمانے پر وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان تقریروں میں اخلاق سے بے پروائی اور عیش و نشاط کی زندگی کی مذمت کی جاتی تھی۔ امیروں کو اس لیے برا بتایا جاتا ہے کہ وہ جبر و ظلم، فریب، اجارہ داری اور سود خواری کے ذریعے سے دولت حاصل کرتے ہیں۔ غریبوں اور مسکینوں کے حالات سے بے پروا ہیں گویا کلیسائیت اور الٰہیات کے دور میں جان نے اصلاحِ معاشرت کا پیغام دیا۔ اپنی واعظانہ صلاحیتوں کی بدولت وہ اتنا مشہور ہو گیا کہ ۳۹۸ء میں اسے قسطنطنیہ کا اسقفِ اعلیٰ چنا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے پیشرو نے جو قیمتی چیزیں جمع کر رکھی تھیں انہیں فروخت کر کے روپیہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے وعظوں کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ یہ کہتا تھا کہ شوہر کی بے وفائی بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسی بیوی کی بے وفائی۔ گویا اس نے اوپر سے کلیسا کی تطہیر شروع کی۔

اخلاقی اور معاشرتی اصلاحات پر ایسے غیر مصالحانہ اصرار کا نتیجہ یقیناً یہی ہو سکتا تھا کہ دربار کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے۔ اس کے بڑے دشمنوں میں ایک ملکہ یوڈوکسیا[3] بھی تھی جو شہنشاہ آرکاڈیوس[4] کی بیوی تھی۔ جان نے ایک خطبے میں اسے ہیرودیہ[5] سے تشبیہ دی تھی بلکہ اس کا مجسمہ ایک بڑے کلیسا کے پاس نصب کرنے کی تجویز پیش کی تھی جان نے اس پر اعتراض کیا۔ اسے دو مرتبہ دارالحکومت سے جلاوطن کیا گیا لیکن وہ استقلال سے اپنی روش پر قائم رہا۔ وہ جلاوطن ہو کر قفقاز کی جانب سلطنت کی سرحد کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اسے مجبور کیا گیا تھا کہ لمبی منزلیں طے کرے۔ دھوپ اور بارش نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا اور اس نے راستے ہی میں وفات پائی۔ اس کی نعش قسطنطنیہ منتقل ہوئی اور بڑی دھوم سے اسے دفن کیا گیا۔ ابتدائی دور کے مسیحی مبلغوں میں وہ سب سے بڑا سمجھا

---

[1] John Chrysostom

[2] Silpius

[3] Eudoxia

[4] Arcadius

[5] Herodias

جاتا ہے۔ موت کے بعد اسے کریسوسٹم یعنی "سنہری زبان والے" کا لقب دیا گیا اس کے وعظوں میں علم و فضل کے بجائے فصاحت زیادہ ہوتی تھی ان سے بھی وقت کی اجتماعی زندگی پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ وہ مسیحی اخلاق کا ممتاز ترین معلم سمجھا جاتا ہے اور کلیسا کے دائرے میں ویسا کوئی دوسرا شخص پیدا نہ ہوا[1]۔

یوسیبیوس

اس عہد کا ایک اور مسیحی پیشوا یوسیبیوس[2] (۲۶۴ء۔ ۳۴۹ء) قیصریہ (فلسطین) میں اسقف تھا اور کلیسا کا پہلا بڑا مؤرخ اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ فلسطین میں اور غالباً قیصریہ میں پیدا ہوا اور انطاکیہ میں تعلیم پائی۔ دوسرے معاصر اسقفوں کی طرح ابتداء میں وہ بھی آریوس کا حامی بن گیا تھا لیکن جب نقیہ میں مشہور مذہبی مجلس منعقد ہوئی اور فلسطین نے مجلس کے افتتاح کا اعلیٰ منصب یوسیبیوس کے سپرد کیا تھا تو اس نے اس بڑے ملحد آریوس، کی مذمت کی۔ اس نے شہنشاہ کے لئے ایک مدحیہ خطبہ پڑھا اور اسے شہنشاہ کے دائیں ہاتھ بٹھایا گیا۔ یوسیبیوس عمر بھر قسطنطین کا گہرا دوست اور سرگرم مدّاح بنا رہا۔ اس نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کتاب کا نام تاریخ کلیسا تھا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اسی کتاب میں یوسیبیوس نے مسیحیت کے ظہور و ترقی کا ذکر تفصیلاً کیا ہے ساتھ ہی سلطنت نے اس کے تعلق کی کیفیت بتائی ہے۔

قیصریہ کا ایک اور مؤرخ پروکوپیس[3] تھا وفات ۵۶۳ء وہ جسٹینین (۵۲۷ء۔ ۵۶۵ء) کے عہد کے واقعات کا سب سے بڑا مؤرخ ہے۔ پروکوپیس نوجوان ہی تھا جب ۵۲۷ء میں رومی جرنیل بلیساریوس نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور قانونی مشیر مقرر کر لیا چنانچہ وہ ایشیا، افریقہ اور اٹلی کی تمام مہموں میں بلیساریوس کے ساتھ رہا۔ جسٹینین نے اسے سینیٹ کا ممبر بنا دیا۔ پروکوپیس بعض اوقات ایک مسیحی کی حیثیت میں اور بعض اوقات یونانی دیوتاؤں کے معتقد کی حیثیت میں لکھتا ہے۔ اس کی تاریخی معلومات کو اس وجہ سے سند کا درجہ حاصل ہو گیا کہ اس نے بعض معلومات خود متعلقہ لوگوں سے سنیں اور زیادہ تر ذاتی تجربات سے حاصل کیں۔

بہت سے مسیحی مشاہیر جنوبی شام سے وابستہ ہیں، اگرچہ وہ شام میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں درجہ سینٹ جیروم[4] (۳۴۵ء۔ ۴۲۰ء) کو حاصل ہے۔ جیروم کی طبیعت راہبانہ تھی۔ وہ ۳۸۶ء میں بیت لحم کی ایک خانقاہ میں جا بیٹھا۔ وہاں سے بادیۂ شام میں چلا گیا اور پانچ سال تارک الدنیا درویشوں کے ساتھ بسر کئے پھر اس نے مغرب میں خانقاہی زندگی کا نظام جاری کیا۔ اس کا زیادہ نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بائبل کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا جو ولگیٹ[5] کے نام سے مشہور ہے اور رومن کیتھولک کلیسا کی عبادات میں اسی کو معیاری مانا جاتا ہے۔

۱۔ اس کی شبیہ ایا صوفیہ کی دیوار پر بنی ہوئی تھی جس پر پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں یہ تصویر برآمد ہوئی۔

۲۔ Eusebius

۳۔ Procopius

۴۔ St. Jerome

۵۔ Vulgate

غزہ

قیصریہ کے بعد جنوبی شہروں میں سے صرف غزہ تھا جس نے اس عہد میں علم کی شمع روشن رکھی یروشلم ابھی تباہی کی اس ضرب سے سنبھلنے نہیں پایا تھا جو اسے رومیوں کے ہاتھ سے لگ چکی تھی سوزومن[1] نے پانچویں صدی میں کلیسائی تاریخ لکھی۔ وہ بیت ایل کا باشندہ تھا جو غزہ سے تھوڑے فاصلے پہ واقع ہے اس کے والدین مسیحی تھے اور اس کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہر اور اس کے حوالی سے خوب واقف تھا۔ اس نے اپنی تاریخ تھیوڈوسیس ثانی (۴۰۸ء۔ ۴۵۰ء) کے نام سے منسوب کی تھی لیکن شہر کی شہرت کا اصل ذریعہ بلاغت کی ایک درس گاہ تھی جو سنہ ۵۰۰ء کے آس پاس وہاں فروغ پر تھی اس درس گاہ کا خیال اسکندریہ کی درس گاہ دیکھ کر پیدا ہوا اس کے اساتذہ اور متعلم کبھی کبھی قیصریہ اور دوسرے علمی مرکزوں سے مبادلہ کر لیتے تھے۔ چند اساتذہ تو فلاطونی تھے باقی اپنے آپ کو مسیحی سوفسطائی کہتے تھے۔ ان اساتذہ نے جو کتابیں لکھیں ان میں بائبل کی تفسیریں نیز یونانیوں یا غیر یہودیوں کے خلاف رسالے بھی تھے بحیثیت مجموعی جنوبی ساحل کے شہر کلیسائی مباحث کے ویسے مشتاق نہ تھے جیسے انطاکیہ یا شمال کے دوسرے شہر۔

بیروت علمی مرکز کی حیثیت میں

بزنطینی شام کے تمام شہروں میں سے صرف بیروت تھا جو علمی قیادت میں انطاکیہ کا مقابلہ کرتا تھا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ بیروت میں قانون کی ایک درس گاہ موجود تھی اور بزنطینی عہد میں قانون پہ بہت زیادہ توجہ مبذول رہتی تھی۔

یہ درس گاہ پانچویں صدی میں اوج کمال پہ پہنچی جب بزنطینی سلطنت کے بہترین نوجوان دماغ اس طرف کھچے آنے لگے خود قسطنطنیہ میں ایک درس گاہ ۴۲۵ء میں قائم ہوئی تھی لیکن وہ بیروت کی درس گاہ کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی اس درس گاہ کے نصاب میں سائنس، ہندسہ، بلاغت، یونانی، لاطینی وغیرہ شامل تھے، چار سالہ تعلیم دی جاتی تھی جسٹینین ۵۲۷ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے ایک سال کی مدت بڑھا دی طالب علم پچیس سال کی عمر تک فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے بہت سے مسیحی اسقفوں، مقدس لوگوں اور شہیدوں نے بیروت ہی میں تعلیم پائی۔

اس درس گاہ کی طرف ابتدائی اشارہ گریگوری تھوماترگوس[2] کے اس خطبے میں آیا ہے جو ۲۳۸ء میں دیا گیا تھا گریگوری کپاڈوشیا سے تعلیم کے لیے پہلے بیروت آیا، پھر قیصریہ (فلسطین) چلا گیا جہاں اوریجن نے اسے مسیحیت کا حلقہ بگوش بنا لیا یہاں کا ایک اور ممتاز طالب علم پمفیلوس[3] تھا کہ یہ بیروت کا باشندہ تھا اور آگے چل کر قیصریہ کا اسقف بن گیا تھا وہاں ۳۰۹ء میں گیلیریوس[4] کے حکم کے ماتحت اسے شہید کر دیا گیا ممتاز مورخ یوسیبیوس پمفیلوس ہی کے شاگردوں میں سے تھا شاگرد کو استاد کا اتنا احترام ملحوظ تھا کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ پمفیلوس کا اضافہ کر لیا گریگوری ساکن نازینزوس[5] (کپاڈوشیا) آگے چل کر قسطنطنیہ میں

---

[1] Sozomen

[2] Thaumaturgus Gregory تو ماترگس یہ لفظی معنی میں عجائبات دکھانے والا۔

[3] Pamphilus

[4] Galerius

[5] Nazianzus

اسقف بنا اور اسے مقدس لوگوں میں شامل کر لیا گیا۔ وہ قانون کی تعلیم پانے کے لیے ۴۸۶ء میں ایتھنز سے بیروت پہنچا۔ اس سے بھی زیادہ مشہور فرد سیویرس تھا جو انطاکیہ میں یعقوبی فرقے کا اعلیٰ اُسقف رہا (۵۱۲ء - ۵۱۸ء) اس کے سوانح حیات ایک ہم جماعت نے لکھے تھے جس کا نام زکریا تھا اور وہ غزہ کا باشندہ تھا۔

طالب علم کی زندگی

بیروت جیسے آفاقی شہر میں جو مشرق و مغرب کی حدوں پر واقع ہے، تعلیمی زندگی کی دلچسپ تفصیلات سیویرس کے انھیں سوانح حیات میں ملتی ہیں، مثلاً نئے طالب علم آتے تھے تو پرانے طالب علم ان کا مذاق اڑاتے تھے تاکہ ان کی صلاحیت ضبط کا امتحان ہو جائے۔ بالکل اسی قسم کا برتاؤ امریکی یونیورسٹیوں میں اب کیا جاتا ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نوواردوں کے ساتھ برا سلوک ہوتا تھا۔ زکریا سیویرس سے ایک سال بعد ۴۸۷ء یا ۴۸۸ء کے موسم خزاں میں بیروت پہنچا تھا۔ جب وہ پہلے پہل لیونٹیوس[1] جیسے ممتاز استاد کے لیکچر میں شامل ہوا تو دوسرے نوواردوں کی طرح اس پر بھی اضطراب طاری تھا لیکن سیویرس اور دوسرے پرانے طلبہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ زکریا مذہبی طبیعت کا آدمی تھا سبق ختم ہوتے تو دعا کے لیے گرجے میں چلا گیا۔ بعد اناں بندرگاہ کے قریب اس کی ملاقات سیویرس سے ہوئی تو اس نے سیویرس سے کہا لیکچر سن لینے کے بعد روزانہ گرجے میں پہنچنا چاہیے گھوڑدوڑ اور تھیٹروں سے دور رہنا چاہیے، شراب اور جوئے سے پرہیز لازم ہے۔ دوسرے طلبہ ان برائیوں میں شریک رہتے تھے جو شخص آگے چل کر اسقف اعظم بنا (سیویرس) وہ امیر گھرانے کا فرد تھا اور تعلیم کے لیے درسگاہ میں آتا تو غلام ساتھ ہوتے تھے۔ اس نے اپنے نوجوان دوست زکریا پر واضح کر دیا کہ میں قانون پڑھتا ہوں، راہب نہیں، البتہ وعدہ کرتا ہوں کہ جس حد تک ممکن ہوگا، برائیوں سے دور رہوں گا۔

ہفتے کی دوپہر کے بعد اور اتوار کے دن تعلیم موقوف رہتی تھی۔ شام کے وقت طالب علم دن کے پڑھے ہوئے سبق یاد کرتے تھے۔ زکریا نے ایک مسیحی انجمن بنائی تھی، جس کے ارکان ہر شام کو کلیسا میں جمع ہوتے اور وہاں باسل، کریسوسٹم اور دوسرے مسیحی مصنفوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا۔ اس انجمن کے ممبروں کی فہرست دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ زیادہ تر طالب علم بیرونی علاقوں کے تھے۔ ہمیسٹا کا ایک طالب علم ایوگریوس[2] اس انجمن کا صدر تھا، وہ پہلے انطاکیہ میں تعلیم پا چکا تھا، وہاں ایک فساد میں زخمی ہو گیا تھا وہ ہر روز روزہ رکھتا، سال میں صرف ایک دفعہ عید الفصح کے موقع پر نہاتا۔ زہد کی ان مثالوں سے متاثر ہو کر سیویرس نے گوشت چھوڑ دیا۔

اس اثنا میں طلبہ نے ایک اور انجمن بنائی جس کا مدعا یہ تھا کہ علم غیب سے دلچسپی بڑھائی جائے۔ آرمینیا، تھریس، طیبہ (تھیبز)، مصر، اور سیویوپلس (شام) کے طالب علم اس انجمن کے روح رواں تھے۔ مصری طالب علم ایک عورت پر فریفتہ ہو گیا تھا، جو اس کی محبت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ بعد میں اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ اگر مصری کے سیاہ فام غلام کو قربان کر دیا جائے تو دیو اس سے متاثر ہوں گے اور مطلوب نتیجہ نکل آئے گا۔ جب یہ رسم آدھی رات کو سرکس میں ادا کی جا رہی تھی تو اچانک ایک شخص کی آمد سے خلل پڑ گیا اور اس زدہ غلام بھاگ کر اپنے آقا کے پاس پہنچ گیا۔ جادو کی کتابیں تلاش کی گئیں جنھیں طالب علم نے کرسی کی نشست میں چھپا رکھا تھا، انھیں جلا دیا گیا۔ وہ کتابیں عجیب و غریب ناموں سے بھری ہوئی تھیں ان میں دیوؤں کی تصویریں تھیں بعض کا تعلق زرتشت سے بتایا گیا تھا۔ جب تفتیش ہوئی تو یہ راز کھلا

---

[1] Leontius

[2] Evagrius

کہ پروفیسر لیونتیوس بھی ان ناجائز سرگرمیوں میں شامل تھا۔ ایک تحقیقاتی عدالت مقرر ہوئی جس میں پادری اور میونسپل افسر شریک تھے لیونتیوس اور دوسرے لوگ مجرم ثابت ہوئے ان کی کتابیں جلا دی گئیں بعض ملزم شہر سے بھاگ گئے۔

بیروت میں جادو کی مصیبت اسی پر ختم نہ ہوئی شہر بہ شہر پھرنے والے جادوگروں کی ایک جماعت یہاں آپہنچی اور اس نے ایشیائے کوچک کے ایک طالب علم کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک گرجے کی قبریں کھودی جائیں کیونکہ ان میں دارا کے چھپائے ہوئے خزانے موجود ہیں۔ گرجے کے دو پادریوں نے بھی اس سے چشم پوشی کر لی دیوؤں کو مدد کیلئے بلانے کی غرض سے ضروری تھا کہ گرجے میں چاندی کی جتنی چیزیں تھیں ان سے کام لیا جاتا یہ رسم ادا ہو رہی تھی کہ زلزلہ آگیا اور یہ بیچ ہی میں رہ گئی۔ پادریوں کو سزا دی گئی ان میں سے ایک کو خانقاہ میں قید کر دیا گیا۔

۵۵۱ء، ۵۵۵ء کے درمیان کئی زلزلے آئے جن سے ساحل فونیقیہ کے شہر تباہ ہوئے۔ بیروت میں ایک زلزلہ ۳۴۹ء میں بھی آچکا تھا جس میں شہر کا ایک حصہ تباہ ہو چکا تھا تاہم اس سے یونیورسٹی کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن اس زلزلے کا معاملہ مختلف ہے۔ اس نے اس شہر کو اپنی خوبصورتی سے محروم کر دیا جسے فونیقیہ کے لیے زیب و زینت سمجھا جاتا تھا یہاں بعض عمارتیں فن تعمیر کے مشہور شاہکار سمجھی جاتی تھیں ان میں سے کوئی بھی قائم نہ رہی، صرف بنیادیں باقی رہ گئیں مقامی اور بیرونی باشندوں کی بہت بڑی تعداد کھنڈروں میں دب کر تباہ ہو گئی۔ یونیورسٹی کے پروفیسر صیدا چلے گئے اور یونیورسٹی کی عمارتیں از سر نو بننے تک وہیں لیکچر دیتے رہے۔ نئی یونیورسٹی کی عمارت بن چکی تھی، ابھی اس میں تعلیم شروع نہیں ہوئی تھی کہ ۵۶۰ء میں ایک اور مصیبت نازل ہوئی، یعنی آگ لگ گئی جس نے سب کچھ بھسم کر ڈالا۔ پھر یونیورسٹی کے متعلق کچھ سننے میں نہ آیا۔

اٹھائیسواں باب

کلیسائیت کا ایک دور

بیزنطینی شام کا عمومی منظر رومی شام سے مختلف تھا۔ بیزنطینی عہد میں شام بہ حیثیت مجموعی ایک مسیحی سرزمین تھی حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی ایک دور ہے جس میں شام کامل مسیحی ملک رہا۔ ایک طرف رومی وثنیت تھی اور دوسری طرف اسلامی عرب تھا۔ دونوں کے بیچ میں شام تھا اور اس کے بیزنطینی عہد کو یگانہ سمجھنا چاہیئے۔

محض ایک ملک ہی مسیحی نہ تھا بلکہ وہ دور بھی کلیسائیت کا دور تھا، کلیسا سب سے بڑا ادارہ تھا اور مذہبی بزرگوں کو مقدس ترین ہیرو مانا جاتا تھا۔ چوتھی صدی سے چھٹی صدی تک راہب، پادری، اسقف، راہبائیں اور تارک الدنیا درویش جس تعداد میں موجود ہیں اس کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ کلیساؤں کی عمارتیں جا بجا نئے نئے انداز میں بن رہی تھیں کہیں دعا کے لیے کمرے بنائے جاتے تھے کہیں بڑے بڑے ہال اور خانقاہیں، بعض میں گنبد تعمیر کیے جاتے، بعض میں ناقوس کے برج، بعض کے اوپر صلیبیں نصب کی جاتیں۔ درویشوں کے غار وسیع کر دئیے گئے یا ان کے لیے نئے حجرے بنا دئیے گئے، ایسے منارے جا بجا تعمیر ہوتے، جن پر راہب جا بیٹھتے، وہیں زندگی بسر کرتے اور وہیں مر جاتے۔ زیارتوں کا بڑا غلغلہ تھا، بیماریوں کے لیے طبیبوں سے رجوع نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ بزرگوں کی قبروں پہ جا کر دعائیں کرنے یا منتیں ماننے کو زیادہ موثر سمجھا جاتا تھا چنانچہ بیزنطینی دور کی تعمیرات اور مذہبی عمارتوں کے باقیات سابقہ زمانوں کے مقابلے میں زیادہ نظر آتے ہیں۔

راہبیت

راہبیت کو اس زمانے میں بہت پسند کیا جاتا تھا، عفت، افلاس اور اطاعت اس کے خاص جوہر تھے۔ ان جوہروں سے عام لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی میں رومی سلطنت پر زوال آیا اور نظم و نسق میں خلل پڑ گیا تو آبادی گھٹ گئی۔ خوش حالی ماند پڑ گئی اور اداروں پر سے اعتماد و اعتقاد زائل ہو گیا۔ مسیحیت ایک ایسا نصب العین پیش کر رہی تھی، جو دنیا کی سطح سے بالا اور طبیعت کے حدود سے اوپر تھا۔ اس میں ایسی روحانی نعمتیں تھیں، جن کے لیے دنیا کو چھوڑنا اور جان دے دینا زیبا معلوم ہوتا تھا۔

خانقاہی راہبیت کا نظام مسیحیوں کے زہد و تقشف سے پیدا ہوا۔ اس کا بانی سینٹ انتھونی[۱] نام ایک مصری تھا جو سب کچھ چھوڑ کر صحرا میں نکل گیا اور وہیں ۳۰۵ء اور ۳۵۶ء[۵] کے درمیان اس نے انتقال کیا۔ مسیحی زندگی کا یہ نیا نمونہ بہت دور مصر سے جنوبی شام پہنچا اور پھیل گیا۔ یہاں ہلاریون[۲] ساکن غزہ

---

[۵] ایک شاہی مخطوطے میں بتایا گیا ہے کہ نیقیہ کی مجلس میں فلسطین سے اُنیس اسقف، فونیقیہ سے دس اسقف، شیبی شام سے بائیس اسقف، اور عرب البصری، فلاڈلفیا وغیرہ سے چھ اسقف شریک ہوئے۔ [۲] Hilarion [۱] St. Anthony

نے سب پر سبقت کی۔ وہ انیتونی کا شاگرد تھا۔ چوتھی صدی کے آخری دور میں راہبوں کی آبادیاں انطاکیہ کے اردگرد وجود پذیر ہو چکی تھیں۔ افرائیم (وفات ۳۷۳ء) شام کے خانقاہی نظام کے بانیوں میں سے تھا۔ پانچویں صدی میں پہلا منارہ نشین راہب سینٹ شمعون[1] نمودار ہوا اور اس نے ملک کے شمالی علاقے میں منارہ نشینی کا سلسلہ شروع کیا۔ جس منارے پر وہ بیٹھتا تھا اسے اب تک ایک عالیشان گرجے کے کھنڈروں میں سیاحوں کو دکھایا جاتا ہے (قلعہ سمعان)۔ خانقاہی زندگی کا یہ نیا طریقہ پانچویں صدی تک باقی رہا۔ مصر اور جنوبی شام میں انتقائی درجہ کے راہبوں کی زندگیاں مسیحیت کے لیے مقبول نمونہ بن گئیں۔ لفظ "ہرمٹ"[2] (درویش اور تارک الدنیا) ایک یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی صحرا کے ہیں۔

کلیسائی عمارتیں

مسیحی کلیسا حضرت مسیحؑ کے حواریوں کے اس چھوٹے سے گروہ سے شروع ہوا جو اپنے قائد کو "نجات دہندہ" اور "مسیح" کہتا تھا۔ پہلا حلقہ جس کا نام مسیحی رکھا گیا، انطاکیہ کا حلقہ تھا۔ مسیحؑ کے حواری (رسول) پہلے پہل یہودیوں کے ہیکلوں میں وعظ کہتے تھے۔ جن لوگوں نے نیا مذہب قبول کیا وہ یا تو یہودی تھے یا وہ غیر یہودی جو ہیکلوں میں پہنچتے تھے۔ اس بنا پر سمجھ لینا چاہیے کہ مسیحیوں کی پہلی مجلسیں زیادہ تر یہودیوں پر مشتمل تھیں۔ یقیناً اس زمانے میں نووارد مسیحیت کے پیروؤں اور صدیوں سے قائم شدہ یہودیت کے حلقہ بگوشوں میں امتیاز مشکل ہو گیا۔

ابتدا میں مسیحی یا تو گھروں کے اندر عبادت کرتے تھے جہاں غیر رسمی اجتماع ہوتے تھے یا یہودی معبدوں میں جاتے تھے۔ جب عبادت کے ان مقامات نے گرجوں کی شکل اختیار کر لی تو ان کے لیے یہودی معبدوں ہی کا نمونہ سامنے رکھا گیا۔ یہودیوں کے معبد ہیکلِ سلیمانی کی تباہی کے بعد اس کے مقامی بدل مانے جاتے تھے۔ بہرحال یہودی معبد عبادت کا ایک نیا اور انقلابی ذریعہ بن گیا۔ اس میں نہ تو پر اسرار رسمیں ادا کی جاتی تھیں اور نہ قربانیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی معبد آگے چل کر گرجوں اور مسجدوں کے لیے نمونہ بن گئے۔

فلسطین میں یہودیوں کے جس قدیم ترین معبد کے کھنڈر موجود ہیں وہ پہلی صدی عیسوی میں بنا تھا۔ دورا یوروپس میں ابتدائی معبد وہ ہے جو ۲۰۰ء میں ایک نجی مکان کو ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ تیسری صدی کے وسط میں ایک معبد بنا جس میں عورتوں کے داخلے کے لیے الگ دروازہ تھا اور ان کے بیٹھنے کے لیے بنچ بھی الگ رکھے گئے تھے۔ اس میں جو تصویریں ہیں وہ معبدوں کے فنِ آرائش کے لحاظ سے یگانہ ہیں۔ اسی شہر میں ایک گرجے کے کھنڈر بھی ملے ہیں جو ۲۳۲ء میں بنا تھا۔ فلسطین میں یہ ہر معلوم گرجے سے زیادہ پرانا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ مسیحیوں کا یہ قدیم ترین گرجا ہے جو اب تک برآمد ہوا ہے۔ کنیستہ القیامہ (کلیسائے

---

[1] Simeon [2] Hermit

ضریح مقدس) اور کنیسۃ المہد (مقام ولادت مسیحؑ کا کلیسا) میں قسطنطین کے زمانے کے کچھ آثار باقی ہیں۔ کنیسۃ المہد کی موجودہ عمارت جسٹینین نے بنوائی تھی۔ جراسا کے بہت سے کلیسا چھٹی صدی عیسوی کے ہیں اگرچہ ان میں چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں، ان میں سے ایک ابتدا میں یہودی معبد تھا۔ پھر اسے کلیسا میں تبدیل کر لیا گیا۔ بعد کے زمانے میں گرجوں کی جگہ مسجدیں تعمیر ہوئیں۔[1]

ان باقیات اور دوسرے باقیات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کلیسا اور یہودی معبد بہ لحاظ تعمیر باہم دگر متعلق تھے۔ بیزنطینی دور میں دونوں ایک ہال کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ البتہ یہودی معبد کا رخ یروشلم کی طرف رکھا جاتا اور کلیسا کا رخ مشرق کی طرف۔ ان دونوں میں جو نقاشی استعمال ہوئی، اس میں بھی گہرا تعلق تھا۔

مسیحی کلیسا کا ابتدائی نمونہ یہ تھا کہ ایک لمبا کمرہ بنا لیا جاتا۔ اس میں سادگی ملحوظ رکھی جاتی اور تعمیر میں مقامی نمونے سامنے رہتے۔ یہ نمونہ اُمّ الجمال کے گرجے میں نظر آتا ہے جس کی ایک ناف ہے اور یہ سنہ ۳۴۴ء میں بنا تھا۔ امّ الجمال حوران میں بصریٰ کی جنوبی سمت ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں شام کے اندر جو گرجے تعمیر ہوئے ان میں ناف عریض رکھی جاتی تھی اور مشرقی جانب تین محرابیں ہوتی تھیں یا کہنا چاہیے کہ بیچ میں ایک محراب ہوتی تھی اور اس کے دونوں جانب حجرے رکھے جاتے تھے۔ یہ نمونہ مسیحیت سے پیشتر کی عمارتوں سے لیا گیا تھا۔ سفوپولس (بیسان) میں ایک خانقاہ زمین کھود کر نکالی گئی ہے۔ اس میں ایک گرجے کے کھنڈر بھی نکلے ہیں جس میں درمیانی راستہ کوئی نہ تھا اور مشرقی سرے پر ایک نعل نما محراب تھی۔ محراب کے داخلے میں قربان گاہ رکھی گئی تھی۔ خانقاہ کے بڑے ہال میں پچی کاری کے ذریعے سے تقویم بنائی گئی تھی۔ اس میں زیادہ تر نیلا اور سیاہ رنگ استعمال کیا گیا تھا، کہیں کہیں سرخ اور ہلکے بادامی رنگ کی جھلک بھی پڑتی تھی، زمین سفید رکھی گئی تھی۔

فنِ مسیحی

ابتدائی دور کے فنِ مسیحی سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فنِ یہود کا ممنون تھا۔ مثلاً رموز کے سلسلے میں کلیسا نے یہودی معبدوں کا نمونہ سامنے رکھا۔ حضرت مسیحؑ کی جو قدیم ترین صورتی ملی ہے اس میں آپ کو ایک عصا کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ غالباً یہ وہی عصا تھا جس سے حضرت موسیٰؑ نے چٹان پر ضرب لگائی تھی۔ زمین دوز تہ خانوں میں حضرت مسیحؑ کی جو صورت ملی ہے، وہ حضرت موسیٰؑ ہی کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی۔ اگرچہ بعض عالموں کی یہ رائے ہے کہ شام فنِ مسیحی کا سرچشمہ تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیحی تصویروں کے تدریجی نشوونما ارتقا میں یونانیت کی دیویوں شاعروں اور خطیبوں کی تعبیروں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ مختلف مقامات اور اوقات میں فن کاری مختلف رہی، البتہ چوتھی اور پانچویں صدی میں ایک قطعی انفرادی اور معیاری حیثیت اختیار کر لی گئی۔

ابتدائی دور کے مسیحی ارباب فن کے لیے ایک عام موضوع "اچھا چرواہا" تھا۔ دورا یوروپس کے کلیسا کی دیواروں پر بائیبل کی دوسری صورتوں کے ساتھ اس کی صورت بھی موجود تھی۔ اسے عام طور پر یوں دکھایا جاتا تھا کہ بھیڑ کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ سامی افکار میں چرواہا قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ حمورابی نے مجموعۂ قوانین کے مقدمے میں اپنے آپ کو لوگوں کا چرواہا (راعی) کہا ہے۔ چرواہے کی جتنی ابتدائی تصویریں ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ ایک نوجوان ہے۔ جس کی ڈاڑھی مونچھ نہیں۔

[1] سرسری نظر میں شاید یہ امر غیر مناسب معلوم ہو لیکن بعض معلوم واقعات تصرف کو نظر انداز کر دیا جائے تو گویا یہ ہوتا رہا کہ جب کسی مقام کی آبادی کا مذہب بہ حیثیت مجموعی بدل گیا تو اس نے سابقہ معبد کو نئے مذہب کا معبد بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہودیوں نے بہ کثرت مسیحیت قبول کر لی تو یہودی معبد گرجے بن گئے۔ جب مسیحیوں نے بہ کثرت اسلام قبول کر لیا تو گرجے مسجدوں میں تبدیل ہو گئے۔

اس نے آستینوں کے بغیر ایک چھوٹا کرتا پہن رکھا ہے اور شکل کا نمونہ یونانی و رومی فن سے لیا گیا ہے۔ خود یونانی تصوّر کا مبدا تلاش کیا جائے تو مشرقِ قریب میں ملے گا۔ مسیحؑ سے نو سو سال پیشتر شمالی شام کے ایک مقام شمائل اور آٹھ سو سال پیشتر دورِ شاروکین دنزد نینوی) میں جو تصویریں ملی ہیں ان میں ہرن کے بچے کندھوں پر اٹھا رکھے ہیں اور بچوں کے منہ آدمی کے منہ کی طرف ہیں۔ یہ بچے غالباً قربانی کی غرض سے تھے۔

بیزنطینی دور کے شام میں تعمیرات مصوری، بت تراشی اور تزیینی فن کے دوسرے دائروں میں نئے مظاہر تلاش کیے گئے جو یونانی و رومی نمونوں سے مختلف تھے۔ سکندر کی فتوحات کے وقت سے فنی کارناموں پر خاص توجہ ہو گئی تھی۔ مقامی فن میں حقیقت پسندی پر زیادہ زور دیا جاتا۔ آہستہ آہستہ برہنہ نمونوں اور رسمی شکلوں سے آزادی حاصل کر لی گئی۔ اسی طرح قرونِ وسطیٰ کے مسیحی فن، نیز اسلامی فن کا راستہ ہموار ہو گیا۔

احیائے آرامیت

لسانی نقطۂ نگاہ سے شام کے مسیحی کلیسا نے دو مختلف خطوں پر پیش قدمی کی۔ ساحلی علاقے اور یونانی شہروں میں اس کی زبان یونانی تھی اور داخلی ملک میں سریانی زبان استعمال کرنے والے کلیسا کا آغاز دوسری صدی میں ہو گیا تھا۔ مسیحیت پھیل گئی تو تیسری صدی میں سریانی کلیسا نے شامی کلیسا کے خلاف قدم جمایا۔ بیزنطینی عہد میں یونانی کے خلاف جذبہ پیدا ہوا اور لوگ عموماً آرامی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قدیم سامی زبان سے دلچسپی کا احیا قومی بیداری کے احیا کی دلیل تھا۔

شام کے باشندوں کو اجنبی زبانیں سیکھنے کا خاص ذوق تھا۔ جو لوگ قانون سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے لاطینی پڑھی اور جنھیں فلسفے سے ذوق تھا انھوں نے یونانی سیکھ لی لیکن باقی لوگ خصوصاً وہ جو امرا کی حکومت سے باہر رہتے تھے۔ وطنی زبان ہی سے چپٹے رہے۔ بیزنطینی سرکاری افسروں کو عوام سے بات چیت کے لیے ترجمانوں سے کام لینا پڑتا تھا کرد سوستم انطاکیہ میں بیٹھا ہوا شکایت کرتا ہے، اس کے سامعین یونانی زبان نہیں سمجھتے اور مذہبی پیشوا دیہاتی سریانی بولتے ہیں۔

اودیسا

جو سریانی ادب اب تک محفوظ ہے، وہ عموماً مسیحی ہے اس میں سائنس اور فلسفے کی وہ کتابیں بھی ہیں جو یونانی زبان سے سریانی میں ترجمہ کی گئیں جن شہروں میں یونانی بولی جاتی تھی، ان سے باہر قومی زبان کا سب سے بڑا مرکز اودیسا تھا جسے آرامی دنیا کا ایتھنز سمجھنا چاہیے۔ اودیسا کی درس گاہ ۴۸۹ء تک فروغ پر رہی پھر شہنشاہ زینو نے اسے کاملاً تباہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اور اساتذہ اودیسا سے نصیبین چلے گئے، جو سریانی و یونانی علوم میں اودیسا کا جانشین بن گیا۔ اودیسا میں کلیسا کی بنیاد دوسری صدی کے آخر میں پڑی تھی۔ بعد کی صدیوں میں یہ کلیسا انطاکیہ اور مغرب کی یونانی روایات سے مطابقت قائم نہ کر سکا۔ چنانچہ انجیلوں کے متعلق اس نے اپنی تعبیرات اختیار کر لیں۔ پہلے وہ سلسلہ جاری رکھا جو اصطلاح میں اتفاق اناجیل[1] کہلاتا ہے پھر پشیتا[2] یعنی

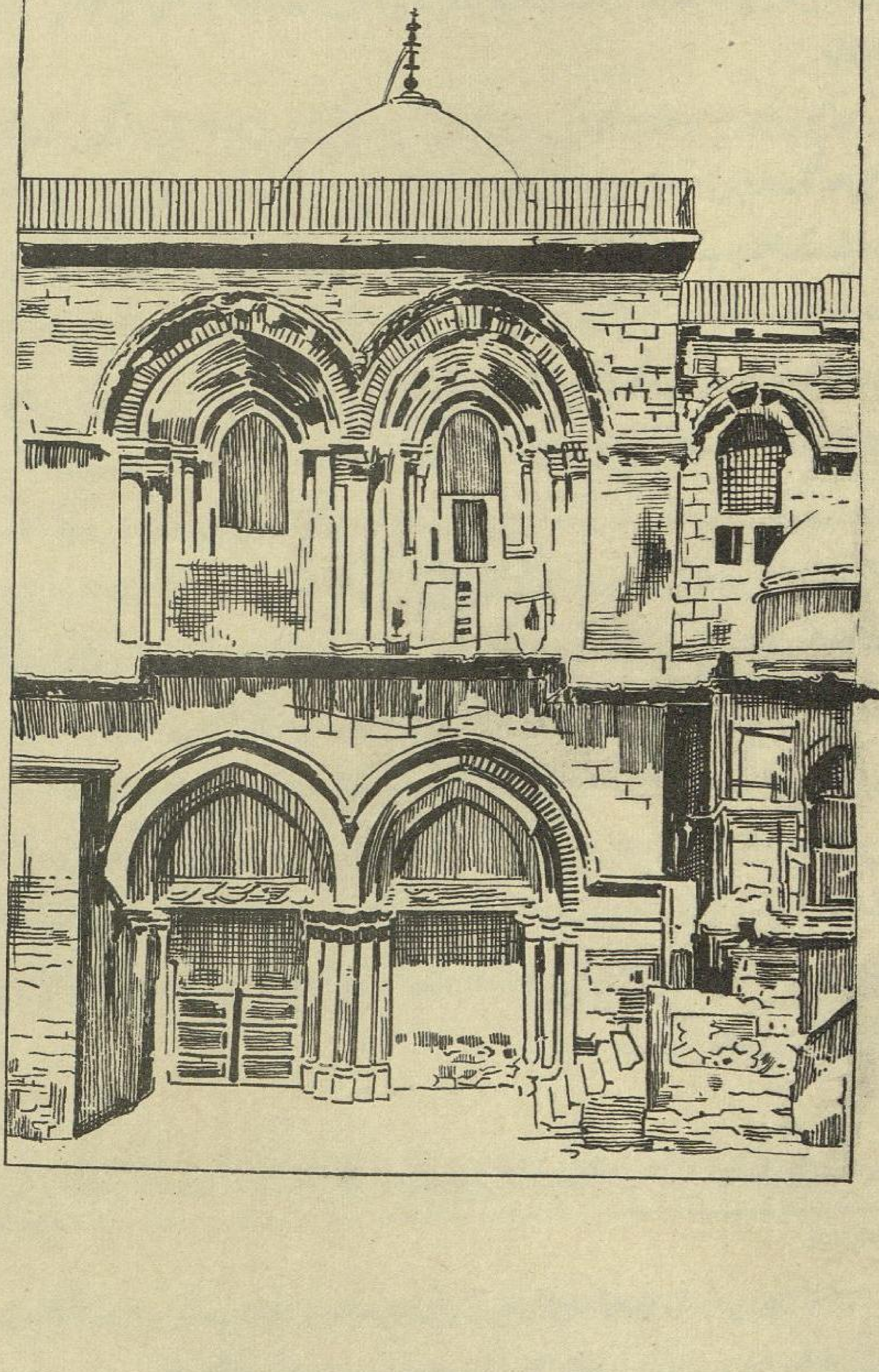
---

[1] اصطلاح میں اسے دیا تیسارون Diates saron کہتے ہیں۔

[2] Peshitta عہد نامۂ جدید کا سریانی ترجمہ۔

كنيسة القيامة

(بيت المقدس)



سادہ تعبیر اپنالی گئی۔ پشیتا اس وقت سے معیاری سریانی تعبیر مانی جاتی ہے۔

سریانی کلیسا کا پہلا ماہر دینیات افرائیم سائرس[۱] تھا۔ یہ شخص شامی کے لقب سے مشہور ہے۔ قریباً ۳۰۶ء میں پیدا ہوا اور قریباً ۳۷۳ء میں وفات پائی۔ وہ دینی شاعر بھی تھا اور خانقاہی نظام جاری کرنے کا ذمہ دار تھا۔ افرائیم نصیبین میں پیدا ہوا، پھر اودیسا چلا آیا۔ یہاں اس نے ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی یا کسی پرانی درسگاہ کو از سرِ نو زندہ کیا یہ درسگاہ ایک عظیم الشان سریانی یونیورسٹی بن گئی۔ اس سے پہلے بردیسانیز[۲] گزرا ہے (۱۵۵ء تا ۲۲۲ء) وہ اودیسا کا باشندہ تھا جس نے سریانی میں مذہبی گیتوں کی ابتدا کی۔ کلیسا میں گانے کا سلسلہ اسی نے جاری کرایا۔ بعض لوگ اسے غناسطی[۳] یا عرفانی قرار دیتے ہیں۔

مذہبی انشقاقات

بیزنطیم اور انطاکیہ کے مسیحی افکار کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفرقہ پیدا ہوگیا جسے راسخ العقیدہ لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے الحاد قرار دیا جانے لگا۔ جس حد تک زبان کا تعلق ہے یہ تفرقے در اصل قومی بیداری کا مظاہرہ تھے یونانی حضارت کی موجوں کے نیچے صدیوں تک دبے رہنے کے بعد اب سریانی روح نمایاں ہونے لگی تھی۔ اہل شام نہ پہلے رومیت کے رنگ میں رنگے گئے تھے اور نہ اب یونانیت کا رنگ ان پر چڑھ سکا تھا۔ بیزنطینی حکمرانوں سے ان کی اجنبیت کے اسباب فکر و نظر کے نہیں تھے بلکہ سیاسی اور اقتصادی تھے۔ بیزنطینی حاکم حکمرانی میں زیادہ مطلق العنان اور ٹیکس لگانے میں زیادہ جابر تھے۔ انھوں نے دیسی باشندوں سے ہتھیار رکھوا لیے اور ان کے احساسات سے بالکل بے پروا تھے۔ مذہبی معاملات میں بھی وہ ان وثنی حکمرانوں سے کم روادار تھے جو ان سے پہلے تھے یعنی رومی۔

چوتھی اور پانچویں صدی کے پڑھے لکھے لوگوں کے مذہبی مناظرے اور مباحثے زندگی کی روح بن گئے تھے۔ یہ مباحثے عموماً فطرتِ مسیح اور متعلقہ عنوانوں پر ہوتے تھے جن سے آج کل کوئی بھی مسیحی کسی قسم کا سروکار نہیں رکھتا۔ اس طرح بہت سے فکری دبستان پیدا ہو گئے جن میں سے بعض کو الحاد قرار دیا گیا۔ بعض میں ارسطو کی منطق اور بعض میں نو فلاطونی فلسفے کے اصول سے کام لیا جاتا۔ اس اثنا میں مسیحیت کے اندر ایسے فرقے نشو و نما پا کر سر اٹھا رہے تھے جنھیں زرتشتیت اور بدھ مت سے زیادہ قرب تھا کہ یسوستم انطاکیہ میں ایک ایسے گروہ کا ذکر کرتا ہے جو تناسخ کا قائل تھا اور پیلے کپڑے پہنتا تھا۔ نئے مذاہب میں سے، جو مشرق کی جانب سے آئے تھے سب سے بڑھ کر خطرناک مانویت تھی۔ جس کی بنیاد ۲۴۶ء میں مانی نے رکھی تھی مانی نے اپنے معتقدات کے لیے صلیب کی سزا قبول کر لی۔ اس کا مذہب مسیحیت، بدھ مت اور زرتشتیت کے اصول سے مرکب تھا اور ایران سے ہسپانیہ پہنچا تھا۔ اس کی غلطیوں نے شام کے مسیحی پیشواؤں میں مخالفت کا جو جذبہ پیدا کیا وہ کسی دوسرے مذہب کی غلطیوں نے نہ کیا

الپولی نارس

جن لوگوں نے ملحدانہ تحریکات کو فروغ دیا وہ لوگ یا شام میں پیدا ہوئے تھے یا کم از کم انہوں نے تعلیم شام میں پائی تھی ان کا

---

[۱] Ephraim Syrus

[۲] Bardesanes "بر" بمعنی ابن اور "دیصان" اودیسا کی ایک ندی کا نام ہے، یوسیبیوس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

[۳] Gnostic مسیحیت کی اصطلاح میں ان لوگوں کو کہتے تھے جو گیان دھیان پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔

سلسلہ چوتھی صدی میں آریوس سے شروع ہوا جس کے نظام کی مذمت نیقیہ کی مجلس میں ہوئی تھی لیکن آریوسیت کو مذہبی اور سیاسی اہمیت بدستور حاصل رہی۔ آریوسیت کا ردِ عمل لاذقیہ کے اسقف اپولی ناریس[1] (وفات ۳۹۰ء) سے شروع ہوا۔ اپولی ناریس نے حضرت مسیح کی انسانی فطرت پر زیادہ زور دیا۔ وہ کہتا تھا کہ مسیح ایک پاکیزہ انسانی جسم میں پاکیزہ انسانی روح تھے (وہ حصّہ جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے) البتہ ان میں کلام کو نفس کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ انسان کا سب سے بلند حصّہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اپولی ناریس کا استدلال نوفلاطونی اصول پر مبنی تھا۔ نوفلاطونی کہتے تھے کہ انسانی فطرت تین چیزوں سے مرکب ہے — جسم، روح اور نفس جس کی وجہ سے انسان حیوانِ ناطق یا عاقل بنتا ہے — اپولی ناریس کا جاری کیا ہوا طریقہ آریوسیت اور نسطوریت کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اس نے آریوسیت کی مخالفت کی اور نسطوریت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

نسطوریت

نسطوریس[2] شرقی سلیشیا میں پیدا ہوا اور انطاکیہ کے نزدیک ایک خانقاہ میں رہا۔ ۴۲۸ء میں اسے شہنشاہ تھیوڈوسیس ثانی کے ایما پر قسطنطنیہ کا اسقف بنا دیا گیا اس طرح شہنشاہ کی خواہش یہ تھی کہ پھر انطاکیہ سے کریسوستم جیسا کوئی شخص آ جائے۔ ۴۳۱ء میں مجلس افی سوس[3] نے نسطوریس کی مذمت کر دی۔ اس کے جس عقیدے پر اعتراض کیا گیا وہ یہ تھا کہ مسیح میں شخص الٰہی (کلمۃ اللہ) اور شخص بشری کا ملاپ ہم آہنگی سے عملاً متصل ہو گئے لیکن ایک شخص نہیں بنے۔ نسطوریس کے بہت سے ہم نوا تھے اور انھوں نے نسطوری فرقے کی بنیاد رکھ دی۔

جن عیسائیوں کو نسطوری کہا جاتا ہے وہ بعد میں آئے۔ یہ لوگ دراصل مشرقی کلیسا یا جیسا کہ وہ خود فخریہ کہتے ہیں کلیسائے شرق کے اجزائے ترکیبی تھے۔ یہ کلیسا حواریوں کے عہد سے چلا آتا تھا اس کے نمایندے آج تک موجود ہیں یہ لوگ رومی سلطنت سے منقطع ہو چکے تھے اور انھوں نے مقامی اصول و مراسم پیدا کر لیے۔ وہ نسطوریس کو شامی نہیں بلکہ یونانی مذہبی پیشوا قرار دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس کلیسا کے بعض مصنفوں نے نسطوری زبان استعمال کی لیکن کلیسا کی دعائیں اور اجتماعی عبادات کی زبان نسطوری الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ یہی کلیسا تھا جس میں اتنی روحِ حیات باقی تھی کہ آگے چل کر اس نے اپنے مبلّغ ہندوستان اور چین بھیجے۔

یعقوبی کلیسا

نسطوریت کے بعد مشرقی کلیسا میں دوسرا بڑا تفرقہ وحدتِ فطرتِ مسیح کے معتقدوں نے پیدا کیا۔ وہ مسیح کی دو فطرتیں (الٰہی اور بشری) قبول نہیں کرتے تھے جن کا فیصلہ کیلسی ڈون[4] کی مجلس نے ۴۵۱ء میں کیا تھا ان کا شعار یہ تھا: کلمۃ اللہ کی فطرت

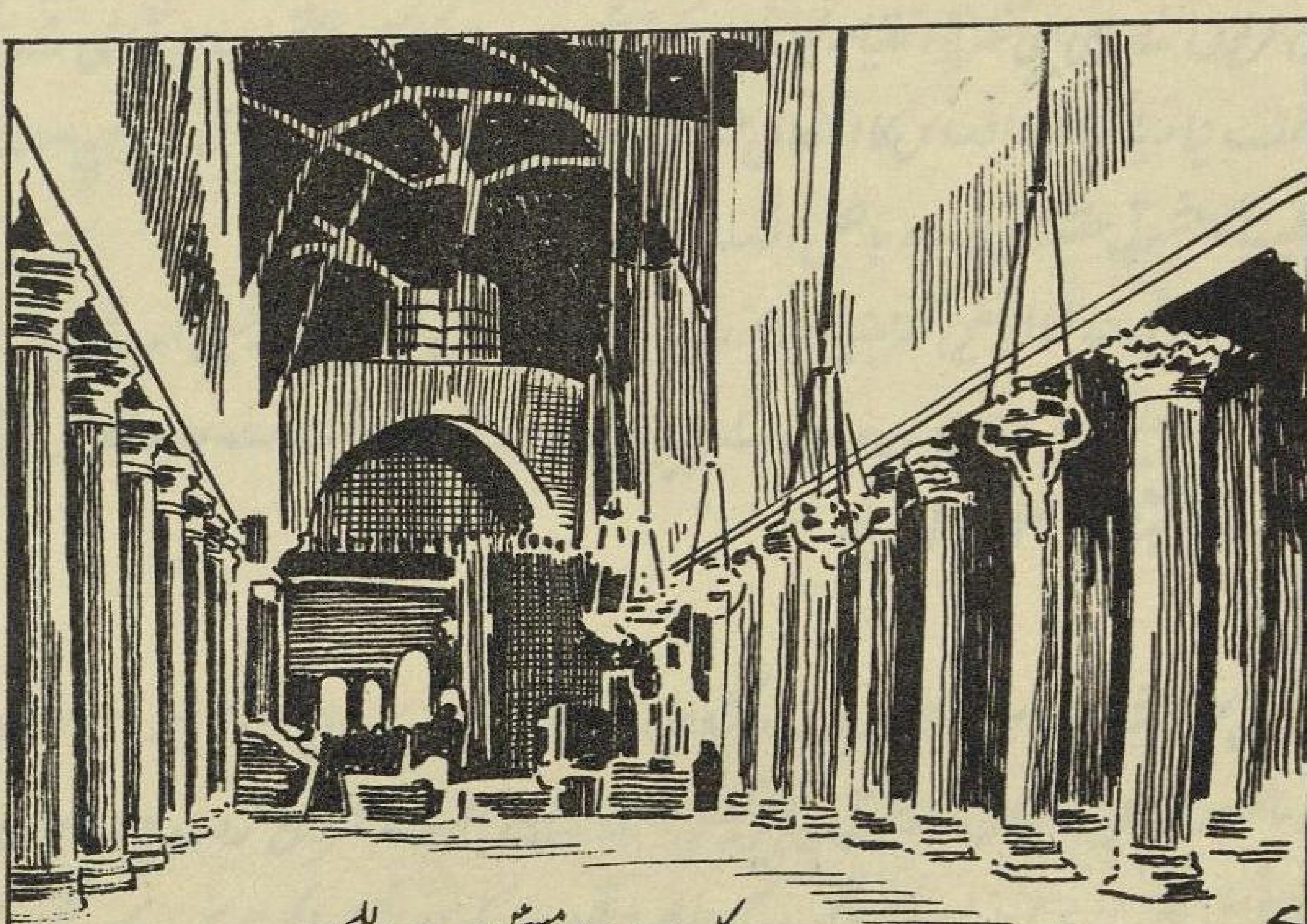
---

[1] Apollinaris

[2] Mestorius

[3] Ephesus ایشیائے کوچک کا قدیم شہر جو دراصل یونانی شہر تھا یہیں ڈائنا کا وہ مشہور مندر تھا جو دنیائے قدیم کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں کلیسا بھی بالکل ابتدائی دور ہی میں بن گیا تھا اور یہ مسیحیت کا مشہور مرکز تھا۔

[4] Chalcedon



کلیسائے مولدِ مسیحؑ (بیت اللحم)



بہ صورت تجسیم ایک تھی۔ دراصل وحدتِ فطرتِ مسیحؑ[1] کے قائلین کہتے تھے کہ انسانی اور الوہی فطرتیں مسیحؑ میں جمع ہو گئیں اسی بنا پر ان کا نام تجویز ہوا۔

پانچویں صدی کے اواخر اور چھٹی صدی کے اوائل میں قائلین وحدتِ فطرت نے شمالی شام کے بڑے حصے کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور جنوبی شام میں اپولی ناریس کی جماعت کے جانشین بن گئے۔ ان کی کامیابی بڑی حد تک شام کے ایک مسیحی راہب برصوما اسقف نصیبین (۴۵۷ء۔ ۴۹۶ء) کی تبلیغ اور سیویرس اسقف اعظم انطاکیہ (۵۱۲ء۔ ۵۱۸ء) کی شخصیت کا نتیجہ تھی۔ قائلینِ وحدتِ فطرت (یعقوبیوں) کا دعویٰ یہ ہے کہ منارہ نشین راہب شمعون کے دینی نظریات وہی تھے جو خود قائلینِ وحدت کے تھے۔ غسانیوں اور دوسرے شامی عربوں نے بھی یہی نظریہ اختیار کیا۔ شام کے قائلینِ وحدت کا کلیسا یعقوب البرذعی[2] نے منظم کیا۔ جسے ۵۴۱ء میں ادلیسا کا اسقف بنا دیا گیا تھا اور اس کا انتقال ۵۷۸ء میں ہوا۔ اسی وجہ سے شام کے قائلینِ وحدت کو یعقوبی کہنے لگے اس طرح شامی کلیسا کا مشرقی حصہ مغربی سے بالکل الگ ہو گیا۔

شام سے یعقوبی نظریات شمال میں آرمینیا اور جنوب میں مصر پہنچے۔ اہل آرمینیا اور قبطی اب تک یعقوبی دینیات ہی کے پابند ہیں۔ شام اور سواد یعنی دجلہ و فرات میں اس مذہب کے پیروؤں کی تعداد اس وقت سے روبہ زوال ہے جب سے اسلام نے ان سرزمینوں میں مقتدر حیثیت حاصل کر لی ہے۔

ایرانی خطرہ

بزنطینی عہد میں محض شام ہی نہیں بلکہ مصر اور دوآبۂ دجلہ و فرات میں بھی قدیم روایات کا احساس تازہ ہو گیا۔ ساسانیوں کی جارحانہ قوت کے ماتحت ہمسایہ ایران نے مشرق پر بزنطینی اقتدار کی مزاحمت شروع کر دی۔ پہلا ایرانی حملہ (۵۲۷ء۔ ۵۳۲ء) جسٹینین کے قابل جرنیل بلیساریوس نے رد کیا۔ جنگ کے حالات قیصریہ کے مؤرخ پروکوپیوس نے لکھے ہیں[3] جو بلیساریوس کے ہمراہ تھا لیکن یہ حملہ سر پر منڈلانے والے خطرہ کا محض پیش خیمہ تھا۔

۵۴۰ء میں ایرانی خسرو اوّل انوشیرواں (۵۳۱ء۔ ۵۷۹ء) کے ماتحت پھر نمودار ہوئے۔ اس سرگرم بادشاہ نے تیس ہزار فوج کے ساتھ شام پر حملہ کیا۔ وہ ہیراپولس (منبج) کے راستے حلب پہنچا۔ چونکہ شہر مطلوبہ تاوان فراہم نہ کر سکا اس لیے آگ کی نذر ہو گیا۔ خراج چار ہزار پونڈ چاندی مقرر ہوا تھا۔ یہ اس مقدار سے دگنا تھا جو اہل ہیراپولس نے ادا کر کے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ پھر خسرو انطاکیہ کی طرف متوجہ ہوا جہاں بہت کم فوج تھی۔ چھ ہزار آدمی لبنانی فونیقیہ (حلقۂ حمص) سے بطور کمک پہنچ گئے لیکن وہ ایرانی حملہ آور کے مقابلے میں کیا کام دے سکتے تھے۔ اس وقت بزنطینی سلطنت کی جنگی قوت مغرب میں مصروفِ پیکار تھی جہاں جسٹینین قدیم رومی سلطنت کے اجزا فراہم کر رہا تھا۔ انطاکیہ کو لوٹا گیا۔ اس کے کلیسا سے سونے چاندی کے خزانے اور سنگ مرمر سب کچھ نکال لیا گیا۔ شہر کی تباہی کے علاوہ اس کے باشندوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ ان کے لیے

---

[1] یعنی یہ لوگ کہتے تھے کہ مسیحؑ کی دو فطرتیں (الوہی اور بشری) نہیں بلکہ دونوں جمع ہو کر ایک فطرت بن گئیں

[2] Jacob Bardaeus اسی کے نام پر فرقے کا نام یعقوبی پڑا۔

[3] جنگ کے متعلق مختلف حالات پروکوپیس کی کتاب سے ماخوذ ہیں ملاحظہ ہو کتاب دوم

فاتح نے سلیوسی نون کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا جس کا نام انطاکیہ خسرو رکھا گیا۔

یوں آٹھ سو سال کے بعد انطاکیہ علمی مرکزی حیثیت میں ختم ہو گیا۔ آخری دور میں انطاکیہ ایک مشہور مسیحی شہر تھا اور اسقف اعلیٰ کے مرکز کی حیثیت میں اسے قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے برابر درجہ حاصل تھا۔ ۲۵۲ء اور ۳۸۰ء کے درمیان یہاں دس کلیسائی مجلسیں منعقد ہوئیں کریسوستم کا اندازہ ہے کہ مسیحی آبادی ایک لاکھ تھی بہ ظاہر اس میں ملازموں، غلاموں اور بچوں کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ ۵۲۶ء میں یہاں خوفناک زلزلہ آیا معاصر وطنی مؤرخ ملالاس[۵۰] نے بتایا ہے کہ اس میں اڑھائی لاکھ اہل انطاکیہ تباہ ہوئے ایرانی حملے اور ۵۲۶ء نیز ۵۲۸ء کے زلزلوں سے اقتصادی لحاظ سے انطاکیہ کو بری طرح برباد کر ڈالا۔

انطاکیہ سے خسرو افامیا پہنچا یہ بھی اس زمانے میں بارونق مسیحی مرکز تھا یہاں کا کلیسا اس امر کا دعوے دار تھا کہ اس کے پاس اصل صلیب (جس پر مسیح کو چڑھایا گیا تھا) کا ایک ہاتھ لمبا ٹکڑا موجود ہے اسے ایسی کشتی میں رکھا گیا تھا جو جواہرات سے مرصع تھی۔ خاص مذہبی پیشوا اس کی حفاظت کرتے تھے اور سال بھر میں ایک مرتبہ اس مقدس شے کی زیارت کرائی جاتی تھی اس وقت پوری آبادی عبادت میں مصروف ہو جاتی تھی۔ حریص حملہ آور کو مطمئن کرنے کے لیئے یہ مرصع کشتی بھی دے دی گئی اور شہر میں سونے چاندی کے جو ذخیرے تھے وہ بھی پیش کر دیئے گئے، البتہ مقدس صلیب کو کلیسا میں رہنے دیا گیا حملہ آور کے نزدیک اس کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی تھی؟ جب ایک شہری نے ایک ایرانی سپاہی پر الزام لگایا کہ وہ میرے گھر میں داخل ہوا اور میری دوشیزہ لڑکی کی آبروریزی کی تو خسرو نے حکم دے دیا کہ مجرم کی کھال کھینچ لی جائے۔ باشندوں کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف مقدس صلیب کی بدولت شہر تباہی سے محفوظ رہا۔

حلب کے نزدیک ہی کیلسس (عجز) تھا پھر فاتح نے اس کا رخ کر لیا اس شہر نے سونے کی ایک مقدار دے کر اپنے بچاؤ کا بندوبست کیا۔ خسرو نے استحصال کی جو مہم شروع کی تھی پھر وہ دریائے فرات کے مشرقی علاقوں میں جاری رہی۔

۵۴۵ء میں متارکہ ہوا جس کی تجدید ۵۶۲ء تک کئی مرتبہ ہوئی آخر جسٹینین نے پچاس سال کے لیے صلح کر لی اور عہد کیا کہ "شہنشاہ اعظم" کو خراج ادا کیا جائے گا اور ایرانی علاقوں میں پروپیگنڈا بالکل نہیں کیا جائے گا۔ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں پھر لڑائی چھڑ گئی لیکن اس کی داستان کا تعلق ایک آئندہ باب سے ہے یعنی اس باب سے جو عرب میں ایرانی سلطنت کے ظہور پر مشتمل ہے۔

---

۵۰ Malalas

انتیسواں باب

قبلِ اسلام کی شامی عربی ریاستیں

اسلام کے ظہور اور شمالی جانب اس کی توسیع سے پیشتر شام کے حواشی پر تین عرب ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں اور بگڑ گئیں۔ جنوب میں نبطی ریاست، شمال میں تدمر کی ریاست اور ان دونوں کے درمیان غسّانی ریاست، یہ ایک دوسری کے بعد ظہور میں آئیں اور بعض خصوصیتیں تینوں میں مشترک تھیں یہ خانہ بدوشوں یا صحرانورد قبیلوں کو حضری بنا لینے کے باعث وجود میں آئیں ان کی خوشحالی تجارت پر موقوف تھی جس کے قافلے ان ریاستوں میں آتے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ریاست کم از کم کچھ مدت کے لیے وقت کی نہایت عظیم الشان طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہی ——— ایک رومہ دوسری ایران ——— اور ان سے اعانتی رقمیں لیتی تھی۔ نبطیوں اور تدمریوں کو آخر رومہ نے تباہ کیا۔ غسّانی ریاست بیزنطیم اور ایران کے ہاتھوں برباد ہوئی۔

نبطی

نبطی پہلے پہل چھٹی صدی قبل مسیح کے اوائل میں بدوی قبیلوں کی حیثیت میں نمودار ہوئے۔ ان کا وطن وہ صحرائی علاقہ تھا جو آج کے شرقِ اردن کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ سرزمین تیرھویں صدی قبل مسیح سے مختلف چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں کا مرکز تھی، ادوم اور موآب جنوب میں، عمون اور جلعاد شمال میں۔ یہ سب کنعانی یا آرامی تھے۔ تیرھویں صدی قبل مسیح سے پیشتر ادوم اور موآب میں کوئی نہیں رہتا تھا اور ان کی تاریخ انیسویں صدی قبل مسیح تک خالی چلی آتی ہے کم از کم آثارِ قدیمہ کی شہادت یہی ہے۔ تئیسویں صدی قبل مسیح سے انیسویں صدی قبل مسیح تک ان علاقوں میں گھنی آبادی رہی پھر صحرائی جانب سے حملے شروع ہوئے اور بظاہر انہیں حملوں کی وجہ سے یہ علاقے تباہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ——— مثلاً احیاب اور حضرت داؤدؑ کے زمانے میں ——— یہودیوں کی جنگی قوت اور مذہب بھی ان سرزمینوں میں پہنچے مگر حق یہ ہے کہ یہودیوں کا توحیدی مذہب کبھی بڑی قوت کی شکل میں دریائے اردن کے پار نہ پہنچ سکا اور نہ اس کے جنوبی جانب قدم جما سکا۔ یہی لوگ تھے جو آگے چل کر نبطی وفاق میں شامل ہوئے۔ اس وفاق میں ثمود[1] اور شمالی حجاز کے بنو لحیان[2] بھی شامل تھے۔

گلہ بانی کے بجائے کھیتی باڑی

چوتھی صدی قبل مسیح سے پیشتر نبطی خانہ بدوش ہی تھے، وہ خیموں میں رہتے تھے، عربی بولتے تھے، شراب سے سخت پرہیز کرتے تھے اور کھیتی باڑی سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آئندہ صدی میں انہوں نے گلہ بانی ترک کر دی اور حضری زندگی اختیار کر کے کھیتی باڑی

---

[1] یہ وہی قوم ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا آیا ہے۔ حضرت صالحؑ اس کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

[2] انہیں ثمود سے قریبی تعلق ہے۔

اور تجارت میں مشغول ہو گئے۔ دوسری صدی کے اختتام تک وہ ایک ایسے معاشرے کی شکل میں اعلیٰ پیمانے پر منظم ہو چکے تھے، جو حضارت کے لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکا تھا اور بڑھا چلا جا رہا تھا نیز خاصا دولت مند تھا۔ یہ ایک اور مثال تھی جیسی مثالیں مشرق قریب کی قدیم تاریخ میں بار بار پیش آتی رہی ہیں۔ یعنی گو بدو پہلے کاشتکار بنے پھر انہوں نے تجارت اختیار کر لی جس سرزمین میں وہ رہتے تھے اگرچہ اس کے وسائل ناکافی تھے لیکن اس کا موقع اور محل ایسا تھا جہاں سے تجارتی قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس طرح طبعی قلت کی تلافی ہوتی رہی۔

نبطیوں کی تاریخ میں پہلا قابل ذکر واقعہ ۳۱۲ ق م میں پیش آیا۔ سکندر یونانی کے ایک جانشین اینٹی گونس[۱] کے ماتحت شام سے دو مرتبہ ان کے سنگین حصار پر حملہ ہوا۔ دونوں مرتبہ اسے ناکام بنا دیا گیا۔ ان کے دار الحکومت کی ابتدا ایک پہاڑی قلعے سے ہوئی تھی۔ وہ ایسے مقام پر واقع تھا جہاں مسالوں کی تجارت کے مختلف راستے آکر مل جاتے تھے اور یہ خوب مستحکم تھا۔ یہ چٹانی جائے پناہ تھی جس کا نام پیٹرا اور الحجر تھا۔ نبطیوں کے دور سے پیشتر ادومی اسی شہر کو مقام حفاظت سمجھتے تھے اور ادومیوں سے انہوں نے حوریوں سے چھینا تھا۔ اس لیے کہ بہت بڑی چٹانوں کو کھود کھود کر یہ شہر بنایا گیا تھا اور اس میں قوس قزح کے تمام رنگ نمایاں تھے۔

کاشتکاروں کے بجائے تاجر

لفظ پیٹرا "صخرہ" کا یونانی ترجمہ ہے۔ عبرانی میں اسے سلع[۲] کہتے تھے۔ اس کا عربی مترادف الرقیم[۳] ہے۔ وادی موسیٰ میں اس کا موجودہ محل ام البیارہ کہلاتا ہے۔ اپنے دار الحکومت سے نبطیوں نے دائرۂ اقتدار پھیلانا شروع کیا اور ان کی نو آبادیاں پاس کے شمالی خطوں میں قائم ہوتی گئیں جو ادومیوں اور موآبیوں کے جو پرانے شہر تباہ ہو چکے تھے نبطیوں نے انہیں پھر سے آباد کر لیا نیز تجارتی قافلوں کی تجارت کے لیے نئی چوکیاں بنوائی گئیں اور معدنی وسائل کی تفتیش کے لیے نئے مرکز قائم کیے۔ دریائے اردن اور حجاز کے درمیان صرف پیٹرا تھا جہاں صحت بخش صاف پانی بہ افراط ملتا تھا علاوہ بریں شہر کو تین طرف سے بالکل ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا یعنی مشرق المغرب اور جنوب کی طرف سے چوتھی صدی کے اختتام سے پیٹرا تجارتی راستے کا کلیدی مقام بن گیا اور اسے جنوبی عرب کے بخور پیدا کرنے والے علاقوں اور شمال کے بخور خریدنے والے علاقوں کے درمیان اتصالی کڑی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ چار تجارتی راستوں پر اس کا پورا قبضہ تھا اول مغربی جانب غزہ کی بندرگاہ تک جانے والا راستہ، دوم شمالی جانب بُصریٰ اور دمشق کا راستہ، سوم ایلہ کا راستہ جو بحیرۂ قلزم کی مشہور بندرگاہ تھی، چوتھا خلیج فارس کا راستہ جو صحرا میں سے گزرتا تھا۔ ان چاروں راستوں کے لیے اونٹوں کے قافلے پیٹرا میں مہیا ہوتے تھے۔

نبطی آبیاری کے ماہر انجینیر چشموں کے پانی پر قانع نہ ہوئے۔ انہوں نے زمین کی تہ سے پانی نکالنے کا انتظام کیا اور اس سے باقاعدہ فائدہ اٹھایا علاوہ بریں بارش کا پانی بھی اکٹھا ہونے لگا معلوم ہوتا ہے انہیں وہ معجز نما عمل مل گیا تھا جو پیشتر اس

---

[۱] تفصیلات کے لیے دیکھیے سٹرابو، کتاب نمبر ۱۶۔

[۲] دیکھو ڈیو ڈورس کتاب دوم باب ۴۸ نیز کتاب ۱۹ باب ۹۴۔

[۳] بائیبل میں اس کا ذکر یسعیاہ سلاطین، یرمیاہ وغیرہ میں آیا ہے۔

[۴] قرآن مجید سورۂ کہف آیت ۹ نیز یاقوت جلد اول و دوم اور جرزنیس کتاب آثار الیہود۔

علاقے میں پھرنے والے ایک سامی یعنی حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوا تھا جس سے کام لے کر آپ خشک چٹانوں سے پانی نکال لیتے تھے۔ اس طرح نبطیوں نے صحرا کے بہت سے خطے کھیتی باڑی کے مرکزوں کی صورت میں تبدیل کر دیے عربوں کے کسی گروہ نے یہ کام اس پیمانے پر نہ اس سے پہلے انجام دیا تھا نہ بعد میں۔

تیسری صدی ق م میں نبطیوں کے متعلق بہت کم ذکر آیا اس صدی میں نبطی باشندے آبادکاری کے ممکنات کو ترقی دے رہے تھے دوسری صدی کے آغاز ہی میں انہوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ مشرق قریب کی سیاسیات میں انہیں نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا، لیکن ظہور کے ساتھ ہی وہ بطلیموسیوں کے زیر اثر آ گئے ۱۶۹ ق م میں ان نبطی بادشاہوں کا آغاز ہوا جن کے حالات ہمیں قطعی طور پر معلوم ہیں۔

نبطی بادشاہ

بادشاہوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام حارثہ (الحارث، ۱۶۹ ق م) کا ہے اسی کو اریتاس[1] "بادشاہ عرب" کہتے ہیں۔ متعدد نبطی بادشاہوں نیز غسانی ملوک کا یہی نام تھا۔ الحارث ان یہودیوں کا معاصر تھا جنہوں نے مکابی خاندان حکومت کی بنیاد رکھی تھی دونوں خاندان شام کے سلیوکی بادشاہوں کے خلاف طبعی حلیف تھے لیکن بعد ازاں دونوں میں اختلاف پیدا ہو گئے حارثہ ثانی (۱۱۰ ق م – ۹۶ ق م) ۹۶ ق م میں غزہ کی امداد کے لئے گیا جس کا محاصرہ الیگزانڈر جنایوس[2] مکابی نے کر رکھا تھا۔ ۹۰ ق م کے آس پاس حارثہ ثانی کے جانشین عبیدہ[3] نے جنایوس پر نمایاں فتح حاصل کی یہ لڑائی بحیرۂ طبریہ کے مشرقی ساحل پر ہوئی اور اس فتح نے جنوبی و مشرقی شام پر قبضے کا دروازہ کھول دیا۔ شام کے یہی علاقے ہیں جنہیں آج کل حوران اور جبل دروز کہتے ہیں۔ جب سلیوکیوں اور ان کے ہمسایہ بطلیموسیوں کا ستارہ زوال میں آ گیا تو عبیدہ کے جانشین حارثہ ثالث (۸۷ ق م – ۶۲ ق م) نے فائدہ اٹھاتے ہوئے عربی سلطنت کی سرحد شمال کی طرف بڑھائی اس وقت تک روما مشرقی منظر پر نمودار نہیں ہوا تھا۔

حارثہ نبطیوں کی قوت کا اصل بانی تھا اس نے بار بار یہودیوں کی فوج کو شکست دی یا یروشلم کا محاصرہ کر لیا ۸۵ ق م میں وہ دمشق کی دعوت پر وہاں پہنچا اور اس سلیوکی شہر کا حکمران بن گیا ساتھ ہی اس زرخیز میدان پر قبضہ کر لیا جسے نشیبی شام کہتے ہیں۔ دمشق کی طرف سے دعوت اس لیے آئی تھی کہ اہل دمشق کو اتیوری حاکم کیلس (ٹنجرا) سے نفرت تھی جو شام کے تخت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ بارہ سال بعد حارثہ نے پمپی کا حملہ ناکام بنا دیا جو رومی سلطنت کی حدیں بحیرہ قلزم تک پہنچانے کا خواب دیکھ رہا تھا اس طرح حارثہ شام کا نہایت طاقتور بادشاہ بن گیا اور روما کے ساتھ پہلی مرتبہ براہ راست تعلق پیدا ہوا۔

حارثہ نے ایک ہاتھ سے رومی فوجوں کو پیچھے ہٹایا دوسرے ہاتھ سے یونانی اور رومی اثرات کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اپنی سلطنت کو یونانی تہذیب کے دائرے میں لے گیا اور "محب یونانیت" کا لقب حاصل کیا وہ پہلا شخص تھا جس نے نبطی سکے جاری کیے اور ان کے لیے بطلیموسی نمونہ پیش نظر رکھا اس نے شامی و یونانی فن کار بلائے غالباً انہیں نے وہ خوب صورت [illegible] کھدوایا ہوگا جو آج کل

---

[1] Aretas

[2] Alexander Jannaeus

[3] اسے یونانی انداز میں ... کہا جاتا ہے سید سلیمان ندوی مرحوم نے "ارض القرآن" میں اس کا نام عبادہ لکھا ہے (جلد دوم ص ۷)

"الخزنہ" کہلاتا ہے یہ اصل میں مقبرہ تھا جو اس نے اپنے لیئے بنوایا تھا۔ تھیٹر بھی غالباً اسی کے زمانے میں بنا تھا۔ اس وقت سے پیٹرا نے یونانی شہر کے نمونے کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہاں ایک خوب صورت بڑا بازار تھا، بہت سی مذہبی اور عوامی عمارتیں تھیں۔ اسی وقت سے نبطی روما کے حلیف بن گئے جب قیصر نے ۴۷ ق م میں نبطی بادشاہ مالک[1] (۵۶ ق م، ۲۸ ق م) سے درخواست کی تھی کہ اسکندریہ کی جنگ کے لیئے رسالہ مہیا کیا جائے۔ مالک کے جانشین عبیدۂ ثالث (۲۸ ق م۔ ۹ ق م) نے ایلیوس گالس[2] کو عرب آبادیوں پر حملے کے لیئے آمادہ کیا تھا۔ گالس آگسٹس کی طرف سے مصر کا حاکم تھا اور اس نے ۲۴ ق م میں عرب آبادیوں پر ناکام حملہ کیا تھا جس کے لیئے عبید نے پیدل امداد کا وعدہ کیا تھا۔ گالس کا دوست سٹرابو حملے کی ناکامی کا الزام نبطیوں کے وزیر سیلاس[3] کی غداری پر عائد کرتا ہے جو مہم کا رہبر تھا۔ جب عبید کے جانشین حارث چہارم نے آگسٹس کی اجازت کے بغیر بادشاہی سنبھال لی تو اس وجہ سے اس کا تخت معرضِ خطر میں پڑ گیا۔

سلطنت کا دورِ عروج

حارثہ رابع (۹ ق م۔ سنہ ۴۰ء) کے طویل اور خوشحال عہد میں سلطنت اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ اس نے رومی تہذیب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اسی کے ایک والی نے پولوس رسول کو دمشق میں گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی[4]۔ ہیرودیس اعظم کے بیٹے ہیرودیس کی شادی اسی حارثہ کی بیٹی سے ہوئی تھی لیکن جب اسے ایک رقاصہ سے شادی کی ضرورت پیش آئی تو حارثہ کی بیٹی کو بے تکلف طلاق دے دی، یہی رقاصہ یوحنا بپتسمہ دینے والے کی شہادت کی ذمہ دار تھی[5]۔ حارثہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے یہودی بادشاہ کے خلاف کامیاب جنگ شروع کر دی[6]۔ پیٹرا میں جو بلند عمارتیں اور خوب صورت مقبرے اب تک باقی ہیں[7] نیز مدائن صالح کے آثار اسی عہد کی یادگار ہیں۔ مدائن صالح (الحجر) ثمود قوم کا مرکز تھا[8]۔

سلطنت کے انتہائی عروج کے زمانے میں جنوبی فلسطین، شرقِ اردن، جنوبی و مشرقی شام اور شمالی عرب اس میں شامل تھے، لیکن سلطنت کے شامی حصے اور شرقِ اردن کے درمیان جمعیت بلاد عشرہ کا علاقہ حائل تھا۔ وادی سرحان ان دونوں کو ملاتی تھی۔ شرق اردن کی مشرقی سرحد پر یہ صحرائی علاقہ قلبِ عرب اور شام کے درمیان شاہراہ کا کام دیتا تھا اور یہ شاہراہ بلاد عشرہ کے علاقے سے بچی ہوئی شام پہنچ جاتی تھی۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کاروانی راستے پر قدرتی چشمے بھی ہوں گے، ایسے چشمے بھی ہوں گے جن سے پانی لیا جاتا تھا۔ سرائیں، چوکیاں، قلعے اور تھانے بھی اسی طرح قائم ہوں گے جس طرح وادی العربہ کے راستے میں قائم تھے۔ یہ آخری راستہ پیٹرا سے گزرتا تھا اور وادی اردن کو خلیج عقبہ سے ملاتا تھا۔ انتظامی اور احتیاطی تعمیرات اس لئے ضروری تھیں کہ بدوؤں کے چھاپوں سے راستے محفوظ رہیں۔ وادی العربہ والا راستہ بحیرۂ لوط پر دو شاخوں میں بٹ گیا تھا۔ مشرقی جانب والا راستہ شرقِ اردن کو جاتا تھا اور اس شاہراہ

---

[1] یونانی میں Malchus

[2] Aelius Gallus

[3] Syllaeus

[4] کرنتھیوں کے نام پولوس رسول کا خط باب ۱۱، آیت ۳۲۔

[5] متی کی انجیل باب ۱۴، آیات ۶-۱۱۔

[6] جوزیفس "آثارِ یہود"

[7] ایلگزانڈر کینیڈی کی کتاب پیٹرا۔

[8] قرآن مجید سورہ بنی اسرائیل، آیت ۸۰۔

سے مل جاتا تھا جو سطح مرتفع کے زرخیز حصوں کو قطع کرتی ہوئی نکل گئی تھی مغربی جانب والا راستہ فلسطین کو جاتا تھا یہ دونوں وادیاں وہ گزرگاہیں تھیں صلح کا زمانہ ہوتا تو ان گزرگاہوں سے نبطیوں کا سامان جاتا جنگ کا زمانہ ہوتا تو ان گزرگاہوں سے ہتھیار بھیجے جاتے۔

آخری دور کے بادشاہ

نبطیوں کے آخری بادشاہوں کے متعلق معلومات بہت کم ہیں صرف تھوڑے سے حقائق مقامی کتبوں، سکوں اور کلاسیکی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں عبیدہ ثالث (۳۰ق م ۔ ۹ ق م) کے زمانے سے سکوں پر ملکہ کی تصویر بھی بادشاہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اور یہ سلسلہ سلطنت کا تختہ الٹنے تک جاری رہا۔ ایک مجسمے پر کتبہ لگا ہوا ہے جس میں عبیداللہ کو "الوہیت" کے رنگ میں یاد کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبطی بادشاہوں کو موت کے بعد الوہیت کا درجہ دے دیا جاتا تھا حارثہ رابع کے بیٹے مالک ثانی (۴۰ء ۔ ۷۰ء) کے سکوں پر ملکہ کو بادشاہ کی بہن بتایا گیا ہے گویا فرعونی اور بطلیموسی دستور کے مطابق بعض نبطی بادشاہوں کی بیویاں ان کی بہنیں تھیں عبیدہ کے مجسمے پر ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ حارثہ رابع کی بیویوں میں سے بھی ایک اس کی بہن تھی یہی مالک ثانی تھا جس نے ۶۷ء کے قریب ایک ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے ٹائٹس کی امداد کے لئے بھیجے تھے جب اس نے یروشلم پر حملہ کیا تھا۔ اسی مالک کے زمانے میں دمشق رومیوں کے حوالے ہوا۔ اس وقت غالباً نیرو روما کا شہنشاہ تھا۔

مالک کا بیٹا اور جانشین ربیل ثانی (۷۰ء ۔ ۱۰۶ء) آخری نبطی بادشاہ تھا۔ حوران کے ایک کتبے میں بتایا گیا ہے کہ "اس نے اپنی رعایا کے لیے زندگی اور نجات کا بندوبست کیا۔" یہ تحریر غالباً ستم ظریفی کا کرشمہ ہے اس بادشاہ کے بعض سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند سال تک یہ اور اس کی والدہ حکمرانی میں شریک تھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ۱۰۶ء میں کون سا ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر اس شامی عربی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے علاقے سلطنت روما میں شامل کر لیے گئے۔ روما اس وقت تک شام اور فلسطین کی تمام چھوٹی چھوٹی بادشاہیاں ہضم کر چکا تھا اور پارتھیا کی عظیم الشان ایشیائی بادشاہی سے تیغ آزمائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں بیچ میں کسی نیم خود مختار سلطنت کو چھوڑنا قرین مصلحت نہ تھا چنانچہ سب ریاستیں ختم کر دی گئیں لیکن غالباً ربیل[1] کا عہد ختم ہونے پر رومیوں نے اس کے جانشین کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ٹراجن کے شامی نائب کارنیلیس پالما[2] کی طرف سے پیٹرا کے خلاف قدم اٹھتے ہی مزاحمت ختم ہو گئی آئندہ سال نبطی علاقے رومی سلطنت کا عربی صوبہ بن گئے۔ بصریٰ کو تمام شہروں میں ممتاز حیثیت حاصل تھی آگے چل کر اسی کو دارالحکومت بنا لیا گیا اور عرب نبطستان ایک مستقل سلطنت کی حیثیت میں ناپید ہو گیا۔

اس کا خوب صورت اور دولت مند دارالحکومت تاریخ کے اعراف میں داخل ہو گیا جہاں سے یہ باہر نکل آیا ہے شرقی اور غربی تجارتی راستہ شمال میں تدمر کی طرف منتقل ہو گیا جنوبی و شمالی راستے نے بھی شرقی جانب پلٹا کھایا اور راستہ بدل کر پہنچ گیا جہاں سے

۱؎ سید سلیمان ندوی نے اس کا نام سبیان لکھا ہے ارض القرآن جلد دوم ص ۰۰

۲؎ Cornelius Palma

مسلمان حرمین آتے جاتے تھے اور جہاں بعد میں حجاز ریلوے کی پٹڑی بچھی۔ پیٹرا کا چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کا بپتسمہ دیا گیا تھا۔ ساتویں صدی میں اسے حلقہ بگوش اسلام بنا لیا گیا اور بعد میں یہ مسلمان ہی رہا۔ ۱۱۰۰ء میں بالڈون اوّل نے بادشاہ بنتے ہی اس مستحکم شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا مگر ۱۱۸۹ء میں صلاح الدین نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی تو پیٹرا کا بھی فیصلہ ہو گیا پھر یہ حالتِ گمنامی میں پڑا رہا یہاں تک کہ ۱۸۱۲ء میں سوئزرلینڈ کے مشہور سیاح برک ہارٹ نے اس کے کھنڈروں سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔

تجارتی اور صنعتی علاقے

پیٹرا کے تجارتی سلسلے اس وقت کی مہذب دنیا کے نہایت دورافتادہ گوشوں تک پہنچ گئے تھے۔ ان کے تحریری آثار پٹیولی سے جو کسی زمانے میں روما کی بندرگاہ تھا، خلیج فارس میں جرہا العقیر تک بکھرے ہوئے تھے۔ بعض نبطی دستاویزیں ... ملیٹس، رہوڈز، نیل کے مشرقی ڈیلٹا، مصر بالا اور رہا اور فرات میں دستیاب ہوئی ہیں۔ پٹیولی میں ایک ایسا کتبہ ملا ہے جو جگہ جگہ سے خراب ہو چکا ہے۔ یہ اب نیپلز کے موزیم میں موجود ہے اور یہ ۵ء کا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک معبد پچاس سال پیشتر بنا تھا۔ پھر اس کی تجدید ہوئی اور حارثہ رابع کے لئے چند چیزیں اس میں مخصوص کر دی گئیں۔ چینی دستاویزیں بھی نبطیوں کی تجارتی سرگرمیوں کی شہادت دے رہی ہیں۔

تجارت کی خاص جنسیں یہ تھیں: جنوبی عرب کا مُر، سامان اور بخور، دمشق اور غزہ کے اعلیٰ درجے کے ریشمی پارچات اور عسقلان کی حنا، صیدون اور صیدا کے شیشے کے برتن اور ارغوان اور خلیج فارس کے موتی، نبطی علاقے کی خاص پیداوار یا تو سونا اور چاندی تھے یا تل کا تیل، جسے روغن زیتون کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا[۲] اسفالٹ اور دوسری منفعت بخش دھاتیں غالباً بحیرۂ لوط کے مشرقی کنارے سے نکالی جاتی تھیں۔ ان کے بدلے میں چین سے ریشم درآمد کیا جاتا تھا۔ چینی ریشم کو شام میں سلیوکیوں کے زمانے سے شہرت حاصل تھی اور خام ریشم پہلی صدی عیسوی سے صیدون میں بنا جاتا تھا۔ یونان اور روما سے جو جنسیں نبطی علاقوں میں پہنچتی تھیں وہ اٹیکا کے مرتبانوں میں بھر کر آتی تھیں اور ان کے ٹکڑے اب تک پیٹرا اور ایلہ[۳] کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ ایلہ کاروانی منزلوں کے سلسلوں کی ایک کڑی تھا۔ اس طرح بُصریٰ اور صلخد بھی کڑیاں تھیں۔ یہ شہر اور ان کے علاوہ دوسرے شہر ہتھیاروں اور مختلف سامان کے ذخیروں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ جگہ جگہ فوجی دستے راستوں اور مرکزوں کی حفاظت کے لئے موجود تھے اور نبطی آبادکار ان دستوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ حال ہی میں ایلہ سے پچیس میل مشرق کی طرف جبل رمّ[۴] نام ایک مقام دریافت ہوا ہے۔ اسے وہی مقام بتایا جاتا ہے جسے قرآن مجید میں ارم قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے

۱؎ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Travels in Syria and the Holy Land — Burckhardt

۲؎ سفرا ابوکتاب ۶ اباب ہم۔ ۳؎ اس کا قدیم نام ایلاث تھا۔ اب اسے عقبہ کہتے ہیں اس لئے کہ احمد بن طولون نے یہاں قلعہ بنا دیا تھا۔

۴؎ Jabal Ramm ارم کا ذکر سورہ فجر میں آیا ہے۔ الم تر کیف فعل ربک بعاد، ارم ذات العماد، التی لم یخلق مثلہا فی البلاد (تو نے نہیں دیکھا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ؟ وہ جو ارم میں تھے بڑے ستونوں والے، کہ نہیں ویسے سارے شہروں میں) یہ مقام شمالی میں بتایا گیا ہے لیکن اب تک جتنی روایات معلوم تھیں وہ عادِ ثانیہ کا مقام بھی جنوبی عرب ہی قرار دیتی رہیں۔ اگر جبل رم واقعی "ارم" ثابت ہو تو یہ نیا انکشاف ہو گا۔

کہ اس کے متعلق دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ نبطی قافلوں کے راستوں کی حفاظت کرتے تھے اور آنے جانے والے مال پر محصول لیتے تھے۔ ایک خاص وقت تک انہیں اجارہ دار کی حیثیت حاصل رہی۔ سٹرابو کا بیان ہے کہ انہیں املاک حاصل کرنے سے خاص رغبت تھی جس کے املاک گھٹ جاتے، اس سے جرمانہ وصول کیا جاتا اور جس کے املاک بڑھ جاتے، اسے اعزازات دیئے جاتے ہیں[1]

حضارتی پہلو

نبطی حضارت گوناگوں عناصر سے مرکب تھی۔ مثلاً بولی عربی تھی، رسم الخط آرامی تھا، مذہب سامی، فن اور طرزِ تعمیر رومی و یونانی۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو وہ یونانی معلوم ہوگی، لیکن بنیادی طور پر عربی تھی اور عربی ہی رہی۔

سٹرابو، جوزیفس اور ڈیوڈورس نبطیوں کو عرب قرار دینے میں بالکل حق بجانب تھے۔ ان کے شخصی نام اور دیوتاؤں کے نام عربی تھے۔ آرامی کتبوں میں بھی عربی لب ولہجہ صاف نظر آتا ہے اور کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ان کی زبان شمالی عرب ہی کی ایک بولی تھی۔ پیٹولی کے جس کتبے کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس میں ایک نام علی بھی آتا ہے جو آگے چل کر مسلمانوں میں زیادہ عام ہوا۔ ادبیات میں پہلی مرتبہ یہ نام وہیں دیکھا گیا۔ دو اور نام مذکور ہیں، جو عربی میں بہت عام ہوئے، ایک "حبیب" اور دوسرا "سعید"۔ بعض عربی الفاظ مثلاً "قبر" اور "غیر" بھی مختلف کتبوں میں آئے ہیں۔ ۲۶۸ء کے ایک کتبے میں خالص عربی الفاظ اس کثرت سے آئے ہیں کہ پورا کتبہ عربی کے قریب پہنچ گیا ہے[2]۔

اس زمانے کی بین الاقوامی بولی آرامی تھی۔ نبطی اور ان کے شمالی ہمسایے دونوں اس سے کام لیتے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت تک عربی حروف ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ نبطیوں نے ۳۱۲ ق م میں انٹی گونس کے لیے جو پیغام بھیجا تھا وہ سریانی رسم الخط میں تھا۔ اپنی یادگاروں اور سکوں میں وہ آرامی زبان ہی استعمال کر سکتے تھے۔ خود نبطی رسم الخط رفتہ رفتہ آرامی سے جدا ہوا۔ پہلی صدی عیسوی کے وسط تک اس کے اپنے حروف مرتب ہو چکے تھے اور یہ معیاری درجہ حاصل کر چکا تھا۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ نبطی تاجر زیادہ نہیں تو کم از کم دو زبانیں ضرور جانتے تھے۔ آج کل قاہرہ اور بیروت کے تاجروں کی کیفیت بھی یہی ہے۔ نبطی تاجر عربی اور آرامی کے علاوہ یونانی بھی ضرور جانتے ہوں گے اور لاطینی سے بھی انہوں نے ایک حد تک واقفیت حاصل کر لی ہوگی۔

نبطی حروف کی ثقافتی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے، کہ عربی ابجد اسی سے نکلی اور ابتدائی دور کے عربی کتبوں کا مطالعہ فنی تحریر کے رو سے کیا جائے تو یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ قدیم ترین عربی متن جو ہمارے سامنے آیا ہے، النمارہ (مشرقی حوران) کا کتبہ ہے یہ ۳۲۸ء میں نبطی حروف میں کندہ ہوا تھا۔ جس خط نسخ میں عربی لکھی جاتی تھی، وہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنا کہ کوفی رسم الخط، جسے کوفہ (عراق)، سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کتبوں کی شہادت کے متعلق اسلامی روایات میں اختلاف ہے اور غلطی سے عراق کو حقیقی عربی تحریر کا مرکز بتایا جاتا ہے۔

---

[1] سٹرابو کتاب ۱۶، باب چہارم۔

[2] دیکھیے جوسن اور ساوینک کی کتاب فرانسیسی زبان میں۔

مذہب

نبطی مذہب کا نمونہ وہی تھا، جو سامیوں میں عام تھا، یعنی زرخیزی کے متعلق چند رسمیں ادا کی جاتی تھیں، جن کا تعلق کھیتی باڑی سے تھا۔ بلند مقامات اور کھڑے پتھروں کی پوجا کا پرانا طریقہ رائج تھا۔

نبطیوں کے تمام دیوتاؤں میں سب سے بڑا دوشارا (ذوالشریٰ یا دوسارس[1]) تھا۔ یہ دراصل سورج دیوتا تھا جس کی پرستش پتھر کی ایک بلند لاٹ یا ان گھڑ چار گوشہ سیاہ پتھر کی شکل میں کی جاتی تھی۔ ایک نبطی معبد کے کھنڈر دریافت ہوئے ہیں، جو بحیرۂ لوط کے جنوب مشرق میں خربۃ التنور کے نام سے مشہور تھا۔ یہ پہلی صدی مسیح میں بنا تھا۔ اصل معبد سادہ صندوق کی شکل کا تھا اور اسے کعبے سے مشابہت تھی[2]۔

ذوالشریٰ کے ساتھ ہی لات کی پوجا بھی ہوتی تھی، جو عربوں کے نزدیک بڑی دیوی تھی۔ یہ دراصل چاند کی دیوی تھی۔ ان کے علاوہ جن نبطی دیویوں اور دیوتاؤں کا ذکر ہے، ان میں منات، عزیٰ اور ہبل نام بھی کتبوں میں آتے ہیں۔ آرامیوں کی دیوی اتار رغاتس خربۃ التنور میں رکھی گئی تھی۔ یہ غلوں، سبزیوں کے پتوں، پھلوں اور مچھلی کی دیوی تھی[3]۔ یہاں کی متعدد دیویاں تدمُر، دوریوروپس، ہیرا پولس اور ہیلوپولس کی دیویوں سے ملتی جلتی تھیں۔ سانپوں کی پوجا بھی مذہب کا جزو تھی۔

نبطیوں کی عبادت کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ سٹرابو ایک شاہی دعوت کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "اس دعوت میں کوئی بھی گیارہ پیالوں سے زیادہ نہیں پی سکتا اور ہر مرتبہ سنہری پیالہ استعمال کیا جاتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مذہبی رسم تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ابتدا میں جس سنجیدگی اور تقشف سے کام لیا جاتا تھا، وہ بعد کی تہذیب کے زیر اثر ختم ہو چلے ہوں گے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کھانے پر بیٹھتے تھے تو تیرہ تیرہ آدمی گروہ بن کر بیٹھتے تھے اور ہر گروہ کے لیے دو لڑکیاں گانے پر مامور ہوتی تھیں۔ جب یونانیت کے طریقے اور عیش رانیاں اختیار کر لی گئیں تو دیویوں اور دیوتاؤں کے سامی نام بھی بدل گئے اور انہوں نے رومی لباس پہن لیا۔ چنانچہ دوشارا (ذوالشریٰ) دیونیسوس بن گیا۔

نبطیوں کے قومی کردار کے متعلق سٹرابو اور ڈیوڈورس ہمارے بہترین ماخذ ہیں۔ ان کے بیانات بے شک و شبہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان میں سچائی کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور ہونا چاہیے۔ عام نقشہ یہ ہے کہ وہ سمجھ بوجھ والے، محنتی، منتظم اور جمہوریت پسند لوگ تھے۔ تجارت و زراعت میں لگے رہتے تھے۔ ان کے معاشرے میں اگرچہ تھوڑے سے غلام موجود تھے، لیکن قلاش کوئی نہ تھا۔ تمام لوگ ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے تھے، ایک دوسرے کے خلاف مقدمے دائر کرنے سے احتراز کرتے تھے اور امن پسند تھے۔ ان کے بادشاہ میں ایسا جمہوری ذوق تھا کہ وہ اکثر اپنے کاموں کی روئداد مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کر دیتا۔ انہیں اس زندگی کے معاملات میں اتنا انہماک تھا کہ وہ اپنے مردوں کو گوبر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔

---

[1] ذوالشریٰ کا مطلب ہے مالک شریٰ، شریٰ ایک مقام تھا۔ پیٹرا کے شمال و مشرق میں جو پہاڑ ہے، اس کا نام اب تک شریٰ ہے۔ اس کے لفظی معنی غالباً "حِما" کے یعنی مقام محفوظ یا مقام مقدس۔

[2] دیکھیے ایم، ای کرک کی کتاب An Outline of the Ancient Cultural History of Transjordan

[3] نیلسن گلوئک (Nelson Glueck) کی کتاب The Other Side of the Jordan ۔

نبطیوں کا اثر شمالی سمت میں یہودیوں کی سرزمین تک اور جنوب میں جزیرۃ العرب کے اندر تک پہنچ گیا۔ اسرائیل کا بادشاہ عمری سامریہ کا بانی تھا اور وہیں ۸۷۴ ق۔م دفن ہوا۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نبطی تھا۔ قریباً ایک صدی گزر گئی تو یہودیہ کے بادشاہ امصیاہ نے پیٹرا کے ادومی دیوتاؤں کو اتنا قوی سمجھا کہ ان کی مورتیاں یروشلم کے ہیکل میں رکھوا دیں، تاکہ یہواہ کے ساتھ ان کی بھی پوجا ہو[1]۔ جس جشمو نے یروشلم کے گرد فصیل بنانے کی مخالفت کی تھی اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی خود نبطی تھا۔ جو دانشمند لوگ پورب سے پہنچے تھے[2] وہ غالباً نبطی صحرا کے عرب تھے، ایران کے مجوسی نہ تھے[3]۔ جسٹن مارٹر[4] اور دوسرے مسیحی پادریوں نے ان کے پیش کردہ نذرانوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ پنتکست کے زمانے میں جو عرب تھے، وہ بھی غالباً نبطی ہی تھے اور پولوس رسول نے جس عرب میں پناہ لی تھی، وہ بے شک وشبہ نبطی علاقے ہی کا کوئی صحرا تھا۔

اگر مزید تحقیق کی جائے تو غالباً ابتدائی دور کی مسیحیت اور اسلام پر نبطی اثر کے مزید پہلو آشکارا ہوں گے۔ قرآن مجید میں لفظ حنیف آیا ہے اور یہ اصطلاح رسول اللہ صلعم کے ان معاصروں کے لیے استعمال ہوتی تھی، جو وحدت کے تصوّر سے ایک حد تک آشنا تھے۔ یہ لفظ اصل میں آرامی نبطی معلوم ہوتا ہے۔

فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر

نبطیوں نے مندر، مقبرے اور دوسری عمارتیں بنائیں اور ایک نیا فنِ تعمیر جاری کیا، یعنی وہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر اور تراش تراش کر عمارتیں بنایا کرتے تھے۔ ان کے مکانوں کی چھتیں محراب دار ہوتی تھیں۔ آرائش کے سلسلے میں وہ استرکاری سے کام لیتے تھے۔ استرکاری کا فن ان کے ہاں سے عراق اور ایران میں منتقل ہوا۔

مذہب اور سنگ تراشی میں پیٹرا کے باشندے ان شہروں کے باشندوں سے زیادہ قریب تر تھے، جو صحرا کے حاشیے پر واقع تھے، مثلاً تدمر اور دورایوروپس۔

یونانی نمونے دیکھ کر نبطیوں نے ظروف گلی کی ایک ایسی طرز ایجاد کی، جو اس خطے میں بہترین مانی گئی[5]۔ ان کی پیالیوں، پرچوں، قابوں، صراحیوں اور پیالوں کے جو باقیات موجود ہیں، وہ حیرت انگیز حد تک نفیس ہیں، موٹائی میں یہ انڈے کے چھلکے سے زیادہ نہ ہوں گے اور ان پر بہت اعلیٰ کام ہوتا تھا۔ ہر قسم کے ظروف ملتے تھے، مثلاً سادہ، روغنی، دندانہ دار، نقاشی والے۔ ان کے لیے سرخی مائل مٹی استعمال کی جاتی تھی اور نمونے میں پھول یا بیل وغیرہ کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ آرائش میں انگور یا انگور کی بیل کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں شراب سے احتراز کا جو سلسلہ جاری تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ یروشلم میں عتیقیات کی چھان بین کے لیے امریکیوں نے جو ادارہ قائم کر رکھا ہے، اس کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے عقبہ سے بحیرۂ لوط کے شمالی سرے کے درمیان پانسو ایسے مقامات دریافت

---

[1] سلاطین حصہ دوم باب ۱۴، آیت ۷، تواریخ حصہ دوم باب ۲۵، آیت ۱۴۔

[2] متی کی انجیل باب ۲، آیت ۱۔

[3] ارنسٹ ای ہرزفیلڈ کی کتاب Archeological History of Iran صفحات ۶۴-۶۶

[4] ٹرائفو (Trypho) کے ساتھ مکالمہ ملاحظہ ہو Ante-Nicene Christian Library جلد دوم صفحات ۱۹۵-۱۹۶

[5] کرک ص ۱۹۵۔ گلوئک ص ۱۷۳-۱۷۴۔

کیے ہیں، جو نبطیوں سے منسوب تھے[۱] فن کاری، تعمیرات، انجینئری، غالباً ادبیات اور ظروف گلی کی ساخت میں نبطی اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے اور انہیں تاریخ کی بہترین قوموں میں شمار کرنا چاہیے[۲] وہ ان قافلوں کے منتظم تھے، جنہیں مشرقِ قدیم کے تجارتی جسم میں خون کی نلیوں کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ایک ایسے شہر کے معمار تھے، جو انسانی فنون کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے ایسی جگہوں پر بند اور نہریں بنائیں، جہاں اب پانی بالکل ناپید ہے۔ آج کل ان نبطیوں کی نمائندگی حویطات بدو کر رہے ہیں جو اسی جگہ صحرانوردی کرتے ہیں، جہاں ان کے اسلاف زمانہ ماضی میں اوج و عروج پر تھے۔ وہیں خیمے لگاتے ہیں، جہاں ان کا گلابی رنگ کا شہر اتنا پرانا ہے کہ اس کی عمر تاریخی دور کے نصف تک ضرور پہنچتی ہے۔

تدمر اور اہلِ تدمر

پیٹرا کے عروج کا آفتاب غروب ہونے لگا۔ تو تدمر کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہ بھی ایک کاروانی شہر تھا۔ بادیۂ شام کے قلب میں پانی کثیر مقدار میں موجود تھا، اگرچہ کھاری تھا۔ اس پانی کی وجہ سے ایک نخلستان وجود میں آگیا اور وہاں ایک آبادی بس گئی۔ چند عربی قبائل اس میں رہتے تھے۔ عالمی سلطنتوں نے نیا مسلک اختیار کیا اور تجارتی راستوں کی اہمیت بڑھی تو یہ معمولی آبادی ایک ایسے شہر کی صورت اختیار کر گئی جو ثروت و اقتدار میں عہد قدیم کا ایک درخشاں شہر تھا۔

مقامی باشندے اس آبادی کو "تدمر" کہتے تھے۔ اس شکل میں یہ آبادی ۱۸۰۰ء ق م میں پہلی مرتبہ نمایاں ہوئی تھی۔ پھر اشوری دستاویز سے واضح ہوتا ہے کہ تغلات پلاسر (قریباً ۱۱۰۰ء ق م) نے بدو حریفوں کا تعاقب کیا اور انہیں اس صحرائی پناہ گاہ تک پہنچا دیا۔[۳] جوزیفس ہمیں بتاتا ہے کہ اہلِ شام اس آبادی کو "تاراحورا"[۴] کہتے تھے۔ قدیم سامی نام، عربی میں اب تک باقی ہے، یعنی "تدمر" عبرانی مورخ کا بیان ہے کہ تدمر کی بنیاد سلیمانؑ نے رکھی تھی (تواریخ حصہ دوم باب ۸، آیت ۴) لیکن یہ بیان یا تو حضرت سلیمانؑ اور ان کی سلطنت کے متعلق مبالغہ آمیزی کا مرقع ہے یا سمجھنا چاہیے کہ مورخ نے "تارمار" کو غلطی سے تدمر لکھ دیا۔ تامار رومیہ کا ایک مقام ہے جس کی بنیاد واقعی حضرت سلیمانؑ نے رکھی تھی۔ اس کا یونانی نام "پالمیریا" ہے۔ اس کے معنی ہیں شہر انخیل (کھجور کے درختوں کا شہر) اور یہ نام عبرانی "تامار" کا مترادف ہے۔ تدمر کے اشتقاق کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے[۵] مسلمان داستان سراؤں کے پیشِ نظر ایک تو یہودیوں کی روایت تھی (یہ کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا) دوسرے اس کے عالی شان کھنڈر، ان چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں یقین ہو گیا کہ (یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں، بلکہ) جنوں کا بنایا ہوا ہے، جو حضرت سلیمانؑ کے فرمانبردار تھے۔

---

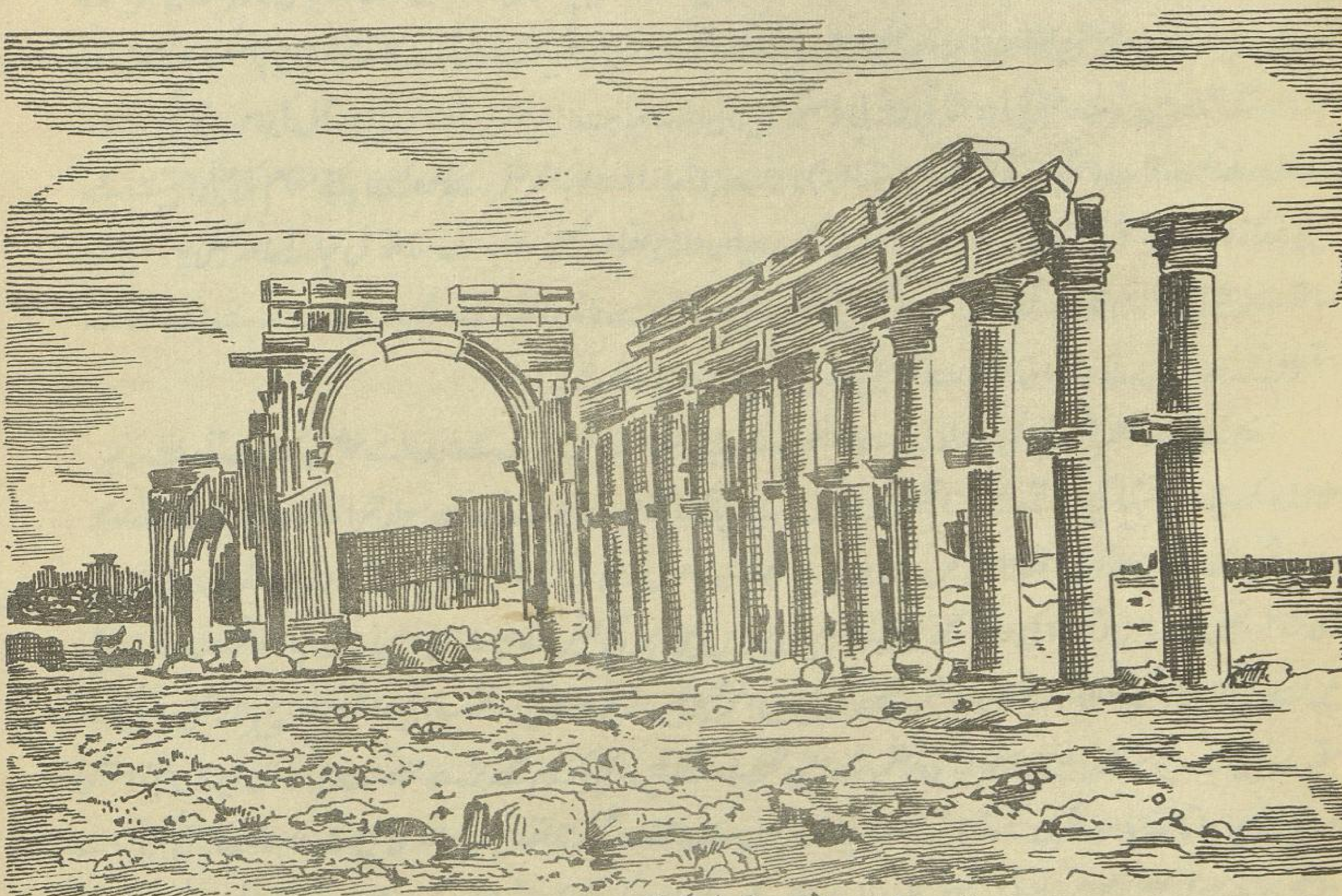
[۱] گلوئک ص ۱۷۳۔

[۲] ایضاً ص ۱۵۹-۱۶۰

[۳] جولیس لیوی کی فرانسیسی کتاب نیز "ریویو بیلیق" دار مکن بل جلد اول۔

[۴] جوزیفس کتاب الآثار الیہود کتاب ۸، باب ۶۔

[۵] شاید اس کا تعلق سامی کلمہ تدمورتا سے ہو جس کے معنی ہیں "جائے تعجب" ایلبرائٹ کا مقالہ Journal, Palestine Oriental Society جلد ۱۴۔



تدمر: محرابِ فتح اور ستونوں کی قطار

صحرا پار تجارت کا مرکز

پارتھی سلطنت پھیلتے پھیلتے دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں حلقۂ فرات کے اندر پہنچ گئی۔ اس سے مشرقِ قریب میں نئی صورتحال پیدا ہوگئی۔ قریباً پچھتر سال بعد شام کا الحاق رومی سلطنت سے ہوگیا۔ ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے درمیان تدمر تھا۔ یہ صحرا کے قلب میں ہر طرف سے منقطع تھا۔ نہ روما کے جنگجو وہاں پہنچ سکتے تھے اور نہ پارتھیا کے رسالے کا قدم وہاں جا سکتا تھا صحرا پار کی تجارت کے سلسلے میں شمالی وجنوبی اور شرقی وغربی راستوں میں یہ ایک نہایت اہم منزل تھا۔ موقع اور محل کی اس یگانگی سے تاجروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ تدمر کے سیاستدان بھی بڑے ہوشیار اور دور اندیش تھے سو وہ بھی اپنے مقام کی جنگی اہمیت کے صحیح اندازہ شناس تھے کیونکہ تدمر دو بڑی سلطنتوں کے درمیان واقع تھا وہ کبھی روما کے ساتھ مل جاتے اور کبھی پارتھیا کے ساتھ۔ اس طرح توازن قائم رکھتے اور اکثر وبیشتر اپنی غیر جانب داری سے فائدہ اٹھاتے۔ ایک حریف کو دوسرے کے خلاف استعمال کر کے انہوں نے درمیانی سلطنت کی حیثیت میں اپنی آزادی قائم رکھی۔

تدمر کے رؤسا صحرا کے قبائلی سرداروں سے قافلوں کے لیے بسلامت گزر جانے کے عہد نامے حاصل کر لیا کرتے تھے۔ بنجر علاقوں کے لیے رہبر مہیا کیے جاتے تھے۔ قافلوں کو بدوؤں کے اچانک حملوں سے بچانے کے لیے سوار تیر انداز ساتھ جاتے تھے۔ جو سامان شہر کے اندر سے گزرتا تھا اس میں سے ہر چیز پر بھاری محصول وصول کیا جاتا تھا۔ تجارتی جنسوں میں ضرورت کی چیزیں بھی شامل تھیں اور اس وقت کی دنیا کے عیش وآرام کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ عام سامان اس سے زیادہ مختلف نہ تھا جو پیٹرا میں سے گزرتا تھا مثلاً اون، ارغوان، ریشم، شیشے کی چیزیں، خوشبوئیں، زیتون کا تیل، خشک انجیر، اخروٹ، پنیر اور شراب۔ ایک مقبرے میں سے، جو ۸۳ء میں بنا تھا، چینی ریشم کے بعض ٹکڑے ملے ہیں۔ بحیرۂ روم کے بڑے حصے سے جو سامان ایران، ہندوستان اور چین بھیجا جاتا تھا یا ان ملکوں سے آتا تھا وہ سب تدمریوں کے ہاتھ سے گزرتا تھا۔ تیسری صدی مسیح کے وسط کے بعض کتبوں سے واضح ہوتا ہے کہ مجلس عوام نے ایک مجسمہ کارواں سالار کے لیے اور ایک مجسمہ منڈیوں کے رئیس کے لیے نصب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ تاجر شہریوں کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تجارت کے ساتھ مقامی صنعت نے بھی فروغ پایا۔ ۲۵۸ء کے ایک کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے اور چاندی کی چیزیں بنانے والوں، یعنی سناروں کی ایک بااثر جمعیت موجود تھی۔ حال ہی میں دو پہاڑوں کے درمیان کھدائی کرتے ہوئے ایک بند کے آثار ملے ہیں مقصد یہ تھا کہ پانی کو روک کر اسے زراعت کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھیتی باڑی کو بالکل پس پشت نہیں ڈال دیا تھا۔ ان گوناگوں سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تدمر مشرقِ قریب کے حد درجہ دولت مند شہروں میں سے ایک بن گیا۔

رفتہ رفتہ مٹی کی جھونپڑیوں کی جگہ پتھر کے مکانوں نے لے لی۔ نئے شہر کے بازار خاصے چوڑے رکھے گئے اور سب سے بڑا بازار بعل کے معبد کی طرف جاتا تھا۔ بازاروں کے دونوں طرف ستونوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ اس وجہ سے تدمر نے ایک اہم یونانی ورومی شہر کی شکل اختیار کر لی تھی، جس میں سیر گاہیں بھی تھیں اور تھیئٹر بھی۔ شہر اتنا دولت مند تھا کہ اس کی داستانیں سن کر مارک اینٹونی کی آتشِ حرص بھڑک اٹھی اور ۴۱ ق م میں اس نے حملے کے لیے رسالہ بھیج دیا۔ اہلِ تدمر نے حملے کی خبر سنتے ہی قیمتی چیزیں اٹھائیں، شہر خالی کر دیا اور وہ دریائے فرات کے پار چلے گئے۔ روما اور تدمر کے درمیان تعلق کی یہ پہلی تحریری دستاویز

تھی۔

رومہ کی باجگزاری

اس صحرائی شہر کے لیے اس سلطنت کے روز افزوں اقتدار کے سامنے اپنی کامل آزادی برقرار رکھنا مشکل تھا جو مغربی جانب واقع تھی شہنشاہ ٹائبیریس نے محاصل کے متعلق جو شاہی فرمان ۱۷ء اور ۱۹ء کے درمیان جاری کیے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی سنین کے آغاز میں تدمر نے رومہ کی برتری تسلیم کر لی ہو گی۔ لیکن اپنی آزادی حوالے نہ کی۔ اسی زمانے کے آس پاس شہر میں رومہ کا ایک مستقل نمائندہ پہنچا اور خود اہل شہر نے اپنے ایک نمائندے (الگزانڈروس[1]) کو رومہ کی طرف سے حمص کے رئیس سامپسی جریمس[2] کے پاس بطور سفیر بھیجا۔ ٹراجن نے ۱۰۶ء میں تدمر کو ایک صوبہ بنا دیا اور ہیڈرین ۱۳۰ء میں یہاں پہنچا تو اس نے اسے باجگزار رومہ کی حیثیت میں "ہیڈریانہ پامیرا[3]" کا نام دیا، جو شہر تدمر کے تابع تھے، وہ بھی رومہ کے باجگزار بن گئے تیسری صدی مسیح کے آغاز میں تدمر نے سپٹیمس سیویرس یا رومہ کے شامی شاہی خاندان کے کسی دوسرے بادشاہ سے نوآبادی کے حقوق حاصل کر لیے۔ چنانچہ کیراکلا کے سکوں میں "تدمر کو" کالونیا[4]" بتایا گیا ہے، اس لحاظ سے اسے محاصل سے آزادی حاصل تھی۔ خاندان سیویرس کے لیے تدمر کی رعایت ملحوظ رکھنا بالکل طبعی تھا۔ ۱۹۳۹ء میں ایک ایسے مقام کی کھدائی ہوئی، جو کسی زمانے میں سیرگاہ عامہ رہ چکا تھا۔ وہاں سے جو تمسکات ہاتھ لگے، وہ جولیا میزا اور خاندان کے دوسرے افراد کی مورتیوں سے مزین تھے[5]۔ رومہ کے باجگزار کی حیثیت میں تدمر اور اس کے تابع شہروں کے لیے خوش حالی اور اقبال مندی کا بنیادی دور شروع ہو گیا، جو ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ رومیوں نے ایسی سڑکیں بنا دی تھیں جن کی وجہ سے تدمر کا تعلق ایک طرف داخلی شام کے دارالحکومت دمشق سے اور دوسری طرف وادیٔ فرات کے شہروں سے پیدا ہو گیا[6]، نیز سرحدی چوکیوں تک آمد و رفت کی سہولتیں مہیا ہو گئیں۔ حال میں ہوائی جہازوں کے ذریعے سے جو چھان بین کی گئی ہے، اس سے واضح ہوا ہے کہ دریائے دجلہ سے بحیرۂ احمر تک شام اور شرقی اردن میں قلعے بنے ہوئے تھے۔ اردن کے آثار اب بھی موجود ہیں[7]۔ ممتاز باشندگانِ تدمر نے اپنے ناموں کے ساتھ رومی نام لگانے شروع کر دیئے تھے، خود شہر کا نام نیا رکھا گیا۔ ایک خاندان نے اپنے سامی نام کے ساتھ سپٹیمس کا اضافہ کر دیا تھا یہ اس امر کا اظہار تھا کہ اس خاندان کو سیویرس کے دور میں شہرت ملی اور یہ غالباً پارتھیوں کی جنگ میں شاندار خدمات کا نتیجہ تھی۔

۱؎ Alexandros

۲؎ Sampsigeramus

۳؎ Hadriana Palmyra

۴؎ Colonia

۵؎ جین سٹارکی (Stracky) کی کتاب Paimyre, guide archeologique (مطبوعہ بیروت ۱۹۴۸ء) ص ۴۸

۶؎ ایلائس موسل (Musil) کی کتاب Arabia Deserta (نیویارک، ۱۹۲۷ء) ص ۵۱۴- ۵۱۶- نیز Palmyrena (نیویارک ۱۹۲۸ء) ص ۲۲۸/۲۳۸

۷؎ آرل سٹین کا مقالہ Surveys on the Roman Frontier in 'Iraq and Trans Jordan جو Geographical Journal میں طبع ہوا جلد ۹۲، ص ۲۸، ۴۲۸

جو شہر تدمر کے تابع تھے، ان میں سے، ان میں سے پہلا درجہ دور یوروپس کو حاصل تھا۔ یہ شہر تدمر کی بڑھتی ہوئی تجارت کی حفاظت کے لیے ایک حلقے کے طور پر آباد کیا گیا تھا۔ اس میں ایسے آثار ملے ہیں، جن کی آرائشی تصویروں میں تدمر کے سپاہی دکھائے گئے تھے۔

اس سلسلے کا دوسرا قابلِ ذکر شہر رصافہ تھا۔ جس کا نام بعد میں ایک مقامی مقدس بزرگ سرجیس کے نام پر سرجیو پولس رکھا گیا۔ سرجیس ایک سپاہی تھا، جس نے ڈایوکلیشئن کے زمانے میں (۳۰۳ء) شہادت پائی۔ چنانچہ یہ مدت تک شامی کلیسا کا مقدس بزرگ رہا۔ اسی وجہ سے سرجیو پولس ایک اہم زیارت گاہ بن گیا اور وہاں ایک اسقف بھی مقرر ہوا[۱]۔ رصافہ کی شکل میں اس مقام کا ذکر نویں صدی قبل مسیح کی ایک اشوری دستاویز میں بھی آیا ہے[۲]۔ یہ وہی رزف (دہکتا ہوا کوئلہ) ہے جسے سینخرب نے برباد کیا تھا[۳]۔ عربوں نے اسے الرصافہ بنا لیا اور آگے چل کر اس نے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ اموی خلفا یہاں گرمیوں کا موسم گزارا کرتے تھے[۴]۔

خاندانِ اُذَینہ

جس خاندان نے اپنے نام کے ساتھ سپٹیمس کا اضافہ کیا تھا، وہ تیسری صدی کے وسط میں تدمر کے اندر قیادت کی پوزیشن حاصل کر گیا۔ ۲۵۱ء[۵] میں اس خاندان کے رئیس سپٹیمس حیران بن اُذینہ کے لیے ایک مجسمہ تیار ہوا تھا۔ اس پر جو عبارت کندہ تھی، اس میں بتایا گیا تھا۔ "یہ شخص" تدمر "کا راس" (رئیس) اور مجلس نمائندگان کا ایک ممتاز فرد ہے[۶]۔" بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تدمر میں یہ پہلا شخص تھا، جس نے اپنے رومی منصب، یعنی رکنیت مجلس نمائندگان کے ساتھ لقب رئیس کا اضافہ کیا۔ اس کا باپ محض رکن تھا۔ جیسا کہ مختلف کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ منصب اسے الیگزانڈر سیویرس نے ۲۳۰ء یا ۲۳۱ء میں عطا کیا تھا جب وہ ایرانی جنگوں کے سلسلے میں تدمر پہنچا تھا۔ یہ حیران غالباً مشہور اُذینہ کا باپ تھا[۷]۔ افراد کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاندان اصلاً عرب تھا۔ ایک یونانی مورخ اُذینہ کو "حاکم شرقیین[۸]" بتاتا ہے۔ اس خاندان کے افراد حکومت کی شاخِ تنفیذ پر قابض تھے۔ خود حکومت کا اختیار عوامی مجلس کی تحویل میں تھا۔ جو لوگ اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دیتے تھے، انہیں مجلس مذکورہ اعزازات دیا کرتی تھی۔

حیران کے زمانے میں تدمر نے بین الاقوامی معاملات میں نمایاں حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت تک پرانے پارتھی حکمرانوں

۱۔ Ptolemy کتاب ۵، باب ۱۵۔ نیز پروکوپیس کتاب ۲، باب ۵۔ پامیر نیا ص ۲۶۰ - ۲۶۸ اور ۲۹۹ - ۳۲۶۔

۲۔ ملاحظہ ہو ونکلر کی جرمن کتاب اور ساؤ کی فرانسیسی کتاب۔

۳۔ سلاطین حصہ دوم باب ۱۹، آیت ۱۲، یسعیاہ باب ۳۷، آیت ۱۲۔

۴۔ یہ ذکر آگے آئے گا۔

۵۔ ملاحظہ ہو Chabot ص ۵۰

۶۔ اُذینہ کے معنی ہیں چھوٹا کان۔ اس نام نے یونانی زبان میں Odenathus کی شکل اختیار کی۔

۷۔ Saracens یہ لفظ شرقیین، یعنی اہلِ شرق کا بگاڑ ہے اور عام طور پر عربوں کے لیے مستعمل رہا۔ مثلاً سید امیر علی کی انگریزی تاریخ Short History of the Saracens

کی جگہ ایک نیا اور سرگرم خاندان برسرِ اقتدار آگیا تھا۔ یہ ساسانی تھے جن کی حکومت ۲۲۷ء سے ظہورِ اسلام تک قائم رہی۔ ۲۶۰ء میں ایرانی فوج نے شاپور اوّل کے زیرِ سرکردگی رومی لشکروں کو اوڈیسا کے قریب نہایت خوفناک شکست دینے کا فخر حاصل کیا۔ اس جنگ میں شہنشاہ ویلرین دشمن کے ہاتھ قید ہو گیا۔ ویلرین نے دو سال پیشتر اُذینہ کو قنصل کا درجہ عطا کیا تھا۔ اس کے بعد ایرانیوں کے حملے شمالی شام تک جا پہنچے، یہاں تک کہ انطاکیہ اور دوسرے شہر لُوٹے گئے۔ اس نازک موقع پر اُذینہ شامیوں اور عربوں کی خاصی بڑی فوج لے کر ویلرین کی امداد کے لیے میدان میں اُترا۔ اس نے ایرانیوں کو دریائے فرات کے کنارے شکست دی اور تعاقب کرتا ہوا ان کے دارالحکومت پرسی پولس کی دیواروں تک جا پہنچا۔ شاہی حرم کا بھی ایک حصّہ اس کے ہاتھ آگیا، مگر ویلرین کو قید سے نہ چھڑایا جا سکا۔ اس نے قید ہی میں وفات پائی۔ ایرانیوں نے اس کی کھال اتار کر اندر بھس بھرا اور اپنے ایک معبد میں اسے لٹکا دیا۔

اُذینہ نے نئے شہنشاہ کے ساتھ وفاداری کا سلسلہ قائم رکھا۔ ۲۶۲ء میں تدمر کے اس رئیس کو "قائدِ شرق[1]" کا خطاب عطا کیا گیا۔ گویا وہ سلطنت کے مشرقی حصے میں شہنشاہ کا نائب تھا۔ اس زمانے میں سلطنت کی حالت کمزور تھی اور ایک حد تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ پوری بربری دنیا، ایشیا اور یورپ سے دونوں جگہ رومی سلطنت پر حملے کر رہی تھی۔ اُذینہ کا ستارہ اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا، جب پُراسرار حالات میں اسے اور اس کے ولی عہد کو قتل کر دیا گیا (۲۶۶ء تا ۲۶۷ء) اس وقت وہ حمص میں ایک جشن منا رہا تھا۔ اُذینہ کا بھتیجا بھی اس سازش میں ملوّث تھا، جو غالباً روم نے تجویز کی تھی۔ اُذینہ بڑا جفاکش اور کسرتی بدن کا آدمی تھا، وہ زیادہ سے زیادہ مشقتیں جھیل لیتا تھا۔ ان تمام کھیلوں اور خوبیوں میں سب سے بڑھا ہوا تھا جنہیں عربوں کے نزدیک خاص طور پر احترام کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی شانِ کرم عالیشان دعوتوں اور مذہبی جشنوں میں بہ طور خاص نمایاں ہوتی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً عوامی حماموں کو تیل کے عطیے بھیجتا رہتا تھا۔

زنوبیا

تاریخی شخصیت کے لحاظ سے اُذینہ کی حیثیت اس صاحبِ عزم اور خوب صورت بیوہ کے سامنے ماند پڑ گئی، جو اپنے نابالغ بیٹے وہب اللات (عطیۂ لات[2]) کے نام پر حکومت کرتی رہی۔ زنوبیا کو تدمری کتبات میں "بت زبائی" (بنت عطیہ) کہا گیا ہے اور عربوں کی نیم افسانوی حکایتوں میں "الزباء" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر کی طرح بڑی جفاکش تھی مگر سبک جسم کی عورت تھی۔ اسے بھی شکار اور شہسواری کا بڑا شوق تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ دانت موتیوں کی طرح درخشاں تھے، آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔ وہ اپنے عالی شان دربار میں شاہی شان و تمکنت سے رہتی تھی اور دربار کے تمام آداب و قواعد وہی تھے جو شاہانِ ایران کے ہاں رائج تھے۔ حاشیہ نشین اسے بھی اسی طرح سجدہ کرتے تھے، جس طرح ایرانی بادشاہوں کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ رسمی تقریبوں میں وہ ارغوانی رنگ کا لباس پہنتی، جس کے حاشیے پر جواہرات ٹکے ہوتے تھے اور کمر پر ایک بکسوے کے ذریعے سے اسے باندھ لیا جاتا تھا۔ ملکہ کا ایک بازو مونڈھے تک بالکل برہنہ رہتا تھا، وہ سر پر خود رکھتی تھی اور ایک

---

[1] dux Orientis

[2] اسے یونانی میں Athenodorus کہا گیا۔

ایسی گاڑی میں بیٹھتی تھی، جس میں بیش قیمت جواہرات لگا دیئے گئے تھے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ مصر کی ملکہ کلیوپیٹرا کی رشتہ دار ہوں، وہ یونانی علوم کی مربی اور سرپرست تھی، خود آرامی اور یونانی زبانیں بولتی تھی اور ایک حد تک لاطینی بھی جانتی تھی۔ اس نے مشرق کی ایک تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ اس کے دربار کا علمی زیور لونگینوس[1] فلسفی تھا۔

زنوبیا بے شک و ریب کلیوپیٹرا سے زیادہ صاحبِ عزم اور باا‌ثر حکمران تھی۔ اس کے عہد میں تدمر نے واقعی ایک سلطنت کی شان پیدا کر لی اور اس میں شام اور شمالی عرب کے علاوہ ایشیائے کوچک کا بھی ایک حصہ شامل تھا۔ ۲۷۰ء میں اس کا سپہ سالار زبدہ عام روایت کے مطابق ستر ہزار فوج لے کر مصر پر بڑھا، وہاں سے غاصب کو نکالا اور اسکندریہ میں ایک جیش بٹھا دیا۔ اسکندریہ میں جو سکے مضروب ہوئے ان پر وہب اللات کے علاوہ اورلیان[2] کی تصویر تھی۔ آئندہ سال (۲۷۱ء) اسکندریہ میں جو سکے مضروب ہوئے، ان میں اورلیان کی تصویر موجود نہ تھی۔ گویا اس وقت تک زنوبیا کو پورا اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خود مختار قرار دینے کی اہل ہے اور کوئی اس کی قوت سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غرض وہب اللات کو "آگسٹس" اور زنوبیا کو "آگسٹا" کہا گیا ہے۔ شام کے سنگ ہائے میل پر شہنشاہ اور زنوبیا آگسٹا[3] کے نام ثبت تھے۔ تدمر کے بڑے ستونوں میں سے ایک بلند ستون پر ملکہ کا ایک مجسمہ ۲۷۱ء میں رکھا گیا تھا۔ اس پر اب تک یہ یونانی اور تدمری کتبہ پڑھا جا سکتا ہے۔

> یہ مجسمہ سیدہ سپٹیمیا زنوبیا کے لئے، جو شہرت و تقویٰ میں سب سے بڑھی ہوئی
> تھی، سپٹیمی زبدہ سپہ سالارِ اعلیٰ اور زبائی سالارِ قصرِ شاہی نے اگست ۲۷۱ء
> میں نصب کیا۔

پاس ہی ایک اور مجسمہ تھا، جس پر تدمری زبان میں مکتوب تھا:

> یہ سپٹیمیس اذینہ ملک الملک اور مجدد و شان شرق کے لیے، ممتاز سالاروں، زبدہ
> سپہ سالارِ اعلیٰ، اور زبائی سالارِ افواج تدمر نے اگست ۲۷۱ء میں نصب کیا۔

روم کی طرف سے پیش قدمی کا خطرہ تھا۔ تدمر کے دو مشہور سپہ سالاروں زبدہ اور زبائی نے پیش بندی کے طور پر ایشیائے کوچک میں پیش قدمی شروع کر دی اور انہوں نے انقرہ تک جا بجا فوجی چوکیاں قائم کر لیں یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ کیلیڈون نے بھی جو بیز نطیم کے سامنے تھا، تدمری فوجوں کا اثر محسوس کیا۔ اس طرح صحرا کی ملکہ نے رومی سلطنت میں سے اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے ایک سلطنت پیدا کی، جو بے نتیجہ رہی۔ چار سو سال بعد بنو امیہ یہی کام انجام دینے والے تھے۔

تدمر کا آخری دور

آخری رومی شہنشاہ اس پیش قدمی کے انسداد کے لیے تیار رہا۔ یہ اورلیان (۲۷۰ء تا ۲۷۵ء) کا زمانہ تھا، جس کے قومی بازوؤں نے فرنگوں، المانیوں، گاتھوں اور ایرانیوں کے حملوں کے بعد سلطنت کا بگڑا ہوا انتظام درست کر دیا تھا۔ ۲۷۲ء میں شہنشاہ نے

ایشیائے کوچک کی تدمری فوجوں کو شکست دے دی۔ پھر وہ شام کی جانب بڑھا۔ انطاکیہ اور سیلیوکیہ رومیوں کے طرفدار تھے، وہاں برائے نام مزاحمت سے سابقہ پڑا۔ تدمریوں کا رسالہ بھاری سامان جنگ سے لیس تھا۔ رومیوں کے سبک رفتار رسالے اور پیادہ فوج نے اسے مات دے دی۔ زنوبیا اور زبدہ پیچھے ہٹتے ہٹتے تدمر پہنچ گئے[1]۔ اب تدمری سلطنت کے دارالحکومت کا صحرائی راستہ حملہ آور دشمن کے لیے کھلا پڑا تھا۔ شہنشاہ کچھ دیر تک حمص میں ٹھہرا رہا تاکہ سورج دیوتا کے لیے نئے معبد مکمل ہو جائیں۔ روم واپس ہوا تو ایک خاص معبد سورج کے لیے بنوایا، جس میں سامی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

شہنشاہ تدمر کی طرف بڑھا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لطف یہ کہ اسے مصر سے فوجی امداد مل گئی، زنوبیا کا ہاتھ کسی نے نہ بٹایا۔ ایران بھی خاموش بیٹھا رہا۔ شہنشاہ نے پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ شہر حوالے کر دیا جائے اور بڑی ہلکی شرطیں پیش کی تھیں۔ یہ شرطیں ملکہ نے ٹھکرا دیں۔ پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ مقابلہ بے سود ہے۔ چنانچہ ایک سانڈنی پر سوار ہو کر رات کے وقت بھاگ جانے کی کوشش کی۔ سواروں نے تعاقب کیا۔ ملکہ دریائے فرات کو عبور کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ اسے جا لیا[2]۔ اس کا بیٹا پہلے شہر کی حفاظت میں جان دے چکا تھا۔ اب تدمر کے لیے حوالگی[3] کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ فاتح نے تمام بیش قیمت پارچے اور اعلیٰ درجے کی زیبائی چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ ان میں سے بعض روما کے معبد شمس کی زینت بنیں۔ آبادی پر تاوان لگایا گیا اور رومی گورنر مقرر کر دیا گیا جس کے ساتھ تیراندازوں کا ایک جیش تھا۔

جن مشیروں کو حمص میں اس لیے موت کی سزا دی گئی کہ انہوں نے ملکہ کو روما کا جوا اتار پھینکنے پر آمادہ کیا تھا۔ ان میں مشہور فلسفی، لونگینوس بھی شامل تھا۔ شہنشاہ واپس جاتا ہوا ہیلس پانٹ پہنچا تو خبر ملی کہ تدمر میں دوبارہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، رومی گورنر مارا گیا اور رومی جیش پر قابو پا لیا گیا[4]۔ یہ سنتے ہی شہنشاہ تیزی سے لوٹا اور یکایک تدمر پہنچ گیا۔ شہر کو تباہ کر ڈالا گیا اور باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ صرف بعل کا معبد چھوڑا گیا۔ زنوبیا اور اس کے ایک بیٹے کو روما لے گئے[5]۔ شہنشاہ ۲۷۴ء میں روما پہنچا تو اس کے جلوس فتح میں ملکہ کی سواری بھی شامل تھی، جس نے بہت سے جواہرات پہن رکھے تھے اور وہ سنہری زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ تودلی[5] کے نزدیک ایک بنگلہ اسے دے دیا گیا تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کا آخری دور گزارا۔ وہاں غالباً ایک رومی سے شادی بھی کر لی تھی اور اپنے پیچھے بچے بھی چھوڑے[6]۔

تدمر کی اہمیت ختم ہو گئی۔ ڈایوکلیشن (۲۸۴ء تا ۳۰۵ء) اور جسٹینین (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) کے ماتحت تھوڑی ہی مدت کے لیے اس کی رونق بحال ہوئی۔ پھر یہ رفتہ رفتہ گمنامی کی تاریکی میں ڈوب گیا، اگرچہ وہاں اسقف کا مرکز قائم ہو گیا تھا، لیکن صحرا پر باشندوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو صحرا نے ان پر غلبہ پا لیا۔ یہ کیفیت بارہا دہرائی گئی۔ دورِ حاضر میں تدمر کی پوری آبادی ایک پرانے

1. زوسی مس Zos mus کتاب ہذا۔
2. Vopiscus in Scriptnres کتاب ۲۷، باب ۲۸
3. Zosunus کتاب ۱،۱۔
4. ایضاً
5. Tivoii
6. Pollio in Scriptores

معبد میں سمائی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی سابقہ عظمت کا سایہ بھی نہ تھا اور اسلاف کے عظیم الشان شہر کے کھنڈر سامنے تھے ۱۹۲۹ء میں فرانسیسیوں نے لوگوں کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ معبد کو چھوڑ دیں اور اپنا گاؤں باہر بسالیں۔ وہاں ایک فوجی ہوائی مرکز اور شتر سواروں کے لیے بارکیں بھی تعمیر کی گئیں۔

آثارِ باقیہ

تدمر کے آثار صحرا میں نہایت مؤثر منظر پیش کرتے ہیں۔ دنیا کے جن لوگوں کو پرانے آثار سے محبت ہے، تدمر انہیں مسحور کر کے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بعل کا معبد ایک اونچے چبوترے پر کھڑا ہے۔ اسے میوزیم کی شکل دے دی گئی ہے۔ معبد کے سامنے وہ عظیم الشان محراب تھی، جس سے گزر کر ستونوں کی قطار والے حصے میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ ستونوں والا بازار ایک ہزار دو سو چالیس گز لمبا تھا۔ اسے پورے قصبے کا محور سمجھنا چاہیئے۔ اسی میں سے چھوٹی چھوٹی گلیاں آبادی کے اندر داخل ہوتی تھیں۔ اس حصے میں تین سو پچھتر یا اس سے بھی زیادہ ستون تھے۔ ہر ستون پچپن فٹ بلند تھا۔ ان میں سے قریباً ڈیڑھ سو یا تو پورے سلامت ہیں یا ان کا ایک حصہ ضرور سلامت ہے۔ ان میں سے زیادہ تر گلابی رنگ کے پتھر کے ہیں اور ان کے تاج میں کارنتھ کی طرز نمایاں ہے۔ چند ستون سنگ خارا کے ہیں، جن میں نیلے رنگ کے دھبے ہیں۔ یہ اسوان (مصر) سے آئے تھے۔ ستونوں کے ساتھ ان لوگوں کے مجسمے نصب کیے گئے تھے، جنہوں نے شہریوں کی اعلیٰ خدمات انجام دی تھیں۔ یہ تدمری تعمیر کی خصوصیت تھی۔ تدمر کے تمام مجسمے ایسے تھے کہ سامنے کا چہرہ پورا نظر آتا تھا اور کندھے پر کتبہ لگا ہوتا تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کو یونانی لباس پہنا دیا جاتا تھا، عوام کا لباس پارتھیوں کا سا تھا۔ ایک ساقی نے پارتھی لباس پہن رکھا تھا اور دوسرے نے رومی چغہ۔

عمارتوں کی طرح مقبرے بھی بڑے ہی عجیب ہیں۔ اہلِ تدمر کی اصطلاح میں انہیں "ابدی گھر" کہا جاتا تھا۔ شہر سے باہر اونچے برج بنا دیئے جاتے تھے، جن میں کئی درجے ہوتے اور ہر درجے میں مُردے رکھے جاتے تھے۔ اندر خوب رنگ کر دیا جاتا تھا اور اموات کی تصویریں پتھروں پر کندہ کر دی جاتی تھیں۔ دورا یورو پس میں بھی اس قسم کے کتبے موجود ہیں۔ تدمر اور دورا کی استرکاری فن کی تاریخ کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے وہ خلا پورا ہو جاتا ہے، جو آشوریہ اور بابل، نیز فونیقیہ کے قدیم سامی فن اور ابتدائی مسیحی فن میں پایا جاتا ہے۔ اس استرکاری کو سامنے رکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ رومی اور یونانی تصویروں پر مشرقی اثر کیونکر شروع ہوا اور کس طرح بیزنطینی فن کے لئے راستہ ہموار ہوا۔

زبان

تدمر کی حضارت شامی، یونانی اور ایرانی عناصر کا ایک عجیب مرکب تھی۔ یہاں کے اصل باشندے بے شبہ عرب تھے، جنہوں نے بول چال اور تحریر کے لیے آرامی زبان اختیار کر لی تھی، جو اس زمانے میں وہاں رائج تھی۔ آبادی کی اکثریت عرب ہی رہی، اگرچہ ان میں آرامی خون کی آمیزش ہو گئی تھی۔ مقامی کتبوں میں سے کوئی بھی ۳۰ ق م سے پیشتر کا نہیں، جب تدمر ایک ممتاز تجارتی مرکز بن رہا تھا۔ مسیحی صدی کے آغاز سے پیشتر سلیوکی شام کے باشندے آرامی تحریر میں جو رسم الخط استعمال کرتے تھے، وہی رسم الخط تدمری تحریر میں استعمال ہوتا رہا اور خود اہلِ تدمر نے اس میں کوئی نمایاں اختلاف پیدا نہ کیا۔ جن قوانین کا تعلق عوام سے تھا وہ یونانی و آرامی دونوں زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔ اس طرح آرامی رسم الخط کا پڑھنا آسان ہو گیا۔ تدمر سے ایک کتبہ ہنگری کو ملا اور ایک برطانیہ کو، جو کتبہ

برطانیہ کو ملا وہ تدمر کے ایک باشندے نے اپنی انگریز بیوی کو بطور تحفہ دیا تھا۔ تدمر کے تیر اندازوں کو رومی نہایت دور افتادہ مقامات پر بھیجتے رہے، مثلاً مراکش اور برطانیہ۔ اہل تدمر جو زبان بولتے تھے، اس کا تعلق مشرقی آرامی (ادیسا) سے نہیں، بلکہ مغربی آرامی سے تھا۔ یہ وہی زبان تھی، جو شام، نبطیہ اور مصر میں استعمال ہوتی تھی اور اس زبان سے مختلف نہ تھی، جو حضرت مسیحؑ بولتے تھے۔ جن لوگوں کا درجۂ حضارت بلند تھا، وہ یونانی و آرامی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ عربی زبان صرف کاروباری آدمی سمجھتے تھے اور بعض اہلِ تدمر اسے ایک مقامی بولی کی حیثیت میں استعمال کرتے تھے۔

لونگینوس

تدمر میں علم و فضل کے اعتبار سے کوئی آدمی دیونیسیوس کاسیوس لونگینوس[۱] (۲۱۳ء۔ ۲۷۳ء) پر فائق نہ تھا۔ لونگینوس غالباً حمص کا باشندہ تھا۔ اس نے پہلے اسکندریہ میں، بعد ازاں ایتھنز میں تعلیم پائی، جہاں اس کے بہت سے شاگردوں میں سے ایک شاگرد فرفیریوس بھی تھا۔ اس کی ماں شامی تھی اور وہ سریانی زبان جانتا تھا۔[۳] اپامیا کا امیلیوس بھی لونگینوس کا معاصر تھا۔ زمانہ ایسا تھا، جس میں زورِ خطابت، جدّتِ تراکیب اور عجیب و غریب لفظی ہتھکنڈوں پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ لونگینوس لفظی شعبدہ بازی کے اسی دور میں علم کا ایک بلند مینار تھا اور اس جیسا کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ اس کے علم کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ایک معاصر نے اسے "زندہ کتب خانہ" اور "چلتا پھرتا میوزیم" قرار دیا تھا۔ لونگینوس ہی نے ملکہ زنوبیا کو یونانی ادب سکھایا تھا اور بعد ازاں وہ مشیر بن گیا تھا۔ افسوس کہ ہم تک اس کی تحریرات کے صرف بعض اجزا اور اقتباسات پہنچے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قدیم لامذہبی مسلک پر قائم رہا، اگرچہ یہودیت اور نصرانیت سے اسے کوئی عداوت نہ تھی۔ اورلیان نے اسے موت کی سزا دی۔ اس سزا کو اس نے ایسی دلجمعی اور خوشی سے قبول کر لیا، جو صرف سقراط کے لیے زیبا تھی۔[۴]

تدمر کے معبود

تدمر کے دارالاصنام میں شام، عرب، ایران اور بابل کے دیوتا جمع تھے۔ ان میں سے بعض کو لاطینی نام دیئے گئے تھے۔ حقیقت کے اعتبار سے تدمر کا مذہب شمالی شام اور اس کے صحرائی علاقے سے مختلف نہ تھا۔ بعل کو تمام دیوتاؤں پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ اصلاً سورج دیوتا نہیں تھا، بلکہ ایک کائناتی دیوتا تھا۔ جو بابل سے چلا اور وہاں کے مردوخ کا مثنیٰ تھا۔ اسے انسانوں کی تقدیر کا مالک اور آسمانی دیوتاؤں کا کارفرما مانا جاتا تھا۔ بڑا معبد اسی کے لیے وقف تھا۔ بعد میں اسے زیوس قرار دے دیا گیا۔ تدمر میں ایک اور معبد بعل شمین کے لیے مخصوص تھا۔ یہ بعل آسمانوں کا مالک مانا جاتا تھا۔[۵] اس کے لیے ایک معبد دورا میں بھی بنا تھا، جہاں ۳۲ء کے ایک کتبے میں اس کا ذکر آیا ہے۔ تدمر میں کئی ایسی قربان گاہیں ملیں، جو شمس[۶] کے لیے وقف تھیں۔ اس سورج دیوتا کو بعض اوقات

۱۔ Dionysius Cassius Longinus

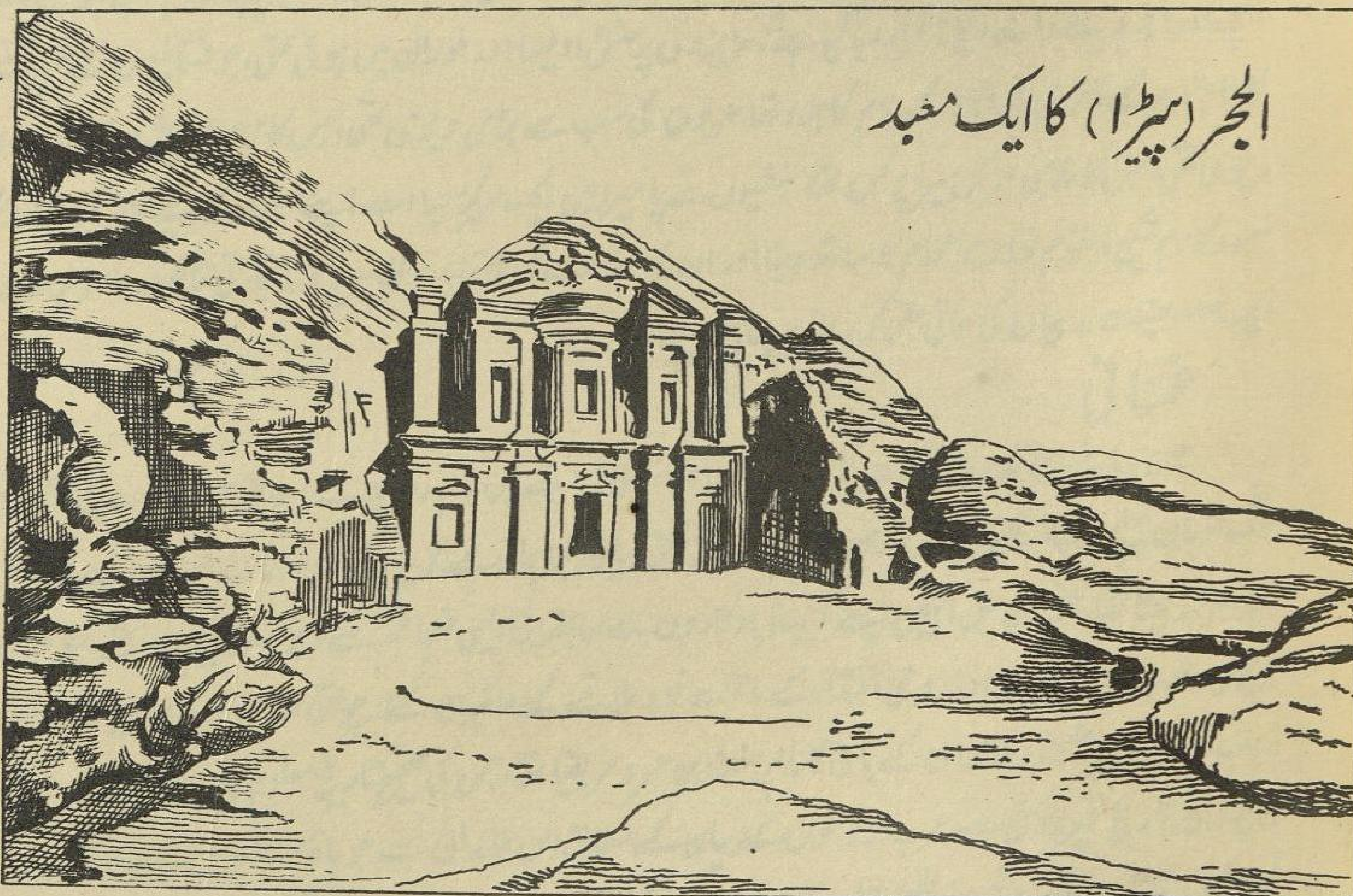
۲۔ Vopiscus in Scriptores

۳۔ Philostratus and Eunapius

۴۔ Zosimus. Bk. I

۵۔ دیکھیے Chabot نیز رسالہ Syria جلد ۱۴ (۱۹۳۳) کا مقالہ

۶۔ شمس = سورج دیوتا۔



الحجر (پیٹرا) کا ایک معبد

بعل کے ایک طرف رکھا جاتا تھا اور چندر دیوتا کو دوسری طرف، چندر دیوتا کا نام عجل بول (بعل کا بچھڑا) تھا[1]۔ اس کی بعض شکلیں ایسی دیکھیں کہ اس کے کندھوں پر ہلال بنا ہوا تھا[2]۔ ایک دیوتا کا نام یرخی بول تھا۔ نام کے پہلے حصے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی چندر دیوتا ہی ہوگا۔ لیکن اس دیوتا کے ہاں استخارے کیے جاتے تھے، گویا یہ اپولو کے برابر تھا۔ ملک بعل (بعل کا فرشتہ) پیغام بردار سمجھا جاتا تھا اور اس کی حیثیت ہرمس دیوتا کی سمجھی جاتی تھی۔ ایک قربان گاہ ایسی بھی ملی ہے، جو بے نام دیوتا کے لیے مخصوص تھی۔ اسے صالح اور رحیم سمجھا جاتا تھا۔

کتبات میں بہت سی ایسی چیزیں ملتی ہیں جو ارصو[3] اور عزیزو[4] کے لیے وقف تھیں۔ ظاہر ہے کہ نام عربی الاصل تھے۔ انہیں بہت اچھے اور اجر دینے والے دیوتا قرار دیا گیا ہے[5]۔ عزیزو کی پرستش اویسا اور حوران میں ہوتی تھی، جو غسانیوں کے شہر تھے۔ لات جس کا نام تدمر کے آخری بادشاہ کے نام کا جزو تھا۔ عربوں کی سب سے بڑی دیوی تھی، جس کا نام عترعتہ (اتارغانس) تھا[6]۔ یہ آرامی دیوی تھی، جس کا مذہبی مرکز ہیراپولس تھا۔ نبطیوں نے پامیرا میں ایک مرکز عبادت اپنے معبود کے لیے قائم کیا تھا (۱۳۲ء) اس معبود کا نام شیع القوم تھا (جو عوام کا ساتھ دیتا اور ان کی حفاظت کرتا تھا)۔ بہ ظاہر دیوتا تجارتی قافلوں کا سرپرست تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جاتی تھی کہ یہ شراب نہیں پیتا[7]۔

غسانی

جس زمانے میں تدمر کی سلطنت کا سلسلہ بگڑ رہا تھا، اسی زمانے میں عام روایت کے مطابق جنوبی عرب کے ایک قبیلے کے لوگ حوران پہنچ رہے تھے۔ یہ بنو غسان تھے، جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس زمانے میں یمن سے نکلے، جب بند مآرب پہلی مرتبہ پھٹا تھا۔ حوران میں انہیں اپنے عرب آبادکاروں سے سابقہ پڑا، یعنی ضجاعم سے، جو قبیلہ سلیم سے تھے۔ بنو غسان نے ان عربوں سے امارت چھین لی اور رومی اقتدار کے ماتحت خود علاقے کے حاکم بن گئے۔ چوتھی صدی عیسوی میں غسانیوں نے مسیحی مذہب قبول کرلیا[8]۔ اس خاندان کے بانی کا نام جفنہ ابن عمرو مزیقیا تھا، جس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کی پوری تاریخ غیر واضح ہے۔ عرب مؤرخوں کے بیان کے مطابق اس خاندان سے جو بادشاہ ہوئے۔ ان کی تعداد گیارہ سے تیس تک بتائی جاتی ہے[9]۔ بیز نطینی تاریخ میں جو امر دلچسپ ہے، وہ غسانیوں کا تعلق قسطنطنیہ سے ہے۔ صرف آخری

1. Chabot ص ۷۱-۷۳ Alamoundaros   2. ایضاً ص ۶۵
3. Arsu کتبات صفا میں اسے رضو کہا گیا ہے یعنی رحمت، رضا۔
4. Azizu عربی بہ معنی غالب
5. ملاحظہ ہو Chabot ص ۶۹
6. Athar-atheh ملاحظہ ہو لگ۔ ص ۲۶۸۔   7. ملاحظہ ہو Chabot ص ۶۷-۶۸
8. شام و لبنان کے بعض مسیحی قبائل مثلاً آل معلوف اور آل عطیہ اپنا سلسلہ نسب بنو غسان تک پہنچاتے ہیں۔
9. ابن قتیبہ "المعارف"، المسعودی "مروج الذہب"، حمزہ اصفہانی کی کتاب تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء، ابو الفدا کی تاریخ اور Costi K. Zurayk کی کتاب:
The Princes of Ghassan from the House of Gafna

پانچ بادشاہوں کے حالات زیادہ تفصیل سے معلوم ہیں، جو ظہورِ اسلام سے بیشتر کی صدی میں گزرے۔

الحارث بن جبلہ

ان بادشاہوں میں پہلا اور سب سے بڑا الحارث بن جبلہ[1] (۵۲۹ء - ۵۶۹ء) تھا، جو ۵۲۸ء میں پہلے پہل تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوا اور اس حالت میں نمودار ہوا کہ الحیرہ لخمی بادشاہ المنذر[2] ثالث کے خلاف لڑ رہا تھا۔ لخمی خاندان بھی جنوبی عرب ہی سے آیا تھا اور وہ ایرانی سلطنت کی مغربی سرحد پر آباد ہوا تھا۔ ایرانیوں نے ان کے علاقے کو اس طرح درمیانی ریاست کے طور پر استعمال کیا، جس طرح بیزنطینی سلطنت غسانیوں کو استعمال کرتی رہی تھی۔ شہنشاہ جسٹینین نے الحارث کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے شام کے تمام عربی قبیلوں کا سردار تسلیم کر لیا اور اسے دو لقب دیئے ایک فیلارک[3] (رئیس قبیلہ)، دوسرا بطریق[4]۔ شہنشاہ کے بعد یہ سب سے اونچے لقب تھے۔ عربوں نے ان لقبوں کا ترجمہ ملک (بادشاہ) کیا۔ غالباً غسانی بادشاہ اپنے آپ کو نبطی بادشاہوں کا جانشین سمجھتے تھے۔

بیزنطینی تاج کی وفاداری میں الحارث بدستور لخمیوں سے لڑتا رہا۔ سامریوں نے بغاوت کی تو اسے فرو کرنے میں بھی الحارث نے امداد دی۔ جب بیزنطینی فوج بلیساریوس کی سرکردگی میں جنگ کے لئے دوآبہ دجلہ و فرات میں پہنچی تو اس وقت بھی الحارث اس فوج میں شامل تھا[5]۔ ۵۴۴ء میں اس کا ایک بیٹا المنذر کے ہاتھ گرفتار ہو گیا اور اسے عزیٰ[6] کے لیے قربان کر دیا گیا۔ عزیٰ دیوی افرودیت دیوی کا مثنیٰ تھی[7]۔ دس سال بعد کنسرین (چالس) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ میں الحارث نے اپنے بیٹے کا بدلا لیا اور المنذر لخمی کو اس جنگ میں قتل کر دیا۔ غالباً یہی جنگ ہے، جسے عربی تاریخوں میں معرکہ حلیمہ قرار دیا گیا ہے۔ حلیمہ الحارث کی بیٹی تھی، جس نے جنگ سے پیشتر اپنے والد کے فوجیوں کو اپنے ہاتھ سے خوشبو لگائی تھی۔ ۵۶۳ء میں الحارث جسٹینین کے پاس پہنچا اور ایک دبدبے والے بدوی شیخ کی حیثیت میں درباریوں پر گہرا اثر چھوڑ آیا[8]۔ یہ اثر اس سے مختلف نہ تھا جو سعودی شہزادوں نے سیاحتِ امریکہ میں اہلِ امریکہ پر چھوڑا ہے۔ سالہا سال گزر گئے۔ جسٹینین کا بھتیجا اور جانشین جسٹن شہنشاہ تھا۔ شاہی محل کا داروغہ جب کبھی اسے خاموش کرانا چاہتا تو صرف یہ کہتا "چپ رہیے ورنہ ابھی

---

[1] اسے بعض اوقات الحارث ثانی کہا جاتا ہے، تاکہ یہ اپنے دادا الحارث اوّل بن ثعلبہ سے ممتاز رہے، جو جفنہ کا پڑپوتا تھا۔ مؤرخ اسے "عرج" یعنی لنگڑا قرار دیتے ہیں۔

[2] یونانی مؤرخوں نے المنذر کو Alamoundstor لکھا ہے۔ پروکوپیس نے المنذر کو اس طرح لکھنے کے علاوہ الحارث کو Al-Harith ibn-Jabalah لکھا ہے۔

[3] Phylarch یعنی رئیس قبیلہ

[4] Patricius بطریق

[5] پروکوپیس کتاب ۲، باب ۱۶

[6] ایضاً کتاب ۲، باب ۲۸

[7] الکامل، ابن الاثیر (مترجمہ ٹان برگ) جلد اوّل ص ۴۰۰، ابن قتیبہ ص ۳۱۴ - ۳۱۵ - ابوالفدا: جلد اوّل ص ۸۴۔

[8] ملاحظہ ہو Theophanes کی کتاب Chronographia مطبوعہ لائپزگ ص ۲۴۰

الحارث کو بلا لوں گا۔[1]

جب الحارث قسطنطنیہ میں تھا تو اس نے یعقوب البرداعی ساکن اویسا کو شام کے اس کلیسا کا اسقف مقرر کرا لیا، جو وحدتِ فطرتِ مسیحؑ[2] کے حامیوں نے قائم کر رکھا تھا۔ خود الحارث اور اس کے بیٹے کے عہد میں اس فرقے کا عقیدہ شام کے اندر خوب پھیلا، کہا جاتا ہے کہ یعقوب نے ایک لاکھ پادری اور نواسی اسقف صرف شام میں مقرر کیے۔ غسانی سلطنت اپنے انتہائی عروج میں پیٹرا سے اذرعاقہ تک پھیلی ہوئی تھی، جو تدمر کے شمال میں واقع ہے اور اس میں البلقا، الصفا[3] اور حران شامل تھے۔ بصریٰ میں ایک گرجا ٥١٢ء میں تعمیر ہوا تھا، یہی مقام پوری غسانی سلطنت کا مذہبی مرکز بن گیا اور یہی وہاں کا مشہور تجارتی مرکز تھا۔ غسانیوں کا سیاسی مرکز ابتدا میں کسی ایک مقام پر مقرر نہ تھا، لیکن آگے چل کر الجابیہ[4] کو مرکز بنا لیا گیا، جو علاقہ جولان میں واقع تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے جنوبی حوران کا مقام جلق[5] مرکز بنا رہا۔

المنذر

الحارث کے بعد اس کا بیٹا المنذر (٥٦٩ء – ٥٨٢ء) تخت نشین ہوا، اس کی تخت نشینی کے قریبی دور ہی میں رسول اللہ صلعم کی ولادت ہوئی۔ بیٹا باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔ اس نے مذہبی اعتبار سے یعقوبیوں کی حمایت کی، سیاسی لحاظ سے لخمیوں کے خلاف لڑتا رہا، جو ایران کے باجگزار تھے۔ یعقوبی عقیدے کے لیے المنذر کی حمایت شہنشاہ جسٹن کو راہِ صواب کے خلاف نظر آئی، چنانچہ دونوں کے تعلقات میں اجنبیت پیدا ہوئی، بلکہ جسٹن، المنذر کی سیاسی وفاداری کو بھی شبہے کی نظر سے دیکھنے لگا۔ انجام کار اس نے شام کے گورنر کو خط لکھ دیا کہ المنذر سے نجات حاصل کی جائے۔ ایک خط المنذر کو بھی لکھا گیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ شام کے گورنر سے ایک ضروری مشورے کے لیے ملاقات کرے۔ یہ خط بڑے شائستہ انداز میں لکھا گیا تھا، لیکن شہنشاہ کے سیکرٹری نے گورنر کے نام خط غلطی سے المنذر کو بھیج دیا۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد شہنشاہ اور المنذر کے درمیان مصالحت ہو گئی اور بوڑھا غسانی رئیس اپنے دو بیٹوں کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا (٥٨٠ء) بیزنطینی سلطنت کے نئے شاہنشاہ طائبیریس ثانی نے بڑے

---

١ جان ساکن افی سوس کی کتاب Ecclesiastical History مترجمہ پین سمتھ ص ١٧١

٢ اس سے مقصود مسیحیوں کا وہ فرقہ ہے جسے مونوفی سائٹ Monophysite کہتے تھے جو حضرت مسیحؑ کی دو فطرتوں (الوہی اور بشری) نہیں بلکہ ایک فطرت کا قائل تھا یہ فرقہ آگے چل کر اسی یعقوبی البرداعی کے نام سے یعقوبی مشہور ہوا

٣ آتش فشاں پہاڑوں کا یہ خطہ اس سے بہت پہلے عربوں کے قبضے میں تھا، جنہوں نے چھ ہزار کے قریب کتبے اور یادگاریں چھوڑیں، یادگاروں پر ایسی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن میں نیزوں والے ہرنوں کا شکار کھیلتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، کتبوں میں "یشع" کا ذکر بھی ہے اور یہ وہی نام ہے، جو عبرانی میں یشوع، آرامی میں یشوعا عربی میں یسوع ہے۔ اللات اور المناۃ کے نام بھی آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو A Study of the Lihyanite and Thamudic Inscriptions

٤ وساد کی کتاب Topographic ص ٣٣٧، ٣٣٣۔ دمشق کے مغربی دروازے کا نام ابتک باب الجابیہ ہے۔

٥ یہ غالباً الکسوہ ہے، جو دمشق سے دس میل جنوب میں ہے۔ دیکھئے وساد کی مذکورہ بالا کتاب نیز بیوں کا تانی کی کتاب Annali dell' Islam جلد سوم ص ١٢٨۔

احترام سے اس کا استقبال کیا، بلکہ کلاہ کی جگہ ایک تاج بھی المنذر کو پہنایا۔ اسی سال المنذر نے لخمیوں کے دارالحکومت الحیرہ کو جلا دیا۔[1] دو سال بعد وہ شام کے گورنر کی دعوت پر حوران کے ایک کلیسا کی تقریب انتساب میں شریک ہوا وہاں اسے گرفتار کر لیا گیا اور بیوی، نیز تین بچوں کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، وہاں سے اسے سسلی پہنچا دیا گیا، جفنیوں کو جو رقم سالانہ بطور امداد ملتی تھی وہ بند ہو گئی اور ان کے ساتھ رشتے توڑ لیے گئے۔

افراتفری کا دور

المنذر کے بڑے بیٹے النعمان کی سرگردگی میں صحرائی علاقے سے رومی شام پر متعدد حملے ہوئے۔ آخر اسے بھی المنذر کی طرح فریب دے کر گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا (۵۸۲ء)۔ اس پر غسانی قومیت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا اور سلطنت کئی چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی، ہر حصے کا الگ الگ امیر تھا۔ ان میں سے بعض نے ایران سے وابستگی پیدا کر لی بعض خود مختار رہے۔ ایسے بھی تھے، جنہوں نے بیزنطینی سلطنت سے مل جانا قرین مصلحت سمجھا۔ یہاں پہنچ کر یونانی تاریخ نگاروں کو غسانیوں سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی اور عرب مؤرخوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ واضح اور قطعی نہیں۔ افراتفری اور بدنظمی جاری تھی، یہاں تک کہ ایران نے ۶۱۱ء تا ۶۱۴ء میں شام کو مسخر کر لیا۔

چودہ سال بعد ہرقل نے ایرانیوں کو ملک سے باہر نکالا۔ غالباً اس نے پرانی غسانی سلطنت بحال کر دی۔ مسلمانوں نے جنگ شروع کی تو سابقہ غسانی سلطنت کے قبائل عام بیانات کے مطابق بیزنطینیوں کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ آخری غسانی امیر جبلہ بن الایہم یرموک کی فیصلہ کن جنگ (۶۳۶ء) میں مسلمان حملہ آوروں کے خلاف لڑا تھا[2] لیکن بعد میں وہ اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ پہلی مرتبہ حج کے لیے گیا تو ایک بدو کا پاؤں اس کے کپڑے پر پڑ گیا اور اس نے بدو کو تھپڑ مارا۔ خلیفہ کے پاس مقدمہ پہنچا تو یہ فیصلہ صادر ہوا کہ جبلہ یا تو بدلے میں بدو کا تھپڑ کھائے یا جرمانہ ادا کرے۔ جبلہ اسلام سے منحرف ہو کر بھاگا اور بیزنطیم پہنچ گیا۔[3]

غسانی دربار کی شان و شوکت

جفنی دربار کی درخشاں شان و شوکت کو دورِ جاہلیت کے متعدد شعرا نے بقائے دوام کا لباس پہنا دیا ہے اور غسانی ملوک ان شاعروں کی سرپرستی کا خاص اہتمام کرتے رہے۔ ان شاعروں میں سے ایک مشہور نابغہ ذبیانی تھا۔ نابغہ لخمیوں سے ناراض ہوا تو غسانیوں نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا۔ غسانیوں کی طرف سے نابغہ پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہی۔ نابغہ ان کی مدح و ستائش کے گیت گاتا رہا۔ ایک شعر اکثر دہرایا جاتا ہے جس میں نابغہ نے ان کی فوجی قوت کی ستائش کی ہے:

ولا عیب فیہم غیر انّ سیوفہم !!
بہنّ فلولٌ من قراع الکتائب

---

[1] الطبری: تاریخ الرسل والملوک مترجمہ گوئیجے جلد اوّل، ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب الاغانی جلد دوم ص ۷۔

[2] البلاذری: فتوح البلدان مرتبہ گوئیجے ص ۱۳۰، مترجمہ فلپ۔ حتی بنام Origins of the Islamic State ص ۲۰۸، ۲۰۹

[3] العقد الفرید مصنفہ ابن عبد ربہ جلد اوّل ص ۱۴۰ - ۱۴۱، نیز ابن قتیبہ ص ۳۱۶۔

دیوان کا قصور نہیں ـــــ سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں دشمنوں کے جتھوں کو مارتے مارتے کند ہو گئی ہیں[1]

ایک اور شاعر حسان رضؓ ابن ثابت مدنی تھے، جو عہد رسالت کے سب سے بڑے شاعر بننے سے پیشتر غسانیوں کے دربار میں بڑے اچھے دن گزار چکے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ انھیں غسانیوں سے نسبی تعلق ہے۔ حضرت حسانؓ کی روایت سے صاحب الاغانی[2] نے جبلہ بن الایہم کے عہد کی حالت بیان کی ہے، جس سے ہم شان و شوکت کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

"میں نے وہاں دس گانے والی عورتیں دیکھیں جن میں سے پانچ ستار پر یونانی گیت گا رہی تھیں اور پانچ اہل حیرہ کے سُر الاپ رہی تھیں۔ وہاں عرب گانے والیاں بھی موجود تھیں، جو مکّہ اور دوسرے مقامات سے آئی تھیں۔ جب جبلہ شراب پینے کے لیے بیٹھتا تو اس کے لیے مہندی، چنبیلی اور دوسرے عمدہ خوش بو والے پھولوں کا فرش بچھا دیا جاتا۔ سونے اور چاندی کے ظروف میں عنبر اور مشک سلگا دیا جاتا۔ سردیوں کا موسم آتا تو اسے آرام پہنچانے کے لیے عود الطیب کی لکڑی جلائی جاتی۔ گرمیوں کا موسم آتا تو برف استعمال کی جاتی۔ گرمیوں کے موسم میں خود جبلہ اور اس کے درباری خاص ہلکا لباس پہنتے، جو اسی غرض سے بنایا جاتا۔ سردیوں کے موسم میں سفید رنگ کے سمور یا اسی قسم کے دوسرے لباس استعمال کیے جاتے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کبھی اس کی صحبت میں نہ گیا جب تک اس نے اپنا لباس خاص مجھے نہ دیا[3]۔"

جب جبلہ نے اسلام قبول کیا اور وہ اپنے درباریوں کے ساتھ رسمی طور پر مدینہ میں داخل ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے آبائی تاج پہن رکھا تھا۔ یہ تاج دو موتیوں سے مزین تھا، جو کسی زمانے میں حارث ابن جبلہ کی ماں کے آویزوں میں ٹنکے ہوئے تھے[4]۔ یہ موتی کبوتری کے انڈے کے برابر تھے اور عربی ادبیات میں ضرب المثل بن گئے[5]۔

اگرچہ یہ روئدادیں ایک حد تک مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے پتا چلتا ہے کہ اقتصادی حالت اچھی تھی۔ یقینی ہے کہ غسانیوں نے بارش کے پانی اور زیر زمین پانی کے ان تمام وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے بند و بست کر لیا تھا، جو اہل شام نے رومیوں کے دور حکومت میں مہیا کر لیے تھے، بعد ازاں وہ ضائع ہو گئے۔ حوران کی مشرقی اور جنوبی ڈھلانوں پر کوئی تین سو قصبوں اور دیہات

---

[1] دیوان النابغہ الذبیانی نیز چارلس جے لائل Lyall کی کتاب Translations of Ancient Arabian Poetry ص ۹۶۔

[2] جلد ۱۶، ص ۱۵، اگرچہ بیان مشکوک ہے تاہم یہ شاعر کے قصائد پر مبنی ہے عقد جلد اوّل ص ۱۴۲

[3] نکلسن کی کتاب A Literary History of the Arabs دوسرا ایڈیشن ص ۵۳

[4] الاغانی جلد ۱۴ ص ۱۴ میں اس کا نام "ماریہ" بتایا گیا ہے، جسے آرامی اثر کے تحت خاتون کا مترادف سمجھنا چاہیے، نہ کہ ذاتی نام۔ غالباً اس خاتون کا نام "مادیہ" ہو گا جیسا کہ الاغانی جلد ۱۶ ص ۱۰۳ پر بتایا گیا ہے۔

[5] المیدانی کی کتاب مجمع الامثال جلد اوّل ص ۱۵۶۔

کے باقیات مندرجۂ بالا حقیقت کے گواہ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ غسانیوں نے اپنے پیشرو نبطیوں کی طرح شامی حضارت کے بعض نہایت اہم عناصر اپنے ابتدائی ہم قوموں یعنی عربوں تک اور خصوصاً اہلِ حجاز تک پہنچائے، جو آگے چل کر اسلام کا گہوارہ بنا۔ علاوہ بریں ان عربی الاصل سرحدی شامی ریاستوں نے، جن میں سب سے آخری ریاست غسانیوں کی تھی، آگے چل کر اسلام کے زیرِ علم عربوں کے لیے تسخیرِ شام کا راستہ ہموار کر دیا۔ گویا ریاستیں وسیع اور عظیم الشان نمائش کی ابتدائی جھلک تھیں، جو بروے کار آنے والی تھی۔

حصّۂ چہارم

عربی دور

تیسواں باب

شام آغوشِ اسلام میں

صبحِ ظہورِ اسلام

عہدِ قدیم کے اواخر میں دو واقعے ایسے پیش آئے، جو اہمیت میں سب پر فوقیت لے گئے۔ اوّل ٹیوٹانی (جرمانی) قبائل کی نقل و حرکت، جس کی وجہ سے مغربی رومی سلطنت تباہ ہوئی، دوم اسلامی عربی قبائل کا انفجار، جنھوں نے ایک طرف ایرانی سلطنت کو تباہ کیا اور دوسری طرف بیزنطینی سلطنت سے اس کے بہترین صوبے چھین لیے۔ دونوں میں سے آخری واقعہ زیادہ عظیم الشّان تھا۔ جس وقت یہ پیش آیا، صرف ایرانی اور بیزنطیم کی سلطنتیں عالمی طاقتیں تھیں، اور عرب گمنامی کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جو لوگ اس وقت زندہ تھے، انھیں کیونکر خیال ہو سکتا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ واقعی دائرۂ امکان میں تھا!

بیزنطینی سلطنت کے شہنشاہ ہرقل کا آبائی وطن اوببار الرّھا، شمالی شام) تھا۔ ایرانیوں نے شام بیزنطینی سلطنت سے چھین لیا تھا۔ خسرو ثانی (شہنشاہ ایران) طوفان کی طرح اٹھا تھا اور پورے ملک میں پھر نکلا تھا (۶۱۱ء تا ۶۱۴ء) وہ جہاں جہاں گیا، اپنے ساتھ غارت گری و تباہ کاری لے گیا۔ اس نے دمشق کو بُری طرح لُوٹا، نیز قتل و خونریزی اور قید و بند سے ملک کی آبادی گھٹا دی۔ یروشلم کے کلیسا مزارِ مقدس (کنیسۃ القیامہ) کو کھنڈر کی حالت میں چھوڑ دیا۔ اس کی تمام بیش قیمت چیزیں مالِ غنیمت کے طور پر اٹھا لیں، ان میں وہ حقیقی صلیب بھی شامل تھی، جو حضرت مسیحؑ سے منسوب تھی۔ ہرقل نے چھ سال کی جد و جہد کے بعد، جس میں اسے شکستیں بھی ہوئیں۔ ۶۲۶ء میں شام ایرانیوں سے واپس لے لیا۔ ۱۴ ستمبر ۶۲۹ء کو وہ بھی حقیقی صلیب لے کر فاتحانہ یروشلم میں داخل ہوا[1]۔ پوری مسیحی دنیا نے اسے نجات دہندہ اور مشرقی رومی سلطنت کے اتحاد کا بحال کنندہ سمجھتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

عربوں کے ابتدائی چھاپے

اس اثنا میں تین ہزار عربوں کے ایک جیش نے موتہ پر حملہ کیا[2]، جو بحیرۂ لوط کے جنوبی گوشے کے مشرق میں واقع ہے۔ اس جیش کے سپہ سالار زید بن حارثہؓ تھے، جو رسول اللہ (صلعم) کے منہ بولے بیٹے تھے۔ حملے کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ رسول اللہ (صلعم) نے جو قاصد بصریٰ بھیجا تھا، غسانی امیر نے اسے شہید کر دیا تھا، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ دین میں نئے نئے وارد ہوئے تھے، ان

---

[1] اس روز آج کل بھی لبنان کے مسیحی خوشیاں مناتے ہیں۔

[2] موتہ شرقِ اردن میں ہے اور کرک کے جنوب میں دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ الائس میوسل Alois Musil وہاں گیا تھا دیکھیے اس کی کتاب، Arabia Petraea جلد اوّل، ص ۱۵۲

کے لیے مالِ غنیمت حاصل کیا جائے۔ اس مالِ غنیمت میں وہ تلواریں بھی شامل تھیں، جو "شرقیہ" کہلاتی تھیں اور موتہ ہی کے نواح میں بنتی تھیں[۱] سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے کی جس پالیسی کا آغاز رسول اللہ (صلعم) نے کیا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ نئے مذہب کو ایمان لانے میں زیادہ ہر دل عزیز بنایا جائے[۲]۔ زیدؓ میدانِ جنگ میں شہید ہو گئے۔ ان کی فوج کے باقی حصّے کو خالد بن الولیدؓ مدینہ واپس لائے، جو خود آگے چل کر جنگجو اسلام کے زبردست مجاہد بننے والے تھے۔ اہل موتہ کے نزدیک اس حملے کی حیثیت ویسے ہی بدوی چھاپوں کی تھی، جن سے اکثر انھیں واسطہ پڑتا رہتا تھا اور ان کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ دراصل یہ حملہ اس طویل کارزار میں "پہلی گولی" کی حیثیت رکھتا تھا، جو اس وقت تک ختم نہ ہوا۔ جب تک بیزنطینی سلطنت نے حوالگی قبول نہ کی اور گرجوں میں مسیحؑ کے نام کی جگہ رسول عربی (صلعم) کے نام کو نہ ملی[۳]

۶۳۰ء میں رسول اللہ صلعم خود ایک مہم کے ساتھ تبوک[۴] تشریف لے گئے، جو شمالی حجاز میں واقع ہے۔ وہیں چند روز قیام فرما کر اردگرد کی آبادیوں سے گفت و شنید شروع کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سب نے اطاعت قبول۔ ان کی حفاظت کا ذمّہ اٹھا لیا گیا، املاک انھیں کے پاس رہے، یہ اجازت بھی دے دی گئی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، البتّہ ان کے ذمّے سالانہ خراج کی ایک رقم لگا دی گئی۔ ان آبادیوں میں سب سے پہلی ایلہ تھی، جو خلیج عقبہ کے سرے پر واقع تھی، یہاں کی آبادی مسیحی تھی۔ ایلہ کے جنوب میں خلیج ہی پر ایک مقام مقنا تھا، جس کی یہودی آبادی کا پیشہ عموماً پارچہ بافی اور ماہی گیری تھا۔ ایک اور مقام اذرح تھا، جو پیٹرا اور معان کے درمیان تھا۔ اس کی آبادی کوئی ایک سو خاندانوں پر مشتمل تھی، اذرح سے ایک گھنٹے کی مسافت پر الجربا اس رومی سڑک پر واقع تھا، جو بصریٰ سے بحیرۂ احمر کی طرف جاتی

---

۱ مصنف نے یہ واقعہ ایسے انداز میں بیان کیا ہے، جس سے عام خوانندگانِ کتاب غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے ایک قاصد کو اسلام کا دعوت نامہ دے کر بصرہ کے حاکم شرحبیل بن عمرو کے پاس بھیجا تھا متعدد دوسرے سلاطین و امراء کے نام بھی اسی طرح دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔ شرحبیل نے تمام بین الاقوامی قواعد و آداب کو پس پشت ڈالتے ہوئے قاصد کو شہید کر دیا۔ یقیناً اسے خیال ہو گا کہ اوّل شہنشاہ قسطنطنیہ اس پر خوش ہو گا، حالانکہ خود اس نے اسلامی قاصد کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ دوسرے وہ سمجھ رہا ہو گا کہ اسلامی حکومت کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کی تادیب کے لیے فوج بھیجی گئی تھی۔ بلاشبہ اس کے سالار زید بن حارثہؓ تھے، لیکن رسول اللہ صلعم نے فرما دیا تھا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب (حضرت علیؓ کے بھائی) سالار بنیں اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ پھر مسلمان جسے چاہیں سالار بنا لیں۔ تین ہزار کے اس لشکر نے ڈھائی لاکھ فوج کا مقابلہ کیا، مقابلہ تین روز جاری رکھا۔ جب وہ فوج میدانِ جنگ سے ہٹ گئی تو مسلمان بھی لوٹ آئے۔ اتّفاق سے زیدؓ، جعفرؓ اور عبداللہؓ تینوں یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے، پھر حضرت خالدؓ کو سپہ سالار بنا لیا گیا، یہی جنگ ہے جس میں خالد کے ہاتھ سے نو تلواریں پے در پے ٹوٹی تھیں اور واپسی پر رسول اللہ صلعم نے انھیں "سیف اللہ" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ مالِ غنیمت کا قصہ بالکل لغو ہے۔

۲ یہ فاضل مولف کی حق ناشناسی اور باایں ہمہ وسعتِ علم مذہبی تعصب و تنگ نظری کی ایک عبرت ناک مثال ہے۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

۳ شام فتح ہو گیا اور لوگوں نے اسلام قبول کر لیا جس کے اسباب مصنف نے آگے چل کر خود واضح کر دیے ہیں کیا گرجوں کی جگہ مسجدیں نہ بنتیں اور رسول اللہ صلعم کا اسم گرامی مسجد کے مناروں سے نہ گونجتا؟ مسیح علیہ السلام کا نام حذف نہ ہوا۔ کیونکہ مسلمان انھیں بھی ایک جلیل القدر پیغمبر مانتے ہیں۔

۴ یہ مقام حجاج و زائرین کے راستے پر واقع تھا، بعد میں حجاز ریلوے کا سٹیشن بن گیا ملاحظہ ہو واقدی المغازی، یاقوت جلد اوّل، بلاذری۔ کاتانی کی جلد دوم اس مقام کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جوسن اور سیوی ناک Jaussen and Savignac نیز الاؤس میوسل کی کتاب The Northern Hegaz

۵ یاقوت جلد چہارم، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میوسل کی کتاب جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

تھی۔ اس کی آبادی بھی مسیحی تھی۔ آگے چل کر الجربا نے صلیبی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ شام کے بھی مقامات تھے، جن سے مسلمانوں کو رسول اللہ (صلعم) کی زندگی میں تعلق پیدا ہوا، مذکورہ آبادیوں کی حوالگی کے لیے جو شرطیں تجویز ہوئیں[۱] ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ آئندہ کیا کچھ پیش آنے والا تھا۔ جنوبی شام کی ان آبادیوں سے جو سلوک محمد (صلعم) کے زمانے میں ہوا، وہی ان کے جانشینوں کے زمانے میں دوسروں سے ہوا۔

رسول اللہ (صلعم) کی وفات سے ایک سال بعد ہمسایہ سرزمینوں پر زبردست حملے کے لیے سٹیج آراستہ ہو چکی تھی۔ عرب میں ارتداد کا جو فتنہ پیدا ہوا تھا، وہ فرو ہو چکا تھا اور پورا عرب ایک شخصیت کے ماتحت متحد و منظم ہو گیا تھا۔ یہ شخصیت خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی تھی (۶۳۲ء-۶۳۴ء)۔ داخلی جنگوں کے سلسلے میں جو قوت فراہم ہو چکی تھی، اس کے لیے نئے وسائل عمل تلاش کرنے کی ضرورت تھی، خصوصاً اس وجہ سے کہ نئے مذہب نے عام تصور کے مطابق تمام حلقہ بگوشوں کو ایک برادری میں تبدیل کر دیا تھا۔ قبیلوں کے نزدیک چھاپے ماضئ قدیم سے ایک قومی کھیل چلے آتے تھے۔ ان کی جنگی روح اسلام کے بعد بھی دبی نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر انھیں یہ امید بھی تھی کہ وہ قدم بڑھائیں گے تو جو عرب قبیلے شام میں آباد ہیں، وہ ہر حال میں اُن سے تعاون کریں گے۔ اگرچہ اس وقت تک یہ قبیلے جن میں سے جذام اور قضاعہ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں[۲] مسیحی بنائے جا چکے تھے، مگر وہ اپنی حالت پر مطمئن نہ تھے۔ انھیں سرحدوں کی حفاظت کے لیے سالانہ ایک رقم ابتدا سے ملتی آ رہی تھی۔ ہرقل نے مصارف میں تخفیف کا مقصد پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ رقم روک دی تھی۔ جو قلعے جنوبی سرحد کی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے، اُن سے بھی تغافل برتا گیا اور ان کی فوجیں شمال میں بلائی گئیں، اس لیے کہ ایران کی طرف سے خطرہ درپیش تھا۔[۳] پھر شام قریب ترین اکھاڑا تھا، جہاں جنگ ہو سکتی تھی۔

حملے کی ابتدا

چنانچہ ۶۳۳ء میں تین فوجیں شام بھیج دی گئیں۔ ایک کے سالار عمروؓ بن العاص تھے، دوسری کے یزیدؓ بن ابی سفیان اور تیسری کے شرجیل بن حسنہ[۴]۔ عمرو ابن العاص، آگے چل کر مصر کے فاتح بنے۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اگر تینوں فوجیں یک جا لڑیں تو اس صورت میں عمروؓ ابن العاص سپہ سالار رہیں گے، یزیدؓ کی فوج میں علمداروں کا منصب امیر معاویہؓ کو حاصل تھا، جو آگے چل کر اموی خاندان کی حکومت کے بانی ہوئے۔ یزیدؓ و شرجیلؓ نے تبوک و معان کا راستہ اختیار کیا، جو آمد و رفت کا عام راستہ تھا اور عمروؓ نے ساحل کے ساتھ ساتھ

---

[۱] بلاذری

[۲] بنو سلیح بھی قضاعہ ہی کی ایک شاخ تھے۔ بنو عاملہ اس وقت ذرا شمال میں آباد تھے۔ وہاں سے وہ جنوبی لبنان میں پہنچے۔ اس مقام کو اب تک جبل عامل کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ابوالفداء "تقویم"۔

[۳] مصنف نے خود جو حالات پیش کر دیے ہیں کیا ان میں کسی اضافے کی ضرورت ہے؟ یعنی مسیحی ہو جانے کے باوجود قبائل کی بے اطمینانی اغلباً جو رقم بطور حق محنت بسلسلۂ حفاظت سرحد ملتی تھی، اس کی بندش اس میں صرف ایک چیز اور بڑھانی ضروری ہے اور وہ یہ کہ عرب میں اسلام پھیلا تو عربی قبائل جہاں جہاں تھے، وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے، نہ صرف رومی حلقوں، بلکہ مشرقی سرحد پر ایرانی حاکموں نے بھی اسے اپنی حکومت کے خلاف سرکشی قرار دیا اور عربوں کو دبانے لگے۔ اس طرح کشمکش شروع ہوئی تو عرب طبعاً اپنے بھائیوں کی امداد پر متوجہ ہوئے، خصوصاً اس لیے کہ وہ مسلمان ہو چکے تھے، اس وجہ سے لڑائیوں کا دائرہ پھیلا اور جو کچھ پیش آیا، وہ تاریخ کا سرمایہ ہے۔

[۴] بلاذری ص ۱۰۷، ۱۰۸، ترجمہ گورنچے۔

ایلہ کے پاس سے پیش قدمی کی۔ ان فوجوں کو کمک پہنچی تو تعداد تین ہزار سے سات ہزار پر پہنچ گئی۔ ابوعبیدہؓ ابن الجراح، جنہیں بعد میں سپہ سالار اعظم بنایا گیا، غالباً کسی کمکی فوج ہی کے ساتھ شام پہنچے تھے۔

پہلی لڑائی وادی العربہ میں ہوئی۔ یہ بحیرۂ لوط کے جنوب میں ایک بہت بڑا نشیب ہے۔ فلسطین کے حاکم سرجئس نے، جس کا مرکز قیساریہ تھا، مقابلہ کیا اور یزید کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس کی فوج لوٹ رہی تھی کہ غزہ کے قریب داثن میں مسلمانوں نے اسے جالیا اور تباہ کر ڈالا (۴ فروری سنہ ۶۳۴ء)۔ سرجئس خود بھی مارا گیا۔ اب راستہ کم از کم عارضی طور پر صاف ہو چکا تھا۔ یزیدؓ اور عمروؓ نے پورے جنوبی فلسطین کو فوجوں کی آماجگاہ بنا لیا۔ قیساریہ بھی خطرے میں پڑ گیا اور یروشلم کا راستہ سمندر سے کٹ گیا۔[1]

خالد کا جانبازانہ سفر

یہ خبر ہرقل کو ملی تو وہ حمص میں تھا۔ وہیں اسے رسول اللہ (صلعم) کی طرف سے اسلام کا دعوت نامہ پہنچا تھا۔ اس نے فوراً ایک فوج تیار کی اور اپنے بھائی تھیوڈورس کے ماتحت اسے جنگ کے لیے بھیج دیا۔ اس اثناء میں ابوبکرؓ کی طرف سے خالدؓ بن ولید کے نام حکم پہنچ چکا تھا کہ عراق سے تیزی کے ساتھ شامی فوج کو کمک پہنچاؤ۔ عراق پر حملہ شام پر حملے سے تھوڑی دیر پہلے شروع ہو چکا تھا، لیکن شام حجاز سے قریب تر تھا، اس لیے اس کے متعلق زیادہ تشویش تھی۔

خالدؓ نے غالباً الحیرہ سے صحرا کا خطرناک سفر شروع کیا۔ الحیرہ اور بعض دوسرے مقامات اس وقت تک مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ جو راستہ اختیار کیا گیا، وہ غالباً جنوبی و مغربی تھا جو دومۃ الجندل[2] کی طرف جاتا تھا (موجودہ الجوف)۔ یہ شام و عراق کے وسط میں واقع تھا۔ دومہ پہنچ جانے کے بعد اسلامی فوج بطن السّر (وادی سرحان) کے راستے بُصریٰ پہنچ سکتی تھی، جو شام کا مشرقی دروازہ تھا لیکن اس راستے میں قلعے واقع تھے۔ لہٰذا فوج نے شمالی و مغربی راستہ اختیار کیا، جو قراقر (قلبان قراقر) کی طرف جاتا تھا، یہ مقام بطن کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں سے شمال کی طرف سوٰی[3] کا رُخ کر لیا گیا، جو پانچ دن کی مسافت پر تھا، لیکن پورے علاقے میں پانی بالکل ناپید تھا۔ فوج کی تعداد پانچ سو سے آٹھ سو تک تھی۔ اس کے لیے مشکیزوں میں پانی بھر لیا گیا۔ گھوڑوں کے لیے یہ طے ہوا کہ ضرورت کے وقت اونٹوں کے پیٹ چاک کر کے پانی پلایا جا سکے گا۔ یہ پانی اشد ضرورت پیش آجانے پر آدمی بھی پی سکتے تھے۔ گھوڑے اس لیے ساتھ رکھے گئے تھے کہ مقابلہ پیش آجائے گا تو ان سے کام لیا جائے گا۔ رہبر طے قبیلے کا ایک شخص رافع بن عمر نام تھا۔ ایک موقع پر سورج کی کرنوں سے اس کی آنکھیں اس قدر چندھیا گئیں کہ وہ زیر زمین پانی کا مطلوب نشان دریافت نہ کر سکا۔ اس نے اہل فوج سے درخواست کی کہ ایک خاردار جھاڑی تلاش کرو، جسے عوسج کہتے ہیں۔ اس کے پاس سے زمین کھودی تو نم آلود مٹی مل گئی اور پانی نکل آیا۔ اس طرح

---

[1] یاقوت جلد دوم، ص ۵۱۴، ۵۱۵۔ بلاذری: ص ۱۰۹۔ تمدن اص ۱۶۷، ۱۶۸۔ گوئجے ص ۳۱۔ ۳۴۔ کائتانی جلد دوم ص ۱۱۴۱، ۱۱۴۵۔

[2] عربوں نے دو سے تین صدی بعد تک فتوحات کی تفصیلات مرتب کیں۔ ان کے بیانات حقائق اور اندازے کے لحاظ سے غیر واضح ہیں۔ میرے بیانات کائتانی، دی گوئجے، ولہاسن، بیکر اور دوسرے نقاد مصنفین دَور حاضر کے بیانات پر مبنی ہیں۔

[3] بائبل کی کتاب پیدائش باب ۲۵، آیت ۱۴، یسعیاہ باب ۲۱، آیت ۱۱۔

[4] یہ مقام دمشق کے شمال مشرق میں موجودہ سبع بیار (سات کنوؤں) کے قریب ہے۔

کی سلامتی کا انتظام ہو گیا اور صحرائی فضا میں ایک ایسا کارنامہ انجام پا گیا، جس کی کوئی نظیر موجود نہ تھی[1]

خالدؓ صرف اٹھارہ روز کے سفر کے بعد ڈرامائی فجائیت کے ساتھ ۲۴-اپریل ۶۳۴ء کو منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ وہ دمشق کے شمال مشرق اور اس فوج کے عقب میں جا کھڑے ہوئے جو بیزنطینیوں نے عجلت میں تیار کر لی تھی۔ انھیں پہلا مقابلہ السبٹر کے دن (عید الفصح) غسانی مسیحی فوج سے بہ مقام عذرا[2] پیش آیا، جو مرج راہط میں ہے[3]۔ خالدؓ فنونِ جنگ کے بڑے بالغ نظر ماہر تھے، انھوں نے شرق اردن میں سے جنوبی سمت میں دباؤ ڈالا، جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اپنے رفیقوں کی ان فوجوں سے اتصال پیدا کر لیں، جن کے لیے (بیزنطینی فوجوں کی کثرت کے باعث) پریشانی پیدا ہو چکی تھی۔ ذاتی برتری یا مالِ غنیمت کی خواہش انھیں اصل مقصد سے اِدھر اُدھر نہ کر سکی۔

دمشق کی حوالگی

تمام اسلامی فوجیں مل گئیں تو غالباً سپہ سالارِ اعظم کے فرائض خالدؓ کے سپرد ہوئے۔ ۳۰ جولائی ۶۳۴ء کو انھوں نے اجنادین میں خونریز فتح حاصل کی[4]۔ اب پورا فلسطین حملہ آوروں کے لیے کھلا پڑا تھا۔ چھ ماہ تک ہر طرف ترکتازوں کا سلسلہ جاری رہا۔ تبریاس[؟] معمولی مزاحمت کے بعد مسخر ہو گیا۔ فحل[4] کو بھی اسی صورتِ حال سے سابقہ پڑا، جو دریائے اردن کے مشرقی گھاٹ کے سر پر کھڑا تھا۔ بیسان دریا کے دوسرے کنارے پر تھا، وہ بھی بیزنطینیوں سے چھن گیا۔ بیزنطینی فوجوں کا نیا سالار بانس[5] پہلے سالار سے زیادہ خوش نصیب ثابت نہ ہوا۔ ایک ماہ بعد بیزنطینی فوج سے پھر ایک مقابلہ مرج الصفر[6] میں ہوا۔ وہاں سے یہ فوج شکست کھا کر پناہ کی غرض سے دمشق کی فصیل کے اندر پہنچ گئی۔ خالدؓ نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور اسلامی سلطنت کے آئندہ مرکز (دمشق) کا محاصرہ کر لیا۔ مدعا محض یہ تھا کہ دمشق کو دوسرے حصوں سے منقطع کر دیا جائے۔ اس وقت تک عربوں نے محاصرے کا فن اس سے زیادہ نہیں سیکھا تھا۔

---

[1] بلاذری، الطبری، ابن الاثیر، یعقوبی، ہوتسما، ابن عساکر، البصری وغیرہ کے بیانات سے متعدد تاریخی اور جغرافیائی مسائل پیدا ہوتے ہیں، میں نے اس سلسلے میں سیوسل کے قیاسی منازل سفر کو پیشِ نظر رکھا ہے، نیز کائتانی سے استفادہ کیا ہے (جلد دوم ص ۱۲۲۰-۱۲۳۶)

(مترجم:- خالدؓ کا سفر کسی راستے سے ہوا ہو۔ منازل میں کم و بیش اختلاف ہو سکتا ہے۔ اصل قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں میں کتنا عظیم الشان جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ دشوار ترین مراحل بھی انھیں ایک لمحے کے لیے ہراساں نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دشت و جبل اور سمندروں میں اس طرح پھرنے لگے تھے۔ گویا قدرت نے ہر شے صرف ان کے لیے بنائی ہے)

[2] یہ ایک میدان ہے جو دمشق سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے، ملاحظہ ہو بلاذری ص ۱۱۲، ترجمہ ص ۱۸۲، یاقوت جلد چہارم ص ۱۰۱۶۔

[3] اس مقام کا اور تو کوئی پتا نہیں ملتا، اِلّا یہ کہ اسے "جنا تبیں" سمجھا جائے، جو غزہ — یروشلم والی سڑک پر رملہ اور بیت جبرین کے درمیان ہے، ملاحظہ ہو کائتانی جلد سوم ص ۱۷۶-۱۸۷، ولہاسن جلد چہارم ص ۵۰، ۵۸۔ وساؤ Topographic ص ۳۱۸

[4] یہ شاید فحل (فا مفتوح) ہے جسے یونانی میں پیلا کہتے تھے اور تل العارم کی تحقیقوں میں Bi-hi-lim تحریر کیا گیا ہے۔ یہ اب خربۃ فحل کے نام سے مشہور ہے دیکھیے کائتانی جلد سوم ص ۱۸۷، ۲۱۱-ایبل Abel جلد دوم ص ۳۴، ۴۰۵

[5] Baanes

[6] ایک میدان جو دمشق سے بیس میل جنوب میں ہے۔

اور نہ ان کے پاس محاصرے کے آلات تھے۔ چھ مہینے کے بعد شہر نے غداری کے باعث حوالگی منظور کر لی (ستمبر ۶۳۵ء)۔ صلح کی گفتگو کرنے والے دو شخص تھے، ایک اسقف، دوسرا منصور ابن سرجون، جو سینٹ جان دمشقی کا دادا تھا اور اسے حکومت کے محکمۂ مالیات میں بہت اونچا منصب حاصل تھا۔ یہ روایتی بیان بعد میں تراشا گیا کہ نصف شہر بہ زور شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ (عنوۃً) اور نصف صلح کی بنا پر (صلحاً) مسخر ہوا اور اس غرض سے تراشا گیا تھا کہ بنو امیہ کو گرجے کی تقسیم کے لیے دستاویز جواز مل جائے[1]۔ حوالگی کی شرطیں وہی تھیں جو پہلے رسول اللہ صلعم نے تجویز فرمائی تھیں اور یہ شرطیں دوسرے شامی بلاد کے لیے ایک نمونہ بن گئیں:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خالدؓ بن ولید کی طرف سے باشندگان دمشق کے لیے یہ شرطیں ہیں، جن پر شہر میں داخلے کے بعد عمل ہوگا۔ وعدہ کیا جاتا ہے کہ باشندوں کی جانیں املاک اور گرجے محفوظ رہیں گے۔ شہر کی فصیل ڈھائی نہیں جائے گی اور نہ کسی مسلمان کو ان کے گھروں میں ٹھہرایا جائے گا۔ ہم باشندوں کو اللہ، اس کے رسول خلفا اور مومنوں کی حفاظت میں لیتے ہیں۔ وہ جب تک جزیہ ادا کرتے رہیں گے، ہماری طرف سے انھیں بھلائی کے سوا کچھ نہیں پہنچے گا[2]۔"

شام کے مرکز حکومت کی تسخیر کے بعد واضح ہو گیا تھا کہ اب آخری فتح یقینی ہے۔ اختتام سال سے پیشتر ابو عبیدہؓ نے علاقہ حمص پر قبضہ کر لیا۔ آس پاس کے تمام شہروں ـــــ بعلبک، حمص، حماۃ ـــــ نے اپنے دروازے فاتحوں کے لیے کھول دیے بعض حالتوں میں ـــــ مثلاً شیزر کے تعلق میں[3] ـــــ لوگ باجے بجاتے اور گاتے ہوئے استقبال کے لیے نکلے اور فاتح کے آگے جھک گئے۔ صرف یروشلم، قیساریہ اور بعض ساحلی مقامات اس اُمید پر مزاحمت کرتے رہے کہ شاید ہرقل کی طرف سے انھیں کمک مل جائے۔

ہرقل کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ ان شہروں کو مایوس کرے۔ اس نے انطاکیہ اور حلب کے گرد و نواح میں پچاس ہزار فوج جمع کی، جو زیادہ تر تنخواہ دار ارمنوں اور عربوں پر مشتمل تھی۔ اس کی سالاری اس نے اپنے بھائی تھیوڈورس کے سپرد کی اور بانس کو اس کی امداد کے لیے متعین کر دیا۔ چونکہ یہ فوج تعداد میں زیادہ تھی، اس لیے عرب سالاروں نے حمص کو فوراً چھوڑ دیا، بلکہ دمشق اور بعض دوسرے اہم جنگی مقامات سے بھی پیچھے ہٹ گئے اور قریباً اڑھائی ہزار فوج وادی یرموک[4] میں جمع کر لی، جہاں سے وہ بوقتِ ضرورت صحرا کی جانب ہٹ سکتے تھے۔ ہرقل کی فوج نے نشیبی شام اور شرقِ اردن والا راستہ اختیار کیا۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں اور آویزشوں میں کچھ وقت گزر گیا۔ اسی اثنا میں فوج نے بانس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ پھر لڑائی کی نوبت آئی۔ لڑائی اس مقام پر ہوئی، جہاں دریائے اقوصہ، دریائے یرموک

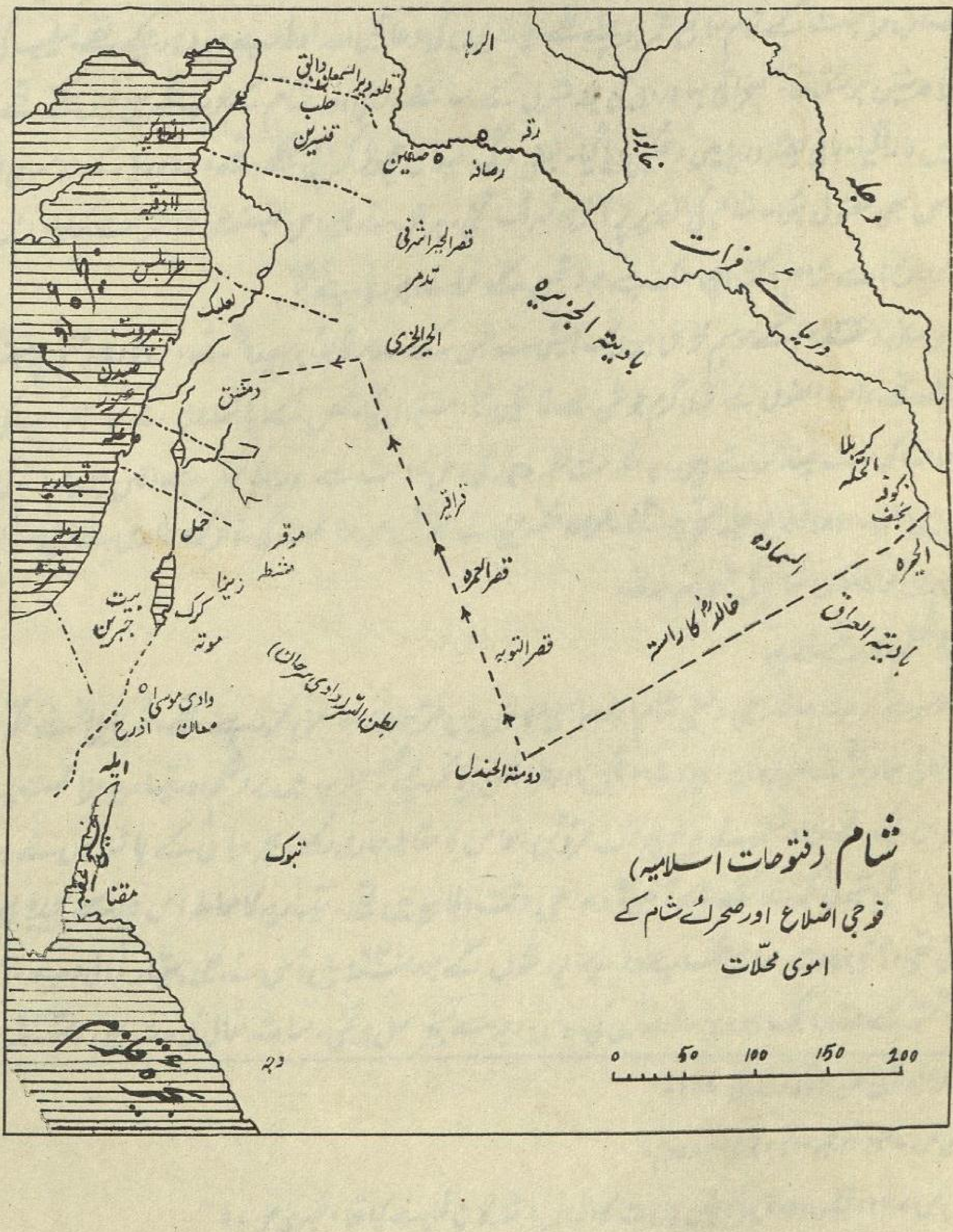
---

[1] کاتنانی جلد سوم ۳۵۹-۳۹۲۔ [2] بلاذری ص ۱۲۱ ترجمہ ص ۱۸۷

[3] اصل مقام لاریسا تھا۔ آج کل اسے شیزر کہتے ہیں۔ نہر عاصی پر واقع ہے۔ یہ حما سے پندرہ میل شمال مغرب میں ہے۔

[4] تھیوفینز (Theophanes) ص ۳۳۷۔ طبری جلد اول۔

[5] ہیرومکس (Hieromax) با جو جنہ شریعۃ المناذر (ایک بدوی قبیلے کے نام پر) یرموک دریائے اردن کا ایک معاون ہے۔ اسے یرموث سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے جس کا ذکر کتاب یوشع باب ۱۰ آیت ۳ میں آیا ہے اور آج کل خربۃ یرموک کہلاتا ہے (نزد اجنادین)



شام (فتوحات اسلامیہ)
فوجی اضلاع اور صحرائے شام کے
اموی محلات

میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی واقوصہ (موجودہ یاقوصہ) کے نزدیک ۲۰۔ اگست ۶۳۶ء کو گھمسان کا رن پڑا۔ اس روز شدید گرمی تھی۔ پھر آندھی آگئی۔ اس سے عربوں کو یقیناً فائدہ پہنچا۔ بیزنطینی فوجیں لڑتے لڑتے دونوں ندیوں کے درمیان ایک تنگ مقام پر پہنچ گئیں۔ مغربی جانب دریائے آناد کا پُل تھا جس پر عربوں نے قبضہ کرلیا، مشرقی جانب بیزنطینی فوج کے خطوطِ رسل و رسائل بالکل منقطع کر دیے گئے۔ اب مراجعت کے تمام مواقع ختم ہو چکے تھے۔ پادریوں کی دعائیں اور اوراد بے سود ہو چکے تھے۔ صلیب کی نمائش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا تھا[1] صحرائی بہادروں کی یورشوں کے سامنے ارمنی اور شام کے عرب ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک حصّہ میدانِ جنگ ہی میں مارا گیا۔ باقی حصّہ دریا میں دھکیل دیا گیا۔ بعض لوگ میدان چھوڑ کر بچ نکلے تھے، وہ دریا کے دوسری طرف مارے گئے۔ تھیوڈورس بھی مقتول ہُوا۔ شام کی تقدیر پر آخری مُہر لگ گئی۔ ہرقل نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرلیا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے "الوداع اے شام! کتنا اچھا ملک ہے جو دشمن کے حوالے ہو رہا ہے[2]!"

اسی سال (۶۳۶ء) کے موسمِ خزاں میں ایک جیش نے جس کے سالار غالباً ابوعبیدہؓ تھے، دوبارہ دمشق پر قبضہ کرلیا۔ جو شہر پہلے مسخّر ہو چکے تھے، اب انھوں نے بڑی گرم جوشی سے فاتحین کا استقبال کیا۔ حمص کے باشندوں نے کہا: "ہم آپ کی حکومت اور عدل و انصاف کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ حکومت ظلم و جور کی اس حالت سے بدرجہا بہتر ہے، جس میں ہم زندگی بسر کرتے رہے[3]" مزید شمال میں حلب اور انطاکیہ جلد مسخّر ہو گئے۔ صرف قنسرین نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ آخر کوہ طارس نے عربی عساکر کی بے خلل پیش قدمی روک دی۔ یہی کوہستان شام کی طبعی سرحد تھا۔

یروشلم اور قیساریہ

دوسرے عرب سالار بھی وسطی شام اور ساحلی علاقوں میں فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ شرحبیلؓ نے عکّہ اور صُور[4]، یزیدؓ اور اس کے بھائی معاویہؓ نے صیدون، بیروت، جُبیل اور طرابلس فتح کرلیے[5]۔ جنوب میں یروشلم اور قیساریہ مزاحمت پر قائم رہے۔ یہ دونوں یونانی شہر بن چکے تھے۔ یروشلم نے ۶۳۸ء تک عمروؓ بن العاص کا مقابلہ جاری رکھا۔ پھر وہاں کے باشندوں نے یہ شرط پیش کی کہ عمرؓ خود شہر کی حوالگی قبول کرنے کے لیے آئیں[6]۔ وہ اس وقت الجابیہ میں تھے۔ قیساریہ کا معاملہ اس وجہ سے پیچیدہ ہوگیا کہ اسے بحری امداد برابر مل سکتی تھی۔ آخر سات سال تک پے در پے یورشوں کے بعد ۶۴۰ء میں اُس نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ آخری محاصرہ معاویہؓ نے کیا تھا[7]۔ شہر کے اندر ایک یہودی نے غدّاری کی۔ اس وجہ سے تسخیر سہل ہوگئی۔ سات سال کی مدت میں (۶۳۳ء۔ ۶۴۰ء)

---

[1] ابن عساکر جلد اوّل ص ۱۴۳، بُصری ۹۷۔

[2] بلاذری ص ۱۳۷، ترجمہ ۲۱۰، طبری جلد دوم۔

[3] بلاذری ص ۱۳۷، ترجمہ ۲۱۱۔ قریباً ایسے جذبات کا اظہار باشندگانِ فحل نے کیا تھا، بُصری ص ۹۷

[4] بلاذری ص ۱۱۶، ترجمہ ۱۷۹، دی گوبجے ص ۱۳۳۔

[5] بلاذری ص ۱۲۶، ترجمہ ۱۹۴، کاشانی جلد سوم ص ۸۰۱

[6] طبری، جلد اوّل، بلاذری ص ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ترجمہ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ یعقوبی جلد دوم ص ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ دی گوبجے ص ۱۵۲ سے آگے۔

[7] بلاذری ص ۱۴۰۔ ۱۴۲، ترجمہ ۲۱۵۔ ۲۱۹۔ دی گوبجے ۱۶۶۔ ۱۶۹ کاشانی جلد چہارم۔

پورا ملک جنوب سے شمال تک قبضے میں آگیا۔

فتح بیسیر

بیزنطینی سلطنت کا اتنا اہم صوبہ انتہائی سہولت سے فتح ہو گیا[1]۔ اس کے وجوہ بیان کرنا مشکل نہیں۔ سلطنت کی جنگی نظام ان ایرانی حملوں کی وجہ سے حد درجہ کھوکھلا ہو چکا تھا، جو ساتویں صدی کے اوائل میں ہوئے تھے اور معاشرے کی روحانی وحدت یعقوبیوں کی اس مذہبی علیحدگی کے باعث درہم برہم ہو چکی تھی، جس کی ابتدا پانچویں صدی مسیحی کے وسط میں ہوئی تھی، ہرقل نے آخری وقت میں (۶۳۱ء) مفاہمت کے ذریعے سے اس تفرقے کو ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ اسی طرح بیکار رہی، جس طرح پہلی کوششیں بیکار رہی تھیں۔ یہ مفاہمت اس کے اسقف سرجئس نے تجویز کی تھی، جو خود شام کے ایک یعقوبی خاندان کا فرد تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت کے متنازع فیہ مسئلے سے اعتراض کرتے ہوئے ان کی "مشیئتہ واحدہ" پر زور دیا جائے لیا فارمولا نہ تو بیزنطیم کے راسخ العقیدہ مسیحیوں کو مطمئن کر سکا اور نہ شام کے اختلافی فرقے، یعنی یعقوبیوں کو۔ اس سے ایک نیا فرقہ پیدا ہوا، جسے مونوتھیلائٹ[2] (قائلینِ وحدۃ المشیئتہ) کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کی مشیئتہ ایک تھی اور وہ الوہی مشیئت تھی۔ شامیوں کی کثرت اپنے عقیدے پر جمی رہی۔ ان کے نزدیک یہ عقیدہ مذہب سے بھی زیادہ بلند حیثیت رکھتا تھا، یعنی یہ ایک دبے ہوئے اور نیم متکلم احساس قومیت کا اظہار تھا۔

سکندر کی فتح کے وقت سے کسی بھی دور میں اہلِ شام نے بہ حیثیت قوم اپنا قومی کردار ضائع نہ کیا، نہ اپنی زبان ترک کی، نہ وہ سامی مذہب سے دست بردار ہوئے اور نہ بہ حیثیت عمومی یونانی و رومی طریق زندگی اختیار کیا۔ یہ حقیقت پہلے بھی واضح ہو چکی ہے۔ یونانی حضارت کا اثر عہدِ عروج میں بھی محض سطح تک محدود رہا۔ اور اس سے صرف وہ لوگ ایک حد تک متاثر ہوئے تھے، جو شہروں میں رہتے تھے اور پڑھے لکھے تھے۔ آبادی کی اکثریت ہمیشہ حاکموں کو اجنبی سمجھتی رہی۔ حکومت کی بدنظمی اور محاصل کی زیادتی نے حاکموں اور محکوموں کے درمیان اجنبیت کی خلیج وسیع کر دی۔ ساتویں صدی مسیحی کے اکثر شامیوں کے نزدیک مسلمان عرب قومی، لسانی اور غالباً مذہبی نقطہ نگاہ سے نفرت انگیز بیزنطینی حاکموں کے مقابلے میں زیادہ قریب تھے[3]۔

جنگ کے بعد نظم و نسق

شام کی فتح مکمل ہو گئی تو سپہ سالار کی جگہ ناظم نے سنبھال لی۔ خالدؓ نے عرب، العراق اور شام میں شاندار فتوحات کی بنا پر سیف اللہ کے لقب کو حق بہ جانب ثابت کر دیا تھا، اب خلیفہ عمرؓ کی طرف سے حکم پہنچا کر اس کی جگہ ابوعبیدہؓ مقرر کیے جاتے ہیں، جو رسول اللہ صلعم

---

[1] بلاذری

[2] Monothelites

[3] مترجم: مصنف نے جو کچھ یہاں لکھا ہے۔ وہ سراسر تکلف ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں، جس کی شکست کے ایسے اسباب پیش نہ کیے جا سکیں۔ ایرانیوں نے بیزنطینیوں کا فوجی نظام کھوکھلا کر دیا تھا۔ پھر بیزنطینی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کا نظام کھوکھلا کر دیا۔ گویا دونوں سلطنتیں باہم رزم و پیکار سے عربوں کی فتوحات کا راستہ صاف کرتی رہیں، مگر سوال یہ ہے کہ عربوں کو کہاں سے قوت ملی؟ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایرانی اور مشرقی رومی سلطنت آخر وقت تک نہایت عظیم الشان فوجیں میدان جنگ میں لاتی رہیں؟ پھر اس علاقے کی فتح میں سات سال لگ گئے۔ یہ معمولی وقت نہ تھا کہ اسے فتح بیسیر کہا جائے اور عربوں کے کارناموں کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کی جائے

کے ممتاز صحابی تھے اور ان تین اصحاب میں سے ایک تھے، جنھوں نے اسلامی اقتدار سنبھال لیا تھا[1] باقی دو میں سے ایک ابوبکرؓ تھے اور دوسرے عمرؓ۔ عمرؓ اجنادین کی جنگ (۶۳۴ء) کے بعد ابوبکرؓ کی جگہ خلیفہ بن گئے تھے۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خالدؓ پسند نہ تھے، لیکن جنگِ یرموک کے بعد ہی انھوں نے اپنے دوست ابوعبیدہؓ کو کمانڈرِ اعلیٰ بنا دیا۔ خالدؓ نے خدمت عامہ سے علیٰحدگی اختیار کرلی اور حمص میں مقیم ہوگئے۔ وہیں ۶۴۲ء میں بہ حالتِ فراخ نگری وفات پائی۔ روایات میں وہ اپنے معجز نما کارناموں کی بدولت زندہ رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ترکی نمونے کے مطابق ان کا مقبرہ بنا اور اس کے ساتھ ایک مسجد تعمیر ہوئی۔ ان کی بیوی "فقفاء" بھی پاس ہی دفن ہوئی۔

۶۳۹ء میں حضرت عمرؓ الجابیہ کی اسلامی چھاؤنی میں اس غرض سے پہنچے کہ فتح کا جشن منائیں اور مفتوحہ علاقوں کی حیثیت کا فیصلہ کریں۔ انھوں نے ابوعبیدہؓ کو نہ صرف مستقل سالارِ اعظم بنا دیا، بلکہ انھیں گورنر جنرل اور نائب حکومت بھی مقرر کر دیا۔ سن رسیدہ خلیفہ یروشلم میں داخل ہوا تو ایک اونٹ پر سوار تھا اور نہایت معمولی لباس پہن رکھا تھا۔ اس سے اچھا اثر نہ پڑا[2]۔ صفرونیوس نے استقبال کیا۔ وہ بطریقِ اعظم تھا اور کلیسا کا "نہایت شیریں زبان" محافظ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یونانی زبان میں اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ دانیال نبی کی کتاب میں جس تباہی کی خبر دی گئی ہے، وہ یہی ہے، جو مقامِ مقدس میں اس وقت موجود ہے[3]۔

---

[1] (مترجم — یہ سقیفہ بنو ساعدہ کے واقعے کی نہایت افسوسناک تحریف ہے۔ عام طور تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات پر انتظامی امور کا بندوبست لازم تھا انصار نے باہم مشورے شروع کر دیے اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچے۔ انصار کو مطمئن کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے لیے سب نے اتفاق کر لیا نہ کہ اقتدار ان تین بزرگوں یا کسی دوسرے مجمع نے سنبھالا، اقتدار سب امت کے ہاتھ میں تھا۔ کاروبار امت کے مشورے اور اتفاق سے چنے جاتے تھے۔ البتہ بنو امیہ نے یہ نظام قائم نہ رہنے دیا اور خلافت بادشاہی بن گئی۔ افسوس کہ مصنف علم و فضل کے باوجود ایسی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکا)۔

[2] (مترجم — معلوم نہیں اس سے مصنف کا مقصود کیا ہے؟ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا لباس نہایت سادہ تھا بلکہ اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ بعض عرب سالاروں کو بھی خیال ہوا تھا کہ شاید اس لباس میں غیروں پر اچھا اثر نہ پڑے لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر ان کے خیال کی تردید کر دی تھی کہ ہمیں اسلام نے جو عزت بخشی ہے، وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ انسان کی حقیقی عزت فاخرہ لباس سے نہیں، دولت سے نہیں بلکہ اس کی سیرت اور کردار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی عزت تقویٰ ہی سے وابستہ ہے)۔

[3] (مترجم — تسلیم کرلینا چاہیے کہ یہ بطریق بڑا ہوشیار اور فریب کار تھا اور اس کے بیان کی توثیق کے لیے دانیال نبی کے صحیفہ کی جن کی آیات کے حوالے مصنف نے دیے ہیں ان میں سے باب ۹ آیت ۲۷ "شہر اور مقدس" کو مسمار کرنے کا ذکر ہے۔ باب ۱۱، آیت ۳۱ میں بھی "مقدس" کو ناپاک اور دائمی قربانی کو موقوف کرنے کا ذکر ہے۔ باب ۱۲ آیت ۱ میں مرقوم ہے کہ وہ ایسی تکلیف کا وقت ہوگا کہ پہلے کبھی پیش نہ آیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آیت مسلمانوں کی فتح بیت المقدس پر چسپاں نہیں ہوتی سب رومیوں کی تخریبات پر چسپاں ہوتی ہیں۔ تعجب ہے مصنف نے سب کچھ جاننے کے باوجود تردید نہ کی۔ مصیبت یہی ہے کہ اکثر لوگ علم و فضل میں بلند مرتبہ حاصل کر لینے کے باوجود بعض معاملات میں دانستہ چشم پوشی کر جاتے ہیں، اور یہ نفس انسانی کی بوالعجبی کا نہایت ہی عجیب مرقع ہے کہ مذہبی اختلافات لوگوں کو حق و صداقت کے صحیح انداز سے محروم کر دیتا ہے)۔

فتح شام کی اہمیت

شام کی فتح مقامی اور عارضی مصلحتوں سے آگے نکل گئی۔ اس نے اسلام کی نومولود قوت کا وقار دنیا کی نظروں میں بڑھا دیا اور مسلمانوں میں اعتمادِ نفس پیدا کر دیا۔

شام کو مرکز بنا کر عرب فوج نے عیاض ابن غنم کی سرکردگی میں شمالی و مشرقی جانب سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس طرح سنہ ۶۳۹ء اور سنہ ۶۴۶ء کے درمیان دجلہ و فرات کا پورا درمیانی علاقہ مسخر کر لیا گیا اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ ایک اور فوج عمروؓ ابن العاص کی سرکردگی میں جنوب مغرب کی جانب بڑھی۔ اس میں مہم شام کے دوسرے بہادر بھی شریک تھے۔ چنانچہ سنہ ۶۴۰ء اور سنہ ۶۴۶ء کے درمیان مصر بھی فتح ہو گیا۔ مصر سے اہلِ شام کے تعاون کے ساتھ شمالی و مغربی افریقہ میں جنگی کارروائیاں شروع ہو گئیں اور انجام کار مسلمان ہسپانیہ پہنچ گئے شمالی شام سے ایشیائے کوچک پر حملے بہ آسانی ہو سکتے تھے، چنانچہ ان کا سلسلہ قریباً ایک صدی تک برابر جاری رہا۔

فتوحات اسلامی کے اسباب

یہ تمام فتوحات منظم مہموں کا نتیجہ تھیں، وقتی چھاپوں کا نتیجہ نہ تھیں، جیسا کہ ابتدائی فتوحات تھیں۔ العراق اور شام میں جو ابتدائی لڑائیاں ہوئیں، وہ کسی ایسے نقشے کی بنا پر نہیں ہوئی تھیں، جو کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھ کر اور پورے حالات کا جائزہ لے کر پہلے سے تیار کر لیا گیا ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد میں زیادہ تر فتوحات ہوئیں۔ انھوں نے کبھی کوئی جنگی مجلس منعقد نہ کی اور نہ نقل و حرکت کا کوئی منصوبہ تیار کیا۔ کم از کم ابتدائی دور کی حالت یہی تھی یا ممکن ہے، انھیں مفتوحہ علاقوں پر مستقل قبضہ قائم رکھنے کا خیال ہی نہ آیا ہو، لیکن واقعات کی منطق نے یہ نتیجہ سامنے پیش کر دیا۔ ابتدا میں فوجوں کو شہروں میں اقامت کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ایک چھاؤنی، الجابیہ کے نزدیک بنا دی گئی تھی، جو شروع میں مرکزِ حکومت کا کام دیتی رہی۔ دراصل یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ ابتدائی مہمّیں نہ صرف خلیفہ کے احکام کے بغیر، بلکہ ان کے خلاف شروع کر لی گئی ہوں گی، مثلاً خالدؓ کی مہم العراق میں۔[۱]

اسلامی فتوحات کو اصلاً یا عموماً مذہبی جہاد کے رنگ میں بھی نہ دیکھنا چاہیے۔ مسلم مؤرّخوں نے ان فتوحات کی عام تعبیر میں وہی مذہبی نمونہ پیش نظر رکھا، جو یہودیوں نے اپنی قومی تاریخ کے سلسلے میں اور قرونِ وسطیٰ کے مسیحیوں نے کلیسا کی توسیع کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔ اس تعبیر میں پوری تحریک کو زیادہ سے زیادہ مذہبی رنگ دیا گیا کہ مشیّتِ الٰہی یہی تھی۔ حقیقت میں مسلمان عربوں کی فتوحات کے تحت اقتصادی محرّکات کارفرما تھے۔[۲] یہ اقتصادی پہلو بلاذری جیسے محقق مؤرّخ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔

---

۱ (مترجم۔ یہ بیان بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے لڑائیاں شروع نہیں کی تھیں بلکہ سرحدی چپقلشوں کے باعث لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ان چپقلشوں کے ذمہ دار ایران و قسطنطنیہ کی حکومتوں کے وہ حاکم تھے، جن کے ماتحت سرحدی علاقے تھے۔ انھوں نے عربوں کو دبایا۔ عربوں نے مقابلہ کیا۔ کشمکش شروع ہوئی۔ پاس کے مسلمان عربوں نے اپنے بھائیوں کی حمایت کی اس طرح رزم و پیکار کا سلسلہ وسیع ہو گیا۔)

۲ کائتانی جلد دوم ص ۸۴۱-۸۶۱ بیکر (Becker) لیمنس (Lammens) اور دوسرے مصنفوں نے اسی کی پیروی کی ہے۔

(مترجم — اس سے اختلاف کی ضرورت نہیں۔ جنگوں کا ایک پہلو اقتصادی بھی تھا۔ لڑائیاں ہوئیں تو فتوحات اور مالِ غنیمت سے فائدہ اٹھانا نہ گناہ تھا اور نہ اس سے انکار کی ضرورت ہے۔)

بلاذری لکھتا ہے کہ شامی مہم کے لیے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ابوبکرؓ نے مکّہ، طائف، یمن، پورے حجاز اور نجد کے عربوں کو دعوت دی کہ آؤ اور اس جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ ساتھ ہی انھیں مالِ غنیمت کی ترغیب دی، جو یونانیوں سے حاصل ہونے کی امید تھی۔[1]

اسلامی فتوحات کو صحیح اور حقیقی ڈھنگ میں دیکھا جائے تو وہ "مہاجرت" کی لہروں میں سے ایک لہر تھی۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ غیر زرخیز جزیرہ نما کی زائد آبادی ان زرخیز سرحدی علاقوں میں مقیم ہو جائے، جہاں ضروریاتِ زندگی بہ کثرت فراہم ہیں۔ غیر علاقوں میں مداخلت کا جو سلسلہ اہلِ بابل چار ہزار سال پیشتر شروع کر چکے تھے، یہ اس کی آخری منزل تھی۔ تاہم اعتراف کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کی نقل و حرکت کا ایک خاص پہلو بھی تھا اور وہ ان کا مذہبی جذبہ تھا۔ اقتصادی ضرورت کے ساتھ یہ جذبہ بھی مل گیا تو اس نے تحریک کو بے پناہ بنا دیا اور وہ ان حدود تک جا پہنچی، جہاں پہلے کبھی نہیں پہنچی تھی۔ اسلام نے یقیناً ایک جنگی نعرے اور شعار کا بندوبست کر دیا۔ اس کی حیثیت وہی تھی، جو پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں "جمہوریت" کے نعرے کی تھی۔ مزید براں اسلام اتحاد و اتصال کا ایک ایسا وسیلہ بن گیا جس نے قبیلوں اور مختلف العناصر عوام کو اس طرح یکجا کر دیا کہ یک جائی اور وحدت کا یہ منظر پہلے کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ ممکن ہے، بعض بدوؤں کے دل میں یہی جذبہ ہو کہ دین کی اشاعت کریں یا شہادت پائیں گے تو بہشت بریں میں پہنچ جائیں گے، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک محرک یہی تھا کہ ہلالِ زرخیز میں جا بسیں اور زندگی کی راحتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی وقار و وقعت کھو چکا ہے، جو مسیحیوں نے وضع کر رکھا ہے، یعنی وہ مسلمانوں کی تصویریں کھینچتے ہیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ حالانکہ اہلِ کتاب کے سلسلے میں تیسری صورت بھی موجود تھی۔ یعنی ادائے جزیہ۔ قرآن مجید میں ہے کہ لڑو... ان اہلِ کتاب سے جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یومِ آخرت پر، نہ خدا اور رسولؐ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں اور ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو۔[2] یہ

---

[1] (مترجم – مسلمان سپاہی رضاکارانہ تمام خدمات انجام دیتے تھے۔ انھیں یہ بتانا کہ کارِ ثواب کے ساتھ مالی منفعت کے مواقع بھی ہیں، کسی بھی نقطۂ نگاہ سے غیر مناسب نہ تھا)

[2] (یہ سورہ توبہ کی آیتِ جزیہ کا ایک حصّہ ہے جو مصنّف نے یہاں پیش کیا، لیکن ظاہر ہے کہ یہاں مصنّف نے دو غلطیاں کیں۔ اوّل یہ کہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک کے ساتھ جنگ لازمی قرار دے لی، حالانکہ صورتِ حال یہ نہ تھی اور مسلمانوں نے سب سے جنگ نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں مسیحی اسلام کے مخالف نہ تھے، بلکہ نجاشی شاہ حبشہ نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور آگے چل کر خود بھی مسلمان ہو گیا تھا، لیکن جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیلی تو سب سے پہلے سرحدِ شام کی وہ مسیحی ریاستیں مضطرب ہوئیں، جو بیزنطینی سلطنت کے ماتحت تھیں۔ اس سلسلے میں پہلا واقعہ حضرت حارث بن عمر کی شہادت کا تھا جو سفیر کی حیثیت میں شرحبیل بن عمرو غسّانی کے پاس گئے تھے اور اس نے سفارت کے تمام بین الاقوامی قاعدوں کو بالائے طاق رکھ کر انھیں شہید کیا۔ اس کے نتیجے میں جنگِ موتہ پیش آئی۔ پھر قیصرِ قسطنطنیہ کی تیاری کا حال سن کر تبوک کی مہم کا انتظام ہوا۔ چونکہ وہ لوگ پھر تیاریاں کر رہے تھے اور یہودی عرب کے اندر سازشوں میں مصروف تھے۔ اس لیے ان سے لڑنے کا حکم ہوا۔ یہ جنگ صرف ان اہلِ کتاب سے ہوئی تھی، جو مسلمانوں کے خلاف خفیہ یا علانیہ تدبیریں کر رہے تھے۔ دوسری غلطی یہ کی کہ "صاغرون" کا ترجمہ غلط کیا، حالانکہ عربی محاورے کے مطابق اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ وہ خوشی خوشی جزیہ دیں اور ان کی سرکشی باقی نہ رہے۔ پھر جزیہ واحد ٹیکس تھا، جو ان سے لیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ و صدقات کے علاوہ دوسرے محاصل بھی تھے اور لڑائیاں بھی تھیں۔ فوجی خدمت انجام دینے والے اہلِ کتاب جزیے سے بھی مستثنیٰ کر دیے جاتے تھے، نیز فقہائے مثیلِ اہلِ کتاب کی اصطلاح پیدا کی، یعنی وہ لوگ جو کسی نہ کسی کتاب اور ہدایتِ آسمانی کے قائل تھے۔ ان کے ساتھ بھی اہلِ کتاب کا سلوک ہوا۔ — مترجم)

حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ خارج کے نقطۂ نگاہ سے جزیہ زیادہ مطلوب تھا، جس وقت غیر مسلم اسلام کا اقرار کر لیتا تھا، جزیہ ختم ہو جاتا تھا[1]

تاریخی اہمیت کے لحاظ سے پہلی صدی کی اسلامی فتوحات سکندر یونانی کی فتوحات کے برابر ہیں۔ یہ دونوں واقعے مشرقِ قریب کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں عظیم الشان نشانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سکندر کے بعد ایک ہزار سال تک شام اور ہمسایہ سرزمینوں کی تہذیبی زندگی کا رُخ مغربی جانب سمندر کے پار رہا۔ اب رُخ مشرق کی طرف صحرا کے پار ہو گیا۔ روما اور بیزنطیم کے ساتھ اتصال کی آخری کڑی بھی کٹ گئی۔ مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ نئی کڑیاں ڈھل گئیں۔ حقیقت حال کے اعتبار سے نئی پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ پرانا دور تازہ ہو جائے، اس لیے کہ مسلمان عربوں کی تہذیب نے زیادہ تعداد میں نئے عناصر پیش نہ کیے۔ یہ دراصل قدیم سامی حضارت کا احیاء تھا۔ اس لحاظ سے یونانیت کو دو ہم جنس دوروں کے درمیان مداخلت کا دور قرار دینا چاہیے۔

دس سال میں اسلامی فتوحات نے مشرقِ قریب کی ہیئت بدل ڈالی اور ایک صدی میں پوری مہذب دنیا کی کایا پلٹ گئی۔ اثرات کی اس وسعت و شدّت کی مثال سکندر کی فتوحات پیش نہیں کر سکتیں۔ اسلامی فتوحات کو معاشرۂ قرونِ وسطیٰ کے ارتقا میں ایک فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل تھی۔ ان فتوحات نے بحیرۂ روم کو اسلامی جھیل بنا دیا۔ مشرق و مغرب کے درمیان بحری رشتہ منقطع ہو گیا۔ اس وجہ سے، نیز بحیرۂ روم کے مشرقی و مغربی اور جنوبی ساحل پر مسلمانوں کے قبضے سے ایک نئی دنیا پیدا ہوئی۔ اس دنیا میں شارلیمین (۷۴۲ء - ۸۱۴ء) اور اس کے معاصروں نے زندگی بسر کی۔ اس طرح عہد قدیم ختم ہو گیا اور قرونِ وسطیٰ کا آغاز ہوا۔

---

[1] (مترجم — تاریخ میں ایک معاملہ بنو امیہ کے زمانے کا پیش کیا جاتا ہے، لیکن حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے اس کے خلاف حکم صادر کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ خدا نے اپنا رسولؐ ہدایت کے لیے بھیجا تھا، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجا تھا۔)

اکتیسواں باب

عربوں کا نظم و نسق

دوسرا سوال یہ تھا کہ نئے علاقے کے انتظام کی صورت کیا ہو؟ عربوں نے بہت بڑی فتح کی سرشاری کے بعد آنکھیں کھولیں تو وہ ایک نہایت اہم مسئلے سے دوچار تھے، جسے حل کرنے کے لیے وہ پوری طرح تیار نہ تھے۔ ان کے سابقہ تجربات میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جسے وہ مشعل راہ بنا سکتے۔ صاف ظاہر ہے کہ قدیم مدنی معاشرے کے قاعدے اور ضابطے ناکافی تھے اور نئے اسلامی معاشرے کے قوانین سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ مفتوحہ علاقوں کی آبادیوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔[1]

عہد عمرؓ

عمرؓ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس معاملے کو طے کرنے پر توجہ مبذول فرمائی۔ عام روایت کے مطابق "یوم جابیہ" پر ایک مجلس شوریٰ بھی منعقد ہوئی، جو تین ہفتے جاری رہی۔ اس مجلس میں عمرؓ اور ان کے سالاروں نے معاملے پر بحث کی۔ کچھ معلوم نہیں کہ بحث میں کیا کچھ کیا گیا اور نہ یہ معلوم ہے کہ جو تحریر عہد عمرؓ کے نام سے مشہور ہوئی اس کی دفعات کیا کیا تھیں۔ اس بارے میں مختلف روایات مذکور ہیں اور ان میں وہی قوانین شامل ہیں جو بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ بظاہر یہی سمجھنا چاہیے کہ عمرؓ ان اداروں کے لیے قوانین وضع نہیں کر سکتے تھے، جو بروئے کار نہیں آئے تھے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس عہد کے بعض اصول عمرؓ کی پالیسی کے آئینہ دار تھے۔ پہلا اصول یہ تھا کہ عرب مسلمانوں کو مفتوحہ علاقوں میں ایک قسم کے مذہبی و فوجی طبقے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ وہ اپنے خون میں دوسروں کے خون کی آمیزش نہ ہونے دیں گے اور ہر اراضی جائداد کی ملکیت یا کاشت سے باز رہیں گے۔ مفتوحہ باشندوں کو ایک نیا درجہ دے دیا گیا، یعنی ذمیوں یا اہل الذمّہ[2] کا ذمیوں کی حیثیت میں ان سے زمین کا مالیہ بھی لیا جاتا تھا، جسے آگے چل کر "خراج" کہا گیا اور فی کس ٹیکس بھی، جسے "جزیہ" کہتے تھے، لیکن انھیں اسلام کی حفاظت حاصل تھی اور وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ صرف مسلمان ہی اسلامی سرزمین کی حفاظت میں تلوار اٹھا سکتے تھے۔ اس طرح فاتحین اور مفتوحین

---

[1] (مترجم۔ لیکن اصلاحی نظام میں تو پہلے سے سب کے لیے اصول موجود تھے۔ یہ کہنا چاہیے کہ ان اصول کے نفاذ کا وقت نئے علاقے فتح ہونے پر آیا۔)

[2] ملاحظہ ہو، اے، ایس ٹرٹن (Tritton) کی کتاب The Caliphs and their Non-Muslim Subjects

[3] ابتدا میں یہ اصلاح اہل کتاب کے لیے مخصوص تھی، یعنی یہودیوں، مسیحیوں اور عراقی صابیوں کے لیے پھر وسعت دے کر زرتشتی اور دوسرے لوگ بھی اس میں شامل کر لیے گئے (مترجم — لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ باقی لوگوں کو مثیلِ اہل کتاب قرار دیا تھا۔ نیز اہل الذمّہ سے مراد وہ لوگ تھے جن کے حقوق کی حفاظت مسلمانوں نے اپنے ذمے لی تھی۔

کے درمیان نامساوات کا اصول قائم ہو گیا، جو پالیسی کی مستقل بنیاد بن گیا۔[۵]

ایک اور اصول جسے عمرؓ سے منسوب کیا جاتا ہے، یہ تھا کہ منقولہ جائداد اور قیدی جو جنگ میں حاصل ہوں، "غنیمت" سمجھے جائیں گے اور اس کے مالک وہ لوگ ہوں گے، جو جنگ میں حصّہ لیں گے، لیکن زمین کو اس سے الگ رکھا گیا۔ زمین اور رعایا سے وصول شدہ رقموں کو "فے" قرار دیا گیا اور "فے" تمام مسلمانوں کی ملکیت ٹھہری۔ جو لوگ "فے" کی زمین کاشت کرتے تھے، وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مالیہ ادا کرتے رہے۔

محاصل کے متعلق جس قانون کو از روے روایات عمرؓ کی تحریک سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ سالہا سال کے عمل کا نتیجہ تھا۔ ابتدائی خلفا اور صوبائی گورنروں سے محاصل کا نظام اور مالیات کا نظم و نسق وضع اور جاری کرنے کی امید نہیں ہو سکتی تھی، ان کے لیے سہل طریقہ یہی تھا کہ بیزنطینی صوبائی نظام کو اللہ کے نام سے قائم رکھتے، جو شام اور مصر میں جاری تھا۔ اسلامی سلطنت میں خراج کا طریقہ جابجا مختلف تھا اور اس میں زمین کی نوعیت، نیز پہلے سے رواج یافتہ نظام کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، خواہ وہ نظام بیزنطینی تھا یا ایرانی لیکن یہ بنیاد پیش نظر نہ تھی کہ کوئی سرزمین صلح کی بنا پر مسخّر ہوئی ہے یا قوت کی بنا پر جو کتابیں اس موضوع پر عربی زبان میں لکھی گئیں[۶]، ان میں محاصل کے اختلاف کی تشریح عموماً کسی علاقے کے فتح ہونے کی صورت ہی کی بنا پر کی گئی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ قانونی افسانہ تھا، جو بعد میں تراشا گیا۔ جزیے اور خراج[۷] کے درمیان امتیاز بھی عمرؓ کے زمانے میں پیدا نہ ہوا ہو گا۔ یہ دو اصطلاحیں شروع میں بہ طورِ مترادف استعمال ہوتی رہیں۔ دونوں کے معنی اس رقم کے تھے جو وصول کی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں لفظ جزیہ صرف ایک مقام پر آیا ہے (۹ : ۲۹)۔ اسی طرح لفظ خراج بھی ایک ہی مقام پر وارد ہوا ہے (۲۳ : ۷۲) اور وہاں اس سے مراد مالیۂ زمین نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بنو امیّہ کے زمانے تک جزیے اور خراج کی اصطلاحوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

جزیہ نچلے درجے کا خراج تھا اور یہ سال بھر میں یک مشت وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار خوشحال لوگوں سے چار دینار تھی[۸]، درمیانے

---

۵ (مترجم — یہ پورا بیان بے بنیاد ہے۔ مسلمانوں نے کبھی کسی سرزمین کی حفاظت کو اپنا اجارہ قرار نہیں دیا، لیکن وہ دوسروں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کر سکتے تھے اور مجبور نہیں کیا۔ انھیں اجازت دے دی کہ جزیہ دے کر اطمینان سے بیٹھیں۔ فوجی خدمت انجام دینا چاہیں تو شوق سے آئیں۔ جزیہ معاف ہو گا۔ اسے نامساوات قرار دینا بھی زیادتی ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت مسلمانوں کی طرح ذمیّوں سے بھی جبراً جنگی خدمات لیتی تو الزام دیا جاتا کہ مسلمانوں نے قوت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انھیں مختار بنا دیا گیا تو اب الزام دیا جا رہا ہے کہ نامساوات کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے جواب میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔)

۶ الماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ، مرتبہ انجر Enger ص ۲۵۳ - ۲۵۶، امام ابویوسف کی کتاب الخراج ص ۴۶، بلاذری ص ۱۲۰، ۱۲۱، ترجمہ ص ۱۸۶ - ۱۸۷۔

۷ لفظ خراج یا تو یونانی لفظ Choragia سے نکلا ہے یا آرامی سے۔

۸ دینار عربی لفظ ہے، جو یونانی، لاطینی لفظ دیناریوس Denarius سے نکلا ہے۔ یہ زمانۂ خلافت میں سنہری سکّہ تھا، جس کا وزن چار گرام تھا۔ عمرؓ کے زمانے میں دینار دس درہم کے برابر تھا۔ بعد میں بارہ درہم کے برابر ہو گا۔

درجے کے لوگوں سے دو دینار اور غریبوں سے ایک دینار۔ عورتیں، بچے، درویش، بہت بوڑھے اور بیمار اس سے مستثنیٰ تھے؛ بشرطیکہ ان کے پاس آمدنی کے مستقل ذریعے نہ ہوتے۔ زمین کا مالیہ قسطوں میں لیا جاتا تھا، مویشی اور پیداوار سے یہ مالیہ بصورت جنس ادا ہوتا تھا۔ سؤر اور شراب قرآن کے رو سے ممنوع تھے۔ ان کے علاوہ اسلامی فوجوں کی امداد کے لیے وقتاً فوقتاً خاص ٹیکس بھی لگائے جاسکتے تھے۔

فوجی منطقے

جابیہ کی مجلس شوریٰ نے شام کو انتظامی نقطۂ نگاہ سے چار فوجی حلقوں میں بانٹ دیا تھا۔ ہر حلقے کو اصطلاح میں جُند کہتے تھے اور یہ حلقے بیزنطینی صوبوں کی اس تقسیم کے مطابق تھے، جو تسخیر شام کے وقت رائج تھی۔ چار حلقے یہ تھے: دمشق، حمص، اردن اور فلسطین۔ اردن میں جلیل بھی شامل تھا۔ آگے چل کر یزید ابن معاویہؓ نے ایک نیا حلقہ پیدا کیا، جس کا نام حلقۂ قنسرین تھا۔ یہ حمص سے الگ کر لیا گیا تھا اور اس میں انطاکیہ، منبج (ہیراپولس) اور الجزیرہ (دوآبہ دجلہ و فرات) بھی شامل تھے؛[1] خلیفہ عبدالملک نے الجزیرہ کو الگ کر کے ایک مستقل جند (فوجی حلقہ) بنا دیا۔ ابتدا میں جابیہ کو مرکز کے طور پر استعمال کیا گیا، پھر دوسری فوج کی چھاؤنیاں تیار ہو گئیں۔ مثلاً حمص، عمواس[2]، طبریہ (برائے اردن) اور لد (برائے فلسطین)؛ آگے چل کر لُد کی جگہ رملہ نے لے لی۔

عرب سپاہی اپنے اہل و عیال ان چھاؤنیوں میں لے آئے اور وہ مفتوحہ علاقوں کے نئے شہر بن گئے۔ ان میں سے بہتیرے لوگوں کی بیویاں یا کنیزیں وہ عورتیں تھیں، جو دورانِ جنگ میں اسیر ہوئیں۔ جنگجوؤں اور مدافعوں کی حیثیت میں انھیں جو حقوق و رعایات حاصل تھیں، وہ بعد میں آنے والے عربوں کو حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان سب پر ایک سالارِ اعظم اور حاکمِ عام مقرر تھا، جس کی ذات میں انتظامیہ، عدلیہ اور عسکریہ کے وظیفے جمع تھے۔ حکومت کا وہی سلسلہ قائم رکھا گیا، جو بیزنطینیوں نے جاری کر رکھا تھا۔ جن مقامی افسروں نے ملک کی تسخیر کے وقت جگہ نہیں چھوڑی تھی، انھیں بدستور منصبوں پر قائم رکھا گیا۔ عربوں کے پاس ایسے تربیت یافتہ آدمی بھی تھے، جو ان کا کام سنبھال سکتے۔ مزید برآں ان کا خاص وظیفہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کا ضبط و نظم قائم رکھیں۔ اور محاصل جمع کرتے رہیں۔[3] ابتدائی دور میں عربوں کے صوبائی نظام کی وضع قطع فوجی تھی اور وہ مالیے کی فراہمی سے سروکار رکھتا تھا۔ شام، مصر اور عراق تینوں جگہ یہی کیفیت تھی۔

طاعون عمواس

جابیہ میں جس سال مجلس شوریٰ ہوئی (۱۸ھ – ۶۳۹ء) اس سال کے اختتام سے پہلے ایک خوفناک وبا بصورتِ طاعون پھوٹ پڑی۔ اس کی ابتدا عمواس سے ہوئی تھی۔ پھر یہ پھیلی اور فوجوں میں سخت تباہی پھیلائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں بیس ہزار کے قریب افراد لقمۂ اجل

---

[1] یعقوبی جلد اوّل ص ۱۳۶–۱۳۷۔ بلاذری ص ۱۳۰–۱۳۲۔ ترجمہ ۲۰۲–۳۰۳۔ نیز یعقوبی جلد دوم ص ۱۰۶۔ نقشہ بھی ملاحظہ کیجیے۔

[2] قدیم Emmaus

[3] دیباؤسن ص ۲۰،۱۸، ۲۱ ترجمہ مارگریٹ جی ویر Weir The Arab Kingdom and its Fall ص ۲۸، ۳۲۔

ہوئے۔ سالارِ اعظم ابو عبیدہؓ[1] اور ان کے جانشین یزیدؓ بن ابو سفیان) نے بھی اسی میں وفات پائی[2]۔ پھر عمرؓ نے یزیدؓ کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی معاویہؓ کو مقرر کر دیا۔ یہ ۶۴۰ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد بیس سال تک معاویہؓ حاکمِ شام کی حیثیت میں تمام معاملات پر حاوی رہا۔ مزید بیس سال کے لیے اس نے دنیائے اسلام کے خلیفہ کی حیثیت میں حکومت کی۔ معاویہؓ کے عہد میں شام مرکزِ حکومت بن گیا۔ اور اسے امتیاز و برتری کا وہ درجہ حاصل ہوا جو کم و بیش ایک صدی قائم رہا۔

معاویہؓ بحیثیتِ حاکم

معاویہؓ نے بہ حیثیتِ حاکم جو پالیسی اختیار کی تھی، بہ حیثیت خلیفہ بھی اسی پر کاربند رہا اور اسے شہرت کے عربی ایوان میں ایک مستقل اور نمایاں جگہ حاصل ہو گئی۔ اس نے پالیسی کا نقطۂ آغاز یہ بنایا کہ شامی رعایا کے ساتھ تعلقات خوش گوار رہائے۔ وہ لوگ ابھی تک مسیحی تھے۔ اور ان میں عرب قبیلے بھی تھے، جیسے غسانی۔ وہ ظہورِ اسلام سے بیشتر شام میں آباد ہو گئے تھے اور مسیحیت قبول کر لی تھی۔ ان میں سے بعض قبیلوں کا تعلق جنوبی عرب سے تھا۔ ان کے برعکس جو نئے عرب وہاں پہنچے تھے، وہ شمالی عرب کے باشندے تھے۔ معاویہؓ نے ایک یعقوبی مسیحی عورت سے شادی کی، جس کا نام میسون تھا۔ وہ جنوبی عرب کے ایک فرد بحدل کلبی کی صاحبزادی تھی۔ میسون اپنے آبائی مذہب پر قائم رہی۔ معاویہؓ کا فرزند یزید اسی کے بطن سے تھا۔ مزید براں معاویہؓ کا ذاتی طبیب، نیز درباری شاعر بھی مسیحی تھے۔ مالی انتظامات کے لیے معاویہؓ نے منصور بن سرجون کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ عرب مؤرخ اس امر پر خاص زور دیتے ہیں کہ نئے حاکم کی دانشمندانہ اور رواداراںہ پالیسی کے باعث شامیوں کا احساس وفاداری کمال پر پہنچ گیا تھا۔[3]

پھر معاویہؓ نے صوبے کو مستقل بنیادوں پر منظم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس وقت تک عرب فوج کی حیثیت خام مسالے کی تھی۔ معاویہؓ نے اسے منظم کر کے اسلام میں پہلی باقاعدہ جنگی قوت مہیا کر دی۔ قدیم زمانے سے فوج قبائلی بنیادوں پر چلی آتی تھی، معاویہؓ نے اسے منسوخ کر دیا۔ اس کاروبار میں مرکزِ حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عمرؓ کے جانشین خلیفہ عثمانؓ (۶۴۴ء۔ ۶۵۶ء) معاویہؓ کے رشتہ دار تھے۔ کیونکہ دونوں قریش کی اموی شاخ کے رکن تھے۔ فوج کو اعلیٰ حیثیت میں برقرار رکھنے کی تدبیر یہ سوچی گئی تھی کہ "بلادِ روم"[4] پر وقتاً فوقتاً حملے کیے جاتے تھے۔

پہلی بحری قوت کا انتظام

معاویہؓ کو ابتدا ہی میں احساس ہو گیا تھا کہ جو صوبہ سمندر کے کنارے واقع ہے، اس کی حفاظت کے لیے محض منظم اور وفادار فوج ہی کافی نہیں، بحری قوت بھی ضرور ہونی چاہیے۔ چنانچہ عکّہ میں جہاز سازی کی گودیاں مل گئیں[5] جن میں بیزنطینیوں نے ضروری سامان تیار کر رکھا تھا۔ معاویہؓ نے ان گودیوں سے اس پیمانے پر کام لیا کہ سکندریہ کے بعد عکّہ دوسرے درجے کا مرکزِ جہاز سازی بن گیا۔

---

[1] دوسرے فاتحوں کی طرح آپ کو بھی ولی اللہ کی حیثیت میں یاد کیا جاتا ہے۔

[2] یعقوبی جلد دوم ص ۱۷۲، طبری جلد اوّل، ابن العساکر جلد اوّل ص ۱۷۱ - ۱۷۷۔

[3] طبری جلد اوّل، مسعودی جلد پنجم ص ۸۰ - ۱۰۴، عقد الفرید جلد اوّل ص ۲۰۷۔

[4] اس سے مراد ایشیائے کوچک ہے۔

[5] دار الصناعہ۔

لبنان کے جنگلوں سے ضرورت کے مطابق جہازوں کے لیے لکڑی مل سکتی تھی۔ آگے چل کر معاویہؓ نے جہاز سازی کا مرکز عکہ سے تبدیل کر کے صور میں قائم کر دیا۔[1] نئے اسلامی بیڑے کے تمام کارکن یونانی اور شامی تھے، جنھیں بحرپیمائی کی روایات سے وافر حصّہ ملا تھا۔

عکہ سے ۶۴۹ء میں پہلی بحری مہم قبرص بھیجی گئی جسے ایک ایسے خنجر کی حیثیت حاصل تھی کہ اس کی نوک قلبِ شام کی طرف تھی۔ معاویہؓ نے خلیفہ عثمانؓ کو لکھا: "یہ جزیرہ اتنا نزدیک ہے کہ اہلِ شام یونانی کتّوں کے بھونکنے اور مرغوں کے بانگ دینے کی آواز سُن سکتے ہیں"[2] عثمانؓ نے نیم دلی سے مہم کی اجازت دے دی؛ لیکن شرط یہ لگائی کہ معاویہؓ اپنی بیوی کو اس مہم میں ساتھ لے جائیں۔ تاکہ شہادت مل جائے، جزیرہ بہت قریب ہے اور اسے بہ سہولت فتح کیا جا سکتا ہے۔[3] اس مہم نے معاویہؓ کو عربی تاریخوں میں پہلا امیر البحر[4] بنا دیا۔ عثمانؓ کے پیشرو عمرؓ نے بحری مہم کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح افریقہ پر حملے کی اجازت نہیں دی تھی۔ عمرؓ نے عمروؓ بن العاص کے نام جو ہدایات بھیجی تھیں، ان سے وہ خوف صاف واضح ہوتا تھا، جو صحرائی طبعاً سمندر کے متعلق محسوس کرتا ہے۔ عمرؓ نے لکھا تھا کہ میرے اور تیرے درمیان پانی حائل نہ ہونا چاہیے اور کسی ایسی جگہ فوجی کیمپ نہ بننا چاہیے جہاں میں اپنی سواری پر تمھارے پاس نہ پہنچ سکوں۔[5]

بزنطینی بیڑے کی تباہی

اسلام کی تاریخ میں پہلی بحری مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبرص قبضے میں آ گیا۔ دوسری مہم ۶۵۴ء) رودس تک جا پہنچی۔ دو سال بعد رودس کا وہ دیوپیکر مجسمہ جو اپولو کے نام پر بنایا گیا تھا اور ایک سو بیس فٹ بلند تھا، ایک کہنہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مجسمے کی دھات کے ٹکڑے اٹھانے کے لیے اسے نو سو اونٹوں سے کام لینا پڑا۔ یہ مجسمہ دنیا کے قدیم سات عجائبات میں سے تھا۔ ۶۵۵ء میں شامی بیڑا بسر بن ابی ارطاۃ کی سرکردگی میں نکلا اور اس نے مصری بیڑے کے تعاون سے بزنطیم کی بحری قوّت کا مقابلہ کیا، جس کی قیادت خود شاہ کانسٹنس ثانی ابن ہرقل کر رہا تھا۔ لیسیا کے ساحل سے قریب فونکس (موجودہ فینیکی) میں جنگ ہوئی۔ اسلام کی پہلی عظیم الشّان بحری فتح تھی۔ عرب مؤرّخوں نے اسے جنگ "ذی صواری" یا "ذات الصوری" قرار دیا ہے[6] (مستولوں کی جنگ) اس کی وجہ یا تو یہ تھی

---

[1] بلاذری ص ۱۱۷، ۱۱۸، ترجمہ ۱۸۱، لاسٹرانج Palestine under the Moslems ص ۳۴۲

[2] طبری جلد اوّل

[3] بلاذری ص ۱۵۲-۱۵۳، ترجمہ ۲۳۵-۲۳۶۔

[4] امیر البحر کا لفظ انگریزی زبان میں ایڈمیرل کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ لفظ اسی وقت یورپ پہنچا۔ جب عربوں کو ہسپانیہ میں زبردست قوّت حاصل تھی۔

[5] یعقوبی جلد دوم ص ۱۸۰، ابن الطقطقا الفخری مرتبہ H. Derenbourg ص ۱۱۴ (مترجم۔ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے متعلق شدید غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اور مصنّف نے بھی اس کا ثبوت دے دیا۔ تعجّب ہے، اس نے یہ نہ سوچا کہ حضرت عمرؓ تو صحرائی ہونے کی حیثیت میں سمندر سے خوف کھاتے تھے، امیر معاویہؓ کہاں کے رہنے والے تھے؟ وہ بھی تو ویسے ہی "صحرائی" تھے، جیسے حضرت عمرؓ تھے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ابتدائی دورِ خلافت حضرت عمرؓ کے نزدیک احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ سنبھل سنبھل کر قدم آگے بڑھایا جائے، نہ ملکی فتوحات ان کا نصب العین تھیں اور نہ وہ فتوحات کے لیے مسلمانوں کی جانیں خواہ مخواہ خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار تھے۔ پھر جیسے جیسے حالات بدلتے گئے مسلمانوں کی پالیسی میں بھی تغیّر آتا گیا۔

[6] ابن الحکم کی کتاب فتوح مصر و اخبارہ مرتبہ چارلس ٹوری Torrey ص ۱۸۹-۱۹۰، طبری جلد اوّل۔

کہ آس پاس سرو کے بے شمار درخت تھے یا اس لیے کہ جنگ میں مستولوں والی بے شمار کشتیوں اور جہازوں نے حصہ لیا تھا۔ عربوں نے اپنے ہر جہاز کو کسی بیزنطینی جہاز سے ملا کر دست بدست لڑائی کا انتظام کر لیا، جس میں انھیں پوری مہارت حاصل تھی اور جس کے وہ عادی تھے۔ اس جنگ نے بیزنطینیوں کی بحری قوت سے وہی سلوک کیا، جو جنگ یرموک نے ان کی بری قوت سے کیا تھا، یعنی بحری قوت بھی بری قوت کی طرح تقریباً تباہ ہو گئی[1]۔ طبری لکھتا ہے کہ سمندر مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا[2]۔

تاہم معاویہؓ ان فتوحات سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا، جو بری اور بحری فائدوں نے حاصل کی تھیں۔ کیونکہ دنیائے اسلام داخلی اضطرابات میں مبتلا ہو گئی تھی اور مختلف ہنگامے خانہ جنگی کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ ۶۵۸ء یا ۶۵۹ء میں معاویہؓ نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ دے کر کانسٹن سے صلح کر لی۔ اس کا ذکر تھیو فینس[3] نے کیا ہے۔ بلاذری نے اس کی جانب محض اشارے پر قناعت کر لی ہے[4]، لیکن یہ خراج جلد سے جلد منسوخ کر دیا گیا اور شمالی سمت کے مستقل دشمن کے خلاف بری اور بحری جنگوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔

---

[1] تھیو فینس ص ۳۳۲ - ۳۴۵ - ۳۴۶ -

[2] جلد اول۔

[3] ص ۳۴۷ -

[4] بلاذری ص ۱۵۹ ترجمہ ۲۴۵ -

بتیسواں باب

خلافتِ راشدہ

١٦۔ جون ۶۵۶ء کو اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ حادثہ پیش آیا کہ خلیفہ[1] خود مسلمانوں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ یہ عثمان رضؓ تھے، یعنی چار خلفائے راشدین میں سے تیسرے خلیفہ۔ انھیں خلفائے راشدین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ بزرگ رسول اللہ (صلعم) سے گہرا تعلق رکھتے تھے، صحبت سے بہ طور خاص مستفید ہوئے اور سیاسی امور کے انتظام میں انھوں نے رسول اللہ (صلعم) کے ارشادات اور نمونۂ عمل کی پیروی میں زیادہ سے زیادہ کوشش کی۔ رسول اللہ (صلعم) کی شخصیت اور طریقِ عمل کا اثر ان خلفا کی زندگی میں بہت نمایاں رہا۔ عثمان رضؓ کے سوا تمام خلفا بہت ابتدا میں ایمان لے آئے تھے۔[2] مدینہ ان کی حکومت کا مرکز تھا۔ ان کی فہرست ذیل میں درج ہے:

نام	عہد حکومت
ابوبکر رضؓ	۶۳۲ء ۔ ۶۳۴ء
عمر رضؓ	۶۳۴ء ۔ ۶۴۴ء
عثمان رضؓ	۶۴۴ء ۔ ۶۵۶ء
علی رضؓ	۶۵۶ء ۔ ۶۶۱ء

ان میں سے کسی خلیفہ نے بھی خلافت اپنے بیٹے کو نہ دی اور نہ کسی نے خاندانِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا انتخاب ایک ایسے عمل کے ذریعے سے ہوتا تھا جسے "بیعت" کہتے تھے۔ اس موقع پر عوام کے لیڈر اور قبیلوں کے شیخ امیدوار کا ہاتھ فعلاً یا بہ طور رمز اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور اسے عہد وفاداری کا نشان سمجھا جاتا۔

خلفائے راشدین کی زندگی نہایت سادہ تھی اور انھوں نے نہایت عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ ابوبکر رضؓ رسول اللہ (صلعم)

---

[1] خلیفہ کے لغوی معنی جانشین کے ہیں، اصطلاحاً اس سے رسول اللہ صلعم کے جانشین مراد ہیں، جو رسالت کے سوا باقی تمام فرائض انجام دیتے رہے۔ رسول اللہ (صلعم) چونکہ خاتم النبیین تھے۔ اس لیے ان کے بعد نبی کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ اس اعتبار سے خلافت کا منصب محض مدنی منصب تھا۔ اسلام میں پوپوں جیسا کوئی نظام موجود نہ تھا۔ اس کے برعکس جو غلط تصورات شائع ہوئے وہ اٹھارھویں صدی کی پیداوار ہے۔

[2] (مترجم)۔ یہ صحیح نہیں، حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت علی رضؓ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہیں، حضرت ابوبکر رضؓ کی کوشش سے حضرت عثمان رضؓ بھی جلد ایمان لے آئے تھے۔ البتہ عام روایات کے مطابق حضرت عمر رضؓ نبوت کے چھٹے سال ایمان لائے، لیکن اس تقدّم و تاخّر سے جس کا تعلّق بالکل ابتدائی دور سے تھا خلفاء کی حیثیتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سے قریباً تین سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے عرب کو مسخر کیا[۱] اور اسے آسودگی بخشی۔ اپنے اعلیٰ اوصاف اور بلند کردار کی بنا پر 'صدیق' کا لقب حاصل کیا۔ عمرؓ نے ہجری سنہ مقرر کیا، وقت کی معلوم دنیا کا بڑا حصہ فتح کرنے کے نگران رہے، انتظامات میں محکمہ دیوان[۲] قائم کیا اور مفتوحہ علاقوں کی حکومتوں کا بندوبست فرمایا۔ ایک ایرانی غلام[۳] کے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے شہادت پائی۔ اس غلام کا مذہب مسیحی تھا۔ عمرؓ اپنے پیچھے ایسی روایات چھوڑ گئے، جن کی وجہ سے انھیں ابتدائی دور کے مسلمانوں میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔

عثمانؓ کا تعلق بنوامیہ سے تھا، اس شاخ کے رئیس رسول اللہ (صلعم) کی وفات سے قریباً دو سال پیشتر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے[۴]۔ عثمانؓ ہی کے عہد میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب مکمل ہوئی اور اللہ کے کلام کو آخری غیر متبدل شکل ملی[۵]۔ اس شکل میں یہ اب تک محفوظ ہے۔ عثمانؓ کے عہد میں ایران، آذربائیجان اور آرمینیا کے ایک حصے کی تسخیر مکمل ہوئی۔ لیکن یہ عہد نزاعات سے پاک نہ رہا۔ خلیفہ نے اپنے ایک رضاعی بھائی کو مصر کا گورنر بنا دیا، ایک سوتیلے بھائی کو کوفہ کی حکومت دے دی، ایک چچیرے بھائی[۶] کو مالیات کا مختار بنا دیا علاوہ بریں خویش پروری اور بے ضابطگی کے الزامات بھی لگائے گئے اور ان تین اصحاب نے بے چینی کے احساسات کو ہوا دی، جو خلافت کے آرزو مند تھے۔ یہ تینوں قریشی تھے اور علیؓ کو ان سب پر تقدم حاصل تھا[۷]۔

علیؓ کو ابتدا ہی سے سرگرم حامیوں کی ایک جماعت مل گئی، جن کا مذہبی عقیدہ یہ تھا کہ ۶۳۲ء میں رسول اللہ (صلعم) کے بعد علیؓ اور صرف علیؓ کو جانشین بننا چاہیے تھا، اوّل اس لیے کہ وہ رسول اللہ (صلعم) کے چچیرے بھائی تھے، دوم اس لیے کہ وہ دوسرے یا تیسرے مسلمان تھے، سوم اس لیے کہ وہ رسول اللہ (صلعم) کی صاحبزادی فاطمہؓ کے شوہر اور حسنؓ و حسینؓ کے والد تھے۔ حسنؓ اور حسینؓ ہی رسول اللہ (صلعم) کے اخلاف تھے۔ علیؓ کے حامی کہتے تھے کہ ان وجوہ کی بنا پر سب سے پہلے علیؓ ہی کو رکھنا چاہیے تھا۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ خلافت اسلام میں بلند ترین عہدہ ہے، اسے انتخاب کرنے والوں کے افکار و رجحانات پر نہیں چھوڑا

---

[۱] اس محکمے میں جمع خرچ کا رجسٹر رکھا جاتا تھا اور یہ غالباً ایرانیوں سے لیا گیا تھا، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ فخری ۱۱۶، ماوردی ص ۳۴۳ - ۳۴۴ حتی، تاریخ عرب ص ۱۷۲

[۲] طبری جلد اوّل ص ۲۷۲ - ۲۷۳ یعقوبی جلد دوم ص ۱۸۳

[۳] (مترجم - یعنی فتح مکہ کے وقت)

[۴] (مترجم - اللہ کا کلام پہلے بھی مرتب تھا اور ترتیب رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک ہی میں ہو چکی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اختلاف قرأت کو دور کیا، جو الفاظ کی بنا پر نہیں، بلکہ مختلف حصوں کے لب و لہجہ کی بنا پر پیدا ہو گیا تھا۔

[۵] مروان بن الحکم جو آگے چل کر خلیفہ بن گیا۔

[۶] (مترجم - مصنف کا یہ پورا بیان بالکل غلط ہے۔ حضرت علیؓ یا حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ میں سے کوئی بھی بہ طورِ خود خلافت کا آرزومند نہ تھا۔ حضرت علیؓ تو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے تدبیریں فرماتے تھے، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور خود حضرت عائشہؓ کو (جو موقع پر موجود نہ تھیں، بلکہ مکہ معظمہ میں تھیں) غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے خلیفۂ شہید کے خون کا معاملہ پیش کرایا۔ حضرت علیؓ خلافت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اسی وجہ سے تیار ہوئے کہ پورا نظام درہم برہم ہو رہا تھا اور نارکی پھیل رہی تھی، اب پہلا کام یہ تھا کہ انارکی ختم ہوتی اس کے بعد قاتلوں کی جانچ ہوتی۔ ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔ گویا مقصد ہی قطعاً اختلاف نہ تھا۔ صرف غلط فہمیوں نے معاملے کو طول دے دیا اور جب باہم بات چیت ہوئی تو غلط فہمی زائل ہو گئی)

جا سکتا تھا۔ اس کے لیے اللہ اور رسول (صلعم) نے انتظامات کر دیے ہوں گے اور علیؓ ہی اس منصب کے لیے نامزد ہوئے تھے۔ اس استدلال کے مطابق صرف علیؓ ہی رسول اللہ صلعم کے صحیح جانشین تھے اور علیؓ کے بعد ان کی اولاد میراث کی بنا پر اس منصب کی حق دار رہی۔

علویوں نے کوفہ میں ایک مضبوط گروہ منظم کر لیا تھا۔ وہیں سے عثمانؓ کے خلاف سرکشی کی ابتدا ہوئی پھر یہ سلسلہ مصر پہنچا اور وہاں سے قریباً پانسو باغی مدینہ آ گئے۔ یہ اپریل ۶۵۵ء کا واقعہ ہے، مسن رسیدہ خلیفہ اپنے مکان میں بند ہو گئے۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے[1] جب باغیوں میں سے ایک نے ان پر تشدد کا پہلا وار کیا۔ یہ ان کے رفیق اور دوست ابوبکرؓ کا بیٹا تھا۔ وہیں علیؓ کی خلافت کا اعلان ہو گیا[2] (۲۴ جون ۶۵۶ء)

علیؓ کا عہد حکومت

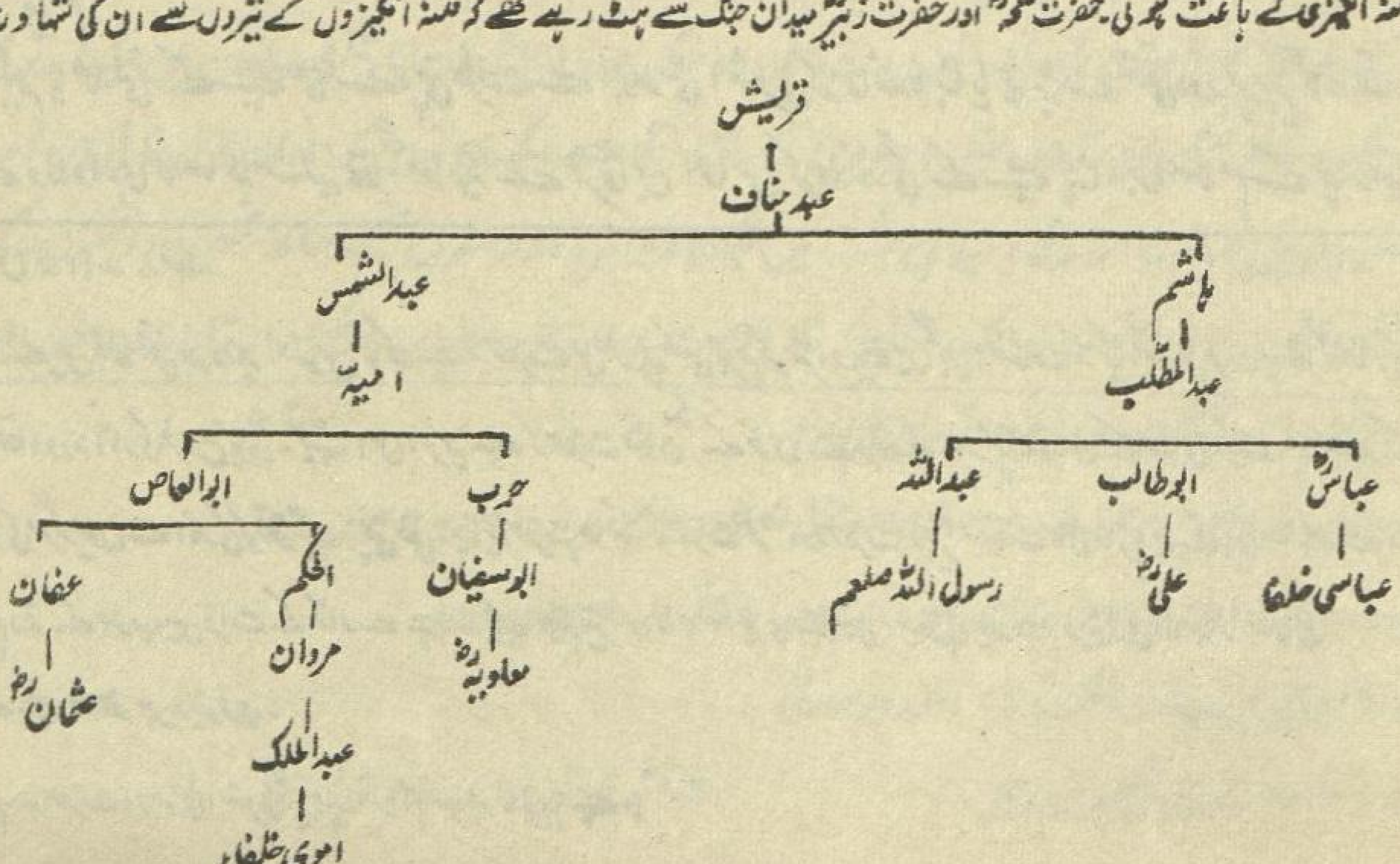
علیؓ کا عہدِ حکومت ابتدا سے آخر تک مشکلات سے لبریز رہا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ خلافت کے باقی دو مدعیوں، طلحہؓ اور زبیرؓ کی مخالفت کیوں کر ختم کی جائے۔ انھوں نے حجاز اور عراق کے ہمنواؤں کو ساتھ لے کر علیؓ کی خلافت کے قبول سے انکار کر دیا۔ اختلاف رکھنے والوں کو رسول اللہ (صلعم) کی محبوب بیوی عائشہؓ کی حمایت سے تقویت پہنچی۔ ۹ دسمبر ۶۵۶ء کو بصرہ کے باہر جنگ ہوئی، جسے اسی وجہ سے جنگ جمل کہا جاتا ہے کہ عائشہؓ اس میں ایک اونٹ پر سوار تھیں۔ علیؓ کے دونوں مخالف اس جنگ میں شہید ہوئے عائشہؓ سے احترام کا برتاؤ کیا گیا، جیسا برتاؤ "ام المومنین" سے لازم تھا۔[3] یوں اسلام میں پہلی خانہ جنگی ختم ہوئی۔ علیؓ کوفہ کے نئے

---

[1] مختلف شہر دعویٰ کرتے رہے کہ وہ نسخہ ان کے پاس ہے جس پر حضرت عثمانؓ کا خون گرا تھا۔ ابن بطوطہ ۱۳۲۶ء میں بصرہ پہنچا تو وہاں کی مسجد بھی اس نسخے کی دعویدار تھی۔ دیکھیے ابن بطوطہ کا سفرنامہ "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار۔"

[2] (مترجم) یہ پورا بیان غلط ہے۔ نہ محمد ابن ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا۔ وہ اگرچہ حملہ آور گروہ میں شامل تھے، مگر الگ ہو گئے تھے۔ نہ حضرت علیؓ کی خلافت کا وہاں اعلان ہوا، بلکہ تین روز بعد لوگوں کے شدید اصرار پر حضرت علیؓ بیعت لینے کے لیے آمادہ ہوئے۔

[3] یہ جنگ مخالفوں کی فتنہ انگیزی کے باعث ہوئی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ میدان جنگ سے ہٹ رہے تھے کہ فتنہ انگیزوں کے تیروں سے ان کی شہادت ہوئی۔



دارالحکومت میں بلا اختلاف خلیفہ قرار پائے، مگر کچھ دیر بعد دوسری خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔

معاویہؓ میدان مقابلہ میں

صوبوں کے حاکموں میں سے صرف ایک نے حلف اطاعت سے انکار کیا، یہ معاویہؓ تھے جو شام کے حاکم اور عثمانؓ کے رشتہ دار تھے۔ وہ شہید خلیفہ کے خون کا بدلہ لینے کے دعویدار بن گئے تھے۔ انھوں نے دمشق کی جامع مسجد میں عثمانؓ کا خون آلود کرتا نیز عثمانؓ کی بیوی نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھائیں، جس نے شوہر کو بچانے کی کوشش کی تھی[1]۔ معاویہؓ نے ذاتی مقاصد کو چھپائے رکھا اور علیؓ کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ یا تو قاتلوں کو سزا دی جائے یا خلیفہ کی شہادت میں شرکت تسلیم کی جائے۔ علیؓ مجرموں کو سزا نہ دیتے تھے اور نہ دے سکتے تھے[2]۔ بنیادی طور پر یہ مسئلہ شخصیتوں سے تجاوز کر گیا اور اس نے اس سوال کی صورت اختیار کر لی کہ آبادیٔ اسلام کی قیادت عراق کو ملنی چاہیے یا شام کو، کوفہ کو ملنی چاہیے یا دمشق کو۔ مدینہ اس مسابقت کے دائرے سے باہر نکل گیا تھا۔ وسیع فتوحات نے مرکز ثقل شمالی جانب منتقل کر دیا تھا اور سابق دارالحکومت کی حیثیت معمولی رہ گئی تھی۔

دوسری خانہ جنگی

صفین[3] کے میدان میں دو فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ایک عراق کی فوج تھی جس کے سالار علیؓ تھے، دوسری شام کی فوج تھی، جس کی قیادت معاویہؓ کر رہے تھے۔ ہفتوں کی نوک جھونک کے بعد ۲۶ جولائی ۶۵۷ء کو لڑائی ہوئی، تین روز کی خون ریز جنگ کے بعد علیؓ فیصلہ کن فتح حاصل کرنے والے تھے۔ جب قرآن مجید نیزوں پر باندھ کر بلند کر دیے گئے۔ یہ تدبیر معاویہؓ کے معاون عمروؓ ابن العاص کی تھی۔ اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ ہتھیاروں کے بل پر فیصلہ کے بجائے قرآن مجید کا فیصلہ قبول کیا جائے۔ لڑائی رک گئی۔ علیؓ نے اپنے نفوق ملی اور سلامت طبع کی بنا پر معاویہؓ کی تجویز منظور کر لی، یعنی یہ کہ خدا کے کلام کی بنا پر ثالثی ہو جائے اور اس طرح مسلمان خون ریزی سے محفوظ رہیں[4]۔

تحکیم

تحکیم یا ثالثی کے لیے علیؓ نے اپنی طرف سے ابوموسیٰ اشعری کو نمائندہ بنایا یہ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، لیکن علیؓ کے قاصد سے وفاداری کا معاملہ مشتبہ تھا[5]۔ معاویہؓ نے عمروؓ ابن العاص کو نمائندگی کے لیے چنا، جو اسلام کے چار سیاسی بالغ نظروں

---

[1] فخری ص ۱۲۵ – ۱۲۷۔

[2] اس بارے میں غلط فہمی حد درجہ افسوس ناک ہے۔ حضرت علیؓ نے کسی مجرم کو سزا دینے میں کبھی اختلاف نہ کیا۔ سوال صرف یہ تھا کہ انارکی کو ختم کیے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا ورنہ انارکی فروغ پاتی۔ تعجب اس امر پر ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خون کے دعوے دار اپنے خیال کے مطابق ایک اہم مقصد کے لیے کوشاں تھے مگر حقیقۃً انہی کی سرگرمیوں سے انارکی کو تقویت پہنچتی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حقیقت حال واضح ہوتے ہی مطالبے سے دست بردار ہو گئے۔

[3] یہ مقام رقہ کے جنوب میں فرات کے کنارے ہے۔ دیکھیے یعقوبیز ص ۲۰۴، طبری جلد اوّل، یعقوبی جلد دوم دینوری الاخبار الطوال۔

[4] تحکیم کے لیے ملاحظہ ہو دینوری۔

[5] (مترجم — حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ پر ایسا الزام سراسر نازیبا ہے۔)

(دو یا تین) میں سے ایک تھے[1] معاویہؓ بھی ان چار میں شمار ہوتے تھے۔ دونوں حکموں (ثالثوں) میں سے ہر ایک کے ساتھ چار چار سو گواہ موجود تھے۔ انھوں نے ایک اجلاس جنوری ۶۵۹ء میں بہ مقام اذرح منعقد کیا، جو دمشق سے مدینہ تک کے کاروانی راستے پر واقع ہے۔

عام رائے یہ ہے کہ دونوں حکموں نے نجی طور پہ اتفاق کر لیا تھا، دونوں بڑے امّیدواروں (علیؓ اور معاویہؓ) کو الگ کر دیا جائے تاکہ ازسرِ نو مجلس شوریٰ منعقد کرنے کا راستہ ہموار ہو جائے۔ دونوں میں سے ابوموسیٰؓ عمر میں بڑے تھے۔ پہلے وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں اپنے امّیدوار کی خلافت کو کالعدم قرار دیتا ہوں۔ بعد ازاں عمروؓ بن العاص نے کہا کہ میں اپنے امّیدوار کے منصب خلافت کی تصدیق کرتا ہوں اس طرح خود ابوموسیٰؓ سے بھی چال چلی گئی[2]۔ دورِ حاضر کے نقّاد عالموں کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل دونوں کی معزولی کا فیصلہ ہوا تھا۔ لیکن عملاً صرف حضرت علیؓ ہی معزول ہوئے، اس لیے کہ وہی خلیفہ تھے۔ معاویہؓ سرے سے خلیفہ تھے ہی نہیں[3]۔ اس میں شبہہ نہیں کہ تحکیم نے معاویہؓ کی پوزیشن اٹھا کر علیؓ کے برابر کر دی تھی یا علیؓ کی پوزیشن گھٹا کر معاویہؓ کے برابر پہنچا دی تھی۔ بہر حال حکموں کے فیصلے نے علیؓ کو اس منصب سے محروم کر دیا، جو انھیں حاصل تھا اور معاویہؓ صرف ایک بے بنیاد دعوے سے محروم ہوئے، جسے وہ برسرِ عام پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ تحکیم سے دو سال بعد معاویہؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ اس وقت علیؓ شہادت پا چکے تھے۔

۲۴ جنوری ۶۶۱ء کو علیؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد کوفہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک خارجی نے زہر آلود خنجر ان کی پیشانی پر مارا خارجی پہلے علیؓ کے معاون تھے، بعد میں الگ ہو گئے اور انھوں نے ایک نیا نعرہ ایجاد کیا کہ لاحکم الاّ للہ (اللہ کے سوا کسی کو حکم کا حق حاصل نہیں[4]) اور وہ علیؓ کے جانی دشمن بن گئے۔ ان کا فرقہ اسلام میں سب سے پہلا فرقہ تھا۔ اس قتل کے محرکات دراصل ذاتی اغراض تھے۔ جس پوشیدہ مقام پر علیؓ کو کوفہ میں دفن کیا گیا تھا۔ اسے امویوں کے عہد نیز عباسیوں کے ابتدائی عہد میں مخفی رکھا گیا تھا[5] ۷۹۱ء میں ہارون الرّشید کو اس کا پتا مل گیا۔ یہی نجف کا مشہد علیؓ ہے[6] جو مسلمانوں کے نزدیک زیارت کا ایک بڑا مرکز ہے اور شیعہ اسے سب سے بڑا مرکز قرار دیتے ہیں۔

وفات کے بعد علیؓ کا اثر بہت بڑھ گیا۔ شیعوں نے انھیں امام اکبر اور ولی اللہ جان لیا۔ ممکن ہے ان میں ایک مدبّر کی خصوصیتیں کسی قدر کم ہوں، لیکن وہ خصوصیتیں بوجہ اتم موجود تھیں، جو عربوں کے نقطۂ نگاہ سے ایک انسان کو انسان کامل بناتی ہیں، وہ خطبوں میں فصیح اللّسان، شوریٰ میں صائب الرّائے، میدانِ جنگ میں شجاع و جوانمرد، دوستوں کے ساتھ مخلص اور دشمنوں کے لیے کریم النفس تھے، روایات نے انھیں اسلامی فتوحات کا ایک مثالی پیکر بنا دیا، بہت سے امثال، خطبات، حکیمانہ ارشادات، اشعار، اور حکایات علیؓ

---

[1] مسعودی جلد چہارم ص ۳۹۱، ابن حجر الاصابہ فی تمیز الصّحابہ جلد پنجم ص ۳۔

[2] فخری ص ۱۲۷ — ۱۳۰۔ یعقوبی جلد دوم ص ۲۲۰ — ۲۲۲ طبری جلد اوّل، مسعودی جلد چہارم ص ۳۹۲ — ۴۰۲۔

[3] ملاحظہ ہو Lammens ص ۱۷، ۲۲، ولہاؤسن ص ۵۷ — ۵۹ — کاشانی جلد دہم ص ۶ — ۲۶۔

[4] فخری ص ۱۳۰ — قرآن مجید میں ہے "ان الحکم الاّ للہ" (سورۂ یوسفؑ)

[5] مشہد کے ابتدائی حالات کے لیے دیکھیے ابن حوقل۔ [6] مشہد کا مطلب ہے مقام شہادت۔

کے گرد وپیش جمع ہوگئی ہیں اور آپ کی حیثیت سلیمانؑ کی سی بن گئی ہے۔ آپ جو تلوار استعمال کرتے تھے، اس کا نام ذوالفقار تھا کہا جاتا ہے کہ یہ تلوار پہلے رسول اللہ صلعم نے جنگ بدر میں استعمال کی تھی۔ اس تلوار کو بار بار کے دہرائے ہوئے شعر نے لافانی بنا دیا ہے:

لا فتیٰ الّا علی　　　　لا سیف الّا ذوالفقار

(کوئی جوانمرد علی کا ثانی نہیں اور نہ کوئی تلوار ذوالفقار کی برابری کر سکتی ہے)

مسلمانوں میں "فتیان" کی جو تحریک جاری ہوئی، اس میں حضرت علیؓ کو بہ طور نمونہ پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اس تحریک نے انھیں اصول وضوابط پر فروغ پایا، جن پر قرونِ وسطیٰ کا نظام مردانگی مبنی تھا۔ درویشوں کی بہت سی برادریوں نے بھی علیؓ ہی کو اپنے لیے مثال بنایا اور اپنا سرپرست قرار دیا۔ شیعوں کے نزدیک وہ معصوم تھے اور غالیوں نے انھیں معبودیت کے درجے تک پہنچا دیا۔

تینتیسواں باب

امیر معاویہؓ

اموی خلافت کی تاسیس

۶۶۱ء کے اوائل میں بہ مقام ایلیا (یروشلم) معاویہؓ کی خلافت کا اعلان ہوا[1]۔ دمشق نئی خلافت کا مرکز قرار پایا۔ قدیم آرامی دارالحکومت اور بیزنطینی حکومت کے مرکز کے مقابلے میں یروشلم بدوؤں اور عربوں سے نزدیک تر تھا۔ بندرگاہوں پہ بحری حملے ہو سکتے تھے۔ مدینہ اور کوفہ کا پس منظر سراسر صحرائی تھا[2]۔

معاویہؓ کے سامنے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ خلافت کے دوسرے مدعیوں سے نجات حاصل کرے اور سلطنت میں امن و استحکام پیدا کر دے۔ اس کام میں امداد کے لیے خوش نصیبی سے ایسے کارکنوں کا ایک گروہ مل گیا، جیسے بعد ازاں اسلام میں بہت کم پیدا ہوئے عمروؓ ابن العاص کو معاویہؓ کے دستِ راست کی حیثیت حاصل تھی۔ عمروؓ نے ۶۵۸ء میں مصر کو علوی حاکم سے چھین لیا تھا، یوں وہ دوبارہ فاتح مصر بنا۔ اب وہ معاویہؓ کی جانب سے وہاں حکومت کر رہا تھا۔ اور ۶۶۳ء میں وفات تک بہ دستور حاکم مصر رہا۔ حجاز میں نئے خلیفہ سے وفاداری میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار نہ ہوا۔ مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کے باشندے یہ نہیں بھولے تھے کہ امیہ خاندان کے افراد بہت بعد میں ایمان لائے تھے اور ان کا ایمان مصلحت پر مبنی تھا[3]۔ تاہم گہوارۂ اسلام نے اس وقت کوئی مشکل پیدا نہ کی۔ عراق نے علیؓ کے فرزند اکبر حسنؓ کی حمایت کا اعلان کر دیا[4]۔ اہل عراق کے نزدیک حسنؓ ہی شہید والد کے

---

[1] شوال ۴۰ھ (مسعودی جلد پنجم ص ۱۴)۔ سنہ ۴۱ھ (طبری جلد دوم ص ۴)، نیز یعقوبی جلد دوم ص ۲۵۶۔

[2] (مترجم۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ امیر معاویہؓ کو یروشلم اس لیے ناپسند تھا کہ وہ بدویوں اور عربوں سے قریب تھا۔ کوئی بندرگاہ اس لیے نہیں منتخب کی جا سکتی تھی کہ بیزنطینیوں کی طرف سے بحری حملے کا خطرہ تھا۔ کوفہ یا مدینہ اس لیے تجویز نہ ہوے کہ ان کا پس منظر صحرائی تھا۔ لیکن دمشق کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ امیر معاویہؓ بیس برس سے وہاں مقیم تھے، اور انھیں دمشق سے اک گونہ مناسبت پیدا ہو چکی تھی۔

[3] (مترجم۔ لیکن مصنف یہ فراموش کر گیا کہ خود اہلِ مکہ نے بھی تو زیادہ تر اسی وقت اسلام قبول کیا تھا جب مکہ فتح ہوا تھا یعنی ۸ھ۔ اور ابوسفیان کا اسلام ان سے مقدم تھا، نیز اموی خاندان ہی سے حضرت عثمانؓ بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ مصنف کا یہ قول بداہتہً غیر مناسب ہے۔)

[4] (مترجم۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے آخری وقت میں حضرت حسنؓ کی جانشینی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ "نہ میں کہتا ہوں ایسا کرو اور نہ میں کہتا ہوں ایسا نہ کرو" حضرت علیؓ نے وفات پائی تو طبعاً اہل کوفہ کے لیے مرکزی شخصیت حضرت حسنؓ ہی کی تھی۔ حضرت حسنؓ پہلے سے خانہ جنگی کو روکنے کا فیصلہ کیے بیٹھے تھے، چنانچہ جب معاویہؓ کی پیش قدمی ہوئی تو حضرت حسنؓ نے مقابلہ ترک کر دیا۔ اور صلح کر لی۔ اس طرح رسول اللہ صلعم کی پیش گوئی پوری ہو گئی کہ میرا بیٹا (حسنؓ) مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔

جائز وارث تھے۔ اس سلسلے میں فوجی مہم کی ضرورت پیش آئی اور معاویہؓ نے فریقِ ثانی کی طرف سے بہت جلد دست برداری حاصل کر لی۔ حسنؓ کے لیے گراں قدر وظیفے کا فیصلہ ہو گیا، جس کی مقدار خود انھوں نے مقرر کی وہ معاویہؓ کے حق میں خلافت ترک کر کے مدینہ پہنچ گئے اور وہاں امن و راحت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ وظیفہ عمر بھر کے لیے مقرر ہوا تھا اور اس کی مقدار پچاس لاکھ درہم تھی جو کوفہ کے خزانے اور ایک ایرانی علاقے کے مالیے سے وصول ہوتا تھا، ساتھ ہی بیس لاکھ درہم حسنؓ نے اپنے بھائی حسینؓ کے لیے مقرر کرا دیے[1]۔ قریباً آٹھ سال بعد حسنؓ نے مدینہ میں وفات پائی۔ اس وقت پینتالیس سال عمر تھی۔ بہ ظاہر انھیں دق کی بیماری تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی وفات زہر سے ہوئی ہو۔ جیسے حرم کی ایک سازش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے عقیدت مند معاویہؓ کو ملزم گردانتے ہیں، اور حسینؓ کو شہید بلکہ سید الشہدا قرار دیتے ہیں۔

عراق میں امن

کوفہ رقابت میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے غرور کا سر نیچا ہو چکا تھا، تاہم اس میں سرکشی باقی تھی۔ سنہ ۶۶۱ء میں معاویہؓ نے مغیرہ بن شعبہ ساکنِ طائف کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جسے خلیفہ عمرؓ نے اس لیے بصرہ کی حکومت سے برطرف کیا تھا کہ اس کے اخلاق اچھے نہ تھے[2]۔ مغیرہ کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ اگر اسے سات دروازوں کے اندر بھی بند کر دیا جائے تو وہ چالاکی سے تمام قفلوں کو توڑنے کا بندوبست کر لے گا۔ علیؓ کی شہادت کے بعد جو افراتفری پھیلی تھی، اس میں مغیرہؓ نے معاویہؓ کی طرف سے حاجیوں کے قافلوں کی نگرانی کی سند خود بہ خود تیار کر لی تھی۔ گورنر کی حیثیت میں اس نے خارجیوں کو شیعوں کے خلاف اور شیعوں کو خارجیوں کے خلاف استعمال کیا۔ علویوں کی مخالفت دبا دی، اور اپنے زیرِ حکومت علاقے میں امویوں کا اقتدار قائم کر دیا۔ اس طرح وہ بھی اسلام کے چار بالغ نظر سیاست دانوں (دھاۃ) میں سے ایک شمار ہوتے تھے۔

مغیرہ کے بعد اس کا پروردہ زیاد بن ابیہ کوفہ کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ اسلام کا چوتھا بالغ نظر سیاست دان تھا زیاد نے ایران میں علیؓ کی حمایت کا پرچم بلند کیا تھا۔ معاویہؓ نے اسے غیر معمولی قابلیت کا آدمی دیکھا تو سرکاری طور پر اسے اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کر لیا یعنی ابو سفیانؓ کا فرزند، طائف کی ایک طوائف کے بطن سے۔ چونکہ اس کے نسب کے متعلق شبہہ تھا اس لیے اسے "ابن ابیہ" کہا جاتا تھا۔ زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس کی حکومت میں عراق، ایران اور متعلقہ عربی علاقے بھی شامل تھے۔ گویا سلطنت کے نصف مشرقی حصے کا نائب بن گیا۔ اس وسیع حکومت کے ایک ایک معاملے پر اس کی نظر تھی۔ ہر ضروری بات پر اس کے کان لگے رہتے تھے۔ پھر وہ بڑا زبردست منتظم تھا۔ غرض اس نے تمام علاقوں کو بخوبی سنبھالے رکھا۔ بصرہ اور کوفہ میں عربوں اور بدوؤں کا معاملہ خاصا پریشان کن تھا۔ زیاد نے یہ معاملہ یوں حل کیا کہ پچاس ہزار بدوؤں اور عربوں کو اٹھا کر مشرقِ ایران میں آباد کر دیا[3]۔

---

[1] (مترجم۔ یہ رقمیں میرے نزدیک کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ بعض کتابوں میں حضرت حسینؓ کا وظیفہ دو لاکھ بتایا گیا ہے اور یہ قرینِ قیاس ہے۔ اغلب ہے امام حسنؓ کا وظیفہ پانچ لاکھ ہو۔ پچاس لاکھ اور بیس لاکھ بہت بڑی رقمیں ہیں۔)

[2] بلاذری ص ۲۵۶، ۳۴۴-۳۴۵، ترجمہ ص ۴۱۰۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ جلد ۰۰۰۰۰۰۰۰ چہارم ص ۴۰۷

[3] بلاذری ص ۴۱۰، طبری جلد دوم ص ۸۱، ۱۵۵، ۱۵۶۔

فتوحات کا دوسرا دور

اسلامی علاقوں میں پوری طرح امن قائم ہوگیا تو معاویہؓ کے غیر معمولی قوائے عمل کو دوسرے مخارج کی تلاش ہوئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ اجنبی علاقوں میں بحری اور بری مہمیں بھیجی جائیں۔ بحری مہمیں صرف بیزنطینیوں کے خلاف تھیں۔ معاویہؓ نے جو فتوحات حاصل کیں، انھیں اسلامی علاقوں کی توسیع کا دوسرا دور سمجھنا چاہیے۔ پہلا دور ابوبکرؓ کے عہد میں شروع ہوا تھا اور عمرؓ کے ماتحت کمال پر پہنچا۔

بری توسیع کا سلسلہ مشرقی اور مغربی دونوں جانب شروع ہوا۔ بصرہ مشرقی مہموں کا مرکز تھا، جس پر زیاد حکمران تھا۔ اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ خراسان کی فتح مکمل ہوگئی (۶۶۳ء - ۴۳ھ)۔ پھر اسلامی فوج نے دریائے جیحوں کو عبور کر کے بخارا پر حملہ کیا۔ (۶۷۴ء - ۵۴ھ)[۱] جو بہت آگے ترکستان کے قلب پر واقع تھا۔ مرو، بلخ، ہرات اور دوسرے شہر قبضے میں آگئے، جو آگے چل کر اسلامی ثقافت و حضارت کے شاندار مرکز بنے۔ اسلامی فوج مالِ غنیمت سے لدی ہوئی بصرہ لوٹی، جو انھیں ماوراءالنہر کے خانہ بدوش ترک قبیلوں سے حاصل ہوا تھا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ عربوں اور ترکوں کے درمیان ربط ضبط پیدا ہوا، جو آگے چل کر اسلامی سلطنت میں اہم کردار ادا کرنے والا تھا۔

مغربی جانب توسیع کا قائد و سالار عقبہ بن نافع تھا، جس کی والدہ عمروؓ بن العاص (فاتح و حاکم مصر) کی ہمشیرہ تھی۔[۲] ۶۶۳ء میں نافع کو اس کے خالہ زاد بھائی نے افریقیا (موجودہ افریقہ) کا حاکم مقرر کیا۔[۳] اس نے نئی حکومت میں پہنچتے ہی القیروان[۴] کو بربروں کے خلاف ایک فوجی مرکز بنا لیا۔ نئی چھاؤنی کی تعمیر میں جزوی طور پر قرطاجنہ کا ملبا استعمال کیا گیا اور القیروان آگے چل کر قرطاجنہ ہی کا مسلمان جانشین بن گیا۔ بربر اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تو انھیں اسلامی فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور وہ شمالی افریقہ، بعد ازاں ہسپانیہ کی تسخیر میں معاون ہوئے۔ بربروں کی امداد سے عقبہ بن نافع نے بیزنطینیوں کو شمالی افریقہ کے بہت بڑے حصے سے باہر نکال دیا۔ جس مقام پر عقبہ نے میدانِ جنگ میں شہادت پائی (۶۸۳ء)، وہ اب تک سدی (اسیدی) عقبہ کے نام سے معروف ہے اور بسکرہ (الجزائر) کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں اس کے مقبرے کو ایک اہم قومی زیارت گاہ مانا جاتا ہے۔ الجزائر میں عقبہ کی فوجی پیش قدمی ویسی ہی شاندار تھی۔ جیسی وسط ایشیا میں اس کے معاصر کی پیش قدمی شاندار تھی، لیکن یہ پائدار اہمیت حاصل نہ کر سکی، کیوں کہ مفتوحہ علاقے پر قبضہ نہ کیا گیا۔ ماوراءالنہر کی طرح یہاں بھی دوبارہ تسخیر کی زحمت اٹھانی پڑی۔

دوسرے کارنامے

یہ مہمیں بڑی زبردست تھیں، تاہم ان میں انہماک کے باعث سالارِ اعظم نے داخلی معاملات سے تغافل کو راہ نہ دی سلطنت

---

[۱] یعقوبی جلد دوم ص ۲۵۸۔ بلاذری ص ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ طبری جلد دوم ص ۱۶۶ سے آگے۔ [۲] ابن خلدون کتاب العبر جلد سوم ص ۱۰۔۱۱۔

[۳] اس سے مراد افریقیا ہے کہ چکا ہے، جسے رومی، لاطینی افریقہ کہتے تھے۔ عربوں نے یہ نام رومیوں سے لیا تھا اور علاقہ بربر کے مشرقی حصے کو افریقیا کہتے تھے۔ مغربی حصے کا نام "مغرب" تھا۔

[۴] اصل لفظ ایرانی تھا، یعنی کاروان۔ یہی انگریزی میں جا کر Caravan بن گیا۔ عقبہ بن نافع کی مہموں کے لیے ابن عبدالحکیم کی کتاب دیکھنی چاہیے۔ ص ۱۴۱۔ ۴۴ ۱۹۔ ۱۹۹۔

کے مالی معاملات کا انتظام آلِ سرجون کے قبضے میں رہا، جو قابل اور تجربہ کار رہتے۔ سینٹ جان انھیں کے اخلاف میں سے تھا۔ بیت المال کی یہ کیفیت تھی کہ معاویہؓ نے سپاہیوں کی تنخواہ دگنی کر دی۔ شمالی سرحد کے قلعوں کو خوب مستحکم بنالیا تاکہ شمالی دشمن (بیزنطینی سلطنت) کا کامیاب مقابلہ ہو سکے۔ ان کے علاوہ حجاز میں زراعت و آبپاشی کے منصوبوں پر عمل شروع ہوا ـــــــ اور حجاز ایسا صوبہ تھا جس میں طبعی سہولتوں کے انتظامات بہت کم تھے ـــــــ سب سے آخر میں یہ کہ علویوں اور ہاشمیوں کو وظیفے دے کر مطمئن بھی رکھا گیا۔ ہاشمیوں میں عباسی بھی شامل تھے، جو امویوں کے مقابلے میں ازروئے نسب رسول اللہ (صلعم) سے قریب تر تھے: "تالیفِ قلوب"[1] کا طریقہ رسول اللہ (صلعم) کے عہد سے شروع ہوا تھا۔ شام میں معاویہؓ نے محکمۂ مال بھی قائم کیا، نیز ڈاک کے محکمے کی بنیاد رکھی، جسے "برید" کہتے تھے۔

معاویہؓ نے صلح و جنگ کے جن جن کاموں میں ہاتھ ڈالا، شامی رعایا کی مستقل وفاکیشی اسے حاصل رہی۔ اس رعایا میں مقامی باشندے بھی تھے اور آبادکار عرب بھی۔ شامی عرب زیادہ تر یمنی تھے، نہ کہ حجازی، . . . . . جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اور وہ مسیحیت قبول کر چکے تھے۔ معاویہؓ کی بیوی میسون بھی انھیں میں سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ معاویہؓ نے اسے طلاق دے دی تھی، کیوں کہ اس نے بعض نظموں میں صحرائی زندگی کے لیے ایک خاص تمنا و آرزو کا اظہار کیا تھا،[2] مثلاً:

"ایک خیمہ جس میں سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا پھرے، میرے لیے اونچے
محل سے زیادہ مسرت انگیز ہے۔ اور اون کا سادہ سا لبادہ اس
فاخرانہ لباس سے مجھے زیادہ پسند ہے، جس میں میں آہیں بھرتی رہتی
ہوں مجھے خیمے کے پاس بیٹھ کر سوکھے ٹکڑے کھانا عمدہ روٹیوں کے
مقابلے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پہاڑی وادیوں میں سے گزرنے والی
ہوا کی آواز میرے نزدیک دائرے کی آواز سے بہتر ہے۔"

معاویہؓ نے اپنے مسیحی طبیب ابن اثال کو علاقہ حمص میں مالیات کا منتظم مقرر کر دیا تھا۔ اسلامی وقائع میں ایک مسیحی تقرر کی یہ پہلی مثال تھی۔[3] معاویہؓ کا درباری شاعر اخطل قبیلہ تغلب میں سے تھا اور وہ قبیلہ مسیحی تھا۔ مارونی اور یعقوبی اپنے مذہبی تنازعات تصفیے کے لیے معاویہؓ کے پاس لایا کرتے تھے۔[4] بیان کیا جاتا ہے کہ اوڈیسا میں ایک گرجا زلزلے سے گر گیا تھا اور معاویہؓ نے اسے ازسرِنو تعمیر

---

[1] مترجم۔ تالیفِ قلب کے لیے روپے صرف کرنا زکاۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف ہے، جن کا ذکر سورہ توبہ میں آیا ہے۔ اس کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ اکثر لوگ نہیں کر سکتے جو لوگ اس وقت اسلام میں داخل ہوتے تھے، وہ تمام اعزہ و اقارب کی دشمنی کا ہدف بن جاتے تھے، بلکہ ان کی تمام زندگی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ ایسے لوگوں کی امداد نہ کی جاتی تو وہ تباہ ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ ہر نو مسلم یا مائل بہ اسلام اس امداد کا ضرورت مند نہ تھا۔ جو ضرورت مند تھے، وہ امداد قبول کرتے تھے۔

[2] مترجم۔ مصنف نے اشعار کے لیے نکلسن کی کتاب A Literary History of the Arabs کا حوالہ دیا ہے ص ۱۹۵، نیز ابوالفدا جلد اول ص ۲۰۳ کا، تاہم طلاق کے واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور یہ ثابت نہیں۔)

[3] یعقوبی جلد دوم ص ۲۶۵، ڈلہاؤزن ص ۸۵ پر اس روایت کو فرض قرار دیتا ہے۔

[4] ڈلہاؤزن ص ۸۰۔ عربوں کی تاریخ میں مارونیوں کا یہ پہلا ذکر ہے۔ (مترجم۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ مسلمانوں کی حسن عدل پر غیر مسلموں کو انتہائی اعتماد تھا۔ اس کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں بھی ملتی ہیں۔ سندھ پر اسلامی حملے سے پیشتر جو مسلمان بہ سلسلۂ تجارت ملیبار میں مقیم تھے، وہاں کے باشندے اپنے جھگڑوں میں انھیں مسلمانوں کو ثالث مانتے تھے نیز امانتیں انھی کے پاس رکھتے تھے)

کرادیا[1] رواداری اور فراخ حوصلگی کے ایسے ہی مظاہروں سے معاویہؓ نے اہلِ شام کے دلوں کو اپنی گرفت میں رکھا اور وہ بڑی مضبوطی سے اسلامی سلطنت کے وفادار رہے۔

لیکن معاویہؓ کی سب سے بڑی خصوصیت وہ تھی، جسے عرب سوانح نگار "حلم" سے تعبیر کرتے ہیں[2]، جس کی بدولت وہ صحیح وقت پر صحیح کام انجام دینے سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ اس تدبّرِ عالیہ کو خود معاویہؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"جہاں میرا تازیانہ کفایت کرے، میں تلوار استعمال نہیں کرتا، جہاں زبان سے کام چل جائے، وہاں اپنا تازیانہ کام میں نہیں لاتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان ایک بال کا بھی رشتہ قائم ہو تو میں اسے نہیں توڑتا، اس طرح کہ وہ کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دے دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں"[3]

حسنؓ کو دست برداری کے لیے جو خط بھیجا، اس سے بھی معاویہؓ کا تدبر و حلم واضح ہے۔ لکھا:

"مجھے اعتراف ہے کہ خونی رشتے کی بنا پر تو اس اعلیٰ منصب کا مجھ سے زیادہ حق دار ہے، اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ تجھ میں وہ تمام اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہیں جو اس اعلیٰ منصب (منصب خلافت) کے لیے ضروری ہیں تو میں بے تامّل تیری اطاعت کا حلف اٹھا لیتا۔ اب اور جو کچھ چاہے مانگ لے"۔

اس خط کے ساتھ معاویہؓ نے ایک سادہ کاغذ دستخط کر کے شامل کر دیا تھا[4]۔ اس حلم کی بدولت معاصرین کے ساتھ معاویہؓ کے ذاتی تعلقات واضح اور دوستانہ رہے۔ مخالفین معاویہؓ کو بڑے لفظوں میں خطاب کرتے تھے، اس کے سامنے علیؓ سے وفاداری جتاتے تھے۔ دوست بھی اسے چھیڑتے تھے۔ اس کا خاندانی نام (امیّہ) دراصل "امہ" یعنی لونڈی ہی کی تسغیر تھا۔

یزید کی ولی عہدی

۶۷۹ھ میں وفات (اپریل ۶۸۰ء میں بہ عمر ۸۰ سال) سے چھ مہینے پیشتر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنا دیا۔ اسلام میں یہ انتظام ایسا تھا، جس کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ یزید کی تربیت اس کی والدہ نے جزوی طور پر بادیہ میں اور خصوصاً تدمر میں کی تھی جہاں

---

[1] (مترجم ـ اس پر بھی تعجب کی کوئی وجہ نہیں، جب دین میں جبر جائز نہیں، جیسا کہ قرآن مجید کا واضح ارشاد ہے تو دوسروں کی جائز دلداری میں تامّل کیوں ہو؟)

[2] فخری ص ۱۴۵۔ عقد الفرید جلد دوم ص ۳۰۴۔ مسعودی جلد پنجم ص ۴۰۔ لامنس جلد اوّل ص ۶۶-۱۰۸۔

[3] یعقوبی جلد دوم ص ۲۸۳۔ عقد جلد اوّل ص ۱۰۔

[4] طبری جلد دوم ص ۵۔

[5] مسعودی جلد پنجم ص ۶۹-۷۳۔ طبری جلد دوم ص ۱۷۴-۱۷۷۔ ابن الاثیر جلد سوم ص ۴۱۶-۴۱۷۔ اس میں تاریخ بیعت ولی عہد تین سال پیشتر بتائی گئی ہے۔

اس کا مسیحی قبیلہ پھرتا رہتا تھا[۱] دارالحکومت میں بھی وہ مسیحیوں سے ملتا جلتا رہتا تھا، سینٹ جان مذہبی عہدہ داری سے پیشتر یزید کا خاص رفیق تھا اور اخطل شاعر سے بھی اس کے اچھے تعلقات تھے۔ صحرا میں پھرتے پھراتے یزید کو شکار کا شوق پیدا ہو گیا، نیز وہ سخت سواری کرتا اور جفاکشی میں متامّل نہ ہوتا۔ شہر میں ہوتا تو شراب پیتا اور شعر کہتا۔ اس وقت سے بادیہ اموی خاندان کے نوجوان شہزادوں کے لیے ایک زیرسما درس گاہ بن گیا، وہ بادیہ میں نکل جاتے۔ ایک غرض یہ ہوتی کہ خالص عربی سیکھ لیں جس میں آرامی کی آمیزش نہ ہو[۲] نیز شہر میں آئے دن وبائے طاعون پھیلی رہتی تھی اور شہزادے اس سے بچاؤ کے لیے باہر نکل جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے، معاویہؓ کے دل میں پہلے سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ یزید کو ولی عہد بنایا جائے۔ چنانچہ جب ۴۹ھ/۶۶۹ء میں قسطنطنیہ کے خلاف مہم بھیجی گئی تو یزید ہی کو اس کا سالار بنایا گیا۔ وہاں یزید کی کامیابی نے وہ شکوک زائل کر دیے، جو مخلص مسلمانوں کے دل میں اس کے اوصاف کے متعلق موجود ہو سکتے تھے۔ اب معاویہ کو دارالحکومت کے متعلق اطمینان ہو گیا تو صوبوں سے وفد طلب کیے اور اپنے فرزند کے لیے بیعت لی۔ عراقیوں کو اس معاملے سے قطعاً کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ان کی خوشامد بھی کی گئی، انھیں ڈرایا بھی گیا اور رشوتیں بھی بہت دی گئیں[۳]۔

اس تدبیر کو اسلامی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں سے میراث کا اصول جاری ہوا، جس سے تمام ممتاز حکمران خاندان برابر فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس نمونے کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکمران خلیفہ اپنے بیٹوں یا رشتہ داروں میں سے جسے اہل سمجھتے اس کے لیے بیعت لے لیتے۔ جانشین کی نامزدگی سے استحکام و تسلسل کی ایک شکل پیدا ہو گئی[۴] اور تخت کے حریفوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

ایک مثالی حکمران

اگرچہ معاویہؓ نے اسلام و عرب کی بے مثال خدمات انجام دی تھیں، اگر وہ مسلمان مؤرخوں کے نزدیک منظورِ نظر نہ بن سکا۔ نہ اس کے "مستعد" معاونوں کو اچھا سمجھا گیا۔ اس کی توجیہ مشکل نہیں، زیادہ تر مؤرخ شیعہ تھے اور ان کا تعلق ایرانی و عراقی یا مدنی دبستان سے تھا[۵] اگرچہ وہ مؤرخ سنی تھے تاہم انھوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش نظر رکھا کہ معاویہؓ نے اسلام کو دنیاداری کا رنگ دیا اور "خلافتِ نبوت" کو بدل کر "ملک" بنا دیا۔ وہ کہتے تھے کہ معاویہؓ اس میں پہلا "ملک" تھا[۶]۔ یہ لقب عربوں کے نزدیک اس درجہ مکروہ تھا کہ وہ اسے صرف غیر عرب بادشاہوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ معاویہؓ پر بعض بدعات کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ مثلاً "مقصورہ"[۷] بنوایا، یہ مسجد

۱؎ لامنس جلد سوم ص ۱۸۹-۲۲۶

۲؎ عقد، جلد دوم ص ۲۹۳۔

۳؎ عقد جلد دوم ص ۳۰۶-۳۰۹۔ ابن عساکر جلد چہارم ص ۳۲۷-۳۲۸۔

۴؎ (مترجم۔ ولی عہدی کے سلسلے میں اگر کوئی قابلِ توجہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ سوء اتفاق سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافتوں میں کشمکشیں پیدا ہوئیں اور اس وجہ سے اسلامی حکومت و نظم کو نقصان پہنچا۔ تاہم اس وجہ سے بنیادی اصول میں تبدیلی ہرگز مناسب نہ تھی۔)

۵؎ شامی دبستان کا بڑا نمائندہ صرف ابن عساکر دمشقی تھا (۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء-۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء)

۶؎ ابن خلدون مقدمہ مطبوعہ قاہرہ ص ۱۶۹۔ یعقوبی جلد دوم ص ۲۵۷۔

۷؎ یعقوبی جلد دوم ص ۲۶۵، دینوری ۲۲۹، طبری جلد دوم ص ۷۰، مبرّد ص ۵۵۴، مقصورہ اس وقت بنوایا جب خلیفہ پر قاتلانہ حملہ ہوا، مگر وہ حملہ ناکام رہا۔

(مترجم۔ تاہم معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ پر مسجد میں قاتلانہ حملہ ہوا اور حضرت عثمانؓ نے مقصورہ نہ بنوایا، حضرت علیؓ نے مقصورہ نہ بنوایا۔)

کے اندر ایک حجرہ ہوتا تھا، جو صرف خلیفہ کے لیے تھا، نیز بیٹھ کر خطبہ[1] دیتا یا تخت پر بیٹھتا[2]۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ معاویہؓ نے اپنے جانشینوں کے سامنے سرگرمی، رواداری اور دوراندیشی کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا، جس کی پیروی کی کوشش بہتوں نے کی[3] مگر بہت کم اس کے قریب پہنچ سکے۔

---

[1] ابن العبری، مختصر الدول ص ۱۰۷۔ معاویہؓ کا عذر یہ تھا کہ وہ بہت موٹے ہو گئے تھے اور پیٹ بڑھ گیا تھا۔ اس وجہ سے بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے۔

[2] ابن خلدون، مقدمہ ص ۲۱۷۔ القلقشندی صبح الاعشیٰ جلد چہارم ص ۶۔

[3] مسعودی جلد پنجم ص ۱۷، معاویہؓ کا مقبرہ باب الصغیر (دمشق) کے باہر قبرستان میں ہے۔ اس کی زیارت اب تک کی جاتی ہے۔

چونتیسواں باب

رومیوں سے لڑائیاں

شام کے سرحدی علاقے

امویوں کے دور میں، نیز عباسیوں کے دور میں بارھویں صدی کے وسط تک کوہستانِ طارس کے دوہرے سلسلے عربوں اور بیزنطینیوں کے درمیان حدِ فاصل تھے، جو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہیں۔ دونوں متحارب قوتیں ایک دوسری کے سامنے تھیں۔ انھوں نے پہلے ایک دوسری کو دور رکھنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ درمیانی زمین کو بنجر بنا دیا۔ اس خطے کو بنجر بنانے میں، جس پر کسی کا دعویٰ نہ تھا، معاویہ نے بھی حصہ لیا[1]۔ بعدازاں امویوں نے مختلف پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ جو قلعے پہلے چھوڑ دیے گئے تھے اور جو شہر برباد کر دیے گئے تھے، انھیں دوبارہ تعمیر کیا یا جابجا نئی عمارتیں بنا دیں۔ اس طرح اسلامی استحکامات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جو سیلیشیا میں کوہستانِ طارس سے شروع ہو کر ملطیہ[2] (بالائی دریائے فرات) تک جاتا تھا۔ ان استحکامات میں اذنہ، المصیصہ[3] اور معرش[4] بھی شامل تھے۔ یہ مستحکم مقامات یا تو فوجی شاہراہوں کی جائے اتصال پر واقع تھے یا تنگ دروں کے دہانوں پر۔ ان کے لیے "عواصم" کی اصطلاح ایجاد ہوئی تھی، جو بالکل بجا و درست تھی۔ یہی اصطلاح قلعوں کے اندرونی یا جنوبی سلسلے کے لیے مستعمل تھی۔ بیرونی یا شمالی سلسلے کو "ثغور"[5] کہا جاتا تھا۔ "ثغور" کا حلقہ شامی اور عراقی سرحدوں کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا۔ جو سلسلہ استحکامات شام کی حفاظت کرتا تھا، اسے "شامی ثغور" اور جو عراق کی حفاظت کرتا تھا، اسے "ثغور الجزیرہ" کہتے تھے[6]۔

عباسیوں کے زمانے میں ثغور کا حلقہ اور بھی تنگ ہو گیا۔ وہ اولاس سے شروع ہو کر جو بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے۔ طارس میں سے گزرتا ہوا سمیساط تک جاتا تھا[7]۔ طرسوس کوہستانِ طارس کے اس مشہور درے کے جنوبی دہانے پر واقع تھا۔ جسے "ابواب سیلیشیا" کہتے تھے، اس لیے یہی مقام رومی علاقوں کے خلاف بڑی فوجی مہموں کا مرکز بنا رہا۔ یہاں پیادوں اور سواروں کی ایک بھاری جمعیت رہتی تھی۔ ایک اور راستہ بھی تھا، جو کوہستانِ طارس میں سے ہوتا ہوا معرش سے البستین تک جاتا تھا[8]، لیکن اسے

---

[1] بلاذری ص ۱۶۴-۱۶۵۔ بیرونی حصے کو طبری میں "ضواحی" کہا گیا ہے جلد دوم ص ۱۳۱۷، ابن اثیر جلد چہارم ص ۲۵۰۔

[2] Melitene

[3] al-Massisah جس کا پہلا نام Mopsuesta تھا۔

[4] Germanicia

[5] ثغر کی جمع یعنی شگاف، خلا۔

[6] بلاذری ص ۱۶۳۔

[7] اصطخری ص ۶۷، ۶۸۔

[8] یاقوت جلد اول ص ۹۳، ۹۴۔ شریح ص ۱۳۳۔ اس کا بیزنطینی نام ابلستھا (Ablastha) تھا، یونانی Arabissus اور عربی البستان۔

عام طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور یہ "دارالحدیث" کہلاتا تھا۔ جنگی لہروں کے مدوجزر کے ساتھ ان مستحکم قلعوں پر تصرف میں ادل بدل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ امویوں اور عباسیوں کے ماتحت زمین کے چپے چپے کے لیے متواتر شدید خونریزیاں ہوتی ہیں۔ یہ درحقیقت ایسی زمین تھی جس کا کوئی مالک نہ تھا، اور نہ وہاں کوئی رہتا تھا۔ اس خطے کی زمین پر اتنا خون بہایا گیا کہ ایشیا کے کسی دوسرے خطے کی زمین پر نہ بہایا گیا ہوگا۔

معاویہؓ اور ان کے بعد عبدالملک، نیز اس کے جانشینوں کے عہد میں عام دستور یہ ہو گیا تھا کہ گرمیوں کے موسم میں بڑی مہم (صائفیہ) اور سردیوں کے موسم میں چھوٹی مہم (شاتیہ) سال بہ سال بھیجی جاتی تھیں[1]۔ یہ مہمیں سپاہیوں کے لیے تربیت گاہیں بھی بن گئیں۔ بدوؤں کے عام چھاپوں اور یورشوں کی طرح ان مہموں کا مقصد بھی غنیمت کے سوا کچھ نہ تھا، اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قسطنطنیہ کا دھندلا سا خاکہ پس منظر کے دور افتادہ حصے سے اشارہ کر کے بلا رہا ہو۔ یہ جان لینا چاہیے کہ قسطنطنیہ کوہ طارس سے براہ راست چار سو میل کے فاصلے پر تھا اور عرب کسی بھی دور میں ایشیائے کوچک کے اندر کوئی مستقل قدم گاہ حاصل نہ کر سکے۔ ان کی بڑی فوجی سرگرمیاں شرقی اور مغربی جانب ہوتی تھیں، جہاں سے مزاحمت کا کم سے کم موقع تھا۔ طارس اور اس کے بالمقابل سلسلے کے اونچے پہاڑوں کو غالباً قدرت نے دائمی سرحدی خط بنا دیا تھا۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ اناطولیہ کی آب و ہوا صحرائی جوانوں کے لیے بڑی سخت اور ناقابل برداشت تھی۔ کوہستان طارس کی جنوبی ڈھلانوں پر عربی زبان بھی ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔ غرض ایشیائے کوچک کے کسی بھی حصے میں عربی زبان کبھی بولی نہ گئی۔ بالکل ابتدائی زمانے، یعنی حتیوں کے عہد سے اس علاقے کی بنیادی آبادی غیر سامی ہی رہی۔

قسطنطنیہ پر یورش

ایشیائے کوچک میں بار بار جو حملے ہوتے تھے، آخر وہ قسطنطنیہ تک جا پہنچے، یہ ۴۹ھ/۶۶۹ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت رسول اللہ (صلعم) کی وفات پر صرف چھتیس سال گزرے تھے[2]۔ اس طرح یہ پہلا موقع تھا کہ عرب جنگجوؤں کی نگاہیں اس عظیم الشان اور پُر فخر دارالحکومت پر پڑیں جو آبنائے باسفورس کے کنارے واقع تھا۔ اس مہم کا سالار فضالہ بن عبید الانصاری تھا۔ حملہ آور فوج نے سردیوں کا موسم کیلسی ڈون میں گزارا، جو ایشیائی جانب قسطنطنیہ کے حوالی میں ہے۔ وہاں رسد حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ پھر سوء اتفاق سے چیچک اور بعض دوسری بیماریاں پھوٹ پڑیں[3]۔ معاویہؓ نے ۶۶۹ء کے موسم بہار میں اپنے آرام طلب دوست اور تن آسان فرزند یزید کو فوج دے کر بھیج دیا، اگرچہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا[4]۔ بہرحال یزید اور فضالہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا، جس کی حفاظت کے لیے سہ گانہ بلند فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ عربی بیڑے نے اس مہم میں ہر ممکن امداد دی، لیکن موسم گرما میں محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اس وقت بیزنطیم میں ایک نیا اور سرگرم بادشاہ بروئے کار آ گیا تھا، یعنی قسطنطین چہارم (۶۶۸ء تا ۶۸۵ء)۔

اس مہم کے افسانوی بیان کے مطابق یزید نے محاصرے میں نمایاں حصہ لیا، بہادری، حوصلہ مندی کے جوہر دکھائے اور "فتی العرب" کا لقب حاصل کیا۔ اغانی کا بیان ہے کہ جس وقت فتح کا معاملہ گومگو میں پڑا ہوا تھا، کبھی ایک فریق جیتتا نظر آتا تھا، کبھی دوسرا

---

[1] بلاذری ص ۱۶۳۔ [2] ابن الاثیر جلد سوم ص ۳۸۰۔ طبری جلد دوم ص ۸۶، ۱۱۱، نیز ص ۲۷، جہاں بسر بن ابی ارطاۃ کے ماتحت قسطنطنیہ پر ایک بحری مہم کا ذکر ہے۔

[3] اغانی جلد ۱۶ ص ۳۳، نویری نہایۃ الارب فی فنون الادب جلد ۴ ص ۹۱۔

[4] لامنس جلد سوم ص ۳۰۶ - ۳۱۲ نیز ولہاؤسن۔

فراق تو دو بیزنطینی خیموں سے شادمانی کے نعرے بلند ہوئے[1]۔ ان میں سے ایک خیمہ شہنشاہ روم کی بیٹی کا تھا اور دوسرا معزول غسانی بادشاہ جبلہ بن الایہم کی بیٹی کا۔ عرب شہزادی کو قبضے میں لے آنے کی امید نے یزید کے سمند عزم کے لیے تازیانے کا کام دیا اور اس نے غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ لیکن یزید کی افسانوی شہرت، کبیر السن ابوایوبؓ انصاری کی شہرت کے سامنے اندر پڑ گئی، جو کسی زمانے میں رسول اللہ (ص) کے علمدار رہ چکے تھے، نیز ہجرت کے موقع پر ابوایوبؓ ہی نے رسول اللہ (ص) کی مہمانداری کی تھی۔ محاصرے کے دوران ہی میں ابوایوبؓ نے پیچش سے وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ شہر سے باہر بنایا گیا۔ یہ مقبرہ بہت جلد یونانی مسیحیوں کی زیارت گاہ بن گیا، جو خشک سالی کے وقت وہاں جاکر دعائیں مانگتے تھے تو بارش ہو جاتی تھی[2]۔ بعدازاں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو مقبرے سے عجیب و غریب شعاعیں نکلیں۔ اس طرح اس کا پتا چلا، یہ بالکل ایسا ہی واقعہ تھا، جیسا پہلی صلیبی جنگ کے دوران میں انطاکیہ سے "مقدس حربہ" ملا تھا۔ چنانچہ اس مقام پر ایک مسجد بنا دی گئی اور مدفن بزرگ تین قوموں کے نزدیک مقدس قرار پائے۔

دوسرا حملہ

معاویہؓ کا قوی بازو دو مرتبہ رومیوں کے دارالحکومت تک پہنچا، دوسرا حملہ پہلے حملے سے پانچ سال بعد ہوا۔ یہی وہ لڑائی ہے جسے عام طور پر ہفت سالہ جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے (۵۴ھ–۶۰ھ = ۶۷۴ء–۶۸۰ء)۔ زیادہ تر بیڑوں کے درمیان باسفورس اور مارمورا میں ہوتی رہی۔ اس جنگ کی طوالت کا سبب یہ ہے کہ عربوں نے ابتدا ہی میں اس جزیرہ نما پر قبضہ کر لیا تھا، جو ایشیائے کوچک کی جانب بحیرۂ مارمورا کے اندر بڑھا ہوا ہے۔ یونانی اس جزیرہ نما کو کزی کس[3] کہتے تھے، عربوں نے اس کا نام "جزیرہ ارواد" رکھا تھا[4]۔ یہ جزیرہ نما حملہ آور فوج کے لیے موسم سرما بسر کرنے کا صدر مقام بن گیا۔ موسم بہار اور موسم گرما کے حملوں کا یہی مرکز تھا۔ ان کش مکشوں کے متعلق عربوں اور بیزنطینیوں کے بیانات میں قطعاً کوئی مطابقت نہیں اور ان بیانات میں ویسے بھی بڑی ہی ژولیدگی پائی جاتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ شہر کو اس خوفناک ایجاد کے بل پر بچا لیا گیا، جسے عموماً "یونانی آگ" کہا جاتا تھا۔ یہ ایک زبردست آتش گیر مرکب تھا۔ جو محض پانی کی سطح پر نہیں بلکہ پانی کی تہ میں بھی ہر ایک چیز کو جلا دیتا تھا۔ اس کا موجد ایک شامی تھا۔ جو دمشق سے ہجرت کر کے قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا۔ اس کا نام کالینی کوش تھا[5]۔ یہ اس خفیہ حربے کا پہلا ذکر ہے۔ صدیوں تک بیزنطینیوں نے اس مرکب کا نسخہ چھپائے رکھا، اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ پھر عربوں نے اسے سیکھ لیا۔ اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یونانی بیانات میں دشمن کے جہازوں پر اس آگ کے اثرات کی بڑی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ عربی بیڑے میں سے جو جہاز بچے تھے، وہ مراجعت کے وقت تباہ ہو گئے[6]۔ مراجعت اس لیے ضروری ہو گئی تھی کہ امیر معاویہؓ کا انتقال ہو گیا تھا۔

---

[1] لامنس جلد ۱۶۔ ص ۳۳۔
[2] ابن الاثیر جلد سوم ص ۳۸۲

[3] تھیوفینیس ۳۵۳-۳۵۴، طبری جلد دوم ص ۱۶۳، ابن الاثیر جلد سوم ص ۴۱۳۔ بلاذری ص ۲۳۶۔ Cyzicus

[4]

[5] Callinicus

[6] تھیوفینیس ص ۳۵۳۔

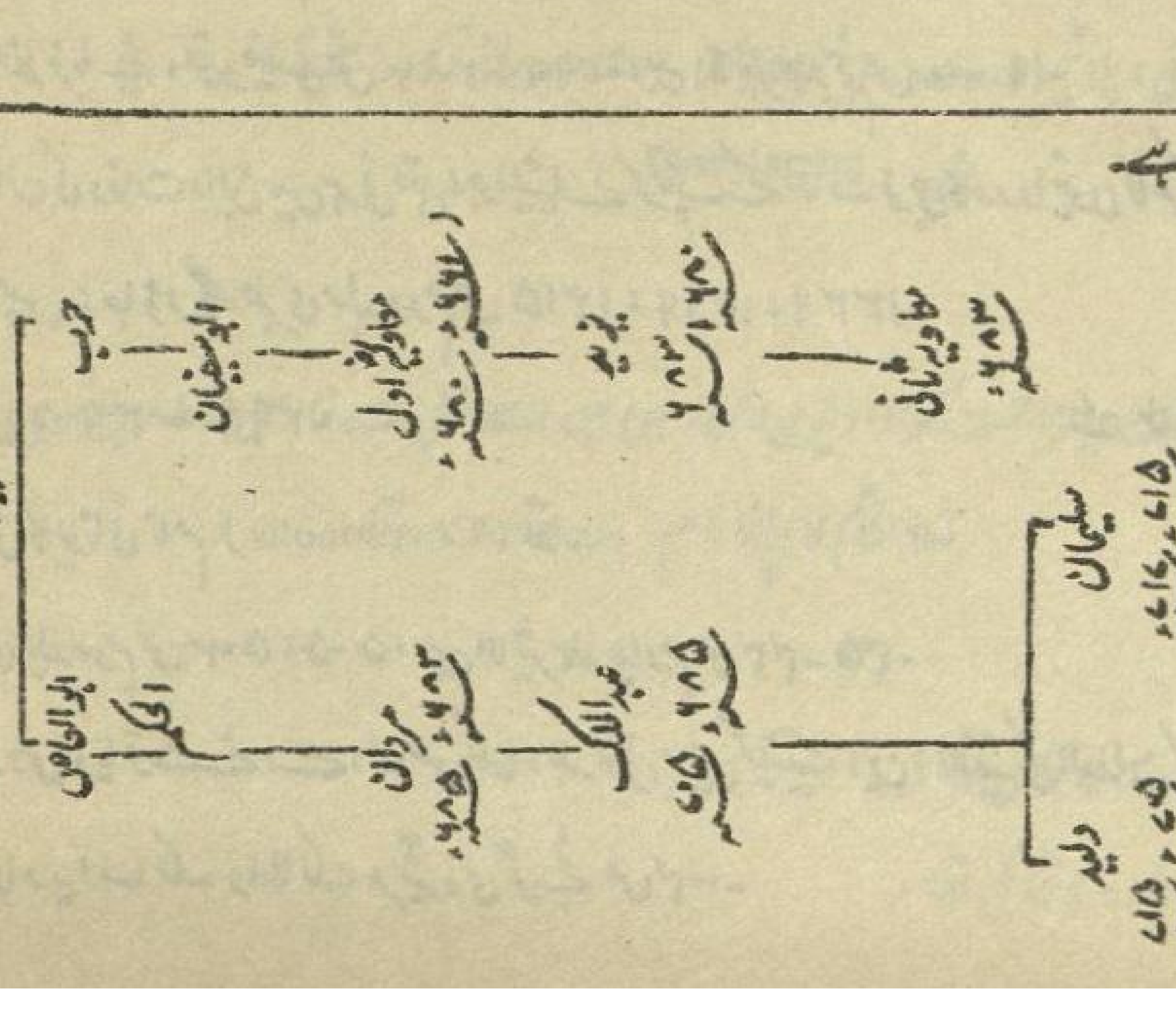
اسی زمانے سے ان متعدد بحری حملوں کا تعلق ہے، جو جزائر ایجہ اور مشرقی بحیرۂ روم کے دوسرے جزیروں پر کیے گئے۔ قبرص پر مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہو چکا تھا، روڈس کو معاویہؓ کے بیڑے نے ۶۵۴ء کے اوائل میں لوٹا تھا، ۶۷۲ء میں اس پر قبضہ کر لیا گیا، اگرچہ یہ قبضہ عارضی تھا۔ دو سال بعد کریٹ (اقریطش) کے ساتھ وہی سلوک ہوا۔ سسلی (صقلیہ) تک عرب ۶۶۴ء میں جا پہنچے اور اس پر بارہا حملے کیے۔ بعد ازاں سسلی اغلبی خاندان کی سلطنت کا ایک خوش حال جزو بن گیا۔ معاویہؓ کے ایک جانشین سلیمان کے عہد میں روڈس پھر عارضی طور پر لے لیا گیا۔ (۷۱۵ء۔ ۷۱۸ء)

قسطنطنیہ پر آخری اموی حملہ

معاویہؓ کی وفات سے چھتیس سال بعد تک عربوں اور بیزنطینیوں کی دشمنی سکون پذیر رہی۔ یزید کا مختصر دورِ حکومت (۶۸۰ء۔ ۶۸۳ء) داخلی مشکلات میں ختم ہو گیا۔ یزید کے بیٹے معاویہ ثانی نے صرف تین مہینے حکومت کی۔ یہ کمزور اور بیمار سا آدمی تھا۔ خود یزید ہی باپ کا کوئی قابل قدر جانشین نہ تھا تو اس کے بیٹے سے کیا امید ہو سکتی تھی؟ سلیمان کے زمانے میں، جس کا تعلق اموی خاندان کی مروانی شاخ سے تھا[1] پھر حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک روایت مشہور تھی کہ جو خلیفہ قسطنطنیہ کو فتح کرے گا وہ پیغمبر کا ہمنام ہو گا خلیفہ سلیمان نے اپنے آپ کو حضرت سلیمانؑ کا ہم نام سمجھتے ہوئے حدیث اپنے سے منسوب کر لی۔ چنانچہ مسند نشین ہوتے ہی اس نے مہم کے لیے سر و سامان تیزی سے فراہم کر لیا، جس کے لیے تیاریاں اس کا بڑا بھائی ولید شروع کر چکا تھا۔ سلیمان اور ولید کے ایک اور بھائی مسلمہ نے ۷۱۵ء میں اس مہم کی قیادت کی۔ فوج ایشیائے کوچک میں سے گزرتی ہوئی قسطنطنیہ پہنچی۔ بحری فوج نے بھی بری فوج کی امداد کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بیڑا قسطنطنیہ کی طرف جاتے ہوئے سیلیشیا کے قریب پہنچا تھا کہ بیزنطینی ملاحوں نے شام کے ساحل پر اتر کر لاذقیہ کو جلا دیا۔ فریجیا کے علاقے میں اموریم[2] (عموریہ، جس کا موجودہ نام سار قلعہ ہے) ناکام محاصرہ کیا گیا پھر فوج آگے بڑھ گئی۔ مزید مغربی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے پرگیمم اور سارڈس پر قبضہ کر لیا گیا۔ پھر ابیدوس کے مقام پر درۂ دانیال کو عبور کیا گیا اور ۲۵ اگست ۷۱۶ء کو قسطنطنیہ کی ناکہ بندی خشکی کی جانب سے کر لی گئی۔ دو ہفتے بعد بحری راستے کو بھی بند کر دیا گیا۔ عربی بیڑے نے بحیرۂ مارمورا اور آبنائے باسفورس کے کنارے شہر کی فصیل کے پاس لنگر ڈال دیے۔ شاخ زریں کا داخلہ ایک بھاری زنجیر کے ذریعے سے بند کر دیا گیا تھا۔ تاریخ کے صفحات پر اس بند کا یہ پہلا ذکر ہے۔

---

[1] شجرۂ مندرجہ سے اموی اور اس کی مروانی شاخ کی کیفیت واضح ہو سکتی ہے۔



[2] Amorium

عربوں نے قسطنطنیہ پر جتنے حملے کیے، ان میں سے یہ بلا شبہ سب سے زیادہ خطرناک تھا اور اس کے حالات بھی بڑے اچھے انداز میں لکھے گئے۔ محاصرہ کرنے والوں کے لیے مصر سے بھی بیڑے کی کمک پہنچی۔ محاصرے میں نفط کے علاوہ منجنیق بھی استعمال کیے گیے[1] لیکن شہنشاہ لیو ایسوری (۷۱۷ء - ۷۴۱ء) نے شہر کی حفاظت کی[2] وہ شام کے شہر مرعش کا ایک معمولی سپاہی تھا اور غالباً خلیفہ کی رعایا پیدا ہوا، پھر ترقی کرتے کرتے شہنشاہ قسطنطنیہ بن گیا۔ اسے عربی اور یونانی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت تھی[3] بلا شبہ محصورین پر بڑا سخت دباؤ پڑتا رہا۔ لیکن محاصرین کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ وبا "یونانی آگ" اور رسد کی قلت کے علاوہ بلغاریوں کے چھاپے ان کے لیے سخت تباہی کا باعث ہوئے[4]۔ پھر اس سال سردی بڑی غیر معمولی پڑی۔ ان تمام آفات کے باوجود مسلمہ اپنے عزم پر قائم رہا۔ نہ یہ مشکلات اسے ہراساں کر سکیں، نہ خلیفہ کی وفات نے اس کے عزم میں تزلزل پیدا کیا[5]۔ لیکن نئے خلیفہ عمرؓ بن عبدالعزیز کے سامنے اسے سر جھکانا پڑا۔ فوج بڑی بری حالت میں واپس ہوئی۔ بیڑے کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا، وہ مراجعت کے وقت طوفان میں تباہ ہو گیا۔ اگر تھیوفینس کا بیان تسلیم کیا جائے[6] تو اٹھارہ سو جہازوں میں سے صرف پانچ واپس شام ہوئے۔ گویا عربوں کا بیڑا ختم ہو گیا۔ ایسوری خاندان کے شامی بانی کو مسلمان عربوں کے مقابلے میں مسیحی یورپ کا نجات دہندہ قرار دیا گیا۔

بعد ازاں صرف ایک مرتبہ عربوں کا لشکر قسطنطنیہ پہنچا، لیکن وہ امویوں کا زمانہ نہیں تھا۔ اس لشکر کا قائد و سالار ہارون الرشید تھا، جو اس وقت تک خلافت عباسیہ کا ولی عہد تھا اور یہ ۷۸۲ء کا واقعہ ہے[7] ہارون سقوطری[8] میں خیمہ انداز ہوا اور ملکہ آئرین سے خراج وصول کیا[9]۔ پھر شہر قسطنطنیہ کے دروازوں پر سات صدی تک کوئی مسلمان نہ پہنچا۔ بعد ازاں ایک نئے فوجی عنصر نے پیش قدمی کی۔ یہ وسط ایشیا کے ترک تھے، جنھوں نے عربوں کا مذہب اختیار کر لیا تھا اور وہ اس مذہب کے عالمگیر مجاہد بن گئے تھے۔

اگرچہ مسلمہ کا حملہ ناکام رہا تھا، لیکن سالار عساکر نے جو غیر معمولی سرگرمی دکھائی تھی، اس سے مسلمان سوانح نگاروں کے افکار میں بجلیاں دوڑ گئیں اور اس کے متعلق کئی افسانے مشہور ہو گئے۔ ممکن ہے مسلمہ نے ابدوس[10] میں مسجد تعمیر کرالی ہو جہاں اس کا کیمپ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ضرورت کی بنا پر ایک چشمہ کھدوا لیا ہو، جو اسی کے نام سے مشہور رہا۔ لیکن یہ کہنا سراسر افسانہ ہے کہ اس نے

---

[1] العیون والحدائق، مرتبہ دی گوبجے حصہ سوم ص ۲۴

[2] العیون نیز طبری جلد دوم ص ۱۳۱۵

[3] العیون حصہ سوم ص ۲۵۔

[4] ملاحظہ فرمائیے، تھیوفینس ص ۳۸۶ - ۳۹۹ - ابن الاثیر جلد پنجم ص ۱۷ - ۱۹۔

[5] سلیمان کی وفات دابق میں ہوئی تھی، جو ایشیائے کوچک کے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ اس نے حلف اٹھا لیا تھا کہ جب تک قسطنطنیہ پر قبضہ نہ ہوگا، دابق سے واپس نہ جاؤں گا۔ طبری جلد دوم ص ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۳۶۔

[6] ص ۳۹۵ - ۳۹۹۔

[7] بلاذری ص ۱۶۸۔

[8] اس کا یونانی نام (Chrysopolis) تھا۔

[9] طبری جلد سوم ص ۵۰۳، ۵۰۵، ابن الاثیر جلد چہارم ص ۴۴ - ۴۵۔

[10] ابدوس، یاقوت نے اسے اندوس لکھا (جلد اوّل) یہی کیفیت ابن الفقیہ کی البلدان کی ہے، مرتبہ دی گوبجے، ص ۱۰۴، مسعودی نے اندلس بتایا۔ ملاحظہ ہو ابن خرداذبہ المسالک والممالک مرتبہ دی گوبجے ص ۱۰۴۔

قسطنطنیہ میں پہلی مسجد تعمیر کرائی یا عرب اسیرانِ جنگ کے لیے دربار کے پاس ایک خاص مکان بنوایا یا وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سینٹ صوفیا کے گرجے میں داخل ہوا۔[1]

شامی جغرافیہ نگار المقدسی[2] نے بڑے جوش و حمیت کے ساتھ ۹۸۵ء میں لکھا تھا۔ جب مسلمہ بن عبدالملک نے رومیوں کی سرزمین پر یورش کی اور ان کے علاقوں میں گھس گیا تو ایک شرط یہ منوائی کہ رومی کنا اپنے محل کے پاس "جزمیدان" میں واقع تھا۔ ایک خاص عمارت بنوائے[3] جب مسلم امرا و شرفا اسیر ہوں تو انھیں اس عمارت میں رکھا جائے۔" مسلمہ کی محافظ فوج کے سالار عبداللہ البطال کو افسانوں میں مسلمہ کے بعد جگہ مل گئی اسے مجاہد اسلام قرار دیا گیا۔ بعدازاں وہ ایک معرکے میں، جو ۷۴۰ء میں پیش آیا، مارا گیا[4] تو ترکوں نے اسے سیّد غازی کا خطاب دے کر قومی ہیرو بنا لیا۔ اس کی قبر اس کی شہر" میں ہے، جسے قرونِ وسطیٰ میں دوری[5] لائم کہتے تھے۔ وہاں بکتاشیوں نے ایک تکیہ بنا لیا۔ مقامی یونانی مسیحیوں نے بھی اسے "مقدس" مان لیا۔ یہ دوسری مثال تھی کہ ممتاز مسلمانوں کے لیے مسیحیوں نے اپنے گرجا میں ایک مجسمہ کھڑا کیا۔[6]

مروق لبنان

مسلمہ ایک اور مہم کی قیادت اس سے پیشتر کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ بہ ظاہر زیادہ شاندار نہ تھی۔ یہ مہم ایک غیر معروف اور نیم خود مختار گروہ کے خلاف تھی، جو شمالی شام کے پہاڑی علاقے میں رہتا تھا۔ یہ لوگ "مردۃ"[7] کہلاتے تھے، جبلِ لکام[8] اور جبلِ طارس میں رہتے تھے، بیزنطینیوں کی بے قاعدہ فوج کے لیے رنگروٹ فراہم کرتے تھے اور عربوں کے پہلو میں کانٹا بن کر چبھتے رہے۔ انھیں جراجمہ[9] بھی کہتے تھے، کیونکہ ان کے مرکز کا نام جرجومہ تھا، جو جبل لکام میں واقع تھا۔[10] وہ عربوں اور بیزنطینیوں کی سرحد پر مقیم تھے اور ایشیائے کوچک کی حفاظت کے لیے "پیتل کی دیوار" بنے رہے[11] وہ تھے تو مسیحی، البتہ یہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ مونوفی سائٹ[11] تھے یا مونو تھی سائٹ[12]

---

[1] ابن الاثیر جلد دہم ص ۱۸۔ الدمشقی کی کتاب نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر مرتبہ مہران ص ۲۲۷، ابن تغری بردی، النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر والقاہرہ جلد ۲ حصہ دوم کہتا ہے کہ ایک فاطمی خطبہ اس مسجد میں پڑھا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو ابن قلانسی کی کتاب ذیل تاریخ دمشق

[2] احسن التقاسیم ص ۱۴۷

[3] یہ عمارت "بلاط" کے نام سے مشہور رہی۔ یاقوت میں اس کے ذکر سے واضح ہوتا ہے (جلد اوّل ص ۱۹) کہ سیف الدولہ حمدانی کے زمانے تک مستعمل تھی (۹۴۴ء-۹۶۷ء) "بلاط" ایک مستعار لفظ ہے جو لاطینی یا یونانی پلاٹی، پلاٹیم Platea Palatium سے سریانی کے راستے آیا۔

[4] طبری جلد دوم ص ۱۷۱۶

[5] Dorylaeum

[6] مسعودی جلد ہشتم ص ۷۴

[7] اس کی اصل ایک قدیم سامی لفظ مرد ہے جس کے معنی ہیں بغاوت یا مزاحمت کرنا، دینوری (ص ۱۳۰) میں اسے غلطی سے فارسی لفظ مرد (آدمی) سمجھ لیا گیا۔

[8] لکام کا پرانا نام Amanus تھا

[9] یاقوت جلد دوم ص ۵۵، بلاذری ص ۱۵۹

[10] تھیوفینس ص ۳۶۴

[11] Monophysites مسیحیوں کا وہ فرقہ جو حضرت مسیحؑ کی وحدت فطرت کا قائل تھا۔

[12] Monothelites مسیحیوں کا وہ فرقہ حضرت مسیحؑ کی وحدت ارادہ کا قائل تھا۔

وہ طبعاً سرکش اور منچلے تھے، جنگجوئی ان کا پیشہ تھا اور جو طاقت ان کے سامنے بہتر شرطیں پیش کر دیتی، اس کی خاطر لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے، جب مسلمانوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا تو جراجمہ نے طلایہ گردوں کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کر دیں اور رجہ درّے سے قریب تھے، ان کی حفاظت کا ذمّہ اٹھالیا[1] ۶۶۶ء میں شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنے رسالے اور بے قاعدہ فوج کے ساتھ ان کے گروہ بھی شامل کر دیے۔ وہ پیش قدمی کرتے ہوئے لبنان تک پہنچ گئے اور قسطنطین تک تمام اہم جنگی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں کوہستانِ لبنان گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا ہو گا اور اس میں آبادی کم ہو گی، البتہ اس حصے میں خاصی آبادی تھی، جو ساحلِ بحر کے میدانی علاقے سے ملا ہوا تھا۔ یہاں مردہ مقیم ہو گئے، مفرور مجرم اور باغی بھی آہستہ آہستہ ان کے پاس جمع ہوتے گئے۔ شمالی لبنان میں یہ لوگ ماردینیوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس زمانے میں امیر معاویہؓ کو علویوں کے ساتھ جنگ درپیش تھی اور داخلی مشکلات بڑھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو سالانہ بھاری خراج دے کر داخلی دشمن کی امداد سے باز رکھا جائے اور خود ان لوگوں کو بھی کچھ روپیہ دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ پہاڑی جنگ عربوں کے لیے کبھی خوش گوار نہیں ہوئی ابن خلدون نے جو یہ لکھا ہے کہ عرب میدانی علاقے میں انتہائی سہولت سے کامیاب ہو جاتے ہیں[2] تو یہ بیان تاریخی جواز سے محروم نہیں تھا۔

معاویہؓ نے ۶۶۹ء میں عراق سے مزید آبادیوں کو ساحلی میدانی علاقے اور انطاکیہ میں منتقل کیا[3] بہ ظاہر مقصد یہی تھا کہ جراجمہ کا مقابلہ کیا جائے۔ اس سے قبل (۶۶۲ء یا ۶۶۳ء میں) ایران سے بہت سے خاندانوں کو اٹھا کر ان یونانیوں کی جگہ آباد کیا گیا تھا۔ جو اسلامی فتوحات کے باعث ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بیزنطینیوں کے بحری حملوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ ایرانی صیدا، بیروت، اُجلیل، طرابلس، عرقہ، بلبک اور دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے[4]

جراجمہ نے جس طرح سفیانیوں (امیر معاویہؓ اور یزید) کے لیے پریشانیاں پیدا کی تھیں، اسی طرح مروانیوں (عبدالملک اور اس کے اخلاف) کے ابتدائی دور میں بھی وہ پریشانیوں کے موجب بنے رہے۔ ۶۸۹ء میں عبدالملک نے جسٹینین ثانی کی شرطیں منظور کر لیں اور جراجمہ کو ہفتہ وار ایک ہزار دینار دینا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں شاہنشاہ نے ان پہاڑی باشندوں کے نئے جتھوں کی ناگیں ڈھیلی کر دیں اور انھیں شام کی طرف دھکیل دیا۔ پھر عبدالملک نے اسی مسلک کی پیروی کی جو معاویہؓ نے اختیار کیا تھا[5]

---

[1] بلاذری ص ۱۵۹

[2] مقدمہ ص ۱۲۵

[3] بلاذری ص ۱۶۲

[4] یعقوبی ص ۱۲۷، بلاذری ص ۱۴۸

[5] بلاذری ص ۱۶۰۔ انساب الاشراف جلد پنجم ص ۳۰۰

آخر عبدالملک کے بیٹے ولید کے عہد میں (۸۶ھ تا ۹۶ھ / ۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) قطعی فیصلہ کر لیا گیا کہ جراجمہ کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ مسلمہ نے ان تکلیف دہ گروہوں کے مرکز پر حملہ کیا اور جرجومہ کو مسمار کر ڈالا۔ ان میں سے ایک حصّہ مارا گیا باقی ترکِ مکان کر کے اناطولیہ چلے گئے۔ جو باقی رہے، ان میں سے بعض اسلامی عساکر میں داخل ہو گئے اور اسلامی پرچم کے سایے میں لڑتے رہے۔ یزید ثانی (بن عبدالملک مروانی) کے عہد میں انھوں نے عراق کی بغاوتیں فرو کرنے کے لیے حکومت سے تعاون کیا۔[1]

---

[1] جراجمہ یا مردہ کے متعلق مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو لیمینس Lammens نیز تسریح الابصار فی ما یحتوی لبنان من الآثار جلد دوم ص ۱۴۱۔۱۴۸۔

پینتیسواں باب

داخلی شورشیں

حضرت حسینؓ کا المیہ

جب تک معاویہؓ کا زبردست اور طویل عہد حکومت قائم رہا، کسی علوی کو کھلم کھلا ان کے اقتدار سے اختلاف کا حوصلہ نہ ہوا۔ جب یزید جیسا غیر سنجیدہ شخص مسندنشین ہوا (۶۸۰ء) تو اضطراب اور بے چینی شروع ہو گئی۔ عراقیوں کی سرگرم اور پے در پے اپیلوں کے جواب میں علیؓ اور فاطمہؓ کے چھوٹے بیٹے حسینؓ نے اپنے والد اور بڑے بھائی کے بعد جائز خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔[۱] اپنے جاں نثار حامیوں اور رشتہ داروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ حسینؓ مکۂ معظمہ سے کوفہ روانہ ہو گئے۔ حالانکہ اس سے پیشتر عراقی طرفداروں کی درخواستیں نامنظور فرما چکے تھے اور مدینۂ منورہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس سفر میں حرم بھی حسینؓ کے ساتھ تھے۔ زیاد کو معاویہؓ نے اپنا بھائی تسلیم کر لیا تھا۔ اسی زیاد کا بیٹا عبیداللہ اپنے باپ کی جگہ عراق کا گورنر تھا۔ ابن زیاد کو پہلے سے حسینؓ کی روانگی کی خبر مل چکی تھی اور اس نے حجاز سے عراق آنے والے تمام راستوں پر جگہ جگہ چوکیاں بٹھا دی تھیں، کوفہ سے پچیس میل شمال مغرب میں کربلا کا میدان ہے، وہاں ابن زیاد کے طلایہ گرد سواروں نے حسینؓ کو نرغے میں لے لیا۔ عمرو ابن سعدؓ ابن ابی وقاص (فاتح عراق و بانیٔ کوفہ) نے چار ہزار فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ حسینؓ شہید کر دیئے گئے اور ان کے دو سو ساتھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔[۲] رسول اللہ (صلعم) کے نواسے کا سر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ یزید نے یہ سر حسینؓ کی ہمشیرہ اور فرزند کے حوالے کر دیا، جو سر کے ساتھ دمشق پہنچے تھے۔ اسے کربلا میں دفن کیا گیا۔[۳]

---

[۱] (مترجم - یہ مصنف کی غلطی ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے خلافت کا اعلان نہیں کیا تھا بلکہ خلافت کا مسئلہ طے ہونے والا تھا اور اہل عراق نے انھیں پے درپے التجاؤں سے امیدوار بننے پر راضی کر لیا تھا وہ صرف خلافت کے ایک امّیدوار تھے۔ آخری فیصلہ رائے عامہ کی بنا پر ہوتا۔ اس باب میں فخری ص ۵۹ اور دینوری ص ۲۴۳-۲۴۴۔ کے حوالے بیکار ہیں۔)

[۲] یعقوبی جلد دوم ص ۲۸۹، مسعودی جلد پنجم ص ۱۴۳۔

[۳] ابن حجر جلد دوم ص ۱۷، ابن عساکر جلد چہارم ص ۳۳۲-۳۳۵، ابن الاثیر جلد چہارم ص ۶۷-۷۵۔ دینوری ص ۲۶۴-۲۶۷۔

(مترجم - مصنف نے ابن حجر کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے لیکن اس میں کہیں یہ ذکر نہیں آیا کہ حضرت امام کا سر مبارک دمشق سے پھر کربلا بھیجا گیا تھا اور بظاہر اس کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ فرق مبارک صرف ابن زیاد کے پاس بھیجا گیا تھا۔ یعنی کوفہ میں۔ پھر ممکن ہے۔ کوفہ یا کربلا میں دفن کیا گیا ہو یا دمشق میں دفن ہوا ہو۔ اس کی قبریں قاہرہ تک میں موجود ہیں۔ جہاں ایک نہایت عالی شان مسجد فرق مبارکِ حسینؓ ہی پر بنائی گئی ہے۔ یہ تمام روایات بے اصل ہیں۔)

حسینؓ نے ۱۰ محرم ۶۱ھ (۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) کو شہادت پائی اور شیعوں کے نزدیک اس وقت سے یہ قومی ماتم کا دن بن گیا۔ ہر سال یوم عاشورہ پر ایک جلوس نکالا جاتا ہے، جس میں امام شہیدؓ کے دردناک مصائب اور ایثار کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ زیادہ انتہا پسند ایرانی ماضی قریب تک جوشِ ماتم میں اپنے زخم لگا لیتے تھے اور ان سے خون بہتا رہتا تھا۔ ان افعال کو وہ اپنے نزدیک حسینؓ سے محبت اور ان کی شہادت پر رنج و غم کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یزید۔ عبید اللہ اور عمرو ابن سعدؓ کے نام ان شیعوں کے نزدیک حد درجہ قابلِ نفرت بن گئے، جو کربلا کو دنیا کا نہایت مقدس مقام مانتے ہیں۔ کربلا کی زیارت اب تک مکہ معظمہ کی زیارت سے زیادہ قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے[۱]۔ یہیں سے شیعیت پیدا ہوئی۔ حسینؓ کا خون نئے مذہب کے بیج کے لیے علیؓ کے خون سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوا۔ اس وقت سے شیعوں کے نزدیک علیؓ کے خاندان کے لیے امامت و قیادت ویسا ہی بنیادی مسئلہ بن گئی، جیسے سنیوں کے نزدیک نبوت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے[۲]۔ "یوم کربلا" اور "انتقام حسینؓ" شیعوں کے نعرہ جنگ بن گئے اور بنو امیہ کے اقتدار کی بنیادیں کھوکھلی ہو جانے کے بعد بھی شیعوں کی سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں۔

عبد اللہ ابن زبیرؓ

حسینؓ کی شہادت پر خلافت کے لیے رزم و پیکار کا سلسلہ ختم نہ ہوا، کیونکہ خلافت کے دعوے دار تین تھے۔ عبد اللہ ابن زبیرؓ جن کے والد نے علیؓ کے خلاف خلافت کے لیے ناکام کوشش کی تھی[۳] اب علانیہ یزید کے خلاف میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبد اللہؓ ان افراد میں سے ایک تھے، جنھوں نے حسینؓ کو کوفہ کے خطرناک سفر پر آمادہ کیا تھا[۴] اور اب عبد اللہ نے حجاز میں اعلان کرا دیا کہ میں امیر المومنین ہوں۔ یزید نے فوری جوابی اقدام کیا اور مدنی مخالفوں کے خلاف ایک تادیبی فوج بھیج دی، جس میں بہت سے مسیحی بھی شامل تھے۔ یک چشم مسلم بن عقبہ اس فوج کا سالار تھا۔ وہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اسے پالکی میں بٹھا کر لائے تھے[۵]۔ ۲۶ اگست ۶۸۳ء کو جنگ ہوئی جس میں شامیوں نے فتح پائی۔ یہ بیان کہ دمشقی فوج تین روز تک شہر رسول (ص) کو لوٹتی رہی، من گھڑت ہے۔ ابن زبیرؓ نے مکہ معظمہ میں پناہ لی، جس کی سرزمین کو حرم سمجھا جاتا ہے۔ مسلم بن عقبہ نے

---

[۱] مترجم۔ یہ انتہائی بے خبری اور ناواقفی ہے۔ کوئی شیعہ ایسا نہیں، جو زیارت کربلا کو حج و عمرہ پر ترجیح دیتا ہو۔)

[۲] (مترجم۔ اس سلسلے میں بھی مصنف کا بیان حقیقی حدود سے متجاوز ہے۔ امام حسینؓ کے واقعہ شہادت کی تفصیلات یقیناً اتنی دردناک ہیں کہ کوئی دوسرا واقعہ دلوں میں ایسا درد اور ایسا رنج و غم پیدا نہیں کرتا، تاہم کسی بھی شخص کے نزدیک حضرت امام حسینؓ کا درجہ حضرت علیؓ پر فائق نہیں اور نہ امامت کو نبوت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ امامت کو نبوت کے بعد لازمی ماننے والے اصحاب بھی نبوت کو بہر حال ترجیح دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ بنیاد و اساس ہے۔)

[۳] (مترجم ۔۔۔۔ یہ بھی غلط ہے۔ حضرت زبیرؓ بھی حضرت طلحہؓ اور حضرت عائشہؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص کے طلب گار تھے۔ یہ مطالبہ غلط فہمی پر مبنی تھا جب ان پر غلط فہمی واضح ہوئی تو وہ اس سے بھی دست بردار ہو گئے۔ چہ جائیکہ اسے کوئی دوسرا رنگ دیا جائے۔)

[۴] مسعودی جلد پنجم ص ۱۳۱۔ دینوری ص ۲۵۶-۲۵۷۔

[۵] یہ وہ عقبہ بن نافع نہ تھا، جس نے افریقہ فتح کیا تھا اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

تعاقب کیا[1] شامی سپہ سالار نے راستے ہی میں وفات پائی اور اس کی جگہ حصین ابن نمیر اسکونی مقرر ہوا۔ یہی شخص۔ جس نے کربلا کے میدان میں حسینؓ کے دھن مبارک پر اس وقت تیر مارا تھا، جب آپ پانی پی رہے تھے[2] حصین کو حرم پاک کے خلاف منجنیق نصب کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوا[3] خود کعبۂ مکرمہ کے پردوں کو آگ لگ گئی اور عمارت جل گئی۔ حجر اسود جو اسلام سے پیشتر بھی مقدس مانا جاتا تھا، ٹوٹ کر تین ٹکڑوں میں بٹ گیا[4] بیت اللہ شریف ماتمی عورتوں کے زخمی سینوں کی طرح نظر آ رہا تھا[5] اس اثنا میں یزید نے وفات پائی اور جنگ کا جو سلسلہ ۲۴۔ ستمبر ۶۸۳ء کو شروع ہوا تھا وہ ۲۷۔ نومبر کو روک دیا گیا۔

یزید کی وفات اور عرب سے شامی افواج کی واپسی نے ابن زبیرؓ کی کامیابی کے مواقع بڑھا دیے۔ چنانچہ ان کی خلافت کا اعلان حجاز کے علاوہ عراق، جنوبی عرب اور شام کے بعض حصوں میں بھی ہو گیا۔ ابن زبیرؓ نے عراق پر اپنے بھائی مصعب کو اپنا نائب مقرر کیا[6] شام میں اپنی عارضی نیابت ضحاک ابن قیس الفہری کے حوالے کی، جو قیسی گروہ (شمالی عرب کا) رئیس تھا اور یہ لوگ برابر امویوں کے خلاف رہے۔ یمنی فریق جو کلبیوں پر مشتمل تھا منئے اموی خلیفہ مروان ابن الحکم کا حامی بن گیا اور ان لوگوں نے ضحاک اور ان کے ساتھیوں کو شکستِ فاش دی۔ یہ جنگ جولائی ۶۸۴ء میں بہ مقام مرج راہط ہوئی، جو دمشق کے شمال مشرق میں ہے[7] جنگِ راہط بھی امویوں کے لیے دوسری جنگ صفین تھی۔ اس جنگ سے اسلام میں تیسری خانہ جنگی ختم ہوئی۔ معاویہؓ اور علیؓ کے درمیان دوسری خانہ جنگی کی طرح خاندانی حکومت کے لیے تھی۔ باقی رہے وہ جھگڑے جو قیس یعنی شمالی عرب کے تارکین وطن اور کلب یعنی جنوبی عرب کے تارکین وطن کے درمیان جاری تھے، بدستور جاری رہے، یہاں تک کہ اس وجہ سے امیہ خاندان معرضِ زوال میں آ گیا۔ قیسی اور یمنی فریق شام و لبنان کی عہد حاضر کی سیاست میں بھی نمایاں ہوتے رہے۔

شام میں امویوں کی مخالف پارٹی کی شکست نے مخالفت کا ایک بازو کاٹ دیا تھا، لیکن حجاز میں اس کا سر ضرور زندہ تھا۔ وہاں اموی خلافت کی مخالفت ابن زبیرؓ کی سرکردگی میں جاری رہی، یہاں تک کہ مروان کے بیٹے اور جانشین عبدالملک نے اپنے فولادی ہاتھ والے سالار حجاج بن یوسف کو حجاز بھیجا۔ حجاج کا تعلق بھی مغیرہ کی طرح قبیلۂ ثقیف سے تھا اور وہ طائف میں مدرسی کرتا تھا۔ جس وقت اسے حجاز بھیجا گیا، اکتیس سال کی عمر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج بیس ہزار تھی[8]۔ ۲۵۔ مارچ

---

[1] انساب جلد ۴ ا ص ۴۰۔

[2] طبری جلد اول ص ۲۲۲۰، یعقوبی جلد دوم ص ۲۹۹، دینوری ص ۲۶۹۔

[3] انساب جلد چہارم ب ص ۴۷۔ ۴۹۔

[4] یعقوبی جلد دوم ص ۳۰۹، ۳۱۱۔ انساب جلد چہارم ب ص ۵۴۔ ۵۵۔ بنطیوں کے کالے پتھر کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

[5] طبری جلد دوم ص ۴۲۷۔

[6] یعقوبی جلد دوم ص ۳۱۴۔

[7] عقد جلد دوم ص ۳۲۰۔ ۳۲۱، مسعودی جلد پنجم ص ۲۰۱، انساب جلد پنجم ص ۱۳۶۔

[8] یعقوبی جلد دوم ص ۳۱۸۔

۶۹۲ء سے حجاج نے مکۂ معظمہ کا محاصرہ شروع کر دیا، جسے ساڑھے چھ مہینے تک جاری رکھا۔ حصین بن نمیر کی طرح حجاج کو بھی شہر مقدس کے خلاف منجنیق پورے زور سے استعمال کرنے میں قطعاً تامل نہ تھا۔ ابن زبیرؓ نے اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ ہمشیرہ عائشہؓ کے جرأت آموز ارشادات سے متاثر ہو کر بڑی جوانمردی سے جنگ کی، لیکن کامیابی کی کوئی امید نہ تھی[1] آخر وہ شہید کر ڈالے گئے۔ ان کا سر کاٹ کر دمشق بھیجا گیا اور جسم صلیب پر الٹا لٹکائے رہنے کے بعد ان کی والدہ کے حوالے کر دیا گیا[2] اسلامی تاریخ میں صلیب دیے جانے کی یہ پہلی تحریری دستاویز ہے۔

ابن زبیرؓ کی وفات کے ساتھ ابتدائی دور کے اسلام کا آخری محاذ ختم ہو گیا۔ عثمانؓ کا بدلہ لے لیا گیا۔ انصار کی قوت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ اسلام میں جو نیا دورِ حکومت شروع ہوا تھا، اس کے قدم جم گئے۔ سلطنت میں سیاست نے مذہب پر پورا اقتدار حاصل کر لیا۔ اس وقت سے مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کو پیچھے ڈال دیا گیا، اور اسلامی تاریخ کا وہ دور شروع ہو گیا، جس میں جزیرۃ العرب پر بیرونی دنیا کے اثرات کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور خود بیرونی دنیا پر جزیرۃ العرب کے اثرات کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ گویا جو جزیرہ برکات کا سرچشمہ تھا، اس کی اصل قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔

حجاج کی گورنری

عبدالملک نے حجاز کی حکومت حجاج کے حوالے کر دی۔ اس خدمت پر وہ دو سال مامور رہا۔ اس اثنا میں اُس نے صرف حجاز بلکہ جنوبی عرب اور یمامہ (مشرقی عرب) میں بھی امن قائم کر دیا۔ ۶۹۴ء میں اسے عراق بھیجا گیا۔ یہ خدمت اگر زیادہ نہیں تو کم از کم پہلی خدمات کے برابر ضرور مشکلات سے لبریز تھی۔

عراق اس وقت تک بھی انتہائی بے چینی اور بے اطمینانی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خود حجاج کے قول کے مطابق عراق کے باشندے "اہلِ شقاق و نفاق" تھے۔ ابن زبیرؓ کے حامیوں اور شیعوں کے علاوہ وہاں خارجیوں[4] کا بھی زور تھا۔ پھر وہ علوی بھی تھے، جنھوں نے حسینؓ کی شہادت کے بعد اُن کے سوتیلے بھائی محمد ابن الحنفیہ کو امام اور مہدی[5] تسلیم کر لیا۔ یہ محمد علیؓ کا ایک فرزند تھا اور اپنی والدہ کی نسبت سے یوں مشہور تھا۔ خارجی سب سے زیادہ مصیبت خیز تھے، انھوں نے مشرقی حصوں میں مسلسل ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔ وہ عراق سے ایران پہنچے۔ مختلف متعصب گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ پھر اہواز اور کرمان کو پامال کیا، سے پر قبضہ

---

[1] طبری جلد دوم ص ۸۴۵، ۸۴۸۔

[2] یعقوبی جلد دوم ص ۳۱۹، ۳۲۰۔ دینوری ص ۳۲۱، اغانی جلد ۱۳ ص ۴۴۔

[3] مسعودی جلد پنجم ص ۲۹۵۔ یعقوبی جلد دوم ص ۳۲۶۔

[4] ان کے عقائد کے لیے ملاحظہ فرمائیے بغدادی کی کتاب "مختصر الفرق بین الفراق" مرتبہ فلپ کے حتّی ص ۶۵، ۹۴۔

[5] مہدی کے لفظی معنی ہیں خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ۔ شیعہ حلقوں کا خیال یہ ہے کہ مہدی ایسا امام ہو گا جو حقیقی اسلام کو بحال کر دے گا۔ دنیا اس کے ہاتھ پر فتح ہو گی اور وہ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مانند قیامت سے پیشتر امن و خوشحالی کا دور دور جاری کر دے گا۔

کرلیا۔ اصفہان کو محاصرے میں لے لیا۔ جہاں جاتے، لوٹ مار کرتے۔ ایران پہنچ کر انھوں نے موالی[1] تحریک سے اتحاد پیدا کرلیا۔ موالی عرب حاکموں کے مخالف تھے۔ یہ لوگ ایرانی الاصل تھے اور اس خیال سے اسلام قبول کیا تھا کہ انھیں برابر کا درجہ مل جائے گا۔ اب وہ مایوس تھے اور انھیں یقین ہو چکا تھا کہ غلطی کی۔

حجاج کو عراق کی حکومت کا پروانہ ملا تو وہ تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوا۔ صحرائی علاقے کو بڑی تیزی سے طے کیا اور بھیس بدل کر بلا اطلاع کوفہ پہنچ گیا۔ صبح ہو چکی تھی اور نماز ادا کی جا رہی تھی۔ حجاج بارہ شتر سواروں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کمان کندھے پر ڈال رکھی تھی، تلوار پہلو میں لٹک رہی تھی۔ اس نے اپنی بھاری دستار اتار دی جس نے اس کے درشت خط وخال چھپا رکھے تھے اور ایک آتشبار تقریر کی، جو اُس وقت سے عربی ادب کا خاص ٹھوس الائی موضوع بنی رہی ہے۔

اس نے کہا،

"میں وہ ہوں، جو اندھیروں میں اجالا کرتا ہوں اور چوٹیوں پر چڑھتا ہوں۔
جب اپنے چہرے سے پردہ اٹھاؤں گا تو تم مجھے پہچان لوگے۔"

حجاج نے خطبے کے آغاز میں جو شعر پڑھا تھا وہ کسی پرانے شاعر کا تھا۔

"کوفہ کے لوگو! یقیناً میں اپنے سامنے ایسے سر دیکھ رہا ہوں، جو کٹنے چاہئیں اور یقیناً میں وہ ہوں، جو انھیں کاٹے گا مجھے دستاروں اور ڈاڑھیوں کے درمیان خون بہتا ہُوا نظر آتا ہے۔ . . . امیرالمومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں میں فوجی وظیفے تقسیم کروں اور مہلب[2] ابن ابی صفرہ کے ماتحت تمھیں دشمن کے مقابلے کے لیے تیار کردوں۔ جو شخص وظیفہ لے لینے کے بعد تین دن کے اندر اندر مہلب کی طرف روانہ نہیں ہو جائے گا، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔[3]"

ساتھ ہی حجاج نے حکم دیا کہ خلیفہ کا فرمان بلند آواز سے پڑھا جائے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خدا کے بندے عبدالملک امیرالمومنین کی طرف سے
اُن اہل کوفہ کے نام ، جو مسلمان ہیں، سلام علیکم"

---

[1] موالی مولا کی جمع، وہ غیر عرب جنھوں نے قبول اسلام کے بعد اپنے آپ کو کسی عربی قبیلے سے وابستہ کرلیا لیکن وہ درجے میں مسلمان عربوں سے نیچے ہی رہے۔ [2] یہی سالار ہے جس نے امیر معاویہؓ کی حکومت کے ابتدائی دور ۶۶۴ء میں ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی تھی اور وہ کابل وملتان پہنچا تھا۔ حجاج اس کا داماد تھا۔

[3] میور ص ۲۱۵، ۲۱۶، یعقوبی جلد دوم ص ۳۲۶۔ مسعودی جلد پنجم ص ۲۹۴۔

اُس وقت تک مجمع سے کوئی آواز نہ آئی۔ حجّاج نے غیظ و غضب کے عالم میں فرمان پڑھنے والے کو روک دیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا:

"گیا معاملات اس حد پر جا پہنچے ہیں کہ امیر المومنین تمھیں سلام کہتے ہیں اور
تم اس کا جواب نہیں دیتے۔ خدا کی قسم! میں تم کو صحیح آداب سکھاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی پھر کہا کہ اب فرمان پڑھو۔ چنانچہ دوبارہ شروع سے فرمان پڑھا گیا۔ جب پڑھنے والے نے سلام وعلیکم کہا تو پورے دہشت زدہ مجمع میں سے ایک بھی فرد نہ تھا، جس کی زبان سے یہ صدا بلند نہ ہوئی:

"امیر المومنین پر سلام ہو"[۱]

نئے حاکم نے معلّم کی چھڑی چھوڑ کر جنگجو کی تلوار سنبھالی تھی اور وہ تلوار کی طرح اپنے قول کا دھنی تھا۔ کوئی ایسی گردن نہ تھی، جو اُس کی گرفت سے باہر رہی ہو اور کوئی ایسا سر نہ تھا، جسے بہ وقت ضرورت کچلنے میں تامّل کیا ہو۔ اُس کا فرض یہ تھا کہ اپنے دائرۂ عمل کے تمام عناصر پر حکومت کی برتری کا سکّہ جما دے، خواہ کوئی صورت پیش آئے۔ یہ کام اس کے ہاتھوں انجام پایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو اُس نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب وہ مرا تو پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں قید و بند کی سختیاں جھیل رہی تھیں[۲] یہ اعداد بے شک و شبہ مبالغہ آمیز ہیں۔ اور اسی طرح اس عرب نیرو کی خون ریزی، خدا ترسی اور ظلم و جور کی داستانیں مبالغہ آمیز ہیں، جو مورخوں نے بیان کیں۔ ان میں سے زیادہ تر شیعہ تھے یا عباسی دور کے سُنّی، انھوں نے اپنے خیال سے ایک تخریبی پہلو تیار کر دیا، آدمی کی اصل تصویر پیش نہ کی۔

تمام حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ حجّاج نے انتظامات کے سلسلے میں کئی تعمیری کارنامے انجام دیے، مثلاً اس نے پرانی نہریں نئے سرے سے جاری کیں اور نئی نہریں بنوائیں۔ بصرہ اور کوفہ عراق کے کلیدی شہر تھے، ان کے درمیان ایک نیا دار الحکومت تعمیر کرایا، جس کا نام واسط رکھا کیونکہ یہ دونوں کے وسط میں تھا۔[۳] اس نے سکّے، محاصل اور ماپ تول کی اصلاح کے لیے بھی ضابطے جاری کیے۔ اس پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس نے قرآن کی تحریف کی، حالانکہ اس نے ذرا سختی سے قرأت کا مطالعہ کرا کے لوگوں کی بعض غلطیاں دُور کر دیں اور ایسے نشانات لگوائے، جن کے بعد قرآن کے مقدّس متن کو غلط پڑھنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے جو جابرانہ طریقے اختیار کیے، انھیں جائز مانا جائے یا ناجائز، تاہم ان سے کوفہ و بصرہ میں امن بحال ہو گیا، حالانکہ ان میں مدّت سے بے چینی اور مخالفت کا بازار گرم چلا آ رہا تھا۔ عرب کے مشرقی ساحل کے ساتھ سلطنت حکومت کا اقتدار قائم ہو گیا۔ عمان اس وقت تک آزاد تھا، وہ بھی زیرِ نگین آ گیا۔ حجّاج کی حکومت میں ایران بھی شامل تھا۔ یہاں اس کے سالار مہلّب نے خارجیوں کے اس گروہ کو عملاً ختم کر دیا، جو ازرقی کہلاتا تھا اور اسلامی اتّحاد کے لیے حد درجہ خطرناک تھا۔

---

[۱] مبرد ص ۲۱۶

[۲] ابن العبری ص ۱۹۵، مسعودی جلد پنجم ص ۳۸۲، نیز تنبیہ الاشراف ص ۳۱۸، طبری جلد دوم ص ۱۱۲۳۔

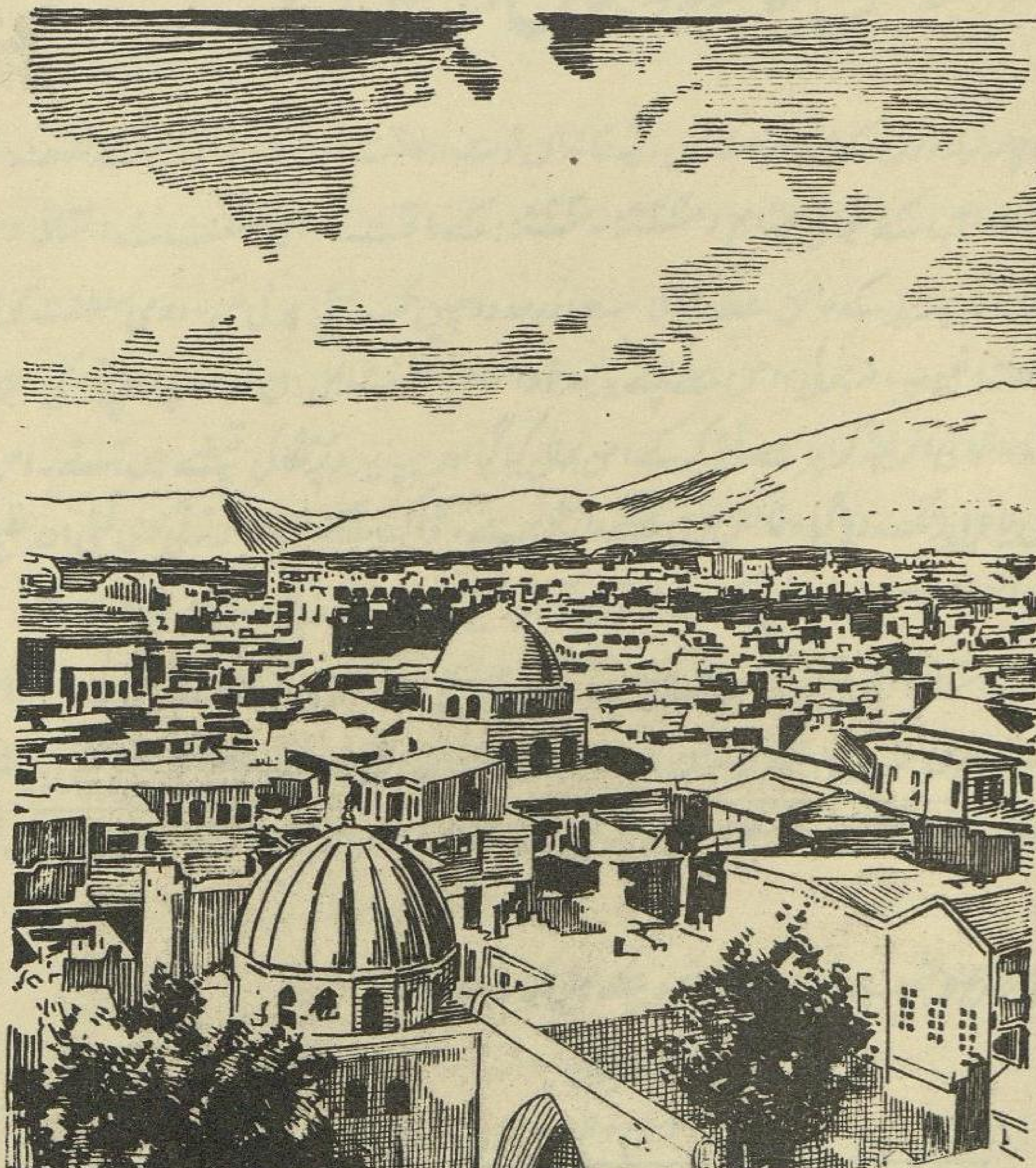
[۳] ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان جلد اول ص ۲۲۱، ذہبی کی کتاب دول الاسلام جلد اوّل ص ۴۲، طبری جلد دوم ص ۱۱۲۔

اس کا پہلا رئیس نافع ابن الازرق تھا، جس سے فرقے کا نام ازرقی پڑا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ خارجیوں کے سوا جتنے مسلمان ہیں، وہ سب کافر ہیں اور ان کا خون بہانا اور ان کے بیوی بچوں پر قبضہ کر لینا عین مطابقِ شریعت ہے۔[1] اس وقت تک الازرقی قطری بن الفجاءت کی قیادت میں کرمان[2]، فارس اور دوسرے مشرقی صوبوں پر قابض ہو چکے تھے۔ حجاج کے سالار ایران سے آگے بڑھ کر وادیٔ سندھ میں داخل ہوئے جیسا کہ آئندہ باب میں بتایا جائے گا۔ حجاج کو دارالحکومت میں اپنی شامی فوج پر بڑا بھروسا تھا۔ اس فوج پر اعتماد اور امیہ خاندان سے وفاداری کے حدود کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔

---

[1] شہرستانی کی کتاب ملل والنحل ص ۸۹، ۹۰، بغدادی ۷۲-۷۶، طبری جلد دوم ۳-۱۔

[2] یاقوت جلد چہارم ص ۲۶۳، ابن خلکان جلد دوم ۱۸۴-۱۸۵۔



دمشق کا ایک منظر: جامع اموی کے ایک مینار سے

چھتیسواں باب

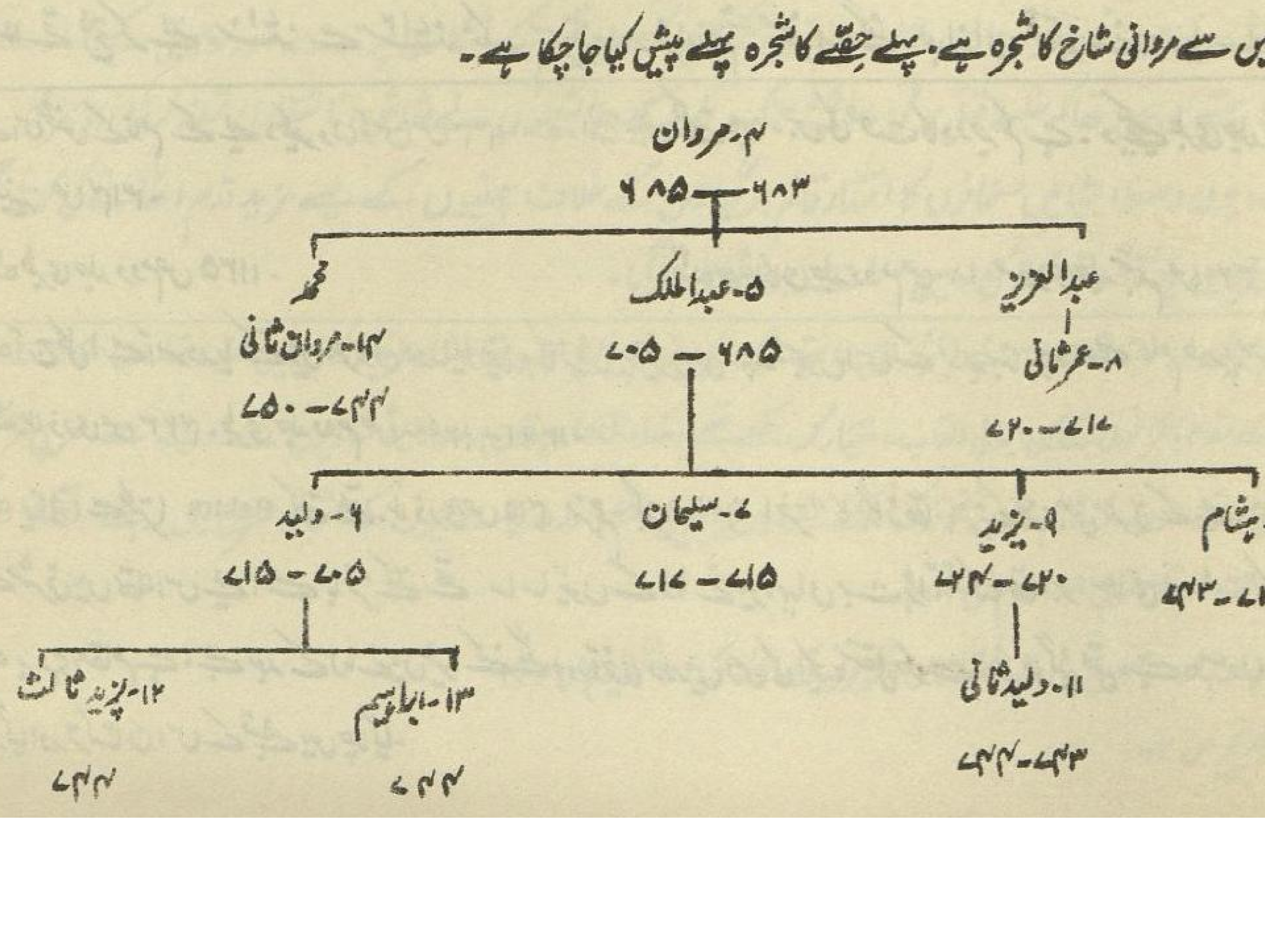
دمشق کا دورِ جلال و اقبال

عبدالملک اور اس کے چار فرزندوں کے عہد حکومت میں امیّہ خاندان قوت و طاقت اور جلال و اقبال کے نصف النہار پر پہنچ گیا۔ ولید (۷۰۵ء - ۷۱۵ء) اور اس کے بھائی ہشام (۷۲۴ء - ۷۴۳ء) کے ماتحت اسلامی سلطنت نے انتہائی وسعت اختیار کرلی۔ یہ اوقیانوس کے کناروں اور پرینیز کے دامن سے وادی سندھ اور حدودِ چین تک پہنچی ہوئی تھی۔ رومی سلطنت کو انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اتنی وسعت نصیب نہ ہوئی۔ اس سے پہلے یا بعد خود اسلامی سلطنت بھی ان حدود پر نہ پہنچ سکی۔ جلال و اقبال کے اسی دور میں ماوراءالنہر مسخر ہوا، شمالی افریقہ کو پھر سے فتح کر کے امن بحال کیا گیا اور ہسپانیہ و پرتگال قبضے میں آئے۔ اسی دور میں سلطنت کے نظم و نسق کو قومی یا عربی رنگ دیا گیا، خالص عربی سکّے رائج ہوئے، ڈاک کے نظام کو ترقی دی گئی اور عظیم القدر عمارتیں بنیں جیسے یروشلم کا قبۃ الصخرا، جو حرمین شریفین کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ متبرک مقام ہے[۱]۔

عمرؓ اور عثمانؓ کے ماتحت شام، عراق، ایران اور مصر فتح ہوئے اور تاریخ میں اسلامی فتوحات کا پہلا دور اختتام کو پہنچا۔ معاویہؓ کے ماتحت اسلامی سلطنت کی حدیں مشرقی جانب خراسان اور وسط ایشیا تک اور مغربی جانب افریقیا تک پہنچ گئیں۔ یہ فتوحات کا دوسرا دور

[۱] اصل مقدس مقام قبۃ الصخرا نہیں، بلکہ مسجد اقصیٰ ہے، جو ہیکل سلیمانی کی جگہ تعمیر ہوئی۔ صخرا کو خود حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں قربان گاہ کے سوا کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔

یہ بنو امیّہ میں سے مروانی شاخ کا شجرہ ہے۔ پہلے حصّے کا شجرہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔



ماوراالنہر اور وادیِ سندھ کی قطعی تسخیر عبدالملک اور اُس کے بیٹے ولید کے عہد میں مکمل ہوئی۔ یہ فتوحات کا تیسرا دور تھا۔

ماوراالنہر کی تسخیر

حجاج کے سالاروں نے ان علاقوں کو پوری طرح مسخر کر لیا تھا، جو اب ترکستان، افغانستان، بلوچستان اور پنجاب کہلاتے ہیں۔ ان سالاروں میں سے ایک عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث تھا، جو کندہ کے شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس خاندان کی حکومت وسط عرب میں تھی۔ خود عبدالرحمٰن سجستان کا گورنر تھا۔ اس کی ایک بہن حجاج کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی۔ عبدالرحمٰن نے ۸۰ھ-۶۹۹ء (۸۱ھ) زنبیل[1] کے خلاف پیش قدمی کی جو کابل کا ترکی یا ایرانی بادشاہ تھا اور اس نے معمولی خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وسط ایشیا میں جتنی سلطنتیں تھیں ان کے حکمران اور فوجیں ترکوں پر مشتمل تھیں لیکن رعایا میں اکثریت ایرانیوں کی تھی۔ عبدالرحمٰن کی فوج اتنے اعلیٰ پیمانے پر سازوسامان سے آراستہ تھی کہ اسے طعن کے طور پر "طاؤس کی فوج" قرار دیا گیا۔ عبدالرحمٰن کی کامیاب مہم اس لیے بےنتیجہ رہی کہ اس نے حجاج کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ عہدے سے معزول ہو گیا۔ ۸۴ھ میں اس نے ایک برج کی چوٹی سے چھلانگ لگائی اور مارا گیا۔[2] اسلامی تاریخ میں خودکشی کا یہ ایک نادر واقعہ ہے۔

۸۶ھ میں قتیبہ بن مسلم الباہلی کو حجاج کی سفارش پر خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ گویا وہ اس حصّے میں نائب السلطنت تھا۔[3] قتیبہ کے کارناموں کے سامنے عبدالرحمٰن کی تمام مہمیں بالکل ماند پڑ گئیں۔ اس نے اپنے دارالحکومت مرو سے مہمّوں کا ایک شاندار سلسلہ ان علاقوں میں شروع کیا جو دریائے جیحوں[4] کے پار واقع تھے۔ اس وقت تک دریائے جیحوں ایران و توران کے درمیان تاریخی نہیں تو کم از کم روایتی سرحد ضرور تھا۔ ایران و توران سے مراد ہیں فارسی بولنے والے اور ترکی بولنے والے علاقے۔ یہ ولید کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں وسط ایشیا میں مسلمانوں کے لیے ایک مستقل قدم گاہ مہیا ہو گئی تھی۔ قتیبہ کی فوج میں چالیس ہزار عرب بصرہ سے تھے، جس میں سات ہزار کوفہ سے اور سات ہزار صحابی تھے۔[5] قتیبہ نے پہلی مہم میں طخارستان کا زیریں حصہ فتح کر لیا، جس کا دارالحکومت بلخ تھا۔[6] ۸۷ھ-۷۰۶ء۔ ۹۰ھ میں اُس نے بخارا (واقع سغدیانہ) اور گردوپیش کے علاقے فتح کر لیے۔ ۹۰ھ سے ۹۲ھ تک سمرقند اور خوارزم[7] مسخر ہو گئے۔ بعدازاں قتیبہ نے دریائے سیحوں کے علاقوں

---

[1] اس شخص کے نام کے لیے دیکھو ولہاؤسن ص ۴۴۱، اسے اتبیل بھی لکھتے ہیں، جس کی صحت کا درجہ کم ہے۔ دیکھیے طبری جلد دوم ص ۱۰۴۲، نیز "تنبیہ" ص ۴۳۱۔

[2] طبری جلد دوم ص ۱۱۳۵۔ [3] ابن خلکان جلد دوم ص ۱۸۰، مسعودی جلد ہشتم ص ۳۲۱

[4] آج کل اسے آمو دریا کہتے ہیں۔ عربوں اور ایرانیوں کی زبان پر جیحوں ہی ہے۔ سیحوں اس کے برابر بہتا ہے اسے عام طور پر سیر دریا کہا جاتا ہے۔

[5] بلاذری ص ۴۲۳۔ طبری جلد دوم ص ۱۲۹۰-۱۲۹۱۔

[6] یونانی اسے بکترا Baktra کہتے تھے۔ بلاذری ص ۴۱۹۔ مترجم۔ بکترا دراصل "باختر" کا بگاڑ تھا۔ باختر کے لغوی معنی مشرق کے ہیں، چونکہ یہ علاقہ ایرانی سلطنت کے مشرق میں تھا، اس لیے اسے باختر کہتے تھے۔ ساسانیوں کے زمانے میں، یہاں بہت بڑا آتشکدہ تھا، جو اسلامی فتوحات تک قائم رہا۔

[7] یہ وہی مقام ہے، جسے بعد کے زمانے میں خیوا کہنے لگے اور آخری دور میں اس کی ایک مستقل حکومت قائم ہو گئی تھی، جسے روسیوں نے فتح کیا۔ پھر بخارا فتح ہو گیا اور ترکستان اس کے قبضے میں چلا گیا۔

خصوصاً فرغانہ پر حملہ کیا۔ اس طرح مسلمانوں کی حکومت، ان علاقوں پر قائم ہوگئی، جنھیں زمانہ حال میں "وسط ایشیا کی خانیاں" کہا جاتا تھا۔ ان علاقوں کی بیشتر آبادیاں خانہ بدوش تھیں۔ ان فتوحات کے سلسلے میں بھی وہی طریق کار اختیار کیا گیا، جو شمالی افریقہ میں اختیار کیا گیا تھا یعنی پہلے معمولی چھاپے مارے جاتے پھر چھاپوں کا تانتا بندھ جاتا۔ چنانچہ لوگ خراج دینے کا اقرار کر لیتے۔ کچھ دیر بعد سرتابی اختیار کر لیتے تو پھر حملے شروع ہو جاتے، یہاں تک صلح ہو جاتی۔

دریائے سیحوں کو عبور کر کے آگے بڑھنا ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھا، کیونکہ اس سے پیشتر جیحوں کے بجائے سیحوں ہی ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان طبعی، سیاسی اور نسلی سرحد تھا۔ اسے عبور کرنے کا مطلب یہ تھا کہ عربوں نے براہ راست منگولوں کو دعوتِ مقابلہ دے دی اور اسلام کی ٹکر بدھ مت سے ہوگئی۔ بلخ، بخارا اور سمرقند میں بھی بدھوں کی خانقاہیں تھیں۔ سمرقند میں قتیبہ کو بہت سے بت ملے، جنھیں اس نے اپنے ہاتھوں سے آگ لگائی۔ بت پرستوں سے قتیبہ کی گفتگو ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ بتوں کی بے حرمتی کرنے والے کے متعلق امید تھی کہ وہ آناً فاناً تباہ ہو جائے گا۔ بخارا کا آتشکدہ بھی برباد کر دیا گیا۔ بخارا، سمرقند اور خوارزم بہت جلد وسط ایشیا میں اسلام کی تربیت گاہیں بن گئے اور یہ عربی حضارت کے ایسے مرکز تھے، جو خراسان میں مرو و نیشاپور، عراق میں بصرہ و کوفہ کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔

جیحوں پار کے علاقے کا الحاق

قتیبہ نے جو کام شروع کیا تھا، اسے نصر بن سیار[2] (نائب قتیبہ) اور اس کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ خلیفہ ہشام نے نصر کو جیحوں پار کے علاقے کا پہلا گورنر بنایا تھا۔ علاقے کا دارالحکومت پہلے بلخ تھا، پھر مرو منتقل ہوگیا۔ مرو سے نصر بن سیار کو پھر ان علاقوں میں مہمیں بھیجنی پڑیں، جنھیں قتیبہ پہلے پامال کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قتیبہ نے جگہ جگہ عرب فوجی کارندے مقرر کر دیے تھے جو مقامی حکمران کے پہلو بہ پہلو کام کرتے تھے، خصوصاً ٹیکس لیتے تھے۔ چینی ترکستان میں کاشغر کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ اسے قتیبہ نے ۹۵ھ میں فتح کیا تھا[3] لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب وہاں نصر کے زمانے میں پہنچے۔ جب ولید ثانی مسند نشین ہوا (۱۲۵ھ)، تو اس نے نصر کو واپس طلب کیا، ساتھ ہی حکم بھیجا کہ وہ ہر قسم کے شکاری پرندے اور موسیقی کے ساز لے کر دمشق پہنچے۔ نصر ابھی راستے ہی میں تھا کہ خلیفہ قتل ہوگیا۔ ۱۲۵ھ تک نصر کے جانشینوں نے شاش (تاشقند) پر قبضہ کر لیا، جو سمرقند کے شمال مشرق میں ہے۔ یوں وسط ایشیا میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا جس کے خلاف چینیوں کے لیے مزید قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ ساتھ ہی جیحوں پار کا علاقہ خلفا کی وسیع سلطنت میں شامل ہوگیا۔

---

[1] سغدیانہ کا حاکم سمرقند میں رہتا تھا اور اس نے اخشید لقب اختیار کر رکھا تھا، جو ایرانی لقب تھا۔ شاہ فرغانہ کا بھی یہی لقب تھا۔ ان مقامات، نیز خوارزم و شاش کے مقامی حکمرانوں نے بھی ایرانی القاب اختیار کر رکھے تھے (خدا، شاہ، دہقان)۔ وہ غالباً شادیوں کے ذریعے سے مغربی ترکوں سے خاقان سے متعلق تھے۔ عرب ان تمام لوگوں کو ترک کہتے تھے جو غیر ایرانی تھے اور دریائے جیحوں کے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ دیکھیے ابن خرداذبہ ص ۳۹-۴۰، یعقوبی جلد دوم ص ۴۷۹۔

[2] ابن الاثیر جلد چہارم ص ۴۱، نیز بارتھولڈ ترکستان منگولوں کے حملے تک (انگریزی) ص ۱۹۲

[3] ابن الاثیر جلد پنجم ص ۲۔

ہندوستان میں فتوحات

قتیبہ اور نصر نے مشرقی حلقۂ جنگ میں کامیاب مہموں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اس اثنا میں ایک اور سالار جنوبی جانب حرکت کرتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ یہ حجاج کا داماد محمد ابن قاسم ثقفی تھا۔ اس کی فوج چھ ہزار شامیوں پر مشتمل تھی[1] محمد بن قاسم نے ۷۱۰ء میں مکران فتح کیا، پھر وہ آگے بڑھتا ہوا اس علاقے میں داخل ہو گیا، جسے آج کل بلوچستان کہتے ہیں۔ ۷۱۱ء اور ۷۱۲ء میں اس نے سندھ مسخر کر لیا۔ یہ دریائے سندھ کے زیریں حصے اور ڈیلٹا پر مشتمل تھا۔ دیبل کی بندرگاہ بھی اس کے قبضے میں آ گئی، جہاں بدھ کا ایک بت چالیس ذراع بلند تھا،[2] نیز اس نے نیرون لے لیا، جہاں عام روایت کے مطابق حیدر آباد شہر آباد ہوا۔ ۷۱۳ء میں فتوحات کا دائرہ ملتان تک پھیل گیا۔ ملتان میں بدھوں کا ایک قومی معبد تھا، جہاں بہت سے بدھ پیشوا اور زائرین گرفتار ہوئے۔ اس معبد سے اتنی دولت ملی کہ اسے "بیت الذہب"[3] کہا گیا۔ ملتان سالہا سال تک ہندوستان میں عربوں کا دارالحکومت اور اسلام کی چوکی بنا رہا۔

بیزنطینیوں کے خلاف اقدام

یہی زمانہ ہے، جس میں بیزنطینیوں کے خلاف نہایت پُر زور حملے کیے گئے۔ عبدالملک نے اپنے عہد حکومت کے آغاز میں، جب ابن زبیر کے ساتھ کشمکش جاری تھی، رومیوں کو خراج دینا منظور کر لیا تھا اور ان کے مسیحی حلیفوں، یعنی جراجمہ کے لیے بھی ایک رقم پیش کی جاتی تھی۔ یہ لوگ اس زمانے میں لبنان کے اندر قدم جما کر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ مدت بعد عبدالملک کو اپنے دائمی دشمن کے خلاف پیش قدمی کا موقع مل گیا۔ ۶۹۲ء میں عبدالملک نے جسٹینین ثانی کی فوج کو سباسٹوپولس (سلیشیا) کے مقام پر شکست دی۔ ولید نے جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۷۰۷ء میں ولید کی فوجوں نے طوانہ پر قبضہ کر لیا، جو کپاڈوشیا کا مضبوط ترین قلعہ تھا۔ پھر سارڈس اور پرگیمم بھی لے لیے۔ ساتھ ہی قسطنطنیہ پر پیش قدمی کا راستہ صاف ہو گیا۔ سلیمان نے اپنے بھائی مسلمہ کو سالار بنا کر قسطنطنیہ بھیجا۔ اس نے اگست ۷۱۶ء سے ستمبر ۷۱۷ء تک محاصرہ جاری رکھا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آرمینیا کو اسی زمانے میں پامال کیا جا چکا تھا، جب معاویہؓ شام کا گورنر تھا۔ ابن زبیرؓ کے ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر آرمینیا نے بغاوت کی۔ عبدالملک نے اسے دوبارہ فتح کیا۔[4]

شمالی افریقہ

اسی طرح افریقیا کو از سر نو فتح کرنا پڑا۔ معاویہؓ کے سالار عقبہ کا قبضہ افریقیا پر اتنا کمزور تھا کہ اسے خالی کر دینا پڑا۔ عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں حسان بن نعمان غسانی (۶۹۳ء - ۷۰۰ء) نے بربروں کی مزاحمت اور بیزنطینیوں کے اقتدار کو ختم کیا۔ اسلامی بیڑے کی مدد سے اس نے بیزنطینیوں کو قرطاجنہ (۶۹۸ء) اور دوسرے ساحلی شہروں سے باہر نکالا۔

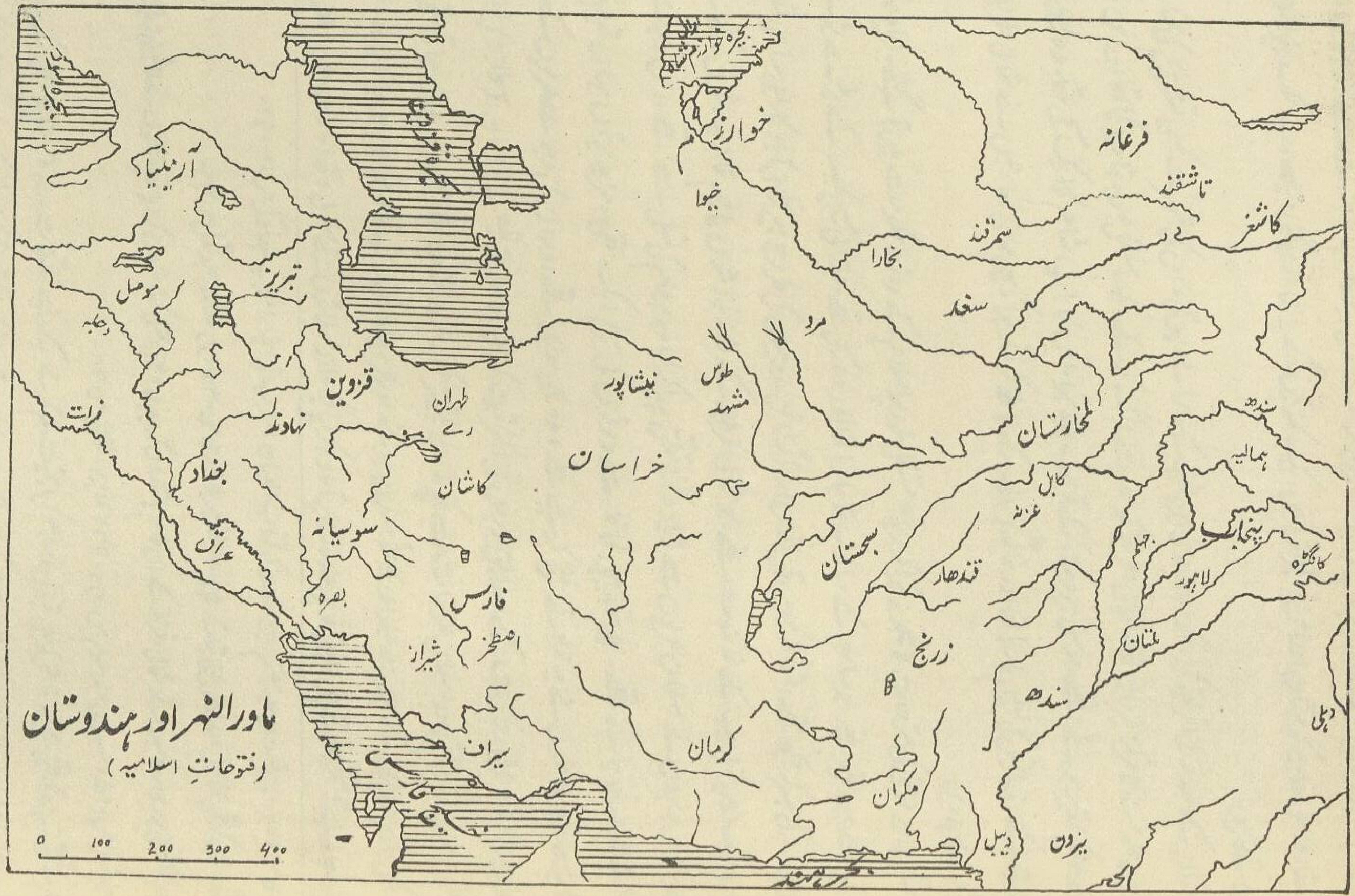
---

[1] بلاذری ص ۴۳۶۔

[2] یعقوبی جلد دوم ص ۳۴۶۔

[3] بلاذری ص ۴۴۰۔

[4] بلاذری ص ۱۶۰۔


ماوراء النہر اور ہندوستان
(فتوحاتِ اسلامیہ)
0 100 200 300 400
آرمینیا
تبریز
موصل
دجلہ
فرات
قزوین
نہاوند
بغداد
عراق
بصرہ
سوسیانہ
طہران
رے
کاشان
فارس
اصطخر
شیراز
سیراف
کرمان
مکران
خراسان
نیشاپور
طوس
مشہد
مرو
خیوا
خوارزم
بخارا
سمرقند
سغد
فرغانہ
تاشقند
کاشغر
طخارستان
کابل
غزنہ
سجستان
قندھار
زرنج
سندھ
دیبل
پنجاب
جہلم
لاہور
ملتان
ہمالیہ
کانگڑہ
دہلی

پھر اس نے بیزنطینیوں کی حلیف اور بربروں کی لیڈر خاتون کو شکست دی جسے عرب کاہنہ کہتے تھے[5]۔ کاہنہ کو اپنے پیروؤں پر پُراسرار اقتدار حاصل تھا۔ یہ کوہستان اوراس (الجزائر) میں ایک کنوئیں کے پاس ماری گئی، جسے اب تک "بئر الکاہنہ" یعنی (کاہنہ کا کنواں) کہتے ہیں۔

حسّان کے بعد شمالی افریقہ کی حکومت موسیٰ ابن نصیر کے حوالے ہوئی، جس کی شہرت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ اس زمانے میں حکومت کا مرکز قیروان تھا۔ شمالی افریقہ کو مصر سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا تھا اور اس کے لیے براہِ راست دمشق سے حاکم مقرر ہوتے تھے۔ موسیٰ بیروت کے قریب پیدا ہوا، اس کا باپ شام کا ایک مسیحی تھا۔ وہ عین التمر (عراق) میں ایک گرجے کے اندر انجیل کی تعلیم پا رہا تھا اور خالدؓ بن ولید کے ہاتھ گرفتار ہوا[2]۔ یہی موسیٰ تھا، جس نے شمالی افریقہ کی سرحدیں مغرب میں طنجہ تک پہنچا دیں۔

حسّان اور موسیٰ کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربر[3] مستقل طور پر اسلام کے دائرۂ حکومت میں آ گئے۔ زیادہ تر بربر زمین کے اس زرخیز خطّے میں مقیم تھے، جو ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور وہ مسیحی تھے۔ ابتدائی مسیحی کلیسا کے بڑے بڑے بزرگ انھیں بربروں میں زندگی بسر کر چکے تھے، مثلاً ٹرٹلین، قبریانوس اور آگسٹائن۔ رومیوں کی طرح بیزنطینی آبادکار بھی ساحلی قصبوں ہی میں رہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب کے نمائندے تھے، جو شمالی افریقہ کے خانہ بدوشوں یا نیم خانہ بدوشوں کے لیے اجنبی رہی۔ اس کے برعکس بربروں نے مسلمان عربوں سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کر لیا۔ بربر حام کی نسل سے تھے، اس وجہ سے سامیوں کے قریبی رشتہ دار مانے جاتے تھے۔ پھر تہذیبی لحاظ سے دونوں کی سطح ایک تھی۔ مزید برآں یہاں قدیم زمانے سے جو فونیقی آ بسے تھے یا انھوں نے یہ علاقے فتح کر لیے تھے، وہ بھی سامی تھے اور ان کی وجہ سے عربوں کے ساتھ قرب کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ عربی روایات کے مطابق بربروں کی اکثریت کنعانی الاصل تھی[4]۔ پیونی زبان (قرطاجنہ کی فینیقی زبان) بھی عربی کی طرح سامی زبان تھی اور اسلامی فتوحات سے کچھ مدّت پیشتر تک دور افتادہ علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ یہ تمام باتیں سامنے رکھی جائیں تو بربروں کے جلد سے جلد اور کاملاً مسلمان ہونے اور عربیّت اختیار کرنے کا معمّا حل ہو جاتا ہے، حالانکہ بظاہر اسے لاینحل سمجھا جاتا ہے[5]۔ مسخّر ہوتے ہی انھیں فوجی خدمات پر آمادہ کر لیا گیا۔ اور مسلمانوں کے مسلسل اقدامات میں انھوں نے نئے

---

[1] بلاذری ص ۲۲۹۔ ابن خلدون جلد ہفتم، ابن عذاری کی کتاب البیان المغرب فی اخبار المغرب جلد اوّل ص ۲۰، ۲۴۔

[2] بعض لوگ موسیٰ کو لخمی الاصل اور بعض یمنی بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو بلاذری ص ۲۳۰، ابن عذاری جلد اوّل ص ۴۲۔

[3] عربی بربر، لاطینی بربری۔ رومیوں نے شمالی افریقہ کے ان تمام باشندوں کو بربری، یعنی وحشی کہنا شروع کر دیا تھا، جنھوں نے لاطینی زبان اختیار نہیں کی تھی۔

[4] طبری جلد اوّل ص ۵۱۶، مسعودی جلد سوم ص ۲۴۰، ۲۳۹، ابن الفقیہ ص ۸۳۔

[5] (مترجم۔ تعجب ہے کہ حتّی جیسے فاضل کو بھی قبولِ اسلام کی اہمیت کم کرنے کے لیے تکلّفات سے کام لینا پڑا، یعنی یہ کہ بربر سامیوں کے بھائی بند تھے، وہ فینیقی زبان جانتے تھے، ان کی تہذیبی سطح یکساں تھی۔ حالانکہ وہ بہ آسانی کہہ سکتے تھے کہ اسلام کے سادہ عقائد، پاکیزہ اخلاق، حرّیت، اخوّت اور مساوات نے بربروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ مصنّفِ محترم نے یہاں تو یہ پہلو پیدا کر لیے، ایرانیوں، ترکستانیوں، افغانیوں، سندھیوں اور ملتانیوں کے قبولِ اسلام کے لیے وہ کون سی وجہ پیش کریں گے؟ مصیبت صرف یہ ہے کہ بڑے سے بڑا مصنّف اور فاضل بھی تعصّب سے اپنی (باقی ص ۳۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

نئے مجاہدوں کے طور پر کام کیا۔

ہسپانیہ کی تسخیر

شمالی افریقہ اوقیانوس تک مسخر ہو گیا[۱] تو جنوبی و مغربی یورپ کی تسخیر کا راستہ کھل گیا۔ ۷۱۱ء میں یہ اہم قدم بھی اٹھا لیا گیا۔ بیچ میں تیرہ میل چوڑی آبنائے حائل تھی، جسے عرب فوج نے پہلی مرتبہ عبور کیا۔ فوری مقصد یہ تھا کہ مالِ غنیمت حاصل کیا جائے۔ یہی حملہ پورے جزیرہ نما کی تسخیر کا سبب بن گیا۔[۲] تسخیر کے بعد اس جزیرہ نما پر کلاً یا جزواً قبضہ تقریباً آٹھ سو سال تک قائم رہا۔ جنوبی و مغربی یورپ میں یہ مہم آخری تسخیری مہم تھی اور عربوں نے جو جنگی اقدامات کیے، ان میں سے ایک نہایت حیرت انگیز اقدام یہ بھی تھا۔ اس سے یورپ اور افریقہ میں مداخلت انتہائی منزل پر پہنچ گئی، جس طرح ترکستان کی تسخیر سے ایشیا میں توسیع انتہائی منزل پر پہنچ چکی تھی۔

طارق ابن زیاد اور عبورِ آبنائے

یہ مہم اقدام کی تیزی اور فتح کی اکملیت کے لحاظ سے نہ صرف عربوں، بلکہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی تمام مہموں میں یگانہ حیثیت کی حامل ہے۔ جولائی ۷۱۰ء میں بربروں کا ایک جیش، جو چار سو پیادوں اور ایک سو سواروں پر مشتمل تھا، موسیٰ کے ایک مولیٰ طریف کی سرکردگی میں روانہ ہوا اور اس چھوٹے سے جزیرہ نما میں جا اترا، جو برِاعظم یورپ کا انتہائی جنوبی گوشہ ہے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ طریف بربر تھا یا عرب[۳]۔ جس جزیرہ نما میں وہ اترا تھا، وہ اب تک اسی کے نام سے موسوم ہے، یعنی جزیرۃ الطریف[۴] (ہسپانوی نام طریفہ) طریف کی کامیابی بڑی حوصلہ افزا تھی، ساتھ ہی ہسپانیہ کے گاتھ بادشاہوں سے کشمکش بپا تھی۔ موسیٰ نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ۷۱۱ء ہی میں اپنے ایک اور مولیٰ طارق ابن زیاد کو ہسپانیہ بھیج دیا۔ طارق کے ساتھ سات ہزار جنگجو تھے۔ ان میں سے زیادہ طارق کی طرح بربر تھے وہ اس عظیم الشان چٹان کے پاس اترا جس نے اس وقت سے طارق کے نام کو غیر فانی بنا دیا۔ یعنی جبل طارق[۵]۔ روایت یہ ہے کہ اس مہم کے لیے جہاز ایک نیم افسانوی شخص جولین[۶]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵) نظر انداز نہیں کر سکتا۔ عرب جہاں پہنچے، آبادیوں کی آبادیاں مسلمان ہو گئیں اور لاکھوں نے عربی زبان اپنا لی۔ کتنا حیرت انگیز مقام ہے کہ آج عربی کے ذخیرے میں بہت بڑا حصہ ان کتابوں کا ہے جو غیر عرب مصنفوں نے مرتب کیں۔ یہ اسلام کی معجزنما برکت تھی اس کے خوش دلانہ اعتراف میں کسی کو بھی تامل نہ ہونا چاہیے خواہ اس کا عقیدہ کچھ ہو۔

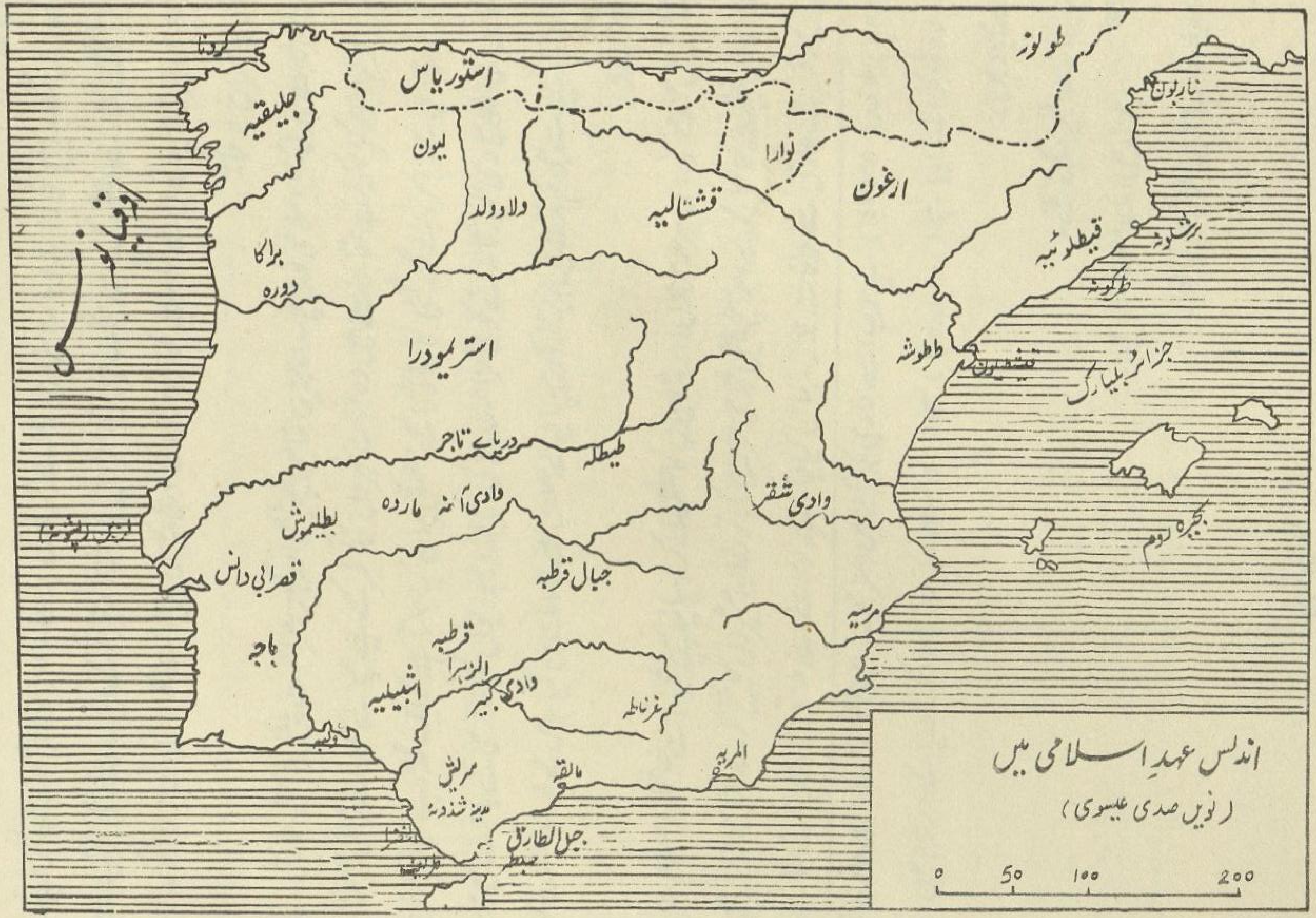
حاشیہ صفحہ ہذا:۔ [۱] ابن عبدالحکم ص ۲۰۵-۲۰۳

[۲] جزیرہ نما سے مراد ہسپانیہ و پرتگال ہیں۔ عرب اس ملک کو اندلس کہتے تھے جو اندلوشیا کی تعریب ہے۔ وینڈال ایک جرمن قبیلہ تھا، جس نے مسلمانوں سے پیشتر ہسپانیہ کو پامال کیا تھا اور اپنے نام پر ملک کا نام رکھا تھا (مترجم۔ مصنف نے یہاں بھی تعصب سے کام لیا ہے۔ طریف کا حملہ لوٹ مار کے لیے نہ تھا غرض صرف یہ تھی کہ اندازہ کر لیا جائے کہ اہلِ ہسپانیہ کی قوت اور جوشِ مزاحمت کا کیا حال ہے)

[۳] المقری نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب جلد اوّل ص ۱۵۹، ابن خلدون جلد چہارم ص ۱۱۷، ابن عذاری جلد دوم ص ۶، اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس ص ۶

[۴] ادریسی ذکر الاندلس ص ۱۱، ۳۵، ۴۴ [۵] ادریسی ص ۳۶

[۶] بلاذری ص ۲۳۰ البیان، اخبار جلد اوّل ص ۴، بلیان، نیز ملاحظہ ہو ابن عذاری جلد ۲ ص ۶، مقری جلد اوّل ص ۱۵۹، ابن عبدالحکم ص ۲۰۶، ابن الاثیر جلد ۴ ص ۴۴۲ غالباً اس شخص کا نام اربن (Urban) یا البن (Olban) تھا۔



اندلس عہدِ اسلامی میں
(نویں صدی عیسوی)

نے مہیا کئے تھے۔ جو سبط کا بیزنطینی امیر تھا۔ یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کے محرکات کیا تھے۔ ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ مغربی گاتھوں کے غاصب بادشاہ راڈرک نے جولین کی خوبصورت بیٹی کی آبروریزی کی تھی۔ یہ کہانی الحاقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تسخیر ہسپانیہ کی پوری داستان میں عربوں اور ہسپانویوں نے آرائش کی وجہ سے حد درجہ آمیزشیں کر دی ہیں۔

فیصلہ کن فتح

طارق کے پاس کمک پہنچ گئی اور وہ بارہ ہزار جانباز لے کر آگے بڑھا۔ ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو دریائے برباط[1] کے دہانے جھیل لاجنڈا[2] کے کنارے راڈرک سے جنگ ہوئی۔ معزول بادشاہ ویتزا[3] کے ایک بیٹے کی تحریک سے اسکے رشتہ داروں نے غداری کی، اس طرح ہسپانیوں نے شکست کھائی، جن کی فوج پچیس ہزار سے کم نہ تھی خود راڈرک میدان ہی میں گم ہو گیا اور اس کا کوئی سراغ نہ ملا[4]۔

یہ فتح فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ پھر اسلامی فوج پورے جزیرہ نما میں پھر نکلی اور کہیں مزاحمت پیش نہ آئی۔ طارق نے بڑی فوج کے ساتھ ٹالیڈو[5] کا رخ کر لیا، جو مرکزِ حکومت تھا۔ راستے میں وہ مختلف شہروں کی تسخیر کے لیے چھوٹے چھوٹے جیش بھیجتا گیا۔ سیویل[6] بڑا مستحکم مقام تھا، اسلامی فوج اس کے پاس سے گزر گئی کارڈووا[7] کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک گڈریے کی غداری سے فتح ہوا۔ اس نے دیوار میں شگاف کی اطلاع دی تھی[8]۔ مالقہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ٹالیڈو یہودیوں کی غداری کے باعث فتح ہوا۔ یہ ۷۱۱ء کے موسم گرما کا آخری دور تھا چھ مہینے سے بھی کم مدت میں بربر حملہ آور ہسپانیہ کے نصف حصے کا مالک بن گیا۔ اس نے پوری سلطنت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا

موسیٰ کا ورود

جون ۷۱۲ء میں خود موسیٰ دس ہزار عربوں اور شامیوں کا لشکر لے کر ہسپانیہ پہنچ گیا۔ اسے خوشگوار معلوم نہ ہوا کہ نائب ہی ملک کی تسخیر کا اعزاز اور مالِ غنیمت حاصل کرے، چنانچہ پیش قدمی شروع کی تو وہاں شہروں کو فتح کرنے لگا جو طارق چھوڑ گیا تھا۔ ٹالیڈو کے اندر یا اس کے قریب طارق سے ملاقات ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ نے طارق کے تازیانے لگائے، کیونکہ مہم کے آغاز

---

[1] اس کا موجودہ نام سلادو (Salado) ہے عرب اسے وادیِ بکہ کہتے ہیں (مترجم۔ بعض لوگوں نے اسے وادیٔ لکہ سمجھ لیا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ وادیٔ لکہ الگ دریا ہے (Guadelete) یعنی وادی لیت۔ بکہ و برباط ایک دریا کے دو نام ہیں۔ یہ دو شہر ہیں، جو اس کے کنارے آباد ہیں)۔

[2] لاجنڈا، عرب اسے البحیرہ کہتے تھے۔

[3] Witiza، عربی میں اسے غطیشہ کہتے ہیں۔

[4] راڈرک دریائے برباط میں غرق ہو گیا تھا۔

[5] طلیطلہ

[6] اشبیلیہ

[7] قرطبہ

[8] ابن عذاری جلد ۲ ص ۱۰، ۱۱، اخبار ص ۱۰، المقری جلد اوّل ص ۶۴، ۶۵، (مترجم۔ دیکھیے مسلمانوں کی ہر فتح کے ساتھ غداری کا پیوند لگانے کی کوشش کی گئی ہے اور مصنف نے یہ نہیں سوچا کہ ساری دنیا مغربی گاتھوں سے غداری پر کیوں آمادہ ہو گئی تھی؟)

ہی میں اسے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا، مگر اس نے حکم کی تعمیل نہ کی۔[1] پھر فاتحانہ اقدامات شروع ہو گئے۔ شمال میں اسلامی فوجیں جلد سارا گوسا[2] پہنچ گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اراگون، لیون اور کلیشیا کے کوہستانی علاقے بھی بہت جلد فتح ہو جاتے، لیکن اس اثنا میں دمشق سے خلیفہ ولید کا فرمان پہنچ گیا، جس کے مطابق موسیٰ پر نافرمانی کا وہی الزام لگایا گیا تھا، جو موسیٰ نے طارق پر لگایا تھا یعنی بالادست حاکم کی اجازت حاصل کیے بغیر کارروائی کی گئی۔

موسیٰ کی واپسی

موسےٰ نے اپنے فرزند عبدالعزیز کو کماندار بنایا اور خود خشکی کے راستے شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا قافلہ بڑا شاندار تھا۔ خاص کارکنوں کے علاوہ مغربی گاتھوں کے شاہی خاندان اور امراء کے چار سو افراد قافلے میں شامل تھے۔ ان کے سروں پر تاج تھے اور کمر میں سنہری پیٹیاں بندھی تھیں۔ ان کے پیچھے غلاموں اور اسیروں کی ایک بڑی جماعت تھی[3] جنہوں نے بیش قیمت مال غنیمت اٹھا رکھا تھا۔ یہ قافلہ شمالی افریقہ کی منزلیں طے کرتا ہوا جنوبی شام کے راستے دار الحکومت کی جانب بڑھا۔ عرب وقائع نگاروں نے مزے لے لے کر اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔[4] قافلہ طبریہ پہنچا تو موسےٰ کے پاس سلیمان کی طرف سے فرمان آگیا کہ میرا بھائی ولید بیمار ہے، جانبر ہونے کی امید نہیں۔ دمشق پہنچنے میں کچھ دیر تاخیر کرو، تاکہ میں تخت حکومت پر بیٹھ جاؤں۔[5]

معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ نے اس فرمان کو نظر انداز کر دیا۔ فروری ۷۱۵ء میں وہ بڑی شان و شوکت سے دمشق میں داخل ہوا اور ولید سے ملاقات کی ـــــ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلیمان سے ملاقات ہوئی جو مسند نشین ہو چکا تھا۔ بہر حال دمشق کی شاندار اموی مسجد کے صحن میں موسےٰ کا استقبال کیا گیا۔ یہ مسجد نئی نئی بنی تھی اور شاہی محل سے متصل تھی۔ فتح مند اسلام کی تاریخ میں یہ ہمیشہ یاد رہنے والا دن تھا۔ مغربی شہزادوں اور امیروں، نیز بھورے بالوں والے یورپی اسیروں کی اتنی بڑی تعداد نے اس سے پیشتر امیر المومنین کی بارگاہ میں فرمانبرداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا۔ اسی ایک واقعے سے امویوں کی شان و شوکت کے دور کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے جو بیش قیمت چیزیں، مالِ غنیمت میں سے موسیٰ نے خلیفہ کی بارگاہ میں پیش کیں، ان میں سے ایک وہ شاہانہ میز (مائدہ) بھی تھی، جو طارق کو ٹالیڈو کے گرجے سے ملی تھی۔ گاتھ بادشاہ اس میز کو بیش قیمت جواہرات سے مزین کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر کوششیں کرتے رہے۔ روایت کے مطابق یہ میز ایک جن نے حضرت سلیمانؑ کے لیے بنائی تھی اور ہیکل سلیمانی سے رومی اٹھا کر اپنے دار الحکومت میں لے گئے۔ وہاں سے یہ گاتھوں کے پاس ہسپانیہ پہنچ گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ نے ٹالیڈو پہنچ کر یہ میز طارق سے چھین لی تو اس کی ایک ٹانگ طارق نے اپنے پاس چھپا لی اور مجلس استقبال میں اسے پیش کیا تاکہ ثابت

---

[1] ابن عذاری جلد ۲ ص ۱۷، ۱۸؛ ابن عبد الحکم ص ۲۱۰ (مترجم۔ یہ واقعہ سراسر جعلی معلوم ہوتا ہے۔ طارق موسیٰ سے بہت دور اقلیم کے ملک میں بیٹھا تھا، فوجی مصلحتوں کا صحیح اندازہ شناس وہی تھا۔ موسیٰ کے لیے تازیانے لگانے کی وجہ کوئی نہ تھی)۔

[2] سرقسطہ

[3] مقری کے بیان کے مطابق تیس ہزار (جلد اول ص ۱۴۴)، ابن الاثیر جلد ۴ ص ۴۸۸۔

[4] ابن عبد الحکم، ابن عذاری، ابن القوطیہ، تاریخ افتتاح اندلس، ابن قتیبہ (قصتہ فتح الاندلس)

[5] مراکش کی کتاب المعجب فی تلخیص الاخبار المغرب ص ۸۔

ہو جائے، یہ اس کا کارنامہ تھا۔[1]

ولید کے جانشین نے موسیٰ کی تادیب کی اور اس کی تذلیل میں کوشاں ہوا۔ اسے خاصی دیر تک دھوپ میں کھڑے رکھا پھر عہدے سے برطرف کر دیا اور اس کی جائیداد ضبط کر لی، گویا موسیٰ کو بھی انہیں حالات سے سابقہ پڑا جو دوسرے کامیاب مسلمان سالاروں اور مدبروں کو پیش آ چکے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ افریقہ اور ہسپانیہ کے اس فاتح کو آخری مرتبہ حجاز کے ایک دور افتادہ گاؤں میں دیکھا گیا جہاں وہ قوتِ لایموت کے لیے بھیک مانگ رہا تھا۔[2]

ہسپانیہ سلطنت شام کا جزو بن گیا۔ موسیٰ کے جانشینوں نے مشرق اور شمال میں مفتوحہ علاقے کی حدیں سیدھی کرنے کا کام جاری رکھا۔ ہسپانیہ میں داخلے سے چھ سال بعد فاتح عرب پرینیز کے سربلند اور عظیم الشان دامنِ کوہ میں پہنچ گئے تھے۔

فتوحات کی توجیہ

اس قسم کی بے مثال فتح داخلی کمزوری اور اختلافات کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ملک کی آبادی رومیوں اور ہسپانیوں پر مشتمل تھی۔ فرمانروائی کی باگ ڈور مغربی گاتھوں کے قبضے میں آ گئی تھی، جنہوں نے پانچویں صدی مسیحی کے آغاز میں ملک فتح کیا تھا وہ مطلق العنان حکمران تھے اور اکثر جبر سے کام لیتے تھے وہ سالہا سال تک اریانوسی مسیحیت کے پابند رہے اور چھٹی صدی کے آخر تک کیتھولک مذہب اختیار نہ کیا، جو ان کی رعایا کا مذہب تھا۔ معاشرے کا سب سے پست طبقہ غلام کاشت کاروں اور غلاموں پر مشتمل تھا۔ یہودیوں پر بھی بڑے ظلم ہو رہے تھے۔ ان اسباب نے مل کر فتح کے لیے سہولتیں پیدا کر دیں۔[3]

پرینیز کا عبور

۷۱۷ء یا ۷۱۸ء میں موسیٰ کے تیسرے جانشین حُر بن عبدالرحمٰن الثقفی نے وہ کوہستان عبور کر لیا، جو فرانس اور ہسپانیہ کے درمیان حائل ہے۔ ابتدائی یورشیں زیادہ تر چھاپوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور یہ چھاپے حُر کے جانشین السمح ابن مالک الخولانی نے بھی جاری رکھے۔ مدعا یہ تھا کہ خانقاہوں اور گرجوں کو لوٹا جائے کیونکہ مشہور تھا۔ ان میں بڑا مال جمع ہے۔ ۷۲۰ء میں (بہ عہد خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ) سمح نے فاربونے (عربی اربونہ) پر قبضہ کر لیا، جسے ایک نہایت مضبوط اور مستحکم مرکزِ اسلحہ بنا دیا گیا۔ ۷۲۱ء میں طولوز

---

[1] مقری جلد اوّل ص ۱۶۷، ۱۷۲، ابن عبدالحکم ص ۲۱۱، ابن الاثیر جلد ۴ ص ۴۸، ۴۹، ابن خلکان جلد ۳ ص ۲۶، ۲۷، نبغتہ من اخبار فتح اندلس

[2] مقری جلد اوّل ص ۱۸۰، ابن خلکان جلد ۳ ص ۲۷ (مترجم۔ یہ واقعہ قطعاً حزین یقین نہیں عجیب امر یہ ہے کہ موسیٰ کا فرزند عبدالعزیز خاصی مدت تک اندلس کا گورنر رہا۔ اس حالت میں اس کا باپ بھیک نہیں مانگ سکتا تھا دیسے بھی موسیٰ تابعی تھا یہ حقیقت نہ تھا کہ اسے کھانے کے لیے بھیک مانگنی پڑتی البتہ وہ عہدے سے معزول ہو گیا۔ لوگوں نے اسے داستان سرائی کا موضوع بنا لیا۔

[3] (مترجم۔ مصنف محض یہ لکھنا بھول گیا کہ اس فتح میں صرف ملکی اسباب مؤثر ہوئے اور خود عربوں کا حصہ اس فتح میں کوئی نہ تھا یہیں آج کل کے بالغ النظر اور بے تعصب مغربی مؤرخ۔

[4] ناربون اور اس کے بعد بوردو، پوئٹیرز، تور زبخلنے نام آئے ہیں یہ فرانس کے مشہور مقامات ہیں۔ مصنف نے خدا جانے کیوں واضح طور پر نہیں لکھا کہ یہ فرانس کی تسخیر کے مختلف مرحلے تھے۔

پر حملہ کیا گیا، جو ایکوٹین[1] کے ڈیوک کا مرکز تھا، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور سمح میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ عربوں پر الازی امیر کی یہ پہلی فتح تھی۔

جنگ تورز

بارہ سال گزر گئے، سمح کے جانشین عبدالرحمٰن ابن عبداللہ الغافقی نے پرنیز کے پار سب سے بڑی اور آخری مہم کا انتظام کیا۔ اس نے پہلے دریائے گارون کے کنارے ایکوٹین کے ڈیوک کو شکست دی، پھر بوردو پر حملہ کیا۔ اسے لے لینے کے بعد وہ شمالی جانب پوئٹیرز کی طرف بڑھا اور اس کی فصیل سے باہر ایک گرجے کو آگ لگائی پھر تورز کی طرف نکل گیا۔ تورز میں گال قوم کے ایک بزرگ سان مارٹن کی زیارت تھی۔ حملہ آور کو خیال تھا کہ وہاں بہت سے قیمتی تحفے اور نذرانے جمع ہوں گے۔

پوئٹیرز اور تورز کے درمیان عبدالرحمٰن کا راستہ چارلس نے روک لیا، جو میروونجی بادشاہوں کا ناظم قصر تھا وہ اگرچہ رسماً نہیں، لیکن عملاً بادشاہ تھا۔ اس نے جوانمردی سے مختلف دشمنوں کو زیر کیا تھا اور ایکوٹین کے ڈیوک سے شمالی فرینکوں کا اقتدار منوایا تھا۔

سات روز تک چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ۷۳۲ء میں اکتوبر کا مہینہ اور ہفتے کا دن تھا، جب فیصلہ کن لڑائی ہوئی، فرینک جنگ جو زیادہ تر پیادہ تھے اور انہیں علم تھا کہ سردی سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ بھیڑیوں کی کھالیں ہیں۔ گھمسان کا رن پڑا، فرینک دوش بدوش کھڑے رہے اور مغربی مؤرخ کے بیان کے مطابق چٹان کی طرح مستحکم اور برف کے تودے کی طرح بے لچک تھے جب اسلامی رسالے نے ان پر حملہ کیا تو پیچھے ہٹے بغیر انہوں نے رسالے کو کاٹ کر رکھ دیا۔ عبدالرحمٰن بھی مارا گیا رات ہوگئی تو جنگ بند کر دی گئی حملہ آور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر نکل گئے صبح تک چارلس کو اندازہ نہ ہو سکا کہ اس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے صبح کے وقت معلوم ہوا کہ اسے فتح حاصل ہوئی، چنانچہ اس وقت سے مارٹل (مارتول، ہتھوڑا) اس کے نام کا جزو بن گیا۔

مسلمانوں کے نزدیک یہ جنگ بلاط الشہداء[2] تھی، یعنی شہیدوں کا فرش۔ مسیحیوں نے اس فتح کو اپنی جنگی کارروائیوں میں ایک نقطۂ انقلاب قرار دے لیا۔ یورپی مؤرخ کہتے ہیں کہ اگر اس لڑائی کا نتیجہ برعکس نکلتا تو لندن اور پیرس میں گرجوں کی جگہ مسجدیں اور یورپی ٹوپیوں کی جگہ ترکی ٹوپیاں لائج ہو جاتیں[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ تورز میں کچھ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ اسلامی فتوحات کے تموج کا زور ختم ہو چکا چکا تھا۔ تورز جبل طارق سے ایک ہزار میل اور مسلمانوں کے مرکز قیروان سے بہت زیادہ دور تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں میں داخلی مناقشے شروع ہو گئے تھے۔ عربوں اور بربروں کے درمیان رقابت زوروں پر تھی۔ بربروں کو یہ شکایت تھی کہ ہمیں تو اندلس کے وسط میں ایک چٹیل میدان دے دیا گیا اور خود عربوں نے زرخیز خطے سنبھال لیے، حالانکہ تسخیر اندلس میں جو لڑائیاں پیش آئیں، ان کا بار سب سے زیادہ بربروں پر پڑا۔ خود عربوں میں یکسانی احساس اور اتحاد مقاصد کی کوئی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ شمالی عربوں (مضریوں[4])، اور جنوبی عربوں (یمنیوں) کے درمیان

---

[1] Aquitaine

[2] اخبار، ص ۵۱، ۶۲، مقری جلد اوّل ص ۱۴۶، یہ جنگ ایک رومی سڑک پر ہوئی تھی، جس پر پتھر بچھے ہوئے تھے۔

[3] گبن، زوال و سقوط روما جلد ۲، ص ۱۵، نیز لین پول، ص ۲۹-۳۰۔

[4] مضری اور ربیعہ دونوں شمالی عرب کے قبیلے تھے، ان کے لیے بعض اوقات معد کا مشترکہ نام استعمال کیا جاتا تھا۔

پرانے جھگڑے عود کر آئے تھے، ان میں فرقہ دارجھگڑوں نے اضافہ کر دیا۔ مضری تمام سنی تھے، یمنیوں میں کچھ لوگ شیعہ ہو چکے تھے یا شیعوں کے ہمدرد تھے۔ بربروں نے خارجیوں کا عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔

دارالحکومت دمشق

اگر تورز پر عربوں کو روک دیا گیا، مگر دوسری سمتوں میں ان کے حملے نہ رُکے۔ ۷۳۴ء میں انہوں نے ایویان[1] پر قبضہ کر لیا تو سال بعد لیانز کو لوٹا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ اسلام کے فاتحانہ اقدامات کا آخری نقطہ تورز تھا۔ ۷۳۲ء میں رسول اللہ صلعم کی وفات پر ایک سو سال پورے ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تھوڑی دیر کے لیے توقف کرکے پوری صورتِ حال کا جائزہ لے لیں۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات سے ایک سو سال بعد مسلمان ایک ایسی سلطنت کے مالک تھے، جو رومی سلطنت کے انتہائی دورِ عروج سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ یہ سلطنت ایک طرف خلیج بسکے سے دریائے سندھ اور حدودِ چین تک اور دوسری طرف بحیرہ خوارزم شاہی سے دریائے نیل کی آبشاروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ دمشق اس وسیع سلطنت کا مرکزِ حکومت تھا یہ دنیا کا وہ قدیم ترین شہر تھا جو گردشِ روزگار سے محفوظ رہ گیا۔ منظر کی عمومی حیثیت پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ شہر باغات کے زمردی حلقے (غوطہ) میں ایک موتی ہے ان باغات کو وہ چشمے سیراب کرتے ہیں، جو کوہستان لبنان کے مشرقی سلسلے کے برفاب سے بھرپور آتے ہیں۔ شمالی جانب سے بردی ندی (ربانا) آتی ہے اور گردوپیش کے میدان میں چاندی کے تاروں کی طرح بکھر جاتی ہے۔ جنوبی سمت سے فارپرندی (عوج) جبل الشیخ (کوہ حرمون) سے پانیوں کا ذخیرہ لے کر تیزی سے بہتی ہوئی آتی ہے۔ تیرھویں صدی کے اوائل کا مشہور جغرافیہ نگار یاقوت کہتا ہے کہ میں نے وہ چاروں مقامات دیکھے ہیں، جنہیں ارضی بہشت سمجھا جاتا ہے اور میرے نزدیک دمشق کو ان میں اوّلین درجہ حاصل ہے[2]۔ وہ کہتا ہے کہ آسمانی بہشت کے بارے میں جو کچھ اب تک بیان کیا گیا ہے، اس میں سے کوئی چیز ہی نہیں، جو دمشق میں مل نہ سکتی ہو[3]۔ شہر کے سامنے ایک میدان ہے، جو جنوبی و مغربی جانب لبنان کے اس پہاڑ تک چلا گیا ہے جسے ایک معزز بطریق سمجھنا چاہیے، یعنی کوہ حرمون جسے عرب جبل الشیخ کہتے ہیں، کیونکہ اس کے سر پر ہمیشہ برف کی دستار بندھی رہتی ہے۔ شہر کے عین وسط میں بنو امیہ کی مسجد (جامع امویہ) ہے جو حسنِ تعمیر کا نہایت قیمتی مرقع ہے اور عمارتی حسن و جمال کے شیدائی اب تک اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ پاس ہی خلفا کا وہ محل تھا جسے "الخضرا" کہتے تھے، کیونکہ اس کا گنبد سبز رنگ کا تھا[4]۔ خلیفہ کا دربار محل ہی میں منعقد ہوتا تھا۔ شان دار ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر خلیفہ ایک مربع تخت پر بیٹھ جاتا۔ جس پر نہایت عمدہ زرّیں گدّے بچھے ہوئے ہوتے والد کی طرف کے رشتہ دار دائیں جانب اور والدہ کی طرف کے رشتہ دار بائیں جانب کھڑے ہو جاتے۔ ان کی ترتیب عمر کی بنا پر رکھی جاتی۔ درباری شعرا اور درخواست گزار پیچھے کی جانب ہوتے۔

---

[1] Avignon جنوبی فرانس کا یہ مقام مارسائی سے تھوڑے فاصلے پر شمال میں ہے۔ لیانز ایونانیان کے شمال میں ہے یہ دونوں مقام دریائے ردم کے کنارے واقع ہیں۔

[2] معجم البلدان جلد ۲ ص ۵۸۹ (مترجم۔ چار ارضی بہشتیں ہیں صغد، سمرقند، شعب بوّان، نہر ابلہ، در غوطہ دمشق)

[3] ایضاً ص ۵۹

[4] ابن جبیر، جلد ص ۲۶۹، اغانی جلد ۶ ص ۱۵۹۔

نظام حکومت میں قومی رنگ

جب سلطنت حدِ بلوغ کو پہنچ گئی تو یہ امرِ طبعی تھا کہ اس کے نظم و نسق میں عربیت اور اس کے اداروں میں قومی رنگ بروئے کار آتا۔ اس وقت تک شام میں یونانی کو دفتری زبان کی حیثیت حاصل تھی، عراق اور مشرقی صوبوں میں پہلوی یا دوسری مقامی زبانیں رائج ہیں۔ فوراً کوئی دوسرا انتظام کر دینا ممکن ہی نہ تھا۔ مسلم فاتحین صحرائی علاقوں سے تازہ تازہ آئے تھے اور انہیں دفتر یا مالیات کا کوئی تجربہ نہیں تھا، لہٰذا وہ یونانی یا پہلوی یا دوسری زبانیں جاننے والے کارکنوں کو بحال رکھنے پر مجبور تھے، لیکن ان کارکنوں میں سے بعض نے عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی اور بعض عرب انتظامی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ تمام دوسری زبانوں کی جگہ عربی کو دفتری زبان بنا دیا جائے۔ بلاشبہہ یہ تغیّر آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ عبدالملک کے زمانے میں شروع ہوا اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ بعض مآخذ کے مطابق تغیر باپ کے زمانے میں اور بعض کے مطابق بیٹے کے زمانے میں ہوا[1]۔ اس طرح ایک ہزار سال کے اندر شام میں یکے بعد دیگرے تین تحریری زبانیں سرکاری زبانوں کی حیثیت میں رائج ہوئیں، اوّل آرامی، دوم یونانی، سوم عربی۔ عراق اور اس کے ملحقات میں امویوں کے نائب السلطنت حجاج نے مالیات کی مختلف زبانوں کی جگہ عربی کو رواج دیا[2]۔ باقی رہا آبادی کو عربیت کے رنگ میں رنگنے کا مسئلہ تو اس پر آئندہ باب میں بحث ہو گی۔

زبان میں تبدیلی کے ساتھ ہی سکّے بھی بدل دیئے گئے۔ شام کی فتح کے وقت شام میں بیزنطینی سکّے رائج تھے انہیں بدستور جاری رہنے دیا گیا[3]۔ بعض صورتوں میں قرآنی آیات سکّوں پر کندہ کرا دی گئیں۔ چاندی اور سونے کے بعض سکّے بیزنطینی اور ایرانی سکّوں کے نمونے پر تیار کرائے گئے۔ معاویہؓ نے تانبے کے سکّے جاری کیے پہلے ایسے سکّوں میں بادشاہ صلیب پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ معاویہؓ نے اس کی جگہ خلیفہ کو شمشیر بکف دکھایا۔ یہ تو متفرق واقعات تھے۔ عربی دینار اور درہم دراصل عبدالملک کے زمانے میں بنے (۶۹۵ء) آئندہ سال حجاج نے کوفہ میں چاندی کے سکّے ڈھلوائے[4]۔

ڈاک کا انتظام

عبدالملک نے ڈاک کے انتظام (برید[5]) کو بھی ترقّی دی ابتدا میں یہ انتظام سرکاری کارکنوں کی ضرورت کے لیے جاری کیا گیا

---

۱ عقد جلد ۲ ص ۳۲۲، ماوردی ص ۳۴۹، ۳۵۰، بلاذری ص ۱۹۳، ۳۰۰، ۳۰۱، بلاذری تبدیلی کا ایک مضحکہ خیز سبب بیان کرتا ہے، یعنی ایک یونانی محرر نے دوات میں پیشاب کر دیا تھا۔ (مترجم۔ یقیناً یہ واقعہ اس زبردست تبدیلی کی وجہ نہیں ہو سکتا، مگر اصل واقعے سے انکار نہ ہونا چاہیئے۔ ذلیل اور پست فطرت لوگ عموماً ایسی خفیفانہ حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

۲ بلاذری ص ۴۶۵، ۴۶۶

۳ طبری جلد ۲ ص ۹۳۹، بلاذری ۲۴۰۔ ۴۶۶۔

۴ یاقوت معجم البلدان جلد چہارم ص ۸۸۶۔

۵ العمری کی کتاب التعریف فی المصطلح الشریف ص ۱۸۵۔ "برید" قدیم سامی زبان کا لفظ ہے، جو "برد" سے مشتق ہے، یعنی بھیجنا، ارسال، ملاحظہ ہو سفرِ استر باب ۸، آیت ۱۰۔ اصفہانی: تاریخ ص ۳۹۔

تھا تاکہ انہیں خط و کتابت میں سہولت رہے۔ اس سلسلے میں عبدالملک نے اپنے عظیم القدر پیشرو معاویہؓ کا قائم کردہ نقشہ پیش نظر رکھا۔[1] اس نے بڑا منظم سلسلہ قائم کر دیا جس کے ذریعے سے اس کی سلطنت کے دور افتادہ علاقے باہم متصل ہو گئے۔ اس غرض سے جگہ جگہ سرکاری گھوڑے مقرر کر دیئے گئے، جو دمشق اور مختلف صوبوں کے مرکزوں کے درمیان ڈاک لانے لے جاتے تھے۔ ڈاک کے خاص افسر مختلف مقامات پر مقرر ہو گئے، ان کا ایک فرض یہ تھا کہ اپنے علاقے کے تمام حالات سے خلیفہ کو باخبر رکھیں۔ ولید نے اس نظام سے اپنے تعمیری مقاصد کے لیے کام لیا۔

مال اور دوسری اصلاحات

اس دور میں مزید تبدیلیاں بھی ہوئیں، جن کا تعلق ٹیکس اور مالی معاملات سے تھا۔ نظری اعتبار سے مسلمان کے لیے صرف ایک ٹیکس تھا، خواہ اس کا تعلق کسی قوم سے ہوتا یعنی زکوٰۃ، لیکن عملاً صرف عربی الاصل مسلمان اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔[2] اصل نظریے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نومسلموں، خصوصاً عراق و خراسان کے نومسلموں نے کھیتی باڑی ترک کی، گاؤں چھوڑ دیئے اور اس امید پر شہروں میں چلے گئے کہ موالی بن کر فوج میں داخل ہو جائیں گے۔ موالی کی اصطلاح بعد کے دور میں آزاد کردہ غلاموں کے لیے استعمال ہوئی۔ لیکن اس زمانے میں اس کے اندر درجے کے نامساوی ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ مالی نقطۂ نگاہ سے یہ تحریک دوسرے نقصان کا باعث تھی۔ کیونکہ اسلام قبول کرتے ہی جزیہ ختم ہو جاتا تھا، دوم فوج میں شامل ہونے ہی خزانے پر وظیفہ واجب ہو جاتا تھا۔ حجاج نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ایسے تمام آدمیوں کو کھیتوں پر واپس چلے جانے کا حکم دے دیا اور ایسا ٹیکس لگایا جو خراج (محصول زمین) اور جزیے کے برابر تھا۔[3]

حجاج کے اس حکم نے نومسلموں کے درمیان اتنی بے چینی پیدا کر دی کہ خدا ترس خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷ء-۷۲۰ء) نے از سر نو پرانا اصول قائم کر دیا جو خلیفہ ثانیؓ سے منسوب تھا، یعنی مسلمان عرب ہو یا موالی اسے کوئی خراج دینے کی ضرورت نہیں۔[4] جب خراسان کے ایک سرکاری افسر نے شکایت کی کہ لوگ زیادہ تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں اور اس سے خزانے پر بڑا اثر پڑ رہا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کا معائنہ کرایا جائے کہ انہوں نے ختنہ کرا لیے ہیں یا نہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب دیا یقیناً خدا نے اپنے رسول (صلعم) کو ہادی بنا کر بھیجا تھا، ختنہ کرانے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔[5] عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس پر بھی اصرار کیا کہ جس زمین پر خراج لیا جاتا ہے وہ کاشتکار کے قبول اسلام کے بعد مسلمانوں کی مشترکہ جائیداد سمجھی جائے اور ابتدائی ـــــ مالک کو پٹہ دار کی حیثیت دی جائے۔[6] جزیے کی رقم مقابلۃً بہت معمولی تھی، اس لیے خراج خزانے کی آمدنی کا بڑا ذریعہ رہا۔

۱۔ فخری ص ۸۰۔

۲۔ مصنف کا مدعا یہ ہے کہ صرف عربی الاصل ادا رہے زکوٰۃ کے بعد دوسرے ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔

۳۔ مبرد ص ۲۸۶۔

۴۔ بلاذری ص ۴۲۶۔

۵۔ طبری جلد ۲ ص ۱۳۵۴۔ ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۷

۶۔ ابن العساکر جلد ۴ ص ۸۰، یعقوبی جلد ۲ ص ۳۶۲، ابن الجوزی، سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۸۸ - ۸۹۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی پالیسی کامیاب نہ ہوئی۔ کیونکہ سرکاری خزانے کی آمدنی کم ہوگئی اور موالی کی تعداد بڑھ گئی[1]۔ بربر، ایرانی اور دوسرے لوگ گروہ در گروہ مالی حقوق کے لیے اسلام میں داخل ہوئے۔ آخر حجاج کی پالیسی بعض ترمیمات کے ساتھ جاری کردی گئی۔

دوسری اصلاحات میں سے حجاج کی ایک اصلاح کا تعلق عربی زبان کی کتابت سے تھا۔ جن حرفوں کی شکلیں ملتی جلتی تھی، مثلاً با، تا، ثا، دال، ذال کے لیے امتیازی علامتیں قائم کی جائیں اور تلفظ کے ابہام کو دور کرنے کے لیے سریانی زبان کی بعض علامتیں اختیار کرلی جائیں، مثلاً ضمہ، فتحہ، کسرہ حروف کے اوپر نیچے لگائے جائیں۔

اس دور کی بعض تعمیری یادگاروں کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا، جنہیں یقیناً بہت بڑے کارناموں کی حیثیت حاصل ہے۔

---

[1] ابن الجوزی ص ۹۹-۱۰۰۔

سینتیسواں باب

اُموی دور کے سیاسی اور اجتماعی حالات

اموی سلطنت بھی انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مختلف حلقوں میں منقسم تھی۔ مغربی صوبوں میں بیزنطینیوں کی تقسیمات اور مشرقی صوبوں میں ایرانیوں کی تقسیمات قائم رکھی گئیں۔ بڑے صوبے نو تھے۔

۱۔ شام و فلسطین

۲۔ کوفہ، جس میں عراق شامل تھا۔

۳۔ بصرہ جس میں ایران، سجستان، خراسان، بحرین، عمان اور غالباً نجد و یمامہ شامل تھے۔

۴۔ آرمینیا۔

۵۔ حجاز۔

۶۔ کرمان اور ہندوستان کے سرحدی اضلاع۔

۷۔ مصر۔

۸۔ افریقیا (مصر کی مغربی سرحد سے مراکش کی مشرقی سرحد تک کا علاقہ، جو آج کل لیبیا، تونیسیا اور الجزائر پر مشتمل ہے)۔

۹۔ یمن اور باقی جنوبی عرب۔

ان میں سے پانچ مرکزوں نے اتنی اونچی حیثیت اختیار کر لی تھی کہ ان کے لیے نائب السلطنت مقرر ہوتے تھے۔

۱۔ عراق، جس میں ایران کا بڑا حصّہ اور مشرقی عرب شامل تھے کوفہ اس کا دارالحکومت تھا۔

۲۔ حجاز، جس میں یمن اور وسطِ عرب شامل تھے۔

۳۔ الجزیرہ (دجلہ و فرات کے دوآبے کا شمالی حصّہ) جس میں آرمینیا، آذربائجان، نیز ایشیائے کوچک کا مشرقی حصّہ شامل تھے۔

۴۔ مصر، بالا و زیریں دونوں حصّے۔

۵۔ افریقیا جس میں شمالی افریقہ بہ استثنائے مصر، نیز ہسپانیہ اور جزائرِ بحیرۂ روم شامل تھے۔

صوبائی نظامِ حکومت

سرکاری نظام کی تین نوعیتیں تھیں، اوّل سیاسی نظم و نسق، دوم جمعِ محاصل، سوم مذہبی نگرانی اور تینوں قسم کے کاموں کی بجا آوری کے لیے کارکن مقرر کیے جاتے تھے۔ نائب السلطنت (امیر یا صاحب) کے ماتحت صوبائی گورنر (عامل) ہوتے تھے، جنھیں

خود نائب السلطنت مقرر کرتا تھا اور وہی ان کی روش کے لیے جوابدہ ہوتا تھا۔ نائب السلطنت کی حیثیت میں وہ اپنے علاقے کے اندر تمام سیاسی اور فوجی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ بعض حالتوں میں جمع محاصل کا کام ایک خاص کارکن (صاحب الخراج) کے حوالے کر دیا جاتا تھا، جو بلا واسطہ خلیفہ سے متعلق ہوتا تھا۔ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ وہ رقم تھی، جو رعایا بہ صورتِ خراج ادا کرتی تھی۔ تمام صوبائی مصارف مقامی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے۔ صرف بچت مرکزی بیت المال میں بھیجی جاتی تھی۔ صوبوں کے عدالتی افسر گورنروں کی طرف سے مقرر ہوتے تھے۔ امویوں کے دور میں ایسے بہت سے قاضی مقرر ہوتے رہے، جو قرآن و حدیث کے عالموں میں سے تھے۔ ان کا دائرہ اقتدار صرف مسلمان شہریوں تک محدود ہوتا تھا۔ غیر مسلموں کو پوری آزادی دے دی گئی تھی کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں سے فیصلے کرا لیا کریں، خصوصاً جن کا تعلق شادی، طلاق اور میراث سے تھا۔ قاضی مذہبی مقدمات کے فیصلے کے علاوہ اوقاف، یتیم خانوں اور محتاج خانوں کا انتظام بھی کرتے تھے۔

دیوانِ خاتم

معاویہؓ نے ایک نیا محکمہ قائم کیا تھا جسے دیوانِ خاتم کہتے تھے۔ یہ ایک قسم کا سرکاری محافظ خانہ تھا، جس میں ہر سرکاری دستاویز کی ایک نقل رکھ لی جاتی تھی، پھر اصل پر مُہر لگا کر جہاں بھیجنا ہوتا تھا، اسے بھیج دیا جاتا تھا[۱]۔ محکمے کے نام کا پہلا لفظ ایرانی الاصل ہے۔ عبدالملک کے زمانے تک دمشق میں ایک بڑا سرکاری محافظ خانہ قائم ہو چکا تھا[۲]۔

فوجی نظم و نسق

اموی فوج بھی بیزنطینی فوج کے نمونے پر مرتب ہوئی تھی اور اس کے بھی پانچ ہی حصے ہوتے تھے، یعنی قلب، میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور ساقہ یعنی عقبی حصہ۔ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی (۷۴۴-۷۵۰ء) نے یہ ترتیب ترک کر کے ایک نئی ترکیب اختیار کی جسے اصطلاح میں کردوس[۳] (گروہی ترتیبات) کہتے تھے۔ اسلحہ اور دوسرے سامان کے لحاظ سے عربوں اور یونانیوں کے درمیان تمیز مشکل تھی۔ رسالے والے گول سادہ زین استعمال کرتے تھے، جو اب تک مشرقِ قریب میں عام ہیں۔ بھاری توپ خانے میں عرّادہ، منجنیق، کبش اور دبابہ[۴] شامل تھے۔ یہ بھاری اسلحہ اونٹوں پر لاد کر فوج کے پیچھے پیچھے بھیجتے تھے۔

دمشق میں زیادہ تر فوج شامیوں اور شامی عربوں پر مشتمل تھی۔ سفیانی[۵] خلفاء کی باقاعدہ فوج ساٹھ ہزار تھی، جس پر سالانہ چھ کروڑ درہم خرچ ہوتے تھے[۶]۔ یزید ثالث (۷۴۴ء) نے تمام مصارف میں دس فی صد کمی کر دی، لہٰذا وہ "ناقص" کے لقب سے مشہور ہوا۔ یزید کے

---

[۱] طبری جلد ۲ ص ۲۰۵، ۲۰۶، فخری ص ۱۴۹۔

[۲] مسعودی جلد ۵ ص ۲۳۹۔

[۳] طبری جلد ۲ ص ۱۹۴۴، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۲۶۷، ابن خلدون جلد ۳ ص ۱۶۵۔

[۴] (مترجم۔ عرادہ پتھر پھینکنے کا آلہ تھا، جو منجنیق سے چھوٹا ہوتا تھا۔ منجنیق ذرا بھاری پتھر پھینکتا تھا۔ کبش اور دبابہ بہت بھاری پتھر پھینکتے تھے اور انھیں صرف مضبوط قلعوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا)

[۵] مترجم۔ یعنی امیر معاویہؓ، یزید اور معاویہ ثانی۔ باقی اموی خلفا مروانی تھے، کیونکہ مروان کی اولاد تھے۔)

[۶] مسعودی جلد ۵ ص ۱۹۵۔

جانشین یعنی آخری اموی خلیفہ کے تحت فوج کی تعداد غالباً بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔[1]

عربی بیڑا بھی بیزنطینیوں ہی کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور شامی اس میں جہازرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جنگی سفینے میں نیچے کے دو عرشوں پر چپو چلانے والوں کی کم از کم پچیس نشستیں ہوتی تھیں۔ ہر نشست پر دو ملاح بیٹھتے تھے اور ہر جنگی سفینے میں ایک سو یا زیادہ ملاح مسلح ہوتے تھے۔ جو لوگ بحری جنگ میں خاص مہارت حاصل کر لیتے تھے، وہ بالائی عرشے پر مقرر ہوتے تھے۔

حکمران کی زندگی

دمشق میں خلیفہ کی زندگی بالکل شاہانہ بن گئی تھی۔ مدنی دور کی سادگی، یکسر ختم ہو چکی تھی۔ اموی خلفاء سے تعلقات کے لیے ایک سیاسی ضابطہ تیار ہو چکا تھا۔ جو لباس خاص رسمی تقریبات پر پہنے جاتے تھے، ان کے حاشیے پر خلیفہ کا نام کڑھا ہوتا تھا۔ بعض آیات بھی حاشیوں پر کاڑھ دی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ غالباً عبدالملک کے زمانے میں شروع ہوا۔ جو کپڑے خلفا کے لیے مخصوص ہوتے تھے، وہ مصر کے قبطی تیار کرتے تھے۔ اسی طرح پیپرس (کاغذ) بھی وہیں سے تیار ہو کر آتا تھا۔ عبدالملک ہی نے حکم دیا کہ سرکاری کاغذات کی پیشانی پر صلیب اور تثلیث کی جگہ اسلامی عبارتیں لکھی جائیں۔ ایرانی لفظ طراز اُن پارچات کے لیے مستعمل تھا، جو حکمرانوں کے لیے بنائے جاتے تھے، ان میں کشیدہ کاری کے کپڑے، زرتار کپڑے، خلعت وغیرہ سب شامل تھے۔ اس اصطلاح سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ کو بیزنطینی نمونوں کے بجائے ایرانی نمونے زیادہ پسند تھے۔

شام کے اوقات خلفاء کے لیے تفریح یا عام ملاقاتوں کے لیے وقف ہوتے تھے۔ معاویہؓ کی تفریح یہ تھی کہ وہ داستانیں سنا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک داستان گو یمن سے بلوایا تھا، جس کا نام عبید (یا عُبَید ابن شریہ) تھا۔ یہ دور ماضی کے بہادروں کے کارنامے سنایا کرتا تھا۔ گلاب کا شربت بہت مرغوب مشروب تھا اور یہ اب بھی دمشق اور دوسرے مشرقی شہروں میں شوق سے پیا جاتا تھا۔

بعض خلفاء زیادہ تر مشروبوں کے شائق رہے۔ خلفاء میں سے یزید بن معاویہؓ پہلا شخص ہے جس کے متعلق شراب نوشی کا ذکر آیا۔ وہ نشے کا اتنا رسیا تھا کہ اس کا لقب ہی یزید الخمور[2] پڑ گیا۔ جو لوگ اس کی مجلس میں شراب پیتے تھے، ان میں ایک پالتو بندر بھی تھا جس کا نام ابوقیس رکھا گیا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ شراب نوشی کا عادی بنا لیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یزید روزانہ پیتا تھا، ولید ایک دن چھوڑ کر، ہشام ہر جمعہ کو پیتا تھا۔ اور عبدالملک مہینے میں ایک مرتبہ، لیکن وہ اتنی شراب پی جاتا تھا کہ تے آور چیزیں استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔[3] خلفاء کی تفریحی زندگیوں کے متعلق یہ معلومات "عقد"، "اغانی" اور اس قسم کے دوسرے ادبی مجموعوں سے حاصل کی گئی ہیں، للٰہذا انھیں واقعی، درست نہ سمجھنا چاہیے۔ یزید ثانی شراب نوشی کے علاوہ طوائفوں سے گانے سننے کا بھی شائق تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت دو محبوب طوائفوں کی صحبت میں بسر ہوتا تھا، جن میں سے ایک کا نام سلامہ تھا اور دوسری کا حبابہ۔ ایک مرتبہ ہنسی مذاق میں یزید ثانی نے انگور کا ایک دانہ دُور سے حبابہ کے منہ میں پھینکا۔ وہ سیدھا حلق میں پہنچا اور اس کا دم گھُٹ گیا، خلیفہ اتنا پریشان ہوا کہ خود اس کا دم نکل گیا[4]۔ تاہم

---

[1] فخری میں ایک لاکھ بیس ہزار غلط بتایا گیا ہے (ص ۱۹۷) ابوالفدا جلد اوّل ص ۲۲۲۔

[2] انساب جلد ۴، ص ۳۰، عقد جلد ۳ ص ۴۰۳، نُمیری کی کتاب نہایہ جلد ۴ ص ۹۱۔

[3] عقد جلد ۳، ص ۴۰۴ [4] العیون والحدائق ص ۴۰، ۴۱، اغانی جلد ۱۳ ص ۱۶۵۔

شراب نوشی میں سب سے زیادہ اور اونچا درجہ یزید ثانی کے بیٹے ولید ثانی (۱۲۶ھ - ۷۴۳ء) نے حاصل کیا، جس کا لقب خلیع (بے لگام) تھا۔ اس کی خاص تفریح یہ تھی کہ شراب کے ایک حوض میں تیرنے لگتا اور اس دوران میں اتنی شراب پی جاتا کہ حوض کی سطح نیچی[1] ہو جاتی۔ اغانی[2] نے ایک چشم دید گواہ کی روداد درج کی ہے کہ خلیفہ کی رنگیلی مجلسیں اس صحرائی محل میں منعقد ہوتی تھیں، جو دمشق اور تدمر کے درمیان اسی غرض سے بنوایا گیا تھا اور اس کا نام القریتین تھا۔ جو خلفاء وقار و احترام محفوظ رکھنے کی غرض سے معقول روش پر کاربند رہے، وہ خاص اوقات میں سب سے الگ ہو جاتے تھے۔ ولید کو ایسی کوئی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی[3]۔

عام تفریحات

بہت سے خلیفہ اور درباری ایسی تفریحات کے عادی تھے جو قابلِ الزام تھیں، مثلاً شکار، شطرنج اور گھڑ دوڑ۔ پولو (عربی جوکان، فارسی چوگان) کا کھیل بھی اموی عہد کے اواخر میں ایران سے آ کر رواج پا گیا تھا اور عباسیوں کے عہد کا مرغوب کھیل بن گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً مرغ بھی لڑائے جاتے تھے۔ شکار عربوں کا پرانا مشغلہ تھا۔ اس کے لیے ابتدا میں سلوقی کتوں سے کام لیا جاتا تھا، جو یمن کے مقام سلوق کی طرف منسوب ہیں۔ بعد ازاں چیتوں (فہد) سے شکار کھیلنے کا رواج ہو گیا۔ ایرانیوں اور ہندوستان نے بہت پہلے چیتوں کو شکار کے لیے سدھانا شروع کر دیا تھا۔ یزید اوّل تاریخِ اسلام میں پہلا بڑا شکاری تھا۔ اُس نے چیتوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ وہ گھوڑوں کے پٹھوں پر سوار ہو جاتے تھے۔ اس کے شکاری کتوں کو جھانجنیں پہنائی جاتی تھیں اور ہر ایک کی دیکھ بھال کے لیے ایک غلام متعین تھا[4]۔ ولید اوّل پہلا خلیفہ تھا، جس نے عوامی گھڑ دوڑوں کی سرپرستی کی[5]۔ اس کے بھائی سلیمان گھڑ دوڑ کے لیے ایک قومی مقابلے کا بندوبست کیا تھا، لیکن پیشتر ہی اس نے وفات پائی[6]۔ سلیمان کے بھائی ہشام نے ایک "گھڑ دوڑ" کا انتظام کیا، جس میں شاہی اصطبل اور دوسرے لوگوں کے اصطبلوں سے چار ہزار گھوڑے شریک ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسی گھڑ دوڑ کی مثال اسلام سے پیشتر یا خود اسلام کے وقائع میں نہیں ملتی[7]۔ اس خلیفہ کی ایک بیٹی نے گھوڑوں کی پرورش کے لیے ایک خاص اصطبل قائم کر رکھا تھا[8]۔

شاہی حرم

خلیفہ کے محل کی عورتوں کو خاصی آزادی حاصل تھی۔ وہ برقعے پہن کر باہر پھر سکتی تھیں۔ حجاب قدیم سامی رسم تھی۔ قرآن مجید نے اس کی تصدیق کر دی۔ معاویہؓ کی صاحبزادی عاتکہ کے لیے ایک مکّی شاعر نے بہت سی نظمیں لکھیں جس نے ایک مرتبہ حج کے موقع پر اس

---

۱ النواجی کی کتاب حلبۃ الکمیت ص ۹۸

۲ اغانی جلد ۲ ص ۷۲

۳ الجاحظ کی کتاب التاج فی اخلاق الملوک ص ۳۲۔

۴ فخری ص ۷۶۔

۵ مسعودی جلد ۶ ص ۱۳، ۱۷۔

۶ ابن الجوزی کی کتاب سیرت ص ۵۶۔

۷ مسعودی جلد ۵ ص ۴۶۶۔

۸ العیون والحدائق ص ۶۹۔

کی جھلک دیکھ لی تھی، جب اُس نے برقع اُٹھا رکھا تھا۔ یہ شاعر عاتکہ کے پیچھے پیچھے دمشق پہنچ گیا۔ خلیفہ نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کے لیے وظیفہ مقرر کر کے زبان بندی کا انتظام کر دے۔ مزید برآں اس کے لیے ایک موزوں بیوی بھی مہیا کر دی[1]۔ معاویہؓ کی ایک پوتی کا نام بھی عاتکہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ اپنے شوہر عبدالملک سے جو زبردست خلیفہ تھا ناراض ہو گئی اور کمروں کے دروازے بند کر لیے۔ عبدالملک نے ہرچند کوشش کی، لیکن عاتکہ نے دروازے نہ کھولے۔ آخر ایک غلام بھاگا بھاگا آیا۔ دروازے پر پہنچا اور عاتکہ کو بتایا کہ آپ کے دو بیٹوں میں لڑائی ہو پڑی ہے اور ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ اب عبدالملک قاتل سے قصاص لینے والا ہے[2]۔ اس پر عاتکہ نے دروازے کھولے۔ یہ پوری داستان جعلی تھی۔ ایک اور شاعر وضاح الیمنی نے دمشق میں خود خلیفہ ولید اول کی بیوی سے عشق شروع کر دیا۔ حالانکہ خلیفہ کی طرف سے سخت سزا کا خطرہ تھا۔ اس جسارت کی پاداش میں انجام کار اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑے[3]۔ حرم کا وہ نظام جو آئندہ جاری ہوا اور جس کے ساتھ خواجہ سراؤں کی ایک جمعیت رکھی جاتی تھی، ولید ثانی کے عہدِ حکومت سے پیشتر مکمل نہیں ہوا تھا[4]۔ خواجہ سراؤں کا ادارہ بھی بیزنطینیوں کے نمونے کے مطابق تیار ہوا تھا۔ ابتدائی دور کے اکثر خواجہ سرا یونانی تھے[5]۔

مرکزِ حکومت

شہر دمشق کی حیثیت اور طور و طریق زندگی میں امویوں کے عہد سے اب تک زیادہ تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی اس کے بازار تنگ اور مسقّف ہیں اور اہلِ دمشق بڑی بڑی شلواریں، بھاری دستاریں اور نوکدار سُرخ رنگ کے جوتے پہنے ان بدؤں سے شانے ملاتے ہوئے پھرتے ہیں، جن کے چہرے دھوپ کی وجہ سے سانولے ہوتے ہیں اور جو کھلی عباؤں کے ساتھ کوفیہ (سر کا کپڑا) اور عقال (سربند) پہنے ہوتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کوئی فرنگی یورپی لباس پہنے پاس سے نکل جاتا ہے۔ کہیں کہیں چند عورتیں برقعے پہنے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض مکانوں کی عورتیں لکڑی کی جالی والے پردوں میں سے جانے آنے والوں کو جھانک لیتی ہیں۔ وہاں دائیں چلو اور بائیں چلو کا کوئی قاعدہ نہیں تھا اور بازاروں کی ایسی تقسیم نہیں رکھی گئی تھی کہ ایک حصہ سواروں کے لیے ہو اور دوسرا پیدل چلنے والوں کے لیے۔ اگر کوئی امیر ریشمی قبا پہنے اور تلوار لٹکائے گھوڑے پر سوار آ جاتا تو وہ بھی بے تکلّف ہجوم میں سے گزر جاتا۔ شربت اور مٹھائیاں بیچنے والے ایک دوسرے سے بڑھ کر شور مچاتے۔ گدھے اور اونٹ صحرائی اور زرعی علاقوں سے مال لے کر آتے۔ شہر کی فضا قسم قسم کی خوشبوؤں سے بسی ہوتی اور بازاروں میں سے گزرنے والے کی آنکھوں، کانوں، ناک پر خاصا دباؤ پڑتا۔

حمص، حلب اور دوسرے شہروں کی طرح عرب اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے ساتھ الگ الگ مقامات پر رہتے۔ ان مقامات کو حارہ کہا جاتا۔ یہ اب تک موجود ہیں۔ دروازہ کھلتا تو سب سے پہلے صحن آتا۔ صحن کے وسط میں ایک حوض ہوتا، جس میں فوارہ مسلسل جاری رہتا

---

[1] اغانی جلد ۶ ص ۱۵۸، ۱۶۱۔

[2] مسعودی جلد ۵ ص ۲۷۳، ۲۷۵۔

[3] اغانی جلد ۶ ص ۳۶، جلد ۱۱ ص ۴۹۔

[4] اغانی جلد ۴ ص ۷۸، ۷۹۔

[5] جے۔ بی۔ بری (Bury) کی کتاب The Imperial Administrative System of the Ninth Century ص ۱۲۰۔

حوض کے کنارے لیمو یا سنگترے کے درخت ہوتے۔ امویوں کے لیے یہ کارنامہ دائمی اعزازات کے باعث ہے کہ انھوں نے دمشق میں آب رسانی کا ایسا انتظام کر دیا تھا، جو اُس زمانے میں بھی سب سے اعلیٰ تھا اور آج بھی بڑی اچھی طرح کام دے رہا ہے۔ ایک اموی خلیفہ یزید اوّل کا نام اس وقت تک ایک نہر کی وجہ سے زندہ ہے، جو بردیٰ ندی سے نکالی گئی تھی اور اس نہر کا انتظام یزید نے کیا تھا۔ یا سمجھنا چاہیے کہ نہر پہلے سے موجود تھی، یزید نے اس کی توسیع کر دی تھی[۱]۔ دمشق کے باہر باغات کا جو وسیع حلقہ (الغوطہ) موجود ہے، یہ بردیٰ ندی ہی سے سیراب و شاداب ہوتا ہے۔ بردیٰ سے نکلی ہوئی مختلف نہریں پورے شہر میں تازگی و سرسبزی پھیلاتی ہیں۔ اب تک ساٹھ حمّام موجود ہیں، جو اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ پانی کی بہم رسانی اور تقسیم کا انتظام کتنا عمدہ تھا۔ ان حمّاموں میں سے بعض میں بڑی عمدہ منبت کاری کی گئی ہے اور خوب صورت ٹائلوں سے مزیّن ہیں۔

معاشرہ

سلطنت کی آبادی چار معاشرتی طبقوں میں منقسم تھی۔ سب سے اوپر حکمران مسلمان تھے جن میں سے پہلا درجہ خاندانِ خلافت اور فاتح عرب امیروں کا تھا۔ عبّاسیوں کے زمانے تک عرب ایک موروثی معاشرتی گروہ بنے رہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی تعداد کتنی تھی۔ یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ عربوں اور بدوؤں میں سے چند ہی تھے جنھیں زراعت سے دلچسپی تھی۔ وہ زیادہ تر شہروں میں جمع ہوتے رہے۔ لبنان پر کسی نے توجہ نہ کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں عربوں کی آمد نویں صدی یا اس کے بعد ہوئی۔ تنوخیوں کو لبنان کے سیاسی معاملات میں خاصی اہمیت حاصل رہی۔ ایک متاخر روایت سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نویں صدی کے اوائل میں لبنان پہنچے تھے[۲]۔ ان کی تعداد زیادہ نہ تھی اور دوسرے جاگیردار خاندانوں کی طرح ان کے وارث بھی باقی نہ رہے۔ بنو عاملہ گیارھویں صدی کے بعد لبنان کے جنوبی حصّے میں پھیلے۔ شام میں بنو حمدان دسویں صدی کے وسط میں پہنچے تھے اور انھوں نے حلب میں حکومت بھی قائم کر لی تھی۔ بنو مرداس، جو بنو حمدان کے جانشین بنے، گیارھویں صدی کے اوائل میں حلب آئے تھے۔ یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قبیلہ براہِ راست صحرا سے نہیں آیا تھا، بلکہ یہ پہلے سے جیرہ یا ہلالِ زرخیز کے کسی دوسرے خطّے میں حضری زندگی اختیار کر چکے تھے۔ باقی رہے بدوی قبائل جو آج کل بادیۂ شام کے مختار بنے بیٹھے ہیں تو وہ بہت بعد میں وہاں گئے۔ مثلاً عنزہ نے سترھویں صدی کے نصفِ آخر میں اہمیت حاصل کی، پھر شمر کے جانشین بن گئے، جو نجد سے آئے تھے۔ رُوَلہ عنزہ ہی کی ایک شاخ ہیں۔ شام میں بدوؤں کا یہ آخری بڑا سیل تھا[۳]۔

بعض عرب، نیز بعض بدو مضافات میں چلے گئے اور انھوں نے دیہات آباد کر لیے۔ دیہات نے ایک خاص ترتیب سے نشوونما پائی۔ پہلے ایک عارضی یا نیم عارضی چرواہی وزرعی آبادی قائم ہوئی، پھر وہ مستقل آبادی کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ زیادہ تر دیہات چشموں

---

[۱] اصطخری ص ۵۹، عیون التواریخ۔

[۲] الشدیاق کی کتاب تاریخ الاعیان جبل اللبنان ص ۲۲۴، صالح ابن یحییٰ کی تاریخ بیروت ص ۶۵۔ اس میں تنوخ کو، جس سے بنو بحتر کا سلسلہ چلا تنوخی قبیلے سے منسوب نہیں کیا۔ بلکہ منذر ابن ماء السماء کے اخلاف میں سے قرار دیا گیا ہے، جو ایک لخمی حکمران تھا۔

[۳] دیکھیے وصفی زکریا کی کتاب اشاعر الشام جلد اوّل ص ۲۱۱۔

کے قریب آباد ہوے، البتہ اس سلسلے میں دفاع کی سہولتیں اور زمین کی زرخیزی بھی پیش نظر رکھی گئی۔ قبائلی زندگی اور تنظیم کے بعض اوصاف وخصائص نمایاں ہیں اور انھیں بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ جس عرب فوج نے شام فتح کیا اس کی تعداد پچیس ہزار کے قریب تھی، مروانِ اوّل کے عہدِ حکومت میں ان عرب مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار تھی، جن کے نام حمص اور ضلع اُردن کے فوجی رجسٹروں میں درج تھے۔ ولید اوّل کے عہدِ حکومت میں دمشق اور ضلع کے عربوں کی تعداد پینتالیس ہزار تھی اور ضلع میں فینیقی ساحل بھی شامل تھے۔ ان اعداد کی بنا پر اندازہ کیا جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ فتح شام کے بعد پہلی صدی کے اواخر میں کل شامی عربوں کی تعداد بتیس لاکھ کی آبادی میں دو لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔[1] باقی رہی لبنان کی آبادی تو اس میں اکثریت آرامیوں اور فینیقیوں کو حاصل رہی۔ عرب تمام مفتوحہ علاقوں میں تھوڑی سی اقلیت تھے اور ہر جگہ ان کی حالت یہی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وسیع آبادیوں کے اتحاد میں نہایت اہم کردار ادا کر سکے۔

شہروں میں عربوں کا اجتماع اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس وقت تک شہروں کی زبان عربی ہوگئی تھی۔ باہر سے جو لوگ اپنی جنسیں فروخت کرنے کے لیے یا اپنے کسی پیشے کے مطابق کاروبار کے لیے شہروں میں آتے تھے، اپنی پہلی بولی چھوڑے بغیر نئی بولی میں سیکھ لیتے تھے مقامی لوگوں نے بھی سرکاری ملازمتوں کی قابلیت پیدا کرنے کے لیے عربی سیکھ لی۔

جن لوگوں نے فوراً نیا مذہب قبول کر لیا تھا، ان کے مقابلے میں نئی زبان سیکھنے والوں کی تعداد یقیناً زیادہ ہوگی اور عمرؓ بن عبدالعزیز کے سوا اموی خلفاء کا رجحان یہی رہا کہ وہ قبولِ اسلام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً ان لوگوں کا قبول اسلام بالکل پسند نہ تھا۔ جو قابلِ کاشت اراضی کے مالک تھے۔ اموی حکومت کے زمانے میں آزادیٔ خیال محض سیاست تک محدود نہ تھی، بلکہ مذہبی اور ذہنی لحاظ سے بھی لوگوں کو خاصی آزادی حاصل تھی۔ اموی حکومت کے آخری دَور تک دارالحکومت، اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کی عام حالت دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہوگا کہ یہ اسلامی شہر ہیں، لیکن دوسرے مقامات خصوصاً پہاڑی خطّے نے اپنے اصل خدوخال اور قدیم تہذیبی نمونے بحال رکھے۔ اسی دور میں مشرقی کلیسا کے اس عظیم القدر عالم دین اور مناجات گو نے پرورش پائی، جو سینٹ جان دمشقی کے نام سے معروف ہے اور شام نے مسیحیت کو پانچ پوپ دیے،[2] جن میں سے دو کو آگے چل کر ولی مان لیا گیا۔ لبنان مذہب کے اعتبار سے بدستور مسیحی رہا اور صدیوں تک اس کی زبان آرامی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات سے صرف مادی کشمکش ختم ہوئی۔ مذہبی، نسلی، مجلسی اور سب سے بڑھ کر لسانی کشمکش کا آغاز ہوا۔

موالی

مسلمان عربوں کے بعد نومسلموں کا درجہ تھا۔ جن مقامی باشندوں نے حالات کی رفتار یا دباؤ یا عقیدت کی بنا پر اسلام کا اقرار کر لیا۔ انھیں نظری اعتبار سے، نہ کہ عملی اعتبار سے اسلامی شہریت کے پورے حقوق مل گئے۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی قبیلے سے وابستگی پیدا کر لی اور اس میں شامل ہو گئے۔ انھیں موالی کہتے تھے۔

---

[1] لامنس جلد اوّل ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

[2] جان پنجم (۶۸۵ء، ۶۸۶ء) سینٹ سرجیس (۶۸۷ء۔۷۰۱ء) سی نیس (۷۰۸ء) کانسٹنٹائن (۷۰۸ء۔۷۱۵ء) سینٹ گریگوری سوم (۷۳۱ء۔۷۴۱ء)

موالی ہونے کے اعتبار سے اسلامی معاشرے میں ان کا درجہ سب سے نیچے تھا اور اس پستی کو یہ لوگ بُری طرح محسوس کرتے تھے۔[1] انھوں نے عراق میں شیعوں اور ایران میں خارجیوں کی طرفداری اختیار کرلی۔ یہ دراصل دلی بے اطمینانی کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔ ان لوگوں میں سے بعض کے ایمانی جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ پُرجوش داعی بن گئے اور اپنے سابق ہم مذہبوں کو بھی ظلم کا تختۂ مشق بنانے میں تأمل نہ کیا۔ اسلامی معاشرے میں موالی سب سے پہلے تحصیلِ علوم اور تکمیلِ فنونِ لطیفہ میں آگے بڑھے: انھوں نے اپنی پرانی روایات اور تہذیب نئے ہم مذہبوں تک پہنچائی۔ ذہنی اعتبار سے بلندی مرتبہ کی نمائش کے بعد انھوں نے سیاسی قیادت کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ پھر عربوں کے ساتھ ان کی شادیاں شروع ہوگئیں اور عربی خون مل جُل گیا۔ (گویا کچھ مدت بعد تمام عربی بولنے والوں کو عرب سمجھا جانے لگا، خواہ وہ کسی نسل سے تھے۔

اہل الذمہ یا ذمّی

اسلامی معاشرے میں تیسرا طبقہ ان فرقوں کا تھا جن سے رواداری کا برتاؤ کیا گیا، یعنی الہامی مذاہب کے پیرو، مثلاً نصاریٰ، یہود اور صابی، جن سے مسلمانوں نے امان کے معاہدے کر لیے تھے۔ نصاریٰ اور یہود سے اس لیے رواداری کا برتاؤ کیا گیا کہ وہ اہلِ کتاب تھے اور رسول اللہ (صلعم) نے ان سے ایسا ہی برتاؤ کیا تھا۔ رواداری کے برتاؤ کے ________ مزید وجوہ یہ تھے کہ رسول اللہ (صلعم) نے تورات کی عزت کی تھی، نیز مختلف عربی قبائل جو شام و عراق کی سرحدوں پر رہتے تھے، مسیحی تھے، مثلاً غسانی، بکر، تغلب، تنوخ، صابیوں کو یہ حق اس لیے دیا گیا کہ وہ توحید کے قائل تھے۔ یہ لوگ وہی مندی تھے، جنھیں سینٹ جان کے نصاریٰ مانا گیا۔ اور جو اب تک دہانۂ فرات کی دلدلوں میں رہتے ہیں۔ خاص عرب میں رسول اللہ (صلعم) کے ایک ارشاد کے مطابق کسی غیر مسلم کو رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ صرف یمن میں یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی کو گوارا کیا گیا، تاہم ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور اسلامی حفاظت (ذمّہ) کے لیے ایک خراج مقرر کر دیا گیا۔ اقلیتوں کے مسئلے کا یہ حل مسلمانوں نے پیش کیا۔

غرض ذمّی زمین کا خراج اور جزیہ دے کر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ چونکہ وہ مقتدر مذہبی جماعت کے ارکان نہ تھے، اس لیے انھیں سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے فروتر درجہ حاصل تھا۔ دیوانی اور فوجداری کے عدالتی مقدمات وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے پاس لے جاتے تھے، البتہ اگر فریقِ مقدمہ کوئی مسلمان ہوتا تو پھر یہ اجازت نہ ہوتی۔ اسلامی قانون کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طریقِ سلوک کے اہم اجزاء عثمانیوں کے عہدِ حکومت اور ابتدائی حکومتوں تک جاری رہے۔ مذہب و قومیت کو یکجا رکھنے کا نظریہ ایک قدیم سامی نظریہ تھا اور یہ مسلمانوں کی ایجاد نہ تھا۔[2] رواداری کا یہ درجہ بعد ازاں آتش پرست زرتشتیوں (مجوس) حران کے ستارہ پرستوں (نیم صابی) کافر بربروں اور دوسرے لوگوں کو بھی دے دیا گیا۔ اگرچہ وہ لوگ کسی الہامی مذہب کے پیرو نہ تھے اور اس وجہ سے انھیں اسلامی حفاظت کے دائرے سے باہر سمجھا جاتا تھا، لیکن مسلمانوں نے ان کے سامنے دو نہیں تین راستے

---

[1] (مترجم) مصنف عربی اور اسلامی معاشرے میں تمیز نہیں کرتا۔ موالی کو عربوں کے نزدیک برابر کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ اس لیے کہ عربوں میں نسلی غرور دیر تک قائم رہا۔ اسلام عدم مساوات کا روادار نہ تھا، وہ عربوں کے گناہوں کو بھی اسلام کے ذمّے لگاتا جاتا ہے۔ [2] (مترجم) لیکن اس سے مصنف نے کیا حاصل کیا؟ سامی عقیدہ یا نظریہ اس بارے میں کچھ بھی رہا ہو، مگر پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظریے اور پرانے سامی نظریے میں نظر بہ ظاہر مطابقت کا کوئی پہلو موجود نہ تھا، نیز اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ مسلمانوں نے یہ نظریہ قدیم سامیوں سے لے لیا تو اس میں برائی کی کون سی بات ہوئی؟)

پیش کیے، یعنی اسلام یا تلوار یا خراج۔ قاضی ابو یوسف، جو ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ تھے، واضح طور پر فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے علاوہ مشرکوں اور آتش پرستوں کو بھی اسلامی سلطنت میں ذمی بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔[۱]

شام میں ذمیوں کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک اچھا برتاؤ ہوتا رہا۔ صرف ایک معاملہ مستثنیٰ ہے، یعنی قبیلہ تغلب مسیحی تھا۔ اس کے سردار نے قبولِ اسلام سے انکار کیا تو ولید نے موت کی سزا دے دی۔[۲] معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ان مسیحیوں کے متعلق کم روادار تھے، جو نسلاً عرب تھے، جیسا کہ تنوخ کے واقعے سے ظاہر ہے۔ قنسرین کے آس پاس جو تنوخ رہتے تھے انہیں فتحِ شام کے وقت اسلام کی دعوت دی گئی، بعض نے دعوت قبول کر لی۔ ان میں سے جو لوگ حلب کے آس پاس رہتے تھے، انہیں عباسی خلیفہ مہدی نے جبراً مسلمان بنا لیا اور ان کے گرجے مسمار کر دیئے۔[۳] مصر میں قبطیوں نے اپنی انفرادی حیثیت واضح کرنے کے لیے کئی مرتبہ مسلمانوں کے خلاف بغاوتیں کیں، آخر مامون عباسی (۲۱۳ھ ۸۳۳ء) کے عہد میں وہ بھی ہمیشہ کے لیے دب گئے۔[۴] نصاریٰ اور یہود معاش کے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے رہے، جن پر پہلے سے کاربند تھے۔ اگرچہ شراب بنانا اور فروخت کرنا، نیز جوا کھیلنا مسلمانوں کے نزدیک حرام تھا، تاہم شراب پینے اور جوا کھیلنے کا سلسلہ بھی جاری رہا اور بعض اوقات مسلمان بھی ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ نصرانی راہبوں کو شراب سازی، شہد کی فراہمی نیز پھلوں کی کاشت میں خاص دسترس حاصل تھی۔ خانقاہوں کے ساتھ خاص کمرے بنائے جاتے تھے، جن میں مہمانوں کے لیے ضیافتوں اور جشنوں کا انتظام ہوتا تھا۔ العمری نے جو دمشق کا باشندہ تھا (وفات ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء) ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ خلفا اور دوسرے مسلمان خانقاہوں اور راہب خانوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ وہاں شراب نوشی بھی ہوتی تھی اور جشن بھی منائے جاتے تھے اور یہ چیزیں معصومانہ قسم کی نہیں ہوتی تھیں۔ ولید ابن یزید (گیارھواں اموی خلیفہ) کے متعلق تو یہ سب کچھ یقینی طور پر درست تھا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس خلیفہ نے ایک خانقاہ کی سنگی حوضی شراب سے خالی کر دی، پھر اس نے اور اس کے بھائی نے اس حوض کو چاندی کے سکوں سے بھر دیا۔ لبنان سے شراب حجاز تک پہنچتی تھی۔[۵] ایک حجازی شاعر نے بہت سی ایسی شبینہ مجالس میں شرکت کی، یہاں تک کہ اس کی بیوی کے دل میں شبہات پیدا ہو گئے۔ شاعر نے اس کے سامنے تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا:

"مجھے اس معزز رفیق کی رفاقت سے محروم نہ کر، جو دوسروں کی برائیاں کبھی

---

[۱] کتاب الخراج ص ۹۷ (مترجم۔ یہ بھی مصنف کا تکلف ہے۔ مسلمانوں نے ہر اس شخص کو حفاظت میں لے لیا، جو اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوا اور حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔ یہی اسلامی حکم تھا۔ یہی قاضی ابو یوسف نے پیش کیا، یہ کوئی ان کا ساختہ پرداختہ حکم نہ تھا۔)

[۲] (مترجم۔ واقعے کی اصل صورت یقیناً دوسری ہو گی، لیکن اگر ولید نے یونہی اس شخص کو قبولِ اسلام پر مجبور کیا تو یہ روش اسلام کے صریح خلاف تھی۔ اس کا ذمہ دار ولید تھا نہ کہ اسلام۔)

[۳] یہ الزام محلِ نظر ہے۔

[۴] الکندی: تاریخ مصر و ولاتہ ص ۷۳، ۸۱، ۹۶، ۱۱۶، ۱۱۷، مقریزی: مواعظ الاعتبار بذکر الخطط والآثار جلد ۲ ص ۴۹۷

[۵] (مترجم۔ بظاہر یہ بیان سراسر غلط یا بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔)

[۶] ابن فضل اللہ العمری: مسالک الابصار فی ممالک الامصار جلد اول ص ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۵، ۳۵۶۔

بیان نہیں کرتی .... بیروت کے دیہات سے جو صاف اور اچھوتی
شراب آتی ہے یا جو بیسان میں بنتی ہے، وہ اتنی پی پی کر ہمارے قدم
لڑکھڑانے لگے ہیں[1]۔

غیر مسلموں پر پابندیاں

عمر بن عبد العزیزؒ کی شہادت محض تقویٰ خدا ترسی یا تخفیف محاصل ہی تک محدود نہیں، اسلامی تاریخ میں وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے مسیحی رعایا پر بعض سخت پابندیاں لگائیں اور ان پابندیوں کو غلطی کی بنا پر ان کے ہم نام خلیفہ (عمرؓ) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمان جاری کر دیا کہ مسیحیوں کو سرکاری ملازمتوں سے باہر رکھا جائے، نیز وہ پگڑیاں نہ باندھیں، پیشانی کے بال کٹوا کر رکھیں۔ امتیازی لباس پہنیں۔ چمڑے کی پیٹی لگائیں۔ زین کے بغیر گھوڑے پر سوار ہوں۔ کوئی نئی عبادت گاہ نہ بنائیں اور عبادت زیادہ بلند آواز سے نہ کریں۔ اگر کوئی مسلمان مسیحی کا خون کر دے تو مجرم کو محض جرمانے کی سزا دی جائے۔ کسی عدالت میں مسلمان کے خلاف مسیحی کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ ممکن ہے، اس قسم کے ضابطے عوام کے مطالبے کی بنا پر جاری کیے گئے ہوں، نظم و نسق کو کاروبار اور صنعت و حرفت میں عرب مسلمان شامی مسیحیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسیحیوں کے مقابلے میں یہودیوں کی تعداد کم تھی اور وہ چھوٹے درجے کے کاموں میں لگائے جاتے تھے، مذکورہ بالا پابندیوں میں سے بعض ان پر بھی عائد تھیں اور وہ سرکاری ملازمتوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اسلام سے پیشتر بھی مشرقِ قریب میں مختلف قومیں امتیاز کی غرض سے مختلف لباس پہنتی تھیں اور ان میں سے بعض ضوابط عمرؒ بن عبد العزیز کے بعد کبھی نافذ نہ ہوئے[2]۔

غلام

معاشرتی زینے میں سب سے زیادہ نچلا پایہ غلاموں کا تھا۔ غلامی قدیم سامی ادارہ تھا جس کے جواز کا اعتراف تورات نے بھی کیا ہے۔ اسلام نے یہ ادارہ قبول کر لیا اور غلاموں کی حالت بہتر بنانے کے لیے قاعدے مرتب کیے۔ مسلمان کسی ہم مذہب بھائی کو غلام نہیں بنا سکتا تھا، لیکن کسی اجنبی کے لیے اسلام قبول کر لینے کے بعد غلامی سے نجات کی کوئی ضمانت نہ تھی۔

اسلام کے ابتدائی دور میں غلام خریدتے بھی جاتے تھے، انہیں اغوا کر کے بھی لایا جاتا تھا، چھاپے مار کر بھی حاصل کیے

---

[1] اغانی جلد ۲ ص ۸۶، ۸۸۔

[2] (مترجم۔ اس سلسلے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے متعلق ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی سیرتوں سے کم از کم مجھے کوئی ایسا حوالہ نہیں مل سکا۔ اس کے برعکس ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کے متعدد واقعات ملتے ہیں، مثلاً وصول جزیہ میں نرمی کی تاکید، ذمیوں کے املاک کی حفاظت ایک مرتبہ حمص کے ایک بوڑھے ذمی نے شکایت کی کہ عباس بن ولید بن عبد الملک نے میری زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عباس سے فوراً یہ زمین واپس دلائی۔ ایک مرتبہ کسی مسلمان نے حیرہ کے کسی ذمی کو قتل کر دیا۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے، وہ چاہیں تو قتل کر دیں، چاہیں تو معاف کر دیں، چنانچہ انہوں نے قاتل کو قتل کرا دیا غرض مصنف کی عادت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف تو غیر مستند کتابوں سے بھی حالات لے لیتا ہے اور ان کے حق میں مستند کتابوں سے شہادتیں لینے میں بھی تامل کرتا ہے)۔

جاتے تھے اور جن جنگی قیدیوں کا فدیہ وصول نہیں ہوتا تھا، انہیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے سب شامل تھے بہت جلد غلاموں کی تجارت اسلامی ملکوں میں فروغ پا گئی۔ مشرقی اور وسطی افریقہ سے سیاہ فام غلام، فرغانہ اور چینی ترکستان سے زرد فام غلام، مشرق قریب اور جنوبی و مشرقی یورپ سے سفید فام غلام مہیا کیے جاتے تھے۔ یہ ادارہ مستقبل حیثیت اختیار کر گیا۔ اسلامی قانون کے مطابق کسی غلام سے لونڈی کی اولاد کو بھی غلام سمجھا جاتا تھا۔ آقا کے سوا ہر شخص سے لونڈی کی اولاد کا درجہ یہی تھا اور اگر آقا بھی بچے کا باپ ہونے سے انکار کر دیتا تھا تو اس بچے کو بھی غلام ہی سمجھا جاتا تھا، البتہ ایک غلام سے آزاد عورت کی اولاد آزاد مانی جاتی تھی۔

آقا اور لونڈی کے درمیان وظائفِ زوجیت قائم کر لینے کی اجازت تھی۔ لونڈی کا ہر بچہ آقا کی اولاد سمجھا جاتا تھا، لہٰذا وہ آزاد ہوتا تھا۔ بچہ پیدا ہوتے ہی لونڈی کا درجہ بڑھ جاتا تھا اور وہ "اُمّ ولد" کہلاتی تھی۔ آقا ایسی لونڈی نہ فروخت کر سکتا تھا نہ اسے یہ اجازت تھی کہ اپنے سے الگ کر دے۔ اس کی موت پر لونڈی خود بخود آزاد ہو جاتی تھی۔ اسلام میں غلام کو آزاد کرانا بطور خاص کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا اور اس سے قربِ حق حاصل ہوتا تھا۔ آزاد غلام کو آقا کے تعلق میں مولیٰ کا درجہ حاصل ہوتا اور وہ اپنے آقا کی موت کے بعد اس کے املاک کا وارث قرار پاتا، بشرطیکہ اس کا کوئی اور وارث نہ ہوتا۔

جس ماحول میں عرب اور غیر عرب کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، اس میں غلاموں نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ دعویٰ حکمرانوں اور عوام دونوں کے تعلق میں درست سمجھنا چاہیے۔ عرب خلفاء نسب کے خالص ہونے پر بہت فخر کرتے تھے، یزید ثالث پر پہنچ کر یہ پُرفخر روایت باقی نہ رہی، یزید کی والدہ ایران کے شاہی گھرانے کی ایک شہزادی تھی، جو خراسان میں گرفتار ہوئی اور حجاج نے اسے ولید کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یزید کا بھائی اور جانشین ابراہیم ایک غیر معروف کنیز کا بیٹا تھا، جو شاید یونانی الاصل تھی[1]۔ ابراہیم کے جانشین مروان ثانی کی والدہ کرد قبیلے کی ایک کنیز تھی[2]۔ ایک روایت کے مطابق جب وہ مروان کے والد کے پاس آئی تو حاملہ تھی[3]۔ اس لحاظ سے آخری اموی خلیفہ اموی ہی ثابت نہیں ہوتا۔ آزاد عرب خواتین کی حیثیت پر کنیزوں کے تصرف کا سلسلہ عباسیوں کے دور میں بہت بڑھ گیا۔

عام اقتصادی حالت

شام بیزنطینی سلطنت سے کٹ گیا تو اس کی بحری تجارت میں خاصی تخفیف ہو گئی، لیکن اس کی تلافی یوں ہوئی کہ ایران اور وسطِ ایشیا میں نئی منڈیوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکل آیا۔ جو جہاز بحیرۂ روم میں چکر لگاتے تھے، ان کے عرشوں کے تختوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں، تاکہ پانی اندر داخل نہ ہو سکے، اور پر سے تارکول بچھا دیا جاتا تھا، لیکن جو جہاز خلیج فارس یا مشرقی سمندروں میں چکر لگاتے تھے۔ ان کے تختے رسّوں سے کس کر باندھ دیئے جاتے تھے۔ حجاج نے حکم دے دیا کہ ان جہازوں کے تختوں میں بھی کیلیں ٹھونکی جائیں[4]۔ حجاج کے جہاز سیلون تک آتے جاتے تھے اور بعض اوقات ہندوستانی بحری قزاق ان پر حملے کر دیتے تھے[5]۔ معاویہ نے

1۔ عقد جلد ۲ ص ۳۳۳، ۳۵۲، یعقوبی جلد ۲ ص ۴۰۱، ۴۰۳، طبری جلد ۲ ص ۱۸۷۴، مسعودی جلد ۶ ص ۳۱، ۳۲۔

2۔ یعقوبی جلد ۲ ص ۴۰۴، طبری جلد ۳ ص ۵۱

3۔ انساب جلد ۵ ص ۱۸۶۔ 4۔ ابن رستہ کی کتاب الاعلاق النفیسہ ص ۱۹۵، ۱۹۶

5۔ بلاذری ص ۴۳۵

عکہ میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ بنایا تھا، عبدالملک نے ایسا ہی ایک کارخانہ تونیسیہ میں قائم کر دیا[1]۔ اس کے بیٹے ہشام نے عکہ والا کارخانہ صور میں منتقل کر دیا، جہاں یہ متوکل عباسی کے زمانے تک رہا[2]۔ بصرہ کے ایک اموی گورنر کے ماتحت اس شہر اور گرد و نواح میں "ایک لاکھ بیس ہزار نہریں" تھیں، جن میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پھرتی رہتی تھیں۔ دسویں صدی کے جغرافیہ نگار اصطخری نے خود یہ شہر دیکھا تھا وہ نہروں کی اس تعداد کو صحیح نہیں سمجھتا ہے[3]

یہ نہریں دمشق کی طرح آبیاری کے لیے تیار ہوئی تھیں۔ اگرچہ شام میں مالیہ بڑھا دیا گیا، تاہم زراعت کو بہ لحاظ مجموعی کوئی نقصان نہ پہنچا، البتہ انگوروں کی کاشت کو ایک حد تک نقصان پہنچا کیونکہ اسلام میں کشید شراب کی اجازت نہ تھی اور یہ صنعت زمانۂ قدیم سے شام کی ایک کامیاب صنعت سمجھی جاتی تھی۔

---

[1] ابن خلدون مقدمہ ص ٢١١۔ [2] بلاذری ص ١١٨۔

[3] اصطخری ص ٨٠۔

اڑتیسواں باب

امویوں کے ماتحت علوم و ثقافت

شامی، عراقی، ایرانی، قبطی اور بربر حلقۂ اسلام میں آئے اور عربوں سے شادیوں کے رشتے پیدا ہوئے تو عرب اور غیر عرب کے درمیان جو فرق تھا وہ آہستہ آہستہ زائل ہوگیا۔ رسول اللہؐ کے پیروؤں میں سے کسی کی ابتدائی قومیت خواہ کچھ تھی، لیکن اس نے عربی کو اپنی زبان بنالیا اور ہر فرد عرب سمجھا جانے لگا۔ عرب اپنے ساتھ صحرا سے کوئی سائنس، کوئی فن، کوئی علمی روایت یا کوئی تہذیبی میراث لے کر نہیں آئے تھے، انہوں نے صرف دو نئے ثقافتی عنصر پیش کئے۔ ایک مذہب دوسرا زبان۔ باقی تمام امور میں ان کا انحصار رعایا پر رہا، شام اور دوسرے مفتوحہ ملکوں میں انہوں نے مفتوحوں کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ مفتوحوں کے ہاتھوں فاتحوں کی اسیری کی یہ ایک اور مثال ہے۔ رومیوں کے تعلّق میں جو کردار یونان نے ادا کیا، وہی عربوں کے تعلّق میں شام نے ادا کیا۔ جب ہم عربی طب یا عربی فلسفے یا عربی ریاضیات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ علوم لازماً عربوں کی ذہنی صلاحیت کے کرشمے تھے یا جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں نے انہیں ترقی دی۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ علوم ان عربی کتابوں میں مدوّن ہوئے جو شامیوں، ایرانیوں، عراقیوں، مصریوں یا عربوں نے لکھی تھیں، خواہ وہ مسیحی تھے یا یہودی یا مسلمان۔ نیز یہ کتابیں یونانی، آرامی، ہندی، فارسی اور دوسرے وسائل سے فائدہ اٹھا کر لکھی گئی تھیں۔

امویوں کے دَور میں ذہنی زندگی کا درجہ زیادہ اونچا نہ تھا۔ درحقیقت یہ آئندہ کے لیے تیاری کا دَور تھا۔ دَورِ جاہلیت کی تاریکی کو دور ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ جنگیں عموماً ہوتی رہتی تھیں۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ اقتصادی اور معاشرتی حالات ناپائیدار تھے۔ یہ تمام اسباب اعلیٰ ذہنی تحصیلات کے لیے سازگار نہیں سمجھے جا سکتے تھے لیکن اسی دَور میں وہ بیج بوئے گئے جنہوں نے عباسیوں کے عہد میں پھولوں کی شکل اختیار کی۔

نحو اور لغت

اس عہد میں سب سے پہلے عربی نحو کے مطالعے پر توجہ ہوئی۔ یہ اس لئے ضروری ہوا کہ نومسلم جلد سے جلد زبان سیکھ کر بلاواسطہ قرآن سے آگاہ ہونا چاہتے تھے، نیز سرکاری ملازمتوں کے لیے عربی کا سیکھنا ضروری تھا اور عربی زبان بولنے والے فاتحین کی جماعت کے افراد سمجھے جاتے تھے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ عربی زبان کا پہلا علمی مطالعہ بصرہ میں شروع ہوا، جو ایرانی سرحد کے قریب تھا اور اس میں زیادہ حصہ اجنبی نومسلموں نے لیا اور انہیں کے لیے یہ ضروری تھا۔ یہی شہر ہے، جس میں عربی نحو کے افسانوی بانی ابوالاسود الدؤلی (وفات ۶۸۸ء) نے زندگی بسر کی، ابن خلکان اس علم کی ابتدا یوں بیان کرتا ہے کہ علیؓ نے دؤلی کے لیے بنیادی اصول تیار کر دیئے، یعنی کلام کے تین اجزا ہیں، اسم، فعل، حرف اور دؤلی سے کہا کہ اس پر ایک مفصل رسالہ

ملھ دو[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی نحو کی نشو و نما آہستہ آہستہ دیر تک جاری رہی اور اس میں یونانی منطق، نیز سنسکرتی لسانیات کے نمایاں نشان صاف نظر آتے ہیں۔

ایک اور بصری عالم خلیل بن احمد (وفات ۷۸۶ء) نے عربی کا لغت بنام کتاب العین مرتب کیا۔ اس نے بھی سنسکرت ہی کے نظام کی پیروی کی، جو عین سے شروع ہوتا ہے۔ سوانح نگار کہتے ہیں کہ خلیل ہی نے شعروں کی بحریں دریافت کیں اور وہ قاعدے بنائے، جن کی پیروی اب تک ہو رہی ہے[2]۔

حدیث اور شریعت

قرآن مجید کے مطالعے اور اس کی تفسیر کے سلسلے میں دو جڑواں علم پیدا ہوئے، ایک فقہ اللسنہ اور دوسرا علم المفردات۔ اسی طرح مسلمانوں کی ادبی سرگرمیوں سے علم حدیث پیدا ہوا، یعنی رسول اللہ (صلعم) اور آپ کے صحابہؓ کے ارشادات کی ترتیب، قرآن و حدیث دینیات کے لیے بنیاد و اساس تھے اور فقہ کو قانونِ شریعت کے جسم اور ریڑھ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور کے سلسلے میں ہمارے پاس بہت کم روایات پہنچی ہیں اور ہم بہت کم محدثین و فقہا سے واقف ہیں۔ ان میں سے بہت زیادہ مشہور حسن بصریؒ (وفات ۷۲۸ء) اور شہاب زہریؒ (وفات ۷۴۲ء) ہیں۔ بصری کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ کم و بیش ستر صحابہؓ سے براہِ راست واقف تھے۔ راسخ العقیدہ سنی مسلمان ان کے اقوال بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور صوفیہ ان کے زہد و تقویٰ کے اثرات سے کبھی آزاد نہیں ہوتے۔ زہری حدیثوں کے مطالعے میں اس درجہ منہمک رہتے تھے کہ ایک مرتبہ ان کی اہلیہ نے کہا، خدا کی قسم، تمہاری کتابیں میرے لیے تین سوتوں سے بھی بدتر ہیں[3]۔ کوفہ میں جو مرکزِ علم ہونے کے اعتبار سے بصرہ کا حریف تھا، عامر بن شراحیل الشعبی (وفات ۷۲۸ء) پیدا ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ڈیڑھ سو سے زیادہ صحابیوں سے روایتیں سنیں[4]۔ اور ان میں سے ایک سطر کاغذ پر لکھے بغیر حافظے سے وہ حدیثیں دہراتا رہا۔ شعبی کو عبدالملک نے ایک نہایت اہم کام کے سلسلے میں شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس بھیجا تھا۔

اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ رومی قانون نے براہِ راست یا تالمود کے ذریعے سے اسلامی قانون کے بعض پہلوؤں پر اثر ڈالا، خصوصاً اموی عہد کے شام اور مصر میں، مثلاً معاملات پر[5] نیز ان امور پر، جن کا تعلق حکومت کی اجارہ داری سے تھا، مثلاً سکوں، مہروں، دستاویزوں نیز ضروری چیزوں کے لیے پیپرس کی بہم رسانی وغیرہ، عربوں نے ان جنسوں کے متعلق بیزنطینیوں ہی کا نمونۂ عمل پیش نظر رکھا اور رعایا کو دھوکے، جعل اور اس قسم کی دوسری بدعملیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہی مناسب تھا کہ زیادہ سے زیادہ

---

[1] ابن خلکان جلد اوّل ص ۲۹۔۴۲۰، ۴۳۰۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۳۰۷

[3] ابن خلکان جلد ۲ ص ۲۲۳، ابوالفدا، جلد اوّل ص ۲۱۵ - ۲۱۶۔

[4] السمعانی کی کتاب الانساب، نیز ابن خلکان جلد اوّل ص ۴۳۶۔

[5] محمد حمید اللہ کی کتاب Influence of Roman on Moslem Law

سخت سزائیں دی جاتیں[1]۔ ان کی تنقید کا ذریعہ وہ ادارے تھے، جو عرب حکومت اور نومسلموں کو سابقہ حکومت یا بیزنطینی رعایا سے میراث میں ملے تھے۔ عربوں کی تشریعی اور قانونی تعبیرات میں کوئی لفظ یونانی یا لاطینی سے نہیں لیا گیا۔ اگرچہ عربی میں بعض ایسی اصطلاحات ضرور موجود ہیں، جن کی ہم معنی اصطلاحات لاطینی میں بھی ہیں۔ ہم رومی قانون کی کوئی ایسی کتاب بھی نہیں بتا سکتے، جس کا ترجمہ عربی میں کیا گیا ہو۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اسلامی فقہ کے بڑے بڑے دبستان ان علاقوں میں فروغ پذیر ہوئے جو بیزنطینیوں کے ماتحت نہ تھے، مثلاً عراق اور حجاز۔ ایک چھوٹا دبستان شام کے فقیہ اوزاعی (وفات ۱۵۷ھ/۷۷۴ء) نے قائم کیا، وہ زیادہ دیر تک جاری ہی نہ رہ سکا۔

تاریخ کی تدوین

تاریخ نگاری کی ابتدا بھی احادیث کی شکل میں ہوئی اور عرب مسلمانوں نے اس پر سب سے پہلے توجہ کی۔ تاریخی تحقیق و کاوش کے لیے خاص محرک یہ ہوا کہ مومن، رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہؓ کے متعلق ہر قسم کی کہانیاں اور روایتیں تلاش کرتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی انہیں ہر مسلمان عرب کا سلسلۂ نسب دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ سرکاری وظیفے کی مقدار کا تعین ہو سکے اور ابتدائی دور کے خلفاء کو اس بات کا خیال رہتا تھا کہ سابق کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی کارروائیوں کا اندازہ کر لیں۔ عَبِیْد (عُبَیْد) کو معاویہؓ نے اس غرض سے دمشق بلایا تھا کہ عرب کے ابتدائی بادشاہوں اور ان کی نسلوں کے متعلق حالات معلوم کریں[2]۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب مرتب کی، جس کا نام "کتاب الملوک والاخبار الماضیین" تھا اور جو مسعودی کے زمانے تک بھی خوب مروج تھی[3]۔ (وفات ۹۵۶ء)، "علم الاوائل" کا ایک اور ماہر وہب بن منبہ تھا (وفات ۷۲۸ء)، یہ ایک یمنی یہودی تھا، جو اسلام لے آیا۔ اس کی ایک کتاب (تیجان)، جس کا تعلق ملوک حمیر سے تھا، حال میں چھپ چکی ہے۔

خطابت

امویوں کے دور میں عوامی تقریروں کی مختلف شکلوں نے اتنی بلندی حاصل کر لی کہ بعد میں کا کوئی دور اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خطیب جمعہ کے دن خطبوں میں زورِ تقریر بہ استعمال کرتے تھے، سالار اس ذریعے سے فوجیوں میں جوش و خروش پیدا کرتے تھے اور گورنر خطبوں ہی کے ذریعے سے رعایا میں حبِ وطن کے جذبات ابھارتے تھے۔ بعض خطبوں کے ٹکڑے محفوظ رہ گئے ہیں، مثلاً حسن بصریؒ نے جو خطبے عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کی موجودگی میں دیئے تھے اور آخر الذکر کی سیرت میں شامل ہو گئے[4]۔ یا حب وطن سے لبریز تقریریں، جو زیاد بن امیہ نے کی تھیں یا وہ آتش ریز خطبے، جو حجاج نے دیئے، اس ابتدائی دور کے نہایت قیمتی ذخیروں میں محسوب ہوتے ہیں[5]۔

---

1. بلاذری ص ۲۶۲، ۲۷۰
2. فہرست ص ۸۹، وہب ابن منبہ التیجان فی ملوک الحمیر مطبوعہ حیدرآباد ص ۳۱۲، ۳۱۳، ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۶۵
3. مسعودی جلد ۴ ص ۸۹
4. ابن الجوزی، سیرت ص ۱۲۱، ۱۲۶
5. مزید نمونوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن قتیبہ کی عیون الاخبار جلد ۲ ص ۲۳۰، ۲۵۲، جاحظ کی البیان والتبیان جلد اوّل و دوم، العقد جلد دوم۔

خط و کتابت

ابتدائی دور کی سرکاری خط و کتابت یقیناً مختصر، بلیغ اور صرف ضروری امور تک محدود ہوتی ہوگی۔ آخری اموی خلفا کے دور میں لفاظی اور طول نگاری کا طریقہ جاری ہوا۔ ابن خلکان[1] کا بیان ہے کہ یہ طریقہ درباری وزیر عبدالحمید کاتب (وفات ۷۵۰ء) نے جاری کیا۔ اس کی رسمی اور بہت منجھی ہوئی تراکیب سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شخص تحریر میں ایرانی نمونوں کا پیرو تھا۔ ابتدائی دور کے بہت سے حکیمانہ اقوال اور ضرب الامثال میں بھی ایرانی اثر نظر آتا ہے۔

شعر گوئی

یہ فتوحات اور توسیع کی مشقت خیزی کا زمانہ تھا۔ اس دور میں عرب قوم نے کوئی شاعر پیدا نہ کیا، حالانکہ اس کی شعری روایات بہت پرانی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام شعر گوئی کے حق میں نہ تھا، تاہم جب دنیا دار اموی خلفاء کا دور شروع ہو گیا تو شراب، راگ رنگ اور شاعری سے از سرِ نو تعلقات استوار کر لیے گئے، پھر شاعری ہی میں ادبی ترقی کے سب سے بڑے کارنامے انجام پائے۔

اموی دور کے ابتدائی شاعروں میں سے ایک کعب ابن جعیل تغلبی (وفات ۷۰۰ء) تھا، جس کے قبیلے کا صرف ایک حصہ مسلمان ہوا تھا۔ اگرچہ ابن جعیل مسلمان تھا، لیکن شعروں میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے خدا کی قسمیں کھاتا تھا، نیز انجیل پڑھنے والوں اور قرآن پڑھنے والوں کو یکساں احترام کی نظر سے دیکھتا ہے[2]۔ کعب کی شاعری میں مسیحی اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے ہم عصر تغلبی شاعر اخطل میں اتنے اثرات نہیں پائے جاتے، حالانکہ وہ مسیحی تھا۔

اخطل (۶۴۰ء - ۷۱۰ء) دینی گروہ کے خلاف شعر و سخن میں امویوں کی حمایت کرتا تھا۔ درباری شاعر کی حیثیت میں وہ معاویہؓ کے محل میں آتا تو صلیب بہ طور نشان اس کی گردن میں آویزاں ہوتی، لیکن اس شراب نوش اور اوباش شاعر کو مسیحیت سے زیادہ گہرا تعلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ اس کی حاملہ بیوی نے دیکھا کہ ایک اسقف گدھے پر سوار جا رہا ہے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے دوڑی کہ تبرک کی غرض سے اسقف کا دامن چھولے، لیکن وہ گدھے کی دم تک پہنچ سکی۔ اخطل نے بے تکلف کہا کہ اس میں اور گدھے کی دم میں کوئی فرق نہیں[3]۔

اخطل ان تین شاعروں میں سے ایک تھا، جو اس عہد کی شاعرانہ فضا پر چھائے رہے۔ باقی دو میں سے ایک پُرجوش جریرؔ (وفات ۷۲۹ء) تھا، جسے حجاج نے اپنا درباری شاعر مقرر کر لیا تھا[4]۔ دوسرا آوارہ مزاج فرزدق تھا، جو عبدالملک اور اس کے فرزندوں یعنی ولید، سلیمان اور یزید کے زمانے میں ملک الشعراء رہا۔ تینوں شاعر مدح گو بھی تھے اور ہجو گو بھی، ان کا گزارہ مدحیہ قصیدوں پر تھا، ان کے ذریعے سے یہ لوگ وہی کام انجام دیتے تھے، جو آج کل مختلف فریقوں اور جماعتوں کے اخبار انجام دیتے ہیں۔ ان

---

1. ابن خلکان جلد اوّل ص ۵۰۰، مسعودی جلد ۶ ص ۸۱
2. خلیل مردم کا مقالہ بہ عنوان کعب ابن جعیل تغلبی شائع کردہ مجلة المجمع العلمی العربی جلد ۱۹۔
3. اغانی جلد، ص ۱۸۳ اخطل کے اشعار کے دو مجموعے شعر الاخطل کے نام سے چھپ چکے ہیں۔
4. ابن قتیبہ کی کتاب الشعر ص ۲۸۰، مزید مثالوں کے لیے دیکھیے جریرؔ کا دیوان۔

کی ہجو گوئی اکثر ایک دوسرے کے خلاف ہوتی تھی۔ شاعری میں ان کا مقام ایسا ہے کہ عربی نقادوں نے بعد کے کسی شاعر کو ان کا ہمسر نہ پایا۔[1]

امویوں ہی کے عہد میں غزل گو شاعر پیدا ہوئے۔ الجزیرہ کے دبستان میں عشقیہ شاعری کا سب سے بڑا نمائندہ عمر بن ابی ربیعہ (وفات ۷۱۹ء) تھا۔ عربی غزل گو شعراء میں اسے امیر مانا جاتا ہے۔ یہ نسبتاً قریشی تھا اور جو خوبصورت لڑکیاں حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین آتیں، ان سے عشق و محبت کا اظہار کرتا رہتا۔ ایسی زبان میں جو شدتِ جذبات سے لبریز اور ترکیب و اسلوب بیان کے اعتبار سے حد درجہ سہل و رواں اور گداختہ تھی، اس نے صنفِ نازک کے متعلق احساسات کو غیر فانی بنا دیا۔[2]

عمر بن ابی ربیعہ شعر میں جس محبت کا داعی تھا، وہ ہر قید سے آزاد تھی، اس کا معاصر جمیل العذری (وفات ۷۰۱ء) ایسی محبت کا داعی تھا جو بالکل پاک تھی اور جسے ہم افلاطونی نمونے کی محبت کہہ سکتے ہیں۔ اس کا قبیلہ بنو عذرہ مذہباً مسیحی تھا اور اس نے حجاز میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ جمیل کے شعر اس کے قبیلے کی ایک دوشیزہ بثینہ کو خطاب کر کے کہے گئے تھے۔[3] ان میں اتنی رقت اور روانی ہے کہ اس دور کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جمیل غزل گوئی کا نمائندہ تھا۔ اس کا حریف نیم افسانوی مجنوں لیلیٰ (وہ شخص، جو لیلیٰ پر مرمٹا وفات ۶۹۹ء) تھا۔[4] مجنوں کا اصل نام قیس تھا، باپ کا نام ملوّح، وہ اپنے ہی قبیلے کی ایک خاتون کا دالہ و شیفتہ ہو گیا۔ خاتون کو بھی قیس سے محبت تھی۔ مگر خاتون کے والد نے جبراً اس کی شادی دوسری جگہ کر دی۔ حسرت دیاس نے قیس کو دیوانہ کر دیا اور وہ باقی عمر نیم برہنہ حالت میں اپنے وطن نجد کی پہاڑیوں اور وادیوں کے اندر سرگرداں رہا۔ اپنی محبوبہ کی محبت میں گیت گانے اور ایک جھلک پا لینے کی آرزو کرتا رہتا۔ جب لیلیٰ کا نام اس کے سامنے لیا جاتا تو اس کے ہوش و حواس بحال ہو جاتے۔ مجنوں و لیلیٰ پر عربی، ترکی، فارسی میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں، جن میں ہمیشہ قائم رہنے والی محبت کی ستائش کی گئی ہے۔

عشقیہ شاعری کے علاوہ اسی دور میں سیاسی شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب یزید کو ولی عہدی کے لئے نامزد کرنے کا تاریخی واقعہ پیش آیا تو مسکین الدارمی سے کہا گیا کہ وہ اس موقع کے مناسب شعر کہے۔[5] اس قسم کی سیاسی شاعری کا انتہائی نقطۂ ارتقا، وہ قصیدے ہیں، جو ابن قیس الرقیات (وفات ۷۰۴ء) نے عبدالملک کے لیے کہے۔[6] اسی دور میں اسلام سے پیشتر کی شاعری کو مجموعے کی شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ کام حماد الراویہ (۷۱۳ء، ۷۷۲ء) نے انجام دیا۔ حماد ایرانی الاصل تھا اور اس کا عربی بولنے کا لب و لہجہ بھی عجمی تھا، لیکن عربی وقائع کے متعلق اس کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ولید ثانی سے کہا: میں حروف تہجی میں سے ہر حرف کے متعلق ایک ایک سو شعر صرف دورِ جاہلیت کے شعروں میں سے سناؤں گا۔ ولید خود شاعر تھا، جب دو ہزار نو سو شعر سن چکا تو اس نے حکم دیا کہ راویہ کو ایک لاکھ درہم انعام دیئے جائیں۔[7]

---

[1] ابن قتیبہ، کتاب الشعر ص ۲۶۰-۲۶۸۔ اغانی جلد ۷ ص ۷۷-۱۰۰ [2] اغانی جلد اوّل ص ۱۶۹، کتبی فوات الوفیات جلد ۳ ص ۱۶۲۔

[3] اغانی جلد ۸ ص ۱۷، ۲۷، ابن قتیبہ، کتاب الشعر ص ۳۴۷۔

[4] ملاحظہ ہو اس کا دیوان۔

[5] دیکھیے اس کا دیوان جس میں خمریات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

[6] ابن خلکان جلد اوّل ص ۱۶۴، ۱۶۲ اغانی جلد ۵ ص ۱۶۴، ۱۶۵، عقد جلد ۳ ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

اموی دور کی شاعری کو اسلام اور جاہلیت کی شاعری دونوں سے زمانی قرب حاصل تھا اس وجہ سے اس کا اسلوب خالص تھا جو کچھ کہا جاتا تھا اس میں قوت و تاثیر کے علاوہ ایک طبعی وقار پایا جاتا تھا۔ ان اوصاف نے اس شاعری کو آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بنا دیا طرزِ ادا اور آرائش کے پیشِ نظر ایک سانچا تیار ہوا جس کے مطابق عرب شعراء کے انفرادی احساسات اور لطفِ بیان کا اظہار ہوتا رہا عرب شاعر اپنی ادبی میراث سے علیحدہ ہو کر کوئی ایسی نظم نہ کہہ سکے، جو زمان و مکان سے آزاد عالم انسانیت کے لیے ہو سکتی۔ اس وقت سے نحو کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں، ان سب میں زیادہ تر مثالیں جاہلیت کی شاعری یا اموی عہد کی شاعری سے لی گئیں۔

تعلیم و تربیت

رسمی نمونے کی تعلیم اس زمانے میں عام نہ تھی۔ اموی خاندان کے لوگ اپنے بیٹوں کو مشرقی صحرا میں بھیج دیتے تھے جسے بادیہ کہا جاتا ہے وہ وہاں بدوؤں میں رہ کر خالص عربی زبان سیکھ لیتے، نیز سواری اور شکار میں طاق ہو جاتے۔ اس کی پہلی مثال معاویہؓ نے پیش کی، یعنی اپنے بیٹے اور ولی عہد کو وہاں بھیج دیا۔ عام لوگ اسی کو تعلیم یافتہ سمجھتے تھے جو پڑھ لکھ لیتا، تیر کمان کا استعمال جانتا اور تیرنے میں مشتاق ہوتا حقیقت یہ ہے کہ جو ان فنون میں مہارت حاصل کر لیتا، اسے تعلیم یافتہ سے بھی کچھ زیادہ ہی سمجھتے اور مردِ کامل کہتے[1]۔ تیرنے کو تعلیمی نصاب العین میں شامل کرنے کا سلسلہ غالباً ان لوگوں سے شروع ہوا جو بحیرۂ روم کے ساحل پر رہتے تھے۔ جس حد تک تعلیم کی اخلاقی اقدار کا تعلق ہے اد بیات سے پتہ چلتا ہے کہ اقدار وہی تھیں، جنہیں بدوؤں کی زندگی میں حد درجہ اہم مانا جاتا تھا، مثلاً شجاعت، صبر یعنی مشکلات کے وقت میں تحمل و برداشت، ہمسایوں کے حقوق و واجبات کا لحاظ مروت، سخاوت، مہمان نوازی اور ایفائے عہد۔

عبدالملک کے زمانے سے اتالیق دربار کی ایک مستقل شخصیت بن گئے۔ انہیں "مؤدب" کہتے تھے۔ عبدالملک نے اپنے بیٹوں کے اتالیق کو جو ہدایات دیں، ان میں سے ایک یہ تھی، انہیں تیرنا سکھاؤ اور کم از کم استراحت کا عادی بناؤ[2]۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے بیٹوں کے مؤدب کو یہ ہدایت دی تھی کہ اگر وہ نحو کے قاعدوں کی خلاف ورزی کریں تو انہیں جسمانی سزا دی جائے[3]۔ اس خلیفہ نے سرکاری طور پر جو ہدایات مؤدب کے لیے تیار کیں، ان سے بھی خلیفہ کے تقویٰ کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً:

"ان کے دلوں پر جو اخلاقی سبق سب سے پہلے نقش کیا جائے،
یہ ہونا چاہیئے کہ وہ تفریحات کے وسائل سے دور رہیں۔ تفریحات
شیطان کی انگیخت کا نتیجہ ہیں اور خدا کے غضب کا مورد بنتی
ہیں[4]"

ابتدائے اسلام سے جن درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند داخل ہو سکتے تھے، وہ مسجدوں کی درس گاہیں تھیں۔ ان کے نصاب میں قرآن و حدیث کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے معلم قاری ہوتے تھے، گویا قاری ہی مسلمانوں میں سب سے پہلے

---

[1] ابن سعد جلد ۳ حصہ دوم ص ۹۱، جلد ۵ ص ۳۰۹، آغانی جلد ۶ ص ۱۶۵

[2] مبرد ص ۷۷۔

[3] یاقوت معجم البلدان جلد اوّل ص ۲۵، ۲۶

[4] ابن جوزی ص ۲۵۰، ۲۵۵۔ جاحظ بیان جلد ۲ ص ۱۳۸، ۱۴۳۔

معلم تھے۔ دیہات اور دور افتادہ مقامات پر اب تک بھی وہی معلمی کا فرض ادا کرتے ہیں۔ عمر فاروقؓ نے ۱۸ھ میں ایسے بہت سے معلم مختلف علاقوں کی طرف بھیج دیئے تھے اور ہدایت کردی تھی کہ لوگ جمعہ کے دن مسجدوں میں ان سے ملاقات کرلیا کریں۔ مصر میں جس شخص نے بہ حیثیتِ معلم سب سے پہلے درجۂ امتیاز حاصل کیا، وہ ایک قاضی تھا، جسے عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۶ھ میں مصر بھیجا تھا، کوفہ میں ضحاک ابن مزاحم (وفات ۱۰۳ھ)، کا ذکر بھی فرزندانِ عبدالملک کے مؤدبین میں آیا ہے[1]۔ ضحاک ایک ابتدائی درسگاہ چلا رہا تھا، جہاں کسی سے تعلیم کے لیے فیس نہیں لی جاتی تھی[2]۔

عربوں کی سائنس یونانی سائنس پر مبنی تھی اور سائنس کی ابتداء عربوں میں طب سے ہوئی۔ مسلمانوں نے اس وجہ سے طب پر خاص توجہ کی کہ ایک روایت رسول اللہ صلعم سے منسوب تھی۔

”علم دو ہیں، ایک جس کا تعلق دین سے ہے اور دوسرا جس کا تعلق بدن سے ہے[3]“

جس زمانے میں عربوں نے مغربی ایشیا کو فتح کیا، یونانی طب زندہ قوت کی مالک نہیں رہی تھی۔ یہ ایک روایت تھی جو یونانیوں تک پہنچی یا کہنا چاہیے کہ سریانی لکھنے والے شارحوں اور اس کے مطابق علاج معالجہ کرنے والوں تک پہنچی، اموی دور کے اطباء کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ ان میں سب سے ممتاز معاویہؓ کا مسیحی طبیب ابن اثال[4] اور حجاج کا یونانی طبیب تیاذوق[5] تھا۔ ایک ایرانی الاصل یہودی طبیب ماسرجویہ بصرہ کا باشندہ تھا، اس نے ۶۸۳ء میں یعنی بہ عہد مروان ابن الحکم ایک سریانی کتاب طبی کا ترجمہ عربی میں کیا۔ یہ کتاب اصلاً اسکندریہ کے مسیحی پادری اہرون[7] نے یونانی زبان میں مرتب کی تھی، یہ عربی زبان میں پہلی علمی کتاب تھی۔ مروان کے پوتے ولید کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں جو لوگ جذامی تھے یا ان کی بینائی جاتی رہی تھی یا وہ کسی دوسری مزمن بیماری میں مبتلا تھے، اس نے انہیں الگ کردینے کا فرمان جاری کردیا تھا اور ان کے قیام کے لیے جداگانہ عمارتیں بنوا دی تھیں[6]۔ تاریخ اسلام میں بیماروں کے لیے اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسکندریہ کے طبی مدارس انطاکیہ اور حران میں[8] منتقل کردیئے تھے۔ اسکندریہ میں یہ مدارس یونانی طور طریقوں کے مطابق چل رہے تھے

---

۱ جاحظ، بیان جلد اول ص ۱۷۵۔

۲ ابن سعد جلد ۶ ص ۲۱۰۔

۳ (مترجم۔ اشارہ اس روایت کی طرف ہے، العلم علمان، علم الادیان و علم الابدان، لیکن یہ روایت غلط ہے۔ عربوں نے طب پر سب سے پہلے اس لیے توجہ کی کہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ تھی)

۴ ابن ابی اصیبعہ، عیون الانبا جلد اول ص ۱۱۶ — ۸ ایضاً ایضاً ص ۱۲۱

۵ ابن العبری ص ۱۹۲

۶ ابن العبری ص ۱۹۵ طبری جلد ۲ ص ۱۱۹۶، مقریزی خطط جلد ۲ ص ۴۰۵

۷ ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۱۱۶۔

علم کیمیا

علم کیمیا پر غور کیجئے جسے علم طب سے گہرا تعلق ہے۔ عربوں نے اس پر بھی بالکل ابتدائی دور میں توجہ کی۔ طب کی طرح اس علم میں بھی عربوں نے خاصا اضافہ کیا۔ یزید اوّل کے بیٹے خالد (وفات ۸۵ھ یا ۷۰۴ء) کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام میں وہ سب سے پہلا سائنس دان اور فلسفی (حکیم) تھا "فہرست"[1] سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس نے کیمیا، طب اور ہیئت کے متعلق قبطی اور یونانی تصانیف کا ترجمہ عربی میں کرنے کا ذمّہ اٹھایا۔ اس بیان میں سچائی کا جوہر صرف اتنا ہے کہ عربوں نے سب سے پہلے یونانی مآخذ کی طرف توجہ کی، تاکہ ضروری علوم حاصل کر لیں۔ روایت یہ ہے کہ خالد نے جابر ابن حیّان کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ حالانکہ جابر اس وقت سے بہت دنوں بعد (قریباً ۷۷۶ء) بروئے کار آیا۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اسی طرح کیمیا اور ہیئت کے بعض رسالے جعفر صادق (۱۴۸ھ/۷۶۵ء، جو شیعوں کے بارہ اماموں میں سے ایک تھے) سے منسوب کیے جاتے ہیں[2] اب ثابت ہو چکا ہے کہ یہ انتساب صحیح نہیں اور اس کے ذمّہ دار دورِ حاضر کے علماء ہیں۔

فکری دبستان

اموی دور میں وہ مذہبی اور فلسفیانہ تحریکیں بھی شروع ہوئیں، جن کی طرف فرقوں کی حیثیت میں اشارے کیے جاتے ہیں شام میں مسیحیّت سے ربط ضبط پیدا ہوا تو دینی بحثیں شروع ہو گئیں۔ انہیں بحثوں نے فکری دبستان قائم کر دیئے، ان میں سے ایک دبستان معتزلہ کا تھا۔ یہ ایک عقلی دبستان تھا، جس کی بنیاد واصل بن عطا (وفات ۱۳۱ھ/۷۴۸ء) نے بصرہ میں رکھی۔ معتزلہ کا بڑا نظریہ یہ تھا کہ جو مسلمان گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے، وہ مومنوں سے الگ ہو جاتا ہے، اگرچہ اسے کافر نہیں کہا جا سکتا، گویا اس کی جگہ کفر و اسلام کے درمیان ہوتی ہے[3] واصل حسن بصریؒ کا شاگرد تھا۔ ایک اور نظریہ یہ تھا کہ ذات کی صفات کا وجودِ ازلی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، مثلاً قدرت، حکمت، حیات۔ وجہ یہ بیان کی جاتی تھی۔ کہ اس طرح توحید باری تعالیٰ پر ضرب لگتی ہے۔ حالانکہ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ غرض معتزلہ نے قدرتِ الٰہی پر ایک حد تک پابندی لگا دی اور صفتِ عدل پر خاص زور دیا۔ وہ اپنے آپ کو حامیانِ عدل و انصاف کہا کرتے تھے خلیفہ مامون عباسی کے ماتحت بغداد میں معتزلہ کی تحریک کمال پر پہنچ گئی۔

اسی زمانے میں ایک فرقہ قدریوں کا تھا، جو جبریوں کے مخالف تھے یہ لوگ آزادیٔ ارادہ کے قائل تھے اور اسلام میں جبر کی شدّت کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر یہ جماعت وجود میں آئی۔ ان کے نزدیک اسلام اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار تھا۔ اسلام میں یہ ابتدائی فلسفی دبستان تھا اور دعویٰ یہ تھا کہ اس میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ ان میں دو حکمرانوں کا نام بھی لیا جاتا تھا، یعنی معاویہ ثانی اور یزید ثالث[4]

---

[1] فہرست ص ۲۴۲، ۲۵۴۔

[2] فہرست ص ۳۱۷، ابن خلکان جلد اوّل ص ۳۰۰۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون جلد ۲ ص ۵۸۱، ۶۰۴، جلد ۳، ص ۵۳، ۱۲۸

[3] مسعودی جلد ۴ ص ۲۲، جلد ۷، ص ۲۳۴، شہرستانی ص ۳۳، بغدادی اصول الدین جلد اوّل ص ۳۳۵، مختصر ص ۹۸، نوبختی فرق الشیعہ ص ۵۔

[4] ابن حزم الفصل فی الملل والاہواء والنحل جلد ۳ ص ۳۱۔

سینٹ جان دمشقی

جن لوگوں کے ذریعے سے مسیحی علوم اور یونانی افکار مسلمانوں تک پہنچے، ان میں سب سے بڑا سینٹ جان دمشقی (۷۴۸ء تا ۶۷۶ء) تھا۔ جان دمشقی کا لقب کرسورس (سنہری ندی) تھا۔ کیونکہ وہ خطابت کے خاص جوہروں سے مزین تھا۔ وہ یونانی زبان میں کتابیں تصنیف کرتا رہا، مگر اصلاً شامی تھا۔ گھر میں یقیناً آرامی زبان بولتا ہوگا اور عربی بھی جانتا تھا۔ اس نے مسلمانوں سے حریتِ ارادہ اور جبر کے متعلق مناظرے کیے اور اس طرح مسلمانوں میں عقلیت کے دور کا آغاز کیا، جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ خدا نے دنیا پیدا کی، پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ ابتدا میں معاویہؓ کے بیٹے یزید کا رفیق تھا۔ پھر اسے حکومت میں مشیر کا اونچا عہدہ مل گیا، جس پر اس کا باپ فائز رہ چکا تھا۔ خلیفہ ہشام کے ابتدائی دور میں وہ راہب بن گیا اور سابا کی خانقاہ میں، جو یروشلم کے جنوب مشرق میں تھی، جا بیٹھا، وہیں عبادت کرتا رہا۔

جان نے متعدد اہم تصانیف کیں، جن میں سے بہترین کتاب ینبوع الحکمت ہے۔ اس کتاب میں جان نے پیشتر کے ممتاز کلیسائی مصنفوں کے افکار خلاصۃً بڑی عمدہ ترتیب سے پیش کیے ہیں۔ اس کی کتاب خلاصۃ الٰہیات سے پہلے پہل پیٹر لمبارڈ اور ٹامس کوئیناس نے فائدہ اٹھایا اور یہ کتابیں بڑے بڑے مسیحی کلامیوں کے لیے معیار بن گئیں۔ جان کی متعدد کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں ہوا۔ لاطینی اور یونانی کلیسا دونوں اسے ولی سمجھتے تھے۔ ہمارے لیے خاص دلچسپی کی چیز دو مکالمے ہیں، جو ایک مسیحی اور ایک مسلمان کے درمیان ہوئے اور جن میں جان نے مسیحؑ کی الوہیت اور انسانی ارادے کی حریت پر زور دیا ہے یہ کتاب مسیحیت کی طرف سے ایک معذرت تھی یا کہنا چاہیے کہ ان مسیحیوں کے لیے رہنما تھی، جنہیں مسلمانوں سے مذہبی بحثیں کرنی پڑتی تھیں۔ ان مکالموں میں ان مباحث کا مرقع پیش کیا گیا ہے جو خلیفہ کی موجودگی میں ہوئے تھے اور جن میں خود جان نے حصہ لیا تھا۔ ان مکالموں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جان قرآن و حدیث سے پوری طرح آگاہ تھا۔ باقی رہا برلام راہب اور ایک ہندو امیر یوذافت کا قصہ، جو قرونِ وسطیٰ کا ایک مشہور مذہبی رومان سمجھا جاتا ہے تو اسے جان سے منسوب کرنا غلط ہے۔ یہ ایک گم نام راہب کی تصنیف ہے، جو خانقاہ سابا میں رہتا تھا اور اس کا نام بھی جان تھا، لیکن وہ دو صدی پیشتر گزر چکا تھا یہ دراصل بدھ کی زندگی کا ایک مسیحی مرقع تھا، جسے یوذافت یا یوذاسف کے نام سے لاطینی اور یونانی کلیساؤں نے ولی بنا دیا۔

جان نے عبادت کی غرض سے بتوں کے دفاع میں خاص سرگرمی دکھائی وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ بوجا بت کی نہیں کی جاتی بلکہ اس وجود کی ہوتی ہے، جس کے لیے بت تیار ہوا۔ یہ شہنشاہ لیو اصوری کا زمانہ تھا، جس کے پیش نظر غالباً یہ امر تھا کہ مسلمانوں میں درجۂ اعتماد حاصل کر لے، لہٰذا وہ بتوں کے حامیوں کو دبا دینا چاہتا تھا اس وجہ سے جان پر بھی اس کا غضب نازل ہوا۔ جان نے وفات سے کچھ مدت پہلے شام کا دورہ کیا۔ وہ بت شکنوں سے لڑتا رہا، پھر اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر قسطنطنیہ پہنچا۔ اس کے نزدیک دینی رسمیات کو خاص اہمیت حاصل تھی، خواہ ان کی شکل کوئی تھی۔ اس نے بہت سے مذہبی گیت تیار کیے، جنہیں اب تک پروٹسٹنٹ گاتے ہیں اور کلیسائی شاعری میں وہ بڑی ہی بلند پایہ ہیں۔ عالم الٰہیات، خطیب، مناظر اور دوسری مختلف حیثیتوں میں جان کلیسا کے لیے باعثِ زینت تھا۔

مرجیہ

قدریوں اور معتزلیوں کی تحریک مسلمانوں کے راسخ عقیدہ کو کمزور کرنے کی طرف پہلا قدم تھی۔ دوسرا قدم مرجیہ کی تحریک تھی۔ ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ جن مسلمانوں سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، ان کے متعلق فیصلہ معرضِ التوا (ارجاء) میں رکھا جائے اور انہیں کافر نہ کہا جائے[1]۔ ان کے نزدیک اعمالِ صحت ایمان کے لیے شرط نہ تھے۔ یہ تحریک دراصل ان اموی خلفاء کے لیے وجوہ جواز مہیا کرنے کی غرض سے شروع ہوئی تھی، جو مذہبی قوانین یعنی شریعت کو دباتے رہے تھے۔ اس نظریے کے حامیوں کے نزدیک خلفاء بنوامیہ کا مسلمان ہونا بالکل کافی تھا، چونکہ وہ عملاً مسلمان کے سیاسی قائد و رہنما تھے، اس لیے ان کی اطاعت ضروری تھی۔ ان کے نزدیک علیؓ اور معاویہؓ دونوں خدا کے خدمت گزار تھے اور دونوں کے متعلق آخری فیصلہ خدا ہی کرے گا۔ اسی دبستان فکر کی فضائے مسالمت میں عظیم القدر فقیہ ابو حنیفہ کی تربیت ہوئی (وفات ۷۶۷ء) جو فقہ کے چار دبستانوں میں سے ایک (حنفی دبستان) کے بانی تھے۔

خارجی

مرجیہ کی طرح خارجی بھی ایک سیاسی و مذہبی فرقہ تھے۔ یہ فرقہ اس وقت سے چلا، جب علیؓ کے پیروؤں میں سے بعض اس بات پر ناراض تھے کہ خلافت کا مسئلہ ثالثوں کے حوالے کیا گیا۔ یہ لوگ پہلے علیؓ کے سرگرم حامی تھے، پھر جانی دشمن ہوگئے وہ اسلام کے دور اول کے قدیم جمہوری اصول نافذ کرانے کے خواہاں تھے اور اپنے اس مقصد کی خاطر ابتدائی تین سو سال میں انہوں نے واقعی خون کی ندیاں بہا دیں وہ اس استحقاق کے خلاف تھے کہ خلیفہ صرف قریش میں سے ہونا چاہیے[2]۔ سلسلہ مشائخ کو برا سمجھتے تھے اور صوفیوں کے شاغل کی مخالفت کرتے تھے۔ آج کل وہ عبادیوں (پیروان ابن عباد) کی شکل میں موجود ہیں[3]۔ الجزائر، طرابلس، عمان اور زنجبار میں بکھرے ہوئے۔

شیعہ

ان سب سے زیادہ اہم گروہ وہ تھا جو شیعہ کہلایا۔ یہ ان حریف گروہوں میں سے ایک تھا، جو ابتدائے اسلام میں خلافت جیسے اہم مسئلے پر منقسم ہوئے۔ دوسرا گروہ سُنیّوں کا تھا۔ اموی دَور ہی میں شیعوں نے ایک مستقل گروہ کی شکل اختیار کی۔ شیعوں اور سنیوں کے درمیان نزاع کی اصل بنا امامت تھی، یعنی رسول اللہ (صلعم) کی جانشینی اور مسلمانوں کی قیادت۔ شیعوں کا عقیدہ یہی رہا کہ علیؓ اور ان کی اولاد ہی سچے امام ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح کیتھولکوں کا عقیدہ ہے کہ مسیحؑ کے جانشین صرف پطرس رسول ہیں۔ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ قرآن مجید، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے، اللہ تعالیٰ اور بشر کے درمیان واسطہ ہے۔ شیعوں نے ایک انسان کو امام قرار دے کر واسطہ بنایا۔ سنی کہتے ہیں: "ہم ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور ایمان لائے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور روزِ ازل سے چلا آرہا ہے۔ شیعوں نے ایک اضافہ کیا کہ اس امام پر ایمان لائے جسے اللہ تعالیٰ نے چنا، روح قدسی اس میں پھونکی اور وہ نجات کی طرف رہنما ہے۔

سنیوں کے نزدیک خلیفہ مسلمانوں کا رئیس، مومنوں کا قائد اور دین کا محافظ ہے، لیکن اسے کوئی روحانی اختیار نہیں دیا

---

۱ دیکھیے مختصر مصنفہ بغدادی ص ۱۲۲، ۱۲۳، ابن حزم جلد ۲ ص ۸۹۔

۲ ابن جوزی نقد العلم والعلماء ص ۱۰۲۔

۳ "مختصر" بغدادی ص ۸۷، ۸۸، ۱۰۸۔ الایجی ص ۳۵۶ شہرستانی ص ۱۰۰۔

ان کے برعکس شیعہ امامت کو صرف علیؓ کے خاندان تک محدود رکھتے ہیں وہ امام کو مسلم معاشرے کا رئیس ہی نہیں مانتے بلکہ روحانی اور مذہبی قائد بھی مانتے ہیں، جس کا اختیار نص پر مبنی ہے۔ اس بنا پر رسول اللہ صلعم کے جو اخلاف علیؓ اور فاطمہؓ کے ذریعے سے ہوئے، انہیں ایک پُراسرار قوت موروثی طور پر مل گئی[1] وہ تمام انسانوں سے بالاتر ہو گئے اور انہیں معصوم مانا گیا۔ بعد کی سنی روایات میں گناہوں اور خطاؤں سے پاکیزگی مختلف درجات میں صرف پیغمبروں کو حاصل رہی، خصوصاً رسول اللہ صلعم کو۔[2] شیعوں میں سے انتہا پسند امام کو خدا کا اوتار سمجھنے لگے۔ مہدی کا نظریہ آگے چل کر ارتقا پذیر ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسے نجات دہندہ قائد کا انتظار کیا جائے جو آزادی اور خوش حالی کے ایک نئے دور کا افتتاح کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ویسا ہی عقیدہ تھا جیسا مسیحؑ کے دوبارہ آنے کا عقیدہ یا اس قسم کے دوسرے عقائد۔

تمام اسلامی سرزمینوں میں سے عراق کی سرزمین علویوں کے نظریات کی تخم ریزی کے سبب حد ساز گار ثابت ہوئی سولہویں صدی شروع ہو جانے کے بعد ایران شیعیت کا حصار بن گیا۔ آج کل کوئی ساڑھے تین کروڑ شیعہ ہیں، یعنی مسلمانوں کی کل تعداد میں سے بارہ فی صد[3] لبنان اور شام میں یہ لوگ متاولہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ خود شیعوں کے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں ملحد بھی ہیں اور انتہا پسند بھی، جنہیں شیعہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ شیعیت نے مقناطیس کی طرح ہر قسم کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا، یعنی ان تمام لوگوں کو، جو اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ بعض ملحد گروہ، جو اوائل میں پیدا ہوئے، دراصل عربوں کے فاتحانہ اقدامات کے خلاف احتجاج کے طور پر اٹھتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہیں شیعیت نے اپنے اندر کھینچ لیا اور شیعیت قائم شدہ نظام کے خلاف ایک زبردست تحریک تھی۔ اسمٰعیلی، قرمطی، دروزی، نصیری وغیرہ، جن کا ذکر آئندہ آئے گا، تاریخی حیثیت سے شیعوں ہی کی مختلف شاخیں تھے۔

موسیقی

ممکن ہے، اسلام نے شاعری کی طرح موسیقی کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی غیر مسلموں کی مذہبی رسموں کا جزو بنی رہی تھی۔ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ موسیقی کے آلات شیطان کے مؤذن ہیں، وہ لوگوں کو شیطان کی عبادت کے لئے بلاتے ہیں[4] بہت سے فقیہ اور علمائے دین بھی موسیقی اور مطربوں کو بری نظروں سے دیکھتے رہے۔ بایں ہمہ لوگوں کا شیوہ یہ رہا کہ شراب جسم ہے اور موسیقی روح، عیش و نشاط کو ان کا بچہ سمجھنا چاہیے[5]

---

[1] شہرستانی ص ۱۰۸، ۱۰۹، مسعودی جلد اول ص ۷۰۔

[2] ابن حزم جلد ۴ ص ۲، ۱۲۵ الایجی ص ۲۱۸۔ گولڈ زیہر Der Islam جلد ۳ ص ۲۳۸، ۲۴۵۔

[3] اگر یزیدیوں، حشاشیوں، علی اللّٰہیوں کو بھی شامل کیا جائے تو تعداد ساڑھے چار کروڑ کے قریب ہوتی ہے، یعنی پوری ملت اسلامیہ کی پندرہ فی صد۔

[4] اس سلسلے میں ابن اثیر کی نہایہ (جلد ۴، ص ۱۲۲، ۱۳۵) ملاحظہ ہو نیز الغزالی: احیا العلوم الدینی جلد ۲ ص ۲۳۸۔ ونسنگ Wensinck کی کتاب A Handbook of Early Muhammadan Tradition ہنری جی فارمر A History of Arabian Music to the Thirteenth Century ۲۵، ۲۴

[5] نواجی ص ۱۰۸، نویری جلد ۴ ص ۱۳۶ ۔

جب اسلام کی ابتدائی دہشت کم ہوئی تو پیشہ ور گانے والوں کا ظہور ہوا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ اموی دور میں مکہ اور اس سے بڑھ کر مدینہ موسیقی کی پرورش گاہ تھا۔ باہر سے اعلیٰ درجے کے فنکار کھنچے چلے آتے تھے اور دربار دمشق کو یہیں سے فنکاروں کے قافلے بھیجے جاتے تھے۔ دوسرے اموی خلیفہ یزید نے مزامیر اور غنا کو دربار میں جاری کیا۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔[1] وہی تھا جس نے شاہی محل میں بڑے بڑے جشن منانے کا سلسلہ جاری کیا اور ان میں شراب اور گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ عبد الملک نے سعید بن مسیجح (یا مسجح) (وفات ۷۱۵ء) کی سرپرستی کی جو موسیقی کے حجازی دبستان سے تعلق رکھتا تھا اور اموی دور کا سب سے بڑا گویا تھا۔ سعید مکۂ معظمہ کا ایک حبشی مولی تھا۔ اس نے عام روایت کے مطابق شام و ایران کے سفر کیے، بیزنطینی اور ایرانی گیتوں کو عربی میں منتقل کیا۔[2] علاوہ بریں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے عربوں کے نظریۂ موسیقی اور دورِ قدیم کے عملیات کو بھی اصولی اعتبار سے منظم کر دیا۔ ولید اول فنونِ لطیفہ اور تعمیرات کا سرپرست تھا۔ اس نے ابن سریج (وفات ۷۲۶ء) کو اپنے پاس بلایا، جو مسلمانوں کے چار بڑے گویوں میں مانا جاتا تھا۔[3] نیز معبد (وفات ۷۴۳ء) کو مدینہ سے بلایا۔ خلیفہ نے دمشق میں بڑے احترام سے ان کا استقبال کیا، سعید یزید ثانی اور ولید ثانی کے عہد حکومت میں بھی دربار کا خاص گویا تھا۔[4] یزید ثانی نے شاعری اور موسیقی کو شاہانہ زندگی کا جزو بنا لیا۔ اس کی دو کنیزیں حبابہ و سلامہ بہت اچھا گاتی تھیں۔ ان کی اور یزید کی کہانیاں بہت مشہور ہیں، آوارہ مزاج ولید ثانی عود بہت خوب بجاتا تھا۔ گانے بھی لکھتا تھا، اس نے بہت سے گویے اپنے دربار میں بلا لیے تھے۔[5] نغموں کے نشان اس زمانے میں بھی موجود تھے۔ لیکن زبانی نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے تھے۔ اغانی امیہ دور کی موسیقی کے اشعار سے بھر پور ہے، لیکن اس میں کہیں نغمے کا نشان محفوظ نہیں رکھا گیا۔ ہشام نے حیرہ سے حنین نام ایک فن کار کو بلایا اور اس کی سرپرستی کی غرض امویوں کے عہد میں موسیقی اس درجہ ترقی کر گئی تھی اور اتنی پھیل گئی تھی کہ عباسیوں کو امویوں کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک مؤثر دلیل مل گئی، جس کی بنا پر وہ ثابت کرتے تھے کہ اموی غاصب بھی ہیں اور دینی لحاظ سے خطا کار بھی۔

مُصوّری

مصوّری کے خلاف سخت اعتراضات کا دور عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں شروع ہوا۔ غالباً یہ ان یہودیوں کی رائے کا اظہار تھا، جو اسلام قبول کر چکے تھے یا کہیئے کہ پرانے زمانے کے اسی وہم کا نتیجہ تھا کہ جس شخص کے پاس کسی کی تصویر ہو وہ اس پر جادو کر سکتا ہے۔

عباسیوں کے زمانے سے بیشتر علمائے دین یہ کہتے رہے کہ جاندار چیزوں کی شکلیں بنانا صرف خدا کا کام ہے رسول اللہ (صلعم) کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ قیامت کے دن مصوّروں کو سخت سزائیں ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسجدوں میں بھی کسی انسان

۱؎ عقد جلد ۳ ص ۲۳۷

۲؎ اغانی جلد ۱۶ ص ۷۰، مسعودی جلد ۵ ص ۱۵۶ - ۱۵۷

۳؎ اغانی جلد ۳ ص ۸۴۔

۴؎ اغانی جلد اوّل ص ۹۸۔

۵؎ اغانی جلد ۲ ص ۱۹، مسعودی جلد ۴ ص ۴۔

کی تصویر نہیں بنائی گئی۔ اگرچہ قصروں اور کتابوں کے مسودوں میں کہیں کہیں تصویریں ملتی ہیں۔ فن آرائش میں بھی سب کچھ یا تو علم الہندسہ سے لیا گیا یا عالم نباتات سے۔

ولید نے شرقی اُردن میں شکار کے لیے ایک چھوٹا قصر بنوایا تھا جس کا نام قُصَیر عمرہ تھا۔ اس قصر کے روکار اور آرائشیں اسلامی تصویری فن کا بالکل ابتدائی نمونہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرائشیں مسیحی فن کاروں نے کی تھیں۔ دیواروں پر چھ بادشاہوں کی تصویریں ہیں۔ ان میں سے ایک خلیفہ کی ہے اور دوسری اس کے مغربی گاتھ حریف راڈرک (شاہ ہسپانیہ) کی۔ باقی تصویریں رمزی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً ایک فتح کی ہے، دوسری فلسفے کی، تیسری تاریخ کی اور چوتھی شاعری کی۔ شکار کا بھی ایک منظر پیش کیا گیا، جس میں ایک شیر نے گورخر پر حملہ کر رکھا ہے۔ برہنہ رقاصاؤں، موسیقاروں اور جشن منانے والوں کی تصویریں بھی ہیں۔ قدیم اسلامی دَور کی تصویریں اس عمدہ حالت میں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

اریحا سے تین میل شمال میں ایک مقام خربۃ مفجر ہے، وہاں حال ہی میں کھدائی ہوئی اور اموی دَور کا ایک نہایت عمدہ قصر نکل آیا، جہاں خلفاء موسم سرما بسر کرتے تھے۔ اس کی دیواروں پر آدمیوں اور جانوروں کی نہایت عمدہ تصویریں تھیں۔ فنکار نے جو نقوش دیواروں پر بنائے، ان میں ہشام کا نام لکھا (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہشام نے جو قصر بنوایا ہوگا۔ اس میں ایک مجسمہ بھی تھا، یعنی ایک لڑکی پھولوں کا گلدستہ لیے کھڑی تھی، ایک تصویر میں رقاصاؤں کا ایک گروہ دکھایا گیا ہے، جن کے لبوں پر مسی لگی ہوئی تھی، ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن سرخ رنگے ہوئے تھے۔ ایک تصویر میں پورا چڑیا گھر دکھایا گیا ہے یعنی پرندے خرگوش اور دوسرے جانور۔ فن میں صاف صاف بزنطی یونانی فن سے متعلق نظر آتا ہے اغلب یہ ہے کہ قصر تکمیل سے پیشتر ۷۴۶ء میں زلزلے کے باعث تباہ ہوگیا۔

صحرائی قصر

جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، اموی خلفاء نے شہروں سے باہر جابجا قصر تعمیر کر رکھے تھے۔ جب کوئی متعدی وبا پھیلتی یا انہیں دیہاتی زندگی بسر کرنے کا خیال آتا یا وہ چاہتے کہ صحرائی آب و ہوا کے شوق کی پیاس بجھائیں، ان قصروں میں منتقل ہو جاتے۔ بادیۂ شام کے حواشی پر، خصوصاً جنوبی حصے میں قصروں یا شکار گاہوں کے باقیات جابجا پائے جاتے ہیں۔ یہ قصر اور شکار گاہیں یا تو اموی خلفاء نے بزنطی اور ایرانی نمونوں کے مطابق تیار کرائی تھیں یا پہلے سے موجود تھیں اور خلفاء نے ان کی مرمت کرائی تھی۔ بعض یقیناً ابتدا میں رومی قلعے تھے۔

عمرہ اور مفجر اس قسم کے قصروں کی دو مثالیں ہیں۔ ان دونوں کے نام، نیز بہت سے دوسرے قصروں کے نام موجودہ عہد کے ہیں، ایسا کوئی نام کلاسیکی ادبیات میں نہیں ملتا۔ قصیر (عمرہ) ان غیر معمولی تصویروں کی وجہ سے زیادہ معروف ہے جو اس کی دیواروں پر بنی ہوئی ہیں یہ ولید اول نے ۹۳ھ اور ۹۶ھ کے درمیان تعمیر کرایا تھا ۱۸۹۸ء میں علمی دنیا کو اس کا سراغ ملا۔

سلہ قصر کی تصغیر۔ اصل لفظ لاطینی میں کیسٹرم Castrum تھا۔ سریانی سے ہوتا ہوا یہ بہ مشکل قصر عربی میں پہنچا۔

سلہ دیکھئے الائس میوسل Musil کی کتاب۔ مصنف مذکور کا خیال تھا کہ یہ ولید ثانی نے تعمیر کرایا۔

اس حصے کا ایک اور معروف قصر "المشتی"[1] ہے (موسم سرما بسر کرنے کا مقام[2])۔ یہ ولید ثانی نے بنوایا تھا، جو شکار اور دوسری غیر معصوم مجالس اور عیش و نشاط کا دلدادہ تھا۔ اس خوبصورت کوشک کا روکار بڑا ہی بلند تھا اور وہ آج کل برلین کے عجائب خانے میں ہے۔ جھیل طبریہ کے شمال مغرب میں "خربتہ المینہ" (باغ)، حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ یہ بھی ولید ثانی ہی نے بنوایا تھا۔ کھدائی کے دوران میں یہاں سے دو دینار ملے ہیں۔ ان کی تاریخ ساخت اس کتبے کے عین موافق ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ولید ثانی ہی نے اس قصر کی تعمیر کا حکم دیا تھا[3]۔ اسی خلیفہ نے قصر "القسطل"[4]، پر بھی قبضہ کر لیا تھا، جو عمان سے تقریباً بیس میل جنوب میں ہے۔ ایک مؤرخ[5] نے بتایا ہے کہ القسطل حارث بن جبلہ غسانی نے تعمیر کرایا تھا۔ اگر یہ بیان درست ہے تو اس قصر کو اسلام سے پیشتر کی تعمیر سمجھنا چاہیئے۔ ولید نے ایک اور قصر سے بھی فائدہ اٹھایا تھا، جو گرد و نواح ہی میں تھا اور اس کا نام الازرق[6] (نیلا محل) تھا۔ اس کے والد یزید ثانی نے یا تو "موقر"[7] خود بنوایا تھا یا یہ پہلے سے بنا ہوا تھا اور اس کی مرمت کرائی تھی۔ اب اس کے کھنڈروں میں سے بہت کم چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ "قصر الطوبہ" (یا توبہ) کے متعلق کچھ معلوم نہیں، جو "موقر" کے جنوب مشرق میں تھا۔

بادیہ کے شمالی حاشیے میں مزید قصروں کے کھنڈر ملتے ہیں، لیکن ان کے بارے میں ابھی تک کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ ان میں سب سے بڑھ کر اہم اُسیس[8] (موجودہ سیس) ہے، جو دمشق سے ۶۳ میل مشرق میں ہے۔ یہ ایک مستحکم و محفوظ مقام ہے۔ یہاں آبیاری کا بھی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ یہ نظام آبیاری موسم سرما کی بارشوں پر موقوف تھا۔ یہ غالباً ولید اوّل نے بنوایا تھا اور اپنی نوعیت کی بالکل ابتدائی تعمیرات میں سے ہے۔

قصر الحیر

اس خطے میں دو اور مقام ہیں اور دونوں کا نام "حیر"[8] ہے۔ خلفاء کے بیشتر قصروں کے ساتھ باغات تھے، جو دیواروں سے محصور تھے اور ان میں جنگلی جانور چھوڑ دیئے جاتے تھے، تاکہ خلفاء جب چاہیں، شکار کھیلیں۔ تدمر سے چالیس میل شمال و مشرق میں پہلا قصر الحیر دریافت ہوا، جسے اس وجہ سے "قصر الحیر الشرقی" کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے غربی نام سے ممتاز رہے۔ یہ قصر الحیر الشرقی تدمر اور الفرنیس کے درمیان ہے، یہ پانچ میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ اسے ہشام نے ۷۲۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ حال کے

---

[1] میوسل کی کتاب میں عرب ریگستان Arabia Desert (تدمر Palmyrena)

[2] مقالہ "خربۃ المینہ" جو فلسطین کے محکمہ آثار قدیمہ کے سہ ماہی رسالے میں شائع ہوا۔ جلد ۶ بابت ۱۹۳۷ء ص ۲۱۵-۲۱۶۔ جلد ۷ بابت ۱۹۳۸ء ص ۴۹، ۵۱۔

[3] یہ لفظ لاطینی Castellum سے بنا۔ یاقوت جلد ۴ ص ۹۵، طبری جلد ۲ ص ۱۷۸۴۔

[4] حمزہ اصفہانی

[5] طبری جلد ۲ ص ۱۷۴۳

[6] یاقوت جلد ۴ ص ۶۸۷۔ بلقا، جس میں موقر، قسطل اور دوسرے قصر تھے، مشرقی اردن کا ضلع تھا، جس میں سراب بھی شامل تھا۔

[7] یاقوت جلد اوّل ص ۲۷۱، میوسل پامیرینیا۔ سریا جلد ۲۰ (۱۹۳۹ء) ص ۲۲۹-۲۵۶۔

[8] دیکھئے ابن مسکویہ کی تجارب الامم جلد اوّل ص ۵۹ "اصل لفظ سریانی سے آیا اس کے معنی ہیں محصور رقبہ۔ اسے حیرہ (چھاؤنی) سے بھی تعلق ہے۔"

ایک صاحبِ علم نے لکھا ہے کہ یہی "رصافہ" تھا، جو خلیفہ ہشام سے منسوب ہے۔ ہشام کو رصافہ سے بے حد دل بستگی تھی اور اس نے وہیں وفات پائی، وہیں دفن ہوا۔[1] فصیل میں دشمن پر پتھر اور تیر پھینکنے کے لیے سوراخ رکھنے کا طریقہ شام میں اسلام سے قبل رائج تھا اور یہ طریقہ بارھویں صدی میں یورپ پہنچا۔ رصافہ میں بھی یہ طریقہ استعمال کیا گیا تھا۔

تدمر سے چالیس میل جنوب مغرب میں قصر الحیر الغربی کے کھنڈر ہیں۔ یہ قصر ۷۲۷ء میں ہشام ہی نے بنوایا تھا، جیسا کہ ایک کتبے میں بتایا گیا ہے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہشام رصافہ میں منتقل ہونے سے پیشتر یہیں رہتا تھا۔ ممکن ہے، یہی جیرون وہ مقام ہو، جسے عرب مؤرخ زیتونہ کہتے ہیں[2]، جو ابتداء میں بیزنطینی یا رومی قصر تھا۔ اس کی آرائشوں میں ایک شانِ امتیاز پائی جاتی ہے داخلے پر دونوں جانب دو عورتوں کے مجسمے نصب ہیں۔ ان میں تدمری فن کاری کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تصویروں میں سے دو گانے والی عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک نے پانچ[3] تار والا ساز اٹھا رکھا تھا۔

اس قصر کی آرائش کے لیے جو سامان استعمال کیا گیا، وہ اب شام کے قومی عجائب خانہ واقع دمشق میں موجود ہے۔ اس سے وہ خلا پُر ہو جاتا ہے، جو بیزنطینی اور اسلامی فن میں اب تک پایا جاتا تھا۔ ان آرائشوں میں ساسانی، بیزنطینی اور شامی عناصر کو نہایت عمدہ طریق پر ملا دیا گیا تھا۔ یہی طریقہ المغرب پہنچا۔ پھر اس نے قرطبہ اور غرناطہ میں نشوو ارتقا کی بلند ترین ممکنات حاصل کیں۔ امویوں نے جیرون کے باغات کی تعمیر میں جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس کی پیروی عباسیوں نے کی۔ انہوں نے سامرہ میں ایک عارضی دارالحکومت قائم کیا تھا۔ مشہور جغرافیہ نگار یعقوبی[4] اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے[5] "وحشی جانور مثلاً غزال گورخر، ہرن، خرگوش اور شتر مرغ وہاں ایک کھلے خطے میں رکھے گئے تھے، جو دیواروں سے محصور تھا۔" رومیوں کو ایسے باغات کا کوئی ذوق نہ تھا، جن میں جانور رکھے جاتے تھے، البتہ شہنشاہوں کے زمانے میں یہ ذوق بروئے کار آیا اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشرقی اثر کا نتیجہ تھا۔

خلیفہ سلیمان (۷۱۵ء۔۷۱۷ء) نے فلسطین میں رملہ شہر آباد کیا تھا اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شام میں صرف یہ ایک شہر ہے، جو عربوں نے آباد کیا۔ وہاں بھی قصرِ خلافت کے نشان بیسویں صدی کے آغاز تک ملتے رہے۔ مسجد سفید کا ایک مینار اب تک باقی ہے۔ یہ مسجد مملوکوں نے ازسرِ نو تعمیر کی تھی اور اتنی اہم تھی کہ دمشق کی جامع امویہ اور یروشلم کے قبۃ الصخرا کے بعد یہ شام میں تیسرا ممتاز مقدس مقام بن گیا تھا۔

مسجدیں

تسخیرِ شام کے بعد مسلمان قریباً نصف صدی تک انہیں گرجاؤں میں نماز ادا کرتے رہے، جنہیں مسجدیں بنا لیا گیا تھا اور خود

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۱۷۲۹۔

[2] طبری جلد ۲ ص ۱۴۶۷۔

[3] بالعموم کہا جاتا ہے کہ مسعود مطرب زریاب نے پانچواں تار اضافہ کیا تھا، جس نے ۸۵۲ء میں وفات پائی۔ تصویر سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔

[4] بلدان ص ۲۶۳

[5] العیون والحدائق فی اخبار الحقائق ص ۸۰۔

کوئی خاص مسجد تعمیر نہ کی۔ دمشق میں انہوں نے ایک گرجے کے دو حصے نہیں کیے تھے، جیسا کہ عام روایات میں بیان کیا گیا ہے بلکہ ایک مقدس احاطے کے دو حصے[1] کیے تھے۔ دمشق کے مسیحی اور مسلمان عبادت گزار ایک ہی دروازے سے اندر داخل ہوتے۔ مسیحی بائیں جانب مڑ جاتے اور مسلمان داہنی جانب[2]۔ جب حماۃ فتح ہوا تو وہاں جو گرجا تھا، اسے ایک مقامی مؤرخ[3] نے کلیسائے کبیر کہا تھا۔ مسلمانوں نے اسے مسجد بنا لیا اور اس کا نام الجامع الکبیر رکھا۔ اس مسجد میں کلیسا کے شرقی اور غربی رو کار اب تک محفوظ ہیں[4]۔ اسی طرح حمص[5] کی مسجد کبیر نیز حلب[5] کی مسجد ابتداءً گرجے تھے۔ حمص کی مسجد میں مسیحی دور کے باقیات اور رومی ستون اب تک نمایاں نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے شام میں جو مسجد تعمیر ہوئی وہ یروشلم کا قبۃ الصخرا تھی، جسے عبدالملک نے ۶۹۱ء میں اسی مقام پر تعمیر کرایا جہاں کسی زمانے میں ہیکل سلیمانی[6] موجود تھا۔ یہ مسلمانوں کی بالکل ابتدائی یادگار ہے۔ قبۃ الصخرا کی داہنی جانب وہ مقام موجود ہے، جہاں رسول اللہ صلعم سفر معراج میں قیام فرما ہوئے تھے پھر معجز نما مرکب پر عالم علوی کا سفر شروع ہوا۔ رسول اللہ صلعم کے مقدس سفر کی ایک منزل اور اسلام کا پہلا قبلہ ہونے کے باعث یروشلم کو مسلمانوں کی نگاہوں میں بہت تقدس حاصل ہو گیا پھر بڑی وزنی سیاسی مصلحتیں بھی تھیں۔ امویوں کی خواہش تھی کہ ایک عالی شان اور پر تکلف مقام عبادت تیار کر دیں تاکہ شام کے لوگ مکہ معظمہ کے بجائے توجہ اس طرف کر لیں۔ کیونکہ مکہ معظمہ اس وقت حریف کے قبضے میں تھا۔ ایک غرض یہ بھی تھی کہ قبۃ الصخرا کی عمارت کنیسۃ القیامہ[7] (مقام قبر مسیحؑ) اور شام کے دوسرے مسیحی گرجوں پر فوقیت لے جائے۔ عبدالملک نے اس عمارت

---

[1] کریسویل حصہ اول ص ۱۲۴

[2] ابوالفدا جلد اول ص ۱۶۸

[3] کریسویل ص ۱۴۱۔

[4] بلاذری ص ۱۴۲، مقدسی ص ۱۵۶

[5] بلاذری ص ۱۴۶، ۱۴۷ (مترجم - اس سلسلے میں عام یورپی مورخین، جن میں خود حتی بھی شامل ہے، عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جب کسی مقام کی مسیحی آبادی اسلام قبول کر لیتی تھی تو وہاں کے گرجے یا گرجاؤں کو مسجدیں بنا لینے پر کیا، اعتراض ہو سکتا تھا یہ عمارتیں بہرحال عبادت کی غرض سے بنی تھیں۔ متعلقہ آبادیوں کے مذاہب بدل گئے تو طریق عبادت بھی بدل گیا۔ یہ صورت حال ہر جگہ ہر قوم کو پیش آئی، البتہ جہاں مذہب نہ بدلے، وہاں کسی عبادت گاہ کو فاتح نہ جوش و خروش سے قبضے میں لے لینا بدل دینا بالکل جائز نہ تھا۔ اسلام کا قانون یہی ہے، دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں

[6] اس مقام کو اہل یورپ غلطی سے مسجد عمرؓ کہتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ ۶۳۸ء میں یہاں آئے تھے اور معمولی اینٹوں یا لکڑی کی ایک مسجد بنوا دی تھی (مترجم۔ مصنف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہیکل سلیمانی کا مقام قبۃ الصخرا تھا۔ صخرا یا معلق چٹان دراصل ہیکل سلیمانی سے باہر قربان گاہ تھی اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قربانیوں کا خون چٹان کے آس پاس سے بہتا ہوا نیچے وادی میں چلا جاتا تھا۔ ہیکل سلیمانی کی اصل جگہ وہی تھی جہاں مسجد اقصیٰ تعمیر ہوئی۔

[7] نستا ص ۱۵۹ - (مترجم۔ کنیسۃ القیامہ سے مراد وہ مقام ہے، جہاں مسیحی روایات کے مطابق حضرت مسیحؑ کی نعش صلیب سے اتار کر ایک قبر میں رکھی گئی تھی اور تین روز بعد مسیحؑ زندہ ہو گئے تھے۔ یہاں ایک عالیشان گرجا بن گیا، جو مسیحیوں کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ یہاں قبر کا نشان بھی بتایا جاتا ہے اور کنیسۃ القیامہ اسکا یہ کہتے ہیں کہ مسیحؑ مرنے کے بعد زندہ ہو گئے تھے۔

بس ان مقامی معماروں اور فن کاروں سے کام لیا، جو بیزنطینی دبستان کے تربیت یافتہ تھے اور وہ نمونہ پیش نظر رکھا گیا جو بصریٰ کے گرجے کا تھا[1]۔ اس کے دروازے پیتل کے ہیں، جن میں جابجا چاندی کی تہیں جما دی گئی ہیں۔ انہیں بیزنطینی فن کاروں کا ایک ممتاز کارنامہ سمجھنا چاہیے اور اپنی نوعیت کے یہ قدیم ترین دروازے ہیں۔ اس عمارت کی آرائش کے لیے کاشی کاری اور رنگ برنگ پتھروں کا استعمال وسیع پیمانے پر کیا گیا، پھر اس کی درستی اور مرمت میں بھی یہی طریقہ پیش نظر رکھا گیا۔ کاشی کاری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مربع یا ہشت پہلو چمکیلی ٹائلیں استعمال کی جائیں، جن میں رنگ رنگ کے بیل بوٹے اور بعض اوقات ہندسی شکلیں بنی ہوتی ہیں۔ اس طریق تعمیر کا استعمال سب سے پہلے ایران میں ہوا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے[2]۔ رنگ برنگ پتھروں کا استعمال سب سے پہلے بابل میں کیا گیا۔ قبے کے اندر کی طرف عبدالملک نے کوفی رسم الخط میں ایک عبارت لکھوائی یہ قدیم ترین اسلامی تحریر ہے، جو اب تک دستیاب ہوئی ہے۔ سوا سو سال بعد عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اس عمارت کو از سر نو آراستہ کیا۔ عجیب امر یہ ہے کہ عبدالملک کی جگہ اپنا نام شامل کر دیا اور تاریخ تعمیر تبدیل نہ کی[3]۔ قبۃ الصخرا کے مشرق میں ایک چھوٹی سی گنٹی بنی ہوئی ہے جسے قبۃ السلسلہ کہتے ہیں۔ یہ قبۃ الصخرا کا بیت المال تھا۔ اس کی تعمیر و تزئین کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ اس مقام کی حفاظت کے لیے ایک روایت تیار ہو گئی، یعنی سلیمان ؑ نے ایک زنجیر بنوا کر یہاں لٹکا دی تھی۔ راست باز گواہ اسے بے تکلف تھام لیتا تھا، جھوٹے کا ہاتھ لگتے ہی اصلیت ظاہر ہو جاتی تھی۔

مسجد اقصیٰ

قبۃ الصخرا کے قریب ہی عبدالملک نے ایک اور مسجد بنائی، یعنی مسجد اقصیٰ[4]، جس میں قبے کی حیثیت محض ایک زیارت گاہ کی ہے۔ مسجد اقصیٰ میں کل چونتیس ایکڑ زمین شامل ہے، جس میں تکیے اور زاویے بھی ہیں، سبیلیں بھی۔ ان میں سے بعض عمارتیں مملکوں اور عثمانی سلطانوں نے تعمیر کرائیں۔ اس مقام کا ایک نام الحرم الشریف بھی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ہیکل سلیمانی تھا، پھر مسیحی کلیسا تعمیر ہوا اور لادین رومیوں کا بھی مندر رہا، غرض یہ مقام روئے زمین کے مقدس ترین مقاموں میں شامل ہے۔ مسجد اقصیٰ کی جگہ ایک گرجا

---

[1] وساؤ کی فرانسیسی کتاب آثار شام ص ۱۰، برگز کی کتاب ص ۳۷

[2] کاشی کاری کاشان سے منسوب ہے، جو ایران کا قدیم شہر ہے، یاقوت معجم البلدان جلد ۴ ص ۱۵

[3] تحریر کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "یہ قبہ تعمیر کیا خدا کے بندے عبداللہ الامام المامون، امیر المؤمنین نے ۷۲ھ میں اللہ تعالٰے قبول کرے اور اس پر مہربان ہو، آمین"!

(مترجم - قابل غور امر یہ ہے کہ ۷۲ھ (۶۹۱ء) میں عبدالملک خلیفہ تھا۔ اس سے بہت مدت بعد عباسی حکومت قائم ہوئی مامون ۱۹۸ھ (۸۱۳ء) میں خلیفہ بنا۔ ظاہر ہے کہ ۷۲ھ میں اس کے ہاتھوں اس عمارت بنانے کا سوال ہی خارج از بحث تھا۔)

[4] یعنی دور کی مسجد جو مکہ معظمہ سے بہت فاصلے پر تھی۔ مقریزی کا بیان ہے کہ یہ قبہ ولید نے بنوایا تھا۔ ابتدائی تعمیر کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن الفقیہ نیز مقدسی۔

تھا جو سینٹ میری کے نام پر جسٹینین نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا ملبا مسجد کی تعمیر میں استعمال ہوا۔ ایک زلزلے میں مسجد گر گئی تو خلیفہ منصور عباسی نے اسے نئے سرے سے بنوایا۔ صلیبیوں نے اپنے دورِ تصرف میں اسے ترمیم کر لیا تھا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے پھر اسے مسیحیوں سے واپس لے کر بحال کر دیا۔[۱]

جامع اموی

ترتیب اور اہمیت کے اعتبار سے دوسرا درجہ (مسجد اقصیٰ کے بعد) دمشق کی جامع اموی کا ہے۔ ۷۰۵ء میں عبدالملک کے فرزند ولید نے اس گرجے پر قبضہ کر لیا، جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے نام پر بنایا گیا تھا[۲] اور یہاں مسجد تعمیر کر دی جو دنیا کی جمیل ترین عبادت گاہوں میں سے ہے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یروشلم کے حرموں کے بعد جامع اموی اسلام میں چوتھی مقدس ترین مسجد سمجھی جاتی ہے۔ گرجا اس مقام پر بنایا گیا تھا، جہاں دمشق کے جوپیٹر کے لیے ایک مندر بنا ہوا تھا۔ یہ جوپیٹر شامی حدد تھا اور مندر میں تدمر کے معبد شمس کا نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں تصرف کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ روایت پیش کی جاتی تھی کہ دمشق کی تسخیر کے وقت دو اسلامی فوجیں دو مختلف سمتوں سے شہر میں داخل ہوئیں۔ ایک کے سالار خالدؓ تھے اور دوسری کے ابو عبیدہؓ۔ مشرق کی طرف سے آنے والی فوج، جس کے سالار خالدؓ تھے۔ بزور داخل ہوئی۔ مغرب کی طرف سے آنے والی فوج، جس کے سالار ابو عبیدہؓ تھے، صلح کی بنا پر داخل ہوئی۔ گرجے کے وسط میں پہنچ کر دونوں فوجیں مل گئیں، جس مقام پر یوحنا (یحییٰ) بپتسمہ دینے والے کا فرقِ مبارک کٹ چکنے کے بعد رکھا گیا تھا، وہ اب بھی مسجد کے اندر محفوظ ہے اور اس پر ایک گنبد بنا دی گئی ہے، جو سنہری بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ ایک اور مسیحی اثر بھی مسجد میں محفوظ ہے، یعنی جنوبی سمت کے رواق کا کتبہ، جس کی عبارت یہ ہے: "اے مسیحؑ! تیری بادشاہت دائمی ہے اور تیری حکومت نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے گی"۔[۳]

ہمیں بتایا گیا ہے کہ ولید نے سات سال تک اس مسجد کی تعمیر کے لیے شام کا پورا مالیہ وقف رکھا تھا۔[۴] مقامی فن کار باعثِ تسلی ثابت نہ ہوئے تو ایران و ہندوستان سے کاریگر بلوائے گئے اور ایک سو یونانی فنکاروں کے لیے بزنطینی شہنشاہ کے پاس درخواست بھیجی گئی۔[۵] رنگ رنگ کے پتھروں اور نہایت کم یاب سنگِ مرمر سے اس مسجد کی دیواریں اور چھتیں آراستہ کی گئیں۔ دیواروں پر سنہری بیل بوٹے بنوائے گئے، جن میں درخت بھی تھے اور شہر بھی، جا بجا جواہرات

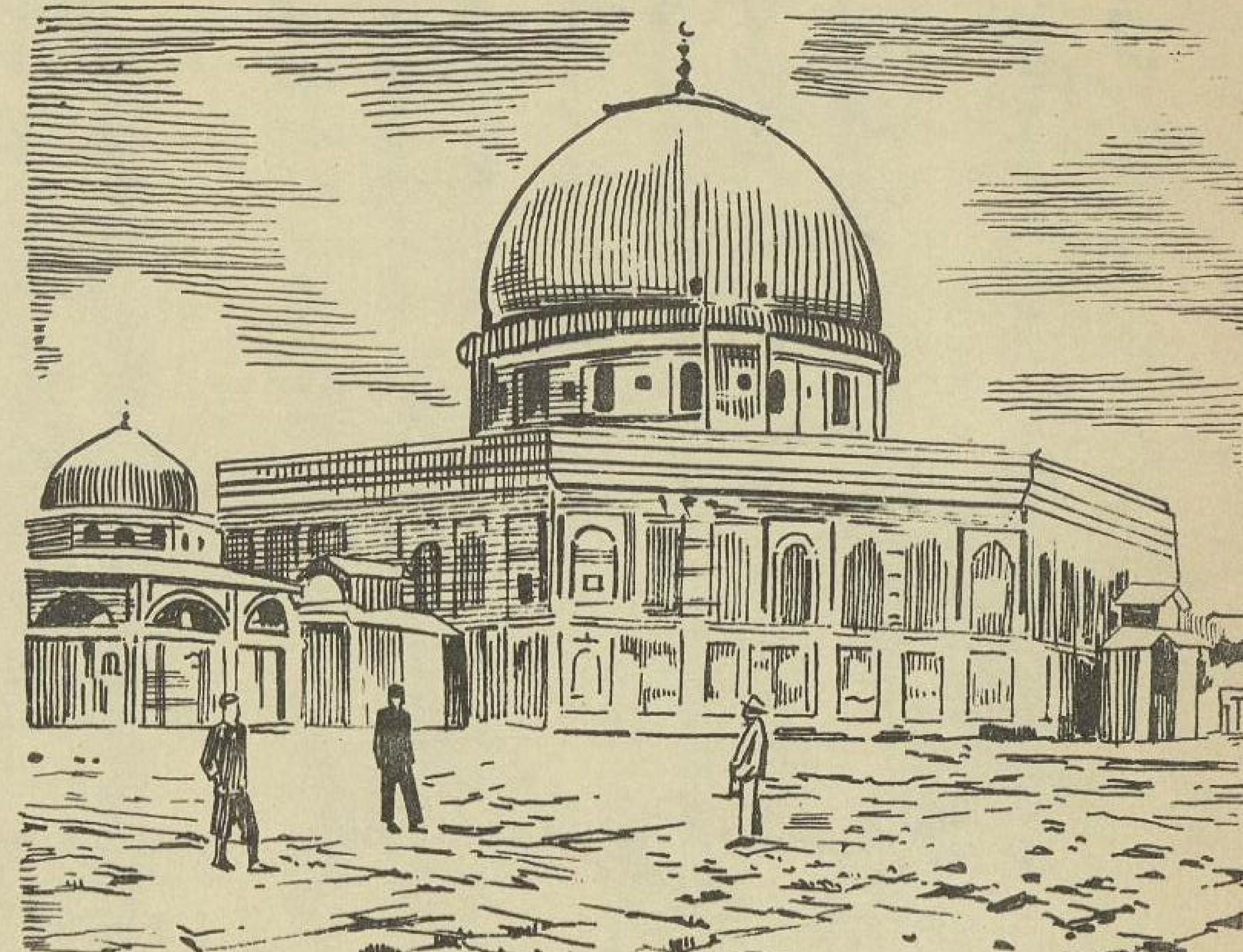
---

[۱] (مترجم۔ ہیکل سلیمانیؑ یا اس کی جگہ رومی مندر یا مسیحی گرجے بننے سے یہاں کچھ غرض نہیں۔ حضرت عمرؓ یروشلم پہنچے تھے۔ تو اس جگہ کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سن رسیدہ آدمیوں کے ذریعے سے ہیکل کا سراغ لگایا اور اپنے ہاتھ سے کوڑا کرکٹ صاف کر کے مسجد کی بنیاد رکھی۔

[۲] ابن العساکر جلد اوّل ص ۲۰۰، ابوالفدا جلد اوّل ص ۲۰۹، ۲۱۰۔

[۳] مقدسی ص ۱۵۸، العیون والحدائق ص ۷۔

[۴] ابن العساکر جلد اوّل ص ۲۰۲۔ العیون میں تعداد ایک لاکھ بتائی گئی ہے جن میں سے کچھ لوگوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیج دیا گیا تھا، طبری جلد ۲ ص ۱۱۹۴، ابوالفدا جلد ۱ ص ۲۱۰، ابن جبیر ص ۲۶۱۔



قبّة الصخرة (بيت المقدس)



جامع اموی ، دمشق

جڑے گئے۔ شام کے جغرافیہ نگار مقدسیؒ نے یہ سب کچھ خود دیکھا تھا، بعد کے متقی حکمرانوں نے اوپر سے پلستر کرا دیا تاکہ کوئی تصویر نظر نہ آئے۔ ۱۹۲۸ء میں نقش و نگار پھر برآمد کر لیے گئے۔ ان آرائشوں کے تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مقامی شامیوں کا کارنامہ تھا نہ کہ بیزنطینی یونانیوں کا۔

مسجد کی شمالی سمت میں ولید نے ایک منارہ تعمیر کرایا تھا، جس پر رات کے وقت روشنی ہوتی تھی۔ پھر تعمیر کے اسی نمونے کی پیروی شام، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں ہوئی۔ عبدالرحمن اوّل نے اسے ہسپانیہ پہنچایا۔ یہ سب سے پرانا اور خالص اسلامی منارہ ہے۔ جنوبی سمت کے دو مینار پہلے گرجے کے بُرج تھے۔ الغزالی (وفات ۱۱۱۱ء) نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ شمالی مینار میں عبادت اور مراقبے کے لیے معتکف رہے[۲]۔ شمالی نمونے کے مینار سادہ اور مربع وضع کے ہوتے تھے اور یہ یقیناً نگہبانی کے میناروں یا گرجوں کے میناروں سے لیے گئے۔ ہشت پہلو، گاؤدم اور گول نمونے کے مینار، جو کلاسیکی رومی ستونوں کی یاد تازہ کرتے تھے۔ ترکوں نے بعد میں اختیار کیے اور ان کی وجہ سے شام میں رائج ہوئے۔ جیسا کہ حمص کی مسجد خالدؓ سے واضح ہوتا ہے۔

دمشق کی مسجد کا ایک امتیازی پہلو اور ہے اور وہ یہ کہ نماز کے لیے محراب سب سے پہلے اسی میں بنی۔ اسی میں نعل نما محرابیں بنائی گئیں۔ یہ مسجد پہلے ۱۰۶۹ء میں جلی، پھر ۱۴۰۰ء میں تیمور نے اسے آگ لگائی اور آخری مرتبہ ۱۸۹۳ء میں اسے آگ کا حادثہ پیش آیا۔ بہ ایں ہمہ مسلمانوں کی نظروں میں یہ بڑا محترم مقام ہے[۳]۔

امویوں میں سے ولید کو سب سے بڑھ کر عمارتوں کا شوق تھا اور اس نے عمارتیں بنوائیں۔ مسجد النبیؐ (مدینہ منورہ) بھی اسی نے از سرِ نو بنوائی اور اس میں توسیع کی۔ مسجد الحرام کو بھی زیادہ کشادہ کیا گیا اور بہت خوب صورت بنوایا۔ شام میں درس گاہیں، شفا خانے اور مسجدیں بنوائیں۔ بعلبک کے گرجے سے ایک ملمّع شدہ گنبد اتروا کر یروشلم کی اس مسجد میں نصب کرا دیا جو اس کے والد نے وہاں بنوائی تھی اس کا عہدِ حکومت خوشحالی اور امن کا عہد تھا۔ دمشق میں جب لوگ کسی جگہ جمع ہوتے تو عمدہ عمارتیں ہی ان کی گفتگو کا خاص موضوع ہوتیں[۴]۔

امویوں نے جو قصر اور مسجدیں پیچھے چھوڑیں، ان میں عربی، ایرانی، شامی اور یونانی عناصر کو بڑے عمدہ طریقے پر باہم ملا دیا گیا ہے۔ اسی امتزاج سے اسلامی فنِ تعمیر کا آغاز ہوا۔ عربی عنصر یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو جتنا چاہتے تھے بڑھا لیتے تھے، پھر جتنا چاہتے تھے، کم کر لیتے تھے، جیسا کہ قرطبہ کی مسجد کے ستونوں سے واضح ہوتا ہے۔ اس سے یہ

۱؎ مقدسی ص ۱۵۷، اصطخری ص ۵۷، ابن رستہ ص ۳۲۶، العیون ص ۸، ۹۔

۲؎ غزالی المنقذ من الزلال ص ۲، ابن خلکان جلد ۲ ص ۲۴۶۔

۳؎ ابن الفقیہ ص ۱۰۶، ابن عساکر جلد اوّل ص ۱۹۸، یاقوت جلد ۲ ص ۵۹۱۔

۴؎ طبری جلد ۲ ص ۲، ۱۲، ۳، ۱۲۷۔

خیال ہوتا ہے کہ عربوں کے پیش نظر صحرا کے مناظر کی یکسانی رہی۔ مثلاً نخلستان میں کھجوروں کے تنے یا قافلوں میں اونٹوں کی ٹانگیں۔ ایرانیوں نے نفاست، نزاکت اور بوقلمونی پیدا کی۔ اموی شام میں قدیم سامی اور یونانی عناصر بھی موافقت پیدا کر کے فن کو اسلام کی دائمی خدمت کے لیے استعمال کیا گیا۔

انتالیسواں باب

سُریانی مسیحی کلیسا

مشرقی سُریانی کلیسا

ظہور اسلام سے پیشتر سُریانی مسیحی کلیسا بہت سے چھوٹے چھوٹے فرقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ ان میں سے پہلا فرقہ وہ تھا، جسے مشرقی سریانی کلیسا یا کلیسائے مشرق کہتے تھے۔ یہ جمعیت دوسری صدی مسیحی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب سے الرّہا کے بادشاہ ابجر نے مسیحؑ سے درخواست کی تھی کہ مجھے لا علاج بیماری سے نجات دلایئے اور مسیحؑ نے وعدہ کیا تھا کہ آسمان پر چلے جانے کے بعد میں اپنے ایک شاگرد کو تیرے پاس بھیجوں گا،[۱] اس وقت سے مسیحؑ کی تعلیم، اوراد و وظائف، تقدیس اور روایت بلا انقطاع اس کلیسا کو حاصل رہی ہے۔ یہی کلیسا ہے، جسے غلطی سے سیلیشیا کے نسطوریس کے نام پر نسطوری کہتے ہیں، حالانکہ یہ کلیسا اس سے اڑھائی سو سال پیشتر قائم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے نسطوری کا نام بعد میں ایک رومن کیتھولک نے لکھا، تاکہ اس پر الحاد کا الزام لگایا جاسکے۔ اس کلیسا کے جو ارکان وحدتِ فطرتِ مسیحؑ کے قائل ہو کر کیتھولک کلیسا میں شامل ہوئے، انہیں کلدانیوں کا نام ملا۔ کلدانیوں کا پہلا اسقفِ اعظم دیار بکر کا اسقف تھا، جسے ۱۶۸۱ء میں تقدیس کا درجہ دیا گیا۔

اس کلیسا کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیحؑ میں بشری اور الوہی فطرت ایک ہو گئی تھی۔[۲] پھر یہ مریم عذرا کو معبود بنانے کا سخت مخالف تھا۔ اس میں زندگی کی زبردست روح تھی اور تبلیغ کے لیے بے انتہا جوش و خروش تھا۔ ان حالات میں ظہور اسلام کے وقت یہ کلیسا حضارتِ شام میں ایک زبردست قوت کا مالک تھا اور حضارتِ شام مشرق قریب کو مصر سے ایران تک متاثر کر چکی تھی۔ اس کلیسا کے افراد چوتھی صدی مسیحیؑ سے یونانی فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے اور ان کے ترجمے کر کر کے انہوں نے شام و عراق میں پھیلائے تھے۔ الرّہا سے اس کلیسا کا آغاز ہوا اور یہ پھیلتے پھیلتے مشرقی سمت میں ایران تک جا پہنچا، پانچویں صدی کے اختتام پر ساسانیوں کے دارالحکومت سلوکیہ ٹسی فون (مدائن) کے اسقف نے مشرقی کلیسا کی اسقفی عظمیٰ کا اعلان کر دیا۔

۷۶۲ء میں بغداد کی بنیاد رکھی گئی اور اسقفی عظمیٰ وہاں منتقل ہو گئی، جہاں اسے خلفاء کی سرپرستی حاصل رہی۔ اسلامی سلطنت میں بھی اس کلیسا کی تبلیغی سرگرمیاں بالکل بے مثال تھیں۔ مدفنوں اور دوسرے آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ سریانی کلیسا کی شاخیں مرو، ہرات، سمرقند اور وسطِ ایشیا کے دوسرے مقامات پر چھٹی صدی کے وسط میں قائم تھیں۔

۱۔ اس خط و کتابت کی نقلوں کے لیے ملاحظہ ہو سعید ابن بطریق کی کتاب: التاریخ المجموع علی التحقیق والتصدیق (مطبوعہ بیروت ص ۲۶۳-۲۶۴)۔

۲۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ مسیحؑ میں دونوں فطرتیں الگ الگ موجود تھیں، لیکن یہ مسیحی کہتے تھے کہ دونوں فطرتیں مل کر ایک ہو گئی تھیں۔

اس زمانے میں "مشرق کی اس پروٹسٹنٹزم" کے مبلغین جنوبی ہند میں بھی پہنچ گئے تھے، جہاں مسیحیت دو سو سال پیشتر جڑ پکڑ چکی تھی، پھر سریانی کلیسا کی شاخیں ہندوستان کے مغربی ساحل خصوصاً مليبار، نیز سیلون میں قائم ہو چکی تھیں۔ اس صنف کے مسیحیوں کو ہندوستان میں "سینٹ ٹامس کے مسیحی" کہتے تھے۔ کیونکہ جس داعی نے سب سے پہلے ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ کی، وہ بعض ناقابلِ اعتماد روایات کے مطابق سینٹ ٹامس تھا۔ بغداد اور دوسرے اسلامی شہروں سے مسیحیوں نے نکل نکل کر آٹھویں اور نویں صدی میں ہندوستان کے عیسائیوں کو تقویت پہنچائی، یہاں تک کہ ان کی شہرت دور دور پھیل گئی اور ایلفرڈ شاہِ انگلستان نے اس دور افتادہ ملک میں اپنی ایک سفارت بھیجی۔

لیکن سب سے بڑا تبلیغی کارنامہ مشرق بعید میں انجام پایا، ساتویں سے نویں صدی مسیحی تک، پھر بارھویں اور چودھویں صدی مسیحی میں سریانی راہب چین تک پہنچ گئے۔ مبلغوں کا جو گروہ پہلے گیا تھا، وہ ۶۳۵ء میں بمقام سیان فو اترا۔ اس زمانے میں اسلامی فوجیں ایران فتح کر رہی تھیں۔ یہاں پتھر کی ایک سل نصب کی گئی تھی، جس میں ۷۰ مسیحی مبلغوں کے نام اور ان کی عنایتیں اور شفقتیں سریانی اور چینی زبان میں کندہ کی گئی تھیں۔ یہ ۷ جنوری ۷۸۱ء کا واقعہ ہے اور یہ سل اب تک سیان فو میں موجود ہے[۱]۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک نسطوری خانقاہ نظر آتی ہے، جو آج کل تاؤ مذہب کا معبد ہے۔ سریانی کلیسا چین میں قریباً سات سو سال تک قائم رہا (۶۳۵ء تا ۱۳۶۷ء) پھر یہ اپنے مرکز سے منقطع ہو گیا۔ بڑھتے اسلام کی وجہ سے کمزور ہو رہا تھا اور شاخ کو مقامی عقیدے ہضم کر گئے مثلاً تاؤ مذہب یا اسلام کے پیرو وغیرہ۔ تاریخِ چین میں اب تک یہ "دینِ منیر" کی حیثیت میں زندہ ہے[۲]۔ اس کے حضارتی آثار اب تک ان سریانی حروف میں دیکھے جا سکتے ہیں جن میں منگولی اور مانچوئی زبانیں لکھی جاتی تھیں۔ ترکستان کی جلدبندی میں جو آرائش کی جاتی تھی، کہا جاتا تھا کہ قبطیوں ہی سے سریانی مسیحیوں تک پہنچیں[۳]۔

پہلی عالمی جنگ کے آغاز پر مشرقی سریانی کلیسا کی نمائندگی ایک لاکھ نوے ہزار افراد کر رہے تھے، جو ارومیہ، الموصل اور وسطی کردستان میں رہتے تھے[۴]۔ جو بچ رہے تھے، وہ عراق و شام میں منتقل ہو گئے۔ نسلی اعتبار سے وہ اشوری تھے تاہم یہ نام اس وقت غیر موزوں ہو جاتا ہے، جب بہت سے افراد کے طبعی خط و خال دیکھ لیے جائیں اور ان کا مقابلہ ان اشوریوں سے کیا جائے جن کی تصویریں یادگاروں پر موجود ہیں۔

مغربی سریانی کلیسا

سریانی کلیسا کی مغربی شاخ مسیحؑ کی بشریت والوہیت کے اتحاد کی قائل تھی۔ مریم عذرا کو ایک تقدس شخصیت تسلیم کرتی تھی، لیکن اس میں تبلیغی سرگرمی مقابلۃً بہت کم تھی۔ اس کے دینیات کی نوعیت واحدیت کی تھی۔ یہ لوگ مسیحؑ کی وحدت پر بہت زور دیتے تھے اور اس سلسلے میں انسانی عنصر کے حذف میں بھی انہیں تامل نہ تھا۔ شام میں معتقدین واحدیت کو حریف یونانیوں نے یعقوبی کہنا شروع

---

۱ P. Y. Saeki کی کتاب The Nestorian Documents and Relics in China ص ۳۵ - ۶۸

۲ ایضاً ص ۶۵۔

۳ محمد آغا وغلو کی کتاب Persian Bookbindings of the Fifteenth Century نسطوریوں کے متعلق مزید معلومات کے لیے دیکھیے ۱. انسٹی ٹیوٹ جلد ۳ حصہ دوم

۴ ا ے A. Yuhanan کی کتاب The Death of a Nation ص ۱۰۸۔

کر دیا تھا۔ یہ نام انہیں یعقوب برادریوس کی وجہ سے دیا گیا، جو چھٹی صدی کے وسط میں الرہا کا اسقف تھا[1] غسانیوں اور دوسرے شامی عربوں نے ظہورِ اسلام سے بیشتر یہی مذہب اختیار کر لیا۔ یعقوبی کلیسا کو شام میں اور نسطوری کلیسا کو ایران میں اقتدار حاصل تھا۔ سریانی دونوں کلیساؤں کی زبان رہی، لیکن خانقاہوں میں یونانی بھی سکھائی جاتی تھی۔ نسطوریوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یونانی افکار پہلے شام میں اور پھر مسلمانوں تک پہنچائیں۔ یعقوبیوں نے بھی اس کوشش کو تقویت پہنچائی۔ شمالی شام میں قنسرین ایک بڑا مرکز تھا جہاں سے واحدیت کا نظریہ اور یونانی علوم نشر کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں جن علوم کی نشو و نما ہوتی تھی اور جو پھیلائے جاتے ان سب کے مرکز و مرجع یعقوبی عالم تھے۔

اس معزز کلیسا کے کم و بیش دو لاکھ پیرو بیسویں صدی کے اوائل تک ماردین، دیار بکر اور آرمینیا کے نواح میں موجود تھے[2] پھر ان پر مصیبتیں نازل ہوئیں، جو باقی بچے انہوں نے شام و لبنان میں پناہ لی۔ ان کے اسقف اعظم کا مرکز حمص میں ہے۔ یہ یعقوبی کہلانے پر معترض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں قدیم سریانی مسیحی کہا جائے۔ ان میں سے جن لوگوں نے رومن کیتھولکوں کا مسلک اختیار کر لیا وہ شامی کیتھولک کلیسا کے رکن بن گئے[3]، جن کا مرکز لبنان میں ہے۔

شام کے یعقوبی کلیسا کے علاوہ واحدیت کے عقیدے کی دو مستقل شاخیں بھی ہیں، یعنی ارمنی کلیسا اور قبطی و حبشی کلیسا۔ شامی کلیسا نے مصریوں، حبشیوں اور ارمنیوں، تینوں کے کلیسا پر کامیابی حاصل کی۔ یہ شامی معاشرے اور حضارت کا ایک اور نمایاں کارنامہ تھا۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ اگرچہ مشرقی اور مغربی سریانی کلیساؤں کو یونانی علوم سے گہری دلچسپی رہی، مگر یہ دونوں دراصل بیزنطیم اور روما کے یونانیت افروز اثرات کے خلاف شامی معاشرے کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوئے تھے۔ بیزنطیم اور روما کے مسیحی دونوں ان کلیساؤں کو الحادی تحریکیں قرار دیتے تھے، لیکن دراصل یہ دونوں اجنبی مداخلت کے خلاف، نیز اس عملی ترکیب کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھیں، جس کی بنا پر شامی مذہب کو یونانی و رومی اجارہ بنایا جا رہا تھا۔ یہ دونوں کلیسا آج معدوم سریانی معاشرے کے متحجرات کی حیثیت میں زندہ ہیں[3]

مارونی

شام کے قدیم کلیسا کی ایک شاخ مارونی تھی، جس کی ابتدا اس کے سرپرست ولی مارون سے ہوئی[4] وہ ایک زاہد راہب تھا، جس کی زندگی کے زیادہ حالات معلوم نہیں وہ انطاکیہ اور قورس کے درمیان رہا اور وہیں وفات پائی۔ غالباً یہ وہی مارون ہے جسے جان "زرین دہن" نے جلاوطنی اختیار کرتے وقت ایک خط لکھا تھا اور اسے مارون راہب پادری کہہ کر خطاب کرتے ہوئے اس سے دعا کی التجا کی تھی، نیز اس کے حالات پوچھے تھے[5] روایت یہ ہے کہ وفات کے بعد مارون کے شاگرد اس کی نعش اٹھا کر

---

[1] السمعانی نے ببلیوتھیکا اورینٹلس جلد دوم کا بڑا حصہ عقیدہ واحدیت رکھنے والوں اور یعقوبیوں کے لیے وقف کیا ہے۔

[2] یوحنان ص ۹۔

[3] ٹمان بی جلد ۵ ص ۱۲۷

[4] مارو ایک سریانی لفظ ہے، جس کے معنی چھوٹے سردار کے ہیں۔

[5] عربی ترجمے کے لیے دیکھیے دویہی کی کتاب تاریخ الطائفۃ المارونیہ ص ۱۹، ۲۰۔

افامیہ کے قریب ایک مقام پر بس گئے، جو دریائے عاصی پر واقع ہے اور وہاں اس کی یادگار میں ایک خانقاہ بنادی۔ پھر یعقوبیوں سے جھگڑا ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس خانقاہ میں ساڑھے تین سو راہب قتل کر ڈالے گئے، جن کی یاد مارونی اب تک مناتے ہیں، لبنان انہیں بہتر پناہ گاہ نظر آیا۔ چنانچہ نئے فرقے نے شمالی لبنان میں قدم جمالیے۔ وہاں مردائیوں سے امتزاج کی شکل نکل آئی، وہ بھی شمالی جانب سے آئے تھے۔

مارون تو نئے فرقے کا بانی تھا، یوحنا مارون نئی قوم کا بانی اور ہیرو بن گیا (وفات ۷۰۷ء) غالباً یہی مارون ہے، جس سے پورے فرقے نے نام پایا۔ وہ سردم میں پیدا ہوا، جو انطاکیہ کے قریب ہے۔ سریانی اور یونانی کی تعلیم انطاکیہ میں پائی پھر دریائے عاصی پر مارونی خانقاہ میں چلا گیا۔ اس نے قسطنطنیہ پہنچ کر بھی تعلیم جاری رکھی، پھر اسے بطرون (لبنان) کا اسقف بنادیا گیا۔ اس کا مرکز پہلے سمار جبیل میں رہا، پھر کفرحی میں منتقل ہوگیا، جہاں اس نے ایک خانقاہ بنائی اور وہیں وہ مدفون ہے۔ اس کی سرپرستی میں مارونی قوم اپنے دائرے کے اندر خودمختار بن گئی۔ اس نے ایک طرف خلیفۂ اسلام کو اور دوسری طرف شہنشاہ روم کو مداخلت سے دور رکھا۔ ۶۹۴ء میں جسٹینین ثانی نے مارونیوں کو مسخر کرنا چاہا۔ اس کی فوجوں نے وہ خانقاہ مسمار کردی، جو دریائے عاصی کے کنارے تعمیر کی گئی تھی۔ مگر یوحنا نے بمقام امیون[1] اسے شکست فاش دی۔ اس وقت مارونی الگ تھلگ سے ہوگئے اور انہوں نے انفرادیت کے وہ خصائص پیدا کرلیے، جو پہاڑی گروہوں میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ وقت تک مارونیوں کا اسقف اعظم قنوبین[2] میں رہا جو لبنان کے دشوار گزار پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بنایا گیا ہے، پھر وہ بکرکی میں منتقل ہوگیا، جو بیروت کے قریب ہے۔

ساتویں صدی کے وسط میں جو مارونی قائد تھے وہ شہنشاہ ہرقل کے دوست تھے اور پورے فرقے کو اس امر کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ شہنشاہ کے عقیدۂ واحدیت کے حامی تھے۔ سعید ابن بطریق ان لوگوں میں سے تھا، جنہوں نے اسی باب میں سلطنت کی تھی[3]۔ اس کے مسلم معاصر مسعودی کا نظریہ بھی یہی تھا[4]۔ سعید کے بعد ولیم[5] ساکن صور آتا ہے، جو صلیبیوں کا وقائع نگار تھا۔ وہ لکھتا ہے مارون اور اس کے پیروؤں کا الحاد یہ تھا کہ ہمارے خداوند یسوع مسیح میں ابتدا ہی سے ایک شیئت اور ایک فطرت تھی۔ ولیم نے ان لوگوں کی تعداد چالیس ہزار بتائی ہے، ساتھ ہی بتایا ہے کہ ۱۱۸۰ء میں انہوں نے الحاد سے دست برداری اختیار کرلی اور وہ کیتھولک کلیسا میں شامل ہوگئے[6]، لیکن خود مارونیوں میں سے ابن الدویہی (وفات ۱۷۰۴ء) اور ابن نمرون[7] (وفات ۱۷۱۱ء) کا دعویٰ یہ ہے کہ اپنے کلیسا سے وابستگی میں مارونیوں کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ موجودہ دور کے

---

[1] مزید معلومات کے لیے دیکھیے السمعانی جلد اول ص ۴۹۶، ۵۲۰۔

[2] سریانی لفظ ہے جو یونانی سے بنایا گیا ہے، جس کے معنی خانقاہ کے ہیں یہاں چند یونانی جغرافیائی نام ہیں سے ہے، اب تک لبنان میں باقی ہیں۔

[3] ابن بطریق ص ۱۲۔

[4] مسعودی کتاب التنبیہ ص ۱۵۴۔

[5] دیکھیے اس کی کتاب "تاریخ" مترجمہ ایملی اے بیکاک (Babcock)، جلد ۲ ص ۴۵۹۔

[6] ایضاً ص ۲۵۲

[7] فاسٹو نیرونی

ایک مارونی مصنف نے بتایا ہے کہ ایک اور مارون تھا، جو الرہا کا باشندہ تھا اور وہ عقیدۂ واحدیت کا پابند تھا، سنہ ۵۸۰ء کے قریب فوت ہوا۔ لوگ اس کے پیرووں کو لبنانی مارونیوں سے خلط ملط کرتے رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مارونیوں نے رومہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، لیکن اٹھارھویں صدی تک اتحاد عمل میں نہ آسکا۔ ان کا کلیسا جسے لبنان کا قومی کلیسا کہا جاسکتا ہے، اب تک سریانی عبادات اور پادریوں کی شادی کا قائل چلا آتا ہے۔ رومہ اب تک اس کلیسا کے مشہور بانیوں سے کسی کو اپنے مقدس آدمیوں کی فہرست میں شامل نہیں کر سکا۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی مردم شماری کے مطابق لبنان میں مارونیوں کی تعداد تین لاکھ اٹھارہ ہزار دو سو گیارہ تھی اور جمہوریۂ لبنان کے ہر مذہبی گروہ سے یہ تعداد زیادہ تھی۔ حال میں جو مارونی وطن چھوڑ کر نکلے، وہ اٹلی فرانس، شمالی و جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور مہذب دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنے رسوم ساتھ لے گئے۔[1]

ملکانی

مشرقی اور مغربی سریانی کلیساؤں کی بہت سی شاخیں تھیں۔ مگر یہ تمام سریانی مسیحیوں کو اپنے اندر شامل نہ کر سکے۔ ایک چھوٹی سی جماعت باہر رہ گئی، جس نے انطاکیہ اور قسطنطنیہ سے یونانی اثر قبول کر لیا تھا اور مجلس کالسیڈون (سنہ ۴۵۱ء) کے فیصلے منظور کر لیے تھے: نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت کو راسخ العقیدہ مان لیا گیا۔ رومہ نے، نیز سرکاری کلیسا نے اس گروہ کے لیے نہ صرف حفاظت کا انتظام کیا، بلکہ اس کی سرپرستی بھی کی۔ اس گروہ کے مخالفین صدیوں تک طنزاً انہیں شاہ پسند ملکانی کہتے رہے، اس گروہ کے زیادہ تر افراد یا تو شہروں کے باشندے تھے یا یونانی آبادکاروں کی اولاد تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے اپنی مذہبی عبادت میں سریانی کی جگہ یونانی زبان اختیار کر لی اور دعاؤں میں سریانی کے بجائے بیزنطینی طریقہ قبول کر لیا۔ یورپی اور مشرقی کتب خانوں میں سینکڑوں مخطوطات موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے آخر تک یونانی زبان کی فتح مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ملکانیوں کو حکمرانوں کی حمایت حاصل تھی تاہم وہ مقابلتہً کمزور رہے اور ان کی آبادیاں صرف شمالی شام، فلسطین اور مصر تک محدود رہ گئیں۔ ان کے سریانی اخلاف نے ایک اسقفِ اعظم دمشق میں مقرر کر رکھا ہے اور دوسرا یروشلم میں۔ اب وہ راسخ العقیدہ یونانی کلیسا کے ارکان سمجھے جاتے ہیں۔

عجیب امر یہ ہے کہ کچھ مدت سے ملکانیوں کی اصطلاح صرف ان مسیحیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو راسخ العقیدہ کلیسا سے تھے اور انہوں نے رومہ سے وابستگی پیدا کر لی تھی، لیکن خود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ پرانے زمانے سے رومن کیتھولک کلیسا کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں اور اس وابستگی میں کبھی خلل پیدا نہیں ہوا۔ یہ حالت موجودہ ان کی تعداد راسخ العقیدہ مسیحیوں سے نصف ہے اور راسخ العقیدہ تقریباً دو لاکھ تیس ہزار ہیں۔ ان کا ایک اسقف مصر میں رہتا ہے، دوسرا لبنان میں یونانی کیتھولکوں اور یونانی راسخ العقیدہ مسیحیوں کی اکثریت لبنان میں نہیں، شام میں رہتی ہے۔[2]

اسلامی اثرات

سریانی مسیحیوں کے نزدیک نو مولود اسلام کا مُلّا اجنبی اور غیر ملکی نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے نیا مذہب نہیں سمجھتے تھے۔

---

[1] ابرام الدیرانی کی کتاب "محاماق عن اموارنہ وقدیسیہم"

[2] اسحٰق ارملہ کی کتاب الملکیون و بطریرکیتم الانطاکیہ ص ۱۰۲، ۱۰۴، حبیب زیاتہ کا مقالہ مجلّہ المشرق میں، جلد ۳۷، ص ۱۷۴۔

یہی خیال ہوگا کہ یہودیت و مسیحیت کا کوئی نیا فرقہ ہے۔ عمومی نقطۂ نگاہ سے اسلام اور مسیحیت کے درمیان مخالفت نظریاتی نہ تھی، صرف رقیبانہ تھی۔ تسخیر شام کے فوراً بعد مشرقی کلیسا کا ایک بطریق نئے آقاؤں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"آپ کو معلوم ہے کہ عرب جنہیں خدا نے دنیا پر حکمرانی کا منصب عطا کیا ہے، اب ہمارے درمیان آ گئے ہیں، لیکن وہ مسیحیت کے دشمن نہیں، اس کے برعکس وہ ہمارے مذہب کی ستائش کرتے ہیں ہمارے پادریوں اور خداوند کے پیاروں کے ساتھ احترام سے پیش آتے ہیں، کلیساؤں اور خانقاہوں سے حسن سلوک کرتے ہیں"[1]

بعض مستشرقین اس حد تک چلے گئے ہیں کہ وہ مختلف حیثیتوں میں اسلام کو سریانی مسیحیت کا ایک وارث قرار دیتے ہیں۔ جان (یوحنا) دمشقی، رسول اللہ صلعم کو نئے مذہب کا بانی نہیں مانتا تھا، سمجھتا تھا کہ اسلام اریانوسیت ہی کی کوئی شکل ہے جس میں مسیح کی الوہیت ترک کر دی گئی ہے وہ اپنے مسلمان حریف کو بتاتا ہے کہ تم ہمیں مشرک قرار دیتے ہو، ہم کہتے ہیں کہ تم نے مذہب کا مثلہ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی پوچھتا ہے، تم مسیحیوں پر صلیب کے سامنے جھکنے کا الزام لگاتے ہو، حالانکہ تم خود حجر اسود کے سامنے جھکتے ہو[2]۔ اس متکبرانہ روش کی وجہ صرف یہ تھی کہ کاہن اجنبی زبان میں لکھ رہا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے لیو ایسوری کے نام ایک مذہبی خط بھیجا اور سمجھ لیا کہ اس خط سے اسے قبول اسلام پر آمادہ کر لیا جائے گا۔ شہنشاہ نے جواب میں مختلف حصوں کا رد کیا۔[3] توحید باری تعالیٰ اور عقیدۂ یوم حساب، قرآن الحاقی اناجیل اور رہبانی تصانیف[4] کے موضوع تھے۔ سینٹ فرائیم (وفات ۳۷۳ء) سریانی کلیسا کی دونوں شاخوں کے نزدیک اس وجہ سے محترم تھا کہ وہ سب سے بڑا واعظ تھا، وہ جنت کی نعمتوں کا نقشہ مادی رنگ میں یوں کھینچتا ہے:

"میں نے اہلِ انصاف کے مقامات دیکھے اور خود اہلِ انصاف کو دیکھا ان کے جسموں پر ایسی چیزیں لگی ہوئی تھیں، جن سے نہایت خوشگوار خوشبوئیں اٹھتی تھیں۔ انہوں نے پھولوں کے ہار پہن رکھے تھے اور کھانے کے لیے ان کے سامنے پھل تھے ...... جب اہلِ عدل تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں تو درخت ان پر سایہ کرنے کے لیے جھک آتے ہیں۔ ان کے نیچے

---

[1] Iso'yahb III, "Liber epistularum", in Scriptores Syri

[2] (مترجم۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض سراسر بے خبری پر مبنی ہے۔ کوئی مسلمان حجر اسود کے سامنے نہیں جھکتا۔ وہ کعبۂ مکرمہ کے طواف کے لیے ایک چکر کے آغاز و انجام کا نشان ہے۔ مسلمان طواف شروع کرتے ہیں تو جو پاس ہوتے ہیں وہ اسے ہاتھ لگا لیتے ہیں یا بوسہ دے لیتے ہیں، جو دور ہوتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ کر کے طواف شروع کر دیتے ہیں)

[3] تھیو فینز کرونوگریفیا ص ۳۹۹، محبوب الکتاب العنوان۔ [4] ملاحظہ ہو ولیم رائٹ کی کتاب Apocryphal Acts of the Apostles

پھول کھلتے ہیں، اور پھل لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔ تیز ہوائیں بابرکت آدمیوں کے پاس ٹھہری رہتی ہیں، تاکہ ان کا حکم بجا لائیں۔ ایک ہوا چلتی ہے تو اطمینان و سکون پیدا ہوتا ہے، دوسری ہوا چلتی ہے تو بارانی بہنے لگتا ہے۔ ایک ہوا تیل سے بھری آتی ہے، دوسری خوشبوؤں سے۔۔۔۔۔ جس شخص نے زمین پر شراب پینے سے احتراز کیا، اسے بہشت کی انگوری بیلیں انتہائی شوق سے تکتی ہیں۔ ہر درخت اسے انگوروں کا ایک خوشہ پیش کرتا ہے جس شخص نے عفت میں زندگی بسر کی، اس کے استقبال کے لیے طاہر و پاک دامن عورتیں موجود ہیں۔"

پھر دونوں مذہبوں میں فرضوں اور نفلوں کے درمیان یکساں تفریق ملحوظ رکھی گئی ہے۔ شعائر اور تنظیم میں بھی خاصی مشابہت ہے۔ سریانی کلیسا نے دن کے وقت تین نمازیں قانوناً مستحکم رکھی تھیں اور دو رات کے وقت۔ اسلام میں پانچ نمازیں اس کے بعد فرض ہوئیں۔ قرآن مجید میں (سورۂ مزمل) شب کے قیام کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ خانقاہیں پہلے سے اس پر عمل پیرا تھیں اور راہبوں کے نزدیک تقویٰ اسی کا نام ہے۔ راہب نماز کے اوقات میں مقررہ جسمانی حرکات کی پابندی کرتے تھے مثلاً گھٹنوں کے بل کھڑے ہونا اور پیشانی زمین پر رکھنا۔ راہب جتنی دفعہ سجدہ کرتے اور پیشانی زمین پر رکھتے تھے، ان کے بال آگے آگرتے تھے۔ اسلام سے پیشتر کی ایک نظم میں ایک راہب کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ زمین پر پیشانی رکھتے رکھتے گٹا پڑ گیا تھا، جو بکری کے گھٹنے سے مشابہ تھا۔[1]

جو مسیحی مسلمان ہوئے، وہ طبعاً اپنے ساتھ افکار و اعمال بھی لے گئے، جن میں سے بعض مختلف فرقوں یا علیحدہ گروہوں میں مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلاف اس وجہ سے بھی گھٹ گیا کہ احادیث کے ابتدائی راویوں نے بانیِ مسیحیت کی زندگی سے بعض واقعات لے لیے اور انہیں بانیٔ اسلام سے منسوب کر دیا، مثلاً یہ قول کہ قابلِ تعریف ہے وہ شخص جو خفیہ خیرات دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو داہنا ہاتھ کرتا ہے اور فرمایا: خدا کہتا ہے، میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز تیار کر رکھی ہے، جو آنکھ نے نہیں دیکھی، کان نے نہیں سنی اور کسی انسان کے خیال میں نہیں آئی۔[2] علاوہ بریں مسیحی راہبوں کے تقدس نے ادارۂ تصوف کے ذریعے سے قلبِ اسلام کی طرف ایک اور راستہ پیدا کر لیا۔

---

[1] شیخو کی کتاب النصرانیہ و آداب ص ۱۷۸۔

[2] (مترجم) کچھ معلوم نہیں کہ مصنف اس قسم کے اتہامات کیوں کرتا ہے ہمارے نزدیک تمام انبیاءؑ واجب الاحترام اور ان کی تعلیمات خاص قدر و منزلت کی مستحق ہیں وہ سب خدا کی طرف سے آئے تھے، محض چند احکام یا ارشادات ہی نہیں، بنیادی طور پر سب کی تعلیم ایک تھی، اسلام سب کے بعد آیا اور سب کا جامع تھا، اگر بعض احادیث میں ویسے الفاظ آئے جیسے مثلاً متی کی انجیل (باب ۶ آیت ۳، ۴، یا کرنتھیوں (باب ۲، آیت ۹) میں آچکے ہیں تو ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے سوا اس کے کہ اچھی باتیں جو پہلے فرمائی گئی تھیں دہرا دی گئیں لیکن اس سے اسلام کی خاتمیت اور جامعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ صرف ان چند ارشادات پر مبنی نہیں۔ اگر مسیحیوں نے صرف اس وجہ سے اسلام قبول کر لیا کہ انہیں چند متعارف اصطلاحات نظر آگئیں تو کروڑوں ایرانیوں، ہندوستانیوں، ترکستانیوں، افریقیوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جو ان سے بالکل ناواقف تھے۔

مستعار الفاظ

سریانی زبان بولنے والے مسیحیوں نے اسلامی ذخیرۂ الفاظ میں بہت سے کلیدی الفاظ فوراً پہچان لیے، مثلاً عربی لفظ فرقان (سورۂ انفال آیت ۲۹، ۴۱)، آیہ (بقرہ ۳۷، آل عمران ۹) کاہن (سورۂ طور ۲۹، الحاقہ ۴۲) سجود (سورۂ بقرہ ۱۹، القلم ۴۲، ۴۳) سفر (سورۂ جمعہ ۵) قسیس (سورہ مائدہ ۸۵) صلاح (بقرہ ۲۰۴، نور ۵) زکوٰۃ (بقرہ ۴۰، ۷۷، ۱۰۴) اور ایسے بہت سے الفاظ جو سریانی یا آرامی سے مستعار لیے گئے۔ کلیسا کی بہت سی دوسری اصطلاحات بھی سریانی سے لے کر عربی بنائی گئیں جیسے اشبین، برشان، تلمیذ، شماس، عماد، کنسیہ، کاروز، ناقوس۔ یونانی کے الفاظ اگرچہ زیادہ نہیں لیے گئے تھے، تاہم وہ بھی ملاحظہ فرمائیے ملقس، کنذلفت، انجیل، اسقف، شدیاق، ابرشیہ، زنار۔ متعدد یونانی الفاظ جو کہ سریانی کے ذریعے سے عربی میں پہنچ گئے، مثلاً خوری بطریرق، اکیم، ہرطوقی — ایک لحاظ سے سریانی نے عربی کی نمایاں خدمت انجام دی، یعنی اس کے لیے وہ حروف مہیا کیے، جو نبطی سے لیے گئے تھے۔ اور نبطی سریانی کی بہن تھی۔

عربی تحریر میں ابتداءً نقطے نہیں لگائے گئے تھے، جن کی بنا پر ہم شکل حروف میں تمیز ہو سکتی، نیز حرکات کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تمام حروف صامت تھے۔ پہلی صدی ہجری میں نقطے لگانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ غالباً نبطیوں ہی سے لیے گئے تھے، نیز حرکات کا بندوبست ہو گیا۔ کسی حرف کے اوپر ایک نشان لگایا جاتا تو زبر کی آواز پیدا ہوتی، نیچے لگایا جاتا تو زیر کی آواز نکلتی۔ مشرقی سریانی بہت پہلے سے ایسا ہی کر رہے تھے۔ اسی صدی کے آخر میں نقطوں کو پھیلا دیا گیا اور زبر، زیر، پیش وجود میں آ گئے۔ یہ اصطلاحات روایات کے رُو سے حجاج کے ساتھ منسوب ہیں۔ عبرانی زبان میں بھی یہی سریانی طریقے اختیار کیے گئے، یہودیوں نے ۸۰۰ء کے قریب مستعار لیے تھے۔

چالیسواں باب

سلطنتِ اُمویہ کا سقوط

امویوں کا دورِ اوج و عروج ولید کے عہدِ حکومت پر ختم ہو گیا (۷۰۵ء۔۷۱۵ء) ولید کے بعد صرف دو ممتاز حکمران ہوئے اوّل عمر بن عبدالعزیزؒ، دوم ہشام۔

عبادت گزار خلیفہ

عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷ء۔۷۲۰ء) اس حکومت میں جسے بالعموم دنیوی سمجھا جاتا تھا، تنہا پرہیزگار خلیفہ تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ اپنے نانا اور ہمنام (خلیفۂ ثانیؓ) کے نقشِ قدم پر چلیں۔ سیرت نگاروں نے ان کی عبادت گزاری، کفایت شعاری اور سادگی پر بہت زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ موصوف پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ عام آدمیوں میں گھل مل کر رہتے تھے اور کوئی شخص درخواست لے کر آتا تھا تو خلیفہ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔[1] ان کے عہدِ حکومت میں علمائے دین کو اقتدار حاصل رہا۔ اسلامی تاریخ میں ان کے تقدس کو خاص شہرت حاصل ہے۔ معاویہؓ نے یہ طریقہ شروع کرایا تھا کہ جمعہ کے خطبے میں علیؓ کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے ختم کرا دیا۔ مالی اصلاحات بھی کیں جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں لیکن ان کی وجہ سے عرب اور غیر عرب مسلمانوں کے درمیان مساوات کو خاصی تقویت پہنچی اور انجام کار فاتحین اور مفتوحین کی اولاد بالکل متحد ہو گئی۔[2]

آخری قابل خلیفہ

ہشام (۷۲۴ء۔۷۴۳ء) کو عرب مورخین بجا طور پر اموی خاندان کا آخری بڑا مدبر مانتے ہیں۔[3] اس کے چار جانشین اگر آوارہ مزاج اور بدروش نہ تھے تو نالائق ضرور تھے۔ جب اس کا بیٹا معاویہ، جو ہسپانوی امویوں کا مورثِ اعلیٰ تھا، شکار کھیلتا ہوا جاں بحق ہو گیا تو والد نے کہا "میں نے اسے خلیفہ بنانے کے لیے پرورش کیا تھا لیکن وہ لومڑیوں کا تعاقب کرتا رہا۔"[4] اس کے عاملِ عراق نے ایک کروڑ تیس لاکھ کی رقم خورد برد کر لی اور سرکاری مالیے کی اس سے کہیں زیادہ رقم برباد کر ڈالی۔ ہشام نے اسے پکڑوا بلایا اور رقم ادا کرنے پر مجبور کیا۔[5]

---

[1] ابن طقطقی ص ۱۷۳، ۱۷۷، نیز ۱۲۵ سے آگے۔

[2] فخری ص ۱۷۶۔

[3] مسعودی جلد ۵ ص ۴۷۹، یعقوبی جلد ۲ ص ۳۹۳، ابن قتیبہ، معارف ص ۱۸۵۔

[4] طبری جلد ۲ ص ۱۷۳۸، ۱۷۳۹۔

[5] طبری جلد ۲ ص ۱۶۴۲، یعقوبی جلد ۲ ص ۳۸۷۔

یہ مقدمہ بہت سے مقدمات میں سے ایک تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظم ونسق میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ خواجہ سراؤں کا نظام قسطنطنیہ اور ایران کی میراث تھا، اب بہت پھیل گیا تھا اور اس سے ادارۂ حرم کی نشوونما میں سہولت پیدا ہو گئی۔ دولت کی بہتات کے ساتھ غلاموں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ عیش وعشرت کے عادی ہو گئے۔ اخلاقی خرابیاں صرف امراء کے طبقے تک محدود نہ تھیں، بلکہ تہذیبی خرابیاں، جن میں شراب، عورتیں اور راگ رنگ بھی شامل تھے، صحرانشینوں پر بھی مسلط ہو گئی تھیں اور ان کا خونِ حیات چوس رہی تھیں۔

چار نااہل خلفاء

ہشام کے بعد ولید ثانی تخت نشین ہوا۔ وہ جسمانی اعتبار سے مضبوط اور خوبصورت آدمی تھا، لیکن اسے امورِ سلطنت کے بجائے موسیقی اور شاعری میں کمال حاصل تھا۔[۱] وہ صحرا میں رنگ رلیاں مناتا ہوا مسند نشینی کے لیے دارالحکومت میں آیا، پھر واپس چلا گیا۔ اس نے صحرا میں جو محل جابجا بنائے، ان کے کھنڈرات تک موجود ہیں۔ لیکن اس کی زیادہ بڑی غلطی یہ تھی کہ ام ولد کے بطن سے دو نابالغ بیٹوں کو ولی عہدی کے لیے نامزد کر دیا، پھر یمنی فریق میں اجنبیت پیدا کر دی، حالانکہ وہی شامی عربوں میں سب سے زیادہ تھے۔ معاویہؓ نے خلافت میں میراث کا اصول جاری کر دیا تھا۔ یہ دیرینہ قبائلی اصول سے متصادم تھا کہ عمر میں سب سے بڑا شخص جانشینی حاصل کرے۔ جب مروان نے اپنے دو بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے نامزد کر دیا۔[۲] تو معاملہ اور بھی الجھ گیا۔ کسی واضح اور مسلمہ اصول جانشینی کا نہ ہونا استحکام وتسلسل کے لیے ساز گار نہ تھا۔ باقی رہا یمنی فریق، تو شام کا تخت صرف اس فریق کے کندھوں پر ٹھہرا ہوا تھا۔ قیسیوں (شمالی عربوں) سے ان کی دشمنی بہت گہری تھی اور یہ زمانۂ حال تک جاری رہی۔ ولید کے چچیرے بھائی یزید کی سرگرمی میں ایک سازش کی گٹھ جوڑ ہوئی۔ یمنی باغیوں کو خلیفہ کے پیچھے بھیج دیا گیا اور خلیفہ تدمر کے جنوب میں قتل ہو گیا۔[۳]

یزید ثالث (۷۴۴ء) کے عہدِ حکومت میں صوبوں کے اندر فسادات شروع ہو گئے۔ یہ پہلا خلیفہ تھا، جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا۔[۴] اس کا بھائی اور جانشین ابراہیم صرف دو مہینے حکومت کر سکا، پھر اپنے دور کے رشتہ دار مروان ثانی (۷۴۴ء) کے حق میں دست بردار ہو گیا، وہ بھی اپنے دو پیشروؤں کی طرح ایک لونڈی ہی کے بطن سے تھا۔[۵]

جب مروان مسند نشین ہوا تو بدنظمی پوری سلطنت میں پھیل چکی تھی۔ شام میں ایک اموی سلطنت کا مدعی بن گیا۔ ایک خارجی نے عراق میں بغاوت کر دی۔ خراسان کے زعماء نے خلیفہ کا اقتدار ماننے سے انکار کر دیا۔ مروان مرکزِ حکومت کو اٹھا کر حران لے گیا جہاں قیسیوں پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا اور وہ خلیفہ کے دونوں سخت دشمنوں یعنی علویوں اور

۱۔ اغانی جلد ۶ ص ۱۰۱۔

۲۔ یعقوبی جلد ۲ ص ۳۰۶

۳۔ یعقوبی جلد ۲ ص ۴۰۰، فخری ص ۱۸۲۔

۴۔ طبری جلد ۲ ص ۱۸۷۴، مسعودی جلد ۶ ص ۳۱، ۳۲۔

۵۔ یعقوبی جلد ۲ ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ مسعودی جلد ۶ ص ۴۰۔

عباسیوں کا مؤثر مقابلہ کر سکتے تھے۔

علوی اور عباسی

شیعوں کے نزدیک اموی خدا ناترس غاصب تھے، جنہوں نے علیؓ اور ان کے اخلاف کے خلاف ناقابلِ معافی اور ناقابلِ فراموش جرم کیا تھا، اہلِ بیت سے شیعوں کی مستقل عقیدت عام مسلمانوں کی دلچسپی اور ہمدردی کا مرکز بن گئی۔ رفتہ رفتہ یہ گروہ اقتصادی سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے غیر مطمئن لوگوں کا نقطۂ رجوع بن گیا۔ چونکہ علیؓ نے کوفہ کو مرکزِ خلافت بنا لیا تھا۔ اس لیے عراق ہی طبعاً علویوں کا مستحکم مقام بنا رہا۔ عراقیوں کے لیے شامیوں کے خلاف عداوت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے مرکزِ حکومت چھین لیا تھا۔ متقی سنی بھی نکتہ چین گروہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے امویوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ دنیاداری اور دنیا پرستی میں لگ گئے ہیں اور قرآنی احکام سے تغافل اختیار کر لیا ہے۔

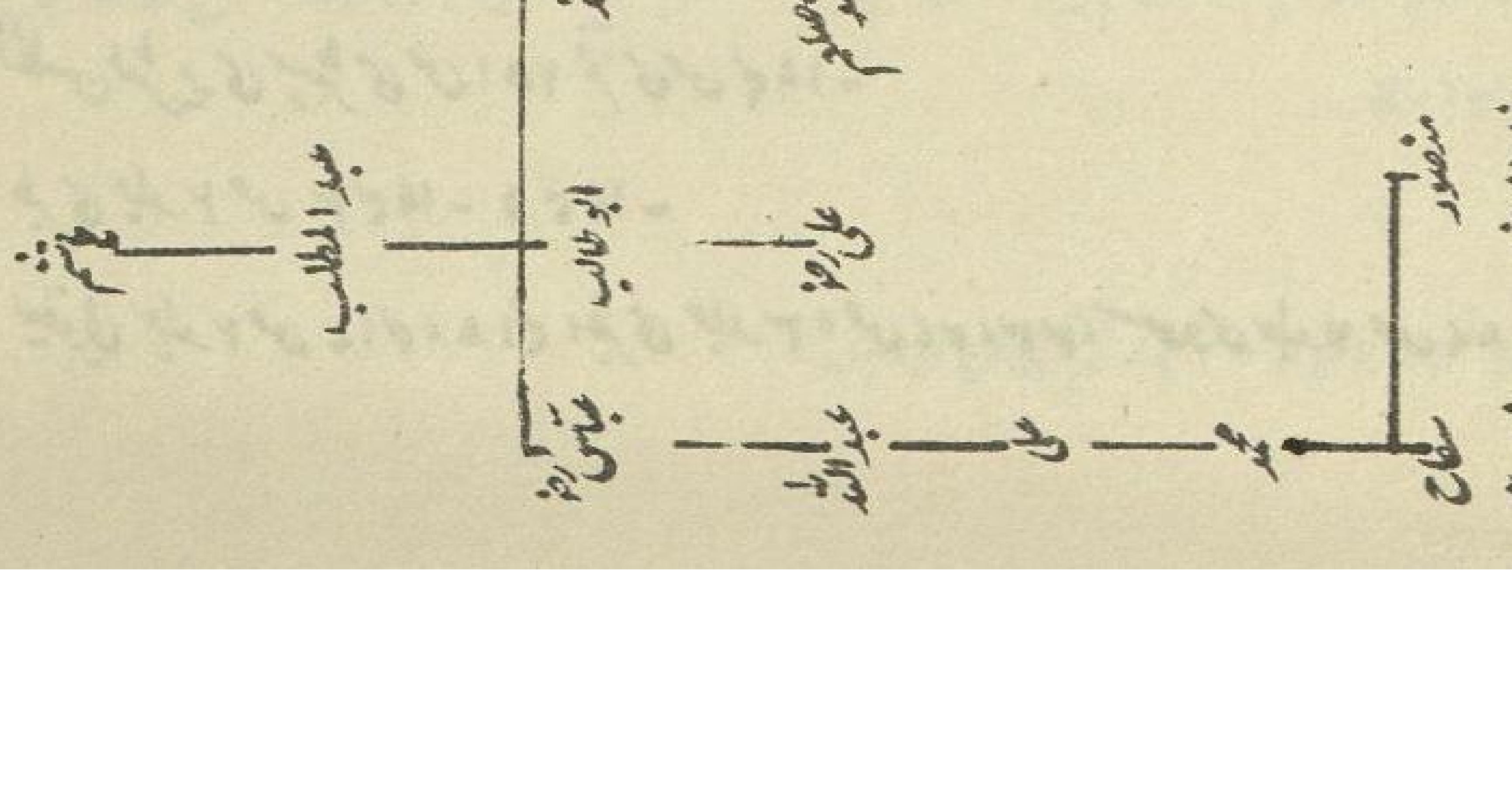
شیعوں کی طرح عباسیوں نے بھی عام بدنظمی سے فائدہ اٹھایا اور سلطنت کے مدعی بن گئے۔ ان کے دعوے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلعم کے ایک چچا کی اولاد ہیں اور بنوامیہ کے مقابلے میں خلافت کے زیادہ حق دار ہیں[1]

خراسانی

اس صورتِ حال میں ایک اور عامل شامل ہو گیا اور وہ یہ کہ غیر عرب مسلمانوں میں عموماً اور ایرانیوں میں خصوصاً عربوں کے طرزِ سلوک سے بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی اصول کے مطابق مساوات کے بجائے نومسلموں کو موالی کا درجہ دے دیا گیا۔ بعض حالات میں انہیں جزیے سے بھی مستثنیٰ نہ کیا گیا جو ذمی ہونے کی صورت میں وہ ادا کرتے تھے۔ یہ غیظ و غضب ایرانیوں میں کمال پر پہنچ گیا، جن کی قدیم اور معزز تہذیب کا اعتراف خود عرب بھی کرتے تھے۔ خراسان کی سرزمین، جو جنوب مشرق میں واقع تھی، شیعوں اور عباسیوں کے لیے عداوت کا بیج بونے کی غرض سے خاص طور پر سازگار ثابت ہوئی۔ شیعوں کے عقیدے نے خراسانیوں کے سازِ قلب کے تار ہلا دیئے۔ بغرض قدیم ایرانیت شیعی اسلام کے لباس میں پھر سے اقتدار حاصل کرنے میں کوشاں ہو گئی۔

صرف ایک عنصر غائب تھا، یعنی قیادت، ایسی قیادت، جو شیعوں، عباسیوں، ایرانیوں اور امویوں کی مخالف دوسری قوتوں کو متحد کر دیتی اور یہ تمام گروہ مشترکہ دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے نکل پڑتے۔ یہ قیادت ابوالعباس عبداللہ نے بہم پہنچا دی، جو عباسؓ (عمِ رسول اللہ صلعم) کا پڑپوتا تھا۔ اس نے امویوں کی مخالف پوری مشنری اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ کامیابی زیادہ تر پراپگنڈے کے ہنرمندانہ استعمال کا نتیجہ تھی۔ عباسیوں نے صدر مقام چھوٹے سے اور الگ تھلگ گاؤں میں رکھا جو بحیرۂ لوط کے جنوب میں واقع تھا۔ حمیمہ اس کا نام تھا۔ بہ ظاہر اس مقام کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، لیکن دراصل دنیا کے تمام حصوں سے تاجروں، سیاحوں اور زائروں کے قافلے یہاں آتے جاتے تھے۔ اسی مقام پر داعیوں کو پروپگنڈے کی تمام ضروری باتیں سکھا دی جاتی تھیں اور خفیہ خفیہ مختلف مقامات پر بھیج دیا جاتا

[1] شجرہ مندرجہ ذیل ہے



تھا جیسے ہی میں سیاسی اسلام کا سب سے پر پیچ اسب سے پہلا عوامی پروپیگنڈا کیا گیا۔ فاطمیوں کے ظہور تک اس جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

بغاوت کا آغاز

جون ۷۴۷ء میں خراسان کے اندر بغاوت شروع ہو گئی۔ اس تحریک کی سرکردگی عباسیوں کے داعی ابومسلم خراسانی کو حاصل تھی جو خود ایک مجہول الاصل مولیٰ تھا[1]۔ اس کے علم کا پرچم سیاہ تھا، اس کے لباس کا رنگ بھی سیاہ تھا یہ رنگ اس نے ماتمی کی حیثیت میں اختیار کیا تھا، کیونکہ خاندانِ علیؓ کے افراد خراسان میں شہید ہوئے تھے۔ یہی رنگ نئے خاندان کا امتیازی رنگ بن گیا۔ ابومسلم نے یمنی عربوں (قبیلہ ازد) اور ایرانی دہقانوں کی فوج تیار کی اور فاتحانہ خراسان کے دارالحکومت مرو میں داخل ہو گیا۔ خراسان کے اموی گورنر نصر بن سیار نے بار بار مروان سے التجائیں کیں اور سر پر منڈلانے والے خطرے سے اسے آگاہ کیا[2]۔ بلکہ شعر بھی لکھ کر بھیجے۔

مجھے راکھ کے نیچے کوئلے دہکتے نظر آتے ہیں۔
قریب ہے کہ وہ بھڑک اٹھیں
دو لکڑیوں کے باہم رگڑنے جانے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ لڑائی کا آغاز درشت کلامی سے ہوتا ہے۔
میں حیران و متعجب ہو کر پوچھتا ہوں۔
کہ اموی جاگ رہے ہیں یا سو گئے ہیں[3]؟

لیکن خلیفہ کو قریب کی پریشانیوں نے الجھا رکھا تھا۔ کیونکہ یمنیوں کی پیدا کی ہوئی بغاوت کے شعلے فلسطین سے حمص تک پہنچ گئے تھے۔ عراق میں خارجیوں نے از سر نو اقدام شروع کر دیا تھا[4]۔ شخصی طور پر مروان معمولی سپاہی نہ تھا۔ میدان جنگ میں استقلال کی بنا پر اسے حمار کا لقب ملا تھا جو اس زمانے میں برا لقب نہ تھا۔ ابتدا سے صفیں باندھ کر جنگ کی جاتی تھی، اس نے یہ طریق ترک کر کے چھوٹے چھوٹے گروہوں (کرادیس) میں جنگ کا سلسلہ شروع کیا، جس میں نقل و حرکت بہت سہل تھی لیکن صورتِ حال مایوس کن ہو چکی تھی اور وہ بے دست و پا ہو گیا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ امویوں کے عہدِ اقبال کا آفتاب ڈوب رہا ہے۔

آخری ضرب

سقوطِ مرو کے بعد نہاوند اور دوسرے ایرانی شہر مسخر ہو گئے اور عراق کا راستہ کھل گیا۔ عراق میں کوفہ سب سے بڑا شہر تھا، جہاں ابوالعباس چھپا بیٹھا تھا۔ یہ شہر زبردست مزاحمت کے بغیر فتح ہو گیا۔ ۳۰۔ اکتوبر ۷۴۹ء کو کوفہ کی جامع مسجد میں نئے خلیفہ کی بیعت ہوئی[5]۔ تمام مشرقی صوبوں میں امویوں کا سفید جھنڈا عباسیوں کے سیاہ جھنڈے کے مقابلے میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مروان نے

---

[1] فخری ص ۱۰۶۔ [2] طبری جلد ۲ ص ۱۹۵۲، دینوری ۳۵۹

[3] نکلسن لٹریری ہسٹری ص ۲۵۱ فخری ص ۱۹۴۔

[4] طبری جلد ۲ ص ۱۹۴۳ - ۱۹۴۹۔

[5] یعقوبی جلد ۲ ص ۴۱۷، ۴۱۸، طبری جلد ۳ ص ۲۷، ۴۲، مسعودی جلد ۶ ص ۸۷، ۹۸۔

آخری دم تک مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بارہ ہزار فوج لے کر حرّان سے نکلا، جنوری ۷۵۰ء میں دریائے زاب اعلےٰ کے بائیں کنارے جنگ ہوئی۔ یہ دریا دجلہ کا ایک معاون ہے۔ عباسی فوج کا سالار نئے خلیفہ کا چچا عبداللہ بن علی تھا۔ نو روز جنگ جاری رہی۔ شامی فوج فتح کے عزم سے عاری ہو چکی تھی۔ اس کی جوانمردی اور ولولہ انگیز قیادت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کن شکست کھائی۔[1]

عبداللہ (عباسی سالار) خراسان و عراق کی فوجیں لے کر بڑھا تو شام کے شہر یکے بعد دیگرے اپنے دروازے کھولتے رہے۔ صرف دمشق نے کچھ دیر مزاحمت کی، لیکن چند روز کے محاصرے نے اسے بھی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ عباسی رسالہ ستر روز تک مسجد میں مقیم رہا[2]۔ فاتح افواج فلسطین میں داخل ہو گئیں پھر ایک جیش کو بھاگتے ہوئے خلیفہ کے تعاقب میں بھیج دیا گیا۔ مصر بالا میں بمقام بوصیر[3] ایک کلیسا کے باہر تعاقب کرنے والوں نے مروان کو جا لیا اور قتل کر ڈالا (۵ اگست ۷۵۰ء) اس کا سر اور خلافت کے امتیازی نشانات ابوالعباسؒ کے پاس بھیج دیئے گئے۔

اب عباسیوں کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اموی خاندان کے باقی افراد سے کیا سلوک کیا جائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان کا استیصال کر دیا جائے اور منصوبے کا نفاذ عبداللہ کے سپرد کیا گیا۔ سنگدل سپہ سالار نے ایسی کسی تدبیر کے اختیار کرنے میں تامل نہ کیا جو غنیم کو صفحۂ ہستی سے محو کر دینے کے لیے موثر ہو سکتی تھی، یہاں تک کہ دمشق (قنسرین) اور دوسرے مقامات پر مقبروں کو بھی محفوظ نہ چھوڑا گیا۔ نعشیں نکال کر سولی پر لٹکا دی گئیں اور باقی چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دی گئیں۔ ہشام کی نعش کو رصافہ میں قبر سے نکال کر پہلے اسّی تازیانے لگائے گئے، پھر اسے آگ میں جلا دیا گیا[4]۔ صرف معاویہؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی قبریں محفوظ چھوڑی گئیں۔ ۲۵۔ جون ۷۵۰ء کو عبداللہ نے امیہ خاندان کے اسّی افراد بہ مقام ابو فطرس کھانے پر بلائے۔ یہ مقام ندیائے عوجا پر یافہ کے قریب واقع ہے۔ اس مقام کا قدیم نام انٹی پیٹرس تھا۔ انہوں نے کھانا شروع کیا تو عبداللہ کے حکم کے مطابق جلّادوں نے ایک ایک کا سر قلم کیا، پھر ان کی گرم نعشوں پر چمڑے کا فرش بچھا دیا گیا۔ عبداللہ اور اس کے ماتحتوں نے اس فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ نیچے سے کراہنے اور سسکنے کی آوازیں آ رہی تھیں، گویا جلّادوں کے وار نے سب کو ختم نہیں کیا تھا، کچھ لوگوں میں رمق باقی

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۴۷ نیز ۵۴۔

[2] (مترجم) ——— نظر بظاہر صرف رسالے کے افراد مسجد میں رہے۔ گھوڑے مسجد میں نہ لے جا سکتے تھے۔ اگرچہ عباسی سپہ سالار اور خود ابوالعباس نے اس دور میں اسلامیت کے ہر مظہر کی جی بھر کے تذلیل کی تاہم وہ مسجد میں گھوڑے رکھنے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔

[3] اس مقام کو ابو میر بھی لکھتے ہیں غالباً یہ بوصیر الملق ہے جو فیوم میں واقع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ساویروس ابن المقفع کی کتاب سیر البطارکۃ الاسکندرانیون ص ۱۸۱، طبری جلد ۳ ص ۴۹، ۵۰۔

[4] مسعودی جلد ۶ ص ۷۷

[5] مسعودی جلد ص ۱۰۴، یعقوبی جلد ۲ ص ۲۰۴، ۴۲۸، فخری ص ۱۴۲۔

رہ گئی تھی۔[1] کارندے اور جاسوس ہر طرف پھیل گئے تاکہ اموی خاندان کے مفرور شہزادوں کا شکار کریں۔ مؤرخ کے بیان کے مطابق اکثر نے "بطنِ زمین"[2] میں پناہ لی کیونکہ روئے زمین پر ان کے لیے حفاظت کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔

ایک ڈرامائی فرار

صرف ایک شخص اس قتلِ عام سے بچا۔ وہ خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمٰن ابن معاویہ تھا۔ یہ اُنیس سال کا نوجوان تھا۔ خاندان پر آفت آئی تو شمالی شام میں دریائے فرات کے بائیں کنارے بدوؤں کے خیموں میں جا چھپا۔ ایک روز ان بدوؤں نے دیکھا کہ سیاہ جھنڈے لیے ہوئے ایک فوج ان کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے۔ عبدالرحمٰن یہ دیکھتے ہی دریا میں کود پڑا۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی، جس کی عمر چھ سال کی تھی، پیچھے ہی کود ا۔ عباسی تعاقب کرتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے عفو کے وعدے کر کے دونوں کو بلایا۔ چھوٹا بھائی وعدے کو صحیح سمجھ کر لوٹا، اپنے آپ کو عباسیوں کے حوالے کر دیا اور مارا گیا۔ بڑے بھائی نے کسی وعدے پر کان نہ دھرا اور تیر کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔[3] وہاں سے بھیس بدل کر عبدالرحمٰن نے جنوب کا رُخ کر لیا۔ فلسطین میں اس کا آزاد کردہ غلام بدر مل گیا، جو بڑا ہی وفادار اور قابل تھا۔ مفرور شہزادے کی گرفتاری یا قتل کے لیے انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔ وہ شمالی افریقہ پہنچا تو وہاں کے گورنر کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار اور بے زر تھا، تاہم شمالی افریقہ کو پیدل طے کرتا ہوا مغربی جانب بڑھتا چلا گیا۔ پانچ سال کی سرگردانی کے بعد ۷۵۵ء میں ہسپانیہ پہنچا اور اپنے اجداد کے ملک پر قابض ہو گیا۔ ۷۵۶ء میں پورے جزیرہ نما نے اس کی حکومت تسلیم کر لی۔ قرطبہ نئی سلطنت کا دارالحکومت بنا۔ مشہور تھا کہ اس شہر کی بنیاد اہلِ قرطاجنہ نے رکھی تھی۔ بہرحال یہ مقام نئی سلطنت کے شایانِ شان بن گیا اور بڑی ترقی پذیر تہذیب کا مرکز ثابت ہوا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی سلطنت کا نظام دمشق کے نمونے پر قائم کیا۔ اس کی حکومت فلاح اور روشن خیالی پر مبنی تھی اور اس نے اپنے اجداد کی بہترین روایات کے مطابق عمل پیرائی میں انتہائی کوششیں کیں۔[4] اس کے ورودِ ہسپانیہ سے چودہ سال پیشتر ہشام نے ستائیس ہزار شامی فوج بلج بن بشر القشیری کی سرکردگی میں اس غرض سے بھیجی تھی کہ بربروں کے خلاف جنگ کرے۔ اس فوج کے مختلف حصے بحیرۂ متوسط کے ساحل پر جا بجا مقیم ہو گئے تھے۔ دمشق، حمص، قنسرین، اردن اور فلسطین کے جیش بالترتیب البیرہ[5]، اشبیلیہ[6]، جیان[7]، مالقہ[8]، شذونہ[9] میں آباد ہوئے۔

---

[1] یعقوبی جلد دوم ص ۴۲۵، ۴۲۶، مسعودی جلد ۶ ص ۷۶، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۲۹/۳۳۰ معرب ص ۲۰۷، اغانی جلد ۴ ص ۱۶۱، فخری ص ۲۰۳، ۲۰۴، عقیدۃ فینز ص ۲۰۷، اس داستان کا مقابلہ یا ہو کے استیصال خاندان اخی اب (سلاطین حصہ دوم، باب ۹، آیت ۱۴، ۲۷) نیز محمد علی کے ہاتھوں ممالیک مصر کی تباہی سے کرو، جرجی زیدان تاریخ مصر الحدیث جلد ۲ ص ۱۶۰، ۱۶۲ (مترجم ۔ جو کچھ بیان ہوا، اسے کسی بھی مسلمان کے لیے زیبا نہیں سمجھا جا سکتا، چہ جائیکہ یہ سیاہی عباسیوں نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھوں سے ملی، حالانکہ وہ عمِ رسولؐ کی اولاد ہونے کے مدعی تھے، بعض امویوں کی نالائقیاں اور ظلم و جور مسلم، لیکن بدلے کی یہ وہ صورت نہ تھی، جس پر ابوالعباس یا عبداللہ نے عمل کیا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون)

[2] ابن خلدون جلد ۴ ص ۱۲۰۔

[3] اخبار ص ۵۲، ۵۴، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۷۷۔

[4] اخبار ص ۳۱، ابن قتیبہ ص ۱۴، ۱۵ ہراکشی ص ۹

[5] Elvira

[6] Seville

[7] Jaen

[8] Malaga

[9] Medina Sidornia

آبادکاروں نے اپنی نئی آبادیوں کے لیے شام کے جغرافیائی نام تجویز کیے۔ آب و ہوا اور طبعی خصوصیات وہی تھیں، جو شام کی تھیں، اس وجہ سے نو واردوں کو کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ شامیوں نے زمین فتح کی۔ شامی موسیقی، شاعری اور فنونِ لطیفہ نے وہاں کے باشندوں کے قلوب مسخر کر لیے، ہسپانیہ اور پرتگال میں جو نئے تہذیبی عناصر معرضِ وجود میں آئے تھے، ان میں سے متعدد بعد ازاں نئی دنیا (امریکہ) میں منتقل ہو گئے۔ عرب جغرافیہ نگار ہسپانیہ کا ذکر کرتے وقت اسے شام کا صوبہ قرار دینے لگے تھے جنگِ زاب نے خود شام کو عباسیوں کا صوبہ بنا دیا۔

اکتالیسواں باب

شام ایک عباسی صوبے کی حیثیت میں

اموی سلطنت کے سقوط کے ساتھ دنیائے اسلام میں شام کی برتری ختم ہو گئی اور ملک کی شان و شوکت افسانۂ پارینہ بن گئی عباسیوں نے عراق کو مستقر بنالیا۔ کوفہ ایرانی سرحد سے قریب تھا۔ یہی نیا صدر مقام تجویز ہوا۔ زاب کی ذلت خیز شکست کے بعد شامیوں کی آنکھیں کھلیں اور انھیں پتا چلا کہ اسلامی کشتیٔ ثقل کا مرکز ان کے ملک سے منتقل ہو کر مشرقی جانب چلا گیا ہے۔ آخری امید گاہ کے طور پر وہ اس وہم میں مبتلا رہے کہ معاویہؓ کے اخلاف میں سے کوئی شخص یعنی سفیانی[1] شاخ کا کوئی فرد مسیحؑ کی طرح یکایک نمودار ہو گا اور انھیں فتح مند عراقی حریفوں سے نجات دلائے گا۔ آج تک یہ امید شامی مسلمانوں کے دل میں موجود ہے، اگرچہ اس کا چہرہ بہت دھندلا ہو چکا ہے۔

نیا دور

اس اثنا میں ابوالعباس اپنے نو مفتوح علاقوں پر گرفت کو مستحکم بنانے میں مصروف تھا۔ کوفہ کی جامع مسجد میں اس نے جو افتتاحی خطبہ دیا تھا اس میں اپنے لیے السفّاحؔ (خونریز) کا لقب اختیار کیا تھا۔ اس سے خلیفہ کے مجوزہ مسلک کا پورا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ جس خاندان کی حکومت ختم ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں نیا خاندان حکومت اپنی تجاویز کو لباس عمل پہنانے کے سلسلے میں بدرجہا زیادہ قوت استعمال کرے گا۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے شاہی تخت کے قریب جلاد کے لیے جگہ تجویز ہوئی اور اسے چمڑے کا تھیلا دے دیا گیا۔ جس میں کٹے ہوئے سر رکھنے منظور تھے۔ نئے خلیفہ کے گرد علمائے دین اور قانون ساز جمع ہو گئے تاکہ نومولود سلطنت کو اموی سلطنت کے مقابلے میں حکومت الٰہیہ کا رنگ دیا جا سکے۔ اموی حکومت محض دنیوی تھی (ملک)۔ رسمی تقریبات میں ابوالعباس وہ بُردہ پہن لیتا تھا، جو رسول اللہ سے منسوب تھا۔ پروپیگنڈے کی منظم تحریک کی بدولت اموی خاندان کے متعلق عوام کا اعتقاد زائل ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نئی حکومت کے وقار و اقتدار کا سکہ بٹھا لینا بہت سہل ہو گیا تھا۔ پروپیگنڈا کرنے والے بار بار اعلان کرتے تھے کہ اب حکومت ہمیشہ کے لیے عباسیوں کے قبضے میں رہے گی اور وہ اقتدار کی باگ عیسیٰ مسیحؑ کے حوالے کریں گے۔ ساتھ ہی یہ انتباہ بھی کیا جاتا تھا کہ اگر عباسی خلافت تباہ

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۱۳۲۰، ابن مسکویہ، تجارب الامم جلد ۲ ص ۵۲۶، یاقوت جلد ۴ ص ۱۰۰۰، اغانی جلد ۱۶ ص ۸۸، نیز لامنس کی فرانسیسی کتاب۔

[2] طبری جلد ۳ ص ۳۰، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۱۶۔

[3] طبری جلد ۳ ص ۳۳، ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۱۸۔

ہوئی تو پوری کائنات برباد ہو جائے گی۔ ایسی حدیثیں وضع کرلی گئیں، جو امویوں کی مخالفت اور عباسیوں کی حمایت پر مبنی تھیں۔ عمارتوں میں جو کتبے تھے، ان میں سے امویوں کے نام مٹا دیے گئے[1] اور اموی دور کے منبروں کی شکلیں بدل دی گئیں۔

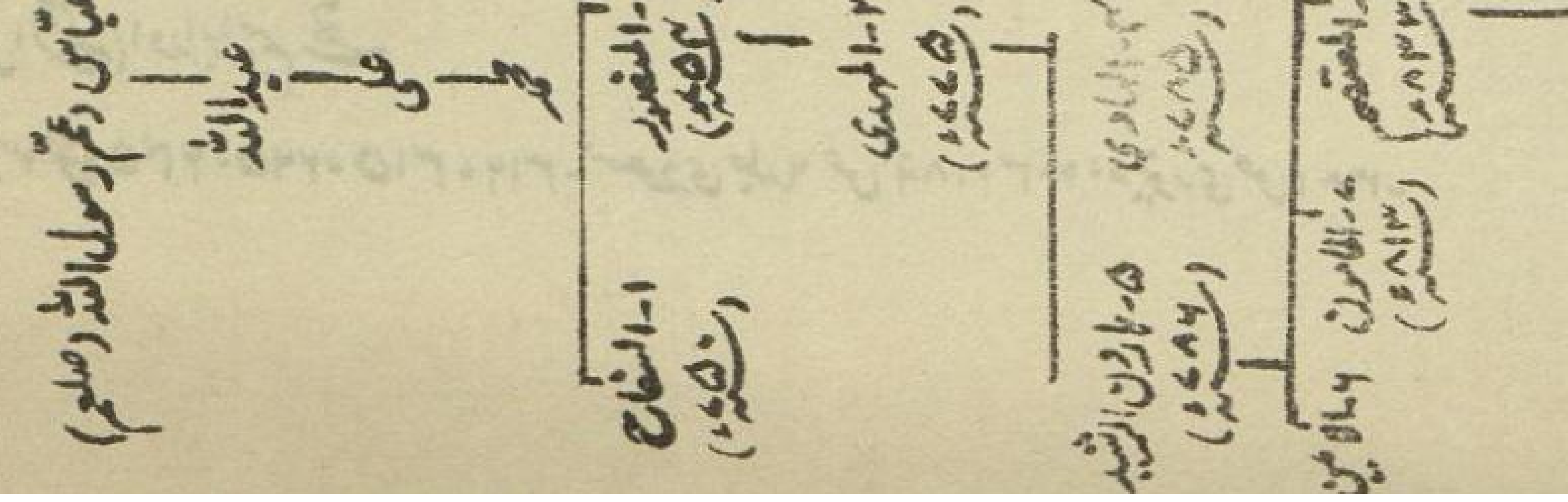
سابقہ خلافت اور عباسی خلافت میں حقیقی فرق یہ تھا کہ آخرالذکر میں ایرانیت کا رنگ غالب تھا۔ دربار کے تمام مراسم ایرانی تھے۔ سیاسی منظر پر ایرانی فنکار چھائے ہوئے تھے۔ شاہی حرم میں ایرانی خواتین کا غلبہ تھا۔ عملی اعتبار سے یہ نو مسلموں کی سلطنت تھی، جن میں عرب بھی ایک فریق کی حیثیت سے شامل تھے۔ اگر امویوں کی سلطنت کو ایک لحاظ سے مشرقی رومی سلطنت کی جانشین قرار دیا جائے تو عباسی سلطنت کو وسیع پیمانے پر ایرانی سلطنت کی جانشین سمجھنا چاہیئے۔ عباسیوں نے اپنی سلطنت کو "دولہ" کہنا شروع کیا، یعنی عہدِ جدید اور یقیناً یہ عہدِ جدید تھا۔ عراقیوں نے سمجھ لیا کہ شامیوں کی غلامی سے نجات پائی۔ شیعوں نے سمجھا کہ بدلا لے لیا گیا۔ ایرانیوں کے لیے نئی حکومت میں اعلیٰ عہدوں کے دروازے کھل گئے۔ انھوں نے ایک نیا عہدہ قائم کیا، یعنی وزارت اور اس پر خود قبضہ کرلیا۔ خلافت کے بعد یہ سب سے اونچا عہدہ تھا۔ خراسانی خلیفہ کے باڈی گارڈ میں شامل ہو گئے۔ عرب امراء کی حیثیت گھٹ گئی۔ عربیت پر زوال آگیا اور اسلام نے ایرانیت کے بھیس میں اپنا فاتحانہ سفر جاری رکھا۔

تاریخی ترتیب سے خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنو امیہ کے بعد السفاح (۷۵۰ء–۷۵۴ء) اور اس کے بھائی ابو جعفر المنصور (۷۵۴ء–۷۷۵ء) کی قائم کردہ خلافت تیسری تھی۔ یہ سب سے زیادہ لمبی مدّت تک قائم رہی اور اس نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ المنصور کے بعد پینتیس خلفاء جانشین ہوئے وہ سب المنصور کے اخلاف تھے۔ المنصور نے دارالحکومت کے لیے ایک مسیحی گاؤں انتخاب کیا، جس کا نام ایرانی تھا، یعنی بغداد[2] (عطیۂ خدا)۔ یہ دجلہ کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ اس کا سرکاری نام دارالسلام (مسکنِ امن) رکھا گیا۔ اس کے گرد اینٹوں کی دہری فصیل بنائی گئی۔ اور گرد گہری خندق تیار کرائی گئی۔ تیسری فصیل جو سب کے اندر تھی، نوے فٹ اونچی تھی۔ یہ مقام اسی وادی میں واقع تھا جہاں عہدِ قدیم کے نہایت عظیم الشان شہر آباد ہو چکے تھے۔ مثلاً ٹیسیفون (مدائن) بابل، نینوا اور مشرق قدیم کے دوسرے دارالحکومت۔ المنصور کے شہر کو ان تمام شہروں کی قوت وطاقت اور عظمت و وقعت میراث میں مل گئی۔ یہی وہ مقام ہے جو الف لیلہ کے افسانوں کا پس منظر ہے، جنھیں شہرزاد نے بڑے اچھے طریقے پر بیان کیا، نیز یہ ہارون الرشید (۷۸۶ء–۸۰۹ء) اور المامون (۸۱۳ء–۸۳۳ء) کے درخشاں عہد ہائے حکومت کا مرکز رہا۔ غرض بغداد تاریخ وافسانہ دونوں میں اسلام کے شکوہ وجلال کا بے مثال نشان بنا رہا۔ ان دو حکمرانوں (ہارون ومامون) کی حکومتوں نے پورے خاندان کے لیے ایک ایسے ہالے کا انتظام کر دیا جس کی جلا اب تک ماند نہیں پڑی۔ خاندان کا دورِ عروج تیسرے خلیفہ المہدی (۷۷۵ء–۷۸۵ء) سے نویں خلیفہ واثق (۸۴۲ء–۸۴۷ء) تک قائم رہا[3]۔ واثق کے بعد دورِ زوال شروع

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۴۸۶ [2] یعقوبی کتاب البلدان ص ۲۳۵، بلاذری ص ۲۹۴۔

[3] عباسیوں کے شجرۂ نسب کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے۔



ہُوا جو مستعصم (۱۲۴۲ء۔ ۱۲۵۸ء) کے زمانے تک رہا۔ مستعصم ترتیب کے لحاظ سے سینتیسواں عباسی خلیفہ تھا۔ پھر یہ خاندان تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ سفّاح اور منصور کے جانشین پانچسو سال کی مدّت تک مسند نشین رہے، مگر ایسے دور بھی آئے، جب حکومت کی باگ ڈور دراصل ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔

غدّاروں اور مشتبہ آدمیوں کا خاتمہ

شام کا پہلا گورنر عبداللہ تھا، جس نے جنگ زاب میں فتح حاصل کی تھی۔ سفّاح کی وفات پر عبداللہ اپنے دوسرے بھتیجے المنصور کے خلاف خلافت کا مدّعی بن گیا۔ اسے اس وسیع منظّم فوج کی حمایت پر پورا اعتماد تھا، جو بیزنطینیوں کے مقابلے کے لیے فراہم کی گئی تھی۔ اس نے سترہ ہزار خراسانیوں کو ذبح کیا[۱] کیونکہ ان پر بھروسا نہ تھا۔ باقی فوج کے ساتھ جو زیادہ تر شامیوں پر مشتمل تھی، وہ مشرق کی جانب چل پڑا۔ نصیبین میں ابومسلم سے عبداللہ کا مقابلہ ہوا۔ (۱۱ نومبر ۷۵۴ء) اور عبداللہ نے شکست کھائی۔ سات سال تک وہ قید رہا، پھر اسے بڑے اہتمام سے ایک ایسے مکان میں لے گئے، جس کی بنیاد عام روایت کے مطابق نمک کے ڈھیلوں پر رکھی گئی تھی اور اس کے اردگرد پانی چھوڑ دیا گیا تھا۔ چنانچہ مکان گرا اور عبداللہ اسی میں دب کر مر گیا[۲]۔ ابومسلم خراسان کا گورنر تھا، اور وہ عملاً خودمختار بن گیا تھا۔ لوگوں کو اس سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ اس نے تمام شخصی اور سرکاری دشمنوں کو سختی سے دبا دیا تھا تو مدائن میں خلیفہ سے ملاقات کی۔ ایک روز ملاقات کے دوران میں دھوکے سے اسے قتل کر دیا گیا۔ عبداللہ کے بعد عبّاسی ابومسلم ہی کے ممنون تھے[۳]۔

پھر علویوں کی باری آئی۔ انھیں ابتدا میں خیال تھا کہ عبّاسی سب کچھ ہمارے لیے کر رہے ہیں، اب ان کی بھی آنکھیں کھلیں۔ ابوالعبّاس اور اس کے لشکریوں کے نزدیک اہلِ بیت خود عبّاسی تھے، نہ کہ علیؓ اور فاطمہؓ کی اولاد۔ علوی اپنے اس دعوے پر مضبوطی سے قائم تھے کہ صرف ہمارے امام تمام اسلامی معاملات میں صدارت کے حق دار ہیں۔ اس طرح عباسی خلفاء کی حیثیت غاصبوں کی ہوگی۔ علویوں نے مخالفت پس پردہ شروع کی اور جب موقع پاتے، کھلم کھلا لڑائی چھیڑ دیتے۔ مشہور امام مالک بن انس چار فقہی دبستانوں میں سے ایک کے بانی تھے جو اب تک شمالی افریقہ میں جاری ہے۔ انھوں نے شیعوں کو عبّاسیوں کے حلفِ اطاعت سے آزاد ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ حسنؓ کے پڑپوتوں محمدؒ اور ابراہیمؒ نے بغاوت کی، جو سختی سے دبا دی گئی[۴]۔ محمدؒ کو جس کا لقب النفس الزکیہ تھا، مدینہ میں سولی دے دیا گیا۔ (دسمبر ۷۶۲ء) ان کے بھائی ابراہیمؒ نے فروری ۷۶۳ء میں کوفہ کے نزدیک شہادت پائی اور ان کا سر کاٹ کر خلیفہ کے پاس بھیج دیا گیا[۵]۔

---

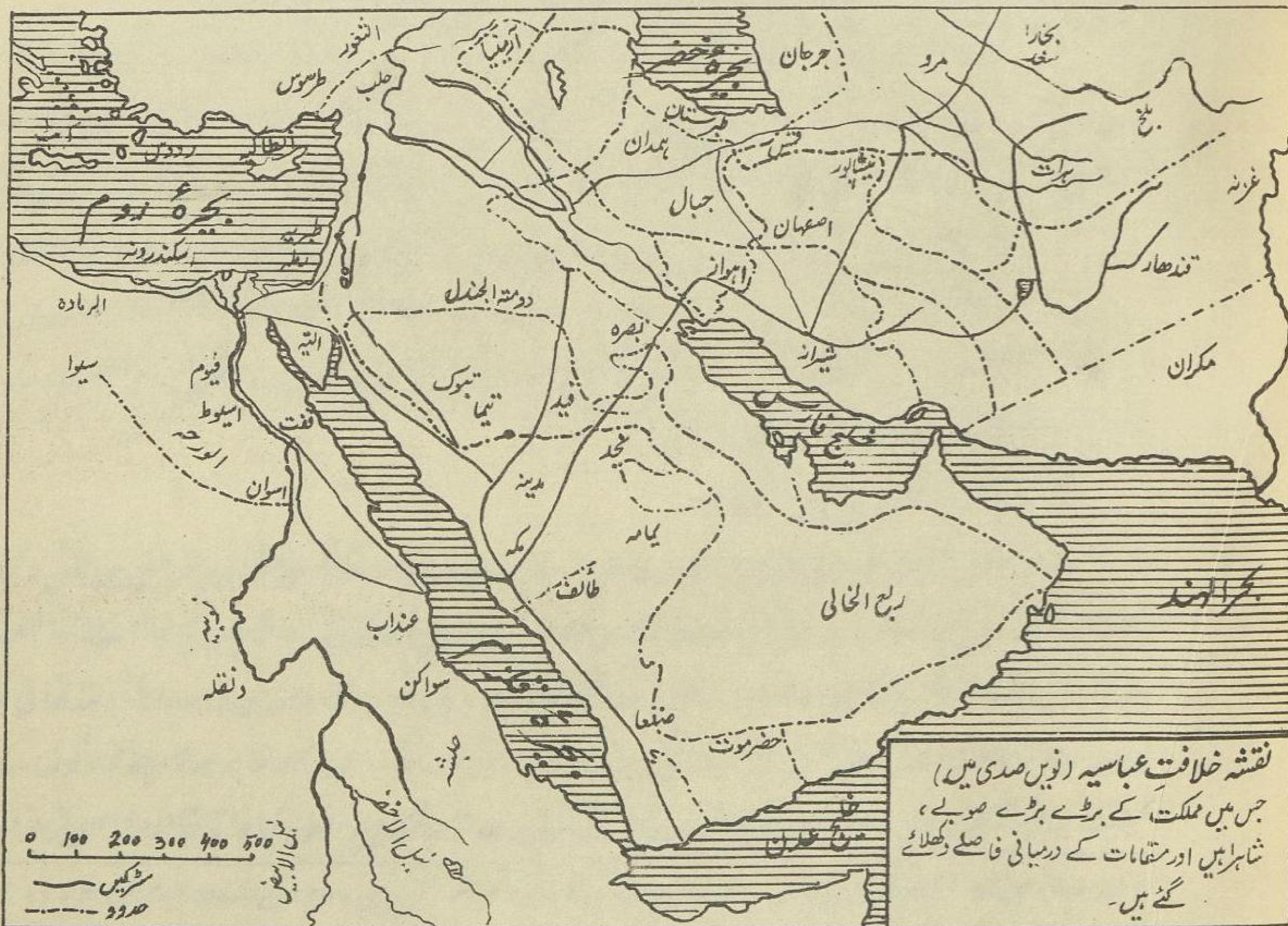
۱ طبری جلد ۳ ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

۲ طبری جلد ۳ ص ۳۳۰۔ یعقوبی جلد ۲ ص ۴۴۳۔

۳ طبری جلد ۳ ص ۱۰۵، ۱۰۷۔ دینوری ص ۳۷۶، ۳۷۸۔

۴ محمد اور ابراہیم کا سلسلہ نسب یہ ہے: حضرت حسنؓ کے فرزند حضرت حسنؓ مثنیٰ، ان کے فرزند حضرت عبداللہ المحض حضرت عبداللہ المحض کے فرزند محمد (النفس الزکیہ) اور ابراہیم تھے۔

۵ طبری جلد ۳ ص ۲۴۵، ۲۶۵، ۳۱۵، ۳۱۶۔ مسعودی جلد ۶ ص ۱۸۹، ۲۰۳، دینوری ص ۳۸۱۔



نقشہ خلافتِ عباسیہ (نویں صدی میں)
جس میں مملکت کے بڑے بڑے صوبے، شاہراہیں اور مقامات کے درمیانی فاصلے دکھلائے گئے ہیں۔

شیعوں کے حامیوں کا ایک اور گروہ بھی تھا، جسے ختم کرنا ضروری تھا، یعنی برمکی۔ یہ ایرانی وزیروں کا ایک خاندان تھا، جو منصور کے عہد میں برسرِ کار آیا۔ یہ لوگ بدھوں کے ایک مذہبی پیشوا (برمک) کی اولاد تھے اور ان کے خاندان نے وہ درجہ امتیاز حاصل کیا اور سخاوت میں وہ نام پایا کہ لفظ برمکی اب تک سخی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہارون الرّشید کے نزدیک اس خاندان کا اقتدار ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ۸۰۳ء میں اور اس کے بعد اس خاندان کو تباہ کرا دیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ غیر منقولہ جائداد اور سرو سامان کو الگ رکھتے ہوئے ان کے قبضے سے تین کروڑ چھ لاکھ چھہتر ہزار دینار برآمد ہوئے۔[1]

دارالحکومت بغداد منتقل ہو گیا تو بیزنطینیوں سے خاصی دوری ہو گئی اور اس موروثی دشمن کی اہمیت زیادہ باقی نہ رہی۔ اس دوران میں جو افراتفری پھیلی تو شہنشاہوں نے اپنی سرحد مشرقی جانب ایشیائے کوچک اور آرمینیا کی سرحد کے ساتھ ساتھ آگے بڑھانے کا موقع پایا۔ المنصور اور اس کے جانشینوں نے شام کے ثغور اور لبنان کی بندرگاہوں کو مستحکم بنانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔[2] ۷۸۲ء میں[3] جب ہارون الرّشید ایک عام شہزادہ تھا، فوج لے کر قسطنطنیہ پہنچ گیا اور آئرین سے بھاری خراج وصول کیا، جو اس وقت نائب السّلطنت تھی، خلیفہ کی حیثیت میں ہارون نے اپنی محبوب قیام گاہ الرّقہ (شمالی شام) سے رومیوں کی سرزمین پر متعدد حملے کئے۔[4] ۸۳۸ء میں ہارون کے بیٹے معتصم نے رومی سلطنت پر آخری بڑا حملہ کیا۔ اس پر خلافت اور مشرقی رومی سلطنت کے درمیان وہ کشمکش انجام کو پہنچی جو ڈیڑھ سو سال سے چلی آ رہی تھی۔

شام، لبنان، فلسطین میں اضطراب

شام کی خاص حیثیت ختم ہو چکی تھی، اہلِ شام نے اس صورتِ حال کے خلاف قولاً اور عملاً اظہارِ ناراضی میں تامّل نہ کیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی حالت خراب ہوتی گئی اور وہ سرکاری عہدوں سے محروم ہو گئے۔ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ المنصور نے ایک مرتبہ کہا "لوگ بڑے خوش ہیں کہ میرے عہد میں طاعون سے محفوظ رہے" ایک شامی نے سنتے ہی جواب دیا: "اللہ تعالیٰ کی رحیمی سے یہ بعید ہے کہ طاعون اور آپ کی حکمرانی کی مصیبت بیک وقت ہم پر نازل کرے"[5] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کی کیفیت کیا تھی۔ مسیحیوں کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ کیونکہ ان سے ناجائز روپیہ وصول کیا جاتا تھا اور محاصل بڑھا دیے گئے تھے۔

---

[1] عقد جلد ۳، ص ۲۸، طبری جلد ۳ ص ۶۸۰، مسعودی جلد ۶ ص ۳۸۷، ۳۹۴، فخری ص ۲۸۸، ابن خلدون جلد ۳ ص ۲۲۳، ۲۲۴۔ کتاب العیون ص ۳۰۶، ۳۰۸۔

[2] بلاذری ص ۱۶۳

[3] کتاب العیون ص ۲۷۸ میں مہم کی تاریخ ۱۶۳۔ ۷۸۰ بتائی گئی ہے۔ یعقوبی میں ۱۶۴، جلد ۲ ص ۴۷۸، ۴۸۶ اور طبری میں ۱۶۵ جلد ۳ ص ۵۰۳، ۵۰۴۔

[4] طبری جلد ۳، ص ۶۹۶، ۷۰۹، ۷۱۰، یعقوبی جلد ۲ ص ۵۱۹، ۵۲۳، دینوری ص ۳۸۴، ۳۸۷، مسعودی جلد ۳ ص ۳۳۷، ۳۵۲ رقہ کی بنیاد سلیوکیوں نے رکھی تھی۔ اس کے کھنڈر دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہارون الرّشید نے اسے وسیع پیمانے پر تعمیر کرایا اور مامون نے استحکامات کیے۔

[5] ابن عساکر جلد ۳ ص ۳۹۲۔

دو سال گزرنے کے بعد بنو امیہؓ کی رعایا بنو عباس کی رعایا بننے پر راضی ہوئی۔

شام کا پہلا گورنر عبداللہ تھا۔ اس نے ۷۵۰ء میں اپنا عہدہ سنبھالا تو مختلف مقامات پر بغاوتیں پھوٹ پڑیں، مثلاً حوران ثنیہ اور قنسرین۔ ان بغاوتوں کی قیادت مروان کی فوج کے سالار کر رہے تھے حمص اور تدمر کے باغیوں کی سرگروہی ایک شخص زیاد نے سنبھال لی، جو معاویہؓ کے اخلاف میں سے تھا اور شامیوں کے نزدیک وہ متوقع سفیانی تھا۔ اس کے مرکز ثلیہ میں چالیس ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے[۱]

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ شام میں عربوں کے دو فریق تھے، ایک قیسی، دوسرا یمنی۔ یہ مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے نمایاں ہوتے رہے۔ اب ان کے درمیان جھگڑا بہت شدت اختیار کر چکا تھا۔ عباسی بالعموم قیسیوں کے حامی تھے اور ان سے فائدہ بھی اٹھا رہے تھے، خصوصاً ہارون الرشید کے زمانے میں کشمکش بہت تلخی اختیار کر گئی۔ اُس وقت دمشق کا گورنر ابراہیم تھا جو عبداللہ کا بھتیجا تھا[۲] دمشق، حوران، بلقا، اردن اور حمص میں خونریزی ہوئی[۳] دو سال تک علاقہ دمشق میں بڑی شدید جنگ صرف اس بنا پر ہوتی رہی کہ کسی یمنی کے باغ سے دوسرے فریق کا کوئی آدمی ایک تربوز اٹھا لایا تھا[۴] خلیفہ نے پہلے خود تادیبی مہم کی قیادت کا فیصلہ کیا، پھر ۷۹۵ء میں قیادت کا منصب ایک برمکی سالار کے حوالے کر دیا جس نے دونوں محارب فریقوں سے ہتھیار لے لیے۔ نہ کوئی برچھی چھوڑی اور نہ گھوڑا[۵] ہارون کے بیٹوں امین اور مامون کے درمیان تخت نشینی کے لیے جو جنگ ہوئی تھی، اس کے اثرات شام پر بھی پڑے۔ شامی فوجوں کو ۸۱۱ء۔ ۸۱۲ء میں بمقام رقہ اساینوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ ایک سالار نے شامیوں کے روبرو پرجوش تقریر کی اور آخر میں کہا:

"سیاہ جھنڈے مردہ باد۔ چلو گھروں کو، واپس چلو فلسطین میں
مرنا عراق میں جینے سے بہتر ہے"[۶]

امین کے عہدِ حکومت میں ایک سفیانی نے، جس کا نام علی تھا، سفید پرچم لہرایا۔ نوّے سال کی عمر میں ایک عالم نے سلطنت کا دعویٰ کیا اور لوگوں کی خاصی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی، جن میں صیدا کا گورنر بھی شامل تھا اس نے پہلے حمص پر قبضہ کیا، پھر دمشق کا محاصرہ کر لیا، عباسیوں کے نمائندے کو باہر نکال کر وہ دمشق پر بھی قابض ہو گیا[۷]

۸۲۹ء میں مامون شام گیا اور زمینوں کی از سرِ نو پیمائش کرائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مالیے میں اضافہ کر دے[۸] چار سال بعد وہ اس غرض

---

۱ ابن الاثیر جلد ۵ ص ۳۳۱۔

۲ حالات اتنے نازک تھے کہ صرف عباسی گورنر مقرر کیے جاتے تھے۔ ابراہیم کا باپ صالح عبداللہ کا بھائی تھا۔

۳ دینوری ص ۳۸۳، ابن الاثیر جلد ۶ ص ۸۶، ۱۲۹، ۵۱۹۔

۴ ابو الفدا جلد ۲ ص ۱۴، ابن الاثیر جلد ۶ ص ۸۷۔ ۵ طبری جلد ۳ ص ۶۳۹۔

۶ طبری جلد ۳ ص ۸۴۴، ۸۴۵۔

۷ یعقوبی جلد ۲ ص ۸۳۲، ابن الاثیر جلد ۶ ص ۱۷۲، طبری جلد ۳ ص ۸۳۰۔

۸ ابن العساکر جلد ۴ ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

سے دمشق گیا کہ وہاں کے قاضیوں کا امتحان لے اور اپنا وہ فرمان نافذ کرے کہ جو قاضی معتزلہ کے مطابق خلقِ قرآن کا قائل نہ ہو، اسے عہدے پر برقرار نہ رکھا جائے۔[1] اس کے متعدد ہیڈ کوارٹر بیرونِ ملک (؟) کے لیے جاتے ہوئے یا بیزنطینیوں سے لڑنے کے سلسلے میں شام جا چکے تھے۔ انھیں گورنروں سے تمام حالات معلوم ہوتے رہتے تھے اور اس غرض سے ایک خاص نمائندہ بھی مقرر ہو چکا تھا، جسے صاحب البرید (پوسٹ ماسٹر) کہتے تھے، لیکن اصل میں وہ خفیہ پولیس کا افسر ہوتا تھا۔[2] خلیفہ نے جس معتزلی عقیدے کو قبول کر لیا تھا، وہ بعد کے راسخ العقیدہ لوگوں کے نظریے سے بالکل مختلف تھا۔ عقلیت کی تحریک بھی دراصل امویوں ہی کے ماتحت شروع ہوئی تھی۔[3]

برقع پوش باغی

بعد ازاں بڑی بغاوت فلسطین میں ہوئی۔ وہاں ایک مجہول الاصل یمنی عرب نے سفید پرچم لہرایا۔ ۸۴۰ء- ۸۴۱ء)۔ عجیب امر یہ ہے کہ وہ جب عوام کے روبرو آتا تو برقع پہنے ہوئے آتا۔ اس وجہ سے اس کا لقب البرقع مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے حامیوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی تھی اور یہ سب دیہاتی اضلاع اور دہقانی طبقات سے جمع کیے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی مقصد کے علاوہ اقتصادی مقاصد بھی پیشِ نظر تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک یہی کافی تھا کہ قائد سفیانی تھا۔ جب کاشتکاری کا وقت آ گیا اور یہ فوجی اپنے کاموں میں لگ گئے تو عباسی سالار نے صرف ایک ہزار فوج کے ساتھ، جو خلیفہ معتصم کی بھیجی ہوئی تھی، برقع پوش کے مستقر پر حملہ کر دیا اور اسے گرفتار کر کے سامرہ پہنچا دیا جو عباسیوں کا دار الحکومت تھا۔[4]

دمشق عارضی دار الحکومت

معتصم کے بیٹے متوکل کے عہد حکومت میں دمشق کے اندر پھر بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی (۸۵۴ء- ۸۵۵ء) عوام نے عباسیوں کے گورنر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خلیفہ نے ایک ترکی سالار کو سات ہزار سواروں اور تین ہزار پیادوں کے ساتھ دمشق بھیجا۔ اس نے متواتر تین روز تک قتلِ عام کا سلسلہ جاری رکھا، نیز شہر کو لوٹا۔ یہ امر ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ نے اس سے تھوڑی دیر بعد دمشق کو قیام کے لیے منتخب کیا۔ ۸۵۸ء میں متوکل نے مرکزِ حکومت دمشق میں منتقل کر لیا۔ غالباً اس کی خواہش یہ تھی کہ اپنی محافظ فوج کے اقتدار سے کسی قدر نجات حاصل کر لے، جو حد درجہ شورش پسند اور غیر منظم ترکوں پر مشتمل تھی۔ ابتدا میں وہ لوگ متوکل کے پیشرو واثق نے تنخواہ داروں کی حیثیت میں ملازم رکھ لیے تھے اور ان میں غلام بھی شامل تھے۔ شہر کی مرطوب فضا تیز ہوا اور مکھیوں کی افراط نے متلوّن مزاج خلیفہ کو صرف اڑتیس روز کے قیام کے بعد وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔[5]

---

[1] یعقوبی جلد ۲ ص ۵۷۱۔

[2] حتی تاریخ عرب انگریزی ص ۳۲۵۔

[3] ایضاً ایضاً ص ۴۲۹۔

[4] طبری جلد ۳ ص ۱۳۱۹، ۱۳۲۲، ابن عساکر جلد ۵ ص ۳۱۲۰، ۴۱۱۔

[5] ابن عساکر جلد ۶ ص ۴۷، ۴۸۔

[6] طبری جلد ۳ ص ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، یعقوبی جلد دوم ص ۶۰۱، ابن عساکر جلد ۴ ص ۲۸۸، ۲۸۹۔

مسیحیوں کے خلاف قوانین

اہلِ شام نے عمل کا جو طریقہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں اختیار کیا تھا، وہ سالہا سال تک اس پر کاربند رہے۔ اس موقع پر نیا عنصرِ اضطراب بروئے کار آ گیا، یعنی یہ کہ مسیحیوں پر جو سخت پابندیاں لگائی گئی تھیں، ان کی وجہ سے بے چینی بہت تیز ہو گئی۔ متوکل کے دور سے پیشتر ہمیں لبنان میں مسیحیوں کی صرف ایک بغاوت کا علم ہے۔ یہ عبداللہ بن علی عباسی کے بھائی صلح بن علی (۷۵۹ء تا ۷۶۰ء) کی گورنری کے زمانے میں پھوٹی تھی۔ ان پر نئے ٹیکس لگا دیے گئے تھے، اس وجہ سے وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ بیزنطینی بیڑا طرابلس کے پانیوں میں پہنچا ہوا تھا، اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی، چنانچہ وہ لبنانی پہاڑوں میں اپنے مستقر واقع منیطرہ سے نکلے اور بقاع کے علاقے میں متعدد گاؤں لوٹ لیے۔ ایک پہاڑی نوجوان ان کا سرِ عسکر تھا، جس کا ہاڑ بہت چوڑا چکلا تھا اور مسیحی اسے اپنا بادشاہ قرار دینے کی جسارت کر چکے تھے۔ عباسی رسالہ بعلبک کے قریب ایک جگہ گھات میں بیٹھ گیا اور لبنانی گروہ کا تیا پانچا کر ڈالا۔ صالح اگورنر نے اس کے بعد بدلا لیا اور پہاڑی دیہاتیوں کو گھروں سے اٹھا دیا، حالانکہ اکثر نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور انھیں شام کے مختلف علاقوں میں الگ الگ جگہ بٹھا دیا۔[1] بعلبک اور بیروت کے مشہور فقیہ امام اوزاعی نے گورنر سے احتجاج کیا، جو اس لائق ہے کہ اسے یہاں درج کیا جائے۔

> لبنان کے جن ذمیّوں کو بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا، ان کا اخراج آپ کے علم میں ہو گا۔ بغاوت کرنے والوں کو یا تو آپ قتل کر چکے ہیں یا انھیں گھروں میں واپس بھیج چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک گروہِ قلیل کے جرم کے لیے آپ اکثریت کو کس بنا پر سزا دے سکتے ہیں اور کیونکر انھیں گھربار اور زمینوں سے نکال سکتے ہیں جب کہ خدا کا یہ فرمان موجود ہے کہ لاتزروازرۃ وزراخریٰ (اور نہ ایک کے گناہوں کا بوجھ دوسرے پر ڈالا جائے) یقیناً خدا کے حکم سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں، جو ہماری فوری اور دائمی اطاعت کا حقدار ہو اور رسولِ خدا کے حکم سے بڑھ کر کوئی حکم ہماری کاربندی اور توجہ کا مستحق نہیں ہو سکتا: "جو شخص میثاق کے ذریعے سے ہمارے ساتھ وابستہ ہے، اس پر ظلم کرنے والے اور طاقت سے زیادہ تکلیف دینے والے کے خلاف میں حجت پیش کروں گا۔"

متوکل سے پیشتر اس کے دادا ہارون الرشید نے بھی مسیحیوں اور یہودیوں کے خلاف بعض قوانین جاری کیے تھے۔[2] ۸۰۷ء میں اس نے حکم دے دیا کہ اسلامی فتوحات کے بعد جتنے گرجے بنائے گئے ہیں، وہ سب منہدم کر دیے جائیں۔ یہ فرمان بھی جاری

---

[1] ابن عساکر جلد ۵ ص ۳۴۱۔

[2] بلاذری ص ۱۶۲ ترجمہ انگریزی ص ۲۵۱۔

کیا کہ جن فرقوں کو امان دی گئی ہے وہ مقررہ لباس پہنا کریں۔[1] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منظور کیے ہوئے اکثر قوانین نافذ ہی نہ کیے گئے۔[2] ۸۵۰ء اور ۸۵۴ء میں متوکّل نے یہ امتیازی قوانین پھر سے زندہ کر دیے، بلکہ ان میں بعض نئے جزئیات شامل کر کے اور زیادہ سخت بنا دیا۔ اور اقلّیتوں کے خلاف انھیں جاری کر دیا۔ مسیحیوں اور یہودیوں دونوں پر یہ پابندی لگا دی گئی تھی کہ وہ اپنے گھروں کے دروازوں پر شیاطین کے چوبی مجسّمے بنوا کر لگائیں، اپنی قبریں زمین کے برابر رکھیں، اپنی آستینوں پر شہد کے رنگ کی دو دھجیاں لگائیں، ایک دھجّی آستین کے عقبی حصّے میں اور دوسری پیشں حصّے میں سلوائی جائے۔ صرف خچّروں اور گدھوں پر سوار ہوں۔ صرف چوبی زین استعمال کریں، جس کے پچھلے حصّے میں انار جیسے دو گولے لگے ہوئے ہوں۔[3] اس امتیازی لباس کے باعث ذمّیوں کو طنزاً "چتکبرے" (دراقط) کہا جانے لگا۔[4] معاصر فقیہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ مسلمانوں کے خلاف کسی یہودی اور مسیحی کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اس بارے میں دلیل یہ پیش کی کہ ان دونوں قوموں نے کتب الٰہی میں تحریف کر لی ہے۔[5] پھر فاطمی خلیفہ الحاکم (۹۹۶ء۔ ۱۰۲۱ء) تک کسی بڑی اذیت رسانی اور تعذیب کا موقع نہ آیا۔

متوکّل کی طرف سے ان قوانین کے اجراء کے بعد حمص میں ایک خوفناک بغاوت پھوٹی، جس میں مسیحیوں اور مسلمانوں، دونوں نے حصّہ لیا۔ بڑی شدید کشمکش کے بعد اسے دبا دیا گیا۔ (۸۵۵ء) بغاوت کے سالاروں کو قتل کیا گیا یا اتنے تازیانے لگائے گئے کہ وہ مر گئے۔ پھر ان کی نعشوں کو شہر کے دروازوں کے باہر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ تمام گرجے ڈھا دیے گئے، صرف ایک باقی چھوڑا جسے مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ تمام مسیحیوں کو شورش پسند شہر سے خارج کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک حمص میں مسیحیوں کی اکثریت تھی۔[6]

ذمّیوں کے لیے جو پابندی سب سے بڑھ کر تکلیف دہ تھی وہ جزیے کی ادائی تھی۔ نظری اعتبار سے یہ قیمت تھی جو قیام اور آزادی کے لیے ادا کی جاتی تھی اور جس کے مطابق جان و مال کی حفاظت کا حق ملتا تھا۔[7] اگر کوئی شخص جزیہ ادا نہیں کرتا تھا یا بغاوت اختیار کر لیتا تھا یا کسی اجنبی سلطنت کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دیتا تھا یا کسی دشمن حکومت کے آدمی کو پناہ دیتا تھا تو معاہدہ فسخ کر دیا جاتا تھا۔ پھر اس میں مزید امور شامل ہوتے رہے، مثلاً کسی آزاد مسلمان خاتون سے بدفعلی یا کسی مسلمان کو ارتداد کی رغبت دینا یا خدا، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی بے حرمتی کرنا۔ مسلمان اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر مسیحیت یا یہودیت اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کسی ذمّی کو غیر مناسب آدمی سمجھا جاتا تھا تو اسے اسلامی علاقے سے نکال دیا جاتا تھا۔ فقہ کے زیادہ تر

---

[1] طبری جلد ۳۔ ص ۷۱۲، ۱۳۶۷؛ ابن الاثیر جلد ۶ ص ۱۴۱۔

[2] لارنس ای براؤن کی کتاب The Eclipse of Christianity in Asia ص ۴۶۔

[3] طبری جلد ۳ ص ۱۳۸۹، ۱۳۹۳ نیز ۱۴۱۹۔

[4] جاحظ بیان جلد اوّل ص ۷۹۔

[5] سورۂ بقرہ آیت ۷۰، سورۂ مائدہ آیات ۱۶، ۱۸۔

[6] طبری جلد ۳ ص ۱۴۳۲، ۱۴۳۴۔ ابن الاثیر جلد ۷ ص ۵۹، ۶۰، یعقوبی جلد ۲ ص ۵۹۹۔

[7] (مترجم — ظاہر ہے کہ مصنف کی یہ تعبیر درست نہیں، ذمی کو یقیناً جان و مال کی حفاظت حاصل تھی، لیکن جزیہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ رکھنے کے لیے وصول کیا جاتا تھا، جو لوگ فوجی خدمت انجام دینے پر آمادہ رہتے تھے، ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔)

دبستانوں کی رائے یہ تھی کہ کسی ذمی کے قتل پر کسی مسلمان کو موت کی سزا نہیں دی جا سکتی[1] اگر کوئی غیر مسلم اپنا مقدمہ اسلامی عدالت میں لانا چاہتا تو اسے اس حق سے محروم نہ رکھا جاتا۔ اگر کسی مقدمے میں ایک فریق مسیحی ہوتا اور دوسرا یہودی تو اسلامی قانون اس وقت تک مداخلت نہ کرتا جب تک دونوں فریق ثالثی کے فیصلے پر متفق ہونے کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔ اگر کوئی شوہر اسلام قبول کر لیتا اور بیوی یہودی یا مسیحی رہتی تو شادی فسخ نہ کی جاتی، لیکن اگر بیوی اسلام قبول کر لیتی تو شوہر کے لیے لازم ہوتا کہ بیوی کو قبضے میں رکھنے کے لیے تین مہینے کے اندر اندر اسلام قبول کر لے۔ اس اثنا میں وظائف زوجیت معطل رہتے۔ بہ صورت دیگر طلاق واقع ہو جاتی، ذمی کسی مسلمان کی میراث نہ پا سکتا۔

اسلام میں داخلہ

اس وقت تک شام نے عمومی مسیحی حیثیت قائم رکھی تھی، لیکن اب صورت حال واضح طور پر بدلنے لگی۔ مسیحیوں میں سے بنو تنوخ حلب کے قرب و جوار میں رہتے تھے، ان کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ انھوں نے عباسی خلیفہ المہدی کا حکم مانتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا[2] جو تنوخ نویں صدی کے اوائل میں بیروت کے مشرقی جانب لبنان کے اندر داخل ہو چکے تھے، وہ پہلے مسلمان عرب خاندان تھے، جنھوں نے پہاڑوں میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس کم آباد علاقے میں جو الغرب کہلاتا تھا، ان تنوخ نے ایک ریاست قائم کر لی، جس پر وہ صدیوں حکومت کرتے رہے۔ عباسی انھیں ایک طرف شمالی لبنان کے مارونیوں اور دوسری طرف سمندر کی طرف سے آنے والے بیزنطینیوں کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ صلیبی جنگجو پہنچے تو یہ لوگ بیروت میں یا اس کے آس پاس رہتے تھے۔ تنوخ سے پیشتر ارسلان خاندان کا بانی، جو لخمی خاندان کے اخلاف میں سے ہونے کا مدعی تھا۔ الغرب میں قدم جما چکا تھا[3] وہ امام اوزاعی کا شاگرد تھا اور اس کی اولاد اب تک دروزیوں کے بلند مرتبت امراء میں شمار ہوتی ہے۔ مان لینا چاہیے کہ متوکل کے بعد شام کے بہت سے مسیحی خاندان (لبنان کے علاوہ) حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ قبولِ اسلام پر ان کی زیادہ تر توجہ اس لیے ہوئی کہ پابندیوں کی ذلت اور ازاء جزیہ سے بچ جائیں، نیز معاشرتی و مجلسی وقار اور سیاسی اثر و رسوخ حاصل کر لیں۔ مسیحی آبادی پہلے ہی اس وجہ سے کم ہو گئی تھی کہ لوگ نکل نکل کر ایشیائے کوچک اور قبرص جا چکے تھے۔ اسلامی فتوحات کے دوسرے دور میں مذہب اسلام کی ظفر مندی بالکل یقینی ہو گئی۔ پہلی فتح اسلامی اسلحہ کی فتح تھی جو دس سال سے کسی قدر کم مدت میں پوری ہو گئی تھی۔

عربی زبان

تیسرے دور کا تعلق زبان سے تھا۔ زبان کی فتح و تسخیر کی رفتار بہت دھیمی تھی اور یہ سب سے آخر میں تکمیل کو پہنچی۔ کشمکش کے اس دائرے میں شام کے اور دوسرے ملکوں کے باشندوں نے بڑی لمبی مدت تک مزاحمت جاری رکھی۔ وہ اس بات پر تو آمادہ ہو گئے کہ سیاسی اور مذہبی وفاداری سے دستکش ہو جائیں، لیکن زبان ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بول چال کی عربی سے پیشتر تحریری

---

[1] مترجم۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، جنھیں مصنف امتیازی قوانین کے لیے سب سے بڑھ کر ملزم ٹھہراتا ہے، ذمی کے قتل کے لیے مسلمان سے قصاص کے قائل تھے اور کم از کم ایک مثال یقیناً موجود ہے کہ انھوں نے ایک ذمی کے بدلے میں مسلمان کو وارثوں کے حوالے کیا اور وہ مسلمان قتل ہوا۔

[2] ابن العبری جلد دوم ص ۱۳۲

[3] محاسن المساعی مناقب الامام ابی عمرو الاوزاعی مرتبہ شکیب ارسلان، الشدیان ص ۶۴۶، ۶۴۷۔

عربی نے میدان مارا۔ شام کے اہلِ علم نے خلفا کی سرپرستی میں عربی تحریر ونگارش کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کے بعد دہقانوں نے نئی بول چال اختیار کی۔ سب سے پرانا عربی مخطوطہ، جو اب تک دستیاب ہُوا ہے، وہ ابو قرہ کا ہے (وفات ۸۲۰ء) اسے ۸۷۷ء میں سینٹ سابا کی خانقاہ میں نقل کیا گیا، جو یروشلم کے نزدیک تھی[1] (مصنّف سینٹ یوحنا دمشقی کا شاگرد اور حران کا ملکی اسقف تھا۔ دینِ اسلام کے قبول نے عربی زبان کا قبول سہل بنا دیا اور اس قبول کی رفتار بھی تیز کردی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک سامی زبان سے دوسری سامی زبان کی طرف منتقل ہونا زیادہ بڑی لسانی مشکلات کا باعث نہ ہوا۔

تیرھویں صدی کے اوائل تک جب عبّاسی دَور ختم ہو رہا تھا عربی زبان کے عام بول چال کا ذریعہ بننے کا سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بیچ میں ایسے علاقے بھی تھے، جنھیں جزیروں کی حیثیت حاصل تھی، یعنی جن میں عربی زبان نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان علاقوں میں غیر مسلموں کی آبادیاں تھیں، مثلاً یعقوبی، نسطوری اور مارونی، صلیبی جنگوں کے دور میں ایسے بہت سے جزیرے قائم رہے۔ ۱۲۱۱ء کے آس پاس جب بنیامین ٹودیلی[2] نے کوہ سینا کا دورہ کیا تو اسے چوٹی پر شامیوں کی ایک عبادت گاہ ملی اور دامن میں ایک گاؤں آباد تھا، جس کے باشندے "کلدانی زبان" بولتے تھے، مارونی لبنان میں مقامی سریانی بولی نے بڑی دیر تک مزاحمت جاری رکھی حتیٰ کہ یہ سترھویں صدی تک سسکتی رہی[3]۔ مشرقی لبنان کے تین دیہات میں اب تک سریانی بولی جاتی ہے، یعنی معلولا، بخعہ اور جبعادین[4]۔ یہ زبان اب تک مارونی اور سریانی کلیسا کی عبادت میں استعمال ہوتی ہے۔ مارونی اپنی دعاؤں اور تسبیحوں میں گرشونی[5] بھی استعمال کرتے ہیں یعنی عربی، جو سریانی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ یونانی زبان بولنے والے شامیوں نے اپنی مادری زبان کے ساتھ ایسی وابستگی کا اظہار نہیں کیا تھا اور یونانی حروف میں اب تک صرف ایک عربی کتبہ ملا ہے۔ یہ بائیبل میں سے لیا گیا ہے۔ (زبور ۷۸، آیات ۲۰، ۳۱، ۵۶، ۶۱) غالباً آٹھویں صدی کے اواخر کا ہے اور ایک اموی مسجد سے دستیاب ہُوا تھا[6]۔

جیسے جیسے غیر عرب کو اسلام اور عربیت کا پابند بنایا گیا، وہ عرب قبیلوں کے ساتھ بہ طور موالی وابستہ ہوتے گئے اور تدریجاً عربوں میں جذب ہو گئے جو پرانا خطِ فاصل عرب وغیر عرب، نیز نئے مسلمانوں اور پرانے مسلمانوں میں قائم تھا، وہ محو ہو گیا۔ سب عرب بن گئے۔ بعد ازاں مملوکوں کے دور میں حضری آبادی کے لیے اولاد العرب کی اصطلاح ایجاد ہوئی۔ یہ اصطلاح اب تک رائج ہے اور ان لوگوں کو عرب بدوؤں سے ممتاز کرتی ہے، عراق وشام کی آرامی بولنے والے لوگوں کا بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا جنھیں تذلیلاً انباط[7] یا علوج کہا جاتا تھا (اجنبی یا ناقابلِ فہم زبان بولنے والے) آرام پرانا نام تھا، اس کی جگہ سیریا کو نیا نام مل گیا، یعنی الشام (ریبار) کیونکہ یہ کعبۂ مکرّمہ کے بائیں جانب واقع ہے۔ یمن (دایاں ہاتھ یا یمین) کے مقابل[8]۔ اس طرح عباسیوں کے ماتحت پوری سامی دنیا عرب بنا لی گئی۔ ایک دین اور ایک زبان نے ان لوگوں میں اتّحاد کا جذبہ

---

[1] تھیوڈورس ابوقرہ کی کتاب میامر تاؤ دورس۔ [2] دیکھیے Itinerary جلد اول ص ۱۵۹۔

[3] دیکھیے حتّی کی کتاب اللغات السامیہ المحکیہ فی سوریا ولبنان ص ۳۰، ۳۴۔

[4] دیکھیے G. Bergstrasser

[5] کرشونی صحیح نہیں اگرشونی سریانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں اجنبی۔

[6] پال کہلے Paul Kahle کی جرمن کتاب۔

[7] مسعودی تنبیہ ص ۷۸، ۷۹۔

[8] مسعودی جلد ۳، ص ۱۳۹، ۱۴۰۔

سریانی شام و لبنان کی عربی زبان پر اپنے کبھی محو نہ ہونے والے اثرات چھوڑے بغیر محو نہ ہوئی۔ یہی اثرات ہیں، جو شامی بولی کو ہمسایہ سرزمینوں کی بولی سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ اثرات تراکیب، مفردات اور اصوات لغویہ میں نمایاں ہیں۔ خانگی اور زرعی الفاظ کا بہت بڑا مجموعہ سریانی سے مستعار لیا گیا ہے[1] مہینوں کے نام براہ راست سریانی سے لیے گئے اور سریانی میں یہ نام اکادی زبان سے آئے تھے[2]

---

[1] مثالوں کے لیے دیکھیے مائیکل، ٹی فیغالی (Fighli) کی کتابیں، نیز یوسف حبیقہ فی مجلة المشرق، غناطیوس اخرام فی مجلة المجمع العلمی العربی، انیس فریحہ: معجم الالفاظ العلمیہ فی اللہجة اللبنانیہ۔

[2] ابتدا دسمبر اور جنوری سے ہوتی ہے "کانون" اول و ثانی جس کے معنی ہیں انگیٹھی "شباط"، مارنے والا یا مہلک" اذار" ابر آلودگی "نیسان" پرچم، جنگ، "ایار" بیج کا پیدا ہونا "حزیران" فصل کٹنا "تموز": میٹھے پانی کا بچہ "آب" سرکنڈے"، ایلول" جشن، "تشرین" اوّل و ثانی (اکتوبر، نومبر) کا مطلب ہے" سورج دیوتا کی نذر"

بیالیسواں باب

احیاءِ علومِ عربیہ میں شام کا حصّہ

یونانی سے ترجمے

عربوں کی عمومی بیداری اور ذہنی احیا و ارتقا کے جن کارناموں کا مرکز عبّاسی عہد کا بغداد تھا اور جو کلاسیکی اسلام کی عظمت کے سب سے بڑے نشان بنے اور اب تک ہیں، ان میں جس قوم نے سب سے بڑھ کر حصّہ لیا، وہ سُریانی بولنے والے مسیحی تھے۔ بن ۷۵۰ء اور ۸۵۰ء کے درمیان عربی دنیا فکر و نظر کی تاریخ میں نہایت جلیل الشّان اور نہایت اہم تحریکات کا مرجع رہی۔ ان میں ایک تحریک یہ بھی تھی کہ فارسی، یونانی اور سریانی زبان سے مختلف کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے۔ عرب مسلمان اپنے ساتھ کوئی فن، کوئی سائنس یا فلسفہ نہیں لائے تھے۔ بلکہ ان کے ادبیات کو بھی بہ مشکل کوئی وقعت دی جا سکتی تھی، لیکن وہ اپنے ساتھ صحرا سے ایک تیز ذہنی تجسّس، علم حاصل کرنے کی بے پناہ تڑپ اور متعدّد خوابیدہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ "ہلالِ زرخیز" میں انھیں یونانی سائنس اور ذخیرۂ علوم کی وراثت مل گئی اور بلاشبہ یہ نہایت قیمتی ذہنی خزینہ تھا جو ان کے ہاتھ لگا۔ تاسیس بغداد (۷۶۲ء) کے بعد چند ہی عشروں میں عربی خواں عوام کے سامنے ارسطو کی بڑی بڑی فلسفیانہ تصانیف، نوفلاطونیوں کی شرحیں، بقراط و جالینوس کی اعلیٰ طبّی تصانیف، اقلیدس کی ریاضیات اور بطلیموس کے جغرافیائی شاہکار مہیّا ہو گئے۔ ان تمام چیزوں کے مہیا کرنے میں اہلِ شام واسطہ بنے۔ عرب یونانی نہیں جانتے تھے، لیکن اہلِ شام کو ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدّت سے یونانی کے ساتھ ربط ضبط رہا تھا۔ ظہورِ اسلام سے دو سو سال پیشتر شامی علماء یونانی کتابوں کے ترجمے سُریانی زبان میں کر چکے تھے۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے اسکندریہ کی درس گاہِ فلسفہ کو انطاکیہ میں منتقل کر دیا گیا تھا، لیکن اس سے بہت پہلے سریانی کلیسا کی خانقاہوں میں ترجموں کا شدید تلاطم بپا رہا تھا۔ جن لوگوں نے یونانی سائنس اور فلسفے کے گنجینوں کا دروازہ پہلے ایرانیوں کے لیے کھولا تھا، اب وہ لوگ وہی کام عربوں کے لیے انجام دینے لگے۔ جو لوگ ظہورِ اسلام سے پیشتر یونانی حضارت کے اہم عناصر کے نشو و ارتقا کا ذریعہ بنے تھے اور یہ حضارت انھوں نے مشرقی سمت میں الرّہا، نصیبین، حرّان اور جند شاپور کی درس گاہوں تک پہنچائی تھی، وہی لوگ اب ان عناصر کو عربی خواں دنیا تک پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ رومی عہد میں ان لوگوں نے مادی تہذیب کے لیے واسطہ بن کر مشرق کی مصنوعات مغرب تک پہنچائی تھیں، اب وہ لوگ مغربی حضارت کو مشرقی معاشرے میں رائج کرنے کا واسطہ بن گئے۔

مسیحیت کے مذہبی کارکنوں کو الٰہیات کے مناظروں کے لیے ارسطو کی منطق اور نوفلاطونیوں کے فلسفے کی اہمیّت کا خصوصی احساس ہو چکا تھا اور یہ چیزیں اُس زمانے میں ذہنی و فکری زندگی کی روح و رواں سمجھی جاتی تھیں۔ انجیلوں کے ابتدائی آرامی مخطوطات گم ہو چکے تھے۔ ان کا ترجمہ بھی یونانی زبان سے کیا گیا۔ عہدِ قدیم کا سبعینی ترجمہ بھی سریانی میں ہوا۔ الرّہا کی درس گاہ کا افتتاح ۳۶۳ء میں ہوا تھا۔ یہ درس گاہ سریانیت کی نظری سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ یہیں کے ایک پروفیسر نے فرفوریوس کی کتاب ایساغوجی کا ترجمہ پہلی مرتبہ کیا۔ یہ منطق کی وہ ممتاز کتاب ہے، جسے بالعموم ارسطو کے مقولات کا مقدّمہ کہا جاتا ہے۔ ارسطو کی اس کتاب کا ترجمہ ایک اور سریانی جالبج نام نے

کیا جیسے ۶۸۶ء میں عرب قبائل کا اسقف بنا دیا گیا تھا۔ اس کے حلقے میں تنوخ۔ تغلب اور شام دوآبۂ دجلہ و فرات کے دوسرے صحرائی قبائل شامل تھے۔ ایک اور سریانی نے اسلامی فتوحات کے آغاز سے قبل ارسطو کی کتاب العبارہ کی شرح لکھی۔ سریانی شرحیں عربی شرحوں کے لیے نمونہ بن گئیں۔ ۴۳۹ء میں شہنشاہ زینو نے الرّہا کا ادارہ بند کر دیا تو وہاں سے نکلے ہوئے۔ اساتذہ مشرقی سرحد کو عبور کر کے حران چلے گئے، جو اس زمانے میں ایرانیوں کے ماتحت تھا اور وہاں ایک مسیحی اکاڈمی کا افتتاح کیا، یا کہہ لیجیے کہ پہلے سے ایک اکاڈمی موجود تھی، جو بند ہو گئی تھی، اسے از سرِ نو جاری کیا۔ بیزنطینی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ سلطنت میں مذہبی یکسانی بہ زور قائم رکھی جائے۔ اس وجہ سے جن لوگوں پر زد پڑی، انھوں نے ایرانی علاقوں میں پناہ لی۔

فلسفے اور الٰہیات کے علاوہ طب اور ہئیت نے بھی شامیوں کی توجّہ اپنی طرف کھینچی۔ ہئیت کو اس لحاظ سے طب کے ساتھ خاص تعلّق تھا کہ اس کا سارا کاروبار ستاروں کی بنا پر چلتا تھا۔ ۵۵۵ء میں کسریٰ نوشیرواں نے طب اور فلسفے کی ایک اکاڈمی جندیشاپور میں قائم کی۔ اس میں بہت سے ممتاز پروفیسر مسیحی تھے، جو سریانی زبان میں اسے تعلیم دیتے تھے۔ ان میں سے ایک جرجیس (جارج) ابن بختیشوع اس اکاڈمی کا ڈین تھا۔ خلیفہ المنصور نے ۷۶۵ء میں اسے طبّی مشورے کے لیے بلایا اور اسلام کی دعوت دی۔ جرجیس نے جواب دیا کہ میں اپنے آبا و اجداد کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، خواہ وہ جنّت میں جائیں یا جہنّم میں۔ جرجیس اس خاندان کا بانی تھا، جس کے طبیب چھ یا سات پشتوں تک دربار کے پورے معالجات کے اجارہ دار تھے۔ اس کا بیٹا بختیشوع (وفات ۸۰۱ء) ہارون الرشید کے زمانے میں بیمارستان بغداد کا سر طبیب تھا۔

حنین ابن اسحاق

یوحنّا ابن ماسویہ ایک اور بختیشوع کا مسیحی شاگرد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ہارون الرّشید کے لیے بہت سے مخطوطات کا ترجمہ کیا۔ ان میں سے زیادہ تر طبّی مخطوطات تھے، جنھیں وہ ایشیائے کوچک پر حملے سے واپسی کے وقت ساتھ لایا تھا۔[2] یوحنّا کا شاگرد حنین[3] ابن اسحاق تھا۔ وہ اس عہد کا سب سے بڑا مترجم اور شریف ترین کردار کا آدمی تھا۔ اس کا تعلّق مشرقی سریانی کلیسا سے تھا۔ حیرہ میں پیدا ہُوا۔ مامون الرّشید نے اسے بیت الحکمت کا اعلیٰ افسر بنا دیا۔ بیت الحکمت مامون الرّشید نے قائم کیا تھا، جو اکاڈمی، کتب خانے، عجائب خانے اور دار الترّجمہ کا مجموعہ تھا۔ حنین کے کام میں اس کا بیٹا اسحاق[4] اور ربیحا جیش ابن الحسن معاون تھے۔ حنین کو یونانی میں زیادہ مہارت تھی، اور بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے یونانی سے سریانی میں ترجمے کا مسودہ تیار کر دیتا تھا۔ معاون اس ترجمے کو عربی میں منتقل کر دیتے تھے۔ اس طرح ارسطو اور جالینوس کی بیشتر تصانیف عربی خواں طلبہ کی دسترس میں آگئیں۔[6] بیان کیا جاتا ہے کہ حنین نے بقراط کے

---

[1] القفطی تاریخ الحکما، ص ۱۵۸، ۱۶۰، فہرست ص ۲۹۶، ابن العبری ص ۲۱۳-۲۱۵، ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۱۲۵

[2] ابن العبری ص ۲۲۷، ابن ابی اصیبعہ جلد اوّل ص ۱۷۵، قفطی ص ۳۸۰۔

[3] Johannititus (۸۰۹ء-۸۷۳ء)

[4] ابن خلکان جلد اول ص ۱۱۶۔

[5] فہرست ص ۲۹۷، ابن العبری ص ۲۵۲۔ ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۱۸۷، ۲۰۳۔

[6] حنین نے جالینوس کی تصانیف کے ان سریانی ترجموں سے بھی فائدہ اٹھایا، جو ایوب الرہاوی (۷۶۰ء-۸۳۵ء) نے کیے تھے۔

بہت سے طبی رسالوں اور افلاطون کی جمہوریت کو بھی عربی کا لباس پہنایا۔ ان ترجموں کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سریانی ترجمہ یونانی سے زیادہ قریب تھا اور عربی میں سریانی کا مفہوم بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ حنین محض مترجم نہ تھا، متوکل نے اسے اپنا طبیب خاص مقرر کر لیا تھا اور ایک مرتبہ جیل خانے بھی بھیج دیا، کیونکہ حنین نے خلیفہ کے ایک حکم کی سرتابی کرتے ہوئے دشمن کے لیے زبردست زہر تیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

حنین کا ایک شاگرد یحییٰ بن علی تھا (وفات ۹۷۴ء)۔ اس نے ان تمام کتابوں پر نظر ثانی کی، جن کے ترجمے ہو چکے تھے۔ علاوہ بریں ارسطو کی کتاب الشعر اور افلاطون کی کتاب النوامیس اور کتاب الطیماوس کے ترجمے نئے سرے سے کیے۔ یحییٰ کا تعلق مغربی سریانی کلیسا سے تھا۔ اس کلیسا نے ادبی علماء پیدا کیے، جنھوں نے مشرقی کلیسا والوں کی پیروی میں علمی کارنامے انجام دیے اور ان کی کتابوں میں اصلاحیں کیں۔ حنین کا ایک معاصر قسطا ابن لوقا بعلبکی (وفات ۹۱۲ء) تھا، جس نے ریاضی اور فلسفے کی کتابوں کے ترجموں میں امتیاز حاصل کیا۔ قسطا یونانی، سریانی اور عربی، تینوں زبانیں جانتا تھا۔ اس نے مخطوطات کی تلاش میں بیزنطینی علاقوں کا سفر کیا۔ پھر بغداد میں بیٹھ کر ان کے ترجمے کیے۔ آرمینیا میں وفات پائی، جہاں اس کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر ہوا۔ اس نے اکثر مستقل تصانیف اور سترہ ترجمے یادگار چھوڑے[1]۔

سریانیوں کو یونانی شاعری اور ڈرامے سے قطعاً اعتناء نہ تھا اور یہی کیفیت عربوں کی تھی۔ ایک مارونی منجم نے، جو خلیفہ مہدی عباسی کا ملازم تھا، ہومر کی ایلیڈ اور آڈیسے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، لیکن وہ چل نہ سکا[2]۔ اس شخص کا نام تاؤفیل[3] تھا اور وہ الرّہا کا باشندہ تھا۔

صابیین

محض مسیحیوں ہی نے نہیں، بلکہ شام کے لادینی فرقوں نے بھی عربوں کی فکری زندگی میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ یہ صابی تھے، بلکہ انھیں نام نہاد صابی کہنا درست ہوگا[4]۔ ان کا مرکز حرّان تھا۔ یہ ستاروں کی پوجا کرتے تھے اور بابلی روایات کے وارث بن گئے تھے۔ انھوں نے نجوم اور اس کے متعلقہ علوم کے ساتھ ابتدا ہی سے دل بستگی پیدا کر لی تھی۔ یونانی علوم کے ساتھ محبّت کے لحاظ سے وہ مسیحی ہم وطنوں کے ہمسایہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ بڑا اور ممتاز عالم ثابت ابن قرّہ (۸۳۶ء۔ ۹۰۱ء) تھا۔ ثابت اور اس کے شاگردوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یونانی ہیئت اور ریاضی کی بیشتر کتابوں کا ترجمہ کر دیا تھا۔ ان میں بطلیموس اور ارشمیدس کی کتابیں بھی شامل تھیں[5]۔ نیز انھوں نے پہلے ترجموں پر نظر ثانی کی۔ حنین نے اقلیدس کا جو ترجمہ کیا تھا، ثابت نے اس میں اصلاحیں کیں[6]۔ ثابت کے بعد اس

---

[1] فہرست ص ۲۹۵، قفطی ص ۲۶۲، ۲۶۳۔

[2] السمعانی جلد اوّل ص ۵۲۱، ۵۲۲، ابن العبری ص ۲۲۰، تاریخ سوریہ جلد ۳، ص ۲۹۷۔

[3] Theophile

[4] حتّی، تاریخ عرب انگریزی ص ۳۵۸۔

[5] فہرست ص ۲۶۷، ۲۶۸، ابن ابی اصیبعہ جلد اوّل ص ۲۱۸، ۲۲۰۔

[6] ابن خلکان جلد اوّل ص ۱۷۷، ۲۹۸۔

کے ایک بیٹے، دو پوتوں اور ایک پڑپوتے نے علم و فضل میں ناموری حاصل کی۔ اس کے بیٹے سنان کو خلیفہ نے قبولِ اسلام پر مجبور کر دیا۔ حنین کے بیٹے اسحٰق نے بھی اسلام اختیار کر لیا تھا۔[1]

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ریاضی اور ہیئت کے باقی رسالے ان آرامیوں اور سریانیوں نے عربی میں ترجمہ کیے جو بابلی علاقے میں رہتے تھے، مثلاً الجبرا (الجبر) الخوارزمی (وفات ۸۵۰ء) کے قلم سے ایک مستقل علم کی شکل میں نمودار ہوا۔ بابلیوں نے پہلے سے اس علم کے لیے ایک نام طے کر رکھا تھا اور وہ نام وہی تھا جو الخوارزمی نے اختیار کیا۔ یعنی "غبرو"۔[2] افسوس کہ سریانیوں اور بابلیوں کے درمیان اتصال کی کڑیاں مفقود ہیں۔

مستقل تصانیف

ظاہر ہے کہ سریانی ادب کا بیشتر حصہ ترجموں اور شرحوں پر مشتمل تھا اور اس میں مستقل یا تخلیقی کتابیں بہت کم تھیں۔ صرف چند کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک دائرے میں شامی راہب ناقلوں اور مقلدوں سے کسی قدر زیادہ تھے۔ یہ وہی دائرہ ہے جسے تصنیف کا متوازی سمجھنا چاہیے۔ اسحاق ساکن نینوا چھٹی صدی کے اواخر میں گزرا ہے۔ وہ اپنے مکاتیب و خطبات میں فکر و مراقبہ کی زندگی پر زور دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہی الہام کی روح ہے، یہی روح ثانی ہے اور یہ روح عقل و استدلال کے بطن سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے پیروؤں کو تاکید کرتا تھا کہ خلوت اختیار کرو اور اس امر پر توجہ جماؤ کہ صرف تم اس دنیا میں زندہ ہو اور خدا ہے، جو تمھاری تمام توجہات کا مرکز ہے۔ مسیحی زاہدوں میں سے ایک اور سریانی تھا، جس کا نام سمعان طیبونہ (وفات حوالی ۶۰۰ء) تھا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ علم کا کم از کم ایک حصہ ایسا ہے، جو لفظوں کے ذریعے سے ذہنی گرفت میں نہیں آتا، بلکہ اس کے لیے دل کے خاموش غور و فکر سے کام لینا ضروری ہے۔ یہی علم کا بلند ترین حصہ ہے جو حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔[3]

مسلمانوں کا حصہ — ابو تمام

اس دور میں مسلمانانِ شام کی بہترین صلاحیتیں شعر و سخن میں نمایاں ہوئیں۔ ان میں سے دو شخصیتیں ایسی تھیں، جنھوں نے عباسیوں کے ماتحت درباری ہونے کا اعزاز حاصل کیا — ایک ابو تمام — دوسری البحتری۔

حبیب ابن اوس معروف بہ ابو تمام (۸۰۴ء–۸۵۰ء) جاسم نام ایک مقام پر پیدا ہوا، جو علاقہ حوران میں واقع ہے۔ باپ مسیحی اور دوا فروش تھا۔ قبول اسلام کے بعد ابو تمام قبیلہ طے سے وابستہ ہو گیا۔ وطن کے دوسرے ادیبوں کی طرح اس نے بھی دنیائے اسلام کا دورہ کیا۔ مثلاً مصر گیا جہاں سقائی کرتا رہا۔ پھر حجاز، آرمینیا، ایران اور عراق میں پھرا، بعد ازاں بغداد میں مقیم ہو گیا۔ وہ خلیفہ معتصم سے نئے دارالحکومت

---

[1] البیہقی تاریخ حکماء الاسلام ص ۱۹۔

[2] جو علمی اصطلاحات یونانی اور لاطینی سے براہ راست یا بہ واسطہ سریانی لی گئیں، وہ اب تک رائج ہیں، مثلاً فلسفہ، جغرافیہ، موسیقی، بعض لاطینی اور یونانی الفاظ معرب کر لیے گئے، مثلاً کورہ (ضلع)، اسکلہ (بندرگاہ)، نوتی (ملاح) انگریزی ناٹیکل (Nautical) سیف (تلوار، یونانی سیفوس)، جو ایرانی الفاظ معرب کیے گئے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے البستان، دیدب (سنتری، نگہبان) سراویل (شلوار، صولجان (چوگان)

[3] مارگریٹ سمتھ کی کتاب An Early Mystic of Bagdad

[4] یہ تادوس (تھیوڈوسیس) کا بگاڑ ہے۔ ابن خلقان جلد اوّل ص ۲۱۴، السیوطی حسن المحاضرہ جلد اول ص ۲۶۷۔

سامرہ میں ملا اور عموریہ کے خلاف اس کے فاتحانہ اقدام (۸۳۸ء) میں ہم رکاب تھا۔ اس مہم کو اُس نے ایک قصیدے میں زندہ جاوید بنادیا۔ یہ قصیدہ آج بھی عرب نوجوانوں کی زبانوں پر ہے۔ ادیبوں کی طرح وہ شراب بھی پیتا تھا، گانا بھی سنتا تھا اور مذہبی احکام کا پابند نہ تھا۔[1] اُس کی شہرت کا انحصار صرف اس کے قصائد پر نہیں، بلکہ حماسہ[2] کی ترتیب پر بھی ہے، جس میں اس نے جاہلیت سے اپنے عہد تک عرب شاعری کے منتخب شاہکار شامل کرلیے۔ عربی ادب کا یہ گنجینہ یوں مرتب ہوا کہ ابو تمام ایک مرتبہ سفر پر روانہ ہوا۔ ہمدان پہنچا تو اتنی برف پڑی کہ راستے بند ہو گئے اور وہ ٹھہرنے پر مجبور ہو گیا۔ جس عالم شخص کا وہ مہمان تھا، اس کے کتب خانے میں صحرائی عربوں اور دوسرے لوگوں کے مجموعہ ہائے اشعار موجود تھے۔ ابو تمام نے فرصت کے اوقات ان مجموعے کے مطالعے میں گزارے اور حماسہ مرتب کردیا[3]۔ اس کی زندگی کا آخری دور موصل میں بسر ہوا۔ وہیں اس کی قبر ہے۔

ابو عبیدہ بحتری

ابو عبیدہ البحتری ابو تمام کے نوجوان معاصروں میں سے تھا (۸۲۰ء-۸۹۷ء)۔ وہ منبج (ہیراپولیس) میں پیدا ہوا اور قبیلہ طے کی ایک شاخ بحتر سے اس کا تعلق تھا۔[4] بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ حمص میں اپنا قصیدہ سنا رہا تھا، ابو تمام بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اُس نے بحتری میں شاعری کے خداداد جوہر دیکھے تو معرۃ النعمان کے لوگوں نے چار ہزار درم اس کو دیے۔ بحتری کو ابو تمام کی شاعری بہت پسند تھی اور وہ اسی کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ بغداد پہنچا تو متوکل نے اُسے ملک الشعراء بنادیا۔ متوکل کے جانشینوں نے بھی اسے اس منصب پر قائم رکھا۔ خصوصاً خلیفہ معتز کی اُس پر بہت نظرِ عنایت تھی۔ بحتری اتنا بخیل تھا کہ بہت غلیظ لباس پہنتا، اپنے غلام اور بھائی کو بھوکا رکھتا، یہاں تک کہ اُن کی جان کے لالے پڑ جاتے تھے[5]۔ اپنے ہم پیشہ آدمیوں کی طرح وہ بھی ذی اثر اور ذی ثروت اصحاب سے صلے حاصل کرتا، بلکہ دھمکی بھی دے دیتا کہ اگر صلہ نہ دیا تو، ہجو کردوں گا۔ اُس کے دیوان میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں کی مدح کی، ان کی ہجو بھی کہی۔ اسے شراب سے بڑی دل چسپی تھی۔ اپنے شعروں میں مقامات، چشموں اور وحشی جانوروں کی تفصیلات بیان کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔[6] عربی شاعری میں ایسی مثالیں بہت شاذ ہیں۔ دیوان کے علاوہ بحتری نے حماسہ بھی مرتب کیا۔ لیکن عرب ماہرینِ لسانیات کی نگاہوں میں اسے ابو تمام کے حماسہ کی سی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ عرب نقاد بحتری کو عربی کے تین بڑے شاعروں میں شمار کرتے ہیں، دوسرے دو ابو تمام اور متنبی ہیں۔ غالباً یورپی نقاد بحتری کو متنبی کا ہم پایہ نہ سمجھیں، تاہم شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے وہ ابو تمام پر فائق تھا۔[7]

---

[1] مسعودی جلد ۷ ص ۱۵۱۔

[2] تبریزی شرح دیوان حماسہ۔

[3] ابن خلکان جلد اول ص ۴۶۸۔

[4] یاقوت معجم الادبا جلد ۷ ص ۲۶۴۔

[5] اغانی جلد ۱۸ ص ۱۷۰۔

[6] دیوان جلد اول ص ۱۰۸، ۱۶، ۵۱، ۱۱۱۔

[7] مارگولیتھ کا مقالہ البحتری انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

دیک الجنّ

ان سے بہت کم درجے کا ایک شاعر عبدالسلام ابن رغبان (۷۷۷ء-۸۴۹ء) تھا، جو دیک الجنّ (جنّ کا مرغ) کے لقب سے مشہور تھا، کیونکہ اس کے خط وخال بہت مکروہ تھے اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ حمص کا باشندہ تھا اور وطن سے باہر کبھی نہ گیا۔ غالباً وہ ابتدا میں مسیحی تھا۔ لیکن جنگ موتہ ———— میں مسلمان ہو گیا۔ دیک الجنّ کو اس وجہ سے خاص حیثیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی نظموں میں مفتوحین کی حمایت کی اور عربوں کے مقابلے میں شامیوں کی برتری پر زور دیا۔ مراد یہ ہے کہ وہ شامی عربوں کو دوسرے عربوں پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کی بہت کم نظمیں محفوظ ہیں۔ اُسے ادب میں اُس دلچسپ ذہنی تحریک کا عَلَم دار کہا جا سکتا ہے، جو شعوبیت کے نام سے مشہور ہوئی، اُس نے ایران اور دوسری سرزمینوں میں سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ دیک معتدل شیعہ تھا۔ اس نے دولت عیش و نشاط میں ضائع کر دی اور رقیبانہ جنون کے عالم میں اپنی بیوی کے مہلک زخم لگائے، جو ابتدا میں ایک مسیحی لونڈی تھی ———— بالآخر اسے بیوی کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ اس کی روح دیک الجن کو درد و کرب کا ہدف بناتی رہی، اور یہ سب کچھ اس نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے[۱]

امام اوزاعی

دین و فقہ کے دائرے میں ممتاز شخصیت مشہور فقیہ عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی کی ہے[۲] امام موصوف بعلبک میں پیدا ہوئے۔ (۷۰۷ء) بیروت میں زندگی بسر کی۔ وہیں ۷۷۴ء میں ایک حمام کے اندر وفات پائی۔ ان کا مقبرہ اب تک شہر کے جنوبی حصے میں موجود ہے۔ وہ بہت بڑے عالم اور زاہد تھے اور اخلاقی جرأت میں ان کا پایہ بہت اونچا تھا۔ ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ وہ شام کے امام تھے اور شام نے اُن سے بڑا عالم کوئی پیدا نہیں کیا[۳]۔ اوزاعی کا فتویٰ یہ تھا کہ جو ذمّی اسلامی فوج میں شامل ہو کر لڑے وہ مسلمانوں کے برابر مالِ غنیمت کا زیادہ حق دار ہے[۴]۔ جب خلیفہ منصور شام پہنچا تو اس نے الاوزاعی کا خطبہ بھی سُنا اور بڑی تعریف کی۔ ان کا مرتّب کیا ہُوا فقہی نظام دو سو سال تک شام میں رائج رہا۔ پھر حنفیؒ اور شافعیؒ نظام رائج ہو گئے۔ اندلس اور مغرب میں بھی فقہِ مالکؒ کی ترویج سے بیشتر چالیس سال تک الاوزاعی کے نظام پر عمل ہُوا۔

نظام اوزاعی کے متعلّق زیادہ معلومات نہیں، غالباً اس پر رومی قانون کے اثرات موجود نہ تھے، جو شام میں رائج رہا اور جس کی سب سے بڑی درس گاہ بیروت میں تھی، جہاں امام موصوف نے زندگی گزاری۔ اسلام میں فوج داری کا قانون، نیز شادی، میراث، ربا اور دوسرے معاملات کے متعلّق تمام قوانین الہامی ہیں، صرف معاملات میں دونوں نظاموں کے درمیان مشابہت کی مثالیں ملتی ہیں۔ عربی اور لاطینی کی قانونی اصطلاحات میں بھی یکسانی پائی جاتی ہے، مثلاً فقہ (جیورس پروڈنس)، فتویٰ (رائے)، اجماع[۵]، عادہ[۶]

---

۱ خلکان جلد اوّل ص ۵۲۶، ۵۲۷، اغانی جلد ۱۲ ص ۱۴۳-۱۴۶۔

۲ اوزاعی نام یا تو ایک یمنی قبیلے سے لیا گیا یا دمشق کے ایک نواح سے، یاقوت جلد ۱۲، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ ابن الاثیر اللباب ص ۷۴، ۷۵، نیز طبری اور ابوالفدا۔

۳ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۹۳

۴ طبری اختلاف الفقہاء ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

۵ Consensus

۶ Custom

مصلوٰۃ عامہ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک نظام دوسرے پر موقوف ہے۔ مستعار الفاظ یا یونانی و لاطینی سے معرّب الفاظ نہیں ملتے، نہ کوئی رومی یا بیزنطینی کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی۔

تینتالیسواں باب

شام چھوٹی سلطنتوں کے ماتحت

طولونی

عبّاسی حکومت میں داخلی انحطاط کا پہلا نشان یوں واضح ہوا کہ ترکی فوج نے المامون (وفات ۸۳۳ء) کے جانشین معتصم کے عہد میں بغاوت کر دی۔ عثمانی تاریخ کے ینی چریوں کی طرح یہ ترکی فوج بھی بہت طاقت پکڑ گئی تھی۔ خلیفہ اس کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اور بعض اوقات انتہائی ذلت سے ان کی رضا پوری کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ کچھ وقفوں کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد عبّاسی طاقت مستقل طور پر گھٹنی شروع ہوئی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ خلافت تدریجاً خودکشی کی حرکتیں کر رہی ہے، گویا تیار ہو رہی ہے کہ تاتاری غول آئیں اور ایک ٹھوکر لگا کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ خلافت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو چھوٹے چھوٹے خاندان جا بجا برسرِ حکومت آ گئے۔ ان میں سے زیادہ تر عربی الاصل تھے اور وہ مغربی سمت میں عبّاسی خلافت کے علاقوں کو باہم تقسیم کر رہے تھے۔ اس اثناء میں دوسرے خاندان جو زیادہ تر ترک اور ایرانی تھے، مشرق میں وہی عمل انجام دے رہے تھے۔

ان میں سے پہلا خاندان، جس سے شام کو واسطہ پڑا، طولونی تھا (۸۶۸ء-۹۰۵ء)۔ اس کم عمر خاندان کی بنیاد احمد بن طولون (۸۶۸ء-۸۸۴ء) نے رکھی تھی، جس کا باپ بخارا سے بہ طور ہدیہ مامون کے پاس آیا تھا[۱]۔ احمد نے اپنی غیر معمولی سیاسی زندگی اس وقت شروع کی، جب اس کا سوتیلا باپ مصر کا گورنر اور جاگیردار مقرر ہوا اور اس نے احمد کو نائب کی حیثیت میں اپنے سے پہلے مصر بھیج دیا۔ نوجوان احمد نے وہاں پہنچتے ہی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ مصر مرکزی حکومت سے بہت فاصلے پر واقع ہے للذا اسے عملاً آزاد کرا لینا کچھ مشکل نہیں[۲]۔ اس نے خلیفہ سے اجازت منگوا کر فوج کی تعداد بڑھالی۔ ایک بیان یہ ہے کہ تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ پھر شام میں ایک باغی کا سر کچلنے کے لیے روانہ ہو گیا اور معلوم ہے کہ شام عبّاسیوں کے خلاف ابتدا سے بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یوں ابن طولون کو ہمسایہ ملک میں داخلے کا موقع مل گیا۔ ۸۷۷ء میں شام کے گورنر کا انتقال ہوا تو ابن طولون نے اس موقع کو مستقل قبضے کے لیے بہت مناسب سمجھا۔ چنانچہ مصری فوج رملہ کے راستے دمشق پہنچی اور وہاں سے شمالی جانب کوچ کرتی ہوئی حمص، حماہ اور حلب پر بلا مزاحمت قابض ہو گئی۔ صرف انطاکیہ نے مقابلہ کیا، لیکن معمولی سے محاصرے کے بعد وہ بھی مسخر ہو گیا[۳]۔ ۲۶۶ھ-۸۸۰ء میں احمد نے دونوں ملکوں میں اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ آزادی کا عملی

---

[۱] ابن خلدون جلد ۳ ص ۲۹۵ - جلد ۴ ص ۲۹۷

[۲] یعقوبی جلد ۲ ص ۶۱۵ سے آگے، طبری جلد ۳ ص ۱۲۹۷۔

[۳] ابن خلدون جلد ۴ ص ۳۰۰، ۳۰۱، کندی ص ۲۱۹ سے آگے۔

امتحان ۲۵۸ھ میں ہو چکا تھا، جب خلیفہ المعتمد نے شدید ضرورت کے ماتحت مصری نائب السلطنت سے روپیہ مانگا اور اس نے کچھ نہ دیا۔

یہ واقعہ تاریخ مصر میں انقلاب انگیز تھا، یعنی مصر اسی وقت سے ایک مستقل سلطنت کی راہ پر لگ گیا اور اس کی یہ حیثیت، ایک اہم مداخلت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے بعد کی صدیوں میں برابر قائم رہی۔ شام اس پوری مدت میں مصر کے ساتھ رہا، جس طرح فرعون کے زمانے میں ساتھ رہا تھا۔ جو قدیم تعلقات ایک ہزار سال پیشتر منقطع ہو گئے تھے، وہ دوبارہ قائم کر لیے گئے تھے۔ اس آزادی سے سرزمین نیل نے فائدہ اٹھایا۔ کم از کم یہ فائدہ بالکل واضح تھا کہ پورا مالیہ خود ملک پر خرچ ہونے لگا، لیکن شام کی حیثیت تابع کی رہی اور اس میں کچھ اصلاح نہ ہوئی۔

احمد ایک مثالی فوجی ڈکٹیٹر تھا۔ اس کی حکمرانی کا ہاتھ فولادی تھا۔ اس نے ایک طاقت ور جنگی نظام تیار کیا اور اسی کے سہارے تخت حکومت بچھایا۔ اس کی محافظ فوج میں چوبیس ہزار ترک اور چالیس ہزار حبشی غلام تھے[۱]۔ ان سب سے وفاداری کا حلف اٹھوایا۔ اختیارات کے غصب کو عوام کی نظروں میں جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے رفاہ عامہ کا ایسا منصوبہ تیار کیا، جس کی کوئی مثال عہد فراعنہ کے بعد موجود نہ تھی۔ اس نے اپنے دارالحکومت الفسطاط اور اس کی نئی آبادی القطائع[۱] کو عالیشان عمارتوں سے آراستہ کر دیا، جن میں سے ایک بیمارستان تھا اور ایک مسجد۔ بیمارستان[۲] پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے اور مصر میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ تھا شام میں — ایک خاص جائداد کی آمدنی بیمارستان کے مصارف کے لیے الگ کر دی گئی تھی۔ مسجد، جو اسی کے نام سے موسوم ہوئی، اسلامی مصر کی نہایت عالی شان عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس پر بیمارستان سے دگنی رقم خرچ ہوئی[۳] اور بعض خصائص کے اعتبار سے اس میں سامرہ کا طرز تعمیر پیش نظر رکھا گیا، جہاں احمد بن طولون نے جوانی کے دن گزارے تھے۔ اس کا مینار مصر میں اپنی نوعیت کی قدیم ترین عمارت ہے۔ عراقی طرز تعمیر بھی زیادہ پھیل نہ سکا۔ ابن طولون کی مسجد اس طرز کی واحد عالی شان عمارت رہ گئی۔

شام کے ساحل پر ابن طولون نے عکہ میں استحکامات کیے اور وہاں ایک زبردست بحری مرکز بنا دیا۔ اس کی دُہری فصیل کا برج اتنا مضبوط تھا کہ اس نے تین سو سال بعد صلیبی مہموں میں شریک ہونے والے دو بادشاہوں کی مشترکہ کوششوں کو ناکام رکھا اور ۱۷۹۹ء میں نپولین نے توپوں سے گولہ باری کی، تاہم عکہ مسخر نہ ہو سکا۔ شام کا جغرافیہ نگار مقدسی لکھتا ہے[۴] کہ میرے دادا کو بندرگاہ کی تعمیر کا غیر معمولی کام انجام دینے کے لیے یروشلم سے بلایا گیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے شہتیر رسّوں سے باندھ لیے اور ان پر بھاری پتھر رکھے۔ وسط میں ایک دروازہ رکھا گیا اور لمبی لمبی زنجیریں لگا دی گئیں۔ جب کوئی جہاز بندرگاہ میں رات کے وقت داخل ہوتا تو یہ زنجیر کھینچ دیتا اور بندرگاہ والوں کو اس کی آمد کی اطلاع مل جاتی۔

---

[۱] مقریزی جلد اوّل ص ۳۱۳ سے آگے۔ قطائع کے معنی ہیں وارڈ یا حلقے، جو آبادی کی غرض سے مختلف آدمیوں کو دیے جائیں۔ بغداد میں بھی ایسے حلقے موجود تھے، مثلاً قطیعہ زبیدہ بنت جعفر بن المنصور۔

[۲] ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر والقاہرہ جلد ۲ ص ۱۱، کندی ص ۲۱۶۔

[۳] ابن تغری بردی جلد ۲ ص ۸، ابن خلکان جلد اوّل ص ۹۷۔

[۴] ص ۱۶۲، ۱۶۳۔ یاقوت نے بھی یہ اقتباس دیا ہے، دیکھیے جلد ۳ ص ۷۰۷، ۷۰۸۔

خمارویہ

احمد بن طولون کے بعد اس کا فضول خرچ اور بدروش بیٹا خمارویہ حاکم بنا (۲۸۴ھ۔ ۸۹۵ء) جس کی عمر صرف بیس سال کی تھی اور وہ اپنے والد کے تینتیس بچوں میں سے ایک تھا، جن میں سے سترہ بیٹے تھے[1]۔ خمارویہ نے ایک قصر تعمیر کرایا۔ اس میں ایک ہال تھا، جس کی دیواریں سونے سے منڈھی ہوئی تھیں اور خود اس کی، نیز اس کی بیویوں اور گانے والی عورتوں کی تصویریں لگی تھیں[2]۔ اردگرد باغ تھا، جس میں سے باہر سے منگوائے ہوئے درخت لگائے گئے تھے۔ اس میں جتنے حوض تھے، ان پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا۔ کیاریوں میں پھول اس طرح لگائے گئے تھے کہ وہ عربی کے حروف بنتے جاتے تھے۔ قصر میں ایک مرکز پرندوں کے لیے تھا اور ایک حیوانات کے لیے، ایک حوض میں پارا ابھرا ہوا تھا۔ اس حوض کی سطح پر چمڑے کے گدے بچھا دیے گئے تھے اور ان میں ریشم کے رسّے لگے ہوئے تھے، جو اردگرد چاندی کے ستونوں سے بندھے رہتے تھے اور خمارویہ ان گدوں پر لیٹ جاتا۔ نیند کا غلبہ ہوتا تو سو جاتا[3]۔

خمارویہ کے ماتحت طولونی سلطنت برقہ (طرابلس الغرب) سے دریائے فرات تک، بلکہ اس سے بھی آگے دجلہ تک پہنچ گئی۔ خلیفہ معتضد ۸۹۲ء میں مسند نشین ہوا۔ دورِ زوال کے عباسی خلفاء میں وہ سب سے زیادہ قابل اور سرگرم تھا۔ اس نے واقعی صورتِ حال کو تسلیم کر لیا اور مصری سلطنت کے وسیع علاقے تیس سال کے لیے خمارویہ اور اس کے جانشینوں کے حوالے اس شرط پر کر دیے کہ تین لاکھ دینار سالانہ خراج ادا کیا جائے۔ خلیفہ نے تعلقات کی درستی اور پائداری کی غرض سے خمارویہ کی بیٹی سے بھی شادی کر لی جو نہایت خوب صورت تھی اور قطر الندی (قطرۂ شبنم) اس کا نام تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خمارویہ نے دس لاکھ درہم جہیز میں دیے اور ایک ہزار سنہری اوکھلیاں، نیز دوسری چیزیں ساتھ کر دیں۔ جیسی کسی شخص نے کبھی بیٹی کو نہ دی تھیں[4]۔

خمارویہ کے اسراف نے خزانہ خالی کر دیا اور روایت کے مطابق اسے غلاموں سے عمل بد کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ ایک رات غلاموں کو غصہ آیا، اور دمشق کے باہر ایک بنگلے میں انھوں نے خمارویہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا[5]۔ میت کو دفن کے لیے مصر لے گئے والد کی قبر کے پاس قبر بنی۔ جہاں سات قاری قرآن پڑھنے میں مصروف تھے خمارویہ کی لاش قبر میں اتاری جا رہی تھی تو قاری سورۂ دخان کی یہ آیت پڑھ رہے تھے۔

خذوہ فاعتلوہ الیٰ سواء الجحیم

(اسے پکڑو، پھر دھکے دیتے ہوئے جہنم کے بیچوں بیچ لے جاؤ)

اس کا نوجوان بیٹا جیش جانشین بنا، لیکن فوج نے چھ مہینے کے اندر اندر اسے بھی قتل کر ڈالا، کیونکہ تنخواہ دینے کے لیے اس

---

[1] ابن تغری بردی جلد ۲ ص ۲۱، سیوطی جلد ۲ ص ۱۱۔

[2] ابن تغری بردی جلد ۲ ص ۵۷، ۵۸، مقریزی جلد ۱ ص ۳۱۶، ۳۱۷۔

[3] ایضاً ایضاً ص ۵۸، ۵۹، ایضاً ایضاً ص ۳۱۷۔

[4] ابن خلکان جلد ۱ ص ۳۱۰، ابن خلدون جلد ۴ ص ۳۰۷، ۳۰۸، طبری جلد ۳ ص ۲۱۴۵-۲۱۴۶، تغری بردی جلد ۲ ص ۵۵۔

[5] ابن عساکر جلد ۵ ص ۱۷۸۔

کے پاس پیسے نہ تھے اور فوج بگڑ بیٹھی تھی[۱]

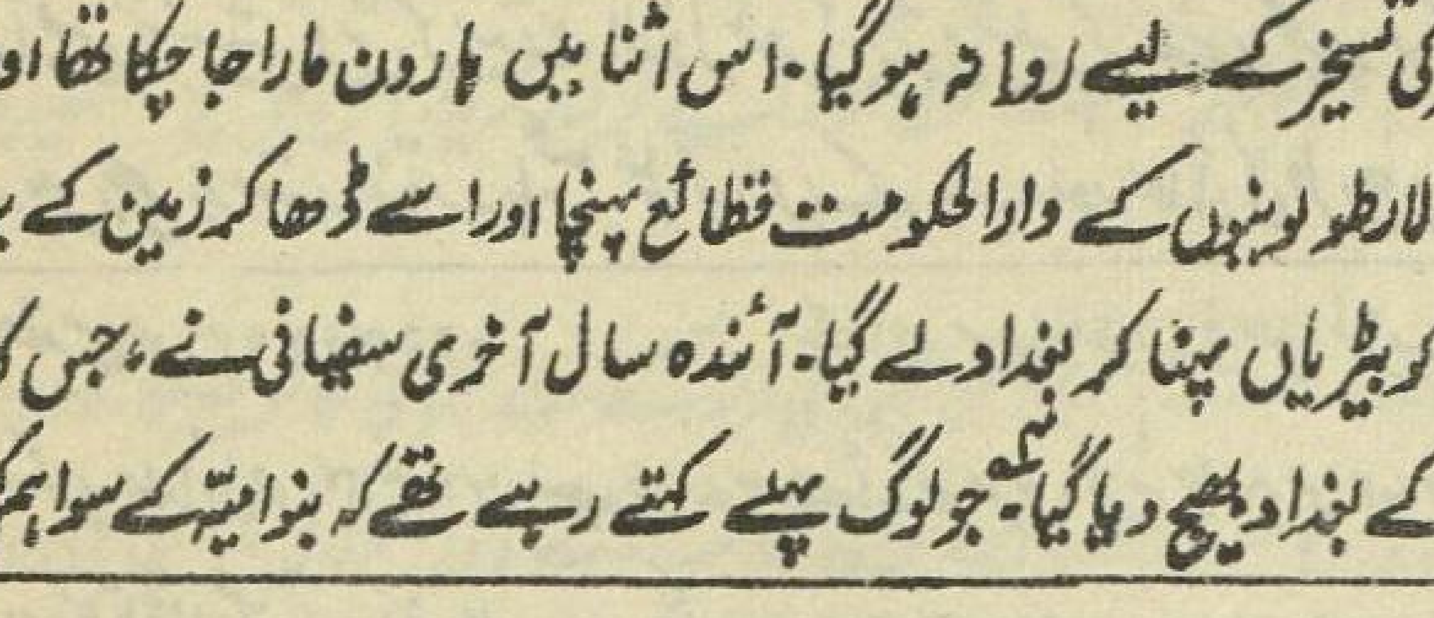
قرامطہ

جیش کے بعد اس کا بھائی ہارون (۸۹۶ء - ۹۰۴ء) مسند نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں قرامطہ کی آمد کے باعث حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ یہ ایک انتہا پسند شیعہ فرقہ تھا جسے اسمٰعیلیوں اور فاطمیوں سے نسبی تعلق تھا۔ انھیں یہ نام ایک عراقی کسان حمدان قرمط سے ملا۔ اساسی اعتبار سے یہ تنظیم ایک خفیہ کمیونسٹ جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں خاص شرطیں پوری کیے بغیر کسی کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ ۸۹۰ء میں حمدان کوفہ کے نزدیک اپنے مستقر میں تھا۔ دس سال بعد اس کے پیروؤں نے خلیج فارس کے مغربی ساحل پر ایک مستقل سلطنت قائم کر لی تھی۔ ان دو مرکزوں سے انھوں نے ہر طرف تباہی پھیلائی۔ امویوں کے زمانے میں شامی مسلمان عام سنّی مسلک کے پیرو رہے، لیکن عبّاسی حکومت وہاں مسلط ہوئی تو علویوں کے نظریات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ اب اہل شام قرمطیوں کے عقائد قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بیزنطینی شام کو بھی ایسی ہی صورتِ حال سے سابقہ پڑا تھا۔ اس وقت شامیوں نے اپنی قومیت بروئے کار لانے کی غرض سے ایسے مسیحی عقائد قبول کر لیے تھے جنھیں قسطنطنیہ کے مرکز میں الحادی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اب اہلِ شام انتہا پسندانہ شیعہ عقائد اور عبّاسیوں کے خلاف سیاسی افکار قبول کر لینے پر آمادہ ہو گئے۔ شام کے خلاف قرمطیوں نے ابن ذکرویہ کی سرکردگی میں پیش قدمی کی۔ انھوں نے طولونی فوج کو شکست دینے کے بعد دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ حمص مسخّر ہو گیا۔ حماۃ اور معرۃ النّعمان کے باشندوں کی خاصی بڑی تعداد ماری گئی۔ بعلبک کی تقریباً پوری آبادی موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ سلمیۃ بھی ان کے قبضے میں آ گیا، جو آگے چل کر اسمٰعیلی حشاشین کا مرکز بنا۔ شام کی بہت سی مسجدوں کے منبروں سے جمعہ کے خطبے میں ذکرویہ کو مہدی موعود قرار دیا گیا۔

۹۰۲ء میں خلیفہ نے ایک قابل سالار کو قرامطہ کے استیصال کے لیے مقرر کیا، چنانچہ اس نے ان مفسدوں کو شکست دی، نائب شام سے اطاعت کا حلف اٹھوایا، پھر وہ مصر کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس اثنا میں ہارون مارا جا چکا تھا اور اس کا چچا شیبان مسندِ حکومت پر بیٹھ چکا تھا[۲] ۹۰۴ء میں عبّاسی سالار طولونیوں کے دارالحکومت قطائع پہنچا اور اسے ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا؛ بیس طولونیوں کے سر کاٹے اور خاندان کے باقی مردوں کو بیڑیاں پہنا کر بغداد لے گیا۔ آئندہ سال آخری سفیانی نے، جس کا ذکر تاریخوں میں آیا، صلح کی پرچم کشائی کی، اسے بھی گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا گیا[۳] جو لوگ پہلے کہتے رہے تھے کہ بنو امیہ کے سوا ہم کسی کی حکومت

---

[۱] طولونیوں کا شجرہ ذیل میں درج ہے۔



[۲] طبری جلد ۳ ص ۲۲۲۱، ۲۲۲۲۔

[۳] کندی ص ۲۴۷، ۲۴۸۔

[۴] طبری جلد ۳ ص ۲۲۷۷۔

نہیں مانتے تھے[1] اب بظاہر مایوس ہو گئے اور انھوں نے اجنبی حکومت قبول کر لی۔

اخشیدی

جس سالار نے طولونیوں کی طرف سے دمشق میں قرامطہ کا مقابلہ کیا تھا، وہ فرغانہ کا ایک ترک تھا جس کا نام طغج تھا[2]۔ اس کے بیٹے محمد نے طولونیوں کی میراث پر قابض ہو جانے کا انتظام کر لیا۔ کچھ مدت تک شام اور مصر پر عباسیوں کی حکومت جاری رہی، تاہم اس کی حالت غیر یقینی تھی۔ پھر محمد نے ۳۲۳ھ (۹۳۵ء) میں اتنی طاقت جمع کر لی کہ الفسطاط میں اپنے فرمانروائے مصر ہونے کا اعلان کر دیا[3]۔ چار سال بعد خلیفہ الراضی نے محمد کی درخواست پر اخشید کا پرانا ایرانی لقب اسے دے دیا، گویا وہ اونچے درجے کے امرا میں شامل ہو گیا۔ انیسویں صدی میں عثمانی سلطنت نے بھی اپنے نائب مصر کو خدیو کا ایرانی لقب عطا کیا تھا۔ طولونیوں کی مثال کے پیش نظر اخشید نے بھی مصر کے شمالی ہمسایے یعنی شام کو للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کیا، جس کے بڑے حصے پر ایک موقع پرست شخص ابن رائق قابض ہو گیا تھا[4]۔ ۳۳۰ھ (۹۴۱ء) میں ابن رائق نے وفات پائی۔ خلیفہ اور اس کے مختار کار یعنی امیر الامراء نے اخشید کو نہ صرف شام و مصر، بلکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا نائب السلطنت بھی تسلیم کر لیا۔ اس وقت سے کئی صدیوں تک حجاز کی تقدیر مصر سے وابستہ رہی۔ ۳۳۳ھ (۹۴۴ء) میں اخشید نے اپنی حاصل کردہ سرزمینوں کی حکومت اپنے خاندان میں موروثی بنانے کا فرمان دربارِ خلافت سے حاصل کر لیا۔

ایک حبشی حاکم

اخشید ابھی بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ شمالی شام میں حمدانیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے دعوتِ مقابلہ مل گئی۔ اس خاندان کے مشہور ترین فرزند سیف الدولہ نے حلب میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اخشید کے دو بیٹوں کے عہد میں لڑائیاں جاری رہیں۔ ایک بیٹا انوجور[5] جو دمشق میں پیدا ہوا، جہاں اس کے باپ نے وفات پائی، ۳۳۵ھ (۹۴۶ء) میں تخت نشین ہوا۔ لیکن کاروبار کی مختاری ایک حبشی خواجہ سرا ابو المسک کافور کو حاصل تھی[6]۔ سیف الدولہ نے پورے شام کو پامال کر ڈالنے کی کوشش کی، مگر کافور نے اسے ناکام بنا دیا اور دو لڑائیوں میں ایسی شکستیں دیں کہ سیف الدولہ مصر کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کافور انوجور کے بھائی ابو الحسن علی (۹۶۰ء۔ ۹۶۶ء) کے عہد میں بھی بدستور مختار رہا[7]۔ علی کو اس کے باپ اور بھائی کی طرح یروشلم میں دفن کیا گیا۔ دو سال تک یہ حبشی اس سلطنت کا حکمران رہا

---

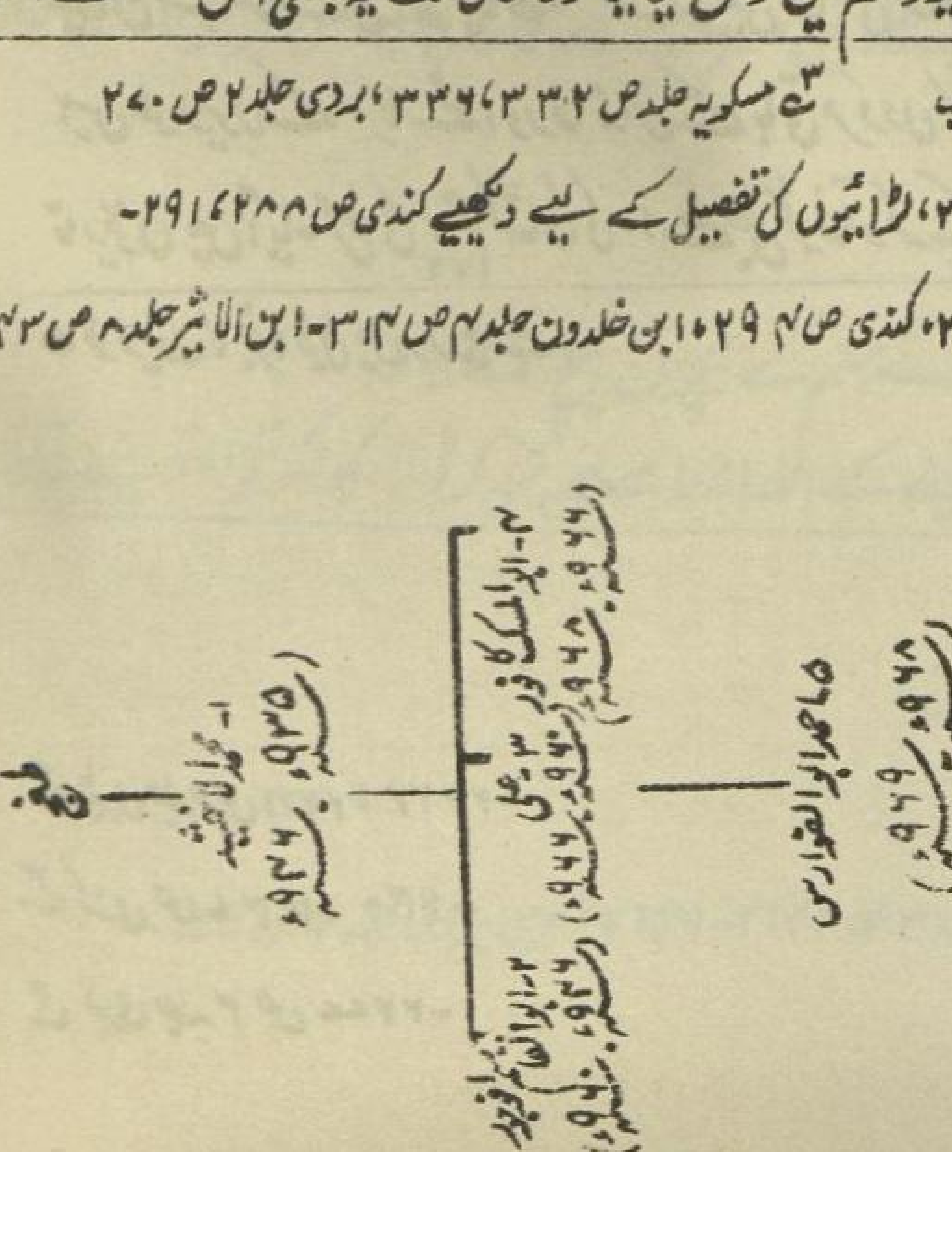
[1] مقدسی ص ۲۹۳، ۲۹۴۔ [2] ابن سعید المغرب فی حلل المغرب [3] مسکویہ جلد ص ۳۰۲، ۳۳۶، بردی جلد ۲ ص ۲۷۰

[4] مسکویہ جلد اوّل ص ۴۱۴، ابن سعید ص ۳۷ سے آگے، ابن الاثیر جلد ۸ ص ۲۷۲، لڑائیوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے کندی ص ۲۸۸، ۲۹۱۔

[5] اس کا تلفظ انجور اور انوجر بھی ہے۔ دیکھیے ابن سعید ص ۴۵۔ بردی جلد ۲ ص ۲۵، کندی ص ۲۹۴، ابن خلدون جلد ۴ ص ۳۱۴۔ ابن الاثیر جلد ۸ ص ۳۴۳۔ مسکویہ جلد ۲ ص ۱۰۴

[6] ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۶۔

[7] اخشیدیوں کا شجرہ نسب ملاحظہ فرمائیے



جس میں مصر و شام کے علاوہ سیلیشیا کے بعض حصّے مع شہر طرسوس شامل تھے۔[1] کافور کا بالائی لب چھدا ہوا تھا اور الاخشید نے اسے ایک تیلی سے اٹھارہ دینار میں خریدا تھا۔ اسلامی تاریخ سلاطین میں وہ پہلی مثال ہے کہ بہت ادنیٰ حیثیت سے اٹھ کر اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا۔ اس کے آزاد کیے جانے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ الاخشید کے پاس ایک ہاتھی اور ایک زرافہ بہ طور تحفہ آئے۔ باقی غلام ان جانوروں کو دیکھنے لگے، مگر کافور کی نظریں الاخشید ہی پر جمی رہیں، کیونکہ اسے گوارا نہ تھا کہ آقا کو کسی خدمت کی ضرورت پیش آجائے اور اس میں ایک لمحے کے لیے بھی توقف کی نوبت آئے۔ اسی مستعدی نے اسے آزادی دے دی۔[2]

اس عہد کے سب سے بڑے شاعر المتنبی نے کافور کے نام کو بھی اس کے حریف سیف الدولہ کی طرح بقائے دوام کا لباس پہنا دیا ہے اور اس کے کہے ہوئے شعر عربی دنیا کا ہر طفلِ مکتب یاد کر لیتا ہے۔ المتنبیؔ نے پہلے کافور کی مدح میں شعر کہے تھے، مگر جب شاعر کی خواہش کے مطابق اسے اعلیٰ منصب نہ ملا تو اس نے ہجو کہہ ڈالی۔

اخشیدیوں کا زوال

کافور کے بعد احمد ابو الفوارس مسندنشین ہوا (۳۵۸ھ۔ ۹۶۸ء-۹۶۹ء) وہ گیارہ برس کا طفل نوخیز تھا اور اس میں وقت کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ تھی۔ حمدانی شمالی جانب سے خطرات کے بادل اٹھا رہے تھے۔ قرامطہ کا سیل مشرقی جانب سے بڑھ رہا تھا اور ان دونوں سے بڑھ کر بھاری خطرہ مغربی جانب سے تھا، ادھر سے فاطمی چلے آ رہے تھے۔ فاطمیوں کی خلافت تونیسیہ میں (۲۹۷ھ ۹۰۹ء) قائم ہو چکی تھی اور اسی وقت سے انھوں نے مصر کے علویوں اور دوسرے ہمدردوں سے خفیہ خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اب قدم اٹھانے کا وقت آگیا تھا۔ ۹۶۹ء میں ان کے ایک من چلے سالار جوہر نے پیش قدمی کر کے کوئی خاص زحمت اٹھائے بغیر اخشیدی فوج کو شکست دے دی اور الفسطاط میں داخل ہو گیا (۶۔ جولائی)۔ خلیفہ معز فاطمی کا نام خطبے میں شامل ہو گیا اور نئے سکّے جاری کر دیے گئے۔ شام کا نائب الحکومت ابوالفوارس کا عزیز تھا۔ اس نے شام کے بچاؤ کے لیے معمولی سی مزاحمت کی۔ جوہر نے ایک سالار کو فوج دے کر بھیج دیا، جس نے نائب کو بہ مقام رملہ شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح فلسطین اور وسطی شام بھی فاطمی خلافت میں شامل ہو گئے۔[3]

طولونیوں کی طرح (۲۵۴ھ-۲۹۲ھ۔ ۸۶۸ء-۹۰۵ء) اخشیدیوں (۳۲۳ھ-۳۵۸ھ۔ ۹۳۵ء-۹۶۹ء) کو بھی محض تھوڑی دیر کے لیے حکمرانی کا موقع ملا۔ دونوں نے ایک ہی طرزِ عمل کی پیروی کی اور یہی طرزِ عمل بہت سی دوسری ریاستوں کا رہا، جو مرکزی خلافت کے دورِ اختلال میں جابجا رونما ہوئیں۔ دونوں حکومتوں نے رعایا کی خوش دلی حاصل کرنے کے لیے سرکاری روپے کا مسرفانہ استعمال کیا اور اس طرح خزانہ خالی ہو گیا۔ دونوں کے لیے اس سرزمین میں کوئی قومی بنیاد و اساس موجود نہ تھی، جس پر انھوں نے حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ باہر سے آئے تھے اور محافظ فوج بھی بیرونی عناصر ہی سے بھرتی کی۔ وہی ان کی سرکاری فوج تھی۔ ایسی حکومت اسی وقت تک قائم رکھی جا سکتی تھی، جب تک بازوئے شمشیر زن مضبوط ہوتا۔

---

[1] ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۵، ۱۸۹، ابن خلدون جلد ۴ ص ۳۱۴-۳۱۵۔ بردی، جلد ۲ ص ۳۷۳۔

[2] ابن سعید ص ۴۶، ۴۷۔

[3] کندی ص ۲۹۷-۲۹۸۔

حمدانی۔ سیف الدولہ

بنو حمدان شمالی شام میں اخشیدیوں کے جانشین بنے۔ وہ حمدان بن حمدون تغلبی کی اولاد تھے۔ اس قبیلے نے ایک زمانے میں مسیحیت قبول کر لی تھی۔ رومی دور کے مشہور شاعر اخطل کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ حمدان نے نویں صدی کے اواخر میں سیاسی دائرے کے اندر قدم رکھا، جب وہ حصار ماردین پر قابض ہوا[1]۔ اس کے جانشینوں کو دوبار خلافت سے بار بار لڑنا بھی پڑا اور انھوں نے صلحیں بھی کیں۔ پھر اپنا دائرہ موصل تک بڑھا لیا۔ گویا شمالی شام کے علاوہ دوآبۂ دجلہ و فرات کا بھی بڑا حصہ ان کی حکومت میں شامل تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور حکمران ابوالعلی حسن تھا، جس نے سنہ ۹۲۴ء میں اخشیدیوں کے نائب حکومت سے حلب انطاکیہ اور حمص چھین لیے[2]۔ پھر خلیفہ نے اسے سیف الدولہ کا عظیم القدر خطاب دے دیا۔ (سنہ ۹۴۴ء۔ سنہ ۹۶۷ء)۔ اس قسم کے خطابات سے خلیفہ کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ خطاب یافتہ کو اپنا مطیع و فرمانبردار ظاہر کرے، حالانکہ وہ خود مختار ہوتا ہے۔ سیف الدولہ اور اس کے جانشین روادار شیعہ تھے اور انھوں نے خطبے میں خلیفہ کا نام قائم رکھا۔ سیف الدولہ نے حلب[3] کو مرکز حکومت بنایا، اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہاں ایک پرانا قلعہ تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ یہ مقام سرحدی قلعوں سے قریب تھا، جنھیں بچانا اور محفوظ رکھنا سیف الدولہ کے اہم مقاصد میں سے تھا، کیونکہ ان دنوں بیزنطینیوں کی طرف سے حملوں کا نیا طوفان بپا ہو گیا تھا۔ امویوں کے بعد پہلی مرتبہ شمال کا ایک بڑا شہر ایک اہم حکومت کا مرکز بنا۔ یہاں سیف الدولہ نے عالی شان محل بنوایا، جس میں تین حمام تھے اور ان میں آبِ رواں کا انتظام تھا۔ ایک ندی محل کے اِردگرد جارہی تھی۔ ایک باغ اور گھڑدوڑ کا ایک میدان اس سے متصل تھے[4]۔

سیف الدولہ کی سلطنت میں شمالی شام کے علاوہ سیلیشیا کا ایک حصہ اور دوآبۂ دجلہ و فرات کے بڑے علاقے شامل تھے، بلکہ اس نے اپنے کرد حامیوں کی بدولت آرمینیا میں بھی قدم جما لیے تھے[5]۔ واضح رہنا چاہیئے کہ اس کی والدہ کرد تھی۔ اس نے الاخشید کی ایک بیٹی سے شادی کر لی تھی اور اسے خیال تھا کہ اس رشتے کے بعد اطمینان سے حکومت کرتا رہے گا۔ دمشق کو مسخر کرنے کی کوشش اُس نے کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا[6]۔ اس کا علاقہ عین سرحد پر واقع تھا۔ اس وجہ سے اس کی سرگرمیوں کا بڑا حصہ بیزنطینیوں کے ساتھ کشاکش ہی میں گزر گیا۔ مدت دراز کے بعد سیف الدولہ پہلا شخص نمودار ہوا تھا، جس نے اسلام کے مسیحی دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ صلیبی جنگوں سے پیشتر کے دور میں حمدانیوں اور بیزنطینیوں کی جنگیں تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ سیف الدولہ کے مقابلے میں بیزنطینی بادشاہ نقفور[7] مردِ میدان نہ تھا۔ سیف الدولہ نے اس سے دس لڑائیاں کیں۔ بلاشبہ

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۲۱۴۱
[2] ابن سعید ص ۱۴۱
[3] اسے "شہبا" بھی کہتے تھے۔
[4] ابن الشحنۃ الدر۔ المنتخب فی تاریخ حلب ص ۶۰، ۶۱، ۱۳۳۔
[5] مسکویہ جلد ۲ ص ۱۶۱۔
[6] ابن سعید ص ۴۲۔
[7] نسی خورس ثانی (۹۶۳ - ۹۶۹)

اس کو ہر مرتبہ کامیابی نہ ہوئی، بلکہ ایک مرتبہ (۹۶۲ء) میں تو اس کا مرکز حکومت بھی معمولی محاصرے کے بعد عارضی طور پر دشمن کے ہاتھ میں چلا گیا اور جو محل سیف الدولہ کی عظمت کا نشان تھا، تباہ کر ڈالا گیا۔[1] اس کا اثر بغداد پر بھی پڑا، جہاں لوگوں نے مظاہرہ کیا اور وہ چاہتے تھے کہ خلیفہ خود فوج لے کر بیزنطینیوں کے مقابلے پر چلا جائے۔ خلیفہ اس مطالبے کے جواب میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔[2] ۹۶۷ء میں سیف الدولہ کا انتقال ہوگیا۔[3] اس کے بعد داخلی بدنظمی اور اختلافات کا جو ہنگامہ بپا ہوا، اس میں نقفور اور اس کے جانشینوں کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ پیش قدمی کرسکیں، چنانچہ انھوں نے شمالی شام کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا اور حمدانی سلطنت کو تھوڑی دیر کے لیے اپنی ماتحتی میں لے لیا۔ ۹۶۸ء میں نقفور نے دوبارہ حلب پر قبضہ کرلیا، ساتھ ہی انطاکیہ حمص اور دریائی مقامات اس کے تصرف میں آگئے۔ چھ سال بعد نقفور کے جانشین، زمسسس[4] نے ساحلی مقامات لے لیے، مثلاً بیروت، جبل، عرقہ، طرطوس، جبلہ، لاذقیہ، لیکن بعض مقامات بدستور آزاد رہے، مثلاً صحیان اور بعلبک۔ انطاکیہ تقریباً ایک سو سال تک (۹۶۸ء۔ ۱۰۸۴ء) بیزنطینیوں کے پاس رہا۔

حلب پر حمدانی ۹۷۵ء تک دوبارہ قبضہ نہ کرسکے۔ اس کا بالاحصار مزید دو سال بیزنطینیوں کے پاس رہا۔ سیف الدولہ کا بیٹا سعد الدولہ پہلے اس پریشانی میں مبتلا رہا کہ اس کا ایک چچیرا بھائی حمص میں سلطنت کا مدعی بن گیا تھا۔ اس سے نجات ملی تو سعد الدولہ کو اپنی جانشینی کی محفوظیت کے متعلق اطمینان ہوا۔ اس اثنا میں ایک اور مصیبت پیش آئی۔ یعنی حلب کے ایک نائب الحکومت نے غداری کی اور بہ طور خود بیزنطینیوں سے ادائے خراج کا معاہدہ کرلیا۔ سعد الدولہ نے یہ معاہدہ ٹھکرا دیا۔ ۹۸۵ء میں سعد الدولہ نے قلعہ سمعان کا محاصرہ کرلیا، جو اس وقت، بیزنطینیوں کے قبضے میں تھا۔ پھر اسے لوٹا، جتنے راہب وہاں رہتے تھے، انھیں یا تو قتل کردیا یا غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ سعد الدولہ کے جانشین سعید الدولہ[5] (۹۹۱ء۔ ۱۰۰۱ء) کے زمانے میں جنوبی فضا پر ایک نیا دشمن نمودار ہوا، یعنی مصر کے فاطمی حکمران۔ فاطمیوں کی طرف سے شدید دباؤ پڑا تو سعید الدولہ نے مشرقی رومی سلطنت کے شہنشاہ باسل سے امداد طلب کی۔ بیزنطینی شہنشاہ سترہ ہزار فوج لے کر تیزی سے حلب پہنچا اور دشمن کو منتشر کردیا، لیکن یہ ایک عارضی

---

[1] ابن الاثیر جلد ۸ ص ۴۰۱ - ۴۰۴ - مسکویہ جلد ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۴ -

[2] مسکویہ جلد ۲ ص ۲۰۱ -

[3] سیف الدولہ کے متعلق عربی کے تمام اقتباسات میریس کینرڈ نے اپنی کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔

[4] عربی ابن الشمشقیق دیکھیے ابن القلانسی ص ۱۲، ۱۴-

[5] حمدانیوں کا شجرہ ملاحظہ فرمائیے۔

سیف الدولہ ابوالحسن علی
(۹۴۴ء - ۹۶۷ء)
|
سعد الدولہ ابوالمعالی شریف
(۹۶۷ء - ۹۹۱ء)
|
سعید الدولہ ابوالفضائل سعید
(۹۹۱ء - ۱۰۰۱ء)

ابوالحسن علی (۱۰۰۱ء - ۱۰۰۳ء) | ابوالمعالی شریف (۱۰۰۱ء - ۱۰۰۳ء)

مہلت تھی۔ انجام کار سعید الدولہ کو فاطمیوں کی سیادت قبول کرنی پڑی۔ وہ نوجوان تھا اور ایک نائب السلطنت اس کی جانب سے کاروبار حکومت کا نگران تھا۔ سعید الدولہ نے نائب کی بیٹی سے شادی کر لی۔ نائب نے اپنے استحکامات کا پورا انتظام کر لیا تو تخت کے لالچ میں داماد اور بیٹی دونوں کو زہر دے دیا۔ سعید الدولہ کے دو بیٹے تھے، علی اور شریف۔ نائب دو سال تک (۱۰۰۱ء۔ ۱۰۰۳ء) اُن کی طرف فاطمی خلفاء کے ماتحت نیابت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۰۰۳ء میں اس نے دونوں کم سن شہزادوں اور حمدانی خواتین کو قاہرہ بھیج دیا اور اپنے بیٹے کو شریک نیابت بنا لیا۔ یہ حمدانی خاندان کی سرگزشت کا آخری واقعہ تھا اور حمدانی سلطنت دوسری اور آخری عرب بادشاہی تھی، جو شام کی سرزمین پر قائم ہوئی۔

سیف الدولہ کا حلقۂ علم وفضل

حمدانی خاندان کا دورۂ حیات اس جوہر سے محروم نہ رہا، جو اس کے دو پیشرو خاندانوں یعنی طولونیوں اور اخشیدیوں کو نصیب نہیں ہُوا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ایک زبردست شخصیت اپنے لیے سلطنت پیدا کرتی۔ پھر نااہل جانشین اس کی جگہ لے لیتے۔ سرکاری روپیہ ضائع کر دیا جاتا۔ سلطنت کے اندر فتنہ وفساد کی ایک آگ بھڑک اٹھتی۔ باہر سے دشمنوں کا ہجوم خاندانی حکومت کا کام انجام پر پہنچا دیتا۔ سیف الدولہ کی تمام فیاضیاں صرف علم وفن کی سرپرستی کے لیے تھیں اور یہی سرپرستی خزانے کا روپیہ صرف ہونے کا بڑا ذریعہ بنی رہی۔

سیف الدولہ نے اپنے شاندار محل میں اہل علم وفن کا ایک ایسا حلقہ جمع کر لیا تھا، جس کا مقابلہ خلافت کے دورِ عروج کے سوا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس میں مندرجہ ذیل جلیل الشان حضرات شامل تھے: فارابی جو شہرۂ آفاق فلسفی اور ماہر موسیقی تھا۔ ابوالفرج اصفہانی جو عربی کا ممتاز مؤرخ تھا۔ ابن نباتہ[1] (وفات ۹۸۴ء) جو فصیح البیان واعظ تھا۔ ابن خالویہ، جو لسانیات کا ماہر تھا۔ ابن جنی[2] (وفات ۱۰۰۲ء) جسے نحو میں کمال درجے کی دسترس حاصل تھی۔ ابو فراس، جو شاعر بھی تھا اور جنگجو بھی۔ ان سب سے بڑھ کر نامور اور یگانہ شاعر ابوالطیب متنبی۔ ثعالبی یتیمۃ الدہر میں لکھتا ہے:

> "سیف الدولہ ——— اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو، اس کی مرادیں پوری کرے۔ جنت کو اس کی قیام گاہ بنائے ——— اپنے عہد کا ایک روشن مینار اور اسلام کا ستون تھا۔ اس کے ذریعے سے حدود کی حفاظت ہوئی۔ امورِ سلطنت نے تنظیم وترتیب پائی ..... کہا جاتا ہے کہ خلفاء کے بعد کوئی حکمران اپنے پاس، اتنے زیادہ اکابر شعرا اور نجوم علم جمع نہ کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کی حیثیت منڈی کی ہوتی ہے۔ لوگ وہی جنس وہاں پہنچاتے ہیں، جس کی مانگ ہوتی ہے۔ سیف الدولہ خود بھی ایک شاعر اور محبِ شعر تھا۔[3]"

---

[1] اس کے خطبوں کے کئی ایڈیشن قاہرہ اور بیروت میں شائع ہو چکے ہیں۔

[2] یہ ایک ترکی غلام کا بیٹا تھا۔ دیوان متنبی کی شرح کے لیے مشہور ہے۔ [3] یتیمۃ الدہر فی شعراء اہل العصر جلد اوّل ص ۹۱۸۔

المتنبی

ابو طیب احمد ابن الحسین (۳۰۳ھ؍۹۱۵ء - ۳۵۴ھ؍۹۶۵ء)[1] متنبّی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اسے یہ لقب اس لیے ملا کہ اوائل شباب میں اس نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا اور قرآن مجید کی پیروی میں کچھ چیزیں لکھی تھیں۔ ایک جماعت اس کی جادو بیانی سے متأثّر ہو گئی تھی خصوصاً لاذقیہ میں اور بادیۂ شام میں۔ حمص کے اخشیدی عامل نے اسے قید کر لیا۔ وہ تقریباً دو سال قید خانے میں رہا۔ دعوائے نبوّت کے مرض کی اصلاح ہو گئی۔ لیکن کبر و غرور، خود پرستی اور ادّعائیّت نے عمر بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ اپنی شانِ ادب کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"میں وہ ہوں، جس کے گوہرِ فنِ شعر کو اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اور میرے شعر کو وہ بھی سنتے ہیں، جنھیں سماعت سے کوئی حصّہ نہیں ملا۔

وہ دور دور پھرتے ہیں اور میں بے خبر ہوں۔

لیکن لوگ انھیں محنت اور اہتمام سے اکٹھے کر لاتے ہیں"۔

"صحرا مجھے خوب پہچانتا ہے، نیز رات اور سوار

تلوار اور نیزہ اور کاغذ اور قلم"

جس شخص نے اپنی تعریف ان شاندار الفاظ میں کی، اس کی اصل بہت معمولی تھی۔ وہ کوفہ میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ سقائی کرتا تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ اپنے خاندان کے ساتھ شام چلا گیا۔ کچھ وقت تک وہ سرپرست کی تلاش میں پھرتا رہا۔ پھر حلب میں توطّن اختیار کر لیا اور سیف الدّولہ نے اسے ملک الشّعراء بنا لیا۔ اس وقت سے دونوں نام اس طرح پیوست ہو گئے کہ انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مغرور متنبی کو اصرار تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے بادشاہ کی مدح میں شعر سناؤں گا اور سنانے سے پہلے عام آداب کے مطابق زمین بوسی نہیں کروں گا۔ وہ کافور سے ملا تو وقت کے آداب کے خلاف نہ جوتے اتارے، نہ تلوار کمر سے الگ کی۔[2] وہ جدھر جاتا تھا، دو مسلّح غلام اس کے ساتھ رہتے تھے۔ شامی دربار کو چھوڑ کر مصر جانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سیف الدّولہ کے استاد ابن خالویہ سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور ابن خالویہ نے متنبّی کے منہ پر کنجی ماری تھی جب وہ کافور سے مایوس ہوا تو اس نے چپ چاپ بغداد کا رُخ کر لیا اور وہاں سے فارس پہنچ گیا۔ واپس ہوا تو بدوؤں کے قزاق گروہ کے ہاتھوں متنبّی اور اس کا بیٹا مارے گئے اور قزاق وہ دیوان لے گئے، جو متنبّی نے اپنے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا۔[3]

اس کے دیوان میں امتیازی حیثیّت ان قصیدوں کو حاصل ہے، جن میں بزنطینیوں کے خلاف سیف الدّولہ کے شاندار کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ آیا اصل کارناموں سے کہیں زیادہ یہ اشعار سیف الدّولہ کو عربی تاریخوں کا ایک افسانہ بنانے کے موجب بنے ہیں یا نہیں بنے؟ ان قصیدوں سے ہر شخص پر واضح ہو سکتا ہے کہ متنبّی کو عربی میں حسنِ تراکیب کا کیسا کمال

---

[1] اس کی ہزار سالہ برسی اہلِ شام نے ۱۹۳۵ء میں منائی تھی۔

[2] ابن خلکان جلد اوّل ص ۶۴۔

[3] ڈائیٹرش ایڈیشن کے علاوہ ایک نسخہ نصیف الیازجی نے شائع کیا بنام العرف الطیب فی شرح دیوان ابی الطیب۔

حاصل تھا۔ پھر شعروں میں جا بجا حکیمانہ اقوال چلے آتے ہیں۔ اپنے عہد کے دوسرے ہم پیشہ آدمیوں کے برعکس متنبی کی زندگی بڑی پاکیزہ تھی۔ بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے الفاظ کے استعمال میں اسراف سے کام لیا ہے اور اس میں تصنع آگیا ہے نیز استعارات میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، لیکن یہ احساس غریبوں کو ہو سکتا ہے، شریفوں کو نہیں۔ شاعر نے عربی بولنے والوں کے ذہن و فکر میں ایسی جگہ حاصل کر لی تھی کہ اسے اب تک دورِ اسلام کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ متنبی اور اس کے دو پیشروؤں ابو تمام اور بحتری کی بدولت عربی شاعری نصف النہار پر نہیں تو کمال نشو و بلوغ کے درجے پر پہنچ گئی پھر چند مستثنیات کے بعد تدریجاً زوال شروع ہو گیا۔

ابو فراس

متنبی کا ایک مدِ مقابل ابو فراس حارث ابن ابی العلیٰ الحمدانی (۹۳۲ء۔ ۹۶۸ء) تھا، جو سیف الدولہ کا چچیرا بھائی اور اس کا رفیقِ جنگ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سیف الدولہ نے صرف ایک شعر پر ابو فراس کو منبج کے قریب ایک جاگیر دے دی تھی، جس کی سالانہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی۔ ۹۶۲ء میں ابو فراس لڑتا ہوا بیزنطینیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ چار سال بعد فدیہ دے کر اسے چھڑایا گیا[1] اس کی بعض نہایت پُر تاثیر نظمیں دورانِ اسیری میں لکھی گئیں[2] ایک قصیدے میں اُس نے علویوں کی بڑی تعریف کی اور عباسیوں کی قدر و قیمت گھٹا دی تھی۔ یہ قصیدہ اب تک شیعی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ابو فراس نے سیف الدولہ کی وفات کے بعد حمص کو آزاد و مختار رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سیف الدولہ کے بیٹے کے خلاف لڑتا ہوا میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

ان جلیل القدر شاعروں کے علاوہ وقت کے افقِ شعر پر کم روشن تارے بھی تھے، مثلاً کشاجم، جسے مختلف فنون میں دسترس حاصل تھی اور واواء، جسے فنِ ترصیع خوب آتا تھا۔ کشاجم ہندی الاصل[3] تھا (وفات ۹۶۱ء) اور اس کا عجیب و غریب نام عربی کے ان الفاظ کے ابتدائی حروف جمع کر کے بنایا گیا، جو اس کے مختلف صفات کے حامل تھے، مثلاً کاتب، شاعر، ادیب، جدلی و نفاظ، منجم۔ وہ رملہ کا باشندہ تھا اور سیف الدولہ کے باورچی کی حیثیت میں زندگی شروع کی۔ اس نے جو شعر کہے، ان میں بعض کھانوں اور مشروبوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے[4] مختلف فنون کے علاوہ وہ طب بھی جانتا تھا اور ایک کتاب اُس نے علم الحیوانات پر لکھی۔ الواٰواء (وفات ۹۹۹ء) دمشق کا باشندہ اور غسانی الاصل تھا۔ اسے اس وجہ سے یاد کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک لڑکی کا ذکر جو رو رہی تھی اور اپنے لب کاٹ رہی تھی، یوں کیا: اُس نے نرگس سے موتیوں کا مینہ برسایا، اس طرح گلاب کی آبیاری کی اور عناب کو اولوں سے کاٹ دیا۔[5]

---

[1] ابن خلکان جلد اوّل ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

[2] دیکھیے دیوان مرتبہ نخلہ قلفاط۔

[3] مسعودی جلد ۸ ص ۳۱۸۔

[4] ایضاً ایضاً ص ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۹، ۴۰۰۔

[5] دیوان مرتبہ کراچو فسکی۔

دوسرے ارباب فن

سیف الدّولہ کا دربار شاعروں کے علاوہ بھی ارباب علم وفن سے مزیّن تھا، مثلاً ادب وموسیقی کا وقائع نگار ابوالفرج اصبہانی اور مشہور فلسفی ومثنی ابونصر فارابی۔ ابوالفرج اصبہانی (اصفہانی) ۸۹۷ء۔ ۹۶۷ء آخری اموی خلیفہ کی نسل سے تھا، لیکن اس کے عقائد کا میلان شیعیت کی طرف تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا۔ اسے ہم نسبوں کی طرف سے، جو اندلس میں حکمران تھے، بہت سے تحائف ملے اور اس نے اپنی کتابیں ان سے منسوب کیں۔ سیف الدّولہ نے اسے سونے کے ایک ہزار ٹکڑے دے کر اس کی مشہور کتاب الاغانی[۱] کا ایک ایسا نسخہ حاصل کیا، جو اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ محض اغانی، یعنی گانوں کی کتاب نہ تھی، بلکہ اس میں اور بھی بہت سی چیزیں تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک معاصر وزیر اپنے عام سفروں میں جو کتابیں ساتھ لیتا تھا، وہ تیس اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔ جب اسے الاغانی کا نسخہ مل گیا تو وہ صرف یہی ایک کتاب ساتھ لے لینا کافی سمجھتا تھا۔[۲]

الفارابی

محمد ابونصر الفارابی فاراب (ترکستان) کا ایک ترک تھا۔[۳] وہ شام میں بہ طور صوفی زندگی بسر کرتا رہا۔ سیف الدّولہ سے اسے روزانہ چار درہم گزارے کے لیے مل جاتے تھے۔ اسی سال کی عمر میں بمقام دمشق وفات پائی (۹۵۰ء) جہاں وہ اپنے مربی سیف الدّولہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ فارابی ابتدائی دور کے مسلم مفکروں میں سے ہے، جس نے یونانی فلسفے اور اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جو نظام فلسفہ تیار کیا، وہ ارسطوئیت، افلاطونیت اور صوفیت کا مجموعہ تھا۔ ہم قوموں نے اسے معلّم ثانی کا یگانہ لقب دیا، یعنی ارسطو معلّم اوّل تھا اور فارابی معلّم ثانی۔ وہ ابن سینا اور بعد کے تمام مسلم فلسفیوں کا ذہنی جدِّ اعلیٰ تھا۔ اس کی خاص تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ رسالہ فصوص الحکم،[۴] جس میں حکمت و دانش کے خوب صورت نگینے جمع ہیں۔

۲۔ رسالہ فی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ،[۵] یعنی عالی پایہ شہر کے ساکنوں کی رائیں۔

۳۔ السیاستہ المدنیہ[۶]

آخری دو کتابوں میں مصنّف نے ایک مثالی نظام کا تصوّر پیش کیا ہے اور یہ ایسا نظام ہے، جو انسانی جسم کے نظام عضوی سے مشابہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب افلاطون کی جمہوریت کے انداز پر لکھی گئی ہے۔

فارابی فلسفی ہونے کے علاوہ ایک اچھا طبیب، ایک ریاضی داں، ایک بلند پایہ رمّال اور ایک ماہر موسیقار تھا۔ موسیقی پر اس نے تین کتابیں لکھیں، جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر کتاب الموسیقی الکبیر تھی۔ اس کتاب کی بدولت وہ عربی موسیقی کے اہلِ علم میں سب سے بہتر نہیں تو چند بہترین علمائے فن میں شمار ہونے لگا۔ وہ خود بھی موسیقی جانتا تھا۔ حمدانیوں کے محل میں عود بجایا کرتا تھا، جو خود اس کی اختراع تھی اور

---

[۱] بیس جلدیں شائع کردہ بولاق

[۲] ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۱

[۳] ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ ص ۱۳۴، قفطی ص ۲۷۷، ابن موقل ص ۳۹۰۔

[۴] لیڈن میں چھپا۔

[۵] قاہرہ میں چھپا۔

[۶] حیدرآباد دکن میں چھپا۔

حسب منشا سامعین کو ہنساتا، رُلاتا یا سُلا دیتا۔[1]

عالم جغرافیہ مقدسی

جس زمانے میں شمالی شام پر حمدانی حکمران تھے اور جنوبی شام پر فاطمیوں کا قبضہ تھا، فلسطین میں ایک بدیع اور نہایت قابل جغرافیہ نگار پیدا ہوا، جو مقدسی کے نام سے مشہور ہے (۹۴۶ء۔ ۳۳۵ھ)۔ وہ یروشلم (بیت المقدس) میں بہ عہد اخشیدیاں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں سیر و سیاحت کے لیے نکل پڑا۔ اندلس، ہندوستان اور سجستان کے سوا پوری اسلامی دنیا میں پھرا۔ اس طرح جو معلومات حاصل کیں، انھیں ۹۸۵ء میں مرتب کر دیا۔ اس کتاب کا نام ہے احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم[2]، یعنی مختلف ممالک کے متعلق معلومات کی بہترین درجہ بندی۔ وہ خود دیباچے میں لکھتا ہے کہ میں نے کتابوں سے کہیں زیادہ ذاتی مشاہدات و تجربات کو مدارِ تحریر بنایا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رجحانات شیعوں اور فاطمیوں کی جانب تھے۔ اس کے عہد میں شیعہ اصحاب اسلام میں فکری اور ارتقائی گروہ کے نمائندے تھے۔

ہمیں مقدسی اور دوسرے جغرافیہ نگاروں کی بدولت، جو اس عہد میں پیدا ہوئے، دسویں صدی مسیحی کے شام کے متعلق اقتصادی اور معاشری حالات کا ایسا ذخیرہ میسر آ گیا جو پہلے کبھی میسر نہ آیا تھا۔ کسی لاطینی، یونانی یا سامی جغرافیہ نگار نے ایسی معلومات فراہم نہ کیں جو کمیت و کیفیت میں عرب جغرافیہ نگاروں کی معلومات سے لگا کھا سکیں۔ مقدسی اپنے بیانات میں تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور تعلیم عامہ کے متعلق بھی معلومات پیش کرتا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ بیروت کے پہاڑوں میں کچا لوہا موجود ہے[3]۔ لبنان میں درخت اور راہب بہ کثرت ہیں[4]۔ چینی اور شیشے کے برتن صور میں بنتے ہیں۔ پنیر اور سوتی کپڑا یروشلم میں تیار ہوتا ہے۔ شہد اور غلّے عمّان میں ملتے ہیں۔ وہ شام کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ ایک بابرکت خطّہ ہے، جہاں میوے اور دوسری چیزیں بہت سستی ملتی ہیں اور یہاں کے لوگ راستباز ہیں۔[5] مقدسی کا ایرانی معاصر ابن الفقیہ بھی لبنان کے درختوں اور راہبوں کا ذکر کرتا ہے، نیز یہاں کے سیب کو بہ طور خاص سراہتا ہے وہ بتاتا ہے کہ عرقہ، طرابلس، شام، بیروت اور دوسرے ساحلی یا داخلی شہروں میں استحکامات اب تک موجود ہیں۔ ایک اور ایرانی، ابن خرداذبہ (وفات ۹۱۲ء) شام کے ضلعے بتاتا ہے، نیز شہروں کے درمیان راستوں اور ان کے فاصلوں کا ذکر کرتا ہے[6]۔ ان کتابوں اور دوسرے معاصر ماخذوں کے مطالعے سے درجہ معیشت کے متعلق خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ ان مصنفوں کے معیار کے مطابق لوگ عموماً مطمئن اور مفید زندگی بسر کرتے تھے۔ مصر اور شام کے ان حکمرانوں کے ماتحت مسیحی اور یہودی عباسیوں کے عہد سے زیادہ ناخوش گوار حالت میں نہ تھے۔ زیادہ تر محرّر مسیحی تھے اور یہی کیفیت طبیبوں کی تھی[7]۔ ۹۹۲ء میں شام زلزلے کا شکار ہوا۔ اس میں اتنا نقصان نہ ہوا جتنا ۸۵۹ء۔ ۸۶۰ء کے زلزلے میں ہوا تھا، جب لاذقیہ اور جبلہ معدوم ہو گئے تھے اور انطاکیہ میں ڈیڑھ ہزار عمارتیں برباد ہوئی تھیں[8]۔ اس سے پیشتر کی صدی میں بھی

---

[1] ابن خلکان جلد ۲ ص ۵۰۱

[2] مرتبہ داگوبجے شائع شدہ لیڈن

[3] ادریسی نزہتہ المشتاق ص ۱۶

[4] ادریسی نزہتہ المشتاق ص ۱۸۸

[5] ایضاً ص ۱۸۰

[6] ایضاً ص ۱۷۹

[7] ایضاً ص ۴۷ سے آگے نیز ص ۹۵ سے آگے

[8] مقدسی ص ۱۸۳

[9] طبری جلد ۳ ص ۱۴۳۹، ۱۴۴۰۔

شام دو مرتبہ زلزلوں کا شکار ہوا۔ ایک مرتبہ ۴۳۸ھ میں دوسری مرتبہ ۴۶۰ھ میں۔

قرونِ مظلمہ کا آغاز

افق پر تاریک بادل چھا رہے تھے۔ مصیبتوں کا دور سامنے نظر آ رہا تھا۔ دسویں صدی نصف گزر چکی تھی، جب فاطمیوں کی بری اور بحری فوجوں نے جنوب میں حملے شروع کیے۔ ایران و عراق کے متعصب قرمطی گروہ شمال و مشرق کی جانب سے ملک کو پامال کر رہے تھے۔ سلجوقی اور دوسرے بے لگام ترک قبیلے شمالی جانب سے پیش قدمی کرنے والے تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شام کی تاریخ میں قرونِ مظلمہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک ایسی حالت رونما تھی، جسے بے نظمی کے قریب سمجھنا چاہیے۔ غارت گری آتش زنی اور قتل حملہ آوروں کی جلو میں چلتے تھے۔ ممتاز و نمایاں شہر مثلاً حلب، یروشلم گیند کی طرح کبھی ایک اجنبی کے ہاتھ آ جاتے کبھی دوسرے کے۔ گیارھویں صدی کے اختتام پر فرنگ اور دوسرے صلیبی جتھے شمال و مغرب سے اس پارہ پارہ اور مظلوم سرزمین کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ صلیبیوں کا سیل ابھی رکا نہیں تھا کہ تاتاری قبیلوں کے تلاطم نے شام کو شمال سے جنوب تک پامال کر ڈالا، مملوکوں کی حکومت عثمانیوں نے ختم کی۔ تاریکی کا سلسلہ اُنیسویں صدی کے وسط تک قائم رہا۔

چوالیسواں باب

سلجوقی اور فاطمی

خلافتِ عبّاسی کے انحلال کے بعد جو سلطنتیں پیدا ہوئیں، وہ وُہ نہ تھیں جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے، بلکہ سلجوقی اور فاطمی سلطنتیں تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں نے باہم شام کے حصّے بخرے کر لیے۔ سلجوقیوں کے قبضے میں شمالی حصّہ اور فاطمیوں کے قبضے میں جنوبی حصّہ آیا۔ سلجوقی ترک تھے اور فاطمیوں کے متعلّق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عرب تھے۔

طغرل بغداد میں

سلجوقی خاندان کا بانی غز قبیلے کا ایک ترکمان تھا، جس کا وطن ترکستان تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے وحشی خانہ بدوشوں کے ساتھ بخارا کی جانب حرکت کی[1] بظاہر وہیں اسلام قبول کیا۔ اس کے پوتے طغرل نے مغربی جانب پیش قدمی شروع کی اور وہ ایران میں سے ہوتا ہوا ۱۰۵۵ء میں بغداد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بے دست و پا خلیفہ قائم کے لیے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا کہ ایک آقا کی جگہ دوسرے آقا کو، یعنی شیعی ایرانی آل بویہ کی جگہ سنی ترک سلجوقیوں کو قبول کرے۔[2] نئے سلجوقی حکمران نے اپنے لیے سلطان (صاحب اقتدار) کا لقب اختیار کیا۔ وہ پہلا مسلمان حکمران ہے جس کے سکّوں پر یہ لقب منقوش ہوا۔ طغرل کے جانشین کے عہد میں اس لقب نے مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ طغرل کی ظفرمندی کے بعد ترکوں، سلجوقیوں اور دوسرے لوگ جتھوں کی شکل میں مغربی ایشیا پہنچے اور پورے خطّے میں جا بجا پھیل گئے۔ تدریجاً انھیں اسلامیّت اور عربیّت کے رنگ میں رنگ دیا گیا۔

طغرل کے بھتیجے اور جانشین الپ ارسلان (بہادر شیر) ۱۰۶۳ء۔ ۱۰۷۲ء) اور الپ ارسلان کے بیٹے ملک شاہ (۱۰۷۲ء۔ ۱۰۹۲ء) کے عہد میں سلجوقی سلطنت کمالِ عروج پر پہنچ گئی اور یہ افغانستان کی حدود سے مغربی ایشیائے کوچک میں بزنطینی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۰۷۰ء میں الپ ارسلان نے شمالی شام میں پیش قدمی کی، جو مرداسیوں کے خلاف تھی اور حلب پر قبضہ کر لیا، لیکن مرداسی گورنر کو وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا۔[3] الپ ارسلان کا سالار اتسز خوارزم کا ترکمان تھا۔ اس نے فلسطین پر حملہ کر دیا۔ یروشلم اور دوسرے شہروں پر قبضہ کرتا ہوا وہ جنوب میں عسقلان تک پہنچ گیا، جہاں فاطمی فوج سے مقابلہ کیا۔[4] ۱۰۷۶ء میں اس نے دمشق لے لیا، لیکن اتنے محاصل وصول کیے کہ لوگ بگڑ بیٹھے۔ الپ ارسلان کے بیٹے تتش نے دو سال بعد دمشق کو از سرِ نو فتح کیا اور اتسز کو

---

[1] ابن الاثیر جلد ۹ ص ۳۲۱، ۳۲۲۔

[2] ابن خلکان جلد ۱ ص ۱۰۷، ۱۰۸؛ ابن بردی جلد ۲ ص ۲۲۵۔

[3] ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۴۳، ۴۴۔

[4] ابن عساکر جلد ۲ ص ۲۳۱؛ ابن خلدون جلد ۵ ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

قتل کر ڈالا[1]۔ ۱۰۷۱ء الپ ارسلان نے بمقام ملاذ کرد[2] (جو جھیل وان کے شمال میں ہے) بیزنطینیوں کو فیصلہ کن شکست دی، جس میں بیزنطینی شہنشاہ قید ہوگیا۔ اس وقت پورا ایشیائے کوچک سلجوقیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ ان کے لشکر اناطولیہ اور شمالی شام میں داخل ہو گئے۔ ترکی سالار پیش قدمی کرتے کرتے ہیلسپانٹ تک پہنچ گئے۔ گویا ایک ہی ضرب میں وہ روایتی سرحد، جو اسلام و مسیحیت کی حد فاصل چلی آرہی تھی، مغربی جانب چار سو میل تک دھکیل دی گئی۔ پہلی مرتبہ ترکوں نے ایشیائے کوچک میں قدم گاہ حاصل کی اور یہ قدم گاہ بعد میں کوئی نہ چھین سکا۔

تاہم اس وسیع سلطنت پر بھی دورِ انحلال آگیا۔ مختلف امیروں نے جداگانہ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ایشیائے کوچک (جسے روم کہنے لگے تھے) الپ ارسلان کے چچیرے بھائی سلیمان کے قبضے میں تھا۔ اس نے ۱۰۷۳ء میں نیقیہ (موجودہ ازنیق) کو مرکز بنایا، جو قسطنطنیہ سے زیادہ دُور نہ تھا۔ ۱۰۸۴ء میں دارالحکومت نیقیہ سے قونیہ میں منتقل کرلیا گیا۔ اسی سال سلجوقیوں نے انطاکیہ، بیزنطینیوں سے واپس لے لیا۔ جب تک بیزنطینی عقب میں کسی علاقے پر قابض رہتے، ایشیائے کوچک پر سلجوقی گرفت مستحکم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی سلیمان کے بیٹے قلیج ارسلان سے صلیبیوں کے پہلے جتھے کا مقابلہ ہوا تھا۔ (۱۰۹۶ء) جب وہ ایشیائے کوچک کے راستے شام آرہے تھے۔ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ مختلف ترکی ریاستیں رومی سلجوقیوں کے زیرِ حمایت قائم ہوئی تھیں، انہیں میں ایک ریاست عثمانی ترکوں کی بھی تھی۔ روایات کے اعتبار سے عثمانی ترک بھی غزوں ہی کی ایک شاخ تھے۔

شام کے سلجوقی

شام میں سلجوقیوں کے حکمران خاندان کی بنیاد الپ ارسلان کے بیٹے تتش نے رکھی[3]، جس نے ۱۰۹۴ء میں حلب پر قبضہ کیا[4]۔ اُس وقت تک بھی حلب شمالی شام کا ممتاز شہر تھا اور یقیناً اس قابل تھا کہ کسی امارت کا مرکز بنے۔ تتش آئندہ سال ایک لڑائی میں مارا گیا اور اس کا بیٹا رضوان (۱۰۹۵ء تا ۱۱۱۳ء) حلب کا امیر بن گیا۔ دوسرے بیٹے دقاق نے دمشق میں الگ حکومت کی داغ بیل ڈال دی[5]۔ بہت جلد دونوں بھائیوں میں کشمکش شروع ہوگئی[6] اور دو سال بعد دقاق بڑے بھائی کی سیادت قبول کرلینے پر مجبور ہوگیا۔ ۱۰۹۸ء میں تتش کے ایک رشتہ دار نے، جو یروشلم کا حاکم تھا، اپنی جاگیر فاطمیوں کے حوالے کردی۔ چنانچہ صلیبی جنگجو ارضِ مقدس میں پہنچے تو وہاں فاطمیوں کی حکومت تھی۔ رضوان نے اسمٰعیلی حشیشیوں کی طرف داری اختیار کرلی تھی اور اہلِ حلب بظاہر زیادہ تر شیعہ اور اسمٰعیلی تھے۔ سنیوں کو رضوان سے سخت نفرت تھی۔ اس نے ایک مہینے تک یہ حکم جاری رکھا کہ خطبے میں فاطمی خلیفہ کا نام لیا جائے اور معلوم ہے کہ فاطمی بھی اسمٰعیلی تھے۔ پھر دفعۃً عباسی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔ رضوان بھی ان امیروں میں سے تھا، جن سے صلیبیوں کو شمالی شام میں بار بار لڑائیاں پیش آئیں۔ اس نے فرنگیوں کی یورشوں کے خلاف حلب کی آزادی بحال رکھی لیکن ۱۰۹۸ء میں انطاکیہ کا محاصرہ ہوا تو اسے اٹھوانے میں ناکام رہا۔

---

[1] ابن خلکان جلد ا، ص ۱۶۸

[2] انگریزی میں اس مقام کو مانزی کرٹ کہتے ہیں۔

[3] ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۱۵۷، ۱۵۸

[4] ابن خلکان جلد ا ص ۱۶۸۔

[5] ابن القلانسی ص ۱۳۰، ۱۳۲، ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۱۶۸، ابن خلکان جلد ۵ ص ۱۴۸۔

[6] ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۲۴۹، ابن القلانسی ص ۱۴۲، ابن خلدون جلد ۵ ص ۱۵۳، ۱۸۴۔

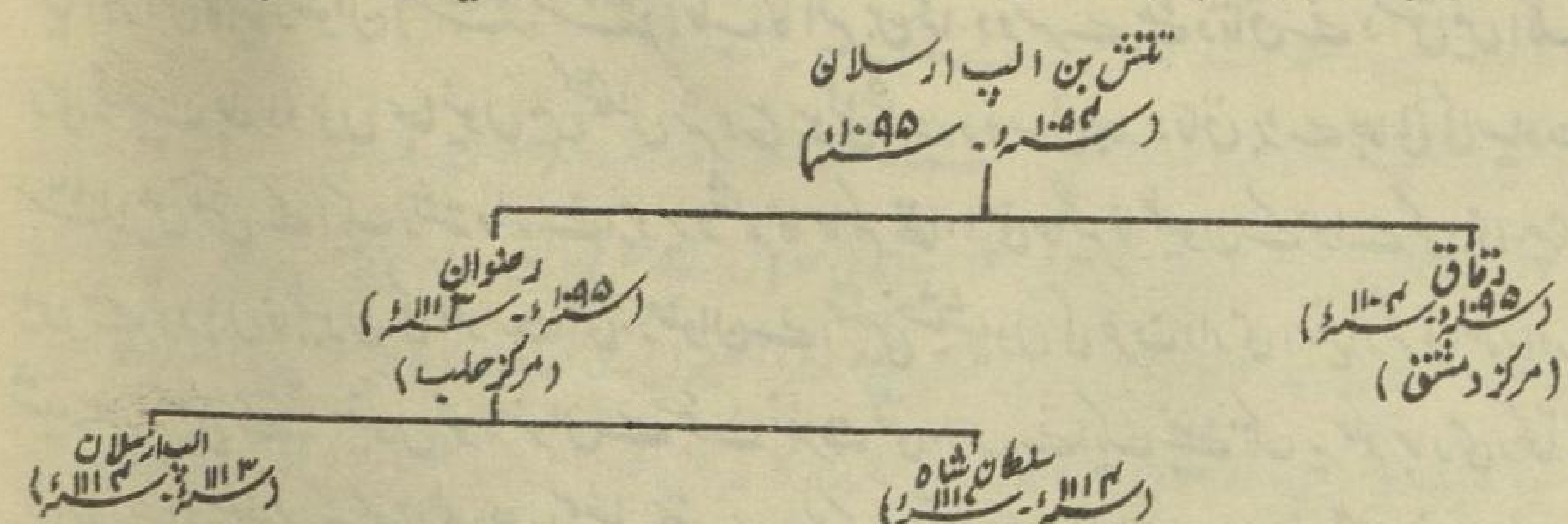
۱۱۱۳ء میں رضوان کا بیٹا الپ ارسلان مسندِ حکومت پر بیٹھا، اس کی عمر سولہ سال تھی اور وہ بڑا بزدل اور عیش ونشاط کا عادی تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نائب السلطنت نے حلب میں اسے قتل کردیا[۱] اور اس کا بھائی سلطان شاہ (۱۱۱۴ء۔ ۱۱۱۷ء) ایک نائب السلطنت کے ماتحت حکمران رہا۔ ۱۱۱۷ء میں سلجوقی فوج کے ایک ترکمان سالار ایلغازی بن ارطق نے حلب پر قبضہ کرلیا۔ ارطقی خاندان نے ماردین کو اپنا مرکز بنایا۔ خود ایلغازی صلیبیوں کے خلاف بڑی جواں مردی سے لڑتا رہا۔

اتابک

۱۱۲۸ء میں ایک اور جنگجو ترک عمادالدین زنگی[۲] نے حلب کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ اس کا وطن موصل تھا۔ اس کا باپ ابتداء میں ملک شاہ کا ایک غلام تھا۔ پھر تتش کی فوج میں اسے سالار کا عہدہ مل گیا[۳]۔ بعد کے برسوں میں زنگی نے حماہ، حمص، بعلبک اور دمشق بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیے۔ صلیبیوں کے خلاف وہ سب سے بڑا مجاہد تھا۔ ۱۱۴۴ء میں اس نے فرنگیوں سے الرہا چھین لیا[۴]۔ یہیں سے صلیبیوں کے خلاف اسلامی سلطنت کی فتوحات کا عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا۔ جو عمادالدین کے فرزند نورالدین زنگی اور نورالدین کے جانشین صلاح الدین ایوبی نے قائم رکھا۔ عمادالدین زنگی ہی قرونِ وسطیٰ کے موصل کی عظمت کا ذمہ دار تھا۔ ایک اور ترک اتابک طغتگین[۵] تھا، جسے تتش نے غلامی سے آزاد کرکے اپنے بیٹے دقاق کی تعلیم و تربیت پر مامور کردیا تھا۔ دوسرے اتابکوں کی پیروی کرتے ہوئے طغتگین نے بھی تمام اختیارات غصب کرلیے اور ۱۱۰۴ء میں دقاق کی وفات پر وہ دمشق کا حاکم بن گیا اور دقاق کی والدہ سے شادی کرلی[۶]۔ ۱۱۱۶ء میں بغداد کے سلطان سلجوقِ اعظم طغتگین کو شام کا عامل مقرر کردیا اور اسے یہ اختیار بھی دے دیا کہ محاصل کا مناسب انتظام کرے نیز فوج بھرتی کرے۔ طغتگین نے ایلغازی سے عہد وفا باندھ لیا اور دونوں مشترکہ حیثیت میں فرنگیوں کے خلاف لڑتے رہے[۷]۔ دونوں بلانوش تھے۔ ایلغازی بعض اوقات مسلسل بیس بیس دن مدہوش رہتا۔ ایک مرتبہ ایلغازی نے ایک فرنگ امیر کو جو صہیان کا امیر تھا،

---

۱ ابن القلانسی ص ۱۸۹، ۱۹۸، نیز کمال الدین: منتخاب من تاریخ حلب شامی سلجوقیوں کا شجرۂ نسب ذیل میں درج ہے:



۲ موصل اور شام کے اتابک خاندان کا بانی۔ اتا بمعنی باپ۔ بک بمعنی امیر۔ یہ لوگ ابتداء میں سلجوقی شہزادوں کے اتالیق تھے۔

۳ کمال الدین، نیز ابن الاثیر۔

۴ ایضاً نیز ابن خلکان اور ذہبی۔

۵ جنگ جو شہباز، اس کا ایک لقب ظہیرالدین بھی تھا۔

۶ ابن القلانسی ص ۱۵۰، ابن خلکان جلد اول ص ۳۰۹، ابن خلدون جلد ۵ ص ۱۵۵، بردی جلد ۲ ص ۳۸۴۔

۷ کمال الدین جلد ۳ ص ۶۲۰ کے بعد۔

اس امید پر طغتگین کے پاس بھیجا کہ وہ اسے خوب ڈرائے گا اور فدیے کی زیادہ بڑی رقم وصول کرے گا۔ طغتگین اس وقت اپنے خیمے میں شراب پی رہا تھا۔ اس نے تلوار کھینچی اور امیر صہبان کا سر قلم کر کے رکھ دیا۔ بعد میں ایلغازی کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ امیر کو ڈرانے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہ تھی۔ صور اس وقت فاطمیوں کے ماتحت تھا۔ ۱۱۱۲ء میں اہل صور نے صلیبیوں کے خلاف طغتگین سے امداد طلب کی، لیکن اس امداد سے محض عارضی فائدہ حاصل ہوا۔ ۱۱۲۴ء میں صلیبیوں نے صور پر قبضہ کر لیا۔[1]

طغتگین سے جس حکمران خاندان کی ابتدا ہوئی تھی، وہ اس کے بیٹے اور جانشین کے نام پر بوری[2] مشہور ہے۔ ۱۱۵۴ء میں زنگی اتابکوں نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ زنگیوں کے کارنامے آگے چل کر بیان ہوں گے۔

فاطمیوں کا قیام

عباسی خلافت کی طرح فاطمی خلافت کے ظہور کو بھی شام سے گہرا تعلق ہے۔ حماہ کے جنوب مشرق میں سلمیہ نام ایک غیر معروف اور الگ تھلگ قصبہ ہے۔ یہی قصبہ نویں صدی کے اواخر میں اسمٰعیلی حشیشیوں کے رئیس کی قیام گاہ اور سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اس کا نام محمد الحبیب تھا اور اس کے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جعفر صادقؓ کے فرزند امام اسمٰعیل کا پر پوتا ہے۔ امام جعفرؒ خود حضرت حسینؓ کی اولاد تھے۔ الحبیب نے اسمٰعیلی شیوے کے مطابق اپنے خفیہ کارندے پوری اسلامی دنیا میں پھیلا دیئے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ سنّی قوت کی جڑ کاٹیں اور حقیقی اسلام، یعنی شیعیت کے قیام کے لیے راستہ صاف کریں۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں عباسیوں کے بعد مؤثر اور خوفناک پراپیگنڈے کا یہ دوسرا انتظام تھا۔

الحبیب کا ایک قابل کارندہ (داعی) جس کا نام ابو عبداللہ الحسن الشیعی (ساکن یمن) تھا، مکہ معظمہ میں قبیلہ قطامہ (شمالی افریقہ) کے بربر حاجیوں سے ملا اور انہیں ہم عقیدہ بنا لیا۔ ۸۹۳ء میں وہ ان کے ساتھ تونیسیہ چلا گیا۔ بڑی دور اندیشی سے اپنا پراپیگنڈا جاری رکھا اور جرأت و ہمت سے کام لے کر اغلبی سلطنت کو ختم کرنے کے لیے کوشاں رہا، جو ایک سو سال پیشتر قائم ہو چکی تھی۔ جب اس کامیابی کا یقین ہو گیا تو اس نے سلمیہ سے اسمٰعیلی امام کو اپنے پاس بلا لیا۔ محمد الحبیب کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا عبداللہ امام تھا۔ عبیداللہ بھیس بدل کر شمالی افریقہ پہنچا، لیکن اغلبی حاکم نے اس کا پتہ لگا لیا اور ۹۰۵ء میں اسے قید کر دیا۔ ۹۰۹ء میں شیعی گروہ اغلبی حاکم کو معزول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبیداللہ کو قید سے رہا کیا گیا اور رقادہ میں اسے نئی سلطنت کا حاکم بنا دیا گیا۔[3] عبیداللہ

---

[1] بردی جلد۔ ص ۲۳۶، ۲۳۷۔

[2] بوری خاندان کا شجرہ ذیل میں درج ہے۔

(۱) طغتگین (۱۱۰۳ء - ۱۱۲۸ء)
- ۲- بوری (۱۱۲۸ء - ۱۱۳۲ء)
- ۳- اسماعیل (۱۱۳۲ء - ۱۱۳۴ء)
- ۴- محمود (۱۱۳۴ء - ۱۱۳۸ء)
- ۵- محمد (۱۱۳۸ء - ۱۱۳۹ء)
  - ۶- ابق (۱۱۳۹ء - ۱۱۵۴ء)

[3] مقریزی جلد ۲ ص ۱۰، ۱۱۔

نے مسندِ حکومت پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ میں مہدی موعود ہوں۔ یوں خلافت کے ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑی، جو فاطمی کے نام سے مشہور ہے۔ اسے علوی اور عبیدی خاندانِ حکومت بھی کہتے ہیں۔ اس حریف کی حیثیت معمولی نہ تھی۔ اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی عباسیوں کا دعوٰئے قیادتِ اسلام مجروح ہو گیا۔ فاطمی خلافت دورِ عروج میں شمالی افریقہ، مغربی عرب اور شام پر قابض تھی، یہ تنہا بڑی شیعی سلطنت تھی اور قرونِ وسطیٰ کی آخری خلافت۔

عبیداللہ کا شجرۂ نسب تاریخی لحاظ سے افسانوں کے پردے میں مستور ہے۔ بہ ظاہر وہ مسلمیہ میں پیدا ہوا، جو حمص سے زیادہ دور نہیں، جہاں سے رومی تخت کو بعض شہنشاہ ملے۔ یہی کیفیت اس کے بیٹے اور جانشین کی تھی۔[۱] نقاد کہتے ہیں کہ اس کا شجرہ مختلف مقامات پر مختلف بنایا گیا ہے، لہٰذا اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا، بعض نے یہ بھی کہا کہ اصل مہدی سجلماسہ کے قید خانے میں مارا گیا تھا اور جس عبیداللہ کو وہاں سے نکال کر حاکم بنایا گیا تھا وہ ایک یہودی تھا، جس نے مہدی کا لباس پہن لیا اور یہ کردار ادا کرتا رہا۔ ایک گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ عبیداللہ نہ صرف علوی ہی نہ تھا، بلکہ عرب بھی نہ تھا۔ وہ دراصل ایک ایرانی عبیداللہ ابن المیمون القداح کے اخلاف میں سے تھا، جس نے امام اسمٰعیلؒ کے بعد دوبارہ اسمٰعیلی فرقے کی بنیاد رکھی تھی[۲] اور جو انتہا پسند شیعی الحادیت، ایرانی تصوف، سریانی غنوسیت اور عقلی نظریات کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن گیا تھا۔ عباسی خلافت کے حامی مورخ فاطمیوں کے دعویٰ صحتِ نسب کی مذمت کرتے ہیں، موجودہ دور کے متعدد یورپی علماء اس شجرۂ نسب کی صحت کے قائل ہیں۔[۳]

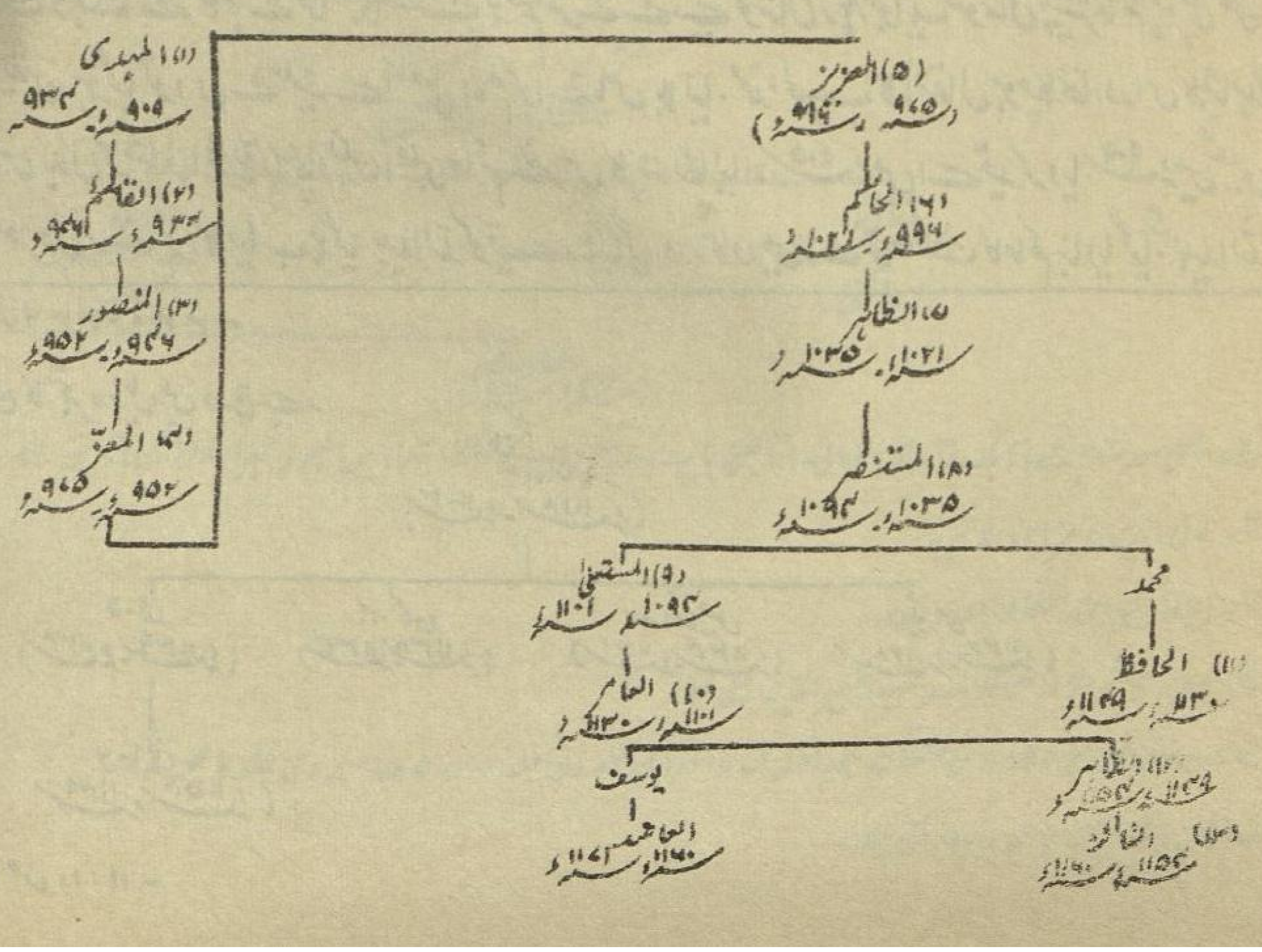
---

۱ ابن حماد اخبار ملوک بنی عبید ص ۱۸۔۲۶، ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۸۸۔

۲ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۸۷، بردی جلد ۲ ص ۱۱۲۔

۳ Polemics on the Origin of the Fatimi Caliphs P. H. Mamour. نیز Ismaili Tradition concerning the Rise of Fatimids

شجرہ مندرجہ ذیل ہے



مملکت کی توسیع

عبید اللہ (۹۰۹ء-۹۳۴ء) نے قیروان کے جنوب مشرق میں ایک نیا دار الحکومت تعمیر کرایا، جس کا نام المہدیہ رکھا۔ اس کا تیسرا جانشین المعز (۹۵۳ء-۹۷۵ء) ۹۷۳ء میں مصر پہنچ گیا، جہاں اس کے فاتح سالار جوہر نے ۹۶۹ء میں ایک نئے دار الحکومت کی بنیاد رکھ دی تھی یعنی القاہرہ، جس کے لیے برِ اعظم افریقہ کا سب سے بڑا شہر بننا مقدر تھا۔ یہیں اس نے ایک مسجد جامع اور ایک یونیورسٹی الازہر کے نام سے بنوائی، جو اعلیٰ تعلیم کا قدیم ترین مرکز ہے اور آج بھی دنیا کے وسیع ترین اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ جوہر سسلی کا ایک مسیحی غلام تھا۔ مسلمان آقا اسے قیروان لے آیا۔ اسے سلطنت گر کا انتہائی بلند اعزاز حاصل ہوا[1]۔ اسی نے ۹۶۹ء میں اخشیدیوں کو مصر و شام سے خارج کیا تھا۔

شام میں جوہر کو دوسرے حریفوں سے بھی مقابلہ پیش آیا، وہاں قرمطی بھی تھے، جنہیں حسن بن احمد الاعصم کی سرکردگی میں عباسیوں کی طرف سے امداد مل رہی تھی، کچھ مدت تک نظر آرہا تھا کہ اعصم کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے دمشق پر قبضہ کیا، فاطمیوں کو ہر مقام سے رجعت پر مجبور کر دیا، بلکہ ان کے تعاقب میں قاہرہ پہنچ گیا۔ بیزنطینی اس امر کے منتظر تھے کہ کوئی سازگار موقع سامنے آئے تو اس سے فائدہ اٹھا کر وہ سرزمین دوبارہ حاصل کر لیں، جہاں کسی زمانے میں حکمران رہ چکے تھے۔ پھر ترک بھی نچلے بیٹھنے والے نہ تھے۔ ان کے ایک سالار افتگین نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور پورے ملک میں یورشوں کا تانتا باندھ دیا۔ ترکوں اور قرمطیوں نے طبعاً مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد کر لیا۔ ۹۷۷ء میں دوسرے فاطمی خلیفہ العزیز نے خود فوج کی قیادت کی اور متحدہ دشمن کو رملہ کے باہر تباہی خیز شکست دی[2]۔ غرض العزیز نے شام کا ساحلی علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، لیکن وہ حلب نہ لے سکا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ بیزنطینی ہر موقع پر مداخلت کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ العزیز کے عہد میں فاطمی خلافت انتہائی وسعت حاصل کر گئی اور اس کا اقتدار اوقیانوس سے قلزم تک، نیز حجاز، یمن، شام اور الموصل میں بھی تسلیم کیا جاتا تھا[3]۔ خلیفہ العزیز نے جلد سے جلد خبر پہنچانے اور حاصل کرنے کے لیے کبوتروں کو تربیت دی۔ ایک سو بیس کبوتر صرف دمشق سے رقعے مصر پہنچانے کے لیے استعمال ہوتے تھے اور تین یا چار دن میں منزل طے کر لیتے تھے۔ اس کی ایک خواص مسیحیہ تھی جس کے ایک بھائی کو قاہرہ میں اور دوسرے کو یروشلم میں اسقف بنا دیا گیا تھا۔ اس کا وزیر بھی مسیحی ہی تھا، جس کا نام عیسیٰ بن نسطوروس تھا اور شام میں اس کا نائب منشا (منسّہ) بن ابراہیم ایک یہودی تھا۔ وہ دونوں اپنے ہم مذہبوں کی خاص رعایت کرتے تھے۔ ایک روز خلیفہ تیز رفتار خچر پر سرپٹ جا رہا تھا، ایک عورت نے ایک کاغذ اس کی طرف پھینکا، جس پر تحریر تھا: اس کے نام سے، جس نے مسیحیوں کو عیسیٰ کے ذریعے سے اور یہودیوں کو منشہ کے ذریعے سے عزت دی، مسلمانوں کو تیرے ذریعے سے دکھ پہنچایا۔ کیا تو مسلمانوں پر رحم کھائے گا اور ان کی پابندیوں کو دور کرے گا، جو میرے لیے باعثِ مصیبت بنی ہوئی ہیں؟[4]

---

[1] ابن خلکان جلد ۱ ص ۲۰۹، ۲۱۳، مقریزی جلد ۱ ص ۳۵۲، ۳۷۷

[2] ابن قلانسی ص ۱۸، ۱۹؛ ابن خلدون جلد ۴ ص ۵۲۔

[3] بردی جلد ۲ ص ۱۰؛ ابن خلکان جلد ۳ ص ۵۴۔

[4] ابن قلانسی ص ۳۳؛ بردی جلد ۲ ص ۴؛ سیوطی جلد ۲ ص ۱۴؛ ابو الفدا جلد ۲ ص ۱۳۸۔

ناپائدار قبضہ

شام پر فاطمیوں کی گرفت غیر مستقل اور ناپائدار تھی۔ قرمطی، سلجوقی، دوسرے ترک اور بیزنطینی، بلکہ مقامی باشندے اور صحرائی بدو بھی مقابلے کے لیے تیار رہتے تھے۔ الحاکم فاطمی (۹۹۶ء-۱۰۲۱ء) کی مسند نشینی کے دوسرے سال صور کے ایک ملّاح نے، جس کا نام علاقہ تھا، اپنے نام کے سکّے جاری کیے اور شہر کی آزادی کا اعلان کر دیا، ایک مدّت تک وہ مصری فوج کا مقابلہ کرتا رہا اور بیزنطینی بیڑے کی مدد سے مصری بیڑے کو اس نے روکے رکھا۔ آخر اسے شہر حوالے کرنا پڑا۔ بغاوت کی پاداش میں پہلے اس کی کھال اتاری گئی، پھر اسے سولی پر چڑھایا گیا۔ اس کی کھال میں بھس کر قاہرہ میں نمائش کی گئی۔

مرداسی

الحاکم کے عہد میں بدنظمی ایسی صورت اختیار کر گئی کہ بادیۂ شام کے بدوؤں کو بھی چھاپے مارنے کا حوصلہ ہوا۔ ۱۰۲۳ء میں صالح بن مرداس نے، جو قبیلہ کلاب کا سردار تھا، شمالی شام کا دارالحکومت فاطمیوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مرداسی نصف صدی سے زیادہ مدّت تک حلب پر قابض رہے۔ انہوں نے کلب اور طے قبیلوں سے اتّحاد کر لیا۔ کلاب نے ۱۰۲۵ء میں دمشق کی ناکابندی کر لی۔ طے نے ۱۰۲۴ء میں رملہ کو آگ لگا دی۔ لوٹ مار، قزّاقی اور بدامنی کا آغاز سلجوقیوں کی آمد کے ساتھ ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ بدستور جاری تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے، حلب نے خوش حالی کا منظر قائم رکھا۔ ایران کے اسمٰعیلی سیّاح ناصر خسرو نے ۱۰۴۷ء میں حلب کو دیکھا تھا۔[1] وہ کہتا ہے کہ وہاں عراق، مصر اور ایشیائے کوچک سے تاجر آتے تھے اور مرداسی تجارتی اشیاء پر محصول وصول کرتے تھے۔ بغداد کے ایک مسیحی طبیب ابن بطلان نے ایک دوست کو حلب دیکھ لینے کے بعد ایک خط لکھا تھا جس میں مرداسی عہد کے حلب کا سرسری نقشہ پیش کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر کے اردگرد سفید پتّھر کی فصیل ہے، جس میں چھ دروازے ہیں، پرانا حصار فصیل کے ساتھ ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر دو گرجے ہیں اور ایک مسجد۔ شہر میں اور گرجے ہیں (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیوں کی آبادی بہت زیادہ تھی) اور ایک جامع مسجد ہے۔ ایک چھوٹا ہسپتال بھی ہے۔ لوگ بارش کا پانی پیتے ہیں جو حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ ایک تجارتی ایوان میں کپڑے کے بیس تاجر ہیں، جو بیس سال سے یہی کام کر رہے ہیں اور ہر روز ان کے ہاتھوں بیس ہزار دینار کے سودے ہوتے ہیں۔[2]

ابوالعلا معرّی

اس عہد کی سیاسی بدنظمی، مجلسی انحطاط، ذہنی قنوط اور مذہبی تشکک کا آئینہ شمالی شام کے مشہور شاعر ابوالعلا معرّی (۹۷۳ء-۱۰۵۷ء) کی کلام ہے، جس کا مقام پیدائش معرّۃ النعمان تھا۔ ابوالعلا یمن کے قبیلہ تنوخ سے تھا۔ چار سال کی عمر میں چیچک نکلی اور ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ بعد میں دوسری آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔ اس جسمانی بدنصیبی نے اس کے مزاج میں مزید تلخی پیدا کر دی۔ بینائی زائل ہو جانے کے باوجود نوجوان ابوالعلا نے حلب میں حتی الامکان تعلیم پائی۔ بعد میں دو مرتبہ بغداد گیا۔[3] دوسری مرتبہ

---

[1] سفرنامہ ناصر خسرو ص ۱۰۔ [2] یاقوت معجم البلدان جلد ۲ ص ۳۰۶-۳۰۸

[3] ابن خلکان جلد ۱ ص ۵۹، یاقوت، ادباء جلد ۱ ص ۱۶۲۔

اس نے عقلیت پسندوں، معتزلیوں اور یونانی دبستان کے فلسفیوں سے بہت مذاکرے کئے اور خود بھی آزاد خیال حلقے میں شامل ہوگیا۔ ۱۰۱۰ء میں اسے یکایک وطن لوٹنا پڑا، کیونکہ اس کی والدہ سخت بیمار ہوگئی تھی اور وہ ابوالعلاء کے پہنچنے سے پیشتر ہی وفات پاگئی۔ بغداد میں وہ غالباً ہندوؤں سے بھی ملا اور انہیں کی صحبت میں سبزی خور بنا۔ بعدازاں پینتالیس برس تک اس نے گوشت بالکل نہ کھایا[۱]۔ وہ اپنے وطن میں رہا۔ شادی نہ کی اور کہا جاتا ہے کہ وصیت کردی تھی، میری لوح قبر پر یہ شعر لکھ دیا جائے:

یہ غلطی میرے باپ نے کی تھی کہ میں پیدا ہوا۔
لیکن میں نے ایسی غلطی نہ کی[۲]

جس آمدنی پر اس کا گزارہ تھا، وہ خطبوں سے ہوتی تھی۔ جب خلیفہ حاکم فاطمی کا پوتا المستنصر معرہ پر قابض ہوا تو اس نے خزانے کی پوری رقم شاعر کی خدمت میں پیش کی، لیکن ابوالعلاء نے اسے قبول نہ کیا[۳]۔ وہ زیادہ وقت تنہائی میں گزارتا تھا اور اپنے آپ کو رہین المحبسین (دو قید خانوں کا قیدی) کہتا تھا۔ ایک گھر اور دوسرا نابینائی۔ ایک موقع پر وہ معرہ کے پاس ہی ایک مقام پر صالح بن مرداس سے ملا اور اپنے قصبے کے ساٹھ ممتاز افراد کے لیے سفارش کی، جنہیں صالح نے بغاوت کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ سب رہا کر دیئے گئے۔

اپنے عہد کے دوسرے شاعروں کے برعکس اس نے کبھی کسی امیر یا بادشاہ کی مدح نہ کی اور نہ صلہ لیا۔ ابتدائی دور میں اس نے سیف الدولہ کی مدح میں چند قصیدے کہے تھے، لیکن بظاہر وہ سیف الدولہ کے روبرو پیش نہ ہوئے۔ ابوالعلاء نے بعد میں جو کچھ لکھا، اس میں قنوطیت اور فلسفۂ حیات کا تشکک غالب ہے وہ تمام مسائل پر عقلی نقطۂ نگاہ سے غور کرتا تھا۔ اسمٰعیلی فرقے کا داعی اعظم بھی اس کے مکتوب الیہم میں تھا، اپنے رسالۃ الغفران میں ابوالعلاء نے بڑے بڑے ملحدوں اور آزاد خیال لوگوں کو جوارِ جنت میں جگہ دی۔ یہی رسالہ تھا، جس سے عام رائے کے مطابق دانتے کو "طربیۂ آسمانی" مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا[۴]۔ "اللزومیات" میں اس کی بعض بڑی ہر دلعزیز نظمیں شامل ہیں، جن میں سے بعض میں وہی خیال پیش کیے گئے ہیں، جو بعد میں عمر خیام نے پیش کیے۔ اس کی کتاب "الفصول والغایات" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالعلاء نے قرآن کی نقل پیش کرنے کی کوشش کی تھی، جو مسلمانوں کی نگاہ میں کفر ہے۔ جو فلسفہ وہ اپنی تصانیف میں پیش کرتا رہا وہ بنیادی طور پر لذتیوں کا فلسفہ تھا۔ ذیل کے اشعار سے اس کی آزاد خیالی واضح ہو سکے گی۔

"ہم ہنستے ہیں اور ہنسنا صریح سفاہت ہے۔
ہمیں رونا چاہیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہیے"۔

۱۔ یاقوت جلد ۱ ص ۱۷۰

۲۔ ابن خلکان جلد ۱ ص ۵۹، ص ۳۱۷

۳۔ یاقوت جلد ۱ ص ۱۷۸۔

۴۔ Miguel Asin, Islam and the Divine Comedy

زمانے نے ہمیں شیشہ سمجھ کر ریزہ ریزہ کر ڈالا۔
ہم پھر کبھی شیشہ نہ بن سکیں گے۔

عقل کو رہنما بنا اور جس کی وہ تصدیق کرے، وہی کچھ کر۔
یقین رکھ کر وہی بہترین مشیر ہے۔
تورات میں جو قانون درج ہیں، ان میں سے کوئی قبول نہ کر۔
تو صاف گوئی کا خواہاں ہے، وہ تجھے وہاں نہیں ملے گی۔

دین حنیفی کے پیرو لغزشیں کھا رہے ہیں، مسیحی گمراہ ہو چکے ہیں،
یہودی سرگرداں ہیں، مجوسی غلط راستے پر جا رہے ہیں۔
ہم فانی انسان دو بڑے گروہوں سے مرکب ہیں۔
یا تو عقلمند ہیں، مگر بے دین یا دین دار ہیں، مگر بے وقوف۔

ابو العلاان چند عرب شعراء میں سے تھا، جو زمان ومکان کی قیود سے بالا ہو کر آفاقی انسانیت کے دائرے میں پہنچ گئے۔ ۱۹۴۴ء میں دمشق کی عرب اکاڈمی کے زیر سرپرستی اس کی ہزار سالہ برسی دمشق، حلب، لاذقیہ اور معرۃ النعمان میں منائی گئی تھی، شام، لبنان، شرق اردن، عراق اور مصر سے مندوبین آئے۔ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے بھی مقالے لکھے۔ دمشق کی برسی کے متعلق بتایا گیا تھا کہ شہر کی ثقافتی تاریخ میں یہ سب سے بڑی تقریب تھی۔ جشن کے سلسلے میں اس کے مقبرے کی بھی مرمت کرائی گئی جو اس کے وطن میں ہے اور اسے قومی زیارت گاہ بنا لیا گیا۔

دروزی

فاطمی خلیفہ الحاکم (۹۹۶ء بہ ۱۰۲۱ء) سے اسلام میں ایک اور فرقہ پیدا ہوا، یعنی دروزیت۔ یہ نام ایک ایرانی باطنی داعی سے لیا گیا، جس کا نام محمد بن اسماعیل الدرزی (درزی یعنی کپڑے سینے والا) تھا۔ یہ پہلا شخص تھا، جس نے علانیہ اس فاطمی خلیفہ کی تقدیس کی۔[1] یہ عقیدہ کہ خدا خود آدمی کے جسم میں حلول کرآتا ہے اور اس کا آخری بڑا مظہر خلیفہ الحاکم تھا۔ دروزی نظام عقائد کی بنیاد و اساس ہے۔ انبیائے کرام مقابلۃً ان کے نزدیک کم تر حیثیت رکھتے ہیں۔

الدرزی کو اپنے نئے عقیدے کے لیے مصر میں چنداں گرمجوشی نظر نہ آئی تو وہ وادی تیم[2] میں منتقل ہو گیا، جو کوہ شیخ کے دامن میں (لبنان) واقع ہے۔ وہاں آزادی پسند پہاڑی لوگ رہتے تھے۔ وہ پہلے ہی انتہا پسندانہ شیعی افکار سے متاثر تھے۔ انہوں نے

---

[1] بردی جلد ۲، حصہ دوم ص ۶۹۔

[2] یہ نام اس لئے پڑا کہ عربوں کا ایک قبیلہ تیم اللہ (پہلے تیم اللات) پہلے حلقہ فرات میں آباد تھا وہاں مسیحیت اختیار کر چکنے کے بعد جنوبی لبنان پہنچ گئے، طبری جلد ۱ ص ۲۲۸۹، ۲۲۹۰، ۲۰۳۱۔

الدّرزی کی باتیں توجہ سے نہیں لیں[1] یہاں الدّروزی ایک لڑائی میں مارا گیا (۱۰۱۹ء) اور اس کا حریف حمزہ بن علی معروف بہ "الہادی" جانشین ہوا۔ وہ بھی ایرانی ہی تھا[2] جب الحاکم محل کی ایک سازش ہی کے باعث مارا گیا تو الہادی نے اس کی موت سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ خلیفہ موصوف عارضی طور پر غائب ہوئے ہیں اور اب ان کی فاتحانہ رجعت کا انتظار کرنا چاہیے[3] بہاؤ الدین المقتفی جو حمزہ کا دست راست تھا، اس نئے فرقے کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیا، ہندوستان و قسطنطنیہ تک خطوط پہنچائے[4] آگے چل کر اس نے نئی پالیسی اختیار کر لی جس کا مطلب یہ تھا کہ الحاکم کی غیبوبیت میں مذہب کا کوئی حصہ نہ تو فاش کرنا چاہیے اور نہ اس کی اشاعت ہونی چاہیے۔ یہ پالیسی یقیناً اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ ایک چھوٹی سی جماعت، جو اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کر رہی تھی تباہی سے محفوظ رہے۔ اس وقت سے "دروازہ بند کر دیا گیا" نہ کوئی نیا آدمی اس مذہب میں داخل ہو سکتا ہے، نہ داخل شدہ باہر نکل سکتا ہے، امام غائب کے عقیدے کو دروزیت سے پیشتر غالی شیعہ انتہا تک پہنچا چکے تھے۔

"الرسالۃ المسیحیہ" میں بہاؤ الدین حمزہ کو "مسیح" بتاتا ہے دوسرے خطوط میں مسیحیوں کو مقدس لوگ اور مقدس لوگوں کے گروہ قرار دیتا ہے، اس لئے وہ انھیں اپنا ہم خیال و ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ ایسی تمثیلوں سے کام لیتا ہے۔ جیسی عہد نامہ جدید میں ملتی ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مسیحی تھا، جس نے ارتداد اختیار کر لیا تھا۔

حمزہ نے حاکم کے نام پر تمام پیرووں کو تمام بنیادی اسلامی فرائض کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ ان میں روزہ اور حج بھی شامل تھے۔ ان کی جگہ راست گفتاری، برادران مذہب کے درمیان تعاون، باطل عقائد سے کامل بیزاری اور رضائے باری تعالیٰ کے پر خلوص قبول پر زور دیا آخری اصل، جسے عقیدۂ قضا و قدر ہی کی ایک صورت سمجھنا چاہیے۔ اب بھی دروزیت میں ایک زبردست عامل ہے۔ نیز یہ لوگ تناسخ ارواح کے قائل ہیں، یہ عقیدہ ہندوستان سے آیا اور اس میں افلاطونی فلسفے کے بعض عناصر شامل ہو گئے۔ معتزلیوں اور باطنیوں نے بہت پہلے اس قسم کا عقیدہ قبول کر لیا تھا۔ ایران کے موجودہ متصوفین اور بہائی اب بھی اس کے پابند ہیں۔ تعاون کے اصول نے دروزیوں کو اب تک ایک فرقے کے بجائے ایک دینی برادری بنا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ فرقہ دو بڑے حصوں میں بٹا ہوا ہے یعنی "عقّال" اور "جہال"۔ مقدس کتابیں صرف چند عقال ہی کی نگاہوں سے گذر سکتی ہیں۔ یہ سب کی سب مخطوطات کی حالت میں ہیں، اجتماعات الگ جگہوں پر ہوتے ہیں، جو دیہات سے باہر پہاڑوں پر بنی ہوئی ہیں اور عموماً جمعرات کی شام کو ہوتے ہیں۔

دروزیوں نے جنوبی شام میں مستقل قدم گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھیں ایک ملحد فرقے نصیریہ سے لڑائیاں پیش آگئیں۔ آخر نصیریہ کو شمالی شام کی جانب منتقل ہونا پڑا، پھر دروزیوں کو دوسرے ہمسایوں، یعنی شیعوں اور سنیوں سے کشمکش کی نوبت آگئی۔ ان کا ابتدائی وطن جنوبی لبنان میں تھا۔ پھر وہ ضلع سوف میں منتقل ہو گئے، جو بیروت کے مشرق میں ہے۔ صلیبی گروہ

---

[1] بروبی جلد ۲ حصہ دوم ص ۰۷

[2] حافظ ابن حجر عسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر میں اسے زوزنی کہا گیا ہے۔ وزن کا باشندہ جو مشرقی ایران میں ہے۔

[3] ملاحظہ ہو حتی کی کتاب The Origins of the Druze People and Religion

[4] جو خط قسطنطین (کانسٹانٹن) کے نام بھیجا گیا تھا، اس کے لئے ہو حتی کی مذکورہ بالا کتاب

آئے تھے تو دروزی ضلع شوف ہی میں تھے اور اب بھی وہ وہیں ہیں۔ وہ کسی شہری آبادی میں فروغ نہ پا سکے۔ دروزیوں کا ذکر یورپ میں پہلے پہل بنیامین تودلی کے سفرنامہ میں آیا (۱۱۶۹ء کے آس پاس) جب وہ وادیٔ تیم میں مقیم تھے۔ قیسیوں اور یمنیوں کے خونی جھگڑوں سے مجبور ہو کر ان میں سے بعض ضلع شوف سے اٹھارھویں صدی کے اوائل میں حوران (شام) چلے گئے۔ انیسویں صدی میں صورتِ حال پر عدم اطمینان کے باعث ہجرت کی رفتار بڑھ گئی۔ آج کل حوران میں ان کی تعداد چھیاسی ہزار اور لبنان میں اناسی ہزار ہے۔ ان کی پوری سرگزشت عزم حریت سے ممتاز ہے اور شام کے قومی معاملات میں ان کا اثر تعداد سے کہیں زیادہ رہا ہے۔

نصیریہ

اسماعیلیوں کی ایک اور شاخ، جو اب تک زندہ ہے "نصیریہ" ہیں۔ یہ نام غالباً محمد ابن نصیر کوفی کے نام پر رکھا گیا جو (نویں صدی کے اواخر میں) گیارھویں امام الحسن العسکری کا حامی تھا۔ (وفات ۸۷۴ء) ابن نصیر اور اس کے پیروؤں کے متعلق ابتدائی قابلِ ذکر اشارے حمزہ اور دروزیوں کے مناظروں کی تحریرات میں ملتے ہیں۔ اس فرقے کا آخری بانی حسین ابن حمدان الخصیبی (وفات ۹۵۷ء) تھا جو حمدانیانِ حلب کا اسمٰعیلی مولیٰ تھا۔

اس فرقے کے مذہب کے متعلق بہت کم معلومات ہیں کیونکہ اسے خفیہ رکھنے پر سخت اصرار کیا جاتا ہے۔ اس کی تنظیم میں کاہنیت کا دستور پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور اس کے معمولات و مراسم میں باطنیت کا پہلو غالب ہے۔ اس کی مقدس تحریرات دروزیوں کی تحریرات کے برابر بھی منظرِ عام پر نہیں آسکیں چونکہ یہ بہت بڑی مخالفت اکثریت میں ایک قلیل التعداد الحادی فرقہ تھا، اس لئے تحفظ کی غرض سے معرضِ خفا میں چلا گیا اور اسی حالت میں رہا۔ مشرقِ قریب کے مذہبی معموں میں سے یہ ایک ایسا معمّا ہے، جو محض جزوی طریق پر حل ہو سکا ہے۔

بایں ہمہ اتنا معلوم ہے کہ شیعوں کے دوسرے غالی فرقوں کی طرح نصیریہ بھی علیؓ کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک علیؓ خدا کا آخری اور نہایت اہم اوتار تھے[1] بعد میں ان سے اور شاخیں پیدا ہوئیں مثلاً مغربی اناطولیہ کے "تختجی" لکڑی کاٹنے والے، مشرقی اناطولیہ کے قزلباش اور ایران و ترکستان کے علی اللّٰہی۔ نصیریہ کو بعض اوقات علوی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام اس زمانے میں مروج ہوا۔ جب فرانسیسیوں نے لاذقیہ کے اردگرد کا علاقہ الگ منظم کر کے اس کا نام "علویین" رکھا۔ صلیبی جنگوں کے وقائع میں انھیں "نزری" کہا گیا ہے۔ اس فرقے کی حقیقی کیفیت یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ گویا ایک پرانے وثنی گروہ پر شیعی افکار کا سخت دباؤ پڑا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک پرانا وثنی گروہ ہے، جس نے شیعی لباس اختیار کر لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے اکابر وثنیت سے اسماعیلیت میں منتقل ہو گئے[2] بعد میں انھوں نے کچھ سطحی مسیحی خط و خال بھی اپنا لیے، مثلاً وہ اس انداز میں جمع ہوتے ہیں جیسے مسیحی دعائے شام کے لیے جمع ہوا کرتے ہیں۔ وہ بڑا دن مناتے ہیں[3] ایسٹر مناتے ہیں (عید الفصح) وہ مسیحیوں جیسے نام رکھتے ہیں، مثلاً متّی۔ جبرئیل، یوحنا، ھیلینا، ہیلن،

---

[1] شہرستانی ص ۱۴۳-۱۴۵

[2] کتاب الباکورة السلیمانیة شائع کردہ جشی ص ۱۵۹-۱۶

[3] مرتو تفیض کا مقالہ جرمنی رسالے Der Islam میں بابت ۱۹۴۷ء ص ۱۷۵، ۱۷۹

ان کے اکابر جنھیں درروزیوں کے "عقال" کا ہمسر سمجھنا چاہیے۔ تین طبقوں میں منقسم ہیں۔ باقی طبقے کو طبقہ عوام سمجھنا چاہیے عورتوں کو خاص مجالس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں، یہ طریقہ درروزیوں سے سراسر مختلف ہے۔ اجتماع عموماً رات کے وقت اور الگ تھلگ مقامات پر ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف یہ الزامات بھی لگائے جاتے ہیں کہ وہ مجالسِ شبینہ میں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور آلۂ تناسل کی پرستش کرتے ہیں۔ ایسے الزامات ان تمام گروہوں پر لگے ہیں جو مذہبی عمال خفیہ خفیہ انجام دیتے ہیں[1] آج کل نصیریہ کی تعداد کوئی تین لاکھ ہوگی وہ سب کسان ہیں، انھوں نے شمالی و وسطی شام کا کوہستانی علاقہ گھیر رکھا ہے اور ترکی سیلیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مسیحیوں پر سختیاں

فاطمیوں کے عہدِ حکومت میں مسیحیوں اور یہودیوں سے بہ حیثیت مجموعی اچھا برتاؤ ہوتا رہا۔ صرف الحاکم کے عہد حکومت میں ان پر وہ ذلت خیز پابندیاں از سرِ نو لگا دی گئیں جو عمر بن عبدالعزیزؒ اور متوکل نے تجویز کی تھیں، بلکہ اس خلیفہ (الحاکم) نے نئی پابندیاں لگا دیں، حالانکہ اس کی ماں اور اس کا وزیر مسیحی تھے۔ پہلے سے یہ ضابطہ موجود تھا، ذمی خاص لباس پہنیں تاکہ دیکھتے ہی سب کو معلوم ہو جائے وہ مسلمانوں سے الگ گروہ ہیں یہ ضابطہ جاری کر دینے کے علاوہ الحاکم نے ۱۰۰۹ء میں حکم دے دیا کہ مسیحی حمام کے لیے جائیں تو لازم ہے، ان کی گردنوں میں پانچ پونڈ وزنی صلیب بندھی ہوئی ہو اور یہودیوں کی گردنوں میں لکڑی کا اتنا ہی وزنی ڈھانچہ ہو جس میں گھنٹیاں لگی ہوئی ہوں[2]۔ اسی سال الحاکم نے بہت سے گرجے منہدم کرا دیے، جن میں دمشق کا کنیسائے مریمؑ و عذراؑ اور یروشلم کا کینستہ القیامتہ (کنیسائے مزار مسیحؑ) بھی شامل تھا قرآن مجید کے ضابطۂ امتناع خمر کو پورا کرنے کے لیے اس نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں انگور کی بیلیں ہیں، کاٹ ڈالی جائیں اور مصر میں انگور کے باغات مسیحیوں ہی کے تھے۔ جو ذمی خلیفہ کے ان احکام کو ماننے میں متامل تھے، انھیں دربار میں بلا کر کہہ دیا گیا کہ یا تو اسلام قبول کر لو یا اسلامی سرزمین چھوڑ کر رومیوں میں جا بسو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مصر و شام کے مسیحیوں کی تعداد اگر مسلمان ہم وطنوں سے زیادہ نہیں تو برابر ضرور ہوگی اور یہ رسول اللہ صلعم کے عہد سے تقریباً چار سو سال بعد کا واقعہ ہے۔ بیس سال کے بعد الحاکم کے بیٹے اور جانشین الظاہر نے بیزنطینی شہنشاہ سے ایک معاہدے کی پابندی میں تمام تباہ شدہ گرجے سنبھال کر دیے۔ ان میں کینستہ القیامہ بھی شامل تھا۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ مسیحیت کے اس مقدس مزار کی تباہی صلیبی جنگوں کے تائیدی عوامل میں سے ایک عامل تھی۔

نیلی آنکھوں والا الحاکم گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور چھتیس سال کی عمر میں ختم ہو گیا۔ اس کی روش عجیب و غریب تضاد نظر آتے ہیں۔ اس نے قاہرہ میں ایک اکاڈمی بنائی۔ تین سال بعد اکاڈمی اور اس کے پروفیسر سب تباہ کر دیے۔ اس نے جنسی کج روی کے خلاف سخت قانون نافذ کیا اور حکم دے دیا کہ قاہرہ کے بازاروں میں کوئی عورت باہر نہ نکلے۔ اسی طرح دعوتوں غنائی مجلسوں اور شطرنج کی ممانعت کر دی بلکہ بعض کھانے روک دیے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ فاطمیوں کے مخالفوں نے

---

[1] کانڈر Conder کی کتاب Syrian Stone-Lore ص ۴۲۳

[2] ابن خلکان جلد ۳ ص ۵، سعید ابن البطریق ص ۱۹۵، مقریزی جلد ۲ ص ۲۸۸، ابن حماد ص ۴

کہا ہے کہ اس کا دماغ ہی درست نہ تھا[1]

الحاکم کے جانشینوں کو نظم و نسق سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ وہ عیش و نشاط کے متوالے تھے، لہذا نہ داخلی امن قائم رکھ سکے، نہ بیرونی ممالک پر تسلط باقی رکھ سکے۔ ۱۰۲۳ء میں حلب جو شمالی شام کا مرکز تھا مرداسی بدوؤں نے چھین لیا۔ ۱۰۷۱ء میں یروشلم، جو جنوبی شام کا بہت بڑا شہر تھا، سلجوقیوں کے قبضے میں آگیا۔ پانچ سال بعد دمشق بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۰۹۸ء میں یروشلم سلجوقیوں کے ارتکی نائب سے لے لیا، لیکن آئندہ سال اس پر اجنبی اور غیر متوقع دشمن قابض ہو گئے۔ یہ صلیبی تھے۔

[1] ابن خلکان جلد ۳ ص ۴، ۷، ابن خلدون جلد ۴ ص ۵۹، ۶۱، بروبی جلد ۲ حصہ سوم ص ۶۲ سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۱۴، ۱۵ ابن القلانسی ص ۶۶، ۶۷، ۶۹، ۸۰۔ مقریزی جلد ۲ ص ۲۸۵ - ۲۸۹، ۱۰ ابن حماد ۴ ص ۵۴ - ۵۵۔

پینتالیسواں باب

صلیبی جنگیں

شرق و غرب کا ربط ضبط

۲۶ نومبر ۱۰۹۵ء کو پوپ اربن ثانی نے، جو ولادت کے اعتبار سے فرانسیسی تھا، جنوبی و مشرقی فرانس کے ایک مقام کلرمون میں اشتعال انگیز تقریر کی۔ جس میں سچے مسیحیوں کو جوش دلایا کہ وہ کینستہ القیامہ پہنچیں، اس مقام کو شریر قوم سے چھینیں اور اپنے قبضے میں لے آئیں۔ اگر نتائج کے اعتبار سے اندازہ کیا جائے تو یہ غالباً تاریخِ عالم کی سب سے زیادہ پُر تاثیر تقریر تھی۔ سامعین میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ نعرہ تھا۔ "خدا کی مرضی یہی ہے"۔ یہی جنگی نعرہ بن گیا اور پورا یورپ اس سے گونج اٹھا۔ تمام چھوٹے بڑے اعلیٰ ادنیٰ اس سے یوں مسحور ہو گئے، گویا ایک عجیب و غریب نفسیاتی وبا پھیل گئی تھی۔

تحریک کے پُرپیچ عوامل

تاہم تحریک میں شامل ہونے کا معاملہ صرف اس حد تک محدود نہ تھا کہ کلیسا نے ایک نیا طریقہ اور نیا نصب العین سامنے رکھ دیا تھا۔ راسخ العقیدہ مسیحیوں کے علاوہ ایسے فوجی سالار بھی موجود تھے جو عزم کیے بیٹھے تھے کہ فتوحات کے نئے میدان تلاش کریں۔ تاجر بھی شامل تھے، خصوصاً جینوا، وینس اور پیسا کے تاجر، جن کی دلچسپی روحانی سے کہیں زیادہ تجارتی تھی۔ رومان پسند بیقرار اور ہنگامہ طلب لوگ بھی تھے جو بظاہر اس شاندار تحریک میں بے تکلف شامل ہو گئے۔ مجرم اور گناہ گار لوگ بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ ارضِ مقدس کی زیارت سے جرموں اور گناہوں کی تلافی کریں، جہاں کسی زمانے میں "خداوند خدا کا قدم پڑا تھا"۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اقتصادی اور مجلسی اعتبار سے تباہ ہو چکے تھے ان کا صلیب اٹھا کر روانہ ہو جانا قربانی کے بجائے محض مشکلات سے عارضی نجات کا سامان تھا۔[۱]

مزید عوامل بھی کارفرما تھے، جن کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ پوپ نے اپنے ابتدائی خطبے کے لیے جنوبی فرانس کو منتخب کیا تو یہ انتخاب بلا وجہ نہ تھا۔ جنوبی فرانس، یورپ کا وہ حصہ تھا، جسے ہسپانیہ سے آئے ہوئے اسلامی لشکر بار بار پامال کر چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ساڑھے چار سو سال سے مسلمان مسیحیت کے خلاف جارحانہ اقدامات کرتے رہے تھے۔ ابتدا میں بیزنطینی سلطنت کی جانب سے بعد ازاں ہسپانیہ، سسلی اور اٹلی سے[۲] اب مسیحیوں کی طرف سے ردعمل

---

[۱] یورپ کے مزید حالات کے متعلق دیکھیے اگسٹ سی کرے (Krey) کی کتاب The First Crusade ص ۲۴-۴۲

[۲] اغلبیوں کے سسلی کو ٹیونس سے فتح کیا دیکھیے حتی کی تاریخ عرب انگریزی

کا وقت آگیا تھا۔ علاوہ بریں اس مسیحی اجتماع سے ایک سال پیشتر بیزنطینی شہنشاہ الیکسیس کومنی نس پوپ اربن سے امداد کے لیے اپیل کرچکا تھا۔ کیونکہ اس کے ایشائی مقبوضات کو سلجوقی قسطنطنیہ تک روند چکے تھے۔ پوپ کے نزدیک اس طلب امداد نے ایک موقع پیدا کر رہا تھا کہ یونانی کلیسا اور رومی کلیسا کے درمیان تفرقے کا زخم مندمل کر دیا جائے جو چالیس سال پیشتر لگ چکا تھا۔ اس طرح پوری مسیحی دنیا کی قیادت حاصل کر لی جائے۔

پہلی صلیبی مہم

۱۰۹۷ء کے موسم بہار میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی پوپ کی اپیل پر جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ فرینک اور نارمن تھے اور یہ قرار پایا تھا کہ قسطنطنیہ میں تمام گروہ مل جائیں گے۔ صلیب ان کا نشان تھا، اس لئے انھیں صلیبی کہا جانے لگا۔ پہلی مہم کے لئے قدم اٹھا یا گیا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ قسطنطنیہ سے ایشائے کوچک کے راستے ارض مقدس میں پہنچا جائے۔

ایشائے کوچک اس وقت قلیج ارسلان کی سلطنت تھا۔ اسی سال جون کے مہینے میں نیقیہ پر قبضہ کر لیا گیا، جو سلجوقیوں کا مرکز تھا۔ جولائی میں دوری لیم (موجودہ اسکی شہر) مسخر ہوگیا[1] اس فاتحانہ اقدام نے بیزنطینی شہنشاہ کے مقبوضات کا بڑا حصہ بحال کر دیا۔ اس نے تمام صلیبی قائدوں سے وفاداری کا حلف اٹھوایا تھا۔

پہلی لاطینی ریاست

کوہستان طارس سے گزرنے کے بعد صلیبی قائدوں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔ ہر ایک اپنے لیے جداگانہ علاقے فتح کر لینا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک قائد بالڈون تھا، جو رھائن لینڈ سے آیا تھا۔ وہ مشرقی جانب اس علاقے کی طرف پلٹ گیا جہاں مسیحیوں کا قبضہ تھا۔ ۱۰۹۸ء میں اس نے الرّھا پر قبضہ کر لیا۔ جہاں اس وقت ارمنی حکومت تھی وہاں پہلی لاطینی ریاست کی بنیاد رکھی گئی اور بالڈون اس کا رئیس قرار پایا۔ یروشلم کے آئندہ بادشاہ (بالڈون) نے ایک ارمن شہزادی سے شادی کرلی اور عارضی طور پر شمال میں مقیم ہوگیا۔ ایک اور صلیبی رئیس جس کا نام ٹینکرڈ تھا ارمنوں کا سردار تھا جو اٹلی اور جنوبی سسلی سے آئے تھے اس نے سیلیشیا کا رخ کر لیا جو مغربی جانب واقع تھا۔ اس کی آبادی بھی زیادہ تر ارمنوں یا مخلوط نسل کے یونانیوں پر مشتمل تھی۔ ٹینکرڈ نے طرسوس اور ملحقہ علاقے لے لیا۔

اس اثنا میں صلیبی ہجوم بڑھا چلا آرہا تھا اور شام میں داخل ہوگیا، جو سب کی منزل مقصود تھا۔ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ شمالی شام خود مختار سلجوقی امیروں کے قبضے میں تھا اور جنوبی شام پر فاطمی خلفاء قابض تھے۔ پوری سرزمین سنی ترکوں اور شیعی مصریوں کے درمیان سال ہا سال سے استخوانِ نزاع بنی ہوئی تھی۔ مقامی حصے مقامی عرب رئیس سنبھالے بیٹھے تھے۔ مثلاً طرابلس الشام ۱۰۸۹ء سے بنی عمار کے زیر اقتدار تھا جو شیعہ تھے۔ شیزر جو دریائے عاصی پر واقع تھا، ۱۰۸۱ء سے بنو منقذ کے ماتحت تھا۔ مقامی کشمکشوں، برادرانہ رقابتوں اور خاندانی جانشینوں کی الجھنوں نے سیاسی بے یقینی کی ایک مزمن حالت پیدا کر دی تھی۔ خود آبادی بھی اس قابل نہیں رہی تھی کہ مشترکہ محاذ پیش کرسکے۔ مختلف فرقوں نے پورے شام میں جا بجا جداگانہ حلقے قائم کر رکھے تھے۔ مثلاً دروزی جنوبی لبنان میں تھے۔ نصیری شمالی شام کے کوہستانی علاقے میں، اسمٰعیلی اور آگے چل کر حشیشی نصریوں سے مشرقی جانب مقیم ہوگئے۔ مسیحیوں میں سے شمالی لبنان کے

---

[1] مصنف نے متعدد فرانسیسی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ایک حوالہ ابن القلانسی کا بھی ہے۔ ص ۱۳۴

مارونی اس وقت سریانی زبان بول رہے تھے۔

دوسری لاطینی ریاست

صلیبی فوج کے راستے میں شام کا پہلا بڑا شہر انطاکیہ آیا۔ اس پر ایک سلجوقی امیر مسلط تھا جس کا نام یاغی سیان تھا[1] اسے ملک شاہ نے مقرر کیا تھا، جو طغرل اور الپ ارسلان کے بعد تیسرا جلیل الشان سلجوقی سلطان تھا۔ انطاکیہ میں پہلے مسیحی کلیسا کی تنظیم ہوئی تھی[2] لاطینی مسیحیت کا ابتدائی گہوارہ تھا۔ اس وجہ سے صلیبیوں کی نگاہوں میں انطاکیہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ محاصرہ بہت طول پکڑ گیا اور اس میں بڑی مشقتیں اٹھانی پڑیں (۲۰ اکتوبر ۱۰۹۷ء سے ۳ جون ۱۰۹۸ء تک)۔ حلب کے حکمران رضوان اور دمشق کے حکمران دقاق نے محصورین کے لئے کمک کا انتظام کیا لیکن کمکی فوج کو شکست دے دی گئی۔ محاصرے کا سالار بوہیمند تھا، جو ٹینکرگ کا رشتہ دار اور نارمنوں کا قائد تھا۔ اطالوی بیڑے نے محاصرین کا ساتھ دیا۔ اس موقع پر، نیز بعد کے مواقع میں یہ بیڑا رسد بھی بہم پہنچاتا رہا اور محاصرے کے منجنیق بھی ساحلی مقامات پر اتارتا رہا۔ لیکن شہر پر تقدیر کی آخری مہر ایک ارمنی کماندار کی غداری کے باعث لگی، جو کسی نہ کسی وجہ سے غیر مطمئن تھا۔[3]

جونہی محاصرین شہر کے اندر داخل ہوئے وہ خود محصور ہو گئے۔ ایک طالع آزما سلجوقی جس کا نام کربوقا تھا اور جو بنو عقیل[4] عربوں سے موصل چھین چکا تھا، تازہ دم فوج لے کر آپہنچا۔ اس کے بعد پچیس روز تک طاعون اور بھوک کی وجہ سے فرنگیوں کو جو تجربات ہوئے وہ غالباً شام کی مہم میں بدترین تجربات تھے[5] حالت اتنی خراب تھی کہ صرف کوئی معجزنما واقعہ ہی ان کے حوصلے قائم رکھ سکتا تھا اور انھیں تباہی سے بچا سکتا تھا ——— بیان کیا جاتا ہے کہ یکایک انھیں "مقدس بھالا" مل گیا یعنی وہ بھالا، جس سے نجات دہندے کی پسلی چھیدی گئی تھی، جب وہ سولی پر لٹکا ہوا تھا۔ یہ بھالا انطاکیہ کے ایک گرجے میں دفن کر دیا گیا تھا۔ بھالا ملتے ہی صلیبیوں نے محاصرین کو شکست دے دی۔ بوہیمند، جو مسیحی قائدوں میں سب سے زیادہ دور اندیش اور قابل تھا، انطاکیہ اور اس کے قرب وجوار کے نظم ونسق کا ذمہ دار بنا رہا۔ بزنطینی شہنشاہ کو امید تھی کہ انطاکیہ اس کی سلطنت میں شامل کر دیا جائے گا، لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ مایوسی طولوز کے ریمان کو ہوئی، جو فرانس کے جنوبی اور مشرقی صوبے کے صلیبیوں کا دولت مند رئیس تھا اسی کے ساتھیوں نے "مقدس بھالا" دریافت کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انطاکیہ کی ریاست ان کے حوالے کر دی جائے ایک اور افسانہ انطاکیہ کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسیحی بزرگ سینٹ جارج تھے، جن کا وطن لد تھا[6] وہ ڈایوکلیشن کے عہد حکومت میں موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے (۳۰۳ء) اب دہراس زدہ

---

[1] ابن الاثیر نے یہ نام صحیح نہیں لکھا دیکھئے جلد ۱۰ ص ۱۸۷، ابوالفدا جلد ۲ ص ۲۲۰، ابن خلدون جلد ۵ ص ۲۰۔

[2] رسولوں کے اعمال باب ۱۱ آیت ۲۲۔

[3] کمال الدین جلد ۳ ص ۸۰-۱۰۵، ابن القلانسی ص ۱۳۵

[4] یہ پہلے حمدانیوں کو خراج دیتے تھے، پھر موصل پر قابض ہو گئے۔

[5] انھوں نے جانوروں کے ڈھانچے کھود کر نکالے اور کھا گئے دیکھئے ولیم صوری کی کتاب جلد اول ص ۲۷۱، ابن القلانسی ص ۱۳۶

[6] ولیم صوری جلد اول ص ۳۳۲، صالح ص ۱۶

صلیبیوں کی امداد کو پہنچ گئے[۱]

ساحلی علاقوں پر حملے

ریمان نے جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ معرۃ النعمان جو ابو العلا معری کا وطن تھا، نذر آتش کر دیا گیا اور اس کی آبادی فنا کردی گئی[۲] پھر ریمان دریائے عاصی کے ساتھ ساتھ حصن الاکراد[۳] پہنچا اور اسے فتح کرلیا۔ یہ مقام جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم تھا، کیونکہ ایک درّے پر واقع تھا جو ساحلی میدانوں اور دریائے عاصی کے میدانوں کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ عرقہ بڑا مستحکم مقام تھا اور اب امارتِ طرابلس میں شامل تھا اس نے مزاحمت کی۔ فروری سے وسط مئی تک محاصرہ جاری رہا۔ مارچ میں بالڈون کا بھائی گاڈ فرے جو ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا جبلہ کا محاصرہ کرچکا تھا، ریمان سے آملا۔ ریمان کے آدمیوں نے اسے مجبور کیا کہ محاصروں میں وقت ضائع نہ کرے اور سیدھا یروشلم پہنچے۔ اس اثناء میں ابن عمار امیر طرابلس نے ترغیب کے لیے کچھ تحفے بھی پیش کر دیے، لہٰذا ریمان نے محاصرہ اٹھالیا۔ عرقہ سے ریمان انطرطوس پہنچا، جو ساحل پر واقع تھا۔ وہاں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی اور صلیبیوں کے لیے اطالوی بیڑے سے ربط ضبط پیدا کرلینے کی صورت نکل آئی۔ ساحل کے ساتھ وہی راستہ اختیار کیا گیا، جس سے سکندر اور دوسرے فاتح گزر چکے تھے۔ لاذقیہ کو اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہاں بزنطینی بیڑا قابض تھا اور بزنطینیوں کے تعلقات صلیبیوں سے منقطع ہو چکے تھے[۴] البترون میں صلیبیوں نے مارونیوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ جو بڑے جوانمرد جنگجو اور ہمت ور تھے۔ انھوں نے صلیبیوں کے لیے اچھے رہبر مہیا کر دیے، جن کی سخت ضرورت تھی[۵] بیروت کے امیر نے طرابلس کے نمونۂ عمل کی پیروی کرتے ہوئے روپیہ بھی پیش کیا اور رسد کا اچھا ذخیرہ بھی فراہم کر دیا[۶] اس طرح صلیبی صیدا پہنچ گئے جہاں اب ریمان کے پاس انھیں خیمے نصب کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ چند روز وہاں قیام فرما رہے۔ ۲۴ مئی کو وہ عکّہ پہنچ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوجیں صرف بڑے بڑے شہروں میں موجود تھیں۔ اجنبی جنگجوؤں نے نہ مقامی آبادی کو تکلیف دی اور نہ ان کے ہاتھوں کوئی تکلیف اٹھائی۔ پیش قدمی نے علاً میر یا چہل قدمی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ قیساریہ اور ارسوف سے گزرتے ہوئے رملہ پہنچ کر صلیبیوں نے اندرون ملک کا رخ کرلیا اور ۷ جون کو وہ مقدس (یروشلم) پہنچ گئے جو پوری مہم کی آخری منزل تھا۔

---

۱ نارمنوں کے ذریعے سے سینٹ جارج کا نام یورپ پہنچا۔ چودھویں صدی میں انگلستان نے اسے اپنا خاص سرپرست بنا لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک عفریت کو مار کر شہزادی کو اس کے پنجے سے نجات دلائی تھی۔ اس مقام کا نام جو خلیجِ بیروت میں ہے اب تک خلیجِ مار جرجیس ہے (مترجم۔ تعجب ہے کہ مسیحی یورپ بارھویں صدی عیسوی تک ان اوہام و خرافات میں مبتلا تھا۔)

۲ ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۱۹۰، کمال الدین جلد ۳ ص ۵۸۶، ۵۸۷، ابو الفدا جلد ۲ ص ۲۲۱۔

۳ آج کل اسے قلعۃ الحصن کہتے ہیں یہ قلعہ صلیبیوں نے اس مقام پر تعمیر کیا تھا۔ جہاں ۱۰۳۱ء میں امیر حمص نے کردوں کی فوج کے لئے نوآبادی قائم کی تھی۔

۴ کاہن Cahen ص ۲۲۲

۵ ولیم صوری جلد ۲ ص ۵۴۹، جلد اول ص ۳۲۳، اڈوف خان سوشم ص ۱۳۵

۶ ولیم صوری جلد اوّل ص ۳۳۱۔

یروشلم پر قبضہ

اس وقت صلیبیوں کی کل تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی، جن میں سے نصف کو لڑنے والی فوج تصور کرنا چاہیے[۱]۔ مصری فوج جو شہر کی حفاظت کے لیے مامور تھی، ایک ہزار کے قریب ہوگی۔ ایک مہینے تک گاڈفرے، ریمان اور ٹینکرڈ نے محاصرہ جاری رکھا۔ ۱۵ جولائی کو شہر پر حملہ کیا اور اس کی آبادی کو بلا لحاظ عمر و صنف اندھا دھند تہِ تیغ کر دیا گیا۔ ایک عرب ماخذ کا اندازہ ہے کہ ستر ہزار افراد مارے گئے[۲]۔ ایک ارمن مورّخ مقتولین کی تعداد پینسٹھ ہزار بتاتا ہے[۳]۔ ایک لاطینی مؤرخ نے لکھا ہے کہ شہر کے ہر بازار اور چوک میں کٹے ہوئے ہاتھوں پاؤں اور سروں کے انبار نظر آتے تھے[۴]۔ اب شام میں تیسری لاطینی ریاست قائم ہوئی جو سب سے اہم تھی۔ گاڈفرے اس کا رئیس قرار پایا جو بڑا مخلص مسیحی اور زبردست جنگجو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہاں سونے کا تاج پہننا گوارا نہ کیا، جہاں نجات دہندے کو کانٹوں کا تاج پہنایا گیا تھا! اس نے اپنے لیے کینستہ القیامہ کے محافظ کا لقب اختیار کیا[۵]۔

گاڈفرے کی حکومت صرف ایک سال قائم رہی۔ اس نے عسقلان کے قریب مصریوں کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اس طرح یروشلم میں لاطینی ریاست اور بھی محفوظ ہوگئی، لیکن عسقلان فاطمی فوج ہی کے قبضے میں رہا اور یہ ان کا ایک بحری مرکز بھی تھا[۶]۔ صلیبی جب آئے تھے تو یافہ کھنڈر کی حالت میں تھا۔ اب اس پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور اہلِ پیسا کو وہاں خاص حقوق دے دیے گئے۔ حیفا پر وینس کے بیڑے کی مدد سے قبضہ کیا گیا[۷]۔ اس اثناء میں ٹینکرڈ اندرون ملک یعنی اردن کی طرف پیش قدمی کرتا رہا۔ ساحل اور اندرونی علاقوں پر قبضہ کیے بغیر لاطینی یروشلم کی حیثیت مستحکم نہیں ہو سکتی تھی۔ بیسان، جو دمشق سے بحیرۂ روم جانے والے راستے پر واقع تھا، سب سے پہلے فتح کیا گیا۔ ناولس لڑائی کے بغیر ہاتھ آگیا۔ ٹینکرڈ طبریہ میں گاڈفرے کا نائب بن گیا۔ مارچ ۱۱۰۰ء میں اس نے نیابت چھوڑ دی اور اپنے چچا بوہیمنڈ رئیس انطاکیہ کا جانشین بن گیا، کیونکہ بوہیمنڈ ایک ترک کے ہاتھ اسیر ہو گیا تھا۔

بالڈون کی بادشاہی

گاڈفرے کے بھائی بالڈون رئیس الرّہا کو بلا کر ۱۱۰۰ء کے بڑے دن یروشلم کی بادشاہی کا تاج پہنا دیا گیا۔ اس کے سامنے فوری کام یہ تھا کہ ساحلی قصبوں کو مسخر کرے تاکہ اس طرح اول، وطن کے ساتھ بحری روابط استوار ہو جائیں، دوم مصری بیڑے کو مخالفانہ اقدامات کا موقع نہ مل سکے۔ اطالوی جمہوریتوں میں اسے ایسے ملاح مل گئے جو خدمت کے لیے مشتاق اور ساتھ ہی حریص بھی تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اول مالِ غنیمت میں سے حصّہ دیا جائے۔ دوم ہر مفتوح شہر میں ہمارے لیے قیام کی جگہیں مخصوص کر دی جائیں، جو ہماری جمہوریتوں کے ماتحت ہوں گی۔ سوم ہمیں حق حاصل ہونا چاہیئے کہ جو سامان چاہیں بلا محصول لے آئیں اور فروخت کریں[۸]۔

---

[۱] ولیم صوری جلد اوّل ص ۳۴۹

[۲] ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۱۹۴

[۳] ایجائلز Agiles ص ۶۵۹، ولیم صوری جلد اول ص ۳۷۴-۳۷۰

[۴] ایجائلز ص ۶۵۴

[۵] ابن القلانسی ص ۱۳۹، ابن خلکان جلد ۱ ص ۱۷

[۶] ولیم صوری جلد اوّل ص ۴۴۴-۴۵۵

[۷] میتھیو ساکن الرہا ص ۲۲۶

[۸] ابن میسر کی کتاب اخبار مصر ص ۳۹۔

اس طرح انھیں وہی حقوق حاصل ہوگئے جو آگے چل کر اہلِ یورپ نے مراعات کی شکل میں حاصل کیے۔ ارسوف اور قیساریہ پر ۱۱۰۱ء میں جینوا کے بیڑے کی مدد سے قبضہ ہوا اور دونوں شہروں نے عارضی صلح کے دوران میں خراج ادا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ عکّہ کی فصیل بڑی مضبوط تھی۔ پیسا اور جینوا کے جہازوں نے مل کر اس پر حملہ کیا اور تین سال بعد وہ بھی مسخّر ہوگیا۔ ۱۱۱۰ء میں بیروت کا محاصرہ خشکی اور تری، دونوں جانب سے کرلیا گیا۔ گیارہ ہفتوں کے محاصرے کے بعد ۱۳ مئی کو شہر پر حملہ کیا گیا اور اس کے بہت سے باشندے قتل کر ڈالے گئے۔ پاس ہی صنوبر کے جھنڈ تھے جہاں سے لکڑی کاٹ کاٹ کر بُرج بنائے گئے اور فصیل پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں تیار کی گئیں[1]۔ اسی سال ناروے سے پچپن جہازوں کا ایک بیڑا آگیا اور اس کی مدد سے صیدا پر قبضہ کرلیا گیا[2]۔

بالڈون نے اپنی سلطنت کی حدیں جنوب کی طرف بڑھائیں۔ اس طرح اس کی غرض یہ تھی کہ بحیرۂ قلزم اور بحرِ ہند کی تجارت کے کم ازکم ایک حصّے پر قابض ہوجائے۔ بحیرۂ لوط کے جنوب میں اس نے ایک مستحکم قلعہ شوبک کے نام سے بنوایا، تاکہ دمشق سے مصر اور حجاز جانے والے قافلوں کی حفاظت ہوسکے۔ اس کے جانشین بھی اسی پالیسی پر کاربند رہے، یعنی ملک پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے انھوں نے جگہ جگہ قلعے بنالیے۔ اس علاقے کے سات قلعوں میں سے شوبک اور کرک جنگی لحاظ سے بڑے اہم تھے[3]۔ ۱۱۱۸ء میں بالڈون نے وفات پائی۔ اس وقت لاطینی سلطنت عقبہ سے بیروت تک پھیلی ہوئی تھی اور یہ اس کی انتہائی وسعت تھی۔ صور ایک جزیرہ نما میں واقع تھا اور ۱۱۲۴ء تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا۔ عسقلان کو ۱۱۵۳ء تک کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ عرضاً لاطینی سلطنت دریائے اردن سے کچھ ہی آگے تھی۔

شمالی جانب توسیع

لاطینی علاقے شمالی جانب بھی پھیل رہے تھے۔ ریماں[4] کی نظر طرابلس پر تھی۔ وہ یروشلم پر قبضہ کرچکنے کے بعد واپس چلا گیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ شہر کو اردگرد سے منقطع کرنے کے لیے اس نے پاس کی ایک پہاڑی پر، جو تل الحجاج کے نام سے مشہور تھی، ۱۱۰۲ء میں ایک قلعہ تعمیر کرایا، جس کا نام شاطو پیلیرن رکھا[5]۔ یہ مقام ایک لاطینی آبادی کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ آس پاس کے پہاڑی علاقوں سے کمک بھی پہنچی، تاہم محاصرہ طویل ہوتا گیا[6]۔ طرابلس کی آبادی بیس ہزار تھی۔ بلور اور کاغذ اس کی صنعتیں تھیں۔ وقتاً فوقتاً قریب کے قصبوں پر بھی جینوا کے بیڑے کی مدد سے قبضہ کیا گیا۔ مرقب علاقۂ طرابلس کی شمالی حد اور جبیل جنوبی حد تھا۔ طرابلس پر ریماں کی وفات سے چار سال بعد یعنی ۱۱۰۹ء تک قبضہ نہ ہوسکا۔ یہ شہر بنو عمار کے ماتحت شیعی تعلیمات کا مرکز بن گیا تھا۔ وہاں درس گاہیں

---

[1] سٹیونسن کی انگریزی کتاب "صلیبی سرزمین مشرق میں" ص ۵۸، ۵۹، ولیم صوری جلد اوّل ص ۴۸۴، ۴۸۵، ابن القلانسی ص ۱۴۷-۱۴۴ صالح ص ۲۸، ۲۹۔

[2] ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۲۳۶، ۲۳۷، ابن القلانسی ص ۱۷۱

[3] کرک ارامی زبان کے لفظ کرخا سے ہے۔ اس کے معنی ہیں قصبہ یا شہر۔

[4] اسے ریماں آف سینٹ جیلز کہتے تھے۔ عربوں نے اسے سنجیل یا ابن سنجیل کہنا شروع کیا۔

[5] Chateau Pelerin ترکوں نے اس کی مرمت کرلی تھی اور یہ قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

[6] ابن خلدون جلد ۵ ص ۱۸۶۔

بھی تھیں اور کتب خانے بھی صلیبیوں نے وہ سب کچھ مٹا کر رکھ دیا[1]۔ ابوالعلا معرّی بھی ان ممتاز آدمیوں میں سے تھا، جنھوں نے طرابلس کے کتب خانوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔

مزید شمالی جانب لاذقیہ تھا۔ اس پر ٹینکرڈ نے سنہ ۱۱۰۳ء میں اور افامیہ پر تین سال بعد قبضہ کر لیا۔ یہ دونوں شہر ریاست انطاکیہ میں شامل ہو گئے، جس میں کبھی کبھی سلیشیا کے بعض حصّے بھی شامل ہو جاتے تھے۔

بالڈون ثانی (سنہ ۱۱۱۸ء۔ سنہ ۱۱۳۱ء) کی وفات پر لاطینی سلطنت اپنی ماتحت ریاستوں کے ساتھ مکمّل تھی۔ شمال کی تینوں لاطینی ریاستیں طرابلس، انطاکیہ اور الرہا رسمی طور پر شہنشاہ یروشلم کے ماتحت تھیں یہ کامیابی بڑی حیرت انگیز تھی اور فرنگیوں میں اعتماد و امید کی نئی روح پیدا ہو گئی ہو گی، لیکن حقیقت میں صورتِ حال روشن نہ تھی۔ شمال اور جنوب میں مقبوضہ علاقے بہت تنگ تھے اور ارگرد اسلامی مقبوضات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی بھی قصبہ ایسا نہ تھا جہاں دشمن ایک روز کی مسافت طے کر کے نہ پہنچ سکتا ہو اندرونی شہر مثلاً حلب، حماہ، حمص، بعلبک، دمشق کبھی فتح نہ ہوئے اگرچہ وقتاً فوقتاً ان پر حملے کئے گئے۔ کبھی کبھی وہ خراج بھی دے دیتے تھے مثلاً دمشق نے سنہ ۱۱۲۶ء میں بالڈون ثانی کو خراج ادا کیا۔ البقاع کا درخیز خطہ دمشق ہی کے علاقے میں شامل تھا فرنگیوں کی آبادیاں اپنی ریاستوں میں بھی بہت کم تھیں۔ یروشلم اور دوسرے مفتوحہ شہروں میں بھی وہ صرف اقلیّت میں تھے۔ یروشلم مسخّر ہو گیا تو ان میں سے ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی، جنھوں نے سمجھ لیا کہ جو حلف اٹھایا گیا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ وطن واپس چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بدیشی ریاستیں اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہیں، جب تک وطن سے تازہ دم فوجوں کی بہم رسانی کا سلسلہ جاری رہے اور جب تک مخالف گروہ کی قوّتیں کسی ایک صاحب عزم قائد کے ماتحت جمع نہ ہو جائیں۔

مسلمانوں کا ردِ عمل — زنگی

نیلی آنکھوں والے ترک اتابک صاحبِ موصل و حلب کے بروئے کار آتے ہی اتحاد و قیادت کے عناصر بھی فراہم ہونے لگے۔ زنگی (عماد الدین) کے ساتھ صلیبیوں کی سرکوبی کرنے والے مجاہدین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ زنگی نے پہلی زبردست ضربیں لگائیں، جن کے زیر اثر لاطینی ریاستوں میں شکست و ریخت کا آغاز ہوا۔ پہلی زد الرّہا پر پڑی، جو ان ریاستوں کا شمالی دمدمہ تھی۔ چار ہفتے کے محاصرے کے بعد سنہ ۱۱۴۴ء میں اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس وقت جوسیلن ثانی امیر تھا[2] ریاست الرّہا سب سے پہلے وجود میں آئی تھی اور سب سے پہلے ختم ہوئی۔ اس کے سقوط کے ساتھ ہی واضح ہو گیا کہ صورتِ حال مسلمانوں کے حق میں پلٹ رہی ہے اس پر یورپ میں دوسری صلیبی مہم کا سروسامان شروع ہو گیا (سنہ ۱۱۴۷ء۔ سنہ ۱۱۴۹ء)

صلیبی جنگوں کی عام ترتیب اور مہموں کی مقررہ تعداد سراسر مصنوعی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لہریں مسلسل آتی رہیں اور ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک خط فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ زیادہ اطمینان بخش تقسیم یہ ہو گی کہ پہلا دور لاطینی فتوحات کا تھا جو سنہ ۱۱۴۴ء تک قائم رہا۔ دوسرا دور اسلامی ردِّ عمل کا تھا، جس کا آغاز زنگی نے کیا اور وہ صلاح الدین ایوبی کی شاندار فتوحات میں اوج کمال کو پہنچا۔ تیسرا دور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا تھا جو تیرھویں صدی میں ہوئیں۔ ان میں ایوبیوں اور مملوکوں نے حصّہ لیا اور تمام صلیبیوں کے اخراج پر یہ انجام کو پہنچا۔

---

[1] ابن قلانسی ص ۱۴۳، ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۲۲۲۔ ۴۲۳، سبط ابن الجوزی مرات الزمان، ص ۱۷۔ ولیم صوری جلد اوّل ص ۴۷۷۔ ۴۷۸

[2] Joscelin II دیکھئے ابو شامہ جلد اوّل ص ۳۶، ۳۷ ابن الاثیر۔

نورالدین زنگی

عمادالدین زنگی کی وفات پر اسلامی مقاصد کے لئے جہاد اور قیادت کی ذمہ داری اس کے فرزند نورالدین محمود پر آپڑی۔ نورالدین محمود اپنے باپ سے بھی زیادہ قابل اور سرگرم تھا۔ ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں اس نے طغتگین کے ایک جانشین سے دمشق لے لیا اور یوں زنگی سلطنت اور یروشلم کے درمیان جو آخری رکاوٹ تھی وہ ختم ہو گئی۔ سالہا سال سے دمشق لاطینی سلطنت کا حلیف چلا آتا تھا[1] صلخد۔ بصریٰ، بانیاس، اسمٰعیلیوں کے ماتحت اور علاقہ دمشق کے دوسرے قصبے مسلمانوں کے خلاف جنگوں کے لئے لاطینیوں سے امداد لیتے تھے[2] قبیلہ طے کے بنو فضل وادیٔ شام کے تمام قبائل سے زیادہ ذی اثر تھے وہ کبھی فرنگیوں کے طرفدار بن جاتے تھے اور کبھی فاطمیوں کے۔ لاطینی سلطنت کے پاس رسالے کا ایک جیش تھا، جسے "ترکوپولی" کہتے تھے، یعنی ترکوں کے بیٹے[3] یہ رسالہ مسلمانوں سے بھرتی کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ارمنوں کے پیادہ جیش تھے اور ایک لشکر مارونی تیر اندازوں کا تھا[4] دمشق پر قبضے کے بعد نورالدین کی سلطنت موصل سے حوران تک پھیل گئی اب ہلال کے کنارے جنوبی جانب بڑھ رہے تھے۔

نورالدین کو پورا اندازہ ہو چکا تھا کہ فاطمی سلطنت ضعف کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اگر مصر پر قبضہ کر لیا گیا تو یروشلم کی لاطینی سلطنت چکی کے دو پاٹوں میں آجائے گی۔ یہ اندازہ کرتے ہی اس نے اپنے ایک قابل نائب اور رفیق شیر کوہ کو مصر بھیج دیا۔ شیر کوہ وہاں پہنچا تو اس نے سیاسی اور فوجی فتوحات کی بنا پر ۵۶۴ھ/۱۱۶۹ء میں خلیفہ العاضد (۱۱۶۰ء-۱۱۷۱ء) سے وزارت کا منصب حاصل کر لیا۔ دو ماہ بعد شیر کوہ نے وفات پائی اور منصب وزارت اس کے بھتیجے صلاح الدین ابن ایوب کے سپرد کر دیا گیا[5]

صلاح الدین ایوبی

الملک الناصر السلطان صلاح الدین یوسف ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں بمقام تکریت جو دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے پیدا ہوا۔ اس کے والدین کرد تھے۔ اس کی عمر ایک سال ہوئی جب خاندان کے ساتھ بعلبک منتقل ہو گیا۔ کیونکہ عمادالدین زنگی نے اس کے باپ ایوب کو بعلبک کا کماندار بنا دیا تھا۔ صلاح الدین نے ہوش سنبھالا تو اسے فوجی امور کے بجائے مذہبی امور سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ۱۱۶۴ء میں وہ بادل ناخواستہ اپنے چچا کے ہمراہ مصر کی مہم پر گیا تھا۔ اسی سفر نے اس کے لئے نئی راہ عمل طے کر دی۔ جس کے تین مقاصد تھے۔ اوّل مصر میں شیعیت کی جگہ سنیت بحال ہو، دوم مصر اور شام کو متحد کر دیا جائے، سوم فرنگیوں کے خلاف جہاد مقدس جاری رکھا جائے[6]۔ پہلا

---

[1] ابن القلانسی (جسے اس موقع پر حکومت دمشق میں ایک منصب حاصل تھا) ص ۲۰۸، ۲۰۹، ولیم صوری جلد ۲ ص ۷۶-۷۷، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۲۲۴ ابوشامہ جلد اوّل ص ۷۷۔

[2] ابن القلانسی ص ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۱۴، ۳۱۶، ابوالفدا جلد ۳ ص ۲-۳۔ [3] ابن خلدون جلد ۶ ص ۶ کے بعد نیز اے ایس ٹرٹن (Tritton) کا مقالہ بلیٹن، سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز جلد ۲، ص ۵۶۷ [4] عمادالدین ص ۲۲۵، اسامہ ص ۵۱، ترجمہ ص ۷۹۔

[5] دیکھیے Jacques de Vitry کی کتاب The History of Jarusalem ترجمہ آبری سٹیوارٹ ص ۶۹۔

[6] ابوشامہ جلد اوّل ص ۱۴۰، ۱۶۰، سبط ابن الجوزی ص ۱۷۵۔

[7] ابن الاثیر جلد ۱۱ ص ۲۲۳، ابوشامہ جلد اوّل ص ۱۵۵، ابوالفدا جلد ۳ ص ۴۷۔

مقصد نہایت آسانی سے پورا ہو گیا۔ ۱۱۷۱ء میں خلیفہ العاضد بستر مرگ پر پڑا تو صلاح الدین نے وزیر کی حیثیت میں فاطمی خلیفہ کے نام کی جگہ خطبے میں عباسی خلیفہ المستضی کا نام شامل کر دیا۔ یوں فاطمی خلافت ختم ہو گئی۔ بظاہر یہ ناقابل یقین نظر آئے گا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا عظیم الشان تغیر یوں عمل میں آ گیا اور دو بکریوں کے سر ٹکرانے کی نوبت بھی نہ آئی[1] ساتھ ہی صلاح الدین مصر کا مختار کل بن گیا۔ دوسرا مقصد اس کے شامی سرپرست نورالدین کی وفات پر پورا ہوا۔ یعنی معمولی لڑائیوں کے بعد شام نورالدین کے یازدہ سالہ بیٹے اسمٰعیل سے لیا گیا[2] دو مقصد پورے ہو گئے تو تیسرے کی تکمیل کے لئے کام شروع کر دیا گیا۔

سائرانیکا اور حجاز مصر کے ملحقات تھے، وہ بھی نئی شامی مصری سلطنت میں شامل ہو گئے۔ صلاح الدین کے بڑے بھائی توران شاہ نے نوبیا اور یمن کو بھی مسخر کر لیا۔ ۱۱۷۵ء میں عباسی خلیفہ نے ان تمام علاقوں کا پروانہ حکمرانی صلاح الدین کو دے دیا۔ گویا خلیفہ نے وہ چیز دی جو اس کی نہ تھی اور اس کے لئے یہی خوشی کافی تھی کہ پروانہ دینے سے انکار نہ کرے۔ موصل اور دوآبۂ دجلہ و فرات کے دوسرے حصوں کو شامل کر لینے سے سلطنت کے حدود سیدھے ہو گئے[3] نورالدین زنگی نے فرنگیوں کو گرفت میں لے کر کچل ڈالنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس کے زیادہ نامور جانشین کے ماتحت واقعیت اختیار کرتا ہوا نظر آنے لگا۔

حطّین کا فیصلہ کن معرکہ

انجام کار صلاح الدین کو اپنی فوجیں "کافروں" کے خلاف آراستہ کر لینے کا موقع مل گیا۔ چھ روز کے محاصرے کے بعد طبریہ مسخر ہو گیا تو اسلامی فوج پاس کے ایک مقام حطین پہنچ گئی[4] گویا لاطینی سلطنت کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ وہاں ۳ اور ۴ جولائی ۱۱۸۷ء کو جنگ ہوئی۔ گرمی بہت زیادہ تھی فرنگیوں نے بھاری اسلحہ پہن رکھے تھے۔ وہ طویل مسافت طے کر وہاں پہنچے تھے اور تکان سے چور ہو رہے تھے۔ مزید براں پیاس نے انھیں بدحال کر رکھا تھا۔ اسی حالت میں اسلامی فوج نے انھیں نرغے میں لے لیا اور تیروں کی ایسی موسلا دھار بارش کی جس کا تجربہ فرنگیوں کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ بیس ہزار سواروں[5] اور پیادوں میں سے صرف چند زندہ بچے جو یا تو بھاگ گئے یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ یا قید کر لیے گئے۔ قیدیوں کے جلوس کی پیشوائی یروشلم کا بادشاہ گائی دالوسیان کر رہا تھا۔ جواں مرد اور فراخ حوصلہ سلطان نے شاہ

---

[1] ابن الاثیر جلد ۱۱ ص ۲۴۲، ابوالفدا جلد ۳ ص ۵۲۔ ابوشامہ جلد اوّل ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

[2] ابن الاثیر جلد ۱۱ ص ۲۷۴-۲۷۵

[3] ایضاً ایضاً ص ۳۱۹-۳۲۱

[4] قرون حطین بحیرۂ طبریہ کے پاس ستر۰ سو فٹ اونچا ایک برج سا ہے وہ دراصل ایک آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ ہے جہاں اب آتشیں مادہ نہیں رہا۔ روایت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کا پہاڑی وعظ یہیں ہوا تھا۔

[5] (مترجم۔ صلیبی جنگجوؤں کے دو بڑے گروہ تھے، ایک گروہ کو ہیکلی یعنی ٹمپلرز کہتے تھے (Templars) اس لئے کہ یروشلم میں انھوں نے ہیکل سلیمانی کے قریب رہنا شروع کر دیا تھا دوسرے ہاسپٹیلرز Hospitaliers کہلاتے تھے، ہاسپٹل یا ہوسٹل ابتدا میں مہمان خانہ تھا یہ لوگ زائرین کی مہمان داری کرتے تھے۔ پھر انھوں نے جنگ جوؤں کا ایک گروہ پیدا کر لیا۔ سواروں سے مراد بھی یہی لوگ ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ مصنف نے صلیبیوں کے لیے جابجا فرنیکوں کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا عام ترجمہ ہماری زبان میں "فرنگی" ہے لیکن میں نے دانستہ فرنیک ہی لکھا، اس لئے کہ وہ لوگ فرنگیوں کا ایک خاص گروہ تھے۔

یروشلم سے وہی سلوک مرعی رکھا، جو اس کے بلند منصب کے پیش نظر زیبا تھا، لیکن اس کا رفیق ریجینالڈ آف شاتیلان حاکم کرک بالکل ہی مختلف سلوک کا سزاوار تھا اور وہی سلوک اس سے کیا گیا۔ اس نے بار بار معاہدے لیئے اور ہر مرتبہ ان کی خلاف ورزی کر کے حاجیوں اور تاجروں کے قافلے پر حملے کرتا تھا جو جنوبی جانب یروشلم کی طرف جاتے ہوئے اس کے قلعے کے پاس سے گزرتے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان کی ہمشیرہ قافلے کے ساتھ تھی۔ موقع پرست ہونے کے علاوہ ریجینالڈ اخلاق سے بھی عاری تھا۔ اس نے بحیرۂ قلزم میں جو بیڑا متعین کر رکھا تھا اور نوبیا اور عرب دونوں کے ساحلی علاقے پر یورش کرتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے حجاز کے مقدس ساحل پر فوج اتاری، جس نے مدینہ منورہ کا قصد کر لیا۔ جب وہ فوج مدینہ منورہ سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئی تو مصری فوج جلدی سے تیار کئے ہوئے جہازوں میں سوار ہو کر پہنچی اور ریجینالڈ کی فوج کو مار مار کر پیچھے ہٹایا۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ اس کا ارادہ رسول اللہ صلعم کی میت مبارک کو مدینہ سے نکال کر کرک لے جانے کا ہے تاکہ مسلمان زائروں سے بھاری رقمیں وصول کرے[۵۱]۔ صلاح الدین اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی قسم کھا چکا تھا اور اس قسم کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ریجینالڈ کے بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں جس خیمے میں اسے رکھا گیا تھا، وہاں اس کی درخواست پر پینے کے لیے ٹھنڈا پانی مہیا کر دیا گیا۔ لیکن عربوں کے اصول مہمان نوازی کے مطابق یہ تواضع ریجینالڈ کو سزائے موت سے نجات نہیں دلا سکتی تھی کیونکہ پانی خود پیش نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کی درخواست پر مہیا کر دیا گیا تھا۔ صلاح الدین گائی کو قتل کرنے کے لئے آیا تو وہ خوف سے کانپ اٹھا۔ لیکن صلاح الدین نے یہ کہہ کر اسے تسلی دے دی کہ بادشاہ بادشاہ کو قتل نہیں کرتا[۵۲]۔

جنگ حطین میں فرنگیوں کی فوج بالکل تباہ ہو گئی۔ اس میں دارالحکومت کی فوج کے علاوہ دوسری لاطینی ریاستوں کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ اس طرح لاطینی بادشاہی کے محضر پر آخری مُہر لگ گئی۔ ایک ہفتے کے محاصرے کے بعد یروشلم ۲ اکتوبر کو حوالگی پر آمادہ ہو گیا۔ صلاح الدین نے فرنگ آبادی سے جو سلوک کیا، وہ اس سلوک کی بالکل ضد تھا جو خود فرنگیوں نے اٹھاسی سال پیشتر مسلمانوں سے کیا تھا۔ سلطان نے اجازت دے دی کہ جو لوگ فدیہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ادا کر کے رہا ہو جائیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو یہ مہلت دے دی گئی کہ وہ چالیس روز میں ایک خاص رقم یک مشت جمع کریں اور اسے خزانے میں داخل کر کے چلے جائیں۔ باقی لوگوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ جو زمینیں فرنگیوں نے خالی کی تھیں وہ اہل فوج اور مقامی مسیحیوں نے خرید لیں[۵۳]۔ یروشلم سے فتوحات کی لہریں مختلف مستحکم مقامات کی طرف بڑھتی رہیں مثلاً شوبک اور کرک جنوب میں تھے، الکوکب[۵۴] شقیف[۵۵] اور صہیان، جو شمال میں تھے۔

---

۵۱ ابن جبیر ص ۵۸، ۶۰۔ اس سیاح نے اسکندریہ میں فوجیوں کا ایک حصہ دیکھا تھا۔ یہ لوگ اونٹوں پر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے منہ دموں کی طرف تھے۔ ڈھول بج رہے تھے اور انھیں قتل کرنے کے لیے لے جا رہے تھے، ابوالفدا جلد ۳ ص ۶۸، ۶۹۔

۵۲ ابو شامہ جلد ۲ ص ۷۵، اس کی گواہی چشم دید ہے، ابن الاثیر جلد ۱۱ ص ۳۵۲، ۳۵۵۔ بہاؤالدین ابن شداد: سیرۃ صلاح الدین ص ۶۰، ۶۵، ۷۲، عماد الدین الاصفہانی کی کتاب فتح القسی فی فتح القدسی ص ۲۲، ۲۸ وغیرہ۔

۵۳ ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۱۱۔

۵۴ بیسان کے شمال میں دریائے اردن کے کنارے صلیبیوں کا تعمیر کردہ قلعہ، جس کا پورا نام کوکب الہوا تھا۔

۵۵ یہ اب پندرہ سو فٹ اونچی پہاڑی پر ایک قلعہ تھا جو کہ لیطانی کے قریب تھا۔ دیکھنے میں عقاب کا گھونسلا معلوم ہوتا تھا، اس کا پورا نام شقیف ارنون تھا۔ شقیف سریانی لفظ ہے، جس کے معنی چٹان کے ہیں، یا بھاری پتھر کے۔ ارنون کے معنی سیل تند کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک ارنون آرناند کی تخریب ہے۔

عسقلان، عکّہ، صفد، طرطوس، جبلہ، لاذقیہ وغیرہ ۱۱۸۹ء کے اواخر تک مسخر ہو گئے۔[۵۱] چھوٹے مقامات اور معمولی قلعوں کے علاوہ، صور، طرابلس اور انطاکیہ فرنگیوں کے قبضے میں رہ گئے۔[۵۲]

جنگی سرگرمیوں کا مرکز ۔ عکّہ

شہر قدس (یروشلم) چھن جانے سے یورپ میں آگ لگ گئی اور تیسری صلیبی جنگ کی تیاری ہوئی۔ اس میں مغربی یورپ کے تین نہایت زبردست حکمرانوں نے حصّہ لیا، یعنی جرمنی کا فریڈرک باربروسہ، فرانس کا فلپ آگسٹس اور انگلستان کا رچرڈ اوّل، جسے بالعموم شیردل کہا جاتا ہے۔ افسانے اور تاریخ نے مل کر اس مہم کو مشرق و مغرب کی سرگزشتوں میں ایک واقعی شاندار اور رومانی دور بنا دیا ہے، جس میں رچرڈ اور صلاح الدین ایوبی کو سب سے بڑے کردار تجویز کیا گیا۔

جرمنی کے بادشاہ نے خشکی کا راستہ اختیار کیا اور وہ سیلیشیا میں ایک دریا کو عبور کرتا ہوا غرق ہو گیا۔ اس حادثے سے اس کے اکثر ساتھیوں کے حوصلے پر اوس پڑ گئی اور وہ واپس چلے گئے۔ شام میں بسنے والے لاطینیوں کا فیصلہ یہ تھا کہ عکّہ چھنی ہوئی سلطنت کی بحالی کے لیے کلید بن سکتا ہے۔ چنانچہ تمام جنگ جو، جن میں یورپ سے تازہ وارد فوجیں بھی شامل تھیں، عکّہ کی جانب چل پڑے۔

شاہ گائی نے جنگ حطّین کے بعد صلاح الدین کے روبرو عزت کی قسم کھا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ آپ کے خلاف کبھی ہتھیار نہ اٹھاؤں گا، لیکن اب وہ عکّہ کی جانب پیش قدمی کرنے والی فوج کا سرِ عسکر بن گیا۔ اس فوج نے عکّہ کا محاصرہ کر لیا۔ صلاح الدین بجلی کی سی تیزی سے شہر کی مدافعت کے لیے پہنچ گیا اور دشمن کے روبرو خیمہ زن ہو گیا۔

خندق کے قریب لڑائی لڑی گئی۔

ایک طرف اللہ تعالیٰ کے بندے تھے اور دوسری طرف لادین مویشی۔[۵۳]

فرنگیوں کو دو باتوں میں برتری حاصل تھی، اوّل ان کے پاس بیڑا تھا، دوم محاصرے کا بھنور بن سروسامان تھا۔ دو سال تک محاصرہ جاری رہا، ۲۷۔ اگست ۱۱۸۹ء۔ ۱۲۔ جولائی ۱۱۹۱ء اس دور میں ایسی لڑائیاں بھی پیش آئیں، جو قرون وسطیٰ کے فوجی وقائع میں بڑی لڑائیاں سمجھی جاتی ہیں۔ بیروت کے مسلمان گورنر نے مسیحی ملاحوں کو فرنگیوں کا لباس پہنا کر رسد کے جہازوں میں سوار کرایا اور ان کے ساتھ سؤر بھی بھیج دیے اس طرح محصورین تک غذائی جنسیں پہنچائیں۔[۵۴] دونوں جانب کے جنگ جوؤں نے مردانگی کے کارنامے انجام دیے۔ دمشق کے ایک سنار نے خود آتش گیر مادّے تیار کر کے محاصرین کے تین برج جلا دیے اور اللہ کے ہاں اجر کے علاوہ سلطان سے بھی انعام حاصل کیا۔[۵۵] رچرڈ نے چقماق کا ایک پتھر سسلی سے اپنے منجنیق کے واسطے لیا تھا۔ اس سے تیرہ اہل عکّہ مارے۔ پھر یہ پتھر بطور ایک نادر چیز کے صلاح الدین کو دکھایا گیا۔ تیراکوں اور کبوتروں دونوں سے کام لے کر صلاح الدین قصبے

---

۵۱ المقریزی کتاب السلوک لمعرفتہ الملوک جلد اوّل ص ۹۹، ۱۰۱۔

۵۲ ابن شداد ص ۶۵۔ عماد الدین ص ۱۳۶۔

۵۳ ایمبرائز Ambroise کی کتاب The Crusade of Richard Lion Heart

۵۴ ابوشامہ جلد ۲ ص ۱۶۱۔

۵۵ ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۲۱۔

کی محصور آبادی تک پیغامات پہنچاتا رہا۔ ایک تیر اک مارا گیا اور اس کی نعش کنارے جا لگی تو اہل عکہ نے وہ خطوط اور روپے لے لیے، جنھیں پہنچانے کی غرض سے اسے بھیجا گیا تھا۔ صلاح الدین کا سیرت نگار لکھتا ہے:[۵۱] "ہمیں کوئی ایسا واقعہ معلوم نہیں کہ کسی شخص نے زندگی میں کوئی امانت لی ہو اور موت کے بعد ان لوگوں کے حوالے کی ہو، جنھیں پہنچنی چاہیے تھی" صلاح الدین نے خلیفہ سے بھی امداد طلب کی تھی، لیکن نہ دی گئی۔ آخر محصورین نے شہر حوالے کر دیا۔

حوالگی کی شرطوں میں ایک شرط یہ تھی کہ وہ اصلی صلیب مسیحیوں کو دے دی جائے گی، جو حطین میں سلطان کے ہاتھ لگی تھی؛ نیز محصور فوج کو دو لاکھ دینار ادا کرنے کے بعد رہا کر دیا جائے گا۔[۵۲] رقم ایک مہینے میں بھی ادا نہ ہو سکی تو "شیر دل" نے دو ہزار سات سو قیدیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔[۵۳]

رچرڈ نے تجویز پیش کی کہ اس کی بہن کی شادی سلطان صلاح الدین کے چھوٹے بھائی ملک العادل سے کر دی جائے۔ عکہ اور یروشلم انھیں جہیز میں دے دیے جائیں۔ اس طرح مسیحیوں اور مسلمانوں کی کشمکش ختم ہو جائے گی۔[۵۴] العادل کے بیٹے الملک الکامل کو رچرڈ نے مئی ۱۱۹۲ء میں اپنے ملک کے دستور کے مطابق بہادری کا اعزاز دیا۔ صلاح الدین کو برسوں پہلے یہ اعزاز مل چکا تھا۔ رچرڈ اور صلاح الدین کے درمیان تحائف کا مبادلہ بھی ہوا۔ ۲۔ نومبر ۱۱۹۲ء کو صلح نامہ مکمل ہو گیا۔ اس میں قرار پایا کہ ساحل لاطینیوں کے قبضے میں رہے گا اور باقی ملک پر مسلمان حکومت کریں گے۔ مسیحی زائروں کو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی۔ اس طرح فلسطین تقسیم ہوا۔ رچرڈ شام کو خیرباد کہتا ہوا واپس چلا گیا:

آہ! شام! میں اب تجھے
خدا کے حوالے کرتا ہوں، میری دعا ہے
کہ وہ مجھے خاصی مہلت دے۔ اگر اس کی مشیت یہ ہو
تو میری آرزو اب بھی یہی ہے کہ تجھے آلام سے نجات دلاؤں۔
میرے دل میں اب تک تیری امداد کی آرزو موجزن ہے۔[۵۵]

آئندہ سال مارچ کے مہینے میں صلاح الدین کو بخار آیا اور پچپن سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ اس کا مقبرہ جامع امویہ کے قریب ہے اور دمشق کی نہایت محترم زیارت گاہوں میں شمار ہوتا ہے۔

صلاح الدین محض جنگ جو اور اسلام خالص کا مجاہد نہ تھا، بلکہ اس نے تعمیرات میں بھی بڑا حصہ لیا، نیز وہ علم کا مربی تھا۔ اُس نے شام و مصر میں درس گاہیں قائم کیں، بحث و نظر کے مرکز بنائے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کی وزارت میں دو فاضل وزیر شامل تھے، ایک

---

۵۱ ابن شداد ص ۱۲۰۔

۵۲ ابو شامہ جلد ۲ ص ۱۸۸۔ عماد الدین ص ۳۵۷، ابن العبری ص ۳۸۶، ۳۸۷، ابوالفدا جلد ۳ ص ۸۳، ۸۴۔

۵۳ پیٹر برو کا بینڈکٹ Benedict of Peterborough جلد ۲ ص ۱۸۹، ابن شداد ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

۵۴ ابوالفدا جلد ۳ ص ۸۴۔

۵۵ ایمبرائز ص ۴۴۴۔

قاضی الفاضل[51]، دوسرا عماد الدین اصفہانی[52]۔ بہاء الدین بن شداد[53] اس کا پرائیویٹ سکرٹری اور سیرت نگار تھا۔ فاطمیوں نے جو وسیع خزانہ جمع کر رکھا تھا، ان کی خلافت کا تختہ الٹنے کے بعد صلاح الدین کے قبضے میں آیا۔ اس نے پورا خزانہ اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیا، اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا، ان میں ایک نیلم تھا جسے مشہور مؤرخ ابن الاثیر نے بہ ذات خود وزن کیا تھا اور وہ سترہ درہم[54] نکلا۔ اس کا نام "الجبل" تھا[55] اور یہ رات کے وقت چراغ کی طرح روشن رہتا تھا۔ اس کے متعلق مختلف روایتیں مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ یہ کسی زمانے میں سلجوقیوں کے پاس تھا یا یہ کہ عباسیوں کے پاس تھا اور ہارون الرشید کے ہاتھ سے دجلہ میں گر پڑا تھا۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ یہ نیلم ایران کے ساسانی بادشاہوں کی ملکیت تھا[56]۔ نور الدین کی جو جاگیر تھی، وہ صلاح الدین نے اُس کے بیٹے کے حوالے کر دی تھی۔

صلاح الدین نے جو جائداد چھوڑی، وہ کُل ایک دینار اور سینتالیس درہم تھی[57] لیکن اس نے جو یادگار چھوڑی، وہ اب تک مشرقی عربی دنیا کی میراث کا ایک غیر معمولی گنجینہ ہے۔ اس کی بہادری کی یادگار یورپ میں بھی تقریباً یکساں محترم مانی جاتی ہے۔ انگریز شاعر اور دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں کے افکار بھی اس سے متأثر ہوئے۔

صلاح الدین کے بعد کا دور

اسلام کے اس جلیل القدر ہیرو کی وفات کے بعد صلیبی جنگوں کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، یعنی وہ دور، جس میں اختلافات پیدا ہوئے اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہ دور ایک صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ تیرھویں صدی میں یورپی عوام کے جذبات ان حملوں سے بے پرواہ ہیں۔ اس صدی کے وسط میں فرانس کے بادشاہ لوُئی کے اقدام کو پہلی صلیبی مہم کی طرح مذہبی مصلحتوں کی کارفرمائی کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دور کی متعدد صلیبی حملوں کا نصب العین مصر تھا۔ امید یہ تھی کہ اس طرح حملوں میں حصّہ لینے والے لوگ بحیرۂ قلزم پر پہنچ جائیں گے اور بحرِ ہند کی تجارت سے فائدہ اٹھائیں گے، جو بڑی نفع آور تھی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر دمیاط یا اسکندریہ پر قبضہ کر لیا گیا تو اس کے مبادلے میں یروشلم لے لیا جائے گا۔ مسلمانوں میں بھی جہاد کا پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ خصوصاً قابلِ ذکر امر یہ تھا کہ وہ متحدہ قیادت اور متّحدہ سلطنت کھو چکے تھے۔ شام صلاح الدّین کے تین فرزندوں نے باہم تقسیم کر لیا تھا، لیکن تھوڑی دیر بعد صلاح الدین کے چھوٹے بھائی الملک العادل نے مصر کے علاوہ شام کا بھی بڑا حصّہ قبضے میں لے لیا۔ ملک العادل نے (جسے لاطینی وقائع نگار سفادین[58] لکھتے ہیں) اپنے عہدِ حکومت میں (۱۱۹۹ء۔ ۱۲۱۸ء) فرنگیوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ مدعا یہ تھا کہ امن قائم رہے اور اطالویوں سے تجارتی تعلقات بڑھ جائیں۔

---

۵۱ ابن خلکان جلد اوّل ص ۵۰۹۔ السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔ جلد ۴ ص ۲۵۳ - ۲۵۴۔

۵۲ ابن خلکان جلد ۲ ص ۴۹۵، سیوطی حسن المحاضرہ جلد اوّل ص ۲۷۰۔

۵۳ ابن خلکان جلد ۳ ص ۴۲۸ اس کی سیرت سے اس باب میں خاصا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۵۴ ابن الاثیر جلد ۱۱ ص ۲۴۲ (درہم طبی ساڑھے تین ماشے ہوتا تھا اس لحاظ سے پورے نیلم کا وزن ۵۹½ ماشے یعنی آدھا ماشہ کم پانچ تولے ہوا۔ مترجم)

۵۵ (اس سے معلوم ہوا کہ بڑے ہیروں کو "کوہ" کہنے کا دستور یہیں یہ تھا۔ عرب میں بھی یہی دستور تھا۔ یہاں ایک ہیرے کا نام "کوہ نور" تھا فاطمیوں یا عربوں نے ایک نیلم کا نام "الجبل" رکھ دیا۔ مترجم)

۵۶ ابن الاثیر جلد ۶ ص ۴۷، جلد ۱۰ ص ۲۶۶، مسعودی جلد ۷ ص ۳۷۶، طبری جلد ۳ ص ۶۰۲، ۱۶۴۰۔

۵۷ ابو الفدا جلد ۳ ص ۹۔

۵۸ یہ سیف الدین کا بگاڑ ہے۔ ابن خلکان جلد ۲ ص ۴۴۶۔

العادل سے ایوبی حکمرانوں کی مختلف شاخیں پھوٹیں جو مصر، دمشق اور عراق میں حکمران رہیں حمص حماۃ اور یمن میں بھی کچھ شاخیں کارفرما ہو گئیں۔ خاندان کے افراد میں بار بار کشمکش پیدا ہوئی نتیجہ یہ نکلا کہ بیروت، صفد، طبریہ اور یروشلم بھی (۶۲۶ھ) فرنگیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ العادل کے بیٹے الکامل (۱۲۱۸ء تا ۱۲۳۸ء) نے یروشلم فریڈرک ثانی شاہ سسلی کو دے کر دس سال کے لیے صلح کر لی۔ جس کی شرط یہ بھی تھی کہ فریڈرک دشمنوں کے خلاف الکامل کو مدد دیتا رہے۔ دشمن سب کے سب ایوبی تھے۔[۵۱] الکامل کے بھتیجے الملک صالح نجم الدین نے ۶۴۲ھ میں خوارزمی ترکوں کی ایک فوج مرتب کر لی، جنھیں چنگیز خاں کی یورش نے وسطِ ایشیا سے نکال دیا تھا اور اس فوج کو یروشلم کی واپسی کے لیے استعمال کیا۔ فرنگیوں کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھا سکتے۔ وہ خود بہت بُری حالت میں تھے۔ جینوا اور وینس کے درمیان رقابتیں جاری تھیں۔ صلیبی جنگ جُو بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کے لیڈروں کے درمیان کشمکش کا بازار گرم تھا۔ ان جھگڑوں میں کبھی مسیحی کسی فریق کے خلاف مسلمانوں سے اور کبھی مسلمان کسی فریق کے خلاف مسیحیوں سے مدد لے لیتے تھے۔

تیرھویں صدی کے وسط میں لوئی شاہ فرانس نے اس سلسلے میں قدم اٹھایا اور چھٹی صلیبی مہم کی قیادت سنبھالی (مصر کے خلاف پہلی براہِ راست مہم) لوئی نے شام میں چار سال بسر کیے (۱۲۵۰ء۔ ۱۲۵۴ء) اور وہاں یافہ، قیساریہ، عکہ اور صیدا کو مستحکم کیا۔ صیدا کے قلعے کے کھنڈر اب تک باقی ہیں، جہاں ہیکلی جنگ جُو ٹھہرائے گئے تھے۔ تمام صلیبی قائدوں میں سے لوئی کا کردار سب سے زیادہ بے لوث اور اشرف تھا۔ واقعی یہ کردار ایسا تھا، جیسا بزرگوں کا ہوتا ہے۔

بیبرس شاہِ مصر

اب مشرق کے سر پر ایک نیا اور متوقع خطرہ منڈلانے لگا، یعنی تاتاری۔ تاتاریوں کا سیل شمالی شام میں پھر نکلنے کے بعد جنوب کی طرف پلٹا۔ عین اسی زمانے میں ایوبی سلاطین کی جگہ مملوک لے رہے تھے۔ ان میں سے چوتھا حکمران الملک الظاہر بیبرس (۱۲۶۰ء تا ۱۲۷۷ء) تھا۔ اس سے سلاطین کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہُوا، جنھوں نے لاطینی شام پر مہلک ضرب لگائی۔ بیبرس نے تاتاریوں کی پہلی پیش قدمی شام میں روکی، پھر شامی علاقے ان سے واپس لیے، مصر و شام کو متحد کیا۔ بعد ازاں وہ جہاد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے قابل ہُوا۔ ۱۲۶۳ء سے ۱۲۷۱ء تک اس نے فرنگیوں کی آبادیوں پر سالانہ حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک کے بعد ایک آبادی مسخر ہوتی گئی۔ صلیبی جنگجوؤں کے دو بڑے گروہ، جو لاطینی ریاستوں کا دفاعی مورچا سمجھے جاتے تھے اور مستحکم قلعوں میں بیٹھے تھے، بیبرس کی پے در پے ضربوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۲۶۳ء میں بیبرس نے الکرک پر قبضہ کیا اور وہ محترم گرجا مسمار کر دیا۔ جس کا نام ناصرہ تھا۔ دو سال بعد اس نے قیساریہ پر اچانک قبضہ کر لیا۔ چالیس روز کے محاصرے کے بعد ارسوف کو ہیکلی جنگ جوؤں سے چھین لیا۔[۵۲] ۱۲۶۶ء میں صفد نے مقابلہ چھوڑا اور اس کے دو ہزار ہیکلی جنگ جُو موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، حالانکہ ان سے جان بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا۔[۵۳] اس شہر کی فصیل پر اب تک یہ کتبہ موجود ہے: "سکندرِ زماں عماد الدین"

---

[۵۱] ابوالفدا جلد ۳ ص ۱۴۸ - ابن الاثیر جلد ۱۲ ص ۳۱۵-

[۵۲] ابن الفرات "تاریخ" ص ۸۲-

[۵۳] المقریزی کتاب السلوک فی معرفت دول الملوک جلد اول حصہ دوم ص ۳۹ - ۳۰۰ - ابوالفدا جلد ۴ ص ۳-

بیبرس نے دریائے اردن پر جو پل بنوایا، اس میں اپنے کتبے کے دونوں جانب قیر نصب کرائے۔ ۱۲۶۸ء میں یافہ پر قبضہ ہوا، پھر شقیف ارنون اور انطاکیہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انطاکیہ کی فوج اور باشندوں میں سے سولہ ہزار قتل کیے گئے اور ایک لاکھ قید ہوئے۔ انھیں فروخت کیا گیا۔ ایک نوجوان لڑکے کے لیے بارہ درہم اور ایک نوجوان لڑکی کے لیے پانچ درہم ملے۔ شہر میں ایک پرانا قلعہ اور بہت سے گرجے تھے، جنھیں عالم گیر شہرت حاصل تھی۔ وہ سب نذرِ آتش ہوئے۔ انطاکیہ قدرت کی اس ضرب سے پھر نہ سنبھل سکا[1]

انطاکیہ دوسری لاطینی سلطنت تھی۔ اس کے چھن جانے سے سب کے حوصلے پست ہوگئے، چنانچہ چھوٹے چھوٹے لاطینی قلعوں کی ایک تعداد سے دست برداری اختیار کرلی گئی۔ ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد پر حملہ ہوا، جو قرونِ وسطیٰ کے قلعوں میں سے محفوظ ترین تھا۔ مختصر سے محاصرے کے بعد یہ مقام بھی مسخر ہوگیا (۴ مارچ - ۸ اپریل)۔ اس قلعے میں بیک وقت دو ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ سالہا سال طرابلس کا امیر اس پر قابض رہا۔ اس قلعے سے اس راستے کی حفاظت ہوتی تھی، جو شمالی لبنان کو شام سے ملاتا تھا۔ اسی طرح قلعہ شقیف جنوبی راستے کی حفاظت کرتا تھا۔ اس قلعے کو پہاڑی نمونے کے قلعوں میں پہلی حیثیت حاصل تھی اور یہ ان دروں کے سر پر تھے، جہاں سے اسلامی سرزمین اور فرنگیوں کے ساحلی مقبوضات کے درمیان آمد و رفت جاری تھی۔ اس قسم کے اور قلعے یہ تھے: مصیاف[2]، قدموس، کہف اور خوابی، یہ تمام قلعے حشیشیوں کے قبضے میں تھے، جو ہیکلی صلیبیوں کے حلیف تھے۔ ان قلعوں میں سب سے زیادہ مستحکم مصیاف تھا، جو نصیریوں کے علاقے میں واقع تھا۔ ان سب کو فتح کرلیا گیا۔ انطرطوس[3] اور مرقب[4] نے بھی جلد صلح کرلی۔ یہ دو قلعے ساحل پر واقع تھے اور ان کا مدعا یہ تھا کہ ساحلی سڑک اور بندرگاہوں کی حفاظت کریں اور مصری بیڑا حملہ آور ہو تو اس کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔ انطرطوس کے قلعے کا زیادہ حصہ باقی نہیں رہا، لیکن مرقب کا قلعہ اب تک پہاڑ پہ ایک بڑے جنگی جہاز کی شکل میں موجود ہے۔ مشہور جغرافیہ نگار ادریسی نے اس وقت سے کچھ ہی پہلے شام کی سیاحت کی تھی۔ وہ بیروت اور لاذقیہ کے درمیان سولہ قلعوں کا ذکر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ صلیبی جنگوں کے دور میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان جنگی تعمیرات کے جس نمونے نے نشو و نما پائی، وہ بنیادی طور پر بیزنطینی استحکامات سے ماخوذ تھا۔

حشیشی

جس گروہ کو حشیشی کہتے ہیں، وہ اسمٰعیلی فرقے کی ایک نئی تنظیم پر مبنی تھا، جس کی ابتدا حسن بن صباح نے کی۔ ۱۰۹۰ء میں اس نے کوہستانِ البرز کے اندر بمقام الموت ایک قلعہ بنایا تھا، وہی اس کا صدر مستقر تھا۔ یہ نام حشیش (بھنگ) سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ وقتاً فوقتاً بھنگ پیا کرتے تھے۔ یہ ایک خفیہ تنظیم تھی، جس کا ایک رئیس کبیر تھا، جسے داعی الدعاۃ سمجھنا چاہیے۔

---

1. ابن العبری ص ۵۰۰، المقریزی، نیز ابوالفدا جلد ۴ ص ۴، ۵۔
2. اس کے مختلف نام ہیں، مثلاً مصیاف، مصیاد، مصیاث، مصیات دیکھیے اس پر مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۱۴۸۔
3. انطرطوس (موجودہ طرطوس) دیکھیے یاقوت جلد ۳ ص ۵۲۹۔
4. مرقب بمعنی پہرے کا برج۔

اس کے ماتحت وہ لوگ تھے، جنھیں بڑے داعی قرار دینا چاہیے۔ سب سے نیچے فدائیوں کی جماعت تھی، جو رئیس کبیر کے حکم پر ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، خواہ اس میں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔ فدائیوں نے مسیحیوں اور مسلمانوں کے خلاف خنجر کا استعمال یکساں طریق پر کیا، یہاں تک کہ قتل کو ایک فن بنا دیا۔

جس زمانے میں صلیبی شمال کی طرف سے شام میں داخل ہو رہے تھے، حشیشین شمال مشرق سے آ رہے تھے۔ سلجوقیوں کا امیر رضوان (وفات ۱۱۱۳ء) سب سے پہلے ان کا حلقہ بگوش بنا اور انھوں نے بانیاس کو اپنا پہلا مستحکم قلعہ بنایا۔ ۱۱۴۰ء تک وہ شمالی شام کے پہاڑوں میں متعدد قلعے حاصل کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا طرزِ عمل وہی تھا، جو ان کے ایرانی ہم مشربوں کا تھا۔ ۱۱۳۳ء میں قدموس کا قلعہ حاصل کر لیا گیا۔ ولیم صوری[۵۱] کے نزدیک ان کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اہلِ یورپ شام کے رئیس کبیر کو شیخ الجبل کہتے تھے۔ اس کا مرکز مصیاف تھا۔ ۱۱۶۲ء میں تیس سال تک راشد الدین سنان[۵۲] اس منصب پر فائز رہا۔ یہی شخص تھا، جس کے آدمیوں نے دو مرتبہ صلاح الدین پر قاتلانہ حملے کیے تھے[۵۳]۔ راشد الدین کو دمشق کے ایک وزیر نے اس کام کے لیے رشوت دی تھی، جو نور الدین زنگی کا وفادار تھا۔ صلاح الدین نے مصیاف پر حملہ کیا، لیکن اسے فتح نہ کر سکا۔ کہا جاتا تھا کہ خود صلاح الدین نے کانرڈ شاہ یروشلم کو قتل کرانے کے لیے حشیشیوں سے کام لیا اور وہ ۱۱۹۲ء میں ایک ایسے گروہ کے ہاتھوں مارا گیا، جس نے مسیحیوں کا لباس پہن رکھا تھا[۵۴]۔ ایک اور ممتاز فرینک کاؤنٹ ریمان ثانی والیِ طرابلس تھا، جو حشیشیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا (۱۱۵۲ء)۔ فرینکوں کے ایک امیر نے سنان کے جانشین سے اس کے پہاڑی قلعے میں ملاقات کی تھی۔ قلعے کے بلند گنبدوں کی حفاظت سفید پوش حشیشی کر رہے تھے۔ رئیس کی طرف سے اشارہ ہوا تو دو سنتری برجوں سے نیچے چٹانوں پر کود پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے[۵۵]۔ اس کہانی سے واضح ہوتا ہے کہ فدائی صرف مذہبی جوش کی بدولت غیر مشروط اطاعت و فداکیشی کے لیے تیار رہتے تھے، یہ نہ تھا کہ کسی نشہ آور بوٹی سے انھیں مدہوش کر دیا جاتا تھا۔

۱۱۷۲ء میں "شیخ الجبل" نے اپنے سفیر شاہ یروشلم کے پاس بھیجے، تاکہ اپنے آدمیوں کے مسیحیت قبول کر لینے کے امکانات کا اندازہ کرائے۔ یہ طریقِ عمل اس "تقیہ" کے عین مطابق تھا، جس کی اجازت غالی شیعوں کے مطابق شرعی احکام میں موجود تھی۔ ہیکلی جنگ جوؤں کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر حشیشیوں نے مسیحیت قبول کر لی تو وہ خراج ختم ہو جائے گا، جو ان سے وصول کیا جا رہا تھا۔ اس اندیشے کی بنا پر جنگجوؤں نے حشیشی رئیس کے مرسلہ آدمی قتل کر ڈالے[۵۶]۔ سینٹ لوئی عکہ میں تھا کہ اس کے

---

۵۱ ولیم صوری جلد ۲ ص ۶۹۱۔

۵۲ ابوالفدا جلد ۳ ص ۸۹، ابن خلدون جلد ۲ ص ۵۲۱۔

۵۳ ابوالفدا جلد ۳ ص ۶۰، ۶۱۔

۵۴ ابن الاثیر جلد ۱۲ ص ۵۱۔ بنیر جیکو سے دی وتری ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ ایمبرائز ص ۳۳۴، ۳۳۵۔

۵۵ دیکھو: Marinus Sanuto جلد ۲ ص ۲۰۱۔

۵۶ ولیم صوری جلد ۲ ص ۳۹۲، ۳۹۴۔ برچارڈ ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

پاس حشیشیوں کا وفد پہنچا، جو اپنے ساتھ تحائف بھی لایا، مثلاً زیور، بلور و عنبر کے جانور، ایک انگشتری اور ایک کُرتا۔ کُرتا بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ لوئی رئیس حشیشین سے اتنا ہی قریب ہے، جتنا خود اس کا جسم، لوئی نے بھی اسی طرح تحائف بھیجے[۱]۔ دو جنگ جو، جو عربی بولتے تھے، ترجمانوں کی خدمت انجام دیتے رہے۔ لوئی ابھی فرانس سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حشیشیوں نے اس پر بھی قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان کا دائرۂ عمل مغربی یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرقی جانب ان کی کارفرمائی منگولیا تک جاری تھی۔ وہاں انھوں نے ایک خانِ اعظم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بیبرس نے ان کی شامی پناہ گاہ برباد کر ڈالی، جہاں بیٹھ کر وہ سازشیں کرتے تھے اور جہاں قتل کے منصوبے کیے جاتے تھے۔ ساتھ ہی شامی حشیشیوں کی قوت ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئی۔

آخری صلیبی نوآبادی

بیبرس نے فرنگیوں کے خلاف جو کام شروع کیا تھا، وہ اس کے جانشین قلاؤن نے بھی ویسی ہی سرگرمی اور جوش سے جاری رکھا۔ قلاؤن (۱۲۷۹ء - ۱۲۹۰ء) کا لقب الملک المنصور تھا اور یہ لقب ہر لحاظ سے موزون تھا۔ ۱۵ اپریل ۱۲۸۲ء کو قلاؤن نے اس صلح کی تجدید مزید دس سال اور دس مہینے کے لیے کر لی، جو بیبرس نے انطرطوس کے ہیکل جنگ جوؤں سے کی تھی، تین سال بعد صور کی شہزادی سے اس قسم کا معاہدہ ہوا، جس کے قبضے میں بیروت بھی تھا[۲]۔ مرقب اڑتیس روز کے محاصرے کے بعد ۲۵ مئی ۱۲۸۵ء کو مسخر ہو گیا۔ اس کی بیرونی فصیل میں اب بھی پتھروں کے درمیان تیروں کے پیکان دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایوبی دور کا مؤرخ ابو الفدا اس زمانے میں بارہ سال کا تھا، اسے لڑائی کا پہلا تجربہ اسی مقام پہ ہوا تھا[۳]۔ یہاں کے صلیبی جنگ جوؤں کو طرابلس لے گئے[۴]۔ چار سال بعد طرابلس بھی مسخر ہو گیا۔ یہ سب سے بڑا شہر تھا، جو صلیبیوں کے قبضے میں رہ گیا تھا۔ یہاں لاشوں کے انبار سے ایسی مکروہ بو اٹھ رہی تھی کہ ابو الفدا اسے برداشت نہ کر سکا[۵]۔ برسوں کے بعد طرابلس کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا، مگر پہلی جگہ نہیں، جو سمندر کے کنارے تھی، بلکہ سمندر سے چند میل ہٹ کر، جہاں یہ اب بھی موجود ہے۔

اب عکّہ کے خلاف تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یہ تنہا بڑا مقام تھا، جو صلیبیوں کے قبضے میں رہ گیا تھا۔ ابھی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ قلاؤن نے وفات پائی اور اس کا بیٹا الملک الاشرف مسند نشین ہوا۔ (۱۲۹۰ء - ۱۲۹۳ء) الملک الاشرف نے عکّہ کا محاصرہ کر لیا اور اس میں بانوے منجنیق استعمال کیے۔ ایک ماہ کے محاصرے کے بعد ۱۸ مئی ۱۲۹۱ء کو شہر پر حملہ کیا۔ اس نے جنگ جوؤں کو امان دے دی تھی، لیکن بعد میں قتل کر دیا۔ ابو الفدا نے اس کے محاصرے میں بھی حصّہ لیا[۶]۔ شہر کو عملاً صفحۂ ہستی سے محو کر دیا گیا[۷]۔

۱ھ جائنوِل ص ۲۵۰

۲ھ مقریزی نے دونوں معاہدوں کا متن محفوظ رکھا ہے، جلد ۲ ص ۱۷۲، ۱۷۶، ص ۱۷۷، ۱۸۱-

۳ھ مقریزی جلد ۴ ص ۲۲

۴ھ ابن الفرات جلد ۸ ص ۱۷، ۱۸-

۵ھ ابن الفرات جلد ۴ ص ۲۴، جلد ۸ ص ۸۰، ۸۱- ادریسی ص ۱۸-

۶ھ جلد ۴ ص ۲۵، ۲۶- مقریزی جلد ۲ ص ۱۲۵، ۱۲۶-

۷ھ اسے اٹھارھویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ اس کا قلعہ بعد میں انگریزوں نے قید خانے کے طور پر استعمال کیا، جسے یہودی دہشت پسندوں نے ۴ مئی ۱۹۴۷ء میں اڑا دیا۔

عکّہ کی تسخیر نے باقی ساحلی قصبوں کی قسمت پر بھی مہر لگادی۔ صور کو اسی روز چھوڑ دیا گیا، جس روز عکّہ مسخر ہوا تھا۔ صیدا سے ۱۴ جولائی کو تسلط اٹھا۔ بیروت ۲۱ جولائی کو اور انطرطوس ۳ اگست کو خالی ہوئے عتلیت کو صلیبی جنگجوؤں نے خالی کردیا اور وہ وسط اگست میں تباہ ہوا[1] ارواد کے صلیبیوں نے مزید گیارہ سال تک مقابلہ جاری رکھا۔ اس جزیرے میں جو قلعہ ہے، اس کے دروازے پر لوسیناں کا خاندانی نشان اب تک دیکھا جا سکتا ہے، یعنی شیر اور کھجور۔ سقوط ارواد کے ساتھ ہی مشرق و مغرب کی آویزش کے ایک شاندار ڈرامے کا آخری پردہ گر گیا۔

---

[1] صالح ص ۴۲۔ ابوالفدا جلد ۴ ص ۲۶ سنز ٹو جلد ۲ ص ۲۳۱۔

چھیالیسواں باب

ثقافتی تعامل

صلیبی جنگوں میں رومانی اور دلآویز واقعات کی خاصی بہتات تھی، تاہم ذہنی اور ثقافتی اعتبار سے یہ بڑی مایوس کن تھیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی وہ تہذیبی اثرات کے لحاظ سے مشرق کے بجائے مغرب کے لیے زیادہ اہم تھیں، ان جنگوں نے اہلِ یورپ کے سامنے صنعت و حرفت، تجارت اور استعمار کے نئے افق پھیلا دیے۔ اُن لوگوں نے شام میں جو حکومتیں قائم کیں، وہ دورِ حاضر کی استعماری سلطنتوں سے ملتی جلتی تھیں۔ ثقافتی عناصر کو مشرق سے مغرب پہنچانے والے سپاہی نہ تھے بلکہ تاجر اور زائر تھے۔ اہلِ یورپ مشرق میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان تلخی اور نفرت کی ایک ایسی میراث چھوڑ گئے جو آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

مغرب پر اثر

صلیبی جنگوں کے وقت اسلامی ثقافت مشرق میں رو بہ انحطاط تھی۔ کچھ مدت پیشتر یہ اپنی تخلیقی حیثیت کھو چکی تھی، سائنس، ادبیات اور فلسفے کی نمایاں روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ خود فرنگ بھی پست تر ثقافتی سطح پر تھے۔ قومی عداوتیں اور مذہبی تعصبات ان کے اور مسلمانوں کے درمیان تعاملی قوتوں کی کارفرمائی کا راستہ روک رہے تھے اور ان میں کسی ردِ عمل کے لیے گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔ پھر اس پر تعجب کی کون سی وجہ ہے کہ اس پوری مدت میں صرف ایک بڑی علمی کتاب عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئی، یعنی مجوسی کی کتاب[1] "کامل الصناعۃ الطبیہ" معروف بہ "کتاب الملکی"۔ یہ ترجمہ ۱۱۲۷ء میں بہ مقام انطاکیہ پیسا کے ایک شخص نے کیا تھا، جس کا نام سٹیفن تھا۔ ایک اور چھوٹی سی کتاب انطاکیہ ہی میں ترجمہ ہوئی (۱۲۴۷ء)، جس کا نام "سر الاسرار" تھا۔ یہ رسالہ سحر و نیرنجات پر تھا، جسے ارسطو سے منسوب کر دیا گیا تھا اور قرونِ وسطیٰ کے آخری دور میں سحر و نیرنجات کا رواج عام ہو گیا تھا۔ مغرب میں معالجات کا نظام پہلے بھی موجود تھا۔ مشرق سے اسے مزید تحریک مل گئی، چنانچہ بارھویں صدی کے یورپ میں بہت سے شفاخانے اور دار الصحت خصوصاً جذامی خانے قائم ہونے لگے۔ ہم شامی جذامی خانوں کو یورپی جذامی خانوں کا پیشرو قرار دے سکتے ہیں۔

ادب پر اثر اور بھی کم تھا اور اس کا پتا لگانا مشکل ہے۔ بعض کہانیاں یقیناً منتقل ہوئیں، جو اصلاً ایرانی یا ہندی تھیں، لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ انھیں بدل ڈالا گیا، جیسا کہ "جستا رومانورم"[2] اور دوسرے مجموعوں سے واضح ہے۔ چاسر نے

---

[1] اس کا اصل نام علی عباس تھا، جسے لاطینی میں ہلی عباس بنایا گیا (وفات ۹۹۴ء)۔

[2] Gesta Romanorum

جاگیرداروں اور امیروں کی جو کہانیاں نظم کیں، ان کا نمونہ الف لیلہ ولیلہ کی شکل میں موجود تھا۔ بکیشیو کی کتاب "ڈیکامیرون[۵۱]" میں کئی ایسے قصے شامل ہیں، جو مشرق میں زبانی سنے گئے تھے۔ "جامِ مقدس[۵۲]" کے افسانے میں ایسے عناصر موجود ہیں، جن کی اصل بے شائبۂ ریب شامی ہے۔

فنِ حرب

شام میں فرنگیوں نے جو نئی چیزیں سیکھیں، یہ تھیں:

۱۔ "صلیبی کمان[۵۳]" کا استعمال

۲۔ جنگجو اور گھوڑے کے لیے بھاری زرہ کا استعمال

۳۔ جنگی باجوں میں طنبور اور نقارے کا استعمال

۴۔ فوجی مخابرت کے لیے نامہ بر کبوتروں کا استعمال

۵۔ رات کے وقت سگنل کی غرض سے آگ کا استعمال[۵۴]

۶۔ فتح کے موقع پر جشن میں چراغاں کا طریقہ بھی اہلِ یورپ نے شام ہی سے لیا اور جنگ جوؤں کے درمیان اپنے اپنے کمالات دکھانے کے لیے جو مقابلے ہوتے رہتے تھے، ان میں بھی چراغاں کا طریقہ جاری کر لیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے "نظامِ فتوت" کی نشو و نما سرزمینِ شام میں ہوئی۔ مسلمان جوانمردوں سے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگیوں میں بھی ہر وقت ہتھیار لے کر نکلنے اور طمطراق و کرّ و فر دکھانے کو فروغ ہُوا۔ دوسر والا عقاب قدیم سمیریوں کا نشان تھا، زنگی نے اسے سکوں پر استعمال کیا۔ ارتقیوں نے اسے اپنا نشان بنا لیا۔ یہ نشان شام سے "گول میز[۵۵] کے بہادروں" تک پہنچا۔ یہی نشان بیزنطینیوں میں رائج ہُوا۔ ۱۳۲۵ء میں جرمن شہنشاہوں نے یہی نشان اختیار کر لیا۔ آخر یہ امریکہ پہنچ گیا اور حکومت امریکہ اب تک عقاب کو بطور نشان استعمال کر رہی ہے۔ شگوفۂ سوسن عیلامیوں اور اشوریوں کا نشان تھا۔ مسلمانوں میں یہ نشان پہلے پہل زنگیوں کے ذریعے سے آیا، یعنی نور الدین زنگی کے بیٹے نے اپنے پرچم کے لیے اختیار کیا۔ ایوبیوں اور مملوکوں کے سکوں میں یہ بار بار استعمال کیا گیا۔ فرنگیوں نے بھی اسے اختیار کر لیا۔ پھر یہ فرانس منتقل ہُوا، بعد ازاں کینیڈا جا پہنچا۔ فیتے یا چمڑے کا گلاب ایوبیوں اور مملوکوں میں رائج تھا۔ بعض مملوکوں کے نام جانوروں کے نام پر تھے اور وہ اپنی ڈھالوں پر انھیں جانوروں کی تصویریں بنوا لیتے تھے۔ بیبرس کا طغرا شیر بر تھا۔ لاجوردا اور اس قسم کی دوسری اصطلاحات اس امر کی شہادت ہیں کہ مسلمانوں میں بھی جوانمردی کا نظام خاصا پائدار تھا۔

---

۵۱ Holy Grall

۵۲ Decameron وہ پیالہ جو مسیحؑ نے آخری عشا میں استعمال کیا تھا۔

۵۳ (مترجم۔ یہ کمان کی ایک خاص قسم تھی، جس کی عام وضع قطع صلیب کی تھی)۔

۵۴ ملاحظہ ہو صالح ص ۶۰، ۶۱۔ الظاہری کی کتاب زبدۃ کشف الممالک ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ قلقشندی، جلد ۸ ص ۳۹۲، ۳۹۴۔ عمری ص ۱۹۶، ۱۹۷۔ سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۱۸۶۔

۵۵ انگلستان کے بادشاہ الفریڈ نے ایک گول میز بنوائی تھی، جس پر اپنے بہادروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ غرض یہ تھی کہ سب میں عملاً مساوات قائم رہے۔

صلیبیوں میں جنگ جُوؤں کے دو بڑے نظام تھے۔ ٹمپلرز[۵۱] اور ہاسپٹیلرز۔ یہ نظام مذہب اور جنگ کے اتحاد پر مبنی تھے اور یہ کارنامہ اسلام نے انجام دیا۔ ٹمپلرز کا نظام حشیشیوں کے نمونے پر مرتب ہوا تھا۔ اس نظام کا زیریں طبقہ اُن اخوان، امراء اور جوانمردوں پر مبنی تھا، جنھیں مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی اور یہ داعیوں کے تین طبقوں یعنی لاصقوں، فدائیوں اور رفیقوں کے عین مطابق تھا۔ جوانمرد سفید لباس پہنتے تھے اور سُرخ صلیب لگا لیتے تھے۔ حشیشیوں کے رفیقوں کا لباس بھی سفید تھا اور وہ سُرخ ٹوپی پہنتے تھے۔ اونچے طبقے تین تھے، یعنی مدبّر، مدبّر اعظم، سیّد اعظم۔ حشیشیوں میں بھی یہی تین درجے تھے، یعنی داعی، داعی کبیر اور شیخ الجبل۔ پھر ایک اور خفیہ نظام تھا، جسے نظامِ فتوّت کہتے تھے۔ اس میں عربوں کی جوانمردی نمایاں ہوتی تھی۔ اس نظام کی اصلاح عباسی خلیفہ النّاصر (۱۱۸۰ء - ۱۲۲۵ء) نے کی تھی اور خود ہی اس کا سرپرست بن گیا تھا۔ ممکن ہے، اس نے صلیبی نظاموں کا سلسلہ پیشِ نظر رکھا ہو۔ جو لوگ پہلے پہل اس سلسلے میں داخل ہوتے تھے، وہ خاص قسم کی شلواریں پہنتے تھے۔ صلاح الدّین کا بھائی العادل اور اس کے فرزند ایسی ہی شلواریں استعمال کرتے تھے۔ شام میں اس نظام کی ایک خاص سرگرم شاخ تھی، جو نبویہ کے نام سے مشہور تھی۔[۵۲]

تعمیرات

صلیبیوں کے جو باقیات شام میں بطورِ خاص نمایاں رہے، وہ ان کے بنائے ہوئے قلعے تھے، جو اب تک پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں انھوں نے کلیسا بھی بنوائے۔ انھوں نے اپنے کلیساؤں میں رومانیوں اور گاتھوں کا نمونہ پیشِ نظر رکھا۔ لیکن ان کی تزئینات بیزنطینی اور شامی تھیں۔ کنیستہ القیامہ اور قبۃ الصخرا کا نمونہ مدوّر ہیکلوں کی مختلف مذہبی عمارتوں میں پیشِ نظر رکھا گیا، جو انگلستان، فرانس، ہسپانیہ اور جرمنی میں ہیں۔ صلیبی دَور کے بہت سے کلیسا بعد میں مسجدیں بنا لیے گئے۔ ان میں صور کا وہ کلیسا بھی ہے جو سیّدہ کے نام سے موسوم تھا اور جہاں مشہور مؤرخ ولیم صوری[۵۳] اسقفِ اعظم تھا (۱۱۷۵ء - ۱۱۸۵ء)۔ صیدا میں ہاسپٹیلرز نے ایک کلیسا بنایا تھا، وہ آج کل الجامع الکبیر ہے۔ بیروت میں سینٹ یوحنّا کا کلیسا بالڈوِن نے ۱۱۱۰ء میں بنوایا تھا، وہ آج کل مسجد عمری[۵۴] ہے۔ انطرطوس کا کلیسا، جو سیّدہ کے نام سے منسوب ہے، سب سے زیادہ خوب صورت تھا اور اسے بہتر طریق پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ لوگ بہ طورِ خاص اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ یہ ۱۱۲۳ء میں بننا شروع ہوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس میں ایک تصویر ایسی ہے، جو مسیحؑ کے حواری لوقا نے بنائی تھی اور ایک قربان گاہ بھی ہے، جہاں مسیحؑ کے حواری پطرس نے دعائے عام کی تھی۔[۵۵] اس عمارت کے ساتھ ایک نیا مینار بنا دیا گیا۔ یہ اس جگہ بنا، جہاں ابتدا میں ایک مسیحی گرجا تھا۔ البلمند (بیلمانٹ) طرابلس کے قریب تھا۔ یہ آج کل ایک یونانی خانقاہ ہے اور فرینک راہبوں نے ۱۱۵۷ء میں بنائی تھی۔[۵۶]

---

۵۱ ان کی تشریح پہلے ایک حاشیے میں ہو چکی ہے۔

۵۲ ابن الاثیر جلد ۱۲، ص ۲۶۸، فخری ص ۴۳۴، ابن جبیر ص ۲۸۰۔

۵۳ جلد ۲، ص ۴۱۱، اینلارٹ جلد ۲، ص ۳۵۳۔

۵۴ صلح ص ۵۸، اینلارٹ جلد ۲ ص ۶۹۔

۵۵ جوائن وِل ص ۳۲۸، جیکوبس دا وتری ص ۱۲۰-۱۲۱، اینلارٹ جلد ۲ ص ۴۰۳-۴۔

۵۶ اینلارٹ جلد ۲ ص ۴۵۔

زراعت اور صنعت و حرفت

صلیبی زائروں سے بہت پہلے زائر ارضِ مقدس میں آتے تھے اور تاجر بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر لنگرانداز ہوتے تھے۔ صلیبی تحریک نے اس آمد و رفت میں مزید سرگرمی پیدا کر دی۔ اس وجہ سے مشرقی چیزیں، جن سے پہلے بھی اہلِ یورپ ناواقف نہ تھے، یورپی منڈیوں میں کثرت سے بکنے لگیں۔ ان چیزوں کی اصل کا معاملہ طے کرنا مشکل ہے، کیونکہ شام سے براہِ راست بھی یہ چیزیں جاتی تھیں، اور سسلی اور ہسپانیہ کے راستے بھی پہنچتی تھیں، لہٰذا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ فلاں چیز کس راستے سے یورپ پہنچی۔

صلیبی جب تک شام میں رہے، انھیں بعض مقامی اور گرم خطوں کی چیزیں استعمال کرنے کا موقع ملا، جو شام کے بازاروں میں پائی جاتی تھیں اور ان کے لیے ذوق بھی پیدا ہو گیا، مثلاً تل، خروبہ، باجرا، چاول، لیمو، خربوزہ، خوبانی، عسقلانی پیاز۔ خوبانیوں کو بعض اوقات دمشق کے آلوچے کہتے تھے۔ دارالحکومتِ شام کو گلاب اور دوسرے عطریات کی ساخت میں درجۂ اختصاص حاصل تھا۔ عطر اور خوشبودار روغن، جو ایرانی الاصل تھے، نیز خوشبوئیں اور عرب کی دوسری خوشبودار چیزیں، جن میں مسالے، یعنی لونگ، سیاہ مرچ وغیرہ شامل تھے، نیز مٹھائیاں بہ کثرت استعمال ہونے لگیں۔ لونگ، سیاہ مرچ، دوسرے مسالے، پھٹکڑی، ایلوا وغیرہ یورپ کے مطبخوں اور دواخانوں میں پہنچ گئے۔ پہلے یہ سب چیزیں مشرقی یورپ میں پھیلیں، پھر آہستہ آہستہ مغربی یورپ میں پہنچ گئیں۔ ساتھ ہی اوہام کی بھی اشاعت ہوئی، جو ان سے وابستہ تھے، مثلاً یہ کہ یہ مسالے بہشت میں تھے اور دریائے نیل کے پانی میں شامل ہو کر ہم تک پہنچ گئے[۱]۔ مصر میں زنجبیل بھی صلیبیوں کی غذاؤں میں شامل ہو گئی۔ ان تمام اشیا سے زیادہ اہم حیثیت چینی (شکر) کو حاصل تھی۔ گنا فرنگیوں نے پہلے پہل بیروت کے ساحلی میدانوں میں دیکھا تھا۔ عرب تاجر گنا ہندوستان سے یا جنوبی و مشرقی ایشیا سے لاتے تھے، جہاں ابتدا میں یہ خودرو ہوتا تھا۔ اس سے پیشتر اہلِ یورپ کھانوں یا دواؤں میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے شہد استعمال کرتے تھے۔ صور، جو ولیم کا وطن تھا (وفات ۱۱۹۰ء اور وہ صلیبی جنگوں کے سب سے بڑے مؤرخوں میں شمار ہوتا ہے)، نیز اس کے گرد و نواح میں گنا بہ کثرت ہوتا تھا[۲]۔ چینی ہی سے ہلکی مٹھاس کے مشروب، مٹھائیاں اور قند بنتی تھی۔ یورپ میں پون چکی سب سے پہلے علاقۂ نارمنڈی میں نمودار ہوئی (۱۱۸۰ء) اور اس کا نام ودتر کائز، (ترکی) تھا۔ رہٹ پون چکیوں سے بھی پہلے یورپ میں موجود تھے، لیکن جو رہٹ جرمنی میں بیریو کے قریب تھے، ان میں شامی نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ شام میں رہٹ رومیوں کے عہد سے رائج تھے۔

لباس، اگر مردوں کی آرائش اور فیشن کے سلسلے میں نئی خواہشیں پیدا نہ ہوئیں تو کم از کم انھیں ایڑ ضرور لگی۔ فرنگیوں کو یقین ہو گیا کہ دیسی غذا اور دیسی لباس مستحق ترجیح ہے، چنانچہ شامیوں کی پیروی میں بعض اہلِ یورپ نے ڈاڑھیاں چھوڑ دیں، ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنتے اور سر پر کوفیہ رکھتے، عورتیں وہ مشرقی گاؤن پہننے لگیں، جنھیں سکوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ وہ دیوان پر بیٹھتیں، عود و رباب سنتیں اور باہر نکلتیں تو نقاب پہن کر نکلتیں[۳]۔ جنگجو زائر ملاح اور تاجر مشرق سے لوٹتے تو اپنے ساتھ قالین، شطرنجیاں

---

۱ جوائن ول ص ۱۰۴۔

۲ جلد ۲ ص ۶، جوائن ول ص ۱۰۱۔ ۳ ابن جبیر ص ۳۳۳۔

اور مشجر لاتے تھے، جو زمانۂ قدیم سے مشرق قریب کے گھروں میں باعثِ زینت چلے آتے تھے۔ جو خاص کپڑے مشرق میں رائج تھے، وہ یورپ پہنچ گئے، مثلاً دمشق، موصل اور بغداد کے خاص کپڑے، شرقیہ، اطلس، تافتہ، خمل، ریشم اور ساٹن[۵۱] خملہ[۵۲] اور مختلف قسم کے سمور بھی خوب رائج ہو گئے۔ دمشق اور قاہرہ کے جواہرات کی مانگ بڑھ گئی۔ صلاح الدین کے بھائی العادل نے عام بیان کے مطابق فرنگیوں کی بیویوں کو جواہرات رشوت میں دیے، تاکہ انھیں لڑائیوں میں شریک ہونے سے باز رکھیں۔ جن چیزوں کو مشرق میں عیش و نشاط کا سامان سمجھا جاتا تھا، وہ مغرب میں ضرورت کی چیزیں بن گئیں۔ فولادی آئینوں کی جگہ کانچ کے آئینے استعمال ہونے لگے۔ تسبیحیں ہندوؤں نے ایجاد کی تھیں۔ ان سے شامی مسیحیوں نے لیں۔ پھر یہ رومن کیتھولکوں کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے مسلمان صوفیوں میں رائج ہو گئیں۔ زائرین واپس گھروں کو جاتے تھے تو تبرکات خانے ساتھ لے جاتے تھے، جو شامیوں کی مصنوعات میں سے تھے۔ یورپی کاریگر بھی اس نمونے کے تبرکات خانے بنانے لگے۔ ایرس[۵۳] اور دوسرے یورپی مرکزوں نے مختلف چیزیں، قالین اور پارچے مشرقی نمونوں پر بنانے شروع کر دیے۔ کپڑوں اور صنعتی مصنوعات کے ساتھ رنگ بھی یورپ پہنچے۔ ان میں سے نیلا تھوتھا، گہرا سُرخ اور قرمزی رنگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مشرق میں ظروفِ رنگ یا سونے چاندی یا مینا کاری اور کانچ پر نقش و نگار کا جو کام ہوتا تھا وہی یورپ میں بھی رائج ہو گیا۔

بین الاقوامی تجارت

بارھویں اور تیرھویں صدی میں بحری سرگرمی اور بین الاقوامی تجارت اس پیمانے پر پہنچ گئی، جو رومیوں کے زمانے سے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اصطرلاب کا استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ اس سے جہازرانی میں بڑی مدد ملی۔ مسلمانوں سے پیشتر چینیوں نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ مقناطیسی سوئی ایک معین سمت میں رہتی ہے۔ یورپی جہازرانوں میں سے اطالویوں نے سب سے پہلے اصطرلاب سے فائدہ اٹھایا۔ تجارت کو خاصا فروغ حاصل ہوا تو اس نے کئی ضرورتیں پیدا کر دیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ زائر اور صلیبی نقد روپیہ ادا کریں۔ اس ضرورت کا نتیجہ یہ نکلا کہ روپیہ اقتصادیات کی بنیاد بن گیا اور کرنسی کی رسد اور ترویج بڑھ گئی۔ اٹلی کے مختلف شہروں میں لین دین کرنے والی فرمیں قائم ہو گئیں، جنھوں نے مشرقی بحیرۂ روم کے ساحل پر شاخیں قائم کر لیں اور ساتھ ہی ہنڈیوں سے کام لینا شروع کر دیا گیا۔ بیزنطینی دینار، جس پر عربی کا کتبہ تھا، غالباً سب سے پہلا سنہری سکہ تھا، جو لاطینیوں نے بنایا اور پہلے قنصل، جن کے متعلق تاریخ میں ذکر آیا، جینوا کے تھے، جنھیں ۱۱۸۰ء میں عکہ بھیجا گیا۔ قنصل جینوا کی مقامی عدالتوں کی صدارت کرتے تھے، معاہدوں، وصیتوں اور وثیقوں پر مہریں لگاتے تھے۔ اُن کے ہم قوموں میں سے جو لوگ نئے نئے پہنچتے تھے، اُن کی تصدیق کرتے تھے۔ جھگڑوں کے تصفیے انھیں کے ذریعے سے ہوتے تھے۔ غرض وہ لوگ ویسے ہی فرائض انجام دیتے تھے، جیسے موجودہ زمانے کے قنصل انجام دیتے تھے۔

---

۵۱ عربی میں اسے زیتونی کہتے ہیں۔ یہ چین کے مشہور شہر ٹسین تنگ کے چینی تلفظ کا بگاڑ ہے۔ جہاں سب سے پہلے ریشمی کپڑا بُنا جاتا تھا۔

۵۲ یہ اونٹ کی نرم و ملائم اُون اور ریشم سے بنتا ہے۔

۵۳ Arras فرانس کا مشہور مقام۔

اجتماعی ربط ضبط

واضح رہے کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں امن کے دور لڑائیوں کے دور سے زیادہ طویل تھے۔ اس طرح مشرقیوں اور مغربیوں کے درمیان خوشگوار اور ہمسائگی کے تعلقات استوار کرنے کے خاصے مواقع تھے۔ جب زبان کی رکاوٹ دور ہوگئی تو یقین ہے، فرنگیوں پر واضح ہوگیا ہوگا۔ مسلمان بُت پرست نہیں، جیسا کہ اسے سمجھا جاتا تھا اور وہ یورپ کی یہودی و مسیحی اور یونانی رومی میراث میں بھی حصہ دار تھا۔ ہمیں بہت سے صلیبیوں کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے عربی زبان میں مہارت پیدا کر لی تھی، مثلاً ریجینالڈ ساکن شاتینلوں اور ولیم صوری، لیکن ہمیں کسی ایسے عرب کا نام معلوم نہیں، جو فرانسیسی اور لاطینی بولتا ہو۔ رواداری، نقطۂ نگاہ میں وسعت اور سیکولرزم کی طرف رجحان وغیرہ اوصاف مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے لوگوں سے میل جول کے باعث پیدا ہوتے ہیں اور یہ چیزیں یہاں مشرقی معاشرے کے بجائے مغربی معاشرے کو حاصل ہوئیں۔ ارض مقدس میں بعض زیارت گاہیں ایسی تھیں، جن کا احترام مسیحی، یہودی اور مسلمان یکساں کرتے تھے۔ معاشرتی و اقتصادی سطح پر مسلمان اور مسیحی آزادانہ ملتے تھے[51] گھوڑوں، کتّوں اور بازوں کی تجارت کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے امان کے پروانے لیتے تھے، بلکہ ان میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ دیسی ماؤں سے ایک نسل پیدا ہوتی جسے پُلّانی[52] کہتے تھے۔ موجودہ زمانے کے لبنانیوں اور فلسطینیوں، خصوصاً اہدن (لبنان) اور بیت اللحم میں ایسے لوگ بھی ہیں، اگرچہ تھوڑے ہیں، جن کی آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہیں۔ بعض مسیحی خاندان، مثلاً فرنجی، صلیبی، دوہی، بردویل[53] اور صادی نے ایسی روایات یا نام قائم رکھے ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ وہ یورپی الاصل ہیں۔ فلسطین میں بعض دیہات، مثلاً سنجیل (سینٹ جلز) اور الرنیہ (رینالڈ) دو فرینک ناموں کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

اسامہ کی شہادت

اسامہ ابن منقذ (۱۰۹۵ء - ۱۱۸۸ء) نے اپنی کتاب مذاکرات میں مختلف نسلوں کے امتزاج کی بڑی واضح تصویر پیش کی ہے، جو براہِ راست مشاہدے پر مبنی ہے۔ اسامہ، صلاح الدین کا دوست تھا اور اس کا آبائی قلعہ شیزر دریائے عاصی پر ایک عمدہ جگہ واقع تھا، جسے وہ حشیشیوں اور فرنگیوں کے خلاف محفوظ رکھتا تھا۔ وہ قلعہ کبھی کسی صلیبی گروہ کے ہاتھ نہ لگا۔ زمانۂ امن میں وہ خود فرنگیوں سے برادرانہ تعلقات پیدا کر لیتا تھا۔ اسے فرنگیوں کی اس روش پر حد درجہ تعجب ہوتا تھا کہ وہ مقابلتاً آزاد جنسی تعلقات کے قائل ہیں اور ان میں غیرت و رقابت کا کوئی جوہر نظر نہیں آتا۔[54] وہ مجرموں کو سزائیں دیتے تھے تو اس سلسلے میں یا تو پانی

---

۵۱ ابن جبیر ص ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۸، ۳۰۲، اسامہ الاعتبار ص ۱۳۱، ۱۳۴۔

۵۲ چھوٹے بچے (مترجم — ہندوستان میں عربی الاصل مسلمانوں کی ایک جماعت مالابار میں رہتی ہے، جسے ماپلا کہتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اصل اور پلّا بتاتے ہیں، یعنی ماں کے بیٹے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بظاہر پُلّانی وہی لفظ ہے جو ماپلا کا جزو ہے۔)

۵۳ میر نو سنوٹو کی کتاب، جس کا ترجمہ لے سٹیورٹ نے کیا۔ وہ لکھتا ہے: شہنشاہ بردویل جہاں بالڈون نے وفات پائی۔ یہ جزیرہ نما سینا کے شمالی ساحل پر واقع ہے

۵۴ اعتبار ص ۱۳۵۔

استعمال کرتے تھے یا حریف کو مقابلے کی دعوت دے دیتے تھے[۵۱] یہ طریقے مسلمانوں کے طریق عدل و انصاف کے مقابلے میں بہت پست تھے۔ ان کے معالجات یقینی طور پر بہت خام معلوم ہوتے تھے۔ ایک فرینک، خاندان کے دو آدمی منیطرہ میں ایک مقامی مسیحی طبیب کے زیرِ علاج تھے اور اچھی دیکھ بھال ہو رہی تھی کہ ایک یورپی طبیب بلا لیا گیا۔ اس نے ایک مریض کی ٹانگ اٹھا کر لکڑی کے ایک کندے پر رکھی اور ایک جنگجو سے کہا کہ کلہاڑی کی ایک ہی ضرب سے اسے کاٹ دو۔ ایک مریض عورت تھی۔ یورپی طبیب نے اس کا سر منڈوا دیا اور چوٹی پر صلیب نما زخم لگایا، اوپر سے نمک ملوا دیا، تاکہ بدروح اس میں سے نکل کر بھاگ جائے۔ دونوں مریض وہیں ختم ہو گئے۔ دیسی طبیب نے خود یہ کہانی بیان کی۔ آخر میں وہ کہتا ہے: "میں نے اہلِ خانہ سے پوچھا کہ آیا اب بھی میری خدمت کی ضرورت ہے؟ جب جواب نفی میں ملا تو میں گھر چلا آیا اور یورپی طب کے متعلق جو علم مجھے پہلے حاصل تھا، وہ اب حاصل ہو گیا۔"[۵۲]

شام پر اثرات

بہ حیثیتِ مجموعی شام پر صلیبی جنگوں کے اثرات تباہی خیز پڑے۔ فرینکوں میں سے کچھ لوگ شام چھوڑ کر قبرص چلے گئے تھے، مملوکوں کو خطرہ تھا کہ وہ لوٹ آئیں گے، لہٰذا انھوں نے عکہ، ارسوف و قیساریہ، صور، طرابلس اور دوسری بندرگاہوں کے استحکامات ختم کر دیے[۵۳]۔ ایوبیوں نے عسقلان کو برباد کر ڈالا تھا[۵۴]۔ عکہ کے بعد صور فرینکوں کے مقبوضہ شام کا سب سے زیادہ پُررونق شہر بن گیا تھا۔ ابن جبیر کے نزدیک صور استحکامات میں بھی سب سے بڑھا ہوا تھا[۵۵]۔ ابوالفدا نے ایک صدی بعد اسے کھنڈروں کی حالت میں دیکھا تھا[۵۶]۔ اُن اختلافی مسلم عناصر کا بڑا حصہ ختم کر دیا گیا، جن میں شیعہ، اسمٰعیلی اور نُصَیری بھی شامل تھے۔ ابن جُبیر[۵۷] کے بیان کے مطابق ان کی تعداد سُنیوں سے زیادہ تھی، لیکن فرینکوں کے معاون بن کر انھوں نے مختلف مواقع پر اپنی وفاداری کو دھبا لگا لیا تھا۔ ان طبقوں کے باقیات پناہ گیری کے لیے وسطی لبنان اور البقاع چلے گئے۔ اس سے قبل الملک الاشرف نے دروزیوں سے اقرار لے لیا تھا کہ وہ ظاہراً سُنّی طور طریقوں کی پیروی کریں گے، لیکن یہ پیروی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بیبرس نے نصیریوں کو مجبور کر دیا تھا کہ اپنے دیہات میں مسجدیں بنائیں، لیکن وہ انھیں مسجدوں میں عبادت کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے مسجدوں سے اپنے مویشی اور باربرداری کے جانور ٹھہرانے کا کام لیا[۵۸]۔ مملوکوں کی یہ پالیسی تھی کہ کوئی چیز باقی نہ چھوڑی جائے، جس سے صلیبی فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ انھوں نے لبنان کو بار بار منظّم طریق پر لوٹا۔ سب سے

---

۵۱ اعتبار ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

۵۲ ایضاً ص ۱۳۲۔ ۱۳۳۔

۵۳ ابوالفدا تقویم، ابن بطوطہ، تحفۃ النظار جلد اوّل ص ۱۲۹۔ ۱۳۰، ادریسی ص ۱۱۔

۵۴ دیکھیے ابن بطوطہ جلد اوّل ص ۱۲۶۔

۵۵ ایضاً۔ ص ۳۰۴۔

۵۶ تقویم ص ۲۴۳

۵۷ ایضاً ص ۲۸۰

۵۸ ابن بطوطہ جلد اوّل ص ۱۷۷۔

زیادہ تباہی خیز مہم وہ تھی، جو ۱۳۰۶ء میں ناصر نے بھیجی اور اس میں کسروان[1] کے لوگ بالکل تباہ ہو گئے۔ یہاں کے شیعوں کی جگہ کُرد اور ترکمان آباد کر دیے گئے۔ شمالی جانب سے مارونی بھی آ گئے، تاکہ خالی جگہ پُر کر دیں۔ بیروت کو بحری حملے سے محفوظ رکھنے کا کام ۱۳۹۱ء میں بحتر خاندان کے حوالے کر دیا گیا اور انھیں غرب کے امیر بنا دیا گیا۔ مشہور وقائع نگار صالح ابن یحییٰ[2] کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ اُس وقت سے لبنان کا رجحان مغربی جانب کم ہو گیا اور اُس نے وہ مسلک اختیار کر لیا، جس پر وہ کم و بیش دورِ حاضر تک قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت شام میں تہذیب کے جو عناصر جمع ہوئے، وہ اُنیسویں صدی کے اوائل تک قائم رہے۔ پھر مغربی افکار کی تازہ لہریں آئیں اور ان کی وجہ سے ان ثقافتی عناصر میں تغیّر پیدا ہو گیا۔

مختلف عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں پر جو سختیاں ہوئیں، مقامی مسیحیوں پر اُن سے کم سختیاں نہ ہوئیں۔ شامی مسیحیوں اور مسلمان ہمسایوں کے درمیان عداوت اس درجے پر پہنچ گئی، جس کی نظیر پہلے بمشکل ملے گی اور یہ عداوت اب تک کالعدم نہیں ہوئی۔ الرّہا اور انطاکیہ کے مسیحیوں نے صلیبیوں کو جس سرگرمی سے امداد دی تھی، اس نے یروشلم کے مسلمان حاکموں پر گہرا اثر ڈالا اور مسیحیوں کے پاس اُنھیں جتنا روپیہ اور سامان نظر آیا، وہ سب چھین لیا[3] ــــــــ سن رسیدہ اور بیمار مردوں، نیز عورتوں اور بچوں کے سوا سب کو شہر سے نکال دیا۔ جب صلیبی شہر میں داخل ہوئے تو تھوڑے سے زندہ تھے۔ لبنان میں لاطینیوں نے مارونیوں کو تمام مذہبی اور شہری حقوق عطا کر دیے، جو رومن کیتھولک جماعت کے لیے مخصوص تھے۔ ۱۱۹۱ء میں صلاح الدّین نے بیروت پر قبضہ کیا تو ہزاروں مارونی شام چھوڑ کر قبرص چلے گئے، جہاں اب تک ان کے چار ہزار اخلاف باقی ہیں۔ ارمنوں اور یعقوبیوں نے لاطینیوں کے ساتھ پہلے سے بھی گہرے تعلّقات پیدا کر لیے، لیکن وہ اتّحاد کے درجے پر نہ پہنچ سکے۔

صلیبیوں کے خلاف جوابی حملوں کے سلسلے میں جہاد کا جو جوش مملوکوں میں پیدا ہُوا تھا، اب اس کا رُخ قبطیوں اور شامیوں کی طرف پلٹ گیا۔ تلادوں (۱۲۷۹ء تا ۱۲۹۰ء) نے اپنے عہد کے اواخر میں ایک فرمان جاری کیا، جس کے مطابق مسیحیوں کے لیے سرکاری ملازمتیں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ ۱۳۰۱ء میں سلطان النّاصر نے وہ پرانے قوانین پھر تازہ کر دیے، جن کے مطابق ذمّی مسیحیوں اور یہودیوں کو امتیازی لباس پہننا پڑتا تھا۔ وہ گھوڑے پر نہیں، صرف خچّر پر سوار ہو سکتے تھے۔ سلطان الصّالح نے بھی ۱۳۵۴ء میں یہی کیا[4]۔ النّاصر اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس نے حکماً قبطیوں کا ایک جشن منسوخ کر دیا[5] اور مسیحیوں کے بہت سے گرجوں پر مصر میں قفل ڈلوا دیے۔ مسیحیوں کے خلاف جوش کی یہ لہر معاصر ادبیات میں بھی منعکس ہوئی۔ تقریروں، فتووں اور خطبوں کے ذریعے سے عوام کو بھڑکا دیا گیا۔ شام کے

---

[1] صالح ص ۱۳۶۔ اس مقام کا نام مروی قائد کے نام پر رکھا گیا۔ شدیاق ص ۲۰۱۔

[2] ص ۶۳۔

[3] ولیم صوری جلد اوّل ص ۳۳۴۔

[4] قلقشندی جلد ۱۳، ص ۳۷۷، ۳۸۱، بردی جلد ۵ ص ۱۳۳۔

[5] مقریزی جلد اوّل ص ۶۹۔

مشہور عالم ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء ۔ ۱۳۲۸ء) کی تحریرات وقت کی ارتجاعی روح پر مشتمل ہیں[۵۱] ابن تیمیہ کی پیدائش حران میں ہوئی۔ وہ حنبلی فقہ کے سرگرم پیرو تھے ۔ دمشق میں انھیں شہرت حاصل تھی اور وہیں زندگی گزاری ۔ وہاں انھوں نے اولیا پرستی اور مزار پرستی کے خلاف آواز بلند کی ۔ انھیں کے اصول بعد میں وہابیوں نے اپنا لیے ، جو آج نجد و حجاز کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں مقتدر حیثیت حاصل کیے بیٹھے ہیں ۔ ابن تیمیہ اور ابن عساکر کی قبریں جامعۂ شام کے حلقے میں واقع ہیں ۔

ادب کا ایک اور نمونہ بروئے کار آیا ، جسے جوابی پروپیگنڈا کہا جا سکتا ہے ، یعنی یروشلم کے محاسن پر زور دیا گیا ۔ کہا گیا کہ اس کی زیارت کرنی چاہیئے اور رسول اللہ صلعم نے حرم یروشلم میں نماز کو دوسری مساجد کی نمازوں سے بدرجہا بہتر قرار دیا ہے صرف مکۂ معظّمہ اور مدینۂ منورہ کی مسجدیں مستثنیٰ رکھیں ۔ جامع اموی (دمشق) کا ایک خطیب بھی جس کا نام ابن فرکاح[۵۲] تھا (وفات ۱۳۲۹ء) انھیں خیالات کا پابند تھا ۔ اس کے پہلو بہ پہلو "ادب سیرت" نے فروغ پایا ، یعنی بعض عرب مشاہیر کے حقیقی یا خیالی کارناموں کی مدح و ستائش میں تاریخی رومان مرتّب کیے گئے ۔ صلاح الدین ، بیبرس اور عنترہ ان رومانوں کے ہیرو بن گئے ۔ عنترہ ظہور اسلام سے پیشتر کا ایک جنگجو شاعر تھا ، لیکن اس کی جو سیرت بارھویں صدی میں شام کے اندر مرتب ہوئی ، وہ بالکل عجیب و غریب چیز تھی ۔ قاہرہ ، بیروت ، دمشق اور بغداد کے قہوہ خانوں میں جو داستان گو داستانیں سنایا کرتے تھے ، وہ سیرت عنترہ یا سیرت الظاہر (بیبرس) سے جو واقعات بیان کرتے تھے ، وہ الف لیلہ کی کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ شوق اور توجہ سے سنے جاتے تھے ۔

جاگیرداری

شام میں فرنگیوں نے جو ریاستیں قائم کی تھیں ، وہ جاگیرداری کے اسی نظام پر مبنی تھیں ، جو یورپ میں رائج تھا ، لیکن بعض جاگیردار دیسی باشندے تھے ۔ شام میں جاگیرداری کا ایک نظام فتح اسلام کے وقت سے چلا آتا تھا ۔ فاتحین خواہ وہ خلیفہ تھے ، سلطان یا امیر ، اپنے سالاروں اور بلند پایہ عہدہ داروں کو جاگیریں (اقطاعات) دیتے تھے اور وہ اپنے ماتحتوں اور کسانوں میں زمینیں تقسیم کر دیتے تھے ۔ سب سے نچلا درجہ کسانوں اور غلاموں کا تھا ، جو کاشتکاری کرتے تھے غیر مسلموں سے مالیہ (خراج) وصول کرنے کا کام ذی اثر آدمیوں کو اجارے پر دے دیا جاتا تھا ۔ عبّاسی خلفاء نے زیادہ بولی دینے والے کو زمینیں دینے کے بجائے موروثی کاشتکاروں کا سلسلہ قائم کیا اور وہ لوگ مقررہ رقم سال بسال

---

۵۱ اس کے لیے دیکھیے کتی جلد اوّل ص ۴۸ ، ۴۹ ، نیز ہنری لاؤسٹ کی فرانسیسی کتاب

(مترجم ـــــ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متعلق مصنّف نے جو کچھ لکھا ہے ، اصولاً غلط ہے ۔ شیخ الاسلام نے صرف ان فرقوں کی سختی سے مذمت کی ، جو عقیدۃً باطل ہونے کے علاوہ بار بار دشمنوں سے مل کر حکومت کو اور اسلامی آبادیوں کو سخت نقصان پہنچا چکے تھے ۔ وہ خالص اور غیر مروج اسلام کے داعی تھے تفصیل کا یہ موقع نہیں) ۔

۵۲ ـــــ باعث النفوس لزیارت القدس المحروس ۔ ابن جوزی بغدادی نے بھی فضائل القدس کے نام سے ایک رسالہ لکھا ۔

دیتے جاتے تھے۔ فاطمیوں اور مملوکوں نے پہلا عمل جاری رکھا[1]۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں زمیندار امراء کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی جاگیروں میں مستحکم قلعے بنا لیے تھے۔ انھوں نے ایک طرف بادشاہوں سے اچھے تعلقات پیدا کر لیے۔ دوسری طرف انھیں اپنی جاگیر کے تمام افراد پر اقتدار حاصل تھا۔ اسلام میں ایسا کوئی طبقہ پیدا نہ ہُوا۔ جاگیردار عموماً شہروں میں رہتے تھے اور جو آمدنی جاگیروں سے ہو جاتی تھی اس پر قانع تھے۔ فرنگیوں نے جاگیرداری کا جو نظام جاری کیا تھا، مقامی طور طریقوں پر اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا[2]۔ البتہ ایوبیوں کے زمانے میں محدود فوجی جاگیرات کا سلسلہ جاری ہُوا اسے بھی حکمران اور رعایا کے درمیان زرعی تعلقات کا خاص ذریعہ تھا۔ فرنگیوں کی بادشاہی نے شام کے سیاسی اداروں پر کوئی مستقل اثر نہ چھوڑا، لیکن بادشاہی کے پہلو بہ پہلو جو مذہبی نظام جاری ہُوا تھا، وہ اب تک یروشلم کے لاطینی بطریق کی شکل میں موجود ہے۔

مشنری سرگرمیاں

صلیبی جنگوں کی ایک دلچسپ ضمنی پیداوار یہ تھی کہ مسیحی مشنریوں نے از سرِ نو تبلیغ شروع کر دی۔ ان جنگوں کی ناکامی نے سب کو یقین دلایا تھا کہ مسلمانوں کے تعلق میں جنگی ذرائع استعمال کرنا بالکل بے سود ہے اور ریمان لل[2] (وفات ۱۳۱۵ء) نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ مسیحیوں کو پُرامن ذرائع پر توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ یہ ہسپانیہ کے صوبہ قطلونیا (کیٹالونیا) کا باشندہ تھا اور اس نے مشرقی علوم والسنہ کے مطالعے پر خاص زور دیا، کیونکہ اکراہ و تشدد کی جگہ پُرامن وسائل سے کام لینے کا بہترین ذریعہ یہی تھا۔ وہی شخص ہے، جس نے صلیبی روح کو نئے دھارے کی صورت دی، یعنی مسلمانوں کے استیصال کے بجائے انھیں مسیحی بنایا جائے۔

مسیحیوں نے اس غرض سے جو ادارے بنائے، ان میں سے ایک کا نام کرمل تھا جس کی بنیاد ایک صلیبی نے ۱۱۵۶ء میں رکھی تھی اور جس مقام پر بنیاد رکھی تھی، اسی سے یہ ادارہ منسوب ہُوا۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں مزید دو نظام وجود پذیر ہوئے ایک فرانسسکن[3]، دوسرا ڈومینیکن[4]۔ ان کے نمائندے بھی مختلف شامی شہروں میں مقیم تھے۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں بمقام بیروت فرانسسکن کا ایک بڑا گرجا موجود تھا[5]۔ ۱۲۱۹ء میں فرانسسکن نظام کا بانی سینٹ فرانسس مصر پہنچا اور ایوبی دربار میں پہنچ کر الملک الکامل سے بے نتیجہ مذہبی گفتگو کی۔ ڈومینیکن کے ایک اسقف ولیم طرابلسی نے ایک عالمانہ رسالہ لکھا۔ اس میں وہ نکات بیان کیے، جن پر مسیحیت اور اسلام کا اتفاق تھا۔ اس رسالے میں یہ نقطۂ نگاہ بھی پیش کیا کہ ارضِ مقدس کی بازیافت کے لیے سپاہیوں کے بجائے مشنریوں کو کام کرنا چاہیے۔ ولیم صوری کی طرح یہ بھی شام میں پیدا ہُوا تھا، البتہ اس کے ماں باپ یورپی تھے۔

---

[1] قلقشندی جلد ۳، ص ۴۳ سے آگے، نیز ص ۱۳۹ سے آگے، پولیاک Poliak کی کتاب بھی دیکھیے فیوڈلزم Feudalism in Egypt

[2] Syria, Palestine, and the Lebanon [2] Raymond Lull

[3] Franciscan [4] Dominican

[5] صلیح ص ۱۳۹، اینلارٹ جلد ۲ ص ۷۹۔

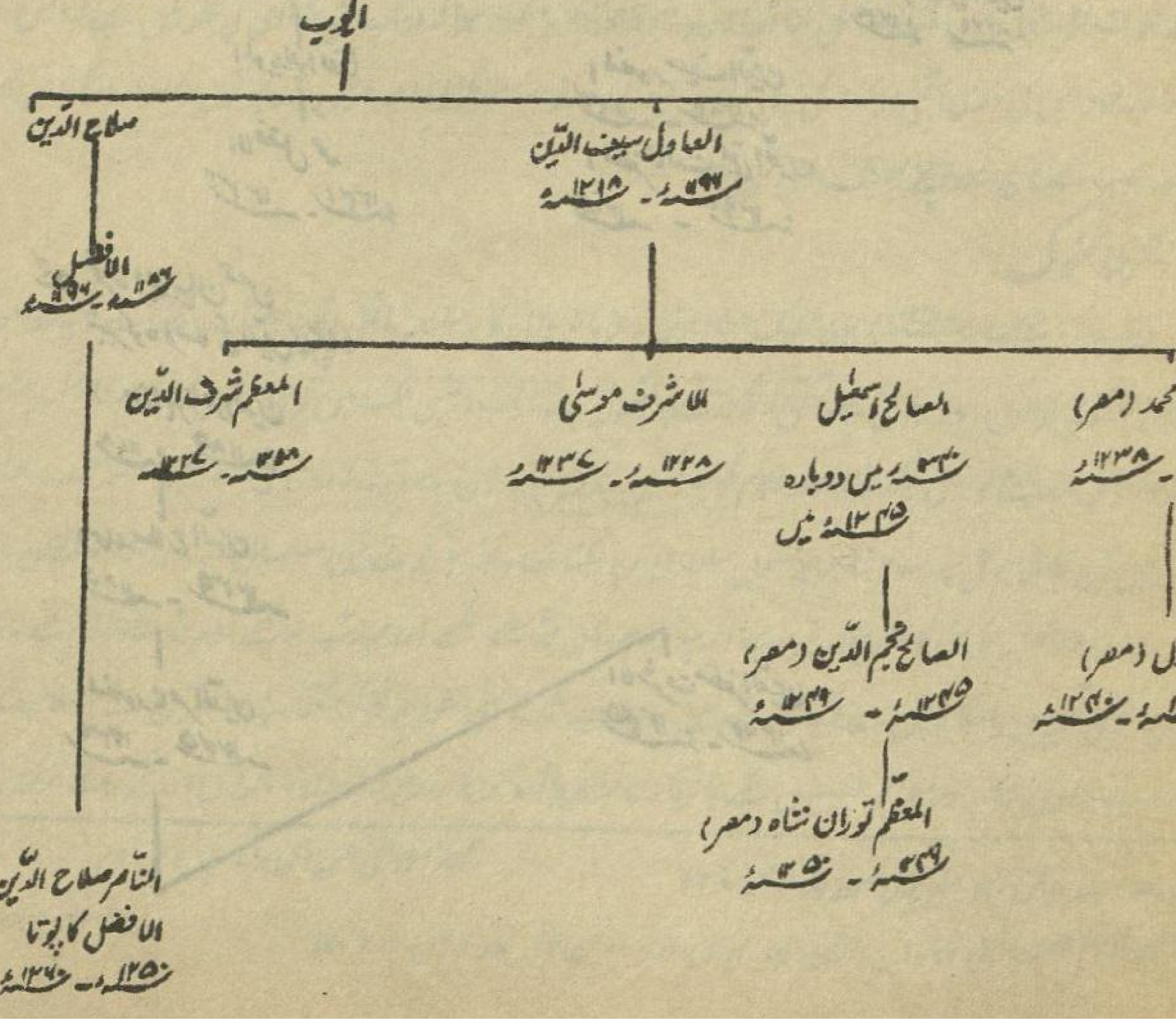
سینتالیسواں باب

ایوبی اور مملوک

صلاح الدین نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ دریائے نیل سے دریائے دجلہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ جانشینوں نے اس کے حصے بخرے کر لیے، لیکن ان میں سے کوئی بھی صلاح الدین کے اوصاف و خصائص سے بہرہ مند نہ تھا۔ اس کا بیٹا الملک الافضل دمشق کے تخت پر بیٹھا، لیکن ۱۱۹۶ء میں اس کا چچا العادل فرمانروائے مصر اس پر قابض ہو گیا۔ ۱۲۵۰ء میں دمشق کی شاخ حلب کی شاخ میں ضم ہو گئی اور تقریباً دس سال بعد اسے تاتاری سیل نے آغوش میں لے لیا۔[۱] صلاح الدین کا دوسرا بیٹا العزیز مصر میں باپ کا جانشین بنا (۱۱۹۳ء ۔ ۱۱۹۸ء) لیکن ۱۱۹۸ء میں العادل ہی نے اس کی بھی جگہ لے لی۔ دونوں صورتوں میں اس نے بھتیجوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھایا۔ یہی خاندانی اختلافات تھے، جن کی وجہ سے فرنگیوں کو چھنے ہوئے علاقوں کا کچھ حصہ واپس لے لینے کا موقع مل گیا۔ ۱۲۱۰ء میں العادل نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کو عراق کا حاکم بنایا۔ صلاح کا تیسرا بیٹا الظاہر حلب میں باپ کا جانشین

---

[۱] شجرہ ایوبیان دمشق



ہوا۵۰ صلاح الدین کے ایک بھتیجے نے حماہ میں ایک چھوٹی سی حکومت قائم کی، جو ۱۲۶۰ء کی تاتاری یورش کے بعد بھی باقی رہی۔ حالانکہ اس یورش نے عباسی خلافت کو دو سال پیشتر بالکل برباد کر ڈالا تھا بلکہ یہ شاخ مملوکوں کے ماتحت بھی ۱۳۴۱ء تک بدستور قائم رہی اور خاندان نے جتنی شاخیں قائم کیں، ان سب سے زیادہ پائیدار ثابت ہوئی۵۱ اسی خاندان سے مشہور مؤرخ ابوالفدا کا تعلق تھا (وفات ۱۳۳۲ء)۔۵۲ ایک اور چھوٹی شاخ جس نے حمص میں حکومت قائم کی صلاح الدین کے ایک چچا کی نسل سے تھی اسے مملوک سلطان بیبرس نے ۱۲۶۲ء میں ختم کیا۵۳ ایک شاخ نے بعلبک میں حکومت کی طرح ڈالی تھی۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب صلاح الدین کے بھائی توران شاہ سے ملاتے تھے۔

---

۵۰ شجرہ ایوبیان حلب

صلاح الدین
|
الظاہر غیاث الدین
۱۱۸۶ء - ۱۲۱۶ء
|
العزیز غیاث الدین
۱۲۱۶ء - ۱۲۳۶ء
|
الناصر صلاح الدین
۱۲۳۶ء - ۱۲۶۰ء

۵۱ شجرہ ایوبیان حماہ

نور الدین شہنشاہ
|
المظفر اول تقی الدین
۱۱۷۸ء - ۱۱۹۱ء
|
المنصور ناصر الدین
۱۱۹۱ء - ۱۲۲۰ء

الناصر صلاح الدین
۱۲۲۰ء ۱۲۲۹ء

المظفر علی
|
المنصور سیف الدین
۱۲۴۴ء - ۱۲۸۴ء
المظفر ثالث تقی الدین
۱۲۸۴ء - ۱۲۹۸ء

المؤید ابوالفدا
|
الافضل محمد
۱۳۳۲ء - ۱۳۴۱ء

۵۲ و ۱۲۹۹ء سے ۱۳۱۰ء تک وقفہ رہا جس میں گورنر مملوکوں کے ماتحت حکومت کا کاروبار چلاتے رہے

۵۳ شجرہ ایوبیان حمص

شیرکوہ (صلاح الدین کا چچا)

القاہر ناصر الدین
۱۱۷۸ء - ۱۱۸۵ء
|
المجاہد صلاح الدین
۱۱۸۵ء - ۱۲۳۹ء
|
المنصور ناصر الدین
۱۲۳۹ء - ۱۲۴۵ء
|
الاشرف مظفر الدین
۱۲۴۵ء - ۱۲۶۳ء

ایوبیوں کی جگہ مملوک

ایوبیوں کی تمام شاخوں میں سے شاخِ مصر کو سب پر برتری حاصل تھی۔ اس شاخ میں سے بعض سلطان دمشق اور قاہرہ دونوں پر قابض رہے۔ انھیں میں سے ایک الملک الصالح نجم الدین ایوب تھا جس نے نومبر ۱۲۴۹ء میں وفات پائی اور مشہور ملکہ شجرۃ الدرّ اسی کی بیوی تھی۔ شجرۃ الدرّ ابتدا میں مستعصم باللہ خلیفہ بغداد کے حرم میں کنیز تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اصلاً ترک تھی یا ارمنی۔ وہاں سے وہ الملک الصالح نجم الدین ایوبی فرمانروائے مصر کے ہاں پہنچی اس کے بطن سے بیٹا پیدا ہوا تو الملک الصالح نے اسے آزاد کر دیا اس نے اپنے شوہر کی وفات تین مہینے تک کسی پر ظاہر نہ ہونے دی انتظار یہ تھا کہ اس کا بیٹا توران شاہ عراق سے واپس آ جائے مملوک توران شاہ پر راضی نہ ہوئے اور اسے قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بارے میں ملکہ نے بھی چشم پوشی سے کام لیا بعد ازاں ملکہ نے ہمت کی اور اپنی فرمانروائی کا اعلان کر دیا[54] دمشقی شاخ کے ایک شش سالہ بچے الاشرف موسیٰ کو ملکہ کا شریک حکومت بنا دیا گیا۔ اسی دن تک شجرۃ الدرّ تمام معاملات کی مختار رہی۔ شمالی افریقہ اور مشرقی ایشیا میں وہ تنہا مسلمان خاتون تھی، جس نے فرمانروائی کا درجہ حاصل کیا اور اس سے پیشتر زنوبیا اور کلیئو پیٹرا فرمانروائی میں بڑی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے نام کے سکّے جاری کیے۔ خطبے میں بھی اس کا نام لیا جانے لگا۔ جب اس کے سابق آقا خلیفہ بغداد نے ایک سخت تحریر امرائے مصر کے پاس بھیجی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر تمھارے ہاں کوئی مرد اس قابل نہیں رہا کہ حکمرانی کا کاروبار سنبھال سکے تو ہمیں بتاؤ ہم یہاں سے کسی کو بھیج دیں[55] تو ان امرا نے باہم مشورہ کر کے سالارِ اعظم کو سلطان تجویز کر لیا۔ شجرۃ الدرّ نے یہ صورت حال دیکھی تو فوراً نئے سلطان سے شادی کر لی ایبک نے حکومت کے پہلے سال ایوبیوں کے شامی حامیوں کو ختم کرنے میں صرف کر دیے جو سمجھتے تھے کہ خاندانی سلطنت کے اصل مالک وہ ہیں۔ پھر ایبک نے الملک الاشرف کو معزول کیا جو بچہ تھا اور اس سالار کو بھی الگ کر دیا، جس نے لوئی نہم کے خلاف لڑائیوں میں امتیاز حاصل کیا تھا جب شجرۃ الدرّ کو یہ معلوم ہوا کہ ایبک نئی شادی کی فکر میں ہے تو اس نے اسے حمام میں قتل کرا دیا۔ اب خود اس کی باری آ گئی ایبک کی پہلی بیوی کی لونڈیوں نے اسے پکڑ لیا اور لکڑی کے جوتوں سے مار مار کر اس کا بھیجا نکال دیا اور لاش قلعہ قاہرہ کے برج سے نیچے پھینک دی گئی[56]

بحری مملوک

ایبک (۱۲۵۰ء تا ۱۲۵۷ء) پہلا مملوک سلطان تھا۔ فرمانروائی کا یہ سلسلہ بالکل یگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ غلاموں کا خاندان تھا اور غلام بھی مختلف قوموں اور نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، جنھوں نے ایک اجنبی ملک میں فوجی برتری کا نظام قائم کر لیا۔ جب کوئی مر جاتا تو بار ہا ایسا ہوتا کہ اس کے بیٹے کو نہیں بلکہ تنخواہ دار غلام کو جانشین بنا دیا جاتا جس نے اپنے کارناموں سے شہرت و عظمت حاصل کر لی ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں آج کا غلام کل سپہ سالار اور پرسوں سلطان بن سکتا تھا۔ تقریباً پونے تین سو سال تک یہ غلام سلطان دنیا کے نہایت سرکش حصوں پر بہ زورِ شمشیر حکمرانی کا سکہ چلاتے رہے اگرچہ وہ چنداں پڑھے لکھے اور مہذب نہ تھے اور بڑے ظالم تھے۔ تاہم انھوں نے قاہرہ کو بعض ایسی تعمیری یادگاروں سے آراستہ کیا جن پر وہ اب تک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے انھوں نے اسلام کے لیے دو اور کارنامے انجام دیے۔ اول شام اور مصر کو صلیبیوں کے باقیات سے پاک کر دیا۔ دوم ہلاکو کے تاتاریوں اور تیمور کے ترکوں کی پیش قدمی روک

---

[54] ابوالفدا جلد ۳ ص ۱۹۰۔ مقریزی خطط جلد ۲ ص ۲۳۷

[55] سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۲۹

[56] قلعے کا نام قلعۃ الجبل تھا۔ ابن خلکان جلد ۴ ص ۱۳۴، ابن الاثیر جلد ۱۰ ص ۱۹۰، ۱۹۰

دی۔ اگر یہ خدمات انجام نہ پاتیں تو مصر اور مغربی ایشیا کی تاریخ اور ثقافت کا رنگ بالکل مختلف ہوتا۔

یہ غلام اسلامی روس اور کیشیا کی منڈیوں میں اس غرض سے خریدے گئے تھے کہ ایوبی سلطان الملک الصالح کے لئے باڈی گارڈ تیار کر لی جائے[1] ابتدائی دور کے مملوک حکمرانوں کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ یہ گروہ خواہ مخواہ خاندانوں میں بٹ گیا، اول بحری مملوک (۱۲۵۰ء-۱۳۹۰ء) دوسرے برجی مملوک (۱۳۸۲ء-۱۵۱۷ء) بحری نام اس لئے مشہور ہوا کہ یہ لوگ دریائے نیل کے ایک جزیرے میں رکھے گئے تھے، جہاں ان کے لئے بارکیں بنا دی گئی تھیں۔ دریا کی وجہ سے انھیں بحری کہنے لگے[2] یہ زیادہ تر ترک اور تاتاری تھے۔ برجی مملوک زیادہ تر سر کیشیا کے تھے[3] ان کے ظہور سے دس سال بعد تاتاریوں کی آمد آمد شروع ہو گئی اور شام پھر ایک مرتبہ دو متحارب فریقوں کا میدان جنگ بن گیا۔

تاتاریوں کی یورش

خلافت بغداد اور حشیشیوں کے عقابی گھونسلے الموت کی تباہی کے بعد تاتاری لشکر چنگیز کے پوتے ہلاکو کے زیر سرکردگی شمالی شام میں نمودار ہوئے حلب ان کی یورش کا پہلا ہدف بنا۔ پچاس ہزار باشندے تہ تیغ کئے گئے یہ ان حالات کا ایک سرسری ابتدائی مرقع تھا جو اس نئے خطرے میں اہل شام کو پیش آنے والے تھے۔ اس کے بعد تاتاریوں نے حارم اور حماہ پر قبضہ کر لیا اور ایک سالار کو محاصرۂ دمشق کے لئے بھیج دیا گیا۔ خود ہلاکو ایران لوٹ گیا کیونکہ اس کے بھائی خان اعظم کا انتقال ہو چکا تھا۔ لاطینی انطاکیہ تاتاریوں کے ساتھ مل گیا۔ لوئی نہم اور پوپ دونوں کی رائے تھی کہ حملہ آوروں سے اتحاد مسلمانوں کے خلاف لڑائیوں میں مفید ثابت ہو گا تاتاریوں کا مذہب شمنیت تھا۔ یہی مذہب ان کے ترک ہم قوموں کا تھا، لیکن ان میں سے بعض لوگ مسیحی والدین کی اولاد تھے، جنھیں شامی مشنریوں نے بہت پہلے مسیحی بنا لیا تھا جس سالار نے شام کو بہت بری طرح پامال کیا اور لوٹا، وہ خود عیسائی تھا اور اس کا نام کتبغا تھا۔ مملوک حکمران قطز (۱۲۵۹ء-۱۲۶۰ء) نے ہلاکو کے بھیجے ہوئے سفیروں کو قتل کرا دیا[4] ناصرہ کے قریب عین جالوت کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں بیبرس نے قطز کی ہراول فوج کے ساتھ تاتاریوں پہ حملہ کیا اور انھیں تباہی خیز شکست دی۔ کتبغا کی لاش مقتولوں میں ملی[5] بیبرس کو امید تھی کہ اس جنگی خدمات کے صلے میں حلب کی جاگیر دی جائے گی، لیکن قطز نے یہ امید پوری نہ کی۔ شام سے مصر جاتے ہوئے بیبرس کے ایک ہمراز نے قطز سے بات چیت شروع کی اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا، خود بیبرس نے قطز کا کام تمام کر دیا اور قاتل مقتول کا جانشین ہوا۔

بیبرس مملوک فرمانرواؤں میں بہ اعتبار ترتیب چوتھا تھا، لیکن وہ پہلا جلیل القدر مملوک تھا جس نے ان حکمرانوں کی بنیاد مستحکم کی۔ اسے پہلی کامیابی تاتاریوں کے خلاف جنگ میں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تمام کارناموں میں ممتاز ترین کارنامہ یہ ہے کہ صلیبیوں

---

[1] ابوالفدا جلد ۳ ص ۱۸۸، ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۷۲

[2] بول چال میں نیل کو بحر کہا جاتا ہے

[3] ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۶۹، سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۸۰

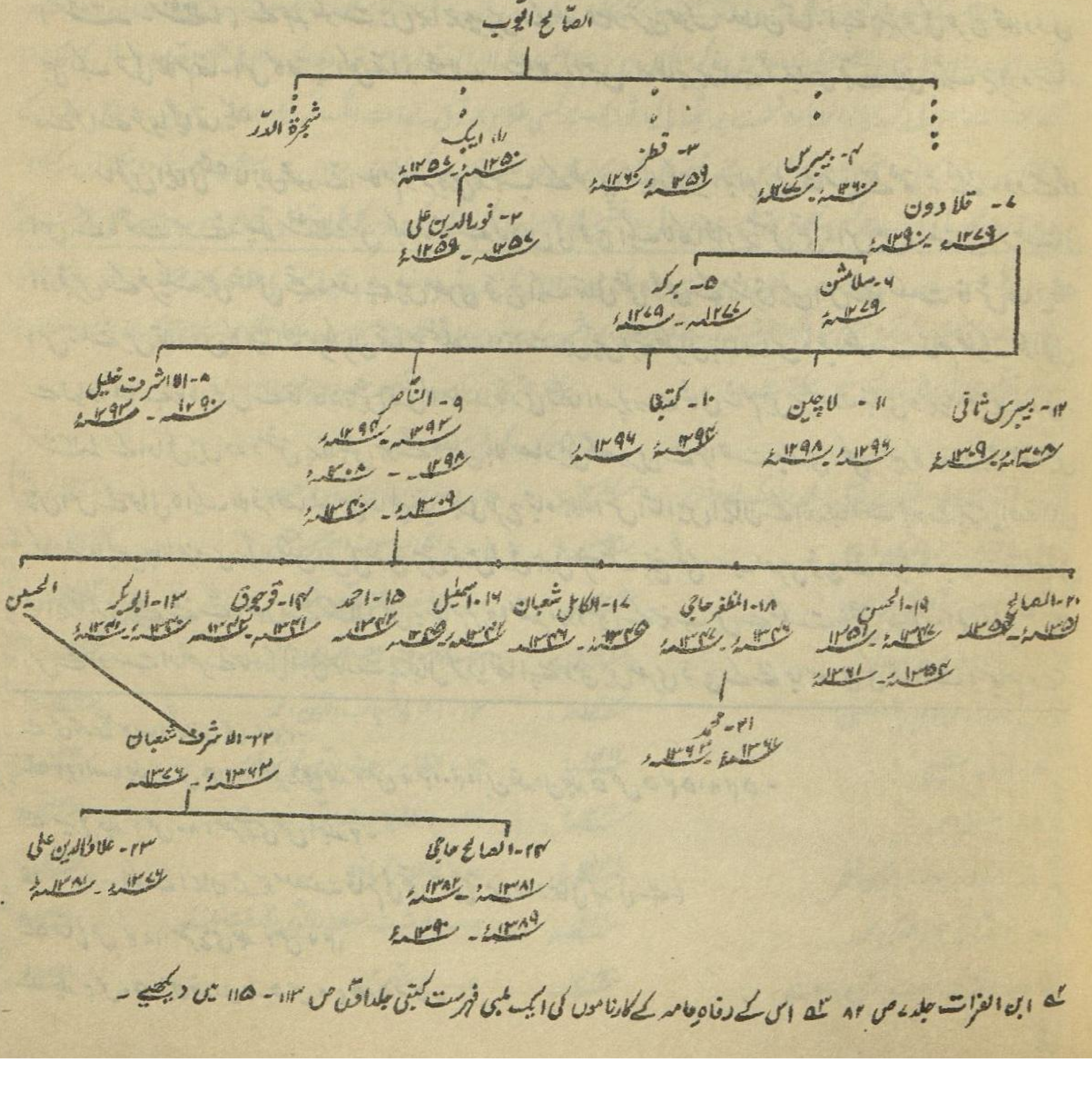
[4] جو خط وہ قطز کے پاس لائے تھے، وہ مقریزی میں محفوظ ہے (مترجم)۔ قطز نے اس بنا پر بھی سفیروں کو قتل کرا دیا تھا کہ ان کی روش بڑی گستاخانہ تھی وہ بیباکانہ دھمکیاں دیتے تھے۔ قتل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قطز ملوں سے لڑنے پر تلا بیٹھا تھا وہ جانتا تھا کہ دونوں صورتوں میں تباہی ہے لیکن مردانہ وار لڑ کر جان دے دینا اسے بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ سفیروں کے قتل کے بعد اسے یقین تھا کہ صلح کے لئے کسی گفتگو کا امکان نہ رہے گا اور لڑائی ناگزیر ہو جائے گی۔ یہی وہ چاہتا تھا۔

[5] ابوالفدا جلد ۳ ص ۲۰۱، ۲۱۴، مقریزی جلد ۱ ص ۹۸-۱۰۴، ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۴۴۔

کے خلاف اس نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں[۵] وہ محض جنگجو ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ درجے کا منتظم بھی تھا۔ اس نے نہر کھدوائیں، بندرگاہوں کی اصلاح کی، مصر و شام کے مرکزوں کو ایک عمدہ سڑک کے ذریعے سے ملا دیا جس پر تیز رفتار ڈاک گاڑیاں جاتی آتی رہتی تھیں۔ یہ انتظام ایرانیوں اور عباسیوں کے نمونے پر کیا گیا تھا۔ مصر سے شام اور شام سے مصر جانے آنے کا انتظام اتنا عمدہ تھا کہ بیبرس ہفتے کے شروع میں دمشق میں چوگان کھیلنے کے بعد روانہ ہو جاتا اور ہفتے کے اواخر میں قاہرہ چوگان جا کھیلتا[۶] اس نے رفاہ عامہ کے بہت سے منصوبے پورے کرائے۔ پرانی تاریخی مسجدوں کی مرمت کرائی جن میں قبۃ الصخرا بھی شامل تھا۔ پرانے قلعے درست کرائے۔ ان میں حلب کا قلعہ بھی شامل تھا اور بہت سے مذہبی و خیراتی اوقاف کا بندوبست کیا[۷] دمشق میں اس کا مقبرہ آج کل ایک کتب خانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جسے الظاہریہ کہتے ہیں۔ اس کتب خانے میں دنیا کا ایک قدیم ترین مخطوطہ موجود ہے جو کاغذ پر لکھا گیا، یعنی مسائل

---

[۱] بحری مملوکوں کا شجرہ ذیل میں درج ہے۔



[۵] ابن الفرات جلد ۷، ص ۹۲ [۶] اس کے رفاہ عامہ کے کارناموں کی ایک لمبی فہرست کتبی جلد اول ص ۱۱۳ - ۱۱۵ میں دیکھیے۔

امام احمد بن حنبل رح اور اس پر ۲۲۶ھ (۸۴۰ء - ۸۴۱ء) کی تاریخ ثبت ہے[1]

تاتاریوں کا خطرہ صرف عارضی طور پر ٹل گیا تھا۔ وہ اپنے ابتدائی مسکن یعنی وسط ایشیا سے ان قوتوں کی کارفرمائی کے باعث نکلے تھے، جن کا صحیح اندازہ اب تک نہیں کیا گیا۔ وہاں سلطنت چین کی سرحدوں تک پھرتے رہتے تھے۔ پھر باہر نکلے تو مختلف لہروں کی شکل میں نکلے اور ان کا خروج دیکھ کر ابتدائی دور کے سامیوں اور ٹیوٹانیوں کے خروج کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ہلاکو کے بیٹے اور جانشین اباقا نے تبریز کو مرکز حکومت بنایا اور از سر نو شام پر حملے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں تاتاری مسیحیت کے ساتھ ساز باز میں لگے ہوئے تھے۔ اباقا نے یورپ نیز ایڈورڈ اول شاہ انگلستان اور دوسرے یورپی حکمرانوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ جس کا مدعا یہ تھا کہ از سر نو صلیبی مہم کا انتظام کیا جائے اور مملوکوں کو شام سے نکال دیا جائے۔ اگرچہ تاتاری فوج کی تعداد زیادہ تھی اور ارمنستانی، گرجستانی اور ایرانی بھی ان کے معاون بن گئے تھے، تاہم ۱۲۸۱ء میں انھوں نے بمقام حمص شکست فاش کھائی[2] یہ حملہ قلاوون (۱۲۷۹ء - ۱۲۹۰ء) کے عہد حکومت میں ہوا جو بیبرس کے بعد ممتاز ترین مملوک سلطان تھا۔ اپنے پیشرو کی طرح قلاوون بھی ایک ترکی غلام تھا۔ اس کا لقب الفی تھا (۱۲۷۹ء - ۱۲۹۰ء) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھاری قیمت یعنی ایک ہزار دینار دے کر اسے خریدا گیا تھا[3]

ساتویں ایلخانی[4] غازان محمود نے اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر اختیار کر لیا، بایں ہمہ شام پر حملے ختم نہ کیے۔ دو حملے خود اس کے ماتحت ہوئے۔ پہلا ۱۲۹۹ء میں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں ارمنستانی، گرجستانی اور قبرص کے فرنگ بھی شامل تھے۔ مقابلے میں مصری فوج ایک تہائی تھی۔ حمص کے مشرق میں اس نے شکست فاش کھائی[5] اس زمانے میں قلاوون کا بیٹا الناصر حکمران تھا جو مختلف اوقات میں تین مرتبہ حکمران بنا اور اس کا عہد حکومت تمام مملوک حکمرانوں سے زیادہ لمبا ہے تاتاریوں نے فاتحانہ پیش قدمی کا سلسلہ جاری رکھا اور پورے شمالی شام میں ہر سمت تباہی و بربادی پھیلا دی۔ ۱۳۰۰ء کے اوائل میں وہ دمشق پر قابض ہو گئے، لیکن بالا حصار میں محصورین نے مزاحمت جاری رکھی۔ شہر کا بیشتر حصہ جس میں اس کے حوالی کا ایک علاقہ الصالحیہ بھی شامل تھا بری طرح تباہ ہوا۔ اس اثناء میں ایران کے اندر بغاوت پھوٹ پڑی اور غازان کے لئے واپس جانا ضروری ہو گیا۔ لیکن اس کی فوج پیش قدمی کرتی ہوئی غزہ تک پہنچ گئی۔ اب مصری فوج نے دوبارہ جارحانہ اقدام شروع کیا اور تاتاری پیچھے ہٹنے لگے۔ انھوں نے ۱۳۰۳ء میں بمقام مرج الصفر، جو دمشق کے جنوب میں ہے شکست فاش کھائی۔ ابو الفداء[6] جسے اس کے دوست الناصر نے حماہ کی آبائی امارت پر بحال کر دیا تھا اپنے وطن میں مصری فوج کے لئے جاسوسی کی خدمات انجام دیتا

---

[1] حتی تاریخ عرب انگریزی ص ۲۴۷۔

[2] ابو الفدا جلد ۴ ص ۱۵، ۱۶، مقریزی جلد ۲ ص ۲۶، ۳۴، ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۹۵، ۳۹۶۔

[3] سیوطی جلد ۲ ص ۸۰، مقریزی ص ا جلد ۲۔

[4] (مترجم۔ ہلاکو نے ایران میں جو سلطنت قائم کی تھی، تاریخ میں وہ ایلخانی کہلاتی ہے۔)

[5] صالح ص ۷۴، ۱۷، مقریزی جلد ۲ ص ۱۴۶

[6] جلد ۴ ص ۵۰، ابن خلدون جلد ۵ ص ۴۰۸، ۴۰۹۔

رہا اور اس نے تاتاری فوج کی نقل و حرکت کے متعلق پوری اطلاعات بہم پہنچائیں اس طرح شام پر تاتاری حملے کی چوتھی کوشش بھی ناکام رہی ظہورِ اسلام کے بعد مصر کے لئے ایسا خوفناک اور زبردست دشمن کوئی پیدا نہیں ہوا تھا جیسے تاتاری تھے۔ مملوکوں نے اس دشمن کو بری طرح شکست دی۔

صلیبی جنگوں کی طرح تاتاری یورشیں بھی اقلیتوں کے لئے تباہی خیز ثابت ہوئیں۔ لبنان کے دروزیوں نے بارہ ہزار تیر انداز تیار کر کے تاتاریوں کے ساتھ کر دیے تھے جو سنہ ۱۳۰۳ء میں پیچھے ہٹتی ہوئی مصری فوج کے لئے ہراس کا باعث بنے رہے۔ اب ان کے محاسبے کا وقت آگیا۔ ارمنوں نے اپنے بدنصیب وطن کو سنہ ۱۳۲۱ء اور اس کے بعد الناصر کے ہاتھوں بار بار تباہ ہوتے دیکھا مسیحی اور یہودی آبادیوں پر بھی سختیاں ہوئیں[1]

برجی مملوک

الناصر کے بعد بیالیس سال میں (سنہ ۱۳۴۰ء - سنہ ۱۳۸۲ء) یکے بعد دیگرے بارہ افراد تخت حکومت پر بیٹھے اور ان میں سے ایک بھی میدان عمل میں ممتاز حیثیت حاصل نہ کر سکا ان میں سے آخری حکمران الصالح حاجی تھا وہ ایک نااہل طفل تھا۔ دو سال کی حکومت کے بعد اسے معزول کر دیا گیا دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا تو ایک چرکسی غلام برقوق نے اسے الگ کر دیا۔ اسی برقوق سے برجی مملوکوں کے خاندان کی ابتدا ہوئی۔ انھیں "برجی" اس لئے کہتے ہیں کہ ابتدا میں وہ قلعۂ قاہرہ کے مختلف برجوں میں متعین تھے[2] دو حکمرانوں کے سوا جو یونانی تھے باقی سب چرکسی تھے انھوں نے موروثی جانشینی کا اصول بالکل ترک کر دیا۔ یہ کل حکمران تنئیس تھے جن میں سے چودہ یا لکل بے حیثیت تھے

---

[1] (مترجم۔ مصیبت یہ ہے کہ مصنف اقلیتوں پر سختیوں کا ذکر ایسے انداز میں کرتا ہے گویا انھیں سب کچھ غیر مسلم یا عقائد کے اعتبار سے غلط اندیش مسلمانوں کی حیثیت میں سختیوں کا تختہ مشق بنایا گیا حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ہر دشمن کے ساتھ ہو جاتے تھے پہلے صلیبیوں کے ساتھ ہوئے پھر تاتاریوں کے ساتھ ظاہر ہے کہ وہ غداری کی سزا سے بچ نہیں سکتے تھے۔)

[2] مقریزی کتاب الخطط جلد دوم ص ۲۲۱

برجی مملوک کی فہرست

۱۔ الظاہر سیف الدین برقوق (کچھ دیر کے لئے وقفہ)	سنہ ۱۳۸۲ء	۱۰۔ العزیز جمال الدین یوسف	سنہ ۱۴۳۸ء
۲۔ الناصر ناصر الدین فرج	سنہ ۱۳۹۸ء	۱۱۔ الظاہر سیف الدین جقمق	سنہ ۱۴۳۸ء
۳۔ المنصور عز الدین عبد العزیز	سنہ ۱۴۰۵ء	۱۲۔ المنصور فخر الدین عثمان	سنہ ۱۴۵۳ء
(ناصر فرج دوبارہ)	سنہ ۱۴۰۶ء	۱۳۔ الاشرف سیف الدین اینال	سنہ ۱۴۵۳ء
۴۔ خلیفہ العادل المستعین	سنہ ۱۴۱۲ء	۱۴۔ المؤید شہاب الدین احمد	سنہ ۱۴۶۰ء
۵۔ المؤید شیخ	سنہ ۱۴۱۲ء	۱۵۔ الظاہر سیف الدین خوش قدم	سنہ ۱۴۶۱ء
۶۔ المظفر احمد	سنہ ۱۴۲۱ء	۱۶۔ الظاہر سیف الدین بلبائے	سنہ ۱۴۶۷ء
۷۔ الظاہر سیف الدین ططر	سنہ ۱۴۲۱ء	۱۷۔ الظاہر تمربغا	سنہ ۱۴۶۷ء
۸۔ الصالح ناصر الدین محمد	سنہ ۱۴۲۱ء	۱۸۔ الاشرف سیف الدین قائت بلئے	سنہ ۱۴۶۸ء
۹۔ الاشرف سیف الدین برسبائے	سنہ ۱۴۲۲ء	۱۹۔ الناصر محمد	سنہ ۱۴۹۵ء

مثلاً ۱۳۴۱ء کے ایک سال میں یکے بعد دیگرے تین حکمران بدلے اور ان میں سے چند ہی نکلیں گے جو طبعی موت مرے ہوں، قلاؤن کا عہدِ حکومت (۱۲۷۹ء - ۱۲۹۰ء) سب سے لمبا اور بعض حیثیتوں میں سب سے بڑھ کر کامیاب تھا۔

نیا عہدِ حکومت پہلے سے بہتر نہ تھا۔ رشوت، سازشوں، قتل اور بدنظمی کا بازار بدستور گرم رہا۔ بعض سلطان بالکل نااہل اور غدار تھے۔ بعض کی اخلاقی حالت بڑی پست تھی۔ زیادہ تر ان پڑھ تھے۔ صرف ایک برقوق کا باپ مسلمان تھا[51] برسبائے (۱۴۲۲ء - ۱۴۳۸ء) ابتدا میں برقوق کا غلام تھا اسے عربی بالکل نہیں آتی تھی[52] اس نے اپنے دو خاص طبیبوں کے سر اس لئے قلم کردیے کہ وہ ایک مہلک مرض کا علاج نہ کرسکے۔ جس میں برسبائے مبتلا تھا۔ برقوق کا ایک اور غلام اینال (۱۴۵۳ء - ۱۴۶۱ء) دستخط بھی نہیں کرسکتا تھا اور سرکاری دستاویزوں پر دستخط حاصل کرنے کے لئے پہلے اس کا کاتب خاص نام لکھ دیتا اور اس کی نقل برسبائے کرتا۔ یہ معاصر مؤرخ ابن تغری بردی کا بیان ہے[53] ادارہ غلمان غیر فطری جنسی تعلقات کے لئے عباسیوں کے دور کی طرح پھر فروغ پر آگیا۔ بہت سے مملوکوں پر، جن میں بیبرس بھی شامل تھا، اس علت کا الزام لگایا جاتا تھا۔ صرف سلطان ہی نہیں بلکہ ان کے ماتحت امیر بھی کم و بیش خرابیوں میں مبتلا تھے۔ قابل ترین افسر کو بھی تین سال سے زیادہ برسرکار رہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک قاضی دس مرتبہ ہی مقرر اور دس مرتبہ معزول ہوا۔

شام کا نظم و نسق

مملوک حکومت بے شبہ ایک یگانہ چیز ہے لیکن ان کے عہد کا نظم و نسق وہی تھا جو فاطمیوں اور عباسیوں کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ شام کو نصف درجن صوبوں میں تقسیم کرلیا گیا تھا اور انھیں نیابات (واحد نیابہ) کہتے تھے۔ ایوبیوں کے زمانے میں بھی عام تقسیم یہی تھی۔ چھ صوبے یہ تھے۔ حلب، حماہ، دمشق، طرابلس، صفد، الکرک۔ ابتدا میں سلطانوں کے غلام صوبوں کے گورنر بنائے جاتے تھے اور ان کا تعلق فوج سے ہوتا تھا (ارباب السیوف تھے[54]) اس خدمت پر اہلِ علم (ارباب الاقلام) مامور نہیں ہوتے تھے گورنر ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہوتے تھے۔ وہ بھی چھوٹے پیمانے پر اسی طرح دربار کا سلسلہ قائم رکھتے تھے، جیسا قاہرہ میں تھا۔ مرکزی حکومت کی رقابتوں اور اختلاف آرائیوں کا اثر صوبوں میں بھی منعکس ہوتا تھا۔ جب ایک مملوک سلطان کی جگہ دوسرا مسند نشین ہوتا تو دمشق یا کسی دوسرے صوبے کا گورنر بغاوت کر دیتا تھا[55] عرب لبنان قبیلہ تنوخ کے بحتریوں کو بطور جاگیر دے دیا گیا تھا جو وہاں کے مقامی سردار تھے[56] دمشق کو تاریخی پس منظر کے باعث دوسرے صوبوں پر فوقیت حاصل تھی۔ بیبرس جس نے مملوک سلطنت کو منظم کیا۔ عموماً دمشق ہی میں دربار منعقد کرتا تھا۔ دمشق کے ایک گورنر تنگز (۱۳۱۲ء - ۱۳۳۹ء) کو الناصر کے تیسرے عہد حکومت میں شام کا نائب السلطنت تسلیم کر لیا گیا تھا۔

---

[51] سیوطی، حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۸۸

[52] تنہا وہی نہیں تھا جسے عربی نہیں آتی تھی، دیکھئے اخبار الاول فی من تصرف فی مصر من الدول

[53] جلد ۷، ص ۵۵۹ [54] قلقشندی جلد ۹ ص ۲۵۳

[55] علی ابراہیم حسن دراسات فی تاریخ المملوک البحریہ ص ۲۴۸ - ۲۵۳

[56] صالح ص ۸۱۔

مملکتِ دمشق کے علاوہ فلسطین بھی اس کے ماتحت تھا[51] صرف صفد اور الکرک چھوٹے چھوٹے صوبے الگ تھے اور دمشق کا صوبہ، شمالی جانب بیروت، حمص اور تدمر تک پھیلا ہوا تھا۔ تنگز نے یروشلم کے لیے پانی کا انتظام کیا۔ بیروت کے برج کو بحال کر دیا اور وہاں سرائیں اور حمام تعمیر کرائے[52] بہت دیر تک حکومت کر چکنے کے بعد، جو اہلِ ملک کے لیے فائدہ رساں تھی، تنگز کا اختر تقدیر زوال میں آگیا۔ وہ پہلے اسکندریہ میں قید ہوا، وہیں اسے موت کی سزا دی گئی[53]

قحط اور طاعون

مملوکوں کے پورے عہدِ حکومت میں بار بار خشک سالی، قحط اور وبا سے سابقہ پڑتا رہا۔ زلزلوں نے بھی عام تباہی میں حصّہ لیا۔ اس عہد کے تمام وقائع کے صفحات رنج والم اور تباہی کی رودادوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس دور کے ممتاز مؤرخ مقریزی[54] نے ایک مستقل کتاب، ۱۴۰۵ء تک مصر کے قحطوں پر لکھی ہے۔ ابن تغری بردی[55] کا بیان ہے کہ چودھویں صدی میں کم از کم چار مرتبہ طاعون سخت وبائی شکل میں پھیلی (۱۳۴۸ء۔۱۳۴۹ء)، ۱۳۵۹ء۔۱۳۶۱ء)، (۱۳۶۲ء۔۱۳۶۳ء)، (۱۳۸۹ء)۔ پندرھویں صدی میں کم از کم چودہ مرتبہ وبا پھوٹی جیسا کہ مختلف تاریخوں میں مذکور ہوا۔ گویا بطور اوسط ہر سات سال میں ایک مرتبہ۔ الفناء الکبیر، جس نے ۱۳۴۷ء تا ۱۳۴۹ء میں یورپ کے اندر خوفناک تباہی پھیلائی، مصر میں سات سال تک جاری رہی۔ ابن ایاس[56] کے اندازے کے مطابق صرف دارالحکومت میں اموات کی تعداد نو لاکھ تک جا پہنچی، جسے بہ آسانی صحیح سمجھنا مشکل ہے۔ غزہ میں ایک مہینے کے اندر بائیس ہزار آدمی مر گئے۔ حلب میں روزانہ اوسط اموات پانسو تھا۔ مرنے والوں میں اجنبی اور بچے بھی بہت تھے۔ ان حادثات کے علاوہ مملوکوں کی بدنظمی کے باعث مصر و شام کی آبادی پہلے کے مقابلے میں صرف ایک تہائی رہ گئی تھی۔

تجارت اور صنعت وحرفت

اقتصادی صورتِ حال میں ایک خرابی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ٹیکس بڑھا دیے گئے اور جو مسلک اختیار کیا گیا، وہ اصولاً درست تھا۔ فرنگیوں اور تاتاریوں کی لڑائیوں نے مصر و شام دونوں جگہ ٹیکسوں کا بوجھ زیادہ کر دیا۔ مثلاً کرائیوں پر ۱/۳ ۳۳ فی صد ٹیکس لیا جاتا تھا جس کے سبب بہت سی شکایات ہوئیں۔ گھوڑوں اور کشتیوں ہی پر نہیں، بلکہ زندگی کی ضروریات، یعنی نمک اور چینی پر بھی بھاری ٹیکس لگایا گیا تھا۔ بعض فرمانرواؤں نے مختلف چیزوں کا اجارہ لے لیا اور وہ مرضی کے مطابق قیمتیں بڑھاتے رہتے تھے۔ بعض نے سکّے کی قیمت گھٹا دی، جس کی وجہ سے افراطِ زر شروع ہوگئی[57] عوام افلاس کا شکار ہوتے گئے، حکمرانوں نے خوب دولت فراہم کر لی۔ اگر دولت جمع نہ ہوتی تو ان عظیم الشان عمارتوں کی تکمیل کا کون سا امکان تھا جن پر مصر بجا طور پر فخر کر رہا ہے۔

---

۵۱ عمری ص ۱۷۶، ظاہری ص ۱۳۱۔ ۵۲ ابن بطوطہ جلد اوّل ص ۱۲۱، صالح ۱۵۵، ۱۵۶۔

۵۳ ابن ایاس بدائع الظہور فی تاریخ الدہور جلد اوّل ص ۱۷۲، مقریزی خطط جلد ۲ ص ۵۴، ۵۵۔

۵۴ اغاثۃ الامہ بکشف الغمہ شائع کردہ محمد زیادہ و جمال الدین شیال۔

۵۵ جلد ۵ ص ۷۰، ۷۶، ص ۱۵۴، ۱۸۵، ۴۰۸، ۵۰۷۔

۵۶ جلد اوّل ص ۱۹۱، بردی جلد ۵ ص ۷۱۔

۵۷ مقریزی، اغاثہ ص ۷۰، ۷۲، بردی، حوادث ص ۳۱۰، ۳۱۲۔

خوش قسمتی سے اقتصادی نقصان کی ایک حد تک تلافی یوں ہوگئی کہ صلیبی جنگوں کے بعد تجارت خاصی بڑھ گئی۔ العادل اور بیبرس نے اہل وینس اور دوسرے یورپی تاجروں کے لیے خاص مراعات کا انتظام کر دیا تھا، اس وجہ سے جنسوں کے مبادلے کو تقویت پہنچی اور قاہرہ مشرق و مغرب کے درمیان بہت بڑی منڈی بن گیا۔ شام کا ریشم نیز عطریات اور مسالے برآمد میں پہلے نمبر پر تھے۔ ان کے بعد کانچ اور دوسری مصنوعات کا درجہ تھا۔ دمشق، طرابلس، انطاکیہ اور صور صنعت و حرفت کے ممتاز مرکز تھے۔ شام کی منڈیوں میں جو ریشم تھا، اس کا ایک حصہ چین سے درآمد کیا جاتا تھا۔ مسالے عرب اور دوسرے گرم ممالک سے آتے تھے۔ موتی خلیج فارس سے یافہ اور طرابلس لائے جاتے تھے[51]۔ جب دمشق کے ایک گورنر نے اپنا ایک کارندہ لبنان کے ضلع شوف میں اس غرض سے بھیجا کہ دیکھیے، وہاں شہتوت کی شاخیں نیزہ بنانے کے کام آسکتی ہیں یا نہیں تو لبنانیوں میں بڑی تشویشیں پھیلی[52]۔ حلب، دمشق اور بیروت کے بازاروں میں ہاتھی دانت اور دھات کی چیزیں، رنگے ہوئے کپڑے، قالین اور چینی کے برتن ملتے تھے۔ بیروت کے آس پاس زیتون کا تیل پیدا ہوتا تھا اور صابون بنتا تھا[53] اور اب تک یہی کیفیت ہے۔ ساحل کے ساتھ عثلیت اور دوسرے مقامات پر نمک بنانے کے نشانات اب تک موجود ہیں[54]۔

اہل شام برآمدی تجارت کے لیے صرف اجنبیوں پر انحصار نہیں رکھتے تھے۔ خود صلاح الدین کے زمانے سے شامی تاجروں نے قسطنطنیہ میں اقامت اختیار کر لی تھی اور صلاح الدین کی درخواست پر شہنشاہ قسطنطنیہ نے ان کے لیے ایک مسجد بنوائی تھی۔ اسی طرح مصری تاجر بھی وہاں جا پہنچے تھے۔ بیزنطینی تاجروں کو شام و مصر میں ایسی ہی مراعات حاصل تھیں۔ اُدھر کسی اجنبی تاجر کو بیزنطینی دارالحکومت میں مستقل اقامت کی اجازت نہ تھی۔ ایک جرمن پادری لڈالف (فان) سشم نے ۱۳۳۶ء سے ۱۳۴۱ء تک ارض مقدس کی زیارت کی تھی۔ وہ دمشق، عکہ اور دوسرے شامی شہروں میں خوش حالی کے نشان دیکھ کر بہت متاثر ہوا[55]۔ عکہ کو وہ نہایت جلیل الشان شہر قرار دیتا اور لکھتا ہے:

> "شہر (عکہ) کے بازار بہت صاف ہیں۔ تمام مکانوں کی دیواریں یکساں اونچی ہیں اور ایک قسم کے گھڑے ہوئے پتھر سے بنی ہیں، انھیں شیشے کی کھڑکیوں اور روغنی تصویروں سے بڑے عجیب طریقے پر آراستہ کر دیا گیا ہے۔ شہر میں جو محل اور مکان ہیں، وہ اس لیے نہیں بنے کہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں، ان میں عیش و نشاط کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔
>
> بازاروں پر ریشمی کپڑے یا خوب صورت پردے تان دیے گئے ہیں، تاکہ لوگ دھوپ سے محفوظ رہیں۔ ہر بازار کے موڑ پر ایک حد درجہ

---

[51] C. Krueger, "The Wares of Exchange in the Genoese-Africa Traffic of the Twelfth Century"

[52] صالح ص ۲۲۵

[53] ایضاً ص ۲۲۹

[54] کانڈر ص ۲۵۱

[55] ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۲

مستحکم بُرج کھڑا ہے - اس کے اِرد گرد جنگل ہے، جس میں لوہے کا ایک
دروازہ اور زنجیر لگی ہوئی ہے - تمام امراء شہر کے بیرونی حاشیے پر مستحکم
قلعوں اور قصروں میں رہتے ہیں - شہر کے وسط میں تاجروں اور کاریگروں
کی آبادی ہے - ہر تاجر اور کاریگر اپنی خاص تجارت یا صنعت کے بازار
میں رہتا ہے [۵۱]،،

ابن جبیر[۵۲] نے صلاح الدین کے زمانے میں دمشق دیکھا تھا - وہ اسے عروس البلاد قرار دیتا ہے - یہاں اس نے مسجد میں ایک گھڑی دیکھی - دن کو دو برنجی مرغ بتاتے تھے، رات کو وقت معلوم کرنے کے لیے خاص روشنی کا انتظام کر دیا گیا تھا - بنیا میں تو دہلی نے بھی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے [۵۳]

لبنان کی کیفیت

لبنان کے جاگیر دار امراء نے حیرت انگیز چابک دستی سے سیاسی ہیر پھیر کے اس فن پر عمل کیا، جس میں میکیاولی کو ناموری حاصل ہوئی اور یہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے، جب میکیاولی پیدا بھی نہیں ہوا تھا - جس ہنگامہ زار میں ان پر یکے بعد دیگرے فاطمی، اتوبی، فرینک، مملوک اور تاتاری مسلّط ہوتے رہے، وہ اس فن سے کام لیتے رہے - جب صلیبی جنگجو بیروت و صیدا پر مسلّط تھے، تو بنو بحتر امیران غرب آس پاس کے کچھ علاقے پر جاگیر داروں کی حیثیت میں قابض رہے اور انھوں نے فرینکوں کو جنگی امداد پیش کی [۵۴] مملوکوں سے انھیں شرطوں پر تعلق پیدا کرنے میں قطعاً تامّل نہ ہوا [۵۵] بحتریوں کی جاگیر میں شملان، عنبات اور بیصور جیسے مقامات شامل تھے، جن کا ذکر تاریخ میں کبھی نہیں آیا اور وہ اب تک موجود ہیں [۵۶] تاتاریوں اور مملوکوں کی کشمکش میں ان امیروں کے نمائندے بعض اوقات دونوں جانب شامل رہے - اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر حالت میں کامیاب و فتح مند فریق کے ساتھ ہوتے خواہ وہ کوئی ہوتا [۵۷] چودہ سو سال قبل مسیح سے سواحل شام کے باشندوں کا مسلک یہی رہا کہ وہ پوری احتیاط سے حالات کے نشوو ارتقاء کا انتظام کرتے رہتے، جس کا پانسا بھاری ہوتا، اس کے ساتھ ہو جاتے، گویا منافقت پر عمل پیرا چلے آتے تھے - یہ مسلک فخر الدین اور امیر بشیر کے زمانے تک قائم رہا -

اگرچہ متعدد عرب قبائل پہاڑی علاقوں میں چلے آئے تھے، خصوصاً جنوبی سمت سے [۵۸]، لیکن پہاڑوں کا ایک حصّہ بدستور

---

۵۱ لڈالف خان ستم ص ۵۱

۵۲ ص ۲۶۰، ۲۷۰، ۲۷۱ -

۵۳ جلد اوّل ص ۸۴، ۸۵

۵۴ صالح ص ۴۷ - ۷۵، ۸۳ - ۸۴ - ۱۱۱ - ۱۱۲ -

۵۵ صالح ص ۸۱ -

۵۶ صالح ص ۸۱، ۱۲۸، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۳۴، ۲۳۵ -

۵۷ صالح ص ۹۳، ۹۴، ۲۴۲، ۲۴۸ -

۵۸ اس زمانے کے ادب میں شام و مصر کے اندر بس جانے والے عرب ''اولاد الغرب'' کہلاتے تھے - اور لفظ ''عرب'' سے مراد بدّو لی جاتی تھی - دیکھیے ابو الفرج ہمدانی کی کتاب حوادث اور الجبرتی کی کتاب ''عجائب الآثار''، ابن الفرات جلد ۷، ص ۸۰، قلقشندی جلد ۳ ص ۵، جلد ۹ ص ۲۵۴ - ظاہری ۱۳۶ -

جنگلوں سے پٹا رہا۔ چنانچہ ریچھ، جنگلی سؤر، شیر اور گورخر چودھویں صدی تک ان جنگلوں میں ملتے تھے[۵۱] شام میں ایسے جانوروں کی تصدیق اسامہ[۵۲] کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ گورخر، غزال، شیر، جنگلی سؤر، چرخ اور چیتے کا ذکر کرتا ہے۔ ان جنگلوں میں ہر قسم کے خودرَو پھل اور کھانے والی سبزیاں مل جاتی تھیں۔ میٹھا پانی ہر جگہ دستیاب ہوتا تھا۔ لہٰذا عیسائیوں اور مسلمانوں میں سے درویش اور راہب ان پہاڑوں میں رہنا بہت پسند کرتے تھے۔ بارھویں صدی کے ایک مصنّف نے اپنی کتاب کے کئی ابواب ان مردوں اور عورتوں کے ذکر کے لیے وقف کیے ہیں، جو لبنان اور شام کے پہاڑوں میں رہتے تھے[۵۳] ابن جبیر[۵۴] نے بڑی خوشگوار حیرت سے لکھا ہے کہ آس پاس کے مسیحی ان زاہدوں اور گوشہ گیروں سے بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ تصوّف کی کتابوں میں ایسے لوگوں کے متعلّق بہت سی افسانوی کہانیاں موجود ہیں۔ ایک لبنانی مسلمان درویش کا قصّہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسے کہیں سے ایک روٹی روزانہ مل جاتی تھی۔ ایک روز نہ ملی تو باہر نکل کر آس پاس کے کسانوں کے گھروں میں پہنچا اور بھیک مانگنے لگا۔ ایک مسیحی کسان نے اسے جَو کی دو روٹیاں دے دیں، لیکن کُتا اس کے پیچھے لگ گیا اور اس وقت تک بھونکتا رہا، جب تک اس سے دونوں روٹیاں نہ چھین لیں اور لباس نہ اُتروا لیا۔ جب درویش نے کہا، کُتا بڑا حریص ہے تو قدرت کی طرف سے کُتے کو زبان مل گئی اور وہ بولا: "میں اپنے آقا کے گھر اور ریوڑوں کی نگہبانی کرتا ہوں اور جب کبھی اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو کچھ کھائے پیے بغیر ہی گزارا کر لیتا ہوں۔ تمھاری حالت یہ ہے کہ ایک روز روٹی نہ پہنچی تو ہمارے پاس آ کر بھیک مانگنے لگے۔ بھلا بتاؤ ہم دونوں میں سے زیادہ حریص کون ہے، مَیں یا تم؟[۵۵]"

ثقافتی سرگرمیاں

سیاسی ہنگاموں اور اقتصادی بدحالیوں کے باوجود نوریوں اور ایوبیوں، خصوصاً نورالدّین اور صلاح الدّین کے عہد میں شام نے بہترین فنّی اور تعلیمی سرگرمیوں سے فیضان حاصل کیا۔ دمشق مرکزِ حکومت تھا، وہاں اب تک ان دو حکمرانوں کے عہد کے تعمیری کارناموں کی شہادتیں موجود ہیں۔ نورالدّین نے فصیل اور اس کے برجوں اور دروازوں کی مرمّت کرائی، نئی عمارتیں بنوائیں، جن میں سے بعض ماضی قریب تک باقی تھیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر وہ شفاخانہ تھا، جو خود اس کے نام سے منسوب ہوا[۵۶]۔ اب اس عمارت میں تجارتی درس گاہ ہے[۵۷] اس شفاخانے کی عمارت کے لیے ایک فرنگ قیدی کے فدیے کی رقم استعمال کی گئی تھی[۵۸] ابن جبیر[۵۹] نے یہ شفاخانہ ۱۱۸۴ء میں دیکھا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ جو جائداد وقف تھی، اس کی آمدنی پندرہ دینار روزانہ تھی

---

۵۱ صالح ص ۱۱۳، ۱۹۳۔ ابن بطوطہ جلد اوّل ص، ۱۸۵۔ ۵۲ اعتبار ص ۱۹۳، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۴۔

۵۳ ابن الجوزی صفت الصفوہ جلد ۴ ص ۲۱۳، ۲۲۱، ۲۲۳، ۳۲۷۔

۵۴ ص ۲۸۷۔ ۵۵ الکی نزہتہ الجلیس ومنیۃ الادیب الانیس ص ۵۸، ۵۹۔

۵۶ المارستان النوری۔ "مارستان" کی اصل "بیمارستان" تھی، یعنی وہ مقام، جہاں بیمار رکھے جاتے ہوں، ابن جبیر نے ایک پرانے شفاخانے کا ذکر کیا ہے، جو سلجوقی فرمانروا دقوق ابن تتش نے قائم کیا تھا نہ کہ الولید نے۔

۵۷ صلاح الدین المنجد رسالہ المشرق۔ بابت ۱۹۴۸ء ص ۵۱-۲۔ عمارت کی تفصیل کے لیے دیکھیے ارنسٹ ہرز فیلڈ کی کتاب دمشق۔

۵۸ مقریزی جلد ۲ ص ۴۰۸۔ ۵۹ ص ۲۸۳۔

اور اس میں ایسے نگران موجود تھے، جو ہر بیمار کی کیفیت اور مصارف تفصیل سے درج کرتے۔ طبیب بیماروں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے۔ بیماروں کے لیے دوائیں اور غذائیں مفت مہیا کی جاتی تھیں۔ مشہور مؤرخ ابن الاثیر نے بھی اس شفاخانے میں علاج کرایا تھا۔ جب اس نے احتجاج کیا کہ میں خرچ دے سکتا ہوں، لہٰذا مجھ سے رقم وصول کی جائے تو جواب ملا کہ نورالدین کی سخاوت آج تک کسی نے نہیں ٹھکرائی۔ ابن الاثیر[۵۱] ہمیں بتاتا ہے کہ نورالدین نے سلطنت میں اور بھی بہت سے شفاخانے اور مہمان خانے تعمیر کرائے تھے۔ حلب میں شفاخانے کی جگہ تجویز کرنے کے لیے ایک بھیڑ ذبح کی گئی اور اس کے چار ٹکڑے کر کے شہر کے چار مختلف حصوں میں لٹکا دیے گئے۔ جس مقام پر صبح کے وقت گوشت کی خوشبو میں تازگی باقی تھی، اسی حصے کو شفاخانے کے لیے چن لیا گیا۔[۵۲] بیان کیا جاتا ہے کہ حکیم رازی نے اڑھائی سو سال پیشتر بغداد میں شفاخانہ تعمیر کراتے وقت یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔[۵۳] مصر کے مشہور سرکاری عامل اور مصنف الظاہری نے ۱۴۲۸ء میں دمشق کا شفاخانہ دیکھا تھا[۵۴] اور اس کے ساتھ ایک ایرانی زائر بھی تھا۔ زائر نے دیکھا کہ شفاخانے میں بیماروں کو بڑا آرام ملتا ہے تو وہ خود بھی بیمار بن گیا، تاکہ اسے ہسپتال میں داخل کر لیا جائے۔ شفاخانے کے معالج اعلیٰ نے اس کی نبض دیکھی اور پوری طرح معاینہ کیا۔ واضح ہو گیا کہ اسے کوئی بیماری نہیں، تاہم اسے چوزوں کا شوربا، خوشبودار شربت، عمدہ پھل، ذائقہ دار روٹیاں اور دوسری نفیس چیزیں تجویز کر دیں۔ تیسرے دن نیا نسخہ لکھا جو یہ تھا: "مہمان داری صرف تین دن ہوتی ہے۔"

علم طب

اس شفاخانے کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا اور یہاں علم طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ابن ابی اصیبعہ نے یہاں کے پہلے طبیب اور استاد طب کا نام ابوالمجد ابن ابی الحکم بتایا ہے، نیز لکھا ہے کہ ایوبی العادل کے عہد میں یہاں کا ممتاز استاد جس کا نام مہذب الدین ابن الاخوار (۱۱۶۱ء - ۱۲۳۰ء) تھا اور اس کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ یہاں طبیبوں، دواسازوں اور امراض چشم کے ماہروں کا امتحان لیا جاتا تھا اور انھیں اجازت نامے دیے جاتے تھے، اجازت نامے حاصل کیے بغیر وہ نہ علاج کر سکتے تھے اور نہ دوائیں بنا کر فروخت کر سکتے تھے۔ محتسبوں کی رہنمائی کے لیے قانون کی جو کتابیں تیار کی جاتی تھیں، ان میں فصد لینے والوں، سینگیاں لگانے والوں، طبیبوں، جراحوں، ہڈیاں درست کرنے والوں اور دواسازوں کی نگرانی کے لیے واضح اصول بیان کر دیے گئے تھے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان پیشوں کی نگرانی حکومت نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ابن الاخوار کا ایک نہایت قابل شاگرد ابن النفیس تھا، جو قلاوون کے شفاخانے میں مہتمم کے عہدے پر مامور رہنے کے بعد دمشق واپس آیا اور ۱۲۸۹ء ۱۲۸۸ء میں وفات پائی۔ وہ ایسا طبیب تھا کہ جب تک مناسب غذاؤں کے ذریعے سے بیماری کے دور ہو جانے کا امکان ہوتا، کوئی دوا تجویز نہ کیا کرتا۔ ابن النفیس نے بو علی سینا کی مشہور کتاب "قانون"، کی

---

۵۱ جلد ۱۱ ص ۲۶۷۔

۵۲ ابن الشحنہ ص ۲۳۰، ۲۳۱، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے احمد عیسیٰ کی فرانسیسی کتاب ص ۲۰۳، ۲۰۵۔

۵۳ ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۳۰۹۔ ۳۱۰۔

۵۴ ص ۴۴۔ ۴۵۔

جو شرح بنام ”شرح تشریح قانون“ لکھی، اس میں پھیپھڑوں کے دورانِ خون کے متعلق صاف صاف اشارے کر دیے اور یہ پرتگیزی سرویٹس سے تین سو سال پیشتر کا واقعہ ہے، جس سے پھیپھڑوں کے دورانِ خون کا نظریہ منسوب کیا جاتا ہے۔ شام کے ماہرین امراضِ چشم (کحال) نے تیرھویں صدی کی دو بڑی کتابیں پیش کیں، ایک ”الکافی فی الکحل“، جس کا مصنف خلیفہ ابن ابی المحاسن تھا۔ وہ ۱۲۵۶ء کے آس پاس حلب میں تھا۔ دوسری کتاب ”نور العیون وجامع الفنون“ تھی، جس کا مصنف صلاح الدین ابن یوسف تھا۔ وہ ۱۲۹۶ء کے آس پاس حماہ میں تھا۔ خلیفہ کو اپنی جراحی کی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ایک یک چشم کی آنکھ سے موتیا بند دُور کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔[۵۱] یہ لوگ اسلامی علوم کی روشنی کے آخری دَور میں تھے۔

اسی عہد سے فنِ طب میں عربی دنیا کے مشہور مؤرخ موفق الدین احمد ابو ابی اصیبعہ (۱۲۰۳ء۔ ۱۲۷۰ء) کا تعلق ہے۔ ابن ابی اصیبعہ دمشق کے ایک ماہرِ امراضِ چشم کا فرزند تھا اور خود بھی طبیب تھا۔ اس نے ابن الاخوار کے پاس تعلیم پائی۔ پھر قاہرہ چلا گیا۔ وہاں اندلس کے مشہور ماہر نباتیات ابن بیطار کے پاس رہا۔ اس کا علمی شہکار ”عیون الانبائی طبقات الاطبا“[۵۲] ہے جسے عربی تصانیف میں یگانگی کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تقریباً چار سو عربی اور یونانی اطبائ کی سیرتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے بہتیرے فلسفی، ہیئت دان تھے یا طبیعیات اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ ایسی ہی کتاب مصر میں ایک معاصر طبیب القفطی نے لکھی[۵۳] (۱۱۷۲ء۔ ۱۲۴۸ء)۔ اس کی زندگی کا آخری دَور حلب میں گزرا، جہاں وہ ایوبی حکمران کا وزیر تھا۔ یونانی فلسفے کے متعلق ابن ابی اصیبعہ کا ایک ماخذ[۵۴] ایک دمشقی الاصل مصری ابوالوفا بشر ابن فاتک تھا،[۵۵] جس نے ۱۰۵۳ء میں ”مختار الحکم ومحاسن الکلم“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، تیرھویں صدی کے نصف اوّل میں اس کا ترجمہ ہسپانوی زبان میں ہوا، پھر اس کے مطالب لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی میں منتقل ہوئے۔ انگریزی ایڈیشن ولیم کیکسٹن نے ۱۴۷۷ء میں شائع کیا تھا۔ انگریزی زبان کی یہ پہلی کتاب تھی، جس پر مقامِ طباعت اور تاریخِ طباعت درج ہوئی۔ چار سو سال سے زیادہ مدت تک اس عربی کتاب کے ادبی اخلاف مغربی یورپ کی تحریرات و افکار کو متاثر کرتے رہے۔

مدارس

شفاخانوں کے علاوہ مدرسے اور مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں، نورالدین کے خاندان نے جن درس گاہوں کی بنیاد رکھی، انھیں ”مدرسے“ کہا جاتا تھا۔ انھیں مامون الرشید عباسی کے ”بیت الحکمت“ کا جانشین نہ سمجھنا چاہیے، جو ۸۳۰ء میں بمقام بغداد قائم ہوا تھا اور جسے علوم و فنون کی عام اکادمی سمجھنا چاہیے۔ ان درس گاہوں میں ”نظامیہ“ کا نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا، جس کی بنیاد ۱۰۶۷ء میں پڑی اور سلجوقی سلاطین کے ایرانی وزیر (نظام الملک طوسی) کے نام پر اسے نظامیہ کہا گیا ہے۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مدرسے عمومی حیثیت میں ایسی درس گاہیں تھے، جو مسجدوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ پھر ان میں مذہبی مذاکرے بھی ہوتے تھے اور

---

۵۱ دیکھیے سارٹن جلد ۲ ص ۱۱۰۱، ۱۱۰۲۔

۵۲ یہ کتاب پہلے امراؤ القیس ابن الطحان نے دو جلدوں میں شائع کی تھی، پھر مزید اضافوں اور تصحیحات کے ساتھ آگسط مولر نے شائع کی۔

۵۳ اخبار العلماء بالاخبار الحکماء (تاریخ الحکماء)۔

۵۴ جلد اوّل ص ۹، ۱۶، ۲۱، ۲۸، ۳۰، ۳۸، ۴۱، ۴۳، ۴۷، ۵۰۔

۵۵ یاقوت: ارشاد جلد ۶ ص ۲۴۱، قفطی ص ۲۶۹۔

یہ تعلیم فقہ کے مرکز بھی تھے۔ سلطنت کی غرض ان کی تاسیس سے یہ تھی کہ لوگوں میں اصلی اور صحیح دین کی اشاعت ہو۔ ان میں وہی نظریات پیش نظر رکھے گئے تھے، جن کی تصدیق سنیت سے ہوتی تھی اور جن کی تائید ارباب علم کلام کرتے تھے۔ وہی چیزیں پڑھائی اور سکھائی جاتی تھیں۔ معلّموں، پروفیسروں اور طلبہ کو تنخواہیں اور وظیفے ان اوقاف سے ملتے تھے، جو ان مدرسوں کے ساتھ قائم تھے۔ معلّموں میں فقیہ، محدث اور علماء شامل تھے۔ جو شخص کسی نہ کسی مدرسے میں تعلیم نہ پالیتا، اس کے لیے انتظامی محکموں میں ملازمت حاصل کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ ان اداروں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر چکنے کے بعد زنگی خاندان اور اس کے بعد ایوبی خاندان نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ نورالدین زنگی نے ایسے مدرسے دمشق کے علاوہ حلب، حمص، حماہ اور دوسرے شامی قصبوں میں بھی قائم کیے[۵۱]۔ دمشق میں تین مدرسے اب تک باقی ہیں، جو اپنی نوعیت کے قدیم ترین تعلیمی ادارے ہیں۔ ان میں ایرانی الاصل صلیبی شکل پیش نظر رکھی گئی تھی۔ ایک مدرسے میں، جس کا نام "مدرسۂ نوریہ" تھا، نورالدین زنگی دفن ہوا۔ ابن جبیر[۵۲] نے بتایا ہے کہ اس مدرسے کی عمارت دنیا بھر میں بہترین تھی۔ اس پر ایک سادہ سی لوح نصب ہے، جس پر یہ عبارت مرقوم ہے: "یہ شہید نورالدین زنگی کی قبر ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ"۔ اہل دمشق اس مقبرے کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس کا گنبد اس نمونے کا ہے، جسے "مقرنص[۵۳]" کہتے ہیں۔ یہی عمارت شام میں مدرسے، مقبرے اور مسجد کے درمیان رشتۂ اتصال تھی۔

نورالدین نے مسجدوں کی تعمیر میں بھی بڑی فراخ حوصلگی سے کام لیا۔ حماہ کی مسجد اب تک اسی سے منسوب ہے، یعنی "مسجد نوری"۔ اس کی بنائی ہوئی تمام بڑی مسجدوں، شفاخانوں اور مدرسوں کی طرح مسجد نوری کے لیے بھی آب رواں کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ پھر اس نے بہت سے شہروں میں مسجدیں بنوائیں، مثلاً حلب میں، جس کے قلعے کی بھی مرمت کرائی۔ قلعے کے مغربی برج پر اب تک اس کا لگایا ہوا کتبہ پڑھا جا سکتا ہے۔ نورالدین کے کتبے بھی عربی رسم الخط میں ایک نشانی منزل ہیں، اس وقت پرانا کوفی رسم الخط ترک کر کے اس کی جگہ "نسخ" اختیار کیا جا رہا تھا۔

ایوبی نوریوں کے نقش قدم پر چلے۔ صلاح الدین کے بھائی العادل نے ایک مدرسے کی تعمیر از سر نو شروع کرا دی، جسے نورالدین ادھورا چھوڑ گیا تھا اور وہ (العادل) اسی میں دفن ہوا۔ اس کا نام عادلیہ تھا، جہاں اب دمشق کی عرب اکادمی کا مرکز ہے[۵۴]۔

صلاح الدین نے بھی نورالدین کی طرح تعمیرات و تعلیمات کی سرپرستی میں پوری سرگرمی دکھائی۔ اس کے معاصر ابن جبیر[۵۵] کا بیان ہے کہ دمشق میں بیس مدرسے تھے، ایک سو حمام اور چالیس دارالوضو تھے، درویشوں کے لیے بہت سی خانقاہیں تھیں، جن میں آب رواں کا انتظام تھا۔ صلاح الدین ہی نے مصر میں مدرسوں اور خانقاہوں کا بندوبست کیا، تاکہ شیعی نظریات کا مقابلہ

---

[۵۱] ابن خلکان جلد ۲ ص ۵۲۱، ابن الاثیر جلد ۱۱، ص ۲۶۷۔ حلب میں مزید مدرسوں کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے ساواجٹ Sauvaget کی کتاب Alep مطبوعہ پیرس ص ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۴۸۔

[۵۲] ص ۲۸۴، نیز دیکھیے نعیمی کی کتاب الدارس فی تاریخ المدارس ص ۶۰۶، ۶۰۷۔

[۵۳] عربی لغت میں اس کی تشریح زینہ نما کی گئی ہے، اصل لفظ یونانی سے لیا گیا ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جس سے انگریزی کا لفظ کارنس Cornice نکلا۔

[۵۴] نعیمی ص ۳۵۹۔

[۵۵] ص ۲۸۳، ۲۸۸۔

کیا جا سکے، جو بہت پھیل گئے تھے[51] یروشلم میں اس نے ایک شفاخانہ، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ بنوائی، تینوں کا نام "صلاحی" تھا۔[52] نوری خاندان کو بھی یہی سہ گانہ ادارے پسند تھے۔

مملوکوں کی تعمیرات و تزئینات

شاہی تعمیرات میں ایوبیوں کا نمونہ مملوکوں نے مصر میں بھی جاری رکھا، جہاں آج عربی فنون کے بعض نہایت خوب صورت اور دلکش نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نمونے کی خصوصیات یہ ہیں: عمارت میں پائیداری اور پختگی، آرائش کی افراط اور بہتات۔ اس کی آرائشیں نہایت عمدہ پتھر کی پائیدار سلوں پر بہت ہی خوبی اور دل کشی پیدا کر لیتی ہیں۔ تیرھویں صدی میں شامی و عراقی اثرات پناہ گیر فن کاروں اور آرٹسٹوں کے ذریعے سے مصر پہنچے، جو تاتاری حملے کے باعث موصل، بغداد اور دمشق چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ یہ اثرات، مدرسوں، مسجدوں، شفاخانوں، خانقاہوں اور قصروں کی تعمیر میں نمایاں ہیں۔ مملوک سلطان الناصر نے ۱۳۱۴ء میں قصر ابلق بنوایا تھا، جسے ہمہ گیر شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دمشق کے ایک قصر کے نمونے پر بنا تھا۔ ایوبیوں اور مملوکوں نے جو تزئینات اختیار کیں، ان سے عمارتوں کے تعمیری حسن میں اضافہ ہو گیا۔ ایوبیوں کی ایک جدت یہ تھی کہ انھوں نے دقیقہ سنجی، تناسب وغیرہ پر زیادہ زور دیا، نیز سادہ اور مربع وضع کے برج بنانے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ بحری مملوکوں کے دور میں نہایت خوبصورت مینار بننے لگے جو ایوبی دور کے میناروں سے ارتقا پذیر ہوئے تھے، لیکن بہترین مینار برجی مملوکوں کے زمانے میں بنے۔ مسجدوں کے تعلق میں عربوں کے فن تعمیر کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔[53]

ایوبیوں اور مملوکوں کے دور کی مختلف چیزیں ہم تک پہنچی ہیں، مثلاً لوہے، تانبے کانچ اور لکڑی کی چیزیں، جن پر نہایت باریک اور خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ خاص طور پر قابل ذکر تانبے کے گل دان، آفتابے، کشتیاں، شمع دان، بخور دان، قرآن مجید رکھنے کے ڈبے ہیں۔ ان سب پر نہایت نفیس تزئینات کی گئی تھیں:

> "اس تزئین میں نقوش کے اندر حد درجہ چمک پیدا کی گئی۔ بہت عمدہ کوفی خط استعمال کیا گیا۔ جا بجا بیل بوٹے بنائے گئے۔ پھر ایسی شکلیں بنائی گئیں، جو ایک دوسری میں پیوست تھیں۔ ان میں شگوفے تھے۔ عربی وضع کی گل کاری تھی اور کہیں کہیں ایسے نشان موجود تھے، جو جواں مرد جنگ جو ڈھالوں وغیرہ پر لگاتے تھے۔ پھر ان آرائشوں میں محض نگاہوں ہی کے لیے فرحت کا سامان نہ تھا، بلکہ ذہن و فکر پر بھی خاص انشراحی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور یہ آخری خصوصیت ہمارے نزدیک عربوں کی تزئینات کا اصل راز ہے۔[54]"

---

[51] ابن خلکان جلد ۳ ص ۵۲۱، سیوطی جلد ۲ ص ۱۵۶/۱۵۸، مقریزی جلد ۲ ص ۳۶۳۔

[52] ابن خلکان جلد ۳ ص ۵۱۶، مقریزی جلد ۲ ص ۴۱۵۔

[53] ابنی گروسے Grousset The Civilization of the East جلد اول ص ۲۳۵

[54] گروسے ص ۲۳۴

دمشق اپنے ان برتنوں کے لیے خاص طور پر مشہور تھا، جو سنہری معلوم ہوتے تھے یا ایسے آفتابے، جن میں چاندی کے ذریعے سے مختلف شکلیں، بیل بوٹے یا دوسرے نازک نمونے کندہ کر دیے جاتے تھے۔ ایک اطالوی سیاح ۷۸۵ھ/۱۳۸۴ء میں دمشق گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"اگر باپ سُنار ہے تو بیٹے کبھی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے ...... یوں حالات انھیں مجبور کر دیتے ہیں کہ اپنے آبائی فن میں زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کر لیں"۔[۵۱]

مسجدوں کے دروازے کانسی کے بنائے جاتے تھے اور اُن پر بڑی خوب صورت تزئینات ہوتی تھیں۔ یہ تزئینات اس عہد کے حسنِ ذوق کی زندہ شہادت ہیں۔ لکڑی پر بیل بوٹے اور ہندسی شکلیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ منبت کاری دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ فاطمیوں کے فن کی پابندی نہیں رہی تھی۔ قاہرہ کے عربی عجائب خانے میں ایک بوتل ہے، جس پر الناصر صلاح الدین سلطانِ دمشق و حلب (۶۳۴ھ-۶۵۸ھ/۱۲۳۶ء-۱۲۶۰ء) کا نام کندہ ہے۔ یہ کانچ پر میناکاری کے قدیم ترین نمونوں میں سے ایک ہے۔ مسجدوں کے جو جھاڑ فانوس عربی عجائب خانے یا دوسرے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ شام اس وقت تک کانچ کی صنعت میں تمام یورپی ملکوں سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔[۵۲]

فکری مساعی

ذہن و فکر کے کارنامے پیشِ نظر رکھے جائیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایوبیوں اور مملوکوں کے زمانے میں جدت کے بجائے جمع و ترتیب اور نقل پر زیادہ توجہ مبذول رہی۔ بایں ہمہ دمشق اور قاہرہ بغداد کی تباہی اور اسلامی اندلس کے انحلال کے بعد عربی دنیا کے ذہنی اللہ تعلیمی مرکز بنے رہے۔ ان دو شہروں میں جو درس گاہیں قائم ہو چکی تھیں، ان کے لیے بہترین اوقاف کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ انھیں درس گاہوں نے اسلامی علوم محفوظ رکھے اور ان کی اشاعت کا فرض انجام دیا۔

اشراقی تصوّف

تصوّف میں بعض نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر کے زمانے میں حلب ایک غیر معمولی صوفی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا، جس کا نام شہاب الدین السہروردی تھا (۵۴۹ھ-۵۸۷ھ/۱۱۵۵ء-۱۱۹۱ء)۔ اسی نے نظریۂ اشراق کی بنیاد رکھی اور یہ درویشوں کے ایک سلسلے کا بھی بانی تھا۔ نظریۂ اشراق کے مطابق نور اللہ تعالیٰ کا جوہر، تمام اشیا کی بنیادی حقیقت اور معرفتِ صحیحہ کا نشان ہے۔ یہی ذرّیۂ کلمہ ہے۔ یہی محبت خالصہ ہے اور یہی خیرِ محض ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظریات میں زرتشتی، خصوصاً مانوی، بنیز نوفلاطونی اور اسلامی افکار جمع کر دیے گئے تھے۔ پلوٹینس اور مانی اشراق کے اوّلین بانی تھے۔[۵۳] سہروردی خود ایران میں پیدا ہوا۔ نوفلاطونی افکار زیادہ تر شامی مسیحیوں کے ذریعے سے ایران پہنچے۔ نور کی شکل میں خدا کا تصور خود قرآن کے اندر موجود ہے۔ سہروردی سے بہت پہلے غزالی نے ایک

---

۵۱ Simone Sigoli in Cesare Angelini, Viaggi in Terrasanta ص ۲۳۷۔

۵۲ سارٹن جلد ۳ ص ۱۷۳۔

۵۳ اس بارے میں دیکھیے آرتھر جے آربری Arberry کی کتاب مقدمہ تاریخ تصوّف ص ۳۲۔

رسالہ "مشکوٰۃ الانوار"، اسی موضوع پر لکھا تھا۔ غزالی کے نزدیک بھی خدا ہی حقیقی نور تھا۔ دوسری روشنیاں اسی کی شعاعیں یا پرتو ہیں۔ اس سے پیشتر مسیحی متصوفین بھی کہہ چکے تھے کہ روحانی روشنی پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اور یہ روشنی خدا سے پھیلی ہے۔ یہی تمام چیزوں کا جوہر ہے۔ غزالی جس زمانے میں شام کے اندر تھے، انھوں نے یقیناً یونانی کلیسا کے مسیحیوں کی متصوفانہ تعلیمات کے متعلق واقفیت حاصل کی ہوگی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ حقیقی اسلام اور تصوفات میں تطابق پیدا کر دیں۔ سہروردی نے کئی کتابیں لکھیں[۵۱]، جن میں سے "حکمت الاشراق"، کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نوجوان صوفی نے جوش تصوف کے نشے میں قدامت پسند علماء کو اس قدر ناراض کر دیا کہ ان کے اصرار پر سلطان صلاح الدین کو، جو محافظ مذہب تھے، حکم دینا پڑا کہ شہاب الدین کو بھوکا مار ا جائے یا اس کا گلا گھونٹ دیا جائے[۵۲]۔ چنانچہ اس کا لقب شیخ مقتول مشہور ہو گیا۔ اس کا مقبرہ حلب میں ڈاکخانے کی عمارت کے قریب ہے۔

ابن عربی

ایک اور اجنبی الاصل اشراقی صوفی، جس نے زندگی کے آخری دن شام میں گزارے، محی الدین ابن عربی تھا (۱۱۶۵ء-۱۲۴۰ء)[۵۳]، ابن عربی دراصل وجودی فلسفی تھا۔ اسلامی تصوف میں اسے سب سے بڑا مفکر قرار دیا جاتا ہے۔ غالباً ہسپانیہ سے نکلنے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہاں آزاد خیالی پر پابندیاں عائد تھیں، یہاں تک کہ غزالی کی تصنیفات برسرِ عام جلا دی گئی تھیں۔ ابن عربی نے ۱۲۰۲ء میں حج کیا، پھر دمشق کو وطن بنا لیا۔ وہاں اس کا مقبرہ ایک مسجد کے ساتھ ہے، جو عثمانی سلطان سلیم اول نے بنوائی تھی اور لوگ اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ ابن عربی کی رائے کے مطابق سچے صوفی کا مُرشد و رہبر ایک ہوتا ہے یعنی اس کا باطنی نور اور خدا تمام مذہبوں میں ملتا ہے[۵۴]۔ ریمان لل اور دوسرے مسیحی متصوفین کے ہاں ابن عربی کے اثرات کے نشان ملتے ہیں۔ اپنی تصنیف الفتوحات المکیۃ[۵۵] نیز الاسراء الی مقام الاسریٰ[۵۶] میں ابنِ عربی نے رسول اللہ صلعم کے سفرِ معراج کی کیفیت بیان کی ہے۔ دانتے نے اپنی ڈیوائن کامیڈی میں مختلف مناظر، وقائع، مقامات اور تعمیرات کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان میں سے زیادہ تر تفصیلات ابنِ عربی کی ان دو کتابوں اور دوسری اسلامی تحریرات میں آچکی تھیں۔

سیرت کی کتابیں

دمشق کے دار الحدیث نوریہ کے ابتدائی اساتذہ میں سے ایک ابنِ عساکر[۵۷] بھی تھے (۱۱۰۵ء-۱۱۷۶ء)۔ انھوں نے التاریخ الکبیر لکھی، جس میں ان تمام شخصیتوں کے سوانح مرتب کیے جو کسی نہ کسی وجہ سے دمشق کے ساتھ وابستہ رہ چکی تھیں۔ اس

---

۵۱ کتابوں کی فہرست کے لیے دیکھیے ابن خلکان جلد ۳ ص ۲۵۷، ۲۵۸، ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ ص ۱۷۰، ۱۷۱۔

۵۲ ابن شداد ص ۳۰۲، ۳۰۳، سہروردی ثلاثہ رسائل ص ۱۸، ابن خلکان جلد ۳ ص ۲۶۰۔

۵۳ اے ای۔ عفیفی The Mystical Philosophy of Muhyid Din-Ibnul 'Arabi ص ۳، ۵، ۴۷، ۱۰۸، ۱۸۳، ۱۸۴۔

۵۴ ابنِ عربی: ترجمان الاشواق۔

۵۵ دوسرا ایڈیشن، جس کی چار جلدیں ہیں۔

۵۶ مطبوعہ، قاہرہ ۱۳۵۲ھ۔

۵۷ کتبی جلد اول ص ۳۳۳، یاقوت، ارشاد جلد ۵ ص ۱۳۹-۱۴۶، سبکی جلد ۴ ص ۲۷۳-۲۷۷، نعیمی ص ۱۰۰، ۱۰۴، ۱۰۵۔

کتاب کی اسّی جلدیں تھیں۔ ان میں سے صرف چند باقی رہ گئی ہیں[51]۔ سیرت نگار کی حیثیت میں ابنِ عساکر دمشقی درس گاہوں کی تربیت پائی ہوئی ایک اور شخصیت کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہ شخصیت شمس الدین احمد ابنِ خلکان کی تھی، جو مسلم سیرت نگاروں میں بہت ممتاز ہیں۔ موصوف اربل (اربیلا) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۱ء میں شام کے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے[52]۔ اس اعلیٰ عہدے پر وہ اپنی وفات (۱۲۸۲ء) سے کچھ مدت پیشتر تک فائز رہے۔ بیچ میں صرف سات سال کا وقفہ ہوا اور عہدہ دار کی حیثیت میں دمشق ان کا مرکز تھا۔ ابنِ خلکان نے عربی میں قومی سیرت نگاری کا سب سے پہلا مجموعہ مرتب کیا، یعنی وفیات الاعیان وانباء انباء الزمان[53]۔ مصنف نے اسماء کی تصحیح، تاریخوں کے تعین، سلسلۂ نسب کے تجسس اور نمایاں واقعات کی تلاش میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا اور بہ حیثیت مجموعی بہت صحیح اور دلچسپ حالات مرتب کیے۔ حلب کے ایک کتب فروش الکتبی (وفات ۱۳۶۳ء) نے وفیات کا تکملہ لکھا، جس کا نام فوات الوفیات[54] رکھا۔

ایک اور سیرت نگار صلاح الدین خلیل ابن ایبک تھا (۱۲۹۶ء۔ ۱۳۶۳ء)[55] جسے مولد کی بنا پر صفدی کہتے ہیں۔ اس نے ابنِ خلکان سے زیادہ کتابیں لکھیں، لیکن ویسی تحقیق اور دقیقہ سنجی سے کام نہ لے سکا۔ وہ ایک ترک غلام کا بیٹا تھا۔ دمشق کے ایک معلّم نحو ابو حیّان التوحیدی سے تعلیم پائی۔ پھر اس نے مشہور محدث اور مؤرخ حافظ ذہبی[56] (۱۲۷۴ء۔ ۱۳۴۸ء)، نیز فقیہ تاج الدین السبکی[57] (۱۳۲۶ء۔ ۱۳۷۰ء) کی رفاقت اختیار کر لی۔ ذہبی کی تاریخ اسلام اتنی ضخیم تھی کہ ناقلوں کو اس کی نقل کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور کتابیں جمع کرنے والے اس کے متعلق متحیر تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ محفوظ نہ رہ سکی۔ الصفدی دمشق میں خزانچی کے عہدے پر مامور تھا، جس کتاب کی وجہ سے اسے خاص شہرت حاصل ہوئی، اس کا نام "الوافی بالوفیات" تھا، جو تیس جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ اس کے جو حصے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں کوئی چودہ ہزار فرمانرواؤں، قاضیوں، ادیبوں اور عالموں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ عربی میں یہ سیر کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ ابن خلکان کے وفیات میں کل آٹھ سو پینسٹھ افراد کے حالات ہیں، کتبی کی فوات میں پانسو چھ افراد کے اور ابن ابی اصیبعہ کی کتاب عیون میں چارسو افراد کے حالات ہیں۔ صفدی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں اصولِ تاریخ کے متعلق بھی بحث کی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی چیز تھی[58]۔ بہرحال صفدی نے پیشروؤں کی تصانیف کے لیے ضمیمے مہیا کر دیے۔ خصوصاً ابن خلکان اور یاقوت کی تصانیف

---

[51] شائع کردہ عبدالقادر ابن بدران، سات جلدیں۔ [52] سبکی جلد ۵ ص ۱۴، ۱۵، سیوطی جلد اول ص ۲۶۵، ۲۶۶۔

[53] اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یورپی زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

[54] دو جلد مطبوعہ قاہرہ، پلوٹارک اور ابن خلکان کے متعلق نکتہ چینی کے لیے ملاحظہ ہو فان گرون باوم Grunebaum کی کتاب میڈیول اسلام Medieval Islam

[55] سبکی جلد ۶ ص ۹۴ - ۱۰۳۔

[56] ان کی متعدد تصانیفوں میں سے صرف دول الاسلام دو جلدوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ (حافظ ذہبی کی بیشتر کتابیں چھپ چکی ہیں اور تاریخ بھی غالباً زیر طباعت ہے یا طبع ہو چکی ہے۔)

[57] مصنف طبقات الشافعیۃ الکبریٰ چھ جلد۔

[58] سارٹن جلد ۳ ص ۳۰۹۔

کے لیے۔ یاقوت ابتدا میں ایک یونانی غلام تھا۔ اس نے علماء کے حالات کا ایک نہایت اہم مجموعہ تیار کیا، جس کا نام معجم الادباء ہے اور اسے ارشاد بھی کہتے ہیں، لیکن اس نے زیادہ شہرت اپنی جغرافیائی کتاب کی وجہ سے پائی، جس کا نام معجم البلدان ہے۔ ادب کا یہ شاہکار ۱۲۲۸ء میں بمقام حلب تکمیل کو پہنچا اور وزیر قفطی کے نام سے منسوب ہوا۔ یاقوت نے اسی شہر میں وفات پائی۔

تاریخ اور جغرافیہ

جغرافیہ اور سیرت نگاری سے تاریخ کو گہرا تعلق ہے۔ جن شامی مؤرخوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان میں سے ایک ابوشامہ (۱۲۰۳ء۔ ۱۲۶۸ء) تھا[51] جس کی مشہور تصنیف کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین تھی[52] یہ زیادہ تر نور الدین اور صلاح الدین کے حالات پر مشتمل تھی۔ ابوالفدا (۱۲۷۳ء۔ ۱۳۳۲ء) حماہ کے ایوبی حکمرانوں میں سے آخری تھا جس کی "تاریخ"[53] ابن الاثیر کی زیادہ ضخیم تاریخ کی تلخیص اور اس کا تکملہ ہے۔ ابوالفدا دمشق میں پیدا ہوا، جہاں اس کے والدین تاتاریوں کے خوف سے بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس کی کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعد کے مصنفوں نے اس کے مزید خلاصے کیے اور تکملے لکھے۔ جغرافیے پر بھی اس کی تصنیف بڑی قابلِ قدر ہے، جس کا نام تقویم البلدان[54] ہے۔ اس کے مقدمے میں وہ زمین کے گول ہونے کی دلیلیں پیش کرتا ہے اور ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر اس کے گرد سفر شروع کیا جائے تو ایک دن کم یا زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ شامی مصنف بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے عہد کا سب سے بڑا مؤرخ اور جغرافیہ دان تھا[55]۔ ابوالفدا کا ایک معاصر اور ہموطن شمس الدین دمشقی تھا (وفات ۱۳۲۶ء یا ۱۳۲۷ء)، جس نے جغرافیۂ فلکی میں ایک رسالہ نخبۃ الدہر فی عجائب البرّ والبحر[56] لکھا۔ یہ ریاضیات کے اعتبار سے تو "تقویم" کو نہیں پہنچتا، لیکن طبعی، معدنیاتی اور نسلی معلومات کے لحاظ سے بہت قیمتی ہے۔ ایک اور مصنف ابن فضل اللہ العمری تھا، جو مملوکوں کے دربار میں وزیر مالیات رہا، پھر قاہرہ سے دمشق چلا آیا جہاں ۱۳۴۹ء کی وبا میں وفات پائی۔ اس کی دو کتابیں بڑی اہم ہیں۔ ایک مسالک الابصار فی ممالک الامصار[57] اور دوسری التعریف بالمصطلح الشریف[58] آخری کتاب میں منتظموں اور سیاست دانوں کے لیے ضروری معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔

مملوکی عہد میں دو اور ممتاز مؤرخوں کا نام آتا ہے، جنھیں شام سے تعلق پیدا ہوا۔ ایک مصر کا مقریزی، دوسرا تونیسیہ کا ابن خلدون[59]۔ مقریزی (۱۳۶۴ء۔ ۱۴۴۲ء) کی گراں قدر کتاب سے بار بار حوالے دیے جا چکے ہیں۔ وہ بعلبکی الاصل تھا اور دمشق میں پروفیسر رہا۔ اس کا نوجوان معاصر ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔ ۱۴۰۶ء) مصر میں قاضی القضاۃ تھا، پھر مملوک سلطان الناصر فرج کے ساتھ دمشق آیا۔ جب الناصر تیمور کے مقابلے کے لیے فوج لے کر آیا تھا، تیمور نے معزز مہمان کی حیثیت میں ابن خلدون کا استقبال کیا۔ مقدمہ اس

---

۵۱ کتبی جلد اول ص ۳۲۲، ۳۲۵۔

۵۲ قاہرہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۵۳ قسطنطنیہ سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

۵۴ پیرس سے شائع ہوئی اور اس کا ترجمہ بھی ہوا۔

۵۵ سارٹن جلد ۳ ص ۳۰۸۔

۵۶ روس سے شائع ہوئی اور اس کا ترجمہ بھی ہوا۔

۵۷ پہلی جلد احمد زکی نے شائع کی۔ اس کے متعلق دیکھیے عبد اللطیف حمزہ کی کتاب الحرکۃ الفکریۃ فی مصر فی العصرین الایوبی والمملوکی الاول ص ۳۲۴۔ ۳۲۷۔

۵۸ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۲ھ۔

کی جامع تاریخ[51] کی پہلی جلد ہے۔ اس کی بنا پر وہ اسلام میں فلسفۂ تاریخ کا سب سے بڑا ماہر ہونے کا حق دار ہے۔ تاریخی وقائع کی صحیح تعبیر، نیز قومی خصائل کا اثر اقتصادی، جغرافیائی، طبیعی اور دوسرے قواعد پر بیان کرنے کے لیے ابن خلدون سے پہلے کسی نے کوشش نہیں کی تھی اور ابن خلدون کے بعد کوئی اس کا لائق جانشین نہ ہوا۔

سیرت نگاروں، جغرافیہ نگاروں، مؤرخوں اور جامع کتابیں تیار کرنے والوں کی جو فہرست ہم پیش کر چکے ہیں، وہ ابن عساکر سے شروع ہو کر ابن خلدون پر ختم ہوئی۔ اس فہرست کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ ایوبی اور مملوکی دور میں شام و مصر کو وہ حیثیت حاصل ہوئی جو کسی دوسری اسلامی سرزمین کے حصے میں نہ آئی۔

تیمور

شام پر تاتاریوں کی یورشوں کا جو طویل سلسلہ شروع ہوا تھا، ان میں سے آخری یورش تیمور لنگ کی تھی۔ تیمور چنگیز خاں کے اخلاف میں سے ہونے کا مدعی تھا۔[52] وہ اپنے عساکر کو لے کر ایک بے پناہ طوفان کی طرح وسط ایشیا سے اٹھا اور مغربی ایشیا میں پہنچ گیا۔ جہاں جہاں سے ان کا گزر ہوا، اپنے پیچھے تباہی و بربادی چھوڑتے گئے۔ اب چوتھی یا پانچویں دفعہ شام تاتاریوں کے پاؤں پر بے حس و حرکت اور بے یار و مددگار گرا پڑا تھا۔ اکتوبر ۱۴۰۰ء میں حلب کو تین روز تک غارت گری کا تختۂ مشق بنائے رکھا۔ اس کا بالاحصار غالباً تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ہی ہلّے میں فتح کر لیا گیا، کیونکہ حملہ آور نے خندقوں کو لاشوں سے بھرنے کے لیے اپنے آدمی بے دریغ قربان کر دیے۔ بیس ہزار باشندگانِ شہر تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ کٹے ہوئے سروں سے ایک چبوترا بنایا گیا، جو دس ذراع چوڑا، اتنا ہی لمبا اور اتنا ہی اونچا تھا۔[53] شہر کی وہ بے مثال درس گاہیں، جو نوریوں اور ایوبیوں نے بنوائی تھیں، ہمیشہ کے لیے برباد کر دی گئیں۔ سلطان فرج کی فوج نے شکست کھائی اور دمشق کا راستہ حملہ آور کے لیے صاف ہو گیا۔ بالاحصار نے ایک مہینے تک مقابلہ جاری رکھا۔ جوانگی کی شرطوں کو پامال کرتے ہوئے شہر کو لوٹا گیا اور نذرِ آتش کر دیا گیا۔ تیس ہزار مرد، عورتیں اور بچے مسجد میں بند کر دیے گئے، پھر اسے آگ لگا دی گئی۔ عمارت کی صرف دیواریں باقی رہ گئیں۔ دمشق کے اربابِ فن میں سے بہترین علماء، کاریگر، فن کار، اسلحہ ساز، فولاد ساز[54] اور شیشہ گر تیمور کے دارالحکومت سمرقند بھیج دیے گئے، تاکہ ان فنون اور دوسرے فنون کی ترویج کا بندوبست وہاں ہو جائے۔ دمشق کا منصبِ قیادت چھن گیا۔ ابن تغری بردی کا باپ سلطان فرج کا اسلحہ بردار تھا۔ اس نے مہم شام کے تمام حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔[55] غالباً یہ سب سے کاری ضرب تھی، جو اس ملک پر نہیں تو اس شہر (دمشق) پر پڑی۔ ۱۴۰۲ء میں وحشی فاتح نے عثمانی فوج کو انقرہ کے میدان میں تباہ کیا، بروصہ اور سمرنا پر قبضہ کیا اور بایزید اول کو قید کر لیا۔[56] مملوکوں کی خوش نصیبی تھی کہ ۱۴۰۵ء میں تیمور مر گیا۔ اس کے جانشینوں نے اپنی قوت داخلی

---

[51] چھٹی جلد کے ص ۹، ۳ کے بعد اس کے خود نوشت حالات بڑی عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں اور اس کے متعلق اچھا ماخذ ہیں۔

[52] عجائب المقدور فی اخبار تیمور از ابن عرب شاہ ص ۶۔

[53] ابن تغری بردی جلد ۶ حصہ دوم ص ۵۲، ابن الیاس جلد اول ص ۳۲۷۔

[54] خام لوہا غالباً لبنان سے آتا تھا۔

[55] جلد ۶ ص ۵/۱۴۱، ۵۰، حصہ دوم، میرخوند: تاریخ روضۃ الصفا کتاب ششم، مقریزی جلد ۲ ص ۲۴۱۔

[56] ابن عرب شاہ ص ۶، ابن الیاس جلد اول ص ۳۳۴، جلد ۳ ص ۴۸۔

رزم وپیکار میں ضائع کر دی، اس طرح سلطنت عثمانیہ کو ایشیائے کوچک میں اور صفویوں کو ایران میں اپنی قوتیں منظم کر لینے کا موقع مل گیا۔

عثمانی، مملوک اور صفوی

مملوکوں اور عثمانیوں کے درمیان مغربی ایشیا میں برتری حاصل کرنے کے لیے رقابت پندرھویں صدی کے نصف ثانی میں برورئے کار آئی اور صفوی سلطنت سولھویں صدی میں اس اکھاڑے کے اندر پہنچی۔ عثمانیوں اور مملوکوں کے تعلقات محمد ثانی اور "خوش قدم" (۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۷ء) کے زمانے میں بگڑے، جو دوسرے چرکسی مملوکوں کے برعکس یونانی الاصل تھا[۵۱] اور محمد ثانی قسطنطنیہ کا فاتح تھا[۵۲] تاہم ۱۴۸۶ء تک لڑائیاں شروع نہ ہوئیں۔ ۱۴۸۶ء میں قائت بائے نے ادنہ، طرسوس اور دوسرے سرحدی مقامات کے لیے جنگ شروع کر دی۔ اس سلطان نے اپنے عہدِ حکومت کے آخری دور میں پوپ کو پیغام بھیجا کہ فرڈی نند ہسپانیہ میں اسلامی قوت کو تباہ کر رہا ہے، اس کے بدلے میں شامی مسیحیوں کے خلاف سخت جوابی کارروائیاں کی جائیں گی۔ اس سے تھوڑی دیر بعد عثمانیوں اور ایرانیوں کے درمیان لڑائیاں چھڑ گئیں۔ ان میں صفوی فوج بہت جلد تباہ ہو گئی اور سلیم اوّل (۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء) نے عراق پر قبضہ کر لیا، صفوی بڑے پرجوش شیعہ تھے، انھوں نے شیعیت کو سرکاری مذہب قرار دے لیا۔ سلیم نے مملوک سلطان قانصوہ الغوری (۱۵۰۱ء تا ۱۵۱۶ء) پر یہ الزام لگایا کہ اس نے میرے خلاف (سلیم کے خلاف) صفویوں سے معاہدہ کر لیا ہے اور بہت سے سیاسی مفرورین کو اپنے ہاں پناہ دے دی ہے۔

مرج وابق کی فیصلہ کن جنگ

اس اثناء میں قانصوہ نے اس عذر کے ساتھ شمالی جانب کوچ کیا کہ ایران و ترکی کے درمیان ثالثی کے فرائض انجام دے[۵۳]۔ اس کی سلطنت کے قاضی القضاۃ اور خلیفہ المتوکل اس کے ساتھ تھے۔ یہ خلیفہ المستنصر کی اولاد میں سے تھا، جو آخری خلیفۂ بغداد کا چچا تھا اور جسے بیبرس نے ۱۲۶۱ء میں قاہرہ کے اندر منصبِ خلافت پر بٹھایا تھا۔ بیبرس کے نزدیک اپنی بادشاہی کے لیے وجہ جواز پیدا کرنے اور اپنے دربار کو تمام دوسری اسلامی مملکتوں کے درباروں پر فوقیت دینے کی یہی صورت تھی[۵۴]۔ قانصوہ نے سلطان سلیم کے پاس ایک قاصد بھیجا، سلطان نے اس کی ڈاڑھی منڈوائی، لنگڑے گدھے پر سوار کرایا اور اعلانِ جنگ دے کر قانصوہ کی طرف واپس بھیج دیا۔

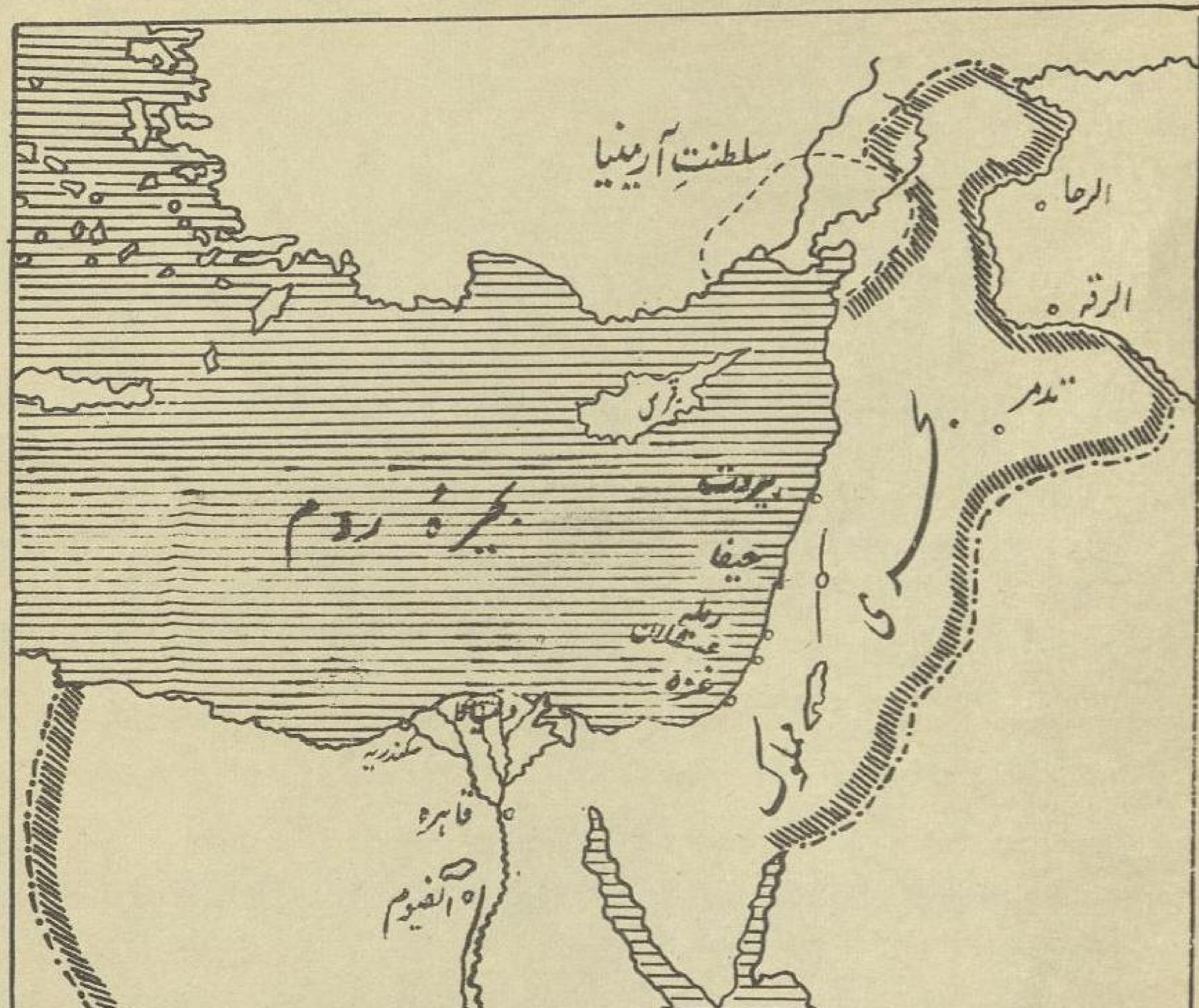
ترکی سلطان اور مملوک سلطان کی فوجیں ۲۴۔ اگست ۱۵۱۶ء کو مرج وابق کے خون آلود میدان میں معروف جنگ ہوئیں، جو حلب کے شمال میں ہے۔ قانصوہ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ اس نے قائت بائے کے غلام کی حیثیت میں زندگی شروع کی تھی، وہ بڑی مردانگی سے لڑا، مگر کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ نہ اسے شامی گورنر کی وفاداری پر بھروسا تھا اور نہ وہ ناقابلِ شکست ینی چری کا مقابلہ کر سکتا تھا

۵۱۔ ابن تغری بردی جلد ۷، ص ۶۸۵۔

۵۲۔ مترجم — مطلب یہ ہے کہ قسطنطنیہ کو محمد فاتح نے یونانیوں سے چھینا، اس وجہ سے یونانی الاصل مملوک "خوش قدم" کو اپنے ہم قوموں کی شکست کے باعث محمد فاتح سے کاوش پیدا ہوئی۔)

۵۳۔ القرمانی "اخبار الدول" ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

۵۴۔ مقریزی کا ترجمہ ص ۱۴۶-۱۴۸، ابن خلدون جلد ۵ ص ۳۸۲-۳۸۳، ابوالفدا جلد ۳ ص ۲۲۲ سیوطی حسن المحاضرہ ص ۴۹، ۵۷، ابن الیاس جلد اوّل ص ۱۰۰-۱۰۱۔



سلطنتِ آرمینیا
الرحا
الرقہ
تدمر
قبرص
بحیرۂ روم
بیروت
حیفا
رملہ
عسقلان
غزہ
اسکندریہ
قاہرہ
الفیوم
اسوان
مدینہ
مکہ
مملوک سلطنت
چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں
0 50 100 200 300

جن کا سازو سامان جنگ بھی اعلیٰ تھا۔ حلب کے غدار گورنر نائر بے کو میسرہ کی کمان دی گئی تھی۔ اس نے پہلے ہی حملے میں اپنے آدمیوں کے ساتھ مملوک سلطان کا ساتھ چھوڑ دیا[۵۱] ترکی فوج نے توپیں، بندوقیں اور دور سے مار کرنے والے دوسرے ہتھیار مصری فوج کے خلاف استعمال کیے۔ وہ فوج زیادہ تر بدوؤں اور شامیوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ ان ہتھیاروں سے ناواقف تھے یا انھیں استعمال کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جنگ میں ذاتی شجاعت و مردانگی ہی اصل شے تھی، جیساکہ پرانے زمانے سے سب سمجھتے آتے تھے۔ ترکوں نے بارود بھی استعمال کی[۵۲] اور بھاری توپیں بھی، جو گاڑیوں پر سوار تھیں اور گھوڑے انھیں کھینچتے تھے[۵۳] جنگ کی گرم جوشی میں قانصوہ پر سکتۂ قلب کا حملہ ہوا اور وہ گھوڑے سے گر گیا۔ سلیم کو فتح کامل حاصل ہوئی۔ اس نے خلیفہ کو گرفتار کر لیا اور اسے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ باقی رہا یہ دعویٰ کہ خلیفہ نے منصب خلافت سلطان کے حوالے کر دیا تو یہ انیسویں صدی کا ایک افسانہ ہے۔ سلیم کو حلب کے قلعے سے مملوکوں کا خزانہ ملا، جو لاکھوں دینار پر مشتمل تھا۔ وسط اکتوبر میں وہ دمشق پہنچا۔ شام پر چپ چاپ عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا، جو چار سو سال تک قائم رہا۔ اس کے باشندوں نے نئے آقاؤں کو پرانے آقاؤں سے نجات دلانے والے مان لیا اور ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ پہلے بھی یہی کرتے رہے تھے۔

مملوکوں کا خاتمہ

شام سے عثمانی فوج جنوب کی جانب کوچ کرتی ہوئی مصر پہنچی، جہاں قانصوہ کے ایک غلام طومان بے کی سلطانی کا اعلان ہو چکا تھا۔ ۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء کو دونوں فوجیں (مصری اور عثمانی فوجیں) قاہرہ کے باہر برسرپیکار ہوئیں۔ مصری فوج پر گولیوں اور گولوں کی ایسی بھرمار ہوئی[۵۴] کہ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ طومان بے نے بھاگ کر بدُّوؤں کے پاس پناہ لی۔ وہاں غداری سے اسے گرفتار کرا دیا گیا اور قاہرہ کے ایک دروازے پر پھانسی دے دی گئی[۵۵] مصر کی سیادت و آزادی ختم ہو گئی۔ الحجاز اور اس کے دونوں مقدس شہر (حرمین شریفین) "تحت قیصریہ" سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گئے۔ جمعہ کے خطبے میں مصری خطیب نے فاتح عالم کے لیے ان الفاظ میں خدا سے دعا کی۔

"اے اللہ! سلطان ابن سلطان، الملک المظفر سلیم شاہ کا حامی و ناصر ہو، وہ برین و بحرین کے مالک ہیں۔ انھوں نے دونوں گروہوں کو شکست دی۔ وہ دونوں عراقوں کے بادشاہ ہیں۔ وہ حرمین شریفین کے خادم ہیں۔ اے اللہ انھیں نصر عزیز سے سرفرازی بخش، انھیں فتح مبین عطا کر، اے دنیا اور آخرت کے مالک، اے جہانوں کے پروردگار، یہ دعا قبول فرما"[۵۶]

دنیائے عرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، یہ عثمانی ترکوں کے اقتدار کا دور تھا۔

---

۵۱ ابن الیاس جلد ۳ ص ۴۶، ۵۱۔

۵۲ بارود چین میں ایجاد ہوئی تھی۔ ۱۲۴۸ء میں تاتاریوں نے اسے یورپ پہنچایا، جہاں آتش بار آلات تیار ہوئے۔ دیکھیے سارٹن جلد ۳ ص ۲۲، ۷۲۳، ۷ شام کی تاریخ میں توپوں کے استعمال کا پہلا ذکر یحییٰ نے کیا (ص ۲۲۹) یعنی جب جینوا کے ملاحوں نے ۱۳۸۲ء میں بیروت میں گولہ باری کی تھی۔

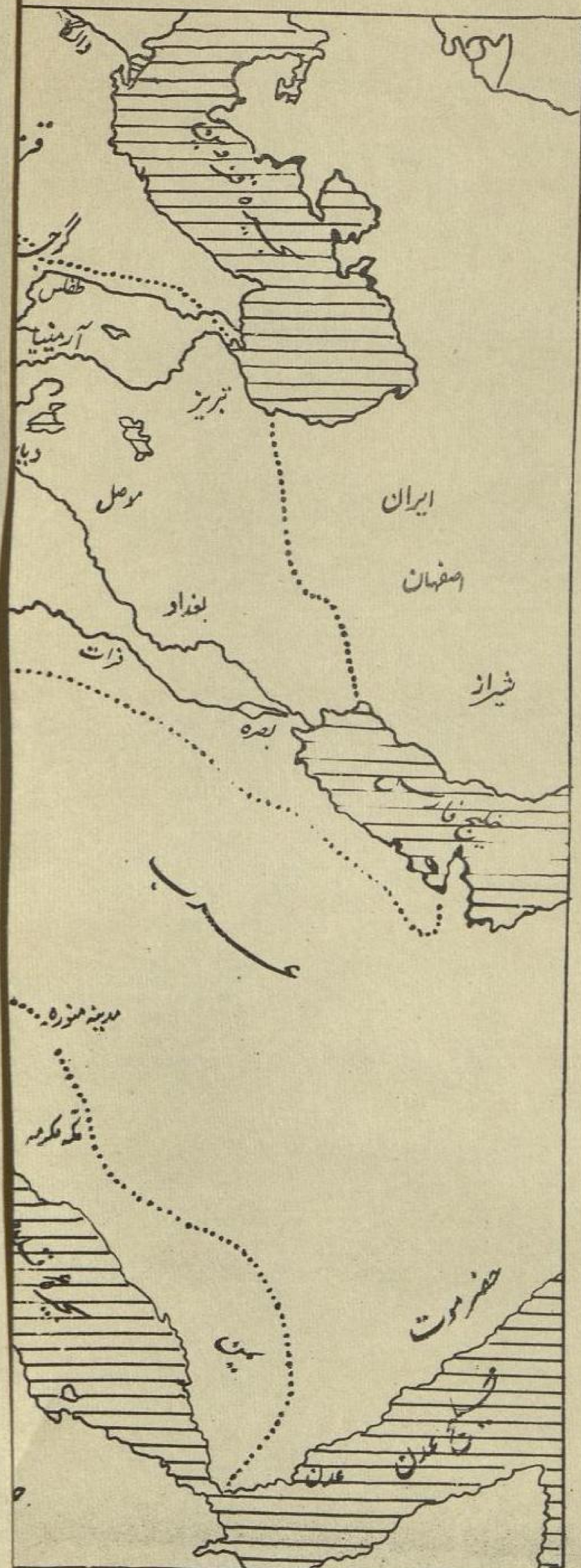
۵۳ قرمانی ص ۲۲۰۔ ۵۴ ابن الیاس جلد ۳ ص ۹۷۔

۵۵ ابن الیاس جلد ۳ ص ۱۱۵، سیوطی جلد ۲ ص ۹۰، قرمانی ص ۲۲۰، سعد الدین: تاج التواریخ جلد ۲ ص ۳۶۱۔

۵۶ ابن الیاس جلد ۳ ص ۹۸۔

حصّۂ پنجم

عثمانی ترکوں کا اقتدار


ایران
اصفهان
شیراز
تبریز
موصل
بغداد
فرات
بصره
آرمینیا
طفلس
خلیج فارس
عرب
مدینهٔ منوره
مکهٔ مکرمه
یمن
حضرموت
عدن

اڑتالیسواں باب

شام، ترکی ولایت کی حیثیت میں

سلطنتِ عثمانیہ

چودھویں صدی کے اوائل میں مغربی ایشیائے کوچک کے اندر ایک چھوٹی سی ترکی سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس نے آئندہ دو صدیوں کے اندر مغربی ایشیا، جنوبی و مشرقی یورپ اور شمالی و مشرقی افریقہ میں مقتدر حیثیت حاصل کر لی۔ اس سلطنت کا ظہور عہد حاضر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے لفظ ترک سب سے پہلے سنہ ۵۰۰ء کے آس پاس وسط ایشیا کے ایک خانہ بدوش گروہ کے لئے استعمال ہوا تھا چھٹی صدی عیسوی میں ترک چھوٹی چھوٹی خانہ بدوش ریاستیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کا سلسلہ منگولیا اور شمالی سرحد چین سے بحیرۂ اسود تک پھیلا ہوا تھا۔ عربوں کا انحصار اونٹ پر اور ترکوں کا انحصار گھوڑے پر تھا وہ اسی جانور کا دودھ پیتے، اسی کا گوشت کھاتے اور اسی پر سوار ہو کر فتح و ظفر کے پرچم اڑاتے وہ رکابوں، کمانوں اور تیروں سے کام لیتے۔ دشمن کے مقابلے میں ان کی برتری کا راز تھا کہ نقل و حرکت میں وہ بڑے تیز تھے۔ ترکستان میں ان کا ربط ضبط ہندی و یورپی گروہوں سے ہوا۔ اسی خطے کے اندر ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل میں عرب فاتحین کو پہلی مرتبہ ترکی زبان بولنے والے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ آخر جب وہ گروہ ایشیائے کوچک پہنچا جو عثمانی کہلایا تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان کی برادری کی ایک اور شاخ سلجوقی پورے علاقے کو ترکیت کے رنگ میں رنگ چکے تھے سلجوقی اور عثمانی دونوں کا تعلق قبیلہ غزیا وفاق قبائل غز سے تھا۔

عثمانی سلطنت اور عثمانی خاندان کا بانی ایک نیم تاریخی قائد عثمان تھا (سنہ ۱۲۹۹ء-سنہ ۱۳۲۶ء)[1] جس کے نام سے، بشرطیکہ اسے صحیح مان لیا جائے ظاہر ہوتا ہے کہ قبیلہ یا تو اس وقت اسلام لا چکا تھا یا لا رہا تھا۔ قبول اسلام کے ساتھ ہی ہزاروں مذہبی، علمی اور ادبی اصطلاحیں عربی سے اور بعض فارسی سے ترکی زبان میں منتقل ہو گئیں۔ اس زبان میں تحریر کا سرمایہ بہت کم تھا۔ اب اس کے لئے عربی حروف اختیار کر لئے گئے جو سنہ ۱۹۲۸ء میں مصطفیٰ کمال کی اصلاحات تک قائم رہے اپنے قیام سے چھیاسٹھ سال بعد، یعنی سنہ ۱۳۰۰ء کے آس پاس عثمانی ریاست کی حیثیت ایک سرحدی امارت کی تھی جس کا دارالحکومت سنہ ۱۳۲۶ء کے بعد بروصہ بن گیا تھا۔ سنہ ۱۳۲۶ء سے سنہ ۱۴۵۳ء تک یہ ایک بادشاہی تھی جس کا مرکز ادرنہ تھا۔ محمد ثانی نے (سنہ ۱۴۵۱ء-سنہ ۱۴۸۱ء) جو فاتح کے لقب سے مشہور ہیں سنہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا تو ایک جلیل الشان سلطنت وجود میں آ گئی۔ یوں مسلمان ترکوں کی یہ حکومت بیزنطینی سلطنت کی وارث بن گئی۔ بعد ازاں اس نے عربی خلافت کے مختلف حصے بھی اس میں شامل کر لئے۔ سلطنت عثمانیہ نے انتہائی وسعت و عظمت سلیمان عالی شان (سنہ ۱۵۲۰ء-سنہ ۱۵۶۶ء) بن سلیم اول فاتح شام و مصر کے عہد حکومت میں حاصل کی۔ سلیمان کو سلیمان قانونی بھی کہتے ہیں۔ سلیمان ہی کے زمانے میں ہنگری کا بڑا حصہ مسخر ہوا، وی آنا کا محاصرہ کیا گیا، روڈز نہ

---

[1] اس سلسلے میں دیکھئے محمد فواد کوپرولو کی فرانسیسی کتاب، ص ۷۸ سے آگے، نیز پال وٹک اور جوزف فان ہیمر کی انگریزی اور جرمن کتابیں۔

پر قبضہ جما لیا گیا اور شمالی افریقہ نے باستثنائے مراکش "باب عالی" (مرکز دولت عثمانیہ) کا سیاسی اقتدار تسلیم کر لیا۔ ۱۶۸۳ء میں ویانا پر قبضہ کی دوسری کوشش کی گئی، لیکن یہ بھی ناکام رہی اور یہیں سے انجام کا آغاز ہو گیا۔ سلیمان کے زمانے میں سلطنت بوڈاپسٹ (برلبِ دریائے ڈینیوب) سے بغداد (برلبِ دریائے دجلہ) تک اور کریمیا سے دریائے نیل کی پہلی آبشار تک پھیلی ہوئی تھی۔ عہد حاضر میں مسلمان ایسی کوئی دوسری سلطنت قائم نہ کر سکے۔ پھر یہ نہایت پائدار اسلامی سلطنتوں میں سے تھی ۱۳۰۰ء سے ۱۹۲۲ء تک چھتیس سلطان یکے بعد دیگرے حکمران رہے اور وہ سب عثمان اول کے اخلاف تھے۔

شام کے انتظامی حلقے

سلطان سلیم اوّل (۱۵۱۲ء ۔ ۱۵۲۰ء) نے عربی دنیا کو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کیا۔ مرج دابق کی فیصلہ کن فتح کے بعد سلیم فاتحانہ حماۃ اور حمص میں داخل ہو گیا۔ دونوں شہروں نے سجاگی قبول کی پھر طرابلس، صفد، نابلس، یروشلم اور غزہ سب نے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ کسی نے خفیف سی بھی مزاحمت نہ کی[1]۔ مصر سے واپس ہوتے ہوئے سلیم خاصی دیر شام میں ٹھہرا رہا، تاکہ اس کا قبضہ بخوبی پختہ ہو جائے اور مفتوحہ علاقوں کا مناسب انتظام کیا جا سکے۔ محاصل کی غرض سے اس نے ایک کمیشن مقرر کر دیا تاکہ زمین کی پوری پیمائش کرے۔ ساتھ ہی البقاع کے زرخیز میدان اور دریائے عاصی کی شاداب وادی جاگیرِ خاص کے طور پر محفوظ کر لی[2]۔ مملوکوں کے زمانے سے یہ سلسلہ چلا آتا تھا کہ زمینیں اس شخص کو دے دی جائیں۔ جو زیادہ سے زیادہ محاصل فراہم کر دینے کے لیے تیار ہوتا۔ یہ سلسلہ قائم رکھا گیا۔ ترک حنفی فقہ کو دوسرے دبستانوں پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے شام میں بھی اسی فقہ کو سرکاری درجہ دے دیا[3]۔ حلب کے ایک فقیہ ابراہیم الحلبی (وفات ۱۵۴۹ء) نے ملتقی الابحر نام ایک کتاب مرتّب کی جو پہلے پہل قسطنطنیہ میں شائع ہوئی۔ یہی کتاب سلطنت میں حنفی قانون کی دستاویز بن گئی۔

مملوکوں کے زمانے کی انتظامی تقسیم فی الجملہ قائم رکھی گئی البتہ نام ایک حد تک بدل دیے گئے۔ پہلے صوبوں کو نیابہ کہا جاتا تھا، اب انھیں ولایہ (ولایت) کہنے لگے۔ اسی طرح حاکم کا لقب نائب کے بجائے والی ہو گیا[4]۔ والی کے بعد سب سے بڑا اعزازی لقب پاشا کا تھا چنانچہ پاشائی اور ولایت مترادف اصطلاحیں بن گئیں[5]۔ ولایت حلب میں ایک موقع پر سات سنجاق[6] تھے۔ ولایت دمشق میں یروشلم، صفد اور غزہ کے مل جانے سے اضافہ ہو گیا اور اس ولایت کا انتظام جان بردی الغزالی کے حوالے ہوا، جس نے حماۃ کے نائب کی حیثیت میں مملوکوں سے غداری کی تھی اور حلب کے رفیق کی طرح الغوری سے بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس طرح غزالی عملاً پورے

---

[1] ابن الیاس جلد ۵ ص ۱۴۹

[2] محاصل کے لیے مزید معلومات حاصل کرنی مطلوب ہوں تو عمر لطفی برکان کی کتاب قانون نامہ ملاحظہ فرمائیے ص ۲۰۰ سے آگے۔

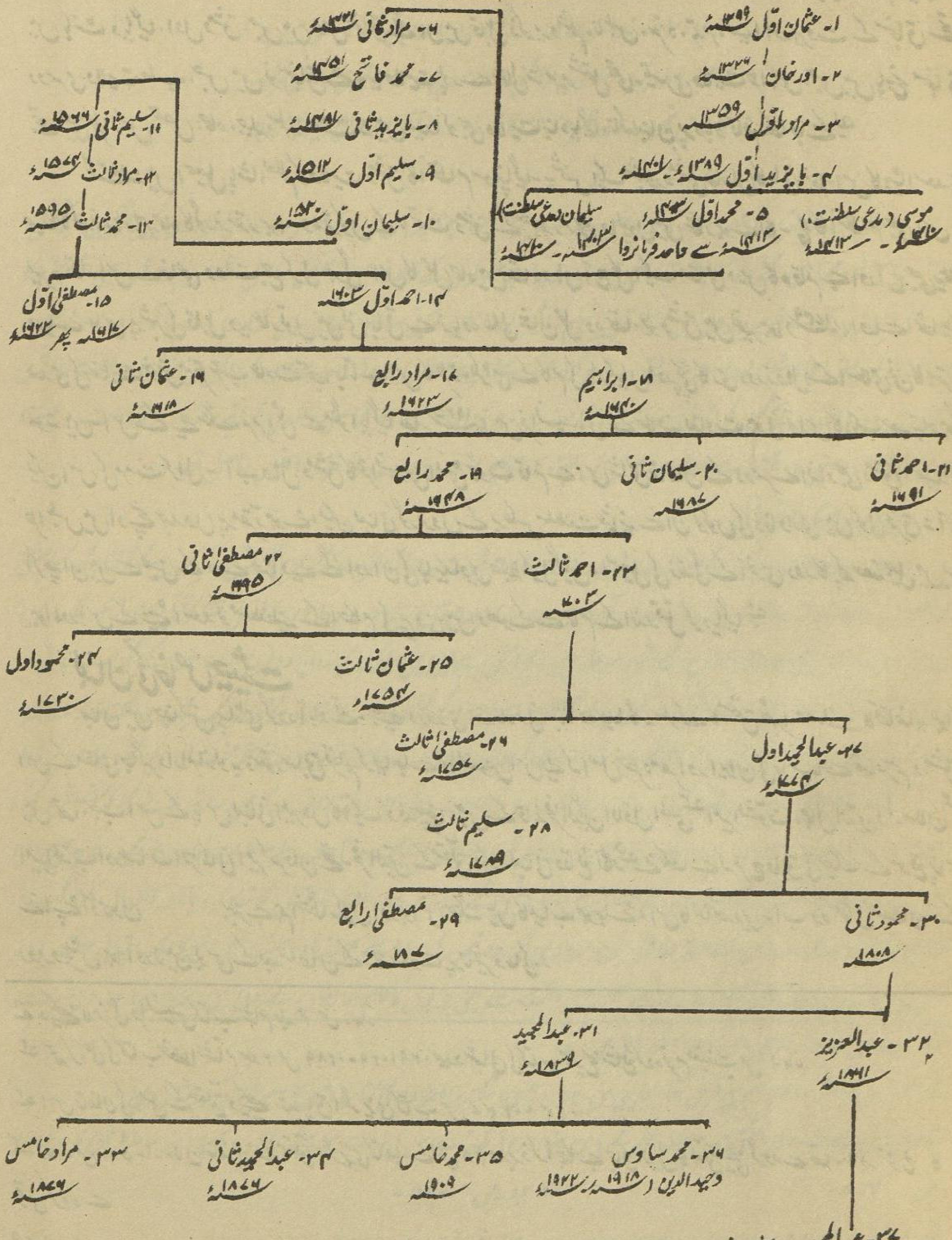
[3] ابن الیاس جلد ۵ ص ۲۳۸ الغزی کی کتاب الکواکب السائرہ باعیان المائۃ العاشرہ ص ۲۱۰۔

[4] متصرفیہ اور متصرّف کی اصطلاحیں بہت بعد میں رائج ہوئیں۔

[5] خان ہمیر جلد ۲ ص ۱۷۷، ترکی لفظ سنجاق (عربی سنجق) دراصل عربی لفظ لوا یعنی پرچم کا ترکی ترجمہ ہے۔ یہ تمام اصطلاحیں پہلے سے سلجوقی رائج کر چکے تھے۔

[6] فریدوں بے کی کتاب مجموعہ منشآت السلاطین طبع دوم ص ۴۵۵، ابن الیاس جلد ۵ ص ۱۵۶، ۱۵۷، اسعد الدین جلد ۲ ص ۲۶۴، ۲۶۵۔

شجرہ سلاطین عثمانیہ



شام کا نائب الحکومت بن گیا۔ اس ایک ولایت کے سوا باقی تمام انتظامی حلقے ترکوں کے حوالے کیے گئے۔ آگے چل کر شام کو تین ولایتوں میں بانٹ دیا گیا، اول دمشق، جس میں دس سنجاق تھے ان میں قابلِ ذکر یروشلم، نابلس، غزہ، تدمر، صیدا اور بیروت کے سنجاق تھے۔ دوسری ولایت حلب، جس میں نو سنجاق تھے۔ یہ ولایت پورے شمالی شام پر مشتمل تھی۔ تیسری ولایت طرابلس، جس میں پانچ سنجاق تھے یعنی طرابلس، حمص، حماہ، جبلہ، سلمیہ۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں صیدا کو بھی ولایت بنا دیا گیا، تاکہ لبنان پر دباؤ قائم رکھا جا سکے[1]۔

سنہ ۱۷۲۵ء میں اسمٰعیل پاشا العظم کو ولایت دمشق کا انتظام سونپا گیا۔ یہ شخص ایک مشہور دمشقی خاندان کا بانی ہوا۔ اس کا بیٹا اسعد پہلے صیدا کا گورنر رہا، پھر حماہ کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ ترکوں کے ماتحت دمشق کے مشہور ترین والیوں میں شمار ہونے لگا۔ حج کا انتظام بھی اس کے سپرد تھا۔ اس نے خاصی دولت جمع کر لی ہوگی۔ اس کا محل حماہ میں تھا۔ وہاں آج کل ایک مقامی درس گاہ قائم ہے اور آج بھی یہ عمارت دریائے عاصی پر شہر کی قابلِ دید عمارتوں میں گنی جاتی ہے زیادہ عالی شان محل وہ تھا، جو دمشق میں تعمیر ہوا (۱۷۴۹ء)۔ اوائل اٹھارھویں صدی کی نہایت خوش منظر عرب عمارت سمجھا جاتا ہے اس کا طرز، لکڑی کے کام کی باریکیاں اور پچی کاری دور زوال کے اسلامی فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس کے لیے سنگِ مرمر اٹلی سے منگوایا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں فرانسیسیوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس کا ایک حصہ تباہ ہو گیا، لیکن اس کی مرمت کرا لی۔ اب وہاں دمشق کا فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ قائم ہے اس شامی خاندان کے دوسرے افراد بھی دمشق، صیدا اور طرابلس میں اونچے عہدوں پر مقرر ہوئے، لیکن لبنانی گورنروں کے برعکس سلطنت عثمانیہ سے ان لوگوں کی وفاداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگرچہ ان میں سے بعض کے درجے گھٹا دیے گئے اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اسمٰعیل کی زندگی کے آخری دور کا کچھ حصہ جیل میں بسر ہوا اور اس کے بیٹے اسعد کو قسطنطنیہ کے احکام کی پیروی میں دھوکے سے حمام کے اندر قتل کر دیا گیا[2]۔

لبنان کی خاص حیثیت

لبنان میں جفاکش پہاڑی گروہ آباد تھے، جیسے دروزی اور مارونی، لہٰذا وہ جداگانہ سلوک کا مستحق ٹھہرا۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کے مقامی جاگیردار امراء کو بہ دستورِ سابق تسلیم کر لیا جائے، بالخصوص اس لیے کہ اصل خطرہ مصر اور ایران کی جانب سے تھا۔ سلیم دمشق میں تھا، جب اس کے پاس لبنانی امیروں کا ایک وفد پہنچا، جس کے قائد فخر الدین الاوّل المعنی[3] امیر الشوف، جمال الدین ارسلان[4] امیر الغرب اور عساف الترکمانی امیر کسروان تھے۔ فخر الدین کے متعلق ایک لبنانی وقائع نگار[5] نے لکھا ہے کہ مرج دابق کی جنگ کے موقع پر اس نے اپنے آدمیوں .... بہتر ہے ہم انتظار کریں اور جو اس جنگ میں کامیاب ہو جائے، اس کا ساتھ دیں۔ اب وہ عثمانی سلطان کے روبرو پیش ہوا اور زمین بوسی کے بعد سلطان کے لئے نہایت پرتاثیر دعا کی۔

---

[1] دیکھئے لامنز کی فرانسیسی کتاب شام جلد ۲ ص ۹۰۔

[2] محمد کرد علی کی کتاب خطط الشام جلد ۲ ص ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، حیدر شہابی کی کتاب تاریخ شائع کردہ نوم مغبغب ص ۷۶۹

[3] اس خاندان کی اصل کے متعلق دیکھیے شدیاق انگریزی کتاب ص ۲۴۷، ۲۴۸۔

[4] حیدر ص ۵۶۱۔ ارسلان خاندان کے متعلق انگریزی کتاب کے ص ۵۸۵ پر ذکر آچکا ہے جمال الدین کا تعلق یمنی گروہ سے تھا۔ اور تنوخ کا قیسی گروہ سے

[5] حیدر ص ۵۶۰۔

"اے اللہ اسے بقائے دوام بخش، جیسے تو نے اپنی مملکت کا انتظام سونپا، خلیفہ بنایا۔ اپنے عبادت گزاروں اور اپنی مقدس سرزمین پر اقتدار عطا کیا۔ سنن و فرائض اسے سونپے۔ وہ جو تیری روشن شریعت کا حامی نجیب اور ظفر مند قوم کا قائد، ہمارا آقا اور والی امیرالمومنین ہے.... [1]"

سلطان سلیم فخرالدین کی فصاحت اور اخلاص سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس کی اور دوسرے لبنانی امیروں کی جاگیریں بحال رکھیں۔ داخلی خودمختاری کے وہ تمام حقوق انھیں سونپ دیے جو مملوکوں کے زمانے میں انھیں حاصل تھے ان پر خراج بھی نسبتہً" ہلکا لگایا [2] فخرالدین کو کوہستانی سرداروں میں ممتاز ترین تسلیم کیا گیا۔ بعد ازاں عثمانی سلطان لبنانی باج گزاروں سے یا تو براہ راست معاملے طے کر لیتے یا والی شام کو واسطہ بنا لیتے۔ یہ باج گزار عملاً اپنے اپنے حلقوں میں آزاد رہے۔ ان کی جاگیریں پشت بہ پشت وارثوں کو ملتی رہیں اور انھوں نے کبھی کوئی فوجی خدمات انجام نہ دیں۔ اپنی رعایا سے وہ محاصل وصول کرتے، ضروری خدمات لیتے، بعض اوقات اجنبی طاقتوں سے معاہدے بھی کر لیتے۔ رعایا پر موت و حیات کا اختیار انھیں حاصل تھا۔

جان بردی الغزالی

جان بردی الغزالی نے نئی حکومت سے اپنی وفاداری کا پہلا ثبوت یہ دیا کہ العرب کے بحری [3] تنوخ سرداروں کو گرفتار کر کے دمشق کے قلعے میں رکھا کیونکہ وہ مملوکوں کے وفادار رہے تھے۔ اس نے صیدا اور البقاع کے عرب سردار ابن الحنش [4] کو قتل کرا دیا، کیونکہ اس نے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا اور البقاع کے شیعہ سردار ابن الحرفوش سے بھی یہی سلوک کیا۔ ان دونوں، نیز نابلس کے کوہستانی بدوؤں کے سر قسطنطنیہ بھیج دیے، لیکن جو شخص پہلے آقاؤں سے بدعہدی کر چکا تھا وہ نئے آقاؤں کا وفادار کب تک رہ سکتا تھا۔ ۱۵۲۰ء میں سلطان سلیم نے وفات پائی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جان بردی نے جامع اموی میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا الملک الاشرف لقب اختیار کیا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور اپنے سابق رفیق خائر بے کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی، جسے سلطان سلیم نے مصر کا نائب بنا دیا تھا، لیکن حلب نے کھلم کھلا الغزالی کی حمایت نہ کی اور نئے سلطان سلیمان نے ایک فوج بھیج دی جس نے ۲۷ جنوری ۱۵۲۱ء کو القابون کے میدان میں، جو دمشق کے قریب ہے، شامی باغیوں کو تباہ کر دیا اور الغزالی مارا گیا۔ شامی دارالحکومت اور اس سے ملحقہ علاقوں کو جو سزا دی گئی وہ تیموری سزا سے بھی زیادہ سخت تھی۔ شہر کا ایک تہائی حصہ اور آس پاس کے دیہات کاملاً تباہ کر دیے گئے [5] اس وقت سے یعنی چرکسوں کا نام شامیوں کے دل میں بربادی اور وحشت

---

[1] حیدر ص ۵۶۱، دوہی ص ۱۵۲، شدیاق ص ۱۵۱

[2] کسروان کا حصہ ۴۰۰۰ سنہری قرش تھا، دوہی ص ۱۵۲، عیسیٰ اسکندر المعلوف کی کتاب تاریخ امیر فخرالدین الثانی ص ۹۰

[3] ان میں سے ایک امیر دمشق میں سلطان سلیم کے پاس پہنچا اور عربی گھوڑے اس کی خدمت میں پیش کیے۔ دیکھیے ابن سباط کا ملخص تاریخ حیدر ص ۵۹۶۔

[4] حیدر ص ۵۹۶۔

[5] ابن الیاس جلد ۵ ص ۳۹۳، ۴۱۱، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۴۱۹، قرمانی ص ۱۶، ۲۱۷

کا مترادف بن گیا۔

نظم ونسق

عثمانیوں کے سیاسی نظریے کا جو عملی تصور عام والیوں کے ذہن میں تھا وہ یہ تھا کہ مفتوحہ اقوام خصوصاً غیر مسلم ایک ریوڑ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی گلہ بانی فاتح کے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوئے کرنی چاہیے۔ جو اصطلاحات عرب میں بدوؤں سے مستعار لی گئی تھیں وہی وسطِ ایشیا کے خانہ بدوشوں کی اولاد کے دل میں روایتی تصورات کی حیثیت اختیار کر گئیں، یعنی مفتوحہ گروہ مویشی اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ ان کا دودھ دوہنا چاہیے، ان کی اون اتارنی چاہیے۔ اور جب تک وہ کوئی خاص تکلیف نہ دیں انھیں زندگی بسر کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ لوگ زیادہ تر کسان، فن کار اور تاجر تھے۔ یہ بڑے بڑے فوجی یا انتظامی عہدوں کے آرزو مند ہو ہی نہ سکتے تھے۔ لیکن ریوڑوں کی نگہبانی کے لیے "کتوں" کی ضرورت تھی یہ "کتے" یا تو جنگی قیدیوں میں سے لیے جاتے تھے یا خرید کردہ غلاموں میں سے چنے جاتے تھے، یا ان مسیحی بچوں میں سے حاصل کیے جاتے تھے جو خراج کے طور پر آتے تھے پھر انھیں تعلیم و تربیت کے ذریعے سے مسلمان بنا لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں سے سالہا سال تک وار حکومت میں سخت خدمات لی جاتی تھیں۔ پھر ان کے درمیان شدید مقابلہ ہوتا۔ قدم قدم پر ان کے حالات کی خوب دیکھ بھال کی جاتی جو لوگ ذہنِ روشن کے مالک ہوتے انھیں انتظامی عہدوں کے لئے الگ کر لیا جاتا۔ جن لوگوں کے جسمانی قوی مضبوط ہوتے، انھیں فوج میں بھرتی کر لیا جاتا۔ ان میں سے بھی زیادہ جفاکش آدمیوں کو اس پیادہ فوج میں رکھا جاتا جسے ینی چری کہتے تھے سلطنت میں جن لوگوں کو اونچے درجے کے فوجی اور انتظامی عہدے دیے جاتے وہ ینی چریوں ہی میں سے لیے جاتے،[1] وزیر اعظم، امرائے بحر، سالارانِ فوج اور صوبائی گورنر سب ابتدائی زمانے میں غلام تھے اور مدت العمر غلام ہی رہے ان کی جانیں اور جاگیریں سلطان کے رحم و کرم پر ہوتیں وہ جب چاہتا اپنا حقِ ملکیت بے تامل استعمال کرتا۔ تاریخ ایسے کسی دوسرے نظام کی مثال پیش نہیں کر سکتی اس کی وجہ سے خاندانِ عثمان سلطنت میں امارت کا تنہا مرکز رہ گیا وہی تمام انتظامی اور رفاہی اختیارات کا واحد مالک تھا۔ علم انتظامی ترتیبات کی دوسری بنیاد مذہبی الحاق تھا زمانہ قدیم سے مشرقِ قریب کا معاشرہ نسل کی بنا پر نہیں بلکہ عقائد کی بنا پر مختلف طبقوں میں تقسیم تھا اور مذہبی جمعیت میں علاقہ نہیں، بلکہ خاندان تنظیم کا جوہر تھا اس فرض سے لوگوں کے دلوں میں مذہب اور قومیت نے چولی دامن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ عثمانی سلطنت میں ہر مذہبی گروہ کے لیے ملت کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی دو ملتیں سب سے بڑی تھیں ایک مسلمان اور دوسرے رومی، یعنی یونانی کلیسا کے پیرو مسیحی۔[3] ارمنوں اور یہودیوں کو

لہ البرٹ ایچ لائبیر A. H. Lyber The Government of the Ottoman Empire

Mille The Palace School of Muhammad the Conqueror

ٹلہ مترجم۔ مصنف نے نگہبانی کتے کی تعبیر بدیہی طور پر مسٹر ٹائنبی سے لی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مذہبی اور قومی تعصب کا نتیجہ ہے جس زمانے میں انتظامی تربیت کے لئے کوئی ادارہ نہ تھا عثمانی ترکوں نے ایسا ادارہ مہیا کیا اور اس سے بہترین طریق پر کام لیتے رہے یورپ میں کسی کو صدیوں تک ایسی توفیق نصیب نہ ہوئی باقی رہا یہ امر کہ آگے چل کر یہ سلسلہ بگڑ گیا تو سلطنت عثمانیہ کے بانی یا اس نظام کی ترتیب کے ذمہ دار ملزم نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ سلیمان اعظم کے دور میں حسن انتظام کی یہ کیفیت تھی کہ مسیحی آبادیاں درخواستیں اور التجائیں کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوتی تھیں

ٹلہ لفظ رومی کا اطلاق سلطنت عثمانیہ کی اس ساری رعایا پر ہوتا تھا جو یونانی کلیسا کی پیرو تھی خواہ اس کا تعلق کسی قومیت سے تھا یا کوئی زبان بولتی تھی سلجوقیوں نے اپنی اناطولی سلطنت کا نام رومی سلطنت رکھا تھا کیونکہ وہ علاقے مشرقی رومی سلطنت سے حاصل کئے گئے تھے۔

بھی جداگانہ ملتیں قرار دیا گیا تھا اسی نظام کے مطابق تمام غیر مسلم گروہوں کو الگ مذہبی جماعتوں کی حیثیت میں منظم کر دیا گیا تھا۔ ان کے اپنے مذہبی رئیس تھے جنھیں بعض اہم انتظامی حقوق حاصل تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محکوم اقلیتوں کے نظم و نسق کا خاص نظام موجود ہے۔ یورپ کے جو لوگ سلطنتِ عثمانیہ میں رہتے تھے، مثلاً اہلِ وینس، اہلِ ہالینڈ، اہلِ فرانس، اہلِ انگلستان، ان سب کے ساتھ ملتوں کی حیثیت سے سلوک ہوتا تھا۔ ۱۵۲۱ء میں سلیمان نے وینس سے ایک معاہدہ کیا، جس کی دفعات تیس تھیں۔ اس میں وہ تمام حقوق تسلیم کر لیے گئے جو اہلِ وینس کو پہلے سے بیزنطینیوں کے ماتحت حاصل تھے۔ فرانس نے چودہ سال بعد پہلی مرتبہ خاص مراعات حاصل کیں [1] ۱۵۸۰ء میں انگریزوں کو بھی ایسے ہی حقوق حاصل ہو گئے۔ جو چیزیں طاقتور سلطانوں سے مراعات کی حیثیت میں حاصل کی گئی تھیں، وہ کمزور سلطانوں کے عہد میں خاص اختیارات کی حیثیت حاصل کر گئیں۔ یہی مراعات آگے چل کر اجنبیوں کے لیے خصوصی ملکی اختیارات کا مدار بن گئیں۔ یہ بڑا ہی ذلت خیز ادارہ تھا جو سلطنت کے انحلال تک قائم رہا۔

خرابیاں اور سعیِ اصلاح

عثمانیوں کے والی مملوکوں کے نائبوں سے عملاً بہتر نہ تھے۔ مملوک بھی اپنے تمام نائب غلاموں ہی میں چنتے تھے، پھر یہ والی مرکزی حکومت سے خاصے فاصلے پر رہتے تھے اور اس کے اثر و اقتدار سے خاصے آزاد تھے۔ لیکن اس سے فرق نہ پڑتا تھا۔ خرابیاں مرکز میں بھی کافی تھیں اور ولایتوں میں بھی۔ والی عموماً روپے دے کر عہدے حاصل کرتے تھے اور ان کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا تھا کہ اپنے فوائد کا دائرہ جس حد تک ممکن ہو، بڑھا لیں۔ ایسے لوگ بھی تھے جو قسطنطنیہ واپس جاتے تو انھیں موت اور املاک کی ضبطی سے سابقہ پڑتا۔ چونکہ عہدوں پر قائم رہنا یقینی نہ تھا، اس لیے خرابیوں میں اضافہ ہو گیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ابتدائی ایک سو چوراسی سال میں دمشق کے لیے ایک سو چونتیس والی مقرر ہو کر آئے، جن میں سے صرف تینتیس ایسے تھے جو دو دو سال والی رہے [2]۔ حلب کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ وینس کا ایک قونصل بتاتا ہے کہ تین سال میں یکے بعد دیگرے نو پاشا مقرر ہو کر آئے [3]۔ بعض اوقات پاشا مرکزی حکومت سے بے پروا ہو کر باہم خونریزی پر تل جاتے۔ کبھی کبھی بدوی چیرہ دستیاں ولایتوں میں آ نکلتے تو لوگوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہو جاتا۔ لیکن اکثر لوگ بہ ظاہر اپنی تقدیروں پر قانع ہو گئے تھے۔ عام روش یہ تھی کہ لوگ چپ چاپ سب کچھ قبول کرتے جاتے۔ ان کی امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ لیڈروں پر اعتماد زائل ہو چکا تھا اور کوششوں کے نتائج کی طرف سے وہ بالکل مایوس تھے۔ بغاوت کی وہ پرانی روح جو عباسیوں اور فاطمیوں کی بدنظمی پر بروئے کار آتی رہی، بہ ظاہر عثمانیوں کے ماتحت مر چکی تھی۔ سلجوقی ترکوں کے زمانے میں قرونِ مظلمہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ ان کی تاریکی عثمانی ترکوں کے زمانے میں بڑھ رہی تھی۔ یورپ عہدِ تنوّر میں قدم رکھ رہا تھا۔ شام عثمانی تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مار رہا تھا [4]۔

سرکاری عہدہ داروں کی ناجائز کارروائیوں کو روکنے اور وسیع پیمانے پر اصلاحات جاری کرنے کی ضرورت کا احساس مصطفیٰ کو پریلو کو ہو گیا تھا جو ۱۶۸۹ء سے ۱۶۹۱ء تک وزیر اعظم رہا۔ اسی نے سب سے پہلے نئے ضوابط جاری کیے تھے جو غیر مسلموں سے

---

[1] شرائط کے لیے دیکھیے de Testa. کی فرانسیسی کتاب جلد اوّل ص ۱۵ سے آگے

[2] لانس جلد ۲ ص ۶۲

[3] Relaziom ص ۱۲۱

[4] المترجم۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے اور دوسرے پہلو پیشِ نظر نہیں رکھے گئے۔

بہتر سلوک کا پیش خیمہ تھے پھر تین سلطانوں نے انھیں اصولوں پر اصلاحات جاری کرنے کی کوشش کی، اوّل سلطان سلیم ثالث (۱۷۸۹ء - ۱۸۰۷ء میں) دوم محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) اور سوم عبد المجید اول (۱۸۳۹ء - ۱۸۶۱ء) لیکن اصلاحات کے یہ تمام ضابطے کاغذوں پر سیاہی کے نقوش ہی بنے رہے۔ سلطان سلیم کے ضابطۂ اصلاحات کا نام "نظام جدید" تھا۔ ینی چریوں اور رشوت خور عہدہ داروں نے اس ضابطے کی مخالفت کی۔ عبد المجید کی اصلاحات کا نام "خط شریف گل خانہ" تھا (۱۸۳۹ء)، ۱۸۵۶ء میں اس نے دوبارہ ایک فرمان جاری کیا، تاکہ ان پابندیوں کو دور کر دے جو رعایا کے بعض طبقات کے لئے تکلیف کا باعث تھیں۔ تمام رعایا کے لیے بلا لحاظ مذہب وملت جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا بندوبست کر دے، مالیے کے لیے اجارہ داری باقی نہ رکھے اور ہر طبقۂ رعایا کے ساتھ قانون کے رو سے سلوک ہو، خواہ اس کا تعلّق کسی ملت سے ہو اور خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو۔ یہ ضابطہ "خطِ ہمایوں" کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن ان تنظیمات پر موثر عمل درآمد کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ قدامت پسند علماء نے جنھیں خاصا اقتدار حاصل تھا، ان کی مخالفت کی، اجنبی جنھیں مداخلت کے مواقع حاصل تھے، ان اصلاحات کو پسند نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ یہودی اور مسیحی صراف بھی ان سے اختلاف رکھتے تھے خصوصاً بعض ان پہلوؤں سے جن کا تعلّق محاصل کی اجارہ داری سے تھا، سلطان سلیم نے اصلاحات کی جو کوشش کی [۵۱] اور وہ اپنے پیشرؤوں کی طرح بے دست و پا نہ تھا۔ اس کی وجہ سے وہ معزول ہوا۔ سلیم کے بعد اس کا چچا زاد بھائی مصطفیٰ رابع، پھر محمود ثانی تخت نشین ہوا جو عہد حاضر کے سلاطین میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے جون ۱۸۲۶ء میں توپوں کا رخ ان بارکوں کی طرف پھیرا جن میں ینی چری رہتے تھے اور ان سب کو تباہ کر ڈالا۔ یہ ایک قومی خدمت تھی، جو اس نے انجام دی [۵۲] یہی محمود تھا جس نے سر کے لئے طربوش (ترکی ٹوپی) تجویز کی اور عجیب امر یہ ہے کہ رعایا اس سلطان کو گبر [۵۳] کہتی تھی۔

ناکام دستوری کوششیں

ان سلطانوں کے بعد جس شخص نے آزاد خیالی اور اصلاحات کا بیڑا اٹھایا، وہ وزیر اعظم مدحت پاشا تھا۔ مدحت نے خدمت عامہ کے میدان میں قدم رکھا تو بائیس سال کی عمر تھی۔ اسے سب سے پہلے دمشق میں ایک سرکاری عہدہ ملا۔ وہ سالہا سال تک بڑی سرگرمی سے مگر خفیہ خفیہ اپنے چند ہم نواؤں کے ساتھ مل کر ملک کو دستوری نظام دلانے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ ان کوششوں کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان مراد خامس نے ۱۵ جولائی ۱۸۷۶ء کو ایک اعلان جاری کیا، جس میں پہلی مرتبہ دستور اساسی یا قانون اساسی کی اصطلاح استعمال کی۔ مراد تین مہینے کی حکومت کے بعد دیوانہ ہو گیا اور اس کا بھائی عبد الحمید ثانی تخت نشین ہوا، جس نے ۲۳ دسمبر کو ایک اعلان کے ذریعے سے دستور اساسی کے نفاذ اور نمائندہ پارلیمنٹ کی ترتیب کا حتمی اقرار کیا۔ اس کا مسودہ مدحت پاشا نے بہ حیثیت وزیر اعظم تجویز کیا تھا اور یہ قانون اساسی فرانس اور بلجیم کے نمونے پہ بنایا گیا تھا۔ اس میں واضح کر دیا گیا تھا کہ تمام افراد رعایا عثمانی کہلائیں گے شخصاً

---

[۵۱] اس کے پیشرو عبد المجید اول نے ولی عہد کو نظر بند رکھنے سے انکار کر دیا، حالانکہ انھیں ایک خاص کوشک میں بند رکھا جاتا تھا، جس کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ ایک اطالوی لفظ ہے، اسے غلطی سے "سرائے" سمجھا جاتا ہے۔

[۵۲] مترجم۔ یقیناً غیر مسلم اسے "خدمت" ہی قرار دیتے ہیں، خصوصاً مسیحی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ ینی چریوں نے بدنظمی سے بڑی مصیبتیں برپا کیں تاہم یہ بھی درست ہے کہ اس طرح ترکی کی سب سے بڑی جنگی قوت تباہ ہو گئی)

[۵۳] (مترجم۔ کتاب میں لفظ Giaur لکھا ہے یہ لفظ غالباً گبر ہے مجھے فارسی زبان کا کوئی لفظ Giaur نہیں ملا جس کے معنی کافر کے ہوں۔

سب آزاد ہوں گے اور اسلام سرکاری مذہب ہوگا۔ اس کے مطابق تمام مذاہب کے لیے تحفظ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اخباروں کو قانونی حدود کے اندر آزادی دے دی گئی تھی نمائندگی عوام کا اصول طے ہوگیا تھا۔ ایک پارلیمنٹ تجویز ہوئی تھی جس کے دو ایوان رکھے گئے تھے، ایک نیابتی ایوان شیوخ۔ یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ ایوان نیابت کے نمائندے ہر چار سال کے بعد چنے جائیں گے اور ہر نمائندے کا حلقہ پچاس ہزار ووٹروں پر مشتمل ہوگا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ عبدالحمید ایسا دستور نافذ کرنے پر صرف اس لیے راضی ہوگیا تھا کہ اس کے اقتدار میں تصرف کا جو خطرہ رونما ہوا تھا وہ ٹل جائے اور مغربی یورپ کے ملکوں کی ہمدردی حاصل کی جا سکے۔ رعایا کے حالات کی بہتری سے اسے کوئی غرض نہ تھی آئندہ فروری میں اس نے مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا اور اگلے سال پارلیمنٹ توڑ دی۔ انگلستان سے دباؤ کے ماتحت اس نے مدحت پاشا کو واپس بلا کر شام کا گورنر مقرر کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر جلاوطن کرکے طائف (حجاز) بھیجا جہاں ۱۸۸۳ء میں باب عالی کے کارندوں نے بظاہر اسے قتل کر ڈالا[1]

مجلسی اور اقتصادی پہلو

عثمانیوں کی فتح سے شام کے سیاسی اور قومی نظام پر کچھ زیادہ اثر نہ پڑا۔ اس دور میں جو بنیادی تبدیلی ہوئی اس کی حیثیت ضمنی تھی اور اس کا تعلق صحرائی آبادی سے تھا۔ ترک افسر مقرر ہو کر آتے اور اپنی مدت پوری کرکے واپس ہو جاتے لیکن وہ کہیں بھی آباد نہ ہوئے۔ جس حد تک دلوں کا تعلق ہے وہ اور اہل شام، جو ان کی رعایا تھے، ایک دوسرے سے اجنبی رہے ۱۸۷۷ء کی روسی اور ترکی جنگ کے بعد چند ہزار چرکسی مسلمان شمالی شام اور شرق اردن میں منتقل ہوگئے اور پہلی جنگ عظیم کے بعد چند ہزار ارمن پناہ گیر لبنان میں پہنچ گئے۔ باشندوں کی زبان عربی ہی رہی، البتہ اس میں چند ترکی لفظ داخل ہوگئے ان میں سے زیادہ تر الفاظ کا تعلق سیاسیات، فوج اور غذائی چیزوں سے تھا[2]

شام کی اقتصادی زندگی آہستہ آہستہ نیچے گرتی گئی، جس کے لیے تنہا عثمانی بدنظمیوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ عثمانیوں نے مشرق کے عربی علاقے مسخر کر لیے تو عین اسی زمانے میں بین الاقوامی تجارت کے راستے بدل گئے لہٰذا مشرق قریب اقتصادی لحاظ سے بے حقیقت رہ گیا۔ ان سرزمینوں کی خوش حالی کی بنیاد (جیسا کہ بارہا اوپر بیان کیا جا چکا ہے) صرف تجارت پر موقوف تھی خصوصاً ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت پر ۱۴۹۷ء میں پرتگیز ملاح واسکوڈی گاما نے راس امید کا راستہ دریافت کر لیا اور اسی راستے سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان آمد و رفت شروع ہوگئی ایک اور پرتگیز فرڈی نینڈ میجیلن نے ۱۵۲۰ء میں جنوبی امریکہ کے انتہائی گوشے کا چکر لگا کر جزائر فلپینز کی دریافت کا راستہ کھول دیا۔ ۱۴۹۲ء میں جنوا کے باشندے کرسٹوفر کولمبس نے مغرب کی جانب کا سفر اختیار کرکے امریکہ دریافت کر لیا۔ ان دریافتوں اور متعلقہ واقعات نے بڑے بڑے تجارتی راستے تبدیل کر دیے۔ دنیا کی سرگرمیوں اور تہذیب کا مرکز مغربی جانب منتقل ہوگیا۔ تحقیق و اکتشاف کا جو نیا دور شروع ہوا، اس میں عرب کوئی حصہ نہ لے سکے پرتگیز کمانڈر البوقرق نے عربوں کے جہازوں سے مشرقی سمندر پاک کر دیے۔ یہی البوقرق ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کے لیے ۱۵۰۳ء اور ۱۵۱۵ء

---

[1] اس کے سوانح حیات علی حیدر مدحت نے ۱۹۰۳ء میں لندن سے شائع کیے تھے

[2] مثلاً باشا (ترکی پاشا) بیرق (ترکی بیراق) علم۔ بلط (کلھاڑی) جاویش (ترکی چاوش) سارجنٹ۔ برغل۔ بلغور) آٹا۔ قورمہ وغیرہ۔

کے درمیان خلیجِ فارس پر اقتدار حاصل کیا اور انھیں انڈونیشیا کے ساتھ تجارت کا مختار بنایا۔ اس طرح پرتگیز بحیرۂ روم کے قزاقوں سے بھی محفوظ ہو گئے اور ان عرب سرزمینوں سے بھی الگ تھلگ رہ کر ہر طرف پھرنے لگے، جن کی آبادیوں کا مذہب پرتگیزوں کے مذہب سے مختلف تھا اور جہاں کے تاجر تجارتی مال پر بھاری محصول وصول کرتے تھے۔ بحیرۂ روم اس وقت تک درمیانی سمندر تھا، لیکن اب اس کی یہ حیثیت بدل گئی۔ ساڑھے تین صدیاں گزر گئیں، پھر نہر سویز کا افتتاح ہوا اور بحیرۂ روم دوبارہ مشرق و مغرب کے درمیان آبی شاہراہ اور میدانِ جنگ بنا۔

شام کے تاجروں کا انحصار اس کے بعد صرف بری تجارت پر رہ گیا۔ حلب بغداد اور بصرہ کے تجارتی راستے کا آخری مقام تھا۔ اس وجہ سے وہ ایک طرف سلطنت کی داخلی تجارت کا مرکز بن گیا، دوسری طرف ایشیا اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی تجارت اس کے ذریعے سے ہونے لگی۔ اس وجہ سے وہاں پھر خوشحالی کا دور شروع ہو گیا۔ یہ ایک خاص وقت کے لیے دمشق پر بھی بازی لے گیا جس طرح اسکندرونہ اور طرابلس بیروت پر بازی لے گئے تھے[1]۔ واقعہ یہ ہے کہ حلب سترھویں صدی کے وسط تک پورے مشرقِ قریب کی سب سے بڑی تجارتی منڈی بنا رہا[2]۔ چنانچہ وہاں اہلِ وینس کی ایک نوآبادی قائم ہو گئی۔ ان کے قونصلوں کی روئیدادوں میں ذکر ہے کہ ہندوستان سے مسالوں کے قافلے حلب اور دمشق پہنچتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں گوشت کو تبریدات کے ذریعے سے محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا اور صرف مسالوں سے یہ کام لیا جاتا تھا، اس لئے یورپ میں مسالوں کی بڑی مانگ تھی۔

وینس کے تاجر شام کے شہروں اور بندرگاہوں میں پہلے سے موجود تھے، پھر ان کے مقابلے کے لیے فرانس کے تاجر بھی آ پہنچے، جنھوں نے سب سے پہلے حلب میں اپنا قونصل خانہ قائم کیا۔ ایک فرانسیسی قونصل نے سنہ ۱۶۸۳ء میں لکھا کہ "حلب قسطنطنیہ اور قاہرہ کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا، حد درجہ خوش منظر اور دولت مند ترین شہر ہے[3]"۔ سلیمان اعظم نے سنہ ۱۵۲۵ء میں فرانسس اوّل شاہ فرانس کو جو مراعات عطا کی تھیں، وہی فرانسیسی تجارت کے فروغ کی بنیاد بن گئیں اور اہلِ فرانس کو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل میں برتری کا موقع مل گیا۔ سنہ ۱۷۴۰ء میں سلطان محمود اول نے لوئی پانزدھم شاہ فرانس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق ارضِ مقدس آنے والے فرانسیسی زائرین ہی نہیں بلکہ تمام مسیحی زائرین کے لئے سلطنت عثمانیہ میں فرانسیسی جھنڈے کے نیچے حفاظت کا حق محفوظ کر دیا۔ ان مراعات کی بنا پر فرانسیسیوں نے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ وہ شام کے تمام رومن کیتھولک مسیحیوں کی حفاظت کے حقدار ہیں[4]۔ حلب کے علاوہ فرانسیسیوں نے اسکندرونہ، لاذقیہ، طرابلس، صیدا، عکہ اور رملہ میں بھی کارخانے اور نوآبادیاں قائم کر لیں۔ فرانسیسیوں کے بعد انگریز پہنچے اور آہستہ آہستہ وینس اور جینوا کے تاجر شامی شہروں اور بندرگاہوں سے غائب ہو گئے۔ سنہ ۱۵۸۱ء میں ملکہ ایلزبتھ نے "لیوانت کمپنی" کی بنیاد رکھی اور شام میں انگریز کاروباری آدمیوں کی آمد شروع ہوئی۔ حلب پھر مرکز بنا[5]۔ قونصلوں کی روئیدادوں

---

[1] ان روئیدادوں کے لئے دیکھئے امرکس Roux کی فرانسیسی کتاب

[2] Sauvaget, کی کتاب حلب Alep ص ۲۰۱

[3] D'Arvieux Memoires جلد ۶ ص ۴۱۱

[4] De Testa جلد اوّل ص ۱۸۶، ایف چارلس رو ص ۹۸، ۷۷

[5] ایلف دس وڈ A History of the Levant Company

سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۶۶۲ء میں وہاں قریباً پچاس انگریزی کاروباری آدمی موجود تھے۔ شیکسپیئر نے ایک ملاح کی بیوی کا ذکر کیا ہے "جس کا شوہر حلب گیا ہوا تھا۔"[1] پوری یورپی آبادی دو سو افراد کے قریب تھی[2] یہ تاجر اہلِ یورپ کے لیے مشرقی عیش ونشاط کے سامان بہم پہنچاتے تھے جس کا ذوق صلیبی جنگوں میں پیدا ہوا تھا۔ ان کی کوششوں سے پرانے تجارتی راستوں پر پھر نقل وحرکت شروع ہوگئی۔ جو سامان یورپ جاتا تھا اس میں سب سے اونچا درجہ لبنان کے ریشم، فلسطین کی روئی، اُون اور تیل کو حاصل تھا۔ بحری تاجروں سے مقابلہ بڑا سخت تھا مگر انگریزوں نے قیمتیں بہت بڑھا دی تھیں، اس وجہ سے شام کے تاجروں کو کاروبار بڑھا لینے کا موقع مل گیا۔

ہر قوم کے تاجروں کے لیے الگ "خان"، سرائے یا ہوٹل، حکومت کی طرف سے مقرر ہوتی تھی۔ خان عموماً چوگوشہ دو منزلہ عمارت ہوتی تھی، جس کے عین وسط میں صحن ہوتا تھا۔ نیچے کی منزل میں سامان تجارت رکھا جاتا تھا اور اوپر کی منزل میں خود تاجر رہتے تھے۔ تاجر زیادہ تر غیر شادی شدہ ہوتے تھے اور دیسی لباس پہنتے تھے۔ حفاظت کی غرض سے حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی غیر ملکی تاجر غروب آفتاب کے بعد باہر نہ نکلے، مراعات کی وجہ سے مقامی عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ان میں متعدد خان یعنی سرائیں اب تک باقی ہیں جو سرائے فخر الدّین ثانی کے زمانے میں بمقام صیدا فرانسیسیوں کے لیے بنی تھی، اس میں آج کل سینٹ جوزف کی راہبات رہتی ہیں۔

تاہم تجارت کے اس نئے فروغ سے خود اہلِ شام کو کوئی پائیدار نفع حاصل نہ ہوا، کیونکہ یہ تجارت زیادہ تر اہل یورپ کے ہاتھ میں تھی۔ شام کی آبادی بہ دستور دولت اور تعداد دونوں میں روبہ انحطاط۔ وائنے[3] ۱۷۸۴ء یا ۱۷۸۵ء میں حلب پہنچا تھا۔ اس کا اندازہ یہ ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی ابتداء میں ولایت حلب کے اندر تین ہزار دو سو دیہات تھے جن سے مالیہ وصول ہوتا تھا مگر اب ان میں سے صرف چار سو باقی رہ گئے تھے۔ یہ بیان بداہتہً ناقابل یقین ہے۔ اس کے بیان کے مطابق حلب کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی[4] حالانکہ سولھویں صدی کے اواخر میں قونصلوں کی بھیجی ہوئی روئدادیں سامنے رکھی جائیں تو آبادی اس سے کم از کم دو چند اور زیادہ سے زیادہ چہار چند ہوگی۔[5] ایک ممتاز ترک مورّخ کا بیان ہے کہ ۱۷۸۱ء تک حلب کے تحصیل دار کا عہدہ سب کو بہت ہی نفع بخش معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس پر پہنچ کر تھوڑی ہی دیر میں اتنی دولت جمع کی جا سکتی تھی جس سے دارالحکومت پہنچ کر وزارت خریدلی جاتی۔

یورپ کے کاروباری آدمیوں کے قدم بقدم مشنری، معلّم، سیّاح اور مکتشفین پہنچ گئے۔ یوں نئے اثرات کے لیے دروازہ کھل گیا۔ عثمانی شام کی تاریخ میں یہ ایک نہایت نتیجہ خیز واقعہ تھا۔ جو مشنری آئے وہ یا تو یسوعی تھے یا کپوچن[6] یا لعزری[7] یا دوسرے کیتھولک

---

[1] Macbeth ایکٹ اوّل سین ۳

[2] گرانٹ Syrian Desert ص ۹۳۔

[3] Volney

[4] وائنے۔ جلد ۲ ص ۱۲۹

[5] جودت، تاریخ، جلد ۳۔ ص ۲۶۹

[6] Capuchins یعنی پادریوں کا ایک نظام

[7] یہ بھی پادریوں کا ایک نظام تھا۔

نظاموں کے ارکان تھے۔ ان کی سرگرمیاں مقامی مسیحی طبقوں تک محدود رہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یونانی[1] کلیسا کی بنیاد پڑی۔ لبنان نے فخرالدین ثانی اور اس کے جانشینوں کے ماتحت مغرب کے ثقافتی اثرات کا خیر مقدم بہ طور خاص کیا۔ یسوعی ۱۶۲۵ء سے وہاں کام کر رہے تھے، ۱۷۳۳ء میں انھوں نے عین تورا میں مارونیوں کے تعاون سے ایک درس گاہ قائم کی، جسے دورِ حاضر کی پہلی اہم درس گاہ قرار دینا چاہیے۔ چالیس سال بعد ان کا نظام عارضی طور پر ختم کر دیا گیا، تو لعزریوں نے ان کی جگہ لے لی۔

ثقافتی پہلو

ذہنی اعتبار سے اس دور میں کوئی بھی قابلِ ذکر چیز بروئے کار نہ آسکی۔ متشدّدانہ حکومت، بھاری محاصل، اقتصادی اور معاشرتی انحطاط فنون یا علوم یا ادب میں کوئی جدید یا تخلیقی کارنامہ انجام دینے کے لئے ساز گار نہیں سمجھے جاسکتے۔ جمع و ترتیب، شرح و تلخیص اور نقل و کتابت کا جو کام صدیوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ وہ جاری رہا۔ لیکن کم و کیف کے اعتبار سے پشت بہ پشت نقد عثمانیوں کے پورے دور میں شام نے اول درجے کا ایک بھی شاعر یا فلسفی یا صاحبِ فن یا سائنس داں یا مقالہ نگار پیدا نہیں کیا۔ ناخواندگی بہت پھیل گئی، بلکہ عام ہو گئی۔ ایسے قاضی مقرر ہوتے تھے جو لکھنا بھی صحیح نہیں جانتے تھے صرف چند اہل علم تھے، مثلاً مؤرخ نعیم حلبی (۱۶۶۵ء - ۱۷۱۶ء) جو قسطنطنیہ چلے گئے تھے اور پوری طرح عثمانی رنگ میں رنگے گئے۔ عربی وقائع نگاروں اور سیرت نگاروں میں سے جن کی تحریرات اس باب کی ترتیب کا مآخذ ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے۔ احمد ابن سنان القرمانی[2] (۱۵۳۲ء - ۱۶۱۰ء) جو دمشق میں سرکاری ملازم تھا۔ نجم الدین الغزی[3] (۱۵۷۰ء - ۱۶۵۱ء) محدّث تھا اور دمشق میں پروفیسر کی خدمت انجام دیتا تھا۔ محمد المحبی (۱۶۵۱ء - ۱۶۹۹ء) یہ بھی دمشق میں پروفیسر تھا۔ تینوں دمشق کے باشندے تھے۔ سمجھنا چاہیے کہ دمشق اٹھارھویں صدی کے آغاز تک علوم و فنون کا مرکز تھا اور حلب کو مالیات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ المحبی نے قسطنطنیہ میں تعلیم پائی تھی اور کچھ مدت تک مکّہ معظّمہ میں نائب قاضی بھی رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف ایک ہزار دو سو نوے مشاہیر کی سیرتوں پر مشتمل ہے جنھوں نے گیارھویں صدی اسلامی میں وفات پائی (۱۵۹۱ء - ۱۶۸۸ء) دمشق ہی میں المقری تلمسانی (وفات ۱۶۳۲ء) نے ۱۶۲۹ء اور ۱۶۳۰ء کے درمیان اندلس کی ضخیم ادبی تاریخ مرتّب کی جس کے لئے وہ مراکش سے معلومات فراہم کر کے ساتھ لایا تھا۔ یہ کتاب متعلّقہ موضوع کے باب میں معلومات کا سب سے بڑا مآخذ سمجھی جاتی ہے[4] دمشق کا ایک اور قابلِ ذکر فرد عبد الغنی النابلسی تھا (۱۶۴۱ء - ۱۷۳۱ء) یہ صوفی اور سیاح تھا اور اس کی بیشتر کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئیں[5] تین وقائع نگار جن کا ذکر اس باب میں آچکا ہے، لبنان کے مارونی تھے۔ ایک بطریق اسطفان الدویہی (۱۶۲۵ء - ۱۷۰۴ء) یہ سولہ سال کا تھا، جب رومہ کی مارونی درس گاہ میں چلا گیا جو پوپ گریگوری سیزدھم نے ۱۵۸۴ء میں اس غرض سے قائم کی تھی کہ مارونی طلبہ کو مذہبی خدمات کے لئے تربیت

---

[1] یعنی متحدہ کلیسا۔ یہ لوگ پوپ کی برتری مانتے تھے مگر انھوں نے اپنے طریقِ عبادت الگ رکھے تھے۔

[2] اس کے حالات کے لئے دیکھیے محبی کی کتاب خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر جلد اوّل ص ۲۰۹، ۲۱۰

[3] محبی جلد ۴ ص ۱۸۹، ۲۰۰

[4] اشارہ ہے مقری کی شہرہ آفاق کتاب کی طرف جس کا نام ہے نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب۔

[5] ذخائر المواریث فی الدلالۃ علی مواضع الحدیث چار جلد مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۴ء

دی جائے۔ دوسرا الامیر حیدر الشہابی (۱۷۶۱ء - ۱۸۳۵ء)[۱] اس کا مکان چھوٹی سی آبادی شملان میں تھا جو بیروت سے بالکل قریب ہے تیسرا طنوس الشدیاق (وفات ۱۸۵۹ء) یہ قریہ حدث کا باشندہ تھا جو بیروت سے قریب ہے اور شہابی امیروں کے ماتحت عہدۂ قضا پر مامور رہا۔ اس نے لبنان کے جاگیر دار خاندانوں کے وقائع مرتب کئے۔

رومہ کی مارونی درس گاہ کے ذریعے سے لبنانی مسیحیوں کے لیے تعلیم کی سہولت کا بڑا اچھا انتظام ہو گیا ان میں سے بعض نہایت قابل افراد اوائلِ شباب ہی میں تربیت کے لئے چن لئے گئے۔ تعلیم و تربیت مکمل کر چکنے کے بعد وہ یا تو وطن آکر اونچے مذہبی عہدوں پر مامور ہوئے یا رومہ ہی میں رہ گئے تاکہ لوگوں کو تعلیم دین اور کتابیں تصنیف کریں۔ بالکل ابتدائی دور کے ممتاز اصحاب میں سے ایک جبرئیل الصہیونی تھا (جسے لاطینی میں سیونیٹا ionita بنا لیا گیا، ۱۵۷۷ء - ۱۶۴۸ء) وہ پہلے رومہ میں سریانی اور عربی کی تعلیم دیتا رہا۔ پھر سربون[۲] پیرس کی درس گاہ میں سامی زبانوں کا پروفیسر مقرر ہوا۔ بائبل کا جو نسخہ متعدد زبانوں میں ترجمہ کر کے تیار کیا گیا تھا، صہیونی اس کی ترتیب میں بھی شریک رہا۔ اس کے بعد لبنان ہی کا ایک اور فرد ابراہیم الحاقلانی (Ecchelensis ۱۶۰۰ء - ۱۶۶۴ء) اس بائبل کی ترتیب میں شریک ہو گیا۔ اس نے رومہ میں تعلیم پائی تھی اور وہاں کی درس گاہ نشر و اشاعت میں عربی و سریانی کا پروفیسر بن گیا تھا ۱۶۴۶ء میں حاقلانی کو کلیہ فرانس میں ایک اونچا عہدہ دے دیا گیا پیرس میں متعدد زبانوں کی جو بائبل تیار ہوئی، اسی میں عربی اور سریانی ترجمے سب سے پہلے شامل ہوئے تھے مارونی درس گاہ کا ایک اور طالب علم، جس نے غالباً سب سے زیادہ امتیاز حاصل کیا، یوسف سمعان السمعانی (Assemani ۱۶۸۷ء - ۱۷۶۸ء) تھا اس کی کوششوں سے ویٹیکن کے کتب خانے میں بہترین مشرقی مخطوطات پہنچے۔ سمعانی نے سریانی، عربی، عبرانی، فارسی، ترکی، حبشی اور ارمنی زبانوں کے نسخوں کی خوب چھان بین کی اور اس غرض سے دو مرتبہ مشرق کا سفر بھی اختیار کیا اس کی تحقیقات کے نتائج ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مرتب ہوئے، جو چار جلدوں میں بمقام رومہ ۱۷۱۹ء اور ۱۷۲۸ء کے ارد گرد مرتب ہوئی تھی۔ یہ کتاب مشرقی کلیساؤں کے متعلق آج بھی معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے[۳]۔ ۱۷۳۶ء میں مارونیوں کی ایک مذہبی مجلس لویزہ (لبنان) میں منعقد ہوئی اس مجلس کے ذریعے سے مارونیوں کا تعلق پوپ کے ساتھ زیادہ گہرا ہو گیا۔ پوپ نے سمعانی کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کر کے اس مجلس میں بھیجا تھا۔ رومہ میں تعلیم پائے ہوئے مارونی فضلاء کی یہی جماعت تھی، جس نے دورِ حاضر کے یورپ کو مشرقِ قریب کی زبانوں اور ادبیات کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ کیا۔ خصوصاً مسیحیوں کے متعلق معلومات کے لئے۔

مطابع

لبنان میں قزحیا کی خانقاہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں مشرقِ عربی میں پہلا مطبع قائم کیا گیا معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ لبنانی علماء کی ایک جماعت نے ۱۶۱۰ء میں زبور کو سریانی زبان میں منتقل کیا تھا نیز ایک ترجمہ عربی میں کیا تھا مگر

---

۱ اس کے سوانح کے لئے ملاحظہ ہو حیدر کی کتاب لبنان فی احد الامراء الشہابیین جسے اسد رستم اور فواد البستانی نے شائع کیا جلد اوّل ص ۸۰۵

۲ Sorbonne

۳ Bibliotheca Orientalis

۴ سمعانی نے مارونیوں اور یورپ کے درمیان اتحاد کے لئے جو کوششیں کیں ان کے لئے دیکھئے۔ جلد ۹ ص ۴۸۳، ۴۸۷ دبہ جلد اول ص ۱۸۱، ۱۸۲

وہ سریانی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ یہی علما یہ مطبع روما سے لبنان لائے تھے[۱]۔ سیاحوں اور یورپی باشندوں کی شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مارونیوں میں اس وقت تک سریانی رائج تھی۔ دار ویو[۲] ۱۶۶۰ء میں شمالی لبنان پہنچا تھا وہ بتاتا ہے کہ اہدن کا اسقف عربی اور سریانی بے تکلف بولتا تھا لیکن اس صدی کے اواخر میں سریانی، بولی کی حیثیت میں مر چکی تھی۔ وائٹنے[۳] نے خوب چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ پورے لبنان میں صرف دو گاؤں تھے جہاں یہ بولی جاتی تھی اور ان میں سے ایک میں اب بھی بولی جاتی ہے۔

پہلا عربی مطبع جس میں عربی حروف استعمال کیے گئے، ۱۷۰۶ء میں بہ مقام حلب قائم ہوا۔ اس کی ابتدا بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکی اس سے ایک سو اسی سال پیشتر ایک عربی مطبع بہ مقام فانو (اٹلی) کھلا تھا۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا مطبع تھا[۴]۔ ممکن ہے یہ اطالوی مطبع پوپ کی توجہ سے قائم ہوا ہو اور ممکن ہے حلب کا مطبع اس کے نمونے پر قائم ہوا ہو۔ پھر لبنان میں مزید مطبعے قائم ہوئے ان میں زیادہ تر مذہبی اور لسانی کتابیں چھپتی تھیں، تاکہ طلبہ کی تعلیم میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ تدریجاً نئی ثقافتی زندگی کا سفر شروع کرنے کے لیے ضروری سروسامان مہیا ہوا۔

---

۱ دیکھیے لوئس چیخو کا مقالہ تاریخ فن الطباعۃ فی المشرق مطبوعہ جریدہ المشرق جلد ۱۳ (۱۹۱۰ء) ص ۲۵۱، ۲۵۷ - ۳۵۵ - ۳۶۲

۲ D'Arvieux جلد ۳ ص ۴۰۷

۳ جلد اوّل ص ۳۲۱، ۳۲۲

۴ دیکھیے حتی کا مقالہ The First Book Printing in Arabic شائع شدہ پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری کرانیکل جلد ۴ ص ۵-۹

اُنچاسواں باب

امرائے لبنان

عثمانی دَور کے دو واقعات نہایت اہم ہیں، اوّل یہ کہ پورا شام مغربی ثقافتی اثرات کے دائرے میں آگیا جس کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جاچکا ہے۔ دوم لبنان ایک مستقل سیاسی وحدت بن گیا۔ اس دور کی پوری تاریخ کے زیادہ تر واقعات کو مذکورہ بالا دو بنیادی معاملوں نیز عثمانی حکومت کی بدنظمی کے ماتحت یک جا کیا جاسکتا ہے۔ عثمانیوں کی فتوحات کے بعد "تنوخیوں"[1] کی جگہ مرکزی اور جنوبی لبنان میں معنیوں کے اقتدار کا دَور شروع ہوگیا۔ شمال میں بنو عساف تھے، جن کے رئیس کو سلطان سلیم نے کسروان کی حکومت دے دی، در جُبیل بھی ساتھ شامل کر دیا تھا۔ منصور (۱۵۲۲ء تا ۱۵۸۰ء) کی امارت کے زمانے میں بنو عساف کا اقتدار انتہا پہ پہنچ گیا۔ اور ان کی حکومت بیروت کے پاس عرفہ تک جاتی تھی، جو طرابلس کے شمال میں ہے، ان کا مرکز "غزیر" میں تھا، جہاں اب بھی ان کی عمارتوں کے بعض باقیات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۵۹۰ء میں اس خاندان کی سیاسی میراث ان کے حریف خاندان بنو سیفا طرابلس کی جانب منتقل ہوگئی، جنھوں نے بنو عساف کے آخری امیر کو قتل کر دیا تھا۔ بنو سیفا کردی الاصل تھے۔[2] ان جاگیردار خاندانوں میں رواج یہ تھا کہ رئیس اعلیٰ مختلف جاگیریں اپنے ماتحتوں میں تقسیم کرتا، جنھیں مقدم یا شیخ کہا جاتا تھا، مثلاً شہابی، معنیوں کے جانشین تھے اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں مندرجہ ذیل ان کے ماتحت تھے، آل جنبلاط[3] جو شوف پہ حاکم تھے، آل ابی اللمع، جو متین کے مالک تھے، آل تلحوق امرائے الغرب الاعلیٰ، آل ارسلان امرائے الغرب الادنیٰ اور آل خازن، امرائے کسروان۔[4] مارونیوں کے اپنے مقدم تھے، جن کا ایک کام یہ تھا کہ حکومتِ عثمانیہ کی طرف سے جو خراج مقرر تھا، وہ جمع کرتے تھے، اور جہاں پہنچانا ہوتا پہنچا دیتے۔ ان میں بشری، بترون اور جُبیل کے مقدم بہت ممتاز تھے، دروزیوں اور مارونیوں کی طرح لبنانی بھی زیادہ تر اپنے ہی قوانین کے تابع تھے، جو نظام ملی کے مطابق مختلف گروہوں کے مذہبی پیشواؤں کے ذریعے سے نافذ ہوتے تھے۔[5]

---

[1] ان کی بعض عمارتیں اب تک عبیہ میں موجود ہیں، جہاں سید عبداللہ التنوخی (وفات ۱۴۸۰ء) کا مزار ہے اور دروزی وہاں بہت جاتے ہیں۔

[2] دویہی ص ۱۸۸، حیدر، تاریخ ص، شدیاق ص ۱۸۱۔

[3] حلقۂ حلب کا ایک کُرد خاندان جس کا ابتدائی نام جان بولاد تھا، شدیاق ص ۱۲۱، جنبلاط اب دروزی ہیں۔ بنو شہاب اب تک امیر ہیں، ان میں سے بعض مسلمان ہیں اور اکثر مارونی عیسائی۔

[4] بنو ابو اللمع کو مقدموں سے امیر بنا دیا گیا تھا (۱۷۱۱ء)، یہ لوگ پہلے دروزی تھے، اب مارونی ہیں، بنو تلحوق شمالی افریقہ سے فاطمیوں کے زمانے میں لبنان آئے تھے، اب دروزی ہیں۔ بنو خازن مارونی ہیں۔

[5] مقدموں کے متعلق دیکھیے شدیاق ص ۲۱۵ تا ۲۲۳۔

شام ترک گورنروں کے ماتحت رہا، لیکن لبنان اپنے جاگیردار اُمراء کے ماتحت بہت اچھی حالت میں رہا۔ اس کی آبادی بھی بڑھ گئی جس کے طبعی اسباب بھی تھے اور باہر سے بھی لوگ منتقل ہو کر آ بسے تھے۔ چونکہ لبنان میں مقابلۃً امن تھا اور کسی طرح کے خلل کا اندیشہ نہ تھا، لہٰذا بقاع کے اہلِ سنّت ساحلی "علماء" چلے آئے اور اس پاس کے دیہات میں آ بسے اور بعلبک کے شیعہ جبیل یا کسروان کے دوسرے مقامات پر مقیم ہو گئے۔ مارونی حلقۂ طرابلس سے جنوبی جانب پھیلتے پھیلتے جونیہ کے شمال میں کوہستان کے دامن تک پہنچ گئے۔ اسی طرح دروزی شمالی جانب برمانا اور متن کے دوسرے دیہات میں چلے گئے۔[51]

قومی اور مقامی سطح پر حصولِ اقتدار کے لیے بھی کشمکش جاری تھی۔ اس میں پُرامن ذرائع سے بھی کام لیا جاتا تھا اور قوّت سے بھی۔ "امیریں" مقدّموں اور شیوخ کا خاصا وقت اور خاصی سرگرمیاں اس کی نذر بھی ہوتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات ان جاگیردار امراء کو خود حکومت کے خلاف بھی ہتھیار اٹھانے کی نوبت آجاتی تھی۔ ۱۵۸۴ء میں یہی چیزیں کا ایک قافلہ لبنان میں سے گزر رہا تھا۔ وہ مصر اور فلسطین کا خراج مرکزی خزانے میں لے جا رہا تھا۔ اس پر حملہ ہُوا، اور روپے کا بڑا حصّہ لوٹ لیا گیا۔ سلطان نے حالتِ غضب میں یوسف سیفا کے خلاف ایک تعزیری مہم بھیج دی، کیونکہ اسی کے علاقے میں قزّاقی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ سُلطانی فوج نے بنوسیفا کے بہت سے دیہات کو آگ لگادی۔ پھر ایک اور مہم دروزیوں کے خلاف بھیجی گئی جو جنوبی جانب رہتے تھے۔ ان کے خلاف یہ الزام تھا کہ جُرم کا ارتکاب انھیں نے کیا۔ دروزیوں کا ایک وفد عین صوفر[52] میں ترک سالار ابراہیم پاشا والیِ مصر سے ملنے گیا اور اس نے پانچ چھ سو دروزیوں کو وہاں ذبح کرادیا اور افواہ یہ پھیل گئی کہ ساٹھ ہزار آدمی قتل کئے گئے، جن سے پہلے ہتھیار رکھوا لیے گئے تھے۔ اُس زمانے میں قرقماز (یا قرقماس) دروزیوں کا رئیس تھا، جو ۱۵۴۴ء میں اپنے والد فخرالدّین اوّل کا جانشین بنا تھا۔ قرقماز نے قلعہ نیحہ (شقیف تیرون) میں پناہ لی، جو جزین کے قریب ہے اور وہیں وفات پائی، غالبًا بابِ عالی کے کسی کارندے نے اسے زہر دے دیا۔ اس کے باپ کو والیِ دمشق نے دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ قرقماز کا صرف ایک لڑکا تھا، جس کی عمر بارہ سال تھی اور اسے دادا کے نام سے موسوم کیا تھا، یعنی فخرالدین۔ قرقماز کی بیوہ نے اس بچّے کو کسروان میں آلِ خازن کے پاس چھپا دیا۔[53]

فخرالدّین ثانی

فخرالدّین ثانی ۱۵۹۰ء میں باپ کا جانشین ہُوا۔ اس کے ماتحت معنیوں کا عروج کمال پر پہنچ گیا۔ بلاشبہ وہ پورے شام نہیں تو کم از کم عثمانی لبنان کی تاریخ میں نہایت قابل اور حد درجہ دلکش شخصیت کا حامل تھا۔ اس کا دَورِ امارت شروع ہُوا تو اس نے تین مقصد پیشِ نظر رکھے جو اس کے سینے میں مستقل طور پر حرارت پیدا کرتے رہے۔ اوّل یہ کہ لبنانِ کبیر کی تعمیر پایۂ تکمیل پر پہنچائے، دوم بابِ عالی سے تعلّقات کی جو کڑیاں باقی رہ گئی ہیں، انھیں بھی ختم کر دے، سوم ملک کو ترقّی کے راستے پر لگا دے۔ یہ تینوں مقصد خود عوام کے رجحانات پر مبنی تھے۔ فخرالدّین ان مقاصد کو شادیوں، رشوتوں، سازشوں، معاہدوں اور لڑائیوں کے ذریعے سے پورا کر دینے کا خواہاں تھا۔ اور یہی طریقے اس زمانے میں مسلّمہ وسیلے تھے۔

---

۵۱ دویہی ص ۱۵۳، شدیاق ص ۲۱۵۔

۵۲ دویہی ص ۱۷۰، حیدر تاریخ ص ۶۱۸، ۶۱۹۔

۵۳ شدیاق ص ۵۰، معلوف ص ۴۸۔

سلطان سے بیروت و صیدا کی امارت حاصل کر لینے کے بعد فخر الدین نے اپنے ہمسائے یوسف سیفا کے خلاف قدم اٹھایا، جس کی بیٹی سے وہ شادی کر چکا تھا اور متعدد کشمکشوں کے بعد شمالی لبنان کا اقتدار اس سے چھین لیا۔ بعلبک کے شیعہ بنو حرفوش بقاع کے بڑے سردار، نیز طبریہ تک جنوبی علاقے کے سردار لبنان کے اس جلیل القدر امیر کے سامنے جھک گئے۔ سلطان احمد اوّل اہل ہنگری اور اہل ایران سے لڑائیوں میں مشغول تھا، اس ہنگامہ زار میں اسے لبنان کے جاگیر دار پر توجہ سے کیا موقع مل سکتا تھا، علاوہ بریں ۱۶۰۶ء میں ایک کرد علی جان بلاد نے بغاوت کر دی تھی اور ولایت حلب پر وہ قابض ہو گیا تھا۔ فخر الدین نے حلب کے ڈکٹیٹر سے دوستی کا معاہدہ کر لینے میں توقف نہ کیا۔ جارج سینڈز[۵۰] ایک انگریز سیاح تھا، جو ۱۶۱۰ء میں لبنان پہنچا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ نہر الکلب سے کرمل تک علاقہ نیز صفد، بانیاس، طبریہ اور ناصرہ فخر الدین کے مقبوضات میں شامل تھے۔ اس نے جنوبی جانب توسیع کا سلسلہ جاری کیا تو ان قلعوں پر قبضہ کر لیا، جنھیں صلیبی جنگوں کے زمانے میں بعض اہم راستوں اور مقامات کے تعلق میں خاص حیثیت حاصل تھی۔ بقاع کا زرخیز علاقہ اس کی امارت میں شامل ہوا تو آمدنی بڑھ گئی اور اسے ایک باقاعدہ فوج کی ترتیب و تنظیم کا موقع ملا۔ چنانچہ پرانے بے قاعدہ جتھوں کی جگہ پیشہ ور سپاہیوں کی ایک جمعیت تیار کر لی گئی۔ بے قاعدہ سپاہی ینی چریوں کے مقابلے میں ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے۔[۵۱] اس کے پاس اتنا روپیہ تھا کہ اس نے دشمنوں اور حریفوں کے درمیان جاسوس مقرر کر دیئے اور عثمانی افسروں کو رشوت بھی دینے لگا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ تجارت کی وجہ سے پیدا ہوا اور فخر الدین نے اہل فلارنس کے ساتھ تجارت کو بہت ترقی دی۔ ان کے جہاز لبنان سے ریشم، صابون، زیتون کا تیل، گیہوں اور دوسرے غلے لے جاتے تھے اور اہل لبنان کو اچھی قیمت مل جاتی تھی۔ ۱۶۰۸ء میں فخر الدین نے فرڈیننڈ اوّل، گرانڈ ڈیوک ٹسکنی سے ایک معاہدہ کیا، جس میں ایک خفیہ دفعہ فوجی معاملات سے بھی متعلق تھی۔ یہ دفعہ باب عالی کے صریح خلاف تھی۔[۵۲] اس پر سلطان نے حافظ پاشا والیٔ دمشق کے حسب ایما اپنے شوخ جاگیر دار کے خلاف قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ اس کی توسیع اور علیحدگی کی پالیسی ختم کی جائے۔ ۱۶۱۳ء میں ایک فوج دمشق سے بھیجی گئی، لیکن علاقہ پہاڑی تھا، لہٰذا وہ کوئی خاص کام انجام نہ دے سکی۔ پھر ساٹھ جہازوں کے ایک بیڑے نے ساحل کی ناکابندی کر لی۔ اس پر فخر الدین کو احتیاط کا تقاضا یہی نظر آیا کہ خود الگ ہو جائے۔ تین جہاز بندرگاہ صیدا میں تھے، ان میں اپنی بیویوں اور ایک جیش کو سوار کرا کے اٹلی بھجوا دیا، جہاں اس کے دوست اور حلیف تھے۔[۵۳] اس کا بیٹا علی امیر بنا۔ اور اس نے اپنے بھائی یونس کو بیٹے کا معاون بنا دیا۔

فخر الدین پانچ سال (۱۶۱۳ء تا ۱۶۱۸ء) یورپ میں رہا۔ اس زمانے میں اس نے لیگھارن، فلارنس، نیپلز، پلرمو، میسینا، مالٹا اور دلچسپی کے دوسرے مقامات دیکھے اور ایسے احساسات اور افکار اسے ملے، جن کی بنا پر سابقہ عزائم کو تقویت پہنچی۔ البتہ ایک مایوسی ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ پوپ اور یورپی طاقتیں متحد ہو کر اس کے لیے ایک فوج کا انتظام کر دیں، جسے لے کر وہ لبنان پہنچے اور اپنے علاقے فتح کر لے۔ یہ کوشش ناکام رہی۔ جن دنوں فخر الدین یورپ میں تھا، یہ افسانہ وضع کیا گیا کہ دروزی ایک صلیبی امیر ویمنڈ[۵۴] کی اولاد میں۔[۵۵]

---

۵۰ George Sandys کی کتاب A Relation of a Journey ص ۲۱۱، ۲۱۲

۵۱ مجتی جلد ۳ ص ۲۶۷، داریو جلد اوّل ص ۴۳۸، داریو جلد اوّل ص ۴۵۷

۵۲ اس معاہدے اور دوسرے معاہدوں کے متعلق دیکھیے پاولو کرالی Paolo Carali کی کتاب فخر الدین ثانی و دربار ٹسکنی جلد اوّل ص ۱۴۹۔

۵۳ احمد الخالدی الصفدی کی کتاب تاریخ الامیر فخر الدین ص ۱۷-۱۹

۵۴ de Dreux

۵۵ دلانتے جلد ۲ ص ۴۰، ۴۱۔

وہ واپس آیا تو اس نے وہ علاقے واپس لینے میں تاخیر نہ کی، جن پر اس کی پس موجودگی میں بنو سیفا اور دوسرے لوگ قابض ہوگئے تھے بنو سیفا کے امیر یوسف کی وفات سے فخرالدین کا سب سے بڑا دشمن ختم ہوگیا۔ اب شمالی اور جنوبی دونوں سمتیں اس کے لئے کھلی تھیں چنانچہ پرانی لبنانی ریاست پھر قائم ہوگئی، بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہوگیا۔ ۱۶۲۴ء میں باب عالی نے عجلون اور نابلس بھی اس کے حوالے کردی دو سال بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ جو کچھ عملاً موجود ہے، اس کا اعتراف کر لیا جائے، چنانچہ فخرالدین کو حلب سے سرحد مصر تک رئیس عربستان قرار دے دیا گیا۔ اس کوتاہ قامت آدمی کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ مخالف طنزاً کہا کرتے، اگر انڈا اس کی جیب سے گر پڑے تو وہ ٹوٹے گا نہیں[۵۱]، لیکن تنہا وہی تھا، جس نے لبنان میں امن قائم رکھا۔ عدل و انصاف کی بخشش کرتا رہا اور اسی کے ذریعے سے خود سلطان کے لئے بھی محاصل جمع ہوسکتے تھے۔

فخرالدین کو شام کا گورنر بنا دیا گیا تو ایک سال بعد اس کے آدمیوں کی لڑائی مصطفےٰ پاشا والیٔ دمشق سے بہ مقام عنجر (بقاع) ہوگئی، اس میں مصطفےٰ پاشا گرفتار ہوگیا۔ فخرالدین نے فوراً اُسے رہا کر دیا[۵۲]۔ آئندہ گیارہ سال کی مدت میں وہ اپنی زندگی سے تیسرے مقصد کے لیے آزادانہ طریق پہ کام کرتا رہا، یعنی لبنان میں دورِ حاضر کے تمام وسائل ترقی کی فراہمی اس نے رفاہِ عامہ کے کاموں یا ذاتی تعمیرات میں مدد کے لئے اٹلی سے معمار، آبپاری کے انجینیئر اور ماہرین زراعت بلوائے۔ دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹسکنی سے وفد بلائے گئے کہ لبنان کے کسانوں کو نئے وسائل زراعت سے روشناس کرائیں، وہاں سے مویشی منگوائے۔ تاکہ لبنان کے مویشی کی نسل بہتر ہو جائے[۵۳]، اس نے بیروت کے استحکام و آرائش میں حصّہ لیا، جہاں اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا۔ اس کے ساتھ ایک شاندار باغ تھا۔ مانڈرل[۵۴] نے ۱۶۹۷ء میں یہ باغ دیکھا تھا جس میں جابجا مجسّمے رکھنے کے لیے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امیر پکا مسلمان نہ تھا[۵۵]۔ صیدا میں اس نے ایک محل اس "خان" کے سامنے بنوانا شروع کیا تھا جو فرانسیسیوں کے لئے

---

۵۱ معلوف ص ۲۰۱، سینڈیز ص ۲۱۰، میں مرقوم ہے کہ اس کا نام فخرالدین ہے، قد بہت چھوٹا ہے، لیکن بڑا جوانمرد ہے اور بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ عمر چالیس سال کے قریب، لومڑی کی طرح عیّار ہے اور ایک حد تک استبداد کی طرف مائل ہے۔ اس نے اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی کوئی جنگ شروع کی اور نہ کبھی کسی اور بڑے کام میں حصّہ لیا۔

۵۲ معلوف ص ۲۳۲ – ۷ دویہی ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

۵۳ کرالی جلد ۲ ص ۵۲۔

۵۴ Maundrell ص ۵۴۔ والنے (جلد ۲ ص ۱۷۲) نے ان صنوبروں کے متعلق جو بیروت کے باہر ہیں لکھا ہے کہ فخرالدین نے لگوائے تھے، اس کا یہ قول غلط ہے، کیونکہ یہ صنوبر صلیبی جنگوں کے زمانے میں بھی وہاں موجود تھے۔

۵۵ (مترجم ــــ یہ امر بجائے خود کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا معیار نہیں، لیکن فخرالدین کے متعلق جو کچھ خود مصنف لکھ چکا ہے، یعنی یہ کہ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اہل یورپ سے ساز باز، مسیحیوں کو مسلمانوں پر ترجیح، صلیبیوں سے نسب نامہ ملانے کی کوشش وغیرہ کیا اس کے بعد بھی اس شخص کے درجۂ اسلامیت کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟)

بنوائی گئی تھی، لیکن نامکمل رہ گیا[۵۱]۔ انھیں دنوں کیپوچن مشنری صیدا میں داخل ہوئے اور انھوں نے بیروت، طرابلس، حلب، دمشق، نیز لبنان کے بعض دیہات میں مرکز قائم کیے[۵۲]۔ یسوعی اور کرملی بھی اسی زمانے میں پہنچے[۵۳]۔ زراعت کو ترقی دینے کے سلسلے میں امیر نے شمال سے مسیحیوں کو جنوبی لبنان میں منتقل ہو جانے پر آمادہ کیا۔ والنے[۵۴] کے بیان کے مطابق مسیحی خاندان روزانہ حکومت ترکیہ کی سختیوں سے بچنے کے لیے شام سے جا رہے تھے۔ امیر نے حلب سے اپنے جنبلاطیوں کا بھی خیر مقدم کیا، جو اس کے حلیف تھے۔ یورپی مشنریوں، تاجروں اور قونصلوں کو اس نے ہمراز بنا لیا۔ وہ تمام لوگ ان مراعات سے فائدہ اٹھا رہے تھے، جن کا انتظام ان کے لیے سلیمان اعظم کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ قونصلوں کی رودادوں سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امیر نے صیدا کے یورپی تاجروں کو بحری قزاقوں سے بچایا[۵۵]۔ اس نے برابر مارونیوں سے مشیر بنائے، جن میں سب سے پہلا درجہ "ابو نادر الخازن" کو حاصل تھا۔ جو امیر کی افواج کا کماندار بھی تھا۔ اس نے الخازن کے خاندان کا درجہ بلند کر دیا۔ اس لیے کہ یتیمی کی حالت میں اسے اسی خاندان نے پرورش کیا تھا۔ وہ لوگ عوام میں شامل تھے، امیر نے انھیں شیوخ بنا دیا۔ اس خاندان کے رئیس کو ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے "الاخ العزیز" کہا، یعنی، "اے عزیز بھائی[۵۶]"۔ اس خاندان کو کسروان کی حکومت حاصل تھی اور ان کے ماتحت کسروان ایک ترقی یافتہ مسیحی علاقہ بن گیا[۵۷]۔ کچھ مدت کے لیے ممتاز فاضل الحاقلانی اٹلی میں اس کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ الحاقلانی ہی کے ذریعے سے امیر نے فلارنس کے بینک میں روپیہ جمع کرایا۔ ایک سو سال گزر جانے کے بعد اس کے وارثوں نے یہ روپیہ ایک مسیحی فاضل سمعانی کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے[۵۸]۔

چونکہ فخر الدین مسیحیوں کا ہمدرد تھا، اس لیے بعض لوگوں نے اس سے مسیحیت منسوب کر دی۔ سینڈیز[۵۹] لکھتا ہے۔ اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی اور کبھی مسجد نہیں گیا۔ وارنیو[۶۰] کی رائے تھی کہ امیر فخر الدین کا مذہب وہی تھا، جو اس کی رعایا کا تھا اور اس کی رعایا کا کوئی مذہب نہ تھا۔ اغلب ہے کہ وہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد ترک حکام اور دنیا کے روبرو اسلام کا اقرار کر لیتے ہوں اور خود اپنے

---

۵۱ تنخیین کا آبائی مرکز "بعلقین" تھا۔ وہاں، نیز پاس کے مقام دیر القمر میں ان کے آثار باقی ہیں۔

۵۲ دیکھیے "ربہ" جلد ۲ ص ۴۶۴ - ۴۷۲۔

۵۳ وہی ص ۲۰۳۔

۵۴ جلد ۲ ص ۶۸۔

۵۵ Relazioni ص ۱۶۳

۵۶ معلوف ص ۷۱۔

۵۷ شدیاق ص ۸۵

۵۸ کرانی جلد اوّل ص ۲۰۴ - ۲۰۳ جلد دوم ص ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۷۸، ۳۸۰ (مترجم۔ جس شخص نے عمر بھر دوستی کا حق ادا کیا اور تعلقات کی استواری ہی کی بنا پر روپیہ جمع کرایا اس کے اخلاف کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا گیا! اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہ راجعون۔ مذہبی نہ سہی، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی اس فعل کی شناخت میں کیسے تامل ہو سکتا ہے؟)

۵۹ ص ۲۱۰۔

۶۰ جلد اوّل ص ۳۶۷۔

لوگوں میں پہنچتے ہوں تو وہ دُرزی بن جاتے ہوں۔ ایک دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ ۱۶۳۳ء میں ایک کپوچن پادری نے، جو اس کا ذاتی طبیب تھا اسے بپتسمہ دیا تھا[۵۱]

امیر فخرالدین کے سامنے بڑا وسیع معاشرتی اور اقتصادی پروگرام تھا لیکن اس نے اپنے مقبوضات کی فوجی ضرورتوں سے غفلت نہ برتی۔ تجارت کی ترقی سے جو رقمیں حاصل ہوئیں، وہ پروگرام اور فوجی ضروریات دونوں کے لیے کافی تھیں، خصوصاً طرابلس اور صیدا کی بندرگاہوں والی رقمیں۔ اس زمانے میں توت کے درختوں کی بڑی افراط تھی۔ امارت کی کُل آمدنی نو لاکھ سنہری پونڈ تھی جس میں سے تینتالیس ہزار سلطانی خزانے میں جاتے تھے۔ امیر نے ٹسکنی سے تازہ ترین سامان منگوایا اور اپنی فوج کو ہر لحاظ سے اعلیٰ پیمانے پر مسلّح کر دیا۔ جس کی تعداد چالیس ہزار سے ایک لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ اُس کے زیادہ تر سپاہی مارونی اور دروزی تھے۔ بعض پُرانے قلعوں کی مرمّت بھی کرا دی۔ تدمر میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ ہے، جو اب تک فخرالدّین کا نام زندہ رکھّے ہوئے ہے۔ فوج اور سازوسامانِ جنگ کی زیادتی، اہلِ یورپ سے ربط ضبط اور مسیحیوں سے ہمدردی کے باعث پھر سلطان کی نگاہیں اُس پر جم گئیں۔ ۱۶۳۳ء میں سلطان مراد رابع نے والیٔ دمشق کوچک احمد پاشا کو حکم دیا کہ اناطولیہ اور مصر سے بہت بڑی فوج جمع کر کے فخرالدّین کے خلاف پیش قدمی کرے۔ اس اثناء میں ایک بیڑے نے جعفر پاشا کے زیر سرکردگی ساحلی قلعوں اور بندرگاہوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ جو لوگ فخرالدّین کے ماتحت تھے، انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا، مثلاً بنو سیفا، بنی حرفوش اور یمنی۔ اس کا بہادر بیٹا علی جو صفد کو سنبھالے بیٹھا تھا، وادیٔ تیم دجبل شیخ کا دامن کی جنگ میں مارا گیا[۵۲]۔ امیر نے اطالویوں سے امداد کی درخواست کی، مگر انگلی تک اس کی حمایت میں نہ اُٹھ سکی۔ وہ مہینوں تک قلعہ نیحا میں چھپا رہا، پھر جزین سے باہر پہاڑ کے ایک غار میں چلا گیا، جہاں پہنچنا حد درجہ دشوار تھا۔ آخر اس کا سُراغ مل گیا اور اسے مع اس کے تین بیٹوں کے بیڑیاں پہنا کر قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ ۲۰-۱ فروری ۱۶۳۵ء کے آس پاس[۵۳]، فصیحانہ اسلوبِ کلام نے ایک مرتبہ اس کے دادا کی امارت بچائی تھی، اب خود اس کی گردن بچا لی، مگر تھوڑی سی مدّت کے لیے اُس نے سُلطان کے رُوبرو جو کچھ کہا، وہ ذیل میں درج ہے:۔

> در حقیقت یہ ہے کہ میرے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی۔ میں نے جب کبھی فوج جمع کی، آپ کے وزیروں اور نمائندوں کے حکم کے بغیر نہ کی، کبھی کوئی قلعہ نہ بنایا، مگر اس غرض سے کہ سلطان کی حفاظت کا فرض انجام دے سکوں۔ صرف اُن آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، جو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ میں نے باغیوں کے قلعوں پر صرف اس غرض سے قبضہ کیا کہ اُنھیں حکومتِ عثمانیہ

---

۵۱ کرالی جلد ۲، ص ۴۰-۴۲ بیان کیا جاتا ہے کہ موت کے بعد اس کے کپڑوں میں سے ایک صلیب نکلی۔ معلوف ص ۲۷۵، نیز دیکھیے دسٹنفیلڈ کی جرمن کتاب ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

۵۲ محبّی جلد اوّل ص ۳۸۶۔

۵۳ دویہی ص ۲۰۴، ۲۰۵، شدیاق، ص ۳۳۰، ۳۳۵، معلوف ۲۷۲، ۲۸۲، کرالی جلد ۲ ص ۳۴۰، ۳۵۶۔

> کے حوالے کر سکوں۔ مزید برآں مجھے راہِ حجاج کو بدوؤں کی یورشوں سے
> محفوظ رکھنے کا کام سونپا گیا تھا۔ میں نے اسے پورا کیا اور باقاعدہ
> خراج سُلطانی خزانے میں داخل کرتا رہا۔ میں نے شریعتِ مقدّسہ
> کے احکام نافذ کیے اور اُن کے ضوابط کا پابند رہا[۵۱]"۔

جلاوطن امیر کے لیے سزائے موت عارضی طور پر روک دی گئی۔ پھر بابِ عالی میں اطّلاع پہنچی کہ جو نیا انتظام کیا گیا تھا، امیر کے رشتہ دار اور پیرو اس انتظام سے سرتابی کر رہے ہیں، چنانچہ ۱۳۔ اپریل ۱۶۳۵ء کو امیر اور اس کے تین بیٹوں کے سر قلم کر دیئے گئے اور خود امیر کی لاش تین روز تک ایک مسجد کے سامنے منظرِ عام پر رکھی رہی[۵۲]۔ جس آزاد لبنان کبیر کا خواب فخر الدّین نے دیکھا تھا اور جس کی کامیاب تعبیر کے لیے انتظام ہو چکا تھا، اسے پورا کرنے کے لئے ایک جانشین امیر بشیر الشّہابی نے کوشش کی، مگر ۱۹۴۳ء تک پورا نہ ہوا۔

بدنظمی کا دور

سیاسی منظر سے فخر الدّین کے ——— الگ ہونے ہی لبنان پر بدنظمی کا ایک دور طاری ہو گیا۔ کوچک احمد پاشا نے علی علم الدّین[۵۳] کو سُلطانی حکم کے مطابق جنوبی لبنان کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اُس نے جانبداری کی پالیسی اختیار کی، معنیوں کی جائدادیں ضبط کر لیں اور انھیں سخت تکلیفیں پہنچائیں۔ ایک موقع پر اسے کھانے کی دعوت دے کر علیہ بلایا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی علی علم الدّین اور اس کے آدمی تنوخ میزبانوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں قتل کر دیا اور جو لوگ وہاں موجود نہ تھے، ان کا تعاقب کیا گیا، یہاں تک کہ پورے خاندان کا استیصال ہو گیا[۵۴]۔ فخر الدّین کا بھتیجا ملحم بن یونس[۵۵] تحریکِ مخالفت کی قیادت کرتا رہا۔ اس نے سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رکھا اور اپنے علاقے کا کچھ حصّہ واپس بھی لے لیا۔ پھر ملحم کے بیٹے احمد نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۶۹۷ء میں اس نے وفات پائی اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے بعد فخر الدّین کا خاندان معدوم ہو گیا۔

---

[۵۱] معلوف ص ۲۷۳، شدیاق ص ۳۳۶۔

[۵۲] کرالی جلد ۲ ص ۳۵۵، ۳۵۶۔

[۵۳] یہ اصلاً تنوخ تھے اور یمنی فریق کے قائد مانے جاتے تھے لہٰذا یہ قیسیوں کے مخالف تھے، شدیاق ص ۱۱۴۔

[۵۴] حیدر تاریخ ص ۷۱۹، شدیاق ص ۱۱۴، ۱۱۵۔

[۵۵] فخر الدّین کا شجرۂ نسب

فخر الدّین اوّل وفات ۱۵۴۴ء

قرقماز (قرقماس)، ۱۵۴۴ء - ۱۵۸۵ء

یونس	فخر الدّین ثانی
ملحم ۱۶۳۵ء - ۱۶۵۷ء	۱۵۹۰ء - ۱۶۳۵ء
احمد ۱۶۵۷ء - ۱۶۹۷ء	

شہابی امراء

بعلقین کے نزدیک سمقانیہ میں لبنانی اکابر کی ایک قومی مجلس منعقد ہوئی، جس میں راشیا خاندان کے امیر بشیر شہابی کو حاکم چُنا گیا اور صیدا کے والی کو اس فیصلے سے مُطّلع کر دیا گیا۔ ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ اس کے ذریعے سے تمام واجبات باقاعدہ ادا ہوتے رہیں گے اور کچھ واجبات اُس وقت تک باقی تھے۔[1] ظاہر ہے کہ لبنانیوں میں ہوم رول کا جذبہ بالکل افسردہ نہیں ہوا تھا۔ ترکی خود اس وقت یورپی طاقتوں کے ہاتھوں تباہی کے خطرے میں مبتلا تھا، لہٰذا صورتِ حال پر اس خیال سے اطمینان کا اظہار کر دیا گیا کہ خراج وصول ہوتا رہے گا۔

اب شہابیوں نے معنیوں کی سیاسی میراث سنبھال لی۔ حکومت کی باگ ڈور ۱۸۴۱ء تک ان کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے بھی پُرانی تدبیروں ہی سے کام لیا، مثلاً کبھی تُرک عہدہ داروں کو رشوتیں دے دیتے۔ کوئی کمزور سلطان تخت پر بیٹھ جاتا تو اس کے خلاف بغاوت کر دیتے۔ ایک رئیس یا ایک فریق کو دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیتے۔ اس طرح پہاڑی علاقے پر انھوں نے اپنا قبضہ بحال رکھا، انھوں نے رعایا کا دروزی مذہب کبھی اختیار نہ کیا۔ اگرچہ بعض دروزی انھیں اپنا ہم عقیدہ سمجھتے رہے چونکہ صدیوں تک لبنانی مدبروں کو نہایت نازک حالات سے گزرنا پڑا۔ گویا وہ تلوار کی دھار پر چل رہے تھے، اس وجہ سے انھیں منافقت اور ریاکاری میں مہارت حاصل ہو گئی۔

فخرالدین کا ایک بیٹا حسین بچپن ہی میں قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا، اس کی تربیت عثمانیت کے رنگ میں ہوئی اور سلطنت کی طرف سے اسے سفیر بنا کر ہندوستان بھیج دیا گیا۔ اس کی درخواست پر بشیر[2] کو اس وقت تک کے لیے نائب بنا دیا گیا، جب تک معن کا نواسہ امیر حیدر شہابی الحاصبانی سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ حیدر کی امارت ۱۷۰۷ء سے ۱۷۳۲ء تک قائم رہی۔ اس اثناء میں ایک لڑائی بمقام عین دارہ ہوئی (۱۷۱۱ء)، جس میں یمنی فریق بالکل تباہ ہو گیا۔[3] ان میں سے بعض افراد لبنان چھوڑ کر حوران چلے گئے۔ جہاں انھوں نے ایک نئی دروزی جماعت کی بنیاد رکھی۔ علم الدین کا خاندان بہت غیر ہر دل عزیز ہو گیا تھا، اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ بنی ابواللمعہ نے جنگ میں بڑی بہادری دکھائی تھی، انھیں امیری کا درجہ دے دیا گیا، چونکہ یمنی طاقت بھی کُچلی جا چکی تھی، اس لیے امیر حیدر نے اپنے خاص حلیفوں —— جنبلاط، ابواللمعہ اور الخازن —— کو ساتھ ملا کر جاگیرداری کا نظام از سر نو مرتب کیا۔ یمنی ارسلانیوں کو بنو تلحوق کے ساتھ شریک علاقہ بنا دیا گیا۔ امیر حیدر کے بیٹے ملحم (۱۷۳۲ء۔ ۱۷۵۴ء) نے بقاع اور بیروت بھی اپنی امارت میں شامل کر لیے،[4] لیکن سکونت بدستور دیر قمر ہی میں رکھی۔ اس وجہ سے اُسے دمشق اور صیدا کے بنو عظم کے ساتھ تصادم پیش آ گیا۔

یمنیوں کے کچلے جانے کے بعد لبنان میں فریقوں کے درمیان از سر نو ردّ و بدل ہوا اور دو بڑے گروہ بروئے کار آئے، ایک بنو جنبلاط، دوسرے بنو یزبک، جنبلاط دروزیوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ہو چکے تھے، بنو یزبک کو

---

[1] حیدر لبنان ص ۳-۴ شدیاق ص ۳۵۸، ۳۵۹، معلوف ص ۴۰۱-۴۔

[2] اسے بشیر اوّل کہتے ہیں، تاکہ یہ اپنے زیادہ نامور جانشین بشیر ثانی سے ممتاز رہے۔

[3] شدیاق ص ۳۶۴، ۳۶۵۔

[4] حیدر لبنان ص ۳۷، ۴۰۔

یہ تاہم ان کے ایک سردار سے ملا، جو آلِ عماد میں سے تھا اور دروزی تھا۔ وہ علاقۂ موصل سے آیا تھا[۵۱]۔ فریقوں کی ترتیبات اصل دائرے سے نکل کر ماردنیوں تک پہنچ گئیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے میں جھگڑا شروع ہوا، وہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک باقی رہا۔ ملحم نے ۱۷۵۴ء میں امارت سے دست برداری اختیار کر لی اور اس کے دو بھائیوں میں کش مکش شروع ہو گئی۔ ان میں سے منصور کا رجحان بنو جنبلاط کی طرف تھا اور احمد یزبکیہ کا حامی بن گیا۔ احمد ہی مؤرخ حیدر کا باپ تھا، جس کی کتاب سے اس باب میں بار بار حوالے پیش ہوتے رہے ہیں۔ داخلی کشمکش کا دور اس وقت تک باقی رہا، جب تک ملحم کے بیٹے یوسف نے بالغ ہو کر منصبِ امارت نہ سنبھال لیا[۵۲]۔ ۱۷۷۰ء میں بہ مقام بارودک ایک قومی مجلس منعقد ہوئی، جس میں منصور نے اعلان کیا کہ میں امارت کے معاملات سے تنگ آ گیا ہوں اور اپنے بھتیجے یوسف کے حق میں دست برداری کے لئے تیار ہوں، چنانچہ وہیں یوسف کی حاکمی کا اعلان ہو گیا[۵۳]۔ والیِ دمشق کو اطلاع دے دی گئی۔ جس علاقے پر یوسف کی حکومت تھی، وہ طرابلس سے صیدا تک پھیلا ہوا تھا۔

شیخ ظاہر العمر

اس وقت دو اور شخص منظرِ عام پر آ چکے تھے، جو شہابی امیر کے ساتھ مجد و بزرگی میں شریک ہونے والے تھے۔ ایک شیخ ظاہر العمر دوسرا احمد الجزار، ان کے ظہور کے ساتھ ہی فلسطین اور لبنان میں سبقت کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ حلب اور دمشق پیچھے رہ گئے معلوم ہوتا ہے کہ حلب و دمشق کی شہری اور آس پاس کی دیہاتی آبادی تعداد میں بھی کم تھی اور اس میں ہمت و حوصلہ بھی نہ تھا۔

الظاہر العمر کے باپ کو بشیر اوّل نے شیخ کا درجہ دیا تھا اور اسے حاکم صفد سے ملحق کر دیا تھا۔ ۱۷۳۷ء میں الظاہر العمر سیاسی اکھاڑے کے اندر داخل ہوا۔ وہ صفد پہلے لے چکا تھا، اب اس میں طبریہ بھی شامل کر لیا[۵۴]۔ بالائی طبریہ کے شیعوں کی امداد سے ظاہر نے اس علاقے کو حاکموں سے پاک کر دینے کی ٹھان لی۔ شیعوں پر ترک افسر سختیاں کرتے تھے، لہٰذا وہ ہر اس لیڈر کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتے تھے جو ان کے لیے سختیوں سے بچاؤ کا وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوتا۔ نابلس اور ناصرہ اس کے قبضے میں آ گئے۔ ۱۷۵۰ء میں عکّہ بھی اسے مل گیا۔ یہ بہت بڑا انعام تھا[۵۵]۔ عکّہ صلیبی جنگوں کے زمانے سے برباد و تباہ چلا آتا تھا، الظاہر العمر نے اس کے استحکامات بھی از سرِ نو تیار کرائے۔ یہیں اقامت اختیار کر لی اور اسی بندرگاہ سے ریشم، روئی اور فلسطین کی دوسری جنسیں بیرونی منڈیوں میں بھیجنے لگا۔ اگرچہ وہ مطلق العنان تھا، لیکن رعایا کا اسے بہت خیال تھا۔ اس نے بدامنی ختم کی، کھیتی باڑی کو ترقی دی۔ مسیحی رعایا سے رواداری کا برتاؤ ملحوظ رکھا۔ ایک شخص چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک روز ناصرہ میں الظاہر گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ یونانی کلیسا

---

۵۱ شدیاق ص ۱۶۲۔

۵۲ سعد الخوری رشمیا کا ایک مارونی تھا، جسے حیدر کا سرپرست بنایا گیا تھا۔ اس کا تعلق اسی خاندان سے تھا، جس سے جمہوریۂ لبنان کے دو صدر منتخب ہوئے، حیدر ص ۷۴۳، شدیاق ص ۳۷۷۔ یوسف نے اس خاندان کا درجہ اونچا کر دیا، دیکھیے حیدر ص ۸۴۹۔

۵۳ حیدر، تاریخ ص ۸۰۷، شدیاق ص ۳۸۶ - ۳۸۷۔

۵۴ دالنے جلد ۲ ص ۸۵، شدیاق ص ۳۶۰، حیدر ص ۸۰۱، میخائیل الصباغ العکاوی نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام تاریخ الشیخ الظاہر العمری الزیدانی، اس کا ص ۲۱-۳۳۔

۵۵ دالنے جلد ۲ ص ۸۹، صباغ ص ۴۱-۴۴۔

کے پاس پہنچا تو اُتر پڑا اور ادب و احترام سے قسم کھائی کہ اگر مجھے فتح حاصل ہوئی تو اس کلیسا میں ہمیشہ چراغ روشن رہے گا[151]۔ الظّاہر کے سیرت نگار نے لکھا ہے کہ اس کے زیرِ اثر علاقے میں ایک عورت بھی سونا اچھالتی ہوئی جاتی تھی تو اسے قطعاً اندیشہ نہ تھا کہ کوئی چھین لے گا[152]۔ وہ سلطنت کے مالی واجبات بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ واجبات ادا کرنے والا ترک ہو یا عرب، حکومت کو روپے سے کام ہے اور کسی چیز سے کیا واسطہ؟

ترکی کو اُس وقت روس سے نہایت خوفناک جنگ درپیش تھی، جو روس کی ملکہ کیتھرائن نے شروع کر رکھی تھی۔ مشرقِ قریب میں سلطنت کا وقار بہت گر گیا تھا۔ علی بے حاکم مصر نے سلطان کی مخالفت میں کوئی تامّل نہ کیا اور اپنے کارندے ابو الذّہب کو شام بھیج دیا۔ تاکہ دمشق اور دوسرے شہروں پر قبضہ کر لے[153]، چنانچہ ۱۷۷۱ء میں قبضہ کر لیا گیا۔ الظّاہر نے علی سے اتّحاد کر لیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ مملوکوں کی سلطنت از سرِ نو بحال کر لی جائے۔ روسی بیڑے نے صیدا پر گولہ باری کی۔ الظّاہر اس بیڑے کے تعاون سے ۱۷۷۲ء میں شہر پر قابض ہو گیا[154]۔ روسیوں نے بیروت پر بھی گولہ باری کی اور شہر کو لوٹا۔ یوسف شہاب نے الظّاہر کے خلاف والیٔ دمشق سے اتحاد کر لیا۔ قسطنطنیہ سے ایک بیڑا اس سلسلے میں امداد کے لیے بھیج دیا گیا، چنانچہ ۱۷۷۵ء میں صیدا لے لیا گیا اور الظّاہر کے مستحکم دار الحکومت کی ناکہ بندی کر لی گئی۔ ترکی گولے عکّہ کی فصیل کے لیے بیکار ثابت ہوئے۔ لیکن ترکی رشوت کامیاب رہی اور الظّاہر مارا گیا۔ جس شامی فوج نے الظّاہر کے خلاف صیدا کو محفوظ رکھنے کی کوششیں کی تھیں، انھیں میں سے ایک احمد الجزّار بھی تھا، جس کے کارناموں کے سامنے الظّاہر کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔

احمد پاشا الجزّار

احمد اصلاً بوسینا کا مسیحی تھا۔ اس نے لڑکپن ہی میں ایک جنسی جرم کا ارتکاب کیا اور وہ بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ وہاں خود ہی ایک یہودی بردہ فروش کے ہاتھ بکا، جس نے قاہرہ پہنچ کر اُسے علی بے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ علی بے اس سے جلّاد کا کام لیتا رہا۔ اس کام میں احمد نے خاص مشق بہم پہنچالی اور وہ جلّادی کی خدمت نہایت خوشی سے انجام دیتا تھا، لہٰذا اسے جزّار (قصّاب) کا لقب دے دیا گیا، جس پر وہ بہت بڑا فخر کرتا رہا اور اس کے لوازم کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ مصر سے بھاگ کر شام پہنچا، جہاں الظّاہر کے خلاف جنگی خدمات کے صلے میں اسے صیدا کا حاکم بنا دیا گیا[155]۔ کچھ مدّت کے لئے وہ بیروت پر بھی قابض رہا، لیکن اس نے یوسف شہابی کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ والنے اسی زمانے میں بیروت سے گزرا تھا، وہ بتاتا ہے کہ شہر کی آبادی تقریباً چھ ہزار تھی[156]۔

الجزّار نے اپنا دائرۂ اقتدار جنوبی جانب بڑھا لیا اور وہ عکّہ میں الظّاہر کا جانشین بن گیا۔ اس پاس کے دیہات سے بیگار اٹھائی

[151] والنے جلد ۲ ص ۴۸۸۔

[152] ایضاً ص ۵۰۔

[153] ابوذہب علی کا غلام تھا وہ تقسیمِ تحائف میں حد درجہ سخی اور کشادہ دل تھا، لہٰذا اس لقب سے مشہور ہوا۔ جبرتی جلد اوّل ص ۴۱۷۔

[154] صباغ ص ۱۱۵، شدیاق ص ۳۸۹، حیدر لبنان ص ۶۳۔

[155] حیدر، تاریخ ص ۸۱۱، ۸۲۷۔

[156] جلد ۲ ص ۱۷۰۔

اور شہر کو بہت مستحکم بنالیا۔ ایک چھوٹا سا بیڑا تعمیر کرایا۔ آٹھ سو سواروں کا ایک رسالہ تیار کرایا، جس میں بوسینا اور البانیا کے باشندے شامل تھے۔ ایک ہزار مغربیوں کا پیادہ لشکر مہیا کر لیا۔ اپنے علاقے کی تجارت پر اُس نے جزوی اجارہ داری کا سلسلہ جاری کر لیا تھا۔ اس طرح جو آمدنی ہوتی، اس سے فوج کے مصارف بھی پورے کرتا اور خود بھی عیش و راحت سے رہتا۔ اس نے عکّہ میں جو مسجد جامع بنوائی تھی، وہ اب تک باقی ہے۔ اس کے ارادے بڑے بلند تھے، فلسطین و لبنان کے محدود حلقے ان ارادوں پر تنگ تھے۔ ۱۷۸۰ء میں اسے دمشق کا والی بنا دیا گیا۔ بعدازاں تقریباً ربع صدی تک وہ شام کا حقیقی نائب السّلطنت اور لبنان کے معاملات کا ثالث بنا رہا۔ پھر اس کی زندگی میں پسپائی کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ ۱۸۰۴ء میں طبعی موت مرا۔ اس عہد کے شام کی سرگزشت میں جزّار کو یگانہ حیثیت حاصل ہے۔ ترکوں کو عرب کے رہائیوں سے واسطہ پڑا ہوا تھا اور وہ کسی دوسری طرف نظر اٹھا ہی نہ سکتے تھے۔

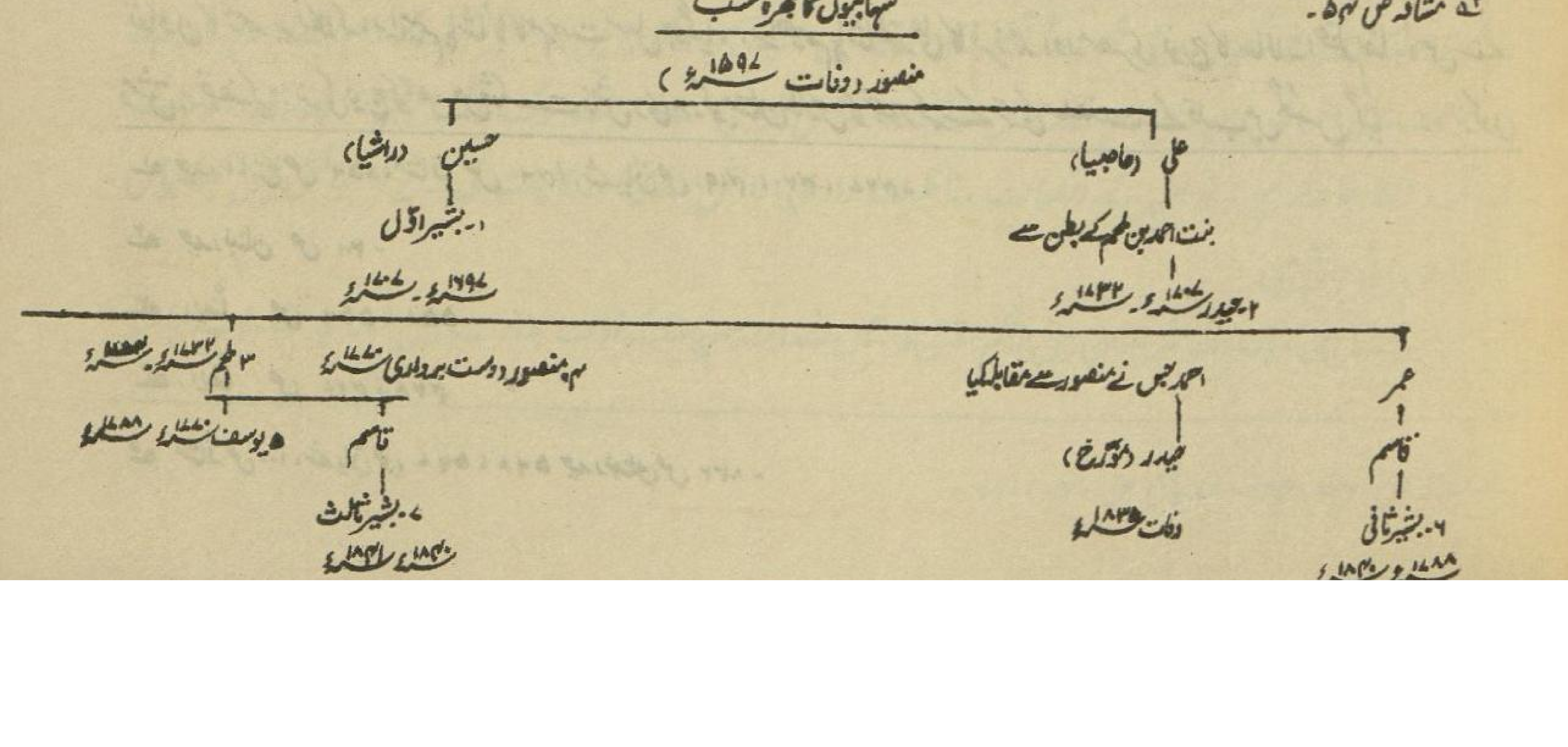
جزّار کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۷۹۹ء میں انجام پایا، جب اس نے نپولین کی پیش قدمی روکی۔ فرانسیسی حملہ آور تسخیرِ مصر کے بعد ساحل فلسطین کے ساتھ ساتھ فاتحانہ پیش قدمی کرتا ہوا امر کنہ جزّار کے دروازوں پر پہنچ گیا۔ جزّار نے سر سڈنی سمتھ کے انگریزی بیڑے کی امداد سے عکّہ کی کامیاب حفاظت کی (۲۱۔ مارچ ——— ۲۰ مئی ۱۷۹۹ء) پھر نپولین کی فوج میں طاعون پھوٹ پڑا۔ اور وہ واپسی پر مجبور ہو گیا۔ قبروں پر فرانسیسی کتبے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں فرانسیسی سپاہی دفن ہوئے تھے۔

عکّہ کا امیر ایک غاصب مطلق العنان شخص تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں اور رقیبوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا، شیعوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اور ان بدوؤں کو بھی بُری طرح دبا دیا جو اس کے پیشروؤں کی امداد کرتے رہے تھے۔ بہ حیثیت عمومی شام و لبنان پر دہشت طاری کیے رکھی۔ اس کا نام آج تک جبر و بیدردی کا مترادف مانا جاتا ہے۔ ایک مقامی وقائع نگار میخائیل مشاقہ[1] لکھتا ہے کہ میرا دادا سرکاری افسر تھا۔ ایک روز اُس نے دیکھا کہ شہر سے باہر چالیس سے زیادہ آدمی ٹھہرائے ہوئے ہیں اور حکم ہُوا ہے کہ اُن کی کھال اتار دی جائے، ان میں سے چار آخری آدمی میرے دادا کی سفارش کی بنا پر معاف کر دیئے گئے، وہی وقائع نگار بتاتا ہے کہ کہ ایک موقع پر جزّار کے دل میں اپنے حرم کے متعلّق کچھ شبہات پیدا ہو گئے۔ اس وقت حرم میں سینتیس عورتیں تھیں۔ اس کے حکم سے خواجہ سراؤں نے ایک الاؤ جلایا اور ایک ایک عورت کو پکڑ کر اس الاؤ میں ڈالتے گئے[2]۔ لبنان میں اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک فریق

[1] میخائیل مشاقہ کی کتاب مشہد الاعیان بہ حوادث سوریہ و لبنان۔ کتاب بڑی قیمتی ہے، لیکن اچھی طرح ایڈٹ نہیں ہوئی۔

[2] مشاقہ ص ۵۴۔

شہابیوں کا شجرہ نسب



کو دوسرے فریق کے خلاف ابھار دیتا۔ خود اسے جنبلاط سے اچھا تعلق تھا۔ ۱۷۸۸ء میں بہ مقام قب الیاس جنگ ہوئی۔ جس میں یوسف شہابی نے شکست کھائی۔ جزّار نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ بشیر شہابی کو حاکم چن لیں۔ یوسف کو عکّہ کے قید خانے میں پھانسی دے دی گئی۔[۱]

بشیر ثانی

ابتدا میں بہ حیثیت حاکم لبنان بشیر ثانی کی حیثیت کمزور تھی۔ اس کے پیش رَو یوسف کے بیٹے سرگرمی سے اس کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور اس کا سرپرست جزّار اس وجہ سے ناراض تھا، کہ بشیر نے نپولین کے خلاف جدّوجہد میں کوئی مدد نہ دی تھی، چنانچہ وہ علاقہ چھوڑ جانے پر مجبور ہوا۔ ۱۷۹۹ء میں سڈنی سمتھ کے ایک جہاز پر سوار ہو کر مصر چلا گیا۔[۲] اس وقت سے انگریز اس کے حلیف بن گئے۔

چند مہینے کی غیر حاضری کے بعد وہ واپس آیا اور داخلی دشمنوں کو کچل کر اپنی امارت مستحکم بنائی۔ یوسف کے بیٹوں کو موت کی سزا دینے سے پیشتر اندھا کر دیا گیا۔ البقاع کو دوبارہ لبنان میں سے بلا لیا گیا، اور والیٔ دمشق کی خواہش کا کچھ خیال نہ کیا گیا، ترکوں کے متعلق بشیر کی پالیسی بڑی پختہ اور پائدار تھی، یعنی وہ ان کا ساتھ دینے پر ہمہ تن آمادہ تھا۔ ۱۸۱۰ء کے اوائل میں نجد کے وہابیوں نے صحرا سے نکل کر شاہی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ عجلون اور جنوبی حوران خطرے میں پڑ گئے تھے، بشیر پندرہ ہزار لبنانیوں کے ساتھ انھیں نکال باہر کرنے میں مدد دینے کے لیے پہنچ گیا۔[۳] فتح یابی کے بعد وہ دمشق بھی گیا۔ اب وہ معمولی مقامی رئیس نہیں رہا تھا، بلکہ شام کے معاملات میں اہم کردار ادا کر رہا تھا، دمشق و طرابلس کے والیوں میں جھگڑا پیدا ہوتا تھا تو وہی اُسے چکاتا تھا، پھر جلا وطنی کی نوبت آ گئی (۱۸۲۱ء، ۱۸۲۲ء)، یہ مدّت اس نے مصر میں بسر کی۔[۴] وہاں مصر کے نائب الحکومت محمّد علی پاشا سے اس کی دوستی ہو گئی۔ محمّد علی پاشا ہی نے آگے چل کر مصر کے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔

چند سال بعد محمّد علی نے شام کے راستے خود ترکی کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس موقع پر بشیر نے اس کا ساتھ دیا۔ مصر کے نائب الحکومت نے یونان کی جنگ میں ترکوں کی شاندار خدمات انجام دی تھیں، پھر عرب میں وہابیوں سے لڑائی کی نوبت آئی تو انھیں بھی بُری طرح کچلا۔ اسے امید تھی کہ ان خدمات کے صلے میں کم از کم شام ہی اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ توقع پوری نہ ہوئی تو لڑائی چھڑ گئی۔ ۱۸۳۱ء میں مصریوں نے عکّہ کا محاصرہ کیا تو لبنانی فوج بھی ان کے دوش بدوش کھڑی تھی۔[۵] بشیر کے تعاون کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابراہیم پاشا کا کام بہت سہل ہو گیا، ابراہیم پاشا محمّد علی کا فرزند اور مصری فوج کا سالار اعظم تھا۔ اُس نے دمشق پر قبضہ کیا۔ ترکی فوج کو حمص میں شکست فاش دی اور کوہستان طارس کو عبور کر کے ترکی سلطنت کے قلب میں گھس گیا۔ وہ ترکوں

---

۱ جیدر، تاریخ ص ۸۵۶، مشاقہ ص ۴۶، شدیاق ص ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۷-

۲ جیدر لبنان ص ۲۰۱-

۳ ایضاً ص ۵۵۶، ۵۵۷-

۴ ایضاً ص ۴۲۷، ۴۲۸

۵ مشاقہ ص ۱۰۱، شدیاق ص ۵۶۷، ۵۶۸ جیدر لبنان ص ۸۳۲-

پر کاری ضرب لگانے ہی والا تھا کہ انگلستان، آسٹریا اور روس کی متفقہ مداخلت نے اسے مراجعت پر مجبور کر دیا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں شام پر اس کی حکومت ختم ہو گئی۔ محمد علی پاشا نے ایک عربی سلطنت کا خواب دیکھا تھا، جس کا رئیس وہ خود بننے والا تھا، لیکن یہ خواب پریشان ہو گیا۔ عرب عوام کے شعور میں ایسی سلطنت کی کوئی بنیاد موجود نہ تھی۔ پچاس سال گزر گئے تو پھر ایک تاجدار نے اپنے دل میں ایسے ہی عزائم کی پرورش کی۔ یہ شریف حسین والیٔ مکہ تھا۔ اس کی کوشش بھی قبل از وقت ثابت ہوئی۔

ابراہیم پاشا شام سے واپس چلا گیا تو ترکوں نے بشیر سے جواب طلب کیا۔ سنہ ۱۸۴۰ء کے موسم خزاں میں ایک برطانوی جہاز اسے مالٹا لے گیا۔ مالٹا سے اسے قسطنطنیہ جانے کی اجازت مل گئی، جہاں اس نے سنہ ۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔ اس کی لاش سنہ ۱۹۴۷ء میں قسطنطنیہ سے بیت المقدس میں منتقل ہوئی، یہ وہ عالی شان قصر تھا، جو اس نے دورِ عروج میں تعمیر کرایا تھا۔ کوہستانی علاقے میں اتنی عالی شان اور خوش منظر عمارت کوئی نہیں۔ بشیر نے اس کے لیے نو میل سے پانی لانے کا انتظام کیا۔ نو میل کے فاصلے پر عین زحلتا تھا، یہاں ایک ایسی پہاڑی تھی، جس پر صنوبروں کے جھنڈ تھے، یہاں برف بھی خاصی پڑتی تھی اور بارش بھی خاصی ہوتی تھی، اس وجہ سے چشمے میں پانی کی بہتات تھی، یہیں سے بذریعہ نہر پانی بیت الدین پہنچایا گیا۔ فخر الدین کے زمانے کی طرح بشیر کے زمانے میں بھی لبنان نے بڑی ترقی کی۔ اس نے سڑکیں بنوائیں، پُل درست کرائے اور بیروت کو ترقی کی اُس راہ پر لگایا، جہاں وہ اب پہنچا ہوا ہے، یعنی شام و لبنان کا دروازہ بن گیا ہے۔ معن اور شہابی اس خیال سے بیروت کا قیام غیر مناسب سمجھتے تھے کہ وہاں بحری قزاقوں اور دوسرے دشمنوں کے حملے ہو سکتے تھے۔ فخر اور بشیر دونوں کی کوشش یہ تھی، کہ لبنان آزاد ہو جائے اور اُس کے حدود خاصے وسیع ہوں، یعنی پہاڑوں کے علاوہ ساحلی مقامات اور مشرقی میدان بھی اس میں شامل ہوں۔ دونوں نے بیرونی تجارتی تعلقات کی حوصلہ افزائی کی۔ دونوں نے سیاسی پناہ گیروں اور مذہبی اقلیتوں کا خیر مقدم کیا۔ بشیر نے حلب کی دروزی خاندانوں کی ایک تعداد کے علاوہ یونانی کیتھولکوں کو اپنے ہاں پناہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

فخر الدین جسمانی اعتبار سے بہت معمولی حیثیت کا تھا، بشیر بڑا خوش رُو اور وجیہ تھا۔ عقابی آنکھیں، شیر کا سا چہرہ اور لہراتی ہوئی داڑھی ہیبت اور احترام پیدا کرتی تھی۔ بلاشبہ وہ مسیحی تھا۔ لیکن اُس نے اعلان خلافِ مصلحت سمجھا۔ اس کا باپ شہابی خاندان کا سب سے پہلا فرد تھا، جس نے اسلام چھوڑ کر مارونیت اختیار کر لی تھی۔ اگر فخر الدین جدید دور کا پہلا لبنانی تھا، تو بشیر دوسرا۔ معن خاندان نے مغربی ثقافت کی جو روایات قائم کی تھیں، بشیر نے ان کا دروازہ چوپٹ کھول دیا، خصوصاً تعلیم کے سلسلے میں اپنے ہم وطنوں میں وہ بشیر الکبیر کے نام سے معروف ہے اور کوہستانی افسانوں میں اس نام نے خاص حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جب لوگ آگ تاپنے کے لیے الاؤ کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں، تو بشیر کے انصاف، ناطرف داری، دانش مندی اور قابلیت کی مدح و ستائش میں کہانیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

سنہ ۱۸۴۰ء میں ایک اور بشیر لبنان میں حاکم مقرر ہوا، جس نے ابراہیم پاشا کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا، جب پاشا

---

[1] مشاقہ ص ۱۳۲، ۱۳۷۔ شدیاق ص ۶۲۰، ۶۲۱۔

نے لبنانیوں پر ٹیکس بڑھا دیئے تھے اور ان سے ہتھیار لے لینے کی کوشش کی تھی[۵۱]۔ امیر بشیر نے ابراہیم کو لبنان سے خارج کرنے میں دولتِ عثمانیہ اور برطانیہ سے تعاون کیا تھا۔ دولتِ عثمانیہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار اس امر کی کوشش کر رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات مرکز کے قبضے میں چلے جائیں۔ یہ پالیسی محمود مصلح نے جاری کی تھی۔ اب انھیں یقین ہو گیا کہ کوہستانی علاقے کو زیرِ اثر رکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آبادی میں تفرقے کے بیج بو دیئے جائیں، یعنی مسیحیوں اور دروزیوں کے درمیان کشمکش پیدا کر دی جائے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، اب تک مختلف فریق ترتیب و تسمیہ کے اعتبار سے قیسی اور یمنی یا یزبکی اور جنبلاطی کہلاتے تھے۔ اب جو کشمکش ۱۸۴۱ء میں شروع ہوئی تو وہ مسیحیوں اور دروزیوں کے درمیان تھی۔ بالآخر وہ ۱۸۶۰ء کے قتلِ عام پر منتج ہوئی۔ اس وجہ سے یورپی طاقتوں کے لیے مداخلت کا موقع پیدا ہوا[۵۲]۔ ایک فرانسیسی فوج تقریباً ایک سال تک لبنان پر قابض رہی جو مسیحی ۱۸۶۰ء میں قتل ہوئے۔ ان کا تعداد کا اندازہ گیارہ ہزار کیا گیا تھا اور جو بھوک سے مرے، وہ چودہ ہزار تھے[۵۳]۔

لبنان کا استقلال

۱۸۶۱ء کے قانونِ اساسی کے مطابق، جس پر ۱۸۶۴ء میں نظرِ ثانی کی گئی تھی، کوہستانی علاقے کے لیے ایک مسیحی گورنر جنرل کے ماتحت داخلی استقلال کا انتظام قائم کر لینے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ یہ گورنر جنرل یا متصرف مذہباً کیتھولک ہو، بابِ عالی اسے نامزد کرے اور جن طاقتوں نے آئین پر دستخط کیے ہیں وہ اس کی منظوری دے دیں[۵۴]۔ یہ عہدیدار پانچ سال کے لیے مقرر ہوتا تھا اور پانچ سال کے بعد اسے دوبارہ مقرر کیا جا سکتا تھا۔ مختلف مذہبی جماعتوں میں سے بارہ نمائندوں کی ایک منتخب انتظامی مجلس اس کی امداد کے لئے تجویز کر دی گئی۔ ماتحت گورنر یا قائم مقام نئے متصرفیہ جبل لبنان کے سات ضلعوں کے لیے مقرر ہوئے۔ اسے سات ضلعوں میں تقسیم کرنے سے پیشتر بیروت، صیدا، وادیٔ تیم اور مشرقی بقاع کو الگ کر لیا گیا۔ اس حکومت نے اپنی عدالتیں مقرر کیں اور انتظام قائم رکھنے کے لیے ایک مقامی ملیشیا بنا دی گئی۔ کوئی ترک فوج وہاں نہ رہ سکتی تھی، نہ کوئی خراج قسطنطنیہ بھیجنا ضروری تھا۔ اور نہ شہریوں سے کوئی فوجی خدمت لی جا سکتی تھی۔

---

۵۱ باغیوں کے منشور کے لیے دیکھیے فلپ اور فرید الخازن کی کتاب مجموعۃ المحررات السیاسیہ جلد اوّل ص ۲-۵

۵۲ ولیم ملر کی کتاب The Ottoman Empire ۱۸۰۱-۱۹۲۷

ص ۳۰۰، ۳۰۲۔ شیلٹما Scheltema، کی کتاب ایک عمدہ عربی ماخذ کا غیر صحیح ترجمہ ہے۔

۵۳ کرنیل چرچل کی انگریزی کتاب: دروزی، مارونی ترکوں کے ماتحت ۱۸۴۰ء۔ ۱۸۶۰ء۔ ص ۲۱۹۔ خازن جلد ۲، ص ۹۹۔

۵۴ ۱۸۶۱ء کے فرمان پر یورپی طاقتوں میں سے برطانیہ، روس، پروشیا اور آسٹریا نے دستخط کئے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں اٹلی بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔ لہٰذا طاقتوں سے مراد یہی پانچ ہیں۔

۵۵

یہ داخلی طور پر مستقل صوبہ لبنان اگرچہ بعض نہایت اہم علاقوں سے الگ کر لیا گیا تھا، جو طبعاً اُس کے حدود میں شامل تھے، تاہم اس کے لیے مقابلۃً امن و خوش حالی کا ایک ایسا دور شروع ہُوا، جو سلطنت عثمانیہ کے کسی دوسرے صوبے کو حاصل نہ ہو سکا۔ نئی سڑکیں وجود میں آ گئیں۔ جن دیہات کی سطح بلند تھی، انہیں گرمی بسر کرنے کے لیے تجویز کر لیا اور ریل کی ایک چھوٹی پٹڑی بیروت و دمشق کے درمیان بچھا دی گئی جس مشکل کی وجہ سے اس کے باشندے صدیوں تک تکلیفیں اٹھاتے رہے، یعنی ان کے درمیان بہ آسانی آنے جانے کے ذریعے بہت کم تھے اور اسی وجہ سے وہ متحدہ ریاست پیدا کرنے میں ناکام رہے، اب وہ مشکل آہستہ آہستہ دُور کی جا رہی تھی۔ گرمی بسر کرنے کی جگہیں ایسی تجویز ہوئیں، جہاں قدرتی مناظر بہت اچھے تھے اور قدرت نے پہاڑوں میں کشادہ دلی سے خوبصورت مناظر پیدا کر دیئے تھے، بلاشبہ لبنان کے طبعی وسائل کم تھے لیکن ان کی تلافی بحری تجارت کی سہولتوں سے پیدا ہو گئی اور پیداوار کی کمی نے لوگوں میں مستعدی پیدا کر دی، جیسا کہ ان کے باپ دادوں میں پیدا کر دی تھی اور وہ مشرقی بحیرۂ روم کے سواحل کے بڑے تاجر اور آبادکار بن گئے۔ یہ ضرب المثل عام ہو گئی کہ "خوش قسمت وہ ہے، جسے لبنان میں ایک بکری کے احاطے جتنی زمین حاصل ہو" بڑھتی ہوئی خوش حالی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آبادی میں بہت اضافہ ہو گیا، خصوصاً مسیحیوں کی آبادی میں، جو اجازت نامے لے کر باہر جانے لگے۔ اگرچہ زمین نسبتاً بنجر تھی، تاہم کوہستانی علاقے کی عورتیں بچے بہت پیدا کرتی تھیں[51] ۱۸۸۰ء کے شروع سے لبنان کے باشندے اجازت نامے لے کر باہر نئے وطنوں کی تلاش میں جانے لگے، مثلاً مصر، امریکہ، آسٹریلیا یا مہذب دُنیا کے دوسرے حصوں میں اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ تنہا ریاستہائے متحدہ میں لبنانی الاصل باشندے اڑھائی لاکھ سے کم نہ ہوں گے[52]

گورنر جنرلوں یا متصرفوں کی ابتدا ایک خاص طور پر قابل شخص سے ہوئی، جس کا نام داؤد پاشا تھا۔ اُس نے لبنان کا کچھ کھویا ہُوا حصّہ بھی واپس دلایا۔ دروزیوں کے لیے عبیہ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو اب تک اسی کے نام سے موسوم ہے۔ اس نے جنوب کے جاگیردار امراء اور شمال کی مسیحی مذہبی پارٹی، دونوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ مذہبی پارٹی کا لیڈر یوسف کرم تھا۔ جسے چند لڑائیوں کے بعد جلا وطن کر کے اٹلی بھیج دیا گیا، وہیں اُس نے وفات پائی۔ داؤد پاشا کے بعد رستم پاشا متصرّف مقرر ہُوا۔ جو آگے چل کر لندن میں سفیر بن گیا تھا۔ وہ بھی بڑا مستعد اور کفایت شعار ناظم تھا[53]

---

[51] ملر (Miller) ص ۳۰۰

[52] دیکھیے Arabic-Speaking Americans ص ۴ -
نیز فلپ حتّی کی کتاب The Syrian in America ص ۶۲ - ۶۳ -
امریکہ میں لبنانیوں کو اب تک عموماً شامی ہی کہا جاتا ہے -

[53] متصرفوں کی فہرست ذیل میں درج ہے :-
داؤد (۱۸۶۱ - ۱۸۶۸)، نصری فرینکو (۱۸۶۸ - ۱۸۷۳) رستم (۱۸۷۳ - ۱۸۸۳) واصا (۱۸۸۳ - ۱۸۹۲)، نعوم (۱۸۹۲ - ۱۹۰۲)، مظفّر (۱۹۰۲ - ۱۹۰۷) جوزف فرینکو (۱۹۰۷ - ۱۹۱۲)، اوبانس کیو بیمان (۱۹۱۲ - ۱۹۱۵)۔ ان میں داؤد اور کیو بیمان ارمنی الاصل تھے، فرینکو اور رستم اطالوی، واصا البانی اور مظفّر پولستانی (باشندۂ پولینڈ یا پولستان)۔

پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔ تو ترکوں نے لبنان کی خاص حیثیت ختم کردی۔ اسے جو حقوق حاصل ہوئے تھے، وہ کریٹ کے لیے ایک مثال بن گئے۔ مجموعی حیثیت میں لبنان ترکوں کے ماتحت داخلی استقلال کی ایک نہایت کامیاب مثال تھا۔[1]

---

[1] طبرص ۳۰۶۔

پچاسواں باب

دورِ حاضر کا نقشہ

دورِ حاضر کے شرق عربی کی زندگی کا جو نقشہ ہمارے سامنے شام و لبنان میں پیش ہُوا، اس کی امتیازی خصوصیت ان زبردست قوّتوں کا ہرتز و تعامل ہے، جن کا تعلّق مغرب کی مداخلت و استعمار سے تھا، یعنی مقامی قومیّت کا ظہور، آزادی کے لیے جدوجہد اور اقوامِ عرب کے اتّحاد کی تحریک کا پھیلاؤ۔ یہ متحرّک قوّتیں ہیں اور ان کا باہم ایک دوسری پر اثر پڑتا ہے۔ یہی قوّتیں گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے نہایت اہم واقعات و حوادث کی ذمّہ دار ہیں۔

سیاسی مداخلت

انیسویں صدی کی ابتداء ہوئی، تو سلطنتِ عثمانیہ کو اپنے بچاؤ کے لیے کوششیں کرتے ہوئے ایک سو سال کی مدّت گزر چکی تھی، وہ برابر سکڑتی جا رہی تھی۔ یورپ کی تین بڑی طاقتوں کے درمیان ترکی میں زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے مقابلہ در پیش تھا۔ تین طاقتیں فرانس، روس اور برطانیہ تھیں، آسٹریا ایک حد تک پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پروشیا اس وقت تک دوسرے درجے کی طاقت تھا اور اٹلی کا سرے سے وجود ہی نہ تھا، فرانس یہ چاہتا تھا کہ اس کی اقتصادی مصلحتیں محفوظ رہیں، وقار کو کوئی نقصان نہ پہنچے جو خاص مراعات ایک زمانے سے حاصل ہیں، ان میں کوئی خلل پیدا نہ ہو، نیز کیتھولک اور مارونی اقلیتوں سے روایتی دوستانہ تعلقات جاری رہیں، بہ طورِ خاص اہمیّت ان مراعات کو دی جاتی تھی، جو ۱۷۴۰ء میں حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق ارضِ مقدّس (فلسطین) کے تمام زائر عملاً فرانس کی حفاظت میں آ گئے تھے۔

روس نے ترکی کو ذلّت خیز شکست دی، جس کی شہادت کوچک کینرجی کا معاہدہ پیش کر رہا ہے، (۱۷۷۴ء) اس وقت سے عملاً فرانسیسی اثر و رسوخ کی جگہ روسی اثر و رسوخ نے لے لی۔ ترکی کے معاملات سے روس کی دلچسپی کا آغاز پیٹر اعظم اور کیتھرائن کے زمانے سے ہوتا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ روس کی جغرافیائی حیثیّت بھی اس دلچسپی کی موید تھی، یعنی اس کے قبضے میں کوئی بحری راستہ نہ تھا۔ اور وہ طبعاً چاہتا تھا کہ جنوبی سمت میں اسے ایک اچھی بندرگاہ مل جائے، جہاں ہر موسم میں جہاز آتے جاتے رہیں، سب سے آخر میں یہ کہ وہ یونانی آرتھوڈکس مسیحیوں سے دلی ہمدردی کا مدّعی تھا۔ کوچک کینرجی کے معاہدے کے رُو سے فرمانروایانِ روس کو یونانیوں کے محافظ مان لیا گیا۔ جنگ کریمیا (۱۸۵۴ء۔۱۸۵۶ء) کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ روس اور فرانس دونوں مقاماتِ مقدّسہ مسیحیّہ کی حفاظت کے سلسلے میں متصادم دعوے پیش کر رہے تھے، برطانیہ کو ترکی کی ہمسائیگی میں کوئی علاقہ حاصل نہ تھا، لیکن سولھویں صدی سے اس نے ہندوستان، مشرقِ بعید اور مشرقِ قریب کے ساتھ خشکی کے راستے تجارت کے سلسلے میں خاص دلچسپی کا سامان فراہم کر لیا تھا۔[۱] سلطنتِ عثمانیہ میں عملِ انحلال شروع ہُوا تو برطانیہ کے تجارتی مفاد نے استعمار کا لباس پہن لیا۔

---

[۱] دیکھیے انگریزی کتاب کا ص ۶۷۲ نیز سیٹن ولیمز کی کتاب Britain and the Arab States ص ۵۰۰۔

برطانیہ کو نہ تو یہ منظور تھا کہ ترکی کے اجزا الگ الگ کر لیے جائیں، نہ یہ منظور تھا کہ روس باسفورس پر آ بیٹھے۔ بڑی طاقتوں کے درمیان رقابت کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی، اس کی وجہ سے ترکی کو زندگی کی نئی مہلت مل گئی اور لمبی مدت کے لیے اس کے وجود کا گویا بیمہ ہو گیا، مزعومہ مسئلہ شرقیہ کا پورا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، مسئلے کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ کے نقصان پر اپنے لیے توسیع کا انتظام کیا جائے اور یہ طاقت جو کسی زمانے میں نہایت عظیم الشان تھی، تدریجاً ناپید ہو تو خلا کو پُر کر دیا جائے۔

انیسویں صدی کے اختتام پر ایک نئی مغربی طاقت سلطنتِ عثمانیہ کی فضا میں نمودار ہونے لگی تھی، یعنی جرمنی قیصر ولیم نے "شرقی جانب پیش قدمی" کی جو پالیسی جاری کی تھی، اس کی وجہ سے بہت جلد جرمنی کو ترکی کے معاملات میں خاصا اقتدار حاصل ہو گیا۔ یہی زمانہ تھا، جب سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء - ۱۹۰۹ء) عثمان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ حد درجہ رجعت پسند سلطان تھا، اسے قیصر ولیم ایک نیا اور خوش آئند دوست مل گیا۔ ۱۸۹۸ء میں شاہنشاہ دو مرتبہ قسطنطنیہ گئے۔ اور وہاں سے یروشلم و دمشق پہنچے۔ دمشق میں قیصر نے سلطان صلاح الدین کے مزار پر پھول چڑھائے۔ پھر ایک آتشیں تقریر میں اس نے سلطان، نیز "تیس کروڑ مسلمانوں کو جو خلیفہ کی حیثیت میں اس کا احترام کرتے ہیں" یقین دلایا کہ جرمن شاہنشاہ ان کا دوست ہے اور ہمیشہ دوست رہے گا۔[۱] بعد ازاں بغداد ریلوے کے لیے اجارہ ایک جرمن کمپنی کو دیا گیا۔[۲] اس طرح برلین کو بغداد سے ملا دینے کا منصوبہ تیار ہوا، جو عوامل پہلی عالمی جنگ کے موجب بنے، ان میں سے ایک سبب یہ ریلوے لائن بھی تھی۔ اس اثنا میں جرمن افسر ترکی فوج کی تنظیم جدید کے لئے بھیج دیے گئے۔

عبدالحمید کا دورِ حکومت

سلطان عبدالحمید کی پالیسی میں اختلافی نقطہ یہ تھا کہ سلطنت کی عام حیثیت یورپی کے بجائے ایشیائی زیادہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس پالیسی پر عمل پیرائی کے سلسلے میں اس نے خلافت کو ایک قدیم اور کہنہ ادارہ بنا دیا۔ اسی ڈھانچے میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اس نے خلافت کی اس سیاسی قوت کو بروئے کار لانے کی تدبیریں اختیار کیں، جو اسے ابتدائی دور میں حاصل تھیں۔ اتحادِ مسلمین کو اس کا نصب العین بنایا۔ اس طرح اسے امید تھی کہ سلطنت ترکی کی غیر ترک مسلم رعایا، نیز بیرونی ملکوں کے تمام مسلمان اس کے حامی بن جائیں گے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے وزیروں کے اختیارات گھٹاتا گیا، یہاں تک کہ ان کی حیثیت محض سکریٹریوں کی رہ گئی اور سلطنت کے تمام معاملات و اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیے۔ اس نے اخباروں پر احتساب دستور قائم کیا، تقریر کی جیسی بھی آزادی تھی، اسے منسوخ کر دیا اور پوری سلطنت میں مخبری اور جاسوسی کا ایک جال بچھا دیا۔ اسے ہر لحظہ اپنی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ہر وقت یہ اندیشہ اسے پریشان کرتا رہتا تھا کہ کہیں تخت نہ چھن جائے۔ چنانچہ وہ اپنے قصر یلدیز کی دیواروں کے پیچھے خلوت و علیحدگی کی زندگی کی جانب کھنچتا گیا۔ وسیع گرفتاریوں، سزائے موت اور ارمنوں کے

---

[۱] علمہ ص ۱

[۲] جارج انٹونیس کی کتاب The Arabic Awakening ص ۷۷۔

[۳] ایڈورڈ میڈ ارل (Earle) کی کتاب Turkey, the Great Powers and the Bagdad Railway ص ۶۷-۷۱۔

قتل کے باعث اسے "خونریز سلطان" کا لقب ملا۔

اتحاد المسلمین کی پالیسی کے مطابق عمل پیرائی کے سلسلے میں سلطان خلیفہ نے ۱۹۰۸ء میں حجاز ریلوے مکمل کی، جس کی وجہ[1] سے قسطنطنیہ اور مدینۂ منورہ کے درمیان ارتباط پیدا ہو گیا۔ اس پر تیس لاکھ پونڈ کی رقم صرف ہوئی اور ایک تہائی رقم مسلمانانِ عالم نے جمع کر کے پیش کی۔ "یہ ریل شام کو شمالاً جنوباً قطع کرتی تھی۔[2] اس کے لیے جرمن انجینیروں سے مدد لی گئی تھی اور پوری ریلوے کا محکمہ ایک شامی احمد عزّت پاشا کے حوالے تھا، جو سلطان کا کاتب خاص تھا، ایک اور شامی ابو الہدیٰ الصیاوی کو سلطان پر حیرت انگیز اثر و اقتدار حاصل تھا، وہی سلطان کا پیش امام تھا۔

تیس سال کی مطلق العنان حکومت کے بعد عبد الحمید ایک صبح (جولائی ۱۹۰۸ء) اٹھا تو انقلاب بپا ہو چکا تھا، جس کی سالاری فوج کے افسر کر رہے تھے اور وہ بالکل بے دست و پا تھا۔ یہ انجمن اتحاد و ترقی کا کام تھا جو نوجوان ترکوں نے خفیہ خفیہ منظم کی تھی اور اختیارات اس کے حوالے کر دیے تھے۔ نوجوان ترک ان نوجوان عثمانیوں کے جانشین تھے جن سے مدحت پاشا کا تعلق تھا۔ اس انجمن کی ابتدا ۱۸۹۱ء میں بہ مقام جنیوا (سوئٹزرلینڈ) ہوئی تھی۔ نوجوان حامیانِ اصلاح اور طلبہ کی سرگرمیاں اس کے وجود کی ذمہ دار تھیں۔ پھر اس کا مرکز پیرس منتقل ہو گیا، اس کا نصب العین یہ تھا کہ مغربی طرز کی دستوری حکومت قائم کی جائے، اس کے ساتھ منتخب پارلیمنٹ ہو۔ نظامِ ملّت کی حدّیں توڑ دی جائیں اور تمام طبقات کو متّحد کر کے ایک وضع و ہیئت کی جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو عبد الحمید نے بادلِ ناخواستہ ۱۸۷۶ء کے دستور کی بحالی کا اعلان کیا، دوسرے ہی دن جاسوسی اور احتساب کے نظام منسوخ کر دیے، سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ ۱۰۔ دسمبر کو اس نے بڑے طمطراق سے اس پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں بتایا کہ پہلی پارلیمنٹ عارضی طور پر ملتوی کی گئی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ شہریت کی تعلیم و ترتیب کے ذریعے سے نیابتی مجلس کے لیے پوری تیاری کر لی جائے۔ اس اثنا میں جوش و امید کی لہروں نے پوری قوم کو آغوش میں لے لیا، بیروت، دمشق، حلب، یروشلم اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں دستور کے اعلان کا خیر مقدم آتش بازی، جلوسوں اور مشعلوں سے کیا گیا۔ یقین کر لیا گیا کہ خوف و دہشت کا کابوس رخصت ہو چکا ہے۔ امید کی نئی صبح طلوع ہو گئی ہے اور ترکی ایک رات کے اندر مثالی سلطنت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لیکن عبد الحمید ۱۸۷۶ء کی طرح ۱۹۰۸ء میں بھی کسی دستوری حکومت کو محفوظ رکھنے پر آمادہ نہ تھا، بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ رجعت پسندوں سے ساز باز میں مصروف ہے اور جوابی انقلاب کے لیے سرگرمی سے تگ و دو کر رہا ہے، چنانچہ اپریل ۱۹۰۹ء میں اسے تخت سے اتار کر اس کے ضعیف و کمزور بھائی محمد ارشاد کو سلطان بنا دیا گیا۔ اختیارات انجمن اتحاد و ترقی کے ہاتھ میں رہے۔

انجمن اتحاد و ترقی

نئے نظام میں تجربے یا سیاسی تدبّر کے بجائے حُبِّ وطن کا جوش زیادہ تھا۔ انجمن نے سب کو اسلامی بنا لینے کی پالیسی اختیار

---

[1] مترجم۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ حجاز ریلوے کو بہ طور خاص اتحاد المسلمین (پان اسلامزم) کا نشان کیوں بنایا گیا۔ ساری دنیا میں ریلیں بن رہی تھیں۔ کیا ترکی کے لیے حرمین شریفین تک ریل بنانا ضروری نہ تھا؟ دیکھیے غیر مسلم خصوصاً بعض اسلامی حکومتوں کے بعض عام ترقیاتی منصوبوں کو بھی غیر مناسب مقاصد کا لباس پہناتے رہے۔)

[2] ٹی۔ ای۔ لارنس کی کتاب Seven Pillars of Wisdom ص ۱۹۰ - ۲۰۳۔

کی، یعنی تمام نسلی اور مذہبی عناصر کو ایک سطح پر لاکر سب کو عثمانی قرار دے دیا جائے، اس کا ناکام رہنا یقینی تھا۔ عربوں نے نئی حرّیت کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے قومی مقاصد پورے کرنے کے لیے آزاد ہوں گے اور اپنی ثقافتی انفرادیت کو ترقی دے سکیں گے جس میں زبان بھی شامل تھی۔ بہت جلد علیحدگی کی تحریکوں نے اپنے دعاوی منظرِ عام پر پیش کر دیے۔ سب کو عثمانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش ناکام رہی تو نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کے عہد کا حربہ اختیار کر لیا یعنی حربۂ اتحاد المسلمین (پان اسلامزم)۔ داخلی مشکلات بین الاقوامی پیچیدگیوں کے باعث بڑھ گئیں۔ ادھر اٹلی سے جنگ چھڑ گئی (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۲ء) جس میں ترکی سے طرابلس اور سائرانیکا چھن گئے۔ شمالی افریقہ میں یہ علاقے ترکی کی آخری قدم گاہ تھے۔ ساتھ ہی جنگِ بلقان کی آگ بھڑک اُٹھی (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۱۳ء)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلقان میں جہاں جہاں برتری کے کچھ آثار ترکی کے لیے باقی رہ گئے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے[۱]۔ مشکلات کے اس ہجوم سے انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر عالمی جنگ چھڑ گئی تو حکومتِ ترکی وسطِ یورپ کی طاقتوں، یعنی جرمنی اور آسٹریا سے مل گئی۔ جنگ میں اس نے جو کردار ادا کیا، اس سے عثمانیت کی ناکامی اور پان اسلامزم کا دیوالیہ پن سب پر آشکارا ہو گیا[۲]۔ آخر ایک جدید دولتِ ترکیہ کا ظہور ہوا جس کی بنیاد قومیت پر رکھی گئی اور مذہبی یا نسلی پیچیدگیاں اس کے لیے مزاحم نہ تھیں۔ اس جدید دولت کا معمار نوجوان ترکوں ہی میں سے ایک فرد تھا یعنی ایک فوجی افسر جس نے انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ اس کا نام مصطفیٰ کمال تھا اور وہی تھا جس کی ہمہ گیر اصلاحات نے عوام تک رسائی حاصل کی۔

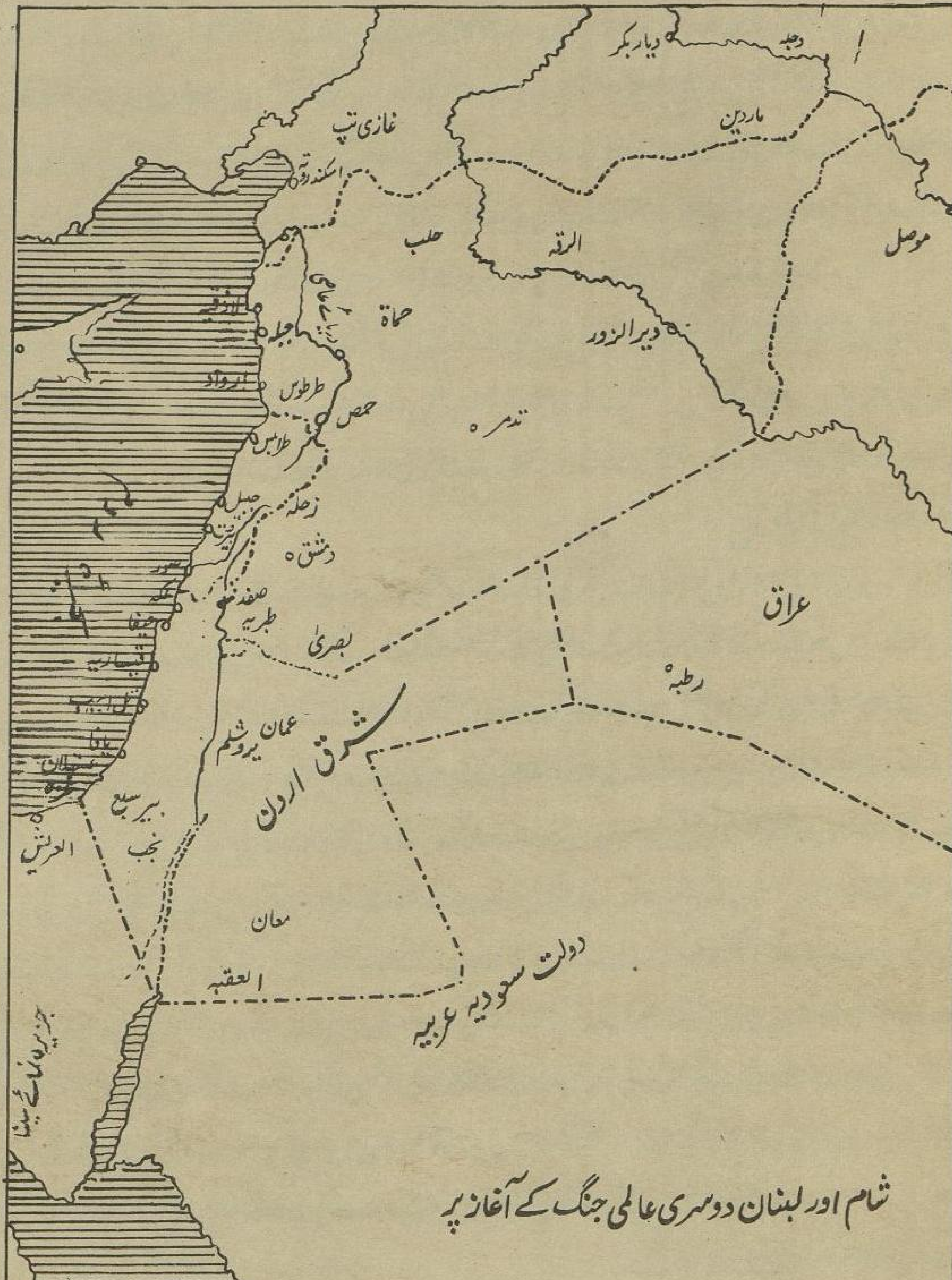
ثقافتی مداخلت

سلطنت کے مشرقی صوبوں میں سے صرف لبنان تھا، جو عبدالحمید کے عہدِ حکومت کی پابندیوں سے چنداں متأثر نہ ہوا۔ ۱۸۶۱ء سے اسے خود اختیاری کا جو درجہ حاصل ہو چکا تھا، اس کی بنا پر مغربی ماخذ سے افکار اور دوسرے ثقافتی عناصر کی لہریں بدستور آتی رہیں۔ ان لہروں کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی، فخر الدین اور بشیر نے ان کے تموّج کو تقویت پہنچائی۔ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۰ء تک شام ابراہیم پاشا کے فوجی قبضے میں رہا، جس کے والد (محمد علی پاشا) نے سب سے پہلے مصر اور مغرب کے درمیان گہرے تعلقات پیدا کیے اور شام کا دروازہ مغرب کے ثقافتی اثرات کے لیے اور زیادہ کھول دیا۔ ابراہیم نے لباس اور سواری کے متعلق

---

۱ (حقیقت یہ ہے کہ یورپی طاقتوں نے خود اٹلی کو اکسا کر طرابلس الغرب پر حملہ کرایا، تاکہ ترکوں کو دستوری حکومت مستحکم کرنے کا موقع نہ مل سکے، پھر اٹلی غیر منظم اور بے دست و پا طرابلسی عربوں کے مقابلے میں قدم قدم پر ناکام رہا تو بلقانی ریاستوں کو ترکی پر حملے کے لیے شہ دی گئی، اس میں پیش پیش برطانیہ اور روس تھے۔ یہ حقیقت نہ اُس زمانے میں کسی سے مخفی تھی اور نہ آج ہی کسی سے مخفی ہے۔ خواہ کوئی مسیحی مؤرخ اس کے اعتراف کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو۔ – مترجم)

۲ (مترجم ـــــ اس میں عثمانیت کی ناکامی یا اتحاد المسلمین کے دیوالیہ پن کا سوال خارج از بحث ہے۔ دونوں چیزیں کامیاب ہو رہی تھیں، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یورپی طاقتوں نے بلقانیوں کو ابھار کر انھیں ناکام بنایا۔ اتحاد المسلمین کی قوت کا تو یہ عالم تھا کہ اسی نے مصطفیٰ کمال کے لیے قومی تحریک منظم کرنے کا موقع پیدا کیا، اسی نے ہندوستان میں ترکِ موالات کی وہ تحریک جاری کی، جو برطانوی قوت پر پہلی مہلک ضرب تھی یہاں تک کہ مصطفیٰ کمال کی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں تو لائڈ جارج کی کوئی کوشش انھیں روک نہ سکی اور وہ خود استعفا دے کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، جمہوریہ ترکیہ اپنی اصل حدود پر بحال ہو گئی۔)



شام اور لبنان دوسری عالمی جنگ کے آغاز پر

بعض پابندیاں اٹھا دیں، جن کے باعث شام کے مسیحی صدیوں سے تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اس کے بعد ہی یسوعی فرقہ ایک خاص مدت کے تعطل کے بعد پھر لبنان پہنچا اور امریکی مشنریوں نے مضبوطی سے قدم جما لیے۔ ۱۹۴۸ء میں شام کے پراٹسٹنٹ کلیسا نے صد سالہ سالگرہ منائی۔ ۱۸۳۴ء میں امریکی مطبع بہ مقام بیروت قائم ہوا۔ اس سے اٹھتیس سال بعد یسوعیوں نے کیتھولک مطبع قائم کیا۔ یہ دونوں مطبعے اب تک کامیابی سے جاری ہیں۔ دونوں نے بائیبل کے ترجمے جدید عربی میں شائع کیے۔ یسوعیوں کی تعلیمی سرگرمیاں سترھویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی تھیں، ۱۸۷۵ء میں یہ حد کمال پر پہنچیں اور بیروت میں سینٹ جوزف کی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ یہیں ۱۸۶۶ء میں امریکی مشن نے ایک کالج قائم کیا تھا، جو آج کل بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے، یہ دو یونیورسٹیاں اس حصۂ ارض میں آج بھی ممتاز تعلیمی ادارے سمجھی جاتی ہیں، ویسی درس گاہیں، مطبعے، اخبار، رسالے اور ادبی انجمنیں خوب فروغ پذیر ہوئیں، فرانسیسی اور انگریزی زبان کی کتابیں بہ کثرت عربی میں ترجمہ ہوئیں اور عوام نے انھیں پسند کیا۔[1] اس طرح نئے افکار درآمد ہوئے ان میں سے قومیت اور سیاسی جمعیت کے افکار بے شک و شبہ بڑے قوی الاثر اور حرکت افروز تھے۔

قومیت اور جد و جہد آزادی

عربوں کی قومی بیداری ابتدا میں صرف ذہنی تحریک تک محدود تھی، یعنی وہ چاہتے تھے کہ عربی زبان، تاریخ اور ادب کے مطالعے پر توجہ مرتکز کی جائے۔ اس تحریک کے علمبردار شام کے فاضل تھے، خصوصاً لبنان کے مسیحی، جنھوں نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔[2] انھوں نے کلاسیکی عربی کو ایسی شکل دے دی کہ وہ جدید افکار و خیالات کے اظہار کا ایک موزوں ذریعہ بن گئی، قومیت کا تصور اور اس کے ساتھ سیکولرزم نیز مادی اقدار پر زور اسلام کے نہایت پسندیدہ افکار و روایات کے خلاف تھا، جو کم از کم نظری اعتبار سے دین کے سوا کسی رشتے کا قائل نہیں۔ عربی بولنے والے لوگوں نے اس قومیت کو اپنا لیا، جو یورپ کے اندر، ماضی قریب میں پیدا ہوئی تھی، پھر ۱۹۱۶ء میں حسین شریف مکہ نے عثمانی ترکوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس طرح اتحاد المسلمین کی رہی سہی امیدیں بھی درہم برہم ہو گئیں اور ان کی جگہ اتحاد عرب نے لے لی، جو مذہب کے بجائے زبان اور سیکولر ثقافت پر مبنی تھا۔ لبنان مغربی اقوام کی مسیحیت سے اتنا متاثر ہوا کہ ہزاروں لوگ ترک وطن کر کے نئی دنیا (امریکہ) میں پہنچ گئے اور انھوں نے اپنی تحریروں اور مسلسل آمد و رفت کے ذریعے سے آزادی، خود مختاری اور جمہوریت کا چراغ روشن رکھا۔ شکری غانم نے، جو ۱۸۷۷ء میں قسطنطنیہ پارلیمنٹ کے شامی مندوب کا بھائی تھا۔ ۱۹۱۳ء میں بہ مقام پیرس ایک عرب کانگرس منعقد کی جس میں شامیوں کی اکثریت تھی۔ اس کے مطالبے معتدل تھے، یعنی انتظامی اختیارات مرکز سے مختلف علاقوں میں منتقل کیے جائیں اور عربوں کو ثقافتی خود مختاری دے دی جائے۔

شامی فاضلوں اور عرب قومیت کے حامیوں کو اپنی سرگرمیوں کے لیے ہمسایہ ملک مصر کی فضا زیادہ سازگار نظر آئی، کیونکہ امریکی افکار نے ان کے دل میں حرکت پیدا کی تھی، عربی بولنے والی قوموں کے گزشتہ شکوہ اور ثقافتی کارناموں نے اس حرکت

---

[1] اے، ایچ حورانی کی انگریزی کتاب شام و لبنان ص ۳۵ - ۳۷۔

[2] انگونیس ص ۴۳، ۵۱، ۵۵، ہینسکوہن کی کتاب A History of Nationalism in the East ص ۲۶۵ سے آگے مارٹن ہارٹمین The Arabic Press of Egypt ص ۳-۱۳۔

میں قوت پیدا کی اور پوری دنیائے عرب کا اتحاد ان کا نصب العین بن گیا۔ اس کی بنیاد بہت وسیع رکھی گئی، یعنی عام عربیت جس میں علاقائی اہمیت کا کوئی پہلو موجود نہ ہو، لیکن بہت جلد اس میں تفریق کا عمل شروع ہو گیا۔ سیاسی تصوّرات نے نشو و نما پائی تو ان میں تنوّع اور مقامیت پیدا ہوئی۔ مصری قوم پرست عناصر نے ۱۸۸۲ء کے بعد اتحادِ عرب سے علیحدگی اختیار کر لی اور برطانوی قبض و تصرّف کی مخالفت ان کا سب سے بڑا نصب العین بن گئی۔ اس طرح عرب قومیّت نے مصر میں علاقائی رنگ اختیار کر لیا، تاکہ برطانیہ کے خلاف تحریک چلانے میں رائے عامہ کو ابھارا جا سکے، شام کی عرب قومیّت کا سارا زور عثمانی اقتدار اور تحریک ترکیت کے خلاف صرف ہونے لگا۔ ۱۹۱۹ء میں فرانس نے شام کی حکمرانی حاصل کر لی تو شام کے عرب قوم پرست فرانسیسی حکومت کی مخالفت کرنے لگے۔ جمال پاشا نے پہلی عالمی جنگ کے دوران میں جن محبانِ وطن کو سزائے موت دی تھی، ان کے خون نے تحریک میں مزید قوت پیدا کر دی[۵۴]۔ شام کا جنوبی حصّہ، یعنی فلسطین کاٹ کر برطانیہ کی حکمرانی میں دے دیا گیا۔ یہاں عرب قومیّت نے برطانیہ اور صیہونیت ــــ جس نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کو جنم دیا ــــ کی مخالفت میں نشو و نما پائی اور صیہونیت وسطی اور مغربی یورپ کے یہودیوں کی غلغلہ انگیز قومی تحریک تھی۔

۱۹۲۱ء میں شرقِ اردن کو فلسطین سے کاٹ کر امیر عبد اللہ کے حوالے کر دیا گیا، جس نے ۱۹۴۶ء سے بادشاہی کا رتبہ حاصل کر لیا۔ اس کا نام تو بائبل سے لیا گیا، لیکن اس کی کوئی مستقل تاریخی حیثیت نہ تھی۔ شام کا تخت عبد اللہ کے بھائی فیصل کو دیا گیا تھا، وہ وہاں سے نکالا گیا تو اسے عراق کا بادشاہ بنا دیا گیا، عبد اللہ شامی تخت کے نقصان کا بدلہ لینے پر تُلا بیٹھا تھا، لہٰذا اسے شرق اُردن دے دیا گیا[۵۵]۔ یہ نئی امارت برطانیہ کے حکمرانہ علاقے اور صحرا کے بے قرار بدوؤں کے درمیان ایک امارتِ حائل کا کام دیتی رہی۔ ۱۹۴۹ء میں یہ اردن کی ہاشمی سلطنت بن گئی۔

نو مولود عرب قومیّت کے تجربے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان عرب علاقوں میں بھی تجزیے کا عمل جاری ہو گیا، جو عثمانی حکومت کے ماتحت یکجا تھے، پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیان بہت سی عرب سرزمینیں، جو سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھیں، ایک دوسری سے الگ ہو گئیں اور انھوں نے مختلف ریاستوں کی حیثیت میں نشو و نما پائی، بلکہ کسی نہ کسی درجے میں الگ قومیّت بھی صورت پذیر ہوئی، لیکن زبان، مذہب اور اقتصادی مفاد کا اشتراک انھیں پھر قریب تر لے آیا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد اتحادِ عرب کی تحریک میں نئے سرے سے سرگرمی پیدا ہو گئی اور اس نے خاصی تقویت اختیار کر لی یہاں تک کہ جمعیت عرب (عرب لیگ) وجود میں آ گئی شام اور لبنان دونوں ۱۹۴۵ء سے اس جمعیت کے رکن چلے آ رہے ہیں۔

جمہوریّت

قوم پرورانہ جذبات کی شدّت اور تعلیم کی توسیع کے ساتھ یہ خواہش بھی بڑھتی گئی کہ معاشرتی اور سیاسی زندگی میں جمہوری معمولات کا دور دورہ ہو۔ کسانوں کے طبقے میں بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ اس نے نئے جمہوری افکار کے لیے پذیرائی اور نشو و نما کا موقع بہم پہنچا دیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں لبنان کے دو ممتاز گروہوں کی جاگیردارانہ تنظیم میں شکست کے آثار نمودار ہو چکے تھے،

---

۵۴ ان کی تعداد وغیرہ کے لئے دیکھیے فرانسیسی زبان کی کتاب ص ۱۵۸-۱۶۸۔

۵۵ ہیلنسکڈہن ص ۱۶۲-۱۶۴، ۱۷۷-۱۷۸، انٹونیس ص ۳۰۴-۳۰۵۔

لیکن دروزیوں کا جاگیردارانہ نظام مارونیوں کے مقابلے میں زیادہ پائدار ثابت ہؤا اور یہ کمزور حالت میں بھی عہدِ حاضر تک باقی رہا۔ شام میں بھی جاگیرداری بالکل محو نہ ہوئی۔ شمالی لبنان میں آلِ خازن اور دوسرے جاگیردار امراء کے خلاف زراعت پیشہ طبقے میں شورش زوروں پر تھی جب دروزیوں سے خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس تحریک کا لیڈر ریفون کا ایک سلوتری تھا، جس کا نام طانیوس شاہین تھا۔ وہ ۱۸۵۹ء میں کسانوں کی ایک دولت مشترکہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا، جس کا صدر وہ خود تھا[۱]۔ مارونی پادری عموماً عوام سے منتخب کیے جاتے تھے، وہ اس تحریک کے حامی بن گئے، جب داؤد پاشا نے کوہستانی علاقے کی حکومت سنبھالی تو مارونیوں کا جمہوریت پسند طبقہ اس اجنبی کو خراج ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہؤا، جس کی تائید امراء کر رہے تھے، مارونیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ حاکم کسی دیسی آدمی کو بنایا جائے۔ یوسف کرم اس شورش کا لیڈر تھا، فرانسیسیوں کے خلاف آزادی کی جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی تو شامیوں اور لبنانیوں نے پہلے سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر مغرب کے جمہوری تصوّرات و ادارات اپنا لیے اور انھیں اپنی خاص ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیا۔ لبنان پہلا عرب ملک تھا، جس نے جمہوری طرزِ حکومت اختیار کیا۔ شام اس کے نقشِ قدم پر چلا۔ لبنانی جمہوریت ۱۹۴۳ء میں حاصل ہوئی اور اسے تسلیم کر لیا گیا۔ شام کی جمہوریت دو سال بعد وجود میں آئی۔

شام، لبنان اور فلسطین کو انیسویں صدی میں باہر کے مزید اقتصادی، علمی اور سیاسی افکار سے سابقہ پڑا۔ سترھویں صدی کے مقابلے میں ان افکار کی شدّت بھی بڑھی ہوئی تھی اور تسلسل بھی۔ عرب دُنیا صدیوں پہلے یونانی وضع کے یورپی ثقافتی اثرات کا مورد بن چکی تھی، شام و لبنان اور فلسطین کو اب مغربی اثرات سے بدرجہا زیادہ حصّہ ملا۔ معاصرانہ دور میں عنصری امتزاج کا عمل عام تھا یہ پورے مشرقِ قریب ہی پر نہیں، بلکہ عملاً پورے ایشیا اور افریقہ پر حاوی تھا۔ مشرقی بحیرۂ رُوم کے باشندوں کا رُخ بھی ایک مرتبہ مغرب کی جانب ہو گیا۔ جیسا فونیقی، رومی اور بیزنطینی دور میں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روایتی مستقل مذہبی نقطۂ نگاہ اور جدید دور کے علمی اور سیکولر نقطۂ نگاہ کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی، جس کا احساس سب سے بڑھ کر اسلامی حلقوں میں ہؤا، پھر یہ کشمکش صرف اعلیٰ حلقوں تک محدود نہ تھی! انیسویں صدی کی دُنیا کے زیادہ تر حصّوں کی طرح یہ حصّہ بھی مغربی یورپ کی صنعت کاری کے اقتصادی جال میں پھنس چکا تھا، مقامی طور پر جو خوبصورت چیزیں بنتی تھیں، وہ ان چیزوں کا مقابلہ نہ کر سکیں، جو مشینوں کے ذریعے سے بن کر باہر سے آتی تھیں۔ اس طرح مقامی اقتصادی نظام میں خلل آگیا۔

شرقِ عربی پر انیسویں صدی میں مغربی یورپ کا ہی اثر تھا، جس نے مشرق کو ٹھوکر لگائی اور وہ قرونِ وسطیٰ کے خوابِ سنگین سے پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اس بیداری کے ساتھ ہی شام و لبنان میں قرونِ وسطیٰ کا دور اختتام کو پہنچ گیا اور نئے زمانے کی صبح طلوع ہو گئی۔ یہ پورا زمانہ عبوری حیثیت رکھتا ہے۔ قومیت اقوام کی زندگی میں مقتدر قوت بن گئی۔ سیاسی جمہوریت اپنا لی گئی، عام رجحان لادینیت اور تجدیدیت کی طرف ہے، یہ تمام چیزیں لبنان و شام کی تاریخ میں نئے دَور کا اضافہ کر رہی ہیں، اس دور کی قطعی اور واضح تاریخ کی تدوین ابھی باقی ہے۔

---

[۱] انطون ڈی العقیقی ثورہ و فتنہ فی لبنان ص ۸۳ - ۹۰۔

حصّۂ ششم

سنہ ۱۹۵۰ء - سنہ ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر فلپ حتی نے یہ کتاب سنہ ۱۹۵۰ء میں مطبع کے حوالے کردی تھی، جیسا کہ ان کے دیباچے سے واضح ہے۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اس کتاب کی تلخیص شائع کی، جس کا نام "مختصر تاریخ شام" رکھا۔ اس کے آخر میں سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۵۹ء تک کے حالات بھی بیان کر دیے، جن کا مفاد تکملۂ تاریخ شام کی حیثیت میں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

اکانواں باب

ذہنی اور قومی بیداری

اُنیسویں صدی کا آغاز

انیسویں صدی کی صبح طلوع ہوئی تو ہمسایہ ملکوں کی طرح شام پر بھی قرونِ مظلمہ کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مصر پہلا عربی بولنے والا ملک تھا، جس نے محمد علی پاشا (۱۸۰۵ء – ۱۸۴۸ء) کے عہدِ حکومت میں مغربی یورپ سے اہم ثقافتی تعلقات پیدا کیے، عثمانی ترکوں نے مغرب کے ساتھ ثقافتی تعلقات سے نہ محض دانستہ احتراز کیا، بلکہ رعایا کو بھی فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہ دیا، حالانکہ وقت حد درجہ اہم تھا اور یورپ اٹھارھویں صدی کے تنوّر اور صنعتی انقلاب میں سے گزر رہا تھا، وہ نہ تو خود اس کاروانِ ترقی میں شریک ہوئے جس کا قافلہ سالار یورپ تھا، نہ دوسروں کو شرکت کی اجازت دی۔ جو ثقافتی عنصر عثمانی پردے کو چاک کر کے اندر پہنچ سکا، اس کا تعلق عسکریت سے تھا، شامیوں یا دوسرے عربوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

غرض انیسویں صدی کے وسط تک شام زندگی کے تمام شعبوں میں قرونِ وسطیٰ کے حالات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خاندانوں اور کنبوں کی کیفیت وہی تھی، جو زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی، یعنی تمام معاملات کی باگ ڈور دادا جان یا کنبے کے کسی دوسرے سن رسیدہ فرد کے ہاتھ میں رہتی تھی، چھوٹے چھوٹے کنبوں کا کوئی تصوّر نہ تھا جو صرف والدین اور کنوارے بچوں پر مشتمل ہوں، علم جیسا بھی تھا تقریباً علمائے دین کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا اور اس کی حیثیت بھی قدامت پسند تھی، چھان بین اور تحقیق سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا، صنعت و حرفت جاری تھی، تاہم اس کا درجہ بہت گھریلو سطح سے اونچا نہ تھا، کاروبار میں شرکت بھی صرف کنبے کے افراد تک محدود تھی سائنس کے متعلق دورِ حاضر میں جو تصوّر ہے اس کا کوئی وجود نہ تھا علاج معالجہ اُن اطبا کے ہاتھ میں تھا، جنھوں نے بو علی سینا یا ایک ہزار سال پیشتر کے دوسرے عرب طبیبوں کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ حجام دندان سازی کرتے تھے اور پنسار ی دواساز بنے بیٹھے تھے، بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اس پورے نقشے میں بنیادی تغیر کا عمل شروع ہو گیا۔

مغربی علوم کی ابتدا

قدیم صورتِ حال میں تغیر کی ابتدائی تاریخ ۱۸۶۰ء بھی جا سکتی ہے، جب لبنان میں فرقہ وار فساد رونما ہوئے تھے، اور ان کا دائرہ دمشق تک پھیل گیا تھا، یورپ میں جن لوگوں کو فلاحی اور رفاہی کاموں سے دل چسپی تھی، وہ جلد سے جلد فسادات سے متاثرہ علاقے کی امداد کے لیے پہنچ گئے۔ بعض امدادی کاموں کی حیثیت وقتی تھی، بعض مستقل حیثیت رکھتے تھے، فرانس نے لبنان میں فوجی مداخلت کی، نتیجہ یہ نکلا کہ کوہستانی علاقے کو داخلی خود مختاری دے دی گئی، یہ بھی طے ہو گیا کہ اس علاقے کا گورنر مسیحی مقرر ہوا کرے اور یورپ کی چھ بڑی طاقتیں ان کاموں کی نگران مقرر ہو گئیں، اس طرح یہ علاقہ ثقافتی اثرات قبول کرنے کا خاص مرکز بن گیا اور یہاں سے ان اثرات کی لہریں ملحقہ علاقوں میں پہنچتی رہیں۔ ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کا افتتاح ہوا، یہ قطعی طور پر مختلف حیثیت کا ایک بین الاقوامی واقعہ تھا، تاہم اس کی

وجہ سے بھی شام کے پورے خطے کا مادی اور ذہنی انقطاع ختم ہوگیا اور یہ از سرِ نو تین برِ اعظموں کے درمیان حلقۂ اتصال بن گیا۔

لبنان کے نئے صوبے میں فلاحی اور تعلیمی اداروں نے خوش گوار فضا میں کام شروع کیا تھا، اس لئے وہ خوب پھولا پھلا۔ کیتھولک مشنری وہاں فخر الدین المعنی کے زمانے سے محدود پیمانے پر کام کر رہے تھے۔ ان پادریوں نے انیسویں صدی کے اختتام سے پیشتر انطاکیہ اور بیروت میں خاص کلیسائی حلقے بنا لیے تھے، حلب اور تین لبنانی دیہات میں بھی ان کے مرکز بن گئے تھے۔ ایک اور کیتھولک مشن ۱۸۵۵ء سے دمشق میں کام کر رہا تھا اور بیس سال بعد اس نے لڑکوں کے لیے سکول قائم کیا تھا، جو اب تک جاری ہے۔ اسے دمشق میں دورِ حاضر کا اوّلین سکول سمجھنا چاہئے۔

کیتھولکوں کے ساتھ پراٹسٹنٹوں کی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں۔ ۱۸۶۰ء کے بعد جرمنی کی مشنری عورتوں نے صیدا میں ایک مرکز قائم کیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ یتیم بچوں کو تربیت دی جائے۔ نرسنگ (تیمارداری) کا کام سکھایا جائے اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ بعد ازآں یہ مرکز صیدا سے بیروت منتقل کر دیا گیا۔ اسی سال برطانیہ کے شامی مشن نے کام شروع کیا، یعنی دمشق، بیروت، بعلبک اور دوسرے قصبوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی درسگاہیں قائم کر دیں۔ لبنانی دار الحکومت میں انھوں نے لڑکیوں کے لیے جس ٹیچنگ کالج کا انتظام کیا تھا وہ اب تک کامیابی سے جاری ہے۔

بہ اعتبارِ نتائج سب سے بڑھ کر اہمیت امریکیوں کی آمد کو حاصل ہوئی، ماہرینِ فنِ تعلیم، معلّم، مبلّغ اور ڈاکٹر پہنچ گئے اور انھوں نے ۱۸۶۶ء میں ایک کالج کی بنیاد رکھی، جو اب بیروت کی مشہور امریکی یونیورسٹی ہے۔ فرانسیسیوں نے بھی ان کی پیروی میں ایک یونیورسٹی قائم کر دی (۱۸۷۵ء)۔ یہ دونوں یونیورسٹیاں مشرقِ قریب میں تعلیم کے مشہور ترین مرکز ہیں، جن کی وجہ سے شام میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نشوو ارتقا کا نیا دور شروع ہوگیا۔ ایک طبّی درس گاہ بھی قائم ہوگئی، جس سے فنِ معالجہ میں نئے طور طریقوں کا آغاز ہوا۔ ان یونیورسٹیوں سے تعلیم پائے ہوئے لوگ علوم و ادبیات میں پوری مشرقی ادبی دنیا کے رہنما بن گئے۔ انھوں نے علمی و ادبی رسالے جاری کیے، علمی مجلسیں قائم کیں، درس گاہوں کا انتظام کیا اور علوم عصریّہ کے متعلق اوّل درجے کی کتابیں شائع کیں۔ امریکیوں نے ۱۸۳۴ء میں بہ مقام بیروت ایک مطبع قائم کیا تھا، تاکہ ان کی تعلیمی کوششوں کو تقویت پہنچے۔ تیس سال بعد فرانس کے یسوعی نظام نے ایک کیتھولک مطبع قائم کر لیا جو فرانسیسی یونیورسٹی سے ملحق ہوگیا۔ یہ دونوں مطبعے اب تک جاری ہیں۔

کچھ عرصہ بعد مقامی درس گاہوں نے بھی قدیم رسمی طریقِ تعلیم چھوڑ کر مغربی نمونہ اختیار کر لیا۔ نصاب میں فرانسیسی اور انگریزی زبانیں پڑھائی جانے لگیں، نصاب کی کتابوں کے علاوہ علمی کتابیں، ڈرامے، ناول پہلے فرانسیسی سے، پھر انگریزی سے ترجمہ ہونے لگے بیسویں صدی کے اوائل میں محرّروں، مصنفوں، شاعروں، ادیبوں وغیرہ کی نئی پود نے کام شروع کر دیا اور وہ لوگ جدّ و جہد کرتے ہوئے پہلی صف میں پہنچ گئے۔ ان کی تحریرات کے باعث عربی زبان میں تازگی پیدا ہوئی۔ اس کا زنگ اتر گیا۔ قدیم رسمی اسالیب کی جگہ ایک نئے طرزِ بیان نے لے لی۔

وسیع اثرات

دورِ حاضر کے افکار نے قدیم روایات، دل نشیں اعتقادات اور محترم اداروں کو درہم برہم کر ڈالا۔ اجتماعی نظام میں بھی کشمکش پیدا ہوئی، یہ دراصل عبوری دور تھا، اور ایسے اوقات میں کشیدگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ پرانے رشتے ڈھیلے ہو گئے۔ رسمی وفاداریاں بدلنے

لگیں۔ جن اقدار کو مُسلّم مانا جاتا تھا، وہ بدل گئیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ قدیم وجدید میں تطابق کی کیا صورت ہے۔ اُس وقت تک معاشرہ صرف دو طبقوں پر مشتمل تھا۔ ایک زمین داروں، امیروں، دینی عالموں اور خوش حال لوگوں کا طبقہ تھا، دوسرے میں کاشتکار، دہقان، مزدور اور غریب شامل تھے۔ ان کے درمیان کوئی قابلِ ذکر گروہ موجود نہ تھا، لیکن اب ایک درمیانی طبقہ رونما ہوا، جس میں طبیب، معلّم، قانون دان اور اہلِ قلم اور دوسرے پیشہ ور شریک تھے، نئی قسم کا کاروبار کرنے والے لوگ بھی اسی میں محسوب ہونے لگے، پرانے مجلسی و اجتماعی نظام میں جابجا شگاف پڑ گئے۔ لیکن یہ صورتِ حال عموماً شہری آبادیوں تک محدود تھی، بیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں نے زیادہ آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا اور انھیں خاصی آزادی مل گئی، نوجوان اب اپنی پسند کی شادیاں کرنے لگے اور شادیوں کے بعد انھوں نے اپنے الگ مکان بنانے شروع کیے۔

اقتصادی صورتِ حال میں بھی تغیر شروع ہو گیا۔ اب تک زراعت صرف ضرورت کی جنسیں پیدا کر لینے تک محدود تھی، اس میں تجارتی اغراض پیشِ نظر نہیں رکھی جاتی تھیں، عام کاشتکار صرف اُتنی جنس پیدا کر لیتا، جتنی اُس کے کنبے کے لیے ضروری ہوتی، اسی طرح کاریگر کا دائرہ بھی محدود تھا، چند ہمسایے یا ہم قصبہ لوگ اس سے چیزیں خریدتے تھے اور انھی ہی خریداری پر وہ قانع تھا۔ عام تاجر خود ہی چیزیں خریدتے، خود ہی بیچتے اور خود ہی حساب کتاب رکھتے۔ جب بحری اور برّی وسائلِ آمد ورفت بہتر ہو گئے اور باہر سے مشینوں کا بنا ہوا مال آنے لگا تو تجارت کا نمونہ بھی بدل گیا، مانچسٹر، پیرس اور نیویارک کے سامان سے منڈیاں بھر گئیں، عوام کا مذاق بدل گیا۔ وہ نئی وضع کے لباس پہننے لگے، نئی وضع کے مشروبات، سیگار، سگرٹ وغیرہ پینے لگے۔ قصبات و دیہات میں جو چیزیں بنتی تھیں، وہ ناپید ہو گئیں۔ شہری آبادیاں بڑھ گئیں۔ مثلاً بیروت کی آبادی اُنیسویں صدی کے آغاز میں صرف پانچ ہزار تھی، وہ ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ گئی، دمشق اس سے بھی آگے نکل گیا اور اس کے افراد کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار ہو گئی،

اقتصادی صورتِ حال بہتر ہوئی تو وسائلِ آمد ورفت پر بھی خاصی توجہ ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں ایک فرانسیسی کمپنی نے بیروت سے دمشق تک ایک شاہراہ بنا دی۔ آہستہ آہستہ شام ولبنان کے تمام بڑے بڑے قصبوں کے درمیان سڑکیں تعمیر ہو گئیں، اور ان پر گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں۔ ۱۸۹۴ء میں ایک اور فرانسیسی کمپنی نے بیروت، دمشق اور حوران کے درمیان ریل کی پٹڑی بچھا دی۔ پھر اس کی شاخیں ترکی، عراق اور حجاز پہنچ گئیں، دیہاتی اور صحرائی باشندے پہلی مرتبہ تہذیبِ حاضرہ کے دائرۂ اثر میں آئے۔ بیسویں صدی کے موڑ پر شام ولبنان عثمانی سلطنت کے مہذّب ترین صوبے سمجھے جاتے تھے اور نظم ونسق کے اعتبار سے لبنان کو مسلّمہ طور پر پہلا درجہ حاصل تھا۔

علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت کے وسائل بھی بہتر ہو گئے اور درجۂ معیشت بلند ہونے لگا تو آبادی بھی بڑھتی گئی۔ ۱۸۴۰ء میں شام ولبنان کی آبادی ساڑھے بارہ لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ یہ رومیوں کے عہد کی آبادی کا محض ایک جزو تھا۔ ۱۹۰۰ء میں آبادی کا اندازہ چالیس لاکھ کیا گیا۔ آبادی کا دباؤ بڑھا، نیز حکومتِ عثمانیہ نے سختیاں شروع کیں تو لوگ نکل نکل کر مصر پہنچنے لگے زیادہ تر تارکینِ وطن لبنانی مسیحی تھے، جنھیں مصر میں برطانیہ کے زیرِ حمایت نئی قیام گاہیں مل گئیں۔ ۱۸۹۱ء تک عثمانیوں کی طرف سے صرف مصر میں منتقل ہونے کی اجازت تھی، اور مصر اس وقت تک سلطنتِ عثمانیہ ہی کا حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ امریکی اور برطانوی درس گاہوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو مصر وسوڈان میں اچھی ملازمتیں مل گئیں۔ باقی تارکینِ وطن نے رسالے اور اخبار جاری کر لیے یا تصنیف وتالیف

کا کام شروع کر دیا یا وہ معلّم اور ترجمان بن گئے ۔ یہی لوگ اُس صحیفہ نگاری اور تصنیف و تالیف کے بانی تھے ، جسے اب تک مشرقِ عرب میں خاص اہمیّت حاصل ہے ۔

تارکینِ وطن کی تعداد بڑھی ، تو وہ امریکہ پہنچ گئے ۔ اس وقت جنوبی و شمالی امریکہ میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر قصبہ ہوگا ، جس میں شام و لبنان کا کم از کم ایک کنبہ نہ رہتا ہو ۔ ان تارکینِ وطن نے امریکہ ، مغربی یورپ اور آسٹریلیا میں کاروبار شروع کر دیا اور بہت سے لوگ صنعت و تجارت میں ممتاز درجے پر پہنچ گئے ۔ بعض نے عالمی معیار کے مطابق بڑی دولت جمع کر لی ۔ کچھ لوگ پھر وطن لَوٹ آئے ، اس طرح آرامیوں اور فونیقیوں کے ان اخلاف نے بین الاقوامی تجارت کی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا ، جو ان کے اجداد کے لیے بھی یقیناً باعثِ عزّت ہوتا ، باہر سے یہ لوگ اپنے متعلقین کے لیے روپیہ بھیجتے رہے ، جس سے وطنِ قدیم کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی ، نیز انھوں نے قاہرہ ، نیویارک ، ساؤ پالو (برازیل) ، بیونس ائرس (ارجنٹائن) ، اور دوسرے مقامات پر عربی اخبار جاری کیے ۔ اپنے عزیزوں سے خط و کتابت جاری رکھی ، بلکہ ان کی ملاقات کے لیے بھی آتے رہے ۔ اس طرح شام میں سیکولرزم ، خود اختیاری نظام اور قومیّت کو خاصی تقویت پہنچی ۔

مغرب سے جو سیکولر افکار آئے ، ان میں نمایاں حیثیت سیاسی افکار کو حاصل تھی ، یعنی خود مختاری ، جمہوریّت اور قومیّت یہ تینوں دوش بدوش چلتے رہے ، اور ان میں سب سے زیادہ زور دار افکار کا تعلّق قومیّت سے تھا ، ذہنی بیداری کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ سیاسی بیداری پیدا ہوتی اور اجنبی اقتدار ختم کر کے آزادی حاصل کی جاتی ۔ انقلابِ فرانس سے حریّت ، اخوّت اور مساوات کے نئے تصوّرات لیے گئے ۔

یہ افکار سب سے پہلے اُن شامی اور لبنانی مصنّفوں کی تحریرات میں ظاہر ہوئے ، جو مصر میں جا بسے تھے ، ان میں سے متعدّد افراد کو سلطان عبد الحمید (۱۸۷۶ء ۔ ۱۹۰۹ء) کی حکومت نے غیر حاضری میں موت کی سزا سنا دی ۔ عربی کا پہلا مصنّف جس نے آزادی اور مساوات کو موضوعِ بحث بنایا ، حلب کا ایک مسیحی تھا ، جس کا نام فرانسس المراش (۱۸۳۶ء ۔ ۱۸۷۳ء) تھا ۔ حلب ہی کے ایک اور وسیع النظر مسلمان ، عبد الرحمٰن الکواکبی (۱۸۴۹ء ۔ ۱۹۰۲ء) ، نے "طبائع الاستبداد" لکھی ، جو مطلق العنانی کے خصائص اور ظلم و جبر کی خرابیوں پر ایک زبردست ضرب تھی ۔ ۱۸۷۰ء میں بیروت کے ایک مسیحی بطرس البستانی نے ایک علمی رسالہ جاری کیا ، جس کے سرورق پر لکھا جاتا تھا ، حبّ الوطن من الایمان ۔ دمشق کے ایک اور مصنّف ادیب اسحاق نے ، جو مصر میں رہتا تھا ، وطن کو نئے معنی میں استعمال کیا ۔ قومیّت کی اصطلاح نے بیسویں صدی کے دوسرے یا تیسرے عشرے تک رواجِ عام حاصل نہ کیا ۔

بہرحال قومیّت کا تصوّر مراکش سے عراق تک جگہ جگہ پھیل گیا ۔ ابتدا میں یہ اصطلاح پوری عرب قومیّت پر حاوی تھی ۔ لبنان کے ایک مسیحی ، ابراہیم الیازجی نے شام کے اہلِ علم کی ایک انجمن کے خفیہ اجلاس میں ، جو بہ مقام بیروت منعقد ہوا تھا (۱۸۶۸ء) ، ایک نظم سنائی اور اس میں عربوں کو بیداری کا پیغام دیا ۔ یہ پکار ہر حلقے میں پہنچ گئی ، اور اتّحادِ عرب کی تحریک کے لیے ایک نعرے کی صورت اختیار کر گئی ۔ اس چنگاری نے مصر میں آگ لگا دی ۔ یہ وسیع بنیادوں پر شروع ہوئی تھی ، لیکن آگے چل کر یہ مختلف حصّوں میں منقسم ہو گئی ۔ مصر پر انگریز مسلّط تھے ، اور وہاں انگریزی تصرّف کی مخالفت جاری تھی ۔ لہٰذا وہاں اس صدا نے انگریزوں کی مخالفت کا لباس پہن لیا ، شام کے عرب قوم پرستوں کو ابتدا میں عثمانی حکومت کی مخالفت کرنی پڑی ۔ پھر وہ فرانسیسی حکمداری کے خلاف متحد ہو گئے ، لہٰذا ان کی تحریک کا رنگ جدا ہو گیا ۔

اس طرح مصر اور شام میں نوجوان طبقہ دو مقصدوں کے درمیان متحیّر رہا، ایک اتحادِ عرب کا مقصد، دوسرا علاقائی آزادی کا مقصد۔ بہ ہر حال مغرب کے اسلحہ خانے سے جو زبردست حربہ عربوں کو ملا تھا، وہ مغرب ہی کے خلاف استعمال ہُوا۔ مصر و شام کا تجربہ لبنان اور عراق میں بھی دُہرایا گیا۔

قومیّت کے فروغ اور آزادی کے جذبے پر عصرِ حاضر کے شام کی تاریخ کا پہلا باب ختم ہوگیا۔ ۱۸۶۰ء سے نصف صدی کے اندر اندر شام قرونِ وسطیٰ کے خواب سنگین سے بیدار ہوکر تنوّر و خود مختاری کے عہد میں داخل ہوگیا۔ لیکن ایک زبردست رکاوٹ گھات میں بیٹھی تھی، فضا پر تاریک بادل چھا رہا تھا، یہ عالمی جنگ کا بادل تھا۔

باونواں باب

جنگ، جبر و تشدد اور وبا

سلطان عبدالحمید کی معزولی

جولائی ۱۹۰۸ء میں ایک صبح دُنیا یہ خبر سُن کر حیران رہ گئی کہ سلطان عبدالحمید کا طویل استبدادی دور ختم ہو رہا ہے، فوجی افسروں نے ایک قدم اٹھایا تھا، جو کامیاب رہا، یہ کام انجمن اتحاد و ترقی کا تھا، جو ایک خفیہ انجمن کا بازوئے شمشیر زن تھی اور جسے عام لوگ نوجوان ترکوں کی انجمن کہتے تھے، یہ انجمن سالہا سال پیشتر نوجوان طالب علموں اور مصلحوں کی مشترکہ کوشش سے جینوا میں قائم ہوئی تھی، پھر اس کا مرکز پیرس منتقل ہو گیا۔ انجمن کا مدعا یہ تھا کہ ایک دستوری حکومت قائم کی جائے جس کے لیے منتخبہ پارلیمنٹ ہو۔ پھر ایک متحدہ جمہوری سلطنت بروئے کار لائی جائے۔ عبدالحمید نے یہ ظاہر اسے قبول کر لیا ۱۸۷۶ء کی پارلیمنٹ بحال کر دی۔ جاسوسی اور احتساب کا نظام توڑ دیا اور تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے۔ پوری عرب دُنیا میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑ گئیں۔ دمشق، بیروت، حلب، یروشلم اور دوسرے شہروں میں نئی اصلاحات کا خیر مقدم زبردست تقریروں اور آتش بازی سے کیا گیا۔ شام سے نمائندے منتخب کر کے پارلیمنٹ میں شرکت کے لیے بھیجے گئے، قسطنطنیہ میں قوم پروروں نے عربی و عثمانی مواخات کی بنیاد رکھی، تاکہ نئے نصب العین کو تقویت پہنچے، لیکن سلطان ۱۹۰۸ء میں بھی جمہوری لوازم قائم رکھنے کا قطعاً خواہاں نہ تھا، بالکل یہی کیفیت ۱۸۷۶ء میں تھی، ۱۸۷۶ء کا دستور مدحت پاشا جیسے آزاد خیال ترک نے مرتب کیا تھا، جو اس وقت وزیر اعظم تھا اور بعد میں شام کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ عبدالحمید رجعت پسندوں سے ساز باز کر کے انقلاب کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ راز کھُل گیا تو اپریل ۱۹۰۹ء میں اسے معزول کر کے اس کے سِن رسیدہ بھائی محمد رشاد کو سلطان بنا دیا گیا۔ اختیارات کی باگ ڈور انجمن اتحاد و ترقی کے تین فوجی ارکان کے ہاتھ میں تھی۔

ان لوگوں کو تجربہ نہ تھا، البتہ ان میں جوش بہت تھا، انھوں نے جو مسلک اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ تمام اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہوں سلطنت کے مختلف عناصر کو عثمانیت کے رنگ میں رنگ لیا جائے اور غیر ترکی قومیت کو جبراً دبا دیا جائے، چنانچہ اعلان ہو گیا کہ غیر ترکی گروہوں نے جتنی انجمنیں بنا رکھی ہیں، وہ ختم کر دی جائیں، یہ دیکھتے ہی عرب قوم پروروں نے خفیہ سرگرمیاں شروع کر دیں، چنانچہ ان کی طرف سے یہ مطالبہ تقویت پکڑ گیا کہ اختیارات مرکز کے بجائے صوبوں میں منتقل ہو جائیں اور عرب کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کر لیا جائے، شام فلسطین اور لبنان کے طلبہ و مہاجرین نے پیرس میں ایک انجمن بنائی، جس کا نام "مجلس نوجوانان عرب" تھا، اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ ترکوں کی حکومت سے عربوں کو آزاد کرایا جائے۔ ۱۹۱۳ء میں ان لوگوں کی کوشش سے عرب نمائندوں کی ایک کانگرس منعقد ہوئی، جس میں شام، لبنان اور عراق سے چوبیس نمائندے شریک ہوئے۔ ان میں دو لبنانی نمائندے ایسے تھے، جو نیویارک سے آئے تھے، اس کانگرس نے یہ مطالبہ کیا کہ عربوں کو داخلی آزادی دی جائے اور عربی کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے، ساتھ ہی یورپی طاقتوں کو انتباہ کیا کہ وہ ترکی

کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ دمشق، بغداد اور قاہرہ میں خفیہ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ترکی فوج میں عرب افسروں نے اپنے الگ حلقے قائم کر دیئے، چونکہ وسائلِ مخابرت موجود نہ تھے، اس لئے مختلف انجمنوں کے کام میں نظم و ترتیب کا اہتمام نہ ہو سکا، نوجوان ترک ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہ تھے، ان کی داخلی مشکلات میں بیرونی مشکلات نے اور بھی اضافہ کر دیا اور بیرونی مشکلات خاصی خطرناک تھیں۔ اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی تو ترکی کی حکومت نے جرمنی و آسٹریا کی معیت اختیار کر لی۔

جمال پاشا

اسی سال کے اواخر میں جمال پاشا شام، لبنان اور فلسطین کا گورنر جنرل، نیز چوتھی عثمانی فوج کا سالارِ اعظم مقرر ہو کر دمشق آیا وہ بھی انجمن اتحاد و ترقی کے تین با اقتدار ارکان میں سے ایک تھا۔ یہ پورا عرب علاقہ عثمانیوں کے سخت خلاف تھا اور تمام لوگ عربیت کے حامی تھے، لبنان کے مسیحیوں کی ہمدردیاں فرانس کے ساتھ تھیں۔ جمال پاشا نے دمشق پہنچتے ہی لبنان کی داخلی خود مختاری ختم کر دی۔ ساتھ ہی جبر و تشدد اور جلاوطنی کے ذریعے سے قومی سرگرمیوں کو دبا لینے کی پالیسی اختیار کر لی۔ اس کے ماتحت سختیوں کا ایسا دور شروع ہوا کہ لوگ اسے السفاح کہنے لگے۔ قومی لیڈروں کے مقدمات فوجی عدالت کے سامنے پیش ہوئے اور انھیں موت کی سزائیں دی گئیں۔ جن لوگوں پر شبہہ کیا جاتا تھا، وہ بھی دارو گیر سے نہ بچے، موت کی سزائیں دمشق اور بیروت کے چوکوں میں دی گئیں، الزامات کی نوعیت مختلف تھی، مثلاً ممنوع انجمنوں میں سے کسی ایک کی رکنیت۔ ذاتی عداوتوں کی بنا پر بھی شکایتیں پیش ہوتی رہیں، حاسد حریفوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ بیروت کے قونصل خانے میں جو کاغذات ملے تھے، ان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کون کون لوگ فرانسیسیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ پھر مکّہ میں شریف حسین نے مخالفت میں قدم اٹھایا تھا، اس کا دم بھرنے والے بھی مجرم قرار پائے، ۱۹۱۶ء میں شریف نے نوجوان ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی، اور اپنے ملک العرب ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ جمال پاشا کے ہاتھوں ۶ رمئی کو چودہ مسلمانوں اور مسیحیوں نے بیروت میں اور سات نے دمشق میں پھانسیاں پائیں، یہ دن اب تک دونوں شہروں میں "یوم شہدا" کے طور پر منایا جاتا ہے اور جن چوکوں میں پھانسیاں نصب ہوئی تھیں، انھیں شہدا کے چوک کہتے ہیں۔

جمال پاشا نے نہر سویز پر حملے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا تھا، اسے کامیاب بنانے کے لیے لازمی فوجی بھرتی کا قانون جاری کر دیا۔ بار برداری کے جانور بیگار میں پکڑ لیے اور لوگوں سے کہا کہ وہ فوج کے لیے رسد کا انتظام کریں، حالانکہ اس زمانے میں عوام خود بھی بڑی مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ اتحادیوں (برطانیہ و فرانس) نے تری اور خشکی کے راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور الم انگیز نتائج واضح ہو رہے تھے۔ مشرق قریب کا یہ علاقہ ہر قسم کی بیماریوں کے جراثیم کی پرورش گاہ بن گیا ــــ موسمی بخار، ٹائفس، تپ محرقہ، پیچش۔ جو سپاہی کسی بیماری سے متاثر ہو کر آتے تھے، وہ جہاں جہاں جاتے اسے پھیلانے کا ذریعہ بن جاتے۔ ۱۹۱۵ء میں ٹڈی دل اس شدت سے آئے کہ سورج کی روشنی ان کی وجہ سے غائب ہو گئی۔ اس بلائے بے درماں نے اقتصادی مصیبتوں اور پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ جو دوائیں دستیاب ہو سکتی تھیں، وہ سپاہیوں کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھیں، عوام تک کیونکر پہنچتیں؟ کہا جاتا ہے کہ لبنان کی ۴ لاکھ آبادی میں سے ایک لاکھ موت کے گھاٹ اتر گئی۔ امریکہ سے رقمیں بھی آتی رہیں اور امداد بھی ملی، جس کا کچھ حصہ اربابِ اختیار نے دوسری طرف منتقل کر دیا۔ اگرچہ

امداد نہ ملتی تو موتیں کہیں زیادہ ہوتیں۔

اتحادیوں کی بندر بانٹ

ادھر لوگ ان مصیبتوں کا شکار ہو رہے تھے، اُدھر اتحادی طاقتیں ان علاقوں کو آپس میں بانٹ لینے کے نقشے تیار کر رہی تھیں، مئی ۱۹۱۶ء میں سائیکس اور پیکو کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہؤا، جس کے مطابق "ہلال زرخیز" کو برطانیہ اور فرانس نے آپس میں تقسیم کر لیا، اس معاہدے کے مندرجات سب سے پہلے روس میں بالشویکوں نے دُنیا کے سامنے فاش کیے۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں مہنری میکو ہن (برطانوی ہائی کمشنر مقیم قاہرہ) نے خاص حدود میں، جن کی وضاحت شریف کر چکا تھا۔ عربوں کی آزادی تسلیم کر لی تھی اور ان حدود میں "ہلال زرخیز" بھی شامل تھا، اگرچہ اس تسلیم کے ساتھ چند مبہم تحفظات بھی رکھے گئے تھے، شریف تحریکِ اتحادِ عرب کی قیادت سنبھال چکا تھا، ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو لارڈ بالفور نے اپنا رسوائے عالم اعلان کیا، جس کے مطابق بتایا گیا کہ حکومت برطانیہ "یہود کے لیے فلسطین میں قومی وطن کے قیام کی تحریک کو پسندیدہ سمجھتی ہے" خواہ اس کا مطلب کچھ سمجھا جائے؛ سات روز بعد قاہرہ کے فوجی مرکز سے فرانس و برطانیہ کا مشترکہ اعلان ہؤا کہ ہمارے نزدیک (فرانس و برطانیہ کے نزدیک) اصل نصب العین یہ ہے کہ جو لوگ مدت دراز سے ترکوں کے ہاتھوں ظلم برداشت کرتے رہے ہیں، انھیں بہرحال آزادی دلائی جائے اور ایسی قومی حکومتیں، نیز انتظامی ڈھانچے قائم کیے جائیں، جن کے لیے اختیارات کا سرچشمہ مقامی آبادیاں ہوں اور انھیں آبادیوں کی مرضی اور حق رائے کے آزادانہ استعمال سے یہ اختیارات حاصل کیے جائیں گے۔[۱] ان دعووں میں حقِ خود مختاری کے اس اصول کی جھلک واضح تھی جس کا اعلان پہلے سے صدر امریکہ مسٹر وڈرو ولسن کر چکے تھے۔ انھوں نے غیر مشتبہ طور پر کہہ دیا تھا کہ جنگ کے بعد تمام امور کا فیصلہ ان لوگوں کے آزادانہ قبول پر مبنی ہوگا، جن سے اس فیصلے کا تعلق ہوگا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو متارکہ ہؤا، اس وقت تک جنرل ایلن بی عرب عساکر کی مدد سے، جو شریف حسین کے بیٹے امیر فیصل کی قیادت میں تھے، شام، لبنان، اور فلسطین پر قبضہ جما چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں صلح کانفرنس بہ مقام ورسائی منعقد ہوئی، فیصل نے اپنے والد کی طرف سے اس کانفرنس میں عربوں کا معاملہ پیش کرنے کے لیے شرکت کی۔ اتحادی طاقتوں کے لیڈر حقِ خود مختاری کے اصول کی پیروی میں اس بات پر راضی ہو گئے کہ تحقیق احوال کے لیے ایک کمیشن شام بھیج دیں، لیکن صرف امریکہ نے ایک کمیشن (کنگ کرین کمیشن) بھیجا، برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ امریکی کمیشن کی رپورٹ ۱۹۲۲ء تک منظرِ عام پر نہ آسکی۔ اس کا بیان یہ تھا کہ شام میں عام لوگ آزادی پر اصرار کرتے ہیں، وہ حکمداری کے نام پر محکومی کے سخت خلاف ہیں، البتہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ امریکہ کی طرف سے امداد کا انتظام کیا جائے، یہ ممکن نہ ہو تو برطانیہ امداد کرے۔ فرانس کی امداد کسی حال میں بھی منظور نہیں، لبنان میں اکثریت نے آزادی کی حمایت کی، ساتھ ہی کہا کہ لبنان کا حلقہ بڑھایا جائے، جو طرابلس الشام سے صور تک ہو، اسے شام سے الگ کر دیا جائے اور فرانس کی طرف سے امداد ملے۔ فلسطین کے متعلق کمیشن

---

[۱] (مترجم) — اس سے ظاہر ہے کہ اتحادیوں نے پے در پے متضاد و متناقض معاہدے کیے، مثلاً (۱) شریف حسین سے اقرار کہ عرب علاقوں کو آزادی دی جائے گی (۲) برطانیہ کی طرف سے سائیکس اور فرانس کی طرف سے پیکو کا خفیہ معاہدہ کہ پورے علاقے باہم تقسیم کر لیے جائیں گے (۳) یہودیوں کی دلداری کے لیے اعلان کہ فلسطین میں ان کے لیے قومی وطن کے قیام کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، (۴) یہ اعلان کہ ترکوں کے ماتحت جتنے عرب ہیں ان سب کو آزاد کرایا جائے گا۔ انجام کار صرف حکمداریاں قائم کر کے شام، لبنان، فلسطین اور عراق کو برطانیہ اور فرانس نے تقسیم کر لیا۔

کی سفارش یہ تھی کہ صیہونیت کا پروگرام محدود کیا جائے، یہودیوں کا داخلہ ایک خاص تعداد سے آگے نہ بڑھے اور فلسطین کو یہودی دولت مشترکہ بنانے کا منصوبہ ترک کر دیا جائے۔

حکمداریوں کا نظام

اس وقت تک سان ریمو (اٹلی) کی کانفرس میں سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا (اپریل ۱۹۲۰ء)۔ اس کے مطابق فرانس کو شام و لبنان کی اور برطانیہ کو فلسطین و عراق کی حکمداری مے دی گئی۔ اتحادِ عرب کا خواب بہت بُری طرح پریشان ہو گیا، چار ماہ بعد ترکی نے معاہدہ سیورے (فرانس) پر دستخط کر دیئے اور جو علاقے حکمداریوں میں آ چکے تھے، ان کے تمام حقوق سے حکومت ترکیہ دست بردار ہو گئی، حکمداریوں کا ادارہ سیاسی تعلقات میں بالکل انوکھی حیثیت رکھتا تھا، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس ادارے کی ابتدائی تحریک جنوبی افریقہ کے جنرل سمٹس اور جمہوریہ امریکہ کے صدر ولسن نے کی تھی، چاروں حکمداریاں ـــــ شام، لبنان، فلسطین اور عراق ـــــ جمعیۃ اقوام کے ماتحت درجہ الف کی حکمداریاں قرار دی گئیں، تمہیدی اقرار نامے میں اعتراف کر لیا گیا تھا کہ ان حکمداریوں کی آبادیاں نشو و ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی ہیں کہ انھیں عارضی طور پر آزاد اقوام تسلیم کیا جا سکتا ہے، البتہ حکمدار طاقت کی طرف سے انھیں انتظامی معاملات میں اس وقت تک مشورہ اور امداد ملنی چاہیئے، جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل نہ ہو جائیں۔ ساتھ ہی صدر ولسن کے اس اصول کو دہرایا گیا تھا کہ ان علاقوں کے باشندوں کی مرضی ہی معاملے کی بنیاد و اساس ہے۔

ترپنواں باب

شام فرانس کی حکمداری میں

فیصل کی عارضی بادشاہی

فیصل شامیوں کے قومی مقاصد کا ایک نشان بن گیا۔ اوائل جون ۱۹۲۰ء میں وہ یورپ کے دوسرے سفر سے واپس آیا تو یقین ہو چکا تھا کہ برطانیہ اور فرانس شام کے استقلالِ کامل کو تسلیم کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں، مجبور ہو کر فیصل نے جارج کلیمنشو سے اتفاق کر لیا تھا کہ فرانس سے انتظامی، مالی اور فنی امور میں امداد لی جائے گی، دمشق میں شامیوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ (۸/مارچ ۱۹۲۰ء کو) حکمداری کی وہ معمولی سی صورت بھی مسترد کر دی گئی، جسے فیصل منظور کر چکا تھا اور شام کے طبعی حدود میں جو کوہستانِ طارس (شمال) سے جزیرہ نمائے سینا (جنوب) تک پھیلے ہوئے تھے، فیصل کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا، اس کانفرنس میں شام و فلسطین کی نمائندگی بوجہ احسن ہوئی تھی، مگر لبنان کی نمائندگی کی صورت یہ نہ تھی۔ اس زمانے میں ہنری گورا[۵۱] فرانس کی طرف سے ہائی کمشنر تھا۔ یہ وہی شخص تھا، جس نے دریائے مارن[۵۲] کی جنگ میں اپنا ایک بازو کھو دیا تھا۔ اس نے ۱۴/جولائی ۱۹۲۰ء کو فیصل کے نام الٹی میٹم بھیج دیا کہ فرانس کا اقتدار غیر مشروط طریق پر تسلیم کر لیا جائے، کچھ مدت بعد اس نے فوج کو دمشق پہنچ جانے کا حکم دے دیا۔ شامی سپاہیوں کے لشکر، جن کی تربیت کا پورا بندوبست بھی نہیں ہوا تھا، میسلون میں جمع ہوئے۔ فرانس کی تجربہ کار اور آزمودہ فوج کو فتح حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ فیصل شام سے نکل گیا۔ بعد ازاں برطانیہ نے اسے عراق کا بادشاہ بنا دیا، جہاں اس کا پوتا ۱۹۵۸ء تک حکمران رہا۔ یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کو جنرل گورا نے لبنان کلاں کے قیام کا اعلان کر دیا۔

فرانس کے انتظامات

خود شام میں ایسی مشکلات درپیش تھیں، جن سے عہدہ برآ ہونا سہل نہ تھا، سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور روحانی اعتبار سے ملک پستی کی آخری منزل پر پہنچا ہوا تھا، خود اختیاری نظام کا کوئی بھی شعبہ ملک میں نشوونما نہیں پا سکا تھا، جمہوریت کے کسی ادارے کو لباسِ عمل نہیں پہنایا گیا تھا اور اہلِ ملک کو پارلیمانی نظام یا دورِ حاضر کی سول سروس کا کوئی تجربہ نہیں تھا، حکمدار طاقت کو پہلے ہی سے یہ اہم کام درپیش تھا کہ انتظامی اور عدالتی ڈھانچے تیار کرے، سڑکیں مرمت کرائے، نظامِ تعلیم کو منظم بنیادوں پر استوار کر دے اور ملک کے طبعی وسائل کو ترقی دے۔

آہستہ آہستہ حکمدار طاقت نے مقابلۃً عہدِ حاضر کی انتظامی مشینری مہیا کی، زمینیں رجسٹر کرائیں، تعلیمی نظام درست کیا، آثارِ قدیمہ کی چھان بین

---

۵۱ Henri Gonrand

۵۲ Marne

کی حوصلہ افزائی کی، حفظانِ صحت کا محکمہ بنایا اور عوام کے لیے تحفظ کا بندوبست ہوا۔ دورِ حاضر کے ضوابط و قوانین رائج کیے گئے، لبنان کے اشتراک سے کسٹمز کی تنظیم ہوئی، جس کا دارالحکومت بیروت پورے اندرونی علاقے کے لیے سب سے بڑی بندرگاہ تھا، البتہ امورِ عامہ کا انتظام، جن میں سڑکیں بھی شامل تھیں، اس پیمانے پر نہ ہو سکا، جس پیمانے پر لبنان میں ہو چکا تھا، بہ حیثیت مجموعی حکومت کی توجہ اقتصادی امور کے بجائے سیاسی امور پر مرتکز تھی اور لوگ بھی سیاسی جدوجہد ہی پر تلے بیٹھے تھے۔

تفرقہ انگیزی اور حکمرانی

عوام کا احساس یہ تھا کہ حکمداری کا نظام، استعماری نظام کے مقابلے میں نظری اعتبار سے بہت مختلف ہے، مگر عملی اعتبار سے چنداں مختلف نہیں، ان کے نزدیک فرانسیسی اقتدار ترکی اقتدار کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر اور اس وجہ سے زیادہ قابلِ نفرت تھا۔ پہلے تین ہائی کمشنر ——— ہنری گورا (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۲۳ء)، میکسم ویگاں[1] (۱۹۲۳ء۔ ۱۹۲۵ء)، اور مارس سرائل[2] (۱۹۲۵ء)، ——— لبنان کے بھی کمشنر تھے اور مسلح افواج کے سپہ سالار بھی تھے، یہ تینوں مشہور جرنیل تھے، جنھوں نے عالمی جنگ میں درجۂ امتیاز حاصل کیا تھا۔ انھوں نے اپنی امداد کے لیے جو فوجی افسر منتخب کیے، وہ افریقہ کے مستعمراتی نظام میں تجربات حاصل کر چکے تھے، قومی مقاصد اور فرانسیسی اقتدار کے درمیان مفاہمت کی کوششیں بارہا کی گئیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں، ایک منتخب دستور ساز مجلس نے اگست ۱۹۲۸ء میں دستور کا مسودہ تیار کر کے ہائی کمشنر کے سامنے پیش کیا، جو مسترد کر دیا گیا اور مجلس توڑ دی گئی، چنانچہ ۱۹۳۰ء تک ملک پر دستور کے بغیر ہی حکمرانی کا سلسلہ جاری رہا، پھر جو دستور نافذ کیا گیا، وہ ہائی کمشنر نے تیار کیا تھا۔ اس میں بعض وہ اصول بھی شامل تھے جو دستور ساز مجلس نے تیار کیے تھے، لیکن ان کے ساتھ تحفظات لگا دیے گئے تھے، بالقوہ علاحدگی کی تحریکوں ——— علاقائی اور مذہبی ——— کو فروغ پانے کا موقع دے دیا گیا، اس طرح "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کے قدیم اصول کے لیے عمل کی گنجائش نکال لی گئی، چنانچہ ملک کو چار ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا: ریاست دمشق، ریاست حلب، ریاست دروز حوران میں اور ریاست علویہ، جس کا مرکز لاذقیہ تھا۔

دورِ کشمکش

ساتھ ہی فرانسیسی ثقافت کی دوا اتنی بڑی مقدار میں پلا دی گئی، جسے لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عربی زبان کو نقصان پہنچاتے ہوئے فرانسیسی زبان سیکھنے پر زور دیا گیا، قوم پروروں کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا گیا، شکری القوتلی (جو آگے چل کر آزاد جمہوریت کے صدر بنے)، فارس الخوری (جو آگے چل کر وزیر اعظم بنے)، صالح الحفار اور دوسرے لیڈر، جو اربابِ فکر و عمل تھے، کسی نہ کسی موقع پر جلا وطن ہوئے یا جیل خانے میں بھیجے گئے، شخصی حقوق پر ایسی پابندیاں عائد کی گئیں، جو عوام کے لیے خفگی و اضطراب کا باعث بنیں، آخر عوام نے حالات سے تنگ آ کر ہڑتالوں اور مقامی بغاوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ۱۹۲۵ء میں بغاوتِ عام کا باعث بنیں، اس بغاوت کی ابتدائی چنگاری دروزیوں نے سلگائی، پھر اس کے شعلے دمشق، حلب، حماۃ اور دوسرے شہروں تک پہنچ گئے اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا، دمشق پر توپوں اور ہوائی جہازوں سے گولے برسائے گئے، اس گولہ باری کے زخم سالہا سال تک غیر مندمل رہے۔[3]

---

[1] Maxime Weygand

[2] Maurne Sarrail

[3] مصنف نے اپنے بیان میں اختصار کے پیشِ نظر تاریخوں کو بُری طرح خلط ملط کر دیا ہے، واضح رہے کہ دمشق پر گولہ باری ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء تک اڑتالیس گھنٹے جاری رہی تھی۔

دنیا بھر میں فرانس کے طرزِ عمل کے خلاف غم و غصہ کی لہریں دوڑ گئیں۔ آخر مجبور ہو کر ایک سویلین کو ہائی کمشنر مقرر کیا گیا جس کا نام ہنری دی جووئیل[1] تھا۔ اس نے شرائط صلح کے لیے گفت و شنید کی، مگر ناکام رہا۔ اس کے جانشینوں کی کوششیں بھی ناکامی ہی پر منتج ہوئیں، قوم پروروں کی کانگریس کا ایک اجلاس دمشق میں ہوا، جس میں فرانس کی پالیسی کی صاف صاف مذمت کی گئی اور اتحادِ عرب کے لیے ایک منشور جاری کیا گیا۔

دوسری عالمی جنگ

۱۹۳۰ء کے اواخر میں فرانس کے خلاف غیظ و غضب کی آگ اور بھی تیز ہو گئی، کیونکہ اس نے حکمداری کی شرائط کے مطابق شام کے حقوق کی حفاظت کے بجائے، اسکندرونہ کی سنجق میں ترکی کو خاص حقوق دے دیئے بالآخر جون ۱۹۳۹ء میں یہ سنجق جمہوریہ ترکیہ کے حوالے کر دی، اسکندرونہ میں ترکوں کی خاص آبادی تھی، تاہم وہ اقلیت میں تھے، سنجق اس لیے ترکوں کو دی گئی تھی کہ وہ جنگ میں جس کے اسباب تیزی سے فراہم ہو رہے تھے، برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں، گویا اس طرح شام کو نقصان پہنچا۔

دوسری عالمی جنگ شام و اہلِ شام کے لیے پہلی عالمی جنگ سے زیادہ شفیق و مہربان ثابت ہوئی، جرمنوں نے بڑے زور شور سے پروپیگنڈہ کیا، بعض اوقات یہ پروپیگنڈا مؤثر بھی ہوتا رہا مگر اہلِ شام نے عراقیوں کی طرح کھلم کھلا عداوت کی کوئی حرکت نہ کی۔ فرانس و برطانیہ کو اندیشہ تھا، کہ کہیں محوری طاقتیں (جرمنی، اٹلی اور جاپان) نہ پہنچ جائیں، وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھیں کہ یہودیوں کی وجہ سے فلسطین میں بغاوت کے حالات مہیا ہیں، اس وجہ سے انھوں نے (فرانس و برطانیہ) عوام کی بے چینی اور بے اعتمادی بڑھانے والی ہر چیز کو دبائے رکھنے کی کوشش کی، فوجوں کی تعداد بڑھ گئی، اس لیے ضروری تھا کہ غذائی اجناس کے وسیع ذخیرے مہیا کیے جاتے، نئی سڑکیں بنائی جاتیں، پرانی سڑکوں کی مرمت کی جاتی، نیز امورِ عامہ کے سلسلے میں دوسرے کام انجام دیئے جاتے، ان ضرورتوں نے مقامی کارکنوں کے لیے ملازمت کے دروازے کھول دیئے، ملک میں سے تجارتی مال بہ مقدارِ کثیر گزرنے لگا، شرقِ اوسط کے لیے رسد کا مرکز قاہرہ میں قائم کیا گیا تھا، اس کے کارفرماؤں کو ضروری معلوم ہوا کہ پورے علاقے کے لیے گندم، چاول، گوشت، دوائیں اور زندگی کی دوسری ناگزیر چیزیں فراہم رکھیں، یوں مقامی پیداوار میں اضافہ ہوا، جہازوں کی کمی کے باعث جو صورت پیدا ہو گئی تھی، اس سے عہدہ برآ ہونے کا بڑا اچھا بندوبست کر لیا گیا۔ غرض ان حالات میں نہ ضرورتیں رکیں، نہ وبائیں پیدا ہوئیں، بلکہ علاقے کی عمومی خوش حالی کو فائدہ پہنچا، بعض تاجروں اور صنعت کاروں نے ذخیرہ اندوزی اور دوسرے ذرائع سے بے اندازہ دولت پیدا کر لی۔

شام پر اتحادیوں کا قبضہ

البتہ سیاسی اعتبار سے پیش قدمی کے بجائے رجعت کی صورت پیدا ہوئی۔ گیبریل پوآؤ[2] ۱۹۳۸ء سے ہائی کمشنر تھا۔ اس نے مئی ۱۹۳۹ء میں فرانس و شام کا وہ معاہدہ ختم کر دیا، جو ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا اور حکمداری کا نظام زیادہ مستحکم بنیادوں پر از سر نو قائم ہو گیا، ساتھ ہی مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا، جب فرانس نے جرمنی کے روبرو ہتھیار ڈال دیئے تو پوآؤ نے حکومت وشی[3] سے وفاداری کا حلف اٹھایا اور جرمنوں نے جو

۱؎ Henri the Jovinal

۲؎ Garniel Puau

۳؎ Vichi Gout اس سے مراد وہ حکومت ہے، جو مارشل پتیان نے جرمنی کے ساتھ صلح کے بعد قائم کی تھی، اور جس کا مرکز پیرس کے بجائے فرانس کا مشہور شہر وشی مقرر ہوا تھا، یہ حکومت جرمنوں کے ساتھ تعاون کر رہی تھی، اس وجہ سے اتحادی اسے دشمن حکومت سمجھتے تھے، جنرل ڈی گال آزادی فرانس کے حامی کی حیثیت میں اتحادیوں کا معاون تھا۔

کمیشن شام و لبنان بھیجا تھا، اس سے پورا تعاون کیا۔ ان حالات میں برطانیہ اور آزاد فرانس کو شام پر قبضہ جمانے کے لیے میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ ۸ رجون ۱۹۴۱ء کو اتحادی فوجیں مشرق اور جنوب کی جانب سے شام میں داخل ہوئیں اور حکومت وشی نے شام و لبنان میں جس شخص کو سالارِ اعظم بنا رکھا تھا اسے مجبور کر دیا گیا کہ شرائط کا فیصلہ کرے، اس طرح جرمنوں کی وہ کوششیں ختم ہوگئیں، جو اس علاقے پر قبضے کے لیے ہو رہی تھیں، آزاد فرانس کے رئیس جنرل ڈی گال نے جارج کاترو[۵۱] کو شام و لبنان میں فرانسیسی افواج کا کمانڈرِ اعظم، سالارِ مختار اور سفیر با اختیار مقرر کیا، جس روز اتحادی فوجوں نے شام پر حملہ کیا تھا، جنرل کاترو نے اعلان کر دیا تھا، کہ مجھے حکمداری کا نظام ختم کر کے اہلِ شام کو آزاد و خود مختار بنا دینے کے لیے بھیجا گیا ہے، حکومت برطانیہ نے بھی اعلان کر دیا کہ جنرل کاترو نے جنرل ڈی گال کی طرف سے شام و لبنان کے ساتھ آزادی کا جو وعدہ کیا ہے، ہم اس کے حامی اور خود اس وعدے میں شامل ہیں، ۱۶ ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو کاترو نے شام و لبنان کی باقاعدہ آزادی کا اعلان کیا، گیارہ روز بعد وہاں نئی آزاد حکومت بن گئی۔ تاہم اس وقت یہ اعلانات محض رسمی اور نمائشی تھے، ان سے صورتِ حالات میں کوئی عملی تغیر پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ نہ کار فرماؤں میں تبدیلی ہوئی تھی، اور نہ انتظامی طور طریقے بدلے تھے، اگست ۱۹۴۳ء تک دستوری زندگی بحال نہ ہو سکی، اس وقت نئے منتخبہ ایوان نے شکری القوتلی کو صدرِ جمہوریت منتخب کیا، اس قومی حکومت نے آزادی کے حقوق و اختیارات حاصل کیے اور پہلے پیرس، لندن، ماسکو، واشنگٹن، بعد ازاں دوسرے مقامات پر سفارت خانے قائم ہوگئے۔

آزادی کامل

کچھ ہی دیر بعد جھگڑے شروع ہوگئے، ان میں اہم ترین مسئلہ یہ تھا، کہ شام و لبنان کے درمیان جو امورِ مشترکہ مفاد کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً کسٹمز، ان کا فیصلہ کس اصول پر کیا جائے، ایک مسئلہ "خاص افواج" کا تھا، یعنی ان افواج کا جو شام و لبنان سے بھرتی کی گئی تھیں، پھر انھیں تربیت دے کر قابض افواج میں شامل کر دیا گیا تھا، پھر فرانس نے مطالبہ کیا کہ نیا معاہدہ کیا جائے، جس کے مطابق فرانس کو دوسرے ملکوں کے مقابلے میں خاص حیثیت حاصل ہو، اہلِ شام نے اس سے انکار کر دیا، مئی ۱۹۴۵ء میں فرانس سے نئی فوجیں پہنچیں، اہلِ شام نے ان پر اعتراض کیا اور فرانس سے تعلقات منقطع کر لیے۔ فرانسیسی فوج نے بیس سال پیشتر کی طرح دمشق پر توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے سے گولہ باری کی، یہ ۲۹ رمئی کا واقعہ تھا، دنیا بھر کے نمائندے اس موقع پر سان فرانسسکو میں اس غرض سے جمع ہوئے تھے کہ انجمن اقوامِ متحدہ کے منشور کی منظوری دیں، گولہ باری نے سب کو متاثر کیا، برطانیہ نے مداخلت کر کے امن بحال کیا، سال ختم ہونے سے پہلے پہلے فرانس و برطانیہ کے درمیان شام و لبنان سے فرانسیسی فوجیں نکالنے کے متعلق سمجھوتا ہو گیا، ۱۲ ر اپریل ۱۹۴۵ء کو دونوں ملک شام و لبنان، انجمن اقوامِ متحدہ میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے حکمداری ختم ہو چکی ہے، اس سے بیس روز پیشتر شام نے جمعیۃ متحدہ عرب کے میثاق پر دستخط کر دیئے تھے، مصر، عراق، لبنان، دولتِ سعودیہ عربیہ، شرقِ اردن اور یمن اس جمعیۃ کے دوسرے ارکان تھے،

---

[۵۱] Georges Catrouse

انجمن اقوام متحدہ کے دباؤ سے ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو شام کا، اور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لبنان کا تخلیہ مکمل ہوگیا۔ اسی وقت سے کامل خود مختاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ "یوم تخلیہ" ہر سال قومی پیمانے پر منایا جاتا ہے، اور دمشق کا ایک چوک بھی اسی واقعے کی یاد تازہ کرتا ہے۔

چونواں باب

آزاد جمہوریت

آزادی کا ابتدائی دور

شام نے صدر شکری القوتلی کی رہنمائی میں کامل آزادی کا سفر شروع کیا، سامنے امید و آرزو کی روشنی تھی، لیکن یہ نظر نہیں آتا تھا کہ راستہ کبھی خوشگوار ہو جائے گا۔ مشکل مسائل سامنے تھے جن میں داخلی بھی تھے اور خارجی بھی، ایسی صورت اختیار کر لی کہ ہر طرف مشکلات ہی مشکلات نظر آنے لگیں، سب سے پہلا مسئلہ لبنان کے ساتھ تعلقات کا تھا۔ ان تعلقات میں کئی چیزیں آتی تھیں، مثلاً سامان پر محصول، کسٹمز، کمپنیوں کے لیے مراعات، آثارِ قدیمہ کا انتظام، مشترکہ سرحد کی حفاظت، ترکی کے ساتھ اسکندرونہ کے مسئلے پر نزاع تھی، اردن کے تعلق میں شام کبیر کا مسئلہ درپیش تھا، جس کے لیے شاہ عبداللہ والیِ اردن مدتِ مدید سے سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھا۔ ۱۹۴۶ء میں شاہ عبداللہ نے اعلان کیا کہ شام کبیر کی تجویز کا محرک خاندانی مفاد نہیں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ شام و فلسطین کے اشتراک سے جو دولت وجود میں آئے وہ اتحادِ عرب کا جوہر بن جائے۔ اہلِ شام کا ایک ذی اثر طبقہ اس تجویز کا حامی تھا، ایک اور جماعت، جسے جماعتِ خلق کہنا چاہیے وہ ہلالِ زرخیز کی تجویز کی حامی تھی، جو عراق کی طرف سے پیش ہوئی تھی، اس کا مدعا یہ تھا کہ شام، عراق اور اردن مل کر ایک حکومت بن جائیں، پھر یہی وحدت باقی عرب اجزا کو متحد کرنے کا ذریعہ ثابت ہو، عراقیوں کی رائے یہ تھی کہ ان کا بادشاہ مرحوم امیر فیصل کا پوتا ہونے کی حیثیت میں دونوں ملکوں کی تاجداری کا حقدار ہے، لیکن برطانیہ سے عراق کے معاہدے کے پیشِ نظر اہلِ شام اس تجویز کے باب میں متذبذب تھے۔

ان تمام گروہوں سے بالکل مختلف اور ممتاز جماعت شامی قوم پرورں کی تھی، ان کا نظریہ یہ تھا کہ عربیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی آزاد شامی قومیت ایک خاص حیثیت کی مالک ہے، ان کی رو سے کے مطابق لبنان شام کا ایک حصہ تھا، اس جماعت کا نظم و نسق استبدادی رنگ کا تھا اور یہ اپنے مقاصد کا پروپیگنڈا بڑے زور شور سے کرتی تھی، بہت جلد پڑھے لکھے نوجوان اس کے حامی بن گئے، اس جماعت کا بانی لبنان کا ایک مسیحی تھا، جو برازیل میں رہ چکا تھا۔ حکومت لبنان نے اسے بدیں وجہ موت کی سزا سنا دی تھی کہ اس کی سرگرمیاں تحفظ لبنان کے منافی تھیں۔ پھر اس جماعت نے خفیہ سرگرمیاں شروع کر دیں، سب سے آخر میں یہودیوں کا مسئلہ تھا، جو معمولی حدود سے اٹھ کر بین الاقوامی اہمیت اختیار کر چکا تھا، اہلِ شام کسی ایسی یہودی ریاست کا خیال بھی برداشت نہ کر سکتے تھے، جو اسی علاقے میں قائم ہو رہی تھی جسے اہلِ شام اپنے ملک کا حصہ سمجھتے تھے اور وہ شام سے بالکل ملا ہوا تھا، حدودِ شام میں رہنے والے لوگ مذکورہ بالا منصوبوں میں سے کسی نہ کسی کی حمایت کر رہے تھے، لیکن یہودیت کے خلاف سب متحد تھے اور جذبۂ مخالفت بڑا ہی تیز تھا۔

یہودیت کی مصیبت

تمام مذکورہ بالا مسائل میں سے یہودیت کا مسئلہ حد درجہ اہم تھا، فلسطین میں صورتِ حالات رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہو رہی تھی، یہودیوں

نے برطانوی حکمداری سے اختیارات چھین، کر دہشت انگیزی کا ایسا دور شروع کر دیا کہ نظم و نسق کے معطل ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ باہر سے یہودیوں کا سیل فلسطین پہنچ گیا، ان میں زیادہ تر نوجوان تھے، جو یہودیت کے لیے لڑ مرنے پر آمادہ تھے، ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تقسیم فلسطین کی تجویز منظور کی تو چھاپا مار جنگ شروع ہو گئی۔ تقسیم کی حمایت میں اکثریت پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ سرگرمی امریکہ نے دکھائی اور واشنگٹن سے تار بھی ملائے جاتے رہے۔ یہ سب کچھ یہودیوں کے دباؤ کا نتیجہ تھا، عرب مغربی یورپ کے مخالف پہلے ہی تھے، اب اس میں امریکہ کو بھی شامل کیا جانے لگا۔ انجمن اقوام متحدہ کے پاس تقسیم کے نفاذ یا قیام امن کے لیے سعی و کوشش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، برطانوی فوجیں فلسطین سے نکل گئیں تو یہودیوں نے فلسطینی عربوں کے "عسکرِ آزادی" پر فتح حاصل کر لی اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا، امریکہ اور روس نے فوراً اسے تسلیم کر لیا، جمعیتِ متحدۂ عرب کے ارکان نے جن میں شام بھی شامل تھا، نئی ریاست کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی، اردن کے سوا کسی کی فوج پوری تربیت یافتہ نہ تھی اور اس غیر منظم فوج نے اپنی قوت کا کوئی اچھا مظاہرہ نہ کیا اور فروری ۱۹۴۹ء میں اسرائیل کے ساتھ متارکے پر دستخط کر دیئے۔[1]

انقلابات کا دَور

اس پوری مدت میں شام کے داخلی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، حکمداری کے دَور کی طرح لوگوں کے فکر و عمل کا مرکز دو چیزیں رہیں، اوّل سیاسی، دوم فوجی، قومی اور ملکی زندگی کے باقی پہلوؤں سے تغافل برتا گیا، مالیات کی حالت بہت ابتر ہو گئی، سکہ اس وقت تک فرانسیسی فرانک سے وابستہ تھا، اور اس کی قیمت میں نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا، قیمتیں بہت بڑھ گئیں اور سامان کی خرید خاصی کم ہو گئی، فلسطین میں فوجی قوت کا جو مظاہرہ ہوا تھا، وہ بدانتہا ذلت خیز تھا، ریاست اسرائیل اپنے حدود زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے مضطرب تھی اور یہ امر شام کے لیے ایک مستقل خطرے کا باعث تھا، اتحاد عرب کا خواب اس طرح پریشان ہو چکا تھا کہ اب اس کے مختلف حصّوں کو جوڑنا بھی مشکل ہی معلوم ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ حالت حکومت میں تبدیلی کی متقاضی تھی۔

۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء کو رات کے سکوت میں ایک فوجی گروہ نے قدم اٹھایا، جس کا رئیس کرنیل حسنی الزعیم تھا، القوتلی اور اس کے بعض وزیروں کو اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک انھوں نے استعفوں پر دستخط نہ کر دیئے، الزعیم نے خاصی ترقی پسندانہ، بلکہ انقلابی اصلاحات جاری کیں، مثلاً معمولی خواندہ عورتوں کو حق رائے دے دیا، اوقاف سرکاری نگرانی میں لے لیے، اخبار پر سنسر لگا دیا، سرحدوں کے دروازے بند کر دیئے، تمام صنعتی کارگاہوں پر پندرہ فی صد محصول عائد کر دیا اور یہ محصول ۱۹۴۷ء سے وصول کیا گیا۔ ارکو (عربی امریکی آئل کمپنی) کو پائپ لائن بنانے کی اجازت دے دی، عہد حاضر کا تجارتی قانون اختیار کر لیا گیا، غرض الزعیم کے سامنے ترکی کے مصطفےٰ کمال کا نمونہ تھا، اس نے اپنے لیے فیلڈ مارشل کا لقب تجویز کیا اور اس عہدے کا نشان پیرس میں بنوا لیا، نیز اس میں بہت سے جواہرات جڑ دیئے گئے۔

---

[1] اسرائیلیوں کے مقابلے میں عربوں کی ناکامی کے اصل وجوہ یہ تھے کہ اوّل مصر کے بادشاہ نے انگریزوں کے زیرِ اثر فوج کے لیے ردی سامان بہم پہنچایا اور جوانمرد مجاہدین جنگ میں بے دست و پا ہو گئے، دوم انگریزوں ہی کے زیرِ اثر شاہ عبداللہ والیٔ اردن نے فلسطین کا علاقہ سنبھال لینے کی حرص میں عربوں کا ساتھ چھوڑ دیا، خود دمشق کے خلاف جو انقلاب برپا ہوا، اس کی اصل وجہ بھی اسرائیل کی جنگ میں ناکامی تھی، اسی طرح شاہ عبداللہ کو بھی اسی وجہ سے گولی ماری گئی، تیسرا سبب یہ تھا کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ بیک آہنگ اسرائیل کی حمایت کا اعلان کر چکے تھے، دھڑا دھڑ اسے سامان جنگ پہنچا رہے تھے اور عربوں کے لیے سامان جنگ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بے شک ان کی فوجی تربیت اونچے پیمانے پر نہ ہوئی ہو گی، لیکن عربوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ تمام یہودیوں کو اٹھا کر بحیرۂ روم میں پھینک دیتے۔ (مترجم)

یکایک لوگوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ الزعیم کے رجحانات فرانسیسیوں کی طرف ہیں، چنانچہ وہ جس تیزی سے بروئے کار آیا تھا، اسی تیزی سے معرضِ زوال میں پہنچ گیا، ۱۴/ اگست کو ایک اور فوجی گروہ نے کرنیل سامی الحناوی کی سرگروگی میں الزعیم کی قیام گاہ پر پہنچ کر اسے اور اس کے وزیرِ اعظم کو گرفتار کر کے فوراً گولی سے اڑا دیا، اعلان یہ کیا کہ اس شخص نے اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے، شخصی آزادی پر پابندی لگادی ہے، اور سرکاری روپیہ ضائع کیا ہے، حنّاوی کا دور پیشرو سے بھی زیادہ بے نتیجہ رہا، ۱۹/ دسمبر کو ایک تیسرا فوجی گروہ کرنیل ادیب الششکلی کی سرکردگی میں اٹھا اور حنّاوی کی حکومت ختم کر دی، اس وقت بتایا گیا کہ حنّاوی نے بعض خارجی عناصر سے مل کر جمہوری نظام کو ختم کر دینے کی سازش کی تھی، ششکلی کو فوج میں چیف آف دی سٹاف کا عہدہ حاصل تھا، کچھ مدّت بعد اس نے پورے اختیارات اپنے قبضے میں لے لیے۔ حنّاوی کی خواہش یہ تھی کہ شام و عراق متحد ہو جائیں، جس خارجی عنصر کا حوالہ دیا گیا تھا، وہ برطانیہ تھا۔

ہمسایوں سے کشمکش

غرض نئے نظامِ حکومت نے بھی حالات میں کوئی نمایاں تغیّر پیدا نہ کیا، شام و لبنان کے درمیان کسٹمز کا اتحاد مارچ ۱۹۵۰ء میں ختم ہو گیا گویا قریب ترین ہمسائے سے اقتصادی تعلق کی آخری کڑی ٹوٹ گئی، شامی برآمد کے لیے لبنانی سرحد بند کر دی گئی، اس میں شام ہی کو زیادہ نقصان ہوا، حکومت نے لاذقیہ کی بندرگاہ کو درست کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ بھی قرار پایا کہ اس بندرگاہ تک سڑکیں بنا دی جائیں، شام سے جو سیاسی لیڈر بھاگ کر لبنان پہنچ گئے تھے، وہ مسلسل کشمکش کا باعث تھے، شام و اسرائیل کی سرحد پر چپقلشیں بڑھ گئیں، بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آیا اسرائیل کو جھیل حولہ کے دلدلی علاقے سے دریائے اردن کے بالائی علاقے تک پانی کے نکاس کا بندوبست کرنے کا حق ہے، حالانکہ یہ علاقہ دونوں ملکوں کے درمیان اس حصّے میں واقع ہے، جہاں فوجی استحکامات کی ممانعت کر دی گئی ہے، دونوں ملکوں کی طرف سے بار بار انجمن اقوامِ متحدہ کے پاس اپیلیں ہوئیں، لیکن نتیجہ غیر اطمینان بخش نکلا، مغربی ملکوں کے خلاف جذبہ تیز ہو گیا، خصوصاً برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے خلاف جن سے اسرائیل کو مال اور اسلحہ کی امداد مل رہی تھی۔

تعمیری منصوبے

شام کے میزانیے میں قومی دفاع کا خرچ برابر بڑھتا گیا، امریکہ کی طرف سے امداد اس لیے ٹھکرا دی گئی کہ اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی وابستہ تھیں، متزلزل ملکی اقتصادیات کو بہتر بنانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ متعدّد تعمیری منصوبے تیار کیے گئے تھے جو خاصے لمبے عرصے میں تکمیل پانے والے تھے، ان میں پہلا درجہ اس منصوبے کو حاصل تھا کہ دریائے عاصی پر بہ مقام غب جو دلدلیں ہیں، انھیں صاف کیا جائے، اس طرح کوئی دو لاکھ ایکڑ زمین کی حفاظت و آبیاری کا انتظام ہو سکتا تھا اور خرچ کا اندازہ اٹھائیس کروڑ شامی پونڈ تھا، علاوہ بریں بن بجلی مہیا کرنے کا بھی ایک منصوبہ تھا، جس سے نئے صنعتی کارخانوں کو فائدہ پہنچتا، نیز دلدلیں صاف ہو جائیں تو بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم کے لیے پرورش گاہیں باقی نہ رہتیں، ان کے علاوہ دریائے فرات، دریائے خابور اور دریائے یرموک پر بند بنا کر آبیاری کے انتظامات کرنے منظور تھے، چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ایک پنجسالہ منصوبہ تیار کیا گیا، جس پر بیس کروڑ شامی پونڈ خرچ ہوتے تھے، ایک فرمانِ خاص کے ذریعے سے چالیس لاکھ ایکڑ سرکاری زمینیں تقسیم کر کے امدادِ باہمی کے اصول پر زراعت کے لیے نوآبادیاں قائم کر دی گئیں، لبنان سے تجارتی معاہدے ہو گئے، جن کی بنا پر تعلق ختم ہو گیا۔ پانی، بجلی، وسائلِ حمل و نقل، اور حلب و دمشق کی کمپنیاں قومی بنا دی گئیں، جون ۱۹۵۳ء میں ششکلی نے خود ایک دستور کا مسودہ تیار کیا، جو ایک حد تک امریکہ کے دستوری اصول پر بنایا گیا تھا، اس کا مدّعا یہ تھا کہ صدر کا انتخاب ہوا کرے اور

تمام تنفیذی اختیارات اس کے حوالے کیے جائیں، منتخب نمائندوں کا ایک ایوان ہو، جو قانون وضع کرے اور ایک عدالت عالیہ۔

ششکلی کا اخراج

ششکلی کی حکومت بہ ظاہر بالکل محفوظ معلوم ہوتی تھی، لیکن اندر ہی اندر اس کی مخالفت جاری تھی، جس کی وجہ سے بنیاد کھوکھلی ہو گئی، اگرچہ اسے چار سال کی مہلت مل گئی تھی، لیکن اس لمبی مدت میں بھی مخالف عناصر نہ تو ختم ہوئے اور نہ ششکلی سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوئی، صرف ایک جماعت تھی جو خود ششکلی نے بنائی اور اسی کو آزادانہ کام کرنے کی اجازت تھی، لیکن وہ موزوں سہارا ثابت نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۴ء میں بار بار ہڑتالیں ہوئیں، طلبہ نے مظاہرے کیے، سیاسی شورشیں پیدا ہوئیں اور یہ سلسلہ ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ بارہ مخالف لیڈروں کو قید کر دیا گیا تھا، جن میں سے بعض ممتاز ترین عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، اس سے عوام متاثر ہوئے، پھر جبل دروز میں شورش برپا ہوئی اور اسے دبانے کے لیے فوج بھیجی گئی تو اس کا نتیجہ الٹا نکلا، آخر حلب کی فوج نے بغاوت کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ ہم دارالحکومت کی طرف پیش قدمی شروع کرنے والے ہیں، اس وقت ششکلی سر جھکانے پر مجبور ہوا، اس نے عہدے سے استعفا دے دیا اور بھاگ کر دولت سعودیہ میں پہنچ گیا، وہاں سے پیرس چلا گیا، جہاں وہ اس وقت تک موجود ہے، معتمر عطاسی، جسے ششکلی نے ۱۹۵۱ء میں باہر نکالا تھا، فوج نے اسے پھر اختیارات کا مالک بنا دیا۔ اس نے ششکلی کے دستور کی جگہ ۱۹۵۰ء کا دستور جاری کیا، شکری القوتلی الذعیم کے برسر اقتدار آنے پر مصر چلا گیا تھا، نمائندوں کے ایوان نے اسے پھر جمہوریت کا صدر بنا لیا اور وہ ۷ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اپنے عہدے پر واپس آ گیا، پانچ سال کے فوجی اقتدار نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ جہاں سے چلے تھے، وہیں سے پھر سفر شروع ہوا۔

القوتلی کی پالیسی

القوتلی کے ماتحت شام اتحادِ عرب کی پالیسی پر قائم رہا۔ اس کی خاص کوشش یہ تھی کہ مصر اور دولت سعودیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گہرے تعلقات پیدا کرے، اسرائیل سے اسے دشمنی تھی، ترکی سے تعلقات ناخوشگوار تھے، لبنان سے روابط کٹ چکے تھے اور عراق سے بھی یہی صورت پیش آئی تھی، ظاہر ہے کہ ان حالات میں شام ہر طرف سے منقطع ہو گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ وہ بیرونی پیشقدمی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ تاریخ، جغرافیے اور روایات کی بنا پر عراق شام کا قدرتی رفیق تھا، لیکن عراق نے میثاق بغداد پر دستخط کر کے (فروری ۱۹۵۵ء) اپنے آپ کو ترکی اور مغربی طاقتوں سے وابستہ کر لیا، اس وقت مصر و شام پر واضح ہوا کہ جمعیتِ عرب نے تحفظ کا جو میثاق تیار کیا تھا، وہ غیر مؤثر ہو گیا ہے، لہٰذا دونوں نے دفاع کا ایک نیا معاہدہ کر لیا، اس معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکوں کی فوجی کمان میں وحدت پیدا کر لی جائے اور یہ معاہدہ فوجی تربیت، ساز و سامان نیز تنظیمات اور نقل و حرکت کے تمام دوسرے فوجی پہلوؤں پر حاوی تھا، مشرق یا مغرب کے مسائل پر شام و مصر کی رائے ایک تھی، دولت سعودیہ روس سے کوئی سروکار رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔

القوتلی کے ماتحت شام بظاہر غیر جانبداری کی پالیسی پر کاربند تھا، یعنی اجنبی طاقتوں سے معاہدے کی مخالفت اور ہر ذریعے سے بلا شرط ساز و سامان جنگ حاصل کرنے پر آمادگی، روس اور اس کے ساتھیوں نے بلا شرط سامانِ جنگ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ۱۹۵۶ء کے اوائل میں حکومتِ شام نے اپنا وہ وفد واپس بلا لیا، جو تعمیر و نشوونما کی غرض سے تین کروڑ ڈالر کا قرض لینے کے لیے بین الاقوامی

بنک کے پاس بھیجا گیا تھا، رومانیہ سے تجارتی معاہدہ کر لیا، یعنی وہاں سے لکڑی، رنگ، کیمیائی اجزا، دوائیں، زرعی مشینری اور دوسری کلدار چیزوں کے بدلے میں روئی، تمباکو، چمڑا، کپڑا اور زیتون کا تیل دینے کا اقرار کر لیا، اسی قسم کے معاہدے ہنگری، بلغاریہ اور چیکوسلواکیہ سے ہو گئے، روس اور چین کے ساتھ ثقافتی وفدوں کا مبادلہ ہوا، روس سے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ بھی قرار پایا کہ سائنس، فنون، تعلیم وغیرہ کے ماہرین کا مبادلہ ہوگا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں ایک بین الاقوامی میلا بہ مقام دمشق ہوا جس میں تیس ملکوں نے حصّہ لیا۔ ان میں سے آٹھ کا تعلق کمیونسٹ بلاک سے تھا، ۱۹۵۷ء کے میلے میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ شریک نہ ہوئے۔

فوجی تیاری کی ضرورت

شام اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی بدستور جاری رہی، سرحدی چپقلشوں نے خاصی نازک صورت اختیار کر لی۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو اسرائیل نے شام کی ایک فوجی چوکی پر حملہ کیا، جو بحیرۂ طبریہ کے شمالی گوشے میں واقع تھی، اس حملے میں چھتیس شامی مارے گئے، اسرائیلیوں میں سے صرف چھ جانوں کا نقصان ہوا، انجمن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پاس رپورٹ ہوئی، تین مغربی طاقتوں نے اسرائیل کے اس فعل کو غیر مشتبہ طور پر مذموم قرار دیا، لیکن یہ مذمت اتنی ہی حیثیت رکھتی تھی، جیسے سرطان کے مقام پر پلسٹر باندھ دی جائے، اسرائیل کو مغربی طاقتوں، خصوصاً امریکہ کی طرف سے برابر امداد مل رہی تھی، نو لاکھ فلسطینی مہاجروں کا زخم ناسور بن چکا تھا، شمالی افریقہ میں فرانس کا ظلم وجور بدستور جاری تھا، ترکی کی سرحد پر جھڑپیں زیادہ ہو رہی تھیں، اس لیے مغربی طاقتوں کے خلاف عداوت تیز ہو گئی اور مشرق کے ساتھ اتحاد کا جذبہ ترقی کر گیا، ان حالات کا تقاضا یہ تھا، کہ فوجی تیاریوں پر زیادہ زور دیا جاتا، چنانچہ ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لیے پناہ گاہیں بنانے، ثانوی اور تجارتی سکولوں میں فوجی تعلیم وتربیت جاری کرنے اور سرحدی استحکامات کو تقویت پہنچانے کے لیے جلد سے جلد منصوبے بنائے گئے اور انھیں لباس عمل پہنایا گیا۔

اسرائیل اور فرانس وبرطانیہ کی سازش

اب مغرب کے ساتھ مصالحت کی ہر امید ختم ہو چکی تھی، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا، ساتھ ہی فرانس وانگلستان نے ہلہ بول دیا، شام اپنے حلیف کی امداد کے لیے تیار ہو گیا، فوجی افسروں نے اپنے علاقے میں —— عراق پٹرولیم کمپنی کی پائپ لائن اڑا دی، اور اس وقت تک مرمت کی اجازت نہ دی، جب تک مصر کی سرزمین تمام اجنبی فوجوں سے پاک نہ ہو گئی۔ اگرچہ اس سلسلے میں ملک کی آمدنی کو خاصا نقصان پہنچا، مصر کے خلاف تین طاقتوں کے حملے، ور اس کی ناکامی نے جمال عبد النّاصر کے وقار واقتدار میں بہت اضافہ کر دیا اور وہ مصر کے قومی ہیرو کے بجائے عرب کے بین الاقوامی ہیرو بن گیا۔ اسے عوام کے قلوب میں ایک خاص جگہ مل گئی یعنی سب اسے مغربیوں کے جارحانہ اقدامات کے خلاف مزاحمت کا نشان اور اتحادِ عرب کے نصب العین کا مجاہد سمجھنے لگے، جنوبی ومغربی ایشیا کے تمام مسلم عوام کے نزدیک مصر کی جمہوریت کا صدر حد درجہ واجب الاحترام شخصیت بن گیا۔

روس کی ہمدردی

جنگ کے دوران میں روس نے اپنے رضاکار مصر بھیجنے کی دھمکی دی، ۱۹۵۶ء کے موسم گرما میں روس کے وزیر خارجہ نے مصر وشام کا دورہ کیا تھا، جب شام کا صدر القوتلی جوابی دورے کے لیے ماسکو پہنچا تو روس کے صدر کلیمنٹی واروشیلاف نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ پارٹی کا انتظام کیا اور یقین دلایا کہ استعمار کے تمام باقیات پر جلد سے جلد قابو پانے کے لیے روس شام کو تمام ضروری امداد دینے

کے لیے تیار ہے اور اس کے لیے روس کسی قسم کی رعایت یا فائدے کا خواہاں نہیں۔ اس کے بعد دو موقعے ایسے آئے، جب شام نے ترکی پر جارحانہ اقدامات کے ارادے کا الزام لگایا، ان موقعوں پر روس نے ترکی کو متنبہ کیا کہ ہم اپنے شامی حلیف کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح روس نے شام اور باقی عرب دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ مشترک مفاد میں ہر ممکن امداد دی جائے گی۔ مشترک مفاد یہ تھا۔ تین بڑی طاقتوں سے عداوت، اسرائیل کے خلاف اسلحہ کی امداد اور اتحادِ عرب کی تحریک سے ہمدردی غرض روس کے نظریات نے نہیں، بلکہ اس کی پالیسی نے عرب کو اپنا دوست بنا لیا۔ رسمی حیثیت سے شام میں کمیونسٹ پارٹی کے خلاف ممانعت جاری رہی، بالکل یہی کیفیت دوسرے عرب ملکوں کی تھی، اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کو شامی پارلیمنٹ میں نشست مل گئی تھی۔ ۱۹۵۷ء کے موسم خزاں تک القوتلی کا اعلان یہ تھا کہ اگر اسرائیل نہ ہوتا تو ہمیں نئے اسلحہ کی ضرورت پیش نہ آتی اور اگر امریکہ کی طرف سے اسرائیل کے ساتھ مسلسل ترجیحی سلوک نہ ہوتا تو ہم نئے روسیوں کے ساتھ تعارف بہم نہ پہنچاتے۔

امریکہ کی پالیسی

آئزن ہاور نے یہ اصول بنایا تھا کہ مشرقِ قریب کے ہر ملک کے لیے کمیونسٹوں کے خلاف حفاظت و امداد کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ اصول کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا اور حکومتِ شام نے اسے ٹھکرا دیا۔ (جون ۱۹۵۷ء)۔ مئی ۱۹۵۰ء میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے ایک معاہدہ کیا کہ کسی عرب ملک یا اسرائیل کی طرف سے حدوں کو توڑنے کا جو اقدام ہوگا، اس کے خلاف فوری قدم اٹھایا جائے گا۔ اس معاہدے پر اب تک عمل نہ ہو سکا، اسی طرح امریکہ کے وزیرِ خارجہ جان فاسٹر ڈلس نے متعلقہ علاقے کا دورہ کرنے کے بعد اپنی حتمی پالیسی یہ بتائی تھی کہ ہم دونوں فریقوں کے یکساں دوست ہیں، موصوف کا یہ اعلان بھی عملی شکل اختیار نہ کر سکا، غرض شام اور امریکہ کے تعلقات بگڑتے گئے، بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ۱۳؍اگست ۱۹۵۷ء کو ذمہ دار فوجی افسروں نے دمشق میں ایک "امریکی سازش" کا سراغ لگایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ شام کے نظامِ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، اس سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کو حکومت میں لے لیا گیا، جن کے رجحانات کمیونسٹوں کی طرف تھے۔ امریکی سفارت خانے کے تین افسر باہر نکال دیئے گئے، اس کے جواب میں امریکہ نے بھی شام کے سفیر اور اس کے ایک معاون کو واشنگٹن سے نکال دیا۔ اس سے کچھ مدت بعد شام نے روس کی امداد کے بھروسے پر ترکی کے خلاف یہ الزام لگایا کہ شامی سرحد پر فوج جمع کی جا رہی ہے، روس کے وزیرِ اعظم نکولائی بلگانن نے انتباہ کیا کہ شامی سرحد پر ترکی فوجوں کے اجتماع کی جو خبر ملی ہے، اس کے سلسلے میں روس بے تعلق نہیں بیٹھا رہے گا۔

شام و مصر کا اتحاد

دو سال تک شام و مصر کے اربابِ اختیار اپنے سیاسی اتحاد کے امکانات پر غور کرتے رہے، ان کا خیال تھا کہ اتحادِ عرب کی جانب یہ پہلا قدم ہوگا، بڑے بڑے افسروں نے باہم ملاقاتیں کیں، اپنی اپنی رائیں پیش کرتے رہے، نمائندوں اور وزیروں کی مشترکہ مجلسیں ہوئیں اور دوسری متعلقہ تدابیر بھی اختیار کی گئیں، مشترکہ دستور کے لیے زمین ہموار کر دی گئی، یکم فروری ۱۹۵۸ء کو قاہرہ سے دونوں ملکوں کے اتحاد کا اعلان ہو گیا اور اس کا نام "جمہوریہ متحدہ عرب" رکھا گیا، ناصر ہی اس کا صدر قرار پایا، یہ بھی طے ہو گیا کہ جمہوریت کا پرچم ایک ہوگا، فوج ایک ہوگی اور دونوں ملکوں کے باشندوں کو ایک قوم سمجھا جائے گا، دوسرے عرب ممالک کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دے دی گئی، یمن نے اس دعوت کے جواب میں گفت و شنید شروع کر دی، عراق و اردن نے اس کے جواب میں اپنے جدا گانہ

اتحاد کا اعلان کر دیا اور متحدہ حکومت کا نام وفاق عرب رکھا، دولتِ سعودیہ نے الگ تھلگ ہی رہنا بہتر سمجھا۔ لبنان نے اعلان کر دیا کہ ہم نہ اپنے ہمسایوں کے داخلی معاملات میں مداخلت کے خواہاں ہیں اور نہ اپنے معاملات میں ان کی مداخلت گوارا کریں گے۔

غرض تاریخ عرب کے ڈرامے میں نئے ایکٹ کے لیے سٹیج آراستہ ہو چکی تھی، جمہوریۂ متحدہ عرب نے پہلے منظر کا عنوان تجویز کر دیا۔ اس میں شام جو کردار ادا کرے گا، وہ مستقبل کی تاریخ کا موضوع بنے گا۔

جلد سوم　صفحات ۵۸۵　قیمت : چودہ روپے

تاتاریوں کی یلغار

تصنیف : ہیرلڈ لیم

ترجمہ : عزیز احمد

وحشی تاتاری سواروں کی زندگی گھوڑوں کی پیشت پر گزرتی تھی - یہ کتاب ان کی دلچسپ اور ولولہ انگیز تاریخ ہے۔

صفحات ۴۰۰　قیمت : بارہ روپے

تاریخِ شام

تصنیف : فِلپ کے۔ حِتّی

ترجمہ : غلام رسول مہر

صفحات ۵۹۱　قیمت : اکیس روپے

تاریخ لبنان

تصنیف : فِلپ کے۔ حِتّی

ترجمہ : غلام رسول مہر

صفحات ۵۰۴　قیمت : پندرہ روپے

سو تاریخی واقعات (طبع سوم، باتصویر)

تصنیف : ولیم اے۔ ڈیوٹ

ترجمہ و اضافہ : غلام رسول مہر

بڑوں اور بچّوں کے لیے تاریخ کے سو اہم واقعات کا مختصر مگر جامع مجموعہ

صفحات ۱۷۵　قیمت : سات روپے

عرب دُنیا (طبع دوم)

تصنیف : نجلا عزالدین

ترجمہ : ڈاکٹر محمود حسین

حالیہ دنیائے عرب کی سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی تاریخ

صفحات ۴۲۰　قیمت : بارہ روپے

صلیبی جنگیں

تصنیف : انتھونی ویسٹ

ترجمہ : رئیس احمد جعفری

صفحات ۲۶۴　قیمت : چھ روپے

قسطنطنیہ

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

اس کتاب میں قسطنطنیہ کے تاریخی شہر کی دل آویز تصویر کشی کے علاوہ زوالِ رومہ سے عہد جسٹنین تک کی تاریخ بھی ہے۔ لیکن آدھی سے بھی بہت زیادہ کتاب اسلامی عہد کے متعلق ہے جسے فاضل مترجم نے خود لکھ کر اس میں شامل کیا ہے۔

صفحات ۲۵۶ قیمت : آٹھ روپے

فتح قسطنطنیہ

تصنیف : برنرڈ بین کیلٹی
ترجمہ : رئیس احمد جعفری

صفحات ۲۷۲ قیمت : پانچ روپے

جنگ ــــ میکیاولی سے ہٹلر تک

تصنیف : ایڈورڈ میڈ ارل
ترجمہ : برگیڈیر گلزار احمد

شاید ہی کوئی دوسری کتاب جدید جنگی مسائل پر ایسی دُور رس اور سیر حاصل بحث کرتی ہو جیسی اس کتاب میں جنگی داؤ پیچ کے بیس عظیم ترین ماہروں اور مؤرخوں نے پیش کی ہے۔ جنگ کے بے شمار شعبوں ــــ نقل و حمل، حملہ و دفاع، اقتصادیات، سیاست، برّی، بحری و ہوائی جنگ کی ہمہ گیر تصویر۔

صفحات ۳۶۷ قیمت : نو روپے

ایرانِ قدیم

تصنیف : اے۔ ٹی۔ اومسٹیڈ
ترجمہ : سیّد عابد علی عابد

اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ قدیم ایرانیوں کے مذہب، علوم فنون، زبان، ادب، صنعیات وغیرہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے پیدا ہوئے۔

صفحات ۳۶۷ قیمت : پانچ روپے

آزادی کے جنم دن

تصنیف : جینی و یو فوسٹر
ترجمہ : مولانا عبد المجید سالک و مولانا غلام رسول مہر

اس کتاب میں تاریخ کے ان بڑے اہم ایام کی باتصویر کہانی پیش کی گئی ہے جب انسان نے مصیبت،

جہالت اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے انگریزی کتاب کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے اسلام اور پاکستان کے متعلق مفید اضافے بھی کیے ہیں اور اس کو ابتدا سے یوم آزادی تک پہنچا دیا ہے۔ نیز مولانا غلام رسول مہر نے مفید حواشی لکھ کر کتاب کے مطالب سمجھنے میں مزید آسانی بہم پہنچائی ہے۔

صفحات ۶۴ — قیمت : چار روپے

ایڈیسن (طبع دوم، باتصویر)

تصنیف : ہنری ٹامس
ترجمہ : محمد سعید

دنیا کے سب سے بڑے موجد ٹامس ایلوا ایڈیسن کی زندگی اور اس کی ایجادات کے دلچسپ اور سبق آموز حالات۔

صفحات ۱۸۸ — قیمت : تین روپے پچاس پیسے

چند عظیم علمائے جراثیم (طبع دوم)

تصنیف : ڈاکٹر پال ڈی۔ کرالف
ترجمہ : پروفیسر عبدالمجید قریشی

ان شہرۂ آفاق سائنس دانوں کے سوانح جنھوں نے جراثیم کے متعلق تحقیق کرکے اپنے آپ کو زندہ جاوید بنا لیا۔

صفحات ۴۴۰ — قیمت : دس روپے

سو بڑے آدمی (طبع سوم - باتصویر)

تصنیف : ولیم۔ اے ڈیوٹ
ترجمہ و اضافہ : مولانا عبدالمجید سالک

ابتدائے تہذیب سے دورِ حاضر تک کی سو عظیم شخصیتوں کے مختصر سوانحی مرقعے جو بڑے اور بچوں کے لیے یکساں دلچسپ ہیں۔

صفحات ۱۰۴ — قیمت : پانچ روپے

عظیم علمائے نفسیات

تصنیف : ایس سٹینز فیلڈ سارجنٹ
ترجمہ : پروفیسر عبدالمجید قریشی

مغرب کے مشہور ماہرینِ نفسیات کے نظریات، انکشافات اور تجربات پر سیر حاصل بحث

صفحات ۶۰۰ — قیمت : بارہ روپے

غازیانِ تہذیب

تصنیف : جوزف کوٹلر
ترجمہ : مولانا سید ہاشمی فرید آبادی

ان لوگوں کے حالات جنھوں نے انسانی تہذیب کو ترقی دی

صفحات ۶۸۰ — قیمت : پانچ روپے

مشہور مُوجد اور ان کی ایجادیں

تصنیف : فلیچر پریٹ
ترجمہ : ابوالحسن نغمی

صفحات ۲۱۰ — قیمت : دو روپے پچھتر پیسے

غریب لڑکے جو نامور ہُوئے (طبع دوم)

تالیف : سارہ کے۔ بولٹن
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
ترتیب و اضافہ : مولانا عبدالمجید سالک

مشرق و مغرب کی ان عظیم شخصیتوں کے حالاتِ زندگی جنھوں نے ناسازگار حالات کا مقابلہ کر کے اپنا ماحول خود پیدا کیا اور انسانیت کو فیض پہنچایا۔ اصل کتاب میں تیرہ مشرقی مشاہیر کے سوانح کا اضافہ کیا گیا ہے۔

صفحات ۲۵۶ — قیمت : چھ روپے

لڑکیاں جو نامور ہُوئیں

(طبع دوم)

تالیف : سارہ کے۔ بولٹن
ترجمہ : اختر عزیز احمد
ترتیب و اضافہ : مولانا عبدالمجید سالک

دنیا کی ان مشہور خواتین کے سوانح، جنھوں نے تعلیم، تیمارداری، فنونِ لطیفہ، ہوابازی، سائنس، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نام پیدا کیا۔ اس کتاب کے لیے دس مشرقی نامور خواتین کے سوانح خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں۔

صفحات ۲۲۰ — قیمت : پانچ روپے

بابر (شیر ببر)

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : سید ہاشمی فرید آبادی

مشہور مصنف ہیرلڈ لیم تاریخ کو افسانوی انداز میں پیش کرتا ہے لیکن اس کی صداقت میں فرق نہیں آنے

دیتا۔ بابر کی اس مستند سوانح عمری میں بھی ناول کی سی دلفریبی ہے۔

صفحات ۲۸۴ قیمت : آٹھ روپے

چنگیز خاں (طبع سوم)

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : عزیز احمد

شہرۂ آفاق فاتح کے حالاتِ زندگی، جس نے جہاں سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی وہاں ایک پائدار تہذیب کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ بے حد دلچسپ اور سبق آموز داستان۔

صفحات ۳۲۴ قیمت : چھ روپے

امیر تیمور (طبع دوم)

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : برگیڈیر گلزار احمد

امیر تیمور، جس کی ہیبت سے زمین و آسمان لرزاں تھے، کسی بادشاہ کا بیٹا تھا نہ کسی قوم کا سردار۔ اس نے جو کمال حاصل کیا اپنے زورِ بازو سے کیا اور نصف دنیا کی افواج کو شکست دی۔

صفحات ۳۷۱ قیمت : نو روپے

سُلطان صلاح الدّین ایوّبی (طبع دوم)

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : یوسف عباسی

اسلام کے بطلِ عظیم سلطان صلاح الدین ایوبی کے مجاہدانہ کارناموں، درویشانہ زندگی اور بارھویں صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی آویزشوں کا جامع اور ولولہ انگیز مرقع۔

صفحات ۶۸۰ قیمت : سترہ روپے پچاس پیسے

سکندرِ اعظم

تصنیف : ہیرلڈ لیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

سکندرِ اعظم کو دنیا جابر اور فاتح کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس کتاب میں اس کے کردار کے بشری پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات ۴۲۲ قیمت : دس روپے پچاس روپے

سلیمان عالیشان

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : غلام رسول مہر

ترکی کا یہ عظیم سلطان بڑا جرنیل اور عالیشان حکمران تھا۔ وہ میدان جنگ میں کیا تھا اور حرم کی دیواروں کے پیچھے کیا؟ اس کا جواب اس تصنیف میں ملتا ہے۔

صفحات ۵۲۰ قیمت : نو روپے پچاس پیسے

عُمر خیّام

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : جمیل نقوی

سحر انگیز رباعیات کے خالق کے حالاتِ زندگی افسانوی اسلوب میں۔ خیّام کی ہمہ گیر شخصیّت اور اس کے عہد کے تمدّن کا دلآویز مرقع۔

صفحات ۵۱۴ قیمت : دس روپے

نُور محل (طبع سوم)

تصنیف : ہیرلڈلیم
ترجمہ : شبلی ایم۔کام و حکیم حبیب اشعر

وہ حسین و جمیل ایرانی لڑکی جو صحرا میں پیدا ہوئی اور سلطنتِ مغلیہ کے عین عروج کے زمانے میں اس کی بے تاج فرمانروا بن گئی۔ لیکن جہانگیر کی وفات کے بعد اس پر کیا بیتی؟ ایک دلآویز افسانوی سوانح عمری۔

صفحات ۳۵۱ قیمت : سات روپے پچاس پیسے

رفقائے عظیم

تصنیف : میکس ایسٹ مین
ترجمہ : پروفیسر محمد حامی الدّین خاں

اس کتاب میں مصنّف نے اپنے ہم عصر مشاہیر سے اپنی ملاقاتوں کا حال نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان ملاقاتی مرقعوں میں دوسروں کے لیے بھی سرمایۂ بصیرت اور دلچسپی موجود ہے۔

صفحات ۴۷۲ قیمت : دس روپے

استقلال کے پیکر

تصنیف : رابرٹ میرل بارٹلیٹ
ترجمہ : حکیم حبیب اشعر دہلوی

دورِ حاضر کے ان چند عظیم انسانوں کے ہمت آفریں حالاتِ زندگی جنھوں نے استقلال کی شاہراہ پر

گامزن رہ کر اپنے اپنے فن اور پیشے میں کمال حاصل کیا۔ مگر خدمتِ انسانیت کے لیے وقف ہو گئے۔ یہ رہنما وطن، نسل اور مذہب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر جہاں تک انسانیت کی خدمت کا تعلق ہے ان سب کی کوششیں ایک ہیں۔

صفحات ۲۸۸ قیمت : چھ روپے پچھتر پیسے

آئن شٹائن کی کہانی

تصنیف : مے بیکر فریمن

ترجمہ : رئیس احمد جعفری

دنیائے سائنس میں شاید ہی کسی شخص نے آئن شٹائن کی طرح دنیا سے عظمت اور تحسین کا خراج حاصل کیا ہو۔ اس عظیم سائنسدان کے حالاتِ زندگی کا انتہائی دلآویز مرقع۔

صفحات ۲۲۸ قیمت : چار روپے

سقراط

تصنیف : کورا مین

ترجمہ : آنسہ صبیحہ حسن

تعارف : ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

خوشی خوشی زہر کا پیالہ پینے والے عظیم فلسفی اور مصلح کی زندگی کی داستان اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ سوانح عمری پر ایک دلچسپ ناول کا گمان گزرتا ہے۔

صفحات ۲۰۸ قیمت : دو روپے پچاس پیسے

پاکستان کی پہلی کتاب

تصنیف : جان بوتھویل

ترجمہ : سید ہاشمی فرید آبادی

اس کتاب میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں شہری اور دیہاتی زندگی پر فاضل مصنفہ نے روشنی ڈالی ہے۔ آفسٹ کی چھپائی اور تصاویر سے مزین۔ صفحات ۷۸ قیمت : تین روپے پچھتر پیسے

عرب اور اہلِ عرب

تصنیف : رچرڈ ایچ۔ سینگر

ترجمہ : مولانا غلام رسول مہر

جغرافیائی، تاریخی، تمدنی، ثقافتی اور ترقیاتی معلومات کا مجموعہ

صفحات ۳۸۴ قیمت : چھ روپے

تاریخ اور سیاست

منتخب التواریخ

مُصنف : ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی

ترجمہ : محمود احمد فاروقی

تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ کا صحیح انتخاب، محمود غزنوی سے عہدِ اکبری تک کے مستند اور مفصل حالات کا مکمل جائزہ، تاریخی حقائق اور مستند ترین واقعات کا بیش بہا مرقع۔

قیمت ۱۸/۰ روپے

ظہیرالدین بابر اور ان کا عہد

مصنف : ولیم ارسکن

ترجمہ : حسینی انور

مغل بادشاہی کے بانی "ظہیرالدین بابر کی عبرت انگیز داستانِ حیات" جس میں اس عظیم الشان بادشاہ کی مدوجزر بھری کہانی ولیم ارسکن نے نہایت ہی دلچسپ انداز میں قلمبند کی ہے۔ گویا اس دور کی مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔

قیمت ۱۵/۰ روپے

امامت و سیاست

رئیس احمد جعفری

اِسلامی تاریخ کے دورِ خلافت کا کامیاب اور تحقیقی جائزہ، یہ کتاب فکر انگیز بھی ہے اور تاریخی حقائق کا حسین و جمیل مرقع بھی۔

قیمت ۷/۵۰ روپے

بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد

رئیس احمد جعفری

مکمل تاریخ، مستند واقعات، عبرت انگیز حقائق کا دلآویز اور حسین مرقع جو اس دور کا مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔

قیمت ۲۵/۰

واجد علی شاہ اور ان کا عہد

رئیس احمد جعفری

نواب واجد علی شاہ کی شخصیت، سیرت و کردار وضع قطع، عادات و شمائل ان کی مظلومیت، اور زبوں حالی کا صحیح خاکہ اور ان کے عہد کی مکمل و جامع تاریخ۔

قیمت ۱۵/۰ روپے

اِنسائیکلوپیڈیا تاریخِ عالم

(تین جلدوں میں مکمل)

تالیف : ولیم، ایل، لنگر

ترجمہ : غلام رسول مہر

دُنیا کی مکمل تاریخ اِس مختصر سے اِنسائیکلوپیڈیا میں اس طرح سمودی گئی ہے کہ ہر اہم واقعہ ایک منٹ میں دیکھ سکتے ہیں۔ پہلی جلد جزوی تاریخ پر مشتمل ہے باقی دو جلدوں میں دنیا کی تاریخ عمومی شروع سے آج تک کا اجمالی جائزہ ہے" جو ہر لائبریری میں ہونا چاہئیے۔

قیمت ۴۵/۰ روپے

حیدرآباد جو کبھی تھا

تصنیف : کے، ایم، منشی

تہذیب و ترجمہ : رئیس احمد جعفری

حیدرآباد کا بگڑنا اور مٹ جانا ایک بہت بڑی داستانِ عبرت ہے۔ یہ سلطنت کس طرح فنا کے گھاٹ اُتری؟ حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل مسٹر کے' ایم' منشی کے قلم سے جس پر رئیس احمد جعفری نے ترجمے کے ساتھ حواشی بھی لکھے ہیں۔ قیمت ۱۲/۰ روپے۔

کشمیر اور جونا گڑھ کی کہانی

مُرتب : وی، پی، مینن

ترجمہ : رئیس احمد جعفری

آزادیٔ ہند کی اِنقلابی زد میں آنے والی مسلم ریاستوں کی عبرت ناک داستان کا انجام۔ قیمت ۷ روپے۔

۱۸۵۷ء

غلام رسول مہر

پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی کے مفصل و مستند اور مکمل و جامع حالات، مجاہدین کی بے مثال استقامت انگریزوں کے ظلم و جور کی لرزہ خیز داستانوں کا مرقع۔

قیمت ۹/۰ روپے

۱۸۵۷ء کے مجاہد

غلام رسول مہر

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جن بہادر اور اولوالعزم مجاہدوں نے اپنی جان کی بازی لگائی اُن کے مستند حالات و سوانح کا گنجینہ۔ قیمت ۵/۰ روپے

جماعت مجاہدین

غلام رسول مہر

سرزمین پاک و ہند میں تحریک احیاء دین اور آزادیٔ وطن کے کارواں سالار سید احمد شہیدؒ کے رفقا کی مکمل و جامع تاریخ کا دلآویز مرقع۔

قیمت ۸/۰ روپے

سرگذشت مجاہدین

غلام رسول مہر

حضرت سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین نے ایک سو سال میں اسلام کے احیاء، اسلامی حکومت کی بحالی اور ملک کی آزادی کے لئے جو جہاد کئے اُن کی مفصل سرگذشت۔

قیمت ۱۲/۵۰ روپے

مختصر تاریخِ اسلام

غلام رسول مہر

تاریخی واقعات کو اِس جامعیت سے پیش کیا ہے کہ اِسے پڑھنے کے بعد اسلامی تاریخ کے تمام پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، مختصر لیکن جامع و مکمل، شجرہ ہائے اور نقشہ جات سے مزین۔

قیمت ۸ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔ حیدرآباد۔ کراچی